اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور
اقبال
ساقی
افسانہ نمبر

ہر سال ساقی کے کئی خاص نمبر
ہیں۔ انکی قیمت مستقل خریدار
علیحدہ نہیں لی جاتی ۔ ا ۔ امہا ۔
بھیجکر ساقی کے مستقل خریدار بنجائیے

روپے
پے سے
بارہ شلنگ
نمونہ مفت

جُرعَات

جلد (۱۶) | ساقی دہلی۔ افسانہ نمبر بابت ماہ جون ۱۹۳۷ء | نمبر (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

افسانہ نویسی و داستان سرائی کے متعلق آئے دن اچھے اچھے مضامین ہمارے رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے فن کے متعلق بھی اردو میں چند کتابیں موجود ہیں۔ ہمارے نئے لکھنے والے بالعموم یہ غلطی کرتے ہیں کہ بغیر کچھ معلومات حاصل کئے افسانے لکھنے شروع کر دیتے ہیں۔ فن کا تو ذکر ہی کیا، مشاہدہ ان کا سطحی اور تجربہ نہیں بالکل ہوتا نہیں۔ ذاتی واقفیت تو یوں ختم ہوئی۔ اب رہ گیا کتابی علم، تو انہیں زحمتِ مطالعہ گوارا نہیں۔ یوں مشاہدہ اور مطالعہ دونوں معدوم۔ جب اس اہتمام سے افسانے لکھے جائیں تو نتیجہ معلوم۔ اس پر اڈیٹر کی سرد مہری کا شکوہ اور اس کے غرور و پندار پر غم و غصہ کا اظہار ؎

ہم نے وہ لطف اٹھائے ہیں کہ دل جانتا ہے!

پھر اڈیٹر ہی سے پوچھا جاتا ہے کہ آخر آپ افسانے میں چاہتے کیا ہیں؟ اس کا جواب اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ یہ سوال آسان ہے۔ تاہم کسی حد تک ہم اسے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

افسانہ نگار کے لئے سب سے ضروری امر یہ ہے وہ جو کچھ لکھے دلچسپ ہو۔ اس کا پلاٹ نیا ہو یا پرانا، سادہ ہو یا پیچیدہ، افسانے کی فضا غم انگیز ہو یا مضحکہ خیز، اس کے دورانِ مطالعہ میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آنا چاہیئے کہ ایک معقول پڑھنے والے کو جمائیاں آنے لگیں اور اس کی طبیعت اتنی اکتا جائے کہ کہانی ادھوری ہی چھوڑ دے۔ اگر پڑھنے والے نے کہانی ختم کرنے سے پہلے پڑھنا ختم کر دیا تو سمجھئے کہ افسانہ نگار اپنے مقصد میں ناکامیاب رہا۔

افسانہ نگاری کے فن کے متعلق تفصیل سے یہاں کہنے کی گنجائش نہیں۔ مغربی افسانہ نگاروں میں اس موضوع پر اختلاف آرا ہے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کی رائے کچھ ہے اور اسٹیونسن اس سے پہلے کچھ اور کہہ گیا ہے۔ وہ مختصر افسانوں کو تین قسموں میں تقسیم کرتا ہے اور اس سے بھی پہلے ایڈگر ایلن پو افسانے کے اجزائے ترکیبی پر اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہے۔ بہرحال مختصراً یوں سمجھئے کہ یہ سب اس پر متفق ہیں کہ فنی حیثیت سے مختصر افسانہ کم و بیش پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ یہ ایک دلچسپ مرقع ہو چند کرداروں کے ایسے واقعات کا جو منتہا کو پہونچتے ہوں۔

افسانے کا اپنا ایک ماحول ہونا چاہیئے، واقعات و خیالات میں جامعیت ہونی چاہیئے اور یہ ایسے گندھے ہوئے ہونے چاہئیں کہ پڑھنے والے کا خیال ان میں جذب ہو جائے۔ اگر افسانے میں ذہن کو اکسانے کا عنصر لطیف بھی ہو تو سونے پر سہاگہ سمجھئے۔

پبلک کا مذاق بہت کچھ بدل گیا اور بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ بیس سال پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے؟ عوام میں تعلیم عام ہونے کی وجہ سے مذاقِ ترقی کے کئی مدارج طے کر چکا۔ جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی رنگین کہانیاں اب عام طور سے بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ آجکل کا پڑھنے والا خیالات کی گہرائی میں اترنے اور تجزیہ کرنے کا خوگر ہو گیا ہے۔ افسانہ نگار کی شخصیت کا اثر قبول کرنے کے لئے بھی آمادہ نظر نہیں آتا۔ بعض وہ کہانیاں جنہیں پڑھکر اب سے ربع صدی پہلے کے پڑھنے والے آبدیدہ ہو جاتے تھے اب انہی کہانیوں کو پڑھکر آج کل کے بعض پڑھنے والے رلانے کی کوشش پر قہقہے لگاتے ہیں۔ یہ وقت تاریخ کا سوال نہیں ہے بلکہ عوام کے ادبی مذاق کی ترقی کا ثبوت ہے۔ اس ترقی یافتہ ذوقِ ادب کا لحاظ بطورِ خاص ہر افسانہ نگار کو رکھنا پڑیگا۔ امید ہے کہ نئے لکھنے والے حضرات، اگر ان امور کو پیشِ نظر رکھیں گے تو انہیں اڈیٹروں کے ظلم اور اپنی مظلومیت کا کچھ زیادہ شکوہ نہیں رہے گا۔

پیشِ نظر "افسانہ نمبر" میں مضمون نگار حضرات کی عنایت سے نہایت پاکیزہ افسانے جمع ہو گئے ہیں۔ دلی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر صاحب کے ہم شکر گذار ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مضامین کے شائع کرنے کی اجازت دی:۔ دربار اکبری کی ایک جھلک۔ ایک پرانا زمانہ۔ فسانۂ آزاد۔ فرزانجی کی بیٹی۔ خرافات اور فولادی عشق۔ ان مضامین کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اے۔ آئی۔ آر۔ دہلی سے کیسے کیسے بیش قیمت مضامین نشر کئے جاتے ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ جو مضامین نشر کئے جاتے ہیں ان کی طباعت و اشاعت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس وقت ایک مغربی شاعر کا قطعہ یاد آتا ہے:۔

(بقیہ بر صفحہ ۸)

دُعا

گدازِ جاوداں یعنی دلِ بیدار مل جائے!
فروغِ مہر یعنی وسعتِ پندار مل جائے!

مرا سوزِ دروں ہو سر بسر اک آتشیں نالہ!
مری طبعِ رسا کو شغلِ موسیقار مل جائے!

تخیل کو مرے مولا شہیدِ جستجو کر دے!
مرے پائے طلب کو برق کی رفتار ملجائے!

مری جو آرزو ہو رزمِ ہستی کا مرقّع ہو!
مری تیغِ خودی کو جوہرِ کردار مل جائے!

عقابِ جستجو کو شہپرِ جبریل دے یارب!
شکارِ آہوانِ وادیِ اسرار مل جائے!

یہی ہے زندگی۔ ہو موت سے بیگانہ دل اپنا
یہی ہے حرّیت۔ آزادیِ افکار مل جائے!

امیں کندہ ہے جس پہ "انتم الاعلون" کا وعدہ
ہمیں ایقان کی وہ تیغِ جوہر دار ملجائے

[illegible]

کہانی کی کہانی

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو ایک افسانے کے ماتحت ایک افسانہ لئے ہوئے پیدا ہوتا ہے۔ جب تک زندہ رہتا ہے افسانہ بن کر زندہ رہتا ہے اور جب مرتا ہے تو دوسروں کے لئے ایک افسانہ چھوڑ جاتا ہے۔ درحقیقت انسان خود ایک افسانہ ہے۔ قدرت کا بنایا ہوا۔ فطرت کا لکھا ہوا۔ چاہے یوں کہہ لو کہ افسانہ نظم ہستی کے ایک بلیغ مصرع کی توضیح ہے جو اپنے اندر صدہا کہانیاں، ہزاروں افسانے رکھتا ہے۔ کچھ پوشیدہ کچھ ظاہر۔

عالم کی تخلیق کے ساتھ ساتھ افسانے یا کہانیاں بھی چلتی ہیں۔ لیکن ارتقا کی ہر منزل میں ان شکلوں میں فرق آتا جاتا ہے اور اپنے کردار کی خصوصیات سے متاثر ہو کر یہ مختلف رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کا بے پناہ اثر۔ حالات کا تغیر پذیر طوفان اور وقت کی اُلٹ پھیر اور دیگر ایسے اسباب ہیں جو اُنہیں ایک معیار پر نہیں رہنے دیتے۔

قصے۔ کہانیاں سننا سُنانا حیاتِ بشری کا ایک دل خوش کُن مشغلہ ہے۔ اس کو آرٹ کی شکل میں لانے کیلئے کچھ زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی۔ مادّہ تیار رکھا۔ ادبی اور تمدنی نشوونما کے ساتھ صرف اخلاقی اور تعلیمی حاشیے چڑھانے تھے۔ قدیم کہانیاں کہنے والے یا داستان گو عموماً گھر کے بڑے بوڑھے یا اخلاقی رہنما ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے قصے اس ارادے سے سناتے تھے کہ سُننے والوں کو عبرت حاصل ہو۔ کچھ عرصہ بعد جب زندگی کی سادگی نظر فریب ہونے لگی۔ جذبات میں گونا گونی پیدا ہو گئی تو افسانوں میں بھی رنگینی آ گئی۔ دلچسپی اور لطف کے لئے وہ باتیں بڑھا دی گئیں جو واقعیت کے خلاف تھیں۔ سننے والے ان طرح کی کہانیوں کو مزے لے لیکر سُنتے تھے اور اس لئے سُنتے تھے کہ روزمرہ زندگی کی یکسانیت اور بے مزگی سے رہائی حاصل ہو۔ ایسے قصوں کا پورا کا پورا سرمایہ عشق و عاشقی کے معاملات۔ بھوت اور پری کے وجود کی تصدیق اور جوانمردی کے کارنامے ہوا کرتا تھا۔ یہاں تک فسانہ گوئی ایک فن اور رنگ گئے بلکہ افسانہ نویسی پورا ایک آرٹ بن گئی۔

ان افسانوں، قصوں اور کہانیوں کو دیکھ کر یورپ والوں نے ناول پیدا کئے۔ تاریخ اور قصص الاصنام کے درمیان ادب کی دُنیا میں ایک ایسا میدان نکالا جس سے مشرق والے تقریباً بے خبر تھے۔ مغربی ناول نویس زندگی کی ایک تصویر پیش کرتا ہے جس سے ہم سمجھ لیتے ہیں کہ اسکا ارادہ عبرت دلانا۔ خوش کرنا۔ ہنسانا یا غور و فکر کی اُلجھنوں میں ڈالنا ہے۔ مشرقی افسانے محض تفنن طبع یا کسی خاص مجلس کی دلچسپی کے لئے ہوتے تھے۔ اس لئے داستان کی تاریخی اور جغرافیائی صحت شرط نہ تھی لیکن مغرب نے ان سب ضرورتوں کا لحاظ رکھا ہے اور جہاں کہیں اس رَوش کو چھوڑنا پڑا ہے تو بے تُکے پن سے نہیں۔

افسانہ اور محبت کا رشتہ بہت پُرانا ہے اور جُوں جُوں تہذیب ترقی کرتی جاتی ہے یہ رشتہ اور مضبوط ہوتا جاتا ہے اور اس لئے چار و ناچار یہ ماننا پڑیگا کہ افسانہ بغیر محبت کے اور محبت بغیر افسانے بے نمک اور پھیکی رہ جاتی ہے۔ "ایک نوجوان مرد اور ایک حسن و شباب کی متوالی عورت" یہی دو تصویریں ہیں جن کو ہر افسانہ اور ہر ناول پیش کرتا ہے۔ عشق کی یہی کہانی ہر قوم اور ہر تہذیب کے افسانہ نگاروں نے دہرائی ہے۔ باوجود اس کمزوری کے اور باوصفِ محبت کے اس فریب میں مبتلا ہونے کے ہر طبقے کی کہانی جُداگانہ ہے۔ بامزہ ہے اور اچھوتی ہے۔ اور اس لئے جنہوں نے محبت کو دُنیا کی تخلیق کا راز سمجھا ہے۔ غلط نہیں سمجھا۔

یورپ کے ناول اور افسانے بھی اس لطیف جذبے سے خالی نہیں ہیں۔ عشق کا عنصر قصہ میں جان ڈالنے کے لئے اکثر ناولوں میں پایا جاتا ہے۔ بہت سے اوچھے اور بازاری مذاق کے ایسے بھی قصے ہیں جن میں ادبی یا اخلاقی کوئی خوبی نہیں بلکہ ان کا وجود تہذیب کو گندا اور انسانیت کو شرمندہ کرنے والا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک مغربی ناول عموماً ایسے آئینے کا کام دیتا ہے جس میں سوسائٹی اپنے عیب و صواب دیکھتی ہے اور معاملات درست کرنے کی جدوجہد کر سکتی ہے۔ انگلستان کے پہلے ناول نویس فیلڈنگ نے اپنے ناول کے ذریعے سے اپنی قوم کو تعلیم و

تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ جو اپنی حالت میں مست اور اشاعتِ علم سے بے اعتنا تھی۔ پھر کیا تھا ناول نویسی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ غربا کی مصیبتیں، امرا کی بے پروائی اور نا انصافی ایسے مؤثر الفاظ میں دکھائی جانے لگیں کہ اکثر حکومتیں بھی مرعوب ہو گئی ہیں۔

یہ سچ ہے، اور جس نے کہا بلاشبہ سچ کہا ہے کہ "انسان حقیقت سے روپوش ہو کر افسانہ میں پناہ لیتا ہے" لیکن اگر شاعری کی طرح افسانہ نویسی کو بھی اس لئے دروغگوئی کا آلہ بتایا جاتا ہے کہ وہ حقیقت کی ان بلندیوں سے انسانی جذبات کو دیکھتی ہے جہاں پہونچنے کے بعد ہماری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں تو کوئی شکوہ نہیں اور اگر ان کا منشا یہ ہے کہ ناول طبیعیات یا ریاضی کی کتاب ہو یا اس میں تاریخ دہرائی جائے تو ناول، افسانے یا ڈرامے ملک یا قوم کی وہ خدمت نہیں کر سکتے جس کے لئے یہ پیدا کئے گئے ہیں۔ آرٹ سے یہ امید رکھنا کہ وہ مذہب یا اخلاق کی قائم مقامی کرے اور الہامی کتابوں کی طرح اس میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں بالکل غلط ہے۔ آرٹ کی خوبی صرف یہ ہے کہ وہ انسانیت اور تہذیب کی حفاظت کرے اور اپنی طاقت سے امن کے وقت امن اور انقلاب کے وقت انقلاب پیدا کر سکے۔

افسانہ نگار اور ناول نویس آرٹسٹ کی حیثیت میں کسی خاص مذہبی یا اخلاقی تعلیم کا پابند نہیں ہو سکتا۔ اس کا مشرب دنیائے جذبات کی سیر ہے۔ وہ دوسروں کو بھی یہی ترغیب دیتا ہے کہ تعین کے تجربے سے نکھو اور حسیات کا مقابلہ کرو۔ کذب و صدق، نیک اور بد کا جو معیار مذہب اور اخلاق نے مقرر کیا ہے ایک آرٹسٹ اسے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اس کو تنگ نظری کہتا ہے۔ اس کا ایمان، اس کا عقیدہ بہت پختہ اور نہایت سچا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی حدود میں سچا اور حقیقت کو ایسی روشنی میں دکھانے والا ہوتا ہے کہ سراسر فریب معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کی بلند پروازی اور معرفت کی بدولت ایک آرٹسٹ گمراہ سمجھا گیا ہے۔

بیسویں صدی کا ایک مشہور ناول نویس اناطول فرانس کہتا ہے:

"سچ کی تلاش ہے تو سائنس کی بارگاہ میں جا۔ ادب کا مقصد تخلیقِ حسن اور صرف تخلیقِ حسن ہے۔ افسانے کو دلکش بنانا چاہتے ہو تو اسے زندگی کے معمولی تجربات سے بلند کرو اور امکانات کی بحث سے کھوٹے سچے کے لئے بے نیاز ہو جاؤ"

اسی طرح آسکر وائلڈ کا قول ہے کہ "صناع خوبصورت چیزوں کا خالق ہے۔ صنعت کا اظہار اور صناع کا اخفا صنعت کا مقصد ہے"

مطلب یہ ہے کہ افسانہ نویس، شاعر اور مصور مذہب کے پیشوا ہوتے ہیں نہ اخلاق کے معلم۔ ان کا موضوع عموماً ایک انسان کی طبیعت ایک جذبے کا کھیل ہوتا ہے، یا کسی واقعہ کا اثر۔ اس سے بحث نہیں کہ بیان نفسیاتی ہو یا عاشقانہ۔ عشق کو افسانہ کے لوازمات میں سے خارج کرنے کی جرأت سب سے پہلے روسی مصنفوں نے کی ہے۔ اس جدت نے عوام الناس کو ناولوں اور افسانوں کی قدردانی سے محروم کر دیا۔ لیکن سنجیدہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت جو ان عشق اور فسق میں ڈوبے ہوئے قصوں کو ادبی لغویات سمجھتے تھے متوجہ ہو گئے۔

لیکن محبت کا ناول سے فراق مبارک نہیں تھا۔ اس جذبے کے بغیر ناولوں اور افسانوں کی کوئی خصوصیت نہیں رہتی۔ وہ لوگ جنہیں انسانیت کے اعلیٰ مسائل سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ جو مذہبی یا اخلاقی کتاب سمجھ کر انہیں نہیں پڑھتے جو صرف اپنی فرصت کے وقت ایک دلچسپ شغل یا سیدھے سادے الفاظ میں اپنے جنسی جذبات کے لئے گدگدی اور دل کو مسکراتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے خشک اور منطقی اور ایسے فلسفیانہ رنگ کو پسند نہیں کر سکتے۔ اور بات بھی ٹھکانے کی ہے۔ اگر ہم ناولوں اور افسانوں میں واقعات کی حقیقت اور غیر ضروری تکلفات پر اصرار کریں تو ناول کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ان کی دلچسپ فلسفیانہ حیثیت بالکل مٹ جاتی ہے۔ اور ان میں کچھ اس قسم کی یکرنگی سی آجاتی ہے جو ہماری زندگی کا صحیح عکس نہیں۔

ناول لکھنا اگر آرٹ ہے اور مان لیا گیا ہے کہ آرٹ ہے تو اس کے لکھنے والے مذہبی گمراہ ضرور ہیں مگر نفسیات کے میدان کے راہبر ہیں۔ ہاں اگر کوئی مصور ننگی عورت کی تصویر بنائے۔ کوئی شاعر عریانیات پر طبع آزمائی کرے اور کوئی افسانہ نگار ہوس پرستی کی ترغیب دے تو حقیقت میں تمدنی تباہی اور اخلاقی تنزل ہے۔ وہ بیشک خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے۔ لیکن یہ ان کا اپنا الحاد، ان کی اپنی بے دینی ہے۔ آرٹ کی کوئی خطا نہیں۔ ہماری دنیا، ہماری زندگی بلکہ ہم خود اعلیٰ و ادنیٰ، رذیل اور جمیل اجزا سے مرکب ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ، رذیل اور جمیل میں امتیاز نہ کرنا، انسانیت اور بشری زندگی کے راز کو نہ سمجھنا صرف ہماری فہم کی کمی ہے۔

پریسٹلے کا قول ہے کہ "میں تخیل کی جولانی پر کل قصوں کو جانچنے کے لئے تیار ہوں۔ کیونکہ ہر زمانے میں اس کی ہمہ گیری زمانہ کے مطابق

رہی ہے۔ اور آج بھی کردار نگاری اسی تخیل کا نتیجہ ہے۔ جو لوگ ناول یا افسانے کے مفہوم کو سائنس کے اُصولوں اور تاریخی زاویہ نگاہ سے جانچنا چاہتے ہیں وہ فطرتِ انسانی کی گوناگونیوں سے محروم ہیں۔ طبعیات کے بہت سے نظریئے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ تاریخی واقعات سے انکار ہو رہا ہے۔ لیکن طلسم ہوشربا، فسانۂ عجائب، شرر اور سرشار کی تصانیف بدستور اپنی جگہ قائم ہیں اور اپنی دلچسپیوں سے برابر اپنے متوالوں کو مسرور کر رہی ہیں۔ گیا یہ افسانہ نویس صرف اس لئے ادب کی محفل سے نکال دینے کے قابل ہیں کہ انہوں نے کردار نگاری کا پورا حق ادا نہیں کیا۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ یورپ کی طرح ہندوستان میں اُردو والے بھی یہ کہنے پر تیار ہونگے کہ ناول یا افسانہ صرف انبساطِ قلب کیلئے ہے۔

ناول کا نام اگرچہ انگریزی ادب کے ساتھ اُردو میں آیا ہے۔ لیکن اس کا مفہوم یہاں اس وقت سے موجود ہے جب سے کہانیاں کہنی اور سُننی شروع ہوئی ہیں۔ اس لئے اس کے معنی محدود نہیں ہو سکتے۔ ناول کا میدان بھی اسی قدر وسیع ہے جتنا خیال کا۔ اگر کوئی شخص اس کو کسی خاص اُصول کے تحت میں دیکھنا چاہتا ہے تو وہ اپنا ذاتی نقطۂ نظر الگ بناتا ہے۔ اور یہ ناول کے مفہوم سے اجنبیت اور اس کی اپنی غلط نگاہی ہے۔

اشرف صبوحی (منشی فاضل)

نگاہِ اولین

(بسلسلہ صفحہ ۴)

سمندر کے تاریک اتھاہ غاروں میں
بیشمار نادر جواہر یارے پڑے ہیں
لاتعداد پھول ایسے کھلتے ہیں جن پر کسی کی نظر تک نہیں پڑتی
اور یہ اپنی خوشبو ویرانے کی ہواؤں میں ضائع کر دیتے ہیں۔

بس اسی سے کچھ ملتا جلتا حال ریڈیو کے مضامین کا ہے کہ نشر کئے جانے کے بعد ہواؤں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ ہم نے بڑی کوشش سے یہ چند مضامین فراہم کئے ہیں۔ بعض حضرات اپنے مضامین کی اشاعت پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ انہیں آمادہ کیا۔ بعض کے پاس مضامین کی نقلیں نہیں تھیں، ڈائریکٹر صاحب کی مہربانی سے ان کے مسودے نکلوا کر نقل کرائے گئے۔ بعض حضرات نے ایک میٹھ دو کاج سمجھکر اپنے مضامین خود ہی عنایت کر دئے اور بعض تو ایسے ثقیل نکلے کہ کسی طرح پسیجے ہی نہیں۔ آخیر تک یہی کہتے رہے کہ وہ تو سننے والوں کیلئے پڑھے گئے تھے، پڑھنے والوں کے لئے نہیں لکھے گئے تھے۔ ہم نے بھی سوچا کہ جو مضامین آنکھوں والوں کے لئے نہ لکھے گئے ہوں ان کا شائع نہ کرنا ہی قرینِ مصلحت ہے۔ ع۔
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

مسٹر کرٹیلے جلدی شائع نہ ہوگی

ناظرینِ ساقی کو یہ خبر سُنکر کس قدر افسوس ہوگا کہ محبوب مصنف مرزا عظیم بیگ چغتائی کی صحت اسقدر گر گئی ہے کہ انہیں چلنے پھرنے بلکہ ہلنے جلنے کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ ایسی صورت میں "مسٹر کرٹیلے" کے آخری ابواب کی تکمیل ناممکن ہے۔ گزشتہ تین سال سے ان کی علالت کا سلسلہ جاری ہے مگر مرض نے اتنا غلبہ اُن پر اب تک نہیں پایا تھا۔ اس عرصے میں وہ اپنی صحت کی طرف سے غافل نہیں رہے مگر طبی مشوروں پر عمل بھی نہ کر سکے۔ ڈاکٹر کہتے تھے چپکے بیٹھے رہو اور دماغی کام بالکل نہ کرو۔ مگر چپکے بیٹھے رہنے اور کام نہ کرنے سے نہ تو اپنا پیٹ بھر سکتا ہے اور نہ بیوی بچوں کا۔ اور نہ ڈاکٹروں کی فیس، دواؤں اور انجکشنوں کیلئے کہیں سے روپیہ مل سکتا ہے۔ چنانچہ ۱۰۴ اور ۱۰۵ درجہ بخار کی حالت میں بھی انہیں بارہ بارہ اور چودہ چودہ گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحت بالکل غارت ہو گئی۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: "ڈاکٹر کہتا ہے کہ چھ مہینے کیلئے کسی سینی ٹوریم میں چلے جاؤ تو جان بچ سکتی ہے۔ چھ مہینے کی چھٹی تو مل سکتی ہے مگر صرف ایک مہینے کی تنخواہ کا میں مستحق ہوں۔ دن رات بس یہی پڑا سوچتا رہتا ہوں کہ کیا ہوگا؟ کیا ہوگا؟" میں نے جب یہ خط پڑھا تو دل کانپ گیا۔ کیسی بیکسی اور بیچارگی ہے۔ خدائے ذوالمنن نہ جانے ما امنا! واقعات کی ایک دلدل ہے جس میں ایک کمزور انسان پھنس گیا ہے جتنا ابھرنا چاہتا ہے اتنا ہی دھنس جاتا ہے۔ ہندوستان کا ایسا بیش بہا دماغ، ادبِ اردو کا اتنا مشہور انشا پرداز، زندگی اور موت کی اس خوفناک کشمکش میں! اگر خدا نخواستہ زندگی ہانپ کر پیچھے رہ گئی تو کیا ہوگا؟ اسکا تصور ہی بھیانک ہے۔ اور اس ٹریجڈی کا منتہا یہ ہے کہ چغتائی صاحب کیلئے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ وائے بر حالِ ما۔

دلی میں کاغذ کی قلت

کاغذ مہنگا تو ہو ہی گیا تھا لیکن یہ نئی بات دیکھی کہ جب افسانہ نمبر کیلئے کاغذ خریدنا چاہا تو بازار میں کاغذ ندارد۔ معلوم ہوا کہ کاغذی اسلئے کاغذ نہیں نکالتے کہ کہیں بھاؤ نہ گر جائے۔ بہزار وقت یہ کاغذ باہر سے منگایا گیا۔ جب ہم نے شکایت کی یہ کاغذ کچھ میلا ہے تو ل[illegible]

دربارِ اکبری کی ایک جھلک

مہاراجوں کے راجہ مہابلی اکبر بادشاہ آگرہ براج رہے ہیں۔ وہی آگرہ جواب اکبر آباد ہو چکا ہے اور اس کا قلعہ بن چکا ہے۔ بہارِ جانفزا کا آغاز ہے۔ ہولی بھی جس کے آنے پر بقول بابر سارا ہندوستان دیوانہ ہو جاتا ہے۔ قریب آ چکی ہے۔ سرسوں پھول رہی ہے۔ دشت و بیاباں سب زعفران زار بنے کھڑے ہیں۔ ہواؤں میں رنگ، دلوں میں اُمنگ، اور سروں میں ترنگ ہے۔ باغ در باغ گل و گلزار سب ہرے بھرے پھلوں سے لدّے ہیں۔ سارے شہر کی آئین بندی ہوئی ہوئی ہے۔ گلی گلی کوچہ کوچہ آراستہ ہے۔ ہندو مسلمان، مرد، عورت، بوڑھے بچے، لڑکے بالے، جسے دیکھئے اپنے اپنے مقدور بھر اچھے اچھے کپڑے پہنے ٹھٹ کے ٹھٹ بولتے اُن راستوں کی طرف چلے جا رہے ہیں جو قلعہ کو جاتے ہیں۔ یہ راستے، اِدھر کے مکانات، ان کی چھتیں تماشائیوں سے بھر گئی ہیں یا بھرتی اور پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ خود قلعہ کی عمارت سُہاگ کا سُرخ جوڑا پہنے کھڑی ہے۔ خندق سے لیکر بُرج و بارہ بلکہ دیوار و کنگرے تک ایک ایک چیز سجی اور اپنے زیور سے لدی ہے۔ راؤ، راجہ، مہاراجہ، امیر، وزیر، رؤسا، سفرا، سپہ سالارانِ نامدار و شاہزادگانِ کامگار کی سواریاں تورۂ اکبری کے مطابق قلعہ کو جا رہی ہیں۔ کوئی صاحبِ فیل و نشان ہے، کوئی صاحبِ طبل و علَم۔ کسی کے آگے آگے توغ ہے کسی کے توغ و تمن توغ ہے یا ماہی مراتب۔ کسی کے سامنے نقارہ و دمامہ بجتا جاتا ہے۔ کسی کے ساتھ نقارہ ہے مگر کیا مجال کہ چوب نقارہ کو چھو جائے۔ کسی کے سامنے نفیری بجتی جاتی ہے۔ اور کسی کے ساتھ صرف جھانج۔ کسی کے ساتھ یہ سب لوازمِ امارت ہیں اور گاجہ باجہ بھی ہر طرح کا بجتا آتا ہے۔ مگر خاص خاص جگہ پر پہونچا اور بند۔ سوار و پیادے، کوتل گھوڑے، اونٹ، ہاتھی باساز و یراق، ہودج و عماری سے سجے ہوئے ان جلوسوں کے ساتھ ہیں۔ لیکن کم و بیش اور علیٰ قدر مراتب۔ قلعہ معلیٰ تک عوام کی رسائی کہاں۔ وہ انہیں سواریوں اور جلوسوں کا تماشہ دیکھنے آئے ہیں۔ ایسی سواریاں وابستگانِ دولت کی ابھی بہت سی آئینگی اور قلعہ کو جائیں گی، اور اُمراء اپنے اپنے جلوس کو جلوخانہ میں چھوڑ کر خود تام جھام۔ ہاتھی یا گھوڑے پر تا بہ نقارخانہ سوار جائینگے۔ کسی کا خاصہ یعنی لوازمہ جلوخانہ میں بھی جگہ نہ پائیگا۔ قلعہ سے باہر ہی رہ جائیگا۔ کسی کو قلعہ کے دروازے یا اُس کے سامنے سے ہی پیادہ پا ہو جانا پڑیگا۔ یہ تماشے آپ یہاں ہونے دیجئے ہمیں جلدی ہے۔ قلعہ کے اندر پہونچنا چاہیئے۔ کہ وقت تنگ اور دربار کی ساعت قریب آ رہی ہے۔

اوہو ہو ہو، یہ کیا سماں ہے! یہ زمین ہے یا آسماں، یہ چھوٹے چھوٹے باغیچے ہیں یا خیابانِ رضواں۔ یہ محلات دیوان ہیں یا قصورِ رضواں۔ اس حوض کو تو دیکھئے، کوثر کا ہمسر ہے۔ یہ نہر اسی سے نکلتی ہے۔ پانی اس کا اسی لئے شہد و شیر کا ہم رنگ ہے۔ نہر کے کنارے کنارے دُور تک موٹے موٹے خوش رنگ نماروں پر روپہلی گھڑے سُنہری کٹوروں کی قطاریں لگے سُرخ سُرخ قند میں لپٹے رکھے ہیں۔ ہوں نہ ہوں اسی آبِ حیات سے بھرے ہیں۔ آگے چل کر یہ نہر دو نہروں میں پھٹ گئی ہے۔ ایک اندر اندر کہیں اور جا نکلی ہے۔ یہ شاخ آبشار بن کر گرتی ہے جس سے یہ مرمری نہر ملتی ہے اس کی تہ میں دیکھنا کیا خوب

لہریا بنا ہے پانی بھی اسی لئے بل کھاتا لہریا اور آب رواں بناتا ہوا بہتا ہے، نہر میں جا بجا فوارے لگے ہیں اور سب اُڑ رہے ہیں۔ کوئی چکر کھاتا ہے، کوئی چادر پھیلاتا ہے۔ کسی نے ساون بھادوں کا سماں باندھا ہے اور پھواریں پڑ رہی ہیں۔ کسی سے چشمہ اُبل رہا ہے۔ غرض جو فوارہ ہے عجائب ہے۔ اس حوض مثمن کو تو دیکھئے اس کی شان ہی نرالی ہے۔ گوشہ گوشہ پر گلدان رنگا رنگ پھولوں سے اور چنگیر تازہ تازہ میووں سے بھرے رکھے ہیں۔ حوض میں چھوٹا سا ہزارہ چل رہا ہے، اس کی پھواریں پھلوں اور پھولوں پر اوس بن کر گرتی اور ان کی تازگی کو طراوت و شادابی کا رنگ دے رہی ہیں۔ جا بجا چاندی کے کھم سنہرے بادلے سے سجے کھڑے ہیں۔ بلبل ہزار داستاں کے پنجرے لبتنی سے کسے زری گوٹے سے زربفت بنے پڑے لٹک رہے ہیں۔ غرض باغ نہیں فردوس بریں ہے۔ حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں۔ اس لئے تصور کے پر لگا کر اب دیوان خانہ پہونچتا ہوں۔

دیوان خانہ میں سر تا سر لاہور کی بادشاہی کارگاہ کا بنا ہوا ایک ریشمی قالین بچھا ہے جس میں بیل بوٹوں سے پورا باغ بنا ہے۔ کتنا خوش رنگ اور نظر فریب ہے۔ بخارائی و ایرانی قالین پا انداز میں پڑے ہیں، عام وخاص کے تمام در و دیوار گجراتی کمخواب، کاشانی مخمل، بنارسی زربفت، رومی بانات اور تاش تامی سے آراستہ ہیں۔ دروازوں پر کشمیری شالوں کے پردے محرابی صورت پر بندھے ہیں۔ کوئی زردوزی ہے، کوئی گوٹے ٹھپے دھنک بیک۔ قیطون، کلابتون، مقیش۔ بادلے سے لپا ہے اور بندھا ہوا ہے جگر جگر کر رہا ہے۔ ستونوں نے ولایتی جامہ وار اور مشجر کا جامہ پہنا ہے اور گل و گلدان لئے کھڑے ہیں۔ چھت میں جس کی لاجوردی زمین رنگ برنگ کے نقش و نگار سے خیالات دو چرخ بریں ہے سونے کا جڑاؤ ہزارہ بلوری جھاڑ لٹک رہا ہے۔ دروازوں میں محرابیاں ہیں۔ دیواروں پر شفق چادریں۔ کونوں میں چاندی سونے کے گنگا جمنی سرد چراغاں رکھے ہیں۔ فانوس، حباب، گلابیاں، لالہ، مردنگ کنول بھی جا بجا لگے ہیں مگر اس خوبی سے کہ جگہ خود ان کو مانگ رہی ہے۔ ایک چیز بھی جگہ سے ہٹ جائے تو حسن بدنمائی سے بدل جائے۔ دیوان خانہ کے آگے سقرلاط کا کہکشانی سائبان کھنچا ہے، اس سے آگے ایک اور اونچا شامیانہ ہے اور اس سے آگے اور اونچا۔ آخیر میں دَل بادل یا آسمانی شامیانہ ہے جس کی چھت آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ چوبیں ان کی سب سونے چاندی سے منڈھی، گلدستوں سے سجی ہیں۔ کس کس چیز کو دیکھئے، ایک سے ایک اچھی ہی ہے۔ سب سے زیادہ نادر اور تحفہ سنگ مرمر کا اورنگ یا تخت ہے جو خاص عام کے وسط میں رکھا ہے۔ چھت اس کی بنگلہ نما ہے۔ نازک نازک مرمری ستونوں کے اوپر کھڑی ہے اور جا بجا ستونوں سمیت جواہر زواہر سے جڑی ہے۔ اس کے اوپر سرخ مخمل و سقرلاط کا شامیانہ ہے مکلل بہ لآلی و جواہر جس کی سنجاف میں موتیوں کی جھالر لٹکتی ہے اور نظر کو خیرہ کرتی ہے۔ تخت کے اوپر مخملی مسند لگی ہے۔ حاشیہ اس کا کوئی چھ سات گرہ جواہرات اور کندن سے مرصع ہے۔ گاؤ تکیہ و پشتی کا کہنا کیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاند کے گرد گویا آسمان کے سارے تارے ٹانک دئے ہیں۔

ابھی ہمیں خاص و عام میں بہت کچھ دیکھنا تھا اور آرام گاہ خاص کے سامنے جا کر خاصہ و توشہ خانہ کی سیر کرنی تھی کہ

دفعتہً دیوان خانہ میں نسقچی، نقیب، یساول، چاؤش و چوبدار داخل ہوئے اور اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور درباری جن کے جلوسوں کو آتا ہوا ہم راستہ میں چھوڑ کر دیوان خانہ آ پہونچے تھے دیوان خانہ کی طرف آتے دکھائی دئے۔ یہ اب تک اپنے اپنے چوکی خانوں میں بیٹھے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ دربار کا وقت قریب آیا تو خاص و عام کا رُخ کیا۔ ہر ایک اپنی اپنی مقررہ جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ لو وہ کرنا کی آواز آئی۔ آ کر بیٹھنے والے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دم قدم کو دیکھا۔ نسقچی نے جس کو ذرا بھی خلافِ قاعدہ پایا چھڑیوں کے ٹہوکوں سے سیدھا کر دیا۔ کیا مجال کہ کوئی چوں بھی کر سکے۔ کچھ سمجھے یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اس لئے کہ بادشاہ آرام گاہِ خاص سے چل پڑے۔ وہ سنکھ بجا۔ مہابلی جہاں پناہ۔ بادشاہ سلامت! بادشاہ سواری خاصہ پر سوار ہو گئے۔ اب جب تک بادشاہ دیوان خانہ تک پہونچیں۔ یساولوں کی بن آئی ہے۔ جہاں کسی امیر سے آدابِ دربار کے خلاف کوئی ذراسی بھی حرکت ہوئی اسی کو اُنھوں نے آ دبوچا۔ پکڑا اور نکال دیا۔ لیجئے عُود و عنبر کی انگیٹھیاں بھی روشن ہو گئیں۔ سارا دیوان خانہ عطر و خوشبو سے مہک اُٹھا۔ وسطِ دیوان میں گلاب کا ہزارہ اُڑنے لگا۔ کتنا باریک ہزارہ ہے۔ بوُند تک دکھائی نہیں دیتی۔ اس کا خزانہ ہو نہ ہو اس طلائی کٹہرے میں ہے جس کو یہ گرجی عورت کا اسٹیچو بغل میں لئے کھڑا ہے۔ لو وہ شہنائی بجی۔ چاؤش پکارے "باادب باش۔ جہاں پناہ مہابلی بادشاہ سلامت"۔ جلوس آن پہونچا۔ اب کیا مجال کہ دیوان خانہ میں کوئی جنبش بھی کر سکے۔ پہلو کے دروازے سے ایک خواجہ سرا دیوان خانہ میں داخل ہوا۔ پھر چاؤش پکارے "باادب باش نگاہ بر قدم، جہاں پناہ، مہابلی بادشاہ سلامت"۔ سلامت کی آواز ختم نہیں ہوئی تھی کہ بادشاہ سلامت نے بادشاہزادوں کو ساتھ لئے، اس طرح کہ بادشاہ و بادشاہزادے کو خواجہ سرا گھیرے ہوتے ہیں جیسے چاند کو ہالہ، دیوان خانہ میں قدم رکھا، سر پر چنور ڈھل رہا ہے۔ مورچھل ہوتا چلا آتا ہے۔ تورہ خانہ کے خاصہ بردار پیچھے پیچھے ہیں۔ سارا دربار فرطِ تعظیم سے جُھک کر دُہرا ہو گیا، آداب بجا لایا۔ بادشاہزادے تخت کے قریب اپنی اپنی جگہ پر ٹھیرے۔ بادشاہ زینہ پر چڑھ کر تخت پر پہونچے۔ اور اللہ اکبر کہہ کر تخت کی مسند پر بیٹھ گئے کہ اکبر کا سلام اور انعامِ الٰہی کا شکریہ یہی اللہ اکبر ہے۔ یہ آواز سُنتے ہی سارے دربار نے جل جلالہٗ کہا اور سیدھے کھڑے ہو گئے۔ نقار خانہ میں نقارے پر چوٹ پڑی۔ دمامہ بولا جیسے کوئی بادل گرجا۔ شہنائی سے مبارک و سلامت کے بول نکلے۔ شادیانہ بجنے لگا اور آس پاس کے ایوانوں سے ساز و سرود کی جانواز آوازیں آنے لگی۔

مہابلی کا رنگ گندمی، قد میانہ۔ بدن دُہرا، سادہ لباس میں بھی نہایت جامہ زیب ہے۔ آج سالگرہ کا دن ہے بڑے گھیر کا گلابی جامہ زیبِ بر ہے۔ سر پر تاج ہے مگر نہ مُغلئی نہ ایرانی وضع کا بلکہ خود مہابلی کی ایجاد ہے۔ ہندوانی مکٹ سے ملتا جلتا ہے۔ سارا جواہرات سے مرصّع ہے موتی اور جواہرات کی لڑیاں اس میں لٹک رہی ہیں۔ جامہ پر قبہلتے نیمہ آستین ہے۔ اس کی آستینیں اور گھیر کوئی تین تین انگل طلائے دبدبی اور جواہرات سے لپی ہے۔ سنجاف پر موتی ٹکے ہیں۔ دامنوں کے کونوں اور شانوں کے شمسے جگر جگر کر رہے ہیں کہ پڑتی نگاہ

ان پر نہیں ٹھہرتی۔ کمر میں مرصّع کمر بند ہے اور اُس میں خنجر لگا ہے۔ داہنے ہاتھ میں ایک گلاب کا پھول ہے، بائیں میں ایک خوش غلاف شمشیر کو تھی قبضہ سب مغرق بہ جواہر۔ بندِ شمشیر میں ایک بڑا سا موتی اور دو لعل آبدار آویزاں ہیں، دونوں کلائیوں میں مرصّع پہنچی، بازوؤں پر ہیرے کے بازوبند بندھے ہیں اور گلے میں مرصّع ہار لٹک رہا ہے۔ کلغی و طرّہ پر اقبالِ اکبری کا اور طرّہ ہے، کسی آنکھ کو نگاہ اور نگاہ کو اس کی طرف دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔ تورخانہ کے جیسے خواص تخت کے پہلو میں دونوں طرف ہاتھوں میں اسلحہ خاصہ لئے ہے خود سر تا پا اُوپچی بنے کھڑے ہیں۔ بھُول کر بھی نظر ان پر جا پڑتی ہے تو زہرا آب ہونے لگتا ہے۔

جہاںپناہ بادشاہ تخت پر بیٹھے ہی تھے کہ تصدقِ فرقِ مبارک شروع ہوا۔ اکابرِ دولت اپنی اپنی باری سے آگے بڑھکر بادشاہ پر زر و جواہر نثار کرنے لگے۔ جو اس رتبہ کے نہیں وہ پیش گاہ بادشاہی میں صدقات فرقِ مبارک پیش کرتے ہیں۔ اور اُلٹے پاؤں چلکر اپنی جگہ پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔ لیجئے نذر شروع ہوئی، ولی عہد سلطنت کی نذر سب سے مقدم ہے۔ جواہرات و عجائبات کی کشتیاں آ رہی ہیں اور بادشاہ کے سامنے پیش ہو رہی ہیں۔ ہاتھی گھوڑے مرصّع و زربفت کے ساز و یراق سے سجے، زیوروں سے لدے دُلہن بنے جھم جھم کرتے پیش گاہِ عالی سے گذر رہے ہیں۔ جہاںپناہ بیٹے سے باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ نذر کی فہرست لاکھوں کی ہے۔ ولی عہد کو جو انعام ملے گا وہ کروڑوں سے کم نہ ہوگا۔

بادشاہزادوں کے بعد اُمرائے سلطنت علیٰ قدرِ مراتب اپنی اپنی نذریں پیش گاہِ بادشاہی میں پیش کریں گے اور شاہانہ انعام و اکرام اور اضافہ منصب و اکرام پائیں گے۔ آخر میں دربار جس ترتیب سے جما تھا اُس کے برعکس ترتیب سے برخاست ہوگا۔

یہاں تک دربار سالگرہ ہے کل سے جشنِ بے تکلف شروع ہوگا۔ دعوتیں، ضیافتیں ہونگی۔ ناچ رنگ کی محفلیں جمیں گی۔ اور نہ صرف اکبرآباد میں، بلکہ ساری مملکت میں آج دربار لگا ہوگا۔ کل سے جشن منے گا۔ خوشیاں ہوں گی۔ ہم اور ہمارا تصور آخر کہاں کہاں جائیں اور کیا کیا دیکھتے پھریں، اس لئے رُخصت۔

عبدالرحمٰن!

ہرودیاس:- سلومی کا حُسن بدی کا بے پناہ حسن تھا۔ اُس کا ناچ رقصِ گناہ تھا۔ اسکا جذبہ کوہِ آتش فشاں کی طرح تند اور اسکی محبت لاوے کی طرح جھُلس دینے والی تھی اُس کے سانس میں زہر تھا اور بوسہ میں موت۔ وہ یوحنان کے لبوں کو چومنا چاہتی تھی مگر یہ خدارسیدہ بزرگ اُسے اور اُس کی ماں کو کوستا تھا اور بُرا بھلا کہتا تھا۔ حاکم رُبع الطیفس کے حُکم سے سلومی ایک عظیم الشان دعوت میں ناچی اور انعام میں اُس نے یوحنان کا سر مانگا۔ اِس خُون آلود سر کو طشت میں سے اُٹھا کر سلومی نے اسکے لبوں کو دیوانہ وار چُوما اور گناہ خُون اور موت کی اس رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانی کو پڑھیے جو فرانس کے مشہور ادیب گستیو فلابیر کی حُسن کارانہ تحریر کا ایک انمول رتن ہے۔ جسکا ترجمہ مولانا عنایت اللہ دہلوی نے کیا ہے۔ قیمت صرف بارہ آنے (۱۲/) علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ:- ساقی بکڈپو۔ دہلی!

ایک پرانا زمانہ

اور

ٹوٹے کنویں کی سیر

اب سے کئی جگ پہلے اسی بھارت ورش بلکہ اسی دلّی میں ہندو مسلمان نہایت پیار و اخلاص سے رہا کرتے تھے۔
گو مسلمانوں کی حکومت گئے ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔ مگر ایک ہوا میں سانس لینے والے۔ ایک اَن جل سے
زندگی بسر کرنے والوں میں بھائی بھائیوں کی طرح سے میل جول تھا۔ شادی، بیاہ۔ موت، زندگی غرض دنیا کے ہر کام
میں وہ ایک دوسرے کے شریک تھے۔ بلکہ ہاٹ بازار۔ رستہ۔ گلی میں جب کوئی ہم محلہ یا پاس پڑوسی ایک دوسرے
سے مل جاتا تو صاحب سلامت کے بعد وہیں کھڑے کھڑے کئی منٹ تک ایک دوسرے کی خیر صلاّ اور خانگی معاملات
پوچھتے پوچھتے ہونٹ خشک ہو ہو جاتے تھے۔ مثلاً تمہارے گھر میں خیریت تو ہے؟ بال بچے اچھے ہیں؟ گذارے کی
کیا شکل ہے؟ اگر خدا نخواستہ کسی کے ہاں دکھ بیماری ہو جاتی تو یہ میرا چشم دید واقعہ ہے بغیر کسی مزدوری یا
صلے کے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے۔ اپنی اپنی معلومات سے فائدہ پہونچاتے اور آڑے نقطے وقت میں تو عورت
مرد۔ بوڑھے نوجوان سب کے سب سگے بھائی بہنوں کی طرح ایک دوسرے پر ہاتھوں چھاؤں کرنے لگتے۔ چھوٹے
کی چھٹائی، اور بڑوں کی بڑائی کا اس زمانے میں خاص امتیاز تھا۔ آپس میں حصّہ بخرا۔ لین دین۔ بنج بیپار۔ اس
عام محبت اور بے فکری کے ساتھ ہوتا کہ اُس وقت میں اور آج کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

بلا مبالغہ ایک روپیہ کے ۳۰ سیر گیہوں، من بھر کے چنے۔ خالص بالکل خالص ڈھائی تین سیر کا گھی، جواب
قیامت تک نہیں مل سکتا، کھلے بندوں پڑا بکتا تھا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ ایک روپے کا آٹا دو میاں بیوی ایک مہینے تک
خوب للّے تلّے سے کھا کر بھی تمام نہیں کر سکتے تھے۔ دودھ۔ دہی۔ مکھن ایسا نردیا اور خالص کہ جنہوں نے کھایا ہے بس
وہی خوب جانتے ہیں۔ تیل، لکڑی، ڈنگری، افراط کے ساتھ ملتے تھے۔ ساگ پات اور ترکاری تو کوڑیوں کے مول
بکتی تھی۔ جس کا جی چاہے الغاروں لیلے، کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا۔ غریب غربا نہیں، امیر لوگ کھاتے پیتے آدمی
ایک پیسے میں چار سودے لینے کے عادی تھے۔ اس پر بھی ملک میں کسی قسم کی بے چینی، پریشانی یا عام گھبراہٹ
کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ جیسے دیکھو ہندو مسلمان، عیسائی، یہودی، پارسی، سکھ، اس سرے سے
اُس سرے تک ہنسی خوشی اور آمی جمی سے زندگی بسر کرتے تھے۔

دلّی! ہائے وہ پچاس برس پہلے کی دلّی بس کیا کہوں؟ شہر کیا تھا ایک گلزار تھا گلزار۔ فتح پوری سے لیکر
چاندنی چوک گھنٹہ گھر، فوّارہ اور پھر خونی دروازے سے ادھر لال قلعہ تک شام کے وقت اگر تھالی پھینکو تو سروں

ہی سروں پر چلی جائے۔ دوسری طرف نیا بانس۔ لال کنواں۔ حوض قاضی اور پھر چاوڑی بازار سے جامع مسجد تک ایک عام تفریح گاہ تھی کہ شہر کے امیر و غریب روزانہ بنے سنورے۔ کچھ پیدل کچھ اپنی اپنی سواریوں میں گُل گشت کرتے نظر آتے تھے۔ تیس ہزاری کی طرف ٹھیک دوپہر کو جہاں اب لارڈ ڈفرن کا پُل ہے بلکہ اس سے ذرا آگے جہاں نہر سعادت خاں لہریں لیتی تھی گرمی کے موسم میں یہ غریبوں کے لئے ایک جنت کا ٹکڑا تھا جس کے دونوں کناروں پر صدہا سایہ دار درختوں کا جُھرمٹ تھا۔ شوقین تیراک پُل پر سے کُودتے تھے۔ قسم قسم کی تیرایاں دکھاتے تھے۔ شنیخو والے۔ نہروں والے، اور خُدا جانے کون کون والوں میں مقابلہ ہوتا تھا اور خلقِ خدا، سب سے زیادہ کارخانہ دار لوگ بہرہ اندوز ہوتے تھے۔

دوطرفہ سودا سُلف بیچنے والوں کے خوانچے۔ پھول والوں کے سبدِ گُل۔ لال لُنگیاں باندھے سقّوں کے کٹوروں کی جھنکار ہر آیند و روند کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ جا بجا مسلمانوں اور ہندوؤں کی سبیلیں، پیاؤ جن سے عام مخلوق سیراب ہوتی اور کوئی کسی سے دوسراہٹ کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔

جیسا کہ پہلے کہہ چُکا ہوں، چاوڑی بازار تو ہر شام کو بیچ میچ کا شاہی بازار بن جاتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اُس مُغلیہ بازار میں خرید و فروخت کرنے والے سب کے سب فرقہ اناث سے تھے اور یہاں سب مرد۔ شوقین جیوڑے اکثر وجیہہ و شریف، کچھ اہلِ حرفہ بقدرِ مقدرت اچھے اچھے لباس پہنے بنے سنورے نکلا کرتے تھے۔ کوئی بادپا پر سوار ہے۔ کوئی فٹن خود ہانک رہا ہے۔ عطروں میں بسے پھولوں کے آڑے کنٹھے پہنے اِدھر اُدھر گذر جاتے تھے۔ کہیں نفیری بج رہی ہے۔ کہیں خوش گُلو باجے پر گا رہے ہیں، کہیں چوک میں حُقّے والے ساقی۔ حُقّے لئے کھڑے ہیں۔ غریب غُربا چلتے چلتے ٹھہر جاتے، دو کش لگاتے اور پیسہ دو پیسہ ہاتھ پر دھر یہ جا وہ جا۔ مگر آج وہی دلّی ہے، وہی شہر۔ مگر وہ حالت نہیں۔ نکبت ادبار اور عام افلاس نے خلقِ خُدا کی صورتیں تک بگاڑ دی ہیں۔ نہ تن پر کپڑا نہ پیٹ کو ٹکڑا۔ نوجوانوں کی لال سی جانیں خودکشی کی نذر ہوتی ہیں۔ روزگار نایاب۔ علم و ہنر گو پہلے سے چہار چند ہے اس پر بھی فراغت اور اطمینانِ قلب نایاب۔ حالانکہ مُلک میں ذرائع آمدنی پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ زراعت اور غلّہ کی پیداوار دُگنی چوگنی ہو گئی ہے۔ خام چیزوں کی مانگ بہت زیادہ۔ آبپاشی کی کثرت۔ لیکن اس پر بھی جہاں دیکھو خاک اُڑ رہی ہو اور بیٹھے نانِ شبینہ کو محتاج۔

اسی زمانے میں ٹُوٹے کُنویں کی سیر

اب میں پچاس برس پہلے کی ایک رنگیلی صحبت کا ذکر کرتا ہوں۔ جس سے صاف معلوم ہو جائیگا وہ کیسا امن چین اور بےفکری کا زمانہ تھا۔ آہ یادش بخیر وہ برسات کا موسم۔ ساون بھادوں کی گھٹائیں دن رات جھوم جھوم کر برستی تھیں۔ کبھی ابرِ محیطِ آسمان رہتا۔ کبھی رنگا رنگ ایلے گیلے پھرنے لگتے۔ کئی کئی شوخ و شنگ ہمجولی مختلف رنگ کے لباس پہنے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے محوِ گلگشت ہیں۔

شُدہ شُدہ کبھی پھر یکایک ایسی اندھیری چھا جاتی کہ بلا مُبالغہ دن پر اچھی خاصی رات کا دھوکا ہو ہو جاتا۔ غرض اسی تاریکی میں پھر جو بجلی چمکتی تو سفید بُراق بگلوں کی لمبی قطار آسمان پر ایسی بھلی معلوم ہوتی تھی جیسے گوری کی آنکھوں میں کاجل۔

بس اسی عالم میں اکثر شوقین جیوڑے سیلانی پنچھی گویا اس شعر کا اعادہ کرتے گھروں سے نکل پڑتے ؎

کبھی ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں برسے ؛ ایسا برسے مرے اللہ کہ چھاجوں برسے

ابھی برسا ابھی پھر کُھل گیا۔ ابھی پھر دُھواں دھار برسنے لگا۔ وہ بجلی کا رہ رہ کر کوندنا۔ وہ بادل کی گرج اور گرج کے ساتھ ہی بار بار وہ موروں کا جھنکارنا، کوئل کی کُوک، پپیہے کی الاپ، ان چیزوں کو کچھ انہیں دلوں سے پُوچھیئے جو قدرت کے کرشموں کے والہ وشیدا ہیں۔ یا ازلی لُٹے ہوئے لوگ۔

الغرض اب سے پچاس برس پہلے بالکل ایسا ہی اک فرحت افزا دن تھا جبکہ برسات کی ٹھنڈی ہوا نے ع سرود بستاں یاد دہانیدن۔ کے موافق چند حسین حسین صورتوں کو لال سبز پڑیوں پر ساون کا جھولا جھولنے اور ملار گانے کے لئے دریائے جمنا کے کنارے ٹوٹے کنوئیں تک کھینچ لائی تھیں جسکو آج تک دلی والے کھمبو دروازہ یا نگاہِ موت کے نام سے پُکارتے ہیں۔

یہ پارٹی کی پارٹی عورتیں اور مرد شکرم گاڑیوں میں لدے پھندے آموں کے ٹوکرے۔ جامنوں کے چھبیے، فرش فروش اور سامانِ خورد و نوش لئے لبِ سڑک آ اُترے۔ گاڑیوں کو تو وہیں چھوڑا، پھر سب کے سب ہنستے کھیلتے پاس ہی ایک آم کے تختہ میں آ براجے۔ یہاں آتے ہی دم کے دم میں ڈیرے ڈنڈے ڈالدیئے، فرش بچھ گئے کڑاہیاں چڑھ گئیں۔ آم اور جامنوں کے ڈھیر لگا دئے۔ اوّل اوّل دسترخوان بچھے۔ سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر سب نے ہاتھ مُنہ دھو، پانوں کی گلوریاں رچا۔ ایک ایک جوڑی باری باری سے جھولنے لگی۔ اُس وقت ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی۔ جو یکایک سامنے سے ایک حسین ترین جوان ملاگیری رنگ کا نیچا کُرتہ پہنے، شہزادوں کی سی اُونچی سلمہ کی سر پر، دلّی کی سپاٹ سلیم شاہی پاؤں میں، جوانی کے نشے میں جھومتا جھامتا ادھر ہی آتا دکھائی دیا۔ بس اسے دیکھنا تھا کہ وہ سب کی سب حسین صورتیں مارے خوشی کے پھول کی طرح کھل گئیں بلکہ کھلکھلاتی ہنستی دوڑتی ہوئی اُس کے خیر مقدم کو گئیں۔ وہ آئے وہ آئے صا العالم، بس ہماری سیر پوری سُہاگن ہوگئی۔ یہ لفظ گویا ہر اک کے ترجمانِ دل تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ حسین جوان بھی خوش خوش وہیں آ بیٹھا۔ پہلے تو اپنے میزبانوں کی خاطر سے کچھ مُنہ جُھٹلا، اور پھر باری باری سے ہر ایک کے ساتھ جھولا جھولنے لگا۔ چنانچہ اسی طرح باری باری سے ہر جوڑی پاؤں جوڑکر جھولتی اور باقی سب کے سب کھڑے ہو کر جھونٹے دیتے تھے اور زبان سے کہتے جاتے "آتے بدروا کارے کارے"! بیشک ان میں سے کئی خوش گلو تھے۔ اُنھوں نے اس ملار کو اس خوبی سے گایا کہ ایک سماں بندھ گیا۔ طرّہ یہ کہ اس پر ہر اچھی صورت نے ادا کاریاں بھی کیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ جب اُس جوانِ رعنا کی باری آئی تو وہ ظالم کچھ اس بلا کا خوش گلو تھا کہ اُسنے اِن بولوں کو

"آتے بدروا کارے کارے۔ کارے کارے۔ آئے بدروا کارے" بغیر کسی ادا کاری کے کچھ اس طرح گایا کہ سب پر اک عالمِ وجد طاری ہوگیا۔ بلکہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ گانا بھی ایک سحر ہے، جادو ہے، واقعی نعمت ہے خاص، جس کو وہ خالق عطا کرے ؎

آغا شاعر قزلباش

گنگا کا کنارا

آنکھوں کو میسّر ہے یہ دلچسپ نظارہ ۔۔۔ تابندہ یہ ذرات یہ گنگا کا کنارا
اس طرح سو دریا میں ہے موجوں کو تلاطم ۔۔۔ جیسے کوئی کرتا ہوا شائے پہ اشارا
یہ بھیگے ہوئے گیسوئے شب تا بہ کمر آہ ۔۔۔ ہر قطرۂ آبی ہے غرض چرخ کا تارا
گرمی کی ہواؤں کا شب اندازِ ترنم ۔۔۔ جیسے کہ کہیں دُور یہ بجتا ہو چکارا
مصروف ہے اشنان میں اک حُسن سراپا ۔۔۔ فردوس تماشا ہے یہ گنگا کا کنارا
یہ جسمِ حسیں چاند سے تابندہ ہے زائد ۔۔۔ اور چاند کو عالم نہیں ہوتا یہ گوارا
وہ ابر کے پردے میں چُھپا شرم کے مارے ۔۔۔ کیا مُنہ کو دکھائے وہ بھلا شرم کا مارا
اشنان سے فارغ ہوئی وہ حُسنِ مجسم ۔۔۔ دیکھا تو کنارے پہ ہے اک درد کا مارا
آنکھوں میں بھرے اشک ہیں چہرے پہ اُداسی ۔۔۔ چلتا ہے وہ ہر گام پہ لے لے کے سہارا
پہچان گئی دیکھ کے وہ مردِ حزیں کو ۔۔۔ کہنے لگی یہ ہوگیا کیا حال تمہارا
اک درد اُٹھا قلب میں آنسو نکل آئے ۔۔۔ اب چیخ کے رونے ہی لگا درد کا مارا
کہنے لگا ایجان تمنائے دل وجاں ۔۔۔ وہ کیا کرے جسکو کہ نہ ہو تیرا نظارہ
تب حُسن یہ بولا ترے جذبے کے تصدق ۔۔۔ اے کاش کہ ہو جائے تجھے ضبط کا یارا
فانی ہے مرا حُسن مرا روپ ہے فانی ۔۔۔ فانی مرا پیکر ہے یہ فانی ہے نظارا
جس نے مجھے پیدا کیا وہ خالقِ عالم ۔۔۔ تو اُسکو ذرا دیکھ کہ کس درجہ ہے پیارا
تُو دیکھ ذرا جلوۂ لیلائے حقیقی

خزانچی کی بیٹی

خزانچی کی بیٹی کے دلچسپ انتقام کی داستان بغداد سے عراقِ عجم تک مشہور ہے۔ اسکو خود موصل کے بادشاہ نے اپنی زبان سے بیان کیا کہ جب میں شاہزادہ تھا اور میری عمر بیس سال کے قریب پہونچی تو میرے باپ نے چاہا کہ میری شادی کردیں۔ انکے اشارے سے میری والدہ نے محل میں ان لڑکیوں کو بلایا جن کے باپوں کی طرف سے پیغامات آئے تھے۔ پھر مجھے طلب فرمایا کہ دیکھکر ان میں سے اپنے لئے منتخب کرلوں۔ ایک سے ایک بڑھکر حسین تھی مگر کوئی بھی میرے دل کو نہیں کھینچ سکی۔

میرے باپ کو سخت تعجب ہوا۔ مگر وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئے کہ اس میں تقدیر کا کوئی بھید ہے۔ اُنھوں نے میرے دل میں بغداد دیکھنے کا بہت شوق پایا اِس لئے اجازت دیدی اور سفر کا ساز و سامان درست کرکے ایک محافظ دستہ بھی ساتھ کردیا تاکہ میں جسوقت بغداد میں پہونچوں تو معلوم ہوجائے کہ موصل کا ولی عہد آیا ہے۔

راستہ میں ایک مقام پر لٹیرے بدوؤں کی جماعت ہمارے اوپر آپڑی۔ ہرچند کہ ہم نے بہادری سے مقابلہ کیا مگر وہ غالب آگئے اور انھوں نے ایک ایک کو قتل کرڈالا صرف میں باقی رہ گیا۔ جب میری طرف بڑھے تو میں نے ڈانٹ کر کہا کہ میں موصل کا ولی عہد ہوں کیا تم بادشاہوں کے اوپر بھی ہاتھ اُٹھانے کی جرآت کرنے لگے۔ اُن کے سردار نے ہنسکر کہا کہ تم سے بہتر شکار ہمکو دوسرا کہاں ملے گا۔ تمہارے باپ نے ہمارے بہت سے آدمی مارے ہیں اُن کا بدلہ ہم تم سے لیں گے۔ اُنھوں نے مجھکو پکڑلیا اور اپنے ساتھ اس جگہ لائے جہاں اُن کے ڈیرے تھے۔ مجھکو ایک درخت سے باندھدیا اور خود کھانے پینے میں مشغول ہوگئے۔

میں اپنی اِس مصیبت پر آسمان کی طرف مُنہ اُٹھاکر روتا تھا۔ خدا کی شان کہ وہ جوں ہی فارغ ہوتے اُن کے جاسوس نے آکر اطلاع دی کہ تاجروں کا ایک قافلہ فلاں راستہ سے گزرنے والا ہے۔ سب کے سب اُسی وقت مسلح ہوکر روانہ ہوگئے۔ اتفاق سے ایک بُوڑھی عورت اس درخت کی طرف آئی جس سے میں بندھا ہوا تھا۔ وہ میری حالت دیکھنے لگی پھر بولی کہ کیا تیری ماں زندہ ہے؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ اُسکو میری جوانی پر ترس آگیا۔ رسّیاں کاٹ دیں اور ایک سمت اشارہ کیا کہ بھاگ جا۔

میں دن بھر اور رات بھر برابر چلتا رہا۔ جب اُجالا ہوا تو دیکھا کہ کچھ لوگ گدھوں پر سامان لادے لئے جارہے ہیں۔ میں بڑھا کر اُس نے پوچھا کہ بغداد کا راستہ کدھر ہے۔ بولے کہ ہم وہیں چل رہے ہیں تم ساتھ ہوجاؤ۔ اُنہوں نے جب سنا میں لٹا ہوا پردیسی ہوں تو بہت مہربان ہوگئے۔ تیسرے دن ہم بغداد میں داخل ہوئے۔

وہاں نہ میں کسی کو جانتا تھا نہ کوئی مجھے۔ ناچار ایک مسجد میں چلا گیا۔ دوسرے دن جب بھوک نے ستایا تو روزی کی تلاش میں نکلا۔ ایک جگہ ایک حویلی دیکھی جس میں سے غربا روٹیاں لے کر نکل رہے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ خزانچی کا مکان ہے جس کے یہاں ہر جمعرات کو غریبوں کو کھانا کھلایا اور تقسیم کیا جاتا ہے۔ میں اندر چلا گیا۔ ایک حبشی غلام نے کھانا سامنے لاکر رکھا۔ ابھی فارغ نہیں ہوا تھا کہ زنانخانے کے پردے سے ایک نوجوان لڑکی نے سر نکالکر غلام کو

بلایا اور کچھ کہا۔ میں نے ایسی حسین شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُس کی صورت میری آنکھوں سے دل تک اُتر گئی۔ اور محبت کا شعلہ ایسا بھڑکا کہ دماغ تک پہونچگیا۔ قریب تھا کہ میں دیوانہ ہوجاؤں۔ کھانے کے بہانے سے دیر تک بیٹھا رہا۔ خادم سیدھا تھا۔ اُس سے پوچھا کہ یہ کون تھی جس نے تم کو بلایا تھا۔ بولا کہ ہمارے آقا کی بیٹی زمرد خاتون جو کہہ رہی تھیں کہ اگر کھانا کم ہو تو اندر سے اور منگا لو۔

اب میں وہاں سے اُٹھا اور ایک طرف کو حیران و سرگرداں چل نکلا۔ آج تک میں نہیں جانتا تھا کہ محبت کیا بلا ہے۔ مگر اس غربت میں یہ مصیبت بھی سر پر پڑگئی۔ دل کو کسی طرح قرار ہی نہیں آتا تھا۔ چلتے چلتے شہر سے باہر نکل گیا اور ایک قبرستان میں پہونچا۔ شام ہوگئی تھی جاتا تو کہاں جاتا۔ تکیہ ہی میں ایک دیوار کے قریب بیٹھکر اپنی حالت پر رونے لگا۔ جب اندھیرا ہوگیا تو کچھ آہٹ سنائی دی اور دیکھا کہ دفعتہً چار آدمی میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ پوچھنے لگے کہ تم کون ہو؟ میں نے کہا آفت کا مارا پردیسی۔ وہ غور سے دیکھتے رہے پھر بولے کہ ہمارے ساتھ چلو۔ مجبوراً اُنکے ساتھ ہولیا۔ تھوڑی دور چلکر وہ ایک تہ خانے میں اُترے۔ کھانا لائے خود بھی کھایا اور مجھکو بھی کھلایا۔ اُن کی باتوں سے معلوم ہوا کہ پیشہ ور چور ہیں کیونکہ وہ آپس میں ایک بڑی چوری کا ذکر کر رہے تھے۔ جو اُنھوں نے حال ہی میں کی تھی۔ مجھکو جوان اور پردیسی پاکر اپنے ساتھ شریک کرنا چاہا۔ کہنے لگے کہ ابھی ہم ایک مہم پر روانہ ہونے والے ہیں تم کو چلنا ہوگا۔ میں نے دل میں کہا کہ اب یہ تیسری اُفتاد مجھ پر پڑی جس کا خدا ہی جانے کیا انجام ہو۔ ڈرتا تھا کہ اگر انکار کروں تو مار ڈالیں گے۔ بیٹھا دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ ناگاہ باہر سے شور سنائی دیا جس کے ساتھ ہی بہت سے سپاہی اندر آگئے اور ہم سب کو گرفتار کرکے شہر میں لائے۔ رات بھر بند رکھا۔ صبح کو کوتوال کے سامنے پیش کیا۔

چور جانے پہچانے ہوئے تھے اُنکو اپنے جرم کا اقرار کرنا پڑا۔ میں نے کہا کہ میں ایک پردیسی آدمی ہوں گرفتاری سے صرف گھڑی بھر پہلے ان لوگوں نے قبرستان سے اپنے ساتھ پکڑ لیا تھا۔ چوروں نے بھی اس کی تصدیق کی اس وجہ سے کوتوال نے مجھے چھوڑ دیا۔ مگر اپنے پاس رکھ لیا۔ معلوم نہیں کہ اس کی غرض کیا تھی۔ چند روز کے بعد وہ بہت مہربان نظر آنے لگا۔ میں نے اپنی شاہزادگی کا ذکر تو اس سے نہیں کیا لیکن خزانچی کے گھر جو واقعہ پیش آیا تھا بیان کردیا۔ اس اُمید پر کہ شاید کوئی صورت وہ نکال سکے۔ پہلے وہ خاموش رہا پھر بولا کہ مشکل یہ ہے کہ میرے اور خزانچی کے درمیان پُرانی عداوت چلی آتی ہے وہ میری بات کیوں ماننے لگا مگر تاہم تم صبر کرو میں کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکالونگا۔

چند روز کے بعد اُس نے تنہائی میں مجھے بلایا اور کہا کہ میں نے ایک اچھی تدبیر سوچ لی ہے۔ مگر تم اپنے آپ کو بصرہ کے قاضی کا بیٹا بتانا۔ پھر مجھے اچھے کپڑے پہنا کر ایک حجرہ میں بٹھا دیا اور اپنے خاص ملازم کو خزانچی کے پاس بھیجا کہ ایک ضروری معاملہ میں گفتگو کرنی ہے اگر قدم رنجہ فرمائیں تو عنایت ہوگی۔ خزانچی اس سے خوف زدہ تھا۔ فوراً آیا۔ کوتوال نے نہایت اعزاز کے ساتھ اسکو مسند پر بٹھایا اور کہنے لگا کہ میرے اور آپ کے درمیان رنجش ہے۔ جس سے میں نادم ہوں۔ عرصے سے میری خواہش ہے کہ آپس میں صفائی ہوجائے۔ اب خدا نے اس کے لئے ایک اچھی صورت نکالدی ہے۔ اسلئے میں نے آپکو تکلیف دی۔ وہ یہ ہے کہ بصرہ کا قاضی میرا ماموں ہے اُسکا بیٹا آپکی لڑکی کی خوبیوں کو

سُن کر میرے پاس آگیا ہے اور میرے ذریعہ سے نکاح کا پیغام دینا چاہتا ہے۔ اگر یہ رشتہ ہو جائے تو ہم آپ ایک ہو جائیں گے۔ لڑکا حُسن و جمال میں یکتا اور علم و ادب میں فائق ہے۔ یہ کہہ کر مجھے بلایا۔ خزانچی نے دیکھا۔ گفتگو کی اور بہت پسند کیا۔ گھر جاکر منظوری کا پیغام بھیجدیا اور دن مقرر کر دیا۔ تاریخ پر کوتوال نے لوگوں کو جمع کرکے شادی کی محفل آراستہ کی۔ اور نکاح ہو گیا۔ خزانچی مجھکو اپنے گھر لایا۔ وہاں عورتیں جمع تھیں۔ گا رہی تھیں۔ سب نے مجھکو دیکھا اور تعریف کرتے ہوئے مبارکباد دی۔ زُمرد میری صورت، بات چیت خاصکر محبت کو دیکھکر بیحد خوش ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو جب اُٹھکر ہم مُنہ دھو رہے تھے کوتوال کا آدمی میرے وہ میلے کپڑے لئے ہوئے آیا جو اس وقت میرے جسم پر تھے جب میں گرفتار ہوا تھا۔ اور کہا کہ یہ اپنے کپڑے لو اور کوتوال صاحب کے کپڑے جو تم نے پہن رکھے ہیں واپس کرو۔ یہ سُنکر گھر کے لوگ گھبرائے۔ میں بھی حیران ہوا اور زُمرد مبہوت ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ اب میں نے ساری داستان سچی سچی کہہ سُنائی۔ زُمرد کو میری باتوں پر یقین آگیا، وہ خوش ہو گئی۔ نیا لباس منگاکر مجھے دیا اور کوتوال کے کپڑے واپس کر دئے۔ پھر بولی کہ کوتوال نے ہمارے گھر بھر کو ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے میں اس سے بدلہ لونگی اور انہیں سکوں میں اسکا قرض ادا کرونگی جن سکوں میں اس نے دیا ہے۔

میں نے کہا کہ اُس نے دھوکا دینے کے لئے مجھے قاضی زادہ بتایا مگر حقیقت میں میں شاہزادہ ہوں لہذا اسکی شرارت سے نقصان کیا پہونچا۔ جس کا بدلہ لینا ضروری ہو۔ مگر عورت جب انتقام پر اُتر آئے تو دُنیا کی کوئی طاقت اُس کو روک نہیں سکتی۔ بولی کہ تمہاری شہزادگی کا معاملہ نہیں ہے تم اگر شہزادے نہ بھی ہوتے تو میرے لئے تمہاری محبت کافی تھی۔ مگر اُس نے دوست بنکر دشمنی کی ہے اس لئے بدلہ لینا لازم ہے۔ تم اجازت دیدو۔ میں نے کہا کہ اگر تمہاری رائے یہی ہے تو بہتر ہے۔

اُس نے سادہ لباس پہنا، اُوپر سے ایک معمولی چادر لپیٹ لی اور اکیلی کوتوالی پہونچی۔ وہاں ایک طرف الگ کھڑی ہو گئی۔ کوتوال نے آدمی بھیجکر دریافت کیا کہ کس لئے آئی ہے۔ جواب دیا کہ ایک نہایت اہم ضرورت سے، جسکو تنہائی میں کوتوال صاحب سے عرض کرونگی۔ اُس نے ایک حجرہ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود وہاں گیا۔ زُمرد نے اُس کے سامنے اپنے چہرے کو کھولدیا اور کہا دیکھئے کیا میں اندھی ہوں؟ کیا میرا چہرہ کالا ہے؟ کوتوال دیکھکر مدہوش ہو گیا، کہنے لگا نہیں نہیں، یہ آنکھیں حور کی ہیں، یہ چہرہ پری کا ہے جوان آنکھوں کو اندھا اور اس چہرے کو کالا بتائے وہ خود اندھا ہے، مگر اس سے مطلب!!

بولی کہ میں آپ سے باتیں کر رہی ہوں اور آپکی باتیں سُن بھی رہی ہوں کیا گونگی ہوں کیا بہری ہوں؟ بولا کہ ہرگز نہیں جو ایسا کہتا ہے اُسپر خدا کی لعنت۔ مگر مدعا تو کہو۔

اب اُس نے چادر اُتار دی اور حجرہ میں خرامِ ناز سے چلنا شروع کیا اور کہا کیا میں لنگڑی ہوں کیا میرے پاؤں مفلوج ہیں؟ بولا کہ خدا کی قسم ایسی خوشنما رفتار اور ایسے خوبصورت پاؤں آج تک میں نے نہیں دیکھے کس کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں جو تم کو لنگڑی کہتا ہے۔ مگر غرض تو بتاؤ یا محض ستانے کے لئے آئی ہو۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی اور بولی

کہ کیا میں کبڑی ہوں۔ پھر بال کھولدتے اور کہا کہ کیا میں گنجی ہوں؟ بولا کہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو تمہارا قد سرو ہے اور تمہاری زلفیں سنبل۔ مگر مقصد تو بیان کرو یا مار ڈالنا ہی منظور ہے۔

اُس نے کُرتہ کی آستینیں چڑھالیں اور دونوں کلائیاں اُس کے سامنے کرکے بولی کہ جناب کیا میں لولی ہوں کیا میں ٹُنجی ہوں؟ بولا کہ کون مردود ہے جو ایسا کہتا ہے یہ کلائیاں بلور اور یہ حنائی ہاتھ چنار کے پنجوں سے بڑھکر ہیں۔ مگر کچھ کہو بھی تو۔ میں تو دیوانہ ہوا جاتا ہوں۔

اب وہ چادر اوڑھکر بیٹھ گئی اور غمگین آواز میں کہنے لگی کہ جناب میں ایک رنگریز کی بیٹی ہوں جسکے دل میں نہیں معلوم کیا سمائی ہے کہ وہ اپنے گھر سے مجھکو نکالنا نہیں چاہتا۔ جہاں جہاں سے شادی کے پیغام آئے کسی سے کہدیا کہ میری بیٹی گونگی اور بہری ہے۔ کسی کو جواب دیا کہ لولی اور لنگڑی ہے۔ کسی کو یہ کہکر ٹالدیا کہ اندھی ہے اور اپاہج۔ یہاں تک کہ اب پیغام آنے بھی بند ہوگئے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میں بھی دوسری عورتوں کی طرح سینے میں دل رکھتی ہوں۔ کب تک یہ ظلم و ستم سہتی اور اس کے گھر میں پڑی سڑتی رہوں۔ کوتوال نے پوچھا کہ آخر کوئی وجہ بھی ہے؟ بولی کہ وجہ تو اسی سے پوچھنی چاہیئے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اُس نے تو اس قدر سختی کی ہو کہ نہ مجھے کہیں نکلنے دیتا ہو نہ کسی عورت کو گھر میں آنے دیتا ہے۔ بڑی تدبیروں سے آج گھڑی بھر کیلئے نکلکر آپ کے یہاں آسکی ہوں۔ آپ حاکم ہیں اور اللہ نے آپکو غریبوں اور بیکسوں کا فریادرس بنایا ہو میری مدد کیجئے۔ ورنہ گھٹ گھٹ کر مرجاؤنگی۔ یہ کہتے ہوئے رونے لگی۔

کوتوال نے کہا کہ میں پوری مدد کرونگا اور خدا نے چاہا تو بہت جلد اس مصیبت سے رہائی دلاؤنگا۔ یہ سُنکر وہ شکریہ ادا کرتی ہوئی اُٹھی۔ کوتوال نے گردن جُھکا کر کہا کہ محترمہ اگر میں اپنا پیغام آپکے لئے بھیجوں تو ناپسند تو نہ کروگی؟ بولی۔ جناب اس سے بڑھکر کونسی عزت مجھکو حاصل ہوسکتی ہے۔ بولا بس بس پھر اطمینان رکھیئے سب کچھ ہوجائیگا۔ پتہ کیا ہے؟ بولی۔ پل کے متصل۔ لال دریہ۔ عبدل رنگریز کا مکان جس کے آگے کھجور کا درخت ہو۔ کوتوال نے کہا جایئے میں کارروائی شروع کئے دیتا ہوں۔

زمرد کوتوالی سے سیدھی میرے پاس آئی۔ سارا ماجرا سُنایا۔ ہم دونوں خوب ہنسے۔ اُدھر کوتوال نے ایک آدمی عبدل رنگریز کے پاس بھیجا۔ وہ ڈرتا ہوا آیا مگر دیکھا کہ توقع کے خلاف کوتوال صاحب بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ مزاج پُرسی کے بعد اندر حجرہ میں لیجاکر بٹھایا اور کہا کہ سُننے میں آیا ہے کہ آپکی لڑکی جوان ہے اس لئے آپکو تکلیف دی ہو کہ ایک پیغام پیش کروں۔ عبدل نے کہا مگر وہ تو اندھی اور اپاہج ہے۔ کوتوال مسکرایا اور بولا کہ ہاں وہ ایسی ہی ہوگی لیکن اگر اس پر بھی کوئی بیاہنے پر راضی ہو تو۔ اُس نے کہا جناب وہ لنگڑی اور لُولی ہے۔ کوتوال دل میں خوش ہوکر بولا کہ بالکل صحیح مگر دُنیا میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ عبدل نے کہا بھلا ایسا کون ہو جو ان عیبوں کے ہوتے ہوئے بھی اُس سے نکاح کرلے۔ بولا کہ وہ یہی شخص ہے جو آپکے سامنے بیٹھا ہو۔ عبدل نے چلاکر کہا خدا گواہ ہے وہ آپکے قابل ہرگز نہیں۔ بولا کہ اس سے آپکو کیا۔ میں ان تمام عیوب کے ساتھ بھی شادی پر رضامند ہوں۔ عبدل نے دل میں سمجھ لیا کہ معلوم ہوتا ہو اسکو کسی نے دھوکا دیا ہے۔ مجبوراً کہا کہ اگر آپکو اصرار ہے تو پھر مجھے بھی انکار نہیں۔

کوتوال منظوری سُنکر خوش ہوا اور بولا کہ مہر کیا ہوگا۔ عبدل نے سوچا کہ جب یہ ایسا متوالا ہو رہا ہے تو کمی کیوں کی جائے، کہنے لگا کہ ایک ہزار اشرفی۔ اُس نے قبول کر لیا۔ اور اُسی وقت قاضی اور اپنے احباب کو بُلوایا۔ عبدل نے مجمع کے سامنے کھڑے ہوکر کہا کہ یہ شادی کوتوال صاحب اپنی مرضی سے کر رہے ہیں۔ میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ کوئی جسمانی عیب ایسا نہیں ہے جو میری لڑکی میں نہ ہو۔ لہذا بعد میں میرے اوپر الزام نہ رکھا جائے۔ کوتوال نے کہا کہ تمہارے اُوپر کوئی ذمہ داری نہیں۔ اس کے بعد قاضی نے نکاح پڑھایا اور مہر عبدل کے حوالے کر دیا۔ وہ لیکر روانہ ہوا اور کہہ گیا کہ گھر پہونچکر میں لڑکی کو رُخصت کئے دیتا ہوں۔

اُدھر کوتوال کی بیوی کو گھر میں جب اس شادی کی اطلاع ہوئی تو اُس نے اُسی وقت اُسکو بلُایا اور گریبان پکڑ کر کہا کہ میں ہرگز کسی سوکن کے ساتھ نہیں رہ سکتی مجھکو ابھی طلاق دو۔ نئی شادی کے نشہ میں بیوی کو طلاق دیدی، وہ سوار ہوکر اپنے میکے کو چلی گئی۔

اب کوتوال نوعروس کا انتظار کرنے لگے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ چار آدمی ایک صندوق اُٹھائے چلے آرہے ہیں۔ اب تک اسی خیال میں تھے کہ رنگریز کی بیٹی نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے۔ سب کو ہٹا دیا اور خود آکر صندوق کا پردہ کھولا۔ دیکھا تو اُسمیں ایک اندھی اپاہج۔ کالی زندہ لاش رکھی ہوئی ہے۔ مُنہ سے چیخ نکل گئی اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اب سمجھ میں آیا کہ کتنا بڑا دھوکا کھایا۔

بغداد کی گلی گلی میں یہ داستان پھیل گئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کس نے یہ چکمہ دیا۔

چند روز کے بعد خزانچی کے مشورہ سے میں خلیفہ کی قدمبوسی کے لئے گیا۔ انکو جب معلوم ہوا کہ میں موصل کا ولی عہد ہوں تو خوش ہوکر سینے سے لگا لیا اور کہا کہ ہم تو تمہارے انتظار میں تھے، دیر کیوں ہوئی۔ میں نے سفر کا واقعہ بیان کیا۔ فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے جس نے تم کو سلامت رکھا مگر تم نے ناحق شرم کی جس حالت میں بغداد میں پہونچے تھے ہمارے پاس آنا چاہیئے تھا۔ تمہارا باپ ہمارا دوست ہے۔ اُنہوں نے قصر خلافت میں ایک حصہ مخصوص کرکے مجھکو حکم دیا کہ معہ اپنی بیوی کے وہاں رہوں۔ اسی درمیان میں خبر آئی کہ میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ مجھے بہت رنج ہوا۔ خلیفہ نے تسلی دلائی اور پھر تین ہزار فوج کے ساتھ ہم کو موصل کی طرف روانہ کیا۔ یہاں ہم جس روز پہونچے سارے شہر نے استقبال کیا۔ پھر میری تخت نشینی کا جشن منایا گیا۔ اب میں بادشاہ ہوں اور زمرد ملکہ۔ جب کبھی رنگریز کے داماد کا ذکر آجاتا ہے تو ہم خوب ہنستے ہیں۔

اسلم جیراجپوری؛

دلّی جون بدلتی ہے

پہلے اندرپرست میں دلّی کی نیو پڑی تھی، جہاں آج کل پُرانا قلعہ ہے۔ وہاں کیرو پانڈو نے اپنا شہنشاہی دربار "راج سُویگ" کے نام سے کیا تھا اور اسی جگہ راجہ شِشوپال نے سری کرشن جی کی توہین کی تھی اور کرشن جی کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔ اور اسی جگہ جوے کی وہ مشہور بازی ہوئی تھی جس پر مہابھارت جیسی عظیم الشان لڑائی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ پھر اس جگہ نے جون بدلی اور شیر شاہ نے یہاں قلعہ بنایا۔ "دین پناہ" نام رکھا۔ ایک خوبصورت مسجد بھی بنائی اور ایک مکان بنایا جس کو شیر منڈل یا شیر منزل کہتے تھے۔ افغان حکومت کے خاتمہ کے بعد ہمایوں دلّی میں دوبارہ آیا تو اسی شیر منڈل کے زینہ پر چاند دیکھنے چڑھا اترنے لگا تو پاؤں پھسلا، گر پڑا اور مر گیا۔ تاریخ ہوئی "ہمایوں بادشاہ از بام اُفتاد"۔ اس قلعے کے غرب میں اکبر کی انّا "ماہم انگہ" نے مسجد بنائی اور ایک مدرسہ بنایا جہاں اکبر بھی کچھ دن پڑھا۔ اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی اسی مدرسے میں پڑھتے تھے اور اسی مدرسے کے بڑے دروازے کی بالائی کھڑکی میں ایک حبشی غلام چھپ کر بیٹھا تھا اور اُس نے اکبر پر تیر چلایا تھا جبکہ وہ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کر کے واپس آ رہا تھا، اور تیر نے اکبر کے بازو کو زخمی کیا تھا۔ اور اسی مسجد اور مدرسے کے شمال میں دلّی کا لال چوک تھا اور ایک عظیم الشان دروازہ تھا جس کے کھنڈر اب بھی باقی ہیں۔ اس لال چوک میں بڑے بڑے جوہریوں کی دوکانیں تھیں اور ایران اور سمرقند اور بخارا کے بڑے بڑے سوداگران دکانوں میں اپنا مال لئے بیٹھے رہتے تھے۔ وہ دکانیں اب بھی موجود ہیں۔ لال چوک سے شمال کی طرف بڑھیں تو سڑک کے غرب میں پہلے مرزا بیدل کا مزار ہے اور پھر حضرت ملک نور الدین یار پَرّاں رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے اور سڑک کے شرق میں ٹیلے پر حضرت بابا ابوبکر حیدری طوسی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے جہاں بانسوں پر بے شمار مٹکے ٹھلیاں اوندھی رکھی ہوئی ہیں۔

لال کوٹ

اندرپرست دلّی نے جون بدلی تو راجہ پرتھی راج نے لال کوٹ قلعہ بنایا۔ جہاں آج کل قطب مینار ہے۔ قطب الدین ایبک نے یہ قلعہ پرتھی راج کی فوج سے لے لیا اور اسلامی دلّی اسی جگہ آباد کر دی۔ ایبک کے بعد بلبن تک دلّی یہاں رہی پھر اس نے جون بدلی۔ بلبن کے پوتے کیقباد نے جمنا کے کنارے بنوائے اور دلّی آس پاس بسائی جہاں آج کل اوکھلے کا بند ہے۔ جلال الدین خلجی نے کیقباد کو قتل کر کے جمنا میں ڈال دیا۔ اور غلام خاندان کی حکومت جمنا میں اُس جگہ ڈوبی جہاں آج کل جامعہ ملیہ کی عمارتیں بنی ہیں، اور ڈاکٹر انصاری دفن ہوئے ہیں۔ جلال الدین کے بعد علاء الدین خلجی نے پھر دلّی کی جون بدلی اور سیری کے نام سے دلّی بسائی جس کے کھنڈر مقبرۂ صفدر جنگ اور قطب مینار کے بیچ میں اب بھی نظر آتے ہیں۔ قطب الدین خلجی پر اس خاندان کا خاتمہ ہوا اور غیاث الدین تغلق نے حکومت حاصل کی تو دلّی قطب مینار سے پانچ میل شرق میں چلی گئی اور تغلق آباد کا عظیم الشان قلعہ تیار ہوا۔ تغلق خاندان کا خاتمہ ہوا تو حکومت لودھیوں میں آئی اور اُنہوں نے چراغ دہلی کے قریب دلّی بسائی۔ ابراہیم لودھی پانی پت کے میدان میں بابر کے ہاتھ سے مارا گیا تو بابر نے قدیمی دلّی پر قناعت کی۔ اس کے بیٹے ہمایوں کو شیر شاہ نے ایران بھگا دیا۔ جب وہ واپس آیا تو پُرانے قلعہ کے پاس شیر شاہ کی بسائی ہوئی دلّی میں رہنے لگا۔ اکبر کا عُروج ہوا تو اُس نے آگرہ بسایا۔ جہانگیر کے زمانے تک دلّی پُرانے قلعہ کے آس پاس رہی۔ شاہجہاں نے یہ شہر بسایا جس میں لال قلعہ ہے اور جامع مسجد کے جنوب میں اُردو بازار ہے اور رسالہ ساقی کے اڈیٹر صاحب اس بازار میں بیٹھے ساقی

کا سالنامہ لکھا کرتے ہیں۔

اب انگریزوں نے شاہجہاں کی دلّی کے گوشۂ غرب و جنوب میں ایک نئی دلّی بسائی ہے جس کی عمارتوں کے مختلف نقشوں کو دیکھ کر کہا جاتا ہے "کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا"۔ اور حضرت اکبر الہ آبادی نے کہا تھا ؎

مری نظروں میں اب کچھ رنگِ دہلی جم نہیں سکتا　　وہی مٹی کے تودے ہیں وہی جمنا کا پانی ہے

آواگون اور تناسخ جیو اور جان اور رُوح کے لئے ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دلّی بھی ایک "جیو" ہے اور ایک "جان" ہے اور ایک "رُوح" ہے۔ نئی دلّی کی عمارتوں میں کہیں رومنوں کا طرز تعمیر ہے کہیں یونانیوں کا کہیں جرمنوں کا کہیں ہندوؤں کا کہیں مسلمانوں کا اور کہیں جنات کا۔ یہ خصوصیت دُنیا کے کسی شہر میں نہیں ہے کہ وہاں جنات کا طرز تعمیر بھی ہو، میر انشا نے لکھنؤ میں کوئی مہمل قطعہ تاریخ کسی مکان پر لکھا دیکھا تھا تو اس کی ہنسی اڑائی تھی۔ نئی دلّی میں جاؤ تو ہنسی نہیں آتی بلکہ رونا آتا ہے۔ کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا مگر اس اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے دلّی نے اس نئی دلّی کے جنم سے پہلے کوئی ایسا کھوٹا کرم کیا تھا کہ اس کو اس عجیب و غریب جون میں آنا پڑا۔

اُردو بازار شاہجہاں کی بنائی ہوئی دلّی میں ایک اُردو بازار بھی تھا جس کے پاس اور بہت سے اچھے اچھے محلّے اور بازار تھے ۱۸۵۷ء کی ہلچل میں بقول مرزا غالب کے "انقلاب کا بندر آیا اور اس نے ان بازاروں کی گنبدیوں کو ہلا ہلا کر گرا دیا"۔ اب چاندنی چوک کی سڑک سے وکٹوریہ اسپتال تک ایک بڑا میدان سنسان پڑا رہتا ہے جس کو پریڈ کا میدان کہتے ہیں اور جس میں چاندنی چوک کی طرف دو مندر ہیں اور وسط میں حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کی درگاہ ہے اور جنوب میں ایڈورڈ پارک ہے اور غرب میں سرمد شہیدؒ کا مزار ہے۔ اس میدان کے جنوب میں نشاط تاکیز سینما کی عمارت سے لیکر لقمان الملک حکیم نابینا صاحب کے مطب تک ایک لمبی سڑک چلی گئی ہے جس کے جنوبی کنارے کنارے بہت سے کتاب فروش اپنی دُکانیں سجائے بیٹھے رہتے ہیں اب اس بازار کا نام اُردو بازار رکھا گیا ہے کیونکہ اس بازار کے شمال میں جو چٹیل میدان پڑا ہے، ایڈورڈ پارک اور جامع مسجد کے بیچ میں، پُرانا اُردو بازار اسی جگہ تھا مگر اب وہاں پاتخانے بنائے گئے ہیں تاکہ ایڈورڈ پارک اور جامع مسجد میں جانے والے اپنی انسانی ضروریات یہاں پوری کر سکیں۔ دلّی میونسپل کمیٹی میں جتنے ہندو مسلمان ممبر ہیں وہ اس عجیب انتخاب کے ذمہ دار ہیں مگر وہ بیچارے کیا کرتے! اس میدان کو لوگوں نے جنگل سمجھ رکھا تھا جہاں آزادی سے رات بھر کی کثافتیں دُور کی جاتی تھیں کمیٹی نے وہاں پردہ دار محفوظ جگہ بنا دی۔

تو اب سونچنا یہ ہے کہ دلّی نے جو اتنی جونیں بدلی ہیں تو اب اس کا کیا ارادہ ہے۔ نئی دلّی کو تو دلّی کی جون نہیں کہہ سکتے۔ یہ جون تو نہ شرقی ہے نہ غربی، شمالی ہے نہ جنوبی۔ آسمانی ہے نہ کوہستانی۔ نہ جنت سے اس کو کچھ تعلق ہے نہ دوزخ سے نہ اعراف سے۔ یہ ہے مگر نہیں ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو یہ ضرور ہے۔ اس واسطے میں تو ساقی کے سالنامے میں ایک نشہ پئے ہوئے آدمی کی طرح جھوم جھوم کر اور بہک بہک کر اور "شاہد" کے کندھے پر ہاتھ ٹکا ٹکا کر یہ کہتا ہوں کہ دلّی اب جون نہیں بدلے گی، اس کا جنم تر اختم ہو گیا آواگون کا چکر پورا ہو گیا۔ اب دلّی کو پورن موکش مل گیا اسلئے دلّی کہتی ہے ؎

ساقیا برخیز و در دہ جام را　　خاک بر سر کُن غمِ ایّام را

افسانہ نمبر ۱ جب میں اپنی دونوں آنکھیں بند کئے جون کی ۵ تاریخ شام کے ۵ بجے خوب تیز لو اور گرمی میں بیٹھا ہوا یہ مضمون لکھوا رہا تھا تو میرے لڑکے علی نے کہا یہ مضمون سالنامے کے لئے نہیں ساقی کے "افسانہ نمبر" کیلئے

در کار ہے۔ میں نے کہا تو بیٹا میں بھی تو ایک افسانہ ہی لکھ رہا ہوں۔ ہر جوان جو بدلتی ہے گذرا ہوا افسانہ سناتی ہے اور آنے والا افسانہ سنتی ہے۔
مجھے ساقی سے آنکھ لڑانے دو اور اس کی چشمِ مخمور میں دنیا بھر کے افسانے دیکھنے دو۔ میں ان سب افسانوں میں اپنی پیاری راج دلاری دل لینے والی من موہن دلی کی کہانی ڈھونڈنی چاہتا ہوں۔ جہاں بہت سی قوموں نے اپنی اپنی بیتی سنائی اور کہتے کہتے چپ ہو گئی تو کسی نے کہا ؎

چمن یونہی رہیگا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

ساقی کے پاس کھڑا ہو جاؤں اور پوچھوں کیوں سرکار! یہ تو بتاؤ یہ سامنے اونچے اونچے میناروں والی کیا چیز ہے تو وہ جواب دے شاہ جہاں کی نماز کا افسانہ، پھر پوچھوں اور وہ دور لال لال دیواریں کیسی ہیں، تو وہ کہے، شاہ جہاں اور اس کی اولاد کا عشرت خانہ اور پھر بے تار کی خبر رسانی کے کالے کلوٹے کھمبوں کا افسانہ، اور ایسی آوازیں جیسے موٹر کی ہوتی ہے، ایسی نہیں جو سارنگی کے تاروں سے نکلتی ہے اور ایسی نہیں جو ساجن سیاں کے میٹھے بولوں میں سنائی دیتی ہے۔ تو بس یہ افسانے سن کر میں سن ہو جاؤں۔ اور پھر چپ ہو جاؤں ــــ اور پھر کہوں کہ بس بات ختم ہوئی۔ ہے۔
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

حسن نظامی

فسانۂ آزاد

اُردو زبان کے نثر نگار مصنف۔ فسانۂ آزاد پنڈت رتن لال سرشار لکھنوی کے برابر اور چند شاید ان سے بہتر خیال کئے جا سکتے ہیں لیکن غالباً اُردو کی کوئی ایک کتاب ایسی نہیں جو ہر پہلو سے فسانۂ آزاد کی ٹکر کی سمجھی جائے۔ اس کا مقابلہ اگر ہو سکتا ہے تو بوستانِ خیال اور طلسم ہوشربا ہی سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں بھی وہی خیالات کی آمد مضامین کی کثرت اور بیان کی دلکشی ہے جو فسانۂ آزاد میں پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ کتابیں فارسی سے اردو میں آئی ہیں۔ اور ترجمے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فسانۂ آزاد اردو ادب کی اپنی بنائی ہوئی چیز ہے اور ایجاد کی ذیل میں آتا ہے۔ خود سرشار نے اور کتابیں لکھی ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس کا نام فسانہ کے ساتھ لیا جا سکے۔ اس شہرت و خوبی کے باوجود یہ کہنا کس قدر دشوار ہے کہ فسانۂ آزاد کیا چیز ہے؟ اس کے مصنف کو عموماً ناول نویسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس کو اردو زبان کا سب سے پہلا ناول نویس خیال کرتے ہیں۔ لیکن کیا ہم فسانۂ آزاد کو ناول کہہ سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے ناول کی ایک صحیح تعریف اپنے ذہن میں قائم کریں۔ یہ ایک طویل مضمون ہے اور پندرہ منٹ کی مختصر تقریر میں اس پر بحث کرنے کی مہلت نہیں۔ اطالین فرینچ وغیرہ میں جن سے لفظ ناول نکلا ہے اس کے کچھ اور ہی معنی تھے۔ انگریزی میں بھی اس لفظ کی موقع کے لحاظ سے مختلف تعریف ہو سکتی ہے۔ لیکن عموماً اس کو ہر قسم کے بناوٹی اور خیالی قصہ کہانیوں کے لئے بول سکتے ہیں اگر لفظ ناول کو ان وسیع معنوں میں لیا جائے تو فسانۂ آزاد کو ناول کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اگر ناول سے ہماری مراد اس قسم کے قصے ہوں جو اٹھارھویں صدی سے آج تک انگلستان میں رائج رہے ہیں تو فسانۂ آزاد کو ناول کہتے ہوئے ضرور تامل ہوگا۔

اس کتاب کی حقیقت کو پہچاننے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ وہ کن حالات میں لکھی گئی تھی اور اس کے لکھنے سے اس کے مصنف کو کیا مقصد حاصل کرنا منظور تھا۔ فسانۂ آزاد کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب لکھنؤ کی بادشاہت کو ختم ہوئے ابھی بیس پچیس سال ہی گذرے تھے وہاں کے امیر اور آسودہ حال لوگ ابھی تک اس عیش پرستی میں مبتلا تھے جس کی بدولت شاہانِ اودھ کی حکومت ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ کچھ بچی کھچی دولت ان نوابوں اور رئیسوں کے قبضہ میں موجود تھی اور وہ اس کو مرغبازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی اور ان سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض بازیوں میں بے دریغ لٹاتے تھے۔ اپنی حالت کو بدلنے کا ان کو مطلق کوئی خیال نہ تھا اور نہ ان کو ان ذہنی اور معاشرتی تغیرات کا کوئی احساس تھا جو مغربی تعلیم اور مغربی خیالات کی درآمد کی بدولت درپیش تھے۔ فسانۂ آزاد کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس طبقہ کو اس کی صورت تخیل کے آئینے میں دکھائی جائے۔ شاید وہ اپنی بگڑی ہوئی شکل سے بیزار ہو اور اسکو سنوارنے کی کوشش کرے۔ اس قسم کے اصلاحی یا ہجویہ خاکے اور لوگوں نے بھی کھینچے تھے۔ اخبار اودھ پنچ میں بہت سے قابل ادیبوں کی مزاحیہ نثر و نظم شائع ہوتی رہتی تھیں جس کا منشا یہی تھا کہ ان نوابوں رئیسوں کو خوابِ خرگوش سے بیدار کیا جائے۔ نواب سید محمد آزاد کا نوابی دربار اسی قسم کا ایک مزاحیہ ادبی خاکہ ہے اور پہلے اودھ پنچ میں شائع ہوا تھا اب بھی کبھی کبھی لکھنؤ کے کتاب فروشوں کی فہرستوں میں نظر آجاتا ہے مولانا اکبر حسین الہ آبادی جن کے کلام کو اس وقت بہت فروغ حاصل ہے ان کی ہجویہ اور مزاحیہ شاعری کی ابتدا بھی اودھ پنچ ہی سے ہوئی تھی۔ اودھ پنچ کا بڑا حریف اودھ اخبار تھا جسے اردو ادب کے محسنِ اعظم منشی نولکشور نے جاری کیا تھا۔ یہ اخبار اگرچہ ظریفانہ مضامین

کے لئے وقف نہ تھا لیکن چونکہ اُس زمانے میں سیاست سے لوگوں کو چنداں دلبستگی نہ تھی اور اخبار بینی کا مدعا خبریں معلوم کرنے کے علاوہ ادبی شوق کی تسکین تھا۔ اودھ اخبار کو بھی اپنے خریداروں کی تفریح کا کچھ سامان مہیا کرنا ضروری تھا۔ یہ خدمت پنڈت رتن ناتھ سرشار نے جو غالباً اُس وقت اخبار کے چیف ایڈیٹر تھے، اپنے ذمّے لے لی اور فسانۂ آزاد کا ایک حصّہ ہر پرچے کے ساتھ شائع ہونے لگا۔ کتاب کے ابتدائی ابواب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے اکثر جُداگانہ ادبی خاکے ہیں جن میں سے ہر ایک لکھنؤ کی معاشرت کا ایک رُخ دکھاتا ہے۔ اور اُن میں باہم سوائے اس کے کوئی ربط یا تعلق نہیں کہ وہ سب ایک ہی شخص یعنی آزاد کے مُشاہدات و تجربات پر مبنی ہیں۔ کیا یہ سمجھنا دُرست ہوگا کہ شروع میں سرشار کا خیال کوئی باقاعدہ اور منظم قصّہ لکھنے کا نہ تھا بلکہ لکھنؤ کے قدامت پسند باشندوں کی روزمرّہ کی زندگی کی ایک جھلک دکھانی مقصود تھی اور اُن کے پیشِ نظر بعض انگریز مُصنّفین مثلاً ایڈیسن اور اسٹیل اور ڈکنز وغیرہ کے وہ ادبی خاکے تھے جو اُنہوں نے اپنے زمانے اور اپنے مُلک کی معاشرت کی آگاہی اور اصلاح کے لئے لکھے تھے۔ بہرحال سرشار کا ابتدا میں کچھ بھی مقصد ہو لیکن قُدرت نے اُن کو مصوّر کی نظر عطا کی تھی وہ نہ صرف اس زندگی کے تاریک پہلو دیکھ سکتے تھے جس کی اصلاح منظور تھی بلکہ اُس کے ہر ایک پہلو پر اُن کی نگاہ تھی اور اُن کا نور افشاں قلم اس کے تمام سیاہ و سفید کو روشن کرنے کے لئے کافی تھا اور اگرچہ شروع میں آزاد کی حیثیت اس زندگی کے ایک تماشائی کی تھی لیکن جب وہ لکھنؤ کے چوک اور بازاروں، میلوں اور تہواروں کی سیر کرتے ہوئے اور نوابوں کی صحبت کا لُطف اُٹھاتے ہوئے حُسن آرا کے محل تک پہونچ جاتے ہیں اور اس پر فریفتہ ہوجاتے ہیں تو پھر فسانۂ آزاد کے ایک قصّہ یا داستان ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کو کس قسم کا قصّہ اور کس قسم کی داستان خیال کی جائے؟ میرا قیاس ہے کہ سرشار کا دوسرا مقصد ایک ایسے قصّے کی تصنیف تھا جو داستان امیر حمزہ وغیرہ پُرانی قسم کی داستانوں اور مغربی نمونے کے نئے طرز کے ناولوں کے بین بین ہو اور جس میں دونوں کی ادبی لطافتوں کو ایک جگہ جمع کیا جاسکے۔

پُرانی داستانوں کی طرح فسانۂ آزاد میں خلافِ عقل واقعات اور جادو اور طلسمات کا تو کوئی ذکر نہیں ہے لیکن اور بہت سی باتوں میں وہ ان کا ہمرنگ ہے۔ اوّل تو قصّہ کی اُٹھان بالکل وہی ہے جو اکثر پُرانی داستانوں کی ہوتی ہے۔ قصّہ کا ہیرو کسی عورت کے حُسن و جمال کی شہرت سُن کر یا اس کی صورت کی ایک جھلک دیکھ کر اُس کے پیچھے دیوانہ ہوجاتا ہے۔ آزاد کی شناسائی حسن آرا کے ساتھ سُنی سُنائی تعریف یا ایک آدھ جھلک سے کچھ زیادہ تھی لیکن اُن کے دل کے آنے کا وہی ناگہانی ڈھنگ ہے جو پُرانی داستانوں میں دکھائی دیتا ہے اس کے بعد ان داستانوں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ عورت اپنی شادی کی شرطیں سُناتی ہے ان میں کسی بہت دُشوار کام کی انجام دہی یا کسی خطرناک مہم کی فتح ایک ضروری شرط ہوتی ہے۔ شاید کسی کو یہ خیال گُزرے کہ لکھنؤ کے چین اور آرام کی زندگی اور اُس وقت کے پُرامن دَور میں ایسی شرطوں کی کہاں گنجایش تھی۔ لیکن حُسن اتفاق سے اسی زمانے میں ٹرکی اور روس کی جنگ چھڑ گئی۔ ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمان ہندوستانیوں کو اس جنگ سے بہت دلچسپی تھی اور عام طور پر اُن کی ہمدردی ٹرکی کے ساتھ تھی۔ حسن آرا کو یہ موقع مل گیا کہ میاں آزاد کو ٹرکی کی [illegible]دد کے لئے بھیج دے۔ اور اس طرح یہ ضروری شرط پوری ہوجائے۔

پُرانی داستانوں میں ہر [illegible] پہلوان کے ساتھ ایک عیّار لگا رہتا ہے جو پہلوان کے زور و قوت کی تائید اپنے مکر و فریب سے کرنے کے علاوہ مُصیبت اور تکلیف میں [illegible]رح طرح کے حیلوں سے اس کا دل بہلاتا اور اُس کی طبیعت کو اُکساتا رہتا ہے۔ آزاد کے ساتھ خوجی ہیں جن میں عیاری کا تو کوئی وصف [illegible] نہیں لیکن اُن کی موجودگی سے آزاد کو وہی تقویت اور پڑھنے والے کو وہی تفریح حاصل ہ[illegible]

ہے جو عیاروں سے ہوتی ہے۔ پُرانی داستانوں کی طرح فسانۂ آزاد کو بھی زیادہ تر اُونچے طبقے کے لوگوں سے واسطہ ہے اگرچہ خود آزاد کے متعلق تو یہ کہنا دُشوار ہے کہ وہ سوسائٹی کے کس طبقہ کا آدمی ہے اور اُس میں یہ بھی وصف ہے کہ امیروں اور رئیسوں سے لیکر بھٹیاروں اور گھسیاروں تک سے برابری کا برتاؤ کر سکتا ہے۔ جن تمام طبقہ کے لوگوں کا ذکر آتا ہے وہ عموماً رئیسوں کے مصاحب، حاشیہ نشین یا ملازم ہیں اور قصّہ میں اُن کو کوئی مرکزی حیثیت نہیں۔

سرشار کی تحریر کے اسلوب میں بھی نئی اور پُرانی طرز دونوں کا میل ہے۔ کہیں اُن کی عبارت آج کل کی روش کی طرح سہل اور صاف ہوتی ہے اور کہیں قدیم دستور کے مطابق رنگین اور مُقفّٰی۔ پُرانی داستان گوئی کا معمول تھا کہ جب کوئی نیا قصّہ شرُوع کرتے تھے تو چند تمہیدی الفاظ استعمال کرتے تھے جو داستان کا چہرہ کہلاتے تھے یا چند اشعار ساقی نامہ۔ غزل وغیرہ کی قسم کے قصّے بیان کرنے سے پہلے پڑھ دیتے تھے۔ سرشار بھی اِس رسم کو نباہنے کی کوششیں کرتا ہے اور شعروں کی جو بھرمار فسانۂ آزاد میں ہے وہ بھی بجائے خود پُرانے رنگ کے موافق اور نئے رنگ کے خلاف ہے۔ صبح و شام کی کیفیت۔ موسموں کا بیان۔ قدرتی نظّاروں کا ذکر۔ جس حد تک بھی فسانۂ آزاد میں موجود ہے وہ سب پُرانے ڈھنگ کا ہے۔ یعنی اُس میں مُصنّف کا ذاتی مُشاہدہ کم ہے اور لفاظی زیادہ۔ اور لفظ بھی اکثر وہی ہیں جو پُرانی شاعری اور پُرانی داستانوں میں کثرت سے برتے جا چکے ہیں۔ لیکن اِن سب باتوں کے ساتھ فسانۂ آزاد میں بہت سی خوبیاں ہیں جنکی بنا پر اس کو یورپ کے اچھے سے اچھے ناول کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ اس میں سرشار نے اپنی بے مثل قوّت ایجاد سے بے شُمار مرد اور عورتوں کی ایک نقلی دُنیا پیدا کر دی ہے۔ جن کے معاملات اصلی دُنیا کے باشندوں کے معاملات سے بھی زیادہ رنگین اور پُر لطف معلوم ہوتے ہیں۔ آزاد۔ خوجی اور حسن آرا سے واقعات کی دُنیا میں ملاقات ہونی ناممکن ہے لیکن سرشار نے اپنی قلم کے جادو سے اُن میں ایسی جان ڈالدی ہے کہ وہ دوستوں کی طرح ہمارے دل میں گھر کر لیتے ہیں اور دوستوں سے زیادہ ہم اُن کے اچھے بُرے سے واقف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوتی ہے۔ دوسرے اگرچہ جذبات اور مناظر قدرت کے بیان میں سرشار رسمی لفاظی سے آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن جہانتک روزمرّہ کی زندگی کا تعلق ہے اُس کی قوّتِ مُشاہدہ بہت زبردست ہے اور فسانۂ آزاد کے ورقوں میں آج سے پچاس سال پہلے کے لکھنؤ اور لکھنؤ والوں کی لفظی تصویریں کثرت سے موجود ہیں۔ فسانۂ آزاد کی تیسری خوبی اُس کی ظرافت ہے۔ جس کی نظیر اُس سے پہلے یا اُس کے بعد کی اُردو ادبیات میں بہت کم ملتی ہے۔ اُردو میں ظرافت کے اکثر معنی صرف ایسی زبان کے استعمال تک محدود رکھے جاتے ہیں جس کو سُنکر یا پڑھکر آدمی کو ہنسی آجائے اور اُس زبان کو گندے اور فحش لفظوں سے پاک رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ وہ ظرافت جو ہنسنے ہنسانے کا موقع اور محل پیدا کر دے۔ اور کانوں سے زیادہ آدمی کے تصوّر کو خوش کرنے کی کوشش کرے اُردو میں بہت کمیاب ہے۔ اور غالباً یہ کہنا مُبالغہ نہ ہوگا کہ سرشار اُردو زبان میں سچّی اور اچھی ظرافت کا موجد تھا۔ خوجی کا کردار فسانۂ آزاد کی جان ہے۔ افیموں کے متعلق ہندوستان میں ہمیشہ سے لطیفے اور حکایتیں سُننے میں آتی رہی ہیں۔ خوجی کو اُن تمام اگلے پچھلے افیمیوں کا مجموعہ خیال کرنا چاہیئے۔ لیکن سرشار نے اپنے افیمی کو ایسی نزاکت اور لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اُسکی ذلّت اور حقارت کا کوئی خیال ہمارے دل میں نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ اسکے برعکس اس سے ایک قسم کا اُنس اور لگاؤ پیدا ہوجاتا ہے جو کتاب کو ختم کرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

بعض لوگ فسانۂ آزاد کی غیر معمولی ضخامت کو ایک عیب خیال کرتے ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ انگریزی ناولوں کو

اپنے سامنے نمونے کے طور پر رکھتے ہیں اور ان سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ابتدا میں انگریزی ناول بھی خاصے طویل ہوتے تھے۔ اُنیسویں صدی میں عام میلان اختصار کی جانب رہا لیکن اب پھر ہزار بارہ سو صفحے کے ناول دکھائی دینے لگے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فسانۂ آزاد غالباً لمبے سے لمبے انگریزی ناول سے بھی کچھ زیادہ طویل ہے۔ لیکن میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ سرشار کے پیش نظر ایک طرف اگر انگریزی ناول تھے تو دوسری طرف ہندوستانی داستانیں جن میں طوالت کوئی عیب نہیں۔ بلکہ ایک قسم کا وصف خیال کی جاتی تھی۔ جو طبیعتیں طلسم ہوشربا کی آٹھ اور بوستانِ خیال کی نو جلدوں کی خوگر تھیں اُن کے لئے فسانۂ آزاد کی چار جلدیں شاید کافی بھی نہ سمجھی جائیں۔ لیکن غالباً فسانۂ آزاد کے اس قدر طولانی ہو جانے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ وہ اودھ اخبار میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر شائع ہوا اور اس کے مصنف کو کبھی اُس کے ڈیل ڈول کو پہلے سے جانچنے اور ناپنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پڑھنے والوں کی دلچسپی بڑھتی رہی اور اس کے ساتھ کتاب کا حجم بھی بڑھتا چلا گیا۔ ان حالات میں ادبی تناسب کی توقع فضول ہے۔ تو بھی فسانۂ آزاد کے بہت کم حصے ایسے ہیں جنکو بھرتی کا سمجھکر نظر انداز کیا جا سکتا۔ باخبر لوگوں کے سننے میں آیا ہے کہ سرشار کی طبیعت میں غضب کی آمد تھی جو کچھ لکھتے تھے قلم برداشتہ اور بے ساختہ لکھتے تھے اور اپنے لکھے کو دوبارہ دیکھنا یا ترمیم کرنا ان کی عادت کے خلاف تھا۔

ایک مشہور ہندی مصنف نے فسانۂ آزاد کا خُلاصہ کرنے کی کوشش کی تھی اپنا اپنا مذاق ہے میں اور شاید اور بہت سے لوگ تو اس میں کوئی کاٹ چھانٹ پسند نہ کریں گے، سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا خوش قطع حوض جس کے عین بیچ میں ایک کنول نما فوارہ لگا ہو اور جس کا پانی شیشے سے زیادہ چمکدار اور شفاف ہو واقعی بھلا لگتا ہے۔ لیکن بعض آنکھوں کو کسی دریا یا ندی کی بے قاعدہ لیکن شاندار روانی کا منظارہ اس سے بھی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتا ہے

نرگسِ جمال

مرزا محمد سعید۔ ایم۔ اے

مولانا نیاز فتحپوری لکھتے ہیں: "ترجمہ ہے مٹرلنک کے ڈرامے "جائزل" کا۔ مارس مٹرلنک (بلجیم) کا مشہور ڈرامہ نگار ہمارے شاہد صاحب کا نہایت محبوب مصنف ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ ذوق نہایت مشکل پسند ذوق ہے۔

مٹرلنک کے ڈرامے عموماً چونکہ اسٹیج کے لئے نہیں ہوتے اسلئے ان میں علمی و فلسفیانہ شان زیادہ پائی جاتی ہے اور طبقہ خواص ہی کی تسکینِ ذوق ان کا اصل مقصود ہوتا ہے۔

مٹرلنک زیادہ تر "عشق و جمال" اور اُسکے متعلقات سے گفتگو کرتا ہے۔ اسی لئے اُسکے یہاں جذبات کی نزاکت و وسعت اور فطرتِ انسانی کی وہ لچک جسے ہم چاہیں تو روحانیت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ وہ دہشت انگیز مناظر پیش کر کے دلوں کو دہلانا پسند نہیں کرتا، وہ انسان کی خون آشامیوں کے افسانے سنا کر رُوح کے سکون کو مضطرب کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف ان لطیف و پاکیزہ انعطافات کی داستان سناتا ہے جو حُسن سے پیدا ہوتے ہیں، محبت کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں اور رُوح میں جذب ہو کر شاہراہِ انسانیت کو منور بنا جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس ادیب کا ذوقِ سخن یہ ہوگا، اس کے یہاں خیال کی نزاکت، بیان کی ندرت، طرزِ ادا کی جدت اور معنی کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال بھی کچھ ہوگا، اور ایک غیر زبان سے ان تمام خصوصیات کو اپنی زبان میں منتقل کرنا آسان کام نہیں۔ لیکن مسٹر شاہد احمد بی۔ اے اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوتے ہیں اور اس کا سبب یہی ہے کہ وہ خود اسی ذوق کے ادیب ہیں۔" قیمت صرف ۱۲؍

ملنے کا پتہ:- ساقی بُک ڈپو۔ دہلی ؀

خرافات

پنواڑی اتنے پان لگائے۔ میں نے ان حضرت کا جائزہ لیا۔ جو دوکان پر ایک طرف کو ایک بھورے کمل میں لپٹے اکڑوں بیٹھے تھے۔ اور جن کے سلسلۂ کلام میں میری فرمائش اچانک مخل انداز ہو گئی تھی۔

اگر کمل میں ذرا سا روزن ناریل مُنہ سے لگانے کو نہ ہوتا۔ یا سامعین بیحد دلچسپی سے ان کی طرف متوجّہ نہ ہوتے، تو یار لوگ یہی سمجھتے کہ بوری میں تمباکو کے سوکھے پتّے رکھے ہیں۔

میں نے پنواڑی سے پان کے لئے کہا تو ان حضرت نے رُک کر ایک چھلکتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اور پھر سر موڑ چُپ چاپ ناریل کی طرف توجہ کر لی۔ انہماک کے عالم میں دو ایک کش لگائے۔ پھر ایک نظر سامعین پر ڈالی۔ جو سامنے مونڈھوں اور لوہے کی کرسیوں پر بیٹھے بیتابی سے منتظر تھے، کہ پنواڑی مجھے بھگتانے میں اور کتنا وقت لیتا ہے۔ ادھر اسکی اکتائی ہوئی پھرتی صاف کہہ رہی تھی کہ اسوقت کاروبار سے زیادہ اخلاق کے خیال نے اُسے میری فرمائش کی تعمیل پر آمادہ کر دیا ہے۔

مَیں پان کھا کر مُنہ اور چُٹکی پونچھنے کو جیب سے رومال نکال رہا تھا کہ سامعین کے انداز نشست اور چہروں سے ذہین طالبعلموں کی سی توجّہ ظاہر ہونے لگی۔ اور آنجناب نے عنانِ فصاحت ڈھیلی چھوڑ دی۔

کہنے لگے "تو بس صاحب، اللہ تمہارا بھلا کرے۔ اب ہم اِس فکر میں کہ آخر کو سُسری بات ہے تو کیا ہے۔ امیروں سے بھی فقیروں سے بھی۔ پڑھے لکھوں سے۔ زاہلوں سے اور تمہارا بھلا کرے، بہروں سے، خنساؤں سے، صاحب لوگوں سے، لیجئے صاحب دُنیا بھر سے پوچھ ڈالا۔ (ناریل کا کش لے کر سر کی جُنبش نفی سے)۔۔۔ کچھ نہیں۔ پر ہم نے بھی دل میں ٹھان لی کہ اگر زندگی رہی تو ایک دُنے مالم تو ضرور کریں گے کہ آخر کو یہ بھید سالا ہے تو کیا ہے۔

(ناریل کے کش لیکر اور سر ذرا مزے میں ہلا کر) کرنا خدا کا کیا ہوتا ہے کہ ایک رِسلدار صاحب ہماری پڑوس میں آکر بس گئے۔۔ ۔۔۔لے دیکھو، یہ کچھ اچھا سا نام تھا ان کا۔ سُسرا زبان تک آ آ کر لوٹ جاتا ہے۔ بشی رتی۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔ خیر صاحب کچھ ایسا ہی نام تھا ان کا غرض کہ۔۔۔۔ تو رِسلدار صاحب تھے تو ہماری طرح زاہل اَن پڑھ۔ مگر ہندوستان سے تا بہ لندن تک، اور صاحب تمہارا بھلا کرے۔ اور افریقہ اور کیا کہتے ہیں اسی کو برما اور ربکا، اور الم غلم بیسیوں جگھوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے۔ بڑے بڑے فرنگیوں سے میل جول تھا۔ واپس آکر بھی صاحب لوگوں میں آتے جاتے رہتے۔ بیلی صاحب کے ہاں ڈالی والی چڑھا آتے تھے، بیلی صاحب کی میم صاحب بھی ہنستی بولتی تھیں ان سے۔ مگر صاحب واہ وا۔ واہ وا۔ کیا عورت تھی! ایک اچھی، ایک بہت ہی اچھی۔ اس قدر کی لائق اور پڑھی لکھی عورت کہ شاذ ہی کی بات ہے جو ہماری نظر سے گذری ہو۔ قسم ہے، امیر علیہ السلام کی۔ ہم نے بھی زمانہ دیکھ ڈالا ہے۔ جوانی کا جب زمانہ تھا ہماری۔ (کمل سر سے سرک گیا۔ آنکھیں چمک اٹھیں، نتھنے پھول گئے) جھوٹ بولنے والا کافر۔ والد جدھر سے گزر جاتے تھے، قیامت مچ جاتی تھی، قیامت۔

(پنواڑی سے) تو نے تو دیکھی ہے، وہ غفورن پان والی۔۔۔ کیا چیز ہے! (فخر سے مسکرا کر) "بڑھاپا ہے، مگر اب بھی جب

دُکان کے سامنے سے گُزر جاتے ہیں ہم، تو سینہ تھام کے رہ جاتی ہے، ہم سے کہا کرتی تھی کہ میر صاحب مجھے اپنے گھر میں ڈال لو۔ اپنی دُم سُئے دیتی تھی۔ اور صاحب تمہارا بھلا کرے، کہتی تھی کہ میرا سارا گہنا پاتا۔ روپیہ پیسہ اور کیا نام اس کا کہ کپڑا لتا لے لو، مگر یہاں جو آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا ہو تو جو چور کی سزا، بات کیا تھی؟ بس ایک روز اتنا کہہ بیٹھے تھے، کہ "بھنّو ذرا دو بیڑے پان تو لگا دے" بس صاحب قسم لے لو۔ جیسی جی چاہے تمہارا، وہ دن اور آج کا دن جو بہن کے سوا اسے اور کچھ جانا ہو۔ تو وجہ کیا؟ کہ قولِ مرداں جان دارد۔ مگر جناب کیا کہنے ہیں اُسکے بھی جگرے کے، کہ آج تک ہمارے نام پر کنواری بیٹھی ہے۔

بس حضرت تو میم صاحب سے جو ملاپ تھا اُن کا، تو ہم دل میں سوچے، کہ جس بات کی ہمیں دُھن لگی ہے، وہ بس یہیں سے ملیگی (اندازِ نشست میں کچھ ترمیم کرکے) لیجئے صاحب ہم نے رسلدار صاحب کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ کبھی جاکر بازار سے سودا سلف لا دیا اُن کا۔ اور صاحب تمہارا بھلا کرے، کبھی اُن کی جُورو کا قارورہ حکیم صاحب کو دکھانے لے گئے۔ غرض کہ اسی طرح میل ملاپ بڑھا لیا۔ تم جانو دلکو دل سے راہ ہوتی ہے۔ رسلدار صاحب بھی ہم پر مہربان ہوگئے۔ (ناریل کے دو چار چھوٹے چھوٹے اور ایک بڑا سا کش لیکر) مہربانی تو اس پاک پروردگار کی چاہیئے ؎

اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار نہ ہو اس سے مایوس اُمیدوار

(سامعین کی زبانوں، آنکھوں اور گردنوں کی جنبش نے کُھلے دل سے تائید کی) لیجئے صاحب، اب ہم اس تاک میں، کہ کوئی موقع ہاتھ آئے تو اپنی منشا زبان پر لائیں، کہتے ہوئے گھبرائیں بھی، کہ اگر ناں کر دے تو مُفت میں بات بھی جائے۔ آدمی آبرو ہی سے تو ہے۔ آبرو پر پانی پھر جائے، تو ٹکے میں بھی سستا نہ کچھ ہونگا۔

اللہ کی قدرت، ان ہی دنوں ہمارے چچا نے ـــــ مُرادآباد میں پولیس میں مُلازم تھے۔ وہ کڑیل نوجوان کہ دیکھکر اُسکی قدرت یاد آتی تھی۔ ہاتھی کی طرح اینڈ اینڈ کر چلتے تھے۔ ایک ایک بازو، خدا جھوٹ نہ بُلوائے تو (ہاتھ سے بتاکر) یہ پتہ تھا۔ بس صاحب تمہارا بھلا کرے، تو اُنہوں نے مُرادآباد کا کچھ خمیرہ ہمیں بھیجدیا۔ تم جانو ہم تو اپنی بات کے فراق میں تھے ہی، تبا کو لے سیدھے رسلدار صاحب کے ہاں پہونچ گئے۔ آٹھوں گُن کے پورے تو ہیں ہی، تو آرکھ کے خمیرے کی ایک چلم جو بھر کے دیتا ہوں، تو پھڑک اُٹھے۔ آنکھیں کُھل گئیں، تمہاری قسم بولے: "قربان جائیں اِن ہاتھوں کے، مانگ آج کیا مانگتا ہے؟"

بس ہمارا یہ سُننا تھا، کہ دل میں گدگدی مچ گئی۔ اُٹھکر مجرا عرض کیا، کہا "پیر و مرشد، اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ راج پاٹ نہ سہی پیٹ کی گُزر چلی چلتی ہے۔ ہاں ایک سوال ہے، جو اس کا جواب سمجھا دیں، تو سمجھونگا بھر پایا۔

کہنے لگے: "پوچھ کیا پوچھتا ہے؟"

ہم بھی کچّی گولیاں ناں کھیلے تھے، کہا "پہلے قول دیجئے"!

قول کا نام سُنکر رسلدار صاحب بھڑکے، مگر صاحب جھوٹے کے مُنہ میں خاک، میں بھی اُپرا تلی چلموں پر چلمیں پلائے گیا۔ آخر کہاں جاتے تھے۔ (ہاتھ پر ہاتھ مار کر) قول ہار بیٹھے۔ پھر تو ہم بھی سمجھ لئے کہ آج میدان مار لیا۔ لے مرے بھائی، جھٹ سامنے آ دست بستہ عرض کی "پیر و مرشد، فرنگی چمچے سے کھانا کھاتے ہیں۔ ہاتھ سے نہیں کھاتے۔ اس میں کیا بھید ہے؟"

لیجئے صاحب ہمارا یہ کہنا تھا، تو آئے ہیں تو جاتے کہاں ہیں۔ گالی گلوچ اور لیجئو پکڑیو اور ایک اُدھم مچا دیا۔ مگر اب ہم کہاں

چھوڑتے تھے، سب کچھ چپکے چپکے سنا گئے۔ کہا، تو صرف یہ، کہ صاحب اب قول ہار چکے ہو۔ (سکوت جس میں نظریں فخر کے انداز میں سامعین پر پڑ رہی اور اپنی سیاست کی داد طلب کر رہی تھیں۔)

آخر بولے "یہ ایک بڑے راز کی بات ہے تو کسی سے کہیو مت"

یہاں تک داستان پہونچا کر آپ نہایت استغنا سے ناریل کی طرف متوجّہ ہو گئے، ہر طرف سے اصرار ہو رہا تھا کہ تمہیں ہماری ہی قسم بتا دو۔ ایک مغلانی جو روز کی آنے جانے والی معلوم ہوتی تھی، ترچھی نظر سے بولی "ہمارا ہی لہو پیے جو نہ بتائے" مجھے دفعتاً احساس ہوا کہ میرا دکان پر یوں کھڑا ہونا کچھ بے موقع سا ہے، مگر میں مقر ہوں کہ داستان کا بقیہ حصّہ معلوم کرنے کا اشتیاق میری خودداری پر غالب آرہا تھا۔ میں اپنے قیام کو معقول نما بنا کر توسیع دینے کیلئے جو کچھ بھی کر سکتا تھا کرتا رہا۔ سگرٹ کی ڈبیا خریدی۔ سگرٹ اس میں سے نکال کر سگرٹ کیس میں بھرے، ایک سگرٹ سلگایا۔ بوٹ کے تسمے کھولتا اور باندھتا رہا۔ اُدھر سامعین کا اصرار دم بدم بڑھ رہا تھا۔ آخر بولے۔ "لے اب کچھ منہ وُہنہ بھی میٹھا کراتے ہو کہ ہم چلیں" ہر طرف سے فراخدلی سے وعدے ہوئے۔ مگر اب دفعتاً بتا دینا بے موقع سا معلوم ہوتا تھا۔ آپ نے نظروں کو خوابناک بنا کر ناریل کی طرف توجہ کرلی۔ انکار سے جو بے لطفی پیدا ہو گئی تھی، اُسے دھوئیں میں اڑا دیا۔ خفیف سا مسکرائے، بولے "کیا کہا جائے....."

ذرا دیر کو پھر ناریل کی طرف توجہ کی۔ دفعتاً نظروں کو برق وش سامعین پر ڈال کر بولے "لے دیکھو۔ کسی سے کہنا تو ہومت"

اتنے آپ دو چار اور کش لگائیں، سامعین ہر ممکن طرح اسکے متعلق اطمینان دلانے کی کوشش کرتے رہے۔

"اور جو کسی سے کچھ کہا، تو پچھتاؤگے"

سامعین نے ایک دوسرے کی طرف تعجب کی نگاہوں سے دیکھا۔ دکان کے آئینے کے سامنے میرے ہاتھ بھی کالر ٹائی پر رک گئے۔ کسی نے دبی زبان سے پوچھا کہ کیا ہوگا!۔

آپ نے ایک پُر اسرار تبسّم کے ساتھ کہا "کہ جو دیا"

یکلخت اِدھر اُدھر احتیاط کی ایک نگاہ ڈالی۔ سر سامعین کی طرف بڑھایا۔ اور آہستہ سے بولے "ناخن! فرنگیوں کے جو ہوتے ہیں ناخن، اِن میں ہوتا ہے ایک طرحوں کا زہر! کیا سمجھے! جو کہیں ان کا ناخن کھانے کو چھو بھی جائے، تو سارا کھانا زہر زہر ہو جاتا ہے۔ پھر تو اِدھر کھایا اُدھر پٹ، اور صاحب تمہارا بھلا کرے، یہ بھی بتا دیں، کیا یاد کروگے، کہ فرنگی کا ناخن نایاب شے ہے، بڑے بڑے اسکے فراق میں ہیا بگڑا دیں ہوں۔ جو کہیں ناخنوں کو ہوا بھی لگنے دیتے ہوں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہ کب تراشتے اور کہاں پھینکتے ہیں۔ وجہ کیا کہ اس زہر کے مارے کا کوئی علاج ہی نہیں۔ لاش کو الٹو پلٹو چیرو پھاڑو۔ کیا مجال جو شبہ بھی گزر جائے، کہ کس شے کی کرامات ہے، ایک اور بات بھی ہمیں معلوم ہوئی، کہ ان فرنگیوں کے ناخن بڑھتے نہیں اور تراشنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ پر اس کا ابھی ہمیں یقین نہیں۔ کبھی فرصت ہوئی تو نشاط خاطر سے عالم کریں گے"

سامعین اس انہماک سے سُن رہے تھے، گویا دنیا کے کسی بہت بڑے راز سے اُنہیں آگاہ کیا جا رہا ہے، اور وہ بڑے فخر اور پوری ذمہ داری کے احساس کے ساتھ اس بار امانت کو اٹھانے کیلئے آمادہ ہیں۔ میں انہیں مصروف چھوڑ کر تحقیق کا بقیہ حصّہ اپنے اوقات فرصت میں مکمل کرنیکا ارادہ کرکے گھر روانہ ہو گیا۔

سید امتیاز علی تاج

کہیں نہ مٹ جائے نامِ دُنیا

بڑا ہے گو اہتمامِ دُنیا۔ الٹ پلٹ ہے نظامِ دُنیا۔ غلط خیالِ دوامِ دُنیا بگڑ رہا ہے قوامِ دُنیا

چھلک پڑا ہو نہ جامِ دُنیا۔ کہیں نہ مٹ جائے نامِ دُنیا

نہ آتشِ اعتقاد باقی۔ نہ شعلۂ اعتماد باقی۔ نہ صورتِ اتحاد باقی قلوب میں ہے فساد باقی

چھلک پڑا ہو نہ جامِ دُنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دُنیا

معاشرت اِک ملمّع سازی۔ ستم ظریفی ستم نوازی۔ نہ پاک بینی نہ پاکبازی۔ نہ دلستانی نہ دلگدازی

چھلک پڑا ہو نہ جامِ دُنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دُنیا

قدم قدم پر قمار خانہ۔ گلی گلی میں سنگار خانہ۔ جو گھر بنے ہیں نگار خانہ تو مدرسے اشتہار خانہ

چھلک پڑا ہو نہ جامِ دُنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دُنیا

فریب کا نام عقلمندی۔ خودی کے پردے میں خود پسندی۔ جہاں ہو پستی میں بلندی۔ وہ ذہنیت ہے سری سی گندی

چھلک پڑا ہو نہ جامِ دُنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دُنیا

رئیس نصیب

دیوانی

حضرت اورنگزیب کا مقولہ ہے کہ شکار کار بیکاراں است! میں بھی ایک مدت سے اسی مقولے پر کاربند ہوں۔ موسم شروع ہوتے ہی کہیں نہ کہیں نکل جاتا ہوں۔ گذشتہ موسم میں بھی میں ایک پہاڑی علاقے میں شکار کے لئے گیا ہوا تھا۔ دامنِ کہسار میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ کوئی پندرہ بیس گھر ہونگے۔ میں ایک گوالے کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک مدت کے بعد جب مجھے اِن علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو یہاں کے رہنے والوں کی زندگی پر رشک سا آنے لگتا ہے۔ ہر بات میں سادگی دیکھ لیجئے۔ بناوٹ اور تصنّع کا کہیں نام تک نہیں۔ مناظرِ قدرت کی طرف دیکھئے تو بیحد دلفریب اور جو گاؤں والوں کی طرف نظر کیجئے تو ایک عجیب رومان انگیز زندگی نظر آئے گی۔ کارزارِ حیات میں ہم شہر کے رہنے والوں کی نسبت یہ لوگ کچھ زیادہ ہی سرگرم نظر آتے ہیں اور میرے خیال میں زندگی کا لطف بھی انہیں ہم لوگوں سے کچھ سوا ہی حاصل ہوتا ہوگا۔

تو خیر! میں گوالے کا مہمان تھا۔ اِس علاقے میں کبک، سی سی، تیتر، بٹیرے اور گلگدار کا شکار ملتا ہے۔ گوالے کا لڑکا میرا راہبر تھا۔ دُنیا بھر کے قصے کہانیاں اُس سے سُن لیجئے۔ اور پھر گاتا بھی خوب تھا۔ اور ذرا نظر باز بھی تھا۔ اُس کی باتوں میں مجھے بہت لطف آتا۔ پنگھٹ پر تو وہ سب کام چھوڑ کر بھی صبح و شام ضرور چلا جاتا۔ اور گھر والوں سے گاہے گاہے اس پر لتاڑ بھی خاصی پڑتی۔ آج وہ دوپہر سے غائب تھا۔ اُس سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ پاڑوں کی ایک ٹولی کہسار کے دامن میں جو جوار کے کھیت ہیں ان میں چگ رہی تھی۔ مجھے اپنے راہبر کا بہت انتظار تھا لیکن جب وہ عصر تک بھی واپس نہ آیا تو میں بندوق لے کر اکیلا ہی پہاڑوں کی طرف چل دیا۔ جن کھیتوں کا لونڈوں نے پتہ دیا تھا وہاں پاڑوں کے سُم کے نشان بالکل تازہ تھے۔ پاڑے جس کھیت میں صبح چرنے کے لئے آتے ہیں دن ڈھلے بھی وہاں ایک آدھ پھیرا ضرور کرتے ہیں۔ میں ایک پتھر سے لگ کر اُن کے انتظار میں بیٹھ رہا۔ کبھی کبھی کسی چٹان پر سے کبک کی آواز تو سنائی دیتی لیکن اس خیال سے کہ پاڑے بندوق کی آواز سُنکر بھاگ نہ جائیں میں اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ میرے دیکھتے دیکھتے دس پندرہ کبک پہاڑ سے اُتر کر کھیت کے کنارے آ کھڑے ہوئے۔ کبک رفتاری کے قصے تو اکثر سُنے ہیں لیکن خدا کی قسم آج آنکھوں سے دیکھکر جو لطف آیا بیان نہیں ہو سکتا۔ جھُوم جھُوم کر قدم اُٹھانا، سینہ اُبھار اُبھار کر چلنا اور مست آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنا قیامت کے فتنے سے کم نہ تھا۔ میں ابھی ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا کہ داہنے ہاتھ کی ڈھلوان پر مجھے پتھروں پر کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے جو جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو چار پانچ پاڑے پہاڑ پر سے نیچے اُتر رہے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ان کمبختوں نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ کیونکہ ایک جھاڑی کے پاس جا کر یہ رک گئے۔ فائر تو میں کر دیتا لیکن فاصلہ زیادہ تھا۔ اِس خیال سے کہ شاید زد میں آجائیں دبک کر بیٹھ رہا لیکن میرے دیکھتے دیکھتے ایک گھاٹی میں اُتر گئے اور میں بندوق کندھے پر رکھ کر جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اُن کے پیچھے ہو لیا۔ اسی طرح چلتے چلتے میں گاؤں سے اتنی دُور نکل گیا کہ راستے کا پتہ نشان نہ رہا۔ شفق کی لالی دشت و جبل پر اس طرح عُریاں تھی جیسے کسی عروسِ نو کے کفِ دست پر حنا۔ میں واپس لوٹ جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہی پاڑے مجھے ایک چٹان پر کھڑے نظر آئے۔ فاصلہ تو کچھ زیادہ نہ تھا لیکن اس چٹان تک پہونچنے کے لئے مجھے ایک چکر کاٹنا پڑا۔ ہوا یہ کہ میرے پہونچتے پہونچتے پاڑے تو کسی اور طرف چل دئے اور میں سستانے کے لئے وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

وسعت نگاہ کے سامنے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور پُشت کی جانب
رفع سر بفلک پہاڑ تھے جن کی برف پوش چوٹیاں ثریا سے ہم کلام معلوم
ہوتی تھیں۔ اور انہی گھاٹیوں میں کہیں کہیں کسی آبشار کی ترنم ریزیوں سے
ایک کیفِ سوز و ساز پیدا ہو رہا تھا۔ شام کی اس ہلکی ہلکی روشنی میں
دشت و جبل کا منظر بیحد دلکش معلوم ہوتا تھا۔ اور بَن کی ہوا سے
مستی کی بُو آ رہی تھی۔ آپ جانئے شکاریوں کے شوق اور ولولے بھی دنیا
بھر سے نرالے ہی ہوتے ہیں۔ دل تو اس وقت یہ چاہتا تھا کہ کیا اچھا ہو
جو اس ویرانے میں ہی رات بسر کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ لیکن
حالات واپس جانے پر مجبور کر رہے تھے۔ اس لئے بندوق اٹھا کر
توکّل کے بھروسے پر جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی کو ہو لیا۔ خیال تو یہ تھا
بستی زیادہ دُور نہیں۔ تاہم دل میں ایک اُلجھن سی پیدا ہو رہی تھی۔ اس
لئے چلتے چلتے بندوق کا ایک آدھ فائر کر دیتا۔ خوف سے نہیں بلکہ
اس خیال سے کہ شاید کوئی گڈریا یا گوالا آواز سنکر ادھر کو آجائے۔ لیکن
نہ تو کوئی گڈریا ہی مدد کو آیا اور نہ کسی گوالے کی بنسری کی آواز سنائی دی
اور تھوڑی ہی دیر بعد لیلائے شب کائنات سے ہمکنار ہونے لگی اور
بامِ فلک پر ستارے کسی کے آویزۂ گوش کی طرح چمکنے لگے۔ جب تک
ممکن تھا راستے کی جستجو میں لگا رہا۔ لیکن جب تاریکی اچھی طرح مسلّط
ہو گئی تو تھک ہار کر ایک درخت کے نیچے آ بیٹھا۔

یہ ظاہر تھا کہ اسی ویرانے میں رات بسر کرنے کی جو مجھے آرزو
تھی اب پوری ہو کر رہے گی۔ لیکن سوال تو جاڑے کا تھا۔ مصیبت
یہ تھی کہ میرے پاس دیاسلائی بھی نہ تھی جو الاؤ تاپ سکتا۔ اب سر پر
جاڑے کی رات تھی اور رات کاٹنے کا سہارا یہی بن کے جنگل تھے اتنا
ہی غنیمت ہوا کہ کوئی پہر رات گئے پہاڑیوں کے عقب میں سے چاند
نکل آیا۔ پہلے تو کہسار کی یخ بستہ چوٹیاں یوں چمکنے لگیں جیسے کسی
نے چاندی کی ڈلی رکھدی ہو۔ پھر بتدریج تمام کائنات حُسن کی تنویر
سے جگمگا اُٹھی۔ لیکن ماہِ تاباں جب کبھی بادلوں کے جھرمٹ میں آ جاتا
تو یہی دیو قامت اشجار الف لیلےٰ کے جنوں کی طرح بھیانک بھیانک
سے نظر آنے لگتے۔ لیکن روئے تاباں سے نقاب اُٹھتے ہی ایسا معلوم
ہوتا گویا جنّت کی کوئی حور شجر و حجر پر نُور کی بارش کر رہی ہے۔ اس
خاموشی اور سنّاٹے میں کسی دُور کے آبشار کی دبی صدائے سوز و
ساز اُداسی کا عالم پیدا کر رہی تھی کہ اچانک میرے کانوں میں
ایک آواز پڑی۔ آواز نہیں بلکہ درد اور سوز میں ڈوبی ہوئی فریاد۔
ایک پہاڑی گیت تھا جس کا مفہوم اُردو میں یوں ادا ہو سکے گا ؎

دُنیا کا ذرّہ ذرّہ مدہوش ہو گیا ہے
تاروں میں حُسنِ عالم روپوش ہو گیا ہے

یہ آواز کیا تھی کوئل کی کوک یا بلبل کا نالۂ فراق تھا۔ لیکن
اس ویرانے میں جس کی خامشی میرے لئے سوہانِ رُوح ہو رہی تھی
یہ غم انگیز صدائیں پیغامِ حیات سے کم نہ تھیں۔ آواز کہیں دُور سے
آ رہی تھی۔ میں کان لگا کر سننے لگا ؎

خاموش میکدے میں مے نوش سو گیا ہے
حتیٰ کہ سازِ فطرت خاموش ہو گیا ہے
میں خُون رو رہی ہوں خاموش سب جہاں ہے
یہ خامشی ہے پریتم! اس وقت تو کہاں ہے

معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فراق آشنا رُوح کسی کی جستجو میں نالۂ
شیون برپا کر رہی ہے۔ میرے کان آواز پر لگے ہوئے تھے۔ لیکن آواز
آنی اب بند ہو چکی تھی۔ مجھے کچھ اطمینان سا ہو چلا تھا کہ خیر میں اِس
بن میں اکیلا نہیں بلکہ کہیں آس پاس ایک اور متنفس بھی موجود ہے
جدھر سے یہ آواز آئی تھی میں اسی جانب ہو لیا۔ چاندنی جوبن پر تھی
اور کہیں کہیں کبک چاند و تیوتا کو دیکھ دیکھ کر رقص کر رہے تھے۔ یہ
پرندے جو دن کے وقت پاس نہ پھٹکنے دیتے اس وقت میں ان کے
قریب پہونچ جاتا اور انہیں خبر تک نہ ہوتی۔ میں اس وقت چھوٹی
پہاڑیوں کے دامن میں چل رہا تھا۔ ہوا چونکہ بند تھی اس لئے یہاں
سردی بھی کچھ زیادہ محسوس نہ ہوتی [illegible]

ہوگیا۔اور دو چٹانوں کے درمیان ایک گھاٹی سی نظر آئی۔کہیں کہیں پانی بھی چمکتا تھا۔حقیقت میں یہ کسی پہاڑی ندّی کا راہگذر تھا۔میں اسی کے کنارے کنارے چلنے لگا۔واقعی دُنیا کا ذرّہ ذرّہ خاموش ہوچکا تھا۔ شجر و حجر بھی نیند کی آغوش میں معلوم ہوتے تھے۔بھلا میں تو ایک راہ گم کردہ تھا۔لیکن اس ویرانے میں اس وقت یہ فریاد و فغاں کرنے والی کون تھی؟ چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ دیوانی ہی نہ ہو جس کا ذکر میں گوالے کے لڑکے سے کئی بار سُن چکا تھا۔اس خیال کے آتے ہی مجھے اس کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔آواز آنی تو دیر سے بند تھی لیکن اس کے سوز بھرے ترانے میرے کانوں میں ابھی تک گونج رہے تھے، ندّی پانڈی کا راستہ میدانوں کی طرف جارہا تھا۔اور مجھے کچھ ڈھارس سی بندھنے لگی تھی کہ شاید میں گاؤں کے قریب ہی کہیں جانکلوں۔

پہاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوچکا تھا۔اور نظر کے سامنے بڑے بڑے پتھر اور چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں۔اور کہیں دُور فاصلے پر یہ سلسلہ ختم ہوتا نظر آرہا تھا۔اچانک پھر وہی آواز سُنائی دی۔لیکن اب کہیں قریب سے وہی پہاڑی گیت جو اردو میں یوں ادا ہوسکیگا ؎

مندر سے آرہی ہیں ناقوس کی صدائیں
تقدیس کے ترانے گانے لگیں ہوائیں
مہکائے رنگ و بُو کی رنگین ہیں فضائیں کو
خوابیدہ حُسن کی پھر زندہ ہوئیں ادائیں کو
یہ دلنواز منظر فطرت کا ترجماں ہے
اے ترجمانِ الفت اس وقت تو کہاں ہے

میں ایک پتھر پر خاموش بیٹھا تھا۔گو آواز آنی بند ہوچکی تھی۔ اس وقت میرے دل میں بھی ایک درد تھا اور یہ درد سبب مجھے بھی ...ر رہا تھا۔کچھ فاصلے پر میدان نظر آرہے تھے لیکن میں ندّی ...ی راستہ چھوڑ کر اس آواز کے رُخ ہولیا۔یہاں بھی قدم قدم ...ب و فراز تھے۔اور پہاڑیوں کا سلسلہ پھر قریب ہوچلا تھا۔

ماہِ تاباں قلۂ کوہ پر اس طرح ضیاپاش تھا جیسے کسی حسینہ کے ماتھے پہ بندیا۔میں دس پانچ قدم چلکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔آخر ایک چٹان پر مجھے ایک عورت کھڑی نظر آئی۔آپ جانتے ہیں! میں توہّم پرست تو ہوں نہیں۔لیکن اس وقت میرا دل دھڑک رہا تھا۔اس ویرانے میں جس کا سکوت اور دہشت شاید ستاروں کے لئے اٹکھیلیاں کررہی تھی۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر جلدی جلدی قدم اُٹھاتا اس کی طرف چلا۔ لیکن پتھروں پر تیزی سے چلنا کوئی آسان کام نہ تھا۔غالباً اس نے بھی کچھ آہٹ سی پالی تھی۔کیونکہ اب وہ بھی اسی طرف جدھر سے میں اُسکی طرف جارہا تھا دونوں ہاتھ کمر پر رکھے دیکھ رہی تھی۔پھر اچانک اُس نے ایک ہاتھ اُٹھاکر اور چیخکر کہا "ساجن"! پھر میری طرف بھاگی۔جگہ جگہ نشیب و فراز تھے۔کبھی وہ سامنے آجاتی اور کبھی آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی۔میرا دل اب ذرا کچھ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔شاید میں بھی گاؤں والوں کی طرح اسے ایک غیر مادّی چیز ہی سمجھ رہا تھا۔وہ میرے نزدیک پہونچ گئی۔اور دونوں ہاتھ پھیلاکر بولی:-

"تم آگئے ساجن؟"

اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔سانس پھولا ہوا تھا۔پیشانی پر عرق کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔کوئی بیس بائیس کے قریب سن و سال تھا۔لانبے سُنہری بال تھے جو شانوں پر بکھرتے ہوئے کمر سے نیچے پہونچ رہے تھے۔غزال کی طرح موٹی موٹی دنبالہ دار آنکھیں تھیں۔اُبھرا ہوا سینہ پھٹے ہوئے کرتے کے اندر سے جوانی کے جذبات کا ترجمان تھا۔ہلکی سانولی رنگت تھی اور خد و خال کی دلکشی اس فرسودہ سامانی میں بھی ایک شانِ دلرُبائی پیدا کررہی تھی۔یہ پیکر خاکی جس انداز سے میری طرف دیکھ رہا تھا قلم اس کیفیت کو بیان نہیں کرسکتا۔چہرے پر مایوسی برس رہی تھی اور خوبصورت سیاہ آنکھیں جن کی مستی شاید کسی وقت چشمِ آہو کو بھی شرمندہ کرتی ہو۔اُسی کی آنکھوں کی طرح میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے سپیرے کی بین نے مسحور بنا رکھا ہو۔

وہ کچھ دیر یونہی دیکھتی رہی پھر ایک آہ بھر کر بولی :-

"نہیں ! نہیں ! مجھے دھوکا ہوا !"

پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی :-

"تم میرے ساجن کا سندیسہ لائے ہو گے ؟"

میں نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔

"نہیں !" اس نے تعجب سے کہا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگی "کون ہو تم ؟"

پھر ایک قہقہہ لگا کر "شاید تمہاری گائے کھو گئی ہوگی۔ اُسے ہی تلاش کر رہے ہو نا ؟"

"نہیں !"

"تو تم ہو کون ؟"

"میں راستہ بھول گیا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"راستہ بھول گئے، کیسے ؟"

گاؤں والے تو اسے دیوانی سمجھتے تھے۔ لیکن باتوں سے تو وہ ہرگز دیوانی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اُس نے پھر پوچھا۔

"کیسے راستہ بھول گئے تم ؟"

"میں شکار کے لئے نکلا تھا" میں نے جواب دیا۔ "لیکن اندھیرا ہو جانے کے باعث راہ بھول گیا"

"تم گاؤں سے آئے ہو ؟"

"ہاں !" میں نے کہا "کتنی دور ہوگا یہاں سے ؟"

"گاؤں تو کچھ دور نہیں" وہ بولی "لیکن میرے ساجن مجھ سے بہت دُور ہیں"

اس کے بال ہوا کے ساتھ رقص کر رہے تھے۔ چاند نے بادل کی سیاہ نقاب چہرے پر ڈال لی تھی اور اس اداس اداس فضا میں یہ جوان عورت واقعی کسی اور ہی دنیا کی چیز معلوم ہوتی تھی کہیں پاس کی چٹانوں سے ایک لگڑ بگڑ کی کرخت سی آواز سنائی دی۔ میں بندوق سنبھال کر تیار ہو گیا کہ نکلے تو ماروں۔

وہ ہاتھ اٹھا کر بولی "مت مار یو اسے، جانے میرے ساجن کا سندیسہ ہی لایا ہو"

میں نے بندوق پھر بغل میں دبالی۔

"تم نے تو نہیں کہیں دیکھا - ؟"

"کسے ؟" میں نے پوچھا۔

"میرے ساجن کو !"

"نہیں !" میں نے کہا "کہاں ہے تمہارا ساجن ؟"

"دل کے پاس، آنکھوں سے دُور !" اُس نے جواب دیا۔

"تم اس وقت ویرانے میں کیوں گھوم رہی تھیں ؟" میں نے پوچھا

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا "ساجن کو ڈھونڈ تی تھی۔ آنے کو جو کہہ گئے تھے۔ کل بھی مجھ سے کہہ رہے تھے چھپا ئیں تو آ کر تم کہاں ہو"

سردی سے ہاتھ شل ہو رہے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھ جیب میں ڈال لئے۔ وہ بولی "تمہیں جاڑا لگ رہا ہے ؟"

"ہاں"

"تو آؤ" وہ بولی "میرے گھر چل کر بیٹھو"

"چلو !"

وہ آگے آگے ہولی۔ میں پیچھے پیچھے چلا۔ لیکن وہ اس تیزی سے چلتی کہ میں لانبے لانبے ڈگ بھرنے کے باوجود پیچھے ہی رہ جاتا کچھ دیر یوں ہی چلنے کے بعد وہ ایک اونچی سی چٹان کے پاس رکی چٹان کے پاس ہی ایک معمولی سی کوٹھڑی تھی۔ گھاس پھوس کی چھت تھی۔ وہ ہنس کر کہنے لگی "یہ ہے میرا گھر۔ اندر چل بیٹھو۔ میں آگ جلا دوں تم آگ تاپیو میں ساجن کو تلاش کرنے جاؤنگی۔ ٹھیک ہے نا ؟"

یہ کہتے ہوئے وہ اندر گئی۔ میں بھی اندر جا کر دیوار سے لگ کھڑا ہو گیا۔ یہاں پاس ہی ایک گڑھے میں کچھ چنگاریاں سی تھیں۔ اس نے ان چنگاریوں پر سوکھی گھاس ڈالی اور پھونکیں لگی۔ پہلے دھواں نکلنے لگا پھر شعلے۔ آگ جلنے سے کمرے میں

روشنی ہوگئی۔ ایک کونے میں سوکھے پتوں کا انبار لگا تھا۔ اِدھر اُدھر کچھ لکڑیاں بھی رکھی تھیں۔ ایک دو مٹی کے گھڑے بھی تھے۔ اور ایک پھٹا پرانا کمبل تھا۔ یہ تھی اس کوٹھڑی کی کُل کائنات۔

"بیٹھ جاؤ" وہ بولی۔ "وہ کمبل رکھا ہے۔ جاڑا لگتا ہو تو اوڑھ لو۔"

میں آگ کے پاس بیٹھ گیا۔

"بیٹھ جاؤ نا تم بھی!" میں نے کہا۔

"نہیں!" وہ بولی۔ "میں تو جاؤنگی۔"

"کہاں جاؤگی؟" میں نے پوچھا۔

"ساجن کو ڈھونڈنے۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ جو آنے کو کہہ گئے تھے۔"

"تو پھر میں اکیلا کیا کروں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے گاؤں کا راستہ بتا دو۔"

"تم ابھی جاؤگے؟"

"تو اور کیا!" میں نے کہا۔ "ہاں! یہ تو کہو تمہارے ساجن گئے کہاں!"

"تمہیں معلوم نہیں۔"

"نہیں!"

تعجب سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"تم گاؤں میں نہیں رہتے؟"

"نہیں!"

"تو تم میری بات سنوگے؟" اُس نے میرے پاس ہی بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! کیوں نہیں۔"

"تم مجھے دیوانی تو نہیں کہوگے؟"

یہ کہکر وہ اُٹھکر کھڑی ہوگئی اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھکر اور میری طرف جُھک کر بولی۔ "کیوں جی؟ جو ساجن کو ڈھونڈے وہ دیوانہ ہوتا ہے؟"

"کون کہتا ہے؟" میں نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ نا!"

وہ پھر بیٹھ گئی۔

"پانچ دیوالیاں کتنا عرصہ ہوتا ہے؟" اُسنے پوچھا۔

"پانچ سال!"

"ٹھیک!" وہ سر ہلاکر بولی۔ "پورے پانچ سال۔ میں تو ساجن کے جانے کی ایک ایک گھڑی گنتی رہتی ہوں۔"

"کیا یہ سچ ہے؟" میں نے کہا۔

"میں بھی گوالے کی بیٹی ہوں۔" وہ کہنے لگی۔ "وہ بھی گوالا ہی تھا۔ ہم دونوں یہاں اپنی گائیں بھینسیں چرنے کو لایا کرتے تھے۔ انہیں بہت گیت یاد تھے۔ ہم دونوں مل کر گایا کرتے۔ بڑے مزے سے۔ ڈھور چگتے چرتے۔ ہم گیت گاتے درختوں پر چڑھ کر پھل اتارتے۔ دونوں مل کر کھاتے۔ پھل کھاتے اور گیت گاتے۔"

میں آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ وہ زور سے میرے زانوں پر ہاتھ رکھکر بولی۔ "سُن رہے ہو؟"

"ارے سُن تو رہا ہوں!"

"اس کوٹھڑی میں پہلے کوئی بیراگی رہا کرتا تھا۔ لیکن وہ ہمارا بیاہ ہونے سے پہلے ہی نہیں چلا گیا۔ جب پانی پڑتا تو ہم یہاں آ بیٹھتے۔ ڈھور چرتے چگتے۔ ہم گیت گاتے۔ بڑے مزے سے۔ پھر ہمارا بیاہ ہوگیا۔ ہم گاؤں میں رہنے لگے۔ ہمارے پاس بہت سے ڈھور ہوگئے۔ ابھی میرے ہاتھوں کی مہندی میلی بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک روز میں چولھے کے پاس بیٹھی روٹی پکا رہی تھی۔ ساجن پاس بیٹھے کھا رہے تھے، ساجن جو تھے۔ اتنے میں گاؤں کا پٹیل تھانے کے دو سپاہی ساتھ لئے آگیا۔ میں نے گھونگٹ نکال لیا۔ ساجن بولے۔ "آئیے مہاراج بھوجن کیجئے۔"

لیکن پٹیل ڈانٹ کر بولا۔ "چل بے! سرکار نے بلایا ہے۔"

"مجھے!" ساجن نے تعجب سے کہا۔ "کیا جرم کیا ہے میں نے؟"

"جُرم وُرم کی ہم نہیں جانتے!" پٹیل نے اکڑ کر کہا۔ "تیرا نام

فوج میں لکھا گیا ہے ۔"

یہ سنکر میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ گاؤں میں کئی روز سے پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ گھبرو جوان زبردستی بھرتی کئے جاتے تھے۔ ساجن بولے "نا مہاراج! میں تو نوکری نہ کرونگا۔"

"نوکری تو تیرا باپ بھی کرے گا" پٹیل نے غصّے سے کہا۔

"کوئی زبردستی تھوڑی ہی ہے" پاس سے میں نے ہولے سے کہا۔

"چپ رہ چھوکری" پٹیل نے جھڑک کر کہا۔

پھر ایک سپاہی بولا "سن بے! تنخواہ بھی ملے گی اور انعام بھی۔"

"مجھے تنخواہ ونخواہ نہیں چاہیئے" ساجن نے بھی ذرا غصّے سے کہا۔

یہ سنتے ہی ساتھ والے نے پاؤں سے ساجن کے ٹھوکر مار کر کہا "پھر بھر سے کھڑے تری بکواس سن رہے ہیں۔ چل ورنہ دوسرا انتظام کرتا ہوں۔"

ہم غریبوں کی کچھ پیش نہ گئی اور وہ ساجن کو پکڑ لے گئے۔ میں بھی روتی ہوئی ساتھ ہو لی۔ کچھ دور جا کر ساجن نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور کہا "جمنا! چنتا مت کیجیو۔ میں جلدی آجاونگا۔"

"آ ہی جائیں گے۔ کہہ جو گئے تھے۔ ساجن آئینگے تو میں اپنا لال جوڑا پہنوں گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں! ہاں!" میں نے کہا "کیوں نہیں آئیں گے۔"

"نہیں!" وہ میری طرف رازداری کے انداز سے دیکھکر کہنے لگی "وہ تو آچکے۔ مجھ سے چھپے رہتے ہیں کہیں۔ کل میں یہاں لیٹی ہوئی تھی۔ ساجن دروازے میں آکھڑے ہوئے۔ میں انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ لیکن وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ پھر مجھے پکار کر کہا۔ جمنا! ڈھونڈھ لو مجھے! لو میں اب جاتی ہوں، انہیں ابھی ڈھونڈھ کر لاتی ہوں۔ لیکن اب میں ان سے بولنے کی نہیں۔ بیٹھے تو روٹھ جاؤں گی میں بھی۔ چھپے جو ہیں مجھ سے! ٹھیک ہے نا!"

اتنا کہہ کر وہ اٹھی اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

جمنا کے جاتے ہی کٹیا بھیانک بھیانک سی نظر آنے لگی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی باہر نکل آیا۔ عارضی ماہتاب پھیکا پڑ چکا تھا۔ محفلِ انجم سرد پڑ چکی تھی۔ آسمان پر بادلوں نے خیمے ڈیرے لگا رکھے تھے اور کہسار کی فضا پر کہر کی ہلکی سی شبنمی تنی ہوئی تھی۔ گھڑی تو میرے پاس نہیں تھی جو وقت معلوم ہو سکتا لیکن قیاساً تو پھٹنے والی معلوم ہوتی تھی۔ میں ایک پتھر پر کھڑے ہو کر ادھر ادھر اس بدنصیب عورت کو دیکھنے لگا۔ ابھی میں دیکھ ہی رہا تھا کہ پھر ایک بار وہی سوز بھری آواز سنائی دی ؎

اب رات ہو چکی ہے گلریز کہسارو
دن رات سر پٹکتے رہتے ہو آبشارو
پیتم مرا کہاں ہے اے نور پاش تارو
تم سے اگر ملے تو یہ کہنا ماہ پارو
پیارے تمہاری جوگن اسوقت نیم جاں ہے
اور پوچھتی تھی ہم سے پیتم مرا کہاں ہے

میرا جی بھر آیا۔ جنگ تو ختم ہو چکی تھی اور جن کے نصیب میں گھر دیکھنے تھے وہ واپس آچکے تھے۔ اس وقت جمنا ایک بلند چٹان پر کھڑی تھی۔ اس کے بال سانپوں کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اور وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے بادل کے ایک ٹکڑے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف چلا لیکن میں ابھی چٹان کے دامن میں پہونچا ہی تھا کہ اس نے زور سے ایک قہقہہ مارا اور خوشی سے بولی :-

"وہ آگئے ساجن!"

یہ کہتے ہوئے وہ بھاگی اور چشم زدن میں ایک کھڈ میں جا گری۔

"ساجن": یہ اُس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔

دن چڑھے جب میں گاؤں میں پہونچا تو میرے نشان بتلائے پر گاؤں والے اس بدنصیب کی لاش اٹھالائے اور ندی کے پاس ہی رسوم کے ساتھ اسے جلا دیا۔ وہی جمنا جسے یہ لوگ دیوانی کہتے تھے اب یہ سادہ لوح اسے دیوی کہنے لگے۔

ایم۔ اسلم۔

شبِ گُل

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی پھول تھے نکہت فروش
ذرہ ذرہ تھا فضائے ناز کا جنت بدوش
میں تھا غرقِ حسن اور تو تھا شبابِ برق پوش
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں

تو میری آنکھوں میں تھا شہزادۂ نرگس نگاہ
وہ سنہری بال، وہ قد، وہ خرامِ حشر گاہ
پھول سے رخسار، آنکھیں نیلگوں ٹیڑھی کلاہ
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں

وہ طرب کا جشن وہ گلگوں لبوں کا اہتزاز
وہ معطر پنکھڑیوں کا جلوۂ بادہ نواز
وہ نویدِ رنگ و بو وہ لذتِ مینا گداز
ہائے کیونکر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں

وہ مرا کچھ پوچھنا وہ تیرا حسنِ التفات
وہ بکھر نا زلف کا وہ عشرتِ جامِ حیات
کیا کہوں کیا چیز تھی وہ رات اے شاخِ نبات
ہائے کیونکر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں

[illegible]ہے وہ قہقہوں کے موتیوں کی آب و تاب
[illegible]ندگی نغمہ لطافت، موجۂ جوئے شراب
زندگی، معصومیت، رنگینیاں جوشِ شباب
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں

وہ ترا تصویر بننا وہ غرورِ اشتعال
وہ محبت کی نگاہیں وہ سرور (قیل) وقال
وہ تبسم وہ ضیائے چشمکِ روحِ جمال
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں

ایک لحن رنگ در ریشم تھا سکوتِ اختلاط
حسن میں ڈوبی ہوئی تھی کارگاہِ انبساط
عشق تھا سرچشمۂ حسنِ طرب زار نشاط
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں

بھول سکتا ہوں کبھی وہ ساعتِ رنگیں عذار
وہ ترا دینا ادائے خاص سے جامِ بہار
وہ متاعِ جلوہ کی رعنائیاں وہ لالہ زار
ہائے کیونکر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں

وہ ترا کاوش پہ کرنا بارشِ لطفِ عظیم
وہ ترا ہنسنا ہنسانا وہ ترا ذوقِ سلیم
وہ نشاطِ رقص، وہ بربط وہ سیلابِ شمیم
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں

کاوش حیدرآبادی

"مسٹر کرٹھلے" کے دو باب۔

اُلّو

غالباً یور رائل ہائنس نے اُلّو دیکھا ہوگا۔ نہ دیکھا ہو تو سُنا تو ضرور ہوگا۔ اِس جانور کو مشرق و مغرب میں یکساں اہمیت حاصل ہے۔ اور اس کے بارے میں روایات مشہور رہیں۔ مغرب کی تمام روایات سے خود یور رائل ہائنس مجھ سے کہیں زیادہ واقف ہونگے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اُلّو کو مغرب میں عقلمند اور مبارک سمجھتے ہیں اور یہ ہوا جاتا ہے کیپلنگ کا کہنا کیونکہ بدقسمتی سے اُلّو کو مشرق میں نہ صرف بیوقوف بلکہ منحوس بھی خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ اُلّو کی بیوقوفی اس قدر عام ہے کہ ہماری معاشرت اور زبان میں اس جانور کے نام نے عجیب و غریب طرح دخل پایا ہے۔

ذرا خیال فرمایئے گا کہ ہماری زبان میں لفظ "اُلّو" ایک شائستہ گالی ہے۔ نوکر کو آقا جھڑکتا ہے تو "اُلّو" کہتا ہے۔ اس سلسلے میں مرکّب الفاظ بنائے گئے ہیں۔ زیادہ غصّہ کی حالت میں لوگ دوسرے کو "اُلّو کا پٹھا" یا "اُلّو کا بچّہ" کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ "اُلّو کا لڑکا" ہرگز نہیں کہیں گے ورنہ زبان کے لحاظ سے یہ حد درجہ غیر فصیح جملہ ہوگا۔ ان جملہ اُمورِ زبان و روایات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اب میرا قصّہ سُنیئے۔

یہ تو سب کچھ ہے لیکن یور ہائنس یقین فرمایں کہ مجھکو قطعی نہیں معلوم تھا کہ یہ مُبارک یا نامُبارک جانور یا اُس کا نام کسی طرح میری زندگی کے واقعات پر اس طرح اثر انداز ہوگا۔

اب مَیں درخواست کرونگا کہ میری گذشتہ کہانی کو قطعی نظر انداز فرماکر یہ سمجھیں کہ وہ زمانہ طالبعلمی تھا اور وہ باتیں کہیں سے کہیں پہونچیں۔ وہ زمانہ ختم ہوا اور مَیں دُنیا کے جھگڑوں اور روزی کی فکروں میں پھنس گیا۔

برسرروزگار ہوتے ہی مجھکو یہ علم ہوا کہ خیر سے تعلیم ختم ہونے سے کچھ قبل ہی سے والدین میری شادی کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے تین جگہ میری شادی کی تجویز کی لیکن بدقسمتی سے اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں۔

والد صاحب قبلہ نے مجھے حکم دیا کہ اُن کے ایک دوست کے یہاں جاکر دہلی ٹھہر جاؤں۔ دراصل دہلی میں ایک جگہ میری شادی طے ہو رہی تھی اور اب یہ قرار پایا کہ میرے والد کے دوست میرے پہونچنے پر اُن حضرت کی دعوت کریں گے جب مجھے اپنی فرزندی میں لینے کے لئے پھُسلائے جا رہے تھے اور قبل رام ہونے کے مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ اُن کی سمجھ تھی ورنہ میری تصویریں تو وہ دیکھ ہی چُکے تھے۔

دن بھر کا راستہ طے کر کے مجھے شام کو دہلی پہونچنا تھا۔ میں نے انٹر کلاس کا ٹکٹ لیا۔ مَیں چونکہ بر دکھاوے کو جا رہا تھا لہذا میں نے اپنے ایک دوست کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ انکے علاوہ ایک اور ہم عمر ہمسفر تھے۔ بہت جلد ہم تینوں گھُل مل کر باتیں کرنے لگے۔

دوسرے مُسافروں میں ایک صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر تھے۔ اُن کی پچاس پچپن برس کی عمر ہوگی۔ ایسے رئیس اور آرام طلب کہ ایک پوری بنچ پر قبضہ کیے بیٹھے تھے اور ساتھ میں وہ رئیسانہ لوازمہ کہ دیکھا کیجیے۔ ریل کا تو سفر اور ساتھ میں حقّہ۔ پاندان۔ کوئلہ۔ برف۔ قرآن شریف۔ ناشتہ دان۔ لوٹا گلاس۔ کٹوردان۔ بوتلیں وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ معلوم ہو کہ گھر پر بیٹھے ہیں۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن بدقسمتی سے یہ حضرت بلا مبالغہ ہر اسٹیشن پر اپنے ایک نوکر کو پکارتے تھے جو تھرڈ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ پکارتے وہ اس طرح تھے کہ یہی سمجھ میں نہ آسکا کہ ان مدتمیز نوکر کا نام "اُلّو" ہے یا "حسینا"۔ وہ پکارتے تھے "ابے اُز بینا ..... ابے اُلّو" اور وہ بھی اس دلکش لہجے میں کہ سُننے والوں پر رقت طاری

ہوجاتے۔ اس کو بھی برداشت کرلیا پر مصیبت اور تھی۔ وہ یہ کہ یہ حضرتِ حسینا اس لئے طلب ہوتے تھے کہ سارا درجہ زیروزبر کردیں۔ مثلاً حقہ کی چلم "اُس طرف" لے جاکر پھونکیں یا دُرست کریں تاکہ اس کی خاک بجائے اُن کے بچھونے کے ہماری آنکھوں میں آئے۔ خیر سے اگالدان بھی ساتھ ہی تھا لہذا اُس کا پانی حضرتِ حسینا ہماری سائڈ کی کھڑکی میں پھینکیں۔ حسینا صاحب کھڑے ہوں تو ہمارے سروں پر۔ اور آمدورفت میں ہماری ہی ناک کی پُھنگیوں میں اپنے کپڑے رگڑیں۔ ایک منٹ میں دس مرتبہ ہم اُن کی آمدورفت کے لئے ٹانگیں ہٹائیں یا اخبار سمیٹیں۔ جوتے ہیں کہ حسینا کچلے دے رہے ہیں۔ کہیں بستر پھاندے جا رہے ہیں کہیں ہماری بنچ پر ان کو پیر رکھ کر اوپر کے مچان سے کوئی چیز اُتارنے کی ضرورت ہو۔ بزرگ آدمی ویسے ٹھہرے کیا کہیئے۔ مگر بدعتیں بھی محدود ہوں۔ نتیجہ یہ کہ اور تو بس نہ تھا۔ اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ پہلے تو میں نے یہ عرض کیا کہ آئندہ جو ضرورت ہو تو حسینا کے بجائے یہ خادم حاضر ہے۔ اس پر التفات نہ ہوئی بلکہ بولے کہ :-

"جناب آپ منع نہیں کرسکتے"

میں نے کہا "قبلہ جہنمی ہو جو منع کرے" مگر وہ منہ پھلا کر خفا ہو کر بیٹھ رہے۔ خیر

دوسرا اسٹیشن جو آیا تو اُن کو تو ضرورت نہ تھی لیکن مجھے کچھ اور سوجھی لہذا میں نے کھڑکی سے گردن نکال کر چیخنا شروع کیا "ابے اُلو..

..ابے الو" خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر۔ یور رائل ہائنس کیا آپ یقین فرمائیں گے کہ سچ مچ حسینا دوڑا چلا آتا ہے!!۔ اُدھر میرا اور میرے دوست کا اور دوسرے مسافروں کا یہ حال کہ مارے ہنسی کے لوٹے جا رہے ہیں اور اُدھر اُن کا حال؟ نہ پوچھئے۔ مارے غصے کے لرز گئے اور ڈانٹ کر کہتے ہیں حسینا سے "ابے الو، تجھے کس نے بلایا ہے؟" مرے پہ سو دُرّے وہ مضمون ہمارا۔ حال یہ کہ معلوم ہو کہ ہنستے ہنستے شاید مرجائیں گے۔

بمشکل ہنسی ختم ہوئی۔ لاکھ جتن کئے۔ اخبار پڑھا۔ دل بہلایا تب جا کر ہنسی کم ہوئی۔ اب میرے دوست نے مجھکو اور میں نے اُن کو "اُلو" کے لفظ سے مخاطب کرنا شروع کیا۔ میرے دوست نے مجھ سے کہا "تم بھی عجیب اُلو ہو" میرے منہ سے برجستہ نکلا "ہم بھی کیا لاجواب اُلو ہیں"

اس مصرعہ کو سُن کر وہ حضرت چونک پڑے اور میرے اوپر برس پڑے۔ میں نے بہت کچھ معذرت کی۔ سمجھایا کہ قبلہ وکعبہ یہ میرے دوست ہیں میرا ان کا مذاق ہے۔ میرے علاوہ اس درجہ میں کوئی اور اُلو نہیں ہے مگر وہ نہ مانے بمشکل لوگوں کی سفارش پر انہوں نے جان بخشی کی۔ مگر اب ادھر میری طبیعت حاضر اُدھر میرے دوست کی۔ شاعری ہونے لگی۔ مصرعہ پہ مصرعہ نازل ہونے لگا۔ چند یاد ہیں :-

ہم بھی کیا لاجواب اُلو ہیں　　آپ عالی جناب اُلو ہیں
جسکو لینا ہو لے علیگڈھ میں　　ان دنوں دستیاب اُلو ہیں

شباب اُلو ہیں۔ کباب اُلو ہیں۔ شراب اُلو ہیں۔ غرض کوئی لفظ نہ چھوڑا جسکو گھسیٹ نہ مارا ہو۔ ان سب کچھ باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی اسٹیشن تک وہ اُلو حسینا نہ آیا۔ پکارنے ہی کی ہمت نہ پڑی۔ پھر خود ہی آیا جو سہی تو حضرت پوچھتے ہیں کہ "ابے اُلو کیا مر گیا تھا"

اب خود سوچئے کہ میں نہ ہنسوں لیکن دوسرے لوگ ہنسیں تو میں کیا منہ پکڑلوں۔ خیر، حسینا صاحب آئے اور ہدایت ہوئی کہ بکس میں سے تولیہ نکالو۔ وہ نکالی جو سہی تو ساتھ ہی اُس کے ایک شیشی پھٹ سے نیچے گری اور ٹوٹ گئی۔ اس میں سے کچھ دوا بہہ نکلی "ابے اُلو یہ کیا؟" معلوم ہوا کہ خضاب کی شیشی تھی جو ٹوٹ گئی۔ فوراً فرمایا کہ "ابے دوسری شیشی کیا ہوئی؟" اُس نے جواب دیا کہ "چھاؤنی گیا تھا نہیں ملی"

چیخ کر بولے "نہیں ملی؟"

اس نے کہا "جی نہیں ملی"

ڈانٹ کر بولے "تجھے معلوم تھا کہ پرسوں دعوت ہوگی۔۔۔۔اب؟۔۔۔" یہ کہکر ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ سوچنے لگے۔

خود سوچئے کہ خضاب کی شیشی ایک تو ٹوٹ گئی دوسری لاپتہ۔ یہاں شاعری کا یہ عالم کہ لعنت ختم ہوگئی۔ سب قافیہ کباب۔ شراب۔ ختم ہوگئے پر خضاب کا خیال تک نہ آیا۔ سامنے ایک عدد ڈاڑھی بے خضاب! شیشی پھوٹی ہوئی! طبیعت یوں بھی حاضر کہ کس مقصد کیلئے جارہے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ شعر موزوں ہوگیا۔ اور ایسا کہ ناممکن کہ اپنے دوست کو نہ سنائیں۔

میں نے کہا "یار غضب کا شعر ہوگیا" ؎ چھاؤنی میں نہیں ملی شیشی

میں نے مصرعہ دوبارہ اٹھایا ؎

عرض کیا ہے ؎ چھاؤنی میں نہیں ملی شیشی

جب سب متوجہ ہوگئے تو میں نے دوسرا مصرعہ کہدیا۔

"ان دنوں بے خضاب۔۔۔۔۔"

یور رائل ہائنس میں عرض نہیں کرسکتا کہ کیا ہوا۔ بس قتل نہیں ہوا۔ ہاتھا پائی بھی نہیں ہوئی اور نہ کوئی مسافر ہنسی کے سبب مرا۔ سب بال بال بچے۔

اس کے بعد خیریت ہی ہوئی جو دہلی کا اسٹیشن آگیا۔ میں نے ہاتھ جوڑے۔ پیر پکڑے اور معافی مانگی مگر وہ حضرت نہ مانے اور یہی کہا کہ "میاں مجھے تم خود معاف کرو"

میں مع اپنے دوست کے اپنے والد صاحب قبلہ کے دوست کے مکان پر پہونچا۔ یہ شخص سرکاری ملازم نہایت ہی سنجھی ہوئی طبیعت کے اور متین اور باوقار شخص ہے۔ میرے بارے میں نہایت ہی اچھی رائے رکھتے تھے۔

تیسرے دن دعوت ہوئی۔ میں نے اپنے کو کپڑوں وغیرہ سے اس طرح درست کیا جیسا کہ چاہیئے۔ ڈاڑھی بنانے میں حد درجہ مبالغہ کیا۔ بال سنوارنے میں۔ اسی طرح بہترین کپڑے اور بہترین وضع سے پہنے۔ اپنے ہونے والے خسر سے ملاقات کرنا تھی!۔

دعوت سے کچھ قبل مہمان آئے۔ معلوم ہوا کہ صرف چار حضرات اور آئیں گے۔ تین حضرات آگئے اور اب مجھے چوتھے کا بجلیی انتظار تھا جن کی صاحبزادی کا شوق مجھکو یہاں تک لایا تھا۔ اور یور رائل ہائنس آپ یقین کیجئے گا کہ یہ حضرت آئے۔ کاش وہ تنہا آتے۔ آہ! مگر ایسی میری تقدیر کہاں۔ ساتھ میں "وہ" بھی تھا۔ ان کو دیکھتے ہی میرا عجیب حال ہوگیا۔ عمر میں شاید ایسی عبرتناک حالت کسی کی نہ ہوگی۔ مجھے ان کا گمان تک نہ تھا! اور انکے آنے سے میری حالت ابتر ہوگئی۔ میں اس وقت موت مانگتا تھا پر ہنسی لتی تھی۔ ہنسی روکنے کے لئے میں نے دانتوں سے زبان کاٹ لی اور میں یقین دلاتا ہوں کہ شاید کام چل جاتا۔ اگر ساتھ میں حسینانہ ہوتا یا میرے دوست نہ ہوتے۔ نتیجہ حد درجہ غمناک نکلا۔ جی ہاں غمناک۔ وہ یہ کہ میرے والد صاحب قبلہ کے دوست ان کی پیشوائی کے لئے بڑھکر مصافحہ کرکے جو ان کا تعارف مجھ سے کرانے بڑھے ہیں تو میں حتی الوسع ہنسی کو روکتا ہوا یہ کہکر بھاگا کہ "ابھی حاضر ہوا" لاکھ چاہا کہ کمرے میں گھس جانے کے بعد ہنسی کی آواز نکلے۔ کمرہ کمبخت دور بھی نہ تھا۔ مگر تقدیر۔

کمرے کے بالکل اندر گھس گیا اور سچ مچ اپنے کلّے پر گھونسے مارے، اتنے زور سے کہ جبڑہ ہل گیا تب کہیں جاکر اس قابل ہوا کہ خاموشی نصیب ہوئی۔
دوڑ کر غسل خانہ میں پہونچا۔ منہ دھویا۔ کھنکارا۔ اللہ سے دعا مانگی کہ الٰہی میری مشکل حل کرئے۔ اور یٰسین شریف دل میں پڑھتا ہوا باہر نکلا۔ کیونکہ قرآن پاک پڑھنے میں مجھے دعویٰ ہے کہ ہنسی روک سکتا ہوں۔ مگر یور رائل ہائنس یقین فرمائیں کہ میرا یہ دعویٰ ہرگز ناکام نہ ہوتا اگر کم سے کم وہاں حسینا نہ ہوتا۔ میں نے کمرے سے باہر قدم رکھا ہی ہے کہ یٰسین شریف بھول گیا اور پھر لوٹنا پڑا۔
لوٹتے ہی میں نے دیکھا وہ حضرت اُٹھکر چلنے لگے۔ ان کو لاکھ روکا۔ لاکھ پکڑا۔ مگر وہ نہ مانے اور چلے گئے۔
مَیں عرض نہیں کرسکتا میرا کیا حال ہوا۔ تن بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ موت کی سی ٹھنڈک بیٹھ گئی۔ سناٹے میں آگیا۔ اور اب ہنسی بھی جاتی رہی۔ مَیں کرسی پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ اتنے میں میرے میزبان صاحب نے آواز دی۔
مَیں کیا کرتا۔ پہونچا۔ سب چُپ تھے۔ میں بھی جاکر خاموش بیٹھ گیا اور طبیعت کی ناسازی کا عذر کیا، اختلاج قلب کا عذر کیا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔
مجھے اپنے دوست سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت یہ کہکے گئے ہیں کہ آدھ گھنٹہ بعد آتا ہوں اور محض اسی اجازت کے لئے اترا تھا۔ اور یہ سُنتے ہی میرا دل سچ مچ پھر دھڑکنے لگا اور دل ہی دل میں مَیں نے دعا مانگی کہ الٰہی اگر وہ آئیں تو کم از کم ایسا گنہگار تو میں نہیں ہوں کہ میری اتنی دعا قبول نہ ہوگی کہ حسینا اُن کے ساتھ نہ آوے۔
لیکن نہیں، وہ نہیں آئے۔ ان کا انتظار کیا گیا۔ پھر آدمی گھر پر بھیجا گیا تو انہوں نے کہلا دیا کہ دفعتاً انکی طبیعت ناساز ہوگئی ہے اور وہ معذرت چاہتے ہیں۔ بیچارہ مجبور ہیں۔ سب کے سب خاموش ہوگئے۔ سمجھ گئے۔ دعوت انتہائی خاموشی سے ہوئی —— اور مجھ سے کچھ نہ کھایا گیا۔
دوسرے روز صبح کی گاڑی سے مَیں مع اپنے دوست کے بھاگ آیا۔ میرے میزبان خاموش رہے اور انہوں نے نہ تو ایک لفظ کہا اور نہ مجھے روکا۔
گھر پر والد صاحب نے جو پوچھا تو میں نے کہدیا کہ میں نے تو ایسا سُنا ہے کہ انہوں نے لڑکی کی دوسری جگہ کہیں رئیسوں میں منگنی بھی کردی۔
والد صاحب نے فوراً کہا "اوہو۔ میں سمجھ گیا۔" پھر مجھے الزام دیا کہ میں ٹالتا رہا اور دیر کردی۔ اور پھر میری شومیِ تقدیر پر اظہار تاسف کیا۔
لیکن تیسرے دن میرے والد صاحب کے دوست کا خط پہونچا۔ اس میں کیا لکھا تھا۔ یہ مت پوچھئے۔ اس لئے کہ صحیح میں بتاؤنگا نہیں اور جھوٹ بولنے سے فائدہ کیا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ والد صاحب نے یہ کہدیا کہ "تم انتہا سے زیادہ نالائق ہو اور اب ہم تمہارے معاملے میں کبھی نہ پڑیں گے"۔ والدہ صاحبہ خوب روئیں۔ میں گھر سے فوراً ہی نوکری پر بھاگا۔
یور رائل ہائنس، خود غور فرمائیں کہ بھلا اس میں میری کیا خطا تھی۔ یہ تو تقدیر کا بدا تھا۔

کلّو

یور رائل ہائنس نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح میری شادی کی تجویز نذر اُلّو ہوگئی لیکن میری دوسری شادی نذرِ کلّو ہوگئی۔ یہ کلّو کون تھے؟ میرے دوست جو دہلی کی اُلّو والی مہم میں میرے شریک تھے۔ ان کا اصلی نام کلّو نہیں تھا بلکہ کچھ اور تھا لیکن عرفیت ان کی کلّو تھی۔ یہ کالے تھے اور اسی مناسبت سے اُن کے والدین نے ان کا نام کلّو رکھدیا۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں کالے اور گورے کے تعصب سے بالا ہوں اور میرے سب گہرے دوست بھی کلو تھے لیکن بخدا مجھکو یہ خبر نہ تھی کہ ع، کالے کی دوستی کا نتیجہ خراب ہے
اور ان کے چہرے کی کالونچ کسی طرح میرے نجی معاملات میں بھی مخل ہو سکے گی۔

دہلی والے واقعہ کے بعد والد صاحب قبلہ بہت دن تک مجھ سے خفا رہے۔ لیکن تا کے۔ ایک دن خط آیا جس میں لکھا تھا کہ ایک خان بہادر کی لڑکی سے شادی طے ہو رہی ہے اور نصیحت فرمائی تھی کہ آئندہ کسی قسم کی حرکت نہ کروں۔ اس شادی کی خط و کتابت طے ہو کر کوئی ان کا آدمی آیا۔ وہ مسخرہ مجھے چپکے اور بے چپکے سے دونوں طرح دیکھ گیا۔ پھر بھی خان بہادر صاحب کو صبر نہ آیا اور انہوں نے اب خود مجھے طلب فرمایا۔ طے یہ ہوا کہ انہی کے یہاں جا کر ٹھہروں۔ میں اس سے بیحد گھبرایا اور یہ سوچا کہ یہ امتحان تو اس سے بھی مشکل ہے۔ بھلا کیسے بھگتونگا۔ یہ تو طے کر لیا کہ ہنسونگا قطعی نہیں۔

اسٹیشن پر ہمیں لینے کے لئے موٹر آیا۔ ایک نہایت ہی ٹھاٹھ کے بنگلے میں جا کر ٹھہرے۔ خان بہادر صاحب بڑے خلیق تھے آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین بھی تھے۔ زمیندار بھی تھے تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے۔ دوسری بیوی کی سب سے بڑی لڑکی سے شادی ٹھہر رہی تھی ہم دونوں بڑے آرام دہ کمروں میں ٹھہرائے گئے۔ رات کو بڑا تکلف کا کھانا مارا۔ اور کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں دوستوں نے چند امور پر غور کیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم خود بھی لڑکی کو دیکھ لیں! کیوں نہ کوشش کریں۔ دوئم یہ کہ وہ مجھے ضرور دیکھے گی۔ بلکہ شاید بلایا ہی اسی لئے گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تب کیا کریں۔ خان بہادر صاحب کے کئی بچے مختلف سائز کے تھے۔ ایک ان میں سے کوئی چار برس کا بڑا باتون اور پیارا بچہ۔ دوسرے دن بعد ناشتے کے خیال آیا کہ کیوں نہ اس سے باتیں پوچھیں۔ لہذا میرے دوست نے اس سے پوچھا کہ "بھئی تمہاری آپا گوری ہیں کہ کالی؟"

وہ ہنسکر بولا "گوری"

میرے دوست نے اپنے چہرے کی طرف انگلی رکھکر کہا "ایسی" (وہ خوب کالے تھے)

لڑکا ہنسکر اور ٹیڑھا ہو کر بولا "نہیں" زور سے سر ہلانے لگا "ہماری آپا گوری ہیں"

میرے دوست ہنسکر بولے "دیکھو۔ ان سے کہنا کہ ہم تمہیں دیکھنے آئے ہیں"

"ابے او کالے" میں نے گرج کر کہا "خبردار جو تو نے اس دفعہ گڑبڑ کی" اور یہ کہکر میں نے روکدیا۔

مگر انہوں نے بچے سے یاری گانٹھی علیحدہ لے گئے اور خوب باتیں ملائیں۔ مجھکو معلوم بھی نہیں اور ان حضرت نے پھر عجیب حرکت کی۔ ایک انگریزی اخبار پڑا تھا۔ اس کا ایک صفحہ لیکر عبارت میں الفاظ تلاش کئے۔ اور ان الفاظ کے نیچے سرخ نشان لگا دیا۔ یہ الفاظ اخبار کے ایک ہی صفحے پر تھے لیکن مختلف سطروں اور مختلف کالموں میں تھے جن الفاظ کے نیچے نشان لگایا تھا ان سب کو ملایا جائے تو حسب ذیل جملہ بنتا تھا۔

"میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اور یہ اخبار دے کر بچے سے کہا کہ اپنی آپا کو دے آؤ۔ پہلے باحتیاط یہ پوچھ لیا کہ کہاں بیٹھی ہیں اور اماں کہاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ اپنے کمرے میں علیحدہ بیٹھی ہیں۔ لڑکا پہلے جاکر دیکھ آیا۔ پھر اسکو اخبار دیدیا۔ وہ اخبار لئے چلا گیا۔ وہاں اندر جاکر اس نے اپنی بہن کو اخبار دکھایا۔ لڑکی تھی تیز اس نے لفظوں کو جو پڑھا تو جھٹ سے ایک جگہ اسی اخبار میں لکھا ہوا تھا "نہیں"۔ اس نے اس لفظ کو خط کشیدہ کر کے

بھیجدیا۔ اور جب یہ اخبار بچہ لئے واپس آیا اور میرے دوست نے دیکھا تو حضرت نے مُنہ پھاڑ کر مجھے بتایا۔ اور تجویز کی کہ اس کا پھر جواب دینا چاہیئے۔'

میں سخت گھبرایا اور میں نے کہا "میاں کالیا۔ یاد رکھو کہ تمہاری عاقبت بگاڑ دونگا اگر ذرا بھی تم اِس معاملے میں مُخل ہوئے۔ پھر خان بہادر اگلا ویسے ٹھہرا۔ یاد رکھنا ہزار مارے گا ایک نہ گنے گا اور پھر جو شکایت کی کہ سُسرال میں پٹوایا تو ایک نہ سُنونگا"

آپ خود غور فرمائیں کہ یہ شخص کس قدر بدتمیزی پر آمادہ تھا۔ یہ کہتا تھا کہ لڑکی کو دیکھ لینا سخت لازمی ہے۔ اور خط و کتابت ضرور کرنی چاہیئے۔ لیکن میں نہ مانا۔ اس لئے کہ لڑکی کے باپ اور بھائیوں کو دیکھکر میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ اگر ان سے کم و بیش بھی لڑکی ملی تو منظور ہے۔ لہذا مزید تفتیش بیکار تھی۔ بہرحال ان حضرت کو بمشکل روکا۔ خان بہادر صاحب نے تین شبانہ روز بڑی خاطر و مدارات کی۔ خوب سیر کروائی۔ اپنے دوست احباب سے خوب ملوایا۔ کئی جگہ چائے کیک کھلوائے۔ اور ہم وہاں سے خوش و خرّم واپس آئے اور ہمارے پیچھے پیچھے ہی خان بہادر صاحب کا ایک خط ہمارے بارے میں ایسا آیا کہ والد صاحب قبلہ کی باچھیں کھل گئیں کہ اوہو میں بھی کسی بیٹے کا باپ ہوں۔ بیحد خوش ہوئے۔ لیکن تقدیر کا بدا کچھ اور تھا۔ میں تو دو دن گھر ٹھہر کر چلا گیا اور اب میرے نام ایک گُمنام خط عجیب و غریب پہونچا۔ یہ خط والد صاحب نے جوں کا توں بند مجھے بھیجدیا۔ اب اُس کو جو کھولکر پڑھتا ہوں تو عجیب معمہ۔ کم و بیش حسب ذیل تھا۔

"جو کتاب آپ کے پاس تھی اُس کو دیکھئے۔

۱۰ ۳/۴ + ۲۰ ۲/۷ + ۸ ۹/۲ + ۴ ۵/۳ + ۱۰۰ ۳/۱۱ وغیرہ وغیرہ"

غرض اسی قسم کا ایک سوال سا لکھا تھا اور خط ختم۔ اور اس خط پر مُہر اس شہر کی جہاں خان بہادر صاحب رہتے تھے۔ اب واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ میرے دوست کے پاس ایک چھوڑ تین کتابیں ساتھ تھیں جو باہر ہی رکھی تھیں۔ اب میں سخت حیران کہ کیا کروں کیا نہ کروں! اور یہ معاملہ کیا ہے۔ اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا میں نے اپنے دوست کو تار دیکر بُلایا۔ وہ آئے تب اُن کو خط دکھایا۔ پوچھا کہ کون سی کتاب تھی۔ کہنے لگے کہ میری ایک کتاب وہاں رہ ضرور گئی ہے۔ انگریزی کا ناول۔ اُس کا نام بتایا۔ اب بتائیے کیا کریں۔ سوچے کہ لاؤ خان بہادر ہی کو لکھیں پھر طے ہوا کہ تار دیکر بمبئی سے منگالیں۔ چنانچہ یہی کیا۔

کتاب آئی تو بہت جلد معمہ حل ہوگیا۔ خیال اسی طرف جا چکا تھا۔ ۱۰ ۳/۴ کا یہ مطلب تھا کہ دسویں صفحے کی تیسری سطر کا چوتھا لفظ! اور ان تمام لفظوں کو جوڑ کر جو جملہ بنایا تو دیوتا کوچ کر گئے کیونکہ آپ یقین مانئے حسب ذیل عبارت سامنے تھی:۔

"جس لڑکی سے تمہاری شادی طے ہو رہی ہے وہ لڑکی کسی طرح بھی تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے اُمید ہے کہ تم ایک شریف اور غیور نوجوان ہو اور اُسے اور مجھے دونوں کو عمر بھر کے لئے احسانمند کروگے"

میں کیا عرض کروں کہ اس عبارت کو پڑھکر میں کیسا کُھل کر رہ گیا۔ حالانکہ میں نے لڑکی کو نہیں دیکھا تھا مگر مجھے یہ لڑکی بیحد پسند تھی۔ لیکن میں نے اور میرے دوست نے یہی طے کیا کہ ہو نہ ہو یہ خود اُس نے لکھا ہے لہذا قطعی شادی نہ کرنا چاہیئے۔ یہ تو طے ہوگیا لیکن سوال یہ تھا کہ والد صاحب کو کون روکے گا۔ اور اُدھر خان بہادر کو کون روکے گا۔ اس لئے کہ وہاں تو معاملات رفتار پر تھے۔ مجھے والد صاحب قبلہ کے مزاج کی کمزوری کا علم تھا چنانچہ ایک خط نے اُن کو بھڑکا دیا۔ میں نے لکھدیا کہ میں نے سُنا ہے کہ لڑکی ذرا "ویسی" ہے۔ اور میں ہرگز

نہ کروں گا۔ اب "دیسی" کی جو تشریح پوچھی تو نہ تو میں نے یہ بتایا کہ کیسی اور نہ یہ بتایا کہ مجھ کو کیسے معلوم ہوا۔ جب بے حد دبایا گیا تو میں نے ایک صاحب سے بشرط رازداری زبانی کہدیا کہ وہ خط کتابت کرتی ہے اور میرے پاس اس کا ثبوت ہے اس سے زائد میں نہیں بتا سکتا۔ آگے والد صاحب کی مرضی ہو تو میں حاضر ہوں۔

والد صاحب یہ سنتے ہی چوک گئے۔ کہاں تو عورتیں لڑکی کا معائنہ کرنے جا رہی تھیں اور کہاں جملہ معاملات التوا میں پڑ گئے۔ مجھے نہیں معلوم والد صاحب اور خان بہادر صاحب میں کیا اور کیسی چھنی۔ یہ شادی ایسی ٹلی کہ سال بھر تک پھر کوئی گفت و شنید والد صاحب کی طرف سے نہیں ہوئی۔ لیکن مجھ کو یہ معلوم تھا کہ وہ فکر میں ضرور رہیں۔ مگر اسی دوران میں ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔

میں ایک کام سے بریلی جا رہا تھا۔ سکینڈ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ میں جو آکر بیٹھا تو ڈبے میں دو مسافروں کو موجود پایا۔ ایک جوان العمر شخص مع اپنی بیوی کے تھے۔ میں آکر خاموش بیٹھ گیا۔ بہت جلد میں نے دیکھا کہ اُن کی نوعمر بیگم صاحبہ نے شاید مجھ کو ضرورت سے زیادہ غور سے دیکھا۔ کئی بار دیکھا۔ میری دیکھنے کی ان کو ہمت نہ ہوئی۔ اس لئے کہ اوّل تو میری عادت بھی نہیں اور دوئم یہ کہ بدقسمتی سے وہ واقعی دیکھنے کی چیز نہیں۔ میں اخبار پڑھنے لگا اور میں نے دیکھا کہ اُن نوجوان خاتون نے اپنے شوہر محترم سے کچھ باتیں کرنی شروع کیں۔ میں حد درجہ بے چین سا ہوا کیونکہ مجھے شبہ ہوا کہ شاید یہ خاتون اس درجہ میں میری موجودگی کے خلاف ہیں اور گفتگو میرے بارے میں ہو رہی ہے! اور بدقسمتی سے یہ واقعہ بھی تھا۔ میں نے مجبوراً رُخ اپنا دوسری طرف کر لیا۔

لیکن بہت جلد ان حضرت نے میری طرف توجہ کی۔ مجھے سگرٹ پیش کیا۔ پھر ایک آدھ سوال اِدھر اُدھر کا دریافت کر کے کہنے لگے۔ "میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے!"

مجھے اس جملے سے ویسے ہی للّہی ہے۔ میں نے کہدیا کہ "بہت ممکن ہے دیکھا ہوگا۔" اس سلسلہ میں میری عادت ہے کہ قصداً میں مقامات کا نام لینے سے گریز کر کے اپنے مخاطب کو قدرے کوفت پیدا کرتا ہوں۔ خود ہی وہ خان بہادر صاحب کا نام لیکر بولے کہ "شاید مجھے وہاں دیکھا ہوگا۔" اب ان نوجوان خاتون کا یہ حال کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مسکراہٹ، شرارت، حجاب اور گھبراہٹ بیک وقت ایسے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اور وہ لاکھ اپنے شوہر مکرم کو روکتی ہیں مگر توبہ کیجئے! ایک قہقہہ لگا کر انہوں نے کہا:

"میں آپ کا اپنی بیگم صاحبہ سے تعارف کراتا ہوں۔ آپ ان کو جانتے ہیں اور یہ آپکو۔"

میں نے بڑھکر مصافحہ کیا اور عرض نہیں کر سکتا کہ میرا کیا حال اور اُنکا کیا حال۔ چوٹ پہ چوٹ وہ حضرت بولے:

"..... اور مجھے آپ کے اُن کالے دوست سے ہمدردی ہے۔"

میں نے ہنسکر کہا: "قبلہ ہمدردی تو مجھ سے کیجئے نہ کہ میرے کالے دوست سے۔"

وہ بولے "کیوں؟"

میں نے کہا: "اس لئے کہ قابلِ ہمدردی تو میں ہوں نہ کہ وہ۔"

وہ بولے: "جناب آپ کیوں ہونے لگے۔"

میں نے کہا "اور پھر کون ہوگا۔"

اب ذرا اُنہوں نے تجسس کے ساتھ اپنی بیگم صاحبہ کو دیکھا جن کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ اور بولے:

"آپ... تو...."

میں نے کہا: "حضت اُمیدوار تو یہ خادم تھا....."

خود خاتون صاحبہ بھی چونک پڑیں اور وہ بھی بولے: "ہیں!"

میں نے کہا: "ہیں کیا....."

وہ بولے: "آپ کا پیغام گیا تھا کہ ان کا؟ جناب کا اسم گرامی؟"

میں نے اپنا نام بتایا اور دیکھا کہ دونوں چونک پڑے۔ اور دونوں چُپ۔ اور پھر جو اُنہیں ہنسی آئی ہے تو نہ پوچھئے۔ حقیقت اب کھُلی۔ عجیب لطیفہ رہا۔ اُن کی بیگم صاحبہ نے چاہا کہ ان کا مُنہ بند کر دیں مگر وہ نہ مانے اور اُنہوں نے بتا دیا۔ بات یہ ہوئی کہ ان محترمہ نے مجھے دیکھنا چاہا اور خود اپنے چھوٹے بھائی اور ایک اور سہیلی کی غلطی سے میرے سیاہ دوست کو مجھے سمجھا اور فوراً ہی ناپسند فرما کر اُن کے مشورے سے وہ عجیب وغریب خط لکھدیا۔ جس کا نتیجہ میرے سامنے تھا۔ محترمہ اپنے شوہر کی زیادتی سے بیحد خفیف اور شرمندہ تھیں۔ انہوں نے بھی غالباً زیادتی کی جو مجھ سے حقیقت کہدی۔ میں نے اُسی وقت اُن دونوں کے روبرو پختہ ارادہ کیا کہ آئندہ اس کالے منحوس کو کبھی ایسے مشن پر لیکر ساتھ نہیں جاؤں گا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ اس موقعہ پر میں خود چوٹ نہ کرتا۔ لہذا میں نے ان حضرت سے کہا کہ "حضرت، معاف کیجئے گا۔ غلط فہمی کو دُعا دیجئے کہ کم از کم کالے گورے کی تفتیش پھر نہ ہوئی۔"

اور میں نے دیکھا کہ محترمہ شرم کے مارے عرق عرق ہوگئیں۔ کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ میرا رنگ اُن کے شوہر محترم سے بہت زیادہ صاف تھا۔

قصہ مختصر بقیہ سفر بہت لُطف کے ساتھ کٹا۔ اور بریلی پر ہم رُخصت ہوئے۔ وہ نینی تال جا رہے تھے۔ مجھے یہ اقبال کرنے میں بالکل شرم نہیں آرہی ہے کہ مجھ کو کوفت اور تکلیف ہوئی۔ اور ایسی اچھی صورت شکل کی لڑکی محض غلط فہمی میں ہاتھ سے جاتی رہنے کا بیحد قلق ہوا۔ اور اپنے کالے دوست کے اوپر تو بیحد غصہ آیا۔ معلوم ہوا کہ کالوں کی دوستی ہی خوب نہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے دوست کا رنگ میرے زندگی کے معاملات میں اس قدر دخیل ہوگا۔

ایک موقعہ اُلو نے کھویا اور دوسرا کالے رنگ نے اور مجھے جب ہی سے اُن تمام قوانین سے اتّفاق ہے جو کالوں کے خلاف دُنیا میں پاس ہوتے رہتے ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی

میرا ایشیائی محبوب

(مشرق و مغرب کی ایک دلکش داستان)

(۱)

طلبا یونیورسٹی کی آزاد، بے فکر اور عجیب و غریب زندگی کے حالات سُن سُن کر میری یہ خواہش روز بروز زیادہ ہوتی جارہی تھی کہ جلد از جلد میں بھی کسی یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے چند سال گزاروں۔ چنانچہ اسکول سے فارغ التحصیل ہو کر میں نے اپنی یہ خواہش والدین پر ظاہر کی مگر انہوں نے اسے پسند نہ کیا کیونکہ وہ مخلوط تعلیم کے مخالف تھے۔ تاہم میں اپنی ضد پر قائم رہی اور چونکہ میں انکی اکلوتی اور چہیتی لڑکی تھی اس لئے میرا اصرار اُن کے انکار پر غالب آیا اور میں یونیورسٹی میں داخل ہو گئی۔

یہاں میری سہیلی لوسی نے میرا تعارف ایک نوجوان طالب علم جون سے کرایا جو نہایت نیک اور با اخلاق شخص تھا۔ شاید ہم دونوں کے تعلقات آہستہ آہستہ اس قدر بڑھ جاتے کہ میں کسی روز اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتی مگر اُسے اُس نے ایک ایسے شخص سے میری ملاقات کرا کے ناممکن کر دیا جس کی یاد سے آج دل کے ناسور رِس رِس کر میری زندگی محال کئے دیتے ہیں۔ جون اکثر اس شخص کی تعریف کیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اس سے زیادہ قابل طالب علم آج تک یونیورسٹی میں نہیں آیا۔ اور یہی نہیں بلکہ بڑے بڑے پروفیسر بھی اس کی لیاقت اور علمیت کے معترف ہیں۔ اس کا نام ہیری لی تھا اور میری اس سے ملاقات نہایت دلچسپ طریقے پر ہوئی۔ ایک شب تبت کے ایک صوفی عالم کی تقریر سننے کے لئے جب میں اپنی سہیلی کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی تو تمام جگہیں بھر چکی تھیں جس سے ہمیں بڑی مایوسی ہوئی لیکن اتنے میں میں نے جون کو اپنی طرف بلانے کا اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔ چنانچہ ہم دونوں جون اور اُسکے ساتھی کی جگہوں پر بیٹھ گئیں۔ جہاں سے وہ ہمارے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"میں اور ہیری ایک طرف کھڑے ہو جائیں گے، آپ آرام سے بیٹھ جائیے"۔ جون نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

سامعین تقریر سن رہے تھے۔ قدرے توقف کے بعد میں نے جون اور اس کے دوست کو مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں دیوار کے سہارے کھڑے ہوئے تھے اور ہیری کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر میں یہ دیکھکر مایوس کن تحیر میں رہ گئی کہ ہیری لی ــــ چینی تھا، جس کا جون نے کبھی تذکرہ بھی نہیں کیا۔ بہرحال وہ خوش رو تھا اور اس کے چہرے سے وقار ٹپکتا تھا۔ اس کے ہاتھ اس کے بازوؤں پر رکھے ہوئے تھے اور آنکھیں ــــ وہ سیاہ ملکوتی آنکھیں ــــ اپنا خاموش اور پُرسکون جادو مجھ پر کر رہی تھیں۔ جب میں نے بمشکل اپنی نگاہیں اُس حسین مرد پر سے ہٹائیں تو آنکھیں ایک دفعہ اور اُس کی طرف دیکھنے کے لئے مچلنے لگیں، دوبارہ، سہ بارہ، نہ جانے کتنی بار! تبت کا بوڑھا صوفی روحانی بارش کر رہا تھا اور میں نے بھی چند لمحات تک اس سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن یہ ... کوشش میرے دل کے خلاف بغاوت کر رہی تھی اور میں مجبور ہو گئی کہ ہیری کو دیکھے جاؤں اور جب بھی میں اسکی طرف دیکھتی اُسکی سیاہ ملکوتی آنکھیں میری نظروں کو کئی لمحات تک گرفت میں لئے رہتیں! اور مجھ پر ایک نامعلوم کیف طاری ہو جاتا۔

تقریر ختم ہونے کے بعد جب مجمع منتشر ہوا تو میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی کہ کہیں محبت کی غیر مرئی زنجیریں مجھے جکڑ نہ لیں مگر میں تو پہلے ہی بے بس ہو چکی تھی۔ میرے پاؤں اٹھ ہی نہ سکے۔ لوسی، ہیری سے مل چکی تھی۔ اس لئے تعارف کے بعد ہیری مجھے میری جائے قیام تک پہونچانے آیا۔ وہ راستے میں عالمانہ گفتگو کرتا رہا۔ اس کا لہجہ شیریں، الفاظ خوبصورت اور خیالات شاعرانہ تھے اور میں اس کے سامنے کچھ بولتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ سایہ دار درختوں کے نیچے خاموش اور تاریک راستے میں وہ تخیل کے انمول موتی بکھیرتا رہا اور میں غیر ارادی طور پر اس کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ اس کی سنجیدہ فطرت اور پُرجوش باتوں نے مجھ پر ظاہر کر دیا کہ کیوں لوگ اسکی قابلیت کے مدّاح ہیں۔ رخصت ہوتے ہوئے میں نے اس کی درخواست کو نہایت خوشی سے منظور کر لیا۔

"بہت اچھا! کل سہ پہر کو میں آپ کے ہمراہ سیر کو چلوں گی۔"

خدا جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میری روح اپنی تکمیل کے لئے محسوس کر رہی تھی کہ وہ ایک دوسری روح کی محتاج ہے۔ میرے ہر سانس کے ساتھ ہر بار ابھرنے والے سینے میں لذّتِ خلش کی ایک بے پناہ موج اٹھ اٹھ کر مجھے ہوش و خرد کے ساحل سے بہت دور لے جا رہی تھی اور میں بے قابو ہو کر سوچنے لگتی تھی: "اے معبود! میری آزادی کیوں چھینی جا رہی ہے!!"

اسی کشمکش میں میں نے لوسی سے اس کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگی: "ہیری نہایت اچھا آدمی ہے، میں تو اس کو قطعی جینیئس سمجھتی۔ بعض اعتبار سے تو دنیا میں شاید اس کا ثانی نہ مل سکے۔"

غرض میری رائے کی لوسی نے بھی تصدیق کر دی۔

دوسرے روز جب ہیری سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے پھولوں کا ایک نازک گلدستہ دیتے ہوئے شاعرانہ انداز میں کہا "آپ خود ہی ایک حسین و جمیل گلِ نو شگفتہ ہیں......"

اس دن کی سیر کے بعد میں ایسا محسوس کرنے لگی گویا میں اس کی شخصیت کے اثر سے مغلوب اور شاعری کے جادو میں گرفتار ہو چکی ہوں۔ اور بہت جلد میں بھول گئی کہ ——— "یہ تو ایشیائی ہے ——— غیر ملکی!!" مگر کس قدر خوبصورت تھا وہ! اسکی مسکراہٹ غضب کی شیریں تھی اور میں نے اس سے زیادہ خوش اسلوب اور شریف النفس شخص کبھی دیکھا ہی نہیں۔ کچھ دنوں بعد ہماری ملاقاتیں ہر روز ہونے لگیں۔ میرا خیال ہے اس کو جو دلچسپی مجھ سے ہو گئی تھی وہ اس کے خلاف لگاتار اجتہاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ کیا یہ سنجوگ ——— ایک مشرقی مرد اور ایک مغربی عورت کا ——— واقعی کمزور دانش کی دلیل نہیں ہے؟ اس نے پڑھائی کی طرف سے کبھی غفلت نہیں کی کیونکہ اس کا قصد ایک آدھ سال بعد پیکنگ یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے جانے کا تھا۔ پھر بھی ہم دونوں شہر سے باہر خوشنما پہاڑیوں اور کم آباد شاہراہوں کی اکثر سیریں کرتے تھے۔ ان موقعوں پر ہیری مجھے ولولہ انگیز رومان اور عہدِ قدیم کی متحیر کر دینے والی داستانیں سنایا کرتا تھا اور آس پاس کا لہلہاتا ہوا حسن ——— یعنی ہرے بھرے کھیتوں خوش رنگ و معطر پھولوں اور پہاڑیوں کے دامن میں بل کھانے والے مناظر میں ہم دونوں جذب ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ شبِ ماہتاب میں وہ مجھے سیب کا ایک کھلا ہوا درخت دکھانے لے گیا جو علفت زار میں سپید پھولوں کا ہولے ہولے جھومنے والا آبشار معلوم ہو رہا تھا بلکہ دور سے تو ایسا نظر آتا تھا کہ برف سے ڈھکی ہوئی سیمیں انگلیاں معبودِ منیر کی پرستش کر رہی ہیں ہیری

میرے تحیر و تعجب پر اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔ "تم بھی سیب کے کھلے ہوئے پھولوں کی طرح ہو!" یکبارگی میں اس کی سحر آلود اور محبت بھری آواز سنکر بالکل اُس کے قریب ہو گئی —— بیحد قریب!!

اُس رات کے بعد ہیری کے لئے میرے دل میں جو جذبات بیدار ہو چکے تھے انہوں نے مجھکو بے قابو کر دیا۔ میں ہر وقت اُسکے ساتھ رہنا چاہتی تھی اور اس ارمان کو پورا کرنے کیلئے میں دنیا کی ہر شے قربان کرنے کو تیار تھی۔

جون کی ایک خوشگوار شام کو ہیری اور میں ایک ایسی راہ چل رہے تھے جہاں کوئی تیسرا ہمیں دیکھنے اور سننے والا نہ تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے کیونکہ چند ہفتے بعد میں گھر جانے والی تھی اور جدائی کا روح فرسا خیال ہمارے دماغوں پر مسلط تھا۔ دفعتاً ہیری ٹھہر گیا اور اپنے ہاتھ میرے شانوں پر رکھدئے۔ میں نے بھی فوراً ہی اس کی طرف دیکھا۔

"اے گلِ رعنا! ہم اور تم ایک پُر سکون دریا میں سفر کر رہے ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی تیز اور طوفانی رَو بہت جلد ہماری کشتی کو کہیں بہالے جائے گی۔" وہ مسکرایا مگر اس کی آنکھوں میں سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ "ہم کو واپس لوٹ جانا چاہیئے۔ اے خوبصورت پھول! ایسا نہ ہو کہ پھر ہم بے بس ہو جائیں۔"

میں جانتی تھی اس کا کیا مطلب ہے لیکن سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ "کچھ بھی ہو ہیری! مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ میں طوفانی رَو سے بھی نہیں ڈرتی جب تک —— جبتک —— تم میرے ساتھ ہو!!"

اس کے معصوم لب میرے بالوں کے قریب آگئے۔ اُس نے مترنم آواز میں کہا۔ "میرے آبا و اجداد کی عقل گرما کے بادل کی طرح ہے جو آسمان میں پھیل جاتا ہے۔ اے گلِ نوبہار! میں تم سے محبت کرتا ہوں، بہت گہری، بہت سچی اور تا زیست کرتا رہونگا، لیکن ہمیں محبت کرنی نہیں چاہیئے۔ تم بالکل بھولی اور کمسن ہو اے میری محبوبہ! اسلئے میں تمہارے پاس سے چلا جاؤنگا۔"

"نہیں، نہیں۔" میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "اگر تم میرے پاس سے چلے گئے —— تو میں مرجاؤں گی۔" میں نے اُسکے سینے پر سر رکھکر والہانہ انداز میں کہا۔ "ہیری میں مرجاؤنگی۔" اور اسوقت مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

اُس نے میری پریشانی سے ملول ہوتے ہوئے میرے رخساروں پر سے آنسو پونچھے۔ "میں تو تمہاری ہی بہتری کے لئے کہہ رہا ہوں اے آسمانی پھول! کہ ہم کو شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ میری محبت تو دائمی رہے گی، تمہاری البتہ ——" "لیکن میں۔" فوراً ہی اُسکی پیشین گوئی کی تغلیط کر دی۔ "تم کیوں شبہ کرتے ہو۔ میں ہمیشہ تم سے محبت کرتی رہونگی!"

کاش میں سمجھ سکتی کہ وہ کس قدر سچا ہے! ایک ماہ بعد ہم دونوں کی شادی ہوگئی۔ مگر میں نے اسے راز میں رکھا۔ ہیری کو ابھی گرمیوں گرمیوں یہاں رہنا تھا چنانچہ ہم نے کالج سے کافی فاصلے پر ایک چھوٹا سا خوشنما مکان لے لیا اور وہیں رہنے سہنے لگے۔ ہیری ہر روز کالج جاتا اور شام کو واپس آتا تھا۔ ہم دونوں خوش تھے، بہت خوش، تنہا، اکیلے —— دنیا کے جھمیلوں سے دور، زمانے کے فریبوں سے الگ! میرے والدین کو میری شادی سے بیحد صدمہ ہوا، خصوصاً میری ماں تو یہ جان کر کہ ہیری چینی ہے قریب المرگ ہوگئی چنانچہ انہوں نے میرے خطوط کے جواب تک نہ دئیے۔ تاہم میں مسرور تھی اور شادی کا اوائل زمانہ بے فکر اور خوش و خرم بلبل کی طرح کرنے لگی۔ ہیری کی عدم موجودگی میں گرما کے خاموش اور پُر سکون دن مجھے افکار و آلام سے غافل کر دیتے اور شام ہوتے ہم دونوں کے درختوں کے نیچے جو پھولوں سے لدے ہوتے بیٹھ جاتے اور ہیری مجھے محبت سے لبریز، پُر سوز نغمے، اور رومان انگیز [illegible]

داستانیں سُنایا کرتا۔ مَیں مستقبل کو بالکل بھُولی ہوئی تھی، ہیرِی کے طلسم کو توڑنے کے لئے مجھ میں تاب ہی کہاں سے آتی!۔

یہ معلوم کر کے کہ مَیں عنقریب ماں بننے والی ہوں مجھے ذرا ناگوار سا گذرا کہ یہ تیسری ہستی ہماری مسرت بے پایاں میں مخل انداز ہوگی مگر ہیرِی اس سے بے حد خوش تھا۔ اُس نے ایک ہوشیار اور تجربہ کار نرس کو گھر پر بُلوایا اور چند ماہ بعد میرے ہاں بچّہ پیدا ہوا۔ مَیں کئی روز تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مُبتلا رہی، اور کافی عرصے بعد میں اس قابل ہوئی کہ ہیرِی کی پریشانی کو جو اس کے مضطرب چہرے اور بے خواب آنکھوں سے ہویدا تھی اپنی کمزور مُسکراہٹ سے دُور کر سکوں۔ مجھے مُسکراتا دیکھکر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی زندگی بھی عود کر آئی ہو۔

"تم بچّے کو دیکھنے کی مشتاق ہوگی"۔ اُس نے محبت سے کہا۔ "وہ تندرست و توانا ہے"۔ یہ کہکر ہیرِی خوش خوش بچّے کو لے آیا اور اسے میری آغوش میں لٹا دیا۔ دو ننھے ننھے ہاتھ ہوا میں کھیل رہے تھے۔ ہیرِی نے بچّے کے چہرے پر سے کپڑا ہٹا دیا کہ میں بچّے کو دیکھ سکوں لیکن...... میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے پھر غور سے دیکھا۔ یہ میرا بچّہ تو نہیں ہو سکتا...... یہ...... یہ مضحکہ خیز صورت، چُندھی آنکھیں، چپٹی ناک! یہ میرا بچّہ کیسے ہو سکتا ہے؟!۔

"جاؤ ــــ لے جاؤ اسے یہاں سے!" میں بُری طرح چیخی۔ "یہ کریہہ المنظر شکل!...... یہ میرا بچّہ نہیں ہو سکتا! نکل جاؤ یہاں سے!"

ہیرِی دھم ہو گیا اور آہستہ سے اُس نے بچّے کو اُٹھا لیا۔ یہ اس کا بچّہ تھا، اُسی جیسا! لیکن مجھے تو اس امکان کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ میرا بچّہ مجھ جیسا ہوگا ــــ!!

میری چیخیں سُن کر نرس کمرے میں آگئی۔ ہیرِی سہما ہوا کھڑا تھا، اس کے چہرے پر حسرت اور اُداسی چھا رہی تھی اور بچّہ اُس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں مجھے غیر معلوم ہو رہے تھے۔

"مجھے تنہا چھوڑ دو ــــ مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے!" میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔ "مَیں اب تمہاری صورت بھی دیکھنی نہیں چاہتی، میں تم سے بیزار ہو چکی ہوں"۔

نرس بولی: "مسٹر ہیرِی! ان پر سرسامی کیفیت طاری ہے، اگر آپ تھوڑی دیر کیلئے باہر چلے جائیں تو اچھا ہو"۔

ہیرِی خاموشی سے اپنے بچّے کو، جسے میں نے قابلِ نفرین سمجھا، سینے سے چمٹائے باہر چلا گیا۔

اس غیر متوقع صدمے سے میری علالت نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ ہیرِی میرے سرہانے رات رات بھر بیٹھا چپکے چپکے روتا تھا اور مجھے تسکین دینے کی مقدور بھر کوشش کیا کرتا تھا۔ میں بمشکل بول سکی: "میری ماں کو بلا دو"۔ اور اسے کہتے ہوئے سنا: "ہاں ہاں پیاری! میں تمہاری ماں کو جلد بلا دونگا"۔

میرے والدین آئے اور جب میں سفر کے قابل ہو گئی تو مجھے واپس لے گئے۔ بچّے کو دیکھ کر وہ حقیقتِ حال سے واقف ہو گئے تھے اس لئے انہوں نے آئندہ مجھ سے یہ ذکر بھی نہیں کیا۔ ہیرِی کی طرف سے میرے دل میں اتنا زیادہ تنفّر پیدا ہو گیا تھا کہ میں متعجب تھی کہ مجھے اس شخص سے اس قدر گہری محبت ہوئی ہی کیوں! میں نے اس سے شادی ہی کیوں کی جو اس کا بچّہ جننے کی نوبت آئی!۔

افسوس اس سال کی یاد میرے دل سے بالکل محو ہو گئی، جب ایک نادر الوجود اور پاک محبت کرنے والی رُوح نے مجھے اپنی پناہ

میں لیا تھا۔

کوئی دو سال بھی نہ گزرے ہونگے کہ میرے پاس یونیورسٹی کا رسالہ آیا جس میں کالج نے پروفیسر ہیری لی کی پیکنگ (چین) میں بیوقت موت پر اظہار رنج والم کیا تھا۔ میں بے انتہا افسردہ ہوئی لیکن پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ اور وہ بچہ؟ میں نے یقین کر لیا کہ وہ بھی مر چکا ہوگا ——— اور اس طرح میری کتابِ زندگی کا یہ اہم ورق ہمیشہ کیلئے الٹ دیا گیا۔

۲

دوسرے سال میری منگنی جیرلڈ سے ہوگئی جو ایک کاروباری فرم میں ملازم تھا۔

میرے باپ نے اس سے میرے لڑکپن کی شادی کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرا پہلا شوہر مر چکا ہے لیکن اُس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہیری چینی تھا اور نہ میں نے کبھی یہ "قصہ" چھیڑا۔

شادی کے بعد ہم لندن کے نواح میں ایک خوبصورت مقام پر رہنے لگے۔ ایک برس بعد ہمارے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اور ہم نے اس کا نام روز رکھا۔ اس کی آنکھیں اپنے باپ کی سی اور بال میرے جیسے تھے۔ اور بہت جلد وہ ہم دونوں کی مرکزِ محبت بن گئی۔ بے شمار دن آسودگی سے گذرے۔ ہاں اس گیارہ سال کے عرصے میں میرے والدین کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد پھر آرام سے گزرنے لگی۔ میں اب ادھیڑ عمر کی ہو چلی تھی اور ایامِ گذشتہ کی تلخ کام یاد کو ماضی نے گم کر دیا تھا۔

ایک دن میرا شوہر دفتر سے آکر کہنے لگا "میں شنگھائی جانے والا ہوں اور فرم کا مالک چاہتا ہے کہ اُس کی لڑکی بھی وہاں کی سیر کر آئے اس لئے اگر تم اس کی نگرانی کیلئے چلی چلو تو وہ تمہارے اور روز کے اخراجات خوشی سے برداشت کریگا" جیرلڈ اور روز شنگھائی جانے کے لئے بہت بے قرار تھے مگر میں نہ جانے وہاں کیوں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے پاس چونکہ کوئی معقول وجہ نہ تھی اسلئے بہت جلد ہم شنگھائی روانہ ہوگئے۔ میری اور روز بہت جلد ایک دوسرے کی سہیلی بن گئیں اور اس سفر سے بیحد خوش تھیں۔

شنگھائی کے ہوٹل میں ہماری ملاقات جیرلڈ کے دوست مسٹر جم، اُس کی بیوی اور برادرِ نسبتی جورج سے ہوئی اور اُن کے اصرار پر ہم نے اُن کی یہ دعوت قبول کرلی کہ ان کے چھوٹے سے خوشنما مکان میں چل کر رہیں جو شہر کے شوروغل سے قریباً پچاس میل کے فاصلے پر تھا۔ جیرلڈ اور جم کام کاج سے فارغ ہوکر ہفتے کو یہاں آتے تھے البتہ جورج اور چند ملازم ہمارے ساتھ ہر وقت رہے کہ ہمیں مختلف مقامات کی سیر کرائیں، لیکن مجھے اب شوروغل نا پسند تھا اور یہ خاموش جگہ مجھے ویران معلوم ہوتی تھی۔ اسکے علاوہ مجھے اُن بدنام چینیوں سے نامعلوم خوف سا لگتا تھا جو سامنے دریا کے کنارے اپنی راہ چلا کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے لڑکیوں سے کہدیا کہ وہ گھر سے دور نہ جائیں۔ ایک ملازم نے بتایا کہ یہ غریب چینی انقلابی ہیں اور کبھی کبھی یہ لوگ رہزنی بھی اختیار کر لیتے ہیں مگر عموماً جانی نقصان نہیں پہونچاتے صرف روپیہ مانگتے ہیں ———

دریا کے کنارے کوئی دو میل کے فاصلے پر ایک مسمار شدہ کنشتِ چین (بدھی بتکدہ) کے کھنڈرات تھے۔ ہم نے ایک دن یہاں کی بھی سیر کی لیکن ہمارے ایک ملازم ڈنگ نے ہمیں بتایا کہ یہاں بہت سے غار اور پوشیدہ مقامات ہیں جن کو ہم نہیں دیکھ سکے کیونکہ اُن میں بہت سے بھک منگے پناہ گزیں ہیں۔

ایک دن ہمیں ایک چینی فقیر ملا اور اُس نے اپنا نام واہ لو بتایا۔

"آپ انگلستان سے آئی ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں! کیا تم انگریزوں کو پسند کرتے ہو؟" روز جواباً بولی۔

واہ بو کہنے لگا "میرا ایک دوست ہے اُسکو انگریزوں سے خاص دلچسپی ہے۔"

"کیا تمہارا دوست انگریزوں کو پسند کرتا ہے؟" لڑکیوں نے وہی سوال دُہرایا۔

واہ بو مسکرا کر آہستہ سے کہنے لگا "ہم دونوں مشنری اسکول میں پڑھتے تھے لیکن میرا دوست انگریز اُستانی کو تگنی کا ناچ نچایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ تو بازار میں اُس نے اس پر کیچڑ پھینک دی۔ اس کے بعد ہم نے بہتری اسی میں سمجھی کہ وہاں سے بھاگ آئیں۔"

لڑکیاں یہ سنکر بڑے زور سے ہنسیں۔

دوسرے دن میں باغ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ واہ بو اور اسکے ساتھ میں ایک اور شخص دیوار پر سے مجھے جھانک رہے ہیں۔

"لی ہونگ! اس میم کو دیکھو" واہ بو نے اپنے ساتھی سے کہا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ لی ہونگ کی وہ ——— سیاہ آنکھیں ——— جن سے تحقیر و ملامت برس رہی تھی ——— میرے دل کو چھلنی کردیں گی۔ چین کے وہ تمام خوف جن کو میں اب تک بھولنے کی کوشش کرتی رہی، اس وقت میرے دل و دماغ پر چھاگئے اور میں وہاں سے بھاگ کر چھپ جانا چاہتی تھی۔ لی ہونگ اور واہ بو دریا کی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دُور چلکر وہ مسز جم اور دونوں لڑکیوں کے پاس آ گذرے جو پانی سے کھیل رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ لی ہونگ کچھ دیر تک وہاں ٹھٹک کر ان کو گھورتا رہا۔

اس وقت کے بعد سے، گھر سے باہر نکلنے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن دن میں ایک آدھ مرتبہ میں لی ہونگ کی جھلک ضرور کہیں آس پاس پھرتے ہی دیکھ لیتی تھی۔ اور ہر دفعہ وہ سیاہ ڈراؤنی اور تنفر آمیز نظریں مجھے کھائی جاتی تھیں۔ جورج اُسے دیکھکر ایک دفعہ کہنے لگا "واہ بو کہتا ہے وہ شخص نصف انگریز ہے۔"

"نصف انگریز!" میرے منہ سے حیرت و استعجاب میں نکلا۔

"ہاں! وہ کہتا ہے کہ اس کا باپ ایک زبردست عالم تھا ——— پیکنگ یونیورسٹی میں پروفیسر ——— اور لی ہونگ کے بچپن ہی میں اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس وقت سے یہ دربدر بھیک مانگتا پھرتا ہے۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا گویا کوئی میری رُوح سلب کر رہا ہے۔ میں نے اپنے کمرے کے دروازے بند کرلئے اور رات بھر کسی خیال سے لرزتی رہی۔ میں سمجھ گئی تھی! ہاں، سمجھ گئی تھی! خدا نے، جو انصاف والا ہے، مجھے اس جگہ اس لئے بھیجا تھا کہ ندامت اور ملامت میرے ایمان کو اپنے تیروں سے مُردہ کردیں اور میں سمجھ لوں کہ دُنیا اتنی وسیع نہیں کہ اس کا کوئی حصہ مجھے اپنے شرمناک اعمال کے نہ ٹلنے والے نتائج سے محفوظ رکھ سکے۔

آخرکار میں نے اپنے آپ کو قسمت کے سپرد کردیا کہ جو ہونا ہے ہو جائیگا۔ چنانچہ لی ہونگ کی آنکھوں سے بچنے کی میں نے پھر کوئی کوشش نہیں کی۔ میں دریا تک شکستہ دل اس طرح چلی گئی کہ رُوح بیمار تھی اور جسم تکلیف میں مبتلا۔ وہ بھی میرے پاس ہی آگیا۔ مگر میں اُسے دیکھتے ہی ناگہانی اضطراب میں چلائی "جاؤ ——— یہاں سے چلے جاؤ!"

"میں کتا نہیں ہوں جسے تم دھتکار سکتی ہو" اُس نے غمگین آواز میں جواب دیا۔

کانپتے ہوئے میں نے پوچھا "تم — چاہتے — کیا ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں مغربی عورتوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اُن سے نفرت ہے۔ میں..... میں..... انہیں مار ڈالنا چاہتا ہوں"

اُس کی سیاہ آنکھیں چمک اٹھیں اور میں ڈر کر پیچھے ہٹی، مگر وہ بھی قریب آگیا اور کہنے لگا "میری ماں — ایک انگریز عورت تھی..... مشنری اسکول میں انہوں نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں لیکن یہ کوئی نہ بتا سکا کہ میری ماں نے مجھے حقارت سے کیوں ٹھکرا دیا۔ میرا باپ ایک جید عالم تھا....." وہ فخر سے سر بلند کر کے کہنے لگا "... میں بھی عالم ہوتا — اگر — میرا معزز باپ مجھے تعلیم دینے کے لئے زندہ رہتا!"

میں نے آہستہ سے پوچھا "آخر تم یہ — مجھے — کیوں بتا رہے ہو؟"

لی ہونگ نے اپنے شانے ہلائے "میں اس نفرت کا اظہار کیا کرتا ہوں جو میرے دل میں روز بروز متلون مزاج میموں کیلئے بڑھتی جاتی ہے"

وہ وہاں سے دریا کے کنارے جانے لگا۔ میں اُس کی طرف کھڑی تکتی رہی۔ کاش مجھے کوئی اس سوہانِ روح مجسّم غم و خوف سے آزاد کرا سکتا!

روز اور میری، ڈنگ کے ساتھ مچھلی کا شکار کر رہی تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر میں نے دیکھا کہ واہ بو اور پانچ چھ اور چینیوں نے لی ہونگ سے کچھ باتیں کر کے لڑکیوں کو گھیر لیا اور ونگ کو بُری طرح زخمی کر دیا۔ بے قابو ہو کر میں اُس طرف چیختی ہوئی دوڑی "انکو چھوڑ دو — چھوڑ دو"

مسز جم بھی میری آواز سنکر آگئیں اور ہم دونوں لڑکیوں کو چھڑانے کیلئے جد و جہد کرنے لگیں۔

اتنے میں، میں نے لی ہونگ کی آواز سنی "جلدی کرو — صرف لڑکیوں کو بھگا لے جاؤ"

ہم دونوں واہ بو سے لڑ رہی تھیں اور باقی چینی لڑکیوں کو لے جا رہے تھے۔ میں نے چیخ کر کہا "لی ہونگ! ایسا نہ کرو — ان کو چھوڑ دو"

اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا، اُس کی آنکھیں زہر میں بجھی ہوئی تلواریں معلوم ہوتی تھیں "کل تمہارے مرد شنگھائی سے آجائینگے اُن سے کہدینا کہ روپیہ تیار رکھیں، لڑکیاں تمہیں واپس مل جائیں گی۔ میں واہ بو کو اُن سے ملنے بھیجونگا — روپیہ تیار رکھنا، اس سے بھوک کے فاقوں سے بچ جائیں گے"

میں نے لی ہونگ کو پکڑ لیا اور میری انگلیاں اس کے کپڑوں میں اُلجھ گئیں "واپس چلی جا — اے انگریز عورت!" لی ہونگ مجھے حقارت سے پرے ہٹاتے ہوئے بولا "روپیہ تیار رہے، لڑکیاں واپس بھیجدی جائیں گی"

"سُنو تو سہی لی ہونگ!" میں نے التجا کرتے ہوئے کہا "تم یہ کر کیا رہے ہو، تم سمجھتے بھی نہیں! وہ میری لڑکی ہے — تم — ہیری لی کے — اور وہ تمہاری — بہن ہے!!"

میں نیم بیہوش ہو کر گر پڑی۔ اس نے مجھ کو دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔ دُور سے میں نے روز کی نحیف صدا سُنی۔

"ماں! — ماں!"

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور مسز جم میرے پاس۔

(۳)

مسز جم کی تسلّی اور ہمدردی سے متاثر ہو کر میں نے اپنی کہانی کا کچھ حصہ اُسے سُنا دیا۔ وہ کہنے لگی کہ یہ لوگ لڑکیوں کے ساتھ کوئی تشدد نہیں کرینگے، صرف روپیہ چاہتے ہیں۔

"کیا خبر لی ہونگ انتقام لینے پر آمادہ ہو جائے" میں نے روتے ہوئے کہا۔

جیرلڈ اور جم دوسرے دن دوپہر کو آ گئے، ونگ نے راستے ہی میں اُن کو اس واقعہ سے مطلع کر دیا۔ اپنے شوہر کی صورت دیکھکر میں ایک اور خوف سے لرز گئی ——— اُسے جب میری گذشتہ زندگی کا حال معلوم ہوگا تو اس کا اعتماد اور محبت چکنا چور ہو جائے گی!۔

جیرلڈ، واہ لو کا انتظار کئے بغیر فوراً بُت کدے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ان بھک منگوں کی جائے قیام تھی۔ جورج گھر پر رہا، باقی سب جیرلڈ کے ہمراہ ہو گئے۔ جب ہم بتکدے کے قریب پہونچے تو ایک بندوق چلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی نصف درجن چینی کھنڈر میں سے نکل کر ہماری طرف دوڑ پڑے۔ انہوں نے ہمیں گھیر لیا اور روپے کا مطالبہ کیا۔ میں دوڑ کر لی ہونگ کے پاس پہونچی۔ اس کی پیشانی سے جیتا جیتا خون بہہ رہا تھا۔

"میری بچی کہاں ہے!"

عین اسی وقت واہ لو، روز اور میری کو کلائیوں سے پکڑ کر ہماری طرف لانے لگا مگر باقی چینی ان کو پھر گھسیٹ کر واپس لے گئے۔ یہ دیکھکر جیرلڈ سے نہ رہا گیا اور اُس نے چینیوں پر گولی چلا دی۔ چینی بگڑ گئے اور بھرے ہوئے شیروں کی طرح میرے شوہر اور جم پر پل پڑے۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ لی ہونگ اور اُس کے ساتھ اس کا دوست واہ لو چاہتے تھے کہ لڑکیوں کو بغیر روپے کا مطالبہ کئے واپس کر دیں لیکن دوسرے لوگ اس پر راضی نہیں ہوئے، چنانچہ انہوں نے بچارے لی ہونگ پر حملہ کر کے زخمی کر دیا تھا.... مگر اسکے باوجود مجھے اندیشہ تھا کہ لی ہونگ مجھ سے انتقام لیکر رہیگا۔

"اسے کوئی تکلیف نہ پہونچاؤ لی ہونگ! ——— یہ میری بچّی ہے ———" میں نے عاجزی سے کہا۔

ہماری نظریں ملیں۔ اب اُن سیاہ آنکھوں سے وہ تنفر اور وہ حقارت معدوم ہو گئی تھی ——— "ہاں! اُس بچّی کو کوئی تکلیف نہیں پہونچے گی۔"

میرا شوہر غصّے سے چلّایا: "اس گدھے سے کیوں عاجزی کرتی ہو!" یہ کہکر وہ لی ہونگ کی طرف جھپٹ کر آیا اور اس کے چہرے پر ایک زور سے مکّا مارا۔ لی ہونگ نے کوئی حرکت نہیں کی ——— زبان سے ایک لفظ تک نہ نکالا ——— لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کے دوست نے جیرلڈ کی طرف بندوق تانی ہے، وہ بجلی کی طرح بندوق اور میرے شوہر کے درمیان آ گیا۔ گولی لی ہونگ کے پار ہو گئی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

آتشِ جنوں سرد ہو گئی۔ لوگ لی ہونگ کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے شکستہ آواز مگر تحکمانہ لہجہ میں کچھ کہا اور وہ چینی جلدی سے

لڑکیوں کو لے آئے ہیں سنے دیکھا کہ لی ہونگ کی دکھ اور رنج سے لبریز آنکھیں مجھے تلاش کر رہی ہیں۔ جیرلڈ بھی اُسے ــــ جس نے اپنی زندگی قربان کر اس کی جان بچائی ــــ اپنے قدموں میں لوٹتا دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔

میرا راز ابھی تک پوشیدہ تھا اور کسی طرح مجھے یقین ہوگیا تھا کہ لی ہونگ اپنے منہ سے کچھ نہ کہے گا لیکن جب میں نے اُسے عالم جانکنی میں دیکھا تو میرے اندر حیرت میں یک ارتعاش پیدا ہوگیا۔ اُس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں ــــ کچھ کہہ رہی تھیں کچھ التجا کر رہی تھیں۔ میرے دل میں ترحم کا ایک طوفان بپا ہوگیا ــــ وہ میرا ہی تو بچہ تھا، میرا ہی خون! وہ غریب و ناتواں جسم، وہ بھوکی رُوح میری ــــ میرے محبوب ــــ ہی کا تو بیٹا تھا!!

مَیں اب بھی وہاں سے اپنا راز محفوظ لیکر آسکتی تھی مگر نہیں، میری رُوح پکار پکار کر کہہ رہی تھی "جا ان عنقریب بند ہوجانیوالی آنکھوں کی خاموش التجا کو سُن لے! جا اُسکے پاس جا اور اُسکو اپنے سینے سے لگالے" اُسکی آنکھیں یہی التجا کر رہی تھیں مگر کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہے گا۔

میں وہیں بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔

"میں اس نازیبا حرکت پر بےحد متاسف ہوں" اس کا سانس اُکھڑ چکا تھا، وہ رُک رُک کر کہہ رہا تھا "ان بچی کو کوئی تکلیف نہیں پہونچائی گئی ــــ مگر پھر بھی، اس کی ماں کو تو تکلیف ہوئی ہوگی ــــ بچہ نہ جانے اپنے ماں باپ کی کیوں خواہش کرتا ہے ... میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ جیسی خاتون مجھے یہ عزت بخشیں"

میرا دل بھر آیا تھا۔ اس سے زیادہ رحم میرے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ میری رُوح گُناہ کی بیڑیاں توڑ رہی تھی۔ "اسکی ہوجہ اس لڑکے کی جو تنہا اور کوئی دم کا مہمان ہے!"

مسز رحم لڑکیوں کو گھر لے گئی اور میں نے اپنے شوہر کو اپنے پاس بٹھا کر کہا "اس نے تمہاری جان بچائی ہے جیرلڈ! اس سے کچھ تسکین آمیز باتیں کرو" اور گویا خدا کہلوا رہا ہو، میں نے آہستہ سے کہا "یہ ــ ہیری لی کا بیٹا ہے ــــ میرا بیٹا!"

جیرلڈ کا چہرہ اُتر گیا لیکن میں نے قطعی پرواہ نہیں کی۔ میں تو اعتراف کر رہی تھی کہ "یہ میرا بیٹا ہے"

"اے خاتون! آپ کسقدر رحم دل ہیں!" لی ہونگ کے مُرتعش ہونٹ سخت ہوتے جارہے تھے۔

"ہیری لی ــــ کیا چینی تھا؟" جیرلڈ نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں!" میں آہستہ سے بولی "مجھے کوئی یاد آرہا تھا" وہ ایک زبردست عالم تھا"

لی ہونگ کے بُشرے پر خوشی اور اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی "میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنے معزز باپ کے پاس سو ؤں" اُس نے بمشکل کہا "وہ پیکنگ میں پیوندِ خاک ہے"

"ہاں ــــ ہاں ــــ ایسا ہی ہوگا" میں نے اس سے وعدہ کیا۔

اگرچہ جیرلڈ صدمے سے دم بخود تھا، پھر بھی اسے احساس تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ بچہ اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے جس نے اس کی جان بچائی۔ وہ لی ہونگ پر جُھک گیا اور پیار سے اسکی پیشانی پر سے موت کا پسینہ پونچھنے لگا۔

لی ہونگ کی نظریں میرے چہرے پر سے نہیں ہٹیں۔ اس نے اپنا رُخسار میرے سینے سے ملا دیا۔ کیا کوئی غیبی طاقت م

کے اُس کو تے سے یہاں اس لئے کھینچکر لائی تھی کہ یہ بچّہ اپنی ماں کی آغوش میں دَم توڑے؟ ــــ وہ آغوش جس نے پیدائش کے وقت نفرت وحقارت سے ٹھکرا دیا تھا؟ میں نے اُس کے رخسار پر اپنے لب رکھدیئے، اس کے جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہوگئی۔ "ما۔ں۔" اُسکے مُنہ سے آخری بار بصد حسرت دیاس نکلا اور اُس کی آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہوگئیں۔

جب جیرلڈ نے اُسے میری آغوش میں سے لیکر اپنی آغوش میں لیا تو میرے دل میں ایک قیامت برپا ہوگئی۔

"اِسے پیکنگ میں اس کے باپ کے پاس سُلا دو!" اور جیرلڈ نے تسلّی دیتے ہوئے کہا "ہاں پیاری! یہ وہیں سوئیگا"

چند دن بعد ہم وطن روانہ ہوگئے۔ مجھے ہوش نہ تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ جب حواس دُرست ہوئے اور میں کچھ سمجھ سکنے کے قابل ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے شوہر کے مغموم و ہراساں رہنے کی وجہ، جو اُس کی روحانی اذیت کا باعث ہوئی، یہ تھی کہ میرا ایک بچہ تھا ــــ جو میری سنگدلی کی وجہ سے جب تک جیا، دو دو دانوں کا محتاج رہا۔ جیرلڈ اس دُکھ میں خود ہی مُبتلا تھا، کاش وہ مجھے بھی اس میں شریک کر لیتا! اس کی اُداس آنکھیں اُسکے دل کا پتہ دے رہی تھیں، کاش وہ مجھ پر بھی اپنی زبان سے اس کا اظہار کر دیتا!۔

ایک سہ پہر کو معاً میں نے اپنے شوہر سے کہا: "جیرلڈ میں تمہاری محبت کی مستحق نہیں ہوں پھر بھی میری خواہش ہے کہ تم مجھ سے محبت کرو ــــ مجھے اب تمہاری محبت کی بیحد ضرورت ہے ــــ میں چین جانا نہیں چاہتی تھی لیکن کوئی مجھے زبردستی دھکیل رہا تھا ــــ مجھے اپنے اعمال کی سزا مل رہی ہے ــــ اور جب مجھے خیال آتا ہے کہ بیس سال کے بعد بھی میں اس سے نہ بچ سکی تو کانپ اُٹھتی ہوں۔ کیا میرے بچے کو میری آغوش میں اس لئے موت آئی تھی کہ میری سزا پوری ہو جائے اور یا وہ خود ہی تمام عمر اس کی دعا مانگتا رہا؟ ــــ جیرلڈ اب میں پہلی سی نہیں رہی، مجھ پر ترس کھاؤ!"

جیرلڈ نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ "میں اپنی غیر ذمہ دارانہ روش پر بیحد نادم ہوں جیرلڈ! میں سزا سے بچتی بھی کہاں تک؟ اور خدا جانے یاد، مجھے تڑپنے کیلئے کب تک زندہ رہنے دے؟ .... تمہارے بغیر تو میں اور بھی بے یار و مددگار رہ جاؤں گی۔ جیرلڈ! مجھے اپنی محبت دے دو!"

میرے شوہر نے میرا ہاتھ اپنے میں لے لیا جس سے میں اطمینان اور سکون سا محسوس کرنے لگی۔

گھر پہونچے ہمیں دو ڈھائی مہینے ہو چکے تھے۔ ایک دن روز نے غمگین آواز میں کہا "امّی ــــ نہ جانے لی ہونگ مجھے کیوں یاد آئے جاتا ہے!"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ کہنے لگی "ابا کہتے ہیں کہ میں اُن واقعات کا ذکر تک نہ کروں مگر اچھی امّی! صرف اس دفعہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔ کیونکہ میرا دل مجھے مجبور کر رہا ہے۔ وہ بُرا آدمی تو نہیں تھا، کیوں امّی؟ اس نے ابا کی جان بچائی اور اس کے علاوہ جب وہ چینی ہمیں غار میں لے گئے تو اس کا سُلوک ہمارے ساتھ نہایت شریفانہ تھا۔ اس نے ہمیں کھانا کھلایا اور پھر وہ فرش پر میرے روبرو بیٹھ گیا۔ چند لمحات تک وہ میری طرف حسرت اور محبت سے دیکھتا رہا، پھر اُس نے انگریزی میں کہا "چھوٹی بہن! ــــ چھوٹے سے سیب کے پھول!" مجھے اس سے کبھی ڈر نہیں لگا۔ اور دیکھنا امّی! اس نے مجھے ایک رام وہ

بستر پر لٹا دیا۔ اور جب میں سو کر اٹھی تو میں نے دیکھا کہ وہ خود زمین پر لیٹا ہوا ہے، اور اتی! ـــ رو رہا ہے!! اُسے مجھے اور میری بچی
لے جانے کا بڑا رنج تھا، تھا نا؟ اُسے یاد کر کے مجھے رونا سا آجاتا ہے ـــ میں چین کے تمام واقعات ایک نہ ایک دن بھول جاؤنگی

مگر اتی ـــ لی ہونگ کو کیسے بھلا دوں؟"

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے: "لی ہونگ نے تمہارے باپ کی جان بچائی تھی روز! وہ ـــ بہادر ـــ تھا!"
بیانے اس سے گلوگیر ہو کر کہا اور اس طرح اُس ٹھکرائے ہوئے بچے کی اندوہناک یاد میں ایک اور دردناک یاد کا اضافہ ہوگیا۔
لی ہونگ نے میری بچی کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا! ـــ وہ جانتا تھا کہ وہ بچی کون ہے!! ـــ اور وہ اسکے لئے رو رہا تھا!؟۔
یہ بہار کا موسم ہے اور گذشتہ گرمیوں کے واقعات بہت دیرینہ معلوم ہوتے ہیں۔ جیرلڈ دفتر سے آنے والا ہے اور روز
برآمدے پر اس کا انتظار کر رہی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کی محبت آپس میں روز بروز بڑھ رہی ہے۔ شاید یہ میرا
خیال ہی خیال ہے کہ جیرلڈ روز کو صرف اپنی بچی سمجھتا ہے اور میری برائے نام ـــ کیونکہ میرا بچہ تو وہ تھا۔
ہوا کے ایک لطیف جھونکے نے سیب کے سپید پھول روز کے بالوں پر بکھیر دئے ہیں اور وہ اپنے باپ کے ہاتھ میں ہاتھ
ڈالے آرہی ہے لیکن میرا دل دُور، بہت دُور ایک ایسی سنسان جگہ مصروفِ ماتم ہے جہاں ایک بہادر بچہ اپنے عالم اور معزز
باپ کے پہلو بہ پہلو محوِ خواب ہے۔

(پلاٹ انگریزی سے ماخوذ) ـــ صادق الخیری

تعلیم زدہ

جسے دیکھئے، نوکری کا ہے سائل ــ یہ "بی اے" یہ "ایم اے" ہیں بدتر زجاہل
تجارت سے واقف نہ کھیتی کے ماہر ــ نہ صنعت کے لائق نہ حرفت کے قابل
غلامی کے فن میں مگر چاق چوبند ــ ہوا ان کو تعلیم سے بس یہ حاصل
وطن کی محبت، نہ قومی حمیت ــ یہ ہوتے ہیں خود فوجِ دشمن میں شامل
سمجھتے ہیں معراج ہے چاکری میں ــ اسی پر ہیں قانع اسی پر ہیں مائل
نہ ہمت رہی ان میں باقی نہ جرأت ــ ہوئے ہیں یہ کمبخت پڑھ لکھ کے بزدل
دماغ اِن کے مفلوج، دل انکے مردہ ــ ارادے فسردہ، خیالات باطل
یہ آزادِ اخلاق! یہ پیروِ نفس! ــ رذائل ہیں ان کی نظر میں فضائل

کسی اور کو ان سے امید ہو کیا
خدا کے یہ بندے خدا سے ہیں غافل

(ک۔ ش)

اندھی محبّت

(جب محبّت کے اندھے دیوتا "کیوپڈ" کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں تو کیا ہوتا ہے؟ -)

۱

حادثہ

"پاج تون" سے شہر شوراک جاتے ہوئے ہمیں کار کا ایک ایسا خوفناک حادثہ پیش آیا جس نے میری کتابِ زندگی میں ایک عجیب و غریب باب کا اضافہ کر دیا۔

موٹر کار کی پچھلی سیٹیں سامان سے لدی ہوئی تھیں۔ چچا جعفر نے سامان کا ایک جزو بنکر پچھلی سیٹ پر ٹھونسے جانے کی بجائے بہتر سمجھا کہ ڈرائیور کو ساتھ نہ لیں اور اسکی سیٹ پر خود رونق افروز ہو جائیں۔ چنانچہ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھے کار چلا رہے تھے اور میں اُنکے پہلو میں دوربین لئے اِدھر اُدھر کے مناظر دیکھ رہی اور راستے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جہاں کہیں پُر خطر راستہ یا کوئی اچانک موڑ نظر آتا دکھائی دیتا میں انہیں پہلے سے آگاہ کر دیتی۔ ایشیائی صبح کی خوشگوار خنک ہوا، پہاڑی راستوں کی ناہموار گھاٹیاں، کہیں اُبلتے ہوئے چشمے، کہیں بل کھاتی ہوئی ندیاں کہیں کہسار کی کاسنی چوٹیاں، کہیں سربلند صنوبر کے مخروطی سرے۔ ان تمام چیزوں نے ہمیں بیحد محظوظ کر رکھا تھا۔

دفعتاً میں نے دوربین سے دیکھتے ہوئے کہا "چچا، چچا! ایک اور پُر خطر موڑ آ گیا۔ رفتار ذرا دھیمی کر لیجئے۔ اُف، یہ سیاہ غار! راستہ بھی بہت ناہموار ہے۔"

چچا جان کے مُنہ میں موٹا سا سگار تھا۔ گول گول آواز میں بولے "تم تردد نہ کرو۔ بہت آہستہ چلا تو تاخیر کا اندیشہ ہے۔ ہمیں شام سے پہلے شوراک پہونچنا ہے۔ وہاں وکیل میرا منتظر ہوگا۔"

ان کا جملہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ آنکھوں نے وہ دیکھا اور حواس نے وہ محسوس کیا کہ الامان الحفیظ! کار اچانک ایک بڑے پتھر سے ٹکرائی اور پیچھے ڈھلوان سڑک پر پھسلنے لگی۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا اس کا مجھے پتہ نہیں۔ میرے حواس جیسے کسی اتھاہ تاریکی میں ڈوب رہے تھے۔

کار شاید کسی کھڈ میں جا گری ہو، شاید کسی پہاڑ سے ٹکرائی ہو، میں بیہوش ہو چکی تھی۔

۲

تاریکی

پانچ دن کیسے گذرے! مجھے اس کا مطلق احساس نہیں۔ پیشانی پر اور سر کی پُشت پر ایسی چوٹیں آئی تھیں جنہوں نے مجھے سُدھ بُدھ کر رکھا تھا۔ اس پر شدید بخار نے حواس مختل کر دئے تھے۔

پانچویں دن جب مجھے کچھ ہوش آیا اور میں نے اپنی پلکیں اُٹھانے کی ایک ناتواں کوشش کی تو دیکھا کمرے میں ایک گہری تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی بے روح تاریکی ―― جسے میری آنکھ نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ اگرچہ میرا سر پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا مگر میں نے اسے آہستہ سے گھما کر دریچوں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر بہت جلد مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں نہ کوئی دریچہ ہے، روشنی کا کوئی دوسرا اہتمام۔ اچانک سرد اور تاریک قبر کی یاد نے میری رُوح میں ایک نشتر گھونپ دیا۔ میرے دل نے کہا

قبر ہے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
اور میں چیخ پڑی: "چچا! چچا جعفر! چچا جعفر!"
پانچ دن کے بعد یکلخت میری آواز سنکر نرس دوڑ پڑی۔
"خاتون! کیا بات ہے، کیا بات ہے! تم کیسی ہو! میں نرس ہوں!"
"نرس" میں نے گھبرا کر روتے ہوئے کہا: "خدا کے لئے کمرے میں روشنی کرو۔"
"روشنی!؟"
"ہاں" میں نے کہا: "یہاں کوئی روشنی کیوں نہیں ہے!؟"
نرس نے قریب آکر میری نبض پر اپنی انگلیاں رکھیں پھر بولی: "دن کا وقت ہے خاتون"
میں گھبرا کر اٹھنا چاہتی تھی۔ مگر میری گردن اکڑی ہوئی تھی، میں بے بسی سے تکئے پر گر پڑی اور رونے لگی "نرس مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے تم بھی دکھائی نہیں دیتیں۔ چچا کہاں ہیں؟ ہائے چچا۔۔۔!"
"میں ابھی مسٹر جعفر کو بلاتی ہوں" نرس نے کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر بھاگ گئی۔
میں سسکیاں لیتی ہوئی بستر پر پڑی رہی۔
"بیٹی! بیٹی زیبا! کیسی ہو؟" چچا کی آواز آئی۔
"چچا چچا آپ کہاں ہیں؟ آپ مجھے دکھائی نہیں دیتے"
"نقاہت کا سبب ہوگا بیٹی۔ چپ چاپ پڑی رہو۔ تم پانچ دن بے ہوش رہی ہو" یہ کہتے ہوئے انہوں نے مجھ پر جھک کر اور میری پیشانی چوم لی۔
میں بے اختیار رو پڑی۔ "چچا میرا دل بیٹھا جاتا ہے، مجھے کچھ نہیں سوجھائی دیتا۔ کیا آپ لوگ مجھ سے ہنسی کر رہے ہیں! کیا باہر آفتاب چمک رہا ہے؟ ہائے میری آنکھیں! میری آنکھیں کیا ہوئیں؟ وہ کھلی ہیں یا بند؟ ۔۔۔ یہ کیا ہو گیا؟!"

معلوم ہوتا تھا چچا جعفر کو میری باتوں پر ہذیان کا شبہ ہو رہا ہے۔ بار بار کہتے "نرس! ٹمپریچر لینا۔ کہیں بخار زیادہ تیز نہ ہو گیا ہو۔"
"جی جناب میں نے آدھے گھنٹے پہلے حرارت دیکھی تھی۔ نارمل تھی۔"
"تو نرس۔ فوراً ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرو۔"
دس منٹ بعد ڈاکٹر پہونچ گیا۔ اس نے مجھ سے چند سوال کئے۔ پھر دھیمی آواز میں چچا سے کچھ کہا اور انہیں کمرے سے باہر لے گیا۔
میں نے گھبرا کر نرس سے پوچھا: "نرس! ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟ کیا میری بصارت جاتی رہی؟"
نرس نے کچھ بتانا شاید مناسب نہ جانا صرف اتنا کہا۔ "ابھی تو کچھ نہیں کہا کوشش کیجئے کہ نیند آجائے" یہ کہکر وہ میرے تکیے ٹھیک کرنے لگی۔ میں سسکیاں لیتی ہوئی ایک جنون افزا اندھیرے میں چپ چاپ پڑی رہی۔

(۳)

علاج کی تجویز

مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ کتنا وقت گذر گیا۔ آدھ آدھ گھنٹے بعد میں نرس سے پوچھ لیا کرتی تھی۔ نرس اب کیا بج گیا؟۔
شام کو چچا جعفر چپ چاپ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے ان کے قدموں کی آہٹ سنی۔ وہ آہستہ سے میرے قریب کھڑے ہوئے۔ میں منتظر تھی کہ کوئی بات کریں گے مگر انہوں نے کوئی بات نہ کی۔ وہ شاید میری آنکھوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔۔۔
آخر گھبرا کر میں نے کہا: "چچا؟"
"ہاں بیٹی زیبا"
"آپ چپ کیوں ہیں؟ میرا جی گھبرا رہا ہے۔ میری آنکھیں

سو کیا ہو گیا چچا جان؟ کیا میں اندھی ہو گئی ہوں؟" میرے منہ سے ایک آہ نکلی۔

چچا ضبط کر کے بولے "نہیں بیٹی۔ یہ عارضی اثر ہے۔ معبود نے چاہا تو ڈیڑھ دو ہفتوں میں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی"۔

میں نے محسوس کیا کہ ان کی آواز میں ایک دلدوز درد پنہاں ہے۔

میں چیخ پڑی "ڈیڑھ دو ہفتے! اتنی مدت اس اندھیرے میں رہوں گی؟ ہائے اب کیا ہو گا؟"

چچا بولے "بیٹی اس طرح رویا نہیں کرتے۔ میں نے آج مشہور ڈاکٹروں سے ملکر مشورہ کیا ہے۔ ان سب کی یہی رائے ہے کہ ڈاکٹر رشیدی کو بلانا چاہیئے"۔

"وہ کون ہیں؟" میں نے مایوس لہجے میں پوچھا۔

"ڈاکٹر رشیدی مشہور ماہر چشم ہیں۔ انہوں نے بعض پیدائشی نابیناؤں تک کو بصارت بخش دی ہے۔ وہ شہر راک سے تین سو میل کے فاصلے پر رہتے ہیں اور اتنے مصروف ہیں کہ شاذ ہی کہیں باہر جاتے ہیں"۔

"تو پھر وہ یہاں کیونکر آئیں گے چچا؟"

"نہ آئے تو ہمیں انکے ہاں جانا پڑیگا"۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ہائے! تو یوں کہئے۔ مجھے اندھوں کے ہسپتال میں رہنا ہو گا۔ میں اندھی ہو گئی۔ گویا زندگی کی تاریکی میں ادھر ادھر بھٹکا کرونگی! کوئی میرا رفیق نہ ہو گا!"

میں نے اندھوں کے کئی افسانے پڑھے تھے۔ ان کی نامراد زندگی کی بے رنگ یکسانی سے بخوبی واقف تھی۔ اب یہی کیفیت میری ہوتی نظر آ رہی تھی۔ نہ میں کتابیں پڑھ سکونگی، نہ صبح اور شام کا حسن دیکھ سکونگی۔

میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ اور میں نے اپنا سر دوسری طرف پھیر لیا۔

"بیٹی رو رہی ہو؟"

"نہیں چچا جان" میں نے ضبط کر کے کہا۔

"پھر ایسی کیوں ہو؟" انہوں نے مغموم لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں ـــ تھک گئی ہوں"۔

"بیٹی افسردہ نہ ہو۔ انشاء اللہ ڈاکٹر رشیدی کا جواب آتے ہی علاج شروع ہو جائے گا۔ یا تو وہ یہاں آئیں گے یا میں تمہیں وہاں لیجاؤں گا"۔

"اچھا چچا جان" میں نے اپنے زخمی جذبات کو چچا سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی۔

چچا جعفر کمرے سے باہر چلے گئے۔ اور میں گھبرا کر رونے لگی۔ میرے لئے اب دنیا میں ـــ اس وسیع اور روشن دنیا میں کچھ بھی نہ رہا تھا۔ تاریکی! صرف بھائیں بھائیں کرتی ہوئی تاریکی!

شاید سامنے کا دریچہ کھلا ہوا تھا۔ اس میں سے ٹھنڈی اور نکہت بیز ہوا کے جھونکے کمرے میں آ رہے تھے۔ رات کی چڑیاں باغیچے میں سُبک دلی سے سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ مگر نہیں ـــــ نہ رنگین پھولوں کو دیکھ سکتی تھی جن سے مجھے محبت تھی۔ نہ خوش گلو پرندوں کو جن سے مجھے عشق تھا۔ آہ! تاریک زندگی۔

۴

معائنہ

ڈاکٹر رشیدی کا جواب آ گیا کہ وہ یہاں نہیں آ سکتے۔ البتہ ہم کو وہاں آ جانے کے لئے لکھا تھا۔

اسی شام چچا اور میں اور بڑی بوڑھی نرس "کوہ فیروز" روانہ ہو گئے۔ جونہی ہم وہاں پہونچے ڈاکٹر رشیدی کے پرائیویٹ سکرٹری نے ہمیں ایک بڑے ہال میں بٹھا دیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ اور ایک نہایت شیریں مردانہ آواز آئی "تسلیم مسٹر جعفر!"

چچا کی آواز آئی "تسلیم، یہ میری بھانجی اور آپکی مریضہ ہیں"

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہلکی ہلکی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

چچا حادثے کی تفصیل بیان کر رہے تھے میں چپ چاپ ایک کوچ پر بیٹھی پاگلوں کی طرح ایک بے بسی کے عالم میں سر ادھر اُدھر پھیر رہی تھی۔ میرے لئے اس نئے مقام میں سوائے نئی آوازوں اور نئی خوشبوؤں کے اور کچھ نہ تھا۔ اپنی محرومی اور نامرادی کا درد دل میں لئے اکتائی ہوئی بیٹھی تھی۔

دفعتاً چچا کی آواز آئی "بیٹی زیبا! ڈاکٹر رشیدی تمہاری آنکھوں کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں۔ انکے ساتھ چلی جاؤ"

میں چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اجازت دیجئے کہ میں آپ کو سہارا دیکر لیچلوں" ڈاکٹر رشیدی نے کہا۔ اسکی آواز غیر معمولی دلفریب اور سُریلی تھی۔

میں چپ چاپ ڈاکٹر کے سہارے جدھر وہ لے گیا چلی گئی۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہوا کہ ایک دروازہ اس نے کھولا اور ہم دونوں اس میں داخل ہوگئے۔

ڈاکٹر نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا "خاتون۔ میں آپ کی آنکھوں پر شعاعیں ڈال کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ ایک ہلکی سُرخ سی روشنی محسوس کرتی ہیں یا نہیں" یہ کہتے ہوئے وہ میری کرسی کی پشت سے لگ کر کھڑا ہوگیا اور جھک کر میرا سر کرسی کی پشت پر رکھکر پیشانی کے بال ہٹا دئے۔

"میں اپنی آنکھیں بند کر لوں؟"

"جی ہاں۔ اگر آپ کوئی روشنی محسوس کریں تو مجھے بتا دیجئے"

"لیکن ڈاکٹر——!" بیساختہ میری زبان سے نکلا "اگر میں نے کوئی روشنی محسوس نہ کی—— تو کیا ہوگا؟ کیا میں ہمیشہ کیلئے اندھی ہوں" میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

رحمدل ڈاکٹر متاثر ہوگیا۔ اُس نے میری تسکین کے لئے میری گرم پیشانی پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھدیا۔ بولا "بانو! اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ آپ کی بصارت آپ کو واپس نہ ملے تو مجبوری۔ لیکن آنکھ رکھتے ہوئے بھی زندگی کو تاریک بنا لینا اور بغیر آنکھوں کے بھی زندگی کو روشن رکھنا انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے"

ان فلسفیانہ باتوں پر غور کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی میں بے بسی کے عالم میں رو پڑی "مگر ڈاکٹر، بغیر آنکھوں کے ساری زندگی کیسے کٹے گی؟ میں کوئی کتاب نہیں پڑھ سکتی۔ کوئی خوشنما منظر نہیں دیکھ سکتی۔ اب کیا ہوگا ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر نے میرے سر پر آہستہ سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "خاتون خوف نہ کیجئے۔ میں پوری کوشش سے آپ کا علاج کرونگا۔ لیکن اگر قدرت کو یہی منظور ہوا کہ آپ اپنی زندگی تاریکی میں کاٹیں تو اس کا انتظام یوں بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی قوت سامعہ کیلئے دلچسپیاں مہیا کی جائیں۔ آپ حسین چیزوں کو دیکھ نہ سکیں گی مگر خوبصورت الفاظ سُن سکیں گی۔ حسین راگ آپ کا دل بہلائیں گے"

ڈاکٹر نے آہستہ سے میرا سر کرسی کی پشت والی کشن سے لگا دیا۔ اور مجھ سے کہا کہ اس کی طرف دیکھوں۔ اپنے اسسٹنٹ کی امداد سے جو بہت خاموش نوجوان معلوم ہوتا تھا وہ دیر تک میری آنکھوں کا معائنہ کرتا اور مجھ سے طرح طرح کے سوال پوچھتا رہا۔ آخر کچھ دیر بعد اطمینان بخش لہجے میں بولا "خاتون زیبا! میرا خیال ہے کہ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ پہلے کچھ دن آپ کا علاج کیا جائے گا اور اس کا اگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا تو آپریشن کیا جائیگا"

"میں دونوں کے لئے تیار ہوں ڈاکٹر" میں نے کہا۔

پھر ہم کمرے سے باہر نکل گئے۔

٭٭٭ ۵ ٭٭٭

مریض اور معالج

ڈاکٹر شیدی کے زیرِ علاج مجھے دو ہفتے گذر گئے۔ چچا جعفر جیسے مصروف آدمی کا اپنے شہر سے باہر رہنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ وہ بوڑھی نرس کو میرے پاس چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے۔

میری آنکھوں کی اب تک وہی کیفیت تھی۔ زندگی ایک دکھ بھری تاریکی میں گذر رہی تھی۔ وہی چند لمحے میرے لئے خوشگوار ہوتے تھے جب ڈاکٹر شیدی میرے پاس آ بیٹھتے۔ اور کسی پُر لطف موضوع پر گفتگو چھیڑ کر مجھے اس میں ایسا منہمک کر لیتے کہ سوائے ایک ذہنی مصروفیت کے مجھے اور کسی بات کا احساس نہ رہتا۔

وہ عموماً ایسے موضوعوں پر گفتگو کرتے یا ان میں میری دلچسپی بیدار کرتے جن کے متعلق آنکھیں رکھنے والے بھی تخیل ہی کی آنکھوں سے کام لے سکتے ہیں۔ آغاز آفرینش۔ قدیم تہذیبیں۔ یونانی فلسفہ۔ نفسیات اور اسی قسم کے دوسرے موضوعوں پر کوئی بات چھیڑ کر میرے تخیل کو ایک راستہ سجھا دیتے۔ اور میں اُنکے متعلق اپنی بساط کے مطابق بات میں سے بات پیدا کرتی رہتی۔ اور نہ معلوم فی الواقع ایسا تھا یا محض میری حوصلہ افزائی کی غرض سے ڈاکٹر عموماً میری ذہانت اور اندازِ فکر کی بہت داد دیتے۔

یہ خیال افروز صحبتیں لذیذ بھی ہوتی ہیں اور طویل بھی۔ شاید میرے علاوہ خود ڈاکٹر بھی اُن سے کم لطف اندوز نہ ہوتے تھے۔ تھوڑے ہی دن بعد وہ اپنی فرصت کا سارا وقت بلکہ بعض اوقات اپنا کام اپنے اسسٹنٹ کے سپرد کر کے میرے پاس آ بیٹھتے۔ اور کوئی گفتگو وہیں سے شروع کر دیتے جہاں پچھلی صحبت میں ہم نے اُسے ختم کیا تھا۔ خیالی باتیں نہ کرتے تو میرے احساسات کا خیال رکھتے ہوئے ان کی آنکھیں میری آنکھوں کا کام سرانجام دیتیں اور وہ آس پاس کی ایک ایک چیز جسے دیکھنے کی میں خواہش کرتی بڑی تفصیل سے مجھ سے بیان کرنے لگتے۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ علاوہ مجھ سے ہمدردی ہونے کے ڈاکٹر کے دل میں میری قدر بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر کے رخصت ہو جانے کے بعد بعض اوقات مجھے بہت دیر تک اپنی نابینائی کا احساس تک نہ ہوتا۔ میرے تخیل کے لئے سوچنے اور غور کرنے کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ موجود رہتا تھا۔ لیکن جب کبھی عملی زندگی کا کوئی واقعہ مجھ میں اپنی نابینائی کا احساس تازہ کر دیتا تو اس تمام خود فراموشی کی کسر نکل جاتی کہ پھر کان کے سوا اور کوئی شے میرے لئے باعثِ تسکین نہ بن سکتی۔

ایک شام میں دریچے کے پاس کوچ پر بیٹھی تھی۔ سر دریچے کے باہر نکال رکھا تھا۔ درختوں پر بلبلوں کے نغمے سُنائی دے رہے تھے کہ یکایک مجھے ایک سُریلی تان سُنائی دی۔ اور پھر ایک خاص بھینی بھینی خوشبو آئی۔ معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر شیدی میرے قریب ہی کہیں ہونگے۔ کیونکہ جب کبھی وہ آتے یہی خوشبو کمرے میں پھیل جاتی تھی۔

اسی وقت ڈاکٹر کی آواز آئی "میں آپ کو دریچے میں دیکھکر ادھر آ نکلا"

"میں یہاں چڑیوں کے نغمے سُن رہی تھی ڈاکٹر۔ کیا ابھی ابھی آپ ہی کوئی مصرعہ گنگناتے زینے پر چلے آ رہے تھے؟"

"جی ہاں۔ وہ میں ہی تھا"

"کتنا پیارا راگ تھا ـــــ" میری زبان سے نکلا۔ "جب سے بصارت گئی میری قوتِ سامعہ تیز ہوتی جا رہی ہے ڈاکٹر۔ کیا آفتاب غروب ہو گیا؟"

ڈاکٹر میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے پھر کہا "ابھی ابھی غروب ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کسی طرف کو چاند طلوع ہو رہا ہو گا۔ آئیے میں آپ کو باغ میں لے چلوں"

میں فوراً تیار ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ کا سہارا دیا۔ ڈاکٹر شیدی دراز قد اور مضبوط آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انکی آواز بھی بہت دلفریب تھی۔ جس وقت ہم دونوں باغ کے زینے پر اُتر آئے اچانک میرا دل دھڑکنے لگا۔ یقیناً وہ بہت خوبصورت بھی ہو گا!

میرا دل بے اختیار چاہنے لگا کہ اسکی شکل دیکھوں۔

ہم دو منٹ باغ کے زینے پر چُپ چاپ کھڑے رہے۔

پھر ڈاکٹر رشیدی نے کہا: "اب چاند طلوع ہو رہا ہے۔ باغیچے پر اس کی ہلکی ہلکی روشنی کانپنے لگی۔ چاند نہ بہت سفید ہے نہ بہت زرد۔ پتے بھی ہل رہے ہیں۔ ان کی آواز تو آپ بھی سنتی ہونگی؟"

"ہاں آواز آ رہی ہے۔ کیا ننھے ننھے پودے بھی جھوم رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں اتنی تیز ہوا نہیں۔ بس، سربلند درختوں کی ٹہنیاں ہل رہی ہیں۔ نیچے، چاند اب کچھ اوپر کو بڑھ آیا۔ شہتوت کا سایہ خوفناک معلوم ہونے لگا۔"

"کیا شہتوت پک گئے ہیں؟"

"ہاں گرمیوں کا آغاز ہے، کچے شہتوت لگے ہیں۔ چلیئے، آپکو فوارے کی طرف لے چلوں۔"

ہم دونوں فوارے کے پاس ایک کوچ پر جا بیٹھے۔ وہ کہنے لگے "فوارے پر ایک عورت کی گردن ترشی ہوئی ہے۔ عورت کی دونوں آنکھوں میں سے پانی نکل رہا ہے۔ گویا آنسو بہہ رہے ہیں۔"

میں بول اٹھی "آہ کتنا المناک تخیل ہے۔ نہ جانے ایسا بُت کیوں تراشا گیا۔"

"چاند کی کرنیں ننھی ننھی بوندوں پر چمکنے لگیں۔ لیجئے ابھی ہمارے سامنے سے ایک جنگلی خرگوش جھاڑی میں بھاگ گیا۔ سرسراہٹ آپنے بھی سنی ہوگی۔"

"ہاں سنی تھی، ڈاکٹر آج تو آپ بالکل وہی خدمت انجام دے رہے ہیں جو کبھی میری آنکھیں دیا کرتی تھیں۔ میں سوچ رہی ہوں اگر میں یہاں سے مایوس گئی تو گھر پر میری آنکھوں کا کام کون دیگا؟"

ڈاکٹر دو لمحے چُپ رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے بغور دیکھ رہا ہے۔ میں کچھ شرما سی گئی اور بولی "ڈاکٹر، آپ کیا کر رہے ہیں؟ چُپ ہیں؟"

وہ بولے "آپنے ابھی ابھی مجھ سے سوال کیا تھا کہ آپ یہاں سے مایوس گئیں تو گھر پر آپ کی آنکھوں کا کام کون انجام دے گا۔ تو خاتون آپ کا جو بہترین دوست ہوگا اس کا سب سے بڑا فرض یہی ہوگا کہ آپ کی آنکھوں کا کام دے۔"

"میں مایوس لہجے میں بولی "مگر میں تو کوئی بھی ایسا دوست نہیں رکھتی ڈاکٹر۔ بالفرض اگر ایسا کوئی نکل بھی آئے تو اسے اتنی فرصت کہاں ہوگی کہ اپنی زندگی کے تمام کام چھوڑ کر مجھے دنیا کی باتیں سنایا کرے۔ ایسی ہمدردی تو فرشتوں میں ہوتی ہے۔ اسی لئے تو میں آپ کو فرشتہ سمجھتی ہوں۔"

"کوئی بھی ایسا دوست نہیں؟" ڈاکٹر نے مکرر پوچھا۔ اسکی آواز میں سنجیدگی اور درد بھرا ہوا تھا۔

"کوئی نہیں ڈاکٹر" میں نے کہا۔

"کیا، کیا ——— یہ خدمت میں انجام دے سکتا ہوں؟"

میں حیران ہوئی "کیا ——؟ کون سی خدمت؟"

"یہی ——— کہ زندگی بھر آپ کی آنکھوں کا کام میرے الفاظ دے سکیں۔"

"زندگی بھر؟ ——؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"یہ کیونکر ممکن ہے؟ زندگی بھر ——؟" میں پاگلوں کی طرح سوال کئے جا رہی تھی۔

میری حیرت ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ڈاکٹر رشیدی نے اپنا ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھدیا اور بھاری آواز میں بولے "زیبا! میں زندگی بھر اس خدمت کو انجام دونگا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ شدید! بڑی شدید!"

میں لرز گئی ——— ! صرف محبت کے فقرے سننا اور اپنے چاہنے والے کا چہرہ نہ دیکھنا کس قدر عجیب ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہیں دور سے ایک ملکوتی راگ میرے کانوں میں پہنچ

رہا ہے۔ میں از خود رفتہ ہو کر ڈاکٹر پر گر پڑی۔ میری زبان سے صرف اتنا نکل سکا "شیدی!"

شیدی نے مجھے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ لرزتی ہوئی آواز سے میرے کان میں پوچھنے لگے "زیبا! تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے!"

میں بے خودی کے عالم میں بولی "یقیناً۔ مجھے تمہاری آواز سے عشق ہے۔ میں تمہارے فلسفیانہ اور شاعرانہ فقروں کی شیدا ہوں ــــ"

⁂ ۲ ⁂

رنگین اندھیرا

اِس عہد و پیمان کے بعد محبت کا ایک نہایت پُر لطف اور رنگین دور شروع ہو گیا۔ میری رگ رگ میں ڈاکٹر شیدی کی محبت سرائت کرتی معلوم ہوتی تھی۔ اُن کی آواز کے سُنتے ہی میری خوابیدہ رُوح جیسے جاگ اُٹھتی۔ ان کے مضبوط ہاتھوں کو چھو کر میں اک نئی زندگی حاصل کرتی تھی۔

میری زندگی کی یہ پہلی محبت تھی۔ اور یقیناً آخری!

اب یہ ہر روز کا معمول ہو گیا تھا کہ اپنے کام سے فارغ ہو کر شام کے وقت شیدی میری طرف آ جاتے اور مجھے باغیچے میں چہل قدمی کرواتے۔ وہ گھنٹوں پتوں کا ہلنا آسمان کا رنگ شفق کی سُرخی پھولوں کی رنگین زندگی کی کہانی مجھے سُناتے رہتے۔ میری آنکھیں نہیں تھیں مگر شیدی کے فقروں نے آنکھوں کی کمی کو بہت حد تک بھلا رکھا تھا۔

اس دوران میں چچا جعفر تین دفعہ ایک ایک دن کے لئے آئے اور مجھے دیکھ کر کچھ مایوس سے چلے گئے۔

آخر جب ایک مہینہ گذر گیا تو ایک دن شیدی نے کہا "زیبا! معلوم ہوتا ہے کہ آپریشن کرنا ہی پڑیگا۔"

یہ سُنکر میں ڈر گئی۔ "شیدی۔ مجھے آپریشن کے نام سے ڈر لگتا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں۔ پہلے میں اپنی نابینائی سے بیزار تھی مگر اب محبت نے میری رُوحانی آنکھیں جگمگا دی ہیں۔ مجھے اب اپنی آنکھوں کی پرواہ نہیں رہی۔"

"مگر پیاری!" اُنہوں نے پیار کے لہجے میں کہا "تم مجھے بھی تو نہیں دیکھ سکتیں۔"

میں مچل گئی "ہاں شیدی! البتہ مجھے تمہارے دیکھنے کی کتنی تمنا ہے۔ تم خود ہی مجھے بتا دو تم کیسے ہو؟ میں تمہاری آواز سُنکر اندازہ لگا سکتی ہوں کہ تم کتنے حسین ہو گے۔ اچھا مجھے دیکھنے تو دو ــــ"

یہ کہکر میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اُن کا چہرہ ٹٹولا۔ "تم بیحد حسین ہو۔ تمہاری آنکھیں لمبی لمبی ہیں۔ تمہاری پیشانی کُشادہ ہے۔"

"یہ سب کچھ صحیح۔ مگر زیبا! خیال کرو۔ جب ہماری شادی ہو گی.... جب ہمارے ننھے ننھے بچے ہوں گے ــــ اس وقت آنکھوں کی ضرورت کس قدر محسوس ہو گی؟" شیدی کی آواز میں ایک ارتعاش تھا۔

میں شرما کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ پھر شرمیلے انداز میں بولی "شیدی کیا باتیں کرتے ہو۔"

شیدی مجھے اپنے بازوؤں میں لیکر بولے "میں غلط نہیں کہتا ــــ کچھ عرصے بعد تمہیں اپنی آنکھوں کی ضرورت محسوس ہو گی۔"

لمحہ بھر بعد کچھ سوچکر میں بگڑ سی گئی بولی "ہاں بیشک تم سچ کہتے ہو اندھی بیوی مصیبت ہوتی ہے۔ ہے نا؟"

"خُدا کی قسم یہ بات نہیں ہے میری زیبا! اندھی بیوی تو مُفید ہوتی ہے مُصیبت کیوں ہونے لگی؟ مگر میں نہیں چاہتا کہ تم آنکھوں جیسی نعمت سے زندگی بھر محروم رہو۔ اگر تمہیں اس بات کا خیال ہے کہ میں اندھی بیوی کو مصیبت سمجھتا ہوں اور محض اپنے

فائدے کے لئے تمہاری آنکھوں کا آپریشن کرنا چاہتا ہوں تو میں تم کو تمہاری موجودہ نابینائی کی حالت میں شادی کرنے پر تیار ہوں۔ کچھ عرصے بعد تمہیں خود آنکھوں کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت تمہارے کہنے پر میں آپریشن کرونگا۔ زیبا۔ اب تمہارا اطمینان ہوگیا؟"

میں مسکرائی "شیدی۔ اگر تم زندگی بھر مجھ سے ایسی ہی محبت کروگے جیسی آج کرتے ہو تو میں اپنی آنکھوں کی کمی کو کبھی محسوس نہ کرونگی۔ میرے پیارے شیدی۔ تمہیں نہیں معلوم دن رات محبت بھرے فقرے سنتے رہنا بھی ایک فردوسی زندگی ہے۔ میری آنکھیں آجائیں گی تو تمہارے محبت بھرے الفاظ بھی کم ہو جائیں گے کیونکہ پھر ان کی ضرورت نہ رہے گی۔ نہیں شیدی۔ میں اندھی ہی اچھی۔ مجھے تمہاری محبت میسر ہو تو پھر نابینائی کا کوئی غم نہیں"

یہ سنکر شیدی بیتاب ہوگئے "زیبا، پھر تو ہمیں شادی میں دیر نہیں لگانی چاہیئے۔ اس ماہ کے اختتام پر ہماری مشترکہ زندگی کا آغاز ہو تو کیسا ہو؟ ——— اصل مرحلہ تو سر جعفر کی منظوری کا ہے۔ انہیں اب تک اس کا بھی علم نہیں کہ یہاں ہم میں کس شدت کی محبت ہوگئی ہے"

میں دھیمے لہجے میں بولی "مگر میرا خیال ہے چچا کو کسی قسم کا اعتراض نہ ہوگا۔ کیونکہ ——— آخر انہیں بھی تو میری نابینائی کا خیال ہوگا کہ ——— نابینا سے شادی کون کریگا"

شیدی بول اٹھے "نہیں نہیں۔ ایسا خیال نہ کرو۔ یہ سرخ گلاب کی پتی جیسے ہونٹ، اور یہ سنہرے بال اور یہ معصوم بھولا بھولا چہرہ ہر نوجوان کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھکر کسی کو نابینائی کا خیال تک نہیں آسکتا۔

تکمیل آرزو

آخر میرا خیال درست نکلا یعنی جب ڈاکٹر شیدی نے چچا سے

میرے لئے درخواست کی تو انہوں نے فوراً منظور کرلیا۔ مگر ضرور کہا "ڈاکٹر شیدی۔ جو کچھ آپ کرنا چاہتے کچھ دنوں غور کیجے۔ ایک نابینا لڑکی سے شادی کرنا غور طلب معاملہ ہے اس پر کافی سوچ لیا ہے؟ میں نہیں چاہتا کہ آئندہ آپ کی ازدواجی زندگی میں اس کی نابینائی کی وجہ سے دقتیں پید

"سر جعفر!" ڈاکٹر شیدی کی دل فریب آواز آئی "میں کافی غور کرلیا ہے۔ اور اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ مجھے خاتون زیبا بہتر بیوی اس دنیا میں نہیں مل سکتی۔ آپ اطمینان رکھیے۔ انشا کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہوگی جس سے زیبا کو ان کی نابینائی باعث کسی قسم کی تکلیف ہو"

"پھر تو میں مطمئن ہوں" چچا نے کہا۔

اس گفتگو کے بعد اسی شام ڈاکٹر شیدی بھاگے میرے پاس آئے اور مجھے لپٹا لیا "زیبا، زیبا، مجھے مبارک تمہارے چچا نے اجازت دیدی"

پندرہ دن بعد اپریل کے آخری ہفتے کی ایک خو شام ہمارا عقد نہایت خاموشی سے ہوگیا۔ شیدی کہہ رہے تھا اس شام اپنے لمبے دامنوں والے عروسی لباس میں نار موتیا کے پھولوں میں لپٹی لپٹائی ایسی معلوم ہورہی تھی جیسے کے حسن و عشق کی دیوی۔

ہم نے اپنے "ایام عروسی" ایک چمکیلے ساحل پر وہ میری زندگی کا انتہائی پر لطف اور رنگین زمانہ تھا۔ مجھے کا زیادہ صدمہ نہ رہا تھا۔ مگر میں محسوس کرتی تھی کہ شیدی کی یہ تھی کہ میری بصارت بحال ہو جائے۔ اور ایک چاہنے و یہی تمنا ہونی چاہیئے۔

چنانچہ ایک دن جب میں دریچے میں کھڑی سمندری لطف اندوز ہورہی تھی وہ آگئے اور کہنے لگے "زیبا! ہر لمحے پر ایسا شبہ ہوتا ہے جیسے ہم فردوس میں بیٹھے ہو

تمہاری آنکھیں ہوتیں تو یہ خلش بھی نہ رہتی جو میرے دل میں خار بنکر کھٹک رہی ہے۔"

میں مسکرا کر بولی۔ "اگر میری نابینائی کا صدمہ ہماری مسرت میں خلل انداز ہو رہا ہے تو میں آپریشن کیلئے تیار ہوں شیدی۔"

"کیا واقعی؟"

"ہاں شیدی۔ بالکل"

"تم بڑی عقلمند لڑکی ہو۔ زیبا۔ سوچو تمہاری آنکھیں آجائیں گی تو ہماری زندگی کس قدر روشن ہوگی ——؟ اس کا خیال وفورِ مسرت سے مجھے پاگل بنا دیتا ہے۔ تم مجھے دیکھ سکوگی —— اپنے شوہر کو۔"

میں بیتاب ہوکر بولی۔ "اللہ وہ وقت کتنا مبارک ہوگا! تمہیں دیکھنا! اپنے پیارے شیدی کو دیکھنا۔ میری تمام روح کھنچکر میری آنکھوں میں آجائے گی۔" پھر ایک لمحے کے بعد کچھ افسردگی کے لہجے میں بولی۔ "مگر شیدی اب میں تمہارے دل کی آواز سن رہی ہوں۔ آنکھیں آجائیں گی تو ہماری محبت چپ چاپ بدھ جائیگی۔"

شیدی ہنس پڑے۔ "پاگل لڑکی۔ کوئی اتنی سی بات پر آنکھیں کھو دیتا ہے؟"

"کیوں نہیں شیدی؟" میں کہنے لگی۔ "کیوں نہیں؟ مجھے تمہارے محبت بھرے فقرے آنکھوں سے کہیں زیادہ محبوب ہیں۔ میں ان فقروں کو کھو دونگی۔ ان سے محروم ہوجاؤنگی۔"

شیدی بولے۔ "تمہیں تو محض میرے فقروں سے محروم ہوجانے کا اندیشہ ہے مگر —— کیا مجھے اس بات کا خدشہ نہیں پیدا ہوسکتا کہ تمہاری آنکھیں آنے پر کہیں —— کہیں میں تمہاری محبت ہی سے محروم نہ ہوجاؤں۔"

میں سمجھ نہ سکی۔ "ایں —— ؟ محبت سے محروم؟ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

شیدی دو لمحے خاموش رہے۔ نجانے کیا کر رہے تھے۔

میں نے پھر پوچھا۔ "شیدی، بولتے کیوں نہیں؟ تم محبت سے محروم کیوں ہونے لگے؟"

شیدی کہنے لگے۔ "زیبا! میں صاف صاف بتا دوں؟ —— دیکھو مجھے معاف کرو۔ میں نے بڑا دھوکا دیا۔ اور شاید اس دھوکے کا انکشاف اب بعد از وقت ہو۔ مگر اب بتائے دیتا ہوں کہ میں کوئی حسین آدمی نہیں ہوں۔"

میں کچھ حیران ہوئی۔ "مگر جب میں اپنی انگلیوں سے تمہارے چہرے کو ٹٹولتی ہوں تو تم بڑے حسین معلوم ہوتے ہو۔"

"ہاں —— انگلیوں کا محسوس کرنا اور بات ہے اور آنکھوں سے دیکھنا علیٰحدہ بات۔ اب تم مجھ سے محبت کرتی ہو اسلئے بھی میں تمہیں حسین معلوم دیتا ہوں۔ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد نہ محبت ہوگی نہ میں حسین معلوم ہونگا۔"

میں کچھ پریشان سی ہوگئی تھی بولی۔ "پیارے شیدی! پھر تو میں اندھی ہی اچھی۔"

شیدی ہلکی ہنسی ہنس پڑے۔ جس شخص کی ہنسی اتنی ہوشربا اور موسیقی آمیز ہو وہ بدصورت ہو سکتا ہے؟ —— کہنے لگے۔ "دیکھا، آخر ڈر گئیں نا۔ لیکن زیبا! میری بدصورتی تمہیں اندھا نہیں رکھ سکتی۔ ایک وفادار شوہر اتنا خود غرض نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی بیوی کے لئے ہر قربانی پر تیار ہو جاتا ہے۔ خواہ مجھے دیکھنے کے بعد تم مجھ سے نفرت ہی کرو۔ مگر میں ضرور تمہاری آنکھوں کا آپریشن کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ مجھے صحنِ باغ میں لے آئے۔

میں کچھ سوچنے لگی۔ باغیچے میں سناٹا تھا۔ دریچی کے پاس ایک ننھا سا پرند گا رہا تھا۔ سمندر کی موجوں کی آواز مسلسل آرہی تھی ——

بڑی دیر بعد میں نے سر اٹھایا۔ "شیدی، تم کہاں ہو —— ؟" اندھے پن کے بعد اس سوال کی مجھے عادت ہوگئی تھی پھر بولی۔ "تم یکلخت چپ ہوگئے۔ کیا سوچ رہے ہو؟"

"پیاری! میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب محبت کے اندھے دیوتا کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں تو کیا ہوتا ہے؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "شیدی۔ تم بڑے بدگمان آدمی معلوم ہوتے ہو۔ مجھے تمہارے حسن یا بدصورتی سے یقیناً محبت نہیں۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ یقین کرو تم سے۔ کاش میں اپنا دل کھول کر تمہیں بتا سکتی۔ تم میری آنکھوں کا آپریشن کرو اور دیکھ لو۔ میری محبت کا دیوتا تمہاری صورت کے معاملے میں ہمیشہ اندھا ہی رہے گا۔"

"کیا تم دل کی گہرائیوں سے کہہ رہی ہو زیبا؟—"

انہوں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ میرے پیارے شیدی۔ دل کی گہرائیوں سے۔"

"تم مجھ سے ہمیشہ محبت کرو گی زیبا؟"

"ہمیشہ شیدی۔"

یہ سنکر شیدی نے مجھے مضبوطی سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

۸

کشمکش

اس گفتگو کے دو تین ہفتے میرے آپریشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔

چچا جعفر اور ڈاکٹر شیدی مجھے تسلی دلاسے دیتے رہتے تھے۔

آخر وہ ہیبتناک دن آ گیا اور میرا آپریشن ہوا۔ وہ وقت بھی گذر گیا۔ اب میری آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ کمرہ اندھیرا رکھا جاتا تھا۔ نویں دن میری پٹیاں کھلنے والی تھیں۔ گویا اگر میری قسمت میں ہوا تو نو دن کے بعد میں اپنے محبوب شوہر کا چہرہ دیکھ سکونگی۔ نہ پوچھیے وہ ایام کس بیقراری اور تذبذب میں کٹے۔

جس صبح میری پٹیاں کھلنے والی تھیں اس کی رات شیدی کمرے میں کچھ گھبرائے گھبرائے سے آئے "زیبا آج کی شام کرنی چاہیئے۔ کیا پتہ یہ شام ہماری صحبت کی آخری شام ہو۔ اس کے بعد کیا پتہ ہماری تقدیر بدل جائے۔"

مجھے صدمہ ہوا "شیدی، تم ایسی باتیں کرو گے تو میں ابھی کھول کر پھینک دونگی۔"

شیدی بولے "تو پھر شاید آج ہی شام سے زندگی بدل جائے۔"

میں چلا کر بولی "اگر میری آنکھوں کی روشنی سے زندگی تاریک ہو جانے کا اندیشہ ہے تو میں کبھی نہ چاہونگی کہ آنکھیں آ جائیں۔"

"اچھا زیبا۔ کل تمہاری محبت، اور میری کم روئی ..."

میں بولی "بیشک ہوگا۔ شیدی، عورت اپنے شوہر کو چاہتی ہے خصوصاً ایسی لڑکی، جس نے اپنی زندگی میں شوہر کے سوا کبھی کسی مرد سے محبت نہ کی ہو۔ کیا تم کو علم نہیں میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔"

شیدی بغور میرے چہرے کا مطالعہ کر رہے تھے اور خاموش تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد جھک کر میرے رخسار ... اور بولے "اچھا زیبا خدا حافظ۔ صبح دیکھا جائے گا کہ جب اندھے دیوتا کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں تو کیا ہوتا ہے۔"

میں مسکرا کر بولی "دیکھ لینا۔"

۹

حسن یا محبت؟

دوسرے دن کی صبح کو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ خواہ مخواہ میرے دل میں ایک وسواس سا پیدا کر دیا تھا۔ او

بصارت بحال ہوتی ہے یا نہیں۔ ہو بھی جاتی تو پھر طرح طرح کے اندیشے تھے۔ میں خدا سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ معبود! مجھے اس امتحان میں کامیاب کر۔ کبھی اپنے دل سے باتیں کرنے لگتی کہ کیا واقعی جس شخص کی میں شیدائی ہوں جسے میں دنیا کا بہترین مرد سمجھتی ہوں وہ کم رو اور کریہہ منظر آدمی ہے! ـــ کیا اسے دیکھ کر میری محبت لرز جائے گی! ـــ میں یہ دعا نہیں کرتی کہ وہ بدصورت نہ ہو بلکہ یہ دعا کرتی ہوں کہ اُسے دیکھ کر میری محبت سہم نہ جائے۔ مجھے شیدی سے محبت ہے۔ محبت ہے۔ میرے قدم اس راہ میں کبھی نہ ڈگمگائیں گے۔ مگر پھر آپ سے آپ دل سرگوشی میں کہنے لگتا پاگل لڑکی۔ محبت کا تعلق تو دل سے پہلے آنکھ سے ہے۔ محبت دیکھ کر ہوتی ہے۔

غرض میری رات شدید ترین اضطراب میں کٹی۔ صبح ہوئی تو دل مارے اندیشوں کے بیٹھا جا رہا تھا۔ جب شیدی میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں ہانپ رہی تھی۔ بے بس ہو کر ان سے لپٹ گئی ـــ

"زیبا! میری زیبا! کیسی ہو رہی ہو؟"

"میں اچھی ہوں" مگر ایک سسکاری نکل گئی۔

"کیوں؟ میری قسمت پر رو رہی ہو؟" انہوں نے بھاری آواز سے پوچھا۔

میں ضبط کر کے بولی۔ "میں سوچ رہی ہوں اتنی مدت بعد میں دنیا کو کیسے دیکھوں گی! اس خیال سے خوف معلوم ہوتا ہے"

میں نے شیدی کا گرم سانس اپنے رخسار پر محسوس کیا پھر بولی "شیدی جب میں تم پر پہلی نگاہ ڈالوں گی تو میرے دل کی کیا حالت ہو گی! ـــ اُف میرے اللہ!"

شیدی سنجیدہ لہجے میں بولے "زیبا، یہ تمہاری آنکھوں کی پٹیاں میں نہیں کھولوں گا مجھے ڈر لگتا ہے۔ میرا اسسٹنٹ یہ خدمت انجام دے گا"

"جیسی تمہاری مرضی شیدی۔ میرا تو یہی خیال تھا کہ تم کھولو گے۔ اور دنیا میں سب سے پہلے مجھے تمہاری حسین صورت نظر آئے گی"

"اگر وہ حسین ہوتی تو ایسا ہی ہوتا زیبا"

آخر وہ وقت آ گیا کہ میری پٹیاں کھولی جانے لگیں۔ میں چپ چاپ لیٹی تھی۔ میرے اطراف دو تین ڈاکٹروں کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ شیدی بھی اس کمرے میں موجود ہیں۔

آخر پٹی کھل گئی ـــ ڈاکٹر نے مجھے دیکھنے کو کہا۔

اُف وہ لمحہ! پلکوں کو پلکوں سے جدا کرنا۔ روشنی کیلئے! یا ابدی تاریکی کے لئے ـــ! سہمے اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے پلک اُٹھائی۔

میں لرز گئی۔ اور ایک چیخ سی میرے منہ سے نکلی ـــ روشنی کی پہلی کرن میں نے محسوس کی۔ اس دھندلی روشنی میں سے کمرے کے رنگ ابھرتے اور واضح ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ میں ایک سبز دریچوں والے حسین کمرے میں کوچ پر پڑی تھی۔ کھڑکی میں سے آسمان نظارہ افروز تھا۔ وہی نیلا، روشن حلم سے مسکراتا ہوا آسمان"

"شیدی! شیدی!" میرے منہ سے نکلا۔ شیدی نے مجھے میری آنکھیں واپس دیدیں۔ یہ انہیں کے پیارے ہاتھوں کا کرشمہ ہے۔ میرے دل میں محبت کا ایک چشمہ ابلنے لگا۔ اس شخص کو دیکھنے کے اشتیاق نے مجھے پاگل بنا رکھا تھا جس سے مجھے محبت تھی اور جس نے مجھے آنکھیں بخشی تھیں۔

دفعتاً پردے کے پاس مجھے کچھ آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور چیخ کر کہا "شیدی!" مردانہ حسن و وجاہت کا ایک نفیس نمونہ پردے کے پاس کھڑا تھا۔ لمبی لمبی نشیلی آنکھیں۔ سنہرے بال حسین مانگ۔ نہایت شگفتہ چہرہ۔ میں بیخود ہو کر اس کی طرف

گئی۔ وفورِ شوق سے میری زبان سے بمشکل اتنا نکلا "میرے شیدی"۔

نوجوان نے سر جھکا کر مجھے سلام کیا۔ بھاری آواز میں بولا۔

"ڈاکٹر شیدی باہر ہیں معزز خاتون میں انکا اسسٹنٹ ہوں"۔

"او ۔۔۔۔" میں نے مایوس لہجے میں کہا "مجھے غلطی ہوئی۔ کیا آپ براہِ کرم انہیں بلا دیں گے"۔

اسسٹنٹ بولا "پانچ منٹ میں وہ خود ہی آجائیں گے۔ وہ اپنے اس وقت کے اضطراب کو مریضوں میں مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

میں اپنا اشتیاق چھپا نہ سکی "اسسٹنٹ تم کو معلوم ہے کہ میں مدت سے اندھی تھی۔ میں نے اپنے شوہر کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔ آپ مجھے بتا دینگے کہ وہ کیسے ہیں!"

وہ مسکرایا "وہ ۔۔۔۔ منٹل پیس پر ڈاکٹر شیدی کی تصویر رکھی ہے ادھر آئیے"۔

میں منٹل پیس کے پاس گئی اور تصویر اٹھالی "یہ شیدی کی ۔۔۔ میرے رفیقِ زندگی کی تصویر ہے! میرے اللہ" میرے منہ سے ایک آہ نکل گئی۔ یہ ایک چالیس سالہ مرد کی تصویر تھی۔ پیشانی فراخ مگر نقش نہایت بھدے۔ چہرے پر کرختگی برس رہی تھی اور تمام تصویر پر کچھ ایسی بے رونقی اور بدصورتی چھائی ہوئی تھی کہ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ سامنے قدِ آدم آئینے میں اپنا کاہیدہ مجسمہ دیکھکر میں لرز گئی۔ مجھ سی نازنین عورت یہ کس مرد کی محبت میں گرفتار ہوگئی!۔

اسسٹنٹ مجھے بغور دیکھ رہا تھا بولا "بھولی خاتون! کس سوچ میں کھڑی ہو؟ آپ کی کچھ دنوں کی نابینائی نے آپ کی زندگی سے بڑی بدسلوکی کی۔ جب ڈاکٹر شیدی سے آپ کی شادی ہونے کو تھی تو کئی بار میرا جی چاہا کہ کسی خفیہ طریق پر آپ کو ان کی بدصورتی کے راز سے آگاہ کر دوں۔ مگر آپ جانیئے ڈاکٹر شیدی بھلا ایسا موقع مجھے کب دینے لگے تھے ۔۔۔۔! آخر انہوں نے وہی کیا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ ان کی عمر چالیس سال کی ہوگئی! انکی تجرد کی زندگی کی تمام ذمہ داری انکی شکل پر عائد ہوتی ہے۔ اس علاقے کی تقریباً تمام لڑکیوں نے انہیں بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ آخر آپکی بدنصیبی آپ کو یہاں کھینچ لائی"۔

میں ششدر کھڑی تھی۔ اور ٹکٹکی باندھ کر اس حسن کے دیوتا کو دیکھ رہی تھی جو میرے سامنے کھڑا تھا۔ یہ بالکل افسانوں کے ہیرو کا سا حسن و جمال رکھتا تھا۔ کچھ دیر بعد میری نظر اپنے شوہر کی تصویر پر گئی۔

"مگر مجھے ڈاکٹر شیدی سے محبت تھی ۔۔۔ محبت ہے"۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"آپ کی محبت نابینائی کی مرہونِ منت ہے، اب آپ اپنی آنکھوں سے مشورہ لیجے۔ سچ تو یہ ہے خاتونِ زیبا۔ آپ سی نازنین لڑکی کو ڈاکٹر صاحب جیسے مکروہ انسان کے ساتھ دیکھکر میرے دل پر چھریاں چلنے لگتی ہیں"۔

"آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیئں اسسٹنٹ ۔۔۔ محبت کا دارومدار حسن پر نہیں ہوتا"۔

نوجوان اسسٹنٹ دلفریب آواز میں ہنس پڑا "ایمان سے کہیئے آپ کو اپنے شوہر کی تصویر کو دیکھکر مایوسی نہیں ہوئی؟"

میں بولی "اسکے لئے میں پہلے سے تیار تھی۔ شیدی نے مجھے خود بتا دیا تھا کہ وہ حسین نہیں ہیں۔ مگر ۔۔۔ میں سمجھتی تھی ۔۔۔ وہ ۔۔۔ انکی شکل ایسی تو نہ ہوگی"۔

"اگر آپ کو شبہ ہو تو کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لیجے۔ وہ برآمدے میں ایک مریض کو کچھ ہدایتیں دے رہے ہیں"۔

میں دھڑکتے ہوئے دل سے کھڑکی کی طرف گئی، اور جھانک کر دیکھا۔ آہ، میرا دل بیٹھ گیا۔ وہ تصویر سے زیادہ بدصورت تھے۔ کیا میں اسی شخص کی پرستش کرتی ہوں؟ کوئی عورت اس سے محبت کر سکتی ہے؟۔

میں سر پکڑ کر ایک کوچ پر بیٹھ گئی۔

نوجوان اسسٹنٹ سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے ایک گہرے نیلے رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ گہرے سبز رنگ کی نکٹائی زیب گلو تھی۔

وہ ایک افسانوی انداز میں مجھ پر جھک کر بولا "خاتون زیبا۔ آپ بڑی جلد باز لڑکی ہیں۔ مگر آپ سے زیادہ تعجب مجھے آپ کے چچا پر ہوتا ہے انہوں نے آپکو اس تاریک غار میں کیوں پھینک دیا۔ کیا ڈاکٹر کی دولت اور ثروت نے انہیں اندھا کر دیا تھا!"

میں جلدی سے بولی "نہیں نہیں۔ سر جعفر کو دولت و حشمت کی مطلق پرواہ نہیں۔ انہوں نے یہی سوچا ہوگا نا ــــ کہ اندھی لڑکی ــــ"

"یہ ظلم ہے صریحاً ظلم" اسسٹنٹ نے کہا "آپ سی حسین لڑکی اگر اندھی بھی تھی تو کسی کو کیا پرواہ ہو سکتی تھی! مثال کے طور پر میں خود اپنے آپ کو پیش کر سکتا تھا۔ اگر آپ سی اندھی بیوی مجھے مل جاتی ــــ تو میں اپنے آپ کو خوش نصیب ــــ"

میں نے روکا "ایں ایں۔ اسسٹنٹ! کیا کہتے ہو؟ میں تمہارے چیف کی بیوی ہوں۔ تم بہت نامعقول شخص نکلے"

"معاف کرنا خاتون زیبا۔ مجھ سے لغزش ہوئی"

میں نے روکھائی سے کہا "اچھا تو اب آپ براہ کرم ڈاکٹر شیدی کو بلائیں، میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں"

"بہت اچھا" یہ کہکر اسسٹنٹ باہر چلا گیا۔

جب محبت کے اندھے دیوتا کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر شیدی اپنے کرخت وضع کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کمرے میں آئے اور خوبصورت اسسٹنٹ باہر چلا گیا۔

"زیبا" انہوں نے کہا۔ انکی آواز میں لرزش تھی۔

"شیدی" میری زبان سے نکلا۔ اور ساتھ ہی ہجوم جذبات سے دو موٹے موٹے آنسو میرے رخسار پر ڈھل آئے۔

"زیبا! آنکھیں مبارک! سچ سچ تم دیکھ سکتی ہو! ایں روتی ہو! کیوں کیا میری تقدیر پر؟" انہوں نے نہایت افسردگی کے ساتھ کہا۔ انکی آواز ایک انوکھے طور پر دردناک معلوم ہو رہی تھی۔

میرے حواس جیسے سُن ہو گئے تھے "نہیں شیدی نہیں" یہ کہکر نجانے کیوں میں سسکیاں لینے لگی۔

وہ کسی قدر قریب آ گئے "زیبا۔ جب محبت کے اندھے دیوتا کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں تو یہی کچھ ہوتا ہے... سسکیاں ــــ اپنے کئے پر پچھتاوا ــــ آنسو ــــ"

میں ضبط کر کے بولی "نہیں شیدی۔ میں اپنے قول پر قائم ہوں میں اب بھی ــــ تم کو چاہ ــــ تی ہوں"

"ہاں۔ چاہتی تو ہو۔ مگر کیا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتی ہو کہ نابینائی کے ایام میں جس وارفتگی سے مجھے چاہا کرتی تھیں وہی وارفتگی اب تک موجود ہے؟"

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں "شیدی۔ مجھے آنکھیں نہیں چاہئیں۔ مجھے تمہاری محبت چاہیئے! میری آنکھوں میں کوئی تیزاب ڈال دو۔ تاکہ پھر میں اپنے خوابوں کے جزیرے میں تمہاری ہی محبت کا گیت گا سکوں۔ میرے شیدی! آنکھیں بڑی فسادی ہوتی ہیں۔ یہ مجھے نہیں چاہئیں۔ مجھے محبت کی اندھی آنکھیں چاہئیں" یہ کہتے ہوئے میں رونے لگی۔

"زیبا میں تمہاری زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ ایک مدت تک میری ویران زندگی تنہائی اور تجرد کے عالم میں بسر ہوتی رہی۔ پھر تم آئیں اور میں نے تمہیں دھوکا دیکر تمہیں اپنے محبت کے جال میں پھنسا لیا۔ اب جبکہ تمہاری بصارت بحال ہو گئی ہے میرے دھوکے

کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔"

"مگر شیدی" میں پریشان لہجے میں بولی "تم نے میری آنکھوں کا آپریشن کیا ہی کیوں؟ میں خوش تھی۔ میں اندھی تھی اور محبت کی پرستار تھی۔"

"وہ میرا انسانی فرض تھا زیبا۔"

"آہ، تم بہت نیک ہو شیدی۔"

"تم نے اپنی آنکھیں بند کیوں کر رکھی ہیں؟" شیدی نے پوچھا انکی آواز میں ایک درد تھا۔

"مجھے اسکی عادت ہو گئی ہے شیدی۔ آنکھیں بند ہوتی ہیں تو میں خواب اور افسانے کی سرزمین پر ہوتی ہوں۔"

"اور جب وہ کھل جاتی ہیں تو ایک دیوتا آدمی تمہارے دلآویز تخیلات کی عمارت کو مسمار کر دیتا ہے۔ یہی بات ہے نا؟" انہوں نے نہایت افسردگی سے پوچھا۔

"نہیں شیدی، ہرگز نہیں۔ مجھے آنکھیں بند رکھنے میں محض اس لئے مزہ آتا ہے کہ مجھے اپنے عشق کے ابتدائی دن یاد آجاتے ہیں، جب میں اندھی تھی اور تم نے پہلے پہل اظہار آرزو کیا تھا۔"

شیدی نے میرا بازو چھوا اور کمرے کی دوسری طرف لے گئے۔ پھر ایک جگہ مجھے کھڑا کر کے کہا "زیبا۔ اب آنکھیں کھولو۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے قد آدم آئینے میں ہم دونوں کا عکس نظر آرہا تھا۔ میں مبہوت ہو کر اپنے حسین اور کاہیدہ اور اپنے شوہر کے بھدے اور کریہہ منظر کے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ میرا دل خون ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا اپنا منہ نوچ لوں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور باوجود انتہائی کوشش ضبط کے میرے آنسو نکل آئے۔

شیدی نہایت دل شکستہ نظر آرہے تھے "زیبا! اب تم نے دیکھ لیا؟ ـــــ میں تمہارے قابل نہیں۔ اگر دنیا میں انصاف کوئی چیز ہے تو مجھے چاہیئے کہ تم سے معافی چاہوں اور ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جاؤں۔ یہی میری سزا ہے۔"

"شیدی، ایسی باتیں نہ کرو۔"

"کیوں ایسی باتیں نہ کروں زیبا؟ آخر مجھے اپنی کم روئی کا احساس ہے۔ اپنے جرم کا احساس ہے۔ تمہارے حسن کا احساس ہے۔ ہر روز تم میری محبت کا مقابلہ دوسروں سے کرو گی۔ میرے حسین اسسٹنٹ ہی سے کرو گی۔ میں سوچتا ہوں کہ جب تم مجھے اور اسے یکجا دیکھو گی تو تمہارے دل پر کیا گزرے گی؟"

میں بیقرار ہو گئی۔ "شیدی۔ تم بے حد بدگمان ہو۔" اسی وقت میری نگاہ اتفاق سے الماری پر جا پڑی۔ اس میں ایک شیشی نظر آئی جس پر کسی تیزاب کا نام جلی لفظوں میں لکھا تھا۔ میں نے الماری کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔ "وہ الماری میں کیا چیز رکھی ہے؟ کوئی تیزاب ہے؟ میں اسے اپنی آنکھوں میں ڈال لونگی۔ اور ہمیشہ کے لئے اندھی ہو جاؤنگی۔ پھر تو ہماری زندگی مزے سے کٹے گی نا ـــ؟"

یہ کہکر میں الماری کی طرف بڑھی۔

شیدی جلدی سے بولے "ٹھہرو۔ تمہیں پھر اندھا بننے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنی مکروہ شکل ہمیشہ کے لئے چھپا لوں گا۔ اپنی آنکھیں ضائع نہ کرو۔ جب حسن دیکھنے کو مل جائے تو آدمی کو اندھا نہیں ہونا چاہیئے۔" پھر وہ دریچے کی طرف گئے اور ہلکی آواز میں کہا "اسسٹنٹ!"

اسی وقت اسسٹنٹ اندر داخل ہوا۔ وہی حسین چہرہ، وہی میٹھی مسکراہٹ۔ وہی دل میں گھر کرنے والی نشیلی آنکھیں۔ میں نے اپنا چہرہ پھیر لیا۔

شیدی نے نہایت درد انگیز لہجے میں کہا "زیبا میں انصاف پسند ہوں۔ میں سمجھ سکتا ہوں میں تم سی حسین لڑکی کے ناقابل ہوں۔ شاید آنکھیں مل جانے کے بعد یہ نوجوان تمہارا زیادہ موزوں رفیق ثابت ہو سکے۔"

مَیں حیران ہوکر اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔ مایوسی اور صدمے سے وہ پاگل ہو رہے تھے۔

میں نے رحم اور بے بسی کے لہجے میں کہا: "شیدی، تم جو کچھ کہہ رہے ہو اُسے نہیں سمجھتے۔ تمہارا دماغ بیکار ہو گیا ہے۔"

شیدی نے سنجیدگی سے کہا: "زیبا۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ اسی لئے تو کہہ رہا ہوں۔ خدا حافظ زیبا۔ مجھے معاف کر دو۔" یہ کہہ کر اُنہوں نے ایک آخری نظر مجھ پر ڈالی اور باہر چلے گئے۔

میں چیخ پڑی: "اسسٹنٹ، اسسٹنٹ۔ انہیں بلاؤ۔ دیکھو۔ یہ تیزاب کی شیشی ـــــ مَیں یہ تیزاب اپنی آنکھوں میں ڈال رہی ہوں ـــــ مَیں اندھی ہو رہی ہوں۔ اپنے شوہر کی خاطر ـــــ"

یہ کہہ کر مَیں نے شیشی کا کارک کھول لیا۔

ایک جھٹکے کے ساتھ شیشی میرے ہاتھ سے دُور جا گری اور اسسٹنٹ نے قریب آکر کہا: "دیوانی ہو گئی ہو؟ وہ مکروہ شکل اب تمہاری زندگی سے باہر ہے۔ مُفت میں اپنی آنکھیں کیوں کھوتی ہو؟" شدّتِ مسرت سے اس کی آواز عجیب ہو رہی تھی ـــــ

"کیونکہ ـــــ کیونکہ اسسٹنٹ مجھے محبت چاہئیے صرف محبت۔ ڈاکٹر شیدی حسین نہ سہی۔ مگر مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ دلی محبت۔ ایسی محبت ـــــ جس نے میری اندھی دُنیا کو روشن کر دیا تھا۔ مَیں اس محبت کو کھو نہیں سکتی۔" میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

"زیبا!"

میری رُوح کانپ گئی۔ ایں۔ یہ کس کی آواز ہے! ـــ

"ڈاکٹر شیدی!!"

میں نے آنکھیں کھولیں: "اسسٹنٹ! کیا ابھی ابھی ڈاکٹر شیدی نے مجھے بلایا تھا! میں سچ کہتی ہوں مجھے ان ہی سے محبت ہے۔ اُنہیں بُلاؤ ـــــ انہیں بُلاؤ۔ اپنی نشیلی آنکھوں سے مجھے نہ دیکھو میری محبت حُسن کی محتاج نہیں۔ میری محبت اُن کی محبت اتھاہ محبت کو پکار رہی ہے۔"

"میری طرف دیکھو زیبا! کیا میری آنکھیں تمہیں محبت کا سبق نہیں پڑھا سکتیں! مجھے اپنی ان آنکھوں سے نہ دیکھو۔ دل کی آنکھوں سے دیکھو۔ شاید اس طرح تم اس میں میری اتھاہ محبت کو پا سکو۔ اپنی آنکھیں بند کرلو اور میرے چہرے کو ٹٹولو۔"

میں اس نوجوان کو تک رہی تھی کہ اچانک ایک نئے کانپتے ہوئے احساس سے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور نہ معلوم فطرت کے کس اصرار پر جوشِ اضطراب کے کس تقاضے پر میں نے آپ سے آپ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور تاریکی کی قدیم رفاقت میں ایک بار پھر میری ذی حس اُنگلیوں کے سرے ایک بیقراری سے اُسکے چہرے کے نقش و نگار ٹٹولنے لگے ـــــ

میرے منہ سے اچانک ایک چیخ نکل گئی! اور میں نے ایک اضطرار کے عالم میں اپنی بیتاب آنکھیں کھولدیں۔ اور حیران ہو کر اس حُسن کے مجسمے کو دیکھنے لگی: "ایں! شیدی! میرے شیدی!!؟"

وہ خاموش کھڑا مسکرا رہا تھا! ـــ

حجاب امتیاز علی

اُلٹ پُلٹ

شادی کے دَوران میں ہنیلی سہیلیوں نے حمیدہ بانو کے دل نشین پڑھا دی تھی، کہ سُسرال میں عزت چاہے تو خبردار کسی سے بولیو نہیں، زبان فساد کی جڑ ہے، دُنیا جہان کے فتنے اِس نگوڑی زبان کے ہی سبب اُٹھتے ہیں۔

اِس اُنجھر نے حمیدہ پر جادو کر دیا۔ سُسرال جاکر وہ چُپ سادھی، کسی اور کا تو ذکر ہی کیا مہینوں خاص گھر والے سے بھوٹے مُنہ بات کرنے کی روادار نہ ہوئی۔

کچھ دن تو یہ ادا سب کو پسند آئی، محلّے ٹولے کی بہو بیٹیوں میں چرچا رہا، کہ واہ واہ خالہ بختاور کو جیسی بہو ملی ایسی سب کسی کو نصیب ہو، بڑی شرمیلی ہے، کوئی کچھ کہا کرے، کیا مجال جو اُلٹ کر جواب دے۔

لیکن ہر بات کی حد ہوتی ہے، آخر کب تک، زبان ہی سے تو دوسرے جانوروں پر انسان کو فضیلت حاصل ہے، جب کوئی ہر وقت مُنہ میں گونگی کی گھنگھنیاں بھرے رہے، تو کیوں نہ آس پاس والوں کا دَم گھُٹے۔

حاصل کلام یہ کہ جس خصلت نے لوگوں کو حمیدہ بانو کا گرویدہ کر رکھا تھا، وبالِ جان ہوگئی، اور دُلہن کا قفلِ خاموشی توڑنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ جھڑکی، دھمکی، ٹھٹولی، برہمی، خوشامد، بیزاری، چھیڑ چھاڑ، کونسا دقیقہ تھا کہ اُٹھا رکھا گیا، مگر اُنکی جو اری کھلنی تھی نہ کھلی۔

ویسے کہنے کو حمیدہ بانو گھر کا کام کاج بھی کرتی تھیں، لیکن کس طرح، کونڈا کنستر سامنے رکھدیا، گھونگھٹ کاڑھے کاڑھے آٹا گوندھنے لگیں، نمک مرچ ہلدی دھنیا کی رکابی دی سل پر مسالا رگڑ لائیں، کسی چیز کی کمی بیشی سے انہیں بحث نہیں، ورد یا رہا یا پتلا ہوگیا، جانے اُنکی بلا۔ ان تو گُم سُم ہیں، مُنہ سے بولیں نہ سر سے کھیلیں۔

میاں عاجز، ساس کا ناک میں دَم، خُسر پریشان، آنے جانے والیاں حیران۔ کون کون سے ڈھنگ نہ برتے، کیا کچھ نہ کیا۔ حمیدہ بانو تھیں کہ آج بولیں نہ کل بولیں۔

آہ! جو بہو ارمانوں سے لائی گئی تھی کہ گھر کی رونق بڑھائے گی، اُس نے گھُنّی سادھ کر سب کا ناطقہ بند کر دیا۔

جو آتا بختاور بیگم بہو کا دُکھڑا لے بیٹھتیں، کوئی کہتا تھا: مارے شرم کے زبان نہیں کھُلتی، کسی نے آسیب کا خلل بتایا، مٹیا پھونس عقیدے کی بڑی بوڑھیاں جادو ٹونے کا اثر سمجھیں۔ اکثر رشتہ داروں کا خیال تھا، کسی نے کچھ کھلا پلا کر گلا مار دیا ہے —!

غرض عجیب عجیب قیاس آرائیاں ہوئیں، طرح طرح کے مشورے کئے گئے، مگر ہوا ہوایا خاک نہیں۔

ایک روز بختاور بیگم کے بھتیجے خورشید علی صاحب جو اپنی پھوپی سے ملنے آئے، اور بھابی جان کا حال پوچھا، تو معلوم ہوا، ویسے تو ٹھیک ہیں، مگر بولتی نہیں۔

"اچھا! بولتی نہیں، تو گونگی ہونگی میں جانوں" خورشید علی صاحب نے کہا۔

بختاور بیگم۔ بیٹا! گونگی ہوتی تو صبر آجاتا، سُنتی ہوں اکیلے میں تیرے بھائی سے کچھ کچھ بات چیت کر لیتی ہے۔

خورشید علی۔ بس، اور کسی سے نہیں بولتیں؟

بختاور بیگم:۔ اے بیٹا! آدھی بات نہیں کرتی، تیرا بھائی ہو یا نہ ہو، سارا سارا دن اوپر کوٹھے پر کمرہ بند کئے پڑی رہتی ہے، کبھی اس طرف آئی بھی تو کیا سوا ہاتھ کا گھونگھٹ کاڑھے، بالکل چُپ چاپ۔۔ ... کتنے ہی تعویذ گنڈے بھی کئے.....

خورشید علی:۔ بھلا تعویذ گنڈے ایسے کاموں میں چلتے ہونگے، پھوپی اماں!۔

بختاور بیگم:۔ مَیں تو تیرے بھائی کی شادی کر کے پچھتائی، وہ اور تیرے پھوپا کچہری چلے جاتے ہیں، دُلہن زینے کی کنڈی لگائے کوٹھے پر کمرے میں پڑی رہتی ہے، بیٹا اب کیا کروں، دو سال ہونے کو آئے تجھے ہی کچھ معلوم ہو تو بتا، بڑی پریشانی ہو رہی ہے۔

خورشید علی:۔ پریشانی کی کیا بات، پھوپی اماں! وہ تو بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

بختاور بیگم:۔ (خوش ہو کر) تیرے منہ میں گھی شکر، بیٹا! بڑے ثواب کا کام ہے، ہاں تو علاج میں خرچ کیا ہوگا۔

خورشید علی:۔ خرچ ورچ کا ہے کا، بغیر پیسے ٹکے درست ہو گئیں تو بات ہی کیا رہی۔

بختاور بیگم:۔ سچ کہیو! اے میں تو ملانوں سیانوں میں بڑا پیسہ گلا چکی ہوں، پھر دیکھو تو فائدہ رتی بھر نہ ہوا۔

خورشید علی:۔ جی رتی بھر، خدا نے چاہا سولہ آنے ٹھیک ہو جائیں، پٹ پٹ باتیں کریں، ایک ہی دن میں دو سال کی کسر نکل جائے۔

بختاور بیگم:۔ (بلائیں لیکر، صدقے گئی بیٹا! تو پھر جلدی سے علاج کر، میرا لال!!

خورشید علی:۔ خیر علاج کرنا تو آپ ہی کو پڑیگا، میں صرف ترکیب بتا سکتا ہوں، نہایت اعلیٰ درجے کی۔

بختاور بیگم:۔ تو بیٹا ترکیب ہی بتا دے!

خورشید علی:۔ مگر آپ کرینگی، جیسا کہوں؟۔

بختاور بیگم:۔ ضرور کرونگی، پر بیٹا ایسی نہ بتائیو کہ مجھ سے ہو نہ سکے۔

خورشید علی:۔ ہو کیوں نہ سکے، پھوپی اماں ہو سکے اور بڑی آسانی سے!

بختاور بیگم (خوش ہو کر، پھر دُلہن بولنے لگے گی؟۔

خورشید علی:۔ اجی صاحب بولنا بھی کیسا خوب چیخیں حلق پھاڑ پھاڑ کر ایک دفعہ کو محلہ سر پر اُٹھالیں۔

بختاور بیگم:۔ اچھا... تو وہ ایسی کیا ترکیب ہے؟۔

خورشید علی:۔ ترکیب کیا معمولی سی بات ہے، پھوپی اماں! موقعہ دیکھکر کوئی چھوٹا سا الزام لگا دیں، جب وہ اُسے کاٹیں تو آپ ہرگز نہ مانیں، برابر الزام پر الزام لگائے جائیں۔ بھابی جان کتنی ہی تنتنائیں آپ ایک نہ سنیں، اپنی ہی کہے جائیں!

یہ نسخہ فی الحال صرف تین روز کے لئے ہے، چوتھے دن حاضر ہونگا، ضرورت ہوئی تو دوسرا طریقہ بدل دیا جائیگا.....

(۳)

خورشید علی صاحب نے بختاور بیگم کو الزامات کی دو تین صورتیں بتائیں، چند فقرے اور خاص خاص الفاظ ذہن نشین کرائے، پھر طریقہ استعمال سمجھا کر رخصت ہو گئے۔

ابھی کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی، کوٹھے کے کواڑ بھیڑے جانے کی دھڑ دھڑاہٹ ہوئی۔ بختاور بیگم سمجھ گئیں کہ اب دُلہن بی ادھر آنے والی ہیں۔

فوراً جھاڑو سنبھال زینے پر چڑھیں اور چپکے سے کواڑوں کی اوٹ (آڑ) میں جا کھڑی ہوئیں، جوں ہی حمیدہ بانو نے کنڈی کھولی اور زینے میں قدم رکھا، ساس صاحبہ جھاڑو تان کر چیخیں:۔

"کیوں ری چڑیل یہ کیا ہو رہا تھا، ہائے وہی تو میں کہوں ہر وقت کوٹھے پر کیوں رہتی ہے، قطامہ آج معلوم ہوا آنے دے ذرا اپنے خصم کو، بوٹیاں ہی نہ نچوائی ہوں تو نام نہیں"۔

تو بھلا حمیدہ بیچاری نے کاہے کو کسی کی کڑی بات سنی

تھی، دُھک سے رہ گئی، کچھ عجیب حال ہوا، غصّہ آیا، دل بیٹھا، تن بدن میں آگ لگی، تیز آنسوؤں کا طوفان اُٹھا اور آنکھوں تک آتے آتے سوخت ہوگیا۔ اِدھر بختاور بیگم صاحبہ نے یقینیؔ کا بتایا ہوا علاج پورے شدّومد سے جاری رکھا۔

چندے ساکت رہکر حمیدہ کی زبان سے بے اختیار نکلا:-

ہیں! ہیں!! ہیں!!!

بختاور بیگم:- ہیں! ہیں!! کی بچی، پیدا ہوتے ہی نہ مرگئی کُٹنی!!!

حمیدہ (رو کر) آپ کیا کہہ رہی ہیں یہ؟

بختاور بیگم:- کہہ کیا رہی ہوں، جیسے ننھی بھولی کچھ جانتی ہی نہیں، اری دیدہ پھٹی قطّامہ تو نے اچھا اپنے خاندان کا نام روشن کیا، ہائے مجھے کیا خبر تھی کہ بہو میں یہ یہ گُن بھرے ہوئے ہیں ....

حمیدہ:- میں نے کیا کیا؟

بختاور بیگم:- (بھبھک کر) کیوں زبان کھلواتی ہو مُردار .... تیرا دین دُنیا میں کالا منہ ہو... کمبخت ...

حمیدہ:- آخر معلوم تو ہو میرا کیا قصور ہے؟

بختاور بیگم:- (آگ بگولہ ہوکر) اُف ری دیدہ دلیری! بے حیائی کی حد ہوگئی، اری بتاؤں، یہ کوٹھے پر ہنس ہنس کر سقّے سے کیا اشارے کئے جارہے تھے، قطّامہ، تو نے اُلٹی جوتی سے ہماری ناک کٹوادی... ہائے غارت گئی تجھے بن مانگی آئے .....

حمیدہ:- اے غضب خُدا کا، کیسا سقّہ، کس نے اشارہ کیا ہے۔

بختاور بیگم:- کُتیا کہیں کی ..... یوہیں چلاتی ہے .... دھوپ میں چونڈا سفید نہیں کیا ہے، تو نہیں تو کیا تیری نانی ہنس ہنسکر سقّے سے ٹھٹولیں کر رہی تھی مُردار، ہائے کیا زمانہ آیا... شریف گھرانوں کے یہ طور طریق رہ گئے ہیں... توبہ! توبہ!!

حمیدہ:- دیدے گھٹنے پھوٹیں، جو اشارہ کیا ہو، مجھے تو خبر بھی نہیں کیسی گلی ہے۔

بختاور بیگم:- (دانت کٹکٹا کر) ہاں! ہاں!! قسمیں کھائیگی، ارے اب تو حلف اُٹھائے گی، قطّامہ، لگاؤں دو جھاڑو ئیں منہ پر...

حمیدہ:- آپ بڑی زیادتی کر رہی ہیں۔

بختاور بیگم:- زیادتی! ہاں زیادتی کر رہی ہوں، آنے دے ذرا اپنے خصم کو آج تیری چٹیا کٹوا کر کالا منہ ہی نہ کرایا ہو.....
ہائے اور کبھی کوئی نہ ملا محلّے کا سقّہ ہی نگوڑا رہ گیا تھا تیرے لئے۔

اتنے میں کسی ہمسائی کی بچی دروازے میں جھانک کر بھاگ گئی، جاتے ہی اپنی ماں کو خبر کی:-

"اماں! اماں!! لو وہ خالہ بختاور کی دُلہن خُوب زور زور سے لڑ رہی ہیں بس جناب وہ تھیں کہ کام کاج چھوڑ سٹر سٹر جوتیاں گھسیٹتی دوڑیں، اُنہیں دیکھ کر گلی میں گڑبڑ مچ گئی آناً فاناً تو چل میں چل ہر محلّے کی پڑوسنیں آموجود ہوئیں، کہ چلو دلہن کی لڑائی دیکھیں، افوہ بڑی مدّت میں بولیں۔

یہاں بی بختاور بیگم صاحبہ کی تو غرض ہی کچھ اور تھی، احسان کرنے کے انداز میں بہو پر سر سے پیر تک نظر ڈال کر کہا۔
"خیر کمبخت اسوقت تو کالا مُنہ کر، پھر سمجھونگی تجھے!"

گویا آئی ٹلی، حمیدہ بانو نے قضا کے چنگل سے رہائی پائی، کھٹ سے کُنڈی لگا دوڑیں کمرے میں، دھم سے چارپائی پر جا پڑیں، اور رو رو کر دل کی بھڑاس نکالنے لگیں۔

اُدھر بختاور بیگم تھیں کہ پڑوسنوں کو لیکر اپنے دالان میں پہونچیں۔ اور آئیں بائیں شائیں میں معاملہ غتر بود کر دیا۔

—— ۴ ——

اس واقعہ سے حمیدہ بانو کچھ ایسی دہلیں، ہر وقت ایک ہول آنے لگا، مبادا اگر تو کر نہیں خُدا کے غضب سے ڈر، خوشدامن صاحبہ بیٹھے بٹھائے کہیں کوئی طوفان نہ اُٹھا دیں، مجبوراً قفلِ خموشی توڑنا پڑا، بختاور بیگم کچھ پوچھتیں تو جی کڑا کر کے جواب دے دیتی تھیں ——

چوتھے دن ملک الموت کے گماشتے جناب خورشید علی صاحب

آوارد ہوئے، رسمی سلام دعا سے نپٹ کر پہلی بات جو انہوں نے کی، یہ تھی:۔

"پھوپی اماں! بھابی جان کا کیا حال ہے؟"

بختاور بیگم نے خوش ہو کر جواب دیا:۔

صدقے جاؤں بیٹا! اچھی ترکیب بتائی، تیرے جاتے ہی کوٹھے کے کواڑ دھڑ دھڑائے، میں تھی کہ جھاڑو اٹھا چپکے سے زینے میں جا کھڑی ہوئی، جوں ہی دلہن نے کھولے کواڑ تڑاق کر کہا:۔

"کیوں ری یہ تو کیا کر رہی تھی ابھی ابھی" اوہ! اسی لئے سارا سارا دن کوٹھے سے نہیں اترتی کہ سقے سے آنکھیں لڑائے"

یہ سنکر بڑی چکرائی۔ لگی برابر سے جواب دینے، میں نے اس کا خوب فضیحتہ کیا، وہ تو یوں کہو پڑوسنیں آگئیں، اس وجہ سے میں نے اُسے تو کوٹھے پر لوٹا دیا، اور اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر آنے والیوں کو ٹالا۔

پڑوسنوں سے گھر خالی ہونے پر کڑک کر دلہن کو آواز دی، روتی دھوتی آئی، تھر تھر کانپتی ہوئی، میرا جی تو بہت کڑھا مگر ویسی ہی ناراض صورت بنائے رہی، بلکہ اور زور سے گھرکی:۔

"قطامہ! رو کر ڈراتی ہے، ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا، اب دیکھ کیسا علاج کرتے ہیں، کہ دنیا تیرے جنم میں تھوکے!!"

بے اوسان ہو گئی، پھوٹ پھوٹ کر روئی، گھگھیا گھگھیا کر لگی قصور معاف کرانے، میرے قدموں پر لوٹ گئی، بمشکل میں نے کہا:۔

"خیر ابکے تو چھوڑے دیتی ہوں، آئندہ کچھ دیکھنے سننے میں آیا تو یاد رکھ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا"

خورشید علی:۔ اچھا اب وہ بولنے بھی لگیں یا نہیں؟۔

بختاور بیگم:۔ سخت مجبوری میں یوں ہی کچھ ہاں ہوں کر دیتی ہے ۔۔۔ پہلے تو اتنا بھی نہیں تھا۔

خورشید علی:۔ رفتہ رفتہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

بختاور بیگم:۔ میرا جی چاہتا تھا ابھی اسکو یہاں بلاتی، لیکن کیا کروں، اس وقت تک پہلی عادت کا اثر باقی ہے، شاید نہ بولے۔

خورشید علی:۔ تو خیر ایسی جلدی بھی کیا ہے۔

بختاور بیگم:۔ مگر نہیں یہ بھی کوئی بات ہوئی ۔۔۔۔ تیرے لئے پان تو لائے ۔۔۔۔ دلہن! اے دلہن!! یہ خورشید آیا ہے، ذرا پان تو لاؤ اس کے لئے!!!

جواب دواب تو کوئی آیا نہیں، البتہ پاندان کھڑکا، دو تین منٹ میں حمیدہ بانو گھونگھٹ کاڑھے آئیں، خاصدان سمیت تین چار سلام کئے، اور بہی ہوئی سی رہ گئیں "دل ہوں میں نہیں کھاتی" بختاور بیگم نے کہا "ہاں بیٹا خورشید!"

خورشید علی صاحب ایک پان اٹھا کر آداب بجا لائے۔

دلہن صاحبہ تھیں کہ جیسے جان بچی لاکھوں پائے۔ دبے پاؤں الگنائی پار، باورچی خانہ میں۔

بختاور بیگم (خورشید علی سے) دیکھا بیٹا! یہ حال ہے!۔

خورشید علی:۔ کچھ مضائقہ نہیں۔

بختاور بیگم:۔ اب کیا کروں بیٹا! میرا تو دم گھٹا کرتا ہے ان باتوں سے۔

خورشید علی:۔ یہی کہ ایک شگوفہ اور سہی کسی وقت، ابکے پورا پورا علاج ہو جائے گا۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے خورشید علی صاحب نے اجازت چاہی۔ بختاور بیگم بولیں، اچھا خیر ایک پان تو اور کھاتا جا اے دلہن! باورچی خانے میں کیا کر رہی ہو، خورشید جاتا ہے، پان لاؤ!!۔

حمیدہ بانو نے دوبارہ خاصدان پیش کیا، ایک گلوری اٹھا کر خورشید علی بولے:۔

بھابی جان کیسا مزاج ہے؟۔

انکے تو گویا پیروں تلے کی زمین نکل گئی، جیسے کسی نے

شکنجے میں کس دیا، اِدھر ہوا جائے نہ اُدھر، کھڑی کھڑی کسمسا رہی تھیں، بختاور بیگم نے کہا۔

"آہ! بیٹا خورشید!! کیسا کیسا سمجھاتی ہوں، یہ ہے کہ خاطر ہی میں نہیں لاتی..... اپنے ٹھسّے میں مری جاتی ہے..... اری لڑکا کیا کہہ رہا ہے..... کچھ سُنا..... بولتی نہیں..... ہائیں!....؟"

گھونگھٹ سے مری سی آواز آئی: "شکریہ"!

اور دُلہن صاحبہ نے رسان سے باورچی خانہ کا رُخ کیا، خورشید علی صاحب اپنی پھوپی امّاں سے رخصت ہوئے، دروازے تک پہونچے تھے، بختاور بیگم نے کہا۔

بیٹا خورشید! یہ دُلہن سلام کر رہی ہیں!!

دیکھتے ہیں جو پلٹ کر تو باورچی خانہ کی دہلیز پر بھابی جان بغلی سائن بورڈ بنی کھڑی تھیں۔

۵

گو اب حمیدہ بانو کے مزاج میں بہت کچھ تبدیلی آچکی تھی، جو حمیدہ بانو شفیق ساس کی انتہائی تلو تِتو کے باوجود دو سال ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ شیطان طوفان کے خوف سے ہر وقت خیر مانگا کرتی تھیں، بلکہ ساس کو رضامند کرنے کا بھی کچھ خیال پیدا ہوگیا تھا، لیکن یکایک کیونکر پہلی روش بدل دی جاتی۔ یہ اپنے شش و پنج میں مُبتلا رہیں، اُدھر بختاور بیگم صاحبہ موقع تاک رہی تھیں، اس ادھیڑبن میں کوئی ہفتہ عشرہ نکل گیا۔

ایک روز جبکہ گھر میں کوئی نہ تھا، اتفاقاً بختاور بیگم کو تقاضائے حاجت کا تقاضہ ہوا۔ جونہی آپ بیت الخلا کے قریب پہونچیں، اندر سے بہو کھنکاریں، اچھی جناب پھر کیا تھا، زمین پر لوٹا رکھ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح پھیل پڑیں۔

"تارے ہے لوگو غضب خدا کا، لو وہ پخانے میں میٹھی روٹی کھا رہی ہے..... (سر پیٹ کر) ہائے ہائے دانیال کی بھی مٹی پلید کی، اری ولدڑ آخر کیا تیرے خاندان میں یہی ہوتا ہے ——؟"

اے توبہ! کہاں کا گھونگھٹ اور کیسی وضعداری، اوسان جاتے رہے، جھم سے قد مچہ کو دُلہن پسینہ میں نہائی ہوئی، حلق خشک، زبان بے قابو، صورت تانبہ، تانبہ۔ کبوتر کی طرح غٹر غٹر کر کے بھرّائی ہوئی آواز سے بولیں۔

اے! اے!! ارے!!!

بختاور بیگم۔ (غضبناک ہوکر) چپ مُردار..... بس اس گھر میں تیرا گذارا نہیں..... نکٹی بےحیا تو نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔

حمیدہ بانو۔ آپ..... مجھ سے..... کیوں..... نا راض ہیں؟....،

بختاور بیگم۔ شاباش بیٹی شاباش، اب یہ بات بنائی، ہائے اچھے سے اچھا کھلاتے ہیں، اچھے سے اچھا پہناتے ہیں، خوشامد کرتے مُنہ سوکھا جاتا ہے، تیرے بھاویں نہیں۔ ہم نے اپنے ہاتھوں اپنی قسمت پھوڑلی، کلیجہ نکال کر رکھ دیا..... آخر گئی نہ اپنی اوقات پر۔

حمیدہ بانو۔ (منّت سے) میری کھال کی جوتیاں بنائیے، اُف نہ کرونگی، مگر واسطہ خدا کا ایسا بہتان نہ باندھیے، رحم کیجئے میرے حال پر!

بختاور بیگم بھلا کاہے کو توجہ دینے لگی تھیں، اُنہوں نے تو لعن طعن کا تار باندھ دیا، حمیدہ بانو کی حالت غیر ہوتی گئی، آخر اُسے وہیں چھوڑ کہتی جھکتی اپنی چارپائی پر آبیٹھیں، حمیدہ بھی سایہ کی طرح لگی چلی آئی۔ کھڑی کھڑی ہچکیاں لے رہی تھی۔ آپ نے گھر کا۔

دُور ہو میرے سامنے سے غارت گئی!

بچاری میں سکت نہ رہی گھٹنوں کے بل زمین پر گری، اور ساس کے قدم پکڑ کر گرم گرم آنسوؤں کا مینہ برسانے لگی،

ایسی روئی ایسی روئی، بختاور بیگم کا جی بھر آیا، چندے ساکت رہ کر ارشاد ہوا۔

"بول! اب کیا چاہتی ہے؟"

حمیدہ:۔ (ہاتھ جوڑ کر) میرا قصور معاف کیا جائے۔

بختاور بیگم:۔ (پُر وقار لہجہ میں) اچھا خیر..... اس دفعہ اور صبر کرتی ہوں! جا مُنہ ہاتھ دھو!۔

اس پر حمیدہ کو ایک بار اور زور و شور سے رونا آیا، پھر ناراضگی کے خوف سے لرزتی ہوئی اُٹھی اور لڑکھڑاتی لڑکھڑاتی، گھڑونچی کے پاس پہونچی، چلچی میں مُنہ ہاتھ دھو کر دوسرے دالان کی چارپائی پر جا بیٹھی۔

سوچنے لگی کہ دیکھو یہی ساس ہیں جو مجھے دیکھ دیکھ کر پھولی نہ سماتی تھیں، میرے کیسے کیسے چوچلے کرتی رہیں آنکھوں میں ڈال کر رکھا، سوتے سالنیں گنیں، ہائے اب انہیں کیا ہو گیا جو ایسی باتیں کرنے لگیں، یوں ہی بیزار رہیں، تو نہ جانے میرا کیا حشر ہو۔

سوچتے سوچتے بیچاری کے ہاتھ پاؤں سُن ہو گئے، یکایک خیال آیا، کہ اُفوہ! ہو نہ ہو یہ سب کچھ حد سے زیادہ خاموشی کا نتیجہ ہے، میری چُپ سے تنگ آ کر انہیں ایسی نفرت ہو گئی کہ صورت کی روادار نہ رہیں۔ افسوس! میں نے بڑی غلطی کی۔ ایسی شفیق ساس کا دل دُکھایا! ایسی سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔

اتنی پٹس کے بعد اصل معاملہ سمجھ میں آیا، پھر نہ یہ گُم سُم رہیں، اور نہ ساس صاحبہ برہم، گھر پہ خوشحالی برسنے لگی۔

جیسے خُدا نے اُن کے دن پھیرے، ایسے سب کسی کے پھیرے۔ آمین۔

میرزا فہیم بیگ چغتائی

محبّت کی پہلی تجلّی

نہ تھا جب کوہکن کے دل میں ارماں چوٹ کھانیکا ⁂ نہ پہونچا تھا اُسے جب حکم جوئے شیر لانے کا

نہ تھے دستِ ہوس آگاہ جب زُلفوں کی تزئیں سے ⁂ ہوا تھا جب نہ شیریں کام خُسرو حُسن شیریں سے

الگ معمورۂ حسرت سے قیسِ عامری جب تھا ⁂ خموشی آشنا دُنیا میں جب فرہاد کا ڈھب تھا

نواحِ عاشقی میں جب اثر اس کا نہ پھیلا تھا ⁂ سوادِ دلبری جب پردہ دارِ حُسنِ لیلا تھا

خیال آرا نہ تھا خوابِ زلیخا جب زمانے میں ⁂ بھرا جاتا نہ تھا رنگِ فسُوں جب ہر فسانے میں

نہ تھا آگاہ جب ذوقِ نظر بازی تکلف سے ⁂ نہ تھا یہ خاکداں پُرنور جب تنویرِ یوسف سے

نہ تھا اپنے اثر کا شوخ چشموں کو جب اندازہ ⁂ نظر جب نیم باز آتا نہ تھا فتنوں کا دروازہ

نیاز و ناز میں جب فرق کرنا سخت مشکل تھا ⁂ محبت آشنا اُس وقت بھی انسان کا دل تھا

فدا ہابیل نے کی جان اقلیما کی اُلفت میں ⁂ یہی پہلا شہیدِ عشق ہے آدم کی عترت میں

انہیں دونوں نے دُنیا میں محبت کی بنا ڈالی ⁂ بہارِ جاوداں تھی مختصر سی ان کی خوش حالی

محبت کے طرب آموز نغمے مل کے گاتے تھے ⁂ جہاں بھی جب کبھی جاتے ہمیشہ ساتھ جاتے تھے

یہ دونوں ایک شب جا بیٹھے دریا کے کنارے پر ⁂ تبسّم چاند کا وہ اُنکے ہر دلکش اشارے پر

قضارا اُس طرف قابیل سا سفاک آتا ہے ⁂ اِنہیں اس طرح خوش خوش دیکھتا ہے تاؤ کھاتا ہے

بھڑک اُٹھتی ہے آتش اُسکے سینے میں رقابت کی ⁂ نظر آتی نہیں صورت اُنہیں اپنی حفاظت کی

یہیں میں ختم کرتا ہوں یہ درد انگیز افسانہ
نتیجہ اس کا مجھ سے کیوں وہ پوچھے ہے جو فرزانہ

[illegible] حیدرآبادی

سچّی کہانی

قارئین ساقی! سینما کے پردہ پر تو آپ بہت سے فلم دیکھ چکے ہیں۔ آج ساقی کے صفحات پر ایک فلم دیکھئے۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر آپ نے توجہ اور اطمینان کے ساتھ اسے ملاحظہ فرمایا اور آپ کے تخیل نے بھی آپ کی تھوڑی سی مدد کی تو دورانِ مطالعہ میں یقیناً آپ ایسا محسوس کرنے لگیں گے جیسے کسی سینما ہال میں بیٹھے ایک نہایت دلچسپ فلم دیکھ رہے ہیں۔

شاید اس حقیقت کا میں پہلے بھی اعتراف کر چکا ہوں کہ کسی افسانہ کا پلاٹ اپنے دماغ سے پیدا کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں صرف واقعات کو افسانہ کی شکل میں پیش کر سکتا ہوں۔ اسی لئے "سچی کہانی" کو میں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ لیکن میری دوسری کہانیوں میں اور اس کہانی میں ایک خاص فرق ہے، وہ یہ کہ جس قدر واقعات اس میں بیان کئے گئے ہیں وہ بعض جزئیات و تفصیلات کو چھوڑ کر تقریباً سب کے سب بجائے خود تو سچے ہیں لیکن آپس میں اُن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے اُنہیں اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ ایک مسلسل داستان بن گئی۔

پریم پجاری

(ایک غریب محلہ۔ چھوٹا سا گھر جسکی ہر چیز سے افلاس برس رہا ہے۔ امر سنگھ پریشان حال گھر میں داخل ہوتا ہے۔)

امر سنگھ کا بوڑھا باپ:- بیٹا، کچھ کام ملا؟

امر سنگھ:- نہیں پتا جی۔ جہاں جاتا ہوں یہی جواب ملتا ہے کہ جگہ خالی نہیں۔

باپ:- دینو بابو نے یہ اخبار ابھی بھیجا ہے (اخبار امر سنگھ کی طرف بڑھاتا ہے) اور کہا ہے کہ اس میں ایک نوکری کا اشتہار چھپا ہے۔ تم بھی عرضی دیدو۔

امر سنگھ:- (پہلے اشتہار پڑھتا ہے پھر کہتا ہے) عرضی دیکے کیا ہوگا۔ ایک جگہ کے لئے سَو سَو اُمیدوار ہوتے ہیں۔ پھر جس کی سفارش ہوتی ہے اُسے جگہ مل جاتی ہے۔ لیاقت کا تو کچھ ایسا سوال نہیں۔ ہمارے پاس سفارش کہاں ہے؟

باپ:- یہ نوکری ہے کس محکمہ میں؟

امر سنگھ:- اشتہار پڑھکر سناتا ہے۔

"ٹریفک منیجر کے دفتر میں ایک اسسٹنٹ کلرک کی ضرورت ہے۔ تنخواہ پینتیس روپے ماہوار، دو روپیہ سالانہ ترقی۔ بی۔ اے ہونا ضروری ہے۔ عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ ہو۔ درخواست خود لیکر حاضر ہو۔"

دستخط ٹریفک منیجر۔ ای۔ سی۔ ریلوے

باپ:- تو پھر بیٹا تم بھی تو بی۔ اے ہو۔ عمر بھی تمہاری پچیس سال سے کم ہے۔ عرضی دینے میں کیا ہرج ہے۔ شاید بھگوان یہ جگہ تمہیں کو دلوا دے۔

امر سنگھ با دلِ ناخواستہ درخواست لکھکر ریلوے

کے دفتر کو روانہ ہوجاتا ہے۔ وہاں پہونچکر دیکھتا ہے کہ کئی سو آدمی دفتر کے سامنے موجود ہیں۔ سب اُمیدوار ہیں۔ خاصہ ہنگامہ برپا ہے۔ لوگ طرح طرح کے لباس پہنے ہیں۔ رومی ٹوپی۔ پگڑی۔ فیلٹ کیپ۔ دھوتی۔ پاجامہ۔ پتلون سبھی نمونے موجود ہیں۔ تھوڑی دیر میں ایک چپراسی دفتر سے نکلتا ہے اور کہتا ہے:-

چپراسی:- صاحب ابھی آتے ہیں۔ تم لوگ ایک لین میں کھڑے ہوجاؤ۔

سب ایک قطار بناتے ہیں جو تقریباً ایک فرلانگ تک چلی گئی ہے۔ ٹریفک منیجر اپنے بابو کے ساتھ دفتر سے نکلتا ہے اور اس کثیر جماعت کو دیکھکر حیران رہ جاتا ہے۔

ٹریفک منیجر:- مائی گاڈ۔ یہ سب لوگ کینڈی ڈیٹ ہے؟

بابو:- ہاں حضور۔ یہ سب کینڈی ڈیٹ ہیں۔

ٹریفک منیجر:- ویل۔ ہم ان سبکو نہیں دیکھ سکتا۔ اتنا ٹائم نہیں ہے۔ ہم کھالی ایک آدمی مانگتا ہے۔ اچھا صرف ایک ڈزن آدمی روک لو۔ باکی ڈسمس کردو۔

بابو پہلے بارہ آدمیوں کو علیحدہ کرکے باقی سے کہتا ہے کہ آپ لوگ جائیے۔

چند آوازیں:- تو پھر بلایا کیوں تھا؟ ہماری عرضی تو دیکھی ہوتی۔

چند اور آوازیں:- اور ان بارہ آدمیوں کو تم نے کیسے چھانٹ لیا۔

کچھ اور آوازیں:- ہم تو ان سے بہت پہلے کے آئے ہوئے ہیں۔ صبح سے انتظار کررہے ہیں۔

لائن ٹوٹ کر ہجوم ہوجاتا ہے۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ کہتا ہے۔

بابو:- چلے جاؤ یہاں سے شور نہ مچاؤ جسے ہم چاہیں گے رکھیں گے۔

ٹریفک منیجر:- Send them away Babu

بابو:- دفع ہو یہاں سے۔ نہیں تو قلیوں سے پٹوا کے نکلوا دونگا۔

ایک شخص:- بدمعاش! تو ہمیں قلیوں سے پٹوا کے نکلوا دیگا یہ کہتے ہوئے بابو کا گریبان پکڑ کر کھینچتا ہے۔ دھینگا مشتی ہونے لگتی ہے۔ بابو گر پڑتا ہے۔ دفتر کے قلی اور دوسرے بابو وغیرہ نکل آتے ہیں اور اس شخص کو مارنے لگتے ہیں۔ سب کھڑے دیکھ رہے ہیں۔

وہ شخص:- (چلاکر) بھائیو! تمہیں غیرت نہیں آتی۔ ایک بے قصور کو یہ ظالم مارپیٹ کررہے ہیں اور تم کھڑے دیکھ رہے ہو۔ مجمع بگڑ جاتا ہے اور ریلوے والوں پر حملہ کردیتا ہے۔

ٹریفک منیجر:- Get away you damned fool. Get away you bloody swines.

ایک شخص صاحب بہادر کے تمانچہ رسید کرتا ہے۔ ہیٹ دُور جا گرتا ہے۔ صاحب بھاگتے ہیں۔ بھاگتے ہیں گر پڑتے ہیں بہرحال دفتر میں گھس جاتے ہیں۔ دفتر کے باقی لوگ بھی کسی طرح دفتر میں داخل ہوکر دروازے بند کرلیتے ہیں۔ مجمع کا غیظ و غضب بڑھتا رہتا ہے۔

ایک شخص:- توڑ دو دروازہ، مار ڈالو حرامزادوں کو۔ مجمع دروازہ توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ ٹریفک منیجر پولیس کو ٹیلیفون کرتا ہے۔ اتنے میں دروازہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لوگ اندر گھس جاتے ہیں۔ صاحب بہادر ایک میز کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ بعض بابوؤں اور قلیوں کی تھوڑی سی پٹائی ہوتی ہے۔ لنے میں شور ہوتا ہے کہ "پولیس آگئی، پولیس آگئی!" لوگ دفتر سے نکل کر بھاگتے ہیں۔ پولیس ڈنڈوں سے مارنا شروع کرتی ہے۔ مجمع پھر بگڑ جاتا ہے۔ بھاگنے والے پلٹ پڑتے ہیں۔ پولیس سے مارپیٹ ہوتی ہے۔ ایک پولیس والا گر پڑتا

لوگ اُس کی پگڑی چھین کر دھجیاں کر دیتے ہیں۔ آخر پولیس فائر بریگیڈ کو ٹیلیفون کرتی ہے جو فوراً پہونچتا ہے۔ مجمع پر پانی سے حملہ کیا جاتا ہے۔ لوگ بھاگتے ہیں اور گرتے ہیں۔ کسی کی ٹوپی، کسی کا جوتا، کسی کی پگڑی رہ جاتی ہے۔ سینکڑوں عرضیوں کے کاغذ اُڑتے پھرتے ہیں۔ لوگ کیچڑ میں پھسل پھسل کر گرتے ہیں۔ پھر اُٹھتے ہیں اور بھاگتے ہیں۔ غرض مجمع منتشر ہو جاتا ہے۔ مجمع کا ایک حصہ ایک خاص سمت میں بھاگتا ہے اور ایک پارک میں پہونچکر پھر جماؤ ہوتا ہے۔ اتنے میں مسٹر مکرجی آ پہونچتا ہے۔ ان لوگوں کو اس حال میں دیکھ کر حیران ہوتا ہے اور پوچھتا ہے۔

مکرجی۔ یہ کیا قصہ ہے؟

ایک شخص :۔ قصہ کیا ہے بابو جی۔ ٹی۔ ایم۔ کے دفتر میں ایک کلرک کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ کئی سو گریجویٹ عرضیاں لے کر پہونچ گئے۔ ٹی۔ ایم نے اور اُس کے بابو نے لوگوں سے بدزبانی کی۔ بس اس پر جھگڑا ہو گیا اور مار پیٹ ہوئی۔ آخر پولیس آ گئی اور لوگوں کو بہت مارا پیٹا اور آگ بجھانے کے انجن سے پانی برسا کر مجمع کو منتشر کر دیا۔

مکرجی :۔ ہائے بدنصیب ہندوستان! اچھا آپ سب لوگ بی۔ اے پاس ہیں؟

چند آوازیں :۔ جی ہاں۔

ایک آواز :۔ میں ایم۔ اے ہوں۔

ایک اور آواز :۔ میں ایم۔ اے۔ بی۔ ایل۔ ہوں۔

مکرجی :۔ بھائیو! ایسی اعلیٰ تعلیم کے بعد بھی آپ کو تیس پینتیس ۳۵ روپے کی نوکری نہیں ملتی۔ اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو قصور سارا خود آپ کا ہے۔ کیوں آپ لوگ کوئی اور کام نہیں سیکھتے۔ کیوں پیشہ ور نہیں بنتے۔ کیونکر صنعت و حرفت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ کیوں ہر شخص اس منحوس تعلیم میں پڑکر اپنی ساری زندگی برباد کرتا ہے۔ کیوں تعلیم کو تعلیم کے لئے حاصل نہیں کیا جاتا۔ کیوں فقط تعلیم ہی کو روزی کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ سب کو تو نہیں لیکن چند بھائیوں کو میں کام سے لگا سکتا ہوں۔ آپ لوگوں میں سے جو صاحب شادی شدہ ہیں وہ اس طرف آ جائیں اور جو کنوارے ہیں وہ اس طرف۔

(دو گروہ ہو جاتے ہیں)

مکرجی :۔ (کنواروں سے مخاطب ہو کر) آپ صاحبان میں سے جو لوگ بالکل آزاد ہیں یعنی جن کے ذمہ والدین یا دوسرے عزیزوں کی پرورش نہیں وہ ایک طرف نکل آئیں۔

(تھوڑے سے آدمی نکل آتے ہیں)

مکرجی۔ (اس قلیل جماعت سے) آپ میں سے جو شخص محض اپنا گذارہ لیکر ملک کی خدمت کرنا چاہے وہ میرے ساتھ چلا آئے۔

(دس آدمی مکرجی کے ساتھ ہو لیتے ہیں)

امر سنگھ :۔ (آگے بڑھکر) بابو جی۔ میں بالکل آزاد تو نہیں ہوں۔ بوڑھے ماں باپ کی خبرگیری میرے ذمہ ہے مگر میں دیش سیوا کے لئے تیار ہوں۔

مکرجی :۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ مگر آپکی مدد کرنا اس وقت میرے اختیار میں نہیں۔

(امر سنگھ مایوس ہو کر پلٹ جاتا ہے)

مکرجی :۔ (اپنے ساتھیوں سے) آیئے۔

سب ساتھ ہو لیتے ہیں۔ پارک سے چلکر سڑک پر آتے ہیں اور ٹرام میں بیٹھ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ٹرام سے اُترتے ہیں اور مکرجی کے مکان میں داخل ہوتے ہیں۔ دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔

مکرجی :۔ بھائیو! میں کوئی دولتمند آدمی نہیں ہوں۔ دیش کا

ایک سیوک اور وطن کی خدمت کرنے والی ایک سوسائٹی کا کارکن ہوں۔ آپکو معلوم ہو کہ آپکو کیا کام کرنا ہوگا؟

کئی آوازیں:۔ آپ فرمایئے۔

مکر جی:۔ کام بتلانے سے پہلے کئی اور باتیں آپکو بتانا ضروری ہیں۔ میں ایک سوال آپ سے پوچھتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگوں کی مصیبت کا اصلی سبب کیا ہو؟

ایک آواز:۔ یہ بھی آپ ہی بتا دیجئے۔

مکر جی:۔ ہماری تمام مصیبتوں کے ذمہ دار ہمارے دیش کے دولتمند لوگ ہیں جو غریبوں کا خون چوس چوس کر اپنی تھیلیاں بھرتے اور عیش کرتے ہیں۔

ایک آواز:۔ آپ سچ کہتے ہیں۔ میں گاؤں کا رہنے والا ہوں میں جانتا ہوں کہ غریب کسانوں پر کیا گذرتی ہو۔ بدنصیب صبح سے شام تک ہل چلاتا ہو۔ چوٹی کا پسینہ ایڑی کو جاتا ہے مگر اس محنت کا بدلہ اُسے اتنا بھی نہیں ملتا کہ پیٹ بھرنے کو روکھی سوکھی روٹی اور تن ڈھانکنے کو موٹا جھوٹا کپڑا میسر آجائے۔

مکر جی:۔ اور مزدوروں کی حالت اُن سے بھی بدتر ہے وہ سارے دن اور کبھی کبھی ساری رات محنت کرتے ہیں مگر اُنہیں جو مزدوری ملتی ہے وہ کسی طرح بھی ایک انسان کی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہوسکتی۔ دو پیسے کے چنے چباب کے دن گذار دیا۔ میلی کچیلی پھٹی ہوئی ایک لنگوٹی باندھ لی اور رات کو فٹ پاتھ پر پڑ رہے۔ یہ اُن کی زندگی ہے۔ اس سب کے ذمہ وار مالدار ہیں۔

دو ایک آوازیں:۔ تو بتایئے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

مکر جی:۔ ابھی بتاتا ہوں۔ ہماری سوسائٹی کا مقصد دولت مندوں کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ آپ لوگوں کا یہ فرض ہو کہ گاؤں گاؤں جائیں اور کسانوں میں اُنکے حقوق کا احساس پیدا کریں اور اسی طرح مزدوروں کو سمجھائیں کہ کس طرح مالدار لوگ تمہاری محنت سے کمائی ہوئی دولت اپنی جھولیوں میں بھر لیتے ہیں اور بیدردی سے خرچ کرتے ہیں۔

ایک آواز:۔ اس کے سوا کچھ اور؟

مکر جی:۔ ہر وہ کام اور وہ قربانی جس سے ہماری تحریک کو قوت پہونچے۔ آہستہ آہستہ پورا پروگرام آپ کو بتلا دیا جائیگا جس پر عمل کرنے سے ہماری غلامی کی زنجیریں کٹ کٹ کر گر جائیں گی۔ اور مفلسی اور بے روزگاری کا نشان مٹ جائیگا۔ سوسائٹی یعنی دیش سیوک منڈل کی طرف سے میں آپکا بیس روپیہ ماہوار الاؤنس مقرر کرتا ہوں۔ جن صاحبوں کو ہمارے مقصد سے اتفاق نہ ہو وہ آزاد ہیں۔ جاسکتے ہیں، کوئی مجبوری نہیں۔ اور جن صاحبوں کو اتفاق ہے اُنہیں حلفیہ اقـــرار کرنا ہوگا کہ وہ آخری دم تک آزادی کی اس جنگ میں شریک رہیں گے۔

سب:۔ ہم تیار ہیں۔ لایئے حلف دیجئے۔

مکر جی:۔ خُدا آپکو کامیابی دے۔ آپکا یہی قول آپکا حلف ہے۔ (اس کے بعد مکر جی سبکو بیس بیس روپے تقسیم کرتا ہے اور کہتا ہے:۔)

مکر جی:۔ پروگرام کی تفصیل اور بعض ضروری باتیں دوسرے وقت بتائی جائیں گی۔ اس لئے آپ لوگ رات کو نو بجے تشریف لائیں۔

(سب جاتے ہیں)

پبلک گارڈن

ایک بچی اسکپنگ رُوپ پر اُچھل رہی ہو۔ کچھ بچے بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔ بعض کھلائیاں بچوں کو گاڑی

میں بٹھائے لئے جا رہی ہیں۔ کہیں لوگ بنچوں پر بیٹھے ہیں، کہیں سبزہ پر۔ ایک چینی کاغذ کے پھول اور کھلونے بیچ رہا ہے۔ بینڈ اسٹینڈ کے گرد بہت سے لوگوں کا ہجوم ہے۔ بینڈ بج رہا ہے۔ ایک جوان آتا ہے اور ایک نوجوان عورت کی پیٹھ چھوتا ہے۔

عورت :- (پلٹ کر) ہلّو موہن!

موہن :- ہلّو شانتی!

شانتی وہاں سے نکل آتی ہے اور دونوں ساتھ ساتھ ایک طرف کو جاتے ہیں۔

شانتی :- حیدرآباد سے کب واپس آئے؟

موہن :- آج صبح ہی تو آیا ہوں۔ اس وقت تمہاری طرف گیا تھا، معلوم ہوا "کہیں باہر گئی ہیں"۔ میں نے کہا ممکن ہے تم ادھر آئی ہو۔ بس میں بھی چلا آیا۔

شانتی :- اب تو تم بھی چھوٹے موٹے پروفٹ (prophet) ہوتے جاتے ہو۔

موہن (ٹہلنے لگتا ہے۔ ایک خالی بنچ کی طرف اشارہ کرکے) چلو وہاں چل بیٹھیں۔

شانتی :- چلو۔

جاکر دونوں بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

اتنے میں ایک نہایت خوبرو جوان فوجی وردی پہنے ذرا فاصلے پر جا رہا ہے۔ موہن اُسے دیکھکر اپنا ہاتھ بلند کرکے ہلاتا ہے اور کہتا ہے "ہلّو پریم"۔

پریم "ہلّو موہن" کہکر مسکراتا ہوا چلا جاتا ہے۔

شانتی :- بڑا سجیلا جوان ہے۔ یہ کون ہے موہن؟

موہن :- میرا اسکول فیلو اور بہت پیارا دوست ہے۔ اسکا نام پریم سنگھ ہے۔ بڑا خاندانی آدمی ہے۔ بزرگ بھی بہت دولتمند تھے۔ اب بھی اچھی خاصی حیثیت ہے۔ فوج میں کپتان ہے۔ کچھ ایسا لمبا چوڑا خرچ نہیں۔ بس ایک بوڑھی ماں ہے اور ایک چھوٹا بھائی اندر سنگھ، وہ بھی فوج میں سیکنڈ لفٹینٹ ہے۔

شانتی :- اچھا! تو ابھی شادی نہیں کی؟

موہن :- نہیں۔

شانتی :- آج کل نوجوانوں میں کنوارے رہنے کی بیماری بہت زور شور سے پھیل رہی ہے۔

موہن :- نہیں، یہ بات نہیں شانتی۔ یہ بیچارہ تو ایک حادثہ کا شکار ہو گیا۔ روپ کماری کو تو تم جانتی ہو نا؟

شانتی :- کون روپ کماری؟

موہن :- ارے وہی ڈاکٹر ٹنڈن کی بیوی۔ اُس روز اسکول کے جلسہ میں تم سے ملاقات نہیں کرائی تھی؟

شانتی۔ (کچھ سوچکر) ہاں ہاں یاد آگیا۔ بڑی مغرور عورت ہے، معلوم ہوتا ہے اُسے اپنی صورت پر بڑا ناز ہے۔

موہن :- ہاں وہی۔ پہلے اُس نے پریم سے محبت کے پینگ بڑھائے اور شادی کی خواہشمند ہوئی۔ پریم اسے بہت چاہنے لگا تھا اور بظاہر وہ بھی اُس پر جان دیتی تھی مگر یہ سب مکاری تھی۔

شانتی :- یہ کیسے؟

موہن :- یہ ایسے کہ پریم کے ایک کشمیری دوست، کپور سے چھپ چھپ کے ملنے لگی۔ ایک روز پریم نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ وہ بہت غیرت دار آدمی ہے۔ بس فوراً تعلقات قطع ہو گئے۔

شانتی :- تو پھر ڈاکٹر ٹنڈن سے کیسے شادی ہوئی!

موہن :- بات یہ ہوئی کہ کپور تو یکایک ولایت چلا گیا۔ ٹنڈن نے اُسے کہیں ہسپتال کے چیریٹی شو میں دیکھ لیا اور اسکا گانا بھی سُنا بس لٹو ہو گیا۔ وہ اس کی دولت پر ریجھ

گئی۔ بس شادی ہوگئی۔

شانتی :۔ شادی کے بعد ڈاکٹر سے کیسی گذری ؟

موہن :۔ ڈاکٹر کو خوب اُلّو بنایا۔ اس کے ایک جوان شاگرد ڈاکٹر رستوگی سے کھُل کھیلی۔ اُسی زمانہ میں پریم کو بھی ایک بہت محبت بھرا خط لکھ کر بلُایا تھا۔

شانتی :۔ اچھا! ان سب جھگڑوں کے بعد پھر پریم سنگھ کو خط لکھا ؟

موہن :۔ ہاں۔

شانتی :۔ پھر وہ گئے ؟

موہن :۔ نہیں جی، وہ کیا جاتے۔ مگر وہ خط اُنہوں نے رکھ لیا اور لکھ بھیجا کہ اب اگر مجھ سے کوئی سروکار رکھا تو یہ خط ڈاکٹر ٹنڈن کو دکھا دونگا۔

شانتی :۔ اس پر تو بہت ناچی ہوگی۔

موہن :۔ اوہو کیا پوچھتی ہو۔ بس اُسی دن سے پریم کی جانی دشمن ہوگئی۔ رستوگی کو اُس کے قتل پر آمادہ کیا مگر رستوگی خود پریم کے ہاتھ سے مارا گیا۔

شانتی :۔ Good God (گڈ گاڈ)

موہن :۔ اب پریم کا یہ عقیدہ ہے کہ سب عورتیں بیوفا ہوتی ہیں اس لئے زندگی بھر کنوارا رہنا ہی بہتر ہے (موہن اپنی گھڑی دیکھتا ہے)

شانتی :۔ کیا بج گیا ؟

موہن :۔ پونے سات۔

شانتی :۔ اب چلنا چاہیئے۔

موہن :۔ اچھا۔ (دونوں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

پریم سنگھ آہستہ آہستہ چلا جا رہا ہے۔

سورج ڈوب چکا ہے۔ باغ (پبلک گارڈن) کا ایک سنسان گوشہ۔ موہنی (ایک نوجوان لڑکی) آہستہ آہستہ جا رہی ہے۔ اُسکے پیچھے یکایک جھاڑی سے تین آدمی نکلتے ہیں اور موہنی کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ موہنی بدحواس ہوکر چلاّتی ہے۔ دوڑو۔ دوڑو۔ بچاؤ بچاؤ۔ اور بہت ہاتھ پاؤں مارتی ہے اور چھوٹ جانے کی کوشش کرتی ہے مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ دو آدمی اس کو لئے جا رہے ہیں۔ تیسرا ساتھ ہے۔ ایک شخص ہاتھ سے موہنی کا منہ بند کرتا ہے۔ وہ برابر تڑپ رہی ہے۔ پھر یکایک چیخ مارتی ہے بچاؤ بچاؤ۔ شور کی آواز سُنکر سامنے سے ایک ادھیڑ عمر کا شخص دوڑتا ہوا آتا ہے۔ یہ مکرجی ہے۔

مکرجی :۔ خبردار! بدمعاشو خبردار! (یہ کہکر اُنکی طرف جھپٹتا ہے۔ تیسرا شخص آگے بڑھکر اسکو لپٹ جاتا ہے اور اس طرح روک لیتا ہے۔ باقی دو آدمی موہنی کو لئے کترا کر آگے بڑھتے ہیں۔ موہنی برابر ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ مسٹر مکرجی اور اس شخص سے بھی برابر دھینگا مُشتی ہو رہی ہے۔ مکرجی اسے گرا لیتا ہے اور اُسے چھوڑ کر للکارتا ہوا موہنی کو بچانے دوڑتا ہے۔ وہ شخص پھر دوڑ کر مکرجی کو لپٹ جاتا ہے اور اس مرتبہ مکرجی کو گرا لیتا ہے۔ جھاڑی کے دوسری طرف پریم سنگھ شور کی آواز سُنتا ہے اور تیزی سے دوڑ کر اِدھر آتا ہے اور یہ ہنگامہ دیکھکر للکارتا ہے۔)

پریم :۔ بدمعاش، خبردار۔ (اتنا کہکر تیزی سے اُنکی طرف جھپٹتا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی دونوں موہنی کو چھوڑ کر سڑک کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور تھوڑے فاصلے پر جو ایک موٹر کھڑی تھی اس میں بیٹھکر فرار ہو جاتے ہیں۔ تیسرا شخص جو مکرجی سے اُلجھا ہوا تھا وہ بھی مکرجی کو چھوڑ کر بھاگتا ہے مگر فوراً پریم دوڑ کر اُسے پکڑ لیتا ہے اور دو چار گھونسے اور لاتیں مار کر گرا دیتا ہے۔ پھر دھکیلتا ہوا اُدھر لاتا ہے۔ جدھر موہنی بدحواس

کھڑی ہے۔)

وہ شخص :۔ حضور۔ (ہاتھ جوڑ کے) معاف کر دیجئے۔

پریم :۔ چُپ رہو (اس کے بعد موہنی سے) آپ کے کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔

موہنی :۔ جی نہیں۔ میں آپ لوگوں کی بیحد شکرگزار ہوں کہ آپنے اِن بدمعاشوں سے میری جان بچائی (مکرجی کی طرف اشارہ کرکے) شاید ان بیچاروں کے کچھ چوٹ لگ گئی ہو۔ اس بدمعاش نے انہیں گرا دیا تھا۔

پریم :۔ (مکرجی سے) آپکے تو کہیں چوٹ نہیں لگی ؟

مکرجی :۔ جی نہیں۔

پریم :۔ اس بدمعاش کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیئے۔

مکرجی :۔ بیشک۔ مگر افسوس ہے میں آپکے ساتھ نہ چل سکونگا۔ مجھے ایک نہایت ضروری کام ہے (گھڑی دیکھ کر) افوہ۔ بڑی دیر ہو گئی (یہ کہکر جلد دینا چاہتا ہے)

وہ شخص :۔ (مکرجی کے پیروں کو لپٹ جاتا ہے) حضور خُدا کے لئے مجھے بچائیے۔ میں مر جاؤنگا۔

پریم اور موہنی ذرا متعجب ہو کر اُسے اور مکرجی کو دیکھتے ہیں۔ مکرجی کچھ گھبرا سا جاتا ہے۔

مکرجی :۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ (یہ کہکر پھر جلد دینا چاہتا ہے)

وہ شخص مدا پھر مکرجی کے قدم پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے) سرکار میں مر جاؤنگا۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آخر میرا کیا دوش ہے۔

پریم سنگھ (اور بھی حیران ہو کر اُس شخص سے) ادھر دیکھو! (وہ شخص اُدھر متوجہ ہوتا ہے) ہمیں بتاؤ کیا بات ہے ؟

وہ شخص :۔ حضور۔ بابوجی نے ہم لوگوں سے کہا تھا کہ تمہیں پندرہ پندرہ روپے ملیں گے۔ تم لوگ اِن بائی جی کو اُٹھا کر لے بھاگنا۔ ہم پاس ہی چھپے رہیں گے۔ جب یہ شور مچا مینگی تو ہم نکل آئیں گے اور ان کو چھڑانے کی کوشش کرینگے۔ تم پہلے تھوڑی دیر ہم سے جھگڑا کرنا۔ پھر ان کو چھوڑ کر بھاگ جانا اور ہماری موٹر میں بیٹھکر غائب ہو جانا۔

پریم :۔ ! Good God (گڈ گاڈ)

مکرجی :۔ بدمعاش، جھوٹا کہیں کا۔ (مارنے کو چھڑی اُٹھاتا ہے پریم روکتا ہے) میں نے تو اِسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔

وہ شخص :۔ (گڑگڑا کر) بابوجی غریب آدمی کو کاہے کو پھنساتے ہو (پھر پریم کے پاؤں چُھو کر) حضور ہمارے مائی باپ ہیں ہمیں چھوڑ دیجئے۔ ہمارے بال بچے حضور کو دعا دیں گے۔

موہنی۔ مبہوت ہو کر مکرجی کی طرف دیکھتی ہے۔ مکرجی کچھ کہے سُنے بغیر روانہ ہو جاتا ہے۔ وہ شخص رونے اور گڑگڑانے لگتا ہے۔

پریم سنگھ (مکرجی کی طرف اشارہ کرکے) یہ کون شخص ؟

وہ شخص :۔ حضور ہم تو یہ بھی نہیں جانتے۔ ہم سے تو ایک روز بازار میں ملاقات ہوئی تھی۔

پریم :۔ اور یہ دو آدمی جو بھاگ گئے یہ کون تھے ؟

وہ شخص :۔ حضور اُنہیں بھی بابوجی اپنے ساتھ لاتے تھے۔ ہم نہیں جانتے۔

پریم موہنی کی طرف دیکھتا ہے۔

موہنی :۔ اب جانے دیجئے اس کمبخت کو۔

وہ شخص :۔ بھگوان آپکا بھلا کرے بائی جی۔

پریم :۔ جاؤ۔ دفع ہو۔

وہ شخص ہاتھ جوڑ کے سلام کرتا ہے اور تیز رفتار سے چلا جاتا ہے۔

پریم :۔ (موہنی سے) اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو گھر تک پہونچا دوں۔

موہنی :- میں آپکی بیحد ممنون ہوں۔ مگر آپکو تکلیف ہوگی۔
پریم :- نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔
دونوں چل پڑتے ہیں۔ سڑک پر پہونچکر ٹیکسی لیتے ہیں اور موہنی کے گھر پہونچتے ہیں (موہنی کا مکان دو منزلہ اور عالیشان ہے) موہنی بڑے احترام اور تواضع سے پریم کو بٹھاتی ہے۔
موہنی :- ساری زندگی آپکا احسان نہ بھولونگی (یہ کہہ کر بڑی محبت بھری نظروں سے پریم کو دیکھتی ہے۔)
پریم :- (بہت متاثر ہوکر) واہ واہ بات ہی کیا تھی۔
موہنی :- کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟
پریم :- میرا نام پریم سنگھ ہے۔ اور آپ کا نام؟
موہنی :- میرا نام موہنی ہے۔
پریم :- موہنی۔
موہنی :- جی۔
پریم اور موہنی دونوں ایک دوسرے کو بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔
پریم :- آپ اس مکان میں اکیلی رہتی ہیں؟
موہنی :- جی ہاں۔ ایک ملازمہ ہے اور ایک پتاجی کے وقت کا بوڑھا ملازم۔
پریم :- اچھا تو کیا آپکے پتاجی ......
موہنی :- جی ہاں۔ پتاجی کو پرلوک سدھارے کوئی چھ مہینے ہوگئے۔
پریم :- اور آپکی اماں جی؟
موہنی :- وہ تو میری پیدائش ہی کے وقت سورگباش ہوگئی تھیں (ایک منٹ کے بعد نہایت محبت انگیز انداز سے) پریم سنگھ جی! کیا میں آپکا پتہ پوچھ سکتی ہوں۔
پریم :- (مسکراکر) بیشک (یہ کہکر اپنا کارڈ نکال کر موہنی کو دیتا ہے۔)
موہنی :- (کارڈ دیکھکر) اچھا تو آپ کیپٹن ہیں (ذرا وقفہ کے بعد) آپکے ماتا پتا زندہ ہیں؟
پریم :- پتاجی کو دنیا سے سدھارے تو بہت دن ہوئے اماں جی کا سایہ ابھی ہمارے سر پر قائم ہے۔ بس اب ہم گھر کے کل تین آدمی ہیں۔ اماں جی۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی اندر سنگھ۔
موہنی :- (سنجیدگی سے) کل تین آدمی۔ یعنی آپ کے بال بچوں کو چھوڑکر۔
پریم :- (مسکراکر) جی نہیں، سبکو جوڑکر۔
موہنی :- میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔
پریم :- موہنی دیوی، ابھی میں نے شادی نہیں کی ہے۔
موہنی :- (تعجب اور مسرت کے ساتھ) اچھا!
پریم :- آپ اس شخص کو جانتی ہیں جسنے آج آپکو یہ تکلیف پہونچائی؟
موہنی :- نہیں پریم سنگھ جی۔ میں نے تو آج سے پہلے کبھی اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔
پریم :- خیال ہوتا ہے کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ اچھا اب اجازت ہے؟
موہنی :- بہت اچھا (یہ کہکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ پریم بھی کھڑا ہوجاتا ہے)
موہنی :- اب کب ملاقات ہوگی؟
پریم :- جب آپ چاہینگی۔
موہنی :- (مسرور ہوکر) بہت اچھا۔ ابھی تو میں پورے طور آپکا شکریہ بھی ادا نہیں کرسکی۔ خیر دوسرے وقت سہی (یہ کہکر مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھاتی ہے)
پریم :- چھوڑیئے اب اس ذکر کو (یہ کہتے ہوئے موہنی کا ہا

تھام لیتا ہے۔ ٹھیک اُسی وقت چمپا داخل ہوتی ہے اور بڑے غور سے پریم کو دیکھتی ہے۔ ہاتھ ملانے کے بعد:۔

پریم:۔ اچھا۔ آداب۔

موہنی:۔ آداب۔

امر سنگھ کا مکان

دو کابلی دروازہ پر آکر کھٹکا کرتے ہیں۔

اندر سے آواز:۔ کون ہے؟

ایک کابلی:۔ باہر مِن آؤ۔

دروازہ کھلتا ہے۔ امر سنگھ کا باپ باہر آتا ہے اور کابلیوں کو دیکھکر سخت پریشان ہوتا ہے اور پوچھتا ہے۔

بڈھا:۔ کیا ہے خان؟

خان:۔ امر سنگھ کہاں ہے؟

بڈھا:۔ باہر گیا ہے۔

خان:۔ کب آئیگا۔

بڈھا:۔ کچھ معلوم نہیں۔

خان (اپنے ساتھی سے پشتو میں کچھ کہتا ہے پھر بڈھے سے) بابو! ہم کتنی دفعہ آیا۔ امر سنگھ ملتا نہیں۔ شام کو ہم پھر آئیگا۔ اُسکو بولو ہمارا روپیہ آج ضرور دینا ہوگا۔ دو مہینہ ہوگیا، روپیہ بھی دیتا نہیں۔ سود بھی دیتا نہیں۔ روز وعدہ کرتا ہے۔ آج دیگا۔ کل دیگا، صبح دیگا، شام دیگا۔ اگر آج روپیہ نہیں دیگا تو ہم کل نالش کر دیگا۔ پھر بہت اُس کا مشکل ہوگا۔

بڈھا:۔ خان، آجکل ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ امر سنگھ بے روزگار ہے۔ کوئی کام نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے آپکے سود میں دیر ہوگئی۔ آپ پندرہ دن اور ٹھہر جایئے جہاں سے ہوگا ایک ایک پائی آپ کا بھگتان کر دینگے۔

اتنے میں امر سنگھ آپہونچتا ہے۔

امر سنگھ:۔ خان سلام

خان:۔ سلام۔ ہمارا روپیہ کا بندوبست کیا؟

امر سنگھ:۔ خان میں بہت شرمندہ ہوں کہ اس دفعہ بہت دیر ہوگئی۔ آپنے جہاں اتنے روز صبر کیا ہے وہاں چند روز کی مہلت اور دیدیجئے آپکا بڑا احسان ہوگا۔

خان:۔ مہلت، مہلت، مہلت۔ کتنا روز مہلت دیگا۔ ہم نہیں جانتا۔ ہمارا روپیہ ابھی دینا ہوگا۔

امر سنگھ:۔ خان بھلا اسوقت روپیہ میرے پاس کہاں ہے۔

خان:۔ کچھ پروا نہیں۔ گھر کا سامان بیچو اور کسی سے قرض لو۔ مگر ہمارا روپیہ آج دینا ہوگا۔ ہم ابھی لے لیگا۔

امر سنگھ:۔ (باپ سے) پتا جی آپ اندر چلئے۔ (دونوں باپ بیٹے گھر میں جانا چاہتے ہیں۔ خان امر سنگھ کا کوٹ پکڑکر کھینچتا ہے۔ کوٹ جھر سے پھٹ جاتا ہے۔)

خان:۔ کدھر جاتا ہے۔

امر سنگھ:۔ چھوڑ دے میرا کوٹ

خان:۔ نہیں چھوڑیگا۔

امر سنگھ:۔ جا عدالت میں عدالت نالش کر دے۔ عدالت سے لے لے۔

خان:۔ عدالت سے کیوں لیگا۔ عدالت کو روپیہ نہیں دیا۔ تمہیں دیا ہے۔ تم سے لیگا۔

دوسرا خان پشتو میں کچھ کہتا ہے۔ راہگیر جمع ہوجاتے ہیں، کچھ محلہ والے آجاتے ہیں۔

ایک پڑوسی:۔ جانے دو۔ جانے دو خان۔ جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ۔

خان:۔ ہم جھگڑا نہیں کرتا۔ ہم اپنا روپیہ مانگتا ہے۔

امر سنگھ:۔ تو روپیہ دینے سے کس نے انکار کیا۔ یہی تو کہا تھا کہ چند روز ٹھہر جاؤ۔

خان:۔ ہم ایک دم نہیں ٹھہریگا۔ ابھی لیگا۔ ابھی لیکے جائیگا۔

پڑوسی:۔ خان ہمارے کہنے سے پندرہ دن کی مہلت اور دیدو۔ اگر پندرہ دن میں یہ نہیں دیگا تو ہم دیگا۔

خان:۔ تم دیگا؟

پڑوسی:۔ ہاں ہم دیگا۔

خان:۔ اچھا، تمہارا بات بھی دیکھے گا۔

یہ کہہ کر دونوں خان پشتو میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ امر سنگھ اور اس کا باپ گھر میں چلے جاتے ہیں اور دروازہ بند کر لیتے ہیں۔ راہگیر اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ اتنے میں ایک بابو دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ امر سنگھ نکلتا ہے۔

بابو:۔ بڑے جھوٹے آدمی ہو جی تم۔ کہہ کے آئے تھے کہ سات تاریخ کو ضرور دونوں مہینے کا کرایہ پہونچا دونگا آج پندرہ تاریخ آگئی۔ اب تک تمہارا پتہ نہیں۔ تین دفعہ ہمارا آدمی بھی حیران ہوا۔ گھر پر بھی تمہارا پتہ نہیں چلتا۔

امر سنگھ:۔ بابو جی میں آج کل سخت پریشان ہوں، آخر دو برس سے ہم آپکے کرایہ دار ہیں۔ برابر وقت پر کرایہ دیتے رہے۔ اب چند مہینے سے یہ دیر ہو گئی ہے۔

بابو:۔ اچھا تو لاؤ اب دو۔

امر سنگھ:۔ بابو جی میں آٹھ دن سے برابر آپ ہی کے روپے کی فکر میں مارا مارا پھر رہا ہوں مگر اب تک کوئی بندوبست نہیں ہوا۔ آپ چند روز اور ٹھہر جائیے۔

بابو:۔ (طنزیہ) چند روز اور ٹھہر جائیے۔ شرم نہیں آتی کہتے ہوئے، اندھیر ہے ڈھائی مہینہ کا کرایہ چڑھ گیا۔ دمڑی کی کوڑی یاں آج تک نہیں دیں۔ اب ان چالوں سے کام نہیں چلیگا۔ کرایہ ابھی دیدو اور کل صبح مکان خالی کر دو۔ نہیں تو اس کا نتیجہ بہت خراب ہوگا۔

امر سنگھ:۔ (منت سے) بابو جی بھگوان نے آپکو بہت کچھ دیا ہے، پندرہ بیس روپے بغیر آپکا کونسا کام اٹکا پڑا ہے۔ ہمارے اوپر دیا کیجئے۔

بابو:۔ (اور تیز ہو کر) بھگوان نے بہت کچھ دیا ہی تو ہم نے کسی کا کچھ چھین لیا ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ کرایہ دیدو۔ اور چپکے سے مکان خالی کر دو۔ نہیں تو کھٹیا پڑیا سب نیلام کرا دونگا۔ بہت بے عزت ہوگے۔

امر سنگھ:۔ (مجبور ہو کر) جو آپکے جی میں آئے کیجئے اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

بابو:۔ اچھی بات ہے۔ اس کا نتیجہ بھی دیکھ لینا (یہ کہکر بڑبڑاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ امر سنگھ پھر گھر میں آتا ہے)

امر سنگھ:۔ (اپنی بوڑھی ماں سے) اماں بڑی بھوک لگی ہے۔

ماں:۔ بیٹا ابھی تو کچھ بھی نہیں پکایا۔ تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ آٹا، دال، چاول، سب چیزیں ختم ہو گئیں۔ اب تم کچھ لاؤ تو پکے۔

امر سنگھ (چپ چاپ چلا جاتا ہے اور محلہ کے بنئے کی دکان پر پہونچکر) لالہ جی دس سیر موٹے چاول اور پانچ سیر ارہر کی دال اور دیدیجئے۔

لالہ:۔ بھیا ہم نے ادھار کا لین دین بند کر دیا۔ کتنے لوگوں کے پاس روپیہ اٹکا ہوا ہے۔ قرض لے کر کوئی دیتا ہی نہیں چاہتا۔ تم نے بھی اب تک پچھلے مہینہ کا بھگتان نہیں کیا اور تازہ قرض لینے کو آ کھڑے ہوئے۔

امر سنگھ:۔ لالہ جی آخر آپکے ہمارا برسوں سے لین دین ہے کبھی آپکی کوئی کوڑی ماری گئی ہے!

لالہ:۔ نہیں ماری تو نہیں گئی، لیکن ہم ایسا بیوپار نہیں کرتے۔

پچھلا حساب صاف کردو اور آگے کو بیچاؤ تو کچھ ڈر نہیں مگر اس طرح ہم نہیں دے سکتے کہ جمع ہوتا جائے اور ایک پیسہ ادا نہیں ہوتا۔

امر سنگھ:- میں بہت جلد آپکا سب حساب بیباق کردونگا۔

لالہ:- نہیں بھیا اب ہم اُدھار نہیں دینگے۔

امر سنگھ:- لالہ جی آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ ہمارا روپیہ دو روپیہ کا اعتبار نہیں کر سکتے۔

لالہ:- اچھا تو کب بھگتان کروگے۔

امر سنگھ:- پہلی تاریخ کو۔

لالہ:- تمہارے کہنے سے آج دئے دیتا ہوں مگر پہلی تاریخ کو ضرور حساب صاف کردینا۔

امر سنگھ:- ضرور۔

لالہ چاول اور دال تول کر امر سنگھ کے حوالہ کرتا ہے امر سنگھ گھر آتا ہے۔

امر سنگھ:- (ماں سے) پتا جی کہاں گئے ؟

ماں:- میں تم سے کہنا بھول گئی تھی کہ نمک بھی نہیں رہا، جب تم چلے گئے تو یاد آیا۔ میں نے اُنہیں ایک پیسہ دیا کہ نمک لے آؤ۔ آتے ہی ہونگے۔

امر سنگھ کا باپ سڑک پر چلا جا رہا ہے۔ دوسرا راہ آتا ہے، سامنے سے ایک موٹر آ رہی ہے۔ موٹر والا شاید نشہ میں ہے ہارن دئے بغیر یکایک موٹر موڑ دیتا ہے۔ بڈھا موٹر سے ٹکرا کر گر جاتا ہے، موٹر اُس کے اُوپر سے گذر جاتی ہے اور وہ فوراً مر جاتا ہے، مجمع ہو جاتا ہے، لاش خون میں تر بتر پڑی ہے۔ اتنے میں امر سنگھ بھی آ پہونچتا ہے اور باپ کی لاش دیکھکر چیخ مار کر اُسے لپٹ جاتا ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک سپاہی ڈیوٹی پر کھڑا ہے۔ ہنگامہ دیکھکر وہ بھی آجاتا ہے۔

ایک راہگیر:- ساری خطا موٹر والے کی ہے۔

دوسرا راہگیر:- ہارن نہیں دیا۔ ایکدم موٹر گھما دی۔

تیسرا راہگیر:- ہاتھ نہیں دکھایا۔ غریب کا خون کر دیا۔

پہلا:- اس کا نتیجہ بھی معلوم ہو جائیگا۔

امر سنگھ (راہگیروں سے) آپ لوگوں کو گواہی دینی ہوگی۔

کئی راہگیر:- ضرور گواہی دینگے۔

سپاہی:- ہم سب رپورٹ بولیں گے۔ غریب کا خون ایسے نہیں جائے گا۔

پولیس والا گاڑی کا نمبر لیتا ہے اور مالک کا پتہ وغیرہ پوچھکر لکھ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ کوتوالی چلو۔

بابو (جو موٹر چلا رہا تھا اور نشہ میں مدہوش ہے) ——

Get away; you go and report. ——

یہ کہہ کر گاڑی چلا دیتا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن کی کوٹھی۔ نہایت عالیشان عمارت خوبصورت پائیں باغ۔ کمرے بہترین سامان اور فرنیچر سے آراستہ۔

ڈاکٹر ٹنڈن اپنے کمرہ میں ٹہل رہا ہے۔ ٹائپ کئے ہوئے کچھ کاغذات اُس کے ہاتھ میں ہیں جنہیں بار بار اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ پھر ایک لفافہ میں بند کرکے میز کی دراز میں رکھدیتا ہے اور تالا لگا دیتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کمرہ میں ٹہلتا ہے جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ یکایک غصہ کی شکل بنا لیتا ہے المماری کے آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہے۔ پھر برابر والے کمرہ کو زور زور سے دھڑ دھڑاتا ہے۔ اُس کمرہ میں اس کی بیوی یعنی روپ کماری اپنے سنگھار میں مصروف ہے۔ زرق برق لباس پہنے آئینہ کے سامنے چہرہ پر پوڈر لگا رہی ہے۔ جب سنگھار

مکمل ہوگیا تو بڑے مغرورانہ انداز سے ڈاکٹر ٹنڈن کے کمرہ میں
آتی ہو ایک ہاتھ میں خوبصورت بیگ اور دوسرے میں چھتری
ہے۔ گویا کہیں جانے کی تیاری ہو۔ ڈاکٹر ٹنڈن متوجہ نہیں ہوتا۔
چہرہ پر مصنوعی غصّہ کے آثار ہیں۔ تھوڑا سا ٹہلنے کے بعد:۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ رُوپو۔ اس باجی کمینہ کی بابت میں تم سے کچھ
باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

روپ کماری:۔ (متکبرانہ) کون باجی کمینہ؟

ٹنڈن:۔ کون باجی کمینہ؛ وہی جو رات دن مجھے اور تمہیں
ذلیل و رُسوا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہو۔ اور زیادہ صاف
صاف کہوں؛ وہی تمہارا پُرانا چہیتا۔ اب سمجھیں؟

روپ کماری:۔ (نہایت سخت لہجہ میں) ذرا اپنے ہوش میں رہیئے
شریفوں کی طرح بات کیجئے۔ کیا اس شخص کا نام نہیں ہو؟

ٹنڈن:۔ (جو اس اثنا میں کرسی پر بیٹھ جاتا ہو۔ کرسی کو آگے
گھسیٹ کر) کیسی بھولی ہو ابھی تک نہیں سمجھیں؛ اُس کا نام
ہے پریم سنگھ۔ اب سمجھ میں آیا۔ شرم تو نہ آئی ہوگی؟

روپ کماری:۔ (اس گفتگو سے سخت پراگندہ ہوکر) بابوجی
آپ انسانیت سے بات کریں تو میں جواب دوں۔ آخر اُس
بدذات نے کیا کیا۔

ٹنڈن:۔ (دھیما ہوکر) اُس نے تم پر آوارگی کی تہمت لگائی
ہے۔ یہ بتاؤ کہ اُس کے پاس تمہارے ہاتھ کی کوئی تحریر سند ہو
جس سے وہ اس الزام کو ثابت کرسکے۔

روپ کماری:۔ (دیوانوں کی طرح اپنی جگہ سے تڑپ کر) سند!
میرے ہاتھ کی تحریری سند! ہرگز نہیں۔ میری کوئی تحریر
کسی کے پاس نہیں۔ جو کہتا ہو وہ جھوٹا ہے اور جو یقین کرتا ہو
وہ احمق ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن روپ کماری کی پراگندگی اور اضطراب دیکھ کر
کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ روپ کماری دونوں ہاتھوں سے
اپنا سر پکڑ کر صوفے پر گر پڑتی ہو اور گذشتہ واقعات
تکتی ہے۔

(گذری ہوئی باتیں۔ عالمِ خیال میں)

پریم اپنے کمرہ میں ڈریسنگ گون پہنے کوچ پر
اخبار دیکھ رہا ہے۔ روپ کماری چپکے سے داخل ہوتی
پریم کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتی ہو پریم آہستہ
روپ کماری کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹا کر اپنے
پر رکھ لیتا ہے۔ پھر اس طرح کھینچتا ہو کہ روپ کمار
گال اس کے گال سے چُھو جاتا ہے۔ پھر کھڑا ہو جاتا

پریم سنگھ:۔ رُوپو!

روپ کماری:۔ پریم۔

اس کے بعد دونوں ہم آغوش ہو جاتے ہیں اور
بوس ہوتے ہیں۔

پریم سنگھ:۔ کیوں روپ کیا تم ہمیشہ مجھے اسی طرح چا

روپ کماری:۔ زندگی کی آخری سانسوں تک پریم

دروازہ پر کھٹکا ہوتا ہو۔ دونوں الگ ہو جاتے

پریم سنگھ:۔ کون؟

آواز:۔ کپور۔

پریم سنگھ:۔ (Come in) کم اِن۔

کپور اندر داخل ہوتا ہو۔ دونوں سے نمسکار کر
اس کے بعد پریم سے:۔

کپور:۔ واہ جناب۔ ابھی تک آپ ڈریسنگ گون م
(گھڑی دیکھ کر) آٹھ بجکے دس منٹ آئے ہیں ساڑ
بجے پیچ شروع ہو جائیگا۔

پریم سنگھ:۔ میں ابھی دو منٹ میں تیار ہوا جاتا ہ

(روپ کماری ایک جھرجھری لیتی ہے)

گذری ہوئی باتیں- عالمِ خیال میں

روپ کماری کا مکان- روپ کماری پُرتکلّف لباس پہنے پیانو بجا رہی ہے، کپور سُن رہا ہے- جب وہ ختم کرتی ہے تو کہتا ہے-

کپور:- اچھا روپ اب چلتا ہوں-

روپ کماری:- اچھا- (پیانو چھوڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور دونوں ہم آغوش و لب بوس ہوتے ہیں- یکایک پریم سنگھ داخل ہوتا ہے اور انہیں اس حال میں دیکھتا ہے- پریم سنگھ کو دیکھکر دونوں گھبرا جاتے ہیں-)

پریم سنگھ:- (طنز اور غصّہ سے) معاف کرنا- مجھے معلوم نہ تھا- (یہ کہکر فوراً واپس ہوتا ہے- روپ اچانک پریم! کہہ کر اس کے پیچھے لپکتی ہے اور دروازہ تک جاتے جاتے اُسے پکڑ لیتی ہے- پریم سنگھ کچھ کہے بغیر روپ کماری کو دھکا دیکر اپنا دامن چھڑا کر چلدیتا ہے-

---

روپ کماری ایک جھرجھری لیتی ہے

گذری ہوئی باتیں- عالمِ خیال میں)

Charity (Variety) Show for Hospi

اسٹیج پر ایک درجن رقاصاؤں کا ناچ ختم ہوتا ہے- ٹالیاں بجتی ہیں، پردہ گرتا ہے- ایک شخص سائڈ میں سے نکل کر کہتا ہے (اُس کے ہاتھ میں پروگرام ہے)

صاحبان! ہمیں افسوس ہے کہ ماسٹر ہیلے بابو جنکا پروگرام میں چھٹا نمبر ہے (پروگرام دیکھتے ہوئے) یکایک طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے نہ آسکے- اس لئے اب پروگرام کا ساتواں نمبر شروع ہوگا اور مس روپ کماری اپنا لاجواب گانا سُنا کر آپ سے اپنے کمال کی داد لیں گی-

پردہ اُٹھتا ہے- روپ کماری بڑے ناز و انداز سے سامنے آتی ہیں- تالیوں کے شور سے اُنکا استقبال ہوتا ہے- کُرسی پر بیٹھکر ہارمونیم بجا کر جو برابر ہی میز پر رکھا ہوا ہے، یہ گانا گاتی ہیں-

اک پیاری صورت ؛ دل کی جویا ہے
سینہ کے اندر ؛ محشر برپا ہے
کالی کالی مست گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہیں
مدّت کی بھولی بسری باتیں پھر یاد دلاتی ہیں
آموں کے نیچے ؛ جھولا ڈالا تھا
مستی چھائی تھی ؛ دل متوالا تھا
پینگ بڑھائے جاتے تھے آواز ملا کر گاتے تھے
جب آنکھیں مل جاتی تھیں شرما کر چُپ ہو جاتے تھے
پھر طوفان اُٹھتا ؛ دونوں کے من میں
بڑھ کر پڑ جاتیں ؛ باہیں گردن میں

گانے کے دوران میں ڈاکٹر ٹنڈن اور اس کا ایک دوست جس نے ابھی اعلان کیا تھا ایک طرف کنارے پر بیٹھے ہوئے ہیں-

ٹنڈن:- شنکر، یار کیا غضب کا گلا ہے-

شنکر:- اور صورت-

ٹنڈن:- اوہ- صورت تو قیامت ہے-

شنکر:- بدن کس قدر خوبصورت ہے-

ٹنڈن:- تصویر ہے تصویر-

شنکر:- آنکھیں کتنی حسین ہیں-

ٹنڈن:- اوہ، جادو ہیں، جادو- شنکر، یار میرا تو دل بے اختیار ہوا جاتا ہے-

اس کے بعد دونوں کچھ کانا پھوسی کرتے ہیں۔

شنکر :- (یکایک اور بلند آواز سے) اچھی بات ہے۔

ٹنڈن پھر آہستہ سے کچھ اُسکے کان میں کہتا ہے۔

شنکر :- اچھی بات ہے۔

یہ کہہ کر شنکر اُٹھ جاتا ہے۔ گانا ختم ہوتا ہے۔ تالیوں کا شور۔ روپ کماری سامنے آکر تسلیم بجالاتی ہے۔ شنکر اسٹیج پر آکر اعلان کرتا ہے۔

شنکر :- صاحبان بس روپ کماری کے گانے سے خوش ہوکر ہمارے شہر کے مشہور اور ہر دلعزیز ڈاکٹر ٹنڈن صاحب نے ہسپتال کے اس چیریٹی فنڈ میں پانچ سو روپیہ عنایت فرمایا ہے۔

تالیوں کا شور۔ پردہ گر جاتا ہے

ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

ٹنڈن :- رُوپو۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ میں نے صرف تمہارے حسن و جوانی کی وجہ سے تم سے شادی کی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں تمہاری صورت سے زیادہ تمہاری باطنی خوبیوں کا دلدادہ ہوں۔

روپ کماری :- اور میرے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ میں نے آپکی دولت کے لالچ میں آپ سے شادی کی۔ کاش وہ جانتے کہ روپ کماری پیسے کی لوبھی نہیں۔ وہ کمال کی قدردان ہے۔ وہ انسانی خوبیوں کی عاشق ہے۔

ٹنڈن :- (بے انتہا خوش ہوکر) اصل بات یہ ہے کہ لوگ ہماری خوش قسمتی کو دیکھ دیکھ کر جلتے ہیں اور طرح طرح سے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں۔ اچھا رُوپو۔ اب دس بج رہے ہیں۔ مریض انتظار میں ہونگے۔ میں بہت جلد واپس آؤنگا۔

(روپ کماری ایک جُھرجُھری لیتی ہے)

(گذری ہوئی باتیں۔ عالمِ خیال میں)

روپ کماری پریم کو خط لکھتی ہے۔

"پریم۔ میرے پیارے۔ الفاظ نہیں ملتے جوانی شرمندگی اور بیقراری کا اظہار کرسکوں۔ ایشور کی بھی گنہگار اور تمہاری بھی۔ مگر میری حالت رحم کے قابل ہے۔ میں نے ڈاکٹر ٹنڈن سے شادی کرکے اپنے آپ کو تباہ کرلیا۔ خدا کے واسطے میری خطاؤں کو معاف کردو۔ قسم کھاکر کہتی ہوں پریم۔ رات دن تمہاری یاد کے سوا اب مجھے اور کوئی کام نہیں۔ کل رات کو میں اکیلی ہونگی۔ تمہارا انتظار کرونگی۔ دیکھو اگر نہ آتے تو یاد رکھنا میرا خون تمہاری گردن پر ہوگا"۔

تمہاری پُجارن۔ رُوپ،

رامداس پریم کا خط لاکر دیتا ہے، رُوپ کھولکر دیکھتی ہے۔

مسنر ٹنڈن! آپ کا خط ملا۔ افسوس ہے کہ میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے درمیان کسی قسم کا بھی کوئی تعلق باقی رہے۔ مہربانی فرماکر آئندہ مجھے خط لکھنے کی تکلیف نہ کیجئے۔ اگر آپ نے اس کے خلاف کیا تو میں یہ خط ڈاکٹر ٹنڈن کو دکھادونگا۔ فقط۔

پریم سنگھ

(روپ کماری ایک جُھرجُھری لیتی ہے)

(گذری ہوئی باتیں۔ عالمِ خیال میں)

ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

روپ کماری اور ڈاکٹر رستوگی (ایک نوجوان)

روپ کماری:- رستوگی! میں ایک بات تم سے پوچھتی ہوں۔
رستوگی:- پوچھیئے۔
روپ کماری:- ڈاکٹر ٹنڈن تمہارے اُستاد ہیں نا؟
رستوگی:- بیشک۔
روپ کماری:- اور میں اُن کی بیوی ہوں؟
رستوگی:- بیشک۔
روپ کماری:- اور تم نے مجھ سے وہ تعلقات پیدا کئے جو صرف میاں بیوی کے درمیان ہونے چاہئیں۔ تم نے اپنے اُستاد کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔
رستوگی:- او۔ رُوپو۔ مجھے اس طرح ذلیل نہ کرو۔ میری رگوں میں شریف خُون ہے۔ مگر ہائے تمہاری محبّت نے مجھے بالکل اندھا کر دیا۔ گناہ کو اب میں گناہ نہیں سمجھتا۔ رُوپو تیرے لئے اب اگر مجھے جہنّم کے غار میں بھی کودنا پڑے تو میں اسکے لئے تیار ہوں۔
روپ کماری:- یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔
رستوگی:- کہنے کی باتیں نہیں۔ روپ مرد جو کہتا ہے وہ کرتا بھی ہے۔
روپ کماری:- مگر اس کا کیا ثبوت کہ تمہیں واقعی مجھ سے سچّی محبّت ہے؟
رستوگی:- ثبوت! ثبوت میں کیا بتاؤں۔ ہاں جس طرح جی چاہے آزما کر دیکھ لو۔
روپ کماری:- فرض کرو میں کہوں کہ فلاں شخص کو قتل کر ڈالو۔ تو؟
رستوگی:- تو کیا۔ کل ہی اُسکی لاش خُون میں لوٹتی ہوگی۔
روپ کماری:- (حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ) اخاہ آپ اسقدر بہادر ہیں۔
رستوگی:- بہادر نہیں۔ محبّت میں اندھا اور دیوانہ۔

روپ کماری:- اچھا تو سُنو۔
(ایک منٹ کانا پھوسی ہوتی ہے)
رستوگی:- اچھی بات ہے۔ ایشور چاہے تو ایک ہفتہ کے اندر اندر میں اُسے دوسری دُنیا میں بھیج دونگا۔

رات کا وقت ہے۔ پریم آہستہ آہستہ سڑک پر جا رہا ہے۔ ایک گلی آتی ہے۔ گلی کے کنارے ایک شخص مُنہ پر نقاب ڈالے کھڑا ہے۔ جب پریم سنگھ گلی کے برابر سے گذرتا ہے تو وہ شخص پیچھے سے پریم سنگھ پر چھُری کا وار کرتا ہے۔ (پریم اوورکوٹ پہنے ہے)
پریم سنگھ:- "آہ مار ڈالا!" کہہ کر گرتا ہے۔ قاتل دوسرا وار کرنا چاہتا ہے کہ پریم اس پر پستول کا فیر کرتا ہے۔ وہ گولی کھا کر آہ کرکے، دھم سے پیچھے کو گرتا ہے۔ لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ پولیس آجاتی ہے۔
پولیس مین:- ارے! کپتان پریم سنگھ!
ایک شخص:- (قاتل کا نقاب اُلٹ کر) ارے یہ تو ڈاکٹر رستوگی ہے۔

روپ کماری ایک چھُری لیتی ہے۔ پھر نہایت جوش میں کھڑی ہو جاتی ہے اور خود بخود کہتی ہے:-
پریم کماری:- اچھا پریم! اگر تجھ سے اپنی رسوائی کا بدلہ نہ لیا ہو تو میرا نام روپ کماری نہیں۔
پھر کچھ دیر سوچتی ہے۔ پھر ایک نوکر کو آواز دیتی ہے:-
رامداس! رامداس!!
رامداس حاضر ہوتا ہے۔
روپ کماری:- رامداس! دیکھو بیکر اسٹریٹ میں نمبر ۱۴ مکان پر جا کر کپتان پریم سنگھ کو دریافت کرنا اور موجود ہوں تو اُن سے

کہنا کہ بائی جی نے آپکو بلایا ہے۔ بہت ضرور کام ہے۔ ایک شخص کی جان کا معاملہ ہے۔ آنے کا وقت پوچھ لینا۔

رامداس:۔ بہت اچھا۔

رامداس کو روانہ کرکے روپ کماری خود مکان سے باہر آتی ہے۔ موٹر ڈرائیور کو آواز دیتی ہے:۔

مادھو! مادھو!! جلد موٹر نکالو۔

مادھو:۔ (وردی پوش ڈرائیور) بہت اچھا حضور۔

مادھو جلد موٹر نکالکر لاتا ہے۔ روپ کماری سوار ہوتی ہے۔

مادھو:۔ کہاں چلیئے گا حضور۔

روپ کماری:۔ (کچھ سوچکر) اچھا اسوقت نہیں۔ کل دیکھا جائے گا۔

موٹر سے اُتر پڑتی ہے۔ پھر کہتی ہے۔

"دیکھو مادھو! بابوجی پوچھیں تو کہدینا کہ ذرا مارواڑی لائبریری تک گئی ہیں۔ ابھی آتی ہیں"

یہ کہہ کر چلدیتی ہے۔ سڑک پر پہونچکر ٹیکسی والے کو آواز دیتی ہے۔ ٹیکسی!

ٹیکسی میں بیٹھکر:۔ لاکس لین چلو۔

ٹیکسی روانہ ہوجاتی ہے۔ لاکس لین پہونچکر روپکماری اُتر پڑتی ہے۔ اور ٹیکسی والے کو رخصت کرکے کچھ دور پیدل چلکر ایک بوڑھے دوا فروش کی دکان پر پہونچتی ہے۔

دوا فروش:۔ کیا چاہیئے حضور؟

روپ کماری:۔ (ادھر اُدھر دیکھکر) اندر چلئے تو بتاؤں۔

دونوں اندر جاتے ہیں۔ اندر پہونچکر:۔

روپ کماری:۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ زہر بھی بیچتے ہیں۔

دوا فروش:۔ جی ہاں، میں ہر قسم کے زہروں کا لیسنس دار ہوں۔

روپ کماری:۔ مجھے ایک نہایت قاتل زہر چاہیئے۔

دوا فروش:۔ کیا آپ نسخہ لائی ہیں؟

روپ کماری:۔ نسخہ! نسخہ کیسا؟

دوا فروش:۔ زہر تو کسی ڈاکٹر کے نسخہ کے بغیر نہیں مل سکتا۔

روپ کماری:۔ (پریشان ہوتی ہے۔ پھر کچھ سوچکر) میں آپ کو منہ مانگی قیمت دونگی۔

دوا فروش:۔ بائی جی۔ سوال قیمت کا نہیں، قانون ہے۔

روپ کماری:۔ میں عمر بھر آپکی احسانمند رہونگی۔

دوا فروش:۔ (کچھ سوچکر) آپ تو بہت مجبور کرتی ہیں۔

روپ کماری:۔ آپکی مہربانی کا شکریہ ادا نہیں کرسکتی۔

دوا فروش:۔ اچھا ایک ڈرام زہر کی قیمت آپ کیا دینگی؟

روپ کماری:۔ جو آپ کہیئے۔

دوا فروش:۔ ڈھائی سو روپے۔

روپ کماری:۔ (متعجبانہ) ڈھائی سو روپے! ایک ڈرام زہر کی قیمت ڈھائی سو روپے!

دوا فروش:۔ جی ہاں ڈھائی سو روپے۔ آپکے خیال میں ایک انسان کی جان کی قیمت ڈھائی سو روپے بہت زیادہ ہے؟

روپ کماری:۔ (کانپ کر۔ بڈھے کی طرف دیکھتی ہے) مگر میں تو اتنا روپیہ ساتھ نہیں لائی ہوں۔ اس وقت میرے پاس کل سو روپے ہیں مگر آپ کے اطمینان کے لئے میں اپنا ہار آپکے پاس چھوڑے جاتی ہوں۔ کل روپیہ بھجوا دونگی اور ہار منگا لونگی۔

ہار اُتار کر بڈھے کے حوالے کرتی ہے۔ بڈھا ہار کو اچھی طرح جانچتا ہے۔ اس کے بعد:۔

دوا فروش:۔ آپ ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں (کہکر جاتا ہے۔ ایک چھوٹی سی سفید شیشی لیکر آتا ہے) بائی جی! یہ نہایت قاتل زہر ہے۔ پھر خوبی یہ کہ نہ اس میں رنگ نہ بُو، نہ مزہ۔ ذرا سی دیر میں کام تمام کردیتا ہے۔ بس ایک بوند کافی ہے۔

روپ کماری:۔ میں آپکی بیحد شکر گذار ہوں (شیشی لیکر اپنے بیگ

میں رکھ لیتی ہے اور سو روپے کے نوٹ بڈھے کے حوالہ کرتی ہے اسکے بعد چلی جاتی ہے۔

دوافروش:۔ (تنہائی میں) بیوقوف عورت! مجھے احمق بنانے آئی تھی۔ نہ جانے کس بیگناہ کی جان لیتی۔ خیر ایک ماشہ خالص پانی کی قیمت ڈہائی سو روپیہ کم نہیں۔

پریم سنگھ کا باغیچہ

پریم سنگھ اور موہن ٹہل رہے ہیں۔

موہن:۔ یہ کب کی بات ہے؟

پریم سنگھ:۔ اُسی دن شام کو جب تم باغ میں نہیں ملے تھے اُسی دن کی بات ہے۔

موہن:۔ اچھا تو پھر دوسری مُلاقات کا وعدہ کیوں نہ لے لیا۔

پریم سنگھ:۔ حماقت اور کیا۔

موہن:۔ تعجب ہے کہ تم جیسے اُستاد سے اور ایسی چُوک۔

پریم سنگھ:۔ ہاں موہن میں اسوقت کچھ ایسا کھو گیا تھا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ رُوپو سے قطع تعلق کے بعد کبھی کسی عورت سے مجھے دلچسپی نہیں ہوئی۔ لیکن اس فتنہ گرنے تو کچھ جادو سا کردیا۔ موہن میں تمہیں کیا بتاؤں۔ ایسی بھولی اور معصوم صورت ہے کہ بے اختیار دل اس کی طرف کھنچتا ہے۔ اُس دن سے آج تک ایک لمحہ کے لئے وہ تصویر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی۔

ڈاکیہ خط لاکر دیتا ہے۔ پریم سنگھ اُسے کھولکر پڑھتا ہے اور خوشی سے اُس کا چہرہ چمک اُٹھتا ہے۔ پریم سنگھ ابھی خط پڑھ ہی رہا ہے کہ موہن کہتا ہے۔

موہن:۔ موہنی کا خط؟

پریم سنگھ:۔ آنہاں۔

موہن:۔ کیا لکھا ہے؟

پریم سنگھ:۔ بلایا ہے۔

موہن:۔ کب؟

پریم:۔ سُنو۔ (خط پڑھتا ہے) "پریم سنگھ جی۔ اگر تکلیف نہ ہو تو جمعرات کے دن شام کے پانچ بجے تشریف لائیے۔ بہت شکر گذار ہونگی۔

موہنی"

پریم سنگھ خط کو مکرر آہستہ آہستہ پڑھتا ہے۔ پھر چومتا ہے، سونگھتا ہے۔ (موہن سے) دیکھنا موہن! خط عطر میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر یہ تین دن کیسے کٹینگے؟ آج تو منگل ہے نا؟

موہن:۔ ہاں منگل ہے۔ تین دن کہاں۔ بس کل ہی کا دن تو بیچ میں ہے۔

پریم سنگھ:۔ پھر تین دن ہو تو گئے۔ آج۔ کل۔ پرسوں۔ موہن نہ معلوم مجھے اِس دفعہ کیا ہوگیا ہے۔ اس قسم کی بے چینی تو پہلے کبھی نہیں ہوئی۔

دونوں ٹہلتے ہوئے مکان کے اندر چلے جاتے ہیں۔ مُلازم اطلاع دیتا ہے کہ ایک شخص کہیں سے آیا ہے۔ ملنا چاہتا ہے۔ پریم سنگھ موہنی کا خط چھُپا لیتا ہے اور کہتا ہے:۔ "بلا لو"

رامداس داخل ہوتا ہے اور باادب سلام کرتا ہے۔

پریم سنگھ:۔ کہاں سے آئے ہو!

رامداس:۔ حضور ڈاکٹر ٹنڈن صاحب کے یہاں سے آیا ہوں۔ بائی جی نے حضور کو بُلایا ہے اور کہا ہے کہ جسدن حضور کو فرصت ہو تشریف لایئے۔ بہت ضروری کام ہے۔ ایک آدمی کی جان کا معاملہ ہے؟

پریم سنگھ:۔ (تیوری چڑھاکر) آخر کام کیا ہے؟

رامداس:۔ حضور مجھ سے تو بس اتنا ہی کہا تھا۔

پریم سنگھ سوچنے لگتا ہے۔

موہن:۔ پریم میرا خیال ہے کہ بات کو بڑھاؤ نہیں۔ ہو آؤ تو اچھا ہے۔ آخر معلوم تو ہو کہ قصّہ کیا ہے۔ جنگ سے صلح بہرحال اچھی۔

پریم سنگھ:- اچھی بات ہے۔ (اپنی ڈائری دیکھتا ہے۔ پھر رامداس سے) کہنا کہ سنیچر کے دن تیسرے پہر کو چار بجے آؤنگا۔

رامداس کے جانے کے بعد پریم سنگھ کو جج پر لیٹ جانا ہے (موہن سے) نہ جانے موہن یہ چڑیل مجھے کس مصیبت میں پھنسائے گی۔

موہن:- ارے کچھ بھی نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ وہی خط واپس مانگے گی۔ دے بھی دو، تمہارے ہے کس کام کا۔

عدالت کا کمرہ

امر سنگھ۔ مدن لال (جس نے موٹر سے امر سنگھ کے باپ کو کچل ڈالا تھا) سپاہی۔ تین گواہ، مجسٹریٹ۔ کورٹ انسپکٹر۔ مدن کا وکیل اور کچھ تماشائی۔

ایک گواہ پیش ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ:- تم نے کیا دیکھا۔

گواہ:- حضور میں اس وقت دور لے پرے گذر رہا تھا۔ موٹر سامنے سے آرہی تھی۔ موٹر والے نے ہارن دیا اور موٹر کی طرف ہاتھ دکھایا۔ ہم لوگ رک گئے مگر وہ بڈھا بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر موٹر سے ٹکر ہوگئی۔

امر سنگھ:- (چلاکر) ارے اتنا سفید جھوٹ۔ (مجسٹریٹ سے) حضور اور لوگوں سے پوچھئے۔ ساری خطا......

مجسٹریٹ:- خاموش (گواہ سے) ہاں پھر کیا ہوا؟

گواہ:- بس حضور وہ بڈھا موٹر کے نیچے آگیا اور کچل گیا۔

دوسرا گواہ پیش ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ:- (دوسرے گواہ سے) تم نے کیا دیکھا۔

دوسرا گواہ:- حضور میں تو موٹر کو سامنے سے آتے دیکھکر پہلے ہی رک گیا تھا۔ موٹر والے نے دور ہی سے ہارن بجایا اور موٹر کے پاس آکر ہاتھ دکھایا مگر وہ بڈھا شاید بہرا تھا کہ اس نے ہارن کی آواز نہیں سنی۔ اور شاید کم سوجھ بھی تھا کہ اس نے موٹر کو آتے ہوئے نہیں دیکھا، آخر موٹر کے نیچے آگیا۔

تیسرا گواہ پیش ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ:- تم نے کیا دیکھا۔

تیسرا گواہ:- حضور اسوقت کئی موٹریں آگے پیچھے آرہی تھیں۔ ہارن کی آوازیں میں نے ضرور سنی مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس موٹر نے ہارن دیا۔ مگر یہ میں نے دیکھا کہ موٹر کے پاس آکر اس موٹر کے بابو نے ہاتھ دکھایا۔ لوگ ایک طرف ہوگئے مگر وہ بڈھا بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر موٹر سے ٹکر ہوئی اور مرگیا۔

امر سنگھ:- (پھر ایکبار چلاکر) حضور یہ سب جھوٹ ہے۔ ان سب کو رشوت دیگئی ہے۔ اس وقت تو یہ سب کہہ رہے تھے کہ بابو نے غریب کو مار ڈالا۔ آج کیسے پلٹ گئے۔

مجسٹریٹ:- خاموش۔ خاموش۔ فیصلہ پیر کو سنایا جائیگا۔

یہ کہہ کر مجسٹریٹ ایک کمرہ میں چلا جاتا ہے۔ تماشائی بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ انمیں مکرجی بھی موجود ہے۔

مکرجی:- فیصلہ تو ظاہر ہے۔ غریب کے خون کی قیمت ہی کیا۔

(سب لوگ باہر نکل آتے ہیں۔ امر سنگھ کے آنسو جاری ہیں۔ مکرجی امر سنگھ کو ایک طرف لیجاتا ہے۔)

مکرجی:- مسٹر امر سنگھ! مجھے سخت افسوس ہے کہ تمہارے بوڑھے باپ کی اس طرح جان گئی۔ امیروں سے جہاں مقابلہ ہو وہاں انصاف کا کوئی سوال نہیں۔ مگر غریبوں کا انصاف کرنے والا خدا ہے۔

امر سنگھ:- (اپنے آنسو پونچھتے ہوئے) نہیں بابو جی غریبوں کی خدا بھی نہیں سنتا۔ مگر میں اپنا انصاف آپ کرونگا۔

مکرجی امر سنگھ کی پیٹھ تھپتھپاتا ہے۔ Young man.

تنگ میں۔ غصہ سے کام نہیں چلیگا۔ صبر و استقلال کی ضرورت ہے۔ کیا ابھی تک آپ کو کوئی کام نہیں ملا؟

امر سنگھ:۔ نہیں بابوجی۔ ابتک بالکل بیکار رہوں۔

مکرجی:۔ مجھے نہایت افسوس ہے۔

امر سنگھ:۔ کیا کہوں بابوجی آجکل میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ بوڑھی ماں کا خیال نہ ہوتا تو آج میں کبھی اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیتا۔ (پھر آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں)

مکرجی:۔ کاش اس طرح جان دینے کا کچھ حاصل ہوتا۔ آپکی طرح ہزاروں بے روزگار آپ سے زیادہ مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اسوقت ایک مختصر سا کام تو میں آپ کو دلوا سکتا ہوں۔

امر سنگھ:۔ کیا کام۔

مکرجی:۔ وہ کام جو ہر شریف انسان کو کرنا چاہیئے۔ یعنی دیش کی سیوا۔ مگر ہاں اس میں ذرا خطرہ ہے۔

امر سنگھ:۔ میں کسی خطرہ کی پروا نہیں کرتا۔ آخر فاقے کر کے مرنے سے تو یہ ہزار درجہ بہتر ہے کہ دیش کی سیوا میں جان جائے۔

مکرجی:۔ اچھی بات ہے (اپنا کارڈ دیتے ہوئے) رات کو آٹھ بجے اس پتہ پر مجھ سے ملئے۔ اسوقت تفصیل سے آپکو بتاؤنگا کہ کیا کرنا ہے۔ (جیب سے روپیہ نکالکر) یہ لیجئے بیس روپے۔ اس سے آپ اپنی اسوقت کی ضرورتیں پوری کیجئے۔

امر سنگھ بے انتہا خوش ہوتا ہے اور شکریہ ادا کر کے روپیہ لے لیتا ہے اور دونوں چلے جاتے ہیں۔

موہنی کا مکان

موہنی سادہ مگر خوبصورت لباس پہنے پریم کی منتظر ہے۔ کبھی گھنٹہ پر نظر ڈالتی ہے۔ کبھی اپنی دستی گھڑی دیکھتی ہے۔ میز کے پاس کھڑی ہو کر ایک اخبار کے ورق الٹتی پلٹتی ہے۔ پھر اُسے رکھ دیتی ہے۔ کمرہ میں ٹہلنے لگتی ہے۔ آہستہ آہستہ گنگناتی جاتی ہے۔ پھر گراموفون کھولکر ایک ریکارڈ چڑھا دیتی ہے ایک منٹ قریب کھڑے ہو کر سنتی ہے پھر ٹہلنے لگتی ہے۔ پھر ایک تصویر کے سامنے ٹھہر کر اُسے غور سے دیکھنے لگتی ہے۔ پریم آہستہ سے کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ موہنی کی اُس طرف پیٹھ ہے۔ پریم سنگھ دبے پاؤں آتا ہے اور دونوں ہاتھ موہنی کے کاندھوں پر رکھ دیتا ہے۔ موہنی جھک کر ایک طرف ہٹ جاتی ہے۔ پھر پریم کو دیکھ کر مسکرانے لگتی ہے۔

موہنی:۔ آداب۔

پریم سنگھ:۔ آداب۔

موہنی:۔ میں تو ڈر گئی تھی۔

پریم سنگھ:۔ (مسکراتے ہوئے) آپ کیا سمجھی تھیں؟

موہنی:۔ کچھ بھی نہیں۔

پریم سنگھ:۔ شاید یہ سمجھی ہوں کہ یہ پریم سنگھ بھی کہیں اُس روز والے بدمعاشوں کا ساتھی تو نہیں۔

موہنی:۔ (ہنسنے لگتی ہے) تشریف رکھیئے (دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

پریم سنگھ:۔ موہنی دیوی۔ یہ عورت کون تھی جو اُس روز میرے جاتے وقت یہاں آئی تھی۔

موہنی:۔ کون چمپا؟ وہ ڈاکٹر سنڈن کے یہاں ملازم ہے۔ اُن کی بیوی نے کسی کام سے میرے پاس بھیجا تھا۔

پریم سنگھ ڈاکٹر سنڈن کا نام اور اس کی بیوی کا ذکر سُنکر سخت مضطرب ہو جاتا ہے۔ فقط "اوہ" اس کے مُنہ سے نکلتا ہے اور خاموش رہتا ہے۔

موہنی:۔ کیوں پریم سنگھ جی۔ آپ پریشان کیوں ہو گئے؟

پریم:- کچھ نہیں، میں...... میں، کچھ نہیں۔ پریشانی کی تو کوئی بات نہیں۔

موہنی:- شاید آپ، اصلی بات مجھ سے چھپاتے ہیں۔ اور در اصل مجھے کوئی حق بھی نہیں کہ آپ کا کوئی راز آپ سے پوچھوں۔

پریم سنگھ:- راز تو کچھ ایسا نہیں۔ مگر سُن کر آپ کو افسوس ہوگا۔ جو لوگ آپ کے دوست ہیں وہ میرے خُون کے پیاسے ہیں۔

موہنی:- (حیرت سے) کون لوگ ؟

پریم سنگھ:- ڈاکٹر ٹنڈن اور اُن کی بیوی۔

موہنی:- مگر آپ نے اُنہیں میرا دوست کیسے سمجھ لیا۔ ڈاکٹر ٹنڈن یوں تو میرے چچا ہیں مگر شاید اُن سے بڑھکر میرا بدخواہ دُنیا میں کوئی نہیں۔

پریم:- (حیرت سے) ڈاکٹر ٹنڈن۔ آپکے چچا ؟

موہنی:- جی ہاں۔

پریم:- مگر وہ تو عیسائی ہیں۔

موہنی:- جی ہاں، وہ مشن اسکول اور مشن کالج کی تعلیم کی برکت سے جوانی ہی میں عیسائی ہو گئے تھے۔ سب کُنبہ والوں نے اُنہیں چھوڑ دیا تھا مگر پتاجی آخر دم تک اُن سے ملتے رہے اور اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ عمر میں وہ پتاجی سے بہت بڑے ہیں۔ میری بدقسمتی کہ مرتے وقت پتاجی اُنہیں کو میرا سرپرست مقرر کر گئے۔

پریم سنگھ:- موہنی دیوی! یہ شخص ہاتھ دھوکے میرے پیچھے پڑا ہے اور اس کی بیوی نے بھی اپنے ایک بیہودہ خط کی خاطر مجھے قتل کرانے کی کوشش کی تھی مگر پرماتما نے بال بال بچا دیا۔

موہنی (بہت متاثر ہوکر) پریم سنگھ جی۔ مجھ پر بھی اُنہوں نے پتاجی کے مرنے کے بعد بڑے بڑے ستم توڑے ہیں کئی دفعہ مجھے بیچنے کی تدبیریں کر چکے ہیں۔

پریم سنگھ:- اوہ ایسی بے غیرتی!

موہنی:- غیرت کا وہاں سوال ہی نہیں۔

(چائے آتی ہے۔ دونوں پیتے جاتے ہیں اور باتیں کرتے جاتے ہیں۔)

پریم سنگھ:- اب مجھے یہ ڈر ہے کہ اگر چمپا کے ذریعہ سے ڈاکٹر ٹنڈن کو میرے یہاں آنے کا حال معلوم ہوگیا تو شاید پھر ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔

موہنی:- نہیں۔ اس کا آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ چمپا بڑی اچھی لڑکی ہے۔ مجھے بہت چاہتی ہے۔ میں نے پہلے ہی احتیاطاً اس کو منع کر دیا ہے کہ آپ کے یہاں آنے کا حال کسی کو معلوم نہ ہو۔ وہ کسی کو نہیں بتائیگی۔

پریم سنگھ:- خُدا کرے ایسا ہی ہو۔ اچھا اُس باغ والے بابو کا تو پھر کچھ پتہ نہیں چلا۔

موہنی:- پرسوں میں ٹہلنے گئی تھی تو باغ میں مُلاقات ہوئی تھی۔ بہت معذرت کرنے لگا کہ میرا اس واقعہ سے اور اُن لوگوں سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ میں تو آپ کا خیرخواہ ہوں۔ اور آج سے نہیں۔ کئی مہینے سے۔ جب سے پہلی مرتبہ آپکو باغ میں دیکھا تھا۔

پریم سنگھ:- اُس کا نام کیا ہے۔

موہنی:- مکرجی اپنا نام بتاتا تھا۔

پریم سنگھ:- کرتا کیا ہے ؟

موہنی:- کچھ معلوم نہیں۔ مجھے تو وہ کوئی بڑا خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اسکی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔

پریم سنگھ:- پھر آپ نے کیا کہا ؟

موہنی:- میں نے کہا کہ مجھے آپکی ہمدردی نہیں چاہیئے آپ مہربانی کرکے تشریف لیجائیے۔ پھر بھی وہ کچھ دیر تک بیہودہ

باتیں بکتا ہی رہا۔ میں اٹھکر چلی آئی۔

پریم سنگھ:۔ دراصل ابھی ہمارا ملک اس قابل نہیں کہ جوان لڑکیاں تنہا سیر و تفریح کے لئے باہر جائیں۔ ہم لوگوں کے اخلاق جیسے ہیں ظاہر ہے۔ آئندہ آپکو احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر اب کہیں ملاقات ہو اور وہ آپسے کچھ کہے تو فوراً پولیس کو بلاکر اس بدمعاش کو گرفتار کرا دینا۔ مجھے افسوس ہے کہ اُسدن مجھ سے بڑی چوک ہوئی۔

موہنی:۔ پریم سنگھ جی۔ میں آپکی مہربانی اور ہمدردی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ جسدن سے آپسے ملاقات ہوئی ہے میرے دل کو بڑی ڈھارس ہوگئی ہے اور آج تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ....... (یہ کہتے ہوئے بڑی محبت سے پریم سنگھ کی طرف دیکھتی ہے۔ پریم اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے)

پریم سنگھ:۔ (آنکھیں ملاکر) کیسا محسوس ہو رہا ہے؟

موہنی:۔ (سر جھکاکر) نہ جانے میں کیا کہہ رہی تھی۔

پریم سنگھ موہنی کے ہاتھ سے کھیلتا ہے۔ موہنی سر جھکائے خاموش ہے۔

پریم:۔ اچھا اب اجازت ہے؟

موہنی:۔ اتنی جلدی!

پریم سنگھ:۔ کچھ ضروری کام ہے۔

موہنی:۔ بہت اچھا۔ (دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

موہنی:۔ اب کب ملاقات ہوگی؟

پریم سنگھ:۔ بہت جلد۔ اب میں آپکے خط کا انتظار نہیں کروں گا۔

موہنی:۔ شکریہ۔

پریم موہنی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے پھر دونوں ایک دوسرے کو نہایت پُرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ موہنی شرماکر آنکھیں نیچی کر لیتی ہے۔

پریم سنگھ:۔ "اچھا آداب" کہکر روانہ ہو جاتا ہے۔

مکرجی کی قیام گاہ۔ چھ بجے شام کا وقت

مختصر مکان۔ تھوڑا سا سامان۔ مگر ہر چیز نہایت صاف ستھری۔ مکرجی کمرہ میں کھڑکی کے برابر نہایت خوش و خرم آرام کرسی پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہے۔ ڈاکٹر ٹنڈن داخل ہوتا ہے۔ مکرجی نہایت گرمجوشی سے اس کا استقبال کرتا ہے اور بڑے احترام سے بٹھاتا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ (مسکراکر) مکرجی آج تو آپ بہت خوش نظر آتے ہیں۔

مکرجی:۔ آپ کا خیال صحیح ہے۔ واقعی آج میں بے انتہا خوش ہوں۔ اور آپکو بھی یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ دس بلکہ گیارہ بے روزگار نوجوان گریجویٹ اور ہمارے دیش سیوک منڈل میں داخل ہوگئے۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ (حیرت اور مسرت سے) واقعی؟

مکرجی:۔ واقعی۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ خدا جانے آپ کیا جادو کرتے ہیں کہ اچھے اچھے تعلیم یافتہ لوگ آپکی باتوں میں آجاتے ہیں اور آپکے کہنے سے بڑے بڑے خطرناک کام کر ڈالتے ہیں۔ اچھا ان لوگوں کو کیا سبق پڑھایا۔

مکرجی:۔ وہی پُرانا سبق کہ تمہاری مفلسی اور بے روزگاری کے ذمہ دار دولتمند لوگ ہیں۔ ملک کی غلامی کا سبب صرف مالدار ہیں۔ ان کا خاتمہ ہو جائے تو کل ملک آزاد ہو جائے اور یہ ساری بلائیں ایک منٹ میں کافور ہو جائیں۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ اور سب لوگوں نے اس بات کو تسلیم کیا؟

مکرجی:۔ تسلیم کیسے نہ کرتے۔ بات ہی معقول ہے۔
ڈاکٹر ٹنڈن:۔ لیکن بڑے زور شور سے آپکی تحریک کی مخالفت شروع ہو گئی ہے۔ کل وکٹوریہ پارک میں جلسہ تھا بابو راجیندر نے بڑی دھواں دھار تقریر کی اور لوگوں کو بتایا کہ مالداروں اور دولتمندوں کے خلاف جو غریب مزدوروں اور کسانوں کو اُبھارا جا رہا ہے یہ محض خود غرض لوگوں کی چالیں ہیں جو وہ اپنے ذاتی فائدہ کے لئے چل رہے ہیں۔
مکرجی:۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی دی یا بس یوں ہی؟
ڈاکٹر ٹنڈن:۔ ایک دلیل کیا بہت سی دلیلیں دیں اُنہوں نے کہا کہ اس وقت جو کچھ بھی غریبوں کے فائدہ کا کام ہو رہا ہے وہ سب امیروں ہی کے دم سے ہے۔
مکرجی:۔ (حقارت سے) ہونہہ۔ غریبوں کے فائدہ کا کام۔ دغا باز مکار کہیں کے۔ اِن بے ایمانوں کو ایسی باتیں کہتے ہوتے شرم بھی نہیں آتی۔ اور کیا کہا!
ڈاکٹر ٹنڈن:۔ کہا کہ آخر یہ سینکڑوں پبلک ہسپتال یتیم خانے، محتاج خانے کس کے روپے سے چل رہے ہیں۔ یہ ہزاروں اسکول سینکڑوں کالج اور کتنی ہی یونیورسٹیاں جنہیں سرکار سے برائے نام مدد ملتی ہے اور جنہیں کروڑوں روپیہ سالانہ کا خرچ ہے کس طرح قائم ہیں۔
مکرجی:۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ یہ اسکول اور کالج آخر ہیں کس مرض کی دوا۔ کلرک بنانے کی فیکٹریاں ہیں جو انسانوں کو اپاہج کرکے بے روزگاری پھیلا رہی ہیں۔
ڈاکٹر ٹنڈن:۔ اُنہوں نے کہا کہ مُلک کی بڑی بڑی پولٹیکل اور سوشل تحریکوں کیلئے روپیہ کہاں سے آتا ہے؟
مکرجی:۔ یہ سب تحریکیں مالداروں کی جڑیں مضبوط کرنے کیلئے چلائی جاتی ہیں۔ دولتمند اُن کیلئے روپیہ کیوں نہ دینگے۔
ڈاکٹر ٹنڈن:۔ اس پر خاص طور پر زور دیا کہ یہ سینکڑوں ہزاروں مفت کے دھرم شالے، مسافر خانے اور آشرم کون چلا رہا ہے!
مکرجی:۔ ارے آج ہم مفلس نہ ہوتے تو ہمیں ان خیرات خانوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔
ڈاکٹر ٹنڈن:۔ پھر اُنہوں نے کہا کہ مُلک میں صنعت و حرفت کی جو کچھ بھی ترقی ہے یہ کس کے دم سے ہے۔ یہ بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں جن کے ذریعہ سے لاکھوں مزدوروں اور غریبوں کا پیٹ پلتا ہے کس کی بدولت قائم ہیں؟
مکرجی:۔ یہ کارخانے ہی تو لعنت ہیں جنہوں نے ہندوستان کی ساری دستکاریوں اور صنعتوں کو تباہ کر دیا (طنزیہ) اور ان سے غریبوں کا پیٹ پلتا ہے؟ غریب اور مزدور نہ ہوں تو یہ کارخانے چل بھی سکتے ہیں؟
ڈاکٹر ٹنڈن:۔ آخری بات اُنہوں نے یہ کہی کہ دولتمندوں نے کسی کا کچھ چھین تو نہیں لیا۔ اپنی لیاقت اور محنت سے دولت پیدا کی ہے۔ نالائقوں اور کاہلوں کو حسد ہوتا ہے۔
مکرجی:۔ کیا کہنے تمہاری لیاقت کے۔ ڈاکٹر صاحب آپ یقین کیجئے کہ اس قسم کی تقریروں سے ہماری تحریک کو کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا۔ یہ لوگ مرض کا سبب جانے بغیر مرض کا علاج چاہتے ہیں۔ جب تک بے روزگاری کے دُور کرنے کی سبیل نہ نکلے گی ہماری تحریک فنا نہیں ہو سکتی اور جب تک یہ ہزاروں اسکول اور کالج موجود ہیں اور اُن میں یہی کلرک بنانے والی تعلیم جاری ہے بے روزگاری روز بروز بڑھتی ہی جائیگی۔ ڈاکٹر صاحب بھوک بُری چیز ہے۔ یہی اسکول اور کالج کے لڑکے، یہی تمہارے بے روزگار گریجویٹ پیٹ کی خاطر ڈاکو اور خونی بن جائیں گے۔ دولتمندوں

کو لوٹیں گے اور اپنا پیٹ بھرینگے۔ انہیں میں سے انارکسٹ
اور ٹیررسٹ پیدا ہونگے جو ملک کے امن و امان کو تباہ
کر ڈالیں گے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- مکرجی آپنے تو آج میرے بھی ہوش اڑا دئے۔
اس کے تو یہ معنی ہیں کہ جس کے پاس بھی کچھ سرمایہ ہو اسکی
جان مال۔ آبرو کوئی چیز محفوظ نہیں۔

مکرجی :- ہرگز نہیں۔ میں تو خدا سے یہ دعا کرتا ہوں کہ
اس موجودہ تعلیم کی اصلاح کی طرف کسی کا خیال نہ جائے۔
ملک کی غلامی کی زنجیریں انہیں بے روزگار گریجویٹوں کے
ہاتھوں کٹینگی۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- اچھا مکرجی اب کچھ کام کی بات کیجئے آج
کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔ کتنے روپیہ بینک سے لے آئے؟

مکرجی :- روپیہ تو میں لے آیا مگر وہ رپورٹ؟

ڈاکٹر ٹنڈن :- (خوش ہو کر کاغذ کا ایک پیکٹ جیب سے
نکالتا ہے) رپورٹ یہ موجود ہے۔

مکرجی اسے بڑے شوق سے لیتا ہے۔ کھولکر ایک
نظر اس پر ڈالتا ہے اور اٹھکر دوسرے کمرے میں رکھ آتا
ہے۔ واپس آکر پھر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- (بے چینی کے ساتھ) اچھا تو اب روپیہ
عنایت فرمائیے۔

مکرجی :- (نہایت نرمی سے) روپیہ موجود ہے مگر.....

ڈاکٹر ٹنڈن :- (نہایت بے صبری سے) مگر کیا؟

مکرجی :- مگر یہ کہ آپ کو ایک کام اور بھی کرنا ہوگا۔ آپ
جانتے ہیں کہ یہ کام تو دوسری حکومتوں کا ہے۔ میری ذات
کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک ذرا سا کام میرا بھی کر دیجئے
تو روپیہ فوراً حاضر ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- (نہایت غضبناک ہو کر) میرے ساتھ
آپکی یہ عیاری نہیں چلینگی۔ مہربانی کر کے آپ میرے کاغذات
واپس کر دیجئے۔

مکرجی :- (ہنس کر) کاغذات تو اب واپس نہیں مل سکتے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- (غصہ میں کرسی سے کھڑا ہو جاتا ہے) کاغذ
نہیں مل سکتے! (جیب سے پستول نکالکر) کاغذ تو میں آپ سے
ابھی لے لونگا۔ ابھی آپ ڈاکٹر ٹنڈن سے واقف نہیں ہیں
اگر مجھے تنگ کیا تو ابھی سازش کا سارا کچا چٹھا کھولدونگا۔
ابھی جناب بڑے گھر میں تشریف رکھتے ہونگے۔

مکرجی :- (نہایت اطمینان کے ساتھ) ڈاکٹر صاحب اتنے
تیز نہ ہوجیئے۔ یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دکھائیے گا۔
پولیس کو اگر خبر ہوگئی تو مجھ سے پہلے آپ جہنم واصل
ہونگے۔ میں دوسری حکومتوں کا باضابطہ ایجنٹ اور جاسوس
سہی مگر میرا کام تو سب آپ ہی کرتے رہے ہیں ہندوستان
کے متعلق رپورٹیں تو سب آپ ہی نے تیار کرا کے باہر
بھجوائی ہیں۔ روپیہ تو اکثر آپ ہی کی معرفت تقسیم ہوا ہے
جس کی رسیدیں میرے پاس موجود ہیں ہمارے دیش
سیوک منڈل کے بعض جلسے بھی تو آپ کے مکان پر
ہوئے ہیں۔ میں پھنسا تو آپ ضرور بچ جائینگے۔ یاد رکھئے
میرے لئے تو بچت کے اور بھی کئی رستے ہیں مگر آپ یقیناً
کتے کی موت مارے جائینگے۔ آیا خیال شریف میں؟

ڈاکٹر ٹنڈن مغلوب ہو کر دھیما ہو جاتا ہے اور نہایت
پریشانی اور عاجزی کے لہجہ میں کہتا ہے :-
اچھا آپکا وہ ذاتی کام کیا ہے؟

مکرجی :- پہلے یہ فرمائیے کہ مس موہنی دیوی سے آپ سے
کیا رشتہ ہے!

ڈاکٹر ٹنڈن :- وہ میری بھتیجی ہے۔

مکرجی :- اور آپ اُسکے قانونی سرپرست بھی ہیں؟

ڈاکٹر ٹنڈن:- ہاں۔

مکرجی:- (نہایت خوش ہو کر) تب تو کام سہل ہے۔ دراصل میں موہنی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کام کرا دیجئے اور سات ہزار روپے آپ کے۔

ڈاکٹر ٹنڈن:- (قدرے اطمینان کے ساتھ) یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ میں کل ہی موہنی کو آپ کے حوالہ کر دونگا لیکن اس رپورٹ کے معاوضہ میں ہمارا آپ کا اقرار تو دس ہزار کا تھا۔

مکرجی:- آپ جلدی نہ کیجئے۔ باقی ضروری کاغذات بھی لے آیئے اور وہ تین ہزار بھی لے لیجئے۔

ڈاکٹر ٹنڈن:- اچھی بات ہے۔ میں ابھی موہنی کے یہاں جاتا ہوں۔

مکرجی:- ہاں، ایک بات میں آپ سے کہنا بھول گیا۔ موہنی سے میں کئی مرتبہ مل چکا ہوں۔ مگر کبھی اُس نے مجھے اظہار مطلب کا موقع نہیں دیا اور نہایت بداخلاقی سے پیش آئی۔

ڈاکٹر ٹنڈن:- آپ کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں اُسے ٹھیک کر لونگا۔ (فوراً چلا جاتا ہے)

اس کے جانیکے بعد مکرجی پلنگ پر لیٹ جاتا ہے۔ موہنی کی تصویر نکالکر دیکھتا ہے اور کہتا ہے:-

"کیا پیاری صورت ہے۔"

ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

روپ کماری بناؤ سنگھار کئے بہترین لباس اور زیور پہنے پریم سنگھ کی منتظر ہے۔ چمپا کو آواز دیتی ہے۔

روپ کماری:- چمپا!

چمپا آتی ہے۔

روپ کماری:- (کچھ دیر سوچتی ہے۔ پھر سر اُٹھا کر) چمپا! یہ صاحب جو ہمارے یہاں چائے پر آ رہے ہیں یہ بہت تیز چائے پیتے ہیں۔

چمپا:- تو میں بہت تیز چائے بنا لونگی۔

روپ کماری:- نہیں۔ اسکی ایک اور صورت ہے۔ ولایت والوں نے چائے کا ایک جوہر نکالا ہے۔ پیالی میں ایک بوند ڈال دینے سے چائے نہایت تیز اور خوش مزہ ہو جاتی ہے۔ مگر جو لوگ اس کے عادی نہیں وہ نہیں پی سکتے۔ میں نے تو ایک دفعہ انہیں کے یہاں پی تھی تو چکر آ گیا تھا اور غشی کی سی حالت ہو گئی تھی۔ (یہ کہتے ہوئے میز پر سے ایک صندوقچہ اُٹھا کر کھولتی ہے اور زہر کی سفید شیشی نکالکر چمپا کو دیتی ہے) دیکھو! اس میں سے ایک بوند اُنکی پیالی میں ڈال دینا۔

چمپا:- بہت اچھا۔

روپ کماری:- اچھی طرح خیال رکھنا۔ میری پیالی میں ہرگز نہ ڈالنا۔ دیکھو بھول نہ جانا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کی پیالی میں بھی نہ ڈالے۔

چمپا:- کہئے تو میں شیشی خود انہیں کو دیدوں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق خود ڈال لینگے۔

روپ کماری:- (جھلا کر) اُلّو کہیں کی۔ میں کہتی ہوں انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیئے، تو کہتی ہے شیشی انہیں کو دیدوں۔

چمپا:- (ڈر کر) اب سمجھ گئی۔ معاف کر دیجئے۔ پہلے میں سمجھی نہیں تھی۔ آپ اطمینان رکھئے۔ جیسا آپ نے حکم دیا ہے ویسا ہی ہوگا۔

(چمپا جاتی ہے۔ روپ کماری اُسے پھر پکارتی ہے اور کہتی ہے)

روپ کماری:- چمپا! میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ یہ جوہر دودھ میں ڈال دینا۔ ممکن ہے کہ نئی بنائی چائے آئے تو وہ سمجھ جائیں۔ سمجھ گئے تو پھر لطف ہی کیا رہیگا۔

چمپا:- بہت اچھا۔ (جاتی ہے)

گھنٹہ چار بجاتا ہے۔ رام داس پریم سنگھ کے آنے کی خبر دیتا ہے۔ روپ دروازہ تک جاکر پریم سنگھ کو لیکر آتی ہے۔ پریم سنگھ روپ کماری سے ہٹ کر بیٹھتا ہے۔ وہ فوجی وردی پہنے ہوئے ہے جیب میں پستول، اور کمر میں تلوار لگی ہے۔ چہرہ پر پریشانی کے آثار ہیں اور ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔

روپ کماری:- (مسکراکر) سرکار نے یہ ہتھیار کیوں سجے ہیں۔ خدانخواستہ کسی دشمن سے لڑنے جانا ہے؟

پریم سنگھ:- (متانت سے) نہیں، یہاں سے مجھے پریڈ پر جانا ہے۔ اچھا فرمایئے کیا حکم ہے!

روپ کماری:- (نہایت دلربایانہ انداز سے) حکم تو نہیں ایک التجا ہے۔ پریم تمہیں یقین تو کیوں آنے لگا مگر بدنصیب روپو تمہاری محبّت کو آج بھی نہیں بھولی۔ میں جانتی ہوں کہ خدا نے تمہیں بہت شریف اور فیاض دل دیا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے مجھ سے جو قصور ہوتے تم اُنہیں ضرور بھول گئے ہوگے۔

پریم سنگھ:- (اپنی تلوار سے کھیلتے ہوئے) روپ! کیا تم سمجھتی ہو کہ جو کچھ تم نے کیا اُسے بھلا دینا ممکن ہے! ایک بیگناہ جس نے محبت کے سوا اور کوئی جرم تمہارا نہیں کیا تم اُس کے قتل کے درپے ہوئیں۔ شاید تمہارے یہاں کا یہی قانون ہے کہ پہلے ایک شخص سے محبّت کرنا۔ پھر اسکا خاتمہ کرکے دوسرے سے دل لگا لینا۔ آہ روپو تم نے میرے کلیجہ میں جو ناسور ڈالدئے ہیں اُنہیں میں کس طرح بھول سکتا ہوں۔

روپ کماری:- (سخت شرمندہ ہوکر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑلیتی ہے) ہائے پریم۔ ابھی تک تم پُرانی باتوں کو نہیں بھولے۔ ابھی تک تمہارے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔

پریم سنگھ:- (روپ کماری کی طرف دیکھکر) روپ۔ ایشور جانتا ہے کہ انتقام کا تو میرے دل میں وہم و گمان بھی نہیں۔ ہاں........

روپ کماری:- (بات کاٹ کے) اگر تمہارے دل میں انتقام کا خیال نہیں تو پھر میرا وہ خط جو میں نے تمہاری محبّت سے مجبور ہوکر تمہیں لکھدیا تھا کاہے کو اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے۔ مجھے واپس کیوں نہیں دیدیتے؟

پریم سنگھ:- (متاثر ہوکر) روپو تم یقین رکھو کہ اس خط سے ہرگز تمہیں کوئی نقصان نہیں پہونچیگا اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے نقصان پہونچانے کی کوئی کوشش نہ کی تو میں ہرگز وہ خط کسی کو نہیں دکھاؤنگا۔ اب میرا دل تم سے بالکل صاف ہے۔

روپ کماری پریم سنگھ کی باتوں سے بالکل مطمئن نہیں ہوتی۔ گھنٹی بجاتی ہے۔ چمپا آتی ہے۔ روپ اشارے سے کہتی ہے کہ چائے لاؤ۔

روپ کماری:- پریم میں تمہاری بیحد شکر گذار ہوں۔ اب تم وہ خط مجھے دو یا نہ دو، مجھے بالکل اطمینان ہوگیا۔ تم یقین رکھو میں آئندہ ہرگز تمہیں نقصان پہونچانے کی کوشش نہ کرونگی۔

پریم سنگھ:- (آنکھیں ملاکر) اچھا روپو اگر ابھی تمہارا خط واپس دیدوں تو کیا قسم کھاکے وعدہ کروگی کہ پھر مجھ سے کوئی سروکار نہ رکھوگی۔

روپ کماری:- (نہایت عاجزی سے) جیسی چاہے قسم لے لو۔ پریم! پرماتما کی قسم۔ اپنی عزت کی قسم۔

پریم سنگھ کا دل بہت نرم ہوجاتا ہے۔ اپنے کوٹ کی

جیب میں ہاتھ ڈالکے خط نکالتا ہے اور روپ کی میز پر رکھدیتا ہے۔ اتنے میں چمپا چائے لیکر آتی ہے۔ اُسے دیکھکر روپ سخت مضطرب ہوتی ہے۔ ایک سکتہ کی سی حالت اسپر طاری ہوجاتی ہے۔ پریم سنگھ کچھ نہیں سمجھتا کہ کیا معاملہ ہے۔ وہ دو پیالیوں میں چائے لوٹتا ہے، جب دودھ ڈالنا چاہتا ہے تو روپ کہتی ہے:۔

روپ کماری:۔ میری پیالی میں دودھ نہ ڈالنا۔ میں کچھ دنوں سے سادہ چائے پیتی ہوں۔

پریم سنگھ چائے بنا کر بڑے شوق سے پیتا ہے۔ روپ کماری اس تمام وقفہ میں خاموش اور سخت مضطرب بنی ہے۔ چائے پینے کے بعد:۔

پریم سنگھ:۔ روپو۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت تمہاری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ بہتر ہے کہ تم اس وقت آرام کرو۔ اچھا پھر کسی دن ملاقات ہوگی (روپ کماری کی حالت اور بھی خراب ہوجاتی ہے)

روپ کماری:۔ ہاں پریم نہ جانے کیوں اس وقت میری طبیعت بہت بگڑ رہی ہے۔ معاف کرنا۔

پریم سنگھ:۔ آداب۔

روپ کماری:۔ آداب۔

پریم سنگھ جاتا ہے۔ روپ کماری اُسی حال میں صوفے پر پڑی رہتی ہے۔ دروازہ سے نکلتے وقت چمپا پریم سنگھ کو روک کے کہتی ہے:۔

چمپا:۔ بابو جی! آج میں نے آپکی جان بچالی۔ اور یہ عرق جو بائی جی نے دیا تھا کہ دودھ میں ڈالدوں، میں نے نہیں ڈالا۔

زہر کی شیشی چمپا کے ہاتھ میں ہے۔ پریم سنگھ سخت حیرت اور غور سے چمپا کو دیکھتا ہے۔

چمپا:۔ میں اُن کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ ایسے شریف اور بہادر جوان کی جان لینا بہا پاپ ہے۔ میں اس میں ہرگز شریک نہیں ہوسکتی۔

پریم سنگھ کو چمپا کی سچائی کا یقین ہوجاتا ہے شیشی اُس کے ہاتھ سے لیکر دیکھتا ہے۔ اس پر "زہر" لکھا ہے۔ پڑھکر تھرا جاتا ہے۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈالکر کچھ روپے نکال کر چمپا کو دیتا ہے اور کہتا ہے:۔

"بھگوان تمہیں اس نیکی کا بدلہ دیگا" یہ کہہ کے چلدیتا ہے مگر دفعتہً اُس کا خون جوش میں آتا ہے اور دیوانوں کی طرح روپ کماری کے کمرہ کی طرف پلٹتا ہے۔ چمپا سدِ راہ ہوتی ہے اور ہاتھ جوڑ کر کہتی ہے:۔

چمپا:۔ بابو جی، میرے اُوپر رحم کیجئے! میں تباہ ہوجاؤنگی۔

پریم سنگھ:۔ تم کچھ فکر نہ کرو۔

روپ کماری پریم سنگھ کے جانے کے ذرا دیر بعد اُٹھتی ہے۔ خط میز پر سے اُٹھاتی ہے۔ غور سے دیکھتی ہے۔ دیا سلائی جلاتی ہے کہ اسے جلا ڈالے۔ یکایک بھاری پاؤں کی وحشتناک آواز سُنتی ہے۔ خط کو اپنے بلاؤز میں چھپالیتی ہے۔ پریم سنگھ سخت غضبناک اور بدحواس گرجتا ہوا داخل ہوتا ہے اور تلوار کھینچکر روپ کماری کی طرف بڑھتا ہے۔ روپ کماری چلاتی ہے۔

آہ۔ پریم۔ ارے تمہیں کیا ہوگیا۔

پریم سنگھ:۔ (گرجکر) غدار۔ قاتل۔ خونی۔ تونے مجھے زہر دیدیا! خط واپس کر۔

روپ کماری پیچھے ہٹتی جاتی ہے اور کہتی ہے۔

تم سے کس نے کہا کہ تمہیں زہر دیا گیا۔

پریم سنگھ:۔ کہا کسی نے نہیں۔ میں اپنی حالت سے سمجھ رہا ہوں۔ آہ۔ ارے کلیجہ پھنکا جاتا ہے۔ جلدی کر میں اب گرتا ہوں اور تجھے بھی ٹھکانے لگاتا ہوں۔

روپ کماری:- (چیخ مار کر) ارے دوڑو۔ دوڑو۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔
پریم سنگھ تلوار اُس کے گلے پر رکھدیتا ہے اور کہتا ہے:-
"خط فوراً واپس دیدے"
روپ کماری خوف کے مارے بلاؤز میں سے خط نکالکر
پریم سنگھ کے سامنے ڈالدیتی ہے۔
پریم سنگھ:- (خط اُٹھاکر) زندہ رہگیا تو اس دغابازی کا
مزہ چکھاؤنگا، اسوقت تو چھوڑے دیتا ہوں۔
فوراً کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ روپ کماری بڑی بُری
حالت میں اٹھکر صوفے پر جا پڑتی ہے۔ پھر چند منٹ میں اٹھکر:-
"بدبخت! کل تک تُو خود راکھ کا ڈھیر ہوگا"

رایل بیکری Royal Bakery

ایک شخص صندوق نے بیکری میں داخل ہوتا ہے۔ اسکے
بعد ایک اور۔ اسکے بعد ایک اور۔ پھر مکرجی پہنچتا ہے جلسہ
شروع ہوتا ہے۔
مکرجی:- آج ایک خاص ضرورت سے میں نے آپ لوگوں کو
تکلیف دی ہے۔ باہر سے جو خبریں آرہی ہیں اُن سے معلوم
ہوتا ہے کہ دوسرے شہروں میں ہمارے دیش سیوک اب
اُس سرگرمی سے کام نہیں کررہے ہیں جس طرح ابتدا کی تھی۔
شاید انکا جوش ٹھنڈا پڑگیا۔ یا وہ تھک گئے ہیں بہرحال
جو صورت بھی ہو۔ ایک بار پھر اُن میں اسٹیم بھرنے کی
ضرورت ہے۔
ایک شخص:- پھر آپنے اسکے لئے کوئی تدبیر سوچی؟
مکرجی:- ہاں۔ اس مطلب کے لئے مجھے دورے پر جانا ہوگا۔
ممکن ہے واپسی میں تین چار مہینے لگ جائیں۔ اتنی مدت تک
ہمارا اس centre سینٹر بغیر لیڈر کے نہیں رہنا
چاہیئے ورنہ بہت سے کام خراب ہوجائینگے اس لئے میں چاہتا
ہوں کہ آپ لوگوں میں سے کسی کو منڈل کا سردار مقرر کردیا جائے۔
تاکہ میری غیر حاضری میں سب کاموں کو اپنی ذمہ داری سے
انجام دے۔
ایک شخص:- تو پھر جسے آپ پسند کریں مقرر کردیجئے۔
مکرجی:- جہاں تک بھروسے اور لیاقت کا سوال ہے میرے
نزدیک آپ سب لوگوں کا مرتبہ برابر ہے مگر دیش سیوک بننے
کے بعد نمبر ۱۱۱ ایک سو گیارہ نے جو قربانیاں کی ہیں انہیں دیکھتے
ہوئے میرا خیال ہے کہ اگر آپ لوگ بھی پسند کریں تو انہیں کو اس
مدت کیلئے سردار مقرر کردیا جائے۔
سب۔ ہمیں آپکی رائے سے بالکل اتفاق ہے۔
امر سنگھ:- (کھڑے ہوکر) میں سب بھائیوں کا اور سردار کا
تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے یہ عزت دی گئی۔
مکرجی:- اچھا یہ مسئلہ تو طے ہوا۔ اب ایک سوال اور ہے۔
اس میں شک نہیں کہ اس وقت کی ضرورتوں کیلئے ہمارے پاس
کافی روپیہ موجود ہے لیکن پھر بھی ہمیں اس طرف سے غافل
نہیں رہنا چاہیئے۔ آج کل پولیس چونکہ بڑی سرگرمی سے
ہماری جماعت کا پتہ لگانے میں مصروف ہے اس لئے کچھ دنوں
قتل، خون اور اسی قسم کے دوسرے ہنگاموں سے دُور رہکر
زیادہ آسان اور خاموش طریقوں سے روپیہ حاصل کرنا بہتر ہے۔
ایک شخص:- خاموش اور آسان طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟
مکرجی:- سُنیئے میں بتاتا ہوں۔ راجے بہادر بنارسی داس
کو تو آپ سب لوگ جانتے ہیں؟
ایک شخص:- شہر میں اُنہیں کون نہیں جانتا۔
مکرجی:- ہاں وہ ہمارے شہر کے سب سے بڑے رئیس اور کروڑپتی
آدمی ہیں اُنکے صرف ایک ہی بچہ ہے۔ اگر اُسے (Kidnapped)
کڈنیپ کردیا جائے تو چالیس پچاس ہزار روپیہ مل جاتا

معمولی بات ہے۔
ایک شخص :۔ مگر خود بچّہ کا کڈنیپ کرنا تو سہل نہیں جس وقت گھر سے نکلتا ہے اس کی حفاظت کیلئے کتنے ہی آدمی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔
مکرجی :۔ یہ سب پہلو میں نے سوچ لئے ہیں۔ بچّہ کی نرس ایک جوان چھوکری ہے نمبر ۱۲ نے اُس سے دوستی کرلی ہے۔ شام کے وقت وہ بچّہ کو ہوا کھلانے اور باغ میں ٹہلنے کے لئے نکلتی ہے۔ نمبر ۱۲ سے ملنے کیلئے باغ کی بونڈری تک آجائیگی۔ بچّہ بھی ساتھ ہوگا۔ باقی کام آسان ہے۔ نمبر ۱۲ کے علاوہ دو آدمیوں کی اور ضرورت ہوگی۔
ایک شخص :۔ جسے آپ حکم دیں وہ چلا جائے۔
مکرجی :۔ نمبر ۵ اور نمبر ۱۰۔
دونوں :۔ (کھڑے ہوکر) بہت بہتر

موہنی کا مکان

(پریم سنگھ داخل ہوتا ہے)

پریم :۔ (ملازمہ سے) بائی جی ہیں۔
مُلازمہ :۔ جی ہاں۔
پریم سنگھ :۔ کیا کررہی ہیں۔
مُلازمہ :۔ اُوپر کمرے میں بیٹھی کچھ لکھ رہی ہیں۔
پریم سنگھ :۔ اچھا ہمارے آنے کی اطلاع کردو۔
ملازمہ :۔ بہت اچھا۔ (جاتی ہے۔ جسوقت زینے پر چڑھنے لگتی ہے پریم اُسے پھر آواز دیتا ہے۔)
پریم سنگھ :۔ مگر دیکھو۔
ملازمہ پلٹتی ہے۔
پریم سنگھ :۔ اطلاع کی ضرورت نہیں۔ ہم خود چلے جائینگے۔

دبے پاؤں زینہ پر چڑھتا ہے اور آہستہ سے کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ موہنی میز پر بیٹھی کچھ لکھ رہی ہے۔ پریم سنگھ آہستہ آہستہ جاکر اُسے آغوش میں لے لیتا ہے۔ موہنی تڑپ کر اُس کی گود سے نکل جاتی ہے۔
پریم سنگھ :۔ موہنی دیوی مجھے معاف کرنا۔ میں بالکل بے اختیار ہوگیا تھا جو بالکل دیوانوں کی طرح تمہیں آغوش میں لے لیا۔
موہنی :۔ (بیتابانہ پریم سنگھ کی طرف بڑھتی ہے اور شرماتے ہوئے انداز سے) پریم سنگھ جی! (یہ کہکر پریم سنگھ کا ہاتھ تھام لیتی ہے)
پریم سنگھ :۔ یہ کیا لکھا جارہا تھا۔
موہنی :۔ کچھ نہیں (یہ کہہ کر میز کی طرف بڑھتی ہے اور خط اُٹھا کر چاک (دو ٹکڑے) کر ڈالتی ہے۔
پریم سنگھ :۔ شاید کوئی راز کی بات ہے۔ معاف کیجئے گا میں نے تو یونہی بے خیالی میں پوچھ لیا تھا۔
موہنی :۔ (گھبراکر) نہیں پریم سنگھ جی۔ راز کیسا۔ آپ نہ دیکھ سکتے ہیں۔
پریم سنگھ :۔ میرے دیکھنے کی چیز ہوتی تو آپ اسے پھاڑ کیوں ڈالتیں۔
موہنی :۔ آج آپ کیسی باتیں کررہے ہیں (کاغذ پریم سنگھ کی طرف بڑھاکر) میری خاطر سے دیکھ لیجئے۔
پریم سنگھ :۔ زبانی ہی بتادیجئے۔
موہنی :۔ نہیں۔ میں نہیں بتاؤنگی۔
پریم سنگھ :۔ آخر کیا ہرج ہے۔
موہنی :۔ اور آپ خود ہی پڑھ لیں تو کیا ہرج ہے۔
پریم سنگھ خط لیکر باآوازِ بلند پڑھتا ہے :۔
"پریم۔ تم نے تو کہا تھا کہ اب جلد ملاقات ہوگی۔ اِ

تمہارے خط کا انتظار نہیں کرونگا۔ مگر تمہیں اپنی مصروفیتوں میں شاید ایک........

موہنی :- (پریم سنگھ کے ہاتھ سے خط چھین کر) بس اب نہیں پڑھنے دونگی۔

پریم سنگھ بیتاب ہوکر دونوں ہاتھ موہنی کے کاندھوں پر رکھدیتا ہے۔ پھر دونوں ایک صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔

پریم سنگھ :- موہنی، یہ تین دن اور تین راتیں جس بےچینی اور بیقراری سے کٹی ہیں، بس میرا ہی دل جانتا ہے۔ خاصکر کل سے تو میری بُری حالت تھی۔ تڑپ تڑپ کے رات کاٹی ہے۔ مگر یہ نوکری کمبخت غلامی ہے، لاکھ چاہا کہ آؤں مگر نہ آسکا۔

موہنی :- (نظر نیچی کئے ہوئے) پریم سنگھ جی۔ کیا واقعی آپکو میرا اتنا خیال ہے۔ کیا میں ان سب باتوں کا یقین کرلوں ایک مرد جسے خدا نے حُسن، دولت، عزت، جوانمردی سب ہی کچھ دیا ہے وہ ایک بے یار و مددگار اور گمنام لڑکی سے بھلا کیوں محبت کریگا۔

پریم سنگھ :- موہنی، میں تمہاری محبت کے قابل تو نہیں مگر ایشور جانتا ہے کہ تمہاری محبت کچھ اس طرح میری رگ رگ میں.......

موہنی :- (بیتابانہ) "آہ۔ پریم پیارے" کہکر پریم سے ہم آغوش ہوجاتی ہے۔ پریم اُسے زور سے بھینچ لیتا ہوا اور اُس کے لبوں کو چومتا ہے۔ موہنی پر ایک بیخودی سی طاری ہوجاتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کرلیتی ہے اور اُس کا سر پریم کے بازو پر پیچھے کو ڈھلک جاتا ہے۔ ایک منٹ کے بعد دونوں جُدا ہوتے ہیں اور پھر گفتگو شروع ہوتی ہے۔

پریم سنگھ :- اُس دن کے بعد پھر تو مکرجی سے بھینٹ نہیں ہوئی۔ خُدا جانے کیوں مجھے اُس شخص سے دلی نفرت ہوگئی ہے۔

موہنی :- (کچھ سوچ رہی ہے۔ پریم کے سوال کا جواب نہیں دیتی، پھر کہتی ہے) آہ پریم اگر تمہیں معلوم ہوجائے کہ اس تین دن میں میں کیسی بیقرار رہی ہوں۔ ایک ایک گھڑی کس طرح ایک ایک برس کی مانند گذاری ہے۔ جیسے کوئی قید میں ہو۔ تو مجھے یقین ہے کہ تمہیں میرے حال پر ترس آجائے اور تم مجھ سے محبت کرنے پر مجبور ہوجاؤ۔

(موہنی کی آواز بھرّا جاتی ہے۔ ذرا دیر خاموش رہتی ہے اس کے بعد) ہاں تو پریم، تم مجھے میرے دشمنوں سے بچاؤگے۔ مجھ بیکس کی مدد کروگے؟ مجھے اپنی حفاظت میں لے لوگے؟ (آنسو گرنے لگتے ہیں۔)

پریم سنگھ :- او جان۔ خُدا کیلئے...... مجھے سخت تکلیف ہورہی ہے۔ بتاؤ تو آخر تمہارے دشمن ہیں کون لوگ؟

موہنی :- ایک تو یہی مکرجی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص دن رات میری فکر میں لگا رہتا ہے۔ کل صبح میں اپنی ایک سہیلی سے ملنے گئی تھی، راستہ میں ملگیا۔ کہنے لگا کہ مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کہنا ہے۔ میں نے کہا مجھے فرصت نہیں، اور میں چل پڑی۔ وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا کہ تمہیں میری بات سُننی ہوگی۔ میں نے کہا تم اپنا راستہ لو نہیں تو میں ابھی پولیس کو بلُاتی ہوں۔ پولیس کا نام سُنکر گھبرا گیا اور کہنے لگا کہ اچھا میں تو جاتا ہوں مگر اس بدسلوکی کا نتیجہ بھی دیکھ لینا۔ بس جب سے میرا دل لرز رہا ہے۔ خُدا جانے یہ بدمعاش کیا کریگا۔

پریم سنگھ :- نہیں موہنی تم بالکل فکر نہ کرو۔ وہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔

موہنی :- (کچھ سوچکر) اور دوسرا دشمن۔ خود میرے چچا ڈاکٹر ٹنڈن۔

پریم سنگھ :- چچا۔ تم اُسے چچا کہتی ہو موہنی، آدم کُش خونخوار کہو

(یہ کہتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالکر زہر کی سفید شیشی نکال کر موہنی کو دکھاتا ہے) اپنی بیوی کی معرفت اس بدمعاش نے مجھے زہر دلوا ہی دیا تھا اوہ تو یہ کہو کہ چمپا کو مجھ پر رحم آگیا۔

موہنی:۔ (نہایت گھبرا کر شیشی پریم سنگھ کے ہاتھ سے لے لیتی ہے اور دیکھتی ہے۔ لیبل پر "زہر" لکھا ہے) آہ۔ یہ تو کوئی بڑا قاتل زہر معلوم ہوتا ہے۔ کیا چمپا نے تمہاری جان بچائی؟

پریم سنگھ:۔ ہاں چمپا نے۔

موہنی کچھ کہنا چاہتی ہے کہ یکایک ملازمہ گھبرائی ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔

بی بی۔ بی بی۔ ڈاکٹر صاحب آگئے۔

پریم سنگھ موہنی کی طرف دیکھتا ہے۔ موہنی نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھکر پریم سنگھ کا ہاتھ پکڑ کے:۔

موہنی:۔ پریم اس کمرہ میں آجاؤ۔

پریم سنگھ:۔ مگر......

موہنی اُسے کھینچتی ہے اور زبردستی اُس کمرے میں داخل کر دیتی ہے اور کہتی ہے:۔

موہنی:۔ پیارے میری رسوائی کا خیال کرو (پھر خود کرسی پر بیٹھکر کتاب دیکھنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر ٹنڈن داخل ہوتا ہے)

موہنی:۔ (بڑے احترام سے) نمسکار چاچا جی۔ مزاج کیسا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ جیتی رہو بیٹی۔ بہت دنوں سے تمہیں دیکھا نہ تھا۔ ملنے کو بہت جی چاہ رہا تھا مگر کاموں میں اُلجھا رہا۔ اِدھر مریضوں کا ہجوم۔ اُدھر ساسائنٹیون کا کام۔ سر کھجانے کی مہلت نہ تھی۔ آج جیسے تیسے وقت نکالا۔ تم تو اچھی ہو؟

موہنی:۔ ہاں چاچا جی آپ کی دُعا سے اچھی ہوں۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ (کچھ دیر سوچکر) موہنی آج تمہارے لئے ایک بڑی خوشخبری لایا ہوں۔ وہ یہ کہ میں نے ایک نہایت دولتمند آدمی سے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ کل صبح آٹھ بجے میں آکر تمہیں لیجاؤنگا۔ شادی کی رسم میرے مکان پر ادا ہوگی۔

موہنی ٹنڈن کی یہ باتیں سُنکر بالکل بدحواس ہوجاتی ہے۔ کتاب کھولکر پڑھنے لگتی ہے تاکہ ٹنڈن اس کی حالت کا کچھ اندازہ نہ کرسکے۔ ٹنڈن جواب کا انتظار کرتا ہے۔ جب کچھ جواب نہیں ملتا تو کہتا ہے:۔

ٹنڈن:۔ موہنی تم جانتی ہو کہ میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں رشتہ کے علاوہ قانوناً بھی میں تمہارا سرپرست ہوں۔ اور تمہارے متعلق ہر بات کے طے کرنے کا مجھے پورا اختیار حاصل ہے۔

موہنی اب بھی کچھ جواب نہیں دیتی۔ برابر کتاب دیکھے جاتی ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ بیٹی میں تمہارے اس شرم و لحاظ کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ یہ تمہارا ہونے والا شوہر کیسا نیک، شریف اور معزز آدمی ہے۔

پھر کچھ دیر چُپ رہتا ہے۔ موہنی اب بھی خاموش ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ موہنی تم سُنتی نہیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کل صبح آٹھ بجے تمہیں میرے یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ سمجھ گئیں۔

موہنی:۔ (برافروختہ ہوکر کتاب کو پٹک دیتی ہے) چاچا جی میں بہری نہیں ہوں۔ سب کچھ میں نے اچھی طرح سُن لیا اور آپ بھی میرا جواب سُن لیجئے کہ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ (جھلا کر) کیا کہا۔ ایسا نہیں ہوسکتا (میز پر گھونسا مار کر) ایسا ضرور ہوگا۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔ کل صبح تمہیں یہ کام کرنا ہی ہوگا۔

موہنی:۔ (حقارت آمیز تبسم کے ساتھ) آپ کو میرے ساتھ اس قدر ہمدردی کب سے ہو گئی جو......

ٹنڈن کچھ جواب دینا ہی چاہتا ہے کہ برابر کے کمرہ میں سے چینی اور شیشہ کے برتنوں کے زمین پر گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آتی ہے۔

ٹنڈن (گھبرا کر) کمرہ کی طرف جاتا ہے۔ دروازہ کھولنا چاہتا ہے مگر دروازہ اندر سے بند ہے۔

ٹنڈن:۔ (موہنی سے) باہر سے بھی تو اس کمرہ کا دروازہ ہے نا؟ موہنی سر کے اشارہ سے "ہاں" کہتی ہے۔ ٹنڈن باہر جاتا ہے۔ پریم سنگھ اس کمرہ میں خاموش کھڑا دروازہ سے کان لگائے ان دونوں کی باتیں سُنتا ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہے۔ تھک کر ذرا پیچھے ہٹتا ہے تو میز سے ٹکر لگتی ہے اُس پر چینی اور شیشہ کے برتن رکھے تھے۔ وہ سب زمین پر گر پڑتے ہیں اور چُور چُور ہو جاتے ہیں۔ پریم جب سُنتا ہے کہ ٹنڈن دوسرے دروازہ سے آرہا ہے تو فوراً بیسا دروازہ کھول موہنی کے کمرہ میں آجاتا ہے۔ موہنی اس ہنگامہ سے سخت بدحواس ہے اور دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہے۔

پریم سنگھ:۔ (آہستہ سے) موہنی تم اپنے چچا سے اتوار تک کی مہلت مانگ لو اور شادی کا وعدہ کر لو۔ باقی میں دیکھ لونگا۔

یہ کہہ کر موہنی کا ایک پیار لیکر خاموشی کے ساتھ مکان سے نکل جاتا ہے۔ ٹنڈن اس کمرہ کا کونا کونا دیکھتا ہے مگر کوئی وہاں موجود نہیں۔ پھر جس دروازے سے گیا تھا اسی دروازہ سے واپس آتا ہے۔

ٹنڈن:۔ تعجب ہے۔ یہ کون تھا جس نے تمام برتنوں کا چُورا کر دیا۔

موہنی:۔ میری بدقسمتی ہے اور کیا۔ بیٹھے بٹھائے مفت میں اتنا نقصان ہو گیا۔ اب یہ چیزیں مجھے کہاں نصیب ہونگی۔

ٹنڈن:۔ اوہ۔ یہ ہے کیا بلا۔ تمہارا شوہر اس سے دس گنا زیادہ اور بہتر تمہیں خرید دیگا۔

موہنی:۔ چاچا جی۔ کیا واقعی وہ بہت مالدار آدمی ہیں؟

ٹنڈن:۔ (نہایت مسرور ہو کر) ہاں بیٹی۔ ڈھائی ہزار روپیہ مہینہ تو اُنہیں تنخواہ ملتی ہے۔ جائداد کی آمدنی الگ ہے۔ لکھپتی آدمی ہیں۔

موہنی:۔ (مصنوعی حیرت سے) لکھپتی آدمی ہیں! اچھا چاچا جی۔ آپ جیسا حکم دینگے میں ویسا ہی کرونگی۔

ٹنڈن کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور اطمینان کا سانس لیتا ہے۔

موہنی:۔ مگر آپ نے اُن کا نام نہیں بتایا۔

ٹنڈن:۔ (مسکرا کر) میرا خیال ہے کہ تم اُنہیں جانتی ہو شاید باغ میں ایک دفعہ وہ تم سے مل بھی چکے ہیں۔

موہنی:۔ (گھبرا کر) کیا آپ کا مطلب مکرجی سے ہے؟

ٹنڈن:۔ تم ٹھیک سمجھیں۔

موہنی سخت پریشانی کے عالم میں دونوں ہاتھوں میں اپنا سر لیکر ایک آہ کرتی ہے اور کچھ دیر خاموش رہتی ہے سوچتی ہے پھر کہتی ہے۔

اچھا چاچا جی، ایک میری عرض ہے۔ میں شادی کیلئے تیار ہوں مگر مجھے اتوار تک کی مہلت دیجئے۔ اس کے بغیر ناممکن ہے۔

ٹنڈن:۔ (کچھ دیر سوچتا ہے۔ پھر کہتا ہے) خیر اس میں کوئی ہرج نہیں لیکن وعدہ کرو کہ اتوار کے دن تم بخوشی اس رسم کو ادا ہونے دوگی۔

موہنی:۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔

ٹنڈن:۔ (کرسی سے کھڑے ہو کر) تو بس ٹھیک ہے۔

موہنی کی پیشانی کا بوسہ لیکر روانہ ہوجاتا ہے۔

پریم سنگھ اپنے کمرہ میں بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ کبھی مسکرا دیتا ہے۔ کبھی اُس کا چہرہ نہایت غمگین ہوجاتا ہے۔ کبھی جماہیاں لیتا ہے۔ گویا رات بھر نہیں سویا ہے۔ نوکر آکر خبر دیتا ہے کہ ایک چھوکری آئی ہے۔

پریم سنگھ:۔ یہاں بھیجدو۔

(چمپا داخل ہوتی ہے)

چمپا:۔ نمشکار، بابوجی۔

پریم سنگھ:۔ (نہایت خوشی کے لہجہ میں) چمپا۔ کہو آج اِدھر کیسے بھول پڑیں۔

چمپا:۔ ڈاکٹر صاحب ابھی ابھی مسٹر مکرجی کے یہاں گئے ہیں۔ چلتے وقت کچھ ضروری کاغذات میز پر بھول آئے۔ بائی جی نے کہا کہ ابھی اُنکے پاس پہونچا دو۔ ساتھ ہی آپ کی خبر معلوم کرنے کو بھی کہدیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ آپ کے دشمن کب کے اس دُنیا سے سدھار چکے ہونگے۔ بابوجی، انہیں کسی طرح معلوم نہ ہونے پائے کہ اس معاملہ میں میرا بھی ہاتھ ہے۔

پریم سنگھ:۔ نہیں چمپا تم بالکل اطمینان رکھو۔ اور یہ کاغذات کیسے ہیں؟ میں دیکھ سکتا ہوں؟

چمپا:۔ (کاغذات پریم کی طرف بڑھاکر) دیکھ لیجئے۔

پریم سنگھ بغور کاغذات کو دیکھتا ہے اور یکایک اسکے مُنھ سے نکلتا ہے (Good God) گڈ گاڈ۔ پھر کچھ پڑھتا ہے۔ پھر کچھ سوچتا ہے۔ پھر سر اُٹھاکر چمپا سے:۔

پریم سنگھ۔ میں ان میں سے ایک کاغذ خریدنا چاہتا ہوں۔ بولو کیا قیمت لوگی؟

چمپا:۔ بابوجی کیا آپ مجھے بناتے ہیں۔

پریم سنگھ:۔ نہیں چمپا۔ دل لگی نہیں۔

چمپا:۔ (حیران ہوکر) کیا سچ مچ آپ ان میں سے ایک کاغذ خریدنا چاہتے ہیں؟

پریم سنگھ:۔ سچ سچ۔

چمپا:۔ (مسکراکر) اچھا کتنے میں لیجئے گا۔

پریم سنگھ:۔ جو قیمت تم مانگو۔

چمپا:۔ نہیں آپ بتادیجئے۔

پریم سنگھ:۔ سَو روپے۔

چمپا:۔ (خوشی سے بیتاب ہوکر) سَو روپے! آپ سَو روپے مجھے دیدینگے۔

پریم سنگھ:۔ بیشک۔ اسی وقت۔

چمپا:۔ مگر میں بائی جی کو کیا جواب دونگی؟

پریم سنگھ:۔ تمہیں اب وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میرے یہاں رہ سکتی ہو۔

چمپا:۔ اور کوئی اونچ نیچ ہوگی تو آپ سنبھال لیں گے۔ میرے اوپر تو کوئی بات نہیں آنے گی؟

پریم سنگھ:۔ نہیں۔ تم بالکل بیفکر رہو۔

چمپا:۔ (خوشی سے اُچھل کر) تو میں بھی تیار ہوں۔

پریم سنگھ سَو روپے کے نوٹ نکالکر چمپا کے حوالے کردیتا ہے۔

مکرجی کا مکان

ڈاکٹر ٹنڈن سخت بدحواس داخل ہوتا ہے۔

ٹنڈن:۔ مکرجی غضب ہوگیا۔ جلد کوئی تدبیر کیجئے نہیں تو ہم سب کا خاتمہ ہے۔

مکرجی:۔ (حیران و پریشان ہوکر) آخر ہوا کیا۔

ٹنڈن:۔ وہ کاغذات گُم ہوگئے۔

مکر جی :۔ (اور بھی گھبرا کر) کون سے کاغذات ؟

ٹنڈن :۔ وہی رپورٹ۔

مکر جی :۔ اوہ غضب۔ آخر گم کیسے ہو گئے ؟

ٹنڈن :۔ آج صبح یہاں آتے وقت میں نے وہ کاغذات بکس میں سے نکالے اور کوٹ پہنتے وقت جیب میں رکھنے کے بجائے وہیں میز پر بھول آیا۔ رستے میں خیال آیا۔ جیب میں دیکھا تو ندارد۔ فوراً گھر واپس گیا۔ لفافہ میز پر موجود نہ تھا۔ مسز ٹنڈن نے کہا۔ "میں نے اس خیال سے کہ آپکو دوبارہ آنے کی تکلیف نہ ہو چمپا کے ہاتھ وہ کاغذات مسٹر مکر جی کے یہاں بھیجدئے۔" میں فوراً پلٹا۔ راستہ بھر چمپا کو دیکھتا ہوا آپکے یہاں آیا۔ آپکے دروازہ پر تالا پڑا دیکھکر پھر گھر واپس گیا مگر چمپا نہ یہاں پہنچی نہ وہاں۔ میں نے اور میرے نوکروں نے سارے دن اُسے تلاش کیا مگر کہیں کمبخت کا پتہ نہ چلا۔ نہ جانے اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

مکر جی :۔ چمپا کو اُن کاغذات کی اہمیت معلوم تھی ؟

ٹنڈن :۔ نہیں۔ اُسے کیا خود مسز ٹنڈن کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس لفافہ میں کیا ہے۔

مکر جی :۔ تب تو کچھ ایسی خوف کی بات نہیں۔ آپ موہنی کو میرے حوالے کر دیجئے۔ میں فوراً ہندوستان سے روانہ ہو جاؤنگا۔ پھر آپکے لئے کوئی اندیشہ نہیں۔

ٹنڈن :۔ موہنی سے تو میں رات مل لیا اور سب معاملہ طے ہو گیا اتوار کے دن صبح کو آپ کی شادی ہو جائیگی۔

مکر جی :۔ (بہت خوش ہو کر) ڈاکٹر ٹنڈن ! سچ تو یہ ہے کہ میں نے آپکی طرح محبت والے اور شریف انسان نہیں دیکھے۔ اچھا موہنی بخوشی راضی ہو گئی ؟

ٹنڈن :۔ ہاں بخوشی راضی ہو گئی۔

مکر جی :۔ شادی کے بعد میں فوراً ہی موہنی کو لیکر یہاں سے روانہ ہو جاؤنگا (بے انتہا خوش ہے۔)

ٹنڈن :۔ اچھا تو اتوار کے دن صبح کے ۸ بجے مع اپنے چند دوستوں کے میرے مکان پر پہونچ جائیے۔ مہمانوں کا زیادہ ہجوم نہ ہو۔

مکر جی :۔ نہیں۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔

ٹنڈن چلا جاتا ہے۔ مکر جی آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہے اور گنگنانے لگتا ہے۔

موہنی کا مکان

موہنی نہایت بیقرار نظر آتی ہے۔ کھڑکی کے باہر جھانک کر بار بار دیکھتی ہے، پھر یکایک رونے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پریم سنگھ داخل ہوتا ہے۔ موہنی اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے۔ پریم اُس کے گلے میں باہیں ڈالکر پیار کرتا ہے۔ موہنی اُسی طرح بیٹھی رہتی ہے۔

پریم سنگھ :۔ (موہنی کا چہرہ غور سے دیکھکر) یہ کیا ؟ تم رو رہی تھیں ؟

موہنی :۔ رونے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہوں۔ اپنی آنکھوں کے سوا اور کسی پر بس نہیں چلتا۔

پریم سنگھ :۔ لیکن آخر اس کا سبب ؟

موہنی :۔ سبب ؟ ہاں ٹھیک تو ہے۔ آپکو اپنے کاموں میں کہاں خیال رہا ہوگا۔ لیکن میں کیسے بھول سکتی ہوں کہ کل اتوار ہے۔ میری شادی یعنی موت کا دن۔ آپ ایسے گئے کہ خبر ہی نہ لی۔ اس مصیبت سے بچنے کا اب تو صرف ایک ہی رستہ ہے کہ آج رات کو کچھ کھا کے سو رہوں (یہ کہہ کر پھر اسکی آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے لگتے ہیں۔ پریم اُسے اپنے آغوش میں لے کر آنسو پونچھتا ہے۔)

پریم سنگھ:۔ اچھا تو اس کے لئے آپ اتنا پریشان ہو رہی تھیں۔ (موہنی کے ہاتھ لیکر اپنے ہونٹوں سے لگاتا ہے) موہنی! کل صبح تمہاری سب مصیبتوں اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تمہارے سب دشمن ایک ساتھ جیل کی اندھیری کوٹھریوں میں پڑے ہونگے۔ آج تو تمہارے لئے انتہائی خوشی کا دن ہے۔

موہنی:۔ میں تو کچھ نہیں سمجھی آپ کا کیا مطلب ہے؟

پریم سنگھ:۔ یہ بدمعاش ڈاکٹر نندن ہندوستان کے متعلق خفیہ رپورٹ مرتب کرکے مکرجی کی معرفت کسی بیرونی حکومت کو بھجواتا رہا ہے۔ مکرجی اُس حکومت کا جاسوس اور ایجنٹ ہے۔ اسکے علاوہ اس مکرجی نے ایک زبردست سازشی پارٹی بنائی ہے۔ جو دیش اور قوم کا نام لیکر چوری۔ ڈاکہ۔ قتل۔ خون اور ایسی قسم کے تمام خطرناک کام کر رہی ہے۔ مُلک کے امن و امان کو تباہ کر ڈالا ہے۔ کسی کی جان، مال، آبرو، کوئی چیز محفوظ نہیں۔ وہ خفیہ رپورٹ چمپا کی معرفت میرے ہاتھ آگئی اور میں نے اُسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس طرح ان سب شیطانوں کی تباہی کا پورا پورا بندوبست ہو گیا۔

موہنی:۔ چمپا کے ہاتھ وہ رپورٹ کہاں سے لگی؟

پریم سنگھ:۔ مکرجی کے یہاں جاتے وقت ڈاکٹر نندن وہ کاغذات اپنی میز پر بھول آیا۔ اُسکی بیوی نے چمپا سے کہا۔ کہ یہ کاغذات مکرجی کے یہاں ڈاکٹر صاحب کو دے آ۔ نہیں تو انہیں پھر آنا پڑیگا اور یہ بھی دیکھتی آنا کہ پریم سنگھ ابھی مرا یا نہیں۔ چمپا پہلے میرے یہاں آگئی، کاغذات اُس سے لیکر میں نے دیکھے۔ اُن میں یہ رپورٹ بھی تھی جو میں نے سَو روپے میں چمپا سے خرید لی۔

موہنی:۔ مگر اب چمپا بیچاری کا کیا حشر ہوگا۔

پریم سنگھ:۔ حشر کیا ہوتا۔ اب وہ میری ملازم ہے۔

موہنی:۔ (مسرور ہوکر) یہ تو خوب ہوا۔

پریم سنگھ:۔ مگر اب تھوڑی سی تکلیف تمہیں بھی کرنی پڑیگی۔

موہنی:۔ وہ کیا؟

پریم سنگھ:۔ طے یہ پایا ہے کہ ایک ایسی مجلس ترتیب دی جائے جس میں یہ سب سازشی شریک ہوں اور ایک ساتھ گرفتار کر لئے جائیں۔

موہنی:۔ نقشہ تو خوب ہے مگر مجھے کیا کرنا ہوگا۔

پریم سنگھ (مسکراکر) کل صبح مکرجی سے تمہاری شادی ہونا؟

موہنی:۔ آ نہاں۔

پریم سنگھ:۔ بس تو قصہ تمام ہوا۔ تم حسب وعدہ اُس مجلس میں حاضر ہو جانا۔ باقی میرے ذمہ۔

موہنی:۔ پیارے مجھے تو اس بکھیڑے سے الگ ہی رکھو تو اچھا۔

پریم سنگھ:۔ موہنی میں خود اسے پسند نہیں کرتا مگر اسکے بغیر چارہ نہیں۔ ابھی میں نے تم سے بیان کیا کہ یہ سازش مُلک کے رہے سہے امن و امان کو تباہ کر دینے والی ہے اور ہر شخص کے جان و مال کے لئے اس سے خطرہ ہے۔ اس کا مٹانا دیش کے ہر خیر خواہ کا فرض ہے اِسلئے اِن غدّاروں کی گرفتاری میں تمہیں بھی مدد کرنی چاہیئے۔

موہنی:۔ جیسی آپکی خوشی۔

پریم سنگھ:۔ تم بالکل اطمینان رکھو۔ اب ہمارے راستے میں کوئی کانٹا باقی نہ رہیگا۔ اچھا اب چلتا ہوں۔ ابھی اور بھی کچھ کام باقی ہے۔

موہنی:۔ اچھا۔

پریم سنگھ موہنی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیکر پیار کرتا ہے اور جلدی سے روانہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن کی کوٹھی

ٹھیک آٹھ بجے صبح ۔ مسٹر مکرجی معہ اپنے چند دوستوں کے ڈاکٹر ٹنڈن کے مکان پر پہونچ جاتا ہے۔ روپ کماری سب کا بڑے تپاک سے استقبال کرتی ہے اور ڈرائنگ روم میں لیجا کر بٹھاتی ہے۔

مکرجی :- ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں ؟

روپ کماری :- ابھی آتے ہیں۔ آپکی دُلہن کو لینے گئے ہیں۔

خوشی سے مکرجی کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اتنے میں ڈاکٹر ٹنڈن کی موٹر آ پہونچتی ہے۔ ٹنڈن اور موہنی اُترتے ہیں۔ موہنی نہایت سادہ لباس پہنے ہوئے ہے۔ مکرجی موٹر کی آواز سُنکر کمرہ کے باہر چلا جاتا ہے اور ڈاکٹر اور موہنی سے آداب عرض کرتا ہے۔ موہنی دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے اور روپ کماری بھی اسکے ساتھ جاتی ہے۔ ٹنڈن اور مکرجی ڈرائنگ روم میں آتے ہیں۔ مکرجی اپنا اٹیچی کیس کھولکر چند زیورات نکالکر دیتا ہے۔

مکرجی :- یہ میری طرف سے موہنی دیوی کو پہنا دیجئے۔

پھر اپنے ملازم کو آواز دیتا ہے۔

مکرجی :- فوددار ! فوددار !

فوددار :- حضور۔

مکرجی :- وہ کپڑوں کا بکس لاؤ۔

فوددار فوراً ایک چھوٹا سا بکس پیش کرتا ہے۔

مکرجی :- (بکس کھولکر) یہ موہنی دیوی کی ساڑی اور باقی کپڑے ہیں۔ یہ بھی انہیں پہنا دیجئے۔

ٹنڈن :- بہت اچھا۔

یہ سب چیزیں نوکر کے ہمراہ دوسرے کمرہ میں لیجاتا ہے۔ جہاں موہنی اور روپ کماری بیٹھی ہیں۔ کپڑے اور زیورات دونوں کو دکھاتا ہے اور تعریف کرتا ہے۔ روپ کماری ایک ایک چیز کو اُٹھا کر دیکھتی ہے اور تعریف کرتی ہے۔ موہنی بالکل خاموش ہے۔ ٹنڈن واپس آجاتا ہے۔ اتنے میں میرج رجسٹرار صاحب بھی آجاتے ہیں اور اب یہ سب لوگ دوسرے کمرے میں جاتے ہیں۔ موہنی وہ سب زیورات اور وہی ساڑی پہنے دُلہن بنی شرمائی بیٹھی ہے۔ سب اُسے دیکھکر متاثر ہوتے ہیں۔

مکرجی کا ایک ساتھی :- (آہستہ اپنے ہمراہی سے) چندو ! ایسے یہ تو بالکل چھوکری ہے۔ یہ بڈھا اس سے بیاہ کریگا۔

چندرو :- اس میں نئی بات کونسی ہے۔ ہمارے یہاں ہمیشہ ہی سے ایسا ہوتا آیا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- اچھا رجسٹرار صاحب۔ اب آپ اپنا کام شروع کیجئے۔

رجسٹرار :- بہت اچھا۔ (چپراسی سے) بھولو رجسٹر لاؤ۔

مکرجی نے آج خلاف معمول بہت زیادہ شراب پی لی ہے نشے میں بالکل مدہوش ہو رہا ہے۔ یکایک کھڑا ہوجاتا ہے اور ٹنڈن سے مخاطب ہوکر کہتا ہے :-

مکرجی :- ڈیر ڈاکٹر ٹنڈن۔ اگر وہ بدمعاش عورت چمپا ہاتھ آجائے تو اُسکی بوٹی بوٹی کر ڈالنا۔

چمپا کا ذکر سُنکر موہنی بیچین ہوتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔

ٹنڈن :- (گھبرا کر) اس وقت ان باتوں کا کیا موقع ہے۔

مکرجی :- نہیں۔ اگر آپنے اس کام میں ذرا سستی کی تو میں آپسے بھی ناراض ہوجاؤنگا۔

یکایک پاؤں کی چاپ سُنائی دیتی۔ سب کان کھڑے کرتے ہیں۔ پریم سنگھ داخل ہوتا ہے۔

مکرجی :- (پریم سنگھ سے) آپ کون صاحب ہیں ؟

پریم سنگھ :- شاید آپ بھول گئے۔ اُس روز شام کو جب

آپ اپنی دلہن کو کڈنیپ (Kidnap) کرایہے؟ تھے باغ میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔

مکرجی:۔ (دیوانہ وار اُٹھکر) بس خاموش۔ فوراً یہاں سے نکل جا۔ نہیں تو مارا جائیگا۔

ٹنڈن:۔ (پریم سنگہ سے) یہ شادی کی محفل ہو۔ میدانِ جنگ نہیں۔ آپ نے کیسے تکلیف فرمائی۔

پریم سنگہ:۔ مجھے نہایت افسوس ہو کہ اس شادی کا انجام بخیر نہ ہوا۔

مکرجی:۔ کیا بکتا ہے؟

پریم سنگہ:۔ (ہاتھ اُٹھا کر) خاموش!

اسی لمحہ آٹھ پولیس والے داخل ہوتے ہیں۔ اُن کا افسر آگے بڑھکر:۔

"عورتوں کے سوا آپ سب لوگوں کو میں سرکاری حکم سے گرفتار کرتا ہوں۔" سب بدحواس ہو جاتے ہیں۔ موہنی پریم کا ہاتھ پکڑ کے کمرہ سے نکل جاتی ہے۔ مکرجی یہ دیکھکر ایک آہ کرکے دھم سے گر پڑتا ہو۔ روپ کماری بھی حیران ہو صرف "اچھا" اُسکے منہ سے نکلتا ہو۔ پولیس والے سب کو ہتھکڑیاں پہنا دیتے ہیں۔ باہر لاری کھڑی ہے اُس میں بٹھا کر سبکو قیدخانے لیجاتے ہیں۔

پریم سنگہ کا مکان

پریم سنگہ کا چھوٹا بھائی اندر سنگہ اور اُسکی بوڑھی ماں۔ بڑھیا کرسی پر بیٹھی کچھ سُن رہی ہے۔ اندر سنگہ اپنی بندوق صاف کر رہا ہے۔ دیواری گھڑی پانچ بجاتی ہے۔

بڑھیا:۔ اندر! پریم اب تک نہیں آیا۔ صبح سے یہ وقت ہو گیا۔ نہ جانے سارا دن کہاں گزار دیا۔ چھٹی کے دن بھی گھر پر رہنا نصیب نہیں ہوتا۔

اندر سنگہ:۔ اماں جی۔ اب آتے ہی ہونگے۔

اخبار بیچنے والے لڑکے کی آواز آتی ہے:۔

"ایک زبردست سازش کا انکشاف۔ کپتان پریم سنگہ کا کارنامہ۔ سازشیوں کا سرغنہ گرفتار ہو گیا۔"

ماں بیٹے دونوں کان کھڑے کرتے ہیں۔ اندر سنگہ کچھ کہے بغیر فوراً اپنی بندوق چھوڑ باہر نکل جاتا ہے۔ اور اخبار کا پرچہ لیکر پڑھتا ہوا آتا ہے۔

بڑھیا:۔ کیا خبر ہے بیٹا؟

اندر سنگہ پڑھکر سُناتا ہے۔

"ایک زبردست سازش کا انکشاف۔ کپتان پریم سنگہ کا کارنامہ۔ سازشیوں کا سرغنہ گرفتار ہو گیا۔ کچھ مدّت سے ایک انقلابی جماعت مُلک میں بڑی سرگرمی سے کام کر رہی ہو۔ یہ لوگ مُلک اور قوم کا نام لیکر بیروزگار تعلیم یافتہ نوجوان کو اپنے گروہ میں شامل کرتے ہیں اور اُن سے طرح طرح کے خطرناک کام لیتے ہیں۔ تفصیل ابھی معلوم نہیں مگر سُنا جاتا ہے کہ پچھلے دنوں سیٹھ کُندن لال کے یہاں جو ڈاکہ پڑا تھا وہ اِنہیں لوگوں کا کام تھا اور دیوالی کے موقع پر بم کا جو حادثہ ہوا تھا اُس کے بھی یہی لوگ ذمہ دار ہیں۔ دولتمندوں کو لُوٹنا اور غریبوں کی تھوڑی بہت مدد کرنا یہ ان لوگوں کا شغل رہا ہے۔ دوسری حکومتوں سے خفیہ سازباز بھی رکھتے ہیں۔ اور پوشیدہ طور پر ہر قسم کی اطلاعیں ہندوستان کے متعلق یہ لوگ دوسری حکومتوں کو بھیجتے تھے۔ کپتان پریم سنگہ نے اس سازش کا پتہ لگایا اور آج صبح جبکہ اس جماعت کا سرغنہ مکرجی نامی، ڈاکٹر ٹنڈن کی نوجوان بھتیجی موہنی دیوی سے شادی کی غرض سے اپنے چند ساتھیوں سمیت اُن کے مکان پہونچا اور شادی کی رسم ادا ہونے ہی والی تھی کہ پولیس نے

چھاپا مارا اور سب کو گرفتار کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر ٹنڈن جو شہر کے مشہور ڈاکٹر اور پبلک ورکر ہیں وہ بھی اس سازش میں شریک ہیں۔"

ماں بیٹے دونوں خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ اتنے میں پریم سنگھ داخل ہوتا ہے۔ موہنی اس کے ساتھ ہے۔ بڑھیا اٹھکر پریم سنگھ کو گلے لگاتی ہے۔ پریم سنگھ اپنی ماں اور بھائی سے موہنی کا تعارف کراتا ہے۔

پریم سنگھ:۔ (ماں کی طرف اشارہ کرکے۔ موہنی سے) میری اماں (اندر سنگھ کی طرف اشارہ کرکے) میرا بھائی اندر سنگھ۔ (ماں اور بھائی سے مخاطب ہوکر، موہنی کی طرف اشارہ کرکے) مس موہنی دیوی۔ (موہنی ہاتھ جوڑکر دونوں کو نمسکار کرتی ہے۔ بڑھیا اور اندر سنگھ دونوں موہنی کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں)

پریم سنگھ:۔ یہ آپ لوگوں سے ملنے کی بہت آرزومند تھیں۔

بڑھیا:۔ بیٹھو بی بی۔

موہنی آداب کرکے بیٹھ جاتی ہے۔ سب بیٹھ جاتے ہیں۔

پریم سنگھ:۔ اماں! اخبار میں آپ نے پڑھ لیا ہوگا کہ میں نے ہی ان کے چچا اور ہونے والے شوہر کو گرفتار کرایا اور شادی رکوادی۔ آپ حیران ہونگی کہ پھر یہ میرے ساتھ کیسے چلی آئیں۔ اور آپ لوگوں سے ملنے کی کیوں آرزومند تھیں۔ دراصل ڈاکٹر ٹنڈن کی زبردستی سے۔ ان کی مرضی کے بالکل خلاف شادی ہورہی تھی۔ میرے وقت پر پہونچ جانے سے یہ بلا ان کے سر سے ٹل گئی۔ اب میں نے ہمیشہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے کیونکہ ان کا کوئی سرپرست اور والی وارث نہیں ہے۔

موہنی:۔ (پریم کی ماں سے) اماں جی۔ دراصل میں پریم سنگھ کا شکریہ ادا نہیں کرسکتی۔ انہوں نے میری شادی نہیں رکی بلکہ میری جان بچائی ہے۔ میں نے تو ارادہ کرلیا تھا کہ اس منحوس رسم کے ادا ہونے سے پہلے کچھ کھاکے سو رہونگی۔ دنیا میں اب آپ لوگوں کے سوا میرا کوئی نہیں (یہ کہہ کر رونے لگتی ہے)

بڑھیا:۔ بیٹی۔ اب جی نہ کڑھاؤ۔ بھگوان اچھا ہی کرے گا۔ جو کچھ مدد ہم سے ہوسکتی ہے اُسکے لئے ہم ہر وقت تیار ہیں۔

موہنی:۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے۔

اندر سنگھ:۔ بھیا آپ نے تو ہمیں کچھ بھی نہ بتایا۔ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ اخبار میں تو کوئی تفصیل نہیں لکھی۔

پریم سنگھ:۔ اس کام کا میرے ہاتھ سے ہونا کچھ ایشور ہی کو منظور تھا ورنہ میں نے تو کوئی خاص کوشش نہیں کی تفصیل فرصت میں سناؤنگا۔ مجھے ابھی پولیس کے دفتر واپس جانا ہے۔ خیال تھا کہ اماں پریشان ہونگی۔ ادھر موہنی دیوی سے بھی وعدہ کیا تھا کہ تیسرا پہر کو آپ لوگوں سے ملا دونگا اسلئے چلا آیا۔

بڑھیا:۔ بیٹا بھگوان تجھے کامیاب کرے اور اس سے زیادہ عزت دے۔

پریم سنگھ۔ (اندر سنگھ سے) ہاں اندر ایک ضروری بات تمہیں بتادوں۔ پولیس کی تحقیقات سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ان لوگوں کی ایک خاص علامت ہے یعنی (Red Cross) ریڈ کراس (ایک گاڑھے کی ٹوپی دکھا کر جس پر ریڈ کراس بنا ہے) اس طرح کی جماعت میں داخلہ کے وقت ممبروں کے نام ایک دوسرے کو نہیں بتائے جاتے۔ نہ بعد میں معلوم ہوتے ہیں۔ ہر شخص کا ایک نمبر مقرر کردیا جاتا ہے اور اس علامت کے ذریعہ سے یہ لوگ اپنے ساتھیوں کو پہچان لیتے ہیں۔ کوئی اس علامت کو ٹوپی پر بنا لیتا ہے کوئی کوٹ پر۔ کوئی نکٹائی پر۔ کوئی بٹن یا انگوٹھی میں اور جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو سلام کی جگہ "دیش سیوک کی جے!" کہتے ہیں۔ پولیس نے ابھی اس بات کو پوشیدہ رکھا ہے کہ کہیں سازشی اس سے مطلع

ہوکر اس علامت کو علیحدہ نہ کردیں۔

موہنی :۔ (یکایک) دیکھا پریم سنگھ جی۔ اس انگوٹھی میں بھی یہی نشانی بنی ہوئی ہے۔

پریم، اندرا اور بڑھیا تینوں اس انگوٹھی کو دیکھتے ہیں۔

پریم سنگھ :۔ یہ شادی کے تحفہ والی انگوٹھی ہے نا ؟

موہنی :۔ جی ہاں۔

پریم سنگھ :۔ ٹھیک ہے۔ اب آپ اسے پہنے ہی رہیئے۔ بہت ممکن ہے کہ اس سے کوئی مفید کام نکلے۔ (ماں سے مخاطب ہوکر) اچھا تو اماں اب میں جاتا ہوں۔

موہنی بھی کھڑی ہوجاتی ہے۔

موہنی :۔ (پریم کی ماں سے مخاطب ہوکر) اماں جی آپ اجازت دیں تو میں کبھی کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوجایا کروں۔

بڑھیا :۔ بڑے شوق سے۔ جب تمہارا جی چاہے آسکتی ہو۔ تمہارا گھر ہے۔

موہنی :۔ میں آپکی بہت شکر گذار ہوں۔ اچھا آداب۔

بڑھیا :۔ جیتی رہو۔

موہنی :۔ (اندر سے) بھیا آداب۔

اندر سنگھ :۔ آداب۔

پریم سنگھ اور موہنی دونوں جاتے ہیں۔ بڑھیا پھر سینے لگتی ہے۔ اندر سنگھ پھر اپنی بندوق صاف کرنے لگتا ہے۔

اندر سنگھ :۔ (ماں سے) اماں۔ بھیا ضرور موہنی دیوی سے شادی کرلیں گے۔

بڑھیا :۔ پھر کیا ہرج ہے بیٹا۔ ہمیں تو انکی خوشی سے خوشی ہے اور سچ یہ ہے کہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔

اندر سنگھ :۔ ہاں یہ بات تو ہے۔

(مدن لال رجسکے موٹر سے امر سنگھ کا باپ کچل کر مر گیا تھا)

اپنے بیڈ روم میں سلیپنگ سوٹ پہنے مسہری پر لیٹا ہے۔ انگڑائیاں لے رہا ہے آنکھیں کھولتا ہے پھر بند کرلیتا ہے۔ یکایک کہیں قریب سے گانے کی آواز آتی ہے۔ مدن چونکتا ہے۔ آنکھیں ملتا ہے۔ جدھر سے آواز آرہی ہے ادھر کان لگاتا ہے۔ گانے کی آواز برابر آرہی ہے۔ دو تین منٹ تک اسی طرح سنتا رہتا ہے پھر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کھڑکی کے پاس جاکر ہمہ تن گوش ہوکر سنتا ہے۔ پھر یکایک کسی خیال کے آجانے سے اپنی میز کی طرف پلٹتا ہے۔ دراز میں کوئی چیز تلاش کرتا ہے نہیں ملتی۔ ادھر اُدھر ڈھونڈتا ہے۔ آخر کرسی پر شال پڑی ہوئی ہے اُسے اٹھا کر دیکھتا ہے تو ایک چمڑے کا بکس پڑا ہے۔ اُٹھا کر کھولتا ہے۔ اس میں دوربین ہے۔ دوربین لیکر فوراً پھر کھڑکی کی طرف آتا ہے اور گانے والے کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گانے کی آواز برابر آرہی ہے۔ روپ کماری اپنے مکان کی دوسری منزل میں اپنے کمرہ میں بیٹھی تان پورے پر گا رہی ہے۔ مدن بابو اُسے دیکھکر اپنا ہونٹ کاٹتا ہے اور گانا سن رہا ہے۔ اتنے میں گانے کی آواز بند ہوجاتی ہے۔ روپ تان پورا رکھدیتی ہے اور رامداس کو آواز دیتی ہے۔

رامداس! چائے لاؤ۔

یہ کہہ کر کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوجاتی ہے اور دیکھنے لگتی ہے۔ گانا بند ہوجانے کے بعد مدن فوراً برابر کے کمرہ میں جاتا ہے۔

مُنّو! مُنّو!!

مُنّو ابھی تک پلنگ پر پڑا سو رہا ہے۔ مدن اُسے جھنجھوڑتا ہے۔

مُنّو! مُنّو!!

مُنّو فوراً کھڑا ہوجاتا ہے۔

منّو:- سرکار!

مدن:- جلدی اِدھر آؤ۔

منّو کو ساتھ لیکر مدن اپنے کمرہ میں آتا ہے۔ کھڑکی کے برابر کھڑا کرکے دُوربین اُسکے ہاتھ میں دیتا ہے۔

مدن:- سامنے دیکھو!

منّو دُوربین سے دیکھتا ہے۔ پھر کہتا ہے:-

منّو:- واہ وا۔ کیا پیاری صورت ہے۔

مدن:- منّو! میں تو مر گیا۔

منّو:- سرکار وہ چیز ہی ایسی ہے۔

مدن:- ارے کمبخت تُونے اسکی آواز نہیں سُنی۔ قیامت کا گلا ہے۔

منّو:- سرکار آپنے کہاں سُنا؟

مدن:- ارے میں تو سو رہا تھا۔ یکایک کان میں گانے کی آواز آئی بس آنکھ کُھل گئی۔ پھر میں نے دُوربین اُٹھا کے دیکھا۔ ابھی ابھی یہ تان پُورا لئے گا رہی تھی۔ منّو سچ کہتا ہوں یہ اندو بالا، اور اختری اور کملا وملا سب اس کے آگے ہیچ ہیں۔ ہائے کیا پیاری آواز ہے۔ ہمیں اس مکان میں آئے آج چار دن ہوگئے اور آج تک خبر نہ ہوئی کہ آسمان کی حور بغل ہی میں موجود ہے۔ منّو کچھ تدبیر کرو۔

منّو:- سرکار تدبیر تو کی جائے مگر......

مدن:- مگر کیا؟

منّو:- مگر یہ کہ کوئی بازاری چیز تو ہے نہیں کہ روپیہ پھینکدیا اور خرید لی۔ وہ تو ایک بڑے معزز اور دولتمند آدمی کی بیوی ہے۔

مدن:- کس کی بیوی ہے؟

منّو:- ڈاکٹر ٹنڈن کی۔

مدن:- کون ڈاکٹر ٹنڈن۔ وہی تو نہیں جو دس پندرہ دن ہوئے سازش کے سلسلے میں پکڑا گیا ہے۔

منّو:- جی ہاں وہی۔

مدن:- تب تو اور بھی رستہ صاف ہے۔

منّو:- نہیں سرکار۔ یہ کام ایسا سہل نہیں۔

مدن:- منّو کچھ بھی ہو۔ یہ کام تو کرنا ہی ہوگا۔ میں تو بُری طرح مر گیا۔

ایک شخص داخل ہوتا ہے۔ مدن سے مخاطب ہوکر آداب عرض ہے سرکار!

مدن:- آؤ پہلوان میں ابھی تمہیں بُلوانے ہی والا تھا۔

پہلوان:- بندہ خود ہی حاضر ہوگیا۔ فرمایئے کیا حکم ہے۔

مدن:- پہلوان آج تمہاری عقلمندی اور دوستی کا امتحان ہے۔

پہلوان:- سرکار! خادم اسی دن کیلئے ہوتے ہیں کہ وقت پر آقا کے کام آئیں۔ انہیں جان بھی جائے تو پروا نہیں۔

مدن:- (انگلی سے اشارہ کرکے) جانتے ہو اس مکان میں کون رہتا ہے؟

پہلوان:- نہیں سرکار مجھے تو نہیں معلوم۔

مدن:- یہ ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان ہے۔

پہلوان:- کون! وہی ڈاکٹر ٹنڈن جو سازش کے سلسلے میں پکڑا گیا ہے؟

مدن:- ہاں وہی۔ تم نے اُسکی بیوی کو دیکھا ہے!

پہلوان:- نہیں سرکار میں نے تو نہیں دیکھا۔

مدن:- ہائے قیامت ہے قیامت۔ اور کہیں تم اس کا گانا سُن لو تو اپنی جانکی بائی اور زہرہ بائی اور گوہر جان سبکو بھول جاؤ۔

پہلوان:- سرکار سے کہاں مُلاقات ہوئی۔

مدن:- ارے مُلاقات ہی ہوجاتی پھر کیا مُشکل تھی۔ میں نے ابھی ابھی اُسے سامنے والے دروازے میں (اشارہ کرکے) کھڑے

دیکھا اور ذرا دیر پہلے وہ یہیں بیٹھی گا رہی تھی۔ بس دل تڑپ
گیا میں تو بُری طرح مر گیا پہلوان۔ ملاقات کی کوئی تدبیر
کرو نہیں تو میری جان پر بن جائیگی۔

پہلوان:- سرکار معاملہ تو بہت ٹیڑھا ہے مگر ایک ترکیب
سمجھ میں آتی ہے۔

مدن:- وہ کیا؟

پہلوان:- دُرگا پُوجا کے بہانے سے سرکار ناچ اور ڈنر کا
ایک جلسہ کریں اور اُس میں سب پڑوسیوں کو بلائیں۔ اس
طرح تعارف ہوجائیگا بعد میں سو رستے نکل آئیں گے۔

مدن:- اور اگر اُنہوں نے دعوت قبول نہ کی تو۔

پہلوان:- نہیں سرکار پہلے ہم اُن سے دعوت میں شریک
ہونے کا وعدہ لے لیں گے بعد میں بندوبست کریں گے۔
بلکہ اس قصہ کو ابھی فیصل کئے دیتے ہیں۔ سرکار وہاں تشریف
لے چلیں اور خود دعوت دیں۔ ممکن نہیں کہ وہ انکار کرسکیں۔

مُنّو۔ ہاں سرکار پہلوان کی رائے بالکل ٹھیک ہے۔

مدن:- تو پھر میں کپڑے پہن لُوں۔ اتنے تم معلوم کرلو کہ گھر
پر ہیں کہیں باہر تو نہیں چلی گئیں۔

پہلوان:- اچھا سرکار۔

مُنّو اور پہلوان جاتے ہیں۔ راستہ میں:-

پہلوان:- کہو دوست کیسی جڑی۔

مُنّو:- اُستاد قائل ہیں تمہاری حکمت کے۔ مگر بات تو
جب ہے کہ کھیل ذرا لمبا چلے تو یاروں کا بھی کچھ ہاتھ ہو۔

پہلوان:- تم دیکھتے جاؤ۔ اب یہ احمق جاتا کہاں ہے۔

مدن تیار ہوجاتا ہے۔ اتنے میں پہلوان اور مُنّو واپس
آجاتے ہیں۔

پہلوان:- سرکار ابھی وہ باہر نہیں گئیں۔

مُنّو، پہلوان اور مدن تینوں موٹر میں بیٹھکر برابر والی
کوٹھی میں جاتے ہیں۔ اطلاع کراتے ہیں۔ نوکر ڈرائنگ روم میں
لیجا کر بٹھاتا ہے۔ روپ کماری داخل ہوتی ہے۔ تینوں کھڑے
ہو کر اُسے آداب عرض کرتے ہیں۔ وہ بھی جواب دیتی ہے۔

پہلوان:- آپ ہمارے راجہ مدن لال صاحب آف نج پورہ
ہیں۔

روپ کماری:- اچھا! آپ ہی نے یہ برابر والی کوٹھی لی ہے؟

مدن:- جی ہاں۔

روپ کماری:- تشریف رکھئے۔

سب بیٹھ جاتے ہیں۔

روپ کماری:- جناب نے کیسے تکلیف فرمائی۔

مدن:- میں آپکو تھوڑی سی تکلیف دینے آیا ہوں۔

روپ کماری:- فرمائیے۔

مدن:- بات یہ ہے کہ دُرگا پُوجا کے موقع پر ہر سال ہمارے
یہاں نج پورہ میں ناچ گانے کا جلسہ ہوا کرتا ہے۔ اب چونکہ
میں تبدیل آب و ہوا کی غرض سے یہاں آیا ہوا ہوں اس لئے
خیال ہے کہ جلسہ یہیں کرلیا جائے۔ دراصل یہ ایک خاندانی
رسم ہے اور پُشتوں سے ہوتی چلی آئی ہے اس لئے میں اسے
بند کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہم لوگ یہاں پردیسی ہیں اور جب
تک ہمارے سب پڑوسی

روپ کماری گھنٹی بجاتی ہے۔ رامداس آتا ہے
روپ کماری:- سگرٹ لاؤ۔
رامداس سگرٹ لاتا ہے۔

شریک نہ ہونگے۔ جلسہ بالکل بے لُطف رہے گا۔

روپ کماری خود راجہ صاحب کو سگرٹ پیش کرتی ہے۔ راجہ
صاحب "شکریہ" کہہ کے سگرٹ لے لیتے ہیں۔ روپ کماری
ڈبہ میز پر رکھدیتی ہے اور مُنّو اور پہلوان سے کہتی ہے کہ
"آپ بھی شوق فرمائیے" دونوں ایک ایک سگرٹ لے لیتے ہیں۔

اِس لئے آپ سے عرض ہے کہ پرسوں شام کو ہمارے یہاں تشریف لائیے اور ہمیں شکریہ کا موقع دیجئے۔

روپ کماری :۔ بہت اچھا۔ میں حاضر ہونگی۔

مدن :۔ مگر شب کا کھانا بھی آپکو وہیں کھانا ہوگا۔

روپ کماری :۔ اِس تکلّف کی کیا ضرورت ہے۔

مدن :۔ تکلّف تو کچھ نہیں لیکن اگر آپ اس حقیر دعوت کو قبول کرلیں گی تو مجھے بے انتہا خوشی ہوگی۔

روپ کماری :۔ آپکی خوشی اسی میں ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں۔

مدن :۔ بڑی مہربانی۔

پہلوان :۔ ہم لوگ آپکے بہت شکرگذار ہیں۔

روپ کماری :۔ واہ صاحب اسمیں شکریہ کی کونسی بات ہے۔

مُنّو :۔ (پہلوان سے) پڑوسی ہونے کی حیثیت سے آخر ہمارا بھی تو آپ پر کچھ حق ہے۔

روپ کماری :۔ ضرور۔

مدن :۔ تو اب اجازت ہے۔

روپ کماری :۔ بہت اچھا۔

مدن :۔ آداب۔

روپ کماری :۔ آداب۔

مُنّو اور پہلوان :۔ آداب۔

موٹر میں بیٹھکر اپنی کوٹھی میں واپس آتے ہیں۔

مدن :۔ پہلوان دیکھا؟

پہلوان :۔ ہاں سرکار دیکھا۔ سرکار کا انتخاب پھر ایسا ویسا تو نہیں ہوتا۔

مدن :۔ اور اخلاق کیسا اچھا ہے۔

مُنّو :۔ کیا بات ہے اخلاق کی۔

پہلوان :۔ مگر ایک بات میں کہونگا۔ سرکار کے قدموں کی قسم بار بار سرکار کو میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ آخر ایسے بھولے جوان بھی تو روز روز دیکھنے میں نہیں آتے۔

مدن :۔ اب لگے تم مجھے بنانے۔

مُنّو :۔ نہیں سرکار۔ یہ تو پہلوان نے سچ کہا۔ جس وقت اُس نے سگرٹ سرکار کے سامنے پیش کیا اُس وقت سرکار دیکھتے کہ کس انداز سے اُس نے سرکار کو دیکھا۔

مدن :۔ (مسکراکر) اور تم سمجھتے ہو کہ میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ ارے میں تو اُس کی ایک ایک ادا کو تاڑ رہا تھا۔ اچھا پہلوان۔ اب یہ کھانے اور گانے وانے کا انتظام سب تمہارے ذمہ ہے۔

پہلوان :۔ سرکار سب چٹکی بجاتے میں ہوجائیگا۔ میں ابھی جاکر دو طائفوں کا بندوبست کرتا ہوں۔ اور کھانے کے لئے فرپو کمپنی کو ٹھیکہ دیدینگے۔

مدن :۔ اچھی بات ہے۔ کتنا روپیہ درکار ہوگا!

پہلوان :۔ بس یہی کوئی سات آٹھ سو روپیہ میں سب انتظام ہوجائیگا۔ (مدن نوٹ نکالکر دیتا ہے۔ پہلوان نوٹ لے کر مُنّو کو دیتا ہے اور کہتا ہے:۔)

پہلوان :۔ لو بھئی مُنّو یہ روپیہ تم رکھو اور حساب بھی تم ہی رکھنا۔ حساب کتاب سے میری جان اُلجھتی ہے۔

مُنّو روپیہ لے لیتا ہے۔

مدن :۔ تو حساب کتاب کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کسی غیر کا معاملہ ہے! جتنا اُٹھیگا اُٹھ جائیگا۔

پہلوان :۔ نہیں سرکار۔ حساب جو جو بخشش سو سو۔

دونوں سلام کرکے چلے جاتے ہیں۔

سازشیں جمع ہیں۔

امر سنگھ :۔ جو صورت بھی ہو۔ سردار کا چھڑانا ہمارا فرض ہے۔

چاہے اِس میں چند جانیں ہی کیوں نہ جائیں۔

ایک:- لیکن فقط جان دیدینے سے کیا نتیجہ اگر ہم سردار کو نہ چھڑا سکیں، جان دینے والے ہمارے پاس کافی ہیں، لیکن ہتھیار تو نہیں۔

امر سنگھ:- ہاں یہ ٹھیک ہے۔ سردار کی گرفتاری سے ساری اسکیمیں تباہ ہوگئیں ورنہ اب تک ہتھیاروں کی کیا کمی ہوتی۔

دوسرا:- اگر کافی قیمت دی جائے تو ہتھیار آج بھی جتنے چاہیں مل سکتے ہیں۔

ایک:- لیکن اس وقت زیادہ روپیہ بھی تو ہم خرچ نہیں کرسکتے۔

امر سنگھ:- ہمارے بہادر بنارسی داس کے بچہ کو (Kidnap) رکڈ نیپ کرنے کی اسکیم آج تک یونہی پڑی ہوئی ہے۔ کیوں اُسی پر عمل نہ کیا جائے۔

دوسرا:- بات تو ٹھیک ہے۔

ایک:- ہاں اگر یہ تدبیر چل گئی تو سب کام درست ہوجائینگے۔

امر سنگھ:- تو پھر آج ہی اُسکے لئے دن مقرر کردینا چاہیئے۔ مسٹر نمبر ۱۲ آپ کب آسانی سے اسکا بندوبست کرسکیں گے۔

نمبر ۱۲:- کل بتا سکونگا۔

امر سنگھ:- اچھی بات ہے۔

راجہ مدن لال کے یہاں ڈنر اور ڈانس پارٹی

کھانا ہو رہا ہے۔ بہت سے مرد اور عورتیں شریک ہیں۔ روپ کماری مدن لال کے برابر بیٹھی ہے۔ باتیں ہو رہی ہیں۔ کھانا ختم ہوتا ہے۔ سب بڑے کمرہ میں آتے ہیں، گانا شروع ہوتا ہے۔ مس کنول کماری اسٹیج پر یہ غزل گاتی ہیں:-

ہنس رہا ہوں، لبِ مجبور پہ فریاد نہیں
کوئی کیا جانے کہ غمدیدہ ہے دل، شاد نہیں

میں نے سمجھا تھا کہ ہے عہدِ وفا، عہدِ وفا
سچ کہا تم نے کہ مجبور تو آزاد نہیں

کیا کہوں کسلیئے رہ رہ کے تڑپ اُٹھتا ہوں
دل میں اک تیر ہے پیوست، تری یاد نہیں

کیا مرے خواب میں آنیکا بھی قدغن ہے تمہیں
قید ہے جسم، تو کیا رُوح بھی آزاد نہیں

کیا کروں آہ بُھلایا نہیں جاتا مجھ سے
وہی پیمانِ محبت جو تمہیں یاد نہیں

بنتے بنتے تری تصویر بگڑ جاتی ہے
یاس میں آہ تصوّر بھی تو آزاد نہیں

چاندنی، موسمِ گُل، صحنِ چمن، خلوتِ ناز
خواب دیکھا تھا کہ کچھ یاد ہے کچھ یاد نہیں

گانا ختم ہونے کے بعد محفل برخاست ہوتی ہے۔ مدن لال مہمانوں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

مدن لال:- میں آپ صاحبان کا بیحد شکر گذار ہوں کہ آپ نے تکلیف فرما کر اس محفل میں شرکت کی اور مجھے عزت بخشی۔

ایک مہمان:- میں سب لوگوں کی طرف سے اور خود اپنی طرف سے آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ ہم لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ آپ سے تعارف ہوگیا۔ اور آپکی انتہائی عنایت ہے کہ آپ نے ہم لوگوں کو مثل اپنے خاص دوستوں کے دعوت

اور محفل میں شریک کیا۔ اچھا گڈ نائٹ۔

مدن لال :۔ گڈ نائٹ۔

مہمان اپنی اپنی گاڑیوں اور موٹر کاروں میں سوار ہو کر روانہ ہو جاتے ہیں۔

مدن لال :۔ (روپ کماری سے) آپکی کار نہیں آئی ؟

روپ کماری :۔ میں نے خود ہی منع کر دیا تھا۔ وہ ہے ہی کے قدم کا فاصلہ۔ یوں ہی چلی جاؤنگی۔

مدن لال :۔ اجازت ہو تو میں پہونچا دوں۔

روپ کماری :۔ نہیں۔ اب آپ تکلیف نہ کیجئے۔

مدن لال :۔ تکلیف تو نہیں خوشی ہو گی۔

روپ کماری :۔ اچھا تو چلئے۔

دونوں ساتھ ساتھ جاتے ہیں۔ جب روپ اپنے مکان میں داخل ہونے لگتی ہے۔ مدن اسکے ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے :۔

مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے۔

روپ کماری :۔ اب کل۔

یہ کہکر ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاتی ہے۔

ڈاکٹر منڈن کی کوٹھی

تقریباً آدھی رات کا وقت۔ روپ کماری ابھی مدن لال کی پارٹی سے واپس آئی ہو اپنے سونے کے کمرہ میں پہونچکر سب زیورات اُتار کر میز پر ڈالدیتی ہے اور کپڑے اُتار کر ایک طرف کرسی پر رکھدیتی ہے۔ لباس شب خوابی پہن لیتی ہے۔ بڑے آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی ہے۔ پھر ایک انگڑائی لیتی ہے اور روشنی گل کر کے مسہری میں داخل ہو جاتی ہو۔ نائٹ لائٹ روشن ہے۔ امر سنگھ خاکی لباس پہنے مُنہ پر نقاب ڈالے۔ مکان کے عقب سے کمپاؤنڈ میں داخل ہوتا ہے اور بیرونی زینہ کے راستہ اُوپر کی منزل میں پہونچ جاتا ہے۔ پستول ہاتھ میں ہے۔ ایک کمرہ میں سے گذر کے۔ کھڑکی سے کود کر، روپ کماری کی خوابگاہ میں پہونچتا ہے۔ میز پر پڑے ہوئے زیورات کو دیکھتا ہے۔ سبکو آہستہ سے اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیتا ہو پھر باقی کمرے کا جائزہ لیتا ہو۔ میز پر ایک صندوقچہ رکھا ہے۔ اُسے کھولتا ہو۔ کسی چیز سے ٹھوکر لگتی ہے۔ کھٹکا ہوتا ہو روپ چونکتی ہے۔ امر سنگھ فوراً پردہ کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ روپ کماری مسہری سے نکل آتی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتی ہو پھر پردہ کو ایک طرف کھینچتی ہو جس کے پیچھے امر سنگھ ہاتھ میں پستول لئے مُنہ پر نقاب ڈالے کھڑا ہے۔ روپ کماری اُسے دیکھکر چیخ مار کے گرتی ہے اور بیہوش ہو جاتی ہے۔ امر سنگھ ایک لمحہ خاموش کھڑا اُسکو دیکھتا ہے پھر کچھ سوچکر اپنا نقاب اُلٹ دیتا ہے۔ روپ کماری کو اُٹھا کر مسہری پر لٹاتا ہے۔ میز پر صراحی رکھی ہے۔ گلاس میں پانی اُنڈیل کر روپ کماری کے برابر مسہری پر بیٹھکر روپ کماری کے چہرہ پر پانی کے چھینٹے دیتا ہے۔ میز پر سے رائٹنگ پیڈ کا گتّا لے کر روپ کماری کو پنکھا جھلتا ہے۔ دو منٹ میں روپ کماری آنکھیں کھولتی ہے اور خاموشی کے ساتھ خوفزدہ آنکھوں سے امر سنگھ کو دیکھتی ہے۔

امر سنگھ :۔ بائی جی آپ ڈر رہیے نہیں۔

روپ کماری اُٹھکر بیٹھ جاتی ہو۔ امر سنگھ کھڑا ہو جاتا ہو۔

روپ کماری :۔ آپ کون ہیں ؟

امر سنگھ :۔ میں کون ہوں ؟ (سر جُھکا کر) آپکو کیسے بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ جو کوئی بھی ہوں آپکا مجرم ہوں۔

روپ کماری بڑے غور اور دلچسپی سے امر سنگھ کو دیکھتی ہے، امر سنگھ جیب سے روپ کماری کے زیورات نکالکر اسکے سامنے

ڈال دیتا ہے۔

امر سنگھ:۔ دیوی مجھ سے بڑا قصور ہوا۔ معاف کر دیجئے۔

روپ کماری سخت حیران ہو کر امر سنگھ کو دیکھتی ہوئی پھر کہتی ہے:۔

روپ کماری:۔ آپکو بتانا پڑیگا کہ آپ کون ہیں!

امر سنگھ:۔ دیوی! وہ کوئی اچھی بات نہیں جسے آپ جاننا چاہتی ہیں۔

روپ کماری:۔ نہیں۔ بتایئے۔

امر سنگھ:۔ میں ایک چور، ڈاکو، خونی ہوں اور کیا بتاؤں یا ایک مصیبت کا مارا ہوا ایک بدنصیب انسان۔

روپ کماری:۔ (امر سنگھ کا ہاتھ پکڑ کے) بیٹھ جایئے۔

(امر سنگھ بیٹھ جاتا ہے) اب تفصیل سے سُنایئے کہ آدھی رات کے وقت آپ میرے کمرہ میں کیسے آئے۔

امر سنگھ:۔ چوری کرنے آیا تھا۔

روپ کماری:۔ تو پھر چوری کر کے بھاگ کیوں نہیں گئے؟

امر سنگھ:۔ جب آپ گر کر بیہوش ہو گئیں اور میں نے آپکو دیکھا تو میرا دل بے اختیار ہو گیا۔ آپکی موہنی صورت نے مجھے قید کر لیا۔ ساتھ ہی مجھے یہ خوف بھی ہوا کہ بیہوش چھوڑ جانے میں کہیں آپ کی جان کو کوئی صدمہ نہ پہونچ جائے۔ میرا ارادہ بدل گیا۔ پھر دراصل میں آپکے یہاں چوری کے ارادہ سے آیا بھی نہ تھا۔ مجھ سے بھول ہوئی مجھے بتایا گیا تھا کہ نمبر ۱۸ کی کوٹھی میں نئج پورہ کا جوان اور بدمعاش راجہ ٹھہرا ہوا ہے۔

روپ کماری:۔ اوہ۔ وہ تو نمبر ۱۷ میں ہیں۔

امر سنگھ:۔ تھوڑے دن ہوئے اُس نے شراب کے نشے میں میرے بوڑھے باپ کو اپنی موٹر سے کچل کر مار ڈالا پھر رشوت دے کر گواہوں کو توڑ لیا اور جس طرح دولتمند انصاف خریدتے ہیں۔ وہ بھی عدالت سے صاف چھوٹ گیا۔ میں اُسی کو لوٹنے اور قتل کرنے کے لئے آیا تھا۔ کمرہ میں داخل ہونے کے بعد جب میں نے میز پر زیورات اور کرسی پر آپکے کپڑے پڑے دیکھے تو یقین ہو گیا کہ میں غلطی سے کہیں اور گھس آیا لیکن ان زیورات کو میں نے اپنی اور دوسروں کی مفلسی اور فاقہ کشی کا علاج سمجھ کر اُٹھا لیا، کمرے کی تلاشی لے رہا تھا کہ شاید کچھ اور مل جائے کہ کھٹکے سے آپکی آنکھ کھل گئی۔

روپ کماری:۔ آپ تو کوئی بہت ہی شریف اور تعلیم یافتہ نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔

امر سنگھ:۔ دیوی۔ کیا شریفوں کے یہی کرتوت ہیں۔ آہ خدا اس بے روزگاری کو غارت کرے، جس نے چور، ڈاکو، خونی سب کچھ بنا دیا۔

روپ کماری:۔ کیا میں آپکی کچھ مدد کر سکتی ہوں؟

امر سنگھ:۔ میں آپکا بیحد شکرگذار رہوں۔ بس اتنا کیجئے کہ میرے قصور کو معاف کر دیجئے۔

روپ کماری:۔ اب اس ذکر کو جانے دیجئے۔

اُٹھکر میز کی دراز کھولتی ہے اُس میں سے کچھ نوٹ نکالتی ہے۔

روپ کماری:۔ مجھے آپکے ساتھ بے انتہا ہمدردی ہے اور مجھے بے انتہا خوشی ہوگی اگر آپ میری اس حقیر مدد کو قبول فرمالیں گے۔

امر سنگھ:۔ (محبت اور تشکر کی نظروں سے روپ کو دیکھتا ہے) اگر آپ یہ رقم مجھے قرض کے طور پر دیدیں تو عمر بھر آپکا احسان نہ بھولونگا۔

روپ کماری:۔ جس طرح آپ کا جی چاہے۔

امر سنگھ:۔ (روپیہ لیکر) آپکا بہت ممنون ہوں۔

روپ کماری:۔ (ایک سانس کے وقفہ کے بعد) آپ سے ایک

اور بھی التجا ہے۔ کیا میں اُمید رکھوں کہ میری خاطر آپ اُسے پورا کر دینگے۔

امر سنگھ:۔ ہاں۔ اگر میرے امکان میں ہو۔

روپ کماری:۔ ہاں۔ آپکے اختیار میں ہے۔

امر سنگھ:۔ تو پھر فرمایئے۔ میں بسروچشم اُسکی تعمیل کرونگا۔

روپ کماری:۔ مدن لال کے قتل کا ارادہ ترک کر دیجئے۔ اور قسم کھا کر مجھ سے وعدہ کیجئے کہ اب آپ اُس طرف کا رُخ بھی نہ کرینگے۔

امر سنگھ:۔ (متحیرانہ) وہ آپکے کوئی عزیز یا دوست ہیں؟

روپ کماری:۔ نہیں۔ میں تو اُنہیں جانتی بھی نہیں۔

امر سنگھ:۔ تو پھر آپکو اُن سے کیا ہمدردی ہے۔

روپ کماری:۔ مجھے اُن سے کوئی ہمدردی نہیں مگر میں نہیں چاہتی کہ کسی طرح آپکی جان خطرہ میں پڑے۔

امر سنگھ:۔ (بہت ہی متاثر ہوکر) دیوی۔ خدا نے آپکو کیسا شریف اور محبت والا دل دیا ہے۔ اچھا میں آپسے وعدہ کرتا ہوں کہ اب اِس ارادہ سے باز رہونگا۔

روپ کماری:۔ بہت ممنون ہوں۔ مجھے آپسے کچھ اور بھی ضروری باتیں کرنی ہیں۔ شاید میں آپکی کچھ اور بھی مدد کرسکوں۔ اگر فرصت ہو تو کل شام کو تشریف لایئے۔ میں آپ کا انتظار کرونگی۔

امر سنگھ:۔ ضرور حاضر ہونگا۔

روپ کماری:۔ (اُٹھکر دروازہ تک پہونچانے جاتی ہے (راستہ میں) جلدی میں مَیں نے آپکا نام بھی تو نہیں پوچھا۔

امر سنگھ:۔ مجھے امر سنگھ کہتے ہیں۔

روپ کماری:۔ (دروازہ پر پہونچکر) اچھا گڈ نائٹ امر سنگھ جی۔

امر سنگھ:۔ گڈ نائٹ دیوی۔

رائے بہادر بنارسی داس کی عالیشان کوٹھی اور وسیع باغ

نرس:۔ (Sunny) سنّی! سنّی!!

بچّہ دوڑتا ہوا آتا ہے۔

نرس:۔ چلو۔ ہوا کھانے چلیں۔

بچّہ:۔ چلو۔

ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ٹہلتے ہوئے جارہے ہیں۔ لڑکے کے پاس گیند ہے۔ اُس سے دونوں کھیلتے ہیں۔ کبھی یہ پھینکتی ہے وہ اُٹھا کر لاتا ہے۔ کبھی وہ پھینکتا ہے یہ اُٹھا کر لاتی ہے۔ اسی طرح چلے جارہے ہیں۔ کوٹھی سے دُور اور باغ کی دیوار سے نزدیک ہوتے جاتے ہیں۔ دیوار کے اُس طرف نمبر۱۲ کھڑا ہے۔ نرس دیوار کے قریب پہونچکر بچّہ کی گیند زور سے پھینکدیتی ہے اور کہتی ہے۔ سنّی! دوڑکے اُٹھا کے لاؤ۔

بچّہ دوڑ جاتا ہے۔ نرس نمبر۱۲ کے قریب پہونچکر:۔

ڈارلنگ! معاف کرنا۔ بہت دیر ہوگئی۔

نمبر۱۲:۔ چھٹی مل گئی؟

نرس:۔ ہاں تین دن کی چھٹی مل گئی۔

نمبر۱۲:۔ میں نے ایک ہاؤس بوٹ کرایہ کرلی ہے۔ راتیں بھی چاندنی ہیں۔ بڑا لطف رہیگا۔

بچّہ گیند لیکر آرہا ہے۔ نمبر۱۲ ایک طرف کو ہٹ جاتا ہے۔ نرس پھر بچّہ کی گیند بہت دُور پھینکدیتی ہے وہ پھر گیند کے پیچھے دوڑ جاتا ہے۔ اتنے میں ایک موٹر ان لوگوں سے دُور باغ کی دیوار کے برابر آکر رُکتی ہے اور دو آدمی اُس میں سے اُترکر دیوار پھاند کے بچّہ کو اُٹھا کر لیجاتے ہیں اور موٹر میں بٹھکر فوراً روانہ ہوجاتے ہیں۔ نمبر۱۲ پھر قریب آجاتا ہے۔

نرس:۔ لیکن سُندر اگر کسی کو خبر ہوگئی تو غضب ہوجائیگا۔

سُندر:۔ خبر کیسے ہوجائیگی۔ تم اپنی خالہ کے گھر دیہات جا رہی ہو۔

نرس:۔ (مسکرا کر) یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر......

اتنا کہہ کر پیچھے پلٹ کر دیکھتی ہے۔ بچہ غائب ہے۔

نرس:۔ (گھبرا کر) ستی کہاں چلا گیا۔

گھبرائی ہوئی اس طرف جاتی ہے اور چلا کر پکارتی ہے:۔

ستی! ستی! ستی۔

اور نہ پا کر شور مچاتی ہے۔

ارے دوڑو۔ دوڑو۔ ستی کو لے گئے۔ ستی کو لے گئے۔

نمبر ۱۲ چپکے سے کھسک جاتا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

روپ کماری اور امر سنگھ ایک صوفے پر پاس پاس بیٹھے ہیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں۔

روپ کماری:۔ رات آپکے جانے کے بعد بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ آنکھ لگی تو پھر آپکو خواب میں دیکھا۔ یہ نہیں بتاؤنگی کس طرح دیکھا۔ پھر تھوڑی دیر میں آنکھ کھل گئی۔

امر سنگھ محبت بھری نظروں سے روپ کماری کو دیکھتا ہے۔ پھر کہتا ہے:۔

یہ آپ کا ریڈیو کام کرتا ہے۔

روپ کماری:۔ آں ہاں۔

اُٹھکر ریڈیو کو (set) سٹ کر دیتی ہے۔ خبریں بیان کی جا رہی ہیں۔

(۱) ریاست رامپور میں ایک دو سر کا بچہ پیدا ہوا ہے۔

(۲) دہلی میں لالہ ہرنام داس کی سات برس کی بچی نے بیان کیا کہ میں پچھلے جنم میں متھرا کے ایک صراف کُندن لال کی بیوی تھی۔ کُندن لال اپنے پچھلے جنم کی بیوی سے ملنے کے لئے دہلی بلائے گئے ہیں۔ روز ہزاروں مرد عورت اس لڑکی کو دیکھنے آتے ہیں اور لالہ صاحب کے مکان پر ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔

(۳) بے روزگاری سے تنگ آکر ایک نوجوان بلدیو سہائے نے کانپور میں، دریائے گنگا میں ڈوب کر جان دیدی معلوم ہوا ہے کہ دو برس ہوتے اُس نے قانون کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا مگر اب تک بالکل بیکار تھا۔

(۴) بھوک ہڑتال کی وجہ سے دیش سیوکوں کے سرغنہ مسٹر مکر جی کی حالت رات سے بہت نازک ہے۔

(۵) آج کپتان پریم سنگھ کی کوششوں سے ایک دیش سیوک اور گرفتار ہوا ہے اور عارضی طور پر کپتان صاحب کی خدمات محکمہ پولیس کو دیدی گئی ہے۔

امر سنگھ غصہ سے کانپنے لگتا ہے۔ پھر جیب سے رومال نکالکر چہرہ کا پسینہ پونچھتا ہے۔ روپ کماری کی نظر رومال پر پڑتی ہے۔ اُس پر (Red Cross) ریڈ کراس بنا ہے۔

روپ کماری:۔ (متحیرانہ) اچھا امر سنگھ جی آپ بھی دیش سیوک ہیں؟

امر سنگھ:۔ (حیران و مضطرب ہو کر) آپ نے کیسے جانا؟

روپ کماری:۔ (رومال کی طرف اشارہ کر کے) اس ریڈ کراس سے۔

امر سنگھ:۔ آپ بھی دیش سیوک ہیں؟

روپ کماری:۔ (اپنی انگشتری دکھلا کر جس پر ریڈ کراس بنا ہے) جی ہاں میں بھی دیش سیوک ہوں۔ لیکن مکر جی کی گرفتاری کے بعد سے میں دیش سیوک منڈل کے حالات سے بالکل بیخبر ہوں۔ اس وقت مجھے یہ معلوم کر کے بے انتہا خوشی ہوئی کہ

آپ دلیش سیوک ہیں۔
امر سنگھ:۔ اور مجھے آپ سے زیادہ خوشی ہوئی۔
روپ کماری:۔ اچھا اب تک آپ لوگوں نے پریم سنگھ کی کوششوں کے روکنے کا کیا بندوبست کیا۔ دراصل ہماری جماعت کی بربادی کا باعث یہی شخص ہے۔
امر سنگھ:۔ ایشور چاہے تو دیش کا یہ دشمن اسی ہفتہ گرفتار ہو جائیگا۔ اور جلد اپنے کئے کی سزا پائیگا۔
روپ کماری:۔ امر سنگھ جی میں بیان نہیں کر سکتی کہ اسوقت آپ کے ان چند جملوں نے مجھے کس قدر خوش کر دیا۔ بھگوان آپ کو کامیاب کرے۔ ہاں ایک بات تو میں آپ سے پوچھنا بھول ہی گئی۔
امر سنگھ:۔ وہ کیا؟
روپ کماری:۔ اسوقت منڈل کا سردار کون ہے؟
امر سنگھ:۔ نمبر ایک سو گیارہ۔
روپ کماری:۔ میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔
امر سنگھ:۔ اُن سے ملکر کیا کیجئے گا۔
روپ کماری:۔ میں اُن سے التجا کرونگی کہ جس طرح ہو جلد سے جلد اس بدمعاش پریم سنگھ کا خاتمہ کر دیا جائے۔
امر سنگھ:۔ میں آپکا یہ پیغام سردار کو پہونچا دونگا۔
روپ کماری:۔ شاید آپ کو مجھپر اعتماد نہیں جو آپ مجھے اُن سے ملانا نہیں چاہتے۔
امر سنگھ:۔ تعجب ہے آپکو امر سنگھ کے متعلق ایسی بدگمانی ہے۔ اچھا فرمایئے۔ منڈل کا سردار آپ کے سامنے موجود ہے۔
روپ کماری:۔ (متحیرانہ) امر سنگھ جی۔ آپ خود!
امر سنگھ:۔ جی ہاں۔ (یہ کہکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ روپ اُس کے دونوں کاندھوں پر ہاتھ رکھکر بڑی محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھتی ہے۔ امر سنگھ بیتاب ہوکر اُسے آغوش میں لے لیتا ہے اور لب بوس ہوتا ہے۔)

شارع عام

ایک شخص نہایت بدحال سڑک پر چلا جا رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بھوکا ہے، چلتے چلتے سڑک کے کنارے بیٹھ جاتا ہے۔ امرودوں کی ٹوکری لئے ایک کنجڑن برابر سے گذرتی ہے۔ یہ شخص للچائی ہوئی نظروں سے امرودوں کو دیکھتا ہے پھر چپکے سے پیچھے پیچھے جاکر ٹوکری میں سے کئی امرود اٹھالیتا ہے اور فوراً کھانا شروع کر دیتا ہے۔ عورت خبردار ہوکر شور مچاتی ہے۔ لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور باقی امرود اُس سے چھین کر کنجڑن کو دیدیتے ہیں اور اس شخص کو بُرا بھلا کہنا شروع کرتے ہیں۔
وہ شخص:۔ تمہیں کیا خبر کہ میرا کیا حال ہے۔ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ بھوک سے جان نکل رہی ہے۔
ایک راہگیر:۔ تو مزدوری کی ہوتی یا لوگوں کا مال لوٹنا شروع کر دیا۔
وہ شخص:۔ مزدوری! کہاں ہے مزدوری؟
ایک اور راہگیر:۔ (طنز و حقارت سے) کہاں ہے مزدوری! بدمعاش کہیں کا، چوروں کیلئے مزدوری کہاں سے آئی۔
وہ شخص:۔ بس خبردار۔ اب ایک لفظ زبان سے نکالا تو اچھا نہ ہوگا۔
ایک اور راہگیر:۔ اس چوٹّے کو پولیس کے حوالے کیوں نہیں کرتے۔
ایک اور آدمی:۔ (جو اب تک نہیں بولا تھا) ارے جاؤ بھیّا جاؤ۔ کاہے کو کسی کے پیچھے پڑتے ہو جاؤ اپنا اپنا کام دیکھو۔

(اُس شخص کا ہاتھ پکڑ کے) تم میرے ساتھ آؤ بھائی۔

مجمع منتشر ہوجاتا ہے۔ یہ آدمی ایک دوانی نکال کر اُس شخص کے حوالہ کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

لو کچھ لیکے کھا لینا (دوانی دیکر اپنی راہ لیتا ہے)

وہ شخص کچھ دیر کھڑا سوچتا ہے۔ پھر ایک دُکان سے پوریاں خرید کر کھاتا ہے۔ اسکے بعد آہستہ آہستہ روانہ ہوجاتا ہے۔ لیول کراسنگ (Level Crossing) آتا ہے۔ ریل کا پھاٹک بند ہے۔ یہ شخص کود کر ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے ایک طرف کو چلا جاتا ہے اور غائب ہوجاتا ہے۔

امر سنگھ کاندھے پر ایک چھوٹا سا صندوق لئے جا رہا ہے۔ صندوق پر لکھا ہے (Royal Bakery) رایل بیکری۔ (Level Crossing) لیول کراسنگ آتا ہے۔ پھاٹک بند ہے۔ امر سنگھ ٹھہر جاتا ہے۔ دو ایک منٹ کھڑا رہتا ہے۔ اُدھر اُدھر ٹرین کو دیکھتا ہے۔ بہت اندھیرا ہے۔ ایک جانب پٹڑی پر کوئی چیز پڑی نظر آتی ہے۔ امر سنگھ اپنا صندوق اُتار کر زمین پر رکھ دیتا ہے۔ کھولکر اُس میں سے ایک ٹورچ (Torch) نکالتا ہے اور اُس طرف روشنی ڈالتا ہے۔ روشنی میں فاصلے پر ایک شخص پٹڑی پر لیٹا نظر آتا ہے۔ امر سنگھ پھاٹک کو پھاند کر اس طرف جاتا ہے اور اُس شخص کو اُٹھاتا ہے۔

وہ شخص:۔ (بگڑ کر) جاؤ اپنا راستہ لو۔

امر سنگھ:۔ بھیا اسوقت آپکی عقل ٹھکانے نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ چلئے۔

وہ شخص:۔ میری عقل بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ تم اپنا کام دیکھو۔

امر سنگھ:۔ نہیں۔ اب میں آپکو اکیلا ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔

وہ شخص:۔ ہائے قسمت۔ دُنیا نہ جینے دیتی ہے نہ مرنے دیتی ہے بھائی میں آپکے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔

امر سنگھ:۔ آخر کچھ اپنا حال تو کہئے۔ شاید میں آپ کی کچھ مدد کرسکوں۔

وہ شخص:۔ مجھے آپکی مدد نہیں چاہیئے۔ بس مجھے اس نامراد زندگی کا خاتمہ کر لینے دیجئے۔

امر سنگھ:۔ ہمّت سے کام لو بھائی۔ جوان ہو تندرست ہو، خودکشی بزدلوں کا کام ہے۔ اور جان ہی دینا ہے تو دیش کی سیوا میں جان دو کہ نام بھی ہو اور کام بھی۔

وہ شخص:۔ اجی جہنّم میں جائے وہ دیش جو اپنی اولاد کو روٹی بھی نہ دے سکے۔

امر سنگھ:۔ بھائی آپکی طرح لاکھوں انسان بے روزگاری سے بدحال ہیں۔ نہ پیٹ کو روٹی نہ تن کو کپڑا۔ کیا آپ کے جان دینے سے یا اور بہتوں کے خودکشی کر لینے سے یہ بے روزگاری کی بلا دیش سے دُور ہوسکتی ہے۔

وہ شخص:۔ تو پھر آپکا یہ مطلب ہے کہ فاقے کر کرکے مرجانا چاہیئے

امر سنگھ:۔ نہیں آپ میرے ساتھ آیئے میں آپکو وہ تدبیر بتلاؤنگا جس سے آپ کو بھی فائدہ پہونچے اور دیش کا بھی بھلا ہو۔

دونوں چُپ چاپ پھاٹک کے اُس طرف آجاتے ہیں اتنے میں ٹرین گذر جاتی ہے۔ پھاٹک خود بخود کھل جاتا ہے امر سنگھ اپنا صندوق اُٹھا لیتا ہے اور اُس شخص کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہے۔ دونوں روانہ ہوجاتے ہیں۔

امر سنگھ:۔ آپکو کام مل جائیگا آپ گھبرایئے نہیں۔

وہ شخص:۔ کہاں سے مل جائیگا۔ آج ڈیڑھ مہینہ ہوگیا مارے مارے پھرتے ہوتے۔ جہاں جاؤ یہی جواب ملتا ہے کہ جگہ خالی نہیں۔

امر سنگھ:- آپ کیا کام جانتے ہیں۔
وہ شخص:- جو ہر گریجویٹ جانتا ہے وہی میں بھی جانتا ہوں۔ یعنی لکھنے پڑھنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتا۔ سو وہ کس مرض کی دوا ہے۔
امر سنگھ:- آپ جانتے ہیں کہ اس بے روزگاری کا سبب کیا ہے؟
وہ شخص:- کیا سبب ہے؟
امر سنگھ:- سبب صرف یہ ہے کہ سرمایہ داروں نے دولت اکٹھی کر رکھی ہے اس لئے وہ افراد پر تقسیم نہیں ہو سکتی۔ جب تک سرمایہ داری کا خاتمہ نہ کیا جائیگا مفلسی اور بے روزگاری کی بلا ہرگز ملک سے دور نہیں ہو سکتی ہے۔ ملک میں ایک ایسی جماعت موجود ہے جو سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانیاں پیش کر رہی ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو آپ بھی اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔
وہ شخص:- ایسے مفید کام میں شریک ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے میں بخوشی اسکے لئے تیار ہوں۔
لنٹنے میں دونوں (...) رایل بیکری کے دروازہ پر پہونچ جاتے ہیں اور اندر داخل ہوتے ہیں۔ بیکری میں لوگ مختلف کاموں میں مصروف ہیں۔ کئی آدمی میز پر آٹا گوندھ رہے ہیں۔ کوئی بسکٹ بنا رہا ہے۔ کوئی پیسٹری وغیرہ سانچوں میں بھر رہا ہے۔ ایک طرف تنور روشن ہے۔ کچھ لوگ اس میں کچھ پکا رہے ہیں۔ امر سنگھ کے داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اور ہر شخص کام چھوڑ کر آ جاتا ہے سب ایک خاص کمرہ میں جمع ہوتے ہیں جو بظاہر ڈرائنگ روم ہے۔
ایک:- سردار بہت دیر لگائی۔
امر سنگھ:- ہاں دیر اس لئے ہوئی کہ میں ایک نیا دیش سیوک تیار کر کے لایا ہوں (اس شخص کو سب کے سامنے پیش کرتا ہے) جان دینے کے لئے یہ بریل کی پٹڑی پر لیٹے تھے۔ یہ بھی اسی مصیبت میں مبتلا ہیں جس نے ہم سب کو دیش سیوک بنا دیا (اس شخص سے مخاطب ہوکر) آپ بخوشی دیش سیوک بننے کے لئے تیار ہیں؟
وہ شخص:- مجھے کیا کام کرنا ہوگا۔
امر سنگھ:- جس طرح ممکن ہو مالداروں سے دولت چھین کر غریبوں کی مدد کرنا۔ کسانوں اور مزدوروں میں اُن کے حقوق کا احساس پیدا کر کے اُنہیں دولتمندوں کی تباہی کے لئے تیار کرنا۔ بس یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے اور اسی میں ہمارے دیش کی رکشا ہے۔ آزادی کا اور دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ آپکے ضروری خرچ کا ذمہ دار دیش سیوک منڈل رہے گا۔
وہ شخص:- میں تیار ہوں۔
امر سنگھ:- اپنی عزت اور شرافت کی قسم کھا کر وعدہ کیجئے کہ زندگی کی آخری سانسوں تک آپ آزادی کی اس جنگ میں ہمارے شریک رہینگے۔
وہ شخص:- میں اپنی عزت و شرافت کی قسم کھا کر آپ سب لوگوں کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ مرتے دم تک آپ لوگوں کا ساتھ دونگا۔
امر سنگھ:- ہمارے منڈل میں ایک ممبر کو دوسرے کا نام نہیں بتایا جاتا کہ بزدلوں کو غداری کا موقع نہ ملے، منڈل کی طرف سے ہر ممبر کو ایک نمبر دیدیا جاتا ہے۔ سب ممبر بیکری کے خریدار کہلاتے ہیں (سکرٹری سے مخاطب ہوکر) دیکھئے تو کونسا نمبر خالی ہے۔
سکرٹری:- (رجسٹر دیکھکر) نمبر ۵۔
امر سنگھ:- آج سے آپکا نمبر ۵ ہے اور یہی آپ کا نام ہے۔

اس کے علاوہ سوسائٹی کی ایک خاص نشانی بھی ہے یعنی (Red Cross) ریڈ کراس۔ یہ ہر وقت آپکو اپنے پاس رکھنی چاہیئے۔ چاہے ٹوپی پر بنا لیجئے، چاہے کوٹ پر، چاہے انگوٹھی یا بٹن میں۔ اس کی مدد سے سوسائٹی کے سب ممبر ایک دوسرے کو پہچان سکتے ہیں (اسکے بعد سکریٹری سے) مسٹر نمبر ۵۷ کا الاؤنس دیدو۔

سکریٹری بیس روپے کے نوٹ اُس شخص کے حوالے کرتا ہے۔

امر سنگھ:۔ یہ آپکا ایک مہینہ کا الاؤنس ہے۔

وہ شخص:۔ میں آپکا بیحد شکر گذار ہوں۔

امر سنگھ:۔ اس وقت سب سے بڑا کام یہ درپیش ہے کہ کپتان پریم سنگھ جس نے ہماری جماعت کو تباہ کر ڈالا ہے۔ جس طرح بنے جلد سے جلد اُسے گرفتار کیا جائے۔

سب:۔ بیشک۔

امر سنگھ:۔ اس لئے کل چار آدمیوں کی ضرورت ہوگی، (سکریٹری سے) دیکھو تو کل کس کس کی ڈیوٹی کا دن ہے؟

سکریٹری:۔ نمبر ۱۳۔ نمبر ۱۷۔ نمبر ۲۲ اور نمبر ۳۱ سے نمبر ۴۱ تک۔

امر سنگھ:۔ بس تو پہلے چار آدمی جائینگے۔ تفصیل کل صبح بتائی جائیگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اسوقت تک ہتھیاروں کی بہت کمی ہے۔ آپ لوگوں کو یہ سُنکر خوشی ہوگی کہ تھوڑی سی ہمت سے اس کا بندوبست بھی بہت آسانی سے ہوجائیگا۔

ایک:۔ وہ کیا صورت ہے؟

امر سنگھ:۔ آج ہی مجھے خبر ملی ہے کہ شکاریوں کی ایک پارٹی رام نگر کے جنگل میں شکار کھیلنے کیلئے جارہی ہے۔ یہ لوگ اتوار کی رات کو روانہ ہونگے۔ ان کے ساتھ کم سے کم دس بارہ بندوقیں ہونگی۔ میگزین بھی کافی ہوگا، اگر یہ سب سامان ہاتھ آگیا تو بہت سی مشکلیں آسان ہوجائینگی، اس کے متعلق مفصل پروگرام کل رات کو طے کیا جائیگا۔

مجلس برخاست ہوتی ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے کام پر لگ جاتے ہیں۔

نمبر ۵۷:۔ (امر سنگھ سے) اگر آپکی اجازت ہو تو کل کی مہم پر میں بھی جانا چاہتا ہوں۔

امر سنگھ:۔ اچھی بات ہے۔ تو پھر رات کو یہیں رہ جایئے کیونکہ صبح ہی جانا ہے۔

نمبر ۵۷:۔ بہت اچھا۔

ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

روپ کماری اور مدن لال ایک صوفے پر بیٹھے ہیں۔ مدن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ روپ کماری خاموش ہے۔

مدن:۔ تو آپکا خیال ہے کہ میری محبّت محض بناوٹی اور نمائشی ہے۔

روپ کماری:۔ میں نے تو یہ نہیں کہا۔

مدن:۔ ہاں کہا تو نہیں۔ مگر میرے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے اُس کے تو یہی معنی ہیں۔ آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ایک عیاش آدمی محبّت کرنا کیا جانے۔ روپ! یہ سچ ہے میں نے بہت آوارگی کی ہے لیکن پھر بھی آخر میں انسان ہی تو ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل اور دل میں محبّت کا جذبہ ہے۔

روپ کماری:۔ شائد ہو۔

مدن:۔ شائد ہو؟ ہاں تمہیں کس طرح یقین آسکتا ہے روپ مجھے اقرار ہے کہ میں آوارہ تھا۔ ہرجائی تھا۔ عیاش تھا مگر تم نے میری کایا ہی پلٹ دی۔ میری ساری آرزوؤں کا مرکز

اب صرف ایک ذات ہی اور وہ تم ہو۔ روپ اب مجھ میں بالکل صبر کی تاب نہیں۔

روپ کماری:۔ مجھے بہت افسوس ہے۔

مدن:۔ تمہیں بہت افسوس ہے۔ کاش افسوس کی جگہ تمہیں ہمدردی ہوتی۔ آہ۔ روپ تمہیں کیسے بتاؤں کہ میرے سینہ کے اندر کیسا طوفان مچا ہوا ہے۔ کیا قیامت ہے کہ تم میرے پاس ہو پھر بھی مجھ سے دُور ہو۔ کیوں روپ تمہیں مجھ پر بالکل ترس نہیں آتا۔ تمہاری صورت سے تو نہیں معلوم ہوتا کہ تم اسقدر بیدرد ہو۔

یہ کہکر روپ کماری کے ہاتھ تھام لیتا ہے۔

روپ کماری:۔ (سر جھکا کر) مدن میں سب کچھ جانتی ہوں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ لیکن جب تک اپنے دل کو چین نہ ہو انسان کسی سے محبت کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔

مدن:۔ روپ میری ساری دولت تمہارے قدموں پر نثار ہے۔ اگر تم اس سے اپنے دل کا چین خرید سکو۔

روپ کماری:۔ آپکی محبت کا شکریہ۔ مگر افسوس ہے کہ دولت میرے درد کا علاج نہیں۔ عیش و راحت کے ضروری سامان تو خدا کی مہربانی سے یہاں بھی کم نہیں مگر اس سے میرے کلیجہ کا ناسور تو نہیں بھر سکتا۔

مدن:۔ آخر بیان تو کرو۔ شاید میں کسی کام آسکوں۔

روپ کماری:۔ بیکار ہے بیان کرنا۔ یہ کام آپکے بس کا نہیں۔

مدن:۔ پھر بھی بتانے میں کیا نقصان ہے۔

روپ کماری:۔ آپ کو اصرار ہے تو سُن لیجئے۔ پریم سنگھ کو آپ جانتے ہیں؟

مدن:۔ وہی نا جس نے ڈاکٹر صاحب اور مسٹر مکرجی کو گرفتار کرایا ہے۔

روپ کماری:۔ ہاں وہی۔ اس ظالم نے میرے کلیجہ میں ناسور ڈالدئے ہیں۔ میرا بھرا گھر بلکہ میری ساری زندگی کو تباہ و برباد کردیا ہے۔ جب تک اُسے موت کی گود میں نہ دیکھ لونگی میرے دل کو چین نصیب نہ ہوگا۔

مدن سناٹے میں آجاتا ہے۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہتی ہے۔

روپ کماری:۔ (طنز سے) سُن لیا آپنے؟

مدن:۔ ہاں سُن لیا۔ روپ شاید تم یہ سمجھتی ہوگی کہ میں محبت کی دیوی کو جان کی بھینٹ دینے سے ڈرتا ہوں۔

روپ کماری:۔ شاید۔

مدن:۔ نہیں روپ اس کا تجربہ تم ابھی کرسکتی ہو۔ (دیوار پر سے ایک چھُری اُتار کر جو آرائش کے لئے لگی ہوئی تھی) اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالو۔ اگر اُف کروں تو مرد نہیں۔ اور اگر کہو تو اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ کے رکھ دوں۔

روپ کماری:۔ اس سے مجھے کیا فائدہ۔

مدن:۔ فائدہ؟ ہاں تمہیں اس سے کیا فائدہ۔ خیر جو کچھ ہو۔ میں تمہارے لئے اپنی جان قربان کرسکتا ہوں لیکن کسی اور کے خون سے ہاتھ رنگنا اسکے لئے میرا دل کسی طرح آمادہ نہیں ہوتا۔ روپ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میرے ساتھ تمہارا یہی سلوک رہا تو......

روپ کماری:۔ (بات کاٹ کر) ایک اور سہل تدبیر بھی ہے۔

مدن:۔ وہ کیا؟

روپ کماری:۔ پریم ایک چھوکری پر بُری طرح مرتا ہے۔ اگر چند روز کے لئے اُسے غائب کردیا جائے اور یہ افواہ اُڑادی جائے کہ وہ مار ڈالی گئی تو مجھے یقین ہے کہ پریم دیوانہ ہوجائیگا۔ اور خود سر ٹکرا ٹکرا کے مر جائیگا۔

مدن:۔ (خوش ہوکر) ہاں یہ کام میں کرسکتا ہوں۔

روپ کماری:۔ کب؟

مدن:۔ تین دن کے اندر اندر۔

روپ کماری:۔ یقیناً۔
مدن:۔ یقیناً (ایک منٹ خاموش رہکر) اچھا اسکے بعد۔
روپ کماری:۔ اس کے بعد روپ تمہاری ہوگی۔
مدن:۔ (خوشی سے بیتاب ہوکر) ہوئی شرط! لاؤ ہاتھ!
روپ کماری ہاتھ دیتی ہے۔ مدن چومنا چاہتا ہے۔
روپ کماری ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔
روپ کماری:۔ پہلے شرط پوری ہونی چاہیئے۔
مدن:۔ (افسردہ ہوکر) اچھی بات ہے۔

پریم سنگھ کا مکان

پریم سنگھ اپنے کمرہ میں کپڑے پہنکر باہر جانے کیلئے تیار ہو رہا ہے ملازم داخل ہوتا ہے۔
ملازم:۔ حضور ایک سپاہی پولیس صاحب کے یہاں سے آیا ہے۔ ملنا چاہتا ہے۔
پریم سنگھ:۔ کہدو آتے ہیں۔
اس کے بعد کوٹ پہنکر باہر نکلتا ہے۔ سپاہی باقاعدہ سلام کرتا ہے اور کہتا ہے:۔
سپاہی:۔ حضور، بڑے صاحب نے سلام بولا ہے اور حضور کو فوراً بلایا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔
پریم سنگھ:۔ (کچھ سوچکر) اچھا تو ایک گاڑی لے لو۔
سپاہی:۔ حضور موٹر موجود ہے۔
پریم سنگھ اور سپاہی دونوں موٹر میں سوار ہوتے ہیں۔ دو سپاہی پہلے سے موٹر میں موجود ہیں۔ موٹر چل پڑتی ہے جس وقت آبادی کے باہر سنسان سڑک پر پہونچتے ہیں اچانک دو سپاہی پریم سنگھ کو لپٹ جاتے ہیں۔ تیسرا بھی مدد کرتا ہے۔ تینوں ملکر پریم سنگھ کو باندھ لیتے ہیں اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیتے ہیں۔ موٹر کا ہُڈ چڑھا دیتے ہیں اور موٹر تیزی سے روانہ ہو جاتی ہے۔

پبلک گارڈن

باغ کے ایک ایسے حصہ میں جہاں نسبتاً بہت کم لوگ آجا رہے ہیں موہنی ایک بنچ پر نہایت افسردہ بیٹھی ہے۔ ایک نوجوان مرد اُدھر سے گذرتا ہے۔ موہنی کو دیکھکر ٹھٹکتا ہے پھر چل پڑتا ہے کچھ دُور جاکر آہستہ آہستہ پلٹتا ہے قریب آکر پھر ٹھٹکتا ہے۔ اس وقت موہنی کا ہاتھ بنچ کی پُشت پر رکھا ہوا ہے۔ اس طرح کہ (Red Cross) ریڈکراس والی انگوٹھی جو اُس کی اُنگلی میں ہے سامنے ہے۔ اُسے دیکھکر نوجوان یکایک موہنی کے سامنے آکر:۔
"دیش سیوک کی جے"!
موہنی چونک پڑتی ہے مگر فوراً سنبھل کر اسی طرح جواب دیتی ہے۔
"دیش سیوک کی جے"! آپ کا نمبر؟
نوجوان:۔ نمبر ۹۹ (ننیانوے)
موہنی:۔ تشریف رکھیئے۔
نوجوان:۔ (بہت خوش ہوکر بیٹھ جاتا ہے) دیوی! میں نے کبھی آپکو منڈل کے جلسوں میں نہیں دیکھا۔
موہنی:۔ میں منڈل کے جلسوں میں کبھی شریک نہیں ہوئی ہیں دیش سیوک منڈل کے سردار کرجی کی چیلی ہوں جس دن وہ گرفتار ہوئے اُسدن بلکہ اُسی وقت ہماری شادی ہونیوالی تھی۔
نوجوان:۔ (چونک کر) اچھا تو موہنی دیوی آپ ہی ہیں۔
موہنی:۔ جی ہاں، جب سے وہ گرفتار ہوئے میں منڈل کے حال سے بالکل بیخبر ہوں۔ آہ، بھگوان ناس کرے اِس بدذات

پریم سنگھ کا جس نے ہم سب کو برباد کر دیا (ذرا سا وقفہ) میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک اپنے ہاتھ سے اُس کا خون نہ بہا لونگی آرام سے نہ بیٹھونگی۔ اس ارادے سے میں کئی دن سے اُسکی گھات میں تھی مگر پرسوں سُنا کہ وہ یکایک غائب ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کروں ؟

نوجوان:۔ دیوی آپ یہ سُنکر خوش ہونگی کہ پریم سنگھ دیش سیوکوں کی قید میں ہے۔

موہنی:۔ (بے انتہا خوشی کا چہرہ بنا کر) واقعی ؟

نوجوان:۔ جی ہاں۔

موہنی:۔ او بھگوان۔ تیری بڑی مہربانی۔ بھائی کسی طرح مجھے وہاں تک پہونچا دو۔ غصّہ اور رنج سے میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ میں چُھری کے ایک ہی وار میں اُس خونی کا کام تمام کردونگی۔

نوجوان:۔ پرسوں صبح میں ڈیوٹی پر وہاں جاؤنگا۔ سردار بھی وہیں ہیں۔ بہتر ہو کہ آپ اُن سے مل لیں۔ پھر جیسی اُن کی صلاح ہو ویسا کیا جائے۔ آپ کہیں تو میں آپ کو اپنے ساتھ لے چلوں۔

موہنی:۔ میں عمر بھر آپ کا احسان نہ بھولونگی۔ پرسوں صبح کو آپ جہاں کہیں وہاں آپ کو مل جاؤں۔

نوجوان:۔ یہیں مل جایئے۔

موہنی:۔ بہت اچھا۔ دیش سیوک کی جے۔

نوجوان:۔ دیش سیوک کی جے۔ (دونوں جاتے ہیں)

پریم سنگھ کا مکان

موہنی بہت ہی گھبرائی داخل ہوتی ہے۔

موہنی:۔ اماں جی آداب۔

بڑھیا:۔ جیتی رہو بیٹی۔ اسقدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو ؟

موہنی:۔ اماں! پریم سنگھ جی کا پتہ لگ گیا۔ وہ دیش سیوکوں کی قید میں ہیں۔ پرسوں صبح میں اُنہیں چُھڑانے کے لئے جا رہی ہوں۔

بُڑھیا:۔ بیٹی خدا کیلئے کہیں تم خود ان بدمعاشوں کے جال میں نہ پھنس جانا۔ پولیس کو اطلاع کیوں نہ کردی جائے۔

موہنی:۔ نہیں اماں جی۔ اسوقت پولیس کو اطلاع کرنے میں پریم سنگھ جی کی جان کا خطرہ ہے۔ بھیا اندر سنگھ ابھی نہیں آئے۔

بُڑھیا:۔ وہ تو ابھی گیا ہے اور کل کسی وقت آئیگا۔

موہنی:۔ تو پھر جس وقت آئیں مجھے چھپا کے ہاتھ فوراً بلا بھیجئے گا اُن سے کچھ ضروری مشورہ کرنا ہے۔

بُڑھیا:۔ اچھی بات ہے۔

موہنی نمسکار کرکے رخصت ہوتی ہے۔

آدھی رات کا وقت

ایک موٹر موہنی کے مکان سے کچھ فاصلہ پر آکر ٹھہرتی ہے۔ تین نقاب پوش اس میں سے اُترتے ہیں۔ مکان کا دروازہ بند ہے۔ یہ لوگ اُتر کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں اور مکان کے اندر پہونچنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر ایک مکان سے ملا ہوا ایک بلند درخت ہے۔ ایک آدمی اسپر چڑھ جاتا ہے۔ اور اس پر سے مکان کی چھت پر کُود جاتا ہے۔ وہاں سے چھتوں چھتوں، چُھپتا ہوا موہنی کے مکان کی چھت پر پہنچتا ہے۔ مکان میں اُتر جاتا ہے اور دروازہ کھول دیتا ہے۔ اسکے باقی دو ساتھی بھی مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مکان میں بالکل اندھیرا ہے۔ ٹورچ کی روشنی میں ٹٹولتے ہوئے ایک کمرہ میں پہونچتے ہیں جس میں ایک پلنگ پر کوئی سو رہا ہے۔

ایک شخص آگے بڑھکر ایک کمبل اُسکے اُوپر ڈال دیتا ہے۔ عورت جاگ اُٹھتی ہے اور چیخ مارتی ہے۔ ایک آدمی اُسکے مُنہ میں کپڑا ٹھونس دیتا ہے۔ پھر اُسے باندھ لیتے ہیں اور کاندھے پر ڈالکر باہر لے آتے ہیں۔ پھر موٹر میں ڈال کے روانہ ہوجاتے ہیں۔

مدن لال بہت مسرور روپ کماری کے کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ روپ کماری سنگھار کر رہی ہے۔

مدن :- روپ، کام ہوگیا۔

روپ کماری :- (بے انتہا خوش ہوکر) سچ!

مدن :- سچ۔

روپ کماری :- (بیتابانہ دوڑکر مدن کو لپٹ جاتی ہے پھر یکایک تڑپکر اُسکے آغوش سے نکل جاتی ہے) مگر جب تک میں اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لوں مجھے اطمینان نہیں ہوسکتا۔

مدن :- تو وہ کونسا مشکل کام ہے۔ ابھی چل کے دیکھ لو۔

روپ کماری :- اچھا۔

یہ کہہ کر دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کمرہ سے باہر نکلتے ہیں اور بڑی عجلت سے موٹر میں سوار ہوجاتے ہیں جو باہر انتظار کر رہی ہے۔ موٹر تیزی سے روانہ ہوجاتی ہے۔

موٹر چلی جارہی ہے۔ ایک دفعہ مدن روپ کماری کو زور سے چمٹا لیتا ہے۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد روپ اُس سے جُدا ہوجاتی ہے۔ موٹر بیچ پورہ پیلیس پہونچتی ہے۔ نوکر چاکر استقبال کو دوڑتے ہیں۔ منّو اور پہلوان بھی موجود ہیں۔

مدن :- (پہلوان سے) کہاں ہے پہلوان!

پہلوان :- سرکار تشریف لایئے۔

پہلوان آگے آگے اور مدن اور روپ پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ کئی کمروں سے گذر کر ایک کمرہ میں پہونچتے ہیں۔ ایک عورت رسیوں سے بندھی ہوئی ایک کرسی پر پڑی ہے۔ روپ کماری کو دیکھکر ایک چیخ مارتی ہے، روپ اُسے دیکھکر آگ بگولا ہوجاتی ہے۔

روپ کماری :- آہ! حرامزادی۔ اب دغابازی کا نتیجہ تو دیکھ لے۔

یہ کہکر چھُری لیکر لپکتی ہے۔

مدن :- روپ خُدا کیلئے۔ یہ کیا غضب کرتی ہو۔

روپ کماری :- (مدن کو جھٹکا دیکر) چھوڑ دو۔ چھوڑ دو سارے فساد کی جڑ یہی بدذات ہے۔

مدن اور روپ میں کشمکش ہورہی ہے۔

مدن :- مگر پہلے تو کبھی تم نے موہنی کا کوئی قصور نہیں بتایا۔

روپ کماری :- لے یہ موہنی ہے کب؟ یہ تو میری مُلازمہ چمپا ہے۔ جو میرے یہاں سے خفیہ کاغذات لیکر بھاگ گئی تھی اور جس کی وجہ سے ہم پر یہ تباہی آئی۔

سب حیران ہوکر چمپا کو دیکھتے ہیں۔

مدن :- چمپا!

روپ کماری :- ہاں چمپا۔ مدن دیکھو اس وقت مجھے چھوڑ دو۔ میرا خون کھول رہا ہے۔ مجھے انتقام لے لینے دو۔

مدن :- روپ ذرا صبر سے کام لو۔ یہاں سے یہ کہاں جاسکتی ہے۔ موہنی کا حال تو اس سے پوچھ لینے دو۔ پھر تمہیں اختیار ہے۔

روپ کماری بیٹھ جاتی ہے۔

مدن :- چمپا۔ موہنی کیا ہوئی۔

چمپا :- مہاراج مجھے کچھ نہیں معلوم۔ شام کو پریم سنگھ جی کی امّاں نے مجھے بھیجا کہ موہنی دیوی کو بلا لاؤں میں گئی۔ اُنہوں نے

کہا کہ میری ملازمہ کام سے اپنے گھر گئی ہے۔ تم یہاں ٹھہر جاؤ اور جب تک میں واپس نہ آؤں تم یہیں رہنا۔ وہ جو گئیں تو پھر نہ آئیں۔ شاید رات کو وہیں رہ گئی ہونگی۔ سرکار میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں نے کوئی مخبری نہیں کی۔

روپ کماری:- (جھٹ کر پھر کرسی سے کھڑی ہو جاتی ہے) حرامزادی، مکار، جھوٹی کہہ کر پھر چمپا کی طرف جھپٹتی ہے مدن روک لیتا ہے اور کہتا ہے۔

مدن:- میرا خیال ہے کہ ابھی اسے یہیں قید رکھا جائے۔ اس سے بہت سی مفید باتیں معلوم ہونگی۔ اور اب چلکے موہنی کا پتہ چلا کے اُسکی گرفتاری کا انتظام کرنا چاہیئے۔

یہ کہہ کر روپ کا ہاتھ پکڑ کے کمرہ سے باہر آتا ہے اور موٹر میں بیٹھنا چاہتا ہے۔

روپ کماری:- اچھا میں اس سے ایک بات اور پوچھ لوں۔ سب پلٹتے ہیں۔ روپ اطمینان سے چمپا کے پاس جاتی ہے۔ چھُری جو مدن نے اُس کے ہاتھ سے چھین کر میز پر ڈال دی تھی۔ اُٹھا کر اچانک چمپا کے سینے میں بھونک دیتی ہے۔ سب ارے ارے کرکے رہجاتے ہیں چمپا تڑپنے لگتی ہے اور ذرا سی دیر میں سرد ہو جاتی ہے۔

مدن:- (سخت بدحواس ہو کر پہلوان اور منتو سے) جلد سے جلد اسے دفن کرادو اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو نہیں تو ہم میں سے کسی کی جان کی خیر نہیں۔

پہلوان:- (نہایت پریشانی کے عالم میں) اچھا سرکار۔

دن کا وقت۔ موہنی اور اندر سنگھ ساتھ ساتھ پریم سنگھ کے مکان سے نکلتے ہیں۔ باہر موٹر کھڑی ہے۔ اُس میں بیٹھ کر روانہ ہو جاتے ہیں۔

موہنی:- اوّل تو اُمید ہے کہ میں اکیلی ہی اُن کے چھڑانے میں کامیاب ہو جاؤنگی لیکن اگر ہم لوگ رات میں کسی وقت واپس آجائیں تو دن نکلنے سے پیشتر آپ مع مسلح پولیس کے پہونچ جایئے۔

اندر سنگھ:- بہن تم خواہ مخواہ اپنے کو خطرہ میں ڈال رہی ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔

موہنی:- نہیں بھیّا آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ ایشور چاہے تو سب اچھا ہی اچھا ہوگا۔

یہ لوگ موٹر میں (پبلک گارڈن) باغ کے دروازہ پر پہونچ جاتے ہیں۔

موہنی:- بس اب آپ یہیں کہیں ٹھہر جایئے۔

موہنی باغ کے اندر چلی جاتی ہے۔ اندر سنگھ باہر رہ جاتا ہے۔ موہنی اُسی جگہ پہونچتی ہے نمبر ۹۹ اُس کا منتظر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھکر وِش سیوک کی جے۔ کہتے ہیں۔ دونوں بہت خوش نظر آتے ہیں۔ باغ سے نکل کر نمبر ۹۹ ایک ٹیکسی کو آواز دیتا ہے۔ دونوں اسمیں بیٹھکر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اندر سنگھ اپنی موٹر میں اس ٹیکسی کا تعاقب کر رہا ہے۔ موہنی کی ٹیکسی بہت آگے ہے۔ اندر سنگھ بار بار دوربین سے دیکھتا ہے۔ آخر موہنی کی ٹیکسی ٹھہرتی ہے اندر سنگھ بھی اپنی موٹر روک لیتا ہے۔ نمبر ۹۹ اور موہنی اُتر پڑتے ہیں اور ٹیکسی رخصت کر دی جاتی ہے۔ نمبر ۹۹ اور موہنی کچھ دُور پیدل چلتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر ایک اور موٹر اُنکی منتظر ہے اُس میں بیٹھکر پھر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اندر سنگھ فاصلے سے تعاقب کر رہا ہے۔ آخر موہنی کی موٹر رکتی ہے۔ موہنی اور نمبر ۹۹ دونوں اُتر کر گھنے جنگل میں داخل ہوتے ہیں۔ اندر سنگھ بہت دُور فاصلے پر اپنی موٹر روکتا ہے اور موٹر کو ایک طرف چھُپا دیتا ہے۔ خود دوربین ہاتھ میں لئے چھپتا ہوا اُن کا تعاقب کرتا ہے۔ یہ لوگ ایک پُرانی گڑھی میں داخل ہو جاتے ہیں جس کے کچھ حصّے ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر

ہوگئے ہیں اور کچھ حصے ابھی تک صحیح و سالم باقی ہیں۔ اندر سنگھ پلٹ آتا ہے۔

نمبر ۹۹ دروازہ پر "دیش سیوک کی جے" کہتا ہے دروازہ کھل جاتا ہے۔ دونوں داخل ہوتے ہیں۔ دروازہ پھر بند کر دیا جاتا ہے۔

نمبر ۹۹:۔ (پہرہ دار سے) سردار ہیں ؟

پہرہ دار:۔ نہیں۔ وہ تو صبح سے کسی ضروری کام سے شہر گئے ہیں۔

نمبر ۹۹:۔ (موہنی سے) سردار کے آنے تک آپکو انتظار کرنا پڑے گا۔

موہنی:۔ (چھری نکالکر) آہ! اب تک انتظار کرنا پڑیگا۔

نمبر ۹۹ موہنی کو اپنے ساتھ ایک کمرہ میں لیجاتا ہے جہاں کافی ہتھیار اور میگزین موجود ہے۔ کمرہ میں داخل ہوکر نمبر ۹۹ پٹیاں نیکر وغیرہ فوجی وردی پہن لیتا ہے اور موہنی سے کہتا ہے۔

نمبر ۹۹:۔ آپ تھوڑی دیر یہاں آرام کیجئے۔ میں ڈیوٹی پر جاتا ہوں۔ سردار کے آتے ہی آپ کو اُن سے ملا دونگا۔

یہ کہہ کر چلا جاتا ہے۔ پریم سنگھ کی کوٹھری کے دروازہ پر پہونچکر پہرہ دار سے کنجی لیتا ہے اور اُسکو رخصت کرتا ہے۔ پہرہ دار اُسی کمرہ میں آتا ہے جس میں موہنی بیٹھی ہے۔ موہنی کو دیکھکر "دیش سیوک کی جے" کہتا ہے موہنی بھی اسی طرح جواب دیتی ہے۔ یہ شخص وردی اُتار کر سادہ کپڑے پہن لیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد موہنی اُٹھکر اِدھر اُدھر ٹہلتی ہے۔ ہر چیز کا اندازہ کرتی ہے۔ خصوصاً ہتھیاروں کا جائزہ لیتی ہے۔ پھر اپنے کپڑوں میں سے ایک پستول نکالکر اچھی طرح اُسکی جانچ کرتی ہے اور پھر اپنی ساڑی میں چھپا لیتی ہے۔ دو منٹ کے بعد کمرہ سے باہر نکلتی ہے اور اُس طرف پہونچتی ہے جہاں پریم سنگھ قید ہے۔ صرف نمبر ۹۹ پہرے پر ہے۔ بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا ہے۔ موہنی کی طرف اُس کی پیٹھ ہے۔ موہنی چپکے چپکے جاکر پستول اُسکے سامنے کر دیتی ہے اور کہتی ہے۔

خاموش! کھڑے ہو جاؤ۔

نمبر ۹۹ کھڑا ہو جاتا ہے۔ موہنی اُسے ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کرتی ہے۔ وہ ہٹتا ہے۔ پریم سنگھ دوڑ کر اپنی کوٹھری کے دروازہ پر آتا ہے اور حیران ہوکر کہتا ہے۔

موہنی!

موہنی:۔ پریم سنگھ جی۔

پریم سنگھ:۔ موہنی کوٹھری کی کنجی اسکی جیب میں ہے۔

موہنی:۔ (نمبر ۹۹ سے) کنجی زمین پر ڈالدو۔

نمبر ۹۹ کنجی جیب سے نکالکر موہنی کے آگے ڈالدیتا ہے موہنی کنجی اُٹھاکر دروازہ کھولدیتی ہے۔ پریم سنگھ نکل آتا ہے اور نمبر ۹۹ کی بندوق اُٹھا لیتا ہے۔

پریم سنگھ:۔ (نمبر ۹۹ سے) آگے آگے چلو۔

نمبر ۹۹ آگے آگے چلتا ہے اور یہ دونوں پیچھے پیچھے ایک دروازہ سے گذرتے ہیں۔ چند قدم چل کر نمبر ۹۹ اس زنجیر کو کھینچ لیتا ہے جو چھت میں لٹک رہی ہے۔ الارم بج جاتا ہے۔ پریم سنگھ جھلاکر اُسکے گولی مار دیتا ہے۔ وہ آہ کرکے گرتا ہے

پریم سنگھ:۔ موہنی جلدی کرو۔

موہنی کا ہاتھ پکڑکے تیزی سے بھاگتا ہے۔ ابھی چند قدم جاتا ہے کہ بہت سے قدموں کی آواز آتی ہے۔

پریم:۔ آہ! قسمت نے اب بھی ساتھ نہ دیا۔

دونوں پھر پلٹتے ہیں اور دروازہ بند کر لیتے ہیں۔ دروازہ کے دوسری طرف بہت سے مسلح لوگ آجاتے ہیں۔

کئی آدمی:۔ (چلاکر) دروازہ کھولدو۔

پریم سنگھ کچھ جواب نہیں دیتا۔

ایک :- دروازہ توڑ ڈالنا چاہیئے۔

دروازہ توڑنا شروع کرتے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص کہتا ہے ٹھہرو! دروازہ مت توڑو۔ ادھر سے بھی بند کردو کہ نکل نہ سکیں اور بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کے مرجائیں۔

ایک اور :- بالکل ٹھیک۔

فوراً لکڑیوں، پتھروں اور مٹی کے انبار سے دروازہ ادھر سے بند کردیا جاتا ہے۔

دس بارہ شکاریوں کی ایک پارٹی جنگل میں چلی جارہی ہے۔ کچھ برجیس پہنے ہیں۔ کئی ہاف پینٹ پہنے ہیں۔ ایک بہت چوڑے چکلے صاحب فقط کرتہ پاجامہ میں ہیں۔ ہیٹ سب کے سروں پر ہیں۔ کئی ملازم ساتھ ہیں۔ ایک کے پاس شکار کئے ہوئے پرند ہیں۔ ایک کے پاس ٹفن کیریر ہیں ایک کے سر پر صندوق ہے۔ ایک کے سر پر کچھ اور سامان لدا ہے۔

ایک شکاری :- (کرتہ پاجامہ والا) بس بھائی۔ اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔ بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے۔

دوسرا شکاری :- بڑے ڈھیلے آدمی ہو جی۔ صبح ڈھائی سیر پکا ناشتہ ٹھونس چکے ہو۔ اب بھوک کے مارے دم نکلا جارہا ہے۔

پہلا شکاری :- اچھا جو کچھ کہو۔ مجھ سے اب آگے نہیں چلا جائیگا اب ایک قدم بڑھے تو میں گر پڑونگا۔

(سب ٹھہر جاتے ہیں)

تیسرا شکاری :- اچھا تو پھر اب یہیں ٹھہر جائیں۔ کھانا کھالیں اور تھوڑا سا آرام کرلیں اس کے بعد آگے چلیں گے۔

سب سامان اتارا جاتا ہے۔ بندوقیں ایک طرف کھڑی کردی جاتی ہیں۔ کارتوسوں کی پیٹیاں انہیں پر لٹکادی جاتی ہیں۔ جازم بچھائی جاتی ہے۔ صندوق میں سے رکابیاں گلاس اور تھرماس نکلتے ہیں۔ کھانا نکالا جاتا ہے۔ سب کھانا شروع کرتے ہیں۔ جب کھانا قریب قریب کھایا جاچکتا ہے یکایک دیسی سپاہیوں کی ایک مسلح جماعت جس کا سردار نمبر ۵ ہے انہیں گھیر لیتی ہے۔ اور سب بندوقیں اور کارتوس لیکر چشم زدن میں غائب ہو جاتے ہیں۔

ایک شکاری :- (کرتے پاجامہ والے صاحب سے) یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ دو دو ڈیڑھ میل پر تو یہاں سے گاؤں ہے۔ وہاں چل کے کھانا کھالیتے تو ایسی مصیبت تھی مگر تمہارا تو دم نکلا جارہا تھا۔

پاجامہ والا :- میری وجہ سے ہوا یا بندوقوں کی وجہ سے ہوا! میں تو اسی وجہ سے ہمیشہ سے مچھلی کے شکار کا طرفدار ہوں۔ پھر میں نے کیا ان حرامزادوں سے سازش کرلی تھی کہ ہمیں لوٹ کے لیجانا۔

ایک اور شکاری :- میری بندوق دادا جان کے وقت کی تھی، غدر میں انھوں نے کسی رئیس سے چھینی تھی۔ اب ایسی چیز نصیب نہیں ہو سکتی۔

پاجامہ والا :- بس تو یہ ساری نحوست تمہاری ہی بندوق کی تھی۔ چوری کا مال چوری میں گیا اور دوسروں کا بھی نقصان کر گیا۔

ایک اور شکاری :- اب ان فضول باتوں سے کیا فائدہ۔ فوراً چل کے پولیس کو خبر دینی چاہیئے۔

پاجامہ والا :- (پریشان ہوکر) کیا؟ ابھی پھر چلنا ہوگا ابھی کھانا کھایا ہے۔ یار کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ ذرا دم تو لینے دو۔ پولیس کو فوراً خبر کرنے سے بندوقیں تو ملنے سے رہیں۔

ایک اور شکاری :- (جھلاکر) اچھا تو اب تم یہاں آرام کرو ہم تو جاتے ہیں۔

(سب چل پڑتے ہیں)

امر سنگھ :- اب سمجھا۔ مجھے کس لئے اس خونی کے قتل سے روکا گیا تھا۔

پھر فیر کرتا ہے اور کہتا ہے :-

خُون کا بدلہ خُون۔

پستول خالی جاتا ہے۔ مدن گاڑی میں نیچے دبک کر بیٹھ جاتا ہے۔ روپ کماری شور مچاتی ہے۔

روپ کماری :- امر سنگھ! خدا کے لئے اب فیر نہ کرنا۔

امر سنگھ :- (گرج کر) بس خاموش رہو۔

یہ کہہ کر ایک فیر اور کرتا ہے۔ گولی مدن کی پیٹھ میں لگتی ہے اور وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اتنے میں پولیس کی لاری جس میں پریم سنگھ۔ اندر سنگھ۔ موہنی۔ بچہ اور پولیس والے ہیں آ پہونچتی ہے۔ اب دونوں طرف سے گولیاں چلتی ہیں۔ آخر سازشی مغلوب ہو جاتے ہیں اور سب گرفتار کر لئے جاتے ہیں۔

روپ کماری ایک مقتول سازشی کی کمر سے چھرا نکال کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوچھا سا زخم لگتا ہے۔ روپ اپنی ناکامیابی دیکھ کر وہی چھرا اپنے سینے میں بھونک لیتی ہے اور گر کر مر جاتی ہے۔

قارئین ساقی! خاتمہ پر اس افسانہ کے معرض تحریر میں آنے کی وجہ بھی سُن لیجئے کہ وہ بھی دلچسپی خالی نہیں بلکہ اس داستان کا ایک حصّہ ہے۔ کپتان پریم سنگھ میرے بہت عزیز دوست ہیں۔ جس روز موہنی دیوی سے اُن کی شادی ہوئی میں نے یہ پوری داستان اپنے ہاتھ سے لکھ کے اور نہایت خوبصورت جلد بندھوا کر "ہدیہ عروسی" کے طور پر اُنکے نذر کی۔ موہنی اور پریم دونوں نے اِس ناچیز ہدیہ کو اُن بہت سے قیمتی تحفوں سے کہیں زیادہ پسند کیا جو شادی کے موقع پر اُن کے دوستوں نے اُنہیں دئے تھے۔

جیسا کہ میں ابتدا میں بیان کر چکا ہوں اس افسانہ کے بعض واقعات کا آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں لیکن میں نے افسانہ کی خاطر اُنہیں باہم مربوط کر دیا ہے۔ تاہم اس داستان کا ایک بہت بڑا حصّہ پریم اور موہنی کے واقعاتِ زندگی پر مبنی ہے۔

پریم پجاری!

فولادی عشق

وائرلس کی ایجاد کے بعد بجلی جو کبھی عضب الٰہی کی ایک لہر تھی قدرت کی مہر ثابت ہو رہی ہے۔ اس کے حیرت انگیز کارناموں سے دنیا اب تک جسقدر واقف ہوئی ہے اس سے کہیں زیادہ معجز نمایہ ثابت ہونے والی ہے۔ ہر انسانی ضرورت اس کی منت مند ہوتی جاتی ہے۔ دم سے لے کر بزم تک اسی کے کرشمے نظر آنے لگے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے لئے ابھی بہت سی چیزیں اس "قہر و مہر" کے پُراسرار خزانہ میں موجود ہیں۔ قدرت کی لامتناہی فضا میں سائنٹفک جد وجہد کا جتنا وسیع میدان اس نے پیش کیا ہے شاید ہی فطرت کی کسی دوسری مخفی طاقت کو نصیب ہوا ہو۔ اس کی سیکڑوں کرامتیں، ہزاروں جادوگریاں ہم دیکھ چکے ہیں، دیکھ رہے ہیں اور خدا معلوم کتنی ابھی دیکھنی باقی ہیں۔

ایکس ریز کے کمالات ہم دیکھ چکے۔ باطن کے سارے راز کھل گئے۔ وائرلس جہاز ہماری نظروں کے سامنے ہیں جن کا آبی سفر ریڈیو کے ذریعے ہوتا ہے۔ ریڈیو طیارے بھی کرہ ہوائی پر اپنا تسلط جمانے کے لئے موجود ہیں نہ کسی ہواباز کی ضرورت ہے نہ پائلٹ کی حاجت۔ آوازوں کا انضباط اور انتشار بھی معمولی بات ہو گیا ہے۔ لندن کی تقریریں دہلی میں سن لیجئے۔ موٹر میں سفر کرتے کرتے دنیا کے واقعات سے باخبر ہو جائیے۔ ٹیلی وژن پر آواز بھی سنئے اور صورت بھی دیکھئے۔ سینما میں بغیر پردے کے تصویریں ناچنے لگی ہیں۔

یہ عجائبات تو تھے ہی۔ اب کچھ دن سے ایک عجیب تر چیز ظہور میں آئی ہے جس کو ریڈیو روبوٹ (Radio Robot) کہتے ہیں۔ یہ مصنوعی انسان ہے جو ریڈیو کے ذریعہ سے سارے کام کرتا ہے۔ چوراہوں پر اس سے رہنمائی کی جاتی ہے۔ ناجائز ہجوموں میں یہ مضبوط سپاہی کا فرض انجام دیتا ہے۔ بنکوں اور پبلک اداروں میں بلوائیوں کا حملہ نہیں ہونے دیتا۔ اسٹیج پر ہاتھوں کے اشارے سے رقص سکھاتا ہے۔ یہ پتلے مختلف شکل و صورت کے ہوتے ہیں۔ جو کام ان سے لینا منظور ہوتا ہے اس لحاظ سے ہاتھ پاؤں سر اور گردن حرکت کرتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں برق لائٹ کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس فولادی پتلے میں کچھ اس قسم کی احساسی قوت رکھی ہے کہ پیر کی آہٹ اور روشنی کی شعاع سے یہ زندہ ہو کر فوراً حرکت میں آ جاتا ہے۔

ایک پروفیسر نے اس میں تکلم اور نشست و برخاست کا خاصہ بھی رکھا ہے۔ مزاج پوچھتا ہے۔ جواب دیتا ہے۔ شکریہ ادا کرتا ہے۔ سگرٹ پیتا ہے۔ دوسرے کا سلگاتا ہے۔ تھیٹر کے ٹکٹ گھر کے پاس کھڑے ہو کر تماشائیوں کی گنتی کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح طب کے ایک ماہر نے ایسا روبوٹ بنایا ہے جو علم تشریح کی تعلیم کے لئے ایک بہترین چیز ہے۔ اس کے اندر تمام انسانی اعضا موجود ہیں اور وہ سب متحرک ہو سکتے ہیں۔ علاج ہی سے یہ تکلیف کا اظہار کرتا ہے۔ امراض کی زحمتوں کا اس پر اثر ہوتا ہے۔ ہنسی کے موقع پر ہنستا ہے اور رونے کی جگہ روتا ہے۔ اس کی آنکھیں بھی بالکل آنکھ کی ساخت پر بنائی گئی ہیں۔ آنکھ بنانے کی مشق ان پر کی جاتی ہے۔

جرمن کے ایک جادوگر نے تو یہ غضب دکھایا ہے کہ اس بجلی کے کھلونے میں جان ڈال دی ہے۔ ستم ظریف نے اس میں جذبات بھی پیدا کرنے چاہے ہیں لیکن پہلے صرف حسن و عشق کے جذبے کی آزمائش کی گئی۔ اور جیسا یہ انسانوں کے لئے ہلاکت آفریں اور تکلیف دہ ہے ویسے ہی ان فولادی دل و گردے والوں کے واسطے بھی ثابت ہوا۔ بنانے کو تو بنانے والے نے یہ طلسمی پتلے بنا ڈالے۔ اور ان کا چہرہ مہرہ۔ خد و خال۔ ہاتھ پاؤں۔ کمر۔ چال ڈھال۔ لب و لہجہ، وہی نزاکتیں اور دلفریبیاں بھی بھر دیں جو اس قسم کے جذبات کے لئے ضروری ہیں۔ مگر جب ہر طرف سے ان کے معاشقہ کی داستانیں، ان کے پریشان کن واقعات سامنے آنے لگے اور پولیس کی بازپرس نے ناک میں دم کر دیا تو یہی ایجاد اس کے درپا عذاب بھی ہو گئی۔ ستہ اپنی گردن

یورپ تنوع پر مرتا ہے۔ وہاں کی جدت پسندی نے اول اول اس طرف کافی توجہ کی۔ سینکڑوں پتلے فروخت ہوئے۔ جس نے نکال کر کے لئے نوجوان حسن کا پتلا خریدا۔ تو کسی نے ایک حسین پتلی اپنی دل لگی کا مشغلہ سمجھ کر خریدی۔ چنانچہ ایک امیر کے لئے مددگار کی ضرورت تھی۔ اور قریب کے مکان میں ایک پتلا۔ دونوں اپنے مالکوں کی فراخ دستیوں کی بدولت پرستان کا ... ہوں کی مدد سے اپنے سر کو دور پھینک دیا۔

سامنا ہو گیا۔ جذبہ محبت رنگ لایا۔ شام ہوئی اور دونوں غائب، رفتہ رفتہ مالکوں کو ان کی عدم موجودگی محسوس ہوئی۔ فہمائش کی گئی۔ مگر بے سود ایک روز اس فولادی پتلی للی کے آقا ہوا کھاتے ہوئے اتفاق سے قریب کے پارک میں نکل گئے۔ پھرتے پھرتے ایک گوشہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی للی اور ان کے پڑوسی نواب کا فولادی خدمت گار ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر انھیں پہلے غصہ آیا۔ پھر تعجب ہوا چند منٹ تک ان کے معاشقہ کی سیر دیکھتے رہے۔ لیکن جب ان کی بے تکلفی ختم ہوتے پر ہی نہیں آئی تو انھوں نے تحکمانہ لہجہ میں پکار کر کہا۔

للی! یہ کیا ہو رہا ہے؟

للی نے پلٹ کر جو دیکھا تو اپنے آقا پر نظر پڑی۔ بغیر کچھ جواب دیئے وہ تیز قدموں سے اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گئی۔ اور وہ فولادی نوجوان منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ گھر پہنچ کر مالک نے اپنے پڑوسی نواب کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ اور ایک خط ان کے موجد ڈاکٹر کو لکھا کہ آپ کے ان پتلوں کا جذبۂ عشق حد سے گزر گیا ہے۔ اس کی تدبیر ہونی چاہیئے۔

ادھر تو للی کی مالک نے للی کو ڈانٹا ڈپٹا اور ادھر اس نواب کی بیگم نے اپنے ڈارلنگ کو ملامت کی اور اس سے وعدہ لیا کہ آئندہ للی کے ساتھ کہیں نہیں جائیگا۔ لیکن گوشت کے بنے ہوئے انسانوں میں جب محبت کے نقش بن کر نہیں مٹ سکتے ہیں تو ان فولادی پتلوں کے یہ جذبات کیونکر فنا ہو سکتے تھے۔ چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اور جب کبھی ان پر سختی کی گئی یہی جواب ملا کہ "ہم مجبور ہیں۔ فولادی زنجیروں نے ہمیں وابستہ کر دیا ہے۔" مجبوراً للی کارخانہ بھیج دی گئی اس درخواست کے ساتھ کہ اس کے دماغ کا وہ خانہ جس میں محبت پرورش پاتی ہے فنا نگ کر دیا جائے۔ کارخانہ جاتے جاتے للی ڈارلنگ سے اشارے کرتی گئی جو اپنی کوٹھی کے برآمدے میں کھڑا ہوا دیدار بازی کا منتظر تھا۔

للی دست بدست دگرے کارخانہ پہنچی۔ تو ڈارلنگ بھی تماشائیوں کی بھیڑ میں موجود تھا۔ ڈاکٹر جب للی کو اپنے خاص کمرے میں لیگیا تو ڈارلنگ نے دروازہ کے شیشوں میں سے جھانکنا شروع کیا۔ ڈاکٹر نے اپنے اوزار درست کرتے ہوئے للی سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"للی! تم نے ہماری ہنرمندی کو بدنام کر دیا۔"

"بدنامی! میں نے تو آپ کے کمال کو چار چاند لگا دیئے۔ ڈاکٹر صاحب!

"پھر تمھارے مالک کو تمھاری شکایت کیوں پیدا ہوئی؟"

"رقابت!"

"رقابت کیسی؟"

"وہ اپنے لئے میری محبت کا طلبگار ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کی ہوس رانیوں کا جواب دوں۔ مگر فولاد میں نرمی کہاں۔ فولادی دل کو متاثر کرنے کے لئے فولادی ہی دل چاہیئے۔"

ڈاکٹر یہ سن کر متحیر ہو گیا۔ وہ اپنی ایجاد پر نازاں تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے پیدا کئے ہوئے احساسات اس درجہ مکمل ہیں۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس اثنا میں للی کی نظر دروازے پر پڑی۔ دیکھا کہ ڈارلنگ کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔ للی بے چین ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ڈاکٹر نے اپنے اوزار سنبھالے للی کے قریب گیا اور اس کے بالوں کے نیچے گدی پر کچھ ٹٹولنے لگا۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ للی رو رہی ہے اس نے پوچھا "للی! تم کیوں رو رہی ہو؟"

للی۔ "اس لئے کہ آپ محبت کو مٹانا چاہتے ہیں۔"

نفرت، وہ محبت جس سے دوسروں کو تکلیف ہو مٹانے کے قابل ہے۔

غم، یہ مٹ گئی تو زندگی میں لطف کیا؟

انجام :- پردیپ ہے۔

کہیتی :- پروفیسر مجیب بی۔ اے

للی ۔ اس طرح کہ میرے ساتھ ایک اور زندگی تباہ ہونے والی ہے ۔
ڈاکٹر ۔ وہ کون ہے ؟
للی ۔ ڈارلنگ !

ڈاکٹر قہقہہ مار کر ہنسا اور یہ کہہ کر "مصنوعی زندگی بھی کتنی محسوسات سے لبریز ہوسکتی ہے" اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ ڈاکٹر نے اس مشین کا اوپر کا حصہ کھول ڈالا۔ دماغ کے کل پُرزوں پر غور کیا ۔ کچھ چھوٹی چھوٹی پلیٹیں تھیں۔ کسی کے نقوش چاقو کی نوک سے کھرچے کسی کے گہرے کئے ۔ کوئی پیچ ڈھیلا کیا۔ کوئی کسا۔ اور پھر اس نے ہر پُرزہ کو اپنی جگہ رکھکر سر کو سر کی جگہ جوڑ دیا۔

للی زندہ ہوگئی اب اس کی نگاہوں میں نہ پہلا سا رسیلا پن تھا نہ اس کے چہرے پر وہ تاثرات قلبی کی علامتیں۔ وہ محض ایک فولادی پتلا تھی۔ ڈاکٹر نے کمرے کے کواڑ کھول دیئے اور کہا "للی جاؤ۔ اپنے مالک کے پاس جاؤ۔ اب تم سے اس کو کوئی شکایت نہ ہوگی"۔

آگے آگے للی تھی اور پیچھے پیچھے ڈارلنگ ۔ راستہ میں کئی مرتبہ ڈارلنگ نے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن للی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس جگہ پہنچ کر جہاں سے دونوں کو الگ ہونا چاہیئے تھا جب ڈارلنگ نے للی کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہا کہ "للی کیا تمہاری محبت میرے لئے ختم ہوگئی ؟ کیا مجھ کو تمہاری طرف سے مایوس ہوجانا چاہیئے ؟" تو وہ ہاتھ جھٹک کر یہ کہتی ہوئی کہ "محبت ! کیسی محبت ! میں اس جذبہ سے بالکل خالی ہوں" روانہ ہوگئی ۔ اور ڈارلنگ حیرت زدہ مایوس کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ایک عجیب تماشہ تھا۔ فولادی پتلے کا دل پانی ہو ہو کر آنکھوں سے بہہ رہا تھا ۔ جسم تھر تھرا رہا تھا اور اس کی ساری مصنوعی دنیا تاریک تھی۔

خدا معلوم کتنی دیر ڈارلنگ اس چوراہے پر کھڑا رہا ۔ آخر ایک سخت گرفت نے اسے چونکا دیا۔ اس نے اپنے مالک کو خفا ہوتے ہوئے دیکھا۔ آقا کی ہر ملامت کا جواب صرف آنسو تھے۔ جب ملامت اور آنسوؤں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تو تنگ آکر ڈارلنگ بولا "میرے آقا ! اب میں آپ کے مطلب کا نہیں رہا۔ مجھکو میرے حال پر چھوڑ دیجئے یا کارخانہ بھیجکر للی کی طرح میرے دماغ کی کل بھی درست کرا لیجئے"! آقا نے ڈارلنگ کو کوئی جواب نہیں دیا اور اس کو ساتھ لے کر اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ بھر ڈارلنگ کی نگرانی کرنی پڑی کیونکہ وہ ہر دس قدم پر رک جاتا تھا اور بچوں کی طرح مچلنے لگتا تھا۔

گھر پہنچکر آقا اور ان کی میم صاحب میں دیر تک مباحثہ رہا۔ صاحب ڈارلنگ کو بھی للی جیسا جذباتِ محبت سے بیگانہ بنانا چاہتے تھے۔ وہ اس کو محض ایک 'بوائے' دیکھنا پسند کرتے تھے۔ لیکن گھر کی مالکہ یہ سادگی چاہتی نہ تھی۔ وہ اس میں حسن و عشق کے تمام کرشمے دیکھنا چاہتی تھی جو فیشن ایبل دنیا کا ایک ضروری جزو ہے ۔ ایسے معاملات میں فتح ہمیشہ صنف نازک کی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے ڈارلنگ کا عشق بدستور کارفرما رہا۔ اور ڈارلنگ ہر طرف سے بے نیاز ہوکر للی اور صرف للی کے خیال میں محو ہوگیا ۔ مالک اور مالکہ میں اس کے متعلق کئی دفعہ شکر رنجی بھی ہوئی ۔ خانہ داری کی زندگی بدمزہ ہوتے ہوتے رہ گئی ۔ مگر نہ ڈارلنگ کا علیحدہ کرنا امکان میں تھا اور نہ ڈاکٹر سے اس کی اصلاح کرانا ۔

ڈارلنگ اس اندرونی کش مکش سے بہت بے چین تھا۔ ادھر للی کی محبت اس کو چیرتی چلی جاتی تھی اور ادھر مالکہ کا تمکمانہ شوق آٹھ پہر اس کی جان نکالے لیتا تھا ۔

دو گونہ رنج و عذاب است جانِ مجنوں را ٭ بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

اس کشاکش کا انجام یہ ہوا کہ ایک دن ڈارلنگ نے اس حرماں نصیب زندگی سے تنگ آکر خودکشی کی ٹھان لی۔ بندوق ریوالور، خنجر یا کوئی زہریلی چیز تو اس فولادی جان کے لئے کچھ موثر نہ تھی ۔ مشین کی موت کے لئے تو مشین کی ترتیب کا انتشار ہی ہونا چاہیئے اور یہ ترکیب وہ ڈاکٹر کے کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ جہاں للی پر دستکاری کی گئی تھی ۔ چنانچہ وہ موقع کا منتظر رہا اور شام کو جب اس کی مالکہ ہوا خوری کو گئی تو یہ بھی چپکے سے نکل گیا اور قریب کے پارک میں ایک سنسان جگہ جا بیٹھا ۔ سورج غروب ہونے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ اپنی گردن کے پیچ ڈھیلے کرنے شروع کئے ۔ جو پیچ کھلتا یہ اُسے دور جا کر پھینک آتا۔ اس طرح دماغ کے کئی ضروری پرزے بھی اس نے نکال کر پھینک دیئے۔ اب اس کے بے جان ہونے میں صرف اتنی کسر تھی کہ سر دھڑ سے الگ کر دیا جاتا جس کے لئے مددگار کی ضرورت تھی ۔ مددگار وہاں کہاں ؟ آخر اس نے کھڑے ہو کر زور سے اپنے بدن کو جنبش دی۔ اور دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنے سر کو دور پھینک دیا۔

سر کا الگ ہونا تھا کہ ایک ہولناک آواز نکلی۔ پانی کا ایک فوارہ سا چھوٹا اور ڈارلنگ کا سارا جسم پُرزے پُرزے ہوگیا۔

صبح کو پولیس اسٹیشن پر ہزاروں تماشائیوں کا اجتماع تھا۔ بیسیوں فولادی پُرزے بکھرے پڑے تھے۔ "فولادی پتلے کی خودکشی" کے عنوان سے اخباروں میں خبریں شائع ہو رہی تھیں اور خفیہ پولیس اس خودکشی کی تفتیش کے لئے سرگرم کار تھی۔ محکمۂ سراغرسانی میں یہ ایک نئی چیز تھی اس لئے ہر شخص دلچسپی لے رہا تھا۔

اشرف صبوحی (منشی فاضل)

"پروین!"

بہت ممکن تھا میں رازِ محبت فاش کر دیتا
مگر دُنیائے شعر و نغمہ کا خوابِ حسیں "پروین!"

ترے دلکش تکلم کی حسیں خاموشیاں آئیں   حسیں خاموشیوں کے بعد نغمہ کوشیاں آئیں
یہ نغمہ کوشیاں گذریں تو پھر بیہوشیاں آئیں

نہ کر سکتا میں اظہار ——— گو کئی پہلو میں دل ہوتے
"ندامت" نے مری دیکھے ——— عزائم مضمحل ہوتے
جو دل میں ہے وہ تجھ پر ہی عیاں اے کاش کر دیتا

× × × × × × × ×

بہت ممکن تھا رازِ عشق طشت از بام ہو جاتا
مگر حسن و لطافت کا ہجوم مرمریں "پروین!"

تری پُرکیف نظروں کی سرور افشانیاں آئیں   تری معصوم باتوں کی جنوں سامانیاں آئیں
ترے جوشِ جوانی کی حسیں طغیانیاں آئیں

نہ ہو سکتا یہ ظاہر ——— گو کئی پہلو میں دل ہوتے
مرے جذبات نے دیکھے ——— عزائم مضمحل ہوتے
یہ حسرت ہی رہی اے کاش میں "بدنام" ہو جاتا

ابن نیازی

ایک خط

ایک دن صبح ہی صبح اختر میرے ہاں آئے۔ کہنے لگے چلو عثمان ساگر چلیں۔ عثمان ساگر دکن دیس کا ایک خوبصورت تالاب ہے۔ تالاب کیا ہے! سخی کا دل ہے کہ خود بھی شاداب ہے، دوسروں کو بھی شادکام کرتا ہے۔ ابھی شہر میں چہل پہل نہ ہوئی تھی۔ زندگی کچھ سوتی کچھ جاگتی تھی۔ کہیں سڑکوں پر ایک دو رہرو نظر آجاتے۔ کبھی سَن سے کوئی موٹر گزر جاتا۔ اس وقت اختر موج (موڈ) میں تھے۔ یہ موج میں ہوں تو احباب ان کے ساتھ ساتھ بہے پھرتے ہیں۔ میں بھی ساتھ ہو گیا۔ موٹر نے ہنکارا بھرا۔ ایک نرم ہچکولے سے چلا۔ پھر یہ جا، وہ جا۔ بات کی بات میں عثمان ساگر جا پہونچے۔ شہر سے اس تالاب تک صبح کی تازگی اس طرح مربوط تھی۔ جیسے کنول تہِ آب سے ابھر کے سطح آب پر کھل جاتے ہیں۔ یہاں پارک کے ایک گلپوش حصے میں لبِ آب ہو بیٹھے۔ ہلکا ہلکا ابر چھایا تھا۔ تالاب کا پانی جھولا جھول رہا تھا۔ بڑی ہی پیاری صبح تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھینی فضا، ٹھنڈی ہوا، دھیمی روشنی آج ہم سے محبت کر رہی ہے! یہیں اختر نے اپنے یورپ جانے کا بھی ذکر چھیڑا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ پرند قفس سے سیرِ چمن کو جاتا تھا! جتنی دیر ہم وہاں بیٹھے رہے، جتنے رومانی سانس لئے، اب تک چھیتے سے نہیں اترے۔ اختر کو ولایت جا کر برس بھر سے اوپر ہو گیا۔ آج بھی جب کبھی جدائی کا خیال آتا ہے وہی منظر آنکھوں کے سامنے کھل جاتا ہے۔ اور جیسا کہ ایک منچلے نے کبھی کہا ہے، اپنا دل بھی بے اختیار کہنے لگتا ہے کہ جدائی ایک ہیر اتپار کرتی ہے جس کا نام یادِ دوست ہے!۔

اِسی پردیسی دوست کے ایک خط سے آپ کی ادبی ضیافت کرنی ہے۔ یہ امانت میں خیانت کی صورت ضرور ہے کہ ایک ذاتی چیز منظرِ عام پر آرہی ہے۔ مگر میں اس خیال سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتا کہ اس خط کی داد نہ دینا بلکہ داد نہ دلوانا بھی بدتوفیقی ہے!

لندن
جنوری ۱۹۳۸ء

ڈیر......!

یہ بھی کوئی انسانیت ہے۔ میں برابر خط لکھے جاؤں، آپ یا تو جواب نہ دیں، یا دیں تو دو حرفی۔ گویا دلوں میں تو باتیں ہوں، اِن بھی اڑان گھائی کہ دل بھی نہ بھرے، سوچتا تھا اب کے میں بھی نہ لکھوں گا۔ مگر ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ لکھنا ہی پڑا۔ اچھا سنئے، مگر حواس جمع کیجئے۔ جگر بھی تھام لیجئے، مجھے یاد پڑتا ہے، پہلے خطوں میں میں نے پکے ڈلی سرکس کا کچھ حال لکھا ہے۔ پھر سُن لیجئے کہ بڑے مجمع کا مقام ہے۔ یہاں ایک زمین دوز اسٹیشن ہے۔ جس سے اوپر آنے کے کئی راستے ہیں ہر راستہ ایک علیحدہ سڑک پر نکلتا ہے۔ اِن راستوں کے بیچوں بیچ جو جگہ چھوٹی ہوئی ہے، اسی کے نیچے اسٹیشن ہے۔ اور اوپر کا حصہ سرکس کہلاتا ہے، یہاں سرِ راہ بیسیوں کامنی صورتیں مل جایا کرتی ہیں۔ جیسے کسی کے انتظار میں ہوں۔ آپ اُن کے پاس سے گزرے، انہوں نے تبسم فرمایا، جی چاہے تو آپ بھی ہنس دیجئے۔ چلئے دوستانہ ہو گیا! کیوں نہ ہو، یورپ متمدن اور آزاد ملک ہے۔ یہاں عورت کے مرد سے زیادہ حقوق ہیں۔ مگر یہ بات ہندوستان میں بیٹھکر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ مشاہدے کی چیز ہے! تو ہاں پرسوں کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر نیاز اور فہیم کرسمس کی چھٹیاں منانے ہمارے پاس آئے ہیں۔ یہاں کرسمس کا کیا پوچھنا۔ دس پندرہ دن پہلے سے بازاروں میں گہما گہمی ہونے لگتی ہے۔ گویا ہمارے ہاں عید کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ خرید و فروخت بڑھ جاتی ہے۔ دکان مکان سجتے ہیں۔ چوطرف خوشی خرمی چھا جاتی ہے۔ مگر مزے کی سیر یہ ہے

کہ عین کرسمس کے دن بازاروں میں بالکل سناٹا ہو جاتا ہے۔ سب اپنے اپنے گھروں میں جشن مناتے ہیں۔ یہ بھی عجب سیر ہوتی ہے۔ لیکن سالِ نو جیسے نور وز کہیئے بڑی بہار کا دن ہوتا ہے۔ اسی طرح اکتیس دسمبر کی رات میں کچے ڈلی سرکس خصوصیت سے دُلہن بن جاتا ہے۔ اچھی اچھی صورتیں، اچھی اچھی پوششیں، جدھر دیکھو آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ جوں جوں رات بڑھتی ہے، دل کی خوشیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ادھر رات کے بارہ بجنے کو ہوئے اُدھر سب کی نظریں گھڑیوں پر جم گئیں۔ بارہ بجنے لگے تو سب خاموش ہو گئے۔ بارہ بج چکے تو سالِ نو کی مُبارک سلامت ہونے لگی۔ اک دُھوم مچ گئی۔ مصافحے ہوئے، معانقے ہوئے، آرزوئے شباب کے نقشے کھنچ گئے! خیر ہم سب یار دوست مل کے نکلے۔ رات کا کھانا کوہِ نور رسٹران میں کھایا کرتے ہیں۔ بعد میں سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ دوستوں میں ایک صاحب ہیں، ان کی ذرا اور قسم کی طبیعت ہے، اس لئے ہم انہیں علیشی کہا کرتے ہیں۔ اتفاق سے آج وہ بھی ساتھ ہیں۔ ان کی سنگت سے اس وقت ہمیں بھی اپنے آپ یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ تو بڑا غضب ہے کہ سینما میں جتنے آئیں، سب کے ساتھ کوئی ہو۔ اور ہم ہجوم میں تنہا رہیں! کچھ ہو آج تو تنہا نہ جائیں گے۔ یہ کہتے ہوئے رسٹراں گئے۔ کچھ کھایا پیا۔ اور ٹرین میں بیٹھکر ہنڈن سنٹرل اسٹیشن پہونچے۔ وہاں اترے۔ باہر آئے تو دیکھا کہ بلوریں دروازوں کی جھوت میں ایک لڑکی نیچی نظروں چُپ چاپ کھڑی ہے۔ علیشی دوستانہ کرنے میں جرأت کے آدمی بن گئے ہیں۔ مگر پھر ہندوستانی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ پُشت ہا پُشت سے جو چیز لحاظ بنکر خون میں رچ گئی ہو اس کا سال دو سال میں نکل جانا آسان نہیں۔ اس لئے سُنا ہے، جرأت کرتے ہیں، مگر نیا دوستانہ کرنے میں بیشتر جھجک بھی جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لڑکیوں کو مخاطب کرنے میں انہیں پسپائی ہوئی۔ پھر بھی اس لڑکی کو دیکھکر سوائے علیشی کے بھلا کون تھا جسے بھیجتے۔ ہم ان سے زیادہ ہندوستانی ہیں! لیکن ڈاکٹر کو مذاق سُوجھا۔ فرمایا، ان کو بھیجتے ہو؟ علیشی نے ڈاکٹر کو لغور دیکھا، کیوں؟ ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ نہیں کوئی بات نہیں۔ مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ آپ خیر سے باتیں بہت بناتے ہیں! یہ سُنکر سب نے قہقہہ لگایا۔ اور علیشی آسانی سے بن گئے مگر پھر کچھ سنبھل کر کہا۔ برادر، تم زاہد خشک! تم صابن کا بھاؤ کیا جانو؟! اس پر ڈاکٹر نے مُسکرا کر کہا۔ صابن کا بھاؤ تو آپ جانیں! میں تو یہ جانتا ہوں کہ ابھی سے آپ کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ چہرے پر ہوائیاں سی چھوٹ رہی ہیں! اس پر سب ہنسنے لگے اور علیشی نے مزاحاً کہا۔ اچھا صاحب! تو پھر تم ہی یہ ثواب کما دو! جب اوروں نے بھی علیشی کی ہاں میں ہاں ملائی تو ڈاکٹر راضی ہو گئے۔ کہا اچھی بات ہے، تم سب کی یہی خوشی ہے تو یہی سہی۔

ڈاکٹر کی اس بات پر سب کو حیرت ضرور ہوئی۔ یہ بڑے مضبوط کردار کے انسان ہیں۔ کبھی اس قسم کی باتوں میں نہیں پڑتے۔ مگر صرف یہ دیکھکر کہ احباب لُطف کے خواہاں ہیں، چلے گئے۔ اور ایک دو منٹ میں اُسی لڑکی کو ساتھ لے آئے۔ بھئی، لڑکی کیا تھی۔ گوہرِ شب چراغ تھی! میانہ قد، گداز جسم، بھولی بھالی۔ بُشرے پر صحت کا اُجالا۔ سانس میں نکہتِ شباب!! ڈاکٹر نے پیر طریقت بنکر ہم سب سے تعارف کرایا۔ پھر سب ملکر سینما چلے گئے۔ سینما کا نام امپے سیڈر ہے۔ یہاں کے متوسط سینماؤں میں ہے۔ ٹکٹ لئے۔ اندر گئے۔ اندر جاتے ہوئے ایک بڑے نفیس قالین پر سے گزرتے ہیں۔ گیٹ پر سے ایک سُندری ساتھ ہو گئی تھی۔ جس نے رہبری کرکے آرام سے بٹھا دیا۔ ہال میں سبز دھیمی روشنی تھی۔ اور بڑے تال میل کے ساتھ ایک سُریلا نغمہ بج رہا تھا۔ یہاں کی ساری نشستیں گلنار مخمل کی ہیں اور بڑی خوبصورت بنی ہوئی ہیں۔ ان کے درمیان نوخیز حُسن کی دُلاریاں کوئی سیاہ، کوئی گلنار لباس زیبِ تن کئے، سفید سفید تاج نما ٹوپیاں پہنے پھرا کرتی ہیں۔ اُفقی سینے پر پیاری پیاری کشتیاں آویزاں۔ جن میں مختلف قسم کے چاک لیٹ۔ اور یہ

حوران ارضی اِدھر اُدھر خاموش ٹہلتی رہتی ہیں۔ منشاء یہ کہ بلائیے۔ دل معطر اور منہ میٹھا کیجئے! تھوڑی دیر میں کھیل شروع ہوا۔ اس میں پیار کا رنگ غالب تھا۔ اِدھر بھی اخلاص بڑھنے لگا۔ کھیل ختم ہوا تو سب گولڈرز گرین گئے۔ وہاں ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا۔ لڑکی بے تکلفی سے ہنس بول رہی تھی۔ مگر اس بے تکلفی میں بھی غیور اور بلند فطرت رہی۔ باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم ہوا کہ پارک شائر کی رہنے والی ہے۔ آئلین ایلس نام ہے۔ ڈاکٹری کی تعلیم پا چکی ہے، لندن تلاشِ روزگار میں آئی اور تین ہفتے سے یہاں ٹھیری ہوئی ہے۔ اسپورٹس کی بہت شائق ہے۔ نہایت خوشدل ہے۔ کھانا کھانے کے بعد ہمارے ساتھ گھر بھی آئی۔ ہم نے موٹر بس میں چلنے کے لئے کہا تو کہا۔ مجھے چہل قدمی اچھی معلوم ہوتی ہے، یہ کہہ کر ہمارے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اور قدم ملا کر چلنے لگی۔ دیکھئے! ہمیں بُرا بھلا نہ کہئے گا۔ یہ ہندوستان نہیں، یورپ ہے، آزاد سرزمین، یہاں یہ عیب نہیں۔ سارے رستے مزیدار باتیں ہوتی رہیں۔ ایک طرف مستقل طور پر علیشی تھے، ایک طرف کبھی ہم اور ڈاکٹر اور معصوم فہیم ہوجاتے تھے! اس وقت بڑی خوش وقتی سے کہنے لگی۔ کاش میرے کئی ہاتھ ہوتے۔ الغرض گھر پہونچے۔ ہم تو تھوڑی دیر ہنس بول کر کھسک گئے۔ علیشی اس سے باتیں کرتے ہوئے بیٹھے رہے۔ بعد میں جو کچھ پیش آیا، اُسے انہیں کی زبانی لکھتا ہوں۔ قسم کھا کر کہتے تھے، تم لوگ چلے گئے۔ ہم دونوں اکیلے ہوئے تو فتنہ نگاہی بڑھنے لگی۔ طرفین میں سرخوشی کی ایک موج آگئی۔ اور اس لڑکی کی ہر بات امرت کا گھونٹ بن گئی۔ زندگی کو ایک نیند سی آئی۔ کانوں میں دل کی دھیمی صدا اس طرح چلی آتی تھی جیسے ہلکی نیند میں پانی برسنے کی آواز آتی ہو۔ اسی نیند میں اُٹھا۔

پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے!

اور آگے بڑھ کے اُس سے کچھ کہا۔ نندا سی وہ بھی تھی۔ جواب میں دبی زبان سے صرف میرا نام لیا۔ علیشی! گویا دھیمے سُروں ساز طرب چھیڑا۔ نغمۂ حیات بجنے لگا۔ پھر مجھے پُرنم آنکھوں سے بغور دیکھا۔ جن میں جوانی تھی۔ حیا تھی۔ مگر حسرت بھی برستی تھی۔! بعد میں نظریں نیچی کر لد [illegible] ئی۔ میری زبان سے بھی نکلا۔ الس! جس سے شادمانی کی ایک ہلکی لہر اُسکے رخساروں پر دوڑ گئی۔ اور [illegible] ہوگے، موج کی زندگی کیا ہے؟ ساحل سے ٹکرانا! ساحل آغوش میں لے لے تو وہ فنا ہوجاتی ہے!۔ اس و [illegible] رہا تھا۔ دل باغی ہوگیا تھا۔ میں نے اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی، اور اپنے کہے پر زور دیا۔ جواب میں اُسنے دو جملے [illegible] ٹھیرو۔ مجھے اتنا بتا دو! دُنیا کے ایک ہاتھ میں بھلائی اور ایک میں بُرائی ہے، کیا تم بُرائی مول لوگے؟!۔ اختر! ان [illegible] ملے الفاظ میں کیا قوت تھی، کیا جادو تھا۔ معلوم ہوا کہ مجھے کسی نے جبراً اندھیرے سے اُجالے میں کھینچ لیا۔ میرے دل کا بوجھ [illegible] میری روح مجھے واپس مل گئی! ششدر ہوکر میں اُس دیبی کا منہ تک رہا تھا۔ وہ نیچی نظروں خاموش کھڑی تھی۔ مگر میں [illegible] دل میں محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے راز و نیاز کا اس وقت ساری کائنات طواف کر رہی ہے! میں دو قدم اس کے پیچھے ہٹ کر [illegible] بیٹھ گیا۔ وہ اس خیال سے کہ مبادا مجھے اس کے کہے کا ملال ہوا ہو مسکراتے ہوئے آہستہ قدم آگے بڑھی اور میرے پاس ہی صوفے [illegible] بیٹھ کر اس طرح باتیں کرنے لگی گویا بہن بھائی کو بُرائی بھلائی سمجھاتی ہو۔ میں نے پشیمانی کے ساتھ معافی چاہی تو کہا نہیں، کیا مضائقہ ہے۔ وہ تو تقاضائے بشریت تھا۔ کمرے سے باہر آئی تو اُس کے چہرے پر شکن تک نہ تھا۔ بڑی خندہ پیشانی سے کل پھر ملنے کا وعدہ کیا۔ اور شب بخیر کہکر چلی گئی۔ مگر مشفق! سچ کہتا ہوں میری زندگی کی تو رَو بدل گئی!۔

دوسرے دن علیشی تو نوٹنگھم چلے گئے میں اور ڈاکٹر اس سے گولڈرز گرین اسٹیشن ملے۔ اُسی خندہ پیشانی اور مہربانی

سے پیش آئی۔ بعد میں سینما گئے۔ وہاں ڈاکٹر نے پوچھا "آنس! تعجب ہے تم کل ہم اجنبیوں کے ساتھ چلنے پر برملا راضی ہوگئیں؟ کہا۔ تم نے کچھ ایسی مہربانی سے مدعو کیا تھا کہ مجھے انکار کا یارا نہ رہا۔ اسکے بعد علیشی کا رات والا قصہ چھڑا۔ ہم نے کہا کہ وہ آپ سے بہت نادم ہیں۔ تو ہنسنے لگی اور کہا: بات یہ ہے انہیں غلط فہمی ہوئی۔ انہوں نے مجھے بھی یہاں کی اور لڑکیوں جیسا سمجھا۔ مگر نہ میں خود ناشائستہ تھی، نہ انہیں بننے دیتی! ارے میاں! شیپ کا بند تو یہ ہے۔ ڈاکٹر نے پوچھا، کیوں آنس! تم بلا کھٹکے کل ہمارے ساتھ چلی آئیں۔ تمہیں یہ خیال بھی نہ گزرا کہ ہم لوگ "کالا آدمی" کہلاتے ہیں! یہ سنکر خوب ہنسی اور کہا۔ ڈاکٹر! کیسی باتیں کرتے ہو۔ کیوں جی یہ تو بتاؤ خدا کا بھی کوئی رنگ ہے؟!! مختصر یہ کہ بھئی لڑکی کیا ہے آفت جان ہے! خوبصورت، خوب سیرت، بتلایئے "ایمان" جانے کے لئے کچھ باقی رہا! اس لئے سینما سے لوٹے گھر پہونچا کہ ہم تو ایسے بگٹٹ چلے کہ مُڑ کر بھی نہ دیکھا اور اپنے ٹھکانے آکر ہی دم لیا۔ رات میں دو گھنٹے تک ان واقعات پر غور ہوتا رہا۔ آخر اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اب بھول کر بھی اس سے نہیں ملیں گے۔ یار کہو گے تو سہی کہ بڑے بے حسے ہو، مگر کیا کریں، آنس سی لڑکی، یورپ سا مقام، ہم سے بے زبان، یقین مانو ان عناصر کے سنجوگ پر بھک سے اڑجانے والا مادّہ ہی پیدا ہوتا!!

وزیر حسن دہلوی

"سراپے"

کل شام ٹہلتا ہوا اک راہ سے گذرا
کرتا ہوا دنیائے تخیل کے نظارے

وہ دن کا سیاہی سے بدلتا ہوا نقشہ
جیسے کوئی گیسوئے پریشاں نہ سنوارے

اس تیرگیٔ شام کے پردے میں اُفق سے
رہ رہ کے فضا میں کوئی کرتا تھا اشارے

تھی نبض کی جنبش جو سرود آفریں مجھکو
بہتے نظر آئے مجھے نغمات کے دھارے

اک برق سی نظروں میں مری کوندرہی تھی
انفاس میں جذبات سے رقصاں تھے شرارے

ہر نقشِ قدم راہ کا تھا ماہِ منوّر
تھے خاک کے ذرات دمکتے ہوئے تارے

اس درجہ فضا نور سے لبریز تھی، گویا
پانی سے چھلکتے ہوئے کوثر کے کنارے

ناگاہ مرے پاس سے اک شوخ ستمگر
قشقہ بہ جبیں، گیسوئے شب رنگ سنوارے

ہر گام پہ اک حشر اٹھاتا ہوا گذرا
کرتا ملک الموت کو نظروں سے اشارے

اک تیر ہوا آکے مرے دل میں ترازو
بھرتا ہوا خاموش فضاؤں میں طرارے

مظلوم نگاہی نے مری دادِ طلب کی
آیا رخِ رنگیں پہ عرق شرم کے مارے

"بلبل ہمہ تن خوں شدہ و گل ہمہ تن چاک
اے وائے بہارِ اگر اینست بہارے"

تابش دہلوی

بلّی بچّہ

گھر میں ایک شربتی نام کی لڑکی تھی۔ پیچھے سے وہ موٹی ہوگئی، چار بچوں کی ماں بنی اور چل بسی۔ سُنتے ہیں بڑی ہو کر اپنے تیز مزاج کے لئے سرنام تھی۔ سُنتے ہیں، مجھے اس لئے کہنا ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ میری لڑکی تھی پر میرے سامنے تو اس کے مزاج کی تُرشی ظاہر ہوتے ہوئے میں نے نہیں پائی۔ ہاں بدن کی بھاری، طبیعت میں اور عادت میں آرام پسند وہ پیچھے سے ضرور ہوگئی۔

میں تب کی بات کہتا ہوں جب شربتی بہت چھوٹی تھی۔ کوئی تین برس کی ہوگی۔ اُس وقت وہ بہت دُبلی پتلی تھی، توتلی بولتی تھی اور مجھے اس کی بڑی میٹھی لگتی تھی۔ لڑکیوں میں چھٹپن سے کچھ ماں پن ہوتا ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی جس کا نام بجّی بھی تھی اور وجے کمار بھی تھا اس کو وہ بہت پیار کرتی تھی۔ پیسہ ملتا تو سینت کر اپنے بجّو کے لئے رکھ لیتی۔ مٹھائی ملتی تو بھی خود نہ کھا کر اُسی کیلئے الگ دھر چھوڑتی۔ کئی بار دیکھا گیا کہ طاق کی جس گولک میں من مار کر وہ جن پیسوں کو جمع کرتی رہی ہے اُن میں سے زیادہ تر کبھی کبھی غائب بھی ہوگئے ہیں۔ اور مٹھائی اُس کے بھنڈار میں کچھ بچی بھی ہے تو وہ سُوکھ ساکھ کر نکمی ہوگئی ہے۔ لیکن ان باتوں سے سبق لیکر شربتی اپنے چلن کو نہیں بدلتی تھی۔ پیسے ملتے تو پھر وہیں بٹور رکھتی اور اپنے حصے کے کھیل کھلونے یا میوہ مٹھائی بھی اسی طرح بجّو کے لئے جمع کر چھوڑتی۔

اِدھر بجّو اصلی بجّو سے کم نہ تھا۔ بڑا اودھمی لڑکا تھا۔ شروع ہی سے جیسے وہ نواب صاحب ہے شربتی کا سب پیار لیتا ہے۔ اور بدلے میں اُسے خوب مارتا ہے۔ وہ کاٹتا ہے نوچتا ہے اور بہن کو خوب رلاتا ہے۔ بڑی بہن ہونے کا ذرا لحاظ نہیں کرتا۔ شربتی بچاری خوب روتی ہے، روتی روتی اماں کے پاس جا کر شکایت کرتی ہے۔

اور کچھ دیر بیتتی نہیں کہ وہی شربتی آکر کہنے لگتی ہے: "بجّی لے، بلفی نہیں لے گا؟"

بجّو کلکاری بھر کر لپکتا ہے اور برفی مُنہ میں رکھ کر شربتی کا چہرہ نوچنے لگتا ہے۔ جس پر شربتی کہتی ہے: "ہٹ بدمعاش۔ بدمعاش بھلا کیوں ہٹنے والا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں کے پنجوں سے اس کا ایسا مُنہ کھسوٹتا ہے کہ شربتی چلّا پڑتی ہے: "دیکھ لے ری اماں، تو پھر مجھے کہے گی!"

پیڑے پر بیٹھی اماں کہتی ہے: "اور کھِلا برفی۔ تجھے یہ بُرا نہال کر رکھیگا جو تو اِسے برفی کھِلاتی مانتی نہیں۔"

اُسکے چار مہینے بعد مہاشہ وجے کمار جلد سے انہیں بلانے چیچک ماتا آگئیں اور وہ بچائے نہ بچے۔ پہلے تو خوب بڑے بڑے ماتا کے دانے سارے بدن پر ہوگئے۔ بدن پر کہیں تِل رکھنے کو ٹھور نہ بچا۔ جیب جروہی پھپولے اُٹھ آئے اور تالو پر بھی، پلک کے اوپر بھی دانے تھے۔ ویسے ہی پلک کے نیچے۔ چھ روز تک ہوتے اُوپر تین تین چار چار ڈگری بخار رہا۔ آنکھیں بند ہوگئیں اور انکے اُوپر موٹے موٹے پھپولے سے اُٹھ آئے۔ بیچارے وجے کمار کو ایک پل چین نہ ملی۔ وہ نہ اس کروٹ سو پاتے نہ اُس کروٹ۔ جدھر ہوئے اُدھر ہی جیسے شریر میں بند ہوکے کانٹے اور گہرے بندھ جاتے تھے۔ کل کسی طرح نہ تھی۔ کُنمُناتے میں سُر رہتا تب تک وجے بابو چیاتے رہتے۔ دم نہ رہا تب بے دم ہو رہتے تھے۔ چیچک کے دانوں سے وجے بابو کا کنول سا سندر مُنہ ایسا ہوگیا تھا کہ ڈر لگتا تھا۔ آنکھیں اُس میں نذارد تھیں۔ چہرے پر اُٹھی ہوئی ناک شناخت نہ ہو پاتی تھی۔ اور مُنہ کی بات پوچھئے نہیں۔ اس حالت میں اُن کے پیٹ میں نہ کچھ کھانا پہونچتا نہ کوئی پینے کی چیز۔ کچھ ٹھنڈے پانی کی بوندیں جو مانتے اندازاً پہچان کر اُس کے مُنہ کے ہونٹوں کے بیچ میں چوآدی جاتیں وہ پانی

وجے بابو کو مانو بیحد ٹھنڈک اور تسکین پہونچ آتا۔ وجے بابو گویا تب مسکرانا چاہتے۔ اس مسکراہٹ کو دیکھکر آنسو روکنا مشکل ہو جاتا۔ منہ ایسا ڈراونا پھر بھی ایسا پیارا لگتا تھا کہ ــــ

خیر وہ دوسری کہانی ہے۔ سات آٹھ روز اپنی ماں کی گود میں پڑے رہکر ان کی اور ماتا سیتلا کی چھینا جھپٹی میں وجے بابو نے ایک ہفتہ تو نکالا۔ اس ہفتے کے بعد بابو یہاں سے لنگر توڑ خدا جانے کہاں کیلئے چل پڑے۔ ڈاکٹر بھی رہ گئے، ان کی اماں بھی رہ گئیں، ہم بھی رہ گئے۔ ان دو ہی رہ جانے والوں میں شربتی کا نام ایکا ایک نہیں آتا۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنی کسی گنتی کے لائق نہیں تھی۔ لیکن وجے کے چل دینے پر وہ تو جیسے ایک ہی دن میں چالیس برس کی ہو گئی۔ اس کا بچپن غائب ہو گیا۔ اس کے متعلق اگر نے نہ کچھ پوچھا نہ پاچھا۔ وہ بالکل نہیں روئی۔ جب کھانا دیا کھا لیا اور کام کہا کام کر لیا۔ اور اس کا ہنسنا اڑ گیا تھا۔ نہ اب وہ مچلتی تھی نہ شکایت کرتی تھی۔

میں نے کہا: "بیٹا شربت!"

اس کے منہ پر سنکر کوئی سرخی نہیں آئی۔ مانو اسے کچھ چیت نہ ہو۔ وہ میرے پاس آگئی اور آکر کھڑی ہو گئی۔ گویا کہہ رہی ہو۔ "بابو جی مجھے گود میں لینا چاہتے ہو تو لیلو۔ میں کھڑی ہوں، میں سامنے ہوں تو!"

میں نے اسے گود میں کھینچکر کہا: "بیٹا شربت!" ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر کہا: "بیٹا سرد کیا بات ہے!؟"

اس وقت وہ رو پڑتی تو میرا جی کچھ ہلکا ہوتا۔ وہ نہ روئی نہ کچھ بولی۔ میں نے گود میں نزدیک کھینچکر اسے چوما پچکارا۔ میں نے کہا: "بیٹا، تجھے تجھے یاد آتا ہے۔ وہ تو چلا گیا بیٹا!"

میرا دل یہ کہتے کہتے خود بھر آتا۔ یہ بات منہ سے نکالنے کی ہمت میں نے جان بوجھکر کی تھی کہ جس سے لڑکی روئے تو، لیکن وہ لفظ مجھے بھی بھر لائے۔ میں نے دیکھا کہ وہ لفظ شربتی کے بھیتر تک بھی گئے ہیں۔ امید ہوئی کہ شربتی ابھی سبک اٹھے گی۔ مجھے اس کے چہرے پر دکھائی دیا گویا اس کے اندر کی جمی ہوئی تکلیف چھڑ گئی ہے۔ وہاں جیسے اس کے درد کو متھا جا رہا ہے۔ گویا کنارے توڑ کر وہ درد اب ضرور بہہ پڑیگا۔ لیکن کنارے آ آکر بھی آنسو کنارہ لانگ کر نہیں آئے، وہ نہیں روئی۔

اس کی ماں اس بات پر ڈر سے بھر گئی۔ شربتی کو ایک ساتھ ایسی عقلمند ہو جاتے دیکھ کر اس کی ماں بیحد بے بس اور لاچار اپنے کو محسوس کرنے لگی۔ شربتی کا من نہیں بہلا، نہیں بھٹکا، اور وہ خالی بھی نہیں ہوئی۔ وہ ایسی بھری رہی کہ کنارہ توڑ کر بہنے کی ضرورت ہی گویا اسے نہ ہو۔ اس کی ماں نے بیچارگی کے لہجے میں مجھ سے بار بار کہا: "ارے کیا وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔ تم بتاؤ نا میں کیا کروں؟"

لیکن میں کیا بتلاتا۔

تین روز کھینچکر چوتھے دن شربتی کھاٹ پر گر گئی۔ اسے بخار ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے بخار بہت تیز ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو جاتی اور بڑبڑانے لگتی۔ اس کی ماں کی فکر کا ٹھکانا نہ تھا۔ ڈاکٹر بھی آئے حکیم اور وید بھی آئے پر بچی کی بیکلی کم ہونے میں نہ آئی بیہوشی سویرے کے گھنٹوں میں کچھ اترتی۔ اس وقت گم سم شربتی کمرے کی چھت کی طرف دیکھتی یا دیوار کو دیکھتی۔ تب وہ اپنی ماں کو بھی پہچانتی تھی مجھے بھی پہچانتی تھی پر ہمارے لئے مانو اسے کچھ کہنا نہ تھا، ہمیں سونی آنکھوں سے دیکھتی اور اسی طرح نگاہ لوٹا لیکر انہیں آنکھوں سے وہ دیوار کی طرف دیکھنے لگتی۔

میں پکارتا: "بیٹا شربت!"

ماں پکارتی: "او ستو، او میری بیٹا رانی، او میرے بیٹے راجہ!"

شربتی سنکر چونکتی اور آنکھیں پھیلا کر ہمیں دیکھتی رہتی۔

وہ بہت دبلی ہو گئی تھی۔ تن میں سینکھ سی ہڈیاں باقی تھیں، اس وقت جب کبھی سوتے سوتے وہ مسکراتی تھی تب دیکھ کر من

ایک مسرت کے ساتھ بڑے درد اور ڈر سے بکھر جاتا تھا۔ لیکن نیند اُسے بہت کم آتی تھی۔ اتنی کل ہی اُسے کب پڑتی تھی کہ اُسے نیند آئے۔ نیند آتی تو اُسے بیہوشی کی نیند کہنا چاہیئے۔ اس بے ہوشی میں بڑبڑاہٹ جاری رہتی جو اس میں سے مانو بچی بچائی جان کو کھینچکر باہر پھینک رہی تھی۔

ایسے ہی دبدھا میں سات روز بیتے۔ اُس کی ماں سب سُدھ بسار کر سب کال اسی کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔ بچی کی پلکیں ذرا دیر کو لگ جاتیں تب ہی اُس کی کھٹولے کی پٹی کو چھوڑتی تھی۔

بڑے دھیمے تھپکی دے کر مُنّی کی ماں نیند کی پری کو مانو مُنّی کی پلکوں پر بلاتی اور جب وہ نیند کی پری ان پلکوں پر چُپ ہو کر سو جاتی تب ہی وہ ماں ہلکے ہلکے پاؤں دھرتی ہوئی وہاں سے کہیں جاتی۔

بچی کی حالت گرتی ہی گئی۔ جینے کی چاہ ہی جیسے بھیڑ سے دھیمی ہوتی جارہی تھی۔ ڈاکٹر ہارنے لگے اور حکیم وید دں کی سمجھ میں بھی کچھ بات ٹھیک نہ بیٹھی۔ بس بچی کی اماں کا جی ہی کچھ اس بارے میں پکا تھا کہ میں منّی کو نہ جانے دونگی۔

بخار تو ٹوٹ گیا تھا پر بدن چھیجتا ہی چلا جاتا تھا۔ غذا کوئی انگ نہ لگتی تھی۔ مانو اب تو وہ اپنی ماں کی دُعاؤں اور اُسکے ارادے کی پختگی کے بل پر ہی جی رہی تھی۔

ایک روز سنرتی کی آنکھ چھبیس گھنٹے کے بعد کہیں جاکر لگی۔ اُس وقت ماں ذرا اُسے چھوڑ کر وہاں سے اُٹھی پر اس بیچ وہ ادھر چوکنی بھی تھی۔ کوئی آہٹ ہو کہ وہ جھٹ بچی کے پاس دوڑ آئیگی۔ وہ ابھی گئی ہی تھی کہ اُس طرف سے کسی کے باریک چچیانے کی آواز اُس نے سُنی۔ وہ بھاگی گئی کہ دیکھتی ہے کہیں سے منّی کے کھٹولے پر ننھا سا بلّی کا بچہ ایک آگیا ہے۔ منّی نے دونوں ہاتھوں میں اُسے زور سے دبوچ رکھا ہے اور وہ کیں کیں کر رہا ہے۔

اماں کو آتے دیکھکر ہی منّی نے کہا: "اماں بلّی بچّہ!"

اُس گھڑی اُس کے چہرے پر جیسے کچھ ٹوٹی ہوئی سُدھ کی جھلک دکھائی دی اور یہ کہتے کہتے اُس بلّی کے بچّے پر سے اُس کی انگلیاں کہیں کچھ ڈھیلی نہ ہو گئی ہوں اس لئے اور بھی اُس بچے کو پنجوں میں دبوچ کر منّی نے کہا "اماں بلّی بچّہ!"

بلّی کے بچّے نے بھی زور سے کہا "کیں کیں کیں" تو بھی گویا وہ اپنے پر قابض اُس مالک پن سے بچھڑنا نہ چاہتا تھا۔

بلّی کا بچّہ سوکھا سا تھا۔ مانو کسی نے مُنہ میں لیکر اُسے بُری طرح جھنجوڑ دیا ہو۔ وہ سہما ہوا تھا۔

منّی نے کہا: "اماں دُودھو!"

اماں نے خوش ہو کر کہا "دودھ پیئے گی بیٹا؟"

منّی نے بلّی کے بچّے کو دکھا کر کہا "بلّی بچّہ اماں!"

ماں ڈر کر بولی "بیٹا اُسے چھوڑ دے، پنجے ونجے مار دیگا"

یہ کہکر ماں اُس کے ہاتھوں میں سے اُس بچّے کو لیکر الگ کر دینے کے لئے آگے بڑھی۔ منّی نے اپنی مٹھیوں کو مضبوط کر لیا۔ اُسکے چہرے پر دکھائی دیا کہ گویا وہ مقابلہ کریگی اور بچّہ بھی مانو مخالفت میں لگ گیا۔

ماں پاس آتے آتے رُک گئی۔ دھیمی اور مُلائم اور میٹھی بانی سے بولی "بیٹا اُسے چھوڑ دے۔ جانور ہے، پنجے ونجے گاڑ دیگا۔"

منّی نے کہا "اماں بلّی بچّہ دُودھو پیئے" یہ کہکر بچّے کو اُس نے زور سے اپنے سینے سے لگا لیا۔

ماں لوٹ کر ایک کٹوری میں دُودھ لے آئی۔

منّی نے بچّے کو گردن دبوچ کر اس کا مُنہ کٹوری میں کرتے ہوئے کہا "پی، دودھو پی بلّی بچّے!"

لیکن بچّہ اپنی گردن چھڑانے کی کوشش میں مصروف رہا دودھ کی طرف مخاطب نہیں ہوا۔ منّی نے اس پر تین چار تھپڑ اسکو

جمائے۔ کہا: "نہیں پیئے گا تو دودھ، نہیں پیئے گا"۔ اور پھر بے رحمی سے اُسکے منہ کو کٹوری میں ٹھونس کر کہا: "پی، پی"۔

لیکن اب بھی بلی کا وہ بیوقوف بچّہ اپنی ہٹ پر ہی قائم رہا۔ اُس نے دُودھ پیا ہی نہیں۔ مُنّی نے اُسے پیٹا، منایا۔ اُس کے بعد اُس کو بڑے پیار سے تھپکا۔ اُسکے بدن کو سہلایا۔ اُس کے مُنہ کو اپنے مُنہ کے پاس لیجاکر پیار کیا اور اُس کے گالوں کو اپنے گالوں سے رگڑ کر کہا: "پی لے میرے بلی بچّے، میرے بچّے"۔ کہکر اُس بدشعور اُس بلی کے بچّے کا مُنہ بھی اسنے چوم لیا۔

اِس مرتبہ بلی کا بچّہ اپنی چھوٹی سی جیب نکال کر کٹوری کا دُودھ چاٹ کر پینے لگا۔ لڑکی کو یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی اُس میں اِس بچّے کے لئے محبّت جاگ آئی۔

پھر وہ یک بیک زندگی کی محبّت بھی اُس میں کھوئی نہ رہی۔ اُس دن سے وہ اچھی ہونے لگی۔ ہمیشہ بلی کے بچّے کو اپنے سے چپٹا کر ہی سوتی۔ جگنے پر کبھی وہ نہ ملتا تو اُسے پلٹ پلٹا خود چین لیتی نہ ہمیں چین لینے دیتی۔

اُسکے بعد تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ایک دن وہ بھی آیا کہ وہ پھل پھولکر خوب موٹی بھی ہو گئی۔

آپ کا تقاضا پایا کہ کہانی لکھو۔ کہانی لکھنے کو تیار ہوکر سوچتا ہوں کہ کیا لکھنا ہوگا۔ ایسے ہی آڑے وقت تار والا آکر ایک تار دے گیا۔ خدا کا رحم دیکھو کہ کیسا عجیب وغریب ہے۔ تار میں خبر آئی ہے کہ شرتی مرگئی۔ تار والا ابھی گیا ہے۔ شرتی میری اپنی بیٹی تھی، اکلوتی تو آپ یوں نہ کہنے دیجئے کہ وجے بھی مجھے ملا تھا جو بچپن میں مجھ سے لُٹ بھی گیا، تو بھی زندگی بھر شرتی کو اکلوتی ہی سمجھتا ہوں۔ چھوٹے چھوٹے چار بچّے چھوڑ گئی ہے۔ خیر، تار پاکر مجھے بلی بچّے کی یاد ہو آئی سو آپ کو سُنا دی ہے۔ اُمید ہے کہ سُنکر آپ کہانی ٹیکھک ہونے سے ہمیشہ بچیں گے۔

جینندر کمار

کُوکلا

اساڑھ کا مہینہ آیا ہمارے گاؤں بدن پور کے نصیب جاگ اُٹھے، اگر ایک طرف کسان کھُرپے گھنے برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے تو دوسری طرف گاؤں کا بنیا نہال تھا اُس کے گھر میں چاندی برس رہی تھی مگر مجھے ان جھمیلوں میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی، آم اور جامن کے باغوں میں بہار تھی۔ میں گاؤں کے چند نشانہ باز منچلے لڑکوں کو اپنے ساتھ لیکر باغوں کی سیر کرتا پھرتا تھا۔ جس باغ میں ہمارا گذر ہوتا تو قیامت ہی آجاتی، پکے آم تو دو چار ہی گرتے مگر ہمارے ڈھیلوں کی بوچھار سے کچے آموں کا زمین پر ڈھیر لگ جاتا، میں زمیندار کا لڑکا تھا۔ زمیندار اپنے گاؤں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ غریب آسامیوں کی مجال نہ تھی کہ وہ میری شرارت پر کوئی فریاد کریں، میرے ہی بل پر گاؤں کے لڑکے بھی اکڑتے پھرتے تھے۔

ساون کا مہینہ شروع ہوتے ہی ہم نہال ہوگئے۔ وہ جھوم جھوم کر بادلوں کا آنا۔ مینہ کی چھما چھم۔ پانی کا شور، ہوا کی سائیں سائیں۔ کوئل کی کُوک۔ مور کی جھنکار۔ گاؤں میں چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ باغوں میں آم کا ٹپکا لگ رہا ہے۔ جامنیں پٹاپٹ گر رہی ہیں اور ہم ان کا مزہ لوٹ رہے ہیں۔ لڑکپن کا زمانہ تھا نہ فکر معاش تھی اور نہ دُنیا کے جھگڑوں سے کوئی خاص غرض۔ دن بھر کبڈی۔ گلی ڈنڈا وغیرہ کھیلنا اور باغوں کی سیر کرنا اور رات کو آرام سے سو جانا یہی ہماری زندگی تھی۔

ہمارے گاؤں کے قریب ہی ٹھاکر چھترلال سنگھ کا بھی ایک گاؤں رام نگر تھا ہم نے سُنا کہ ان کے باغ میں نہایت عمدہ اور شیریں آموں کے درخت ہیں، رات کو ہم نے مشورہ کیا اور علی الصباح ان کے باغ پر دھاوا بول دیا۔ چھوٹے کمسن بچوں کو عقل و تمیز سے ایک قسم کی نفرت ہوتی ہے، میں اپنے ساتھیوں میں زیادہ عقلمند اور سمجھدار مانا جاتا تھا پھر بھی میں اپنی عقل سے کام نہ لے سکا میں نے ٹھاکر صاحب کے باغ کو بھی اپنے ہی گاؤں کا باغ سمجھا۔ ابھی دو چار ہی آم توڑنے پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے۔ کمبخت مالیوں نے ہمیں کچھ اس ترکیب سے گرفتار کیا کہ کسی کو فرار ہونیکا موقعہ ہی نہ مل سکا ورنہ اپنے گاؤں میں تو ہم شیر تھے، ہمیں اس کا ناز تھا کہ ہمیں پکڑنا آسان نہیں ہے۔

باغ کے قریب ہی ٹھاکر صاحب کا خوشنما مکان تھا، مالی ہمیں گرفتار کرکے ان کے پاس لے گئے ٹھاکر صاحب اپنے گھر کے سامنے نیم کے پیڑ کے نیچے چارپائی پر بیٹھے تھے ان کے قریب ہی ایک من موہنی جیتی جاگتی گُجریا کھیل رہی تھی۔ مجھ سے شاید وہ ہی ایک سال چھوٹی رہی ہوگی۔ ٹھاکر صاحب کا بارُعب چہرہ دیکھکر سب کے ہوش اُڑ گئے۔ ہم نے سمجھ لیا کہ اب ہم پر مار پڑیگی لیکن جب مالیوں نے "مال مسروقہ" جو اُنہوں نے ہماری جیب تلاشی سے برآمد کیا تھا ٹھاکر صاحب کے سامنے رکھا تو وہ مسکراتے۔ سوکھے دھانوں پر پانی پھر گیا، ان کو مسکراتے دیکھکر ہماری جان میں جان آئی۔ چونکہ ظاہری حیثیت اور لباس سے میں ہی اپنے ساتھیوں میں کچھ ممتاز نظر آیا۔ اس لئے ٹھاکر صاحب نے سب سے پہلے میرا ہی حسب نسب دریافت کیا۔ میں نے بھی طفلانہ اکڑ سے ساتھ اپنے پتاجی کا نام بتادیا، ان کا نام سُنتے ہی ٹھاکر صاحب نے مجھے پیار سے اپنے پاس بٹھالیا۔ میری وجہ سے سب ساتھیوں کو بھی

معافی مل گئی۔ مال مسروقہ کے علاوہ اور بھی عمدہ عمدہ خوش رنگ پکے ہوئے آم میرے سب ساتھیوں میں تقسیم کرکے انکو رخصت کر دیا گیا۔ لیکن جب میں چلنے کو تیار ہوا تو ٹھاکر صاحب نے مجھے روک لیا اور کہا کہ تم ٹھہرو شام کو میں تم کو تمہارے گھر پہنچا دونگا۔ اتنا کہہ کر انھوں نے مجھے اس موہنی خوبصورت گڑیا سے ملا دیا۔ اُس کا نام "گوکلا" تھا۔ وہ ٹھاکر صاحب کی لاڈلی بیٹی تھی۔ گوکلا سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہم دونوں تھوڑی ہی دیر میں ایسے گھل مل گئے گویا ہم عرصہ سے ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اُس نے مجھے اپنی گڑیاں دکھائیں۔ مجھے گڑیوں سے کوئی خاص اُنسیت نہ تھی، میں اس فن کا ماہر نہ تھا پھر بھی میں نے ان گڑیوں کی دل کھول کر تعریف کی، میری طرف سے گوکلا بہت خوش ہوئی۔ جب میں شام کو اُس سے رخصت ہونے لگا تو وہ بہت روئی مگر جب میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں پھر جلدی ملوں گا تو وہ چپ ہوگئی۔ ٹھاکر صاحب ہم دونوں کی بے لوث بالے پن کے پریم سے بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔ گوکلا کی ماں نے تو یہاں تک کہا کہ ان دونوں کی جوڑی بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔ میرے ساتھ ٹھاکر صاحب نے نفیس اور لذیذ آموں کی ایک ٹوکری بھی بھیجی۔ جب میں ٹھاکر صاحب کے ملازم کے ساتھ اپنے گھر پہنچا تو پتا جی مجھے مارنے کو دوڑے، لیکن ٹھاکر صاحب کے ملازم نے بچا لیا۔ ٹھاکر صاحب نے میرے والد کے نام میرے متعلق ایک سفارشی چٹھی لکھدی تھی جسکو پڑھکر والد صاحب کا غصہ جاتا رہا۔

اب مجھے رات دن گوکلا ہی کا خیال رہنے لگا۔ اس کے ساتھ کھیلنے میں مجھے خاص خوشی حاصل ہوتی تھی میں ہر دوسرے تیسرے دن رام نگر پہنچنے لگا، آموں کے لالچ سے نہیں بلکہ اپنی پیاری گڑیا گوکلا کے ساتھ کھیلنے کیلئے! ایک مرتبہ میری ماں نے گوکلا کی ماں کی دعوت کی، جب گوکلا اپنی ماں کے ساتھ میرے یہاں آئی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا میں نے بھی گوکلا کو اپنی پھٹی پرانی کتابیں۔ اچھی خراب پنسلیں وسلیٹ وغیرہ دکھائیں۔ باطن میں چاہے گوکلا کو وہ چیزیں اچھی نہ معلوم ہوئی ہوں مگر اُس نے میری خاطر میری علمیت پر اظہار خوشنودی کیا۔

کچھ دن یوں ہی گذرے مگر پھر پتا جی نے مجھے دیہاتی مدرسے میں داخل کر دیا۔ اب مجھے گوکلا سے ملنے کا بہت کم موقع ملنے لگا۔ جب اتوار کی چھٹی ملتی تو میں رام نگر ضرور جاتا اور اپنی گوکلا سے مل آتا۔ دو چار سال کے بعد جب میں نے دیہاتی مدرسہ کا چوتھا درجہ پاس کر لیا تو پتا جی نے مجھے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کیلئے میرے چچا کے پاس سہارنپور بھیجنے کا ارادہ کیا۔ مجھے اس خبر سے کچھ خوشی ہوئی لیکن رنج زیادہ ہوا۔ خوشی اس کی تھی کہ شہر میں ریل۔ موٹر۔ کھیل تماشے وغیرہ کا لطف اٹھاؤں گا، شہر کی ہمیشہ تعریف سنتا تھا مگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ رنج اس کا تھا کہ میں اب گوکلا سے جدا ہو جاؤنگا۔ مگر مجھے ایک دن گوکلا سے جدا ہونا ہی پڑا۔ سہارنپور جانے سے ایک دن پہلے جب میں گوکلا سے ملا تو وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی میں بھی اُس کے ساتھ اُس وقت تک روتا رہا جب تک میری آنکھوں کے آنسو خشک نہ ہو گئے۔ اب ہم چھوٹے بچے نہ تھے ہم نے لڑکپن میں پریم کا جو پودا لگایا تھا وہ اب درخت کی شکل اختیار کرنے ہی والا تھا کہ قسمت نے ہمیں جدا کر دیا۔ رخصت ہونے سے پہلے ہم نے ایک دوسرے کو اپنی دائمی محبت کا یقین دلایا۔

(۲)

سہارنپور پہنچکر عرصہ تک میرے دل میں گوکلا کی یاد چٹکیاں لیتی رہی لیکن نئے نئے دوستوں کی صحبتوں میں پڑکر رفتہ رفتہ میرے دل سے گوکلا کا خیال کم ہونے لگا۔ میں نے اُس سے کیا قول وقرار کیا تھا سب بھول گیا۔ شہر کی دلچسپیوں نے دیہاتی زندگی کی یاد کو میرے دل سے محو کردیا۔ اپنے دوستوں میں گلی ڈنڈا اور کبڈی کا ذکر کرنے سے میں شرمانے لگا۔ اب تو کرکٹ، فٹ بال اور ہاکی کے کھیلوں ہی سے مجھے ایک قسم کا عشق تھا۔ میں جب کبھی شہری زندگی کا اپنی دیہاتی زندگی سے مقابلہ کرتا تو مجھے رنج معلوم ہوتا کہ پرماتما نے مجھے دیہات میں کیوں پیدا کیا؟ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی اپنے گاؤں بدن پور نہ گیا۔ چچا نے جب اس کی وجہ پوچھی تو میں نے کہدیا کہ میری تعلیم کا نقصان ہوگا۔ مگر دوسرے سال پتا جی نے گرمیوں کی چھٹیوں میں مجھے زبردستی گھر بلا لیا۔ وہاں پہنچکر مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ میری آمد کی خبر سنکر میرے لڑکپن کے ساتھی میرا بخش جلاہا۔ رام پھل بنیا۔ رام بھروس ملاح۔ جگرو دھوبی۔ مکنا چمار وغیرہ وغیرہ ملنے آئے۔ گاؤں میں اونچ نیچ کا بہت کم سوال ہوتا ہے آپس میں برادرانہ محبت ہوتی ہے میری آمد سے میرے لنگوٹیا یاروں کو بہت خوشی تھی گاؤں بھر میں یہی چرچا تھا کہ "ہمارے راجن بابو آئے ہیں اب پھر گلی ڈنڈا اور کبڈی کے جشن ہوں گے"۔ چنانچہ جب سب میرے دروازہ پر آکر جمع ہو گئے تو مجھے مجبوراً گھر سے باہر نکلنا پڑا۔ شہر میں رہ کر اب میں اپنے خیال سے مہذب بن چکا تھا۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ میں ان گنوار لڑکوں سے ملوں مگر ماتا جی نے مجھے سمجھایا کہ ان غریبوں سے نفرت کرنا اچھی بات نہیں، اپنے پتا جی کو دیکھو وہ سب سے کیسا میل جول کر رہتے ہیں، یہ سب لڑکے تو تمہارے بچپن کے ساتھی ہیں، بہت دنوں کے بعد تم آئے ہو جاکر ان سے دو چار باتیں کرلو اس سے تمہاری عزت کم ہو جائے گی۔ جب میں گھر سے باہر نکلا تو سب لڑکوں نے جُھک کر مجھے نہایت ادب سے سلام کیا۔ انہیں کے ساتھ میں نے اپنے لڑکپن کا زمانہ گذارا تھا۔ ان کے ساتھ کامیں بھی چرائی تھیں باغوں میں چوریاں بھی کی تھیں۔ خاک دھول میں لت پت ہوکر کبڈی اور گلی ڈنڈا کا کھیل بھی کھیلا تھا۔ نمک مرچ، دھنیا، پودینہ کے ساتھ کچے بیر کھائے تھے، بیساکھ جیٹھ کی آندھی میں انہیں کے ساتھ کبھی باغوں میں آم چنے تھے، لڑکپن کی سب باتیں یاد آ گئیں، میری شہریت خاک میں ملنے والی تھی کہ ایک گنوار لڑکا مجھے خاموش دیکھکر بول اُٹھا۔ "راجن بابو اب تو کوٹ پتلون مان کرسٹان مالوم (معلوم) ہوت ہیں"۔ اتنا سُنتے ہی میں چونک اُٹھا۔ اس گنوار کی بدتہذیبی دیکھکر مجھے ان سے نفرت معلوم ہونے لگی شہر کی تربیت ومعاشرت نے مجھے مہذب بنادیا تھا میں نے ان کے پاس کھڑا رہنا یا ان سے باتیں کرنا بھی ہتک سمجھا، چنانچہ میں اپنا مُنہ پھیر کر وہاں سے چلدیا۔ میری اس بے رُخی کا ان سب پر خاص اثر ہوا۔ سب ہنستے آئے تھے مگر مُنہ لٹکا کر واپس ہوئے مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ میں نے سمجھا تھا کہ گنواروں کی چاہے کتنی ہی ہتک کیوں نہ کی جائے مگر ان کے دل پر اُس کا کچھ اثر نہیں ہوتا مگر یہ میری بھول تھی غلطی تھی، آج جب کہ میں اپنی زندگی کے قریباً اڑتیس سال گذار چکا ہوں مجھے اس کا کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ محبت و پریم سے آپ دیہاتیوں کو اپنا غلام بنا سکتے ہیں لیکن شان امارت دکھا کر آپ ان کے دلوں کو موہ نہیں سکتے۔ غریب گنواروں میں بھی خودداری کا مادہ ہوتا ہی یہ اب مجھے پتہ چلا ہے۔

بدن پور پہنچکر مجھے گوکلا کی پھر یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ معلوم نہیں اب گوکلا مجھ سے ملے گی بھی یا نہیں اب تو وہ

شاید محبت پردہ کرے گی، دو تین دن تک یہی سب کچھ سوچتا رہا مگر پھر دل کے ہاتھوں سے مجبور ہو کر ایک دن رام نگر پہنچ گیا مگر افسوس وہاں گوکلا نہ تھی وہ کئی مہینے سے اپنی نانی کے یہاں متھرا گئی ہوئی تھی۔

اسی طرح جب کبھی میں چھٹیوں میں بدن پور گیا تو اتفاق سے گوکلا سے ملاقات نہ ہو سکی۔

(۳)

کئی برس گذر گئے۔ زمانے کے انقلاب سے بچے جوان اور جوان بوڑھے ہوئے، میں نے میڈیکل کالج لکھنؤ سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔ اور سول ہسپتال غازی پور میں میری تعیناتی ہوئی وہاں مجھے ہر قسم کا آرام تھا تنخواہ کے علاوہ پرائیویٹ پریکٹس سے بھی میری کافی آمدنی ہو جاتی تھی ملازمت سے پہلے ہی میری شادی ہو چکی تھی اور اب میری شریمتی جی بھی میرے ہی ہمراہ رہتی تھیں۔

برکھا رت کی اندھیری رات تھی۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی تھیں رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی کچھ بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ ہوا سن سن چل رہی تھی گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں کہ باہر سے کسی نے مجھے آواز دی ایسے وقت میں باہر نکلنے کو جی تو نہیں چاہتا تھا مگر غلامی بُری بلا ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ ممکن ہے کہ اسپتال میں کسی مریض کی حالت بہت خطرناک ہو اور کمپونڈر مجھے بلانے آیا ہو میں مجبوراً گھر سے باہر نکلا۔ میرا کمپونڈر کسی اجنبی کے ساتھ کھڑا تھا اُس نے مجھ سے کہا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ نے مجھے فوراً بلایا ہے موٹر سامنے کھڑی ہے۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کا نام میں نے سُنا تھا وہ غازی پور کے ایک مشہور ٹھیکیدار تھے مگر مجھے ان سے ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کو اپنی فیس سے غرض رہتی ہے میں اُن کے ملازم کے ہمراہ فوراً اُن کے مکان پر پہنچا۔ راستہ میں ملازم سے دریافت کرنے سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ "ملکن" بہت بیمار ہیں۔

ٹھاکر صاحب کے دروازہ پر جب موٹر کھڑی ہوئی تو ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ میری پیشوائی کیلئے آگے بڑھے یہی ٹھاکر صاحب تھے اُن سے ملنے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔ تھے تو گورے چٹے مگر ضعیفی نے ان پر اپنا قبضہ جما لیا تھا چہرہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور کمر کچھ جھک چلی تھی ان کے قریب ہی ایک ملازم لالٹین لئے کھڑا تھا معمولی مزاج پرسی کے بعد ٹھاکر صاحب مجھے مریضہ کے کمرے میں لے گئے چلنے میں ان کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے میں سمجھ گیا کہ ٹھاکر صاحب پر لال پری کا نشہ تھا۔ مریضہ بیہوش تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں، اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے گھونگھر والے سیاہ بال ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے بھونرے پھول پر بیٹھے ہوئے رس چوس رہے ہیں، ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھا تھا اور دوسرا دل کے قریب پڑا تھا اُس حالت میں بھی مجھے وہ حُسن کی دیوی نظر آئی اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس سال کی رہی ہوگی مجھ سے ملازم نے تو کہا تھا کہ "ملکن" بیمار ہیں لیکن میں نے اس مریضہ کو ٹھاکر صاحب کی لڑکی سمجھا۔ میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑا ہے، میں ضروری دوائیوں کا بکس اپنے ہمراہ لے گیا تھا بڑی مشکل سے مریضہ کے منہ میں ایک دوا ڈالی، اس کا فوری اثر ظاہر ہوا اور مریضہ نے کچھ حرکت کی۔ ٹھاکر صاحب ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے جھوم رہے تھے یکبارگی فرمانے لگے "ڈاکٹر صاحب علاج ماکول (معقول) ہونا چاہیے روپے کی کوئی فکر نہ کیجے گا

ہا ہا ہا ہا......" ٹھاکر صاحب کی "علمیت" کا مجھے یہ پہلا تجربہ تھا میں نے ان کی بکواس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور مریضہ کو پھر دوا پلائی اس مرتبہ مریضہ نے دوا پیتے ہی یکبارگی آنکھیں کھول دیں، بیہوشی میں اُس کا چہرہ روشنی سے کچھ ہٹا ہوا تھا ہوش میں آتے ہی اُس نے میری طرف دیکھا چہرہ پر لالٹین کی روشنی پڑی۔ میں سناٹے میں آگیا۔ میرے سامنے میرے لڑکپن کی ساتھی میری پیاری گجریا گوکلا لیٹی تھی۔ گوکلا کے چہرہ اور ہاتھ پر تل تھے اُن کے دیکھنے سے مجھے اور بھی اطمینان ہوگیا گوکلا نے بھی مجھے پہچان لیا۔ جس طرح پانی کی لہروں سے ٹکرا کر کنول کا پھول ہچکولے کھانے لگتا ہے اُسی طرح گوکلا کی مدہ بھری آنکھیں آنسوؤں میں تیرنے لگیں۔

میں نے گھبرا کر ٹھاکر صاحب کی طرف دیکھا۔ شراب نے اُنہیں مدہوش بنا دیا تھا وہ اب کرسی پر غافل پڑے تھے۔ میں نے اپنے دل کو بہت سنبھالا پھر بھی میری زبان سے نکل گیا۔ "گوکلا!" "کوئل کوکی" "راجن بابو"۔ خوابیدہ محبت نے کروٹ لی، راکھ میں دبی ہوئی چنگاری ذرا سا کریدنے سے چمکنے لگی میری طبیعت بگڑنے لگی اب وہاں زیادہ ٹھہرنا میں نے مناسب نہ سمجھا میں نے گوکلا سے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں اب آرام سے سوؤ کل سویرے میں دوسری دوا بھیجوں گا۔" گوکلا نے دبی زبان سے کہا۔ "آپ سا ہمدرد ڈاکٹر علاج کرنے کو ملے تو میں روز بیمار ہونے کو تیار ہوں راجن بابو! آپ کیا سمجھتے ہیں میرا مرض لاعلاج ہے۔" میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں" چلتے وقت میں نے رک رک کر گوکلا سے ٹھاکر صاحب کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔ "آپ کی تعریف؟" گوکلا پھر آبدیدہ ہوگئی اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "یہی تو میری جیون نیّا کے کھیویا میرے سوامی ہیں۔" یہ سُنکر رنج و غم سے میرا سینہ پھٹنے لگا۔ آہ گوکلا کے ماں باپ نے کیا سمجھکر اپنی کمسن پھول سی قبول صورت لڑکی کا بیاہ اس شرابی بوڑھے سے کر دیا اس وقت کچھ اور پوچھنے کا موقع نہ تھا۔ ایک طرف گوکلا سسکیاں بھر رہی تھی اور اُس کے قریب ہی اُس کا لاپروا شرابی شوہر بدمست پڑا تھا میں ان دونوں کی حالت پر آنسو بہاتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ ساری رات مجھے اچھی طرح سے نیند نہ آسکی۔ میں اتنے عرصہ تک گوکلا سے کیوں غافل رہا؟ اب آنسو بہانے سے کیا ہوتا ہے جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میں نے لڑکپن میں گوکلا سے جو قول و قرار کیا تھا وہ نباہ نہ سکا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔

(۴)

گوکلا اچھی ہوگئی اس کے بعد ہمارے یہاں اُس کی آمد و رفت شروع ہوگئی میری بیوی سے اس کا بہناپا ہوگیا۔ وہ اب مجھ سے کانا پردہ کرتی تھی گو وہ کبھی کبھی مجھ سے دو چار باتیں کر لیتی تھی، میں نے کئی مرتبہ اُس سے دریافت کیا کہ وہ ٹھاکر صاحب کے ساتھ خوش ہے یا نہیں مگر اُس نے اس کا جواب کبھی نہ دیا، مجھے چند دنوں کے بعد یہ ضرور معلوم ہوگیا تھا کہ چونکہ گوکلا کی ماں کے خاندان میں کچھ نقص تھا اسی وجہ سے جب برادری میں کوئی معقول شوہر نہ مل سکا تو گوکلا کے پتا نے مجبوراً اپنی لڑکی کو بوڑھے ٹھاکر صاحب کے سپرد کر دیا تھا۔

گوکلا کے شوہر بوڑھے ہونے پر بھی بہت رنگین مزاج تھے۔ خود کو بازارِ حُسن کا جوہری سمجھتے تھے۔ پڑھے لکھے تو معمولی تھے قسمت کے دھنی تھے ٹھیکیداری میں ان کو کافی منافع ہو جاتا تھا ان کا خیال تھا کہ عورت صرف دولت کی پرستار ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے وہ کوکلا کو بھی دولت کی باندی سمجھتے تھے گھر میں خادمہ تھی کوکلا کیلئے ہر قسم کا آرام میسر تھا، اگر ٹھاکر صاحب کے گھر میں کسی بات کی کمی تھی تو وہ محبت کی۔ ٹھاکر صاحب کو شاید اس کا تجربہ ہی نہ تھا کہ جوان عورت دولت سے زیادہ پریم کی بھوکی ہوتی ہے بازاری عورتوں کو رجھانے کیلئے ٹھاکر صاحب بالوں میں خضاب اور آنکھوں میں سرمہ بھی لگاتے تھے مگر کوکلا سے محبت آمیز باتیں کرنے کا انہیں وقت ہی نہ ملتا تھا۔ کوکلا کے لئے ٹھاکر صاحب دو چار نفیس ساڑیاں لائے تھے وہ اُسی کو بڑا احسان سمجھتے تھے۔ حالانکہ میں نے سُنا تھا کہ ٹھاکر صاحب نے بازارِ حسن کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یا اپنے اور کبھی کام کے بہانے سے کوکلا سے اس کے طلائی زیورات تک (جو وہ اپنے میکے سے لائی تھی) مانگ لئے اور کبھی مہاجن کے یہاں گروی رکھدئے جنہیں چھڑانے کی انہیں کوئی فکر نہ تھی، یہ تھی ٹھاکر صاحب کے گھر کی حالت، مگر جب کبھی میں نے کوکلا سے اس کے متعلق کچھ دریافت کرنا چاہا تو وہ ٹال گئی۔ شراب کی زیادتی نے ٹھاکر صاحب کے دونوں پھیپھڑے خراب کر دئے تھے جس سے رات کو انہیں کھانسی کی بہت تکلیف رہتی تھی اس سے ان کی صحت پر بھی بہت بُرا اثر پڑا تھا ایک مرتبہ رات کو ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی وہ کسی اور ڈاکٹر کے زیر علاج تھے مگر اس مرتبہ غالباً کوکلا کی سفارش سے میں بلایا گیا۔ دس بجے رات کا وقت رہا ہوگا گلابی سردی پڑ رہی تھی جب میں ٹھاکر صاحب کے کمرہ میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ٹھاکر صاحب پلنگ پر نڈھال پڑے ہیں۔ ان کے پلنگ کے پاس ہی کوکلا سر جھکائے کھڑی تھی اس کے دونوں گال جو انار کے پھول کے مانند سُرخ تھے پیلے پڑ گئے تھے۔ اس دن اس نے مجھ سے کوئی خاص پردہ نہیں کیا بلکہ میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں مایوسی بھی تھی اور حسرت بھی، اور کہا "ڈاکٹر صاحب! جس طرح بھی ہو میرے پتی کو بچا لیجئے میں آپ کا بہت احسان مانوں گی"۔

میں نے کوکلا کو ہر طرح سے اطمینان دلایا اور ٹھاکر صاحب کا بہت دل لگا کر علاج کیا جس سے اُن کو بہت فائدہ ہوا لیکن مکمل فائدہ نہ ہونے پایا تھا کہ ٹھاکر صاحب نے میرا علاج بند کر دیا۔ میں نے شراب پینے کی ممانعت کر دی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے میرا کہنا نہ مانا۔

کوکلا میرے یہاں تیسرے چوتھے دن آجایا کرتی تھی، میری بیوی سے اس کا دل بہت بہل گیا تھا لیکن عورتیں شک و بدگمانی کی مورتی ہوتی ہیں اس سے میری نیک خصلت بیوی بھی نہ بچ سکی۔ جس طرح روشن چراغ سے کالا کاجل نکلتا ہے اُسی طرح میری بیوی کے پریم سے بھی شک و شبہ کے کالے بادل اُمنڈتے دکھائی دینے لگے، اُس نے کوکلا کو بیکار چھیڑنا شروع کیا، پہلے تو کوکلا نے مذاق سمجھا لیکن وہ آخر کار میری بیوی کے دلی جذبات کو سمجھ گئی اور اُس نے میرے یہاں کا آنا یک لخت بند کر دیا۔

اس کے تھوڑے دنوں کے بعد میرا تبادلہ غازی پور سے بنارس کا ہو گیا۔ چلنے سے پہلے میں نے بہت چاہا کہ کوکلا سے مل کر میں اُس سے اپنی بیوی کی بے وجہ بدگمانی کی معافی مانگ لوں لیکن مجھے اس کا موقع نہ مل سکا۔

(۵)

سال بھر کے بعد میں تین ماہ کی رُخصت لیکر جب اپنے گاؤں بدن پور پہنچا تو مجھے یہ معلوم کرکے سخت صدمہ ہوا کہ کوکلا بیوہ ہو گئی ہے اُس کا سُہاگ اُجڑ گیا ہے۔ میں نے لڑکپن میں کوکلا ہی سے محبت کا سبق پڑھا تھا جوانی میں جب میں اُسے

بھول چکا تھا تو اتفاقاً اُسے ایک بُوڑھے کی شریک زندگی کی حیثیت میں دیکھکر میری محبت میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگیا۔
لیکن اب ـــــ جب کہ وہ بیوہ ہوگئی تو محبت و ہمدردی کے ساتھ ہی میں اس کا سچا پُجاری بن گیا۔ وہ مصیبت کی ماری۔ دُنیا کی ستائی اور سماج کی ٹھکرائی ہوئی تھی اگر اس کیلئے میرے دل میں سچی اور پاک محبت نے جگہ پائی تو یہ کوئی پاپ کی بات نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ سماج کے ٹھیکدار میری سچی و پاک محبت کو اچھی نظروں سے نہ دیکھیں گے مگر میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ میں وقت ناوقت جنگل کی طرف نکل جاتا اور گوکلا کی بدنصیبی ہی پر نہیں بلکہ اس سماج کی حالت پر بھی آنسو بہاتا جو کمسن لڑکیوں کو بُوڑھے مردوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ میں رام نگر بھی کئی مرتبہ گیا لیکن مجھے گوکلا سے مُلاقات کرنے کا موقع نہ مِل سکا میری دلی خواہش تھی کہ ایک مرتبہ تنہائی میں گوکلا سے مِل کر اُسے اطمینان دلادوں کہ میں اُس کا دلی ہمدرد ہوں اور اس کے دُکھ درد میں شریک ہوں لسے کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔
الہ آباد کا ماگھ میلہ قریب تھا میں نے سُنا کہ گوکلا وہاں اشنان کرنے جائے گی۔ جس روز میلہ تھا میں علی الصبح مادھوپور اسٹیشن پر پہنچ گیا میں نے اپنی بیوی سے بھی نہ کہا کہ میں الہ آباد جارہا ہوں وہ ہمارے پاک و صاف دلوں سے واقف ہی نہ تھی اگر اسے معلوم ہوجاتا کہ میں الہ آباد جارہا ہوں تو شاید وہ شکی مزاج عورت خود بھی میرے ہمراہ جاتی۔ اسٹیشن پر پہنچکر میں نے دیکھا کہ گوکلا گاؤں کی عورتوں کے ساتھ جارہی ہے اس کے ساتھ اس کا کوئی خاص رشتہ دار نہ تھا۔ میلہ کی وجہ سے بہت بھیڑ تھی پلیٹ فارم پر ٹرین آئی تو ایک شور مچ گیا کسی کو کسی کی خبر نہ رہی دیہاتی عورتیں اور مردوں کو جہاں بھی جگہ ملی گھس پڑے میں نے سکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا تھا بیچاری گوکلا حیران و پریشان اِدھر اُدھر جگہ کی تلاش میں پھر رہی تھی گاڑی نے سیٹی دی اب میں نے دُنیا کی جھوٹی لاج کو چھوڑ دیا اور اپنے ڈبہ کا دروازہ کھول کر گوکلا کو آواز دی "گوکلا یہاں آجاؤ" گوکلا نے میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا پہلے کچھ ٹھٹکی اور پھر میرے ڈبہ میں چلی آئی۔ اس ڈبہ میں میرے اور گوکلا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ تھوڑی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے اس کے بعد میں نے کہا "گوکلا! میری اس جرأت کو معاف کرنا۔ میں بہت چاہتا تھا کہ تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کروں آج مجھے اس کا موقع مِل گیا"
میں سمجھتا تھا کہ گوکلا میری اس جرأت یا گستاخی پر کچھ لعنت ملامت کرے گی یا خفا ہوگی مگر اُس نے اپنی شرافت سے مجھے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر تک وہ چُپ رہی اس کے بعد وہ کہنے لگی "مگر آپ جانتے ہیں کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا"
"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا"
"میرا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں کا اس طرح تنہائی میں ملنا کوئی اچھی بات نہیں ہو دُنیا کیا کہے گی"
"جب ہم دونوں کے دل صاف ہیں تو ہمیں دُنیا سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں"
"لیکن ہم کو دُنیا میں رہنا ہے۔ آپ تو مرد ہیں آپ کا تو کچھ نہ بگڑے گا لیکن میں ایک بیوہ عورت ہوں جلد بدنام کردی جاؤں گی"

"کوکلا! تم اس کی پروا نہ کرو۔ میں تمہارا سچا ہمدرد ہوں، میرے دل میں کوئی برائی نہیں۔ میں تم سے سچی و پاک محبت کرتا ہوں۔ آج سے نہیں بلکہ بالے پن سے!"

"کیا آپ قسم کھاتے ہیں کہ آپ کو مجھ سے سچی اور پاک محبت ہے؟"

"کیا اس میں تم کو کوئی شک ہے؟"

"شک ہوتا تو میں آپ سے اس وقت تنہائی میں کیوں ملتی؟"

میں نے جب قسم کھا کر کوکلا کو اپنی پاک محبت کا یقین دلا دیا تو اس سے کہا کہ "کوکلا! یہ تو بتاؤ کہ تم مجھ سے پردہ کیوں کرتی ہو۔ کیا اپنوں سے کوئی پردہ کرتا ہے؟"

کوکلا نے کہا: "مجھے شرم معلوم ہوتی ہے اس کے متعلق آپ مجھ سے کچھ نہ کہئے۔"

اب جدائی کی گھڑی قریب آ رہی تھی میں نے معصوم کوکلا کے نرم و گداز ہاتھ کو تھام لیا اور بیخودی میں اسکو دبانے لگا اس وقت ہم کانپ رہے تھے دونوں طرف سے پریم ساگر موجیں مارنے لگا میں نے کہا "کوکلا! میں تم سے کس طرح بتاؤں کہ میرے دل میں تمہاری کتنی عزت ہے۔ تم اپنے دل کو کبھی چھوٹا نہ کرنا مجھے ہمیشہ اپنا خیر خواہ سمجھنا جس طرح تم نے آج مجھ سے میرے دل کا حال دریافت کیا ہے کیا تم بھی مجھ سے سچ سچ بتا سکتی ہو کہ تم کو بھی مجھ سے محبت ہے یا نہیں؟"

کوکلا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ الہ آباد کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا اس کی خاموشی سے بے چین ہو کر میں نے پھر کہا۔ "نیکدل کوکلا! ہاتھ جوڑتا ہوں میرے سوال کا جواب جلدی دو۔ تم کو میری قسم! اپنی پاک محبت کی قسم جلدی جواب دو!"

کوکلا نے مجھے ہاتھ جوڑتے دیکھکر کہا "ہاں! ہاں! یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ میں تو آپ سے چھوٹی ہوں آپ میرے دل کو نہ چھیڑتے تو بہتر تھا۔ یہ سوال مجھ سے نہ کیا جاتا تو اچھا تھا۔ راجن بابو! آپنے آج میرے ضبط پر بجلی گرا دی، بارود کے اندر آگ نہیں چھپ سکی، آپ مجھ سے پاک محبت کرتے ہیں مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی، شاید آپکو معلوم نہ ہو مگر میں آپ کے دلی حالت سے آج سے نہیں بلکہ عرصہ سے واقف ہوں لیکن میری ہمیشہ یہ خواہش تھی کہ آپ کی محبت کا جواب محبت میں نہ دوں، لیکن جب آج بات کھل ہی گئی آپ نے قسم بھی کھا لی کہ آپ کی محبت سچی و پاک ہے تو اب کچھ چھپانا بیکار ہے۔ سنیئے عورتوں کو دنیا میں سب سے بڑھکر پیارا پریم ہوتا ہے وہ پریم ہی کی بھوکی ہوتی ہیں جو ان کی عزت کرتا ہے جو ان سے محبت کرتا ہے وہ بھی ان سے محبت کرتی ہیں جو انہیں اپنا سمجھتا ہے اس کیلئے وہ جان دینے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ عورتوں سے بڑھکر دنیا میں کوئی اپنے چاہنے والے کو نہیں پہچان سکتا، لیکن وہ شرم و حیا سے اس کا اظہار نہیں کر سکتیں۔ لیکن آج جن باتوں کو میں نے اب تک چھپا رکھا تھا ان کو مجبوراً ظاہر ہی کرنا پڑا۔ میری اس کمزوری کو معاف کیجئے گا۔ مگر راجن بابو! میں یہی کہوں گی کہ آپ نے اپنی محبت کی ہوا سے میری محبت کی چنگاری کو بھڑکا دیا۔ سوچئے تو سہی اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کیا دنیا ہماری اس پاک محبت کو اچھی نظروں سے دیکھے گی۔ جب آپکی بیوی بھی اس بات کو پسند نہ کر سکیں کہ ہم ملیں یا باتیں کریں تو دوسرے تو نہ معلوم کتنا بدنام کریں گے۔ مگر ٹھہرئیے.....

آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ میں نے سمجھ لیا ——— برسوں سے میں نے آپ سے محبت کی مگر آپ کو اس کا پتہ بھی نہ چل سکا آج تک کسی کو خواب میں بھی میری محبت کا حال نہ معلوم ہوا۔ دیکھئے عورتیں اپنے دل کو کتنا سنبھال سکتی ہیں۔ میں نے آج تک کبھی نظر بھر کر بھی آپ کو دیکھنے کی جرأت نہیں کی، درشن کے سُکھ سے بھی میں نے خود کو محروم رکھا مگر آج آپ نے میرے دل کو ایسا چھیڑا کہ سب کچھ کہنا ہی پڑا، اب میں اور کچھ کہنا بیکار سمجھتی ہوں اب کچھ کہتے بھی نہیں بنتا مگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں آپ سے زیادہ دُنیا میں کسی سے بھی محبت نہیں کرتی اور جب تک جیوں گی اس محبت کو نباہوں گی۔ آپ بھی میری اس محبت کی لاج رکھیئے گا، اگر میں آپ کو اس جنم میں نہ پا سکی تو دوسرے جنم میں اُمید ہے کہ ضرور پاؤں گی۔ ——— لیکن یہ کیا؟ آپ روتے کیوں ہیں؟ رونا تو عورتوں کی قسمت میں لکھا ہے آپ تو مرد ہیں آپ کو رونے سے کیا کام۔ آپ کے لئے تو دُنیا میں سُکھ ہے چین ہے آرام ہے مجھ غریب بیوہ کے لئے آپ کیوں آنسو بہاتے ہیں۔ مجھ ایسی ہزاروں بیوائیں ہندوستان میں پڑی ہیں آپ کہاں تک روئیے گا ———"

میں جوشِ محبت میں دیوانہ ہوگیا مجھے کچھ بھی ہوش نہ رہا میں نے اس کے خوبصورت نرم و نازک ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر پیار کیا۔ گوکلا نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میری اس گستاخی پر وہ جتنا بھی لعنت ملامت کرتی میرے لئے کم تھا لیکن پاک طینت صاف دل گوکلا نے مجھے معاف کر دیا۔

مدتیں گذریں زمانہ ہوگیا لیکن میرے دل سے کبھی وقت بھی گوکلا کی یاد نہیں جاتی، اس کا پاکیزہ مکھڑا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور گوکلا! جہاں تک مجھے معلوم ہے گوکلا صدق دل سے مجھے یاد کرتی ہے۔ ہمارے درمیان سماج کی دیوار کھڑی ہے جس کا توڑنا آسان نہیں۔ لیکن ہمارے دلوں سے ایک دوسرے کی محبت دُور کرنا بھی سماج کی طاقت سے باہر ہے۔ ممکن ہے کہ جٹا دھاری مہنت اور سماج کے وہ بھگت جو بیٹھوں؛ وہ بیواؤں کے مال پر ہاتھ صاف کر کے "مال پوا" کھا کھا کر اپنے بدن کو اور موٹا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں جو بیواؤں کی کوئی ہستی ہی نہیں سمجھتے، ہماری اس پاک محبت کو بھی گناہ سمجھیں لیکن اگر پریم کرنا بھی پاپ ہو تو دُنیا میں کوئی کام پُن نہیں ہو سکتا؛

(اعظم اکریوی)

تائیس

یورپ کے بہترین مصنف کی بہترین تصنیف کا اُردو کے بہترین مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی کے قلم سے ترجمہ۔ یہ فرانسیسی مصنف اناطولِ فرانس کا شہ پارہ ہے اس میں جسم و روح کے تصادم کے مسئلہ کو عہدِ قدیم کی ایک عروسِ بازاری کی داستان کے طور پر نہایت دلفریبی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول تمام دُنیا کی ادبیات میں نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے عنایت اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ ایسی قادر الکلامی اور اعجاز بیانی سے کیا ہے کہ اُردو میں ادبِ لطیف کی ایک غیر فانی یادگار بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی؛

اندھا بھکاری

کلکتہ کا ایک مکروہ محلہ ——— پچھلے پہر کا وقت

جاڑے کی راتیں ——— ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ

ہوا تاڑی اور ہنڈیا[1] کی بدبو سے بوجھل ہو رہی ہے۔ گلیوں میں آبخوروں کے ٹکڑے، بوتلوں کی کرچیں، جھوٹے پتل اور انڈوں کے چھلکے بکھرے پڑے ہیں۔ طوائفیں منہ چھپائے سو رہی ہیں۔ تکیوں کے نیچے ان کی نسوانیت کی قیمت رکھی ہوئی ہے ——— روپے کم اور پیسے زیادہ۔ پہرے داروں کے "جاگتے رہیو ہو" کی صدائے بازگشت کتوں کی "بھوں بھوں بھوں" میں سنائی دیتی ہے۔ آسمان پر کچھ تارے کوڑھ کے داغوں کی طرح جھلملا رہے ہیں۔

وہاں ایک گھر ہے جس کی دیواریں بانس کی کھپچیوں پر مٹی کے تودے چڑھا کر بنائی گئی ہیں۔ چھپر پھوس کا ہے اور دروازہ ٹین کا۔ باہر دروازے کے سامنے ایک بھدا سا گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔ بھینسے سردی کے مارے کبھی کبھی اپنی موٹی کھال کو سکوڑ لیتے ہیں اور پھر اطمینان سے جگالی کرنے لگتے ہیں۔ دور سے دیکھو تو ان کی آنکھیں مندر کے چھوٹے چھوٹے دیوں کی طرح چمک اٹھتی ہیں۔

اس گھر کو سب لوگ "اندھا ٹولا" کہتے ہیں۔

گاڑی بان کے جسم پر ایک موٹا کمبل تھا، ایک ہاتھ میں ناریل کی گڑگڑی، دوسرے میں چمڑے کا چابک۔ اس نے ٹین پر چابک کے دستے کا ایک ہاتھ لگایا اور بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ دفعتاً اندر اندھیرے میں کچھ لوگوں کے جمہائی لینے اور کھکھارنے کی آواز سنائی دی۔ کتے کان پھڑپھڑا کر ایک طویل "اوہو" کے ساتھ صبح کا بھجن گانے لگے۔ پھر آدمیوں کے ٹٹول ٹٹول کر چلنے اور لڑکھڑانے کی آہٹ سنائی دی۔

اندھے بغل میں اپنا جھولا دبائے، ہاتھ میں لکڑی لئے یکے بعد دیگرے باہر نکلنے لگے۔ ان کے پیچھے کتوں کا غول ایک دوسرے کو بھنبھوڑتا ہوا باہر آیا۔ گاڑی بان چابک سے کونچ کونچ کر انہیں گننے لگا۔ سولہ سترہ ——— دو اب بھی سو رہے ہیں۔ ایک اندھا ایک اندھی۔ ایک دوسرے کا لحاف بنے اب بھی سو رہے تھے۔

گاڑی بان اندر گیا۔ ایک لمحہ کا وقفہ۔ پھر چابک کا چھپاکا اور اندھوں کی چیخ۔ مردہ بیل کی کھال زندہ انسان کی کھال پر، اور ان دونوں کی رگڑ، ایک دردناک فریاد بنکر جوش کی موسٹے ٹکرائی اور اسی میں کھو گئی.....

روز یہی ہوتا تھا۔ پو پھٹنے سے پہلے یہ اندھے ایک گاڑی میں بٹھا کر مختلف چوراہوں پر چھوڑ دئیے جاتے تھے۔ دن بھر وہاں بیٹھ کر وہ بھیک مانگا کرتے تھے۔ راہ چلتوں کا رحم حاصل کرنے کے لئے ان میں سے کوئی لنگڑا بن جاتا تھا کوئی اپنا چمڑا ادھیڑ لیتا تھا اور کوئی ٹنگلیاں لپیٹ کر سڑک پر پڑ جاتا تھا۔

وہ سب اندھے تھے، وہ کبھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان میں سے کسی کی پتلیاں سفید تھیں۔ کفن کی طرح۔ کسی کی آنکھیں سرخ تھیں

[1] ایک قسم کی دیسی شراب۔

ون کی طرح۔ کسی کی آنکھوں میں دو گڑھے تھے — قبر کی طرح، یہ بے مصرف اور پتھرائی ہوئی آنکھیں خلا میں کسی نامعلوم شے کو ڈھونڈا کرتی تھیں۔
ان میں کبھی آنسو نہ آتے تھے۔ وہ اندھے بھکاریوں کی آنکھیں تھیں۔

وہ سب خُدا کو یاد کرتے تھے: "اندھا گھوڑا کالا کمبل دے خُدا کی راہ پر" "میرا جھول بھر دے تجھے مولا ملے" "اندھے کا سوال ہے سب کے اُوپر"

خُدا کی رحمت جھُوٹے ٹکڑوں اور کانی کوڑیوں کی شکل میں ان پر نازل ہوا کرتی تھی۔ اُنکے بے رنگ تخیّل میں ہمیشہ سوکھی روٹیاں اور پھٹی چٹائیاں اُڑا کرتی تھیں۔ راہگیروں کی ٹھوکر سے بچنے کے لئے وہ چوراہے کے تاب دان کے قریب بیٹھ جاتے تھے۔ اس تاب دان میں سماج کی ساری عفونت اور غلاظت بیک جا جمع ہوا کرتی تھی۔ جو مرغی کلمۂ طیبہ کے فیض سے کھانے والوں پر حلال ہو کر راہیِ مُلکِ بقا ہو گئی، اُسکے پیٹ کی آلائش اور بچے ہوئے پر تاب دان میں پڑے رہتے تھے۔ نرم نرم گوشت انسان کے لئے، گرم گرم خُون کتوں کے لئے اور آنتیں چیل کوّوں کے لئے۔ شریفوں کے کھانے سے جو کچھ بچ جاتا تھا — سڑے ہوئے پھل اور سُوکھی روٹیاں — وہ تاب دان کے حصے میں آتا تھا۔ دوپہر کو جب آمد و رفت کچھ کم ہو جاتی تھی تو اپنے کتوں کی مدد سے اندھے تاب دان کا جائزہ لیا کرتے تھے۔ گوشت خور کتے سڑی گلی ترکاریاں اور پھل اپنے اندھے دوستوں کے آگے ڈال دیتے تھے اور وہ اُسے ایک نعرۂ مسرت کے ساتھ حلق کے نیچے اُتار لیتے تھے۔ پھر وہ جھوم جھوم کر سڑک پر چلنے والوں کو دُعائیں دینے لگتے تھے۔

اس طرح اندھیرا ہو جاتا تھا۔ وہ بھینسا گاڑی آتی تھی اور یکے بعد دیگرے ان اندھوں کو لاد کر اپنے ٹھکانے لے جاتی تھی۔ وہاں پہونچکر چودھری ان سب کی جامہ تلاشی لیتا تھا۔ ہر فقیر کو روز کم از کم چونّی کمانا ہی پڑتی تھی۔ اگر کوئی اس سے کم لاتا تو اُسے کھانا نہیں ملتا تھا اور مار الگ پڑتی تھی۔

محلہ کے بھٹیار خانوں میں برتنوں سے جو جھُوٹا بچ رہتا تھا ان ایک جگہ جمع کر کے اندھوں کے لئے بھیجدیا جاتا تھا۔ اُنکے جھول میں پسی ہوئی ہڈیوں، پسیجے ہوئے چاولوں اور باسی روٹیوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ کتے جھول میں منہ ڈال کر ہڈی نکالتے تھے اور اُسے جبڑے میں دبا کر اس طریقے سے چباتے تھے گویا کوئی پکا گویا الاپ رہا ہو۔ اندھے انہیں دیکھ نہ سکتے تھے، جب آواز سے پتہ چلتا بھی تو وہ ایک، آدھ بار دھتکار کر چپ ہو رہتے تھے۔ کتوں کے سوا ان کا ہمدم اور غمگسار کون تھا۔ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔

پھر وہ پھٹی اور سیلی ہوئی چٹائیوں پر اپنی گدڑیاں بچھا کر لیٹ جاتے تھے۔ اندھے ایک طرف اندھیاں دوسری طرف — اور کتے ان دونوں کے مابین، سخت گیر والدین کی طرح، ایک سدِ سکندری قائم کر دیتے تھے۔ جب اندھے کورس میں اپنی دعائیں یاد کیا کرتے تو پہلے تو کتے دھیان سے سنتے اور آخر میں ایک درشت آمین کے ساتھ وہ بھی اُنکے ہمنوا ہو جاتے تھے۔

پھر اندھوں کی اندھیری دنیا میں خاموشی چھا جاتی تھی۔ آرتی کا گھنٹہ ہوا میں ہلکا سا ترنم پیدا کر کے چپ ہو جاتا تھا اور اذان کی آواز بھی فضا پر ٹھہر ٹھہر کر کھو جاتی تھی۔ البتہ بہت دُور سے ایک دُکھی سارنگی کی ریں ریں مچھروں کی طرح بھنبھنا اُٹھتی تھی۔

جب اندھیرا دُور ہو گا تو صبح ہو گی۔ لیکن اندھوں کی دُنیا میں کبھی سورج نہ چمکے گا۔ دعائیں، کوڑے، سوکھی روٹیاں اور کتے — یہی اندھوں کا سنسار تھا۔

ایک شام کو جب اندھے اپنی کوٹھری میں آئے تو کتوں کی بازپرس سے انہیں کسی اجنبی کی موجودگی کی اطلاع ہوگئی۔ انہوں نے اپنی حساس ناکوں کو ہر طرف گھما کر فوراً بھانپ لیا کہ اُن کے گروہ میں کوئی اندھی عورت شامل ہوگئی ہے۔

"کیا نام ہے جی تمہارا؟" — "جمنا"

آواز میں جوانی گا رہی تھی۔

نینا جنم اندھا نہ تھا۔ کبھی وہ بھی آنکھ والا تھا، کبھی وہ بھی ہر رنگ کو دیکھ سکتا تھا۔ ہر صورت کو پہچان سکتا تھا۔ وہ کیمیا سازی کے کسی کارخانے کا مزدور تھا۔ ایک روز تیزاب کی بوتل چٹخ گئی، اُسکے کچھ چھینٹے نینا کی آنکھوں میں پڑے اور وہ اندھا ہوگیا۔ کارخانہ والوں نے اُسے نکالدیا۔ برسوں وہ مارا مارا پھرتا رہا اور اب یہاں آ پھنسا۔

ابھی اُس کے تن میں جوانی کی رگ ماؤف نہ ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ شدت سے محسوس کرتا تھا کہ تاریکی کی عمیق چادر کو پھاڑ کر کوئی چیز روشنی میں آنا چاہتی ہے۔ اگر کوئی اسے خیرات میں کچھ دیتا تو اُس کی پیٹھ پھرتے ہی وہ اسے ایک گندی گالی دیتا تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ اگر اس میں قوت ہوتی تو وہ ان پیسوں کو آگ میں تپا کر ان سخیوں کے پپوٹوں پر رکھ دیتا۔ وہ باآوازِ بلند راہگیروں کو بددعائیں دیا کرتا تھا اور یہ لوگ کوئی پہونچا ہوا درویش سمجھکر اسکی عزت کرتے تھے۔

جوانی کا مقناطیس جوانی ہے۔ جب رات بھیگنے لگی تو نینا کو نیند میں یہ محسوس ہوا کہ کوئی اُس کی گُدڑی کھینچ رہا ہے۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ کوئی کتا ہے لیکن ایک نرم ہاتھ اُس کے پیروں سے لگا اور وہ اُٹھکر بیٹھ گیا۔

"جاڑا لگ رہا ہے جمنا؟"

"ہاں جی"

نینا نے اپنی گدڑی اُسے اُڑھا دی اور خود سِرہانے بیٹھ گیا۔ اُس کی زندگی بنجر زمین تھی جس میں ایک پودا خود بخود اُبھر آیا تھا۔ نینا اندھیرے میں دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ اسے وہ دن یاد آئے جب اُس کی رگوں میں تازہ خون بہتا تھا۔ کس طرح کھیت کی مینڈوں پر وہ دیہاتی لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔ غلیل سے پانی کی کلسیوں کو توڑ دینا، سر سے گھاس کے گٹھوں کو گرا دینا، لڑکیوں کے میٹھے میٹھے کوسنے ———

وہ دن اور اب!!۔

اندھوں کو ایسا لگنے لگا گویا جاڑے کی راتوں میں دھوپ نکل آئی ہے۔ جمنا کے بھولے گیت سُنکر اُن کی بے نور آنکھیں پُرنم ہوجاتی تھیں۔ اس کی الھڑ ہنسی اُنہیں ایک نئی مسرت کا پیام دیتی تھی۔ جب وہ چلتی تھی تو اندھے سہم جاتے تھے کہ کہیں وہ گر نہ پڑے۔ کئی راتیں آئیں اور گذر گئیں۔ ایک بار جب سب سو چکے تھے تو جمنا نے نینا کو اپنی زندگی کا افسانہ سُنایا تھا۔

وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور اندھی ہونے کے باوجود حسین تھی۔ اس کا باپ کسی مہاجن کی دوکان پر منشی تھا۔ جب جمنا کی عُمر چودہ سال کی ہوئی تو اُس کا باپ مر گیا۔ کوئی ایسا نہ تھا جو بوڑھی ماں اور اندھی بیٹی کی دستگیری کرتا۔ ایک ایک کر کے تمام زیور اور برتن بنیے کی نذر ہوگئے۔ تاہم ان کے دُکھ کے دن نہ بیتے۔ خستہ حالی بڑھتی گئی اور فاقوں کا طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ پہلے تو محلہ والوں میں سے کوئی ایک دو وقت روٹی دیدیتا تھا۔ لیکن آخر کب تک۔

اُنہیں دنوں جمنا کے گھر اُس کی کسی دور دراز کی خالہ کا آنا ہوا۔ جانے کیوں ماں عرصہ سے اُس کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔

کئی روز تک اماں اور خالہ ایک کونے میں بیٹھکر سرگوشیاں کرتی رہیں۔ ایک روز ماں نے جمنا سے کہا کہ آج تجھے اپنی خالہ کے گھر جانا ہے۔ صبح سے اُس کی کنگھی چوٹی ہونے لگی، اور جب جمنا اپنی پُراسرار خالہ کے ساتھ رکشا پر بیٹھ گئی تو اُسے اپنی ماں کی ہچکیوں کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔ معلوم نہیں کیوں جمنا کا دل اندر سے بیٹھنے لگا اور وہ کسی آنے والی مصیبت کے خوف سے آپ ہی آپ لرز اُٹھی۔

خالہ نے جمنا کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ گھر پہونچتے ہی اُسے طرح طرح کی مٹھائیاں کھلائیں۔ دیر تک اُسکا بناؤ سنگار کرتی رہی۔ تاہم جمنا کا خوف ہر آن بڑھتا ہی جاتا تھا۔

بہت دیر ہوگئی، دیا جلے، نیچے کی سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ سُنائی دی، قدم اتنے بھاری تھے کہ جمنا سمجھ گئی، کوئی مرد ہے۔

دروازہ کھلا اور خالہ جان "آیئے سیٹھ جی" کہتی ہوئی آگے لپکیں۔ تھوڑی دیر دونوں میں کانا پھوسی ہوتی رہی، پھر روپوں کی چھن چھن ہوئی، خالہ سہمی ہوئی جمنا کے پاس آئی، اُسکے آنچل میں روپے باندھ دئے اور اُسے پچکار پچکار کر باہر چلی گئی۔

قبل اس کے کہ جمنا کچھ سمجھے، اُسے اپنے مُنہ پر کسی جانور کا گرم گرم سانس محسوس ہوا۔ اس کے سخت ہاتھوں نے جمنا کی کلائیاں پکڑ لیں اور اُسے اپنے آغوش میں گھسیٹ لیا ــــــ

جب جمنا گھر لوٹی تو وہ عورت بن چکی تھی۔

کسی شام کو جب حسب دستور اندھے فقیر بھینسا گاڑی پر لَوٹ رہے تھے، تو گاڑی بان اور چودھری میں باتیں ہونے لگیں۔

"چودھری، اور جو بھی ہو تھی تو لونڈیا سُندر۔"

"اجی، ایسی ویسی، سونے کی چڑیا تھی۔ پورے پانچ سو روپے ملے، تھوڑے نہ بہت، بھیا، لڑکی کیا تھی، گُڑیا تھی گُڑیا۔ آنکھ نہ ہونے سے کیا ہوا۔"

نینا کے ہوش اُڑ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا "چودھری، کیا بات ہے؟"۔

گاڑی بان زور سے ہنسا اور اُس کے مُنہ پر کوڑے کا دستہ کونچ کر کہا "بیٹا، بہت مزے کئے، اب چڑیا اُڑ گئی۔ وہ اندھی ٹھکانے لگ گئی، اب لکیر پیٹا کرنا۔"

چودھری نے گاڑی بان کے ہاتھ سے کوڑا لیا اور نینا کو بیدردی سے پیٹنا شروع کیا۔ لیکن نینا بےحس وحرکت بیٹھا رہا۔ وہ کیوں روئے، کیوں تڑپے، اب زندگی میں رہ کیا گیا تھا۔ اُس کی دُنیا ایک مرتبہ پھر روشن ہوئی تھی۔ لیکن آج وہ جوت سدا کیلئے بُجھ گئی۔

سُورج مغرب میں ڈوب چکا تھا اور بجلی کے ننھے گھنگھروؤں کی طرح ہوا میں ناچ رہے تھے۔

نینا نے کھانے کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ جب چودھری کا بیٹا فقیروں کے چٹیل میں ٹکڑے ڈال کر باہر چلا گیا تو وہ چپکے سے اُٹھا، لکڑی ہاتھ میں لی اور باہر نکل گیا۔

سڑک چل رہی تھی۔ اندھا لپکتا ہوا ایک گلی میں گھُسا اور اس بھول بُھلیاں میں غائب ہوگیا۔

ہر راہگیر سے وہ پوچھتا "بھائی تم نے کسی اندھی بھکارن کو ادھر جاتے دیکھا ہے؟" کوئی حقارت سے اُسے گھور کر چلا جاتا تھا، کوئی ایک دھپ جما دیتا تھا، کوئی ہنس پڑتا تھا۔ جب کوئی سنسان سڑک آتی تو اندھا اپنی بے بصر آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا کر آواز میں "جمنا جمنا" پکارنے لگتا تھا۔

آدھی رات گذر گئی اور نینا چلتے چلتے تھک گیا۔ جھولا سرہانے رکھکر وہ فٹ پاتھ پر لیٹ گیا اور فوراً ہی سو گیا۔ معلوم نہیں وہ کتنی دیر سوتا رہا لیکن سینکڑوں آدمیوں کے شور و غوغہ نے اُسے چونکا دیا۔ پہلے تو وہ سمجھا ہی نہیں کہ ماجرا کیا ہے۔ لیکن جب تابڑ توڑ کئی لٹھ اُس کے سر پر پڑ چکے تو اُسے معلوم ہوا کہ یہ پولیس والوں کی لاٹھیاں ہیں۔ پولیس کی لاٹھیاں —— قسمت سے زیادہ جابر اور دوست سے زیادہ بے مروّت! —— پولیس کی لاٹھیاں —— طوفان سے زیادہ تیز اور امیروں سے زیادہ بےحس! ۔ فٹ پاتھ پر سونے والے آوارہ گردوں کی سرزنش کے لئے آج پولیس کا "میسا دی" "ہلّہ" نکلا تھا۔

اندھا بھکاری کہاں بھاگتا۔ وہ سر پر ہاتھ رکھکر پکارتا رہا "بابا میں اندھا ہوں" لیکن لاٹھی بھی اندھی ہوتی ہے۔

جب یہ آندھی گذر چکی تو نینا آگے بڑھا۔ اس کے سر اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ کئی بار گرا اور پھر اُٹھکر چلا۔ جب وہ اس سڑک کے موڑ پر پہونچا تو اُسے سامنے کے کوٹھے سے گانے کی آواز سنائی دی۔ اندھے کی روح کانپ اٹھی۔ یہی وہ آواز تھی جس کی جستجو میں وہ مارا مارا پھر رہا تھا۔ لیکن یہ آواز کہاں سے آرہی تھی؟ —— گیت کی تان اکثر وحشیانہ قہقہوں میں ڈوب جاتی تھی۔ بیچ بیچ میں بوتلیں اوپر سے نیچے گر کر چکنا چور ہو جاتی تھیں۔

اندھا سڑک پر بیٹھ گیا۔

آسمان سے ایک تارا ٹوٹا، اس نے اندھے کو دیکھا لیکن اندھا اُسے نہ دیکھ سکا۔

اختر حسین رائے پوری

عقدِ مکرّر

جمالی کے چہرے پر جوانی کی شان ابھی باقی تھی، اور اُس کے گھنے بال بانکپن کا طرّہ معلوم ہوتے تھے۔ اُسکی روشن آنکھوں سے نکلنے والی نگاہیں نرم بھی تھیں اور نفوذ کر جانے والی بھی۔ اُس کی شان میں غرور کی آمیزش تھی اور اُس کی ادا خودداری و سربلندی کی صورت تھی۔ اُس کی شخصیت کچھ اس نوع کی تھی جس میں سے سکون آمیز اطاعت طلبی کی قوت نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ اور اس میں ایک فاتح کا سا انداز تھا جسے اُس کے اُونچے قد نے اور ابھار دیا تھا۔ وہ اعلیٰ اور اثر انداز ذہانت کا دیوتا معلوم ہوتا تھا۔

مُلک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُسکے نام کا شہرہ تھا، اور دولت اُسکی کنیز بن گئی تھی۔ کوئی دروازہ ایسا نہ تھا جو اُسکے لئے ہر وقت کھُلا نہ ہو، اور کوئی صحبت ایسی نہ تھی جہاں اس کا خیر مقدم تپاک سے نہ ہوتا ہو۔

وہ ایک شاعر تھا، ایک خوش فکر انسان جس کا ذہن تصوّر کر سکتا تھا، دیکھ سکتا تھا؛ اور پھر اُسے ایسی خوش اسلوبی سے ترتیب دے سکتا تھا کہ دوسرے اپنی اپنی ذہانت کے مطابق تصوّر و مشاہدہ کر سکیں۔ غرض اس کی انفرادیت کا پودا بڑھکر بار آور ہو رہا تھا۔ جمالی کے متعلق بلا تامّل کہا جا سکتا ہے کہ اس کی فلک پیما ذہانت کے قدرتی حق نے اُسے انسانوں میں بادشاہ بنا رکھا تھا۔ اُس کے عالی تخیلات اور روشن تصوّرات، انسانی زندگی کے آلام و مصائب کا مرہم ثابت ہوتے تھے۔ اسکے تخیّل کے باغ میں فرزانگی کے پھُول کھلتے تھے۔ فطرت یعنی زندگی کے گوناگوں پہلو اس کی زبان سے بولنے لگتے، چشموں کی گنگناہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ، محبت کی محویت، احساس کی نزاکت، تہذیب کے انداز، اور تمدّن کی آویزشیں اُسکی بنائی ہوئی تصویروں میں زندہ ہو جاتے تھے ——— اس کا فنِ شعر ایک جادو تھا!

سیر کی غرض سے جمالی لاہور سے کلکتے آیا ہوا تھا۔

———— ۲ ————

نجمہ کے خدوخال میں بلا کی جاذبیت تھی۔ اس کی صورت میں انتہائی نظر فریبی تھی۔ اُس کی آنکھیں مدھ ماتی تھیں، اُن سے نکلنے والی نگاہیں خنک محسوس ہوتی تھیں۔ اس کے دہانے کی ساخت نجمہ کے اندر بڑھتے ہوئے جذبۂ امیّت کا اظہار کر رہی تھی۔ بل کھائی ہوئی زُلفوں کی ایک خودسر لٹ اس کی نیچی مگر فراخ پیشانی پر کھیلتے رہنے کی عادی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک ایسا رنگِ استہزا تھا جو انسانی طبع و مزاج کا مطالعہ کرنے والوں یا ایک جاہل و ناتراشیدہ آقا کے ذہین و مہذّب غلام یا اس شخص کی صورت میں نظر آتا ہے جسے حقیقت و صداقت کے خنجر کی خوفناک دھار کا احساس ہو چکا ہو ——— اس استہزا سے میرا مطلب اندازِ طبیعت کے اُس اظہار سے ہے جسے اصطلاح میں "کلبیت" (متعلق بہ دیوجانس کلبی) کہا جا سکتا ہے[1]۔

سنیما میں ابتدائی نغمہ بج رہا تھا، آرکیسٹرا کسی اچھے اُستاد کے تخیّلات بیان کر رہا تھا۔ بیلے اور سارنگی سے دل آویز بول نکل

---

[1] "کلبیت" کو میں نے انگریزی لفظ Cynicism کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

رہے تھے۔ رُوح کو حرکت میں لے آنیوالا نغمہ اپنی زندگی جی رہا تھا۔ یہ نغمہ نجمہ سے باتیں کررہا تھا، اُس کی رُوح کو غسل دے رہا تھا۔ وہ اس موسیقی کو سُنکر ایک اہتزاز محسوس کررہی تھی۔ اس کے اندر نجمہ کو ایک سُنا ہوا ترانہ سُنائی دے رہا تھا ـــــ آہ، کیا وہ اس آواز کو پھر بھی سن سکے گی!۔

اس موسیقی نے اُسے محسوس کرادیا کہ وہ جو کچھ بھی بن گئی ہو اُسکی رُوح ملوث نہیں ہے، وہ ہنوز بے داغ ہے! اُسکی رُوح کو مردوں اور روپے کی فناکاریاں نہیں چھوسکی ہیں! نجمہ کو اسوقت کی موسیقی خدا کی آواز معلوم ہورہی تھی!۔

۳

جمالی جب سینما میں داخل ہوا تو اُس کی نگاہیں اُس عورت پر پڑیں جو موسیقی میں ایسی محو تھی، موسیقی نے جس کے چہرے پر عفت کا یہ غازہ چڑھادیا تھا! نجمہ پر نظر پڑتے ہی وہ چونک سا پڑا۔ اسکے اس وقت کے احساسات عجیب تھے:

"اوہ، آخر کار نجمہ مل گئی!" اس خیال کے ساتھ وہ ایک تڑپ میں اُسکے پاس پہونچ جانا چاہتا تھا۔ نجمہ کے خلاف توقع مل جانیکی خوشی خود اس کے لئے بھی حیرتناک تھی، اور دریا کے ایک زوردار ریلے کی طرح تھی جو پیراکوں کے بھی پاؤں اُکھیڑ دیتی ہے: "اوہ، نجمہ!" اسکے بطون نے یہ نام دوہرایا، لیکن اس جذبے کی عین عروجی حالت میں اس پر اداسی سی پڑ گئی، اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ـــــ اسی لمحے میں اسکی نگاہوں نے نجمہ کے انداز و لباس سے کچھ سمجھا: نجمہ.... یہ کچھ ہوگئی!۔

اس احساس و خیال کے ساتھ اُس کے قوائے ذہنی مفلوج ہوگئے، اور وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا، اب اُسکے سامنے نہ تماشائی تھے اور نہ تماشہ گاہ، نہ روشنیوں کی جگمگاہٹ تھی اور سازوں کی دل رُبائی۔ وہ اس وقت شاعر بھی نہ رہا تھا۔ بس ایک معمولی رسم و رواج کا پابند انسان۔

یاد ماضی نے اُس کے دماغ کو گزرے ہوئے مناظر کی جولانگاہ بنادیا۔ اور جمالی بیتے ہوئے دن غلیش کے "پھر جینے لگا، ایک ایک واقعہ زندہ ہو کر اُسکے سامنے آنے لگا۔

کہر یادُ ھندلکے میں جس طرح نظر آتا ہو، جمالی ایک نوجوان کو دیکھتا ہے جو عسرت و کس مپرسی کی زندگی جی رہا ہے، لاغر جسم، دُرشت خط و خال کا ایک انشائی نوجوان جس کے نتائج فکر شاذونادر ہی "منظور" ہوتے ہیں، کیونکہ وہ زمانہ و ابنائے زماں کے متعلق کچھ ایسے جاندار خیالات لئے ہوتے ہیں کہ اخبار اور رسالے اُن کو شائع کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ اس نوجوان کے مضامین اور نظمیں مسترد ہوتی ہیں اور وہ فاقے کرتا ہے ـــــ بیکس و تنہا نوجوان بھوک اور تمدن کے دو خوفناک دیوؤں سے جنگ کررہا ہے ـــــ ایسی جنگ جو فطانت کو اگر تباہ نہیں کردیتی تو پھر اُسے خوفناک حد تک تیز کردیتی ہے۔ یہ اوقات بسری اس نوجوان کو خود سر بنادیتی اور اس میں غصہ آمیز ضد پیدا ہوجاتی ہے۔

پھر ایک وقت آجاتا ہو کہ اس جوانی کی حالت میں تغیر ہوتا ہے، وہ جب تکلیفوں سے دم خفا ہونے کی حد تک تباہ ہوچکتا ہو تو اپنے "حال" کو بُرا کہتا اور اُسے مٹاسکنے کی آرزو کرتا ہے ـــــ وہ نیم دیوانہ ہوجاتا ہو!۔

اب وہ جو کچھ لکھتا ہے اس میں سماج سے نفرت کا اظہار ہوتا ہے، اس میں سے قاتلانہ ارادوں کی بو آتی ہے۔ وہ سب کو فنا کردینا چاہتا ہے کیونکہ وہ خود فنا کیا جارہا تھا۔

ٹھیک اس حالت میں ایک فرشتۂ غیب نمودار ہوتا ہے، اور یہ فرشتہ اس کا محافظ فرشتہ ثابت ہوتا ہے! ایک سترہ سال کی لڑکی پژمردہ سے پھول کی ایک تصویر، رات کے وقت ایک گلی میں موٹر سے بچتے ہوئے نالی میں گر جاتی ہے۔ یہ اُسے اُٹھاتا ہے۔ وہ ناتواں ہے، اس لئے کہ بھوکی ہے جُسن اتفاق سے نوجوان کی جیب میں کچھ دام تھے۔ وہ چوٹ لگ جانے کے خیال سے گرم دودھ لاکر پلاتا ہے۔ لڑکی کے حواس برجا ہوجاتے ہیں۔ وہ اُس کے گھر پہونچانے جاتا ہے۔ راستے میں اُسے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کا شوہر اوباش ہے اور اپنی کمسن بیوی سے بس اتنا تعلق رکھتا ہے کہ وقت بے وقت جب ضرورت پڑتی ہے، بیوی کو مار پیٹ کر اُس کے میکے بھیج دیتا ہے تاکہ وہ اپنے باپ سے کچھ رقم لے آئے یا ماں کا اندوختہ۔ ورنہ ہفتوں صورت نہیں دکھاتا اور نہ پروا کرتا ہے۔ طلاق دینے پر بھی رضامند نہیں ہوتا کہ اُسے اپنی ضرورتیں رُک جانے کا اندیشہ تھا۔

اس بلا نصیب نوجوان کو اس روز ایک مشاعرے سے ایک نظم کی قیمت حاصل ہوئی تھی۔ اور شاید وہ اس طرح اپنے زائیدہ ہائے طبع کو کسی کا متبنّٰے نہ کرتا اگر وہ اس رقم کو احتیاج سے دائمی مفارقت کے بیمے کیلئے نامزد نہ کرتا۔ اُس نے دن میں ٹھان لیا تھا کہ ایک شب حسب خواہشِ دل کھا پی کر اس زندگی کو خیرباد کہدے گا۔ لیکن اِس وقت اُس کے سامنے ایک اہم تر مسئلہ پیش ہوگیا تھا۔ وہ اپنی ساری پونجی اُس لڑکی کو دیدیتا ہے۔ اور جب اُس کے گھر سے اپنے مکان پر پہونچتا ہے تو اپنی خودکشی یا صبح کی نان و نمک کی فکر کے عوض اپنی طبیعت میں ایک قسم کی جولانی اور اُمنگ محسوس کرتا ہے۔ زمانے کو تاریک و غلیظ دیکھنے کے بدلے اسے شفاف و نورانی دیکھتا ہے۔ اب وہ دُنیا سے نفرت نہیں کرتا بلکہ رافت برتنا چاہتا ہے۔

صبح جب وہ بیدار ہوتا ہے تو نہایت سکون آمیز حسیات کی حالت میں ایک منظوم افسانہ لکھتا ہے ـــــ خود اپنا افسانہ جو ابھی انجام کو نہیں پہونچا ہے، لکھ چکنے کے بعد اس کو پڑھتا اور مسکراتا ہے۔ ایک موقر رسالے کے دفتر میں جاتا ہے اور معقول معاوضہ پاتا ہے۔ یہ کامیابی اُسے براہِ راست اس لڑکی کے پاس لے پہونچتی ہے، کیونکہ اس کے خیال میں اس کامیابی کا سبب اسی کی ذات تھی۔ وہاں پہونچکر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ رات اُس کا شوہر آیا تھا اور یہ [illegible] بتانے پر کہ اُس نے یہ رقم کہاں سے پائی لہولہان کر کے ڈال گیا اور رقم چھین لے گیا ہے۔

نوجوان حُسنِ مجروح و سوگوار کی اِس مُورت کو شفاخانے لے جاتا ہے اور جب تک اُس کی چوٹیں اچھی ہوں برابر اُسکے پاس جاتا رہتا ہے، اُس کی دوا و غذا میں اہتمام کرتا ہے، اُس کے لئے لباس مُہیا کرتا ہے ـــــ اُسکے پاس بیٹھکر اس کا دل بہلاتا اور لطف و مہربانی کی باتیں کرتا ہے۔ لڑکی جس نے اس مہر و التفات کا مزا کبھی نہ چکھا تھا اُس سے مالوف ہوجاتی ہے۔ اور جب وہ شفاخانے سے نکلتی ہے تو نوجوان کے ساتھ چلی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔

ایک مُصیبت زدہ کی احسانمندی، اور ایک محبت کی بھوکی کی محبّت کے جذبات، ایک غریب لڑکی سے جو اور جیسی خدمت کرا سکتے ہیں وہ اس نوجوان کی ویسی ہی خدمت شروع کر دیتی ہے۔ اس محبت آمیز خدمت کا تجربہ اس نوجوان کو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

لڑکی نہ صرف خوش جمال تھی بلکہ ذہین بھی تھی، اور اس کے ساتھ جب محبّت بھی شامل ہو تو نوجوان پھر کیوں نہ فردوسی مسرّتوں سے آشنا ہوجائے! اب وہ جو کچھ لکھتا ہے وہ شائع ہوتا ہے، اور اُس کی شہرت، عزّت، اور ساتھ ساتھ دولت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

عیش وعشرت کی زندگی بعض نازک فطرتوں کو چوندھیا دیتی ہے، اور بعض شستہ طبیعتوں کے لئے ناقابل مزاحمت کشش رکھتی ہے۔ فراوانی دولت کی جگمگاہٹ سے ایک تفلسف ہی بچ سکتا ہے۔ شاید اس نوجوان کی شاعری نے ابھی تک اسے فیلسوفیت کا سبق نہیں دیا تھا۔ ورنہ کامیاب و کامران ہو کر اُس میں یہ تغیر رُونما نہ ہوتا۔ یہ نوجوان سماج میں مقبول عام پاکر رفتہ رفتہ اس لڑکی کی طرف سے بے پروا ہونے لگتا ہے، اور پھر بے رحمی سے بھی باز نہیں رہتا۔ یہانتک کہ وہ لڑکی اس حالت کو سہار نہیں سکتی تو ایک روز اُسے چھوڑکر بھاگتی ہے اور پھر پتا نہیں چلتا۔

اس نوجوان کی کامرانیاں اتنی مکمل تھیں کہ اس لڑکی کے چلے جانے کا اس پر معمولی اثر ہوتا ہے، اور اس کی معمولی تلاش و جستجو بھی اُس کی بڑھی ہوئی مصروفیتوں میں گم ہو جاتی ہے۔ فطری رنج وافسوس ہوتا ہے لیکن سوسائٹی کی رنگ رلیوں میں جلد محو ہو جاتا ہے۔ اسکی آرزوؤں کے پورا ہوتے رہنے اور اُمیدوں کے برآتے رہنے سے اِس نوجوان میں غرور کی شان پیدا ہوتی رہتی ہے۔ وہ اپنی حالت پر مفتخر ہے، کیونکہ عالی خاندان اور پُر جمال خواتین کا تبسم اس کے خیر مقدم میں فرشِ راہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب یہ تمام مصروفیتیں اور دلکشیاں اُس کا دل نہیں بہلا سکتیں اور وہ اپنے قلب کے اندر ایک خلا کا احساس کرتا ہے ——— اس ذلیل اور مسترحم حالت کا احساس کرتا ہے جو کہ ایک مرد کو ایسی ہی حالتوں میں ہو سکتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ہلکی سی ٹیس اُس وقت اُٹھتی ہے جب اُسے وہ لڑکی یاد آتی ہے جس نے اُسے فنا ہونے سے بچالیا ——— جس سے وہ واقعی محبت کرتا ہے!۔

یہ نوجوان خود جمالی تھا۔

گزرے ہوئے زمانے کا خیال گزر گیا۔ جمالی کی چشمِ تصوّر کے سامنے سے ماضی کا غبار چھٹ گیا اور سامنے نجمہ بیٹھی نظر آئی۔ وہ لڑکی نجمہ ہی تھی۔ لیکن کیا وہ واقعی نجمہ کو دیکھ رہا تھا؟ کیا نجمہ سچ مچ ...... اس درجہ ذلیل ہو گئی ہے؟ اسکے آگے جمالی کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا، بجز اسکے کہ ایسا کیوں ہو سکا؟

اس سوال کے ساتھ استادِ عشق نے اُسے فلسفے کا پہلا سبق پڑھایا۔ کیا نجمہ اب ملعون ہے؟ کیا اسے ملعون ہی رہنا چاہیئے؟ اگر ایسا ہی تو ساری دُنیا ملعون ہے ——— وہ خود سب سے پہلے ملعون ہے! اسی خیال میں اس کا سر چکرانے لگا۔

لیکن یہ حالت بھی آنی تھی۔ فرزانگیِ محبت نے اُس کے کان میں کہا کہ اس کی یہ عصبیت ایک خام کاری ہے اور یہ اظہار اس خام کاری کا آخری اظہار تھا! جمالی نے محسوس کیا کہ محبت کا ضابطہ تمام قوانین سے بالاتر و قوی تر ہے۔ اِس خیال کے ساتھ اس پر ایک سکون، ایک پُر مسرت سکون کی حالت طاری ہو گئی۔ اب وہ روشنیوں کو زیادہ جگمگ دیکھ رہا تھا، موسیقی زیادہ شاندار محسوس ہو رہی تھی۔

جمالی نے محسوس کیا کہ نجمہ درحقیقت اُس کے جذبات اور خیالات کی ملکہ ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ نجمہ کو بے خطا سزا ملی! اِس خیال نے اس کی آرزوؤں میں ہیجان پیدا کیا اور اس کی ساری ہستی ہل گئی۔ بیلا اور سارنگی آخری سانس لینے ہی کو تھے، اب وہ خدا سے باتیں کر رہا تھا یا خدا اس سے!

نجمہ نے ابھی تک جمالی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو نغمہ و ساز کو دیکھ سن رہی تھی، موسیقی کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی ——— اور

اپنا درد دکھ، سب بھول گئی تھی۔

دیکھنے والوں نے جمالی کے اس طرح کھڑے ہو جانے کو نشست کے انتخاب کی وجہ باور کیا ہوگا۔ اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتے تھے، جمالی اپنی جگہ سے بڑھا، اور اس کا ہات نرمی و محبت کے ساتھ نجمہ کے شانے پر جا ٹھیرا۔ اس نے چونک کر دیکھا، ہیں! جمالی! وہ بیتاب ہوگئی۔ ــــــ کانپنے لگی۔ جمالی کا چہرہ دیوتاؤں کی طرح دمکتا نظر آیا۔ نجمہ سب کچھ بھول گئی، اور صرف یہ محسوس کرنے لگی کہ جمالی تو اس کا جانِ جاں ہے!۔

لیکن وہ معاً جاگ پڑی ــــــ اس کا خیال جاگا: اس طرح ذلیل و خوار ہو چکنے کے بعد؟ اس سوال سے اسکا دل بیٹھنے لگا۔ محبت کی نظر تیز اور دور رس ہے۔ جمالی سمجھ گیا۔ وہ برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا ہات اپنے ہات میں دبایا۔ گویا اس نے کہدیا کہ محبت کا قانون نرالا ہے ــــــ اسکی پہلی دفعہ درگزر و فراموشی ہے!!۔

اس یقین نے نجمہ کے سامنے محبت کے تقدس اور شاندار مسرتوں کی جنتیں پیش کردیں۔

ٹھیک اس موقع پر پاکیزہ و مقدس موسیقی کا آخری نغمہ جمالی اور نجمہ پر اس طرح برسا جیسے آسمان سے نزولِ برکات ہو ــــــ محبت نے دونوں کو کامل بنادیا تھا۔

"آؤ چلو، محبت کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوسکتی" جمالی نے اسکو اٹھاتے ہوئے کہا۔

ل۔ احمد

دل جسکو پیار کرے!

یاد میں تیری جہاں کو بھولتا جاتا ہوں
بھولنے والے کبھی تجھکو بھی یاد آتا ہوں؟

چار سال سے وہ مجھے چاہے جا رہی تھی اور مجھکو مطلق اسکا احساس نہ تھا۔ یہ کہنے میں تو شاید میں غلطی کر رہا ہوں کہ مجھکو احساس نہ تھا۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ اس کی باحیا حسین آنکھیں میرا دُور تک تعاقب کیا کرتی تھیں۔ تعطیلات میں وہ میری آمد کی بیچینی سے منتظر رہا کرتی تھی اور جب میں اُس کے مکان پر پہونچتا تو مسرت و شرم کی درمیانی حالت میں مجھ سے کہتی "میرا خیال تھا کہ تم چھٹیوں میں لکھنؤ چلے جاؤ گے۔ اچھا ہوا یہاں آ گئے۔ میں روز ـــ" اس کے بعد مسرت پر حیا غالب آجاتی اور وہ چُپ ہو جاتی۔ ان باتوں سے مجھے دُھندلا سا خیال ہو گیا تھا کہ وہ میری بے کیف ہستی میں دلچسپی لیتی ہے۔ مگر محض دلچسپی۔

آہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی تمہیں چاہے اور تم کو خبر نہ ہو۔

باوجود اس قدر رکھ رکھاؤ کے وہ میرے عشق میں دل سے اپنے جذباتِ محبت کی پردہ داری نہ کر سکی۔ ایک روز میں بالاخانہ پر سو رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے صبح اُس سے اپنے رومال دھونے کی درخواست کی تھی جن کو سکھانے کے لئے اُس وقت وہ اُوپر آئی تھی۔ مجھ پر نیم غنودگی سی طاری تھی اور اسی حالت میں میرا بایاں ہاتھ بُری طرح پلنگ پر سے نیچے لٹک رہا تھا۔ اس کی نظر پڑ گئی۔ آہستہ سے اُسکو سنبھالا اور میرے سینے پر رکھدیا۔ میری آنکھ کھل گئی وہ اب تک میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔

"آپکے رومال صاف کر دئے گئے ہیں"۔

"بڑا کرم فرمایا" میں نے مزید شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

نیچے کسی کے پیر کی چاپ ہوتی اور وہ بجلی کی طرح دوسری راستے اُتر کر غائب ہو گئی۔

اسکے بعد تقریباً چھ ماہ تک ہماری مُلاقات نہیں ہوئی۔ میں نے کس قدر آسانی سے چھ ماہ کہدیا ہے۔ یہ طویل مدت مجھے چھ صدی کے برابر معلوم ہوئی۔ میں روز اسکو دل میں یاد کیا کرتا تھا۔ چاہتا تھا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر اس کے پاس پہونچ جاؤں۔

افسوس محبت اپنے نزول کا وقت و محل دیکھنے کی عادی نہیں ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں اپنی بیوی کی مسلسل علالت (جو اب سخت خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی) کے باعث سخت پریشان و غیر مطمئن زندگی بسر کر رہا تھا۔ بیوی کی بیماری کا تقاضہ تھا کہ اُس کے لئے جلد از جلد اچھی سے اچھی طبی امداد بہم پہونچائی جائے۔ بہتر سے بہتر مقام پر اس کو رکھا جائے اور زیادہ سے زیادہ وقت اُسکے پاس صرف کیا جائے۔

میں کبھی اپنے متعلقین کے باب میں بے پرواہ اور کم التفات نہیں رہا ہوں۔ میں ہر عزیز سے بخیالِ قرابت داری یا علائقِ خون، تعلقات نبھائے رہنے کا عادی نہیں ہوں، بلکہ انسانی فرض سمجھکر اُن سے روابط قائم رکھتا ہوں اور اس فرض شناسی ہی سے ہمیشہ نقصان اُٹھاتا رہتا ہوں۔ قطع نظر بیوی کی محبوبیت کے میں نے بہ پاسِ فرض اس کے علاج میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ لیکن وہ صحت یاب ہونے میں، یا قدرت اُسکو صحتیاب کرنے میں خدا جانے میری جانب سے کونسے گرانقدر انسانی جذبے کی قربانی کی منتظر تھی کہ اُس کی صحتیابی کے کوئی آثار ہی نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے اپنی جسمانی آسائش، اپنے مطالعہ کی راحت اور دوستوں کی سوسائٹی کی مسرت سب کچھ بیوی

سول کے نذر کر دی تھی لیکن وہ خلشِ بے زبان،
بات کا تلاطم ہیجان جو روزِ موت کی طرح میرا
قدر وزن و عرض کے ساتھ برقرار تھا عریض
ن تسلیم نہیں کریں گے لیکن اس عجیب ارد گیر
دہ وزن تھا، خباثت سے زیادہ صلابت تھی۔
پابندی تھی۔ محبت کی جمیل نازنین کی تعریف میں
"خباثت" وغیرہ جیسے نامبارک وغیر شعری
ہیں۔ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ محبت کی
انتقام مجھے آخر کسی طرح تو لینے دیجئے!۔
عرض یہ کر رہا تھا کہ میں نے اپنی خارجی و جسمانی
وی کی تیمارداری کی خاطر ترک کر دی تھیں۔
ے پر مسلسل ضرب لگا کر بھی میں اس کو اس قابل
، ذرہ وہ میری بیوی کی تندرستی کی کوششوں
رض و وجدان میں ہمیشہ جنگ رہی ہے۔ ہائے
قدر نازک ہو گئی تھی۔ پہلے بیوی کا علاج کرتا
ج ! ادھر دنیا والوں کا خوف، اعزا و اقربا کے
بنا فرض شوہرانہ، ہمدردی انسانی۔ بلیت
واحد محبت کی پری کی پرطنز مسکراہٹ !۔
بات، اس زندگی کے خونیں میدان، اس حیوانی
سلاح سے فتح کیا جا سکتا ہے !۔
سرمایہ کی آخری پائی تک تمہارا علاج کراؤنگا۔
سانس تک تمہاری تیمارداری میں صرف
سے کہتا۔ دفعتاً دل کو ایک جھٹکا سا لگتا اور
لب پر تحقیر و طنز آمیز قہقہہ کی آواز آتی۔ میں
ذں کی طرح اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگتا۔
سے اپنی بیوی کو تندرست کر دینے کی منت
ب ہو جاتا۔ میرے منہ پر ایک طمانچہ سا لگتا
اور کوئی باطنی قوت کان پکڑ کر کہتی "کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟ کیا تیری
اپیل میں صداقت ہے؟ کیا تیری تمام حرکات غیر منافقانہ ہیں؟"
میں اپنے تمام حواس جمع کر کے جواب دیتا "ہاں جو کچھ کر رہا ہوں
سچے دل سے کر رہا ہوں۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں صداقت مآب زبان
سے کہہ رہا ہوں" پھر دل کی گہرائیوں میں سے ایک طویل مسلسل
اور بلند قہقہہ بلند ہوتا جس کی غلیظ تحقیر، مکروہ تضحیک اور گندے
استہزا سے میں کئی منٹ تک ذہنی صعوبت میں مبتلا رہتا۔

ان دو متضاد قسم کی کشمکش نے میری عجیب حالت کر دی تھی۔ آنکھیں بیوی کی طرف تھیں تو آنکھوں کا نور کسی اور جگہ، حواس یہاں تھے تو حسیات کسی اور جگہ، دماغ یہاں تھا تو دل کسی اور جگہ۔ ایک دن میں نے سوچا کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے بیوی کو الہ آباد لے جاؤں۔ اس کی آب و ہوا بدل جائے گی اور میں بھی اپنی شمسہ کو دیکھ لونگا۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ ان دونوں چیزوں میں سے میرے لئے مقدم کیا چیز تھی۔ خیر تو الہ آباد پہونچا۔

"اب آپ کے گھر میں کیا حال ہے؟" شمسہ نے مجھ سے پوچھا۔

"بدستور حالت ہے۔ شمسہ مجھے کل ایک نئے امر کا انکشاف ہوا ہے" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ عید کے چاند میں" شمسہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"بتاؤ نہ شرماتی کیوں ہو؟" مجھے جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اسکی شادی ہونے والی ہے عجیب حالت تھی۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب دل بیٹھا، اب دل بیٹھا۔ اس سے یہ سوال کرنے میں میں اندوہ کے شائبہ کو نہ چھپا سکا تھا۔ میرے لب تھرا رہے تھے۔ وہ اب بھی چپ رہی۔ جب میں نے قسم دلائی تو دھیمے سے بولی "آخر اس قدر اصرار سے کیوں پوچھ رہے ہیں آپ۔ بالکل پیچھے ہی پڑ گئے" اس کے بعد نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ میری حالت

متنفیہ تھی۔

"ویسے ہی پوچھ رہا ہوں" میں نے اُس کی پیاری نظروں کی زد سے ہٹکر کہا۔

"شاید" اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ایک گہرے سانس کو غیر مستقل تنفس میں خارج کیا گیا ہے۔

"میری دلی مُبارکباد قبول کرو شمسہ۔ اللہ تمہیں خوش رکھے ــــــــ"

"مگر یہ مجھے دُعائیں دیتے ہیں آپ منہ کیوں بسُورتے جا رہے ہیں" اُس نے پھر شوخی سے میری جانب دیکھکر کہا۔

میں نے بہت جلد اپنی حالت کو سنبھالا اور بولا "سچے دل سے جو دُعائیں مانگی جاتی ہیں رو رو کر ہی مانگی جاتی ہیں"

"تو آپ میرے لئے اس باب میں سچے دل سے دُعا کرتے ہیں؟" اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دریافت کیا۔

"ہاں" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"اچھا یوں کہئے کہ میں واللہ سچے دل سے دُعا کرتا ہوں کہ تمہاری شادی ہو جائے"

"نہیں"

"کیوں نہیں؟"

"نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری شادی ہو جائے"

"کیوں نہیں؟"

"میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے جُدا ہو جاؤ۔ ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لی جاؤ"

"آخر کیوں نہیں چاہتے؟"

"بعض اُمور ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی علت نہیں ہوتی"

"مہمل" اُس نے ہنسکر کہا۔

"نہیں بامعنی۔ آفتاب سے زیادہ روشن۔ وجود باری کی طرح واضح۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں شمسہ، میں تمہیں پوجتا ہوں۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کوئی تم کو مجھ سے چھین کرلے جائے"

"اور چار سال سے کہاں تھے؟"

"میں چار سال سے جہنم میں تھا لیکن گذشتہ چھ ماہ سے تمہاری محبت نے مجھے بہشت میں پہونچا دیا"

"تو میں بھی چار سال چھ ماہ سے جہنم میں تھی اور آج تمہارے ساتھ ہی بہشت میں داخل ہوئی ہوں"

"شمسہ کیا تم کو بھی مجھ سے محبت ہے؟" میں نے وحشیانہ دریافت کیا۔

"ہاں۔ خُدا کے لئے جامۂ انسانیت میں ہی رہو۔ میں چار سال سے تمہارے خیال ــــــــ لیکن زاہد تم تو مجھ سے چھپے ہوئے ہو ــــــــ"

"میری رُوح۔ محبت پرست دلوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ مادی طور پر متحد کئے جائیں۔ ہماری محبت آسمانی ہے۔"

"آسمانی محبت آپ آسمان پر جاکر کیجئے۔ ہم کو حقائق نظر انداز نہیں کردینے چاہئیں زاہد"

"ہماری پامالِ مایوسی محبت میں ایک اُمید کی شعاع بھی ہے شمسہ۔ میری پیاری بہار ــــــــ"

میری زبان رُک گئی۔ اب اندرونِ سینہ سے قہقہوں کی آواز نہیں آرہی تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی قوت تحسین و مرحبا پکار رہی ہے۔ آہ خطرناک قوت!

"زاہد یہ تخیل؟"

"شمسہ مجھے معاف کردو۔ آہ لیکن ــــ" میں جزبز ہو کر رہ گیا۔ کیسا خوشگوار تخیل تھا لیکن کتنا بھیانک بھی۔

"شمسہ تم میری ہو ــ میری ــ"

"مگر ایک عزیز زندگی کی قیمت پر۔ اُف قدرت کی ستم ظریفی"

"نہیں بہرصورت تم میری ہو۔ اچھا اپنی پیاری زبان سے بھی کہدو کہ تم میری ہو"

"ہاں شاعرانہ زبان میں تمہاری ہوں۔ لیکن ہم میں بہت بُعد ہے زاہد۔ مجھے تعجب ہے کہ تم مجھ سے کس طرح محبت کر بیٹھے۔ میرا تم سے محبت کرنا بجا تھا۔ کیونکہ میں ابھی آزاد ہوں۔ لیکن تم "برائے دیگراں" ہوتے ہوئے بھی میری محبت میں یوں پھنس گئے۔"

"سبحان اللہ! گویا تمہارے خیال میں آزاد و پابند کی تخصیص محبت کیا کرتی ہے۔ نہیں میری جان۔ دل جس کو پیار کرے۔"

شمسہ خاموش ہوگئی۔

"شمسہ" میں نے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا۔ "آؤ اب ہم ذرا وضاحت سے بات چیت کریں۔ اگر قضا و قدر ہمارے "موانعات" کو ہماری راہ میں سے ہٹا دینے کا کرم کرے"۔

—میں خود بخود چپ سا ہوگیا۔ بیمار کا مسترحم و ملول چہرہ میری آنکھوں کے آگے آگیا اور اس کی زبان سے کبھی یہ نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں کے گوشے گوشے میں گونجتے ہوئے۔ "تم میرے علاج میں کس قدر انہماک سے کام لے رہے ہو زاہد۔ تم مجھے نہیں مرنے دوگے۔ مجھے امید ہے نہیں مرنے دوگے"۔

دفعتاً میرے منہ سے ایک وحشت کی چیخ نکل گئی۔ میں کانپ اٹھا۔ بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھالا اور بے اختیار شمسہ کے سامنے سے اٹھکر بھاگا۔ بیوی کے پاس پہونچا تو اس کی آج حالت خراب تھی۔ مجھے دیکھکر ایک تبسم افسردہ اس کے خشک لبوں پر آگیا۔ اس نے اپنے لاغر ہاتھ سے میرا ہاتھ تھاما۔ اور بولی "جب تم میرے پاس آجاتے ہو تو میری بیماری آدھی جاتی رہتی ہے۔ بیٹھے رہو میرے ہی پاس بیٹھے رہو۔ اب کہیں نہ جانا"۔

"نہیں کہیں نہیں جاؤنگا۔ گھبراؤ نہیں میں یہیں بیٹھا رہونگا"۔ یہ کہتے ہوئے مجھے پہلی بار ایسا محسوس ہوا گویا میں نے کوئی زبردست کام کیا ہے۔

شمسہ تندرست، جوان، حسین، شوخ و ذہین اور محبت پرست۔ رضیہ بیمار، موت کے چنگل میں گرفتار، لاغر، کمزور، صحت باختہ۔ اور— اور میری راہ میں، ہر راہ میں سنگِ گراں۔ شادی سے قبل میں اس کو نہیں جانتا تھا نہ وہ مجھے جانتی تھی لیکن شادی کے بعد سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو مدت سے جانتے تھے۔ وہ مجھے کس قدر چاہتی تھی اور میں بھی اس کی محبت کی کس قدر قدر و اعتراف کرتا تھا! آہ لیکن وہ بیوی تھی۔ یعنی اس حقیقتِ مسلّمہ کی شکار ہستی جس کو اثرات یکجائی ایک بالکل معمولی ہستی بنا دیا کرتے ہیں۔ لیکن میں اس کا شوہر تھا۔ فرض شناس شوہر۔ میں اس کو آسانی سے نہیں مرنے دے سکتا تھا۔ نہیں کسی قیمت پر بھی نہیں مرنے دے سکتا تھا، شمسہ کی محبت کی قیمت پر بھی نہیں مرنے دے سکتا! شمسہ کی دراندازی بڑی ہی بے محل تھی۔ میں نے اس کو کیوں چاہنا شروع کر دیا۔ میری تمام توجہ کی مستحق میری بیوی تھی۔ وہی رہے گی۔ شمسہ کی کل شادی ہوجائے گی۔ وہ دوسرے کی امانت ہے۔ اگر وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو یہ اس کی غلطی ہے جس کا ازالہ بہت جلد ہوجائیگا۔ ہاں اس وقت یقینی ہوجائے گا جب وہ دوسرے کے آغوش میں پہونچ جائیگی—

میں رضیہ کے سرہانے آرام کرسی پر اسی خیال میں دراز ہوگیا اور نہ معلوم کب نیند آگئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو تین باتوں کا مجھے سب سے پہلے احساس ہوا۔ میری گردن انسانی بازوؤں سے کسی ہوئی تھی۔ میں کرسی میں بالکل بھنچا ہوا پڑا تھا۔ اور میرے قریب کسی سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ میں نے گھبرا کر سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور شمسہ کو اپنے قریب پاکر دیوانوں کی طرح اسکی طرف نظریں جما دیں

پھر فوراً ہی کسی خیال سے پریشان ہوکر رضیہ کے پلنگ کی طرف دیکھا جو اب خالی پڑا ہوا تھا۔

"رضیہ کہاں گئی؟" میں نے اپنی حالت سنبھالکر اور شمسہ کے نازک بازوؤں سے اپنی گردن آزاد کرکے دریافت کیا۔

"حکیم جی کے ہاں۔"

"اور تم یہاں کب نازل ہوئیں؟"

"ہاں میں بلا ہوں کہ نازل ہوئی۔ کیوں؟ ذرا ہو اس میں تمہارا قصور نہیں ہے میرا ہی ہے۔ میں اندھی تھی کہ تم کو چاہ بیٹھی۔ حالانکہ تم ایک محبت پرست بیوی کے شوہر ہو۔ میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ اور وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ آپکی بیوی کے اور آپکے مابین حائل نہیں ہونگی۔"

ہائے اس وقت مجھ پر کس قدر نفسیاتی وباؤ پڑا۔ اگر شمسہ یہاں آکر اس وقت اپنی محبت بگھارتی تو میں اپنے اگلے تہیہ کی بنا پر ضرور اس کو مایوس کرنے میں کامیاب ہوجاتا۔ لیکن وہ ظالم تو خود کھنچنے لگی۔ آہ عورت جب محبت قبول محبت کرکے مرد سے کھنچنے لگتی ہے تو مرد کی روح جسم سے کھنچنے لگتی ہے۔ اس وقت تمام مردانہ خودداری۔ عہد پندار وغیرہ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس نفسیاتی مسئلہ کی بنا پر شمسہ نے بھی مجھے پھر جیت لیا۔ میں اپنے تمام پچھلے فیصلے کو فراموش کرکے دیوانہ وار کھڑا ہوگیا اور اس کو اپنے بازوؤں میں جمع کرکے بولا "میری روح ایک ذرا سے مذاق کا اتنا برا مان گئیں۔ شمسہ محبت تو جس کے حصے کی ہوتی ہے اسی کو ملکر رہتی ہے۔ اس میں بیوی وغیرہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ تو میری ہے اور میں تیرا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تیرا ہوں شمسہ۔"

جب بیوی کو یہاں بھی کوئی فائدہ نہ ہوا تو میں واپس اس کو اپنے وطن لے آیا۔ جنگِ عظیم کو آپ کیا اہمیت دیتے ہیں۔ میرے مختصر سینے میں آج کل صدہا جنگِ عظیم کے خونیں حشر موجود تھے۔ قوتِ فیصلہ بالکل مرچکی تھی۔ پاسِ فرض شمسہ کی سنانِ محبت کے چرکے کھاتے کھاتے میری آنکھوں کے سامنے پڑا تڑپ رہا تھا۔ انسانیت و ہمدردی مجروح ہوکر کونے میں منہ دئے رو رہی تھیں۔ بس دنیا کے نظام کو تہ و بالا کردینے والی شے جسکو محبت کہتے ہیں۔ اپنے قوی ہاتھ میں فتحمندی کا نشان لئے سکندرانہ شان سے کھڑی نظر آرہی تھی۔ میری حالت بڑی ہی قابلِ رحم تھی۔ اس قدر قابلِ رحم کہ مجھ کو خود کو اپنی حالتِ زار پر ترس آنے لگتا تھا۔ یہ انسان کی انتہائی بے کسی کا عالم ہوتا ہے کہ اسکو خود اپنے پر رحم آنے لگے۔ بقول امیرؔ

دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو روتا ہوں امیرؔ
اپنی حالت پہ خود آتا ہے ترحم مجھکو

عید کا مہینہ بھی آگیا لیکن مع پیامِ محرم کے۔ ایک روز شمسہ کے والد کا خط آیا۔ ایک بڑا سا لفافہ تھا۔ کھولتا ہوں تو اس کے اندر ایک چھپا ہوا کارڈ نکلا۔ وہی پرانے زمانے کی اردو۔ شمسہ کی شادی طے ہوچکی تھی اور یہ اسی کا دعوت نامہ تھا۔ خوب! آخر اس کی شادی قرار پاہی گئی۔ اس شادی میں مجھے شریک ہونے کی کیوں دعوت دی جارہی ہے۔ میری تو بیوی بیمار ہے۔ دل بیمار ہے۔ شمسہ کیا کہتی ہے۔ کیا وہ بھی چاہتی ہے کہ میں اپنی قبر اپنی آنکھوں سے بنتی ہوئی دیکھوں؟ یہ لوگ مجھے شادی میں شریک کرکے متوقع ہیں کہ میں اپنی تمناؤں کی پامالی پر دل کھولکر مسرور ہوں! اُن کے فریبِ مسرت میں برابر کی شرکت کروں! معاذاللہ۔

اگر اس شادی کو ہونا تھا تو اس کو میرے علم میں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ چپ چاپ کیوں نہیں ہوگئی ہم پر جو مصیبتیں نازل کی جاتی ہیں کیا ان کا قدرت کی جانب سے ہم کو کوئی نوٹس دیا جاتا ہے؟ پھر اس امّ المصائب شادی کے باب میں مجھ پر یہ کرم کیوں کیا گیا؟ کیا یہ بات تیری شانِ کریمی کے

شایاں تھی؟ اُف خدا۔

شمسہ کی شادی ہوگئی۔ میں کس دل سے اس میں شریک ہوتا لیکن جانا پڑا۔ قدرت کا عتاب صرف اسی پر ختم نہیں ہوگیا تھا کہ میں اس اپنی غارت گرِ تمنا شادی میں شریک ہوا۔ بلکہ میں نے اپنی منحوس آنکھوں سے اُس کو دُلہن بنتے دیکھا۔ میں نے اپنے دیدۂ خونبار سے اُسکو رخصت ہوتے ہوتے دیکھا اور میرے علم میں اسکی سہاگ کی رات کو لایا گیا۔ یہ ہیں جناب محبت کے انعامات۔

کہتے ہیں اور ہم بھی مدت سے سن رہے ہیں کہ اس خراب آبادِ گیتی کا نظام نہایت ہی معقول طریقے پر قائم ہے۔ اس لغو خیال پر میں تمام دُنیا کو ایک قہقہہ حقارت بلند کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ نظامِ عالم کے یہ معنی ہیں کہ وہ حیاتِ انسانی کا سازگار رہے وہ ہماری زندگی سے مساعدت کرے۔ اگر پراگندیوں کے باوجود بھی آپ اس پوچ نظامِ عالم کے مداح ہیں تو ایک گول روزن میں چوکور کیل ٹھونکنے کی کیوں نہیں تعریف کرتے! اس شادی کے پندرہ ہی یوم بعد میری بیوی کا انتقال ہوگیا۔ جی ہاں انتقال ہوگیا ـــــ تاکہ میں سمجھ سکوں کہ میں منزل پر اسوقت پہونچا ہوں جب نشانِ منزل ہی نہ رہا۔ حسرتیں اس وقت پوری ہونگی جب سینہ مدفنِ حسرت بن جائے گا۔ میں کہتا ہوں اگر بیوی کو مارنا ہی تھا۔ اگر یہ ہونا ہی تھا تو اُس وقت کیوں نہ ہوا جب اُسکو ہونا چاہیئے تھا۔ یہ پندرہ بیس روز پہلے کیوں نہ ہوا؟؟۔

میں نے بھی میدانِ زندگی کے بہت سے ہزیمت خوردہ بر خود غلط صوفیوں کی طرح تصوف کے دامن میں پناہ لینی چاہی۔ نماز، ذکر و تلاوت کو شعارِ حیات بنالیا۔ زندگی کی لذتوں کو تج دیا۔ لیکن میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا حقیقی مسجود کون ہے۔ اگر اسکو بھی عبادت و ریاضت شمار کیا جاسکتا ہو کہ انسان اسلامی ارکان کے ساتھ کامل بُت پرستی کرے تو میں آجکل ایک زبردست مرتاض ہوں۔

قیسی رامپوری

مسوکو

ایک گاؤں میں کسان کے کچے گھر کے سامنے تار والے نے بائیسکل ٹھیرائی اور دیمپو دیمپو کہکر آواز دی۔ کسان کی ضعیف العمر بیوی چکّی پیس رہی تھی۔ تار کا نام سُنکر پریشان دروازے پر گئی۔ تار لیکر شکریہ ادا کیا اور کسان کو جاکر دیدیا۔ وہ دھان صاف کرنے میں ونڈھا ہوا تھا۔ تار پڑھکر اُس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی لہریں ہویدا ہوگئیں۔ دورانِ مطالعہ میں کئی بار وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے گھدرے دانت نکال نکال کر بے ساختہ ہنس دیا۔ بڈھی کسانی جو ہنوز سہمی ہوئی کسی خبر کی منتظر کھڑی تھی کچھ مطمئن ہوئی اور اب بغیر پوچھے نہ رہ سکی "تار کیسا ہے؟" کسان نے اپنی رفیقِ حیات کی طرف انتہائی مسرت خیز نظروں سے دیکھکر کہا "یاماوا آرہا ہے۔ آج ہمارے لئے کیسا خوشی کا دن ہے۔ ہم دونوں کو خُدا کی درگاہ میں شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ وہ کامیاب ہوکر وطن واپس آرہا ہے" ماں بیٹے کی آمد کا مژدہ سُنکر باغ باغ ہوگئی۔

دونوں میاں بیوی اپنے اپنے کاموں سے بے نیاز ہوکر بچھڑے بیٹے کی آئندہ زندگی پر تبادلۂ خیالات کررہے تھے کہ دفعتاً دھرتی تھا لرزنے لگی اور اس غضب کا شدید زلزلہ آیا کہ تمام گھر مثل ہنڈولے کے جھولنے لگا۔ دونوں دم بخود ایک دوسرے کو مایوسانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ دیکھئے زمین کسے نگلے گی۔ کسان کی چھوٹی بچی مارے خوف کے ماں کے سینے سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ اسکی خوبصورت اور بیشمار گڑیاں جن سے بیٹھی وہ کھیل رہی تھی آناً فاناً تختوں سے گرگر کر فرشِ زمین پر دراز ہوگئیں۔ کسی کو کچھ سُدھ نہ تھی، جو جہاں تھا وہیں جم کر رہ گیا۔ زلزلہ سے گاؤں کو کافی نقصان پہونچا۔ خُدا خُدا کرکے امن ہوا۔

"یاماوا" نے ایک معمولی پڑھے لکھے کسان کے گھر میں جنم لیا تھا۔ اس کا عہدِ طفلی گاؤں کی فضا ہی میں بسر ہوا۔ باپ نے اپنی حیثیت کے مطابق تعلیم دلائی۔ مگر یہ ابھی تشنہ تھا۔ اس کا نصب العین بڑا شاندار تھا۔ وہ اپنے مستقبل کو بڑے اُونچے پیمانے پر سنورے ہوئے دیکھنے کا آرزومند تھا اور قدرتاً اعلیٰ دماغ کا مالک۔ ہر وقت اپنی ترقی کے لئے ہاتھ پیر مارتا۔ بچپنے سے بڈھے باپ کو کھیتوں میں چاولوں کی کاشت کرتے دیکھا کرتا تھا جس میں انتہائی محنتِ شاقہ کے باوجود خاطر خواہ پیداوار نہ ہوتی تھی۔ یہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح یورپ جاکر جدید کاشت کاری کے طریقے سیکھے۔ ہر وقت یہی خیال دل و دماغ میں جاگزیں تھا۔ جب موقع ملتا باپ سے کہتا سنتا۔ غریب کسان اپنی مفلوک الحالی سے ناچار من مار کر مایوس ہوجاتا۔ وہ کسی طرح بھی یورپ کی تعلیم کا کفیل نہ ہوسکتا تھا۔ بڈھی کسانی سے بارہا کہا کاش میرے پاس اتنی جمع پونجی ہوتی کہ "یاماوا" اپنی آرزو پوری کرسکتا۔ کامی سا ما" اگر مہربانی کرے تو چاول کی فصل اچھی ہونے لگے اور میں پھر سب اخراجات کو پسِ پشت ڈال کر اس کو یورپ بھیجدوں۔ اُسے وہاں جانے کا بڑا شوق ہے۔ "یاماوا" ہونہار زمانے کے ساتھ چلنے والا ذکی فہم تھا۔ وہ ہر سخت سے سخت محنت کو بخوشی برداشت کرسکتا تھا۔ اس کا حوصلہ بلند اور دماغ روشن تھا۔ ہردلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ جہاں اور جس کھیت میں جانکلتا سب آنکھوں پر بٹھاتے۔ گاؤں کے لوگوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

لڑکی والے عام طور سے اچھے بَروں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ایک دن بڈھے کسان کے ہم عمر پڑوسی نے پائپ کا لمبا کش

کھینچتے ہوئے کہا۔ "کچھ "یاماداساں" کا بھی فکر کیا۔ اب تو وہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اچھا ہے اپنی زندگی میں ہاتھ پیلے کر دو" کسان نے اپنے تنتے ہوئے سیپی نما چہرے پر ہاتھ پھیر کر ایک ہلکی سی مگر معنی خیز گہری سرد آہ کھینچی۔ اور زمین پر دریا کی شکل بنانے لگا۔ "تاکے اوچی" نے کہا بڑے فکر میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ جواب نہ دیا۔ "کیا کہوں شادی بیاہ سب پیسے کا کھیل ہے۔ اگر میرے پاس کچھ اثاثہ ہوتا تو یقین جانو سب سے پہلے اسے کچھ سیکھنے یورپ روانہ کرتا۔" "تاکے اوچی" کسان کے اِس خیال کو سنکر دنگ رہ گیا۔

"کیا سچ کہہ رہے ہو اگر یہ ہی مبارک خیال ہے تو میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ تمہارے لڑکے کی نسبت بڑے امیر اور سمورائی خاندان میں بہ آسانی کرا سکتا ہوں۔"

"کیوں غریب آدمی سے مخول کرتے ہو۔"

"مخول کیسا تم راضی ہو جاؤ پھر دیکھ لینا۔"

کسان کے دل ہی دل میں خوشی کے لڈو پھوٹنے لگے۔ تاہم اُسے یقین نہ آتا تھا کہ ایسا نایاب رشتہ میرے جیسے معمولی شخص کے لڑکے کو خواب میں بھی میسر آسکتا ہے۔ اُس نے اپنی تھکی ماندی بڑھاپے سے بے رونق آنکھیں جن سے شکر گزاری ٹپکی پڑتی تھی، اُٹھا کر "تاکے اوچی" کو دیکھا اور جاپانی دستور کے موافق کمر کو خم دے دیکر شکریہ ادا کیا۔ "مجھے ہر طرح منظور ہے۔ اگر تم سچ مچ منگنی کرا دو تو میں عمر بھر احسان مند رہونگا۔ میری مالی حالت تم پر خوب روشن ہے۔ ہر بات صاف اور اچھی طرح فریقِ ثانی پر واضح کر دینا۔"

امدادِ غیبی چتر پھیلائے آنے والے وقت کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ "مِسوکو" ایک بڑے امیر اور سمورائی خاندان کی چشم و چراغ ہے ناز و نعم میں پلی بڑھی، قبول صورت، نازک اندام، وضعدار ہے۔ "وتانابے" اور "فجی موتو" اپنی لختِ جگر کو لاڈ و پیار میں پال پوس کر محض مغرور شست اور جاہل و پھوہڑ دیکھنے کے حاشا حاشا آرزومند نہیں۔ اُن کی دلی تمنا ہے کہ اسکو بہتر سے بہتر تمیزدار بیوی بنائیں اور ہر ہنر میں ماہر کرنے کی سعی بلیغ کریں۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی جو کچھ جانتے ہیں بیٹی کے سکھانے میں ہمہ تن منہمک ہیں۔ دیگر ہنروں کے لیے معلم اور معلمات ملازم رکھ چھوڑے ہیں۔ ہر تعلیم اور فن سکھانے کیلئے دن اور اوقات مقرر ہیں۔ "مِسوکو" بذاتِ خود تمام ہنروں میں کمال حاصل کرنے کیلئے اپنے ماں باپ سے زیادہ شوق کا اظہار کر رہی ہے اور سرگرمِ عمل ہے۔

جاپانی وضع کے چھ تتامی والے کمرے میں فرشی میز پر ایک جرمن اتالیق خوبصورت نوجوان لڑکی کو سبق پڑھا رہا ہے۔ لڑکی نے "کلشور" کا نام دہرایا اور جرمن "کلشور" پر سوالات کرنے لگی۔ "مِسوکو" بڑے شوق و محنت سے جرمن زبان سیکھ رہی ہے۔ اس کا باپ بھی باوجود عمر رسیدہ ہونے کے جرمن زبان کی باریکیاں عبور کرنے میں بڑی تندہی سے مصروف ہے۔

ساڑھے چار تتامی والے کمرے میں باپ بہ حیثیت مہمان کے ضابطے کے لباس میں دو زانو بیٹھا ہوا ہے۔ "مِسوکو" میزبان کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ خوشنما کیمونو زیب تن کئے "چانویو" کا کل سامان سامنے رکھے اسکی تیاری میں مصروف ہے۔ سامنے "توکونما" میں مشہور آرٹسٹ کی قدِ آدم تصویر آویزاں ہے۔ اس کے نیچے چوبی چوکی پر ایک نوبو طرز کی آرائش گل ہے اور اسکے پہلو میں گوتم بدھا کا مجسمہ رکھا ہے۔ دونوں کی نشست برخاست اور آدابِ مجلس سے کسی قریبی رشتہ کا احتمال تک نہیں ہوتا۔ ہر دو طرف مدبرانہ خاموشی طاری ہے۔ "مِسوکو" نے بڑی نزاکت سے پھول دار ڈبہ اٹھایا اور نرالے انداز سے بانس کے چمچے سے چائے کا سبز سفوف

نکال کر پیالے میں ڈالا۔ پھر سُرخ ریشمی رومال سے پُچکا پونچھکر مُقرّرہ جگہ پر رکھدیا۔ اب آہنی کیتلی سے ننھی سی ڈونگیا سے گرم پانی نکالا اور پیالے میں ڈال کر تکلّف سے کیتلی کے مُنہ پر ڈونگیا رکھدی اور بانس کے بُرش سے چائے کو پھینٹا۔ اس کے بعد سُرخ رومال پر چائے کا پیالہ رکھکر دیگر اواسے باپ کے سامنے لاکر رکھا۔ اُس نے پیالہ اُٹھاکر اپنے سامنے رکھا اور کمر کو خم دیکر "مِسُوکو" کا شکریہ ادا کیا۔ پھر پیالہ اُٹھاکر ہتیلی پر رکھا۔ اور تین دفعہ چکّر دے کر اس کے تین گھونٹ پئے۔

آٹھ تتامی کے کمرے میں ایک جاپانی خاتون کی شاگردی میں "مِسُوکو" "یوری" پھول کی شاخ کو خم دیکر "شن" کی جگہ لگا رہی ہے۔ مُعلّمہ نے "تائی" شاخوں کے مجموعے کی اصلاح کرکے اس سے "سوئے" کی شاخیں سجوائیں اور پھر گلدان پر نقّادانہ نظر ڈال کر اُسے شاباشی دی کہ خوب پھول سجائے۔

کئی دن کی مسلسل بارش سے نیلگوں سائبان اپنا گرد وغبار دھو دُھلاکر صاف سُتھرا نکھر آیا ہے۔ مطلع صاف ہے۔ دن بڑا پیارا اور خوشگوار ہے۔ بادِ نسیم پیامِ بہار لئے اِٹھلاتی پھر رہی ہے۔ برف کے مارے ٹُنڈ مُنڈ برہنہ درخت نئی پوشش کے لئے گرما رہے ہیں۔ سردی سے ٹھٹھری ہوئی شاخیں برگ وگل لانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ ٹہنیوں پر ننھے دانے اُبھر آئے ہیں۔ ہر شاخِ گُل زمین کی گردش پر نگاہ جمائے ہوئے اپنا اپنا کمال دکھانے کے لئے مضطرب ہے۔ باہر میدان میں "مِسُوکو" باپ کے ساتھ تیراندازی کی مشق کر رہی ہے۔

سُورج کی ضیاتاب کرنیں دن بدن قریب تر ہوتی جا رہی ہیں۔ مادرِ گیتی جو کروڑوں من برف کو اپنے شکم میں لئے سُنجمد تھی، آمدِ بہار پر بسم اللہ کا ختم پڑھ چکی۔ اور اب جاڑے کی تمام نمی کو ابخرات کی شکل میں اُگل اُگل کر ہلکی ہو رہی ہے۔ "مِسُوکو" نازک کمر میں تلوار باندھے باپ کی منتظر ہے۔ "پھری گتکا" میں اُس نے بڑی ہوشیاری اور پھرتی سے تلوار کا وار لمبی تلوار سے اِس خوبی سے رُوکا کہ باپ خوشی سے اُچھل پڑا۔

جاپانی ناچ گانا اور "کوتو" بجانا ہوشیار جاپانی مُعلّمہ کی زیرِ نگرانی جاری ہے۔ "پیانو" سکھانے کے لئے مغربی اُستانی مُقرّر ہے۔

چینی امبرائیڈری میں مدرسے اوّل انعام حاصل کر چکی ہے۔ کشتی رانی اور تیرنے میں باپ کی شاگرد ہے۔ ایک ماہر اُستاد کی اتالیقی میں خوش نویسی سیکھ رہی ہے۔ نقاشی پر نمائش میں تمغہ لے چکا ہے۔ چینی ادب کی تعلیم کچھ تو مدرسہ میں حاصل کی تھی اور اب ایک یونیورسٹی کے پروفیسر سے اس کی تکمیل کر رہی ہے۔ غرضکہ کوئی ہُنر ایسا نہیں جو شائستہ خاتون کا زیور ہو اور وہ اس سے محروم ہے۔

بہار کا موسم شُروع ہو گیا۔ ہری ہری کونپلیں پھُوٹنے لگیں۔ درخت نئے نئے لباس پہنے شکرِ معبود میں جھوم رہے ہیں۔ زمین پر سبزہ اُگ آیا۔ کلیوں نے چونچیں کھول کر ترانۂ فطرت گایا۔ غنچوں نے وا ہو کر بہار میں بہار کر دی۔ نسلِ آدم نے لبادے اُتار پھینکے۔ اور ہلکے پھلکے پیارے پیارے لباس پہن لئے۔ یہی موسم جاپانی خواتین کی طرح طرح کی خوبصورت "اوبیوں" کا منظر پیش کرتا ہے۔ "مِسُوکو" پھولدار کیمونو اور اس پر موری کی امبرائیڈری کی "اوبی" باندھے گھر کے وسیع باغ میں چہل قدمی کر رہی ہے۔ حوض میں قسم قسم کی پالتو مچھلیاں چھوٹی ہوئی ہیں اور وہ اُن کو آٹے کی گولیاں بنا بنا کر کھلا رہی ہے۔ جانوروں کو کھلاتے پلاتے دُور جا نکلی۔ یہاں ہرنوں

نے آن گھیرا (انہیں ترکاری کے ٹکڑے دے رہی ہے۔ بڑی شاداں و فرحاں ہے۔ یکایک دُور سے کسی کی آواز پر کان کھڑے کئے۔ اُس کی نوکر "اوجوسما" ۔ "اوجوسما" پکار پکار کر تلاش کر رہی ہے۔ وہ اسے دیکھکر دوڑی ہوئی آئی۔ اور جُھک کر کان میں، خون میں سنسنی پیدا کرنے والا مژدہ سُنایا۔ "اونیساں" واپس آرہے ہیں۔ (بڑا بھائی یعنی منگیتر) خوشی میں اُچھلنے لگی "سچ کہتی ہو" اب سب جانوروں کو چھوڑ چھاڑ ترکاری پھینک واپس چلی۔ اُچھلتی کُودتی جارہی ہے۔ راستہ میں جو جانور ملتا ہے اُس سے کہتی جاتی ہے۔ "اونیساں" واپس آگئے۔ اِسی بیخودی میں ایک جگہ ٹھوکر کھا کر دھما ہوگیا۔ خوشی میں ایسی وارفتہ تھی کہ بھنوں تک نہ سُکڑی۔

کمرے میں پہونچی باپ سے کہا "اوتوسما" ۔ "اونیسا" کو لینے "یوکوہامہ" چلیں گے۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا۔ جب "توکیو" میں آجائیں گے اُس وقت ملنے جائیں گے؛ رات کو عالمِ خواب میں بندرگاہ یوکوہامہ کی سیر کر رہی ہے۔ جہاز یوکوہامہ سے روانہ ہورہا ہے۔ مُسافر ڈک پر کھڑے ہیں۔ الوداع کہنے والے احباب واعزا بندرگاہ کے کنارے کھڑے کاغذ کی رنگین پٹیاں جہاز پر پھینک رہے ہیں۔ زمین اور جہاز کے درمیان ہوا میں رنگین پٹیوں کی چادر تنی ہوئی معلوم ہورہی ہے۔ ہجراں نصیب سماں ہے۔ ایک پٹی "مشوکو" کے ہاتھ میں ہے۔ یکایک اسکی پٹی ٹوٹ گئی۔ گھبرا کر باپ کو پکارنے لگی کہ یہ کیا بدشگونی ہوئی۔ وہ قریب ہی سو رہا تھا۔ بیدار ہوا۔ خواب سُنکر تسلی کی کہ پراگندہ خیالات ہیں پریشان نہ ہو وہ تو یورپ سے واپس بھی آگئے۔

"چچی بومارو" جہاز یورپ سے واپس آرہا ہے۔ ڈک پر ایک نوجوان کے پہلو بہ پہلو دلکش خدوخال کی جرمن لڑکی اپنی سنہری زلف پریشاں میں نازک اُنگلیوں سے چھلوں کو سنوارتی ہوئی سمندر سے لطف اندوز ہورہی ہے۔ "یامادا" اپنی محبوب جرمن دوست کے حسنِ زیبا پر لٹو ہے۔ اس کی محبت میں سرشار دُنیا ومافیہا سے بے خبر اُلفت کے سُر الاپ رہا ہے۔ دوسرا خیال کا دل و دماغ میں گزر تک نہیں۔ اُس نے "رُدتھ" کو دُنیا کا گلوب دکھا کر "منچوکو" کا ذکر چھیڑا۔ یہاں بڑے بڑے وسیع اور زرخیز میدان ہیں۔ میں انہی میدانوں میں کاشت کاری کرنے کا آرزو مند ہوں۔ ہمارے پاس آب پاشی اور زمین بوسی کرنے کے لئے انجن ہونے ضروری ہیں۔ رُدتھ بھی سُہانے خواب دیکھ رہی ہے۔ دونوں ہوائی قلعے تعمیر کرنے میں انجینیر ہیں۔ "یامادا" جدھر جدھر جاتا ہے پری سایہ کئے ساتھ ساتھ ہے۔

جب جہاز بندرگاہ یوکوہامہ کے قریب پہونچا تو کوہ فجی نے بادلوں سے سر نکال کر اُن کا استقبال کیا۔ پہاڑ کی چوٹی برف سے ڈھکی ہوئی بقعہ نور نظر آرہی ہے۔ بڑا دلفریب منظر ہے۔ نگاہ واپس لوٹنے پر اڑیاں رگڑ رہی ہے اور کسی قیمت پر بھی اس پیارے نظارے سے محروم ہونے کیلئے رضامند نہیں۔ "یامادا" نے انگلی سے پہاڑ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے رُدتھ کو دکھایا۔ دُنیا میں کوئی پہاڑ اس کی طرح یکہ و تنہا کھڑا ہوا اس کا مدمقابل نہیں۔ جاپانیوں کا یہ محبوب ترین "یاما" ہے۔ یوکوہامہ پر دونوں جہاز سے اتر پڑے اور ریل میں سوار ہو کر توکیو روانہ ہوئے۔ راستہ میں فلک بوس عمارتیں، دلکش مناظر دل کو لبھانے کیلئے دلچسپی میں مزید اضافہ ہیں۔ "رُدتھ" نے سوالات کی بھرمار کر دی۔ "یامادا" بڑے شوق و انبساط کے ساتھ اپنی منظورِ نظر کو وطن کی ایک ایک چیز دکھا دکھا کر مسرور ہورہا ہے۔

دونوں نے امپیریل ہوٹل میں قیام کیا۔ داخل ہوا ہی تھا نام وغیرہ لکھنے کے لئے قلم نکالا تھا کہ ہوٹل کے ملازم نے "وتانابے" کا خط دیا، لکھا تھا میں لڑکی سمیت آپ سے ملنے آرہا ہوں۔ خط پڑھکر جبیں پر فکر کی موٹی موٹی شکنیں پڑ گئیں۔ دوسرے روز "وتانابے" "مسوکو" کو ساتھ لئے کر ہوٹل پہونچے۔ چونکہ کچھ روز ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتے تھے اس لئے انہیں بھی پتہ لکھنے کی ضرورت ہوئی۔ "مسوکو" یورپین لباس میں ملبوس باپ سے کچھ دور کھڑی تھی۔ سامنے کے زینے سے جاپانی چہرے کا ایک نوجوان ایک غیر ملکی لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنستا ہوا نیچے اترا۔ وہ اسے دیکھکر ٹھٹکی۔ اس کے حسرت وارمان سے پُر، مسرت سے لبریز اچھوتے دل میں گھونسا لگا۔ روتھ نے یونہی سی اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور دونوں آگے بڑھ گئے۔ ایک دوسرے کو کوئی نہ پہچان سکا۔ "وتانابے" لکھ ہی رہے تھے کہ "یاما دا" نے پہچان کر ہاتھ ملایا۔ یورپ کی آب وہوا نے اُس کو کچھ سے کچھ کر دیا تھا۔ "وتانابے" اس کو مضبوط قد آور چونچال دیکھکر خوش ہوئے مگر ساتھ ہی ایک خوش رو کامنی سی پری "بال حسینہ کو زیب پہلو دیکھکر دل ہی دل میں متعجب ہوئے۔ یاما دا نے خود روتھ کا اپنی دوست کہکر تعارف کرایا۔ جرمن حسینہ سے ہاتھ ملانے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھکر کہا "مسوکو" کہاں ہے۔ وہ غریب افسردہ خاطر دل کو سنبھالے قریب ہی کھڑی تھی۔ لمحہ بھر پہلے اُس کا دل خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ حیران وششدر تھی کہ جن کانوں کو محبت بھرے کلام اور فراق کے گلے شکوے سُننے کی اُمید تھی وہ کیا سن رہے ہیں۔ کاش کانوں میں پارہ بھر جاتا۔

باپ اپنے ساتھ لیکر آیا اور "یاما دا" سے کہا "یہ مسوکو ہے" اس نے دُور سے نیچی نگاہ سے جھک کر سلام کیا اور پھر سکوت لگاتے پرے ہٹ کر فرش کو گھورتی رہی۔ روتھ نے خود ہاتھ بڑھا کر اس سے مصافحہ کیا۔ "مسوکو" کے دل کا خدا ہی حافظ تھا۔ تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ قلبی صدمے نے صاف شفاف رنگ پر زعفران مل دی۔ پل کے پل میں مرجھا گئی۔ باپ کے ساتھ کمرے میں آئی اور کرسی پر نڈھال پڑ کر رونے لگی۔ باپ سمجھدار اور زمانہ شناس تھا اپنے غم کو چھپا کر بیٹی کی دلجوئی کرنے لگا۔ "مسوکو" کے ہنسمکھ اور بشاش چہرے پر غم والم کی گھٹائیں چھانے لگیں۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں ان میں بار بار آنسو بہائیں۔ جنہیں دیکھ کر باپ کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ وہ بیٹی کی رنجیدگی اور خلاف اُمید المناک واقعہ سے سراسیمہ تھا۔

روتھ بڑی شریف نیک طینت اور سمجھدار تھی۔ جلد بات کی تہ کو پہونچ گئی۔ اور پہیلی بوجھ لی۔ اُس نے اچھی طرح اندازہ لگالیا کہ یاما دا نے نسبت کو پردے میں رکھا۔ اُس کے نیک دل میں "مسوکو" سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا اور عزم مصمم کیا کہ یاما دا کا دل کسی نہ کسی طرح اپنی طرف سے پھیر کر محبت کی اصل مستحق کی طرف مائل کر دے۔ یہ خیال کر کے کہ اس لڑکی کی زندگی کی میں میں حائل ہوں بڑی پشیمان ہوئی۔ اس نے "مسوکو" سے رسم بڑھانی چاہی۔ ہوٹل ہی میں اُس کے کمرے میں آنے جانے لگی۔ "مسوکو" کے شکستہ دل میں روتھ سے ملنے کا قطعی سکت نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس کے خیال سے آنکھوں سے دریا رواں ہو جاتا تھا۔ وتانابے ہمیشہ روتھ سے تپاک سے ملا کرتے تھے۔ باپ کے مجبور کرنے سے بیٹی بھی بادلِ ناخواستہ ملتی تھی۔ پہلی مرتبہ جب روتھ ہوٹل کے کمرے میں "مسوکو" سے ملنے آئی تو وہ آنسوؤں کے موتی پرو رہی تھی۔ باہر سے اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ باپ نے "مسوکو" کو آواز دی جب اسکی آواز پر بھی آنسو نہ تھمے تو کہنے لگا کیا تم سموارائی کی بیٹی نہیں ہو؟ کیا سموارائی اپنے غم پر قادر نہیں ہوتے؟ اس پر "مسوکو" کو کچھ غیرت آئی اور آنسو پوچھ کر اسکو آواز دی کہ اندر تشریف لائیے۔ آنے پر اس سے خلق سے ملی۔ وتانابے دو تین روز ہوٹل میں رہے اور چلتے وقت یاما دا کو دعوت دیکر رخصت ہوئے۔

ایک دن یاما دا اور روتھ ہوٹل کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ سامنے سڑک پر جاپانی سپاہ کا ایک دستہ مارچ کرتا ہوا نظر آیا۔ سپاہ کا دیکھنا تھا کہ اس کے خیالات میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ چونکا۔ میں کس نشے میں سرشار ہوں، اور کس راہ پر جا رہا ہوں۔ ہمارا مسلک ملک و قوم کے لئے ایثار و قربانی ہے۔ اگر ان صفات کا میں اہل نہیں تو کیا جاپانی قوم کا ایک فرد کہلانے کا کسی طرح بھی مستحق ہو سکتا ہوں۔ میرے ملک کا ایک ایک بچہ مادرِ شکم سے سپاہی پیدا ہوتا ہے اور تلواروں کی چھاؤں میں پل بڑھکر ملک و قوم کا محافظ۔ تکلیف سہنی اور ہر خوشی قربان کرنی اس کا شیوہ۔ اسی قربانی سے ہماری قوم کی ترکیب ہوئی ہے اور اسی سے ہم نے دنیا کی نظروں میں عزت حاصل کی ہے۔ کیا میرے لئے زیبا ہے کہ ایثار سے گھبراؤں! نہیں! مجھے روتھ کی محبت کی بھینٹ والدین کے حکم کی بجا آوری پر چڑھانی چاہیئے۔ ان خیالات میں ہر وقت غرق رہنے لگا۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے یہی فکر تھا کہ کسی طرح اس گتھی کو سلجھاؤں۔ اگرچہ اس نے روتھ سے کوئی وعدہ وعید نہیں کیا تھا تاہم اتنے عرصے کی دوستی کا پاس تھا۔ گھنٹوں خاموش ٹہل ٹہل کر غور و فکر کرتا کہ خوش اسلوبی سے معاملہ یکسو ہو جائے۔ خود بخود اس کی دلچسپیاں پھیکی پڑنے لگیں اور اب یہ روتھ سے کترانے لگا۔ روتھ متحمل اور انصاف پسند لڑکی تھی۔ اس کے اطوار کو تاڑ گئی۔ وہ اپنی لمبی چوڑی داستانِ محبت کی جڑیں تک عرصہ ہوا اکھاڑ کر پھینک چکی تھی۔ کوشش کرنے لگی کہ "مسوکو" کا خیال اچھی طرح اس کے دل میں جما دے۔ یہی مشغلہ تھا جب اور جس وقت ملاقات ہوئی "مسوکو" اور اس کے آئندہ عزائم کی بابت گفتگو کرتی۔ یاما دا کے لئے طبیعت کا خلجان اس درجہ ناقابل برداشت ہوا کہ طوعاً کرہاً ایک دن وہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر روتھ کو الوداع کہکر رخصت ہوا۔

سیدھا اپنے باپ کے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ کھیتوں میں ہل چل رہے تھے، زمیندار بیج بونے میں مصروف تھے۔ جب اپنے باپ کے گاؤں میں پہونچا تو راستے میں دیکھا بڈھا باپ پنڈلی پنڈلی دلدل میں کھڑا ہل چلا رہا ہے۔ چند منٹ کھڑا دیکھا کیا۔ آخر قدم بڑھا کر "اوتوساں، اوتوساں" پکارا۔ باپ دیکھکر دوڑا ہوا آیا۔ حالت بیتابی میں مٹی کے لتھڑے پتھڑے ہاتھوں سے بغلگیر ہونا چاہتا تھا کہ دفعتاً کپڑے خراب ہونے کا خیال آیا اور ہاتھ ویسے ہی کھینچ لئے۔ یاما دا نے جھرے ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ "انوٹے" نے بہ اصرار بیٹے کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا اور گھر کو روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ بہن نظر آئی۔ وہ پانی کے گڑھے میں گڑیوں کی کشتی چلا رہی تھی۔ اسے دیکھکر گود میں اٹھا لیا۔ بہن نے چھوٹتے ہی سوغات طلب کی۔

گھر پہونچا تو ماں کو انگیٹھی کے پاس بیٹھا دیکھکر ڈیوڑھی ہی سے "اوکاساں، اوکاساں" آواز دی۔ بڈھی کسانی نے مڑ کر دیکھا تو یاما دا کھڑا تھا۔ اٹھکر قریب آئی اور کہا "ما! کتنا بڑا ہو کر آیا ہے، اویا! اویا!" محبت مادری جوش میں آئی اور ہڈیلے پچکے رخساروں پر خوشی کے آنسو ڈھلکنے لگے۔ یاما دا دونوں ہاتھ فرش پر ٹیکے ہوئے جھکا ہوا تھا۔

کئی دن بعد بنیان اور نیکر پہن کر کھیتوں میں جا دھمکا۔ نئے اور جدید اوزاروں سے بنجر زمین صاف کی جنگلی جھاڑیاں اور الا بلا سب کاٹ کر پھینک دیں۔ "انوٹے" دیکھکر متعجب ہوا کہ دنوں کا کام گھنٹوں میں کر کے میدان صاف کر دیا۔ یاما دا نے کھیت کی مٹی دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر دیکھی اور چکناہٹ دیکھنے کی غرض سے ویسے ہی دونوں ہاتھ منہ پر مل لئے۔ "انوٹے" نے کہا "اری موچی دار کیوں یہ مٹی ہے نا؟" کھیتوں میں ہل چلانے کیلئے خچروں کی جانوں پر عذاب تھا۔ یاما دا نے آب پاشی اور ہل چلانے کے لئے انجن منگوانے

کی تجویز باپ کے سامنے پیش کی۔ یہاں سے فراغت پاکر بھن کو کندھے پر بٹھا گھر پہونچا۔ کسان کسانی باتیں کر رہے تھے کہ ڈاکیہ نے یاماداکے نام کا خط دیا۔ "ابزوٹے" نے لفافے کو الٹ پلٹ کے دیکھا اور بیٹے کو دیدیا۔ خط پڑھکر یاماداسوچ میں پڑ گیا اور بغیر کچھ کہے کپڑے پہن موٹر میں چل پڑا۔

روتھ کی آمدورفت مِسوکو کے ہاں برابر جاری تھی۔ دتانابے نے وضعداری کو ہاتھ سے نہیں کھویا۔ ایک دن روتھ کی دعوت تھی جب وہ مکان پر پہونچی تو مِسوکو زاروقطار رورہی تھی۔ باپ نے بہتیرا سمجھایا مگر اس کا آنسو تھمنا تھا نہ تھما۔ بدقت بولی یہ رنج میرے لئے بڑا صبر آزما ہے۔ یاماداُنے کہا تمہیں اس بات کا ذرا بھی لحاظ نہیں کہ وہ تمہارے والدین کی مہمان ہے۔ کیا مہمان کا اسی طرح استقبال کیا کرتے ہیں۔ اِس فقرے نے جادو کا اثر کیا اور فوراً آنسو خشک کر کے اُسے ڈیوڑھی میں لینے گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُسے کھانے کے کمرے میں لائی۔ مِسوکو نے خود روتھ اور یاماداکے سامنے پُرتکلف کھانا چُنا۔ بار بار بیٹھکر کمرے کے بغلی دروازے کا "فسوما" کھولتی اور کھانے کی کشتیاں لالاکر دونوں کے سامنے رکھتی۔ جب سب کھانا قرینے سے چُن چکی تو روتھ کے سامنے بیٹھکر کھانا پیش کرنے کے آداب کے موافق شکریہ ادا کیا۔ روتھ، ہاشی (تیلیوں) سے کھانا کیا جانے لئے بڑی دقت ہوئی۔ ہاشی سے کھانے کی کوشش کرتی تھی مگر کوئی چیز گرفت میں نہ آتی تھی۔ مِسوکو نے ہاشیاں پکڑنی سکھائیں۔ کھانے کے بعد روتھ مِسوکو کا کمرہ دیکھنے گئی اور وہاں اس سے شادی کا کیمونو دکھانے کی درخواست کی۔ مِسوکو نے بڑے غور وفکر کے بعد الماری کھولی اور کیمونو نکال کر دکھایا۔ روتھ نے تعریف کی اور مِسوکو کو پہنکر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے عذر کیا کہ وقت سے پہلے میں نہیں پہن سکتی۔

دتانابے بیٹی کی زدہ حالت دیکھکر شب و روز فکر میں تھے۔ آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک مجلس چند عزیزوں کی موجودگی میں منعقد کی جائے اور اُس میں یاماداکو مدعو کر کے معاملہ کو یکسو کیا جائے۔ مجلس میں تمام لوگ جمع تھے۔ یاماداکا انتظار ہورہا تھا کہ وہ داخل ہوا اور سلام کر کے صدر جگہ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے تقریر کی اور مِسوکو سے گفتگو کرنی چاہی۔ دتانابے نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

مِسوکو بہت رنجیدہ اور شکستہ دل ہورہی تھی۔ اُس نے پوشیدہ طور سے ممبرانِ مجلس کے مشورے سُنے اور دل میں ٹھانی کہ اس پاپی دُنیا سے سوائے منہ موڑنے کے دوسرا علاج نہیں۔ دبے پاؤں اپنے کمرے میں آئی۔ اور الماری سے بہ حسرت ویاس اشکبار آنکھوں سے شادی کا کیمونو نکال کر فرد شکی میں باندھا، اور گھر سے زار و نزار غائب ہوگئی۔ چلتے وقت کاغذ کے ایک ٹکڑے پر نظم کے کچھ بند لکھکر چھوڑ گئی۔

جس وقت گھر کے دروازے سے نکلی مُڑ مُڑ کر کونے کونے پر الوداعی نظر ڈالی۔ مندر میں پہونچی خشوع وخضوع سے دُعا مانگی۔ مندر کے دو طرفہ آسمان تک پہونچنے والے سکورا کے درخت پھولوں سے لدے پھندے ترانۂ وحدت گا رہے تھے۔ تمام میدان میں پیازی رنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ جدھر نظر اٹھتی تھی درختوں پر پھول ہی پھول تھے۔ پتّوں کا نام نہ تھا۔ شاخیں بھی ان میں چھپکر

رہ گئی تھیں۔ ٹھنڈے درختوں پر پھولوں کا نکل آنا طلسم معلوم ہوتا تھا۔ کائنات قدرت کی مدح ثنائی سے عقل عاجز اور زبان گنگ تھی۔ ٹھلا ہوا سکورا بلا شبہ باغ ارم کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سوختہ دل مِسُّو کو دُنیا کی ہر چیز سے بیزار منہ اُٹھائے اپنی دھن میں چلی جا رہی تھی۔ ٹریم کا اسٹیشن آیا۔ مسافروں سے بھری ہوئی ٹریم گڑگڑاتی ہوئی درآمد ہوئی۔ مِسُّو کو سوار ہو گئی۔ اسامہ پہاڑ کے دامن میں ایک نوجوان لڑکی ہاتھ میں کچھ لئے کھڑی ہے۔ چند منٹ کے توقف کے بعد اُس نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ پہاڑ کی چڑھائی اچھے اچھے سورما کا سانس پھلا دیتی ہے۔ یہ نئی پھلکی چھٹانک بھر کی لڑکی بہ ہزار دقت اپنے کو کھینچ رہی ہے۔ دَم پھولا جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں جواب دے رہے ہیں۔ پیشانی عرق ریز ہے۔ راستہ ٹیڑھا سیدھا، اونچا نیچا دُشوار گزار ہے۔ جگہ جگہ تھک کر دم لیتی ہے اور چاروں طرف مایوسانہ نگاہ ڈالتی ہوئی پھر اسنک آتش فشاں پہ نگاہ در کرتی چڑھتی چلی جا رہی ہے۔ تشنگی سے بُرا حال ہے۔ بار بار خشک زبان لبِ نازک پر پھیرتی ہے۔ منہ کا لعاب بھی تقریباً خشک ہو چکا۔ ہوا اس قدر مخالف ہے کہ چلتی کسی طرف ہے اور ہوا کے بے در جھونکے لئے کسی طرف جاتے ہیں۔

یاما دا جب مِسُّو کو کے کمرے میں پہونچا تو وہ موجود نہ تھی۔ چاروں طرف تلاش ہوئی۔ ماں گھبرائی گھبرائی ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ یاما دا کا سامنا ہوا تو اس نے بڑی غم سوز آواز میں کہا "سارا گھر چھان مارا مِسُّو کو کا پتہ نہیں۔ وہ اپنا دُلہن کا کیمونو بھی ساتھ لے گئی"۔ یہ سُنکر یاما دا کا دل مٹھی میں آگیا۔ پہلو کی دیوار پر اس کی تحریر کردہ نظم نظر پڑی۔ ایک ایک مصرعہ تیر کی طرح دل میں گھپتا چلا گیا۔ نظم:-

بہار آئی—
سکورا کے پھول کھلے۔
ہوا چلی۔
عین شباب میں شیرازہ بکھر گیا۔
آہ اسمورائی کی جان!
سکورا رہنمائی کر رہا ہے۔

پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ حالت سراسیمگی میں کبھی کمرے میں آتا اور کبھی برآمدے میں۔ حواسِ خمسہ سست پڑ گئے، کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ باہر بے اوسان کھڑا تھا کہ نگاہ اوپر اٹھی۔ کوہِ آتش فشاں سے دُھواں نکلتا دیکھکر ایکدم خیال اس طرف منتقل ہو گیا۔ موٹر پر سوار ہوا اور نہایت تیز رفتاری سے بھاگتا ہوا دامنِ کوہ میں پہونچا۔

بدقسمتی سے گھبراہٹ اور جلدی میں ایسے دامن میں پہونچا جس کے نیچے جھیل پڑی بہہ رہی تھی۔ اس کو دیکھکر پریشان ہوا۔ کنارہ جھیل پر کوئی اجنبی بیٹھا کش لگا رہا تھا۔ بھاگا ہوا اس کے پاس گیا اور راستہ دریافت کیا۔ اجنبی نے کہا جھیل کو پار کر کے پہاڑ پر چڑھتے ہیں۔ مگر آج دن خراب اور ہوا تیز ہے۔ پہاڑ پر چڑھنا خطرناک ہے۔ یاما دا پر کسی نصیحت کا اثر نہ ہوا۔ اور کچھ سوچکر پہاڑ پر چڑھنے کا جوتا اُتار پھینکا۔ دھم سے جھیل میں کود پڑا۔ تیرتا ہوا کچھ دُور پہونچا تھا۔ دم گھٹنے لگا۔ جھیل پر گندھک کا کثیف دُھواں

چھایا ہوا تھا۔ سانس لینا دشوار تھا۔ کھانسی کے مارے برا حال۔ کہیں کہیں ٹھنڈ درخت جھیل میں کھڑے اپنی زیرآب زندگی پر نوحہ خواں تھے۔ تھک جاتا تو ان کا سہارا لیتا۔ اور پھر تیرنا شروع کر دیتا۔ بڑی تکلیف اور دشواری کے بعد کنارے لگا۔ چند قدم زمین پر چلکر اوندھا گر گیا۔ تھوڑی دیر بے حال پڑا رہا۔ پھر پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ پہاڑی راستہ ٹیڑھا سیدھا، ڈھلواں تھا۔ جگہ جگہ سے دھواں نکل رہا تھا۔ آگے چڑھکر جلتے جھلستے پتھر آنے لگے اور پاؤں کباب ہونے لگے۔ ہمت کرتا تھا مگر پاؤں یاری نہ دیتے تھے جرابیں جل جلکر چھلنی ہوگئیں۔ تلووں میں چھالے پڑنے لگے۔ خدا یاد آرہا تھا۔ ایک جگہ تکلیف سے بیقرار ہوکر پاؤں پکڑکر بیٹھ گیا۔ مگر متلاشی نگاہیں برابر آتش فشاں کی چوٹی پر لگی رہیں۔ چند ہی منٹ میں کھڑا ہوگیا۔ آتشِ الفت کی دبی ہوئی چنگاری بھڑکی اور دردِ دل نے اٹھاکر چلنے پر آمادہ کیا۔ لنگڑاتا ہوا تپتے ہوئے پتھروں اور ناہموار راستے پر چڑھنے لگا۔ دیوانوں کی طرح حال سے بیحال دونوں ہاتھ منہ پر رکھکر ہولناک آواز میں مسّو کو، مسّو کو پکارتا۔ زہریلی گیسیں تمام پہاڑ پر منڈلا منڈلا کر آنیوالوں کو دعوتِ اجل دے رہی تھیں۔ کئی دفعہ سوختہ پاؤں نے جواب دے دیدیا۔ اور پاؤں کو ہاتھ میں لے کر ہو بیٹھا۔ مگر مقناطیسی کشش کبھی منٹ دو منٹ سے زیادہ آرام نہ لینے دیتی تھی۔

مسّو کو چوٹی پر پہونچی تو آتش فشاں کا کھولتا ہوا غار نظر آیا۔ اس میں چنگاریاں چمک رہی تھیں اور دلدل پک رہی تھی۔ کتنے ہی جوانمرگ اس کے پیٹ میں سما چکے تھے مگر اس کی جوع کم نہ ہوتی تھی۔ جب اور جس وقت دیکھئے اپنی آغوش کھولے منتظر تھا۔ خونِ شباب منہ کو لگا ہوا تھا۔ ہر سال نوجوان سپوت اور لاڈلی کنیوں کو ہضم کر جاتا اور ڈکار نہ لیتا۔ مسّو کو منحوس غار کو دیکھکر سہم رہی تھی! اور آنکھیں بند کر لیتی۔ صورت پر دہشت چھائی گئی۔ پژمردہ رخساروں پر آنسو کی لڑیاں ڈھلکنے لگیں۔ جوانا مرگ تنِ تنہا موت کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ خوف سے رواں رواں لرز رہا تھا۔ آخر سوچنے لگی دنیا فانی غم والم کا گھر ہے۔ گوتم بدھا کے پاس پہونچکر یزداں مل جائے گا۔ عقبیٰ میں آرام ہی آرام ہے۔ اب مجھے کس کا خوف۔ اس خیال کے آتے ہی بدھا کی خیالی تصویریں سامنے آنے لگیں۔ اور مصروفِ دعا ہوئی۔ طبیعت کو قدرے سکون ہوا۔ الا اللہ کرکے اٹھی لکانپتے ہاتھوں سے فردشکی کھولی اور بادلِ گریاں کیمونو کو کندھے پر ڈالا۔

یاما دا چلتے چلتے تھک کر چور ہوگیا تھا۔ پاؤں تقریباً زخمی ہوچکے تھے۔ چوٹی سے چند گز کے فاصلے پر بیجان سا پڑا تھا۔ سامنے مسّو کو کیمونو پہنتی ہوئی دکھائی دی۔ رہے سہے اوسان خطا ہوگئے۔ آواز دینی چاہی مگر نہ نکلی۔ پسینے میں شرابور ہوگیا۔ اس خیال نے کہ اب گری اب گری طاقتِ رفتار سلب کر لی۔ اٹھنا چاہا مگر ڈھیر تھا۔ جوں توں کرکے چلا۔ ایک ایک قدم سو سو من کا تھا۔ مسّو کو اپنے خیال میں محو خدا سے لو لگائے کیمونو پہن رہی تھی کہ دفعتاً یاما دا نے پیچھے سے جاکر بغیر ایک حرف کہے جھٹ سے کیمونو اتار لیا۔ مڑکر دیکھا، سکتہ میں رہ گئی۔ خاموش تکتی رہی۔ پھر خفیف سے زیرِ لب تبسم کے ساتھ سر سے پیر تک ایک نظر ڈالی۔ سوختہ پاؤں نے دامنِ صبر کی دھجیاں اڑا دیں۔ دونوں ہاتھوں سے پیروں کو تھام کر وہیں کیمونو ان پر ڈالدیا۔ شادیِ مرگ نے غشی سے ہم آغوش کر دیا اور گر پڑی۔

کوہ آتش فشاں جوش میں آکر پتھر، چنگاریاں، لاوا اُگلنے لگا۔ پہاڑ پر دھواں ہی دھواں مسلط ہوگیا۔ اس ستم کی آتش فشانی ہوئی کہ پہاڑ سے پتھر نکل نکل کر جھیل میں ہتابیاں چھوڑنے لگے۔ زلزلے نے اور آفت ڈھائی۔ آس پاس کے مکان فرش کردئے۔ ہزار دقت یاما دا بیہوش منو کو گود میں اُٹھائے پہاڑ سے اترا اور نیچے سرائے میں لایا۔ ہوش میں لانیکی تدابیر کیں۔ بار بار حلق میں پانی چواتا۔ تھوڑی دیر میں منو کو نے آنکھ کھولی۔ یاما دا نے فرطِ محبت سے صرف اپنی پیشانی اُسکی پیشانی پر رکھدی اور آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوگیا۔

سخت محنت اور رنج والم نے یاما دا کی صحت پر ناخوشگوار اثر ڈالا۔ اور وہ بسترِ علالت پر پڑ گیا۔ صورت مرجھا گئی۔ رنگ سنولا گیا۔ دونوں پیر بندھے آرام کرسی پر پڑا تھا۔ منو کو اُس کی بیماری سے فکرمند ہے۔ طرح طرح سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کررہی ہے۔ ہر وقت اُس کے سامنے مثلِ گُل کے کھلی رہتی ہے۔ سامنے بیٹھی کوتو بجارہی ہے اور وہ سُریلا نغمہ چھیڑا کہ یاما دا سر دھننے لگا۔ لیٹے لیٹے اُٹھ بیٹھا۔ پرستار نگاہوں سے دیکھا۔ منو کو پاس آئی، دونوں زخمی پاؤں کو ہاتھ میں لیکر ہو بیٹھی۔ فجی موتو جاتے کی کشتی۔ لے کر آئیں اسی میں ایک خط رکھا تھا۔ یاما دا نے خط پڑھا اور منو کو کو دیکر کہنے لگا "روتھ بڑی اچھی لڑکی تھی۔ میں تمہیں کھو چکا تھا اُسی نے واپس دلایا ہے"

مسز برلاس (از جاپان)

تصانیفِ مصوّرِ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی ؒ

گولتار۔ مضحکہ خیز اور پُراسرار ناول، شوخ و شنگ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ۔ اور ایک عورت کی دردناک زندگی۔ عجیب غریب کتاب ہے۔ قیمت عار

شریر بیوی۔ ایک خاتون کی معصوم شرارتیں اسقدر دلچسپ ہیں کہ کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ چار تصویریں و رنگین سرورق۔ مجلد ، عہ

روحِ ظرافت۔ "انگوٹھی کی مصیبت" اور دیگر مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔ ہر افسانہ ظرافت کی روح ہے۔ اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ، عہ

روحِ لطافت۔ "مہارانی کا خواب" اور دیگر افسانے جنکو پڑھکر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے۔ پہلا افسانہ لاجواب قرار دیا گیا ہے۔ ، عہ

کمزوری۔ عورت کی کمزور فطرت کس طرح مرد کے بہکاتے میں آجاتی ہے۔ ابتدائی حصہ ہنسانیوالا اور آخری حصہ رُلانیوالا۔ ، عار

خانم۔ چغتائی صاحب کی تازہ ترین کتاب جس کا ایک ایک افسانہ ظرافت کی جان ہے۔ یہ مصنف کی بہترین تصنیف ہے۔ مجلد سنہری ، للعہ

جنّت کا بھوت۔ ایک بدشکل نوجوان اور اُسکی حسین عزیزہ کی پُرلطف داستان، مارے ہنسی کے آپکے پیٹ میں بل پڑجائینگے۔ مجلد ، ۱۲ر

ملفوظاتِ حاجی۔ ایک کتے کی خود نوشت سوانحعمری، اگر کتے کی زبان ہوتی تو وہ اپنے جذبات کس طرح ادا کرتا۔؟ اپنی طرز کی پہلی کتاب۔ ۱۲ر

تفویض۔ ایک بی۔ اے، پاس خاتون کی شادی سیدھے ملا سے ہوجاتی ہے کیسی گذرتی ہے؟ انجام کار کیا ہوتا ہے؟ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ، ۵ر

مرزا جنگی۔ لکھنؤ کے بانکے مرزا جنگی اور اُنکے احباب کا ایک نہایت دلکش ڈرامہ، واجد علیشاہ کے زمانے کے لکھنؤ کی ایک جھلک ، ۶ر

فرزندِ سرحد۔ سرحدی افغانوں کے متعلق ایک عبرتناک افسانہ۔ غیرت، دیانت و شرافت کا مرقع ہے۔ اس پر مصنف کا طرزِ بیان۔ ، ۵ر

قرضِ مقراضِ محبت است۔ اس مقولے پر مصنف نے نئے انداز سے افسانہ لکھا ہے کہ پڑھنے سے بیساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ ، ۵ر

قدرداں۔ سرزمین ریف کے سات خطرناک سالوں اور اُنکے جانباز بہنوئی کا حیرت خیز افسانہ۔ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ ، ۵ر

ملنے کا پتہ۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی نمبر

فرحت کا انجام

سُورج ڈوب چُکا تھا۔ شام کی اُداس تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ کمرے کے دروازے کے گرد نوکروں کا ہجوم تھا جن کے زرد متوحش چہروں پر خوف و دہشت کے آثار تھے۔ میرے پہونچتے ہی سب نے راستہ چھوڑ دیا۔ میں نے چلا کر آوازیں دیں۔ "فرحت!! فرحت ———!!" دروازے میں اندر سے قفل لگا ہوا تھا۔ جب سب زور لگا کر ہار گئے تو بدقت تمام اوزاروں کی مدد سے دروازہ توڑا گیا۔ میں تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ نوکروں میں سے کوئی بھی میرے ساتھ اندر نہیں آیا۔ کسی نامعلوم خوف نے غیر محسوس قوت کے ساتھ اُن کو روک رکھا۔ کمرے کی اتھاہ تاریکی میں میں اکیلا کھڑا تھا، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بجلی کے سوئچ کی تلاش میں میرے نم آلود ہاتھ بیسیوں چیزوں سے ٹکرائے، چینی کے خوشنما مرتبان، آبنوسی چوکھٹوں والی تصویریں۔ کانسی کے گلدان وغیرہ بیش قیمت نوادر جو اُس کمرے میں بے گنتی بھرے تھے میرے راستہ میں حائل ہوئے۔ میرا سر چکرایا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی طویل القامت انسان سفید لبادہ پہنے اپنے برف جیسے خنک ہاتھوں سے مجھے پکڑ رہا ہے۔ میں نے پھر پکارا "فرحت ———!!" لیکن میری آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی ——— اچانک میرا ہاتھ کسی گداز اور چکنی سی چیز پر پڑا جس کو چھونے پر ایسا معلوم ہوا جیسے کسی مُردے کا سرد جسم۔ خوف و دہشت کی ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ میں پیچھے ہٹا اور لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔ چند سکنڈ کے بعد جب حواس ذرا مجتمع ہوئے تو میں نے دیوار پر ہاتھ پھیرا۔ سوئچ بورڈ اتفاق سے قریب ہی تھا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے میں نے بٹن دبایا۔ بجلی کی کپکپی خونخوار درندے کی خون آلود آنکھوں کی طرح دہک اٹھی ——— میں نے دیکھا کہ فرحت سنگار میز کے سامنے ایک کرسی پر نیم دراز ہے ——— میرا دل حلق کے قریب دھڑکتا ہوا معلوم ہوا "فرحت ... "بیگم!!" کہتا ہوا میں اُس کی طرف لپکا ——— کیا واقعی یہ پتھر کا مجسمہ فرحت ہی تھی؟ سفید براق ریشمی ساری میں لپٹی ہوئی یہ بیجان مُورتی کیا میری بیوی ہی تھی؟؟ مجھے اس کے پہچاننے میں کافی دیر لگی۔ اپنی جلتی ہوئی وحشت زدہ آنکھوں سے حیرت، ڈر اور اشتباہ کے ساتھ میں اس برف کے مانند سرد و سفید ڈھیر کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کی بے نور آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں اور سامنے والے بڑے آئینہ پر جمی ہوئی تھیں۔ پتلیاں کچھ کچھ اُوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔ سیاہ گھونگریالے بال پوری لمبائی تک بکھرے پڑے تھے جیسے غضبناک سمندر کی موجیں ——— بایاں ہاتھ کرسی کے نیچے گر پڑا تھا ——— ڈرتے لرزتے کپکپاتے ہوئے میں نے اُس کے ہاتھ کو چھوا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا ——— بجلی کے سے جھٹکے کے ساتھ میرا ہاتھ خود بخود کھنچ گیا۔ وہ اپنے تمام زیورات جو بڑے چاؤ اور شوق سے بنوائے گئے تھے پہنے ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ کے جھٹکے سے اُس کا مُردہ ہاتھ ہلا۔ چوڑیوں کی جھنکار نے مجھے پھر ڈرا دیا۔ کہیں یہ لاش زندہ تو نہیں؟؟ ذرا سنبھل کر میں نے اُس کے چہرے کا جائزہ لیا ——— اس کا لباس نفیس اور بھینی خوشبو سے معطر تھا۔ میں نے اُسکے بھیانک چہرے کی طرف گھور کر دیکھا اور پھر سامنے والے آئینے میں اُس کے عکس کو ——— کیا واقعی یہ فرحت ہی تھی؟ فرحت تو حُسن کی دیوی تھی اور یہ عورت تو مٹیالی راکھ کا ڈھیر ہے۔ لیکن اُسکے نیلے ہونٹوں پر اسکی وہی مخصوص ہریلی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ یہ تلخ اشتہا آمیز مسکراہٹ صرف فرحت ہی کے ہونٹوں پر آسکتی تھی۔ شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ میں نے اپنے قدیم نوکر عبدل کو آواز دی۔ عبدل ڈرتا ہوا آیا اور ایک ہی نظر میں سب کچھ سمجھ گیا۔ وفادار ملازم نے اپنی مالکہ کے ہاتھ چُومے اور قدم چھو کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔

میں نے اپنی مُردہ بیوی کی قیمتی پوشاک اور بھیانک چہرے کی طرف دوبارہ نظر ڈالی۔ اور پھر عبدل کی سچّی عقیدت پر ہنسا۔ یہ مسکین شخص اس مکّارہ کے سامنے جُھک کر اپنی شرافت کا خون کر رہا تھا۔

"عبدل ــ جاؤ ــ" میں نے چلّا کر کہا۔ "تم نہیں جانتے کہ یہ عورت کیسی تھی میں اسے فرشتہ سمجھتا تھا مگر اصل میں یہ زہریلی ناگن تھی ــ شاید تم کو اُس رات کا واقعہ معلوم نہیں ــ مگر خیر، تم جاؤ۔ اس کمرے سے فوراً نکل جاؤ۔ کل صبح بیگم صاحبہ کا شاندار جلوس نکلے گا۔ اسکے لیے انتظام کرو، جاؤ اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

"اکیلا؟" عبدل نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں، کل چاہے تم اسکی مالک بنجاؤ لیکن آج یہ میری ملکیت ہے" میں نے کہا۔

"مگر صاحب، یہ تو دیکھنا چاہیئے کہ موت کیسے واقع ہوئی" عبدل نے مستفسرانہ کہا۔

"یہ تو صاف ظاہر ہے ــ" میں نے میز پر سے ایک چھوٹی سی خالی شیشی اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو اس پر پوائزن لکھا ہے سمجھے۔ نہایت سہل ترکیب ــ اور یہ دیکھو ــ" میز پر بہت سے کاغذ بکھرے پڑے تھے ــ "بیگم صاحبہ نے چند دلچسپ دستاویزات بھی تحریر کی ہیں ــ محبوبہ کا آخری پیامِ الفت تبرک کا درجہ رکھتا ہے۔ شاید تم نہیں جانتے کہ بیگم صاحبہ ادب سے بھی شغف رکھتی تھیں ــ اب تم جاؤ اور مجھے اس شہ پارے کو پڑھنے دو ــ جاؤ"

عبدل بادلِ ناخواستہ چلا گیا۔ اور میں اپنی جاں نواز فرحت سے آخری باتیں کرنے کے لیے اور اُن کی رومان انگیز تحریر سے بصیرت حاصل کرنے کے لیے اکیلا رہ گیا۔

خوف و ہراس، غم و غصّہ کے تمام آثار میرے دماغ سے یک قلم محو ہو گئے۔ ہاں بجائے البتہ دل کی دھڑکن بدستور تیز تھی۔ میں فرحت کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"ہاں، فرحت۔ مجھے یقین تھا کہ تم یہی کرو گی۔ اُس رات کی ناپاک حرکت کے بعد تمہیں دُنیا میں رہنے کا کوئی حق باقی نہیں رہا تھا۔ اب تمہاری وہ سحر انگیز آنکھیں کیوں پتھرا گئیں جن سے تم میرے صادق دوست کو اپنا گرویدہ بنانا چاہتی تھیں۔ وہ شیرینی، وہ ملاحت اور تمہاری مُسکراہٹ کا وہ زہر ہلاہل سب فنا ہو گئے۔ اچھا ہوا ــ کہو تمہیں کیا کہنا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مُردے سن سکتے ہیں۔ کیا تم نہیں سُن رہیں؟ خود فطرت نے انتقام لے لیا۔ میرے معصوم دل کو ٹھکرا کر تم نے میرے سچے دوست پر اپنا جادو چلانے کی کوشش کی۔ یہ اس کا انجام ہے ــ تمہیں بدلہ دینا ہو گا اُس بیوفائی کا جو تم نے میرے ساتھ کی۔ اُس رُوحانی تکلیف کا جو تم نے اپنی شرمناک حرکتوں سے مجھے پہونچائی۔ اس دغا فریب، جھوٹ اور مکر کا جو تمہارے خمیر میں داخل تھا ــ کیا میں تمہارا معافی نامہ پڑھوں"

میں نے بکھرے ہوئے کاغذات کو یکجا کیا ــ ساتھ ہی میں نے اپنی جادو ساکن سرد و سنگین فرحت کا دوبارہ جائزہ لیا۔ ہلکے نیلے جمپر کے نیچے سے سفید ریشمی انڈرویر جھلک رہا تھا۔ میں نے بڑھکر اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ خدا معلوم کیوں، ایک لمحہ کے لیے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس کے قلب کی نازک دھڑکن سُن سکوں۔ لیکن وہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو چکا تھا ــ کسی لجلجی سی چیز پر میرا ہاتھ لگا۔ میں نے ڈر کر ہاتھ گھسیٹ لیا۔ ایک سیاہ بھونرالا سانپ اُس کی کمر کے گرد لپٹا ہوا تھا ــ یہ تحفہ میرے اُس دوست نے نذر کیا تھا جس پر میری رومانی فرحت فریفتہ تھی۔ سیاہ موتیوں کا نہایت خوبصورت سانپ جس کی آنکھوں میں اصلی

بھیرے جڑے ہوئے تھے اور منہ میں بکلس تھا جس سے یہ سانپ ایک بیسٹی کی خدمت انجام دیتا تھا ــــــ اُفوہ مرتے دم تک فرحت نے اس عزیز سانپ کو اپنے سے الگ نہ کیا ــــــ مردہ جسم سے لپٹا ہوا یہ سانپ اس وقت بالکل زندہ معلوم ہوتا تھا اور یقیناً مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہوتی اگر یہ اس وقت اپنا پھن اٹھا کر پھنکارے مارنے لگتا ــــــ سامنے والے آئینے میں میں نے اپنا عکس دیکھا، فرحت کے ہیبتناک عکس کے برابر۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں ــــــ ایسا معلوم ہوا کہ فرحت کی مٹیالی پیشانی پر نفرت کی شکنیں پڑیں لیکن نہیں، اس کے نیلے لبوں پر وہی مسکراہٹ قائم تھی ــــــ البتہ جبڑے کے سختی کے ساتھ بند ہو جانے سے یہ مسکراہٹ اور زیادہ بھیانک ہو گئی تھی۔

تُند ہوا کا جھونکا آیا۔ فضا میں بلی چیخیں سنائی دیں۔ کھڑکیاں ہلیں، پردے کانپے۔ فرحت کے لمبے سیاہ بال لہرائے۔ کمرے کی فضا میں خوشبودار تیل کی مہک پھیل گئی۔ لیکن اس خوشبو کے بین بین شاید ایک قسم کی بساند بھی تھی ــــــ جب سکون ہوا تو میں نے خط سنبھالا اور اطمینان سے پڑھنا شروع کیا۔

بغیر کسی القاب آداب کے خط اس طرح شروع ہوا۔

"میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں مر کر رہوں گی ــــــ کسی جذباتی ہیجان کے تحت نہیں بلکہ پورے غور و خوض کے بعد میں نے یہ اٹل فیصلہ کیا ہے۔ میرا دماغ شدید کرب میں مبتلا ہے اور میرا جسم زندگی کے بوجھ سے دبا جاتا ہے۔ ان سب تکلیفوں کا ختم کر دینا ہی انسب ہے ــــــ موت کے خیال سے اس وقت خوف کی بجائے کچھ انسیت سی معلوم ہوتی ہے۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ اپنی مصیبتوں کے اختتام کے لئے میں کسی غیبی طاقت کی ممنونِ احسان نہ ہونگی بلکہ خود اپنے ہاتھ سے ان کا خاتمہ کر دونگی۔ دل کی اس بیجا دھڑکن، اعصاب کے ارتعاش اور خون کے ابال کو میں اپنی مرضی سے ذرا سی دیر میں ساکت کر دونگی۔ مبارک ہے یہ ارادہ اور شاباش ہے اس اقدام کو ــــــ اپنی بھرپور جوانی میں میں اس زندگی، اس لیل و نہار اور اس دنیا سے بیزار ہوں۔ الحمدللہ کہ جلد ہی میری آنکھیں کھل گئیں ــــــ دنیا سے جاتے وقت مجھے اپنے محبّ کی نورانی آنکھیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں اور بس ــــــ چوبیس برس کی طویل عمر میں صرف چند لمحوں کیلئے میں نے اُسے اپنا بنایا۔ یہ چند لمحے میری زندگی کا عطر تھے۔ افسوس اب وہ چلا گیا۔ وہ جس کے دم سے میری دنیا آباد تھی۔ جس کی زندگی سے لبریز مسکراہٹ میرے ارمانوں کی آبادی میں چراغاں کر رہی تھی۔ وہ چلا گیا اور اس کے بغیر میرا زندہ رہنا عبث ہے۔ میرا وجود دنیا کی پیٹھ پر بوجھ ہے ــــــ اپنے جاہل اور منحوس شوہر کا مجھے ذرا بھی خیال نہیں، بلکہ خوشی ہے کہ میں اس کی مہلک گرفت سے نجات حاصل کر رہی ہوں۔ یہ حضرت بھی خودداری اور ناموس کا پاس رکھتے ہیں، چہ خوش!! اور انہیں بے معنی الفاظ کا آسرا لیکر حضرتِ سلامت نے مجھ سے علیحدگی اختیار کرنے کی دھمکی دی ہے۔ بڑے عزت والے! اس قسم کا آدمی اس کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتا تھا ــــــ اگر اس نے مجھے سمجھا ہوتا۔ میرے جذبات کا پاس کیا ہوتا ــــــ اگر اس عشق و محبت کا ذرا سا بھی اظہار کیا ہوتا جس کی میں بھوکی تھی تو شاید مجھے اس کی طرف سے افسوس ہوتا۔ لیکن اس نے میرے ساتھ بالکل وہی برتاؤ کیا جو ہر مرد ہر عورت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کر سکتا ہے۔ مجھے اچھے سے اچھا کھلایا۔ اچھے سے اچھا پہنایا۔ رہنے کو کوٹھی، خدمت کو نوکر چاکر، اور اس کی ناشائستہ خواہشات کی آسودگی کے انعام میں زر و جواہر کے انبار۔ لیکن کیا کبھی اس نے

یرے ساتھ ہمدردی کا ذرا سا بھی برتاؤ کیا۔ کبھی میرے مضطرب دل کی دھڑکن محسوس کی۔ کبھی میری خاطر سے اپنے جذبات کی فراوانی کو
دکا۔ کبھی خفیف سے ایثار سے بھی کام لیا ـــــ کبھی نہیں۔ شادی کے چار طویل سالوں میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ـــــ اب
بکہ میرا راحتِ روح اور یہ خبیث دونوں عمر بھر کے لئے مجھ سے علیٰحدہ ہو گئے تو میں آزاد ہوں ـــ اس چھوٹی سی نبض کو جس کا
ننا بڑا نام یعنی زندگی ہے، جس کی بساط ایک کمزور تاگے سے زیادہ نہیں، میں بڑی آسانی سے توڑ ڈالونگی ـــــ مجھے خوشی ہے
ہ آج اس وقت مجھے اس ارادے سے باز رکھنے والا کوئی نہیں ـــــ دُنیا میں میرا کوئی نہیں جو میرا ہاتھ پکڑلے اور اس کمزور
اگے کو نہ توڑنے دے ـــ کوئی نہیں!!۔

آج قبر کے کنارے تک پہونچکر میں اپنی گُذشتہ عُمر پر نظر ڈالتی ہوں ـــ مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ زندگی جس کو میں اب ختم
رہی ہوں کس طرح شروع ہوئی ـــــ ایک سبق جو مجھے بچپن سے سکھایا گیا یہ تھا کہ میں اچھے اچھے کپڑے پہنوں اور بناؤ
سنگار کرکے لوگوں کو پرچایا کروں۔ بھولی بھالی فرحت کے نرم رُخساروں پر بڑے بڑے کھوسٹ اپنے تماکو کی بو والے ہونٹوں
سے بڑی شفقت کیساتھ پیار کیا کرتے تھے "کتنی پیاری بچی ہے!" "کیسی بھولی!" وہ مجھے اپنے ہوسناک بازوؤں میں گھیر کر اپنے
سینوں سے چمٹایا کرتے تھے ـــ کتنی حرمزدگی تھی ـــــ بچپن ختم ہوا جوانی آئی۔ شوق و ارمان کی چنگاری جو اپنے بزرگوں کی
عادات و خصائل کے مشاہدے سے میرے دل میں پیدا ہو چکی تھی ایک دم سے بھڑک اُٹھی۔ میرا دل چاہنے لگا کہ ہر مرد میری
طرف دیکھکر سرد آہیں بھرے۔ ہر نوجوان مجھے حاصل کرنے کی تمنا میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور میں سب کے خوابوں کی
دیت دیوی بن بنکر سب کو خوش رکھوں اور کسی کے ہاتھ نہ آؤں ـــــ چنانچہ اس شغل لطیف میں اپنی بہترین کوشش صرف
کرنے لگی۔ طبیعت میں جولانی، ولولہ اور خیالوں میں رومانی محبت رچ گئی ـــ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ادب کی طرف مائل ہوئی۔ شاعری
اور محبت کے افسانوں میں میں خود اپنی واردات تلاش کرنے لگی۔ ہر بگڑا دل شاعر اور ہر محبت کا پجاری افسانہ نویس میرا ہی مبتلا
نظر آنے لگا ـــــ عشق و محبت کے جوشیلے قصے، عاشق و معشوق کی رنگینی ملاقاتوں کے عریاں بیانوں میں مجھے خاص لطف
آنے لگا۔ ہر وقت انہی خیالی قلعوں میں رہنے لگی ـــــ مجھے خود اپنی ذات اور اپنے ان جاں نواز رومانی خیالوں سے کس قدر
محبت ہو گئی تھی۔ صبح سے شام تک میں اپنے خیالی مجنوں کے انتظار میں بیٹھی رہتی ـــــ آہ! دُنیا سے جاتے وقت یہ خیال
کتنے عجیب معلوم ہوتے ہیں ـــــ یہاں کی تمام رنگینیوں اور بہار آفرینیوں سے رُخصت ہوتے وقت جب اپنی گذشتہ
حیات کا جائزہ لیتی ہوں تو دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے ـــــ کھڑکی میں رکھے ہوئے پنجرے میں سے بنگالی مینا
میٹھا س بھری آواز میں کوکی ـــ "فرحت کی مینا" "بیگم کی پیاری!!" ـــ "یہ پیاری مینا کتنی خوش ہے ـــــ
اسے تو خوش ہونا ہی چاہیئے کیونکہ وہ انسان نہیں ہے ـــــ اُس کی پیاری باتیں مجھے کتنی پسند تھیں۔
آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ بیچاری مجھے کتنا یاد کرے گی ـــ یہ خیال کہ میں اُس کی مالکہ مرچکی ہونگی اور یہ پھر بھی اپنے
لہجے میں بولا کرے گی ـــ فرحت کی مینا ـــ!!

. . . . . .

یہ کمزور خیالات میری ہمت پست کئے دیتے ہیں ـــ میں نے مینا کو پنجرے سے رہا کر دیا۔ محبت کی ماری مجھ سے جُدا

نہیں ہونا چاہتی تھی۔ میں نے جھٹک کر پرے کر دیا۔ اب وہ بائیں باغ میں پھُر پھُر کرتی ہوئی، ایک درخت سے دوسرے درخت پر اُڑتی پھر رہی ہے ــــ قید سے رہائی حاصل کرنے پر کتنی خوش ہے ــــ کیا مجھے بھی اپنے قفسِ عنصری سے نجات حاصل کرنے پر خوشی حاصل ہوگی ــ؟ ــ شاید!!

دو ایک فقرے ذرا اور دہرے آگئے۔ جن پر مجھے ندامت ہے ــ مجھے مرنے کا ذرا بھی افسوس نہیں ــ مجھے اپنا بیان جاری رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس طرح میں اپنی افتادِ طبع کا تجزیہ کر سکوں گی ــ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میری رومانی ذہنیت اور شباب کی شعلہ روانیوں کی واحد ذمہ دار میری تعلیم اور میرا ماحول ہے ــ ... خیر ــ سترہ برس کی عمر میں میرے والدین نے "شادی کے بازار" میں مجھے ایک انمول سودے کے طور پر پیش کرنا شروع کیا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر، جلسوں میں اِدھر اُدھر، بڑی بوڑھیوں کی لالچی نظریں مجھ پر پڑنے لگیں۔ اپنے ہونہار اقبالمند صاحبزادوں کے لئے انہیں ایک معقول دلہن کی تلاش تھی۔ ادھر میرے والدین بیچارے قرضے میں گرفتار تھے۔ اُن کو ضرورت تھی ایک ایسے مالدار شخص کی جس کی عنایت سے اُنکے تمام دلدر دور ہو جائیں ــــ ان حالات میں مجھے بہت جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ میرا عنقریب سودا ہونے والا ہے ــــ محبت کے خیال ہی سے محبت کرنے والی دوشیزہ کے لئے یہ خیال سوہانِ روح ہو گیا ــــ اپنے خیالی صنم کے انتظار میں زیادہ بے چینی محسوس کرنے لگی ــــ اس عرصے میں میرے بیسیوں فوٹو کھنچے اور جگہ بجگہ بھیجے گئے ــــ بعض حلقوں میں میری قیمت کے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی تھیں بعض خریداروں کے لئے میری مقررہ قیمت حوصلہ شکن ثابت ہوئی ــ اسی اثنا میں میری ملاقات میری موجودہ ہمسائی سے ہوئی۔ وہ نیکی کا مجسمہ، اخلاق کی پتلی اور محبت کی دیوی تھی۔ اس نے مجھے چند عمدہ کتابیں پڑھنے کو دیں۔ جن سے میں نے اپنے خیالات میں نمایاں تبدیلی محسوس کی ــــ اس وقت جبکہ میں لب گور بیٹھی ہوں میری نیک ہمسائی اپنے گھر میں بفراغت دلچسپ گھریلو کاموں میں مصروف ہوگی ــــ میں چاہوں تو اپنی مدد کے لئے اُسے بلا سکتی ہوں۔ وہ دوڑی دوڑی آئے گی اور نسائیت کے تقاضہ سے مجھے اس ارادے سے باز رکھنے کے سو سو جتن کرے گی۔ مجھ سے لپٹ جائے گی۔ زہر کی شیشی جو میرے قریب رکھی ہے اسے توڑ پھینکے گی۔ مجھے پکڑ کر اپنے گھر لے جائیگی ــــ ایک عجیب خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا ــــ میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے اُسے آہستہ سے بلاتی ہوں۔ شاید وہ سُن لے اور آجائے اور پھر شاید میرا ارادہ بدل جائے ــــ قسمت شاید دوسرا راستہ اختیار کرلے۔ شاید ــ!!

میں نے اُس کا نام لیکر پکارا۔ آہستہ سے تین مرتبہ۔ اُس نے نہیں سُنا۔ وہ نہیں آئے گی ــ آج خدا اُسے اپنا فرشتۂ رحمت نہیں بنائے گا ــ اُسے میرے دل کے زخموں کی کیا خبر ــ اگر وہ میری اصلی سرشت جان لے تو مجھ سے کس قدر نفرت کرنے لگے ــ خیر ــ،

اب وہ زمانہ آیا جبکہ میرا خیالی محبوب جس کی پرستش کرنا میرا واحد مقصد تھا تسلیم کی شکل میں نمودار ہوا ــ ایک وحشیانہ مسرت نے مجھے دیوانہ بنا دیا ــ میرے دماغ پر کیسی مدہوشی طاری ہوگئی۔ میرے خون میں کیسے خوشی آمند شعلے بھڑک اٹھے!

میں نے سلیم کو دیکھا اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی فرشتے کی طلسماتی آنکھوں نے مجھ پر جادو کر دیا ــــــــ پر افسوس اُس کا شنّی بنا ہوا وہ شخص آیا، جس نے بیشمار دولت سے مجھے خرید ڈالا ــــ وحشی، خبیث طینت، منحوس، بوزنہ صفت انسان جو میرا قانونی شوہر ہے ــــ شوہر ــ ہوں!!! ــــ"

. . . .

یہاں میں پڑھتے پڑھتے رُکا اور فرحت کی طرف نظر کی ــــ اُس کا سر سینے کی طرف جھک گیا تھا: "میں بیوقوف تھا جو میں نے تجھ سے محبت کی ــــ تجھے حاصل کرنے میں میں نے اپنی جان تک بیچ ڈالی ــــ اگر تو دوبارہ زندہ ہو سکتی تو پھر میں دیکھتا ــــ" غصہ کے مارے میرا دماغ پریشان ہو گیا۔ میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور چند سے توقف کے بعد پھر پڑھنا شروع کیا۔

. . . .

"میری شادی اُس کروڑپتی وحشی سے ہو گئی۔ ظاہراً میں نے اُس سے محبت کا برتاؤ روا رکھا لیکن سلیم کیلئے میرا دل ہمہ وقت بیتاب رہا اور میں موقع کی تلاش میں رہی۔ میرا خیال تھا کہ شادی کے بعد مجھے زیادہ آزادی حاصل ہو جائے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ شادی کے بعد عیاشی کرنا فیشن میں داخل ہے، میری سہیلیوں میں سے زیادہ تر ایسی ہی تھیں جو شادی کے بعد اپنے محبوبوں سے درانہ ملتی رہتی تھیں۔ ــــ میرا خیال تھا کہ سلیم بھی میری اس مصلحت کو پسند کریگا۔ لیکن آہ! اُس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ اور یہیں سے میری ناکامی کا دُکھڑا شروع ہوتا ہے ــــ ایک بار، دو بار ہزاروں بار میں سلیم کے سامنے گڑگڑائی۔ اس کے قدموں پر سر رکھا لیکن وہ سنگدل ذرا نہ پسیجا ــــ تعجب ہے وہ اسے گناہ کیوں خیال کرتا تھا ــــ فی زمانہ یہ نہایت معمولی سی بات سمجھی جاتی ہے۔ شوہر کے علاوہ ہر فیشن ایبل عورت کا ایک عاشق ہونا ضروری ہے ــــ قریب قریب تمام شہرۂ آفاق مصنفین اس کی حمایت کرتے ہیں ــــ اس مسئلہ پر میں نے ملک کے مایۂ ناز رسالوں میں لاتعداد مضامین دیکھے ہیں ــــ پھر آخر اس قسم کی کوئی خواہش رکھنے پر میں مجرم کیوں قرار دی جاؤں ــــ سب کہتے ہیں کہ بدنامی نہ ہو تو یہ نسخہ نہایت کام کا ہے۔ میرے معاملے میں بھی بدنامی کا کوئی سوال نہیں تھا ــ پھر آخر اس میں کیا نقصان تھا ــ لیکن میری قسمت!

. . . .

ابھی ابھی ایسا معلوم ہوا جیسے سلیم نے مجھے پکارا۔ اُس کا شیریں لہجہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ لیکن اُسے میری پروا نہیں ــــــ کوئی مضائقہ نہیں آج اُس کے نام پر، اُسکی محبت کے نام پر میں اپنی جانِ عزیز قربان کرتی ہوں ــــ میں نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ میں کیسی خوبصورت ہوں ــــ بے انتہا حسین! مجھے یاد ہے گذشتہ سال ایک نجومی نے کہا تھا کہ "تیری خوبصورتی یا تو کسی کو ہلاک کریگی یا خود فنا ہو جائے گی"۔ مجھے خوشی ہے کہ اس پیشینگوئی کا دوسرا حصہ آج سچا ثابت ہو رہا ہے۔ میں نے غور سے اپنی مدبھری آنکھوں کی گہرائیوں کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ان میں طلسمات پوشیدہ ہیں۔ لمبی اور مخملی پلکیں ریشمی جھالروں کی طرح ان جادوگرنیوں کی پردہ پوشی کرتی ہیں۔ پھولی کے سے رخسار، پتلے حلاوت سے بھرے متبسم ہونٹ، شفاف گردن۔ یہ تمام تحائف کس کے لئے ــــ فطرت نے یہ بیش بہا نعمتیں مجھے اسی لئے بخشی تھیں کہ مردوں کے دل لبھاؤں۔ لیکن افسوس سلیم ان سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔

. . . .

زہر کی شیشی میرے قریب رکھی ہے ــــ میں نے اچنبھے سے اُسکی طرف دیکھا ــــ مجھے اِس ننھّی سی شیشی سے کس قدر اُنسیت معلوم ہوتی ہے ــــ سفید جیسے موتی ــــ ایک چمچہ بھر بھی نہیں ــــ پھر بھی یہ بُوند بھر پانی مجھے موت کے تاریک طبقے میں پہونچا دیگا اور دُنیا کی تمام رنگا رنگ محفلوں سے ہمیشہ کیلئے جُدا کر دیگا ــــ اس ننھّی سی شیشی کو کتنی عظیم الشان خدمات انجام دینی ہیں ــــ میرے جسم میں خفیف سا ارتعاش ہے۔ جو خوف و ہراس کے سبب نہیں بلکہ اعصاب کی کمزوری کے سبب ہے اسوقت مجھے پریشان کر رہا ہے۔ موت کے قرب کی وجہ سے گوشت پوست اعصاب خود بخود لرز رہے ہیں ــــ اُف زندگی تیری محبّت انکو کتنی عزیز ہے!!

. . . .

اب میں بالکل تیار ہوں ــــ مجھے اور کچھ نہیں کہنا ــــ اپنے اس اقدام پر میں تاویلیں اور خواہ مخواہ کے عذرات تراشنا نہیں چاہتی ــــ میں جیسی پیدا ہوئی اور میرے ماحول نے جیسا مجھے بنا دیا ویسی ہی ہوں ــــ مغرور، سرکش اور باغی ــــ خود پسند، جذباتی ــــ اُسے جس کو میں چاہتی ہوں حاصل کرنے میں مجھے ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوتی، چاہے اس میں مجھے اپنے شوہر کے ساتھ بیوفائی کرنی پڑے ــــ شوہر کے ساتھ دفا میرے نزدیک اجتماعِ ضدین ہے ــــ اگر میں بُری ہوں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ آنکھ کھول کر میں نے دُنیا میں دیکھا کہ سب اسی طرح کرتے ہیں۔ صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ میں نے ذرا ضد سے کام لیا اور دوسرے خوشامد اور چاپلوسی سے کام نکالتے ہیں ــــ میں صاف صاف کہہ سکتی ہوں کہ میرے تمام افعال کی ذمّہ دار وہ سوسائٹی ہے جس میں میں پلی بڑھی اور مُلک کے وہ مایۂ ناز فلسفی ہیں جن کی تصانیف پر میں ایمان لائی۔ میری شادی ہوئی بالکل اسی طرح جیسے میرے طبقہ کی ہر لڑکی کی شادی ہوتی ہے ــــ یعنی روپیہ سے ــــ میں نے محبت کی بالکل اُسی طرح جیسے میری قماش کی ہر لڑکی محبّت کرتی ہے یعنی جسمانی حُسن سے ــــ اور آج میں مر رہی ہوں بالکل ایسے ہی جیسے میری فطرت اور میری ذہنیت کی ہر لڑکی مریگی۔ قدرتی موت سے یا میری طرح از خود ــــ!!

. . . .

میں زہر پینے ہی والی تھی کہ سامنے والے آئینہ میں مجھے ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ میری ماں کا چہرہ تھا۔ اُن کے نورانی چہرے پر آنسو بہ رہے تھے ــــ انہوں نے میرا نام لیکر پکارا ــــ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ کوئی بھی نہیں تھا ــــ میرا دل زور سے دھڑک اُٹھا اور سر چکرا گیا۔ کچھ دیر تک میں کُرسی کے سہارے کھڑی رہی ــــ پھر میں نے میز کی دراز میں سے یوڈی کلون کی شیشی نکالی اور اپنا رومال اِس خوشبو میں تر کر کے پیشانی اور کنپٹیوں پر رکھا تاکہ طبیعت ذرا بحال ہو جائے ــــ طبیعت بحال ہو جائے!! ــ اِس فقرے میں کتنی تُرشی ہے ــــ قبر کے قریب پہونچکر طبیعت کی بحالی کا خیال ــــ کیا خوب!! اس عطر کی خوشبو کتنی عُمدہ ہے ــــ مجھے خوب یاد ہے یہ میں نے کہاں سے خریدی تھی۔ ہماری شادی نئی نئی ہوئی تھی ــــ نئی نویلی دُلہن کے چاؤ میں میرے سرتاج بہادر نے یہ شیشی شملہ میں خریدوائی تھی جبکہ ہم ہاتھ میں ہاتھ دئے مال پر ٹہل رہے تھے ــــ اس "سہانی" یاد پر میں ہنس پڑی موتی کی سی چمک والے خوبصورت دانت آئینے میں نظر آئے۔ انہیں اچھی طرح دیکھنے کے لئے میں دوبارہ ہنسی۔ آواز سے۔ میری آواز کتنی شیریں صاف، اور دلکش ہے۔ کاش ان بیش بہا تحائف کی قدر کرنے والا کوئی ہوتا!!!

. . . .

زہر کی خالی شیشی پر میں نظریں گاڑے دیکھتی رہی ــــ میں اسے غٹ غٹ پی گئی جیسے کڑوی دوا پی جاتی ہے ــــ آنکھیں میچ کر۔ خفیف سے جبر کے ساتھ ــــ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے میں نے انناس کا مربہ کھایا۔ یہ مربہ قلب کو فرحت پہونچاتا ہے ــــ قلب کو فرحت!! لیکن فرحت کیلئے فرحت کہاں؟؟؟ ــــ میں اپنے چہرے کے عکس کی طرف بغور دیکھ رہی ہوں اور ہر خفیف سی تبدیلی کا اچھی طرح جائزہ لوں گی ــــ کم از کم یہ مشغلہ انتظار کی گھڑیوں کو خوشگوار بنا دیگا ــــ لیکن شاید زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔ موت میرے گھر کے دروازے تک پہونچ چکی ہے ــــ سلامتی ہو تجھ پر اے قوتِ عظیم!!۔

ت ت ت ت ت ت

ناقابلِ بیان ــ سخت تکلیف ــ بےچینی۔ اختلاج۔ اعضا کا تشنج۔ اندر سے کلیجہ کٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میرا رُوواں رُوواں کانپ رہا ہے ــــ اور پسینے سے شرابور ــــ میری آنکھیں کچھ عجیب طرح جُھلس رہی ہیں، اپنا عکس بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی۔ گلے کے پاس والی رگ کچھ عجیب تیزی سے چل رہی ہے ــــــــ میرے پیارے خوشبوؤں میں بسے ہوئے بال۔ میں نے اُن کے سنوارنے بنانے کا کتنا خیال رکھا، اب مجھے نظر نہیں آتے ــــ مجھے سخت پیاس لگ رہی ہے۔ حلق میں کانٹے پڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

ت ت ت ت ت ت

میں نے ٹھنڈی صراحی میں سے پانی پیا ــــ مگر اب مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ پانی پیکر صراحی تک پہونچنے میں مجھے کئی سہارے لینے پڑے۔ میرے ہونٹ کچھ کچھ نیلاہٹ مائل ہوتے جاتے ہیں جیسے چوتھی کی دلہن کے مسّی مالیدہ ہونٹ ــــ میرا سر تیزی سے گردش کر رہا ہے۔ دل کی دھڑکن کا کچھ ٹھکانا نہیں ــ یہ ننھا سا دل جو بیس برس سے برابر دھڑک رہا ہے۔ اب اسے آرام ملے گا ــــ میرے ہونٹ اب میرے قابو سے باہر ہیں۔ میں انہیں نہ بند کر سکتی ہوں نہ کھول سکتی ہوں ــــ کانوں میں عجیب قسم کی گنگناہٹ ہے ــــ ہاتھ بھی لرز رہے ہیں لیکن میں اپنے آخری سانس تک لکھے جاؤنگی۔

ت ت ت ت ت ت

میرے منہ سے آواز بھی نہیں نکلتی۔ میں نے پوری طاقت سے اپنا نام پکارا لیکن خود میں ہی اس نام کو نہ سُن سکی ــــــ میرے پیچھے میری ماں سفید لباس پہنے کھڑی ہیں ــــ یہ دھوکہ نہیں، واہمہ نہیں۔ میں خود اپنی آنکھوں سے اُن کو دیکھ رہی ہوں۔ وہ دیکھو انہوں نے میرا نام لیا۔ "فرحت ــــ فرحت" میں جواب دینا چاہتی ہوں مگر بول نہیں سکتی۔ میں نے اُنکی طرف ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا ــــ انہوں نے آنسو بھر کر کہا "میری فرحت! تیرا یہ انجام؟؟؟"

ت ت ت ت ت ت

اے خدا ــــ! مجھے لکھنے دے۔ طاقت عطا کر کہ میں چند سطریں اور لکھ سکوں۔ ہائے میرا دل!! اس ایک سہارے کو ٹکڑے ہونے دے جو ابھی مجھے دنیا والوں میں شمار کر رہا ہے۔ میری ٹانگیں بالکل ساکت ہیں۔ میں انہیں جنبش بھی نہیں دے سکتی۔ روح آہستہ آہستہ نکل رہی ہے۔ میرے کانوں میں عجیب و غریب آوازیں آ رہی ہیں۔ میز پر رکھی ہوئی شیشیاں مجھے چمکتی ہوئی تلواریں معلوم ہو رہی ہیں ــ اب میں کوئی آواز نہیں سُن سکتی نہ بول سکتی ہوں۔ قلم بھی بمشکل پکڑا جا رہا ہے ــــ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ لیکن کوئی چیز

تھا ۔۔۔ سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے جو میرے سینے میں چھریاں چلا رہی ہے ـــــــ میری ماں اور بھی قریب آ گئی ہیں۔ ان کا ٹھنڈا برف ہاتھ میں اپنے ماتھے پر محسوس کر رہی ہوں ـــ میری پیاری ماں!!۔

. . . .

ہر طرف اندھیرا۔ اب مجھے اپنا چہرہ بالکل نظر نہیں آتا۔ ایک دھندلا سا عکس معلوم ہوتا ہے اور بس ـــ مجھے سانس لینا بھی دشوار ہے۔ سخت پیاس۔ میں اٹھ بھی نہیں سکتی ـــ آہ! کوئی ہوتا جو مجھے دو گھونٹ پانی پلا سکتا۔ خدا۔ مجھے قوت دے کہ میں اس قلم کو چند ے اور پکڑے رہوں۔ لیکن نہیں میرا وقت آ پہونچا ـــ بہت سی عجیب عجیب شکلیں میرے ارد گرد جمع ہوتی نظر آ رہی ہیں ـــ تاریکی۔ آگ۔ گرمی۔ پیاس ـــ لے میرے مُردہ ہاتھ صرف ایک لحظ اور میرا ساتھ دے۔ میں اپنے محبوب پیارے سلیم کو آخری سلام لکھنا چاہتی ہوں ـــ ٹھیرو۔ یہ لوگ مجھے گھسیٹ رہے ہیں۔ اپنی طرف کھینچ رہے ہیں ـــ یہ کون ہے جو مجھے دھکیل رہا ہے۔ سب چیزیں ناچ رہی ہیں ـــ آہ! پیاس۔ سلیم ـــ پانی ـــ آگ ـــ"

. . . .

میں نے خط ختم کیا ـــ اچانک دیوار پر مجھے کسی کا سایہ نظر آیا۔ اور میں دہشت کے مارے بیہوش ہو گیا۔

ـــــــــ انصار ناصری۔

افرودائتی کا ایک باب

استقبال

باقص کو شاہد بازاری کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہوئے پچیس سال گزر چکے تھے۔ یا یوں سمجھنا چاہیئے کہ اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی اور اِس اثنا میں اُس کے حُسن کی رعنائیاں کئی بار رنگ بدل چکی تھیں۔

اسکی ماں نے جو عرصۂ دراز تک اُس کے مکان کی مُنتظم اور تعمیرِ حیات کے ضمن میں بطور مشیر کار رہی تھی، اس کو حسنِ اخلاق اور کفایت شعاری کے وہ زرّیں اصول سمجھا دئے تھے جن پر عمل پیرا ہو کر اُس نے رفتہ رفتہ کافی سرمایہ جمع کر لیا تھا۔ لہٰذا اب وہ اپنے ذوقِ تعیش گذاری و نشاط طلبی کی تسکین دولت کے ذریعہ با آسانی کر سکتی تھی جبکہ باقتضائے عمر اُس کا حُسنِ ظاہری دورِ انحطاط کی تمام منزلیں طے کر چکا تھا۔

زرِ کثیر کے عوض نوجوان کنیزوں کو بازار سے خریدنا ایک ایسا اصراف تھا جسے دوسری بازاری عورتیں ضروری سمجھتیں اور اکثر تباہ ہو جاتی تھیں۔ لیکن اس کے برعکس باقص نے کامل دس برس تک صرف ایک حبشن کو اپنے لئے کافی سمجھا۔ اور آئندہ کے لئے بغیر کسی مزید خرچ کے پورا ایک کنبہ بھی پیدا کر لیا جو اس کے لئے باعثِ منفعت ثابت ہونے کے لائق تھا۔

دس سال کے عرصے میں اس کی کنیز کے بطن سے سات خوبصورت مخلوط النسل لڑکیاں پیدا ہوئیں اور تین لڑکے بھی جن کو فوراً رہا کر دیا گیا۔ کیونکہ یہی غلام جوان ہو کر کاروبارِ محبت میں رقیب روسیاہ ثابت ہونے لگتے ہیں۔ اس نے ساتوں لڑکیوں کے نام سات سیاروں سے موسوم کئے تھے۔ اور اُن کے پیشے جداگانہ طور پر جہاں تک ممکن ہو سکا انکے ناموں کے معنوی اعتبار سے منتخب کئے تھے۔ ہیلیوس[1] کے ذمے دن کی خدمات تھیں۔ اور سیلیمس[2] کے ذمے رات کی۔ آریس[3] صدر دروازے کی محافظ، افرودیسیہ[4] بسترِ عشرت کی نگہبان۔ ہرمیون[5] خرید و فروخت کی محاسب، کرونومیگرا[6] داروغہ مطبخ۔ اور سب سے آخری دائیومیدی[7] ناظرِ خصوصی تھی جو رقوم کے جمع خرچ اور اہم ذمہ داریوں کی انجام دہی پر مامور تھی۔

افرودیسیہ عزیز از جان تھی۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ حسین اور لائقِ محبت تھی۔ اکثر وہ اپنی مالکہ کے ساتھ تماش بینوں کو رجھانے میں شریک کار رہتی تھی، اسی لئے وہ ادنیٰ قسم کے سخت کاموں سے مستثنیٰ تھی تاکہ اُس کے نازو نازک و حسین اور ہاتھ ملائم و نرم رہ سکیں۔ اسی استثنا کے ماتحت وہ اپنے بالوں کو بھی غیر مستور رکھ سکتی تھی۔ اسی لئے اکثر لوگ اُسے ایک آزاد عورت تصور کرتے تھے۔ اور اس مخصوص شام کو وہ پینتیس مینا کی کثیر رقم کے عوض بالکل آزاد ہونیوالی تھی۔

باقص کی ساتوں کنیزیں اس درجہ نوخیز اور لائقِ تحسین حد تک شائستہ تھیں کہ وہ ان پر بہت زیادہ فخر و ناز کرتی تھی۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ اُن کو ہمراہ لئے بغیر باہر گئی ہو۔ حالانکہ مکان کو بالکل کھلا چھوڑ دینا خطرناک تھا۔ اُس کی اِسی ناعاقبت اندیشی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر دیمیطریوس کو اندر داخل ہونے کا بآسانی موقع مل گیا تھا۔ تاہم وہ اس دعوت کے انعقاد تک جس میں قرِاتصص بھی مدعو تھی گردشِ تقدیر کی حقیقت سے لاعلم محض تھی۔

اُس شام قرِاتصص سب سے پہلے وارد ہوئی۔

وہ سبز رنگ کی پوشاک میں ملبوس تھی جس کے دامنوں پر

---

[1] سورج دیوتا۔ مصر کے عہدِ قدیم میں نیل کے دہانے پر اس نام کا شہر اور ایک عظیم الشان ہیکل تھا۔ [2] چاند کی دیوی۔ اصل لفظ سیلینی ہے۔ [3] غالباً مریخ سے مطلب ہے جو جنگ کا دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن لکھنے میں اصل لفظ آریس ہے۔ [4] شہوت پرستی کی دیوی۔ افرودائتی سے متعلق ہے۔ [5] یونانی صنمیات میں تجارت کے دیوتا کو ہرمیس کہتے ہیں۔ اسی سے ہرمیون بنا لیا۔ [6] زحل۔ یونانی صنمیات میں اصل لفظ کرونوس ہے، اسی سے بنایا گیا ہے۔ [7] ان ستاروں میں سے جو زحل کے گرد گھومتے ہیں ایک کا نام دائیون ہے۔ اسی سے دائیومیدی بنا لیا گیا ہے۔ دراصل یہ ساتوں لفظ مصنف نے زبردستی مشتق کئے ہیں۔

[illegible] پچھ نکھر شگفتہ ہو رہے تھے۔

اس سے قبل کہ وہ [illegible] نے دروازہ کھول دیا۔ اور رسوم یونان کا لحاظ رکھتے ہوئے [illegible] نوایف مختنہ کمرے میں لے گئی۔ جہاں اس کے سُرخ جوتے اُتارے اور برہنہ پاؤں نرم ہاتھوں سے دھو ڈالے۔ پھر اس کے لباس پر جہاں جہاں ضروری تھا عطر لگایا۔ کیونکہ مہمانوں کو ہر قسم کی دقت سے بچایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ کھانا کھانے سے قبل تزئینِ جمال بھی میزبان کے فرائض میں شامل تھا۔ پھر اس نے ایک کنگھی اور [illegible] بالوں کو آراستہ کر [illegible] اِن کے علاوہ [illegible] غازہ وغیرہ۔

جب فرالصص ہر لحاظ سے تیار ہو گئی تو اُس نے کنیز سے پوچھا۔

"طفیلی[1] کون کون ہیں؟"

یہ رسم تھی کہ سوائے ایک کے جو حقیقتاً مہمان ہوتا تھا باقی سب طفیلی کہلاتے تھے۔ یہ واحد ہستی جس کے اعزاز میں دعوت دی جاتی تھی اپنے ہمراہ جس کو چاہتی لا سکتی تھی۔ اور باقی "طفیلیوں" کو اپنے بیٹھنے کے لئے گدیلے لانے پڑتے تھے۔ ان کے لئے لازمی تھا کہ شائستگی کا خیال بھی رکھیں۔

فرالصص کے سوال پر آرتی نے جواب دیا۔

"نقراطہ نے فلودیس اور اس کی شریکِ حیات فوسطینہ کو جسے وہ اٹلی سے ساتھ لایا تھا مدعو کیا ہے۔ اُس نے فراسیلاس در طائن کو نیز نیدوس والی تیرتی [illegible] سیسو کو دعوت دی ہے۔"

عین اس وقت [illegible]

"ہاں عزیز من!"

دونوں عورتیں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئیں اور اس زرّیں موقع کی خوشی میں جس نے ان دونوں کو دوبارہ یکجا کر دیا تھا، آپے سے باہر ہو گئیں۔

"مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے" سیسو نے کہا۔ "اس محتے ارتیاس کی وجہ سے مجھے دیر ہو گئی......"

"ہیں! ابھی تک اس سے؟"

"صورت حال بدستور ہے۔ جب کبھی میں دعوت میں شریک ہوتی ہوں وہ [illegible] وہ خیال کرتا ہے کہ ہر شخص مجھ پر ہاتھ ڈالے گا۔ چنانچہ بطور [illegible] اس کی دلجوئی ضروری ہوتی ہے۔ جس کیلئے وقت درکار ہوتا ہے۔ آہ جانِ من! کاش وہ میری حقیقت بہتر طریقے پر سمجھ سکے۔ میں اس کو فریب دینا نہیں چاہتی۔ اسکے مزاج میں رشک کا مادّہ بہت کافی ہے۔ جیسا کہ ہونا بھی چاہیئے۔"

"اور اس کا بچہ۔ کیا کسی کو معلوم ہو گیا ہے کہ تو واقف ہے؟"

"مجھے اس کی امید نہیں۔ تیسرا مہینہ ہے۔ بدبخت کہیں کا خیر ابھی اس کا وجود میرے لئے باعث تکلیف نہیں ہے۔ جب پیدا ہو گا تو میں جلد ہی [illegible] ہونگی۔"

"[illegible] تیرا مطلب سمجھتی ہوں" فرالصص نے کہا۔ "اس مصیبت میں پھنس کر اپنے خدوخال کو نہ بگاڑ لیجو۔ پیدائشِ اطفال صنفِ نازک کی جوانی پامال کر دیتی ہے۔ کل فلیمائشن سے جو ہماری دیرینہ سہیلی ہے ملاقات ہوئی۔ وہ گذشتہ تین سال سے ایک گندم فروش کے خاندان میں بمقام بہاستس زندگی بسر کر رہی ہے۔ کیا تو بتا سکتی ہے کہ اس نے سب سے پہلے کون سی بات کہی؟ "آہ! کاش تو معلوم کر سکتی کہ اس نے کس کس طرح مجھے خراب کیا ہے" اور اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ہر چند میں نے کہا کہ ابھی تیرے حسن و جمال کی رعنائیاں باقی ہیں۔ لیکن وہ یہی کہتی رہی "کاش تو دیکھ سکتی۔ کاش تجھے یاد ہوتا" وہ باتلس کی طرح رو رہی تھی۔ پھر میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے اپنا ہم خیال بنانا چاہتی تھی۔ اور اس لئے میں نے کہا کہ دکھا جو کچھ تو دکھانا چاہتی ہے۔ آہ جانِ من! اس کی جلد اچمڑے کی مانند [illegible] خوبصورت تھی۔ کوئی شخص [illegible] وہ حد سے زیادہ مسرور تھیں، عورت کے خدوخال اسکے جواہرات کے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔"

اتنی ہی گفتگو ہوئی تھی کہ دونوں عورتوں کی تزئین ختم ہو گئی۔ اس کے بعد وہ دونوں اکٹھی ایوانِ طعام میں داخل ہوئیں۔ جہاں باقی پہلے ہی منتظر تھی۔ ان کی کمروں میں پٹکے بندھے ہوئے تھے۔ اور گردن طلائی ہاروں سے اس قدر لدی ہوئی تھی کہ وہ ٹھوڑی تک پہونچ گئے تھے۔

"آؤ میری پیاری سہیلیوں! نقراطہ نے آج شام تم دونوں کو

[1] اسجگہ انگریزی لفظ شیڈز (shadows) ہے۔ جس کا لفظی ترجمہ کرنا درست نہیں۔ میرا خیال ہے کہ نفس مضمون کے لحاظ سے طفیلی مناسب ہے۔

ٹھوکر کے بہت عقلمندی کا اظہار کیا ہے۔"

"ہم اپنے آپ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ یہ اتفاق خود تمہارے عشرتکدے پر ہوا۔" قرالقصص نے یہ ظاہر کرتے ہوئے گویا وہ اس طنز کو نہیں سمجھی ہے جواب دیا۔ اور پھر فوراً ذرا جلانے کی نیت سے حاشیہ آرائی کی۔" دورانکلس کا کیا حال ہے؟"

یہ ایک امیر نوجوان عاشق تھا جس نے باقص سے ناتا توڑ کر صقلیہ کی ایک حسینہ سے شادی کر لی تھی۔

باقص نے بے حیائی سے جواب دیا۔" میں نے خود ہی اُنکو چلتا کر دیا ہے۔"

"تمہیں یہ زیبا نہیں۔"

"کیوں نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مجھے چھوڑ کر عنقریب شادی کرنے والا ہے لیکن مجھے قوی امید ہے کہ وہ شادی کی صبح ہی میرے پاس آن موجود ہوگا۔ وہ میری محبت میں دیوانہ ہے۔"

جب قرالقصص نے یہ سوال کیا تھا کہ "دورانکلس کا کیا حال ہے؟" تو اُس کے ذہن میں یہ دوسرا سوال بھی موجود تھا کہ "تیرا آئینہ کہاں ہے؟" لیکن باقص کی آنکھیں نظر ملا کر اُس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے قرالقصص ایک مبہم اور بے معنی وحشت کے سوا کوئی دوسرے جذبے کا مطالعہ نہ کر سکی۔ اسی وجہ سے اُس نے اپنی بے صبری کے باوجود اپنے سوال کو کسی آئندہ مناسب موقع کیلئے اٹھا رکھا۔

وہ دوبارہ آغازِ گفتگو کرنا چاہتی تھی کہ اچانک فلوڈمیس، فوسطینہ اور نقراط کے آجانے سے رک گئی۔ انہوں نے باقص کو اپنی طرف متوجہ کر کے اس کی طبیعت کو شگفتہ کر دیا۔ وہ دونوں شاعر (فلوڈمیس) کی زرکار پوشاک اور اُس کی اطالوی شریکِ حیات (فوسطینہ) کے حریری لباس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہو گئیں۔ یہ نوجوان خاتون اسکندریہ کے رسم و رواج سے قطعی ناواقف تھی۔ اس لئے یونانی طرز کا لباس مناسب سمجھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس طرح ملبوس ہو کر دعوت میں شریک ہونا غیر موزوں ہے۔ بیشک وہاں پیشہ ور رقاصائیں اُس جیسے نیم برہنہ لباس میں رونق افروز ہونے والی تھیں۔ تاہم باقص نے اشارتاً بھی یہ ظاہر نہ کیا کہ اس کی غلطی محسوس کر لی گئی ہے۔ بلکہ وہ مناسب الفاظ کے ذریعے شاعرانہ انداز میں فوسطینہ کے گھنے چمکدار سیاہی مائل نیلگوں بالوں کی جو روح افزا عطریات میں ڈوبے ہوئے تھے تعریف کرتی رہی۔ اس کے بالوں کا جوڑا ایک طلائی پن کے ذریعے پشت گردن پر بندھا ہوا تھا۔ تاکہ عطر کے داغ اُسکے باریک حریری لباس پر نہ لگ سکیں۔

وہ سب میز کے گرد اپنی اپنی جگہ بیٹھنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ایک نوجوان مہمان وارد ہوا۔ جس کا نام طائمن تھا۔ اس نوجوان کی بے قاعدگیاں گویا قدرتی عطیہ تھیں۔ تاہم اپنے زمانے کے علماء کی صحبت میں رہ کر اور اُن کے اقوال سے فیضیاب ہو کر اپنے کردار کو لائقِ تحسین بنا لیا تھا۔

"میں اپنے ہمراہ کسی اور کو بھی لایا ہوں۔" اُس نے ہنس کر کہا۔

"وہ کون ہے؟" باقص نے بازپرس کی۔

"وہ میندیس کی رہنے والی ایک دیمو ہے۔"

"دیمو! تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو میرے دوست۔ وہ تو ایک ادنیٰ قسم کی لڑکی ہے۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ میں زیادہ اصرار نہیں کروں گا۔" نوجوان طائمن نے کہا۔ "ابھی ابھی راستے کے موڑ پر میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے درخواست کی کہ مجھے کھانا کھلوا دو۔ میں اس کو اپنے ساتھ یہاں لے آیا۔ اگر تمہیں پسند نہیں تو......"

"یہ طائمن تو بہت ہی فضول قسم کا آدمی ہے۔" باقص نے زور دیکر کہا۔

اُس نے ایک کنیز کو آواز دی۔ "ہیلیوک! جا اپنی بہن سے کہہ کہ دروازے پر ایک عورت کھڑی ہوگی۔ اُسے خوب اچھی طرح مار کر نکال دے۔ جلدی جا۔"

وہ ایک متجسس نظر ڈالتے ہوئے مڑ گئی۔

فراسیلاس ابھی تک نہیں آیا۔

فضل حق قریشی دہلوی

سونے کی تلوار

کل پھر رہا تھا صحن چمن میں کشاں کشاں		اپنی ادھیڑ زوجہ کے ہمراہ اک جواں
شوہر کی بے وسیلہ جوانی پہ الاماں		بیوی کے مالدار بڑھاپے کی سختیاں

بے مال و زر شباب کا تھا شیب پر مدار

تھیں جھریاں جو زوجہ کے چہرے پہ بیش و کم		اُن جھریوں کی راہ پہ چاندی کے تھے قدم
شوہر کے عارضوں میں بافراط رنج و غم		سویا ہوا تھا سازِ جوانی کا زیر و بم

گاتی ہوئی خزاں تھی، بِسکتی ہوئی بہار

پانی کی ایک بوند سے مرعوب تھا شرر		حیرانِ شکوہ قطرۂ شبنم سے تھا گہر
چھالے کے طمطراق سے لرزاں تھا نیشتر		ذرّے پہ آفتاب جھکائے ہوئے تھا سر

کمزوریوں کو زور پہ حاصل تھا اقتدار

ٹھنڈی ہوا سے وجد میں تھی رُوحِ بوستاں		سرشار ہو چلی تھی زمیں، پست آسماں
زوجہ کے ساتھ ساتھ تھا شوہر رواں دواں		اک موڑ پر مُڑے ہی تھے دونوں کہ ناگہاں

گزری اُدھر سے ہو کے اِک آئینہ رُو نگار

اس طرح جیسے ناؤ کوئی ڈولتی ہوئی		ابرو کے بل سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی
تلوار سی ہر ایک بچک تولتی ہوئی		گاتی ہوئی ادائیں، نظر بولتی ہوئی

زلفوں کے پیچ و خم میں تھے موجِ آبشار

شوہر کی اُٹھ کے جم گئی اُس شوخ پر نگاہ		پلکوں نے مسکیاں سی بھریں، ورنظر آہ
چمکی نگاہِ زوجہ میں شمشیرِ اشتباہ		پیدا ہوئی وہ آگ کہ اللہ کی پناہ

آفت کی کشمکش تھی، قیامت کا خلفشار

رحمت سے آس جیسے گنہگار توڑ دے		کوئی بہک کے ساغرِ سرشار توڑ دے
گھبرا کے جیسے دم کوئی بیمار توڑ دے		جس طرح کوئی جنگ میں تلوار توڑ دے

شوہر نے یوں جھکائی نظر ہو کے شرمسار

اتنا ذرا غریب کہ تپنے لگا جگر		بیگانہ وار آنکھ اُٹھائی اِدھر اُدھر
گردن ہلائی بیوی نے غصے سے دیکھ کر		یعنی متاعِ زوجہ نے شوہر کے حلق پر

سونے کی بڑھ کے پھیر دی شمشیرِ آبدار

(نتیجۂ ملیح آبادی

فیصلہ

بمبئی کی گجراتی اور مرہٹی چیخ پکار کے ہنگامہ میں شمالی ہند کے دو چار اُردو داں نوجوانوں کا کسی موقع پر اکٹھا ہونا ایک دلچسپ "حادثہ" ہوتا ہے۔ باقاعدہ تعارف کی رسم بھی غیر ضروری سمجھی جاتی ہے اور بے تکلف گفتگو فوراً چھڑ جاتی ہے۔ کل شام کا واقعہ ہے کہ ہم تین دوست درلی کے مقام پر سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے گپ کر رہے تھے۔ مسئلہ زیر بحث "محبت" تھا۔ میں حسب معمول عشق کو ایک دماغی بیماری کو تشبیہہ دے رہا تھا۔ مجھے عاشقوں سے ایسی ہی ہمدردی ہے جیسی پاگل خانہ کے رہنے والوں سے اور گو ممکن ہے کہ میں بھی کبھی اس مرض کا شکار ہوں (جیسے کہ یہ ممکن ہے کہ مجھے نمونیہ ہو جائے یا میں پاگل ہو جاؤں) میرا یہ عقیدہ کہ عشق دماغی خرابی کی علامت ہے کبھی کمزور نہ ہوگا۔ میرے اس نظریہ کی تردید میرے شاعر دوست سعید کمالی کر رہے تھے۔ جو عشق کو زندگی کے خواب کی تعبیر اور کائنات کے نظام کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ اور موتی لال (جس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے) مجھے پریم کی ریت اور پریم کے راستوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور آتا ہے جب وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ مگر وہ کمالی کے شاعرانہ تخیل کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ موتی لال شادی کو محبت کی معراج سمجھتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق قانوناً میاں بیوی کا رشتہ قائم ہوئے بغیر انسانی محبت مکمل نہیں ہو سکتی۔ کمالی زور شور سے موتی لال کی مخالفت کر رہے تھے۔ غالب اور اقبال، عمر خیام اور نظامی، کیٹس اور شیلے کے اشعار اپنے نظریہ کے ثبوت میں پیش کر رہے تھے۔ "محبت گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے۔ شادی بیاہ سماج کے بنائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں اور عشق ان کی قید سے آزاد ہے۔ عشق کو سماجی رسم و رواج کا پابند بنانا روح کو بیڑیاں پہنانا ہے۔" کمالی پورے شاعرانہ جلال کے ساتھ اپنے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے۔ سمندر کی لہریں زور شور سے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ "دیکھو یہ لہریں بھی میری تائید کر رہی ہیں۔" کمالی نے کہا۔ اسی وقت ایک غیر معمولی جسامت کی لہر آئی اور اتنے زور سے ساحل کی دیوار سے ٹکرائی کہ پانی کی ایک بوچھاڑ نے ہمیں بھگو دیا اور اپنا مقام چھوڑ کر ہم دوسری جگہ بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔

ساحل تقریباً سنسان تھا دو چار موٹریں دور کھڑی تھیں جن میں شہر کے سیٹھ ہوا کھانے آئے تھے۔ ان کے علاوہ صرف ایک آدمی اور نظر آیا۔ وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ۔ ننگے سر۔ بال سمندر کی تند ہوا سے پریشان۔ "یہ تو کوئی اپنی طرف کا آدمی معلوم ہوتا ہے!" موتی لال نے کہا۔ اور جب نووارد قریب سے گذرا تو کمالی نے اس کو "معاف کیجئے گا" کہہ کر ٹھیرا لیا۔ کمالی کو بغیر جان پہچان ملاقات بڑھانے کا ملکہ ہے۔ "آپ تو ہماری طرف کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی خاص جلدی نہ ہو تو تشریف رکھئے۔ یہ میرے دوست موتی لال ہیں اور یہ ......"

ہمارا تعارف پورا کرتے ہی کمالی نے پوچھا "اور آپ کی تعریف؟" نووارد نے جو کوئی تیس برس کا نوجوان تھا اپنا نام حامد بتایا اور کہا کہ وہ بمبئی کی سیر کی خاطر آیا تھا اس کی شکل صورت معمولی تھی مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب افسردگی تھی گویا وہ دنیا کی ٹریجڈی کی تہ کو پا گیا ہو۔ دوسرے لحاظ سے وہ معمولی حیثیت کا پڑھا لکھا نوجوان معلوم ہوتا تھا۔

کمالی نے ہماری بحث کا خلاصہ حامد کو سنایا جو اب بے تکلفی سے ہمارے ہمراہ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ "آپ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ بھی اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار فرمائیے۔"

نووارد ایک خشک اور کھسیانی سی ہنسی ہنسا اور ساتھ ہی ایک سکنڈ کے لئے کچھ گھبرا سا گیا گویا کسی نے اس کا کوئی اہم راز بھرے مجمع میں بیان کر دیا ہو مگر بہت جلد ہی اس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور ایک نیا سگریٹ جلا کر کش لیتے ہوئے جواب دیا "مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ تینوں صاحبان ٹھیک کہتے ہیں۔"

ہم تینوں نے تعجب کا اظہار کیا۔ تینوں مختلف عقیدے کس طرح صحیح ہو سکتے تھے؟

"اور شاید آپ سب غلطی پر بھی ہیں" حامد نے سمندر کی طرف نگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ تو کوئی ظریف فلاسفر معلوم ہوتے ہیں" میں نے کسی قدر طنزیہ لہجہ میں کہا۔ میرا خیال تھا کہ حامد ہم لوگوں سے مذاق کر رہا ہے۔

"معاف کیجئے گا" اس نے جلدی سے کہا۔ "یہ کچھ معمہ سا ہو گیا۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ میں آپ سے اتفاق بھی کرتا ہوں اور اختلاف بھی مثلاً آپ کا کہنا صحیح ہے کہ محبت ایک دماغی بیماری ہے۔ مگر ایسی بیماری جس سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ شاعروں نے محبت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ دقیانوسی شاعری نے محبت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ نفسیاتی، جسمانی اور سماجی حقیقتوں کو نظرانداز کرتا ہے۔ مگر آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ کسی مرض کا بہترین علاج اس کی ہجو کرنا ہے۔ محبت کے موجودہ نظریہ کی ذمہ داری ہمارے سماجی حالات پر ہے۔ جس سماج میں ہزار میں سے ایک شادی بھی فریقین کی مرضی سے نہ ہوتی ہو۔ اور جہاں شہری عورتوں کی ایک بڑی تعداد پردے میں رہتی ہو۔ وہاں شاعر اگر خیالی معشوقوں سے محبت نہ کریں تو اور کس سے کریں اور آپ" اس نے کمالی سے مخاطب ہو کر کہا "آپ سچ کہتے ہیں کہ محبت کو شادی بیاہ کی قید سے آزاد ہونا چاہئے۔ اور میرا نظریہ تو یہ ہے کہ انسانی ارتقا کی مکمل ترین منزل میں ہم سب قسم کے قوانین سے آزاد ہوں گے۔ مگر موجودہ سماجی حالات میں موتی لال صاحب کا خیال صحیح ہے کہ شادی ہی محبت کو اصلیت کے معنی پہنا سکتی ہے۔ ایسے ملک میں جہاں ان کے والدین اپنی اولاد کو ان کی مرضی کے خلاف شادیوں میں جکڑ دیتے ہیں آزاد محبت کے خواب دیکھنا بیکاری کا مشغلہ نہیں تو کیا ہے؟ عشق و محبت پر بیکار خیالی محبت کرنے کے بجائے اگر آپ ہندوستانی نوجوانوں کو اپنی پسند پر شادی کرنے کا حق دلانے کے لئے جہاد کریں تو ہزاروں زندگیوں کو تباہی سے بچا سکتے ہیں"

اب ہمیں حامد کی گفتگو میں دلچسپی ہو چلی تھی۔ میں نے کہا "آپ بات تو بہت معقول کہہ رہے ہیں۔ اور شاید آپ اس نتیجہ پر اپنے ذاتی تجربہ سے پہنچے ہیں۔ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو کیا آپ ہمیں بھی اپنے راز میں شریک کر سکتے ہیں"

حامد کے چہرے پر پھر وہی گھبراہٹ کے آثار پائے گئے گویا باتوں باتوں میں کسی نے اس کے پوشیدہ دلی جذبات پر سے پردہ ہٹا دیا ہو "جی نہیں" اس نے اپنی گھبراہٹ کو دور کرتے ہوئے جواب دیا "مجھے تو عشق و محبت کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہے۔ البتہ میرے ایک عزیز دوست پر چند واقعات ایسے ضرور گذرے ہیں جو شاید اس مسئلے پر روشنی ڈال سکیں۔ کیونکہ تقریباً یہی واقعات ہر متوسط درجے کے ہندوستانی مسلمان گھرانے میں پیش آتے رہتے ہیں۔ اور شاید کسی حد تک یہی صورتِ حال ہندو گھرانوں میں بھی عام ہے"

ہمارے اصرار پر حامد نے اپنے دوست کا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ اس کو جھوٹ بولنے کی عادت نہ معلوم ہوتی تھی کیونکہ ہم فوراً ہی سمجھ گئے کہ اپنا عزیز دوست وہ خود ہے۔

"میرا دوست (حامد نے بیان کیا) جو اتفاق سے میرا ہم نام بھی تھا دہلی کے ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے مرحوم والد پنجاب میں تحصیلدار رہے تھے اور رشوت لینے میں کبھی بخل نہ کیا تھا۔ کافی جائداد چھوڑی تھی جس کی آمدنی سے حامد اور اس کی ماں فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے باپ اپنے زمانہ کے لحاظ سے خاصے تعلیم یافتہ تھے۔ اور چونکہ سرکاری نمک کھایا تھا اس لئے اپنے لڑکے کو بھی انھوں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی تاکہ کوئی اچھی سرکاری نوکری مل سکے۔ غرض حامد مشن کالج میں بی۔اے میں پڑھتا تھا۔ وہ ایک سوچنے والا دماغ اور محسوس کرنے والا دل لے کر آیا تھا۔ تاریخ، فلسفہ، معاشیات اور لٹریچر کی تعلیم نے اس کے خیالات میں فراست اور پختگی پیدا کر دی تھی۔ وہ فطرتاً خاموشی پسند اور سنجیدہ نوجوان تھا۔ کالج کے دوسرے لڑکوں کی جنسی دلچسپیوں سے دور رہتا تھا۔ اس کی پرورش ایسے خاندان میں ہوئی تھی جہاں پردے کا شد و مد سے کیا جاتا تھا۔ اس کی ماں خالہ یا رشتہ کی بہنیں کبھی باہر جاتی تھیں تو برقعہ پہننے پر بھی تانگے پر چادر بندھوائی جاتی تھی۔ اس کے مطالعہ اور تجربہ نے پردے کے نقصانات کو اس پر واضح کر دیا تھا۔ لیکن بچپن سے ماں باپ کی اطاعت کا ایسا سبق پڑھایا گیا تھا کہ کبھی یہ ہمت نہ پڑتی تھی کہ اپنے خیالات کا اظہار خود اپنے گھر میں کر سکے غرض وہ ایسی دنیا میں رہتا تھا جہاں غیر عورتوں کا جن میں وہ رومانی دلچسپی لے سکے نام بھی نہ تھا۔ اس کی کلاس میں دو چار لڑکیاں پڑھتی تھیں لیکن ان سے بات کرنے کی اس کو کبھی ہمت نہ ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ سوائے سینما کے روپہلی پردے اور بازار یا سڑک پر کسی بے پردہ عورت کی ایک جھلک دیکھ لینے کے وہ دوسری صنف سے بالکل ناآشنا تھا۔

پہلی لڑکی جس سے اس کی ملاقات ہوئی بلقیس تھی۔ وہ اس کے کالج کے ایک آزاد خیال پروفیسر عبدالرحیم کی اکلوتی لڑکی تھی اور ایف۔اے میں تعلیم حاصل کرتی تھی۔ پروفیسر عبدالرحیم انگریزی ادب پڑھاتے تھے اور چونکہ حامد اپنے کلاس میں سب سے زیادہ ہوشیار تھا اس میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔

اس دلچسپی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ پروفیسر عبدالرحیم اس قسم کے "آزاد خیال" لوگوں میں سے تھے جو اپنی بیویوں کو اس لئے پردہ سے باہر نکالتے ہیں تاکہ انگریز یا اور فیشن ایبل سوسائٹی میں گھل مل سکیں اور بیٹیوں کو اس لئے پردہ نہیں کراتے تاکہ کسی آئی۔سی۔ایس سے شادی ہو جائے۔ پردہ توڑنے کے سماجی اور انسانی فوائد ان کے پیش نظر نہ تھے۔ ان کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ ان کی بیوی ان کے ہمراہ کلب جا سکے اور ان کی بیٹی کی شادی کسی آئی۔سی۔ایس یا اسی قسم کے کسی دوسرے اعلیٰ سرکاری عہدہ دار سے ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حامد میں دلچسپی لیتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ وہ بی۔اے کرنے کے بعد آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں ضرور شامل ہوگا۔ اور قوی امید تھی کہ کامیاب بھی ضرور ہو جائیگا۔ یہی سوچ کر انھوں نے ایک دن حامد کو اپنے ہاں چائے پر بلایا۔ پروفیسر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا تو وہ ابھی تیار نہ ہوئے تھے۔ بلقیس نے مہمان کا استقبال کیا۔ یہ حامد کے لئے پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی لڑکی سے دوبدو بات کی ہو۔ اس لئے وہ قدرتی طور پر گھبرا رہا تھا۔ مگر بلقیس نے جو اٹھارہ برس کی عمر میں نہایت تیز اور ہوشیار تھی اس کو بہت جلد باتوں میں لگا لیا۔ گفتگو کے دوران میں نظر بچا کر حامد بلقیس کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ شلوار، قمیص اور گلابی دوپٹہ میں کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے سیاہ گھونگھریالے بال اور اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں بلقیس کی خصوصیات تھیں۔ ان آنکھوں میں حامد کے لئے خاص دلکشی تھی۔ اس نے اتنی خوب صورت آنکھیں فقط ایک مرتبہ شکار میں ایک ہرن کی دیکھی تھیں۔ جب تک بلقیس اس سے باتیں کرتی رہی اور اس کے بعد جب پروفیسر اور ان کی بیوی بھی شامل ہو گئے حامد کی نگاہیں بار بار بلقیس کی طرف اٹھتی رہیں۔ جب حامد اور پروفیسر عبدالرحیم نے ایک ادبی مسئلہ پر بحث چھیڑ دی تو بلقیس کی والدہ جن کی علمی قابلیت واجبی ہی واجبی تھی اٹھ کر چلی گئیں لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔ گفتگو کے دوران میں حامد نے اس کی طرف نگاہ کی تو اس انداز میں وہ اور بھی بھلی معلوم ہوئی۔ اپنے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں پر سہارا دیئے خاموش بیٹھی تھی۔ حامد کو فوراً خیال ہوا کہ اس طرح وہ ایک موتیا کی کلی سے کس قدر مشابہ تھی۔ چار پینے کے بعد جب حامد رخصت ہوا تو بلقیس نے امید ظاہر کی کہ وہ آئندہ بھی کبھی کبھی ملتا رہے گا۔

اس رات کو حسب معمول جب حامد کتابیں لیکر پڑھنے بیٹھا تو اس کے دماغ میں شام کی یاد تازہ تھی۔ بار بار کتاب کے صفحے پر الفاظ سمٹ کر دو ہرن جیسی خوبصورت آنکھیں بن جاتے اور پھر دہی الفاظ پھیل کر ایک مسکراتا ہوا معصوم چہرہ بن جاتے جو موتیا کی کلی سے مشابہ تھا۔ اس رات حامد کی پڑھائی نہ ہو سکی۔

بلقیس سے اس ملاقات نے حامد کی زندگی میں نمایاں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دنیا کی تنہائی اور اندھیرے میں کسی رفیق نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔ جتنے لڑکے اس کے دوست تھے انھی کی صحبت میں اس کو اب وحشت ہونے لگی۔ وہ بھدّے اور بھونڈے مذاق کرتے۔ اس کی قدرتی جھینپ اور سادہ لوحی پر ہنستے اور معاشرتی مسائل پر اس کے سنجیدہ خیالات کو حماقت خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک طالب علم کی زندگی کا مقصد کرکٹ کھیلنا، اچھے کپڑے پہننا اور دنیا کی ہر لڑکی کے متعلق ناشائستہ انداز میں رائے زنی کرنا تھا۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ حامد کی آمد و رفت پروفیسر عبدالرحیم کے ہاں ہے تو انھوں نے اس کے اور بلقیس کے متعلق بھی پست مذاق کرنا شروع کیا۔ جو حامد کو سخت ناگوار گذرا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس مذاق کی تہ میں حسد ہے کہ بلقیس ان لوگوں کی بجائے حامد جیسے سیدھے اور کم رو شخص میں کیوں دلچسپی لیتی ہے۔ لیکن پھر بھی لڑکوں کی چھیڑ چھاڑ نے اس کو دل میں اپنے اور بلقیس کے تعلقات کی جانچ کرنے پر مجبور کر دیا۔ بلقیس سے ملتے اس کو تقریباً ایک سال ہو گیا تھا۔ اس عرصہ میں ان کو ایک دوسرے میں کافی دلچسپی ہو چلی تھی۔ گو بلقیس کے چاہنے والوں کی کمی نہ تھی لیکن وہ ان میں سے کسی کو منہ نہ لگاتی تھی۔ برخلاف اس کے وہ حامد کا خاص خیال رکھتی۔ حامد کو سیاسیات اور سماجی مسائل سے خاص شغف تھا۔ اس کی خاطر بلقیس نے بھی جو اب تک کالج کی دوسری لڑکیوں کی طرح ملکی سیاست سے نابلد تھی ان مسائل میں دلچسپی لینی شروع کی۔ حامد کے مشورے سے سنجیدہ لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ اور دل ہی دل میں حامد کی شکر گذار ہوئی کہ اس نے ایسی زبردست اور دلچسپ دنیا کا دروازہ اس کے لئے کھول دیا۔

حامد کے دل میں بھی بلقیس کی شخصیت آہستہ آہستہ گھر کرتی گئی۔ گو اگر اس سے کوئی کہتا کہ اس کو بلقیس سے محبت ہے تو وہ فوراً اس کی تردید کر دیتا لیکن یہ واقعہ تھا کہ اس سے ملنے کی خاطر وہ دنیا کے بڑے سے بڑے کام کو ملتوی کر دیتا۔ وہ بلقیس سے اپنے مستقبل کے متعلق گفتگو کرتا، اپنی امیدیں، ارادے اور امنگیں سناتا اور جس ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ بلقیس اس کی باتیں سنتی وہ اس کو کہیں اور نہ نصیب ہو سکتی تھیں مگر کیا اس کو بلقیس سے محبت تھی؟ یہ وہ سوال تھا کہ اکثر اس کو پریشان کرتا تھا۔ یہ واقعہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ ایک دوسرے کو

معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ حامد ٹینس ٹورنامنٹ جیتا تو بلقیس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اور بلقیس امتحان میں اوّل آئی تو حامد نے محسوس کیا کہ گویا یہ خود اس کی کامیابی تھی۔ کیا اسی کا نام محبت ہے؟ اس کا حامد فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ عشق کے عام لیلیٰ مجنوں والے مفہوم کا قائل نہ تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اگر بلقیس کو اس سے ملنے کی ممانعت کر دی گئی تو قیس نجد کی طرح مارا مارا نہ پھرے گا۔ مگر پھر بھی اگر بلقیس سے ملے اس کو ایک ہفتہ ہو جاتا تو وہ کچھ کھویا کھویا رہتا۔ کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ کیا وہ کبھی بلقیس سے شادی کر کے اس کو تمام عمر کے لئے اپنی رفیق بنا سکے گا۔ مگر اپنے خاندانی حالات اس کی نظر کے سامنے تھے اور یہ نہایت مشکل معلوم ہوتا تھا کہ اس کے گھر والے ایک بے پردہ لڑکی کو بہو بنانے پر راضی ہو جائیں۔ اسی اُلجھن میں وہ دل کو یوں بھی سمجھاتا کہ شاید بلقیس کے دل میں اس کے لئے دوستی کے علاوہ کوئی دوسرا جذبہ ہی نہیں ہے۔ اور آخر اس میں ایسی کونسی خوبی تھی جس کے لئے بلقیس اس سے محبت کرے؟ ایسی حالت میں اس سے شادی کرنے کا خیال بھی دل میں لانا بیکار تھا۔

"اسی زمانہ میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے حامد کے دلی سوالات کا جواب دیدیا۔ مگر ساتھ ہی اس کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔

ہوا یہ کہ حامد ملیریا میں مبتلا ہو کر بیمار پڑا۔ لاپرواہی کی بدولت ملیریا ٹائیفائڈ میں تبدیل ہو گیا۔ دو ہفتہ تک نہ کالج ہی جا سکا اور نہ بلقیس ہی سے مل سکا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ پرچہ لکھ کر بھیجدے"۔ ماں کے خوف سے خاموش رہا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کی ماں بے پردہ لڑکیوں کے خلاف ہے۔ اور اگر اس کو معلوم ہو گیا کہ اس کے لڑکے کی دوستی بلقیس کے ساتھ ہے تو وہ از حد خفا ہو گی اور ممکن ہے کہ آئندہ ملاقات کو حکماً بند کر دے۔ اس معاملہ میں حامد اپنی ماں سے بحث نہ کر سکتا تھا۔ صدیوں سے اس کی خاندان کی عورتوں کو یہی تعلیم دی گئی تھی کہ پردہ مذہب اور ایمان کا جزو ہے اور شرافت کی نشانی ہے۔ دو ایک بار اس نے اپنی دبی زبان سے پردہ کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر ہر دفعہ اس کی ماں نے اس قدر سختی کے ساتھ ڈانٹا کہ اب ہمت نہ پڑتی تھی کہ بے پردگی کی حمایت میں ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے۔ جب اس کو بخار آتے آٹھ دن ہو گئے اور بلقیس کو کالج میں معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے تو اس سے نہ رہا گیا اور اپنے باپ سے اجازت لے کر حامد کو دیکھنے اس کے گھر پہنچی۔ بلقیس کو آتے دیکھ کر حامد حیران رہ گیا۔ اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ لوگوں کے کہنے سننے کی پرواہ کئے بغیر اس سے ملنے کی خاطر اس طرح تن تنہا چلی آئیگی۔ اس دن اس کا بخار ہلکا تھا۔ اپنی صحت کا یقین دلا کر اس نے بلقیس کو جلدی ہی رخصت کر دیا لیکن اس وقت پہلی بار اس کو معلوم ہوا کہ اس کو بلقیس سے اور بلقیس کو اس سے محبت ہے۔

بلقیس گھر سے نکلی ہی تھی کہ گھر کی ماما گلابو نے حامد کی اماں سے ہنس کر کہا:۔

"لو بہو خود ہی گھر دیکھ گئی۔ مبارک ہو"

اس کا یہ کہنا ہی تھا کہ حامد کی اماں (جواب تک دوسرے کمرے میں بیٹھی تھی گویا ایک بے پردہ لڑکی کی شکل دیکھنا بھی ان کو ناگوار تھا۔) اس پر برس پڑیں "خبردار جو ایسی بات منہ سے نکالی ہو۔ نوج یہ فرنگن میری بہو بنے۔ نہ لحاظ نہ شرم۔ میرے گھر میں ایسی لڑکیوں کا گذر نہ ہوگا"

حامد کو آج اندازہ ہوا کہ باوجود اپنی اور تمام خوبیوں کے اس کی ماں پردے کے معاملہ میں کس قدر متعصب ہے۔ یہ اس کو ہمیشہ سے معلوم تھا کہ وہ پردے کی سخت حامی ہے اور بے پردگی کو پسند نہیں کرتی۔ اسی لئے اس نے بلقیس سے اپنی دوستی کو گھر والوں سے چھپایا تھا۔ اس کو یہ نہ معلوم تھا کہ اس کا تعصب اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ وہ ایک شریف اور معصوم لڑکی کی مخالف فقط اس بنا پر ہو جائیگی کہ وہ متوسط درجے کے رواج کے مطابق برقعہ نہیں پہنتی۔ یہ تو انتہائی بے انصافی اور صریح ظلم تھا۔ حامد کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت ماں سے بحث کرے۔ اس کو قائل کرے کہ پردہ نہ مذہب کا جزو ہے نہ عصمت کا محافظ بلکہ ایک بیکار رواج ہے جس کی بدولت لاکھوں عورتیں دق، اختلاج قلب اور دوسرے مہلک امراض میں مبتلا ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ بلقیس کی خوبیوں، اس کو اخلاق اس کی انسانی ہمدردی، اس کے ایثار، اس کی اخلاقی جرأت کا ذکر کرے اور اپنی ماں کو اس لڑکی کی عزت کرنے پر مجبور کرے۔ لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سب بیکار ثابت ہوگا۔ اس کی ماں اپنی عمر کے لحاظ سے اچھی خاصی تعلیم یافتہ تھی۔ عقل مند اور دانا خاتون تھی۔ تمام محلّہ والوں سے اس کا برتاؤ ایسا تھا کہ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ غریبوں کی پرورش اور ضرورت مندوں کی امداد کے لئے وہ کبھی دریغ نہ کرتی تھی۔ ہر ایک سے خواہ وہ گھر کی مہترانی ہی کیوں نہ ہو وہ خندہ پیشانی اور انکسار سے پیش آتی۔ کسی کا دُکھ اس سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ اور اگر وہ کسی کو سکھ پہنچا سکتی تو کبھی اپنی تکلیف کا خیال نہ کرتی۔ روپیہ پیسہ، محنت، ہمدردی جس طرح بھی ممکن ہوتا دوسرے کو راحت پہنچانے کی کوشش کرتی۔ اس کی زبان سے کسی کے لئے آج تک کوئی برا لفظ نکلا تھا۔ لیکن تنگ نظر مذہبی تعلیم اور رواج کی غلامی نے اس کو اور اس قسم کی دوسری عورتوں کو پردے کے معاملہ میں اوّل درجہ کا متعصب بنا دیا تھا۔

ان کی حالت اس چینی قیدی کی مانند تھی جس کو چالیس سال تک اندھیری کوٹھری میں قید رکھنے کے بعد جب رہا کیا گیا تو سورج کی روشنی سے اس کی آنکھیں اس قدر چکاچوند ہوگئیں کہ اس نے گڑگڑا کر درخواست کی کہ اس کو پھر اسی اندھیری کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔ اس کو اپنی ماں کے خلاف کوئی غصہ نہ تھا۔ ایسے قیدی پر کیا غصہ کیا جائے جو اپنی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں سے محبت کرے۔ اور ان کو اپنے لئے باعثِ آسائش سمجھے۔ لیکن حامد کے دل میں بے پناہ غصہ تھا اس رواج اور ان رسوم کے خلاف جو اس جہالت اور اس ظلم کے لئے ذمہ دار تھیں۔ گھنٹوں وہ بیٹھا سوچتا رہا کہ کس طرح اس کا ملک اس پرانی لعنت سے پاک کیا جا سکتا ہے لیکن پھر جب اس نے اپنے اور بلقیس کے آئندہ تعلقات کے مسئلہ پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہونچنے کے لئے مجبور ہوا کہ وہ اپنی ماں کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ضعیف تھی، بیمار تھی اور اس کو اپنے لڑکے سے ازحد محبت تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کوئی سکھ نہ پایا تھا۔ رواج کے مطابق شوہر کی اکثر علیحدہ رہی۔ اسی لئے کبھی زوجیت کے خوش گوار تعلقات پیدا نہ ہو سکے۔ کئی اولادیں نادانی اور جہالت کے باعث بچپن ہی میں مر گئیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد اس کا کوئی تھا تو حامد تھا۔ وہ حامد بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ وہ اپنی ماں کو نہ چھوڑ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اپنی ماں کے موجودہ رویہ کے ہوتے ہوئے بلقیس سے تعلقات قائم رکھنے اور اس سے شادی کرنا اس لڑکی کے ساتھ بھی بے انصافی تھی۔ حامد کو یہ گوارا نہ تھا کہ اپنی عزیز ترین دوست کو ایسے گھر کی بہو بنائے جہاں اس کی عزت نہ کی جاتی ہو۔

لیکن کیا انصاف کی رُو سے وہ بلقیس کی محبت کو اپنی ماں کی محبت پر قربان کر کے اس طرح ٹھکرا سکتا تھا۔ جس لڑکی نے اس جیسے غیر دلچسپ خشک اور کم رو انسان کے لئے اتنا کچھ کیا ہو، اس کی زندگی میں پہلی بار دوسری جنس کی رفاقت کے لطیف عنصر کو داخل کیا ہو۔ اس کی خاطر درجنوں شکیل حسین اور امیر لڑکوں کی پرواہ نہ کی ہو۔۔۔ کیا اس کے ساتھ ایسا سلوک جائز تھا۔ تمام رات حامد اسی اُدھیڑبن میں لگا رہا۔ ماں کی محبت یا بلقیس کی محبت؟ ان میں سے ایک کو بھی وہ قربان کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ صبح ہوتے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی کی ان دو محبوب ترین ہستیوں کی محبت پر اپنی عزت اور اپنی شخصیت قربان کر دے گا۔

بخار سے صحت ہونے پر جب حامد کالج واپس آیا تو بلقیس نے اس کے برتاؤ میں ایک عجیب تبدیلی محسوس کی۔ اس نے اب پروفیسر عبدالرحیم کے گھر جانا بند کر دیا۔ کبھی بلقیس ملتی تھی تو بدتمیزی سے منہ موڑ کر کسی اور سے باتیں کرنے لگتا، دوسری لڑکیوں میں زبردستی گھس کر بیٹھتا اور عام لوگوں کی طرح بھدے مذاق کرتا۔ وہ حامد جو کبھی پارسائی کا دیوتا سمجھا جاتا تھا اب باقاعدہ شرابیوں میں شمار ہونے لگا۔ آوارہ لڑکوں کے ساتھ کلب اور ہوٹلوں پر جانا شروع کر دیا۔ سال کے اخیر تک حامد کی آوارگی کا سکہ جم گیا۔ امتحان میں ذلت کے ساتھ فیل ہوا۔ مگر حامد نے دل میں ایسا محسوس کیا گویا اس نے دنیا کے سب سے بڑے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔ اب بلقیس کو اس سے محبت کے بجائے نفرت ہو گئی تھی۔ اس عرصہ میں حامد اور بلقیس کے تعلقات کا یک لخت یکایک بدل جانے پر کالج کے حلقوں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ افترا پردازوں، حاسدوں اور بلقیس کے ناکام عاشقوں کو اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ بعض تو یہ بھی کہتے تھے کہ حامد کی سابقہ پارسائی فقط ایک دکھاوا ہی تھی۔ تاکہ بلقیس پر اپنا اثر جما سکے اور "مطلب نکل جانے کے بعد" وہ اپنی اصلیت پر واپس آ گیا تھا۔ کچھ اور لوگوں کا خیال تھا کہ بلقیس بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ایک آئی سی۔ ایس شوہر کی تلاش میں تھی۔ حامد جیسے لائق طالب علم سے اس کو امید تھی کہ وہ ضرور سول سروس کے مقابلہ کے امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہوگا۔ لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ حامد سرے سے سرکاری ملازمت ہی کے خلاف ہے تو اس نے ایسے بیکار آدمی کو دھتا بتائی۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ بلقیس کا کالج آنا مشکل ہو گیا۔ اس نے اپنا نام کٹا لیا۔ حامد کی طرف سے ناامید ہو کر جس کو وہ خلوص اور وفاداری کا پتلا سمجھتی تھی بلقیس مردوں کی ذات سے ہمیشہ کے لئے بدگمان ہو گئی تھی۔ اب کسی دوسرے سے محبت کرنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ مگر کچھ عرصہ بعد سُنا گیا کہ "زبانِ خلق" کے حملوں سے بچنے کے لئے اور اپنے باپ کے اصرار پر اس نے ایک فوجی لفٹننٹ سے شادی کرنا منظور کر لیا۔"

اتنا کہہ کر حامد رُک گیا اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ قصہ سُنا کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

"اس کے بعد؟" موتی لال نے خاموشی کو توڑا۔

"اس کے بعد" حامد نے کہنا شروع کیا: "اس ٹریجیڈی کا آخری باب شروع ہوا۔ جس لفٹنٹ سے بلقیس کی شادی ہوئی وہ اوّل درجہ کا شرابی اور مہلک پوشیدہ بیماریوں میں مبتلا تھا۔ ایک سال ہوا۔۔۔۔۔۔" اس کی آواز مشکل سے نکلتی تھی اور وہ زمین کی طرف مجرمانہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔

جیسے کوئی قتل کا اقبال کر رہا ہو۔" ایک سال ہوا وہ دونوں ان مرضوں کا شکار ہوئے حامد کی ماں نے اس کی شادی ایک رشتہ دار لڑکی سے کر دی۔ جو ام المریض تھی اور جس کے متعلق ڈاکٹروں کا فیصلہ تھا کہ وہ ازدواج کا بوجھ نہ سنبھال سکے گی۔ مگر خاندانی لال بجھکڑوں نے ڈاکٹروں کی رائے کو ہذیان سمجھا اور اُلٹا فتویٰ دیدیا کہ شادی تو ایسی اکسیر دوا ہے جس سے تمام مرض دور ہو جاتے ہیں۔ حامد جو دل میں اس شادی کے از حد خلاف تھا ماں کے ارادے کے مقابلے میں اپنی آواز اٹھانے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ بلقیس سے قطع تعلق کے بعد اس نے طے کر لیا تھا کہ اس کی ماں اگر کسی اندھی، کانی لنگڑی، لولی لڑکی سے بھی اس کی شادی طے کرے گی تو وہ اس کو بھی منظور کر لے گا۔ اس کی حالت عجیب تھی! اس نے رواج پرست سماج سے ہار مانی تھی۔ جو چیز اس کے لئے بلقیس کے چھُٹ جانے سے بھی کہیں زیادہ ناقابل برداشت تھی وہ یہ احساس شکست تھا۔ سماج اس کو ایک بے پناہ سمندر معلوم ہوتی تھی۔ جس کی خوفناک موجوں میں ہر انسان کی انفرادی شخصیت اور ہر انقلابی ذہنیت کے لئے موت کا سامان ہے۔ وہ ان جواں مردوں میں سے نہیں تھا جو اپنی ہمت کے سہارے سماج کے ساگر کو پار کر کے اپنے خیالات کی بنیادوں پر نئی دُنیا بساتے ہیں۔ وہ فطرتاً کمزور تھا۔ دُنیا کی بزدلوں کی طرح اس نے چند تھپیڑوں سے پریشان ہو کر چپو پھینک دیئے۔ اب اس کی کشتی بھنور میں تھی۔ اور اس کے ساتھ دوسروں کی کشتیاں بھی۔

سکینہ جس کو اپنی شادی طے کرنے میں کوئی دخل نہ تھا جب حامد کی بیوی بن کر آئی تو اس نے شریف لڑکیوں کی طرح شوہر کی ہر طرح خدمت کرنے کی کوشش کی۔ مگر جس کے دل کا شیشہ ایک بار ٹوٹ جائے وہ پھر نہیں جُڑ سکتا۔ حامد نے اپنی بیوی سے کبھی سیدھے منہ بات نہ کی۔ وہ بیچاری بیمار ہمیشہ سے تھی۔ چھ ماہ بعد اسی غم میں گھُل کر مر گئی۔ حامد کی ماں بھی کچھ عرصہ بعد چل بسی۔ اکثر پردہ دار عورتوں کی طرح اس کو دق کا مرض مدت سے تھا۔ شوہر کے مرنے کے بعد وہ فقط اس امید پر زندہ تھی کہ حامد کا سہرا دیکھے۔ بیٹے کی آوارگی کو اس نے ناکتخدا زندگی کی بدعنوانیوں پر محمول کیا۔ اور جتنی جلدی ممکن ہو سکا اس کی شادی سکینہ کے ساتھ کر دی۔ لیکن اس کو کیا معلوم تھا کہ حامد کو جو مرض لاحق تھا اس کا علاج اتنا آسان نہ تھا جب شادی کے بعد بھی اس نے دیکھا کہ حامد کی حالت بہتر نہ ہوئی تو اس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایسا ہونہار لڑکا جس سے اس کو اور تمام خاندان والوں کو بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں یوں دیکھتے دیکھتے تباہ ہوا جا رہا تھا۔ ایک بار فیل ہونے کے بعد کالج سے اس نے ہمیشہ کے لئے نام کٹا لیا تھا۔ باوجود رشتہ داروں کے اصرار کے اس نے سرکاری نوکری کے لئے کوشش کرنے سے انکار کر دیا۔ شراب نوشی اور کوٹھوں پر جانا جو اس نے بلقیس کا دل اپنی طرف سے پھیرنے کے لئے شروع کیا تھا اس کی مستقل عادت بن چکا تھا۔ ماں نے لاکھ کوشش کی، سمجھایا، ڈانٹا لیکن حامد کی حالت نہ سنبھلی۔ بیٹے کی طرف سے مایوسی نے بڑھیا کا دل توڑ دیا۔ اور وہ بیچاری بغیر یہ جانے کہ اپنے بیٹے کی زبوں حالت کی ذمہ دار شاید وہ خود تھی اس دُنیا سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گئی۔

مگر اس کی موت نے حامد کے دل میں یہ خوفناک سوال پیدا کر دیا کہ کیا وہ خود اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار تھا؟ کیا اس نے ایک بے پردہ بہو کے صدمے سے بچا کر اس کو اس سے بھی بڑا صدمہ اپنی آوارگی سے نہ پہنچایا تھا۔ جو قربانی اس نے اپنی ماں کی محبت کی خاطر کی تھی اب بیکار نظر آنے لگی۔ اس کو یہ بھی شبہ ہوا کہ بلقیس سے قطع تعلقات اس نے ماں کی خاطر نہیں شاید سماج کے خوف سے کیا تھا۔ اور ساتھ ہی اس کو اس خیال نے بھی ستایا کہ ممکن ہے بلقیس اور اپنی بیوی کی موت کے لئے بھی وہ خود ہی ذمہ دار ہو۔ اگر اس نے پرلے درجے کی کمزوری دکھانے کی بجائے ہمت سے کام لیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ ان تینوں میں سے ایک جان بھی ضائع نہ ہوتی۔

اسی خیال نے اس کو تقریباً پاگل بنا دیا۔

رات اور دن اس کا ضمیر اس کو الزام دیتا تھا۔ وہ اتنا پریشان ہو گیا کہ رہی سہی جائداد کو بیچ کر آوارہ گردی کو نکل گیا۔ کہ شاید سفر سے دل کو سکون حاصل ہو۔ دھلی سے کلکتہ۔ کلکتہ سے مدراس۔ مدراس سے بمبئی۔ لیکن اس بھیانک خیال نے پیچھا نہ چھوڑا۔"

ہم لوگ حامد کی کہانی بڑے غور سے سُن رہے تھے۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے۔ اور جب اس نے تھک کر بولنا بند کیا تو اس کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ پسینہ میں شرابور وہ اس طرح ہانپ رہا تھا جیسے شکاری کتوں سے گھر کر ہرن موت کے لئے تیار ہوتا ہے۔ جب ہماری گفتگو شروع ہوئی تھی تو ہمیں یہ خیال بالکل نہ تھا کہ ایک اجنبی پہلی ملاقات میں اپنی زندگی کی داستان سنا ڈالے گا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی کو اپنی کہانی سُنانے کے لئے اس قدر بیتاب تھا کہ ذرا سے بہانے پر اس نے تین غیر متعارف شخصوں کو شروع سے اخیر تک تمام

تفصیلات سُنا ڈالیں۔

"تو کیا وہ کسی فیصلے پر پہنچ سکا؟" کمالی نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد سوال کیا۔

"ہاں" حامد نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ جیسے عدالت میں فیصلہ سُنایا جاتا ہے "اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مجرم تھا"

اور یہ کہتے ہی وہ اُٹھا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ جب تک ہم میں سے کوئی آواز دے سکے وہ کافی دور نکل گیا۔

کمالی نے کہنا شروع کیا "عشق جو کائنات کی بُنیاد اور رمزِ حیات کی اصلیت ہے سماج کے وقتی حالات سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا ..."

لیکن وہ دفعتہً رُک گیا۔ اس وقت شاید خود اس کو بھی ان شاعرانہ الفاظ کے کھوکھلے اور لغو ہونے کا احساس تھا۔

اس عرصہ میں حامد دور ایک نقطہ کی مانند نظر آ رہا تھا۔ محیطِ کائنات میں ایک بے حقیقت نقطہ۔ چند ہی لمحہ میں وہ نقطہ بھی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ پھر ساحل پر وہی سناٹا تھا اور سورج ایک خونیں سمندر میں ڈوب رہا تھا۔

خواجہ احمد عباس

دُلھن

میٹھی اور گہری نیند! پون کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے اور سُہاگ کے دن! شباب کی مستی اور حسن کی رعنائی ۔ اور ایک دل حوصلہ مند ۔

آرزو

جیسے سینہ پر آب پر راتوں کو چمکنے والے ستارے اپنا عکس دیکھ دیکھ کر مسکراتے ہیں ۔ جیسے ساون کی کالی کالی راتوں میں جگنو چمک چمک کر کیف حیات کا پتہ دیتے ہیں۔

جیسے ماہِ تاباں بادلوں کے گھونگٹ سے جھانک جھانک کر سوئی ہوئی کائنات پر نور کے دریا بہاتا ہے۔

جیسے شبنم عارضِ گل پر اس بندیا کی طرح چمکتی ہے جو کسی حسینہ کی پیشانی پر ضیا پاشی کر رہی ہو۔

اسی طرح دُلھن

آرزو کے گہوارے میں ۔ حیا کی گود میں ۔ شوق اور تمنا کے جھولے میں خیالوں کی دُنیا آباد کرتی ہوئی اپنے نئے گھر میں قدم رکھتی ہے۔

ایم۔ اسلم

بنارس جا رہا ہوں لکھنؤ سے

چلا ہوں ایک شہر رنگ و بو سے
اُفق کو ریل دوڑی جا رہی ہے
بتانِ ماہ وش کا ساتھ ہے پھر
ہوا لہرا رہی ہے سرد آنچل
کوئی گاؤں میں بیٹھا گا رہا ہے
مری آنکھوں میں گنگا پھر رہی ہو
سراپا شوق و حسرت کی نظر ہوں
کوئی کمسن حسیں گھونگھٹ نکالے
نہاتی ہے کوئی کمسن کنواری
کوئی گنگا میں کر جوڑے کھڑی ہو
وہ خود بت ہو کے پوجا کرنے والی
کوئی آنچل میں لیکر پھول پتی
کوئی نازک بدن چادر لپیٹے
کوئی بازو سے جوشن کھولتی ہو
کوئی پانی کے اندر ہانپتی ہو
کہیں پلو نچوڑے جا رہے ہیں
وہ اک نو عمر جو گم کی ماری
کمر تک بال کھولے کوئی جوگن
کوئی تونبی میں گنگا جل لئے ہے
کہیں گورے خنک ہاتھوں پہ چندن
وہ گورے بازوؤں پر سرخ دھاری
گلے پر کوئی صندل مل رہی ہے
کسی کی آنکھ میں امرت بھرا ہے
خنک شعلے کسی عارض میں غلطاں
گھنی پلکیں گلابی انکھڑیوں پر
ستارہ سی دمک سیم جبیں میں
بدن شاداب چہرہ ارغوانی
کسی میں پدمنی کا روپ رنگت
کوئی عصمت میں سیتا کی جوانی

بنارس جا رہا ہوں لکھنؤ سے
ہوا انفاسوں پہ نغمہ گا رہی ہے
بنارس کے سفر کی رات ہے پھر
اُفق پر ناچتا ہے سبز جنگل
فلک پر چاند دوڑا جا رہا ہے
بتوں کی ایک دُنیا پھر رہی ہے
تصور میں ابھی سے گھاٹ پر ہوں
کھڑی ہے سیس پر گگری سنبھالے
بدن کا جز ہوئی جاتی ہے ساری
نہائی زلف سینہ پر پڑی ہے
لئے ہے ہاتھ پر کُندن کی تھالی
جلانے آئی ہے منت کی بتی
کھڑی ہے ہار جوڑے پر لپیٹے
نہانے کے لئے پر تولتی ہے
کوئی سردی سے تھر تھر کانپتی ہو
کہیں گیسو نچوڑے جا رہے ہیں
الگ بیٹھی ہے سیڑھی پر پجاری
کھڑی جپتی ہے "جل ماتا" کی سُمرن
کوئی سر پر بھری چھاگل لئے ہے
کنول ہوں جس طرح پانی پہ روشن
کلیجے کے لئے اک زخم کاری
ہوا سینہ میں ٹھنڈی چل رہی ہو
کسی کے جسم کا سونا کھرا ہے
کسی کا چاند سا سینہ نمایاں
گھٹاؤں میں مئی گلگلوں کو ساغر
صبا کا لوچ جسم مرمریں میں
جوانی ہے جوانی ہے جوانی!
کسی میں تیر کی میٹھی شرارت
تقدس میں کوئی رادھا کی ثانی

کوئی نازک ادا دیوی حیا کی
کسی میں حسن یزدانی دمن کا

کسی میں جسرا تیں سنجوگتا کی
کوئی سنجوگ خود گنگ و جمن کا

تصور کا معاً ٹوٹا جو افسوں
مقابل ایک لڑکی سو رہی ہے
حسیں نازک کلائی سر کے نیچے
وہ پیشانی پہ بکھرے بال اسکے
پہیلی قوس ابرو میں لئے ہے
ادا سے ہاتھ سینہ پر دھرا ہے
تموج اس کے سینہ کا نظر میں
میں اس کے حسن ابتدا میں گم ہوں

نظر اب جو اٹھی کیا دیکھتا ہوں
سلونی ہونٹوں پہ اس کو کھیلتی ہو
کمر تک ایک کاہی شال اوڑھے
شفق آلود گورے گال اس کے
"سنہری رات" گیسو میں لئے ہے
گلابی رنگ بازو میں بھرا ہے
نمود حسن ہے گویا نظر میں
کہاں یہ ہوش اسٹیشن کو دیکھوں

ہوا اب سرد ہوتی جا رہی ہے
برابر ریل دوڑی جا رہی ہے
یونہی سیٹی بجاتی شور کرتی
اُدھر وہ صبح کی رعنائی لیکر
ادا سے کاروانِ ہوش لوٹا
نگاہیں اس طرح دریا پہ ڈالیں
اُٹھی ہنستی ہوئی کھڑکی سے جھانکی
سحر اوڑھے شفق کی شال نکلی
کہر پانی پہ پر کھولے پڑی ہے
چلی ہر موج سینہ پر لئے ساز
شفق پھوٹی انوکھے بانکپن سے
مری تخئیل پر برسا گئی رس

افق کچھ زرد ہوتی جا رہی ہے
ہوائیں بھیرویں لہرا رہی ہے
اُدھر گنگا کے پل پر ریل پہنچی
اٹھی کچھ اس طرح انگڑائی لیکر
فلک کا آخری تارا بھی ٹوٹا
نظر سے سینکڑوں موجیں اٹھائیں
معاً رنگت بدل دی آسماں کی
لئے سر پر سنہرا تھال نکلی
سنہری ریت ہیروں سی جڑی ہے
فضا میں گونج اٹھی گھنٹوں کی آواز
کلس سونا ہوئے پہلی کرن سے
خدا رکھے تجھے صبح بنارس

مگر اب پل نکل جانے پہ سمجھا
کہ اسٹیشن تو پیچھے چھوڑ آیا
اسی کافر کو دیکھے جا رہا ہوں
یہ کیا کاشی سے آگے جا رہا ہوں

جاں نثار اختر (علیگ)

مسٹر شمس الحسن

مسٹر شمس الحسن گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم تھے۔ ہر سال چھ مہینے دلی اور چھ مہینے شملہ پر رہا کرتے۔ پہاڑ پر جانے کا بھتہ ملتا تھا، سرکاری کوارٹر کا کرایہ بہت کم تھا، اس لئے اوپر نیچے آنے جانے کی زحمت کے علاوہ کوئی اور تکلیف نہ تھی۔ پھر وہ رؤسا، اور افسران کے ساتھ ہر سال پہاڑ پر جاتے تھے۔ گھر پر اور دوستوں اور جاننے والوں میں ان کی عزت زیادہ تھی۔ ہر شخص کا بل بوتہ نہیں کہ ہر سال پہاڑ پر جایا کرے۔ پہاڑ کی اور نیچے کی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ شملہ پر لوگوں کے لئے تو سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مکانوں کے کرائے حد سے زیادہ تھے، دوسرے زندگی بڑی مہنگی۔ پھر مراد آباد سے شاید ہی کوئی ہر سال پہاڑ پر جایا کرتا ہو، البتہ سر محمد ایوب ہر سال جایا کرتے تھے، اور ان کے بعد مسٹر شمس الحسن۔ چنانچہ لوگوں کی نگاہوں میں مسٹر شمس الحسن، جو اب اپنے آپ کو "ایس حسن" لکھنے لگے تھے۔ سر ایوب کے بعد دوسرا درجہ رکھتے تھے۔ شاید اگر ان کے پہلے بھی 'سر' لگا ہوتا تو وہی بازی جیت جاتے۔

بہر کیف جو کچھ بھی ہو۔ اب تو مسٹر ایس حسن تھے اور شملہ ان کی رہائش۔ یار دوستوں میں، جو دفتر ہی کے لوگ تھے مسٹر حسن کافی ہر دلعزیز تھے۔ لیکن بس ملاقات دور ہی کی تھی۔ البتہ کبھی کبھی چاء ڈنر کی دعوت کر دیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس میں کچھ زیادہ خرچ نہ ہوتا تھا بیوی سلیقہ والی تھیں سب کچھ گھر ہی میں تیار ہو جاتا۔ تاہم مسٹر حسن بازار سے بھی کچھ منگوا لیا کرتے، اس لئے نہیں کہ وہ اچھا ہوتا تھا، بلکہ اس لئے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ صرف گھر کی بنی ہوئی چیزوں پر ٹال دیتا ہے۔

ان کی شادی ہوئے چھ برس ہو چکے تھے، اور اب ایک لڑکی اور ایک لڑکا موجود تھا، بچے ہوتے تو اس سے بھی زیادہ، لیکن اتفاق سے شملہ پر لوئر بازار میں ایک کباڑیئے کی دکان سے انھیں "میری سٹوپس" کی ایک آدھ کتاب سستے داموں مل گئی۔ ان کتابوں کا ان پر بڑا اثر ہوا۔ اس کے علاوہ وہ برابر اس بات پر بھی غور کیا کرتے تھے کہ آخر انگریزوں کے اتنے کم بچے کیوں ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی بیویاں تندرست و توانا اور خوش و خرم رہتی ہیں۔ ان کے جسم کیسے سڈول اور تندرست ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے بھی طے کر لیا کہ "میری سٹوپس" کی تمام ہدایتوں پر عمل کر کے اپنی بیوی کو بھی تندرست اور خوبصورت بنائے رکھیں گے۔ یہ بچے بھی بس غلطی سے ہو گئے۔ بہرحال اب ان بچوں کی وجہ سے مسٹر حسن کی فکر میں تو اضافہ ہو گیا لیکن ان کی بیوی کی حیثیت بڑی حد تک اُن کے بچوں کی آیا کی ہو گئی۔ ہر وقت ان کی وجہ سے بیچاری کچھ نہ کچھ سنا کرتیں۔ مسٹر حسن کے سپرنٹنڈنٹ نے اپنے بچوں کے لئے ایک گھوڑا رکھ چھوڑا تھا۔ وہ خود اتنا تو خرچ نہ کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایک گدھا پال لیا۔ جس پر ان کے بچے ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔

مسٹر حسن کو قدرت نے فطرتاً بے نیازی اور اطمینان دے رکھا تھا۔ اُن کو اپنے سوائے کسی اور چیز سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ گھر میں بچے بیمار پڑتے تو ان کو پرواہ نہ ہوتی۔ حالانکہ بڑا بچہ ان کا بڑا لاڈلا تھا۔ بیوی بیچاری بخار میں جلا کرتیں تب بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ البتہ ان کی تکلیف اور بے چینی اور بڑھ جاتی۔ اس لئے جب سے شام کو گھر میں گھسنے اور دوسرے دن جب تک دفتر نہ چلے جاتے ہر وقت چڑچڑاپا ہی کرتے۔

"نہ کھانے کا ٹھیک ہے، نہ بیٹھنے کا۔ سارے گھر میں بچوں کے پوتڑے پڑے رہتے ہیں۔ یہاں ایک نے پیشاب کر دیا، وہاں دوسرے نے گندہ کر ڈالا۔ ڈرائنگ روم میں منوں خاک جمع ہو گئی۔ کوئی آ جائے تو کیا کہے گا!"

غرض یہ خراب ہے، وہ خراب ہے۔ بہرحال انھیں اپنی تکلیفوں کا تو پورا احساس ہوتا تھا، لیکن بیوی بیچاری کی مدد کرنی درکنار الٹ کر پوچھتے بھی نہ تھے۔ وہ غریب بخار میں جلتی رہتیں لیکن وہ ہل کر کبھی پانی بھی نہ دیتے۔ ایسی حالت میں بھی بیچاری میاں کی ہر آسائش کا برابر خیال رکھتیں۔ اور صبح سے شام تک بچوں، ناشتہ، کھانے وغیرہ میں لگی رہتیں مشکل سے کوئی گھڑی فرصت کی ملتی جو اپنی پڑوسنوں سے جا کر ملتیں۔ اس پر بھی نکا فضیحتی ہوتی رہتی۔ میاں کسی بات سے بھی خوش نہ ہوتے تھے۔ ان کو کام صرف اتنا تھا کہ صبح کو بڑے دن چڑھے اٹھتے اور دیر تک آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے دانتوں، آنکھوں، بال، غرض ہر چیز کا بغور معائنہ کرتے۔ گھنٹہ بھر تو صرف کپڑے پہننے میں لگا دیتے پھر چھڑی ہاتھ میں لیکر، مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے سیٹی بجاتے، دفتر روانہ ہو جاتے۔

دفتر میں کسی کو "ہلو" کسی کو "گڈ مارننگ" کرتے ہوئے گھستے۔ پھر ذرا ٹائپ کرنے والی لڑکیوں کی طرف سے گذرتے۔ اگر کسی نے نظر اٹھا کے دیکھ لیا تو باچھیں کھل گئیں۔ دور ہی سے ہلو، گڈ مارننگ کرتے۔ اور خوش خوش اپنی میز پر بیٹھتے۔ اگر سویرا ہوا تو کسی اور کی میز پر بیٹھ جاتے۔ اور پھر وہی دفتر کی باتیں چھڑ جاتیں یعنی کام کی کثرت کی شکایت یا کسی کی برائی

"ذرا سنگھ کو دیکھو۔ کس قدر بنتا ہے۔ جس دن سے فرسٹ ڈویژن ملا ہے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا۔ کام تو آتا نہیں لیکن اپنے آپ کو فرعون سمجھتا ہے۔ کل ہی میرے پاس فائل لے کر دوڑا ہوا آیا مسٹر ن ذرا یہ تو بتانا کہ کیا نوٹ لکھوں۔ اور اگر میرا کوئی کام ہو تو ٹکا سا جواب دیدیتا ہے۔ میاں نمت کی کھاتا ہے ہیں تو اس جیسے دس کا کام ایک دن میں نکال کر پھینک دوں۔ مگر یہاں خوشامد سے کرنی آتی ہے۔ اور وہ صبح سے شام تک ڈارون کے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ اگر ڈارون (سپرنٹنڈنٹ) کو ڈالیاں نہ چڑھاتا تو مر کر بھی فرسٹ ڈویژن نہ ملتا۔ مگر بھئی ہم سے تو اس طرح خوشامد ہو نہیں سکتی۔ دفتر کے بعد اٹھ کے میم صاحب کے پاس سلام کرنے پہنچ جاتا ہے۔ اور بازار سے سودا تک لا دینے میں عار نہیں۔ انھیں دھوتی بندوں نے تو ہم سب کا ستیاناس مار رکھا ہے۔ یہ بے ایمان اینگلو انڈین تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم ان کے جوتے ہی صاف کیا کریں۔ اور سب انہی خوشامدیوں کی بدولت اور اوپر سے بڑے پیٹریس بنتے ہیں۔ یہاں تو دن بھر جی حضور کرتے رہتے ہیں، باہر نکلتے ہی گالیاں سناتے ہیں، اور ملک کی آزادی کے گیت گاتے ہیں جیسے گویا ملک کو آزاد ہی کر لیں گے لیکن انگریز بھی دبتے ہیں تو ان ہی لوگوں سے۔ اور یہ تو دیکھو کہ ایک دوسرے کو کیسا گھسا لیتے ہیں۔ بس ایک کے پیر جمنے کی دیر ہے پھر تو چاروں طرف ہندو ہی ہندو دکھائی دیتے ہیں رائے صاحب جمنا داس نے دیکھو سپرنٹنڈنٹ ہوتے ہی اپنی برانچ میں چھ ہندو بھرتی کر لئے۔ ہم لوگ تو بلی کا گوشت ہیں، منصور صاحب ڈپٹی سکریٹری ہو گئے لیکن ایک آدھ مسلمان کو رکھوا لیا گیا ہم لوگوں کی بھی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ کیسے وعدے کر رہے تھے لیکن جب کام پڑا تو کہنے لگے کہ سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ میں مجبور ہوں۔ میرا حق کاٹ کے اس نے سنگھ کو فرسٹ ڈویژن دیدیا۔ اور اس سے کام تک نہیں سنبھلتا۔"

غرض اسی طرح کی باتوں میں وقت کٹتا۔ دوپہر کو ٹفن کے وقت جب چھٹی ہوتی تو ٹفن روم سے چائے، توس، سینڈوچیز وغیرہ منگا کر کھا لیتے۔ بیوی برابر کہتی تھیں کہ ناشتہ ساتھ لے جایا کیجئے اور لوگ بھی تو لے جایا کرتے ہیں۔ لیکن یہ تکلیف کون گوارا کرتا۔ شروع شروع میں ٹکیاں اور شامی کباب لے لے گئے۔ پھر کچھ روز تھرماس میں چار کچھ توس اور انڈا وغیرہ لے جانے لگے۔ لیکن یہ تجربہ بھی کچھ کامیاب نہیں ہوا۔ دفتر میں جتنے انگریز اور اینگلو انڈین تھے ان کے گھروں سے نوکر ٹفن لے آتے تھے۔ کچھ اینگلو انڈینوں کے نوکر اپنے ساتھ ان کے کتے بھی لے آتے تھے۔ کچھ لوگوں نے دفتر ہی میں انتظام کر لیا تھا۔ مسٹر حسن نے بھی دفتر ہی میں انتظام کر لیا۔ مگر پوری چیزیں لینے میں کافی خرچ بیٹھتا تھا، اس لئے چار اور توس پر ہی اکتفا کی۔ کھا پی کر میز پر پاؤں رکھ کے کرسی میں بیٹھ جاتے۔ اور چھت کی طرف دھواں اڑا اڑا کے بڑی آسودگی سے سگریٹ پیتے یا کچھ اور لوگوں سے وہی دفتر کی ہانکتے۔ شام کو مال روڈ کا چکر لگا کے، عورتوں کو گھورتے اور ٹہلتے ٹہلاتے اپنا بھاری جسم لئے، ہانپتے ہوئے بہت دیر میں گھر آتے پہاڑ پر چڑھائی اتار کی ہمیشہ شکایت رہتی تھی۔ چا پی، اور اگر جی چاہا تو کچھ دیر بیوی سے بات چیت کی یا بچوں سے کھیلے، نہیں تو ڈرائنگ روم میں کوئی پرانا میگزین یا انگریزی کا کوئی معمولی ناول جو کسی کباڑیے کے یہاں سے خرید لاتے تھے لے کے بیٹھ جاتے۔

وہ بیوی سے اکثر کہا کرتے تھے:۔

"ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں بیٹھتیں؟ انگریزوں کی عورتوں کو دیکھو کتنے آرام اور عیش سے رہتی ہیں شام کو، کھانے کے بعد، ہمیشہ ڈرائنگ روم میں سب بیٹھتے ہیں۔ کیسا اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن تم تو سنتی ہی نہیں!!"

بیوی بیچاری ذرا پرانے خیال کی تھیں، ان سے کرسیوں پر چڑھ کے نہ بیٹھا جاتا تھا۔ ایک آدھ بار انھوں نے کوشش کی لیکن ان کی ٹانگیں ہمیشہ اٹھ کر کرسی پر آ جاتیں اور وہ آلتی پالتی مار لیتیں۔

لیکن مسٹر حسن کو یہ بُرا معلوم ہوتا تھا۔

"کوئی دیکھے گا تو مذاق اُڑائے گا۔ انھیں کُرسی پر بھی
بیٹھنا نہیں آتا!"

بیوی بیچاری عادت سے مجبور تھیں۔ دوسرے جب کبھی وہ اس کمرے میں بیٹھتیں تو خواہ مخواہ مسٹر حسن کو اس بات کا خیال آتا اور وہ اپنی بیوی سے کہتے :۔

"دیکھو تو انگریزوں کی بیویاں کیسے اپنا سب کام
خود کرتی ہیں۔ کپڑے دھونا بازار سے سودا لانا، آخر
تم بھی کیوں نہیں کرتیں۔ اس سے صرف کفایت
ہی نہیں ہوتی بلکہ سامان بھی اچھا آجاتا ہے اور صحت
بھی اچھی بنی رہتی ہے۔ مسٹر نرائن کی میم کو دیکھو آخر
وہ بھی تو انگریز ہے، لیکن میاں کے لئے سگریٹ
تک خود ہی بازار سے لاتی ہے!"

آخر کو بیوی نے ڈرائنگ روم میں بیٹھنا ہی چھوڑ دیا لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔ آئے دن ذرا ذرا سی بات پر میموں کے حوالے دیئے جاتے اور بُری طرح فضیحتی ہوتی۔ کبھی صفائی پر، کبھی بچوں پر، کبھی بیوی کی "ہندوستانی عادت" پر۔

آخر کار بیچاری کو دق ہو گئی۔ کچھ روز تو وہ اپنے بخار کو چھپاتی رہیں۔ جوشاندہ وغیرہ پی لیتیں۔ لیکن مرض میں روز بروز زیادتی ہی ہوتی گئی۔ مسٹر حسن روز کہتے :۔

"یہ کیا ڈھونگ بنا رکھا ہے۔ کام دام کچھ نہیں کرتیں۔ بچے الگ رُلتے پھرتے ہیں۔ نہ مجھے وقت پر ناشتہ ملے نہ کھانا۔ مجھے کام کرنا ہوتا ہے۔ دن بھر دفتر کی بیٹیوں اور گھر پر یہ اور مصیبت!"

جب تک بنا بیچاری کرتی گئیں۔ ہندوستانی بیوی کی بھی کیا زندگی ہے! ۔ اپنے آپ کو میاں کا غلام سمجھتی ہے مصیبتیں اٹھائے بُرا بھلا سنے، بچے جنے، ان کو پالے۔ میاں کا خیال رکھے، کام کاج کرے اور بجائے آواز احتجاج بلند کرنے کے منہ سے اُف تک نہ نکالے۔

غرض بیگم حسن کا حال ابتر ہی ہوتا گیا، اب تو مسٹر حسن کو بھی خیال آیا اور ایک روز ڈاکٹر کو بُلا کر دکھا دیا۔ اور پھر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ اور ڈاکٹر سے حال کہنے کے لئے بھی کوئی نہ ہوتا۔ غرض دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اب ان کا یہ حال ہو گیا کہ چارپائی پر پڑی رہتیں آنکھوں میں حلقے پڑ گئے اور رنگ سیاہ ہو گیا۔ بخار سے جسم تپتا رہتا اور کھانسی کے مارے بُرا حال۔ اکثر تو انھیں ایسی کھانسی اٹھتی کہ معلوم ہوتا اب آنکھیں باہر نکل پڑیں گی ۔ ۔ ۔ لیکن مسٹر حسن دفتر سے آتے تو چڑ چڑ ہی کرتے رہتے۔

"ایک تو ویسے ہی کونسا آرام ملتا تھا اور اب یہ
مصیبت الٹی آن پڑی ہے۔ کسی بات کا بھی ٹھیک
نہیں!"

بیوی بیچاری تو مُردہ ہو ہی رہی تھیں، یہ سنکر اور بھی سہم جاتیں۔ جو کچھ ہو سکتا پلنگ پر پڑے ہی پڑے کرتیں، میاں کے ناشتہ کے لئے ٹکیاں تلنا، انڈا پکانا یا حلوا بنانا۔ مگر اپنے لئے کچھ نہیں۔ بچے بیچارے دن بھر مارے مارے پھرتے۔ گھر میں ایک مرد اور ایک لڑکا نوکر تھا۔ جب بیوی کا یہ حال ہوا تو نوکروں نے بھی لاپرواہی شروع کر دی بچوں کے کپڑے بدلے ہوئے دنوں گذر جاتے۔ شام کو مسٹر حسن اس پر بھی بگڑتے۔

"بچوں کا تو ذرا حال دیکھو معلوم ہوتا ہے اُن کی
ماں مر گئی اور وہ یتیم ہو گئے ہیں کس قدر میلے کپڑے
پہنے ہیں۔ نوکروں کے بچے بھی اتنے گندے نہ ہوں گے!"

بیوی کا یہ حال تھا کہ پانی پینے کے لئے اٹھنے کی ہمت باقی نہ رہی تھی۔ میاں کو یہ توفیق کہاں کہ نام ہی کے لئے ذرا گھر کے کام میں ہاتھ بٹا دیں۔ ان کو اپنے آپ ہی سے فرصت نہ ملتی تھی۔

آخر کار بیوی نے اپنی علالت کا حال اپنے گھر لکھ دیا۔ اُن کی ماں تو بچپن ہی میں مر چکی تھیں۔ والد نے سُنا تو بہت پریشان ہوئے۔ اور خود آ گئے، اُن کی خالہ بھی جنھوں نے ان کو پالا تھا سُن کر بولائی ہوئی آئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں والد اور خالہ، اُن کی حالت دیکھ کر رونے پیٹنے لگے لیکن مسٹر حسن بگڑ کر بولے :۔

"اجی صاحب! آپ لوگ ناحق اس قدر پریشان
ہو رہے ہیں۔ گھبراہٹ کی کیا بات ہے معمولی
بخار ہے۔ ڈاکٹر کو دکھا ہی چکا ہوں۔ کچھ روز میں
ٹھیک ہو جائیں گی۔ نہ معلوم انھوں نے آپ کو
لکھ ہی کیوں دیا!"

اب چونکہ گھر میں اور آدمی آ گئے تھے مسٹر حسن اور بھی بے فکر ہو گئے۔ شام کو مال روڈ کے بجائے ایک چکر کے دو چکر لگاتے۔ رات گئے گھر آتے، اور بغیر بیوی کے کمرے میں جھانکے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ اگر بہت ہوا تو اتوار کے دن جیسے مکان

کی صفائی کی جاتی ہے مسٹر حسن کوئی دس یا پندرہ منٹ کے لئے بیوی کے پاس جا بیٹھتے لیکن تمام وقت اس طرح کا لیکچر دیتے کہ بیوی کے آنسو بہنے لگتے۔ وہ کہتے:-

"کام کاج میں دل لگاؤ۔ اٹھتے کیوں نہیں بیٹھ جاتیں۔ ذرا ٹہلو طبیعت ٹھیک کیسے ہو۔ پڑے پڑے کھانا بھی ہضم نہیں ہو سکتا"

اور بیوی کا یہ حال تھا کہ پلنگ پر بھی مشکل سے اٹھ کر بیٹھ سکتی تھیں۔

جب کبھی خسرے سے بات چیت ہوتی کام کی شکایت کرتے۔

"آج ان کا کیا حال رہا؟ مجھے تو آجکل کام کی وجہ سے سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ہوتی۔ اتنے کیسز (Cases) آئے ہیں کہ ڈھیر اکٹھا ہو گیا ہے اس قدر کام ہے کہ اب جا کر فرصت ملی ہے"

پھر کھانا کھانے کے بعد اگر بہت خیال آیا تو بیوی کے پاس ایک آدھ منٹ کو کھڑے ہو آتے اور اس کے بعد بستر میں لیٹ جاتے، اور کتاب پڑھتے پڑھتے سو جاتے۔

ایک روز رات کو انھیں بیوی کی کچھ ایسی محبت آئی کہ تھوڑی دیر کے لئے ان کی چارپائی کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ اُن کے خسر اسی وقت کہیں چلے گئے تھے۔ بیوی کی خالہ دوسرے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ مسٹر حسن کی بیوی چارپائی سے نئی مُردے کی طرح پڑی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں چھت پر گڑی ہوئی تھیں اور سانس کے چلنے کی آواز خرخر آ رہی تھی، جیسے پہاڑی چوٹی پر درختوں میں ہوا کا غناٹا۔ مسٹر حسن نے بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ سامنے میز پر بوتلوں، ڈبوں اور گدڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فرش پر پوڈرے اور کپڑے چیتھڑے پڑے تھے۔ مسٹر حسن کی نگاہ ان چیزوں پر پڑی اور انکی تیوری پر بل آگئے۔ وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ بیوی کے کمزور جسم کو جنبش ہوئی، اور مڑ کر کانپتی ہوئی خفیف آواز میں وہ کہنے لگی:-

"میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ اور شادی کر لیجئے۔ میں بچوں گی نہیں۔ میری وجہ سے آپ تکلیف نہ اٹھائیے"

اُن کی آواز بھر آگئی، اور ایک گرم آنسو اُن کے گلے پر بہتا ہوا تکیہ پر گرا۔ مسٹر حسن نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ سامنے اونچے پہاڑوں کا سلسلہ رات کی تاریکی میں سیاہ اور مدھم، آسمان تک چلا گیا تھا۔ پہاڑ کے دامن پر یکایک ایک الاؤ کی آگ بھڑکی، لیکن فوراً ہی دب گئی۔ اور اندھیرے کے علاوہ کچھ نہ دکھائی۔۔ دیتا تھا۔

بیوی کے ان مایوس کن الفاظ نے مسٹر حسن پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ اپنا غصہ بھول گئے۔ اور بیوی کا ہاتھ آہستہ سے دبا کر بولے:-

"نہیں اس طرح کی باتیں مت کرو۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ اتنی ہراساں کیوں ہوتی ہو؟ کل میں ڈاکٹر مینکیین کو بلا کر تمھیں دکھا دوں گا۔ بڑا ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ سب اس کی تعریف کر رہے تھے"

ایسا معلوم ہوا جیسے ان جملوں نے ان کے اندر نئی جان ڈال دی۔ ان کے چہرے پر اس خوشی کے آثار نمایاں ہونے لگے جو ایک غلام کو اس وقت محسوس ہوتی ہے جب اس کا آقا اس سے کبھی اچھی طرح بات کرے، یا کتے کی وہ وجدانہ کیفیت جو اپنے مالک کے پیار کرنے اور تھپکارنے سے اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس وقت بیگم حسن کا جی ہی چاہتا تھا کہ بڑھ کر اپنے میاں کے قدم چوم لیں۔ اور وہ بستر ہی پر پڑے پڑے اپنے اچھے ہونے اور میاں کی خدمت کرنے کے خواب دیکھنے لگیں۔

صبح اٹھ کر مسٹر حسن نے ڈاکٹر مینکیین کو ٹیلیفون کیا۔ اُسے دس بجے سے پیشتر فرصت نہ تھی، اس لئے اس نے دس اور گیارہ کے درمیان آنیکا وعدہ کیا۔ مسٹر حسن کو تو دفتر جانا تھا اس لئے اپنے خسر سے کہہ کر چلے گئے۔۔۔۔۔

شام کو دفتر سے ذرا جلد واپس آگئے اور خلاف معمول اپنی بیوی کے کمرے میں چلے گئے اور خسرے سے پوچھا کہ ڈاکٹر کیا کہتا تھا۔ انھوں نے کہا:-

"وہ دیکھ گیا ہے، دوا بھی تجویز کر دی ہے لیکن وہ کہتا تھا کہ میں ان کے شوہر سے بات کرنا چاہتا ہوں"

اس پر مسٹر حسن بولے: "کیوں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ وہ کچھ انجکشن وغیرہ دینے کو کہتا تھا"

"تو مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتا ہے؟"

"میاں تم آخر کو شوہر ہو۔ اس خیال سے کہتا ہوگا کہ تم ذمہ دار ہو۔"

"میں کیا کروں گا؟ دوا کے لئے کہتا ہوگا کہ بازار سے لا دو۔ اور کیا۔ لیکن مرض کیا بتاتا تھا؟"

"یہ تو مجھ سے کہا نہیں۔ غالبًا۔ وہ کہتا تھا انشاء اللہ آرام ہو جائے گا۔"

"تو آخر مرض کیا تجویز کیا؟"

پہلے تو خسرے خاموش رہے پھر کچھ دیر بعد بولے:۔

"شاید تم سے اسی کے بارے میں بات چیت کرے گا۔"

"تو صاحب میں کیا کروں گا۔ کیا آپ سے نہیں کہہ سکتا تھا؟"

"میاں تم آخر شوہر ہو۔"

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیا کر لوں گا۔ آپ آخر چھپا کیوں رہے ہیں؟ کہہ کیوں نہیں دیتے کہ دق بتاتا تھا..."

خسرے ویسے ہی متفکر اور پریشان تھے۔ یہ سن کر غصے سے لال ہو گئے۔ مریض کے منہ پر اس صفائی سے کہہ دینا تم کو دق ہو گئی ہے لیکن وہ پُرانے خیال کے آدمی تھے اور داماد سے کچھ نہ بولے۔

مرض جڑ پکڑ چکا تھا، اور ڈاکٹر مینکین کے علاج سے بھی بیوی کو کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ پانچہ انکی خالہ اور والدنے یہ صلاح دی کہ ان کو دلی لے جا کر حکیموں کو دکھائیں۔ پہلے تو مسٹر حسن نے کہا کہ دق کے مریض کو گرمی میں لے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اور حکیموں کے علاج میں دھرا کیا ہے، صرف بھر بھر کے قدحے پلاتے ہیں۔ نہ مرض پہچانیں، نہ ٹھیک علاج کریں۔"

لیکن ان لوگوں کے اصرار سے راضی ہو گئے۔

اتوار کا دن ان لوگوں کے دلی جانے کے لئے مقرر ہوا ہفتہ کی رات کو چونکہ خسرے اور خلیہ ساس اسباب وغیرہ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے، مسٹر حسن اپنی بیوی کے پاس جا بیٹھے۔ وہ چارپائی کے پاس خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور پچھلی آسائشوں کا خیال کر کے ایک حد تک مغموم تھے۔

آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے کبھی کبھی کڑک آواز ہوتی تھی۔ بادلوں میں تیزی سے بجلی چمکتی اور پھر پہلے کی نسبت وہ اندھیرا ہو جاتا۔ بجلی کی چمک میں بیوی کا زرد چہرہ سفید اور مُرجھایا چمک اٹھتا، اور آنکھوں کے گڑھے اور چہرے کی ہڈیاں اُبھر نمایاں ہو جاتیں۔ باہر درختوں میں ہوا کا چلنا ایک آہ کی طرح مایوس کن معلوم ہوتا تھا۔

مسٹر حسن کی بیوی نے ان کی طرف کئی دفعہ غم اور یاس سے دیکھا اور وہ بھی بیوی کو تسلی دینے لگے لیکن بیوی نے میاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ان کا ہاتھ بالکل سرد تھا۔ وہ ناامیدی سے اپنے میاں کا ہاتھ بھینچے رہیں، جیسے اب ان کو بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اور جیسے دنیا میں سہارے کے لئے ان کے پاس اپنے میاں کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ اس معصومانہ حرکت میں وہ درد اور گداز تھا، زندگی میں وہ مایوسانہ التجا جو انسان موت سے کرتا ہے۔ وہ حسرت بھری خواہش جو کوئی مرتے وقت اپنے محبوب سے کرتا ہے کہ مجھے اس آخری وقت میں نہ چھوڑنا، اس میں موت کی ہولناکی تھی، وہ ڈر جو موت کے سامنے انسان پر غالب آجاتا ہے وہ درد انگیز حسرت جو دُنیا کی چیزیں چھوڑتے وقت، اپنے حبیبوں سے جُدا ہوتے ہوئے انسان کو اس بات کا احساس دلا دیتی ہے کہ ہم رخصت ہو رہے ہیں اور پھر کبھی واپس نہ آئیں گے۔ یہ زندہ رہنے۔ ہنسنے بولنے، محبت کرنے اور محبت کئے جانے کی موہوم خواہش تھی۔ اس وقت جب انسان ناامید ہو چکتا ہے کہ اب اُسے موت سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

اس ذرا سی درد بھری حرکت میں وہ دریائے محبت موجزن تھا جس نے مسٹر حسن کو بھی افسردہ کر دیا۔ ان کا ہاتھ کانپنے لگا، اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بوندیں ٹپک پڑیں۔۔۔۔۔ ایک بھٹکا ہوا جگنو کمرے میں آ گیا، لیکن ایک لمحہ چمکنے کے بعد پھر تاریکی میں غائب ہو گیا، زور سے بجلی چمکی، ادھر پہاڑوں میں ہوا کا سناٹا بڑھ گیا۔

مسٹر حسن کالکا تک اپنی بیوی کو پہونچانے گئے۔ اور دلی کی گاڑی میں سوار کرانے کے بعد شملہ واپس آ گئے۔ گھر ان کو اکیلا اکیلا اور سونا معلوم ہوا۔ لیکن ایک آدھ روز میں وہ اس کے عادی ہو گئے۔

دلی سے روزانہ بیوی کی خیریت کے خط آتے تھے لیکن حکیموں کے علاج سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مولویوں کو دکھایا۔ ٹونے ٹوٹکے کئے گئے۔ گنڈے تعویذ کئے گئے لیکن کسی چیز سے افاقہ نہ ہوا۔ روز بروز حالت خراب ہی ہوتی گئی۔ آخرکار، ایک روز مسٹر حسن کے پاس تار آگیا کہ انکی بیوی اس دُنیائے فانی سے رخصت ہو گئیں۔ اور آپ آزاد ہیں۔

کچھ روز تو مسٹر حسن افسوس میں رہے۔ گھر کی بربادی اور آرام کے ختم ہونے کا خیال دس پندرہ روز تک ان پر نمایاں اثر کئے رہا۔ اور بچوں کے خیال نے ان کی پریشانی کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ لیکن چند ہی روز کے بعد وہ نئی زندگی کے خواب دیکھنے لگے۔

اور اب وہ دوسری شادی کرنے کی فکر میں ہیں۔ کئی ایک پیغام آ چکے ہیں لیکن انھوں نے طے کر لیا ہے کہ بغیر لڑکی کو دیکھے اور بغیر اس سے ملے ہوئے شادی نہ کریں گے ...

احمد علی

صبوحی

نور کے دامن میں جمنا کا وہ سندر استھان
چوڑی کی ملکوتی گت جل پریوں کا اشنان
وہ کافر نظارے

یہ نغمے خاموش
شردھا میں مدہوش
چھین رہے ہیں ہوش

یہ کافر نظارے

تو بہ یہ اشنان کی مانی کیا چیں بل دکھلائیں
لہریں جب لہرا کر آدیں ساپن سے بل کھائیں
دھرتی کے یہ تارے

عریاں اور مستور
شردھا مد سے چور
دست طلب سے دور

یہ کافر نظارے

اُف کافر توڑوں کے توڑے چھیڑوں کی یہ آواز
ہردے کی دھڑکن پہ ناچے پریم کا کومل راز
گیت وہ پیارے پیارے
کانوں میں رس گھولیں

بول انوکھے بولیں
پٹ ہردے کے کھولیں

یہ کافر نظارے

بھجنوں کے وہ بول رسیلے شردھا کے وہ راگ
اُٹھ من پاپی پاپ کو دھولے جاگ خدارا جاگ
لوبھ موہ کو مارے

نغموں کے شیدائی
دیوانے ، سودائی
اُٹھ ، دے رام دُہائی

یہ کافر نظارے

مندر چُپ ، نغمات ہیں ساکن ، اور دیوی خاموش
ساری کے دربار کنارے چھین رہے ہیں ہوش
پانی کو انگارے

نیر میں آگ لگائیں
دُوری سے تڑپائیں
اب نہ دیکھے جائیں

یہ کافر نظارے

سروپ رانی نگار

گھوڑے کی پیٹھ پر

اس غریب کنبہ کا انحصار شوہر کی محدود آمدنی پر تھا۔ ان کے ہاں دو بچے تھے۔ وہ شروع سے غریب چلے آتے تھے اور اب اس خوفناک فلاکت کا شکار ہو رہے تھے جو ظاہر یت قائم رکھنے والے خاندانوں میں عموماً رونما ہوتی ہے۔

ہیکڑ کی پرورش آبائی جاگیر کی دیہاتی فضا میں ہوئی تھی۔ بوڑھا ہپّی اس کا اتالیق تھا۔ یہ خاندان کوئی اتنا امیر نہ تھا مگر اس کے تمام افراد اپنی پوزیشن برقرار رکھنے کے لئے کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ جب ہیکڑ بیس سال کا ہوا تو اُسے کلرک کی حیثیت سے بحری دفتر میں پندرہ سو فرانک سالانہ کی ایک اسامی مل گئی۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو شروع ہی میں زندگی کے تلخ مصائب جھیلنا پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ زندگی میں قدم رکھتے ہی اس کے پیچ در پیچ عقدوں کو سُلجھا لینا اس کی طاقت سے باہر تھا۔

دفتر میں اس کے پہلے تین سال بڑی مصیبت میں گذرے۔

اس نے اپنے چند بھولے بسرے رشتہ داروں کو، جو زمانہ کی گردش کے باعث اس کی طرح مفلوک الحال تھے۔ از سرِ نو اپنے حلقۂ احباب میں لے لیا۔ اور اس طرح اس نے ملاقاتیوں کا ایک وسیع دائرہ پیدا کر لیا۔

اس ستم رسیدہ مگر غیور خاندان کے تمام افراد جو زندگی کے جدید اسالیب سے محض نا آشنا تھے چند سال خوردہ مکانوں کی بوسیدہ چھتوں پر کونت پذیر تھے۔ ان مکانوں کے نچلے حصوں میں ایسے خطاب یافتہ لوگ مقیم تھے جو ہیکڑ کے خاندان کی طرح گردشِ ایام میں مبتلا تھے، اور انہیں خطاب یافتہ لوگوں میں اس نے ایک غریب، نوجوان لڑکی سے ..... شادی کر لی۔

چار سال کے عرصہ میں ان کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ غربت نے ان پر غضب ڈھا رکھا تھا۔ اتوار کی سیر اور ان چند راتوں کے سوا جو فری ٹکٹ کے بل بوتے پر وہ موسمِ سرما میں تماشہ گاہوں میں گذارا کرتے تھے، ان کا اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔

موسمِ بہار کے آغاز ہی میں ہیکڑ کے افسر نے کچھ زائد کام اس کے سپرد کر دیا جس سے اس نے تنخواہ کے علاوہ تین سو فرانک اور کمائے۔

بہت تکرار کے بعد ان کی صلاح ٹھہری کہ اس رقم سے ایک ضیافت کی جائے۔

ہیکڑ نے اپنی بیوی سے کہا: "ایسے موقعے کبھی کبھار آتے ہیں۔ میں تمہارے لئے اور بچوں کے لئے ایک بند بگھی کرایہ پر لے لوں گا اور خود گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو جاؤں گا۔ اس طرح سیر میں وقت خوب گذرے گا!"

ایک ہفتہ انھوں نے انہی باتوں میں گذار دیا۔ ہر شام دفتر سے واپس آتے ہی ہیکڑ اپنے بڑے لڑکے کو گھٹنوں پر اوپر نیچے اچھال کر کہتا۔ "بچہ بیٹا! بس تمہارے اباجی اس طرح گھوڑے پر چڑھیں گے!" اور لڑکا سارا دن کرسیوں پر اچھل اچھل کر چلّاتا رہتا: "اس طرح میرے اباجی گھوڑے پر چڑھیں گے!"

کھانے کے وقت ہیکڑ اپنی شہسواری کے متعلق بڑے بڑے ہوائی قلعے بناتا اور کہتا: "مجھے سواری میں خوب مہارت ہے۔ ایک دفعہ گھوڑے پر سوار ہو جاؤں پھر دیکھنا کیسا غضب ڈھاتا ہوں!" پھر خوشی میں تالی بجا کر بیوی سے کہتا: "اگر وہ مجھے کوئی شوخ اور تیز رفتار گھوڑا دیں تو لطف آ جائے جب میری شہسواری دیکھنے کے قابل ہو۔ اگر حسنِ اتفاق سے اُس وقت دفتر کا کوئی ساتھی مل جائے تو اسے تعریف کرتے ہی بنے!"

مقررہ وقت پر بگھی اور گھوڑا ہیکڑ کے دروازے کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ گھوڑے کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے کے لئے، انتہائی اشتیاق کے ساتھ وہ نیچے اترا۔ اس وقت اس نے اپنی پتلون پر فیتے باندھ رکھے تھے اور اس سانٹے سے مشق کر رہا تھا جو اس نے ایک روز پہلے خریدا تھا۔ اس نے گھوڑے کی ہر ایک ٹانگ کو یکے بعد دیگرے، اٹھا کر اچھی طرح دیکھا، ہاتھ پھیر کر اس کی گردن، پسلیوں اور پیٹھ کا مشاہدہ کیا۔ منہ کھول کر اس کی عمر کا اندازہ لگایا۔ تمام افراد کے اکٹھے ہوتے ہوتے ایک ہی منٹ میں اس نے عام گھوڑوں کے متعلق اور بالخصوص اس گھوڑے کے متعلق سب کچھ بیان کر ڈالا۔ جب ہر ایک فرد بگھی میں آرام سے بیٹھ گیا تو ہیکڑ نے اپنے گھوڑے کی کاٹھی کا ملاحظہ کیا۔ اور اس

پھرتی اور قوت سے ایک ہی جست میں اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا کہ گھوڑا معاً بدک کر اچھلنے لگا۔ ہیکڑ کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔ مگر ذرا سنبھل کر بولا "ٹھیرو، ذرا سنبھلو" اور جب گھوڑا ذرا رُکا تو بیوی سے پوچھنے لگا "کیا تم سب تیار ہو؟" وہ سب ہم آہنگ ہو کر بولے "ہاں" اور یہ "قافلہ" چل پڑا۔

ہر ایک تماشائی کی آنکھیں ہیکڑ پر جھکی تھیں۔ وہ انگریز سوار کی طرح ذرا تکلف سے زین پر اوپر نیچے اچھل رہا تھا۔ کبھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی گھوڑے کی ایال پر گر پڑے گا۔ اس کی آنکھیں سامنے کی طرف مرکوز تھیں۔ اس کے ماتھے پر شکن پڑے تھے اور اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ ایک بچہ اس کی بیوی کی گود میں تھا اور دوسرا نوکر کے پاس تھا۔ ہر منٹ کے بعد وہ بچوں کو مخاطب کر کے کہتے "اپنے ابا جان کی طرف دیکھو" اور بچے تازہ ہوا اور سیر کی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے چیخیں مارنے لگتے۔

گھوڑا اس بے پناہ شور سے بدک کر اچھلنے کودنے لگا۔ اُسے روکنے کی کوشش میں ہیکڑ کی ٹوپی زمین پر آ رہی۔ بگھی کے کوچبان نے نیچے اتر کر ٹوپی کو اٹھایا اور ہیکڑ اُسے پہن کر چلانے لگا "بچوں نے یہ کیسا شور مچا رکھا ہے انھیں بند کرو، نہیں تو میرا گھوڑا ڈر کر ہوا ہو جائیگا۔"

وہ کھانا ساتھ لے آئے تھے۔ ایک سبزہ زار میں بیٹھ کر انھوں نے تیسرے پہر کا ناشتہ کیا۔ اگرچہ گھوڑوں کی حفاظت کے لئے ایک کوچبان کھڑا تھا پھر بھی ہیکڑ ہر منٹ کے بعد یہ معلوم کرنے کے لئے گھوڑے کے پاس جاتا کہ شاید اسے کسی چیز کی ضرورت ہو۔ وہ اُسے ہاتھ سے تھپکی دیتا، اور روٹی، کیک اور میٹھے سے اس کی تواضع کرتا۔

اس نے اپنی بیوی سے کہا "دیکھو یہ بڑا اُڑ لگی چلنے والا جانور ہے۔ پہلے یہ مجھے گرایا ہی چاہتا تھا مگر تم نے دیکھا میں نے اُسے کتنی جلدی سنبھال لیا۔ اب اس نے مجھے پہچان لیا ہے"

آتی دفعہ گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں سے راستہ بھرا پڑا تھا۔ سورج کی شعاعیں تیزی سے پڑ رہی تھیں۔ جن سے گاڑیوں کا روغن اور ساز کا پیتل چمک رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی کا موجیں مارتا ہوا ایک بے پایاں سمندر سڑک پر رواں ہے۔

اس بے پناہ اژدہام کو دیکھ کر ہیکڑ کا گھوڑا یکایک بے قابو ہو گیا۔ اور گاڑیوں کے درمیان سے ہوا کی طرح گذرتا ہوا اصطبل کی جانب بھاگ نکلا۔ ہیکڑ نے اُسے قابو میں لانے کی امکانی کوشش صرف کر ڈالی۔ مگر بے سود۔ جس بگھی میں اس کے بیوی بچے بیٹھے تھے۔ وہ بہت پیچھے رہ گئی۔ ہیکڑ کا گھوڑا اب یکایک دائیں جانب کو پھرا۔ ایک بڑھیا سڑک کو عبور کر رہی تھی۔ ہیکڑ چلایا "بچو بچو" مگر بڑھیا شاید بہری تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ بیچاری گھوڑے کی زد میں آ گئی اور دس فٹ کے فاصلہ پر جا پڑی۔ اسی وقت بے ہنگم آوازیں بلند ہوئیں "سوار کو پکڑ لو۔ جانے نہ دو"

ہیکڑ جو اپنے حواس کھو چکا تھا اور گھوڑے کی ایال کھینچ کھینچ کر زور زور سے چلا رہا تھا "مدد۔ مدد" یکایک ایک دھماکے کے ساتھ وہ گھوڑے کے سر سے نیچے زمین پر آ گرا۔ سپاہی اس کے پیچھے بھاگم بھاگ آ رہے تھے۔ انھوں نے جھٹ اُسے آغوش میں لے لیا۔ اسی وقت انسانوں کا ایک جم غفیر وہاں جمع ہو گیا۔ ایک بوڑھا جو مکلف لباس پہنے ہوئے تھا۔ بالخصوص کبیدہ خاطر نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا "اگر تم گھوڑے پر چڑھنا نہیں جانتے تھے تو گھر ہی بیٹھے رہتے۔ بازار میں لوگوں کو پامال کرنے کیوں نکل آئے تھے"

چار آدمی بڑھیا کو اٹھائے نمودار ہوئے۔ وہ بالکل مردہ نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اور اس کی ٹوپی ٹیڑھی ہو کر خاک آلودہ ہو چکی تھی۔

بوڑھا بولا "اس بڑھیا کو کسی ڈاکٹر کی دوکان پر لے جاؤ۔ ہم پولیس اسٹیشن کو چلتے ہیں" آدمیوں کا ایک خاصہ گروہ ہیکڑ کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ دو سپاہیوں نے اسے تھام رکھا تھا۔ اور ایک نے اس کے گھوڑے کو پکڑ رکھا تھا۔ بالکل اسی وقت ہیکڑ کے اہل و عیال کی بگھی نمودار ہوئی۔ اس کی بیوی نے جو اژدہام میں اپنے شوہر کو دیکھا بچوں کو بگھی ہی میں روتا چھوڑ کر جھٹ اس کی طرف بھاگی۔ ہیکڑ اُسے کہنے لگا "بات کچھ نہیں یہ بڑھیا میرے گھوڑے کے نیچے آ گئی۔ میں ابھی گھر واپس آ جاؤں گا"

پولیس اسٹیشن پر سوالات نہایت مختصر تھے۔ ہیکڑ نے اپنا نام اور ملازمت کی جگہ پولیس والوں کو بتا دی۔ ایک سپاہی بڑھیا کے متعلق خبر لایا اور کہنے لگا کہ اس کا نام مادام سائمن ہے۔ وہ پینسٹھ سال کی عمر رسیدہ عورت ہے اور تمام عمر خادمہ کا کام کرتی رہی ہے۔ وہ اب ہوش میں ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی طور پر وہ بڑی تکلیف میں ہے۔ جب ہیکڑ نے سنا کہ وہ زندہ ہے تو اس کی جان میں جان آئی اور اس نے

وعدہ کیا کہ وہ بڑھیا کی بیماری کے تمام اخراجات برداشت کریگا۔

ہیکڑ پولیس اسٹیشن سے فوراً اس ہسپتال میں پہنچا جہاں بڑھیا پہنچائی گئی تھی۔ دروازے پر انسانوں کا ایک جم غفیر کھڑا تھا۔ دو ڈاکٹر اس کی تشخیص میں مصروف تھے۔ کہنے لگے "اس کی ہڈیاں صحیح وسلامت ہیں۔ مگر ڈر ہے کہ کہیں اندرونی طور پر کوئی ضرب نہ پہنچی ہو"

ہیکڑ نے بڑھیا سے پوچھا "کیا تمھیں زیادہ تکلیف ہے؟"

"ہاں میں بڑی تکلیف میں ہوں"

"کس جگہ زیادہ تکلیف محسوس کر رہی ہو؟"

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندرونی اعضا آگ میں جل رہے ہیں"

ڈاکٹر آگے بڑھکر ہیکڑ سے مخاطب ہوا "تو کیا تم ہی اس حادثہ کا موجب ہو؟"

ہیکڑ نے کانپتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں"

"تو اس بڑھیا کو جلد 'صحت گھر' میں پہنچانا چاہئے۔ وہ چھ فرانک روزانہ پر اسے داخل کرلیں گے۔ کیا اس کا انتظام کردیا جائے؟"

ہیکڑ نے بڑے خلوص سے اس کا شکریہ ادا کیا اور اطمینان سے گھر کو چلا گیا۔ اس کی بیوی رو رہی تھی۔ اسے دلاسہ دیتے ہوئے اس نے کہا "چھوڑو بھی۔ اب تو اس کی حالت بہت بہتر ہے۔ میں نے اسے 'صحت گھر' میں بھجوادیا ہے۔ وہ تین روز میں صحتیاب ہوجائیگی"

دوسرے روز کام کاج کے بعد وہ مادام سائمن کی تیمارداری کو گیا۔ وہ مزے لے لے کر یخنی پی رہی تھی۔ ہیکڑ نے پوچھا "اب کیسی ہو مادام؟"

بڑھیا نے جواب دیا "خاک آرام نہیں میں تو زندہ درگور ہوں"

ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ بڑھیا تین روز تک "صحت گھر" ہی میں رہے۔ مبادا کہ کوئی پیچیدگی رونما ہوجائے۔ تین روز کے انتظار کے بعد ہیکڑ پھر بڑھیا کی تیمارداری کو گیا۔ اس کی جلد اب بالکل صاف ہوچکی تھی۔ اور اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مگر جونہی اس نے ہیکڑ کو آتے دیکھا۔ وہ چلانے لگی۔ "میں حرکت تک نہیں کرسکتی۔ ہائے اب تمام عمر میں اسی حالت میں رہوں گی"

یہ سنکر ہیکڑ لرزہ براندام ہوگیا۔ اس نے ڈاکٹر سے مریضہ کی حالت دریافت کی۔ ڈاکٹر کہنے لگا "میں بے حد پریشان ہوں۔ جب ہم اسے اٹھانے لگتے ہیں یا اس کی چارپائی کا رُخ بدلنے لگتے ہیں تو یہ جگر پاش چیخیں مارنے لگتی ہے اور ہمیں اس کے بیان پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ پھر بھی جب تک میں اسے چلتا نہ دیکھ لوں میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ واقعی لنگڑا کر چلتی ہے"

بڑھیا نے ملتفت انداز میں ڈاکٹر کے یہ الفاظ سنے۔ ایک ہفتہ نہیں دو ہفتے، حتیٰ کہ ایک مہینہ گذر گیا مگر مادام سائمن چارپائی چھوڑنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اسے بھوک خوب لگتی تھی۔ جسم پر گوشت بھی آگیا تھا۔ وہ دوسرے مریضوں سے خوب مسخری کرتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پچاس سال کی جانفشانی کے بعد اب وہ زندگی کے باقی ایام آرام سے چارپائی پر بسر کرنا چاہتی ہے۔

ہیکڑ ہر روز ہی اس کے پاس آتا۔ اور اسے اسی حالت میں چیختے چلاتے دیکھتی۔ جب وہ گھر واپس جاتا تو اس کی بیوی متفکر ہوکر پوچھتی "اب مادام ہی ہے؟" ہیکڑ مایوسانہ انداز میں جواب دیتا "بالکل اسی طرح۔ قطعاً کوئی فرق نہیں"

انھوں نے خادم کو بھی معزول کردیا کیونکہ بڑھیا کی بیماری کا خرچ آپڑنے کے باعث خادم کی تنخواہ کو وہ ایک مزید بوجھ محسوس کررہے تھے۔ انھوں نے حتی المقدور کفایت شعاری کی۔ ہیکڑ نے بڑھیا کی حالت پر غور کرنے کے لئے چار ڈاکٹروں کی خدمات طلب کیں۔ جب وہ تشخیص کر چکے تو ان میں سے ایک نے کہا "بڑھیا کو سہارا دے کر چلانا چاہئے" یہ سنکر وہ چلا اٹھی "بھلے مانسو! میں ہرگز نہیں چل سکتی"

انھوں نے مادام کو سہارا دے کر چند قدم گھسیٹا۔ مگر اس نے اپنے کو چھڑا کر فرش پر گرادیا اور اس زور سے چلائی کہ انھوں نے مجبور ہوکر اسے پھر چارپائی پر لٹادیا۔ ڈاکٹروں نے اپنی اپنی تشخیص محفوظ رکھی۔ مگر اسقدر بتادیا کہ "بڑھیا اب کام کاج کرنیکے قابل نہیں رہی"

جب ہیکڑ نے یہ اضطراب انگیز خبر اپنی بیوی کو سنائی تو سر پیٹ کر کہنے لگی "اسے یہیں لے آؤ۔ یہاں خرچ تو کم ہوگا"

ہیکڑ نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا "کیا اپنے گھر؟ اری بیگم تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟" اس کی بیوی بولی "تو پیارے ہم اور کر ہی کیا سکتے ہیں؟ کیا میرا قصور ہے؟"

(ترجمہ) طاہر قریشی / (فی شلے:

"کیوپڈ کی آنکھیں"

"فراموش کار — بیوفا — دغاباز — غرض پرست"!

ایسے ہی خدا جانے کتنے الفاظ ہیں کہ میرے حلقۂ تعارف میں میرے نام کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں۔

انسانی فطرت کی نام نہاد وسعتوں کو بے حجاب دیکھنے کا بہترین وقت وہ ہے جب اس کی کوئی محبوب ترین تمنا غیر متوقع دشواریوں سے متصادم ہو کر جان دے رہی ہو — یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان کے نام سے تہذیب و تمدن کے زریں حجابات میں چھپا ہوا جانور برآمد ہوتا ہے اور شیطان سے لے کر خدا تک کو اُن خود ساختہ حقیر الفاظ کا ہدف بنا ڈالتا ہے جن کا کوئی متعین مفہوم اس کی خود پرستی نے کبھی نہیں سمجھا۔

مجھ سے بھی دُنیا میں چند بلند ترین توقعات قائم کی گئی تھیں — میں انھیں کامیاب نہ کر سکا — اور اس لئے محبت و شوق کے لطیف آغوش کے بجائے آج میرے لئے صرف بیدردانہ ٹھوکریں باقی رہ گئی ہیں۔

اور میں انھیں کامیاب بھی کیسے کر سکتا تھا؟ — وہ کہتے تھے ہمیں تجھ سے محبت ہے — تو بھی ہم سے پیار کر — پیار کر اور پیار کرتا ہوا مر جا!

یہ چیز میری سمجھ میں نہ آتی تھی!!

مگر اسے تو وہ ہی کب سمجھتے تھے؟ — کتنے الفاظ ایسے ہیں جنکو انسان خود اختراع کرنے کے باوجود صحیح طور پر استعمال کرتا ہے؟ دنیا والے زبان کے مالک نہیں — زبان کے غلام ہیں۔ الفاظ کی تلاش وہ اس لئے نہیں کرتے کہ اپنے قلبی جذبات کی ترجمانی کریں بلکہ اس لئے کہ خود اپنے دل میں جذبات کی تخلیق کریں — تخلیق ہنگامی — پابند نمود اور یکسر فریب زریں! — جب وہ کہتے ہیں "تم کتنے حسین ہو" تو انھیں حسن کا کوئی صحیح وجدان نہیں ہوتا۔ مگر کہے جاتے ہیں۔ ہر صبح ہر شام — رات دن — اور پھر الفاظ کا یہ مسلسل اعادہ کہنے اور سننے والے دونوں کی ذہنیت میں شعور حسن کا ایک احساس باطل پیدا کر دیتا ہے۔ وہ خود بھی دیکھیں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ جسے وہ "محبت" کہتے ہیں اس کی زبان "گویائی" نہیں "خاموشی" ہے! حقیقی جذبات کا بلاخیز و بے پناہ طوفان الفاظ کی نازک مختصر آبگینوں میں کیسے آئے؟ اسی لئے تو چپ رہنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور دل کی ہر بات بجز بن بن کر آنکھوں سے نکلنے لگتی ہے۔

انھیں لوگوں میں عشرت بھی تھی۔ دُنیا کہتی وہ حسین ہے — حسن کی اس انتہا تک حسین جس کے بعد ملکوتی معصومیت شروع ہو جاتی ہے — سر سے پاؤں تک "ایک چھلکتا ہوا پیمانہ"! — مجھے صرف اُس کی آنکھیں یاد ہیں — جاذبیت و کشش کے دو برقی مرکز۔ اسرار کے دو ساگر — راز ہی راز!!

میں اس کے ساتھ بولتا تھا۔ ہنستا تھا۔ اور بولتے ہنستے اُسے برابر دیکھے جانا میرا انتہائے نشاط تھا۔ "چاندنی راتیں اور تاج محل" دُنیا کی واحد بہترین لذت ہے۔ لیکن عشرت کے بغیر وہاں میرا جی نہ لگتا تھا۔ لوگ کہتے تھے "یہ محبت" ہے — میں کہتا تھا تم بیوقوف ہو۔ محبت کے معنی ہیں خواہش تصرف — لیکن میں نے تو آج تک یہ نہیں سوچا کہ عشرت سے شادی کر لوں۔ وہ اگر میرے علاوہ کبھی کسی اور کو اپنے چند پُرکیف لمحات سے لذت گیر ہونے کا موقع دیدیتی ہے تو مجھے ذرا بھی برا نہیں معلوم ہوتا — پھر یہ محبت کیسی جس میں "نہ آہ نیم شبی اور نہ نالۂ سحری" — جہاں رشک نہ اشک!

وہ مسکرا کر پوچھتے تھے — "پھر تجھے چاندنی رات اور تاج محل کے ساتھ ساتھ عشرت کا تخیل کیوں ناگزیر محسوس ہوتا ہے؟ — اُسے دیکھتے ہی تیری آنکھوں میں کوئی چیز مسکراتی ہوئی کیوں نظر آتی ہے؟ — اُسے چھوتے ہی تیرے ہاتھوں کے سر انگشت کیوں سرد ہو جاتے ہیں؟ — اور لبوں پر ایک پُرمعنی لرزش کیوں طاری ہو جاتی ہے؟ تیری ہر کتاب پر عشرت کا نام پھر کس نے لکھا ہے۔ عشرت کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ہی تو اپنے دوستوں کو جاسوس کیوں تصور کرنے لگتا ہے"؟

میں کہتا تھا — "تمھارے اِن سب سوالات کا جواب صرف یہ ہے کہ وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ مجھے اُس سے محبت ہوتی تو مکمل ایک سال تک اس سے ہم کلام رہنے کے بعد کیا میرے جذبات مضمحل نہ ہو جاتے؟ جب ایک کمسن بچہ کسی حسین کھلونے کی طرف اپنا پُرشوق ہاتھ بڑھاتا ہے تو کیا اس کا یہ غیر شعوری اور غیر اختیاری جذبہ تمھاری "محبت" سے کچھ مختلف ہوتا ہے؟ تم بھی محبت کے بعد لذت تصرف کے لئے تڑپتے ہو اور وہ بھی — بچہ کھلونے کو اپنی گرفت میں لے کر اپنی جبلیات کو تسکین دینا چاہتا ہے اور تم بھی — پھر کون نہیں جانتا کہ چند لمحے کھیلنے کے بعد بچے کا تمام شوق

تھک جاتا ہے اور اپنے اسی محبوب کھلونے کو جس کی تحصیل کے لئے اس نے حسب مقدرت سارے ہنگامے بپا کئے تھے توڑ کر پھینک دیتا ہے ـــــ نہیں مجھے عشرت سے محبت ہرگز نہیں ورنہ میں اُس کو اپنا بنانے کے لئے ایک فطری خواہش محسوس کرتا۔ اور اگر اس کے ساتھ اس طرح ہم کلام ہونا سینما دیکھنا ـــ چہل قدمی کرنا وغیرہ خواہش تصرف کا ہی تقاضہ ہے تو یہ تصرف مجھے ایک سال سے حاصل رہا ہے اور اب اُسے آسودہ و بے کیف ہو جانا چاہیئے۔"

"تمہارا تصرف ابھی مکمل ہی کہاں ہوا ہے"! وہ کہتے تھے۔

میں اُن سے پوچھتا تھا ـــ "تم میری ذات کو مجھ سے زیادہ جاننے کے مدعی کیسے ہو سکتے ہو؟ مجھے یقین ہے کہ میری خواہشات کو ان معصوم لذتوں سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں ـــ پھولوں سے معمور کسی حسین باغ کی طرح میرے حلقہ تعارف میں صنف لطیف کے نہ معلوم کتنے غنچے نکہت ریز ہیں لیکن میری روحانی طلب کبھی پسندیدگی سے آگے قدم نہیں بڑھاتی عشرت کے ساتھ تم میرے جذبات کو محبت سے تعبیر کرتے ہو۔ لیکن ان باقی ماندہ "پھولوں" کے متعلق تم کیا کہو گے؟ تمہارے استدلال کے مطابق تو مجھے ان سب سے محبت ہونی چاہیئے"!

وہ قہقہہ لگاتے اور اپنا فرسودہ سوال پھر دوہرانے لگتے ـــ پھر ان سب کو چھوڑ کر تمہیں چاندنی رات اور تاج محل کے ساتھ ساتھ عشرت کا تصور ہی کیوں ناگزیر محسوس ہوتا ہے"!

"صرف اس لئے کہ گلاب سب پھولوں سے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے"!

وہ بہت کچھ کہتے تھے نہ جانے کیا کیا ـــ اور میں بھی سب کچھ کہتا تھا ـــ خدا معلوم کیا کچھ؟ ـــ مگر مجھے ان کی پرواہ بالکل نہ تھی ـــ میرا یقین تھا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اسے خود وہ بھی نہیں سمجھتے ـــ اُن کے خیالات اور جذبات الفاظ کے علم سے پیدا ہوتے ہیں اور میرے الفاظ میرے جذبات کے ہاتھوں تخلیق ہوتے ہیں اور اس لئے وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کی وجدانی حقیقت انھیں معلوم نہیں۔ لیکن میں جو کچھ کہتا ہوں وہ میرے جذبات کی پوری ترجمانی نہیں کرتا ـــ وہ فریب میں مبتلا ہیں اور میں مجبوریوں میں!

لیکن آخر میری زندگی کی ایک انقلاب خیز شام آ پہنچی!

ہم تاج محل کے گرد پھیلے ہوئے حسین پارک کے ایک دلربا گنج میں بیٹھے تھے ـــ میں اور عشرت! سورج غروب ہو رہا تھا اور آس پاس کی ویران کوٹھریوں میں سے نکل نکل کر سینکڑوں چمگادڑیں چپ چاپ کہیں اڑی جا رہی تھیں۔ میں کچھ دیر سے بالکل خاموش تھا اور پنچ پر عشرت ایک طرف کو قدرے جھکی ہوئی دھیمے دھیمے سُروں میں گا رہی تھی "جگ میں پریم پریم ہی بھرا ہے . . . . . ." وہ سمجھ رہی تھی کہ میں اس کی اس محبوب راگنی کو سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوں حالانکہ میرے خیالات چمگادڑوں کی خاموش پرواز کی معیت میں خدا جانے کہاں چلے جا رہے تھے۔ اس روز میں نہ جانے کیوں کچھ افسردہ تھا اور شام سے جبری مسرتوں کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

یکایک میں چونک پڑا ـــ عشرت پوچھ رہی تھی "آگے کیا ہے؟"

خدا جانے اس کا مطلب کیا تھا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں سمجھا نہیں!"

"خوب" اس نے بتدریج گرتی ہوئی آواز میں جواب دیا اور پھر چُپ ہو گئی ـــ وہ کچھ سوچ رہی تھی شاید یہ کہ مجھے اس طرح پشیمانی کی اذیت میں کب تک مبتلا رکھے!

اور پھر ـــ ایک دم اُس نے قہقہہ لگایا اور بولی "کیا سوچ رہے تھے تم؟"

میں نے بے اختیار کہہ دیا "کچھ نہیں"۔

"پھر خاموش کیوں تھے؟"

"نہیں تو"! میں نے صریح جھوٹ بولا لیکن پھر فوراً ہی تلافی کرتے ہوئے کہا "اس لئے کہ تم گا رہی تھیں"!

یاقوتی لبوں پر ایک باریک بجلی چمکی ـــ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ـــ "اچھا تو بتاؤ کہاں تک گایا تھا میں نے ـــ آگے کیا ہے؟"

میں انفعال میں ڈوبتا چلا گیا ـــ انفعال کی ایک انتہائی پُرکیف اذیت میں! ـــ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اس کی معیت کے پاکیزہ نشاط سے آسودہ ہو چکا ہوں ـــ میرا دل دھڑک رہا تھا ـــ جیسے کسی مصیبت کے قدموں کی چاپ سُنائی آ رہی ہو۔

"میں بتاؤں کیا سوچ رہے تھے تم؟" اس نے ایک گلاب کا پھول توڑتے ہوئے کہا۔

"تم؟ اچھا دیکھیں بتا سکتی ہو کہ نہیں!" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے دوسرا گلاب توڑا اور پھر دونوں پھولوں کو اپنی پیازی ساڑی کے پلو پر ایک دوسرے سے ملا کر رکھ دیا۔

"دیکھتے ہو؟"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ دو گلاب کے پھول۔ ایک دوسرے سے اس قدر قریب — ایک دوسرے کی پاکیزہ نکہت میں سرشار۔ یہ بھی وہی کچھ سوچ رہے ہیں۔ جو تم سوچ رہے تھے!"

"آخر کیا؟"

"یہی کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو" اس کی آواز میں سنجیدگی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے متانت کے ساتھ پوچھا "تم کس بنیاد پر ایسا کہتی ہو؟"

اس نے اسی طرح نظریں جھکائے ہوئے کہا "اس بنیاد پر کہ میں بھی تم سے —"

اس کی مرمریں کلائی پر میری گرفت یک لخت شدید ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی پُر قوت سیلاب میں میرے پاؤں زمین سے جُدا ہو گئے ہیں۔ جذبات کے اس محشر خیز ہیجان میں جس کی یاد کا احساس آج بھی میرے ہوش کی قوتوں کو لرزا دیتا ہے۔ خدا معلوم میں نے کیا کہا اور کیسے کہا۔

رفتہ رفتہ مجھے ہوش سا آ رہا تھا — ایک آندھی تھی کہ چند لمحات میں آئی اور چلی گئی۔ میری آنکھیں کھلیں — میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اور اُس نے — آہ اس نے ایک بے پناہ دلکشی کے ساتھ میرے گلے میں اپنی متناسب باہیں حمائل کر دیں۔

یہ دوسری ضرب تھی میرے جذبات کے آبگینے پر!

مگر اس دفعہ بے خبری کی بجائے ایک خوددارانہ شعور میری روح پر طاری ہو رہا تھا — میرے دل پر ایک طوفان کی سی خاموشی مستولی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے لب میرے اختیار سے بغاوت کر کے کچھ کہہ رہے ہیں جسے میں یا عشرت کوئی بھی نہیں سُن سکتا — مگر عشرت مسکرا رہی تھی اور اس مخصوص انداز میں جو فطرت صرف ایسے ہی موقع کیلئے عورت کو سکھاتی ہے۔ اُس کے تبسم میں ایک "آرزوئے خموش" مشکل تھی وہ آرزو جس کے اظہار کا یہ حسین طرز صرف ایک نوجوان شوخ دوشیزہ ہی جانتی ہے۔ اور جس کے سامنے دنیا کا کوئی مرد آج تک لرزہ براندام ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

"کیا سوچ رہے ہو مراد؟" اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

کون جانتا ہے کہ جب عورت اس طرح کچھ پوچھتی ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے! آگ پر اُبلتے ہوئے پانی میں جس طرح بے شمار حباب پیدا ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح جذبات کے ہیجان میں الفاظ بے اختیار لبوں پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ جو خود ناکارہ مہمل ہونے کے باوجود اپنے نیچے اُبلتے ہوئے طوفان کی ترجمانی کر دیتے ہیں۔

میں نے کہا "یہی سوچ رہا ہوں کہ دُنیا الٹی کیوں نہیں گھوم جاتی — وقت کی رفتار معکوس کیوں نہیں ہو جاتی!!"

"کس لئے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لئے کہ اپنے گلے میں تمہارے ملکوتی بازو حمائل دیکھنے کی اذیت کو بھول جانے کے لئے مجھے اُن گذرے ہوئے ایام کی ضرورت ہے جب مجھے اس کا خیال بھی نہ تھا"

"تو تمہیں اس چیز کا انتظار نہ تھا"

"مجھے اس کا علم بھی نہ تھا عشرت"

"لیکن تم اب اس کو اذیت سمجھ کر بھول جانا کیوں چاہتے ہو؟" اس نے اپنے بازو میری گردن سے جُدا کرتے ہوئے کہا۔

"اس واسطے کہ میں تمہیں بھول جانے پر مجبور نہ ہو جاؤں"

چاروں طرف تاریکی پھیل چکی تھی اور تاج محل پر شام کو آنیوالوں کا ہجوم ختم ہو رہا تھا۔

اس نے گلوگیر آواز میں پوچھا "میں سمجھی نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟"

دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے یہ الفاظ سُنے۔ اور اپنی ساری جسارتوں کو مجتمع کر کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا — "تم چاہتی ہو کہ میں تم سے محبت کروں اور تمہارا ہو جاؤں — تمہیں اپنا بناؤں؟" — میری آواز رک گئی میرے ہاتھوں ایک رقیق چنگاری سی گری — وہ رو رہی تھی۔

یہ خاموش جواب تھا میرے سوال کا!!

میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے سکوت کے ساتھ اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ اور گویائی کی پوری قوتیں صرف کر کے بولا "لیکن جانتی ہو عشرت اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"کیا؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"شادی!"

"پھر؟"

"پھر — آسودگی — اضمحلالِ جذبات — افسردگی... تلخی اور — جُدائی"

اس نے خاموشی کے ساتھ سر جھکا لیا۔ میں یہ جاننے کے لئے بیتاب تھا کہ وہ میرے خیالات کو کہاں تک سمجھ رہی ہے۔ لیکن وہ کسی

زبردست احساس میں کھوئی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"وقت کافی ہو چکا ہے" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر میرے ساتھ چل دی۔

وکٹوریہ پارک کی اس کشادہ روش پر جو غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ ہی ہزاروں قسم کے پھولوں کی مستانہ نکہت سے معمور ہو جاتی ہے۔ ہماری کار خراماں خراماں جا رہی تھی۔ میں نے نہایت دھیمے لہجے میں اس سے پوچھا۔ "کیا نتیجہ نکالا تم نے عشرت؟"

"صرف ایک نتیجہ — وہی جو ہر شخص تمہاری گفتگو سے اخذ کر سکتا ہے"

"کیا؟"

"یہی کہ تم معصوم و کمسن کیوپڈ کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کو کھول دینا چاہتے ہو"

تقلید پرستی کے آثار کس درجہ حاوی نظر آتے تھے۔ اس کے اس خیال پر!

"سنو عشرت" میں بولا "تمہاری دُنیا میں جس چیز کو اب تک محبت کہا گیا ہے اس کا دیوتا کیوپڈ نہیں — آرگس ہے — ہزار چشم آرگس!! اپنی روح کی ساری قوتوں کے ساتھ کسی کو اپنے شوق و محبت کا مرکز بنا کر دُنیا اُسے اپنی ملک بنانے کے لئے بیتاب ہوتی ہے۔ کیا یہ تصرف نہ آنے کے قرائن ہیں؟ محبت ایک خود غرضی ہے اور خود غرضی سے زیادہ تیز نظر چیز اور کونسی ہے کہ اُسے آرگس سے منسوب کرنے میں پس و پیش کیا جائے؟"

"ذرا تیز چلاؤ" اس نے کار کے مقیاس الرفتار پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ اس طولانی گفتگو سے اکتا گئی تھی۔ میں نے ایک لمحے کیلئے اس کی طرف دیکھا — حسین جبین پر دو معصوم بل نمایاں تھے۔

"تم ناراض ہو گئیں عشرت!" میں نے ایسے افسردہ مگر پُر خلوص لہجہ میں کہا کہ مجھے اپنی آواز اپنی محسوس نہ ہوتی تھی۔ شاید میں نے آج تک کوئی بات اس لہجہ میں نہ کہی تھی۔

مگر وہ خاموش تھی۔

اور اسی طرح وہ خاموش رہی — صبح کے بعد شام اور شام کے بعد صبح دبے پاؤں چپ چاپ میری زندگی کی وسعتوں سے گذرتی چلی گئیں۔ تفریح و نشاط کے مشاغل میں اب عشرت کے نغمے باقی نہ رہے۔

مگر اس کی عدم موجودگی میں اسی جیسے اور بہت سے "لطیف رباب" مترنم رہتے تھے۔ کچھ دنوں میں اُداس رہا لیکن آخر حال نے ماضی کو فراموش کر دیا۔ میرے فلکِ حیات کے آغوش میں اب اگر کوئی "چاند" نہ تھا تو کیا — تابناک ستاروں کا ایک ہجوم — کہکشائیں — یہ سب کچھ تو ابھی باقی تھا — میری رات ابھی بالکل ویران نہ تھی۔

مگر آخر یہ رات بالکل اندھیری ہو کر رہی — کالے کالے بادل ہیبت ناک بلاؤں کی طرح اُمنڈ آئے اور میری زندگی کے سارے ستاروں کو میرے "چاند" کی طرح کہیں چھپا دیا۔

ان سب نے بھی وہی کہا جو عشرت نے کہا تھا — اور پھر وہی کیا جو عشرت نے کیا تھا۔

میرے معبود! کیا ساری دنیا کا انداز فکر غلط ہے — یا کہیں ایسا تو نہیں کہ میں ہی دیوانہ ہوں — دیوانہ۔ فراموش کار۔ اور غرض پرست؟

دل میں خلش سی ہے — اُداسی! — لیکن سوگواریاں مجھ پر مستولی نہیں ہو سکیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ دامنِ حیات کو کسی نے ساری وسعتوں کو چھین لیا ہے — کوئی چیز جو ان تمام وسعتوں میں سمائی تھی کہیں چھن گئی ہے — کوئی چیز ادراک کے حدود سے وسیع تر — لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ چیز ایسی نہیں جسے زندگی کی اہم حقیقتوں میں ... میرے دل سے فراموش نہ کرا سکیں۔

دو ماہ ہوئے زبیدہ میری شریکِ حیات ہو چکی ہے — وہ ایک ۲۸ سالہ بیوہ عورت تھی — سماج کی تنگ نظری کی مجروح۔ شباب پرست دُنیا کی ٹھکرائی ہوئی۔ اب تک اس نے فاقوں کی جاں فرسا اذیت اور آنسوؤں کے درمیان شام کو صبح کیا تھا — اب وہ میری شریکِ زندگی ہے — مسرور — بے فکر!!

مجھے اس سے محبت نہیں — دُنیا کہتی ہے کہ ہے تو کہنے دو — ہاں مجھے اس سے محبت نہیں اور نہ وہ جذبہ بے اختیار جسے میں پسندیدگی کہتا تھا۔ "بقائے ذات" کے لئے میں کھاتا پیتا ہوں۔ کام کرتا ہوں اور سوتا ہوں۔ "بقائے جنس" کیلئے میں نے اس سے شادی کی!

مگر وہ کہتی ہے "مجھے تم سے محبت ہے"

بیوقوف کہیں کی!

مسعود جاوید

میرے جیون کا اندھیارا

بنگالی زبان[1] اور سماج کا ایک قصہ

یہ کہانی ہے ایک اندھیارے جیون کی، ایک پُرشور طوفانی زندگی کی جس میں لطف و انبساط کی گھڑیاں چند اور مصائب و آلام جیلت کے دوران گنت ہیں۔ میں ایک معزز بابو کے ہاں پیدا ہوئی تھی وہ ایک سرکاری ملازم تھے اور میں ان کی اکیلی لڑکی تھی۔ ناز و نعم میں پلی تھی کیونکہ میری ماتا کا انتقال میرے بچپن میں ہوگیا تھا اور میرے پتا کیلئے سوائے میرے کوئی اور چیز نہ تھی جس پر وہ اپنی توجہ، دولت اور جان نثار کر سکتے۔ میری تعلیم و تربیت اور ابتدائی زندگی کے عیش و آرام ایسے وسیع پیمانہ پر ہوئے کہ مجھ سے امیر لڑکیوں کو بھی میسر نہ آئے ہوں گے۔ میرا پورا نام سرتوبالا تھا۔ مگر پتاجی مجھے سترا کے رس بھرے نام سے پکارتے تھے۔

دن کے بعد دن گذرتے چلے گئے اور میں ہوشیار ہوگئی۔

ایک شام جبکہ سخت آندھی اور بارش کے طوفان نے تمام کائنات کو کپکپا رکھا تھا میرے پتاجی نڈھال گھر واپس آئے، ان کے چہرے پر مایوسی کے آثار پائے جاتے تھے اور میں اداس دیکھکر اُن کے قریب گئی دیکھا اُن کے چہرے پر آنکھوں سے ڈھلکے ہوئے چند موتی بکھرے ہوئے تھے۔ میں یہ ماجرا دیکھکر گھبرا گئی کیونکہ میرے پتاجی ہمیشہ خوش رہنے والے لوگوں میں سے تھے۔ کبھی ان کو اداس و متفکر نہ دیکھا تھا۔ ہر وقت ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے رہتے تھے۔ آج کی حالت دیکھکر میں گھبرا گئی اور پتاجی سے لپٹ کر پوچھا:۔

"پتاجی کیا ہوا۔ میرے اچھے پتاجی آپ پریشان کیوں ہیں؟"

پتاجی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ نادان لڑکی میرے ارادوں کی دنیا خاک میں مل گئی ہے۔ جتنے اونچے اونچے پہاڑ تیری زندگی اور آرام کے بنائے تھے سب ختم ہوگئے۔ میرا روپیہ جس بنک میں تھا، تجھے معلوم ہے، میری بیٹی، میری زندگی کا سہارا، ساری کٹھن زندگی کا جمع کیا ہوا، روپیہ سب اسی بنک میں تھا وہ فیل ہوگیا۔ پیاری سترا میں بالکل بھوکا ہوگیا ہوں۔ ایک کوڑی بھی پاس نہیں ہے۔ تجھے اچھے گھر بیاہنے اور بڑا جہیز دینے کی اور زندگی کے آراموں کے جو جو نقشے میں نے بنائے تھے وہ سب مٹ گئے۔

یہ کہکر پتاجی سسکیاں لینے لگے۔ میں نے انھیں دلاسا دیا۔ اور وہ طوفان کی رات جس میں میں نے اپنے باپ کی مالی تباہی کا حال دیکھا رو رو کر گذار دی۔

میرے پتاجی کی صحت اس صدمہ کی وجہ سے خراب رہنے لگی۔ میرے سمجھانے اور دلاسا دینے کے باوجود اُن کی کوئی ڈھارس نہ بندھی تھی۔ میں نے دیکھا وہ جلد بوڑھے ہونے شروع ہوگئے۔ میرے دل کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ آخر ایک دن وہ ہی ہوا جو ہونا تھا۔ شام کو دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے دو آدمی پتاجی کو گودی میں لئے ہوئے مکان پر لیکر آئے۔ معلوم ہوا کہ یکایک ان پر غشی کا دورہ پڑا اور وہ کرسی پر سے دھم سے گر پڑے۔ ڈاکٹر بلوایا گیا۔ مگر ڈاکٹر نے دیکھکر مایوسی کا اظہار کیا اور دو ہی دن میں وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔

موت اور تباہی انسان کے کس قدر قریب رہکر چکر لگاتی ہوئی گذر جاتی ہے اس کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔

اگرچہ ماما کے گھر مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی مگر مامی عجیب طبیعت کی عورت تھیں۔ ماما اگرچہ میری خاطر و مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے مگر پتاجی کے گھر کا سا آرام کہاں۔ اول تو ماما جی کا خود کنبہ بہت تھا۔ دوسرے آمدنی معمولی۔ چھ مہینے تک تو میری خاصی آؤ بھگت ہوتی رہی۔ مگر اس کے بعد شادی تک ماما کے گھر میں جو میری گت ہوئی خدا دشمن پر بھی وہ بپتا نہ ڈالے۔ مامی نے مجھے ایک فضول بوجھ سمجھا اور روز ماما سے لڑنے جھگڑنے لگیں جس کی کچھ نہ کچھ وجہ مجھ سے متعلق ہوتی تھی۔

میں اب چودہ سال کی ہوچکی تھی، اور شادی کا سوال قدرتی طور پر پیدا ہوگیا تھا۔ ماما جی کو بھی فکر تھی۔ مگر جب کوئی بھی لڑکا جہیز میں روپیہ لئے بغیر مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا میرے ماما خود ایک غریب آدمی تھے اور میری شادی میں جہیز دے ہی کیا سکتے

[1] کماری جوگمایا سی موزمدار کی زبانی سنکر لکھا گیا۔

تھے اور بہت پریشان تھے اور کئی بار گھر میں اس کا ذکر بھی ہو چکا تھا۔ آخر کار ایک لڑکا خوش قسمتی سے ایسا بھی مل گیا جو باوجود امیر ہونے کے مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہو گیا۔ وہ یہ چاہتا تھا خواہ لڑکی جہیز میں ایک پیسہ نہ لائے مگر خوب صورت اور خوب سیرت ہو میرے ماما اس رشتہ کے لئے بالکل تیار ہو گئے۔

ہوتے ہوتے مجھے بھی خبر ملی۔ جب میں نے یہ سُنا کہ کوئی لڑکا دُنیا میں ایسا بھی موجود ہے جو مجھ ابھاگی کو بغیر جہیز لئے اپنی بیوی بنانے کے لئے آمادہ ہے تو دل ہی دل میں میری آتما نے کہا۔

"ہے دیوتا جو میرے حال پر اتنا مہربان ہے تو کیسا ہوگا۔ میرے ساتھ کیسا سلوک کریگا۔ میں کس منہ سے اس بھگوان کی تعریف کروں جس نے میرے دیوتا کو ایسا نرم دل دیا ہے۔"

میری شادی اس لڑکے سے ہو گئی جو ایک زمیندار تھا خوشحال اور نئے خیالات کا طرفدار۔ نوجوان۔

جب سسرال میں میں نے قدم رکھا تو سب لوگ میری خوبصورتی کو سراہنے لگے۔ ساس نے کہا یہ بہو بہت خوش نصیب اور بھاگیہ ور ہے۔ جس نے دیکھا میری خوش نصیبی کی خوشخبری دی!

میرا شوہر مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اور اب میں نے محسوس کیا کہ مسرّت اور شادمانی بھی دُنیا میں کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس ہی زمانے میں بسنت آئی مُسرّت والی بسنت، کائنات کا ہر ایک ذرّہ جوش و نمو کی آبداری سے چمک رہا تھا۔ ہر چیز میں ایک طلسمی سرور و مسرّت کا سمندر لہریں لے رہا تھا۔ نیلا آسمان، ہرے بھرے درخت سوندھی زمین غرض ہر ایک چیز میں ایک نشاط اور سرمستی و جوش کا مد بھرا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میری زندگی کا سہارا یعنی میرا خاوند دل و جان سے مجھے چاہتا تھا۔ اور میں اپنے دیوتا کی پرستش کی سرخوشی میں مسرور اور بے حال تھی۔ اس لئے کائنات کی ہر چیز مستی کی انگڑائیاں لیتی مسرّت سے ناچتی تھی، اور شادمانی اور سکون و راحت کے گیت الاپتی دکھائی دیتی تھی۔

ہم ایک بہت بڑے مکان میں رہتے تھے جس میں کئی کرایہ دار آباد تھے جن میں اچھے لوگ بھی تھے اور بُرے لوگ بھی جیسا کہ دُنیا کا قاعدہ ہے کہ اچھے اور بُرے سب ہی قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اس لئے مجھے بھی ایک تجربہ ہوا جس کا بیان مجھے ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ایک دن شام کے وقت میں نہا کر اپنے مکان کی چھت پر بال کھول کر سُکھا رہی تھی اور آہستہ آہستہ ٹہل رہی تھی کہ یکایک میری نظر ایک لڑکے پر پڑی جو مجھے برابر کے مکان سے گھور رہا تھا۔ لڑکا بیماری کی وجہ سے زرد زرد اور بہت لاغر تھا۔ وہ اس قدر بدنظر تھا کہ برابر میری طرف گھورے جاتا تھا۔ میں اس کی یہ بات دیکھ کر نیچے اتر آئی لیکن اس کے بعد میں نے دیکھا کہ جب کبھی میں کوٹھے پر چڑھتی وہ زرد و بیمار لڑکا مجھے تاکنے کے لئے آموجود ہوتا۔ مجھے یہ بات ازحد ناگوار معلوم ہوئی۔ اور میں نے اوپر جانا چھوڑ دیا۔ مگر ایک اور طرف سے یورش ہوئی۔ ہماری بلڈنگ کے سامنے ایک طرف کا بازار تھا اس سڑک پر میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ میرے کمرے کی کھڑکی کی طرف تک رہے ہیں۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور اس بات کا کچھ خیال نہ کیا۔ دوسرے روز جونہی میں نے کھڑکی کھولی کچھ خوش فکرے لوگوں کا پھر مجمع دیکھا۔ یہ لوگ کھڑکی کی طرف برابر دیکھے جاتے تھے۔ اور مجھے اس بات سے ایسی آگ سی لگتی تھی کہ کیا بیان کروں۔ ایک بار تو ایک جوان اس دریچہ کی طرف مُنہ کئے اندھا دُھند گزر رہا تھا کہ ایک چھکڑے سے ٹکراتے ٹکراتے اور مرتے مرتے بچا۔ مگر لوگوں کی یہ بدحواسی کہ میرے کمرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھیں اس واقعہ سے بھی کم نہ ہوئی۔ میں نے حالات کی یہ رفتار دیکھ کر سب کھڑکیاں بند کر دیں اور دروازہ بند کر دیا۔ چار روز تک بند کمرے میں رہی۔

مگر ایک روز میرے دیوتا نے کہا "آخر کھڑکیاں کیوں بند کر دی ہیں کیا ہمیں مار ڈالنے کا خیال ہے۔ صاف ہوا آنے دو۔"

میں ان سے بھلا کیا کہتی۔ بہت جز بز ہو کر کھڑکیاں پھر کھول دیں۔

ہماری بلڈنگ کے ایک حصہ میں ایک بابو ونود نام کے رہا کرتے تھے۔ جو میرے پتی کے دُور کے رشتہ دار بھی ہوتے تھے۔ میری ساس اور گھر کے اور لوگ بلکہ بستی کے سب ہی آدمی، خاصکر عورتیں اس شخص کو نفرت کی نگاہ سے نہیں تو بُری نظر سے ضرور دیکھتی تھیں۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ونود ایک آوارہ مزاج، آوارہ خیال اور بیہودہ زندگی گذارنے والا آدمی تھا۔ مگر میرے پتی سے اس کا گہرا پریم تھا۔ ایک روز وہ انکے ہمراہ ہمارے گھر آیا۔ میں گھونگھٹ کر کے ایک طرف کو ہو بیٹھی۔ وہ بات چیت کر کے چلا گیا۔ دوسرے روز پھر آیا۔ پھر ایک بار آیا۔ اور اب اس کا آنا ایک معمول ہو گیا۔ اس نے میرے دھرم پتی سے یہ بھی شکایت کی کہ میں پردہ کیوں کرتی ہوں۔ بولا "دیکھو دادا میں تمہارے گھر آنا چھوڑ دوں گا اگر اب بھابی نے پردہ کیا۔"

میرے دھرم پتی نے مجھ سے نرمی سے کہا تم ونود سے پردہ ناحق کرتی ہو۔ پردہ اٹھا دو۔" ان کے کہنے سے میں نے گھونگھٹ نکالنا بند کر دیا۔ مگر میں نے یہ دیکھا کہ اس کی نظر بُری ہے۔ اور اس بُری بات سے مجھے سخت نفرت ہوئی بلکہ ایک جلن محسوس ہوئی کہ یہ شخص میرے گھر کیوں آتا ہے۔ میری ساس بھی اس بات کے سخت خلاف تھیں۔ کہ اس کا ہمارے گھر میں آنا جانا ہو کیونکہ سب اس کی بدنگاہی کو جانتے تھے۔

وہ آتا اور گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ میری طرف اس کی نظریں بار بار پڑتیں۔ کبھی کبھار وہ ہنسی دل لگی کی باتیں بھی کرتا جنھیں سنکر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ مگر منہ سے اُف نہ کر سکتی۔

جب اس کے آنے اور میرے پاس بیٹھنے اٹھنے کا چرچا بستی میں پھیلنے لگا تو مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ آج پتی دیو سے اس بارے میں ضرور بات کرونگی۔ وہ آئے تو میں نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ونود بابو کے یہاں آنے سے لوگ کیا کہتے ہیں۔ تمھیں خیال نہیں کہ وہ کیسا آدمی ہے۔

پتی دیو بولے "شرما میں جانتا ہوں وہ کیسا آدمی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سوسائٹی اس کی بابت بُری رائے رکھتی ہے۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب تک میری شرما میری ہے وہ پاکباز رہیگی۔ جب تک تو ندوش ہے مجھے سماج کے کہنے کی کوئی پرواہ نہیں!"

"مگر ایسا کیوں ہو؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہ اس لئے کہ ونود ایک بگڑا ہوا آدمی ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مخلص دوست میں ہی ہوں۔ اور اگر وہ زیادہ خراب ہونے سے بچ سکتا ہے تو مجھ سے میل جول رکھنے کے سہارے سے میں اس کو اور تباہ اور بدحال نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس لئے اس کو اپنے پریم کے پنجے میں داخل کر لیا ہے۔ اس کا دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ اور میں اس کی ڈھارس اور اس کے جیون کا آخری سہارا ہوں۔ تاکہ وہ زیادہ خرابیوں میں نہ پڑے۔ شرما تم سماج کے کہنے کی پرواہ نہ کرو۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔"

میں نہیں کہہ سکتی کہ ان لفظوں نے میرا دل کس قدر بڑھا دیا۔ میرا شوہر جب مجھ پر اپنے پورے بھروسہ کا اظہار کرتا ہے تو پھر مجھے کیا ڈر ہے۔ میں اس خیال سے مست رہنے لگی اور دنیا کے کہنے سننے سے بے خبر ہو گئی۔ ونود آتا جاتا رہا۔ مجھے اپنے پتی کی سیوا اور ان کے پریم بھرے سلوک سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ کسی اور بات کا دھیان کرتی۔

سال میں دو تین مرتبہ میرے پتی دیو کو دیہات میں جا کر روپیہ جمع کرنا ہوتا تھا کیونکہ وہ ایک زمیندار تھے ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ گاؤں چلے گئے اور یہ خیال تھا کہ دو ڈھائی مہینہ تک زمینداری میں رہیں گے۔

ایک رات جبکہ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ بارش شروع ہو گئی۔ میں چھت پر تھی اس لئے نیچے اتر آئی۔ کمرہ میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ میرے بستر پر کوئی شخص چھپا بیٹھا ہے۔ میں یہ سمجھی کہ سیف بکس میرے ہی کمرے میں ہے۔ ضرور کوئی چور آ گیا۔ کچھ ڈری مگر پھر ہمت کر کے آگے بڑھی۔ دیئے کی بتی تھوڑی اونچی کی مگر دیکھا کہ سیف بکس بالکل محفوظ ایک طرف رکھا ہے۔ میں اپنی حیرانی کو ابھی پوری طرح محسوس بھی نہ کرنے پائی تھی کہ یکایک کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں پہچان گئی۔ یہ ونود تھا۔ وہ جھپٹ کر میری طرف بڑھا۔

میں نے کہا "تم یہاں کیسے؟ تمھارے دادا تو یہاں نہیں ہیں۔ تم ابھی چلے جاؤ۔" ونود نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور بُری نیت سے میری طرف بڑھا۔ میں نے پھر چلا کر کہا کہ "تم میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ۔ ورنہ اور شور مچا کر سب گھر والوں کو بلا لونگی۔" مگر اس کی دیوانگی بڑھتی ہی گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ شخص مجھے بے عزت کرنا چاہتا ہے تو میں نے بھی مقابلہ کی ٹھانی، اتفاق سے میرا ہاتھ دیوار کے سہارے لٹکی ہوئی ایک کٹاری پر پڑا جو میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے اُسے اپنے قبضہ میں کر کے ونود کو دھمکایا۔ مگر وہ میرے جسم کے قریب آ گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ نہیں معلوم صرف اتنا یاد ہے کہ چکر آیا تھا۔ جب صبح کو میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میں خون میں تربتر ہوں کٹاری میرے پاس پڑی ہے اور ونود بھی خون میں لتھڑا ہوا مردہ میرے پاس پڑا ہے۔ میں حوالات بھیجدی گئی۔ سب لوگ مجھ سے نفرت کرتے تھے کیونکہ میں نے نرہتیا کی تھی۔ ساس وغیرہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں مگر مجھے یہ بھروسہ تھا کہ جب بھی پتی دیو کو خبر لگے گی وہ ضرور میری مدد کو دوڑینگے مگر میں سوا مہینہ تک حوالات میں رہی لیکن انھیں خبر نہیں ہوئی۔ عدالت میں میں نے صاف صاف بیان دیئے اور لائق جج نے مجھے معصوم و بےگناہ قرار دیکر بری کر دیا۔

اب میں اپنے گھر لوٹی تو دیکھا کہ گھر بند ہے۔ نوکرانی باہر بیٹھی ہے۔ اس سے پوچھا سب کہاں گئے؟ وہ بولی کہ میری ساس اپنے

پریم کہانی

۱

میری شادی کو تقریباً دو برس گذرے ہونگے کہ یک لخت ایک ناخوشگوار حادثہ نے میری پرمسرت زندگی کو دشوار بنا دیا۔ میرے شوہر کمار کے دماغ میں کچھ ایسا خلل رونما ہو گیا جو دیوانگی کے مترادف تھا۔ مجھے خود اس امر کا احساس ایک ماہ بعد ہوا جبکہ وہ ایک نیکدل و فیاض انسان کی بجائے ظالم، کنجوس اور وحشی بن چکا تھا۔ دراصل کمار میں یہ تبدیلی موٹر کے حادثہ کا نتیجہ تھی۔ اس کی موٹر یک لخت ایک درخت سے ٹکرائی تھی اور اس کے سر میں بظاہر ایک خفیف سی چوٹ آئی تھی۔ مگر وہ قریباً ایک گھنٹہ بیہوش رہا تھا۔ ابتدا میں تو میں نے یہ سمجھا کہ یہ شدت ضرب کا اثر ہے جو خود بخود رفع ہو جائیگا۔ چار پانچ ماہ گذرنے کے بعد جب کمار کا دماغی توازن بگڑتا گیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ فی الحقیقت اس کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ اس کی حرکات بسا اوقات نہایت وحشیانہ ہوتیں اور نہایت معمولی سی بات پر بھی وہ غضب آلودہ ہو کر مجھے کوسنے لگتا۔

میری طبیعت مضمحل اور میرا دل مضطرب رہنے لگا۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ اپنی نسبت کسی ڈاکٹر سے مشورہ لے۔ مگر وہ مجھے الٹا ڈانٹتے ہوئے مارنے پر آمادہ ہو جاتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی صحت بالکل درست ہے۔ مارے خوف کے میں خاموش ہو جاتی اور اس سے یہ کہنے کی جرأت نہ کرتی کہ اس کے دماغ میں خلل آ چکا ہے۔ حادثہ سے پیشتر کمار مجھ پر بہت مہربان تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جان سے عزیز رکھتے تھے اور ہمارے دن نہایت سکون و راحت سے گذر رہے تھے۔ بہترین لباس زیب تن کرنا سینما جانا۔ دوستوں اور عزیزوں کو دعوتیں دینا۔ ہر روز شام کو موٹر میں سیر و تفریح کے لئے نکلنا غرضیکہ تمام دنیاوی آسائشیں ہمیں میسر تھیں۔ کمار ایک انگریزی فرم میں مشینری بنانے پر انچارج تھا اور اس کی تنخواہ نہایت معقول تھی۔ اس کا دستور تھا کہ ہر ماہ تنخواہ لا کر میرے حوالے کر دیتا۔ اور میں حسب ضرورت اسے صرف کرتی۔ گویا ہم خوب ٹھاٹھ سے امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر اب کمار میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ وہ بہت بخیل بن گیا تھا۔ وہ مجھے ایک حقیر سی رقم گھر کے ضروری اخراجات کے لئے دیدیتا۔ اور بقیہ تمام روپیہ اپنے پاس رکھتا۔ بجلی کی روشنی اور آگ کی بجائے اب وہ پھر مجھے تیل کا لیمپ جلانے اور آئیل اسٹو سے کھانا پکانے پہ مجبور کرتا۔ حادثہ کے فوراً بعد اس نے موٹر فروخت کر دی اور ریڈیو سیٹ بھی اس بہانہ سے فروخت کر ڈالا کہ وہ اس کی آواز سے بیزار ہوتا ہے۔ بسا اوقات ہمارے کپڑے بوسیدہ رہتے۔ اور اگر میں اسے نیا لباس خریدنے کو کہتی تو غصہ سے آگ بگولا ہو کر مجھے کوسنے لگتا۔ اس کا خیال تھا کہ میں بہت فضول خرچ ہوں۔ حالانکہ میرا مطالبہ محض ضروریات زندگی کو پورا کرنا ہوتا۔ چند مرتبہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کمار سے علیحدگی اختیار کر لوں۔ مگر پھر مجھے اس کی حالت پر رحم آ جاتا۔ گذشتہ دو سال اس نے مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ لہٰذا میں اس کی سابقہ عنایات یاد کر کے اس ارادہ سے باز رہتی۔ میں نے سوچا کہ کچھ عرصہ بعد وہ خود بخود صحیح الدماغ ہو جائیگا۔

اب کمار کو ایک اور عادت بدلاحق ہو گئی تھی کہ وہ اکثر نصف شب کے وقت بیدار ہو کر مکان میں ادھر ادھر گھومنے لگتا چنانچہ ایک مرتبہ آدھی رات کو جب اچانک میری آنکھ کھلی تو میں اسے بستر پر نہ پاکر سخت متعجب ہوئی۔ ایک لمحہ بعد مجھے ملحقہ کمرہ سے جہاں چند پرانے صندوق اور ٹرنک وغیرہ رکھے ہوئے تھے کچھ آواز سنائی دی۔ میں فوراً دروازہ کے قریب پہنچی اور کواڑ ذرا سا کھول کر اندر جھانکنے لگی۔ کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا اور کمار ایک چھوٹا سا ٹرنک کھولے ہوئے کپڑوں کی تہ میں نہایت احتیاط سے کوئی چیز چھپا رہا تھا۔ میں حیران ہو کر واپس لوٹی اور چارپائی پر لیٹ کر صبح تک اس معاملہ پر غور کرتی رہی۔ کیا اس نے اپنا تمام سرمایہ اس ٹرنک میں چھپا رکھا تھا۔ مجھے خوب یاد تھا کہ جب سے اس کا دماغ خراب ہوا تھا اس نے ایک کوڑی کا حساب کسی بینک میں نہیں رکھا تھا۔ اور اسی ایک برس کے دوران میں نہ معلوم کہاں روپیہ جمع کرتا رہا تھا۔ اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے واقعہ مذکورہ کے چند روز بعد ایک دن دوپہر کے وقت جبکہ کمار گھر پر موجود نہیں تھا۔ میں نے

اس کے خفیہ خزانہ کا پتہ لگانا چاہا۔ میں اپنی چابیوں کا گچھا لیکر فوراً اس کمرے میں پہنچی اور خوش قسمتی سے کمار کا ٹرنک کھولنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ دیکھکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ کپڑوں کے درمیان ایک کثیر رقم نقدی اور نوٹوں کی صورت میں نہایت احتیاط سے رکھی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کیونکہ قریباً ایک ہزار روپیہ ٹرنک میں موجود تھا۔ فی الحقیقت اس نے اپنی تمام کمائی اس ٹرنک میں جمع کر رکھی تھی۔ میں نے چاہا کہ چند ایک نوٹ چرالوں مگر کمار کے غصہ و ظلم کے خیال سے لرز گئی۔ اگر اُسے پتہ لگ گیا تو میرا پٹنا یقینی تھا کیونکہ اس سے پیشتر تین چار مرتبہ وہ مجھے زد و کوب کر چکا تھا۔ لہٰذا میں بدستور ٹرنک مقفل کر کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

دن گذرتے گئے۔ مگر کمار کے خفیہ خزانے کا خیال ہر وقت میرے دل و دماغ پر مستولی رہتا۔ مجھے اپنی خستہ حالی پر رونا آتا تھا کیونکہ اب میں پہلی سی امیرانہ زندگی بسر نہیں کر سکتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہی پہلی سی فارغ البالی کے ایام بسر کروں۔ مگر اتنا روپیہ پاس ہونیکے باوجود کمار مجھے ایک پائی تک دینے کا روادار نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ ایک مرتبہ پھر اُسے ڈاکٹر سے مشورہ لینے پر مجبور کروں۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ اگر اس کے علاج کے لئے آپریشن یا ایکس رے کی بھی ضرورت پڑے تو بھی وہ بآسانی اخراجات برداشت کرے گا۔ چنانچہ ایک دن ڈرتے ڈرتے نہایت الفت آمیز لہجہ میں اس سے کہا: "کمار! تم جانتے ہو کہ میں تمھیں کتنا چاہتی ہوں۔ ہماری شادی کے ابتدائی دو سال کتنی خوشی و مسرت میں بسر ہوتے تھے۔ تم نے بھول کر بھی کبھی کوئی بات پردۂ اخفا میں نہیں رکھی تھی مگر اب میں دیکھتی ہوں کہ تم ہمیشہ مجھ سے متنفر رہتے ہو۔ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ تمھارے دماغ میں ضرور کچھ خلل واقع ہو چکا ہے۔ میں تم سے منت کرتی ہوں کہ میری خاطر تم فقط ایک مرتبہ کسی ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کراؤ۔ یقیناً تمھاری حالت اچھی ہو جائیگی۔"

جونہی میرے منہ سے اس نے یہ الفاظ سُنے وہ غصہ سے آگ بگولا ہو گیا۔ مجھے بُرا بھلا کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبوچ کر اس زور سے دبائی کہ میری آنکھیں اُبلنے لگیں۔ نہایت غضب آلودہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا: "خوب! تم سمجھتی ہو کہ مجھے یوں اپنے راستہ سے ہٹا کر میری تمام عمر کی کمائی پر اپنا ہاتھ صاف کر دوگی۔"

قریباً ایک ہفتہ تک میری گردن میں درد محسوس ہوتا رہا۔ اب میں کمار سے انتہائی خائف رہنے لگی۔ کیونکہ میرا شوہر دیوانہ ہو چکا تھا اور میری زندگی اس گھر میں نہایت مخدوش تھی۔ اب میں کمار سے علیحدگی اختیار کرنے کی تجاویز سوچتی رہی۔ میں ابھی خوبصورت و جوان تھی اور محنت میں اپنی جوانی برباد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں بھی مضبوط تھے۔ اور میں محنت کر کے اپنا پیٹ پال سکتی تھی۔

— :(۲): —

اس واقعہ کے چند روز بعد ایک شام کو کمار اپنے ہمراہ پریم نامی ایک خوب صورت نوجوان کو گھر لایا جو کئی سال سے اس کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ وہ پہلے بھی چند مرتبہ ہمارے مکان پر آیا تھا جبکہ کمار کی حالت درست تھی۔ کمار نے آتے ہی مجھ سے کہا "کملا! آج سے پریم ہمارے ہاں رہا کریگا۔ کیونکہ جس جگہ وہ رہائش رکھتا ہے وہ اس کے لئے موزوں نہیں ہے۔ میں نے اسے وہ باغ والا کمرہ کرایہ پر دینے کا وعدہ کیا ہے جو ہمارے مکان کے عقب میں واقع ہے۔" روپیہ حاصل کرنے کی کتنی معقول تجویز ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہتے ہوئے نہایت خندہ پیشانی سے پریم کا استقبال کیا۔ پریم ایک دراز قد خوش وضع اور خوب صورت نوجوان تھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں اور اس کے گھنگریالے بال نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ کمار کا مزاج نہایت ضدی اور چڑچڑا تھا۔ مگر پریم کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ میں دل ہی دل میں اس کی مہماں نوازی سے متفکر ہو رہی تھی۔ کیونکہ اپنی مفلسانہ حالت کے مدنظر میں اس کی کچھ بھی خدمت نہ کر سکتی تھی۔ خیر! جو کچھ روکھی سوکھی روٹی میسر ہو سکی میں نے پریم سے معذرت کرتے ہوئے دسترخوان پر لا رکھی اور جب ہم کھانا ختم کر چکے تو کمار ہمیں باتیں کرنے کے لئے چھوڑ کر کسی کام کے لئے باہر نکل گیا۔

"کملا!" پریم نے مجھ سے کہا "اگرچہ میں کمار کے کہنے پر یہاں آیا ہوں۔ مگر دراصل میں خود تمھارے ساتھ چند باتیں کرنی چاہتا تھا۔ میں دیکھتا ہوں کہ کچھ عرصہ سے کمار کی حالت بدل چکی ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"اس کا دماغ صحیح نہیں رہا۔" میں نے متانت سے جواب دیا۔ "دن بدن اس کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش بھی کی ہے۔ مگر وہ ڈاکٹر سے مشورہ لینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔"

"تمھارے خیال میں یہ اس موٹر کے حادثہ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے؟" پریم نے استفسار کیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتے ہوئے مجھے پُر اشتیاق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہمدردی سے میں دل ہی دل میں اپنی حالت پر افسوس کر رہی تھی۔

"میں اس سے بہت ڈرتی ہوں پریم!" میں نے بالآخر جواب دیا۔ میری آنکھوں میں آنسو اتر آئے اور ندامت سے میں نے منہ پھیر لیا۔

"میرا خود یہی خیال تھا کہ کمار کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔" پریم نے کہا "کام پر بھی اس کی حرکات تعجب خیز ہوتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اب وہ پہلا سا خوش خلق انسان نہیں رہا۔ وہ کہتا تھا کہ تم اسے تباہ کرنا چاہتی ہو۔ اور وہ تمھیں زد و کوب بھی کر چکا ہے۔ اگرچہ میں اس معاملہ میں تمھاری خاطر خواہ امداد نہیں کر سکتا تاہم میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالت میں تمھاری حفاظت کے لئے میرا یہاں ٹھیرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ کمار کی وحشت سے یہ بعید نہیں کہ وہ غصہ میں آ کر کسی دن تمھیں جان سے مار ڈالے۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" میں نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا۔ "پریم! اگر تم میرے پاس رہنا پسند کرو تو میں تمھاری بے حد ممنون ہوں گی۔"

اگلے دن باغ والا کمرہ پریم کے لئے خالی کر دیا گیا اور وہ اپنا سامان وغیرہ لے آیا۔ اب پھر دن کچھ اطمینان سے گزرنے لگے۔ کمار نے بھی مجھے خرچ کے لئے کچھ زیادہ رقم دینی شروع کر دی۔ اور میں دو وقت کا کھانا بہترین و لذیذ پکاتی۔ میں خود کو نئے سرے سے خوبصورت جوان محسوس کر رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہی سابقہ ٹھاٹھ کی امیرانہ زندگی گزاروں۔ مگر میں مجبور تھی۔ پریم بظاہر میری مجبوریوں کو سمجھتا تھا مگر مجھ سے اس کے متعلق کچھ نہ کہتا۔

چند ہفتے آرام سے گذرے ہوں گے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کوئی نصف شب کا وقت ہوگا۔ میری طبیعت قدرے مضمحل تھی۔ اور نیند نہ آنے کے باعث میں اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ کمار میرے قریب ہی اپنی چارپائی پر محو خواب تھا۔ یکایک ایک حرکت غیر ارادی سے میرا ہاتھ کمار کے تکیہ کے نیچے جا لگا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی کیونکہ میرا ہاتھ کسی تیز دھار آلہ سے مس ہوا تھا۔ میں نے اسے نہایت احتیاط سے تکیہ کے نیچے سے نکالا۔ اور کھڑکی کے قریب جا کر چاند کی روشنی میں بہ نظر غور دیکھا۔ یہ ایک لمبا سا خنجر تھا چاقو جو چند روز قبل باورچی خانہ سے کھو گیا تھا۔ خوف کے مارے میرا دل سینے کے اندر شدت سے دھڑکنے لگا۔ کیا اس چاقو سے کمار مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ یا اپنی حفاظت کے لئے پاس رکھ کر سوتا تھا۔ میں نے چاقو بدستور اپنی جگہ رکھ دیا اور خوف زدہ ہو کر دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ تمام رات میں کرسی پر بیٹھی ہوئی خوف سے بید کی طرح کانپتی رہی۔ صبح کے قریب ذرا آنکھ لگی تو کمار نے مجھے آ کر جگایا۔

"تم یہاں کس لئے بیٹھی ہو؟" اس نے غصے سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا۔ مگر پریم کی موجودگی کا خیال آتے ہی میری ہمت بندھی اور میں نے چاقو کا واقعہ اسے صاف صاف بتا دیا۔

"کمار! اس چاقو کو اپنے پاس رکھ کر مت سویا کرو مجھے اس سے خوف محسوس ہوتا ہے۔" میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"سنو!" کمار نے جواب دیا۔ "اگر تم نصف شب کو اٹھ کر میرے سامان کا جائزہ لیا کرو گی تو میں یہی چاقو تمھاری گردن میں پیوست کر دوں گا۔" وہ انتہائی غیظ میں تھا اور اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

وہ گھڑی میں تمام عمر نہ بھولوں گی۔ جو مکان کسی وقت میرے لئے گہوارۂ عیش و مسرت تھا اب مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ میں سہمی ہوئی کرسی پر بیٹھی تھی اور کمار میری جانب رخ کئے کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ سورج کی اولین شعاعیں اس کے سر کو سنہری بنا رہی تھیں مگر اس کی غضب ناک نگاہیں مجھے قتل کا پیام دے رہی تھیں۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی کمار ہے جو مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اور جسے میں اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں سے پیار کرتی تھی۔

(۳)

اس دن کمار بغیر ناشتہ کئے سویرے ہی کام پر چلا گیا۔ ناشتہ کی میز پر میں نے رات کا واقعہ من و عن پریم سے بیان کیا۔ اس نے مجھ کو رائے دی کہ کمار کو زبردستی ہسپتال بھیج کر اس کے دماغ کا معائنہ کرانا چاہئے۔ اگر وہ دیوانہ ثابت ہو تو اس سے علیحدگی نہایت ضروری تھی کیونکہ اس کے پاس رہنے سے میری زندگی مخدوش تھی اور جان بوجھ کر ہلاکت میں پڑنا سخت نادانی تھی۔

"فرض کرو کہ ڈاکٹر اسے دیوانہ قرار نہ دیں تو پھر گھر آتے ہی وہ میرا خاتمہ کر دے گا۔" میں نے گھبرا کر پریم سے پوچھا۔

"بھلا! میرے یہاں ہوتے ہوئے تم اس بات کی فکر نہ کرو۔" پریم نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ اس وقت کیوں مجھ پر نیم بے ہوشی کی حالت طاری ہونے لگی۔ شاید یہ شب بیداری کا نتیجہ تھا یا ان نا ملائم احساسات کا اثر تھا جو کمار کے سفاکانہ طرز سلوک نے میرے دل و دماغ میں پیدا کر دیئے تھے۔ میرا سر چکرانے لگا۔ کمرے کا تمام ساز و سامان مجھے ناچتا دکھائی دیا اور میں میز پر کہنیاں ٹیک کر جھک گئی۔ عین اسی وقت میں نے پریم کے بازو اپنی کمر میں حائل ہوتے محسوس کئے۔ چند لمحات بعد میرے حواس بجا ہوئے تو پریم بدستور میری کمر میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے سچے دل سے پیار کرتا ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ آج کیوں خود بخود میرا دل پریم کی طرف کھنچا جا تا تھا۔ میں غیر ارادی طور پر پریم کی آغوش تمنا میں گر رہی تھی اور اس کے بازو میری کمر کے گرد سخت ہو رہے تھے۔

"جان سے عزیز کملا!" پریم نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ اور بے اختیار ہو کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اس کے شیریں لب خود بخود میرے لبوں سے پیوست ہو گئے یکلخت وہ مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ وہ ندامت سے لرز رہا تھا۔

"کملا! مجھے معاف کر دو!" اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا "میں قسم کھاتا ہوں کہ ایسی حرکت کبھی نہ کروں گا۔ پیاری کملا! میں کیسے کہوں کہ مجھے تم سے الفت ہے۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ کمار کی دوستی کو بالائے طاق رکھکر اس کی بیوی سے میں نے معاشقہ شروع کر دیا۔ آہ! میں کتنا بزدل ہوں!"

"نہیں پریم! قصور ہم دونوں کا ہے" میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ آہ میرا دل بہ عجلت دھڑک رہا تھا "بہتر یہی ہے کہ اب تم ہمارے یہاں سے چلے جاؤ"

"نہیں کملا! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا!" پریم نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا "میں تمھیں کمار کے پاس تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمھیں ہلاک نہ کر دے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اب کبھی تمھارے قریب آنے کی جرأت نہ کروں گا"

پریم سچ مچ اپنے قول کا پکا نکلا۔ اگرچہ میں اُسے اپنے دل سے دور کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ تاہم اس کا خیال آتے ہی میرے جسم میں سر سے پاؤں تک خون کی ہر دوڑ اٹھتی اور میں اس کے اولین بوسۂ محبت کی چاشنی اپنے ہونٹوں پر محسوس کرتی۔ کمار کے طرز عمل میں مطلق تبدیلی نہ ہوئی۔ وہ بدستور چاقو اپنے پاس رکھکر سوتا اور مجھے جان کے خوف سے تمام رات دوسرے کمرے میں صوفے پر سونا پڑتا۔

---※(۴)※---

چند روز بعد میں نے ڈاکٹر سے ملاقات کی اور اسے کمار کے طرز عمل کی نسبت مفصل حالات بتائے۔ میری التجا پر وہ ایک دوست کے ہمراہ کمار کو دیکھنے کے لئے مکان پر آیا۔ کمار کا غصہ اور تلخ کلامی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ جو کوئی بھی اس کے غصہ کی زد میں آتا وہ اسے جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دیتا۔ ڈاکٹر نے اس کی بدحواسی اور بہکی بہکی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ قطعی طور پر دیوانہ ہو چکا ہے۔ دو ہفتے بعد جبر اور بڑی مشکل سے کمار کو علاج کے لئے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ مجھے ڈاکٹروں نے بتایا کہ میں نے اپنے شوہر کے علاج میں سخت کوتاہی سے کام لیا تھا۔ کیونکہ اس کے سر میں چوٹ آنے کے باعث اس کے دماغ پر غیر ضروری دباؤ پڑ چکا تھا اور یہ میری انتہائی خوش قسمتی تھی کہ جو اس کے ہاتھوں سے زندہ بچ رہی۔ دراصل اس کی وحشت نے اسے اتنا سرکش بنا دیا تھا کہ وہ قطعی طور پر مردم کشی پر آمادہ ہو چکا تھا۔ اگرچہ آپریشن کا ہونا نہایت ضروری معلوم ہوتا تھا۔ تاہم ڈاکٹر اس کے خلاف تھے کیونکہ اس صورت میں بھی کامیابی کی ایک فیصدی امید تھی۔

گھر آتے ہی میں نے محسوس کیا کہ ایک بہت بڑا وزن میرے کاندھوں سے اتر گیا ہے۔ کمار کو ہسپتال میں داخل کرانے میں پریم نے میری کافی مدد کی اور دوسرے دن وہ خود بھی اپنا سامان وغیرہ باندھکر کسی دوسری جگہ کرایہ پر جا رہا۔ اب میں نے کمار کے خزانہ کو صرف کرنا شروع کیا۔ میں نے چند ضروری اشیاء خریدیں۔ اپنے لئے کئی عمدہ لباس سلوائے۔ اور مکان کو از سر نو رنگ کرا کر تمام کمرے بیش قیمت سامان سے آراستہ کئے۔ میں نے اپنا پیانو درست کرایا اور ریڈیو بھی نیا خرید لیا۔ الغرض میں نہایت خوش تھی کہ ایک مرتبہ پھر زندگی کی کھوئی ہوئی مسرتوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ کمار کے علاج کے لئے میں نے ایک خاصی رقم ہسپتال میں جمع کرا دی۔

پریم اب بہت کم میرے یہاں آتا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ پھر میرے پاس چلا آئے کیونکہ میں اسے دل سے پیار کرتی تھی۔ اور مقتضائے شباب بھی یہی تھا کہ میں زیادہ عرصہ تک تنہا نہ رہوں۔ جب میں اپنا نیا لباس زیب تن کر کے پیانو بجانے میں مصروف ہوتی تو میرا دل بے اختیار پریم کو اپنے پہلو میں دیکھنا چاہتا۔ کئی مرتبہ میں نے خیال کیا کہ خود پریم کے مکان پر جاؤں مگر میری ہمت نہ پڑتی تھی اور میں خاموش ہو کر رہ جاتی۔ ایک رات میں نے پریم کو کسی ضروری کام کے بہانہ

بلا بھیجا۔ میں ایک بیش قیمت ساڑھی میں ملبوس بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب وہ آیا تو میں دروازہ تک اس کو لینے گئی۔ ......

... میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے سے رنج و خوشی کے ملے جلے آثار ہویدا تھے۔ پہلے تو کچھ دیر ہم ریڈیو سنتے رہے۔ پھر کمار کی نسبت بات چیت کرنے لگے جو اب ہمارے نزدیک عرصہ سے مر چکا تھا۔ پریم نے اس زمانہ کے واقعات سنائے جب اس کی کمار سے انتہائی دوستی تھی اور جب کمار شریف الطبع و نیکدل انسان تصور کیا جاتا تھا۔ میں نے بھی اپنی خوشی کے بھولے ہوئے ایام کا تذکرہ کیا۔ جب کمار کو مجھ سے انتہائی الفت تھی اور ہم نہایت راحت و اطمینان سے دن گذارتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمار کی روح ہمارے درمیان کھڑی ہوئی ہماری ہمدردی کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

سحر کا پریم رخصت ہونے کے لئے اٹھا۔ میں اسے دروازہ تک چھوڑنے آئی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اسے جانے نہ دوں۔ اور بے اختیار اس سے اپنی محبت کا اظہار کردوں۔ یکلخت وہ دروازے پر آکر رک گیا۔ اگرچہ اس کے لب بند تھے تاہم اس کی آنکھیں اس کے دل کا راز کہہ رہی تھیں۔ اچانک ایک نامعلوم جذبہ سے متاثر ہو کر میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے محبت بھری آواز میں کہا۔ "پریم مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ میں یہاں تنہا نہیں رہ سکتی"۔ میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس نے قدرے تامل کیا۔ لیکن فوراً ہی مجھے اپنی آغوش محبت میں لیکر کہنے لگا "کملا پیاری! میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس والہانہ شیفتگی کا کیسے اظہار کروں جس نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ مجھے تمہاری خوشی جان سے عزیز ہے اور میں خود بھی نہیں چاہتا کہ تمہیں ایک لمحہ کے لئے جدا کروں۔ میں کل ہی یہاں چلا آؤں گا۔"

اب پریم اور میں نہایت خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگے۔ میں نے خدمت کے لئے ایک ماما مقرر کرلی۔ وہی مکان جو میرے لئے سوہانِ روح بنا ہوا تھا اب فردوس بریں سے کم نہ تھا۔ ہماری زندگی قابل رشک تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ ہماری یہ مسرت ابدی صورت اختیار کر چکی ہے۔

(۵)

دن نہایت ہنسی خوشی گذرتے گئے۔ کمار کا خیال قریباً قریباً میرے دل سے محو ہو چکا تھا کہ یکلخت بجلی کی سرعت کے ساتھ مجھے ہسپتال سے ایک چٹھی موصول ہوئی جس میں کمار کے دماغ کا اپریشن کرنے کیلئے میری اجازت طلب کی گئی تھی۔ انگلستان سے ایک ماہر ڈاکٹر مارٹن نامی جو دماغی امراض کا معالج خصوصی تھا چند روز کے لئے ہسپتال میں آیا ہوا تھا۔ کمار کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے یقین دلایا تھا کہ اپریشن ضرور کامیاب ہوگا۔ اس خبر کو سنتے ہی پریم اور میں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ میں حیران تھی کہ ایسی زبردست ذمہ داری کیسے برداشت کروں۔ اگر اپریشن سے کمار کی موت واقع ہوگئی تو قصور میرا ہوگا۔ اور اگر وہ صحت یاب ہوگیا تو میرا اور پریم کا ساتھ قطعی ناممکن تھا۔ پریم کے کہنے پر میں نے اپریشن کی اجازت بھیجدی اور ڈاکٹر سے درخواست کی کہ وہ نتیجہ سے بذریعہ تار مجھے مطلع کرے۔ اگلے دن صبح کے وقت کمار کا اپریشن کیا گیا۔ دوپہر کے بعد میں اور پریم بیٹھے ہوئے گفتگو میں مصروف تھے کہ اچانک ہسپتال سے مجھے حسب ذیل تار موصول ہوا:۔

"اپریشن کی حیرت انگیز کامیابی پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں"۔ ڈاکٹر مارٹن

تار کا مضمون پڑھکر جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی میں اسے بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں ایک دم بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ پریم میرے قریب بیٹھا ہوا میرے ہاتھ پاؤں دبا رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مہر سکوت ثبت تھی اور چہرے سے پریشانی کے آثار ہویدا تھے۔ میں سخت مضطرب تھی۔ تار کے مضمون نے میرے دل و دماغ کو پریشان کر رکھا تھا۔ اپریشن کی کامیابی اس امر کی دلیل تھی کہ کمار اب وہ بخیل و ظالم نہیں رہا ہوگا جس نے تین برس تک میری زندگی کو دوبھر بنا رکھا تھا۔ بلکہ دوبارہ خوش خلق و پیارا شوہر بن گیا ہوگا اور یقیناً حقارت آمیز لہجہ کی بجائے ہونٹوں پر پہلا سا تبسم رقصاں ہوگا۔ جس کی ایک جھلک مجھے بیخود بنا دیا کرتی تھی۔ میں اس بات سے ڈرتی تھی کہ جب وہ میری محبت کا خیال دل میں لئے گھر واپس آئے گا تو میری اور پریم کی الفت کا نقشہ دیکھ کر کیا خیال کرے گا۔

اس تار نے مجھ سے زیادہ پریم پر اثر کیا۔ متواتر کئی روز تک اس نے کچھ نہ کھایا۔ اور نہ ہی مجھ سے کچھ بات چیت کی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ کس سوچ میں ہے۔ میرا خیال تھا کہ کمار کو پورے طور پر صحت یاب ہونے کے لئے ابھی چند ماہ ہسپتال ٹھہرنا پڑے گا۔ لیکن ایک ہفتہ بعد جب دروازہ پر دستک سن کر میں باہر گئی تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ کمار دروازے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اگرچہ وہ پہلے کی نسبت اب

قدرے نحیف و لاغر تھا تاہم اس کی آنکھوں میں وہی پہلی سی محبت کی چمک تھی جو ہمارے ابتدائی زمانہ مسرت میں مجھے بیخود بنا دیا کرتی۔ میں کافی دیر مبہوت رہنے کے بعد بے تکلف پکار اٹھی۔ "کمار! میرے پیارے کمار یقیناً اب تم بالکل تندرست ہو گئے؟"

"ہاں!" اس نے مجھے حاسدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ قدرے تاسف آمیز تھا۔ شاید وہ اپنے پراگندہ خیالات کو یکجا کرنے میں تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے۔" کمار نے کہا۔ "جیسے میرے دماغ سے کوئی تاریک پردہ اٹھ گیا ہے۔"

میرے اشارے پر وہ مکان میں داخل ہوا۔ اور آتے ہی کھڑکی کے قریب اپنی دیرینہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے کے ساز و سامان کا جائزہ لیتے ہوئے وہ بولا۔ "تم نے مکان کی آرائش میں نمایاں تبدیلی کی ہے۔ خوب! ریڈیو بھی نیا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس پرانے ریڈیو کا کیا ہوا؟"

"تم نے خود اسے عرصہ ہوا فروخت کر دیا تھا۔ کیا تم بھول گئے ہو کمار؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔" اس نے ماتھے پر شکن ڈالا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ "مگر موٹر کے حادثہ سے قبل کے واقعات جنھیں کئی سال ہو چکے ہیں میں زیادہ آسانی سے سمجھ سکتا ہوں۔ کملا! میرا خیال ہے کہ میں تمھیں کافی عرصہ تک ایذا پہنچاتا رہا؟"

"کمار!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ تمھارا قصور نہیں تھا!" میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں آگے نہ کہہ سکی۔

"پرسوں پریم مجھ سے ملنے ہسپتال آیا تھا!" کمار نے بے تکلف سنجیدہ ہو کر کہا۔

"تم سے ملنے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں!" وہ کہتا تھا تم دونوں ایک دوسرے کو دل سے چاہتے ہو۔"

"کمار! میں سخت نادم ہوں کہ میں نے تم سے بیوفائی کی" میں نے بڑی مشکل سے رک رک کر یہ الفاظ ادا کئے۔

"اس بات کی ضرورت نہیں!" اس نے فوراً کہا۔ "پریم نہایت خوب صورت و سنگدل آدمی ہے اور یقیناً تمھیں ہر حالت میں خوش رکھے گا۔ اس نے مجھے تمام واقعات من وعن سنا دئیے ہیں۔ شاید وہ سمجھتا ہو کہ اگر میں لاعلمی میں مکان پر آیا تو تمھارے راز سے آگاہ ہو کر میرے دل کو صدمہ نہ ہو گا۔"

میرا جسم لرز اٹھا۔ میں عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ میرے لئے پریم کو چھوڑنا بہت مشکل تھا۔ کیونکہ اس کی بدولت میں نے نئے سرے سے زندگی کی مسرتیں حاصل کی تھیں۔ وہ میری زندگی کا جزو لاینفک بن چکا تھا۔

"کملا! اب صرف تم ہی اس بات کا فیصلہ کر سکتی ہو" کمار نے میرے چہرے پر نگاہیں جما کر کہا۔ "پریم یا کمار تمھیں دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔"

"کمار! مجھے معاف کر دو۔" میں نے اپنے جملوں کو بمشکل ادا کرتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتی تھی کہ تمھارا صحت یاب ہونا ناممکن ہے۔ اس لئے میں نے تمھیں اپنے دل سے محو کر دیا۔ میرے نزدیک تم بالکل مر چکے تھے۔ آہ! میں نے شباب کی لذتوں سے مسرور ہونے کے لئے کس قدر غلطی کی۔ اور کتنی عجلت سے کام لیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ تمھاری محبت کی یاد میں مصیبت کے دن گذار دیتی۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا اور زار زار رونے لگی۔

چند منٹ بعد جب میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو کمار بدستور میرے پاس کھڑا تھا۔ "بس میں صرف یہی جاننا چاہتا تھا۔" اس نے پریشان نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر اس کی نگاہیں کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ "میں تمھیں زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ چونکہ تم پریم کو دل سے چاہتی ہو۔ اور یقیناً پریم ہی تمھارا انتخاب ہے۔ لہٰذا اب جہاں تک تمھارا اور پریم کا تعلق ہے تم مجھے اپنے نزدیک مردہ ہی سمجھو اور بے خوف آرام سے زندگی بسر کرو۔" اتنا کہہ کر وہ دروازہ کی جانب مڑا۔ اور میرے اصرار کے باوجود مجھے تنہا چھوڑ کر بہ سرعت باہر نکل گیا۔ میں بے بس ہو کر چارپائی پر جا پڑی اور کافی دیر تک روتی رہی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز پولیس نے مجھے ایک نعش کی شناخت کے لئے بلایا جو دریا سے برآمد ہوئی تھی اور جسے وہ کمار کی نعش تصور کرتے تھے۔ میں نے جا کر دیکھا تو نعش کمار ہی کی تھی۔ اور سچ مچ اس نے پانی میں ڈوب کر جان گنوا دی تھی۔ پولیس نے رپورٹ کر دی کہ دیوانگی کے باعث خودکشی کا ارتکاب کیا گیا۔ مگر یہ میرا دل ہی جانتا تھا کہ کمار کی موت کیونکر واقع ہوئی۔ اس کے یہ الفاظ بدستور میرے کانوں میں گونج رہے تھے کہ "جہاں تک تمھارا اور پریم کا تعلق ہے تم مجھے اپنے نزدیک مردہ ہی سمجھو!" سچ مچ اس نے اپنا آخری وعدہ پورا کر دکھایا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۲۴۹)

ملک کا سب سے بڑا شاعر رات کے دو بجے مشاعرہ سے لوٹا اس دن اسی کی نظم حاصل مشاعرہ سمجھی گئی۔ اس لئے ایک ادبی رسالہ کا نمائندہ اسے حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ ساتھ آیا۔

قیام گاہ پر پہنچکر شاعر نے اُسے اپنی نظم لکھوادی۔

دنیا ایک زبردست دھوکا ہے،
یہاں کی تمام چیزیں حقیقتاً وہی نہیں ہیں جو وہ نظر آتی ہیں۔
اس میں بسنے والے ہر شخص نے اپنے آپ کو دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے۔
زندگی خود ایک فریب ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ہم کسب زر کے لئے اپنی چھوٹی چھوٹی مسرتیں قربان کر دیتے ہیں۔
اور اپنی اس قربانی کی حقیقی قیمت کو نہیں سمجھتے ہیں۔
ہم جائز اور ناجائز طریقے سے دولت سمیٹتے ہیں۔
اس امید میں کہ یہ ہماری آئندہ زندگی کو پُر مسرت بنادیگی،
لیکن ہماری یہ امیدیں پوری نہیں ہوتیں،
کیونکہ ہم زندگی کے آخری لمحہ تک طلب دولت میں مصروف رہتے ہیں،
اور موت کے بعد ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ نہیں ملتا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ہماری روحیں اپنی محنت سے اوروں کو مستفید ہوتے دیکھ کر بیقرار ہو جاتی ہیں،
کیونکہ ہم دنیا میں جو کچھ کرتے ہیں اپنے لئے کرتے ہیں،
صرف اپنی ذات کے لئے!!

ملک کے سب سے بڑے شاعر کا تازہ ترین شہپارہ حاصل کرکے ادبی رسالہ کا نمائندہ اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرنے لگا۔ شکریہ ادا کرنے کے بعد اس نے شاعر سے دریافت کیا۔

"کسی نہایت ہی غیر معمولی واقعہ سے متاثر ہوکر آپ نے یہ نظم سپرد قلم کی ہوگی؟"

"تمھارا خیال غلط ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "بڑے بڑے شعراء اور ادباء کے مایۂ ناز شاہکار اکثر انتہائی معمولی تحریک سے وجود میں آتے ہیں۔ نہایت کم مایہ شئے اعلیٰ ترین لٹریچر پیدا کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ کیونکہ ادب سو فیصدی الہام ہوتا ہے اور تحریک محض برائے نام۔ تم شاید باور نہ کرو اگر میں کہوں کہ میں نے یہ نظم ایک چیونٹی کی موت سے متاثر ہوکر لکھی ہے"

نمائندہ حیرت و استعجاب سے اس کا منہ تکنے لگا۔

شاعر نے اس کے شکوک رفع کرنے کیلئے وہ واقعہ اس طرح بیان کیا۔

"ہفتے کے چھ روز میں مشین کی طرح کام کرتا ہوں۔ میری مصروفیات اس قدر بڑھی ہوئی ہیں کہ اگر اتفاقاً میرا وقت کہیں زیادہ صرف ہوجاتا ہے تو مجھے اپنے دیگر مشاغل ایک نامعلوم مدت کے لئے ملتوی کر دینے ہوتے ہیں لیکن اتوار کو میں آرام کرتا ہوں، مکمل آرام! اس دن میں کسی اہم سے اہم کام کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا۔ گذشتہ اتوار کو میں وقت گذاری کیلئے صحن میں ٹہل رہا تھا کہ میری نظر گملوں کے قریب چیونٹیوں کی ایک قطار پر پڑی۔ بیشمار چیونٹیاں جفاکش مزدوروں کی طرح اپنے سے دُگنا بوجھ اٹھائے ایکطرف جا رہی تھیں۔ دوسری قطار کی چیونٹیاں اپنا بوجھ ڈھو کر واپس آ رہی تھیں۔ وہ تمام کی تمام کسی ظالم نگراں کی زیر سرپرستی کام کرنیوالے مزدوروں کیطرح نہایت سرگرمی اور ہم آہنگی کے ساتھ اپنے اپنے فرض کو انجام دے رہی تھیں۔ میں نے ملازم سے اور ان پر تھوڑی سی شکر ڈلوادی اور چیونٹیاں اس پر ٹوٹ پڑیں۔

اسکے بعد میں آرام کرسی پر لیٹ گیا اور تپائی پر رکھی ہوئی ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا۔ میں مطالعہ میں محو تھا کہ ایک چیونٹی صفحہ کے سرے پر نمودار ہوئی، اور انتہائی سرعت سے بکورے صفحہ کو طے کر کے دوسری جانب مڑ گئی۔ میں نے کتاب الٹ کر اسے مخاطب کیا، تم یہاں کہاں بھٹک گئیں؟ ضیافت میں شریک نہیں ہوئی کیا! آؤ میں تمھیں پہنچادوں۔ یہ کہکر میں نے اُسے چٹکی میں پکڑ لیا اور گملوں کے قریب بچی ہوئی شکر کے پاس لیگیا۔ یہاں پہنچکر مجھے معلوم ہوا کہ میری چٹکی میں چیونٹی نہیں بلکہ اس کی لاش ہے

(طبعزاد)

پلیگ زدہ ہوٹل

...... دھڑ دھڑ دھڑ

کوئی میری خواب گاہ کے کمرے کے کواڑ ٹھونک رہا تھا۔

کب سے؟ یہ میں نہیں جانتا! البتہ اتنا خیال ہے کہ اول تو میں سمجھا کہ خواب میں الف لیلہ والی کہانی "کھل جا سم سم اور بند ہو جا سم سم" دیکھ رہا ہوں اور شاید دل ہی دل میں خوش تھا کہ ادھر دروازہ کھلا اور اُدھر خزانہ ہی خزانہ ہے اور بس۔

"کھل جا سم سم" زیر لب بڑبڑا رہا تھا کہ میں نے دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ کی آواز سنی۔ اب مجھے اپنی کرامت پر شبہ نہ تھا۔ اور میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا ــــ مگر دروازہ کھلتے ہی ایک شخص غفور۔ (میرے پرانے نوکر کا نام) کی صورت شکل کا میری طرف آتا نظر آیا۔ "ارے یہ غفور کہاں میرے پوشیدہ خزانہ کے پاس۔"

میں نے دل میں کہا "بڑا نالائق ہے یہاں بھی پہنچ گیا کمبخت!"

"سرکار! سرکار!!" غفور میرے قریب پہنچ کر مجھے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اول تو مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہ ہوتا تھا۔ پھر کانوں پر۔ معاملات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے سمجھنے تک کمبخت نے مجھے جھنجوڑ جھنجوڑ کر ہوشیار کرنا شروع کیا۔ اور جب اس طرح گت بنی تو میری عقل نے کام کرنا شروع کیا "کہاں کا خزانہ اور کہاں کی الف لیلہ کی داستانٗ وہی میرا گھر تھا۔ وہی خوابگاہ اور وہی میرا نوکر غفور!"

اب صرف تشویش یہ تھی کہ اتنی رات گئے وہ مجھے کیوں جگا رہا تھا۔ رمضان کا مہینہ تو تھا نہیں کہ شریف آدمی تین بجے صبح ہی سے اٹھ بیٹھے۔ پھر بات کیا ہوئی ــــ چور یا شیطان تو کہیں گھر میں گھس نہیں گیا۔ غفور تھا بھی ویسے دل کا بودا اور میں سمجھا کہ ہو نہ ہو یہی واقعہ ہے۔ بچ جانے میں کوئی ڈرپوک تو ہوں نہیں لیکن بہرحال انسان ہوں اور تقاضائے بشری یہی ہے کہ بھاگنے والوں کے آگے اور لڑنے والوں کے پیچھے ہو جائے۔ میں بس اسی خیال سے بستر سے اٹھ بیٹھا اور جائے امن تلاش کرنے کی فکر میں دماغ پکانے لگا۔

"معاف کیجئے سرکار! کیا آپ کے پاس ڈھائی روپے ہیں"

غفور نے خلاف توقع پوچھا۔

"ڈھائی روپیہ؟" چونکہ میں اس قدر متعجب تھا کہ کوئی دوسرا سوال کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے یہی دہرایا۔

"جی ہاں سرکار ڈھائی روپیہ" وہ کہنے لگا "باقر میاں آئے ہیں اور ان کی موٹر کا کرایہ ادا کرنا ہے۔"

"باقر آیا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"تین بجے صبح کے؟"

"جی ہاں"

"تمھارا دماغ خراب ہو گیا یا اُن کا؟"

"نہیں معلوم سرکار۔"

میں سمجھ نہ سکا کہ باقر کا اتنی رات گئے آنا کیا معنی رکھتا ہے اور سمجھتا بھی تو کیسے کہ جبکہ کچھ عرصے سے اس کا رویہ میرے لئے متحیر کن ہو رہا تھا۔ یا تو ایک زمانہ تھا کہ شاید ہی کوئی ایسا منحوس دن ہوگا۔ جبکہ ہم ایک دوسرے سے ملتے نہ ہوں گے اور یا یہ کہ پہلے کئی مہینوں سے ہماری ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میرے مکان سے اب بہت دور رہنے لگا تھا لیکن یہ رہائش کا سلسلہ عارضی تھا۔ اور ان کے چچا کی غیر حاضری میں وہ "گوشۂ عافیت" کی نگرانی کر رہا تھا۔ "گوشۂ عافیت" آبادی سے دور ایسا پُر فضا مقام پر خوشنما بنگلہ تھا جس کو باقر کے چچا یا فسر زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اسدفعہ گرمیوں میں وہ چھٹیاں منانے ٹھنڈے مقام پر چلے گئے تھے۔ اور چونکہ مکان خالی رکھنے میں صفائی اور دیکھ بھال نہ ہونے کا خطرہ تھا۔ اس لئے انھوں نے بطور خاص باقر کو گوشۂ عافیت میں چھوڑا کہ وہ اسکی نگہداشت کرے۔ گھر میں باقر کے علاوہ پرانے نوکر چاکر سبھی تھے۔

ہاں تو جب سے باقر کا قیام "گوشۂ عافیت" میں ہوا تھا نہ ملاقات نہ ہوئی تھی اور نہ کوئی خط و کتابت۔ البتہ تھوڑے دن پہلے خلاف توقع ایک لفافہ مجھے ملا۔ یہ باقر نے میرے نام بھیجا تھا۔ اسمیں پچیس روپئے کا ایک چک تھا۔ اور اسمیں مختصر سا خط جس میں صرف یہ لکھا تھا کہ یہ رقم انھوں نے مجھ سے کوئی چھ ماہ قبل بطور قرض حسنہ لی تھی۔ اور اب چونکہ ان کی مالی حالت درست ہو رہی ہے اس لئے انھوں نے قرض کی ادائی کی طرف توجہ کی۔ مالی حالت ہی کے سلسلہ میں غالباً انھوں نے لکھا تھا کہ وہ کوئی کاروبار کر رہے ہیں۔ مجھے اس

وقت ابھی طرح یاد نہیں ہے کہ کون کاروبار لکھا تھا۔

"موٹر والا انتظار کر رہا ہے سرکار!"

غفور کے اس جملے نے مجھے چونکا دیا۔ اور یہ جان کر کہ یہ وقت سوچ بچار کا نہیں ہے میں نے غفور کو بتایا کہ وہ دو روپے آٹھ آنے میز کی دراز میں سے لے سکتا ہے۔ یہ معلوم کر کے غفور چلا گیا اور میں بدستور سنبھل کر اٹھ بیٹھا۔ پھر خیال کیا کہ کیوں نہ باقر سے مل ہی لوں۔ اور واقعات معلوم کروں۔ اس خیال سے برابر کے کمرے میں گیا جہاں باقر پہلے سے موجود تھا۔

"ہائیں! یہ کیا ہوا! اس حالت میں؟" میرے منہ سے باقر کے لباس کو دیکھ کر بے ساختہ نکلا۔

واقعہ یہ تھا کہ باقر کے جسم پر صرف قمیص اور پاجامہ تھا۔ نہ ٹوپی، نہ شیروانی، نہ جوتا اور نہ آنکھوں پر چشمہ جس کے بغیر وہ باہر نکل ہی نہ سکتا تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور صورت پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا تم اس لباس میں اتنی رات گئے شہر میں گھوم رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں! گھوم نہیں رہا تھا بلکہ سیدھا تیر کی طرح گوشۂ عافیت سے تمہارے ہاں چلا آیا۔" باقر نے اطمینان سے کہنا شروع کیا۔ "اچھا یہ تو بتاؤ تمہارے ہاں کوئی زائد ٹوپی مل سکے گی؟"

"زائد ٹوپی؟ اس وقت؟"

"ہاں زائد ٹوپی۔ اس وقت نہیں، کل۔ مجھے جہاں تک معلوم ہے تم ہمیشہ دو دو ٹوپیاں رکھتے ہو اور سب سے زیادہ کام کی بات یہ ہے کہ تمہارا اور میرا سر بالکل برابر ہے اس لئے تمہاری ٹوپی میں پہن سکتا ہوں۔ اور ہاں شیروانی اور جوتا تو خیر مل ہی جائیگا۔ تم حیرت سے میرا منہ کیوں تک رہے ہو؟ — دیکھتے نہیں کہ میں بیک بینی و دو گوش آیا ہوں۔ اور کل تمہارے لباس میں زندگی کا ایک نیا ورق الٹنے والا ہوں۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ کیونکہ میں تو اس قدر حیرت زدہ تھا کہ کچھ کہتے بن نہیں پڑتا تھا۔ اور باقر کی حالت یہ تھی کہ گویا وہ کسی سوچ میں ہے۔

"تجارت کا بھی عجب حال ہے ابھی مالدار ابھی دیوالیہ۔" باقر نے آخر کار مہر سکوت توڑی۔

میری سمجھ میں خاک نہ آیا کہ تین بجے صبح کے کوئی شخص بغیر شیروانی، ٹوپی اور جوتے کے چلا آتے اور پہلے کپڑے مانگے یہ کہہ کر کہ وہ نئی زندگی شروع کرنیوالا ہے اور پھر تجارت کے نشیب و فراز پر طبع آزمائی کرنے لگے تو اس کے دماغی توازن کے متعلق کیا خیال کرنا چاہیئے اسی لئے میرے جی میں آئی کہ کہوں "انسانی دماغ کا بھی عجب حال ہے ابھی سمجھدار اور ابھی پاگل!" مگر میں اس وقت جبکہ یہ فقرہ کہنے ہی والا تھا اس نے پوچھا۔

"تمہیں پچیس روپے کا چیک ملا ہوگا؟"

"ہاں! ملا تو تھا۔" میں نے اقرار کیا۔

"غیر متوقع طور پر — ہوں!"

"ہاں یونہی سمجھ لو۔"

"ان دنوں تمہیں معلوم ہے کہ میری آمدنی کیا تھی؟" اس نے پوچھا اور جواب کے انتظار کے بغیر سلسلہ جاری رکھا "بس یہ سمجھ لو کہ پچیس روپے کی رقم اتنی حقیر تھی ان دنوں کہ اس سے پہلے شاید ہی میری نظر میں اس کی اتنی کم وقعت ہوئی ہو گی۔ کیونکہ میرا کاروبار دراصل اس وقت خوب زوروں پر چل رہا تھا۔"

"تمہارا کاروبار — ؟"

"ہاں ہاں میرا کاروبار۔"

"کس قسم کا؟"

"ہوٹل کا — ہوا یہ کہ ڈیڑھ مہینے قبل جبکہ چچا آبا گرمیاں گذارنے "اوٹی" چلے گئے اور گوشۂ عافیت کی نگرانی میرے سپرد کر گئے۔ تو مجھے دفعتہً خیال گذرا کہ کیوں نہ اس دلکش بنگلہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ تم تو جانتے ہو کہ وہ کس قدر پُر فضا مقام پر ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ کافی اونچے مقام پر ہے اس لئے ٹھنڈا بھی رہتا ہی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کو چچا آبا کی واپسی تک ہوٹل میں بدل دیا جائے تو بہت آمدنی ہو سکتی ہے۔ تم نے تین مہینے قبل اخباروں میں اشتہارات دیکھے ہوں گے کہ ایک نیا ہوٹل پُر فضا اور ٹھنڈے مقام پر کھلا ہے۔ جہاں بہ نسبت شہر کے گرمیاں آرام سے گذر سکتی ہیں۔ وہ اشتہارات دراصل میرے ہی دیئے ہوئے تھے —"

"جہاں تک مجھے یاد ہے تمہارے چچا تو مکان کو کرایہ پر بھی دینا نہ چاہتے تھے۔ بلکہ وہ اکثر ان لوگوں کو برا بھلا کہتے تھے جو مکان خالی اس لئے ہیں کہ خود رہیں لیکن جب وہ بن جاتا ہے تو کرایہ کی حرص میں اس کو دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔" میں نے بیچ میں خلل دیا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے" وہ کہنے لگا" اور اسی لئے تو انھوں نے جاتے جاتے جو مجھے نصیحت کی وہ یہ تھی کہ خبردار کہیں مکان کرایہ پر نہ دے دینا لیکن تم ہی سوچو یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں اتنے بڑے مکان میں تن تنہا رہتا اور خصوصاً یہ خیال پیدا ہونے کے بعد کہ اس موقع سے بہت فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے ـــــ خیر تو ہوا یہ کہ جونہی میں نے اشتہارات دیئے جوق در جوق لوگ قیام کے لئے "گوشۂ عافیت" آنے لگے۔ نوکر چاکر سب ہی میرے ساتھ اشتراک عمل پر آمادہ تھے۔ اس لئے میں نے بسم اللہ کہہ کر لوگوں کو ٹھہرانا شروع کیا۔ ابتدا ہی میں آٹھ مسافر قیام پزیر ہوئے۔"

"روزانہ کیا کرایہ لیا کرتے تھے؟" میں نے دریافت کیا۔

"پانچ روپئے روز۔"

"کھانے کے ساتھ؟"

"ہاں۔"

"تو گویا اس طرح روزانہ چالیس روپیہ کی آمدنی تھی۔

"اور خرچ بالکل نصف گویا بیس روپیہ۔ اس طرح چھ سو روپئے ماہوار قطعی منافع تھا۔ میرا خیال تھا کہ چچا ابا کے واپس ہونے تک یہ کاروبار چلالوں گا۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ کم از کم تین مہینے میں واپس ہوں گے۔ اور میرا اندازہ تھا کہ انھیں اس سے زیادہ ہی عرصہ لگے گا۔"

"اچھا تو تم نے خورد و نوش اور رہائش کا انتظام کیونکر کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اوہ! یہ کیا مشکل تھا۔ روپیہ اصل چیز ہے۔ بہت سے مسافروں نے تو ایک ایک ہفتہ کے اخراجات پیشگی ادا کر دیئے تھے۔ ان کی تعداد نصف تھی۔ تین چار مہمانوں نے چالیس چالیس روپیہ ادا کر دیئے۔ اور ایک صاحب کوئی فوجی عہدہ دار تھے وظیفہ یاب انھوں نے تو ایک ایک مہینے کی رقم ادا کردی۔ بیچارہ کرنل کتنا نیک آدمی تھا ـــــ مزید فرنیچر وغیرہ کی تو ضرورت ہی نہیں پڑی کیونکہ چچا ابا نے ضرورت سے زیادہ سامان جمع کیا ہے۔ گھر کے نوکر چاکروں کے علاوہ دو ایک میں نے ہنگامی طور پر ملازم رکھ لئے تھے ـــــ کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تم جانتے ہو میں یوں تو مہمان بھی اچھا ہوں لیکن میزبان کی حیثیت سے میری قابلیت بہت زیادہ اچھی ہے۔ مہمانوں کی ضروریات کا خیال ان کی آسائش کا لحاظ اور خورد و نوش کی پسندیدہ اشیا کی فراہمی میں میں بہت مشاق ہوں اور اس دفعہ تو انتظام اس قدر حسن سلیقہ کے ساتھ کیا کہ سب کے سب مہمان میری خاطرداریوں کے سبب ممنون احسان تھے۔

سچ کہتا ہوں کہ وقت ایسا مزے میں کٹتا تھا کہ کچھ نہ پوچھو۔ گپ شپ، سیر و تفریح اور عیش و عشرت کا ہر وقت بازار گرم رہتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم سب ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں۔ نہ مہمانی کا تکلف نہ میزبانی کی تکلیف، بس چین سے کٹتی تھی۔ اپنی بہادری کے کارنامے، جنگ کی نقشہ کشی، شکست و فتح کی تفصیل کرنل کچھ اس طرح نمک مرچ لگا کر بیان کرتا تھا کہ گھنٹوں گذر جاتے تھے اور وقت محسوس تک نہ ہوتا تھا۔ شیخ جی کا برج کھیلتے کھیلتے اپنے ساتھی سے الجھ جانا۔ اور اپنی "برج دانی" کے ثبوت میں ہمیشہ دوسروں کو "اناڑی" سمجھنا اور وہ سید صاحب کا کرنل کو شہ دے دے کر شیخ جی کے خلاف کھڑا کرنا بڑا ہی مزا دیتا تھا۔

تم جانتے ہو کہ عیش کے دن کتنے مختصر ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ مہینہ ہوگیا اور مجھے کوئی نو سو روپیہ فائدہ ہوگیا۔ لیکن مجھے توقع تھی کہ کم از کم ڈیڑھ دو مہینے یہی رفتار اور رہے گی۔ اور یہ میری امید کچھ بیجا بھی نہیں تھی۔ کیونکہ چچا ابا کی عادت ہے کہ جب وہ سیر و تفریح کے لئے باہر جاتے ہیں تو کبھی جلدی واپس ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔"

مگر ایک صبح جبکہ میں بازار گیا تھا اور سامان خریدنے میں مصروف تھا کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور یہ انداز ایسا بے تکلفانہ تھا کہ میں نے نہایت خلوص کے ساتھ مڑ کر دیکھا تو سامنے بیرسٹر صاحب کھڑے ہیں۔ تم جانتے ہو نہ بیرسٹر صاحب کو، وہ جو چچا ابا کے ہاں اکثر آتے جاتے ہیں، وہی پورے ہتے کٹے ـــــ!"

"کیا ہے باقر اچھے تو ہو؟" بیرسٹر صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں! آپ کی دعا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تمھیں تو اطلاع مل چکی ہوگی؟"

"کاہے کی؟"

"تمھارے چچا ابا کی واپسی کی۔" انھوں نے جواب دیا۔

"سچ کہتا ہوں کہ میرا خون خشک ہوگیا۔ "چچا ابا کی واپسی!" میں نے دل میں کہا، ہائے اب کیا ہوگا میرے انتظامات، میرا ہوٹل اور وہ جو میں نے ابھی ابھی متعدد مہمانوں سے پیشگی رقم حاصل کرلی ہے اور اس کو بڑی حد تک رنگ رلیاں منانے میں اڑا بھی چکا ہوں ـــــ کس طرح مکان خالی کرا سکوں گا، اور کیوں کر معاملات پر قابو پا سکوں گا۔"

بیرسٹر صاحب جا چکے تھے اور میں اسی سوچ میں کھڑا ہوا تھا۔ کچھ عرصے بعد ہوش آیا تو سامان خریدے بغیر واپس ہو گیا اور دن بھر یہی سوچتا رہا کہ کس طرح مکان خالی کراؤں۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں ان سے صاف صاف کہہ دیتا۔ کیونکہ پیشگی رقم اور قیام کے معاہدات میں نے کچھ اس طرز میں کئے تھے کہ وہ مجھ پر قانونی چارہ جوئی کر سکتے تھے بلکہ مکان خالی کرانے کے لئے اُلٹے چچا ابا کو ایک عرصہ تک مہمانوں کے خلاف عدالتی کارروائی کرنی پڑتی۔ بالآخر میں نے اپنے ملازمین کی ایک کانفرنس طلب کی کہ ان سے مشورہ کروں۔

شام کے کھانے کے بعد میرے کمرے میں اس کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ بوٹوں کو پالش کرنے والا ایک لڑکا۔ دو بیرے۔ ایک باورچی۔ ایک منیجر اور دو نوکرانیاں سب کے سب وقت مقررہ پر جمع ہو گئے۔ عورتوں کو میں نے کرسی دی اور باقی سب کھڑے رہے۔ البتہ لڑکا فرش پر ہی ٹک گیا۔ میں میز پر بیٹھا تھا۔ کارروائی شروع ہوئی اور میں نے واقعات "الف سے یٰ" تک سنا دیئے۔ اور اس کے بعد اظہار افسوس کے کئی ووٹ پاس ہوئے پھر تدبیریں اور تجویزیں پاس ہونی شروع ہوئیں۔

"میری رائے میں" جوتوں کو پالش کرنے والے لڑکے نے تجویز پیش کی "ہم سب کو فوراً بھوتوں کا لباس پہن لینا چاہئے، اور آٹھوں مہمانوں کے کمرے میں آدھی رات گئے گھس جانا چاہئے اور کچھ ایسی حرکتیں کرنی چاہئیں کہ وہ صبح ہونے سے پہلے اپنے اپنے گھروں کا راستہ لیں۔"

ایک نوکرانی تو بھوت کے خیال ہی سے سہم گئی لیکن باورچی نے یہ کہہ کر تردید کی کہ "فرض کرو اگر ان میں سے کوئی نہ کوئی بہادر نکل آیا اور بھوت پریت کو خاطر میں نہ لایا تو ——؟"

"یقیناً کرنل تو بھوت سے ڈرنے والے معلوم نہیں ہوتے اس لئے میرے خیال میں یہ رائے فضول ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو یوں ہو سکتا ہے" لڑکے نے دوبارہ مشورہ دیا کہ "ہم میں سے کوئی اسٹیشن پہنچے اور آپ کے چچا ابا کو وہاں سے اُڑا لے۔"

"اُڑا لے؟" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں میری مراد اسی حرکت سے ہے جو چور اُچکے کیا کرتے ہیں۔" اس نے سلسلہ جاری رکھا "اور ایسی جگہ پر انھیں قید رکھیں کہ کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔ آپ ان سے وقتاً فوقتاً روپیہ بھی اگر ضرورت پڑے تو وصول کر سکتے ہیں۔" اور ہوٹل کا کاروبار دائمی طور پر چند سکتے ہیں۔"

نہیں معلوم وہ اور کیا کیا کہتا مگر اس کو منیجر نے اس سختی سے ٹوک دیا کہ وہ کمبخت خوف سے لرز گیا۔

"میرا ایک دوست ہے۔" باورچی نے تجویز پیش کرنے کی ابتدا شروع کی۔ "ذرا غنڈے قسم کا۔ اگر اس کی خدمات حاصل کی جائیں تو وہ بہت جلد ہمیں اس مشکل سے نجات دلا سکتا ہے۔"

"کس طرح" ایک بیرے نے پوچھا۔

"ایک صبح وہ صفائی کے انسپکٹر کے لباس میں نازل ہوگا اور بڑے تحکمانہ انداز میں مکان کی صفائی پر اعتراضات شروع کریگا۔" باورچی نے اپنی تجویز ذرا پھیلا کر بیان کرنی شروع کی۔ "آپ لوگ جانتے ہی ہیں کہ آجکل لوگوں کو کس درجہ خبط ہو گیا ہے کہ موریوں، نالیوں اور صفائی کے دوسرے انتظامات خراب ہونے سے وبائیں پھیلتی ہیں۔ اس کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر وہ ایک ماہرانہ تنقید کرے گا تو لوگ یقیناً بیماریوں کے خوف سے بھاگ جائیں گے۔"

چنانچہ یہ تجویز مجھے بہت معقول اور شریفانہ معلوم ہوئی۔ اور اس کے علاوہ کسی اور نے دوسری تجویز اس سے بہتر پیش نہیں کی۔ اس لئے باتفاق آرا جلسہ میں طے پایا کہ باورچی کے غنڈے دوست کی خدمات مستعار طریقہ پر فوراً حاصل کی جائیں۔

دوسرے دن میں حسب قرارداد اپنے مہمانوں کے کمروں میں یہ پوچھنے گیا کہ آیا وہ کسی قسم کی بدبو تو نہیں سونگھ رہے ہیں۔ سبھوں نے انکار کیا مگر میں برابر اصرار کرتا گیا کہ مجھے رات بھر نیند محض اسلئے نہیں آئی کہ بدبو نے ناک میں دم کر رکھا تھا اور یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ ہوا خراب ہونے کا امکان نظر آ رہا ہے۔

شیخ جی نے تو میری بات کی طرف توجہ بھی نہ کی البتہ کرنل چونکہ پلیگ سے بہت ڈرتے تھے اس لئے انھیں ایک قسم کا شبہ پیدا ہوا۔ کہ کہیں چوہا وغیرہ تو نہیں مرا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ کرنل کی تبلیغ نے ایک ہلکا سا انتشار پیدا کر دیا۔ میں خوش تھا کہ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں!

سہ پہر میں باورچی کا دوست اپنے آپ کو صفائی کا انسپکٹر بنائے ہوئے پہنچا اور مکان کی نالیوں اور دوسرے صفائی کے انتظامات کی دیکھ بھال کر کے قسم قسم کے نقائص بیان کرنے لگا۔ بدبو کے متعلق کہنے لگا کہ ہو نہ ہو کوئی چوہا مرا ہوگا کیونکہ شہر میں اکثر جگہ چوہے گر رہے ہیں اور چونکہ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ چوہا کہاں مرا ہے اس لئے ضروری ہے

کہ سارا مکان صاف کرایا جائے اور فوراً خالی کر دیا جائے ورنہ پلیگ سے متاثر ہونے کے کافی امکانات ہیں۔

اس نقلی انسپکٹر کے جاتے ہی لوگ اپنے اپنے بستر باندھنے لگے اور میں بہ ظاہر ان سب کی جدائی پر افسردہ نظر آ رہا تھا لیکن دل ہی دل میں خوش تھا کہ تیر نشانہ پر لگا۔ لیکن عین اسی وقت سید صاحب جو باہر گئے ہوئے تھے وارد ہوئے اور یہ چل چلاؤ کی تیاریاں دیکھکر حیران ہو گئے۔

"ہائیں کرنل صاحب یہ کیا؟" انھوں نے پوچھا۔

"چلو چلو تم بھی بستر باندھ لو۔"

"کیوں خیریت تو ہے؟"

"ارے میاں خیریت ویریت کہاں کی۔ یہ مکان تو پلیگ سے متاثر ہو رہا ہے پلیگ سے۔"

"پلیگ سے؟" کس نے کہا۔

"ابھی ابھی ایک صفائی کا انسپکٹر آیا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ یہ جو ایک قسم کی بدبو آ رہی ہے یہ ہو نہ ہو پلیگ کا چوہا مرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔"

"مجھے تو کسی قسم کی بدبو وغیرہ آ نہیں رہی ہے۔" سید صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "تعجب ہے کہ آپ لوگوں کی ناکیں اس درجہ کیوں تیز ہو گئی ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے تنقیح شروع کی اور سارا گھر چھان مارا۔ سب کمرے اور سب نالیاں اور ہر ہر چپہ ڈھونڈا لیکن ان کی تفتیش میں نہ چوہا ہی ملا اور نہ انھیں کہیں کسی قسم کی بو ہی آئی۔

"کون انسپکٹر آیا تھا نامعقول۔" انھوں نے سلسلہ جاری رکھا۔ "معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تم اناڑیوں کو دیکھکر وہ اُلّو بنا گیا۔ کرنل صاحب شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے بھی محکمہ پلیگ میں چند سال ملازمت کی ہے اور صفائی کے سارے انتظامات اور چوہوں کی بو وغیرہ سے خوب واقف ہوں اور اسی تجربہ کی بنا پر سو سو روپیہ شرط بدنے کو تیار ہوں۔ ناممکن ہے کہ اس گھر میں کوئی پلیگ کا چوہا مرا ہو۔ بات یہ ہے کہ بہت سے بدمعاش انسپکٹر خواہ مخواہ اپنا رعب گانٹھتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ وہ معاملات کی دُم بھی نہیں جانتے۔"

"تو سید صاحب آپ کے خیال میں وہ انسپکٹر یوں ہی کوئی لفنگا تھا۔" شیخ جی نے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا لفنگا، بدمعاش اور دغا باز کہیں کا۔ سچ کہتا ہوں کہ اگر میں ہوتا اس وقت تو خوب گت بناتا مردود کی۔"

"تو پھر ہمیں مکان نہیں چھوڑنا چاہیئے۔" کرنل نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں چاہے آپ لوگ چھوڑ دیں مگر بندہ تو ہرگز نہیں جانے کا۔" سید صاحب نے عزم صمیم کا اظہار کیا۔

"تو بھئی ہم بھی تمھارے ساتھ ہیں۔" شیخ جی نے کہا۔

"اور جب تم دونوں ہو تو ہم بھی ہیں۔ سمجھ لو۔" کرنل نے کہا۔

ان تینوں کا ساتھ دوسرے پانچ مہمانوں نے دینے کا تہیہ کر لیا۔

"مگر سید صاحب انسپکٹر بلا وجہ جھوٹ موٹ کیوں کہتا" میں نے اپنی اسکیم کو ناکام ہوتے دیکھکر کہا۔

"بھائی صاحب تم کیا جانو ابھی بچے ہو ہمارے سامنے کے۔ مجھے تو یقین ہے کہ وہ اصلی انسپکٹر ہی نہ تھا۔" سید صاحب نے نیا انکشاف کیا اور میرا خون خشک ہو گیا۔

"کیا کہا! اصلی نہ تھا؟" شیخ جی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں آجکل لچے اور غنڈے بہت سے ایسے نکلے ہیں جو خواہ مخواہ شریفوں کو پریشان کیا کرتے ہیں۔"

"میرا دل تو کہتا ہے کہ وہ کوئی چوروں اور لٹیروں کا ساتھی تھا۔" کرنل نے جدت پیدا کی۔ "آپ لوگ تو خوب جانتے ہی ہیں کہ لٹیرے اپنی ٹولی میں سے ایک ہوشیار شخص معائنہ موقع کے لئے ایک دن قبل اس مکان میں بھیجتے ہیں۔ جہاں انھیں ڈاکہ ڈالنا منظور ہوتا ہے۔"

"کرنل نے میرے منہ سے بات چھین لی۔" سید صاحب نے کہا۔

"مگر یہ تو اس سے بھی بُری خبر ہے۔" شیخ جی نے دبی زبان سے کہا۔

"تو یہ تم تو سمجھے جاتے ہو۔ ارے میاں مرد بنو مرد۔ اس تن و توش پر یہ دل گردہ۔ لاحول ولا۔"

شیخ کو غیرت آ گئی اور انھوں نے حاضرین کو یقین دلایا کہ وہ تو دوسروں کے خیال سے کہہ رہے تھے۔ ویسے وہ تن تنہا چار چوروں کے لئے کافی ہیں۔ اس پر کرنل نے اپنے طمنچہ اور اپنی نئی بندوق کا ذکر کر کے سب کو ہمت دلائی بلکہ یہاں تک صاف صاف کہدیا کہ ہم میں سے کوئی بھی بھاگ نہیں سکتا اور جو بھی ایسی کوشش کریگا کرنل اس سے الجھ جائیں گے۔ مزید اطمینان کے لئے انھوں نے اپنی خدمات ہر شخص کے لئے وقف کر دیں۔ خواب گاہ کا کمرہ کھلا رکھنے کا وعدہ کیا اور ہر شخص کے کمرے سے اپنے کمرے کو ایک تار کے ذریعہ ملحق کر لیا۔

اس طرح سے کہ ضرورت کے وقت اگر کوئی اپنے کمرے کی گھنٹی بجائے تو فوراً ہی اس کی اطلاع کرنل کو اپنے بستر پر ہو جایا کریگی۔ اس کے علاوہ دو ایک گھنٹہ تک ڈاکوؤں کے طریق کار، ان کی شناخت اور ان کا مقابلہ کرنے پر کرنل نے بڑا دلچسپ لکچر دیا۔ اور بات بات پر اپنے تجربات بیان کئے۔

میں اپنی ساری تجاویز کو ناکام دیکھکر بیحد پریشان تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ بہت غور و فکر کے بعد رہائی کی ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ ساتھ ہی میں نے باورچی کو طلب کیا۔ اور جب وہ آیا تو اس سے یوں مخاطب ہوا۔

"تم کل صبح ناشتہ پر مجھے یہ خبر دینا کہ ایک بیرا سخت بیمار ہے بلکہ یہ صاف صاف کہہ دینا کہ اس کو پلیگ ہو گیا ہے۔ سمجھے نا—؟"

"جی بہت اچھا سرکار!"

"مگر احتیاط یہ کرنا کہ میں بیرے کی بیماری کی اطلاع دو دہیا نہ رہے بلکہ اپنے گھر چلا جائے۔" میں نے اس کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھایا۔

"بہت اچھا۔"

"اور ہاں سارے نوکر بھی اس سے آگاہ ہو جائیں اور سب کے سب اگر ضرورت پڑے تو تمہارے ہم زبان ہوں۔"

"بہت خوب۔"

باورچی چلا گیا اور میں جتنا زیادہ اس تجویز کے جزئیات پر غور کرتا جاتا تھا اتنا ہی زیادہ مجھے اس کی کامیابی کا یقین ہوتا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تو میری یہ حالت ہوئی کہ مارے خوشی کے آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا اور اسی بے اختیاری میں ممکن تھا کہ سارے مہمانوں سے کہہ دیتا کہ اب تو تدبیر الٹ نہیں سکتی۔ بھاگو یہاں سے چپ چاپ۔ مگر میں نے بہت ضبط سے کام لیا۔

دوسری صبح کو جب میں سب کے ساتھ میز پر بیٹھا روٹی پر مکھن لگا رہا تھا۔ باورچی بہت ہی رونی صورت بنائے داخل ہوا۔ سب مہمان اس کی یہ حالت دیکھکر پریشان ہو گئے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نے کچھ اس عمدگی سے اداکاری کی تھی کہ میں بھی بہت قریب تھا کہ اس کے تصنع کو حقیقت سمجھ لیتا۔

"سرکار!" کہنا شروع کیا لیکن اس کی آواز گلوگیر تھی۔

"کیوں؟ کیا حال ہے؟ کہتے کیوں نہیں کیا پریشانی ہے" میں نے بھی بناوٹی انتشار کرتے ہوئے کہا۔

"سرکار! بیرے کو پلیگ —"

"ہائیں پلیگ!" میں نے کرسی سے اچھلتے ہوئے کہا: "کیا بیرے کو؟"

"محمد تقی سیم کو!"

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ کرنل کے حلق میں نوالہ پھنس گیا۔ اور اس نے کھنکارتے ہوئے بڑی مشکل سے چائے کے گھونٹ کے ساتھ اس کو اتارا اور اس کے ساتھ ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"اب تو ہم کو بھاگنا ہی پڑا" کرنل نے کہا۔

دوسرے ساتھیوں نے بھی بے چینی کا اظہار کیا اور بھاگنے پر کمر کس لی لیکن سید صاحب کا یہ حال تھا کہ ٹس سے مس ہی نہیں ہوتے اور برابر نوالہ پر نوالہ اڑائے جا رہے ہیں۔

"کس نے کہا کہ پلیگ ہو گیا" سید صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "شام کو اچھا بھلا تھا۔"

"جی ہاں شام کو اچھا تھا" میں نے کہا "مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا پلیگ کے لئے کوئی مدت معین ہے؟ رات کی رات میں ہو گیا پلیگ بیچارے کو۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں ایک نظر" سید صاحب نے پوچھا۔

میں نے دل میں کہا "آپ کے دیکھنے کے لئے رکھا تھوڑا ہی ہے یہ یہاں۔ اتنے بیوقوف تو ہیں نہیں ہم۔"

"وہ صبح گھر سے نہیں آیا۔ باورچی نے کہنا شروع کیا" میں ناشتہ تیار کر کے ویسے ہی بیٹھا ہوا تھا کہ اس کا لڑکا دوڑتا ہوا چلا آیا۔ اور رو رو کر یہ خبر دے گیا۔"

"اول تو یہ یقین نہیں کہ اسے پلیگ ہو گیا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ تو یہاں ہے نہیں جو ہم گھبرا کر مکان خالی کر دیں" سید صاحب نے اپنی منطق شروع کی۔

"یہاں نہیں ہے تو کیا ہوا۔ مبتلا تو یہیں ہوا" کرنل نے نہایت معقول جواب دیا۔

"مبتلا ہوا تو کیا ہوا مقام صاف کرا کے رہ سکتے ہیں" سید صاحب بولے۔

"ہیں یہ تو اصول حفظان صحت کے خلاف ہے" کرنل بولا۔

"اچھا تو کرنل صاحب مجھے حفظان صحت کے اصول سمجھا رہے ہیں۔ خدا کی شان! اپنے کہتا ہوں کرنل صاحب ابھی آپ کو پچاس

برس سکھا سکتا ہوں۔ ایک مدت تک پلیگ کے محکمہ میں ملازمت کی ہے۔ اور یہ نہیں کہ اِدھر اُدھر رہا ہوں بلکہ ذمہ دار عہدہ دار کے فرائض انجام دیئے ہیں۔"

"ارے بھائی اُلجھتے کیوں ہو۔" شیخ جی نے مصالحت آمیز طرز اختیار کی۔

"دیکھئے تو شیخ جی! کرنل صاحب رعب گانٹھتے ہیں ہم پر۔ میں سب کچھ سہہ سکتا ہوں لیکن ذلت اور ہتک برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے بھی کوئی فوجی کندہ وندہ سمجھ رکھا ہے۔" سید صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔

"اب آپ تو فوجیوں پر حملہ کرنے لگے۔" کرنل نے بھی ذرا تیز ہو کر کہا۔ "آپ تو اپنے پیشہ کے متعلق کچھ سُن نہیں سکتے۔ اور میں بھلا اپنے پیشہ کے متعلق کس طرح سُن سکوں گا اور پھر یوں بھی فوجی ذرا ہوتے ہی ہیں تیز مزاج۔"

قریب تھا کہ دونوں میں زبانی جمع وخرچ کے بعد دونوں گتھم گتھا ہو جائیں۔ کیونکہ کرنل بار بار آستین اُلٹ رہے تھے۔ اس لئے میں نے بیچ بچاؤ کیا۔ کبھی کرنل کو سمجھاتا اور کبھی سید کو روکتا۔

جوں توں کر کے دن گذر گیا لیکن کسی نے بھی جانے کا نام نہ لیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اسی سوچ بچار میں شام ہو گئی اور رات کا کھانا کھا کر میں مہمانوں سے معافی چاہ کر اپنے کمرے میں واپس ہو گیا۔ نیند تو کیا آتی بستر پر کروٹیں لے رہا تھا۔ نصف کے قریب رات گذر چکی تھی کہ یکایک میں نے پستول کی آواز سنی اور ابھی ہوش وحواس یک جا نہ کئے تھے کہ دوسری آواز آئی۔ اب تو بستر پر لیٹا نہ گیا۔ فوراً اُٹھ بیٹھا اور دروازہ کی طرف چلا۔ دروازہ جو کھولتا ہوں تو کرنل صاحب ہوا میں پستول گھماتے اور چال میں ایک خاص بانکپن پیدا کئے جھومتے جھامتے چلے آ رہے ہیں۔

"کیوں کرنل صاحب خیریت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نہ کہتا تھا کہ وہ انسپکٹر چوروں کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔" کرنل نے سلسلہ شروع کیا۔ "میں بستر پر ذرا دیر سے گیا اور یوں بھی خیال کر چکا تھا کہ ذرا ہوشیار سوؤں گا ــــ آپ تو جانتے ہی ہیں، ہم فوجی نیند کے قابو میں نہیں آتے بلکہ ہمیشہ نیند کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں، جونہی میں نے سیڑھیوں پر کسی کے پاؤں کی چاپ کی آواز سنی، فوراً پستول سنبھالتا ہوا بستر سے کود کر نکلا اور سیڑھیوں پر کسی کا سایہ دیکھ کر فیر کرنا شروع کیا۔ مگر کمبخت بچ کر نکل گیا۔"

"کرنل صاحب مگر آپ کے نشانہ نے خطا کیسے کیا؟" میں نے کرنل کی رعونت کو دھکا دینے کے لئے کہا۔

"ہم فوجیوں کا نشانہ خطا کرنا ناممکن تھا۔ میں نے عمداً ہوا میں پستول چلایا۔" کرنل نے جھوٹ موٹ کہنا شروع کیا۔ "کیونکہ میرا مقصد تو قتل کرنا نہ تھا بلکہ ڈرانا تھا اور وہ بدرجۂ اتم پورا ہو گیا۔ چھ گولیوں کا پستول ہے۔ دیکھا آپ نے" (یہ کہہ کر کرنل اپنا پستول مجھے تفصیل کے ساتھ دکھانے لگے)۔

"آیئے ذرا تلاش کریں چور کی اِدھر اُدھر۔" میں نے مشورہ دیا۔

"وہ کہیں دبک کر بیٹھا تھوڑا ہی ہو گا۔ اتنا نڈر چور نہیں کہلاتا۔ اس قسم کے بہادر سوائے فوجیوں کے اور کوئی پیشہ ور نہیں ہوتے۔" کرنل نے سلسلہ جاری رکھا۔ "میری رائے میں تو آرام سے سو رہنا چاہئے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب کی دفعہ اگر اس نے جرأت کی جس کی توقع قطعی نہیں ہے تو میں مار ہی ڈالوں گا مردود کو۔ آپ بےفکر رہیں۔"

میں نے بھی بات بہیں ختم کرنی مناسب سمجھی اس لئے ان کی رائے سے اتفاق کیا بلکہ انھیں کمرے تک چھوڑ آیا۔ لیکن رہ رہ کر ایک بےاطمینانی سی پیدا ہو رہی تھی کہ کس نے ایسی جرأت کی ہو گی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کس چور کی کارروائی ہو گی۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی اور خیال بھی گذر نہیں سکتا تھا۔ تھوڑی دیر اسی فکر میں مبتلا رہا۔ آخر سونے کے لئے لیٹا۔ بمشکل میری آنکھ لگی ہو گی کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑا۔ اور سچ کہتا ہوں کہ مجھ جیسا نڈر شخص کی بھی روح فنا ہونے کے قریب ہو گئی۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی میں نے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو وہ چور ہو گا۔ چیخنے کی کوشش کرتا ہوں تو آواز حلق سے نہیں نکلتی۔ اور مقابلہ کی فکر کرتا ہوں تو جرأت نہیں ہوتی۔

"باقر! باقر!" میرے کانوں میں آواز آئی۔

"ہائیں یہ تو چچا ابا کی آواز ہے۔" میں نے دل میں کہا۔

اور اب جو آنکھیں کھولتا ہوں تو سچ مچ چچا ابا کھڑے ہیں۔ سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب۔

"باقر! یہ باورچی کو کیا ہو گیا؟ دیوانہ تو نہیں ہو گیا کمبخت۔" چچا نے رازدارانہ طریقہ پر پوچھا۔

میں اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملتے ہوئے بغیر کچھ سوچے سمجھے کہنے لگا

"جی۔ جی!"

"باورچی پاگل ہو گیا معلوم ہوتا ہے۔" چچا ابا نے سلسلہ جاری رکھا۔ "لیکن اس کے ہاں پستول کہاں سے آ گیا۔ کہیں کمبخت نے میرا

پستول تو نہیں لیا؟"

"جی! جی!" میری سمجھ میں خاک نہیں آرہا تھا۔

"یہ جی جی کیا کہہ رہے ہو؟ کہتے کیوں نہیں کچھ۔ کب سے دیوانہ ہوا ہے کمبخت؟"

"جی۔ جی!"

"معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ڈر گئے ہو بہت۔" چچا نے تسلی آمیز لہجہ اختیار کیا۔ "میں چونکہ بغیر اطلاع کے دفعتہً آگیا تھا اس لئے نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری نیند میں خلل انداز ہوں۔ اس لئے دبے پاؤں زینہ چڑھ رہا تھا کہ سیدھا خواب گاہ پہنچ کر چپکے سے سو جاؤں لیکن عین جبکہ میں زینہ ختم کر چکا تھا باورچی میری خواب گاہ سے نکلا اور بغیر کچھ سوچے سمجھے ایک فیر کیا۔ میں نے آواز بھی دی اور یقیناً اس نے میری آواز پہچانی ہوگی اس پر بھی اس نے دوبارہ فیر کیا۔ وہ تو خیریت گذری کہ وہ بلا نشانہ چلائے پستول چلا رہا تھا۔ میں اسی کو غنیمت جان کر واپس ہوا اور سیڑھیوں کے نیچے ایک جائے امن تلاش کر کے اب تک ٹھہر گیا۔ ذرا اطمینان ہوا تو تمہارے کمرے میں چلا آیا کہ پوچھوں کہ واقعہ کیا ہے؟"

"جی ہاں باورچی رات ہی سے کچھ دیوانہ پن کی حرکتیں کر رہا تھا۔ اور یقیناً اب تو پریشان ہو گیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پستول یقیناً خطرے سے خالی نہیں۔ اس لئے چچا ابا آپ میری بات سنئے اور فوراً کسی ہوٹل کا راستہ لیجئے صبح کو میں واقعات پر قابو پا کر آپ سے ملوں گا۔" میں نے بات بنتی دیکھ کر جھوٹ موٹ کا قصہ گھڑ لیا۔

"لیکن یہاں تمہارا تنہا رہنا بھی تو خطرناک ہے۔" چچا نے ازراہِ محبت کہا۔

"نہیں نہیں آپ میری فکر نہ کیجئے۔" میں نے خلوص کا اظہار کیا۔ "میں جانتا ہوں کہ باورچی کو کس طرح قابو میں لانا چاہیئے۔ اب آپ جلدی کیجئے۔"

چچا ابا اور میں درانڈے سے گذر رہے تھے اور وہ میری رائے پر عمل کرنے کو تیار تھے۔ لیکن چلتے چلتے جونہی انہیں اپنا لباس تبدیل کرنے کا کمرہ نظر پڑا بغیر کچھ کہے سنے وہ اس میں گھس پڑے۔ میں نے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کی کیونکہ اس میں سید صاحب رہتے تھے مگر چچا میرے روکے نہ رکے۔ ان کا دروازہ کھولنا تھا کہ سید صاحب جو اب تک بستر پر سہمے پڑے تھے اور پستول کی آواز پر اوسان خطا کر چکے تھے دفعتہً چیخ اٹھے۔ ان کی چیخ سن کر کرنل صاحب شیخ جی اور دوسرے مہمان سب ہی دوڑ پڑے۔

اب بات بنانی نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھی اسلئے میں نے یہی غنیمت جانا کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلوں سب کو ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہونے کیلئے میں مکان کے باہر دوڑا اور حسن اتفاق سے ایک کرایہ کی موٹر پاس ہی نظر پڑی تو اس میں سوار ہو کر تم تک پہنچ سکا۔

"اس کے بعد کیا ہوگا" میں نے پوچھا۔

"چاہے کچھ بھی ہو میرا ارادہ تو یہ ہے کہ صبح کی پہلی گاڑی سے بنگلور چلا جاؤں" باقر نے بیان کیا۔ "کیا تم مجھے پچاس روپیہ قرض نہ دے سکوگے؟"

سید بادشاہ حسین (حیدرآباد دکن)

پریم کہانی بسلسلہ صفحہ ۲۳۰

(۶)

ایک ہفتہ بعد پریم سے میں نے شادی کر لی۔ اس واقعہ کو اب ایک سال گذر چکا ہے۔ میں اب ایک بچہ کی ماں بن چکی ہوں۔ لیکن اکثر مرتبہ کمار کی معصوم دلآویز شکل مجھے خواب میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتا ہے۔ اور میں ایک دم سوتے سے چونک اٹھتی ہوں۔ پھر تمام رات مجھے خوف سے نیند نہیں آتی۔ میرا ضمیر اندر ہی اندر مجھے ملامت کرتا ہے کہ میں نے شباب کی مستیوں سے لطف اندوز ہونے کی خاطر اس نیکدل شوہر کی پرواہ نہ کی۔ اور یاس و محرومی نے اسے جان دینے پر مجبور کر دیا۔

ساغر جعفری
بی۔ اے۔ ایل ایل بی

محبت کی فتح

کاظمی خاندان سیکڑوں برس سے شرافت اور نجابت میں مشہور چلا آتا تھا پُشت ہا پُشت سے ان کے ہاں اپنے خاندان ہی میں شادیاں ہوتی تھیں۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہم اصل نسل سادات ہیں جن میں کسی قسم کا میل نہیں۔ ان کے غرور کا یہ حال تھا کہ اور عام مسلمان تو پرے رہے وہ دوسرے سید خاندانوں کو بھی اپنے سے کم ذات سمجھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ جس نے اپنی بیٹی یا بیٹا غیر جگہ بیاہ دیا اس کی نسل خراب ہو گئی۔ وہ اپنے لڑکوں لڑکیوں کو بن بیاہا رکھنا گوارا کرتے مگر کسی دوسرے خاندان میں شادی نہ کرتے۔ ایک کم عمر بچی بوڑھے کھوسٹ سے بیاہنی منظور، ایک نوجوان لڑکی کو دودھ پیتے بچے سے شادی کرنا روا مگر اور کسی جگہ بیاہ کرنا خاندان کو داغ لگانا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خاندان جو کبھی ستر اسی آدمیوں کا تھا مختصر ہوتے ہوتے بالکل چھوٹا سا رہ گیا۔ اب صرف احمد کاظمی اور محمود کاظمی اس خاندان کے نام لیوا باقی تھے۔ محمود کاظمی اور ان کی بیوی سیدہ کچھ عرصہ سے حیدر آباد میں رہنے لگے تھے۔ اور احمد کاظمی اپنی لڑکی رشیدہ کے ساتھ سید نگر میں جو خود ان کی ملکیت تھا رہتے تھے اور کبھی کبھی دہلی جا کر اپنی کوٹھی احمد منزل میں قیام کرتے تھے۔

رشیدہ جب پیدا ہوئی اس وقت اس کی ماں گزر گئی تھی۔ اس کو ایک عورت کریمن نے پالا تھا۔ یہ ذات کی پٹھانی بڑی شریف اور وفادار عورت تھی۔ جس روز رشیدہ پیدا ہوئی اسی روز کریمن کے بھی ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی بیچاری کا خاوند دو مہینے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ احمد کاظمی نے رشیدہ کو اس کے سپرد کر دیا اور اس نے اس محبت اور پیار سے رشیدہ کو پالا جیسے سگی ماں پالتی ہے۔ رشیدہ کو بھی کریمن سے بڑی محبت تھی اس سے ایک دن بھی جدا رہنا گوارا نہ کرتی تھی۔ تاہم خاندانی غرور اس میں بھی موجود تھا۔ یہ بات اس کو نہ بھولتی تھی کہ کریمن ذات کی پٹھانی ہے اور وہ خود اصل نسل سیدانی۔

احمد کاظمی کو رشیدہ سے بہت محبت تھی۔ ان کی زندگی کی کل کائنات یہ لڑکی ہی تھی۔ ان کی محبت میں پدرانہ شفقت سے زیادہ مادرانہ محبت کا رنگ تھا۔ وہ اس بچی ہی کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ انھوں نے اسے اعلیٰ درجہ کی اردو فارسی اور عربی اور انگریزی تعلیم دلوائی تھی۔

اگرچہ رشیدہ نے گھر پر ہی تعلیم پائی تھی مگر وہ قابلیت میں بی۔ اے پاس لڑکیوں سے زیادہ تھی۔ وہ اپنی ماں اور باپ کی جائداد کی واحد وارث تھی۔ اپنے علاقہ کا انتظام وہ خود کرتی تھی اور اس عمدگی سے کہ احمد کاظمی جو خود بڑے منتظم تھے اس کی قابلیت کے معترف تھے۔ کریمن نے خانہ داری اور دستکاری میں بھی رشیدہ کو برق کر دیا تھا۔

احمد کے چھوٹے بھائی محمود کاظمی نے جوانی ہی میں اپنی اور اپنی بیوی کی جائداد برباد کر دی تھی۔ اور اب حیدر آباد میں دو ڈھائی سو کے نوکر تھے اور اسی میں اپنا گذارہ کرتے تھے۔ ان کا اکلوتا لڑکا اسلم عثمانیہ یونیورسٹی میں ایم۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ ایک وجیہ خوش شکل نوجوان تھا اس کے خیالات بلند اور ارادے اونچے تھے۔ تاہم ورثہ میں خاندانی غرور اسے بھی ملا تھا۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ ہم ذات میں سب سے اونچے ہیں۔ کوئی اور ہماری برابری نہیں کر سکتا۔

رشیدہ اور اسلم میں بچپن سے بہت دوستی تھی۔ ایک تو قریبی عزیز پھر ہم عمری کی وجہ اور سب سے بڑی بات یہ کہ دونوں کو سوائے ایک دوسرے کے اور کسی کے ساتھ کھیل کود کی اجازت نہ تھی۔ دس پندرہ برس کی عمر تک ان دونوں کا ہر وقت کا ساتھ رہا۔ اس کے بعد محمود حیدر آباد چلے گئے۔ اور ان دونوں رفیقوں میں جدائی ہو گئی۔ اسلم اگرچہ نئی جگہ جا کر بہل گیا۔ اسے نئے نئے دوست مل گئے۔ اب بھی اس کے دل میں رشیدہ کی یاد چٹکیاں لیتی رہتی تھی۔ جب سے اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی شادی رشیدہ سے ہو گی اسے رشیدہ کی یاد اور بھی بیقرار رکھنے لگی۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کب سید نگر جائے اور رشیدہ کو دیکھے۔ بارے وہ ایم۔ اے میں کامیاب ہو گیا اور اس کی ماں اس کے ساتھ سید نگر روانہ ہوئی۔

رشیدہ کو اسلم بہت یاد آتا تھا۔ جب وہ حیدر آباد گیا تو وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ وہ ہر وقت اداس رہتی۔ اور کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا۔ احمد بچی کی تنہائی اور پریشانی سے گھبرا گئے۔ انھوں نے طرح طرح سے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ کبھی گاؤں سے باہر لے جا کر گھوڑے کی سواری سکھاتے۔ کبھی اپنے ساتھ شکار کو لے جاتے۔ قسم قسم کے کھیل اس کے لئے منگائے۔ کئی ایک استاد اور استانیاں اس کے پڑھانے کو

ساقی کا سالانہ چندہ پانچ روپے اور ششماہی تین روپے ہے۔ ممالک بیرونِ ہند سے بارہ شلنگ۔ قیمت فی پرچہ چھ آنے

ساقی کے کبھی خاص نمبر شائع ہوتے ہیں۔ اُن کی قیمت مستقل خریداروں سے علیحدہ نہیں لیجاتی۔ نمونے کا پرچہ مُفت

جُرعات

جلد ۱۶ | ساقی دہلی۔ بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۷ء | نمبر ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہ اوّلین

بعض نئے مضمون نگار حضرات کو شکایت ہے کہ اُن کے مضامین ساقی میں شائع نہیں کئے جاتے. ساقی کے مضامین کے انتخاب میں نئے اور پُرانے لکھنے والوں میں کوئی خاص امتیاز نہیں کیا جاتا. جب کوئی مضمون آتا ہے تو سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ مضمون نگار نے لکھا کیا ہے، پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ لکھا کیسا ہے. کُہنہ مشق مضمون نگار لکھتے لکھتے یہ سمجھ گئے ہیں کہ انہیں کیا لکھنا چاہیئے اور کیا نہیں لکھنا چاہیئے. انہیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ کونسا پرچہ کس قسم کے مضامین شائع کرتا ہے چنانچہ رسالے کی روش کے مطابق لکھتے لکھاتے رہتے ہیں. نئے مضمون نگار عام طور سے ان امور کو مدِّ نظر نہیں رکھتے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے مضامین بالعموم واپس کئے جاتے ہیں. لیکن بعض نئے لکھنے والے تو ایسے ایسے پاکیزہ مضامین لکھتے ہیں کہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے. یہی وہ حضرات ہوتے ہیں جنکے سہارے آگے چلکر معیارِ صحافت قائم ہوتا ہے اور عرفِ عام میں یہ کُہنہ مشق کہلاتے ہیں. نئے لکھنے والوں کو مضامین کی واپسی سے بد دل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ آئندہ کوئی ایسا مضمون لکھیں جسے اڈیٹر اگر معاوضے کے ساتھ نہیں تو کم از کم شکریہ کے ساتھ قبول کرلے. ہاں یہ ضروری نہیں ہے کہ جو مضمون آپ لکھیں وہ شائع ہی ہو، اور اسی پرچے میں ہو جس کو آپنے بھیجا ہے. ہر پرچے کے اڈیٹر کی کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں. مثلاً اُسے اپنے پرچے کے پڑھنے والوں کے مذاق اور اُنکی توقعات کا بطور خاص لحاظ رکھنا پڑتا ہے. چنانچہ یہ لازمی نہیں ہے کہ جو مضمون ساقی میں شائع نہ ہو وہ کہیں اور بھی شائع نہ ہوسکے. خلقِ خدا تنگ نیست، پائے ترا لنگ نیست. ساقی ہی میں اس کی اشاعت پر کیوں اصرار کیا جائے؟ دوسرے لفظوں میں صرف ساقی ہی آپ کی عنایات کا مستحق کیوں ہو. آخر ساقی ہی کو آپکے مضامین شائع کرنے کا فخر کیوں حاصل ہو؟ اور رسائل نے ایسا کونسا قصور کیا ہے کہ اس سعادت سے محروم رہیں؟ اُردو رسالے کے اڈیٹر کو بدقسمتی سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ علاوہ خواستگارِ معافی ہونے کے وہ آپ کے عطیہ کی واپسی کی وجوہ بھی تفصیل سے بیان کرے. یہ غریب چیز (کیونکہ اس کی انسانیت میں بھی کافی شبہ کی گنجائش ہے.) صرف مضامین پڑھنے کی مشین نہیں ہے بلکہ اسے کاپیوں اور پروفوں کی تصحیح کے علاوہ اکثر منیجر کے فرائض بھی ادا کرتے پڑتے ہیں. ان میں سے بعض بدبختوں کو پرچے کی کتابت بھی خود ہی کرنی پڑتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈاک کا تھیلا بھی خود ہی لاد کرلے جانا پڑتا ہے. غرض اس مظلوم چیز کی جان پر اور عذاب کیا کم ہیں کہ آپ اپنی ناراضگی سے اسکی رہی سہی زندگی بھی اجیرن کر دیں. اس کے لئے یہی سزا کیا کم ہے کہ وہ آپ کے مشوروں سے محروم ہو جائے. اس کا قصور تو اسے لائق دار ہی ٹھہراتا ہے لیکن بعید از ترحّم نہ ہوگا اگر اس بدبخت کی جان بخشی فرمائی جائے اور اسے اس کے حالِ زار پر چھوڑ دیا جائے تاکہ از خود اپنے کیفرِ کردار کو پہونچ جائے. ع.

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

شاہد

(بسلسلۂ گذشتہ)

سمبلین

چوتھا منظر۔ روما کا شہر۔ فلاریو کا مکان۔

پوستی مس اور فلاریو اندر آتے ہیں۔

پوستی مس:۔ آپ کچھ خوف نہ کریں۔ بادشاہ برطانیہ کے پھر مہربان ہونے کا مجھے اتنا یقین ہے جس قدر کہ اِس بات کا یقین ہے کہ امیوجن کی عزّت اُسکے ساتھ رہیگی، کبھی اس میں فرق نہ آئیگا۔

فلاریو۔ بادشاہ کو اپنے اُوپر پھر مہربان کرنیکی کوئی تدبیر تم نے سوچی ہے؟۔

پوستی مس:۔ کچھ نہیں صرف وقت اور زمانے پر بھروسا ہے۔ ممکن ہے کوئی وقت ایسا آئے کہ مزاج میں تبدیلی واقع ہو۔ اسوقت تو میرے لئے جاڑا ہے جس میں کانپ رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ گرم موسم دیکھنا بھی قسمت میں اترا ہو۔ بجز ایسی اُمیدوں کے جن میں خوف زیادہ تر شامل ہے مَیں آپ کی اِس توجّہ اور محبّت کا کوئی بدل نہیں کرسکتا۔ اگر یہ اُمیدیں بھی غلط ثابت ہوئیں تو پھر میرے لئے موت سے پہلے آپ کے احسانات کا معاوضہ کرنا ممکن نہ ہوگا۔

فلاریو:۔ جو کچھ میں نے آپکے لئے کیا اُس کا معاوضہ آپ کی خوبیاں اور آپ کی یہ خوشگوار صحبت بخوبی ادا کر رہی ہے! ابتک تو آپ کے بادشاہ نے ہمارے قیصر اغسطس کا پیغام سُن لیا ہوگا۔ کاسئیس لوکیوس امیرِ سفارت بن کر گیا ہے۔ وہ اِس کام کو بڑی خیر و خوبی سے انجام دیگا۔ اور اُمید ہے کہ بادشاہِ برطانیہ قیصر کو خراج ادا کرنا منظور کرلے گا۔ اور جس قدر بقایا اس کے ذمّے ہے وہ کل ادا کر دیا جائے گا اور ایسا پیش نہ آئے گا کہ ہم رومانیوں سے برطانیہ والے مقابلہ کریں۔ پہلے جو کچھ گزر چکا ہے اُسے آپ کے برطانیہ کے لوگ ابتک افسوس کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

پوستی مس:۔ گو سیاسی تدابیر سے کما حقہٗ مجھے واقفیت نہیں مگر میرا یقین تو یہی ہے کہ آخرالامر دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ جائیگی۔ اور آپ بہت جلد سُنیں گے کہ فرانس میں جو رومانی فوجیں اِسوقت موجود ہیں وہ ساحلِ برطانیہ پر اُتر جائیں گی اور بجائے اسکے کہ خراج کا ایک حبّہ ادا کیا جائے یہی خبر سُننے میں آئیگی کہ لڑائی شروع ہوگئی۔ جس زمانے میں آپ کا بہادر جولیوس سیزر برطانیہ والوں کی کم مشقی فنونِ جنگ میں دیکھکر ہنسا تھا، گو اُن کی ہمت و شجاعت کو دیکھکر اس کی تیوری پر بَل پڑے جاتے تھے، اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ جب لڑائی میں مشق، اور اُن کی جوانمردی دونوں کو شامل کرکے اُن کی آزمائش کی جائیگی تو پھر وہ ایک ایسی قوم ثابت ہونگے جو زمانے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے۔

(یاچیمو اندر آتا ہے)

فلاریو:۔ دیکھئے یاچیمو بھی آرہا ہے۔

پوستی مس:۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہاز سے اترتے ہی نہایت تیز رفتار گھوڑوں نے آپ کو یہانتک پہونچایا ہے اور بحری سفر میں بھی چاروں گوشوں کی ہواؤں نے بادبانوں کو پھُلا کر آپ کے جہاز کی رفتار کو تیز کیا۔

فلاریو۔ یاچیمو آپ کی واپسی موجبِ مسرّت ہوئی۔

پوستی مس:۔ میں سمجھتا ہوں کہ واپسی میں اس قدر عجلت کا باعث جواب کا اختصار ہوگا۔

یاچیمو:۔ آپکی بیوی تو واقعی اتنی حسین ہیں کہ اُن سے زیادہ حسین عورت

تیری نظر سے کبھی نہ گزری تھی۔
پوستی مس۔ اگر وہ حسن و نیکی میں سب سے بڑھکر نہیں ہے تو کم بہتر ہو کہ وہ اپنے حسن سے دغاباز دلوں کو دھوکے میں ڈالے اور خود بھی دھوکے میں پڑکر مجھے فریب دے۔
یاچیمو۔ لیجئے یہ اُس کا خط ہے جو اس نے آپکو لکھا ہے۔
پوستی مس۔ مجھے اُمید ہے کہ وہاں سب خیریت ہوگی۔
یاچیمو۔ غالباً ایسا ہی ہوگا۔
فلاریو۔ ہاں یہ تو کہیئے جب آپ وہاں تھے جو کاسئس لوکیوس دربار برطانیہ میں پہونچ گیا تھا؟۔
یاچیمو۔ اس کا انتظار ہو رہا تھا مگر پہونچا نہ تھا۔
پوستی مس۔ یہانتک تو سب خیر رہی۔ اب فرمایئے کہ میرے اس انگوٹھی کے ہیرے میں وہی چمک ہے جو تھی یا اب اتنی چمک نہیں رہی، اور اب وہ اس قابل نہیں ہے کہ آپ اسے قبول کریں۔
یاچیمو۔ اگر میں اس ہیرے کا مستحق نہ ہوتا تو جو اشرفیاں میں نے شرط میں لگائی تھیں وہ آپ کی ہو جاتیں۔ جتنا سفر اس وقت کیا ہے میں تو اس سے دو چند سفر کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ ایک شب ایسی ہی شیریں عیش و نشاط کی برطانیہ میں بسر کرنے کو نصیب ہوتی کیونکہ اب آپ کی یہ انگشتری میں جیت گیا ہوں۔
پوستی مس۔ اس ہیرے کو جیتنا آپ کیلئے مشکل بات ہے۔
یاچیمو۔ مطلق نہیں۔ آپکی بیوی تک پہونچنا بہت آسان تھا۔
پوستی مس۔ یہ ہیرا اتنا سخت ہے کہ آسانی سے کسی کو نہیں مل سکتا۔
یاچیمو۔ آپکی خاتون کا حاصل کرنا بہت آسان بات تھی۔
پوستی مس۔ آپ اپنی ناکامی کو کھیل نہ سمجھیں۔ آپ سمجھ لیں کہ جو قرار اور معاہدہ ہم میں ہوا تھا اُس کے مطابق اب جان پر بازی لگا کر آپ کو مجھ سے لڑنا پڑیگا۔
یاچیمو۔ اگر اب اپنی واپسی پر میں یہ ثابت نہ کر سکوں کہ میں نے آپ کی بیوی پر قابو حاصل کر لیا تو پھر جان کی بازی لگا کر لڑنا خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ ورنہ ظاہر تھا کہ ہم کو جان پر کھیل کر لڑنا پڑتا۔ لیکن اب تو مجھے یہ دعویٰ ہے اور کہتا ہوں کہ آپ کی بیوی کی عزت اور آپ کی انگوٹھی کو میں جیت گیا ہوں۔ اس میں آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں نے آپکے ساتھ بدسلوکی کی ہے کیونکہ یہ جو کچھ ہوا ہے ہماری آپکی رضامندی سے ہوا ہے۔
پوستی مس۔ اگر ایسا ہوا ہے اور آپ اسے ثابت بھی کر دینگے تو پھر یہ ہاتھ موجود ہے، انگوٹھی آپ کی ہو جائیگی۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر جو بہتان آپنے میری بیوی پر لگایا ہے اور اسکی عزت کو داغ لگانا چاہا ہے اس کی سزا میں یا تو آپ کی تلوار میری ہو جائیگی یا میری تلوار آپکی۔ یا دونوں قتل ہو جائیں گے اور دونوں تلواریں بے وارثی ہو کر رستہ چلنے والے کے ہاتھ لگ جائیگی۔
یاچیمو۔ سنئے جناب جو کچھ میں نے دیکھا یا کہا وہ اتنا ہی سچ ہوگا جسقدر کہ میں اسے سچ ثابت کر سکوں۔ مجھے ثبوت میں قسم کھانے کی نوبت نہ آئے گی۔ واقعات سنکر آپ خود کہنے لگیں گے کہ کسی حلفیہ بیان کی ضرورت نہیں۔
پوستی مس۔ اچھا فرمایئے کیا دیکھا اور کیا کیا؟۔
یاچیمو۔ پہلے تو آپ کی بیوی کی خوابگاہ تھی، جہاں مجھے اتنا کہنا ضروری ہے کہ میں سویا نہیں۔ کمرے کی چیزیں دیکھنے میں مصروف رہا۔ وہاں کے دیوار پوش ریشمیں تھے اور روپہلی کام اُن پر بنا تھا۔ تصویر جو اِن دیوار پوشوں پر بنی تھی وہ ملکہ مصر کلیوپٹرا کی تھی جبکہ وہ اپنے رومن عاشق سے ملی تھی۔ دریائے کدنس طغیانی پر تھا۔ پانی کناروں سے اونچا ہو گیا تھا۔ پانی کی زیادتی یا کشتیوں کی کثرت یا محض غرور و نخوت اس طغیانی کا باعث معلوم ہوتا تھا۔ تصویر میں قوت و حسن اس درجہ تھا اور جو مال اس کے بنانے میں لگایا گیا تھا وہ اتنا قیمتی تھا کہ انسان حیران تھا کہ مصور کے حسنِ صنعت کی تعریف کرے یا قیمتی مال کی، جو تصویر میں لگایا گیا تھا تعریف کرے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ

مصوّر نے تصویر میں جان ڈال دی ہے۔

پوستی مس۔ بالکل سچ فرماتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان دیوار پوشوں کا ذکر آپنے مجھ سے یہاں یا کسی اور سے سنا ہو۔

یاپچیمو۔ ان کے علاوہ اور باتیں بھی تو ہیں جن سے میرے بیان کی تصدیق ہوگی۔

پوستی مس۔ بیشک۔ ورنہ آپ کی عزت معرضِ خطر میں ہو جائیگی۔

یاپچیمو۔ آتشدان کمرے کی جنوبی دیوار میں تھا اور وہاں ایک مجسمہ تھا جس میں پاکدامن دیوی ڈائنا پانی میں نہاتی دکھائی گئی ہے۔ ایسا حسین مجسمہ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا معلوم ہوتا تھا کہ اُس میں جان پڑی ہے اور وہ کچھ بات کرنے کو ہے۔ بت تراش بھی اپنے کمال میں فطرت کا ہمسر تھا، اور اس صنعت میں فطرت ہی کی شکل وہ بھی خاموش تھا، بجز اس کے کہ جان نہ ڈال سکتا تھا اور کوئی بات نہ چھوڑی تھی۔ سانس البتہ نہ تھا لیکن ترکیب اعضاء میں یہ شکل بالکل فطرت کے مطابق تھی۔

پوستی مس۔ لیکن یہ باتیں تو ایسی ہیں جو آپنے کہیں سُن لی ہونگی کیونکہ یہ مجسمہ وہاں بڑی شہرت رکھتا ہے۔

یاپچیمو۔ چھت پر سونے کی منبت کاری میں فرشتے بنے ہیں اور آتشدان کی جالی کے دونوں طرف جو مجسمے کھڑے ہیں اُنکا ذکر تو میں بھول ہی گیا تھا۔ یہ دونوں مجسمے خالص چاندی کے ڈھلے ہیں۔ عشق کیوپڈ کے ہیں آنکھیں اُن کی اندھی ہیں اور ایک ایک پاؤں پر بڑی نزاکت اور خوبصورتی سے کھڑے ہیں۔ دوسرے پاؤں مشعلوں پر ٹکے ہیں۔

پوستی مس۔ کیا آپ کے اس بیان سے اُس کی عفت میں کوئی خلل پیدا ہوتا ہے؟ میں نے مانا کہ یہ سب کچھ آپنے دیکھا اور آپکا حافظہ قابلِ تعریف ہے۔ آپکے اس بیان سے اس شرط میں کوئی فرق نہیں آتا جو آپ کر چکے ہیں۔

یاپچیمو۔ (جوشن اٹھا کر دکھاتا ہے) اِس زیور کو تھوڑی دیر دکھانے میں آپ مجھے معاف کریں گے۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں اپنی مشیخت کے لئے یہ حرکت کرتا ہوں۔ بلکہ جو کچھ میں نے کہا ہے اُس کے ثبوت میں پیش کرتا ہوں۔ اب میں اس جوشن کو پھر وہیں رکھے دیتا ہوں جہاں سے میں نے اُسے نکالا ہے۔ اور یہ زیور بھی اسی ہیرے کے ساتھ رہیگا جو آپ کی انگشتری میں ہے۔ اور دونوں چیزیں اب میرے ہی پاس رہینگی۔

پوستی مس۔ بخدا۔ ذرا مجھے اُسے بغور دیکھنے دیجئے۔ کیا حقیقت میں یہ جوشن وہی ہے جو میں نے اُسے دیا تھا۔

یاپچیمو۔ میں آپ کی بیوی کا ممنون ہوں جنہوں نے یہ جوشن اپنے بازو سے اُتار کر مجھے دیا۔ واللہ جس انداز سے اُسے بازو سے اُتارا تھا وہ صورت ابتک میری آنکھوں میں ہے۔ اس اندازوادا نے اس تحفے کی قیمت اور اس کی رونق بڑھا دی، اور کہتی تھیں کہ کبھی میرے دل میں اسکی بڑی قدر تھی۔

پوستی مس۔ ممکن ہے کہ یہ زیور اِس لئے اُتار کر دیا ہو کہ آپ اُسے مجھ تک پہونچا دیں۔

یاپچیمو۔ اپنا خط پڑھئے۔ کیا اُس میں ایسا کچھ لکھا ہے؟

پوستی مس۔ نہیں نہیں۔ خط میں کچھ نہیں ہے۔ آپ کا فرمانا سچ ہے۔ (ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر یاپچیمو کو دیتا ہے۔) اب تو میری نظر میں یہ انگشتری وہ مارِ قاتل ہے جس کے دیکھنے سے انسان مرجاتا ہے۔ بس آج سے کسی کو متوقع نہیں رہنا چاہیئے کہ عزت، حُسن اور وفا یا اسکی مشابہ صورتیں ایک ہی عورت میں مجتمع ہو سکتی ہیں۔ اور نہ اسکی توقع رکھنی چاہیئے کہ جب کوئی غیر مرد کسی کی بیوی کو بہلانے پھسلانے کی طرف مائل ہوگا تو پھر بیوی کی وفاداری شوہر کیساتھ قائم رہ سکتی ہے۔ اور آج سے یہی بات کہنی پڑیگی کہ عورتیں اپنے عہد و پیمان کی جن سے وہ عہد و پیمان کرتی ہیں پابند نہ رہینگی۔ وہ اپنی نیکیوں کیساتھ خود باوفا نہ رہینگی۔ اور اُنکے نزدیک پیمانِ وفا کی مجبوریاں کوئی چیز نہ ہونگی اُنکی نیکیاں کوئی چیز نہیں۔ اس بیوفائی کی بھی کوئی حد نہ رہی۔

فلاریو۔ ذرا صبر سے کام لیجئے۔ اتنی جلدی فیصلہ نہ فرمایئے۔ یہ انگوٹھی آپ ابھی اپنے ہی پاس رکھئے۔ یاچیمو آسے ابھی جدیا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ یہ جوشن آپکی بیوی نے کہیں کھو دیا ہو۔ ممکن ہے کہ اُس کی کسی خواص کو رشوت دیکر اُسے چرالیا گیا ہو۔

پوستی مس۔ ہاں درست ہے۔ ممکن ہے کہ کسی چور کے ہاتھ یہ جوشن پڑا ہو۔ پس میری انگوٹھی مجھے واپس دیجئے۔ اُسکے جسم کی کوئی علامت یا نشان بتلایئے، کیونکہ یہ زیور تو اسی کے پاس سے چرایا گیا ہے۔

یاچیمو۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کے بازو سے میں نے اُسے اُتارا ہے۔

پوستی مس۔ دیکھئے یہ قسم کھا رہے ہیں۔ وہ ضرور سچے ہیں۔ قسم ہے کہ انہوں نے قسم کھائی ہے۔ اب یہ انگوٹھی وہ اپنے پاس رکھیں۔ جو کچھ یہ کہتے ہیں سچ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ جوشن میری بیوی نے کہیں گم نہ کیا ہوگا کیونکہ اُس کی خواصیں سب عزت آبرو کی عورتیں ہیں اور وفاداری اور نیک خواہی پر حلف لے چکی ہیں۔ زیور چرانا ہرگز اُن کا کام نہیں اور چوری بھی کسی اجنبی کے کہنے سے کرنی اُنکے لئے ممکن نہیں۔ نہیں یاچیمو نے میری بیوی کے ساتھ لذتِ وصل حاصل کی ہے۔ اور یہ میری بیوی کی بیوفائی کا پورا ثبوت ہے۔ ہائے اُس نے اِس نقصان کیساتھ حرامکار ہونیکا خطاب بھی پالیا۔ لو اب اپنے کام کی اُجرت لو اور اسکی اُجرت کو تم اور دوزخ کے شیاطین باہم تقسیم کرلیں۔

فلاریو۔ ذرا صبر کرو۔ یہ باتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ اُس کی نیکی پر......

پوستی مس۔ بس اب اِس ذکر کو چھوڑیئے۔ اِس نے ضرور اُسکی آبرو ریزی کی ہے۔

یاچیمو۔ اگر آپ اور زیادہ ثبوت اس بات کا مانگتے ہیں تو سُنیئے، چھاتی کے نیچے، ہائے جس کے مساس میں کیا لطف آیا تھا ایک قدرتی نشان خال کی شکل کا ہے۔ اور اس تل کو اِس بات پر نازہے کہ ظاہر ہونے کیلئے کیا خوب جگہ ملی ہے۔ اپنی جان کی قسم میں نے اس تل کو چوما تھا اور اُسکے چومتے ہی وہ اشتہا دوبارہ پیدا ہوئی جسے پہلے سیر کر چکا تھا۔ پوستی مس آپ کو تو یہ تل خوب یاد ہوگا۔

پوستی مس۔ ہاں اِس تل سے ایک دوسرے داغ کا ثبوت بھی ملتا ہے جو اتنا بڑا ہے کہ اگر دوزخ میں سوائے اس کے کوئی دوسرا گناہ نہ ہو تو بھی وہاں نہ سما سکے۔

یاچیمو۔ آپ کچھ اور بھی سُننا چاہتے ہیں؟

پوستی مس۔ بس اب اس حساب کتاب کو بند کرو۔ ایک مرتبہ ہونا اور لاکھ مرتبہ ہونا ایک ہی بات ہے۔

یاچیمو۔ مَیں قسم کھانے کو تیار ہوں۔

پوستی مس۔ قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔ اب تو تم اگر یہ قسم بھی کھاؤگے کہ میں نے کچھ نہیں کیا تو میں تم کو جھوٹا سمجھونگا۔ اور اگر انکار بھی کروگے کہ تم نے مجھے ایسا شوہر نہیں بنادیا جس کی بیوی کے ساتھ تم نے زنا کیا ہے تو یقین جانو مَیں تمہیں جان سے مار ڈالونگا۔

یاچیمو۔ مَیں کسی بات سے بھی انکار نہ کرونگا۔

پوستی مس۔ اگر وہ اس وقت میرے سامنے ہوتی تو مَیں اُسکے پُرزے پُرزے کردیتا۔ جہاں وہ ہے اب مَیں وہاں جاؤنگا اور اُسکے باپ کے سامنے سرِ دربار یہی کچھ کرونگا۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور میرے ہاتھوں پیش آئیگی۔

(چلا جاتا ہے)

فلاریو۔ طبیعت قابو سے باہر ہوگئی۔ دل پر سے صبر کی حکومت اُٹھ چکی ہے۔ یاچیمو تم بازی جیت گئے۔ آؤ اُس کے پیچھے پیچھے چلیں اور جو غصہ اُسکو اِس وقت اپنے اُوپر ہے اُسے کسی طرح دُور کریں۔

یاچیمو۔ مَیں دل وجان سے چلنے کیلئے حاضر ہوں۔

پانچواں منظر۔ فلاریو کے مکان کا ایک دوسرا کمرہ۔

پوستی مس اندر آتا ہے۔

پوستی مس۔ کیا دنیا میں اس کے سوا دوسرا طریقہ نہیں کہ عورتیں مردوں کیساتھ نصف کی شریک سمجھی جائیں۔ ہم سب ولد الحرام ہیں۔ اور وہ مرد بزرگ و محترم جنہیں میں باپ کہتا تھا مجھے علم نہیں کہ میرا پیکر کب اور کہاں اور کس نے نقش کیا۔ معلوم نہیں کس سکہ بنانے والے نے اپنے اوزاروں سے مجھے ایک جھوٹا اور جعلی سکہ بنا کر رائج کیا ہو۔ لیکن میری ماں تو دیبی دانتا کی مثل پارسا اور پاکدامن عورت تھی اور بیوی کی حیثیت سے بھی اپنے وقت کی عدیم المثال عفیفہ تھی۔ ہائے انتقام! ہائے انتقام! جائز عیش و آرام سے اُس نے مجھے محروم کر دیا۔ لذائذ نفس سے مجھے منع کرتی رہی۔ تیرے چہرے پر شرم و حیا کی دو سرخیاں آتی رہیں جنہیں دیکھکر پیر فرطوط زحل کا مزاج بھی گرما جائے۔ میں تو تجھے ایسا پاک و عفیف سمجھتا تھا جیسے تازی برف آسمان سے گری ہو اور ابھی تک سورج اُس پر نہ چمکا ہو۔ کیا ممکن ہے کہ میں اپنی ذات میں وہ چیزیں دریافت کرلوں جو عورت کا زائیدہ ہونے کی وجہ سے مجھ میں ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ مرد میں کوئی تحریک جو اُسے بُرائیوں کی طرف راغب کرے ایسی نہیں جو عورت کی طرف سے اُس میں نہ آئی ہو۔ اِن بُرائیوں میں خواہ جھُوٹ بولنا ہو، خواہ خوشامد کرنا، خواہ دھوکا اور فریب دینا۔ یہ سب باتیں قُدرت کی طرف سے اُن میں آتی ہیں۔ ہوا پرستی مٹرے بُرے خیالات بھی طبیعت میں اُسی کی طرف سے آتے ہیں۔ انتقام کشی، حُبِّ جاہ و دولت، طرح طرح کے غرور و نخوت، بُری خواہشیں، غیبت، بدگوئی کے خیالات، غرض تمام وہ بُرائیاں جن کے نام لئے جا سکتے ہیں اور جن کی کیفیت شیطان ہی پر روشن ہے، یہ کُل یا ان کا کوئی حصّہ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ یہ کُل بُرائیاں صرف عورت کی طرف سے مرد میں آتی ہیں۔ عورتیں وفاداری میں ثابت قدم نہیں۔ اُن کی طبیعت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ ایک بُرائی جسے پیدا ہوئے ابھی ایک گھڑی بھی نہیں ہوتی دوسری بُرائی سے جو اس سے بھی کم دیر تک رہے گی بدل جاتی ہے۔ اب عورتوں کے خلاف مضامین لکھونگا اور ان سے ہمیشہ نفرت کرونگا۔ اُن پر لعنت بھیجونگا۔ اور میری سب سے بڑی نفرت کا اظہار اسی میں ہے کہ خدا سے دعا مانگا کروں کہ جو کچھ اُنکے دل میں ہے وہی وہ کرتی رہیں۔ اِس سے بہتر طریقہ اُن کو آزار پہونچانے کا غالباً شیطان کے پاس بھی نہ ہوگا۔ (چلا جاتا ہے)

جُزوِ ثالث

پہلا منظر۔ برطانیہ۔ قصر سمبلین کا ایک ایوان۔

بادشاہ اور ملکہ اور کلوٹن شاہی لباس پہنے ایک دروازے سے اور دوسرے دروازے سے کاسٹیس لوکیوس اور اُس کے ہمراہی داخل ہوتے ہیں۔

سمبلین۔ فرمایئے۔ قیصر اغسطس ہم سے کیا چاہتے ہیں۔

لوکیوس۔ ایک زمانہ ہوا کہ جولیوس سیزر جس کی یاد اب تک لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے اور جس کا تذکرہ ہمیشہ لوگوں کے کانوں اور زبانوں کو مسرور کرتا رہے گا اِس جزیرہ میں وارد ہوا تھا۔ اور اس جزیرے کو اُس نے تسخیر کیا تھا۔ اُسوقت کاسی بیلان آپ کے چچا تختِ شاہی پر متمکن تھے۔ اُن کی تعریف و توصیف سیزر کی زبان پر ہرگز اس سے کم نہ تھی جس قدر کہ بادشاہ موصوف کے کام اعلیٰ دارفع تھے۔ اور وہ حقیقت میں اسی تعریف کے لائق بھی تھے۔ بادشاہ برطانیہ کاسی بیلان نے اپنی طرف سے اور اپنے بعد

برطانیہ کے جو تاجدار ہوں اُنکی طرف سے تین ہزار پونڈ سالانہ بطور خراج کے سلطنت روما کو ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب کچھ عرصے سے یہ خراج ادا نہیں کیا گیا ہے۔

ملکہ:۔ مگر اب آپ کو حیرت پر یہ حیرت اور ہوگی کہ یہ خراج آئندہ بھی کبھی ادا نہ کیا جائے گا۔

کلوٹن:۔ جب تک دوسرا جولیس سیزر پیدا ہو اُس وقت تک تو بہت سے قیصر روما کے تخت پر بیٹھیں گے۔ برطانیہ اب خود اپنی ایک دُنیا ہے کسی کا محتاج نہیں۔ اور اب ہم خود زندہ رہنے کیلئے کسی کو کچھ نہ دینگے۔

ملکہ:۔ وہ زمانہ اب نہیں ہے جبکہ رومانیوں نے ہم سے خراج وصول کیا تھا۔ اب ہمارے حق میں زمانہ اتنا بہتر ہوگیا ہے کہ ہم کسی کو خراج دینا گوارا نہیں کر سکتے۔ بادشاہ سلامت۔ میرے آقا اور سردار حضور یاد فرمائیں کہ آپکے آباواجداد مع اُس شجاعت و تہوّر کے جو اِس جزیرے کے لوگ رکھتے تھے اپنے زمانے میں کیا کچھ نہ تھے۔ اور خود یہ جزیرہ وہ ہے جو رب البحر نیپٹیون کا باغ ہے جو بلند چٹانوں اور پہاڑوں کے حصار میں محفوظ ہے جس کے گرد سمندر کی پُرشور موجیں اُس کی حفاظت کرتی ہیں۔ جہاں کہیں کہیں ایسی دلدل ہے کہ جہاز اس میں چل نہیں سکتے۔ چلنا تو درکنار بڑے بڑے جہاز چوٹیوں تک اُس میں غرق ہو جاتے ہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہونگی کہ جولیس سیزر نے ہمارے اس جزیرے پر ایک زمانہ ہوا کہ ایک قسم کی فتح ضرور حاصل کی تھی لیکن یہ جزیرہ وہ نہ تھا جس میں سیزر غرور کے جملے کہتا کہ "میں آیا۔ دیکھا۔ اور فتح کر لیا" سخت شرمندگی کے ساتھ، اور تین مرتبہ یہ شرمندگی اُسے اُٹھانی پڑی کہ ہمارے ساحلوں سے اُسے پسپا ہونا پڑا۔ دو مرتبہ شکست کھا کر واپس ہوا اور ہمارے طوفانی سمندر میں اُسکے جہاز کاغذ کی ناویں معلوم ہونے لگے اور اُس کے جہاز موجوں کے تلاطم میں چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس طرح موجوں پر تیرنے لگے جیسے انڈے کے چھلکے ہوں۔ اِس خوشی میں کاسی بیلان شاہِ برطانیہ نے متلوّن تقدیر پر ایسا قابو پایا کہ سیزر کی تلوار اُس کے ہاتھ سے چھین لی۔ سرحد برطانیہ کے لوگوں نے اپنے شہر چراغاں کئے۔ اہلِ برطانیہ کی ہمتیں بلند ہوگئیں۔

کلوٹن:۔ سُنیئے جناب۔ اب خراج بالکل نہیں دیا جائیگا۔ ہماری سلطنت اُس وقت سے ہے جب آپنے ہمیں باجگذار بنایا تھا۔ اب طاقت و شوکت میں کہیں ترقی پکڑ گئی ہے۔ اور برطانیہ کے لوگ اب ہمت و عزم میں پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اب کوئی سیزر بھی موجود نہیں ہے جو ہم سے خراج وصول کرے۔ سیزر کی ناکیں گو لمبی اور ٹیڑھی ہوتی ہیں لیکن سچے اور سیدھے ہتھیار اب سوائے ہمارے دوسرے کے پاس نہیں۔

سمبلین:۔ فرزند۔ تم اپنی والدہ کو پوری بات کہہ لینے دو۔

کلوٹن:۔ ہم میں بہتیرے ایسے احمق ہیں جو تلوار کو بادشاہ کاسی بیلان سے بھی زیادہ مضبوطی سے پکڑتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ میں بھی انہی میں سے ہوں، لیکن یاد رہے کہ میرا بازو بھی کچھ کم نہیں ہے۔ خراج! کیسا خراج۔ ہم کیوں کسی کو خراج دیں؟ اگر سیزر میں اتنی طاقت ہو کہ کالے کمبل کا ٹکڑا سورج پر تان لے اور سورج کی روشنی اس طرح ہم تک آنے سے روک دے تو پھر روشنی کا محصول ہم ادا کرنا گوارا کر لیں گے۔ ذرا بادشاہ سلامت حضور سمجھ لیں کہ اب ہم کسی کو خراج نہیں دینگے۔

سمبلین:۔ آپ کو معلوم رہنا چاہیئے کہ جب تک آپکے منچلے اور گستاخ رومانی ہم سے جبراً خراج وصول کرنے پر آمادہ نہونگے ہم باجگذاری سے بالکل آزاد رہیں گے۔ سیزر کا شوقِ ملک گیری اتنا بڑھا ہوا تھا کہ دُنیا کے دونوں سروں تک وہ پہونچ چکا تھا۔ اُسنے بلا کسی وجہ کے ہمارے کندھوں پر خراج کا یہ جُوا رکھا تھا مگر اب ایک جری اور جنگ آور قوم کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس جوئے کو اتار پھینکے، اور ہم بھی اپنے کو دُنیا کی بہادر اور جوانمرد قوموں میں شمار کرنے لگیں۔

کلوٹن اور } ہاں۔ بلاشبہ ہم اپنے تئیں ایک جری اور
امرائے دربار } بہادر قوم سمجھتے ہیں۔

سمبلین:۔ تو پھر آپ قیصر کو اطلاع کر دیں کہ بادشاہوں میں ہمارا مورثِ اعلیٰ ملی تیوس تھا۔ اُس نے ہمارے لئے قوانین وضع کئے تھے۔ اور یہ اُس کے وضع کئے ہوئے قوانین کی پابندی تھی جس نے ہمارے ساتھ قیصر کی لڑائیوں میں بڑے بڑے خلل ڈالے۔ انہی قوانین کو اب دوبارہ زندہ کرنے اور آزادی کے ساتھ اُن پر کاربند ہونے میں اُس قوت و ہمت کے ساتھ دشمن سے لڑنا جو ہم اِس وقت رکھتے ہیں ہمارا سب سے بڑا کام ہوگا۔ خواہ یہ امر روما کی ناراضی ہی کا باعث کیوں نہ ہو۔ بادشاہ ملی تیوس نے ہمارے قوانین وضع کئے تھے اور وہ پہلا برطانوی تھا جس نے سونے کا تاج اپنے سر پر رکھا تھا اور جس نے اپنے تئیں بادشاہ کہا تھا۔

لوکیوس:۔ سمبلین مجھے افسوس ہے کہ یہ جو کچھ آپ نے فرمایا وہی مجھے قیصر اغسطس کے گوش گزار کرنا پڑیگا۔ یہ وہ قیصر ہے جس کے دربار کے خدام میں اتنے بادشاہ اور شہزادے ہیں کہ آپ کے پاس اتنے نوکر اور خدمت گار نہ ہونگے۔ اب وہ آپ کا دشمن ہوجائیگا۔ پس اب سُنیئے کہ میں قیصر کی طرف سے آپ کو اشتہارِ جنگ دیتا ہوں۔ اب اُس کا وہ قہر و غضب نازل ہوگا جس کا روکنا یا دفع کرنا غیر ممکن ہوگا۔ پس میں آپ کو قیصر کی طرف سے مخالفت اور مقابلے کی اطلاع دیتا ہوں۔ مگر اپنی طرف سے آپ کی خاطر و مدارات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سمبلین:۔ کاسئیس آپ کی تشریف آوری ہمارے لئے باعثِ مسرت ہوئی۔ آپ کا قیصر وہ ہے جس نے مجھے "نائٹ" کا خطاب دیا تھا۔ میری جوانی کا زمانہ زیادہ تر قیصر ہی کی خدمت میں گزرا ہے۔ یہ شان و عزت جو میں رکھتا ہوں درحقیقت اسی کا ایک عطیہ ہے، اور یہی چیزیں اب جبراً وہ مجھ سے چھیننی چاہتا ہے۔ اِس لئے تاحدِ امکان اپنی حفاظت کرنا میرے لئے لازمی ہے۔ مجھے علم ہے کہ پانونی اور دلماتی قوموں نے حفظِ مراتب کے لئے ہتھیار اُٹھائے ہیں۔ اس نظیر سے اہلِ برطانیہ اگر سبق نہ لیں تو وہ احمق اور ناسمجھ ثابت ہوں گے۔ لیکن قیصر ہمیں اتنا بیوقوف نہ سمجھے۔

لوکیوس:۔ اس کا ثبوت اہلِ برطانیہ کو دینا ہوگا۔

کلوٹن:۔ بادشاہ سلامت نے آپ کی تشریف آوری کو موجبِ مسرت فرمایا ہے۔ اب آپ ایک آدھ دن ہمارے پاس قیام رکھ کر ہمارے کھیل تماشوں اور تفریحات میں شرکت فرمائیں۔ اس کے بعد اگر آپ ہم سے لڑنے آئیں گے تو آپ کو ہمارے سمندر بہت گہرے نظر آئیں گے۔ اگر آپ نے ہمیں شکست دیکر ہمیں جزیرے سے نکال باہر کیا تو جزیرہ آپ کا ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس کوشش میں آپ شکست کھا گئے تو پھر سارے جزیرے کے زاغ و زغن آپ کو کھا کر خوب موٹے تازے ہو جائینگے اور اس طرح یہ کل قصہ خاتمہ کو پہونچ جائیگا۔

لوکیوس:۔ بہتر ہے تو پھر یہی سہی۔

سمبلین:۔ آپ نے اپنے آقا قیصر کا پیغام ہمیں پہونچا دیا۔ اب آپ ہمارا جواب قیصر کو پہونچا دیں۔ باقی جو کچھ ہمیں کہنا ہے وہ آپ کی تشریف آوری پر اظہارِ مسرت ہے۔

(سب چلے جاتے ہیں)

دوسرا منظر:۔ قصرِ شاہی کا دوسرا کمرہ۔ پسانیو ہاتھ میں ایک خط لئے آتا ہے۔

پسانیو:۔ افسوس۔ حرامکاری کا الزام یہ کیسا لٹکا یا ہے۔ یہ کیوں نہیں لکھا کہ کون شیطان ہے جس نے اُس پر ایسا بیہودہ الزام عائد کیا ہے۔ لیوناتوس۔ میرے آقا۔ یہ زہر کس نے تیرے کان میں بھرا ہے۔ وہ اٹلی کا کون خبیث ہے جس نے اپنی زہر آلود زبان اور زہریلے ہاتھوں سے تجھے جو ہمیشہ کانوں کا کچا تھا ایسا یقین

دلادیں؟ بے وفا! ہرگز نہ بیوفا نہیں۔ یہ سزا اُس کو صدق و وفا کی وجہ سے دی جارہی ہے۔ وہ ایک بیوی کی طرح نہیں بلکہ ایک دیبی کی طرح اپنی عفت و عصمت پر ایسے بے جا حملوں کے مقابلے کیلئے تیار ہے۔ اے آقا اب تیرا دل اس کی طرح سے ایسا کھوٹا ہوا ہے کہ میری تو تقدیر بھی اتنی کھوٹی نہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اُسے مار ڈالوں۔ تیرے حکموں کو سچائی اور محبت سے بجالانے کے جو علے میں نے کئے تھے تو کیا وہ یہی ہیں کہ میں اُس کی جان لوں، اُس کا خون کروں۔ اور اگر ایسے کام میں واقعی آپ کی کوئی اچھی خدمت بھی ہوتی تو میں اسے بجا نہیں لاسکتا تھا۔ اگر میری خدمتگذاری ایسے ہی کام میں رہ گئی ہے تو میں آپ کا خدمتگذار بننا نہیں چاہتا کیا میری صورت میں کوئی بات ایسی نظر آتی ہے کہ میں انسانیت سے خارج ہوکر ایسا بیدردی کا کام کرسکتا ہوں؟ (خط پڑھتا ہے۔)

"جو خط میں نے اُسے بھیجا ہے اُسے پڑھکر جو حکم وہ تمہیں دے گی اس میں تمہیں پورا موقع ملے گا" اے موذی کاغذ کے ٹکڑے جو سیاہی میں خط کی سیاہی سے بھی زیادہ سیاہ ہے۔ اے مہمل اور بے معنی چیز، کیا تو بھی ایسی بیدردی کے کام میں معاون و مددگار ہے۔ گو ظاہر میں تو صاف اور بے گناہ نظر آتا ہے۔ لو۔ ایموجن خود آرہی ہے۔ تجھے کیا علم ہے کہ میرے آقا نے مجھے کیا حکم بھیجا ہے۔

(ایموجن اندر آتی ہے۔)

ایموجن۔ پسانیو کہو کیسے ہو؟

پسانیو۔ حضور میرے آقا کے پاس سے ایک خط آیا ہے۔

ایموجن۔ تمہارا ہی آقا کیوں وہ تو میرا بھی آقا ہے۔ لیونتوس کوئی لائق سے لائق منجم بھی اختر شناسی میں اتنا کمال نہیں رکھتا ہوگا جس قدر کہ میں اپنے شوہر کے لکھے ہوئے حروف کو پہچانتی ہوں۔ ان حروف سے انجم فلک کی طرح آئندہ کے حالات منکشف ہونگے۔ میرے اچھے خداؤ۔ اس خط میں جو کچھ ہو وہ لذت عشق سے معمور ہو۔ اور یہ کہ میرا شوہر صحیح و تندرست ہے۔ خوش ہے۔ مگر خوش نہیں بھی ہے کیونکہ ہم دونوں جدا ہیں۔ یہی سب سے بڑا غم ہے۔ اور یہی غم کرنے دو۔ غموں میں بعض غم علاج پذیر ہوتے ہیں اور مفارقت کا یہ غم ایسا ہی ہے جس سے عشق توانا اور مضبوط ہوتا ہے۔ پس جو کچھ اس میں ہو اتنا ہی ہو۔ اے موم مُہر اجازت دے کہ تجھے توڑدوں۔ مبارک تھیں وہ شہد کی مکھیاں جنہوں نے رموز عشق کو مقفل کرنے کیلئے یہ موم پیدا کیا تھا۔ عاشق اور وہ مجرم جو تسکوں کی مہریں توڑکر قید خانے جاتے ہیں۔ مجرم تو قید خانے جاتے ہیں مگر تو نامۂ عشق کے اوراق کو مقید کرتا ہے۔ خدا کرے کہ خط میں اچھی خبر ہو۔

(خط کھولکر پڑھتی ہے۔)

"تمہارے باپ کا قہرناک انصاف اگر مجھے اُس کی سلطنت میں قدم رکھنے دے تو وہ میری موت کا اتنا باعث نہیں ہوسکتا جس قدر کہ اے میری سب سے عزیز جان تیری آنکھیں دیکھتے ہی پھر مجھے زندہ کردیں گی۔ اب میں کم بریا کے علاقے میں ملفورد ہیون کے مقام پر آگیا ہوں۔ اب جو کچھ تمہارا عشق تمہیں صلاح دے وہی کرو۔ تمہاری ہر خوشی اور مسرت کا جویاں اور اپنے قول و قرار پر ثابت قدم

میں ہوں تمہارا لیونتوس پوستی مس"

پسانیو، سنا تم نے۔ وہ تو ملفورد ہیون میں ہے۔ جاؤ کہیں سے ایسا گھوڑا لاؤ جس کے پر لگے ہوں۔ لو یہ خط خود پڑھ لو۔ اور فوراً بتاؤ کہ ملفورد ہیون یہاں سے کتنی دور ہے۔ اگر کوئی جس کا شوق ملاقات کم ہو اس راستے کو ایک ہفتے میں طے کرتا ہو تو پھر میں کیوں اس مسافت کو ایک دن میں پیادہ پا طے نہ کرلوں۔ اے وفادار پسانیو اگر تجھے اپنے آقا سے ملنے کا اتنا ہی انتظار ہے جس قدر کہ مجھ کو اپنے شوہر سے ملنے کا ہے تو یہ سچ ہے کہ تیرا انتظار میرے انتظار سے کم نہیں، لیکن وہ ضعیف قسم کا ہے۔

مگر میرا شوقِ ملاقات تو حد سے گزرا ہوا ہے۔ بس بتا اے عشق و الفت کے صلاح کار اور اپنے منہ سے جلد جلد الفاظ نکال کر میرے کانوں میں انہیں اس طرح بھر دے کہ وہ مبارک مقام ملفورد ہیون یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے۔ اور یہ بھی بتا کہ صوبہ ویلز جس میں یہ مقام واقع ہے کیونکر ایسا خوش نصیب ہوا کہ میرا محبوب اس وقت وہاں موجود ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سب سے پہلی بات سوچنے کی یہ ہے کہ ہم یہاں سے خفیہ طور پر کیونکر نکلیں۔ اور روانگی اور واپسی کے زمانے میں یہاں سے اپنی عدم موجودگی کا کیا عذر پیش کریں۔ سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہاں سے نکلنا کیونکر ہو۔ عذر و معذرت کے سوچنے کی ابھی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس پر تو بعد کو بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ بتاؤ کہ گھوڑے کی سواری کر ایک گھنٹے میں کتنا فاصلہ طے ہو جائیگا؟۔

پسانیو:۔ ایک سورج کے نکلنے سے دوسرے سورج کے نکلنے تک کوئی بیس میل طے ہو سکیں گے۔ شہزادی صاحبہ آپ کا اس تک پہونچنا سخت دشوار ہوگا۔ (علیحدہ کہتا ہے) خدا جانے اس تک پہونچنے میں کتنی دور اور جانا پڑے۔

ایموجن:۔ ہائیں رفتار میں اتنی سستی۔ اتنا سست تو کوئی مجرم بھی قتل ہونے مقتل کی طرف نہ جاتا ہوگا۔ میں نے تو گھوڑ دوڑ میں لوگوں کو شرطیں لگاتے سنا ہے جن کے گھوڑے اتنے تیز ہوتے ہیں کہ شیشے کے ساعت نما میں ریت بھی گر کر ان کی تیز رفتاری کو نہیں پا سکتا۔ مگر یہ سب باتیں بیکار ہیں۔ جاؤ اور میری خواصوں سے کہو کہ بیماری کا عذر کریں اور کہیں کہ وہ بادشاہ کے سلام کو گئی ہے۔ اور فوراً گھوڑے کی سواری والا لباس حاضر کریں۔ مگر وہ زیادہ قیمتی نہ ہو۔ جتنا کہ ایک معمولی زمیندار کی بیوی پہنے اس سے زیادہ قیمت کا نہ ہو۔

پسانیو:۔ حضور شہزادی صاحبہ پہلے اس بات پر اچھی طرح غور کر لیں۔

ایموجن:۔ میں نے خوب غور کر لیا ہے۔ اِدھر بھی دیکھا ہے اُدھر بھی۔ لیکن ہر طرف میری راہ میں ایک غبار سا حائل ہے جس پر سے میں گزر نہیں سکتی۔ ہر پہلو پر کوئی نہ کوئی خرخشہ لگا نظر آتا ہے پس خدا کے لئے جا اور جو کچھ میں نے کہا ہے وہی کر۔ زیادہ بات کرنے کی گنجائش نہیں۔ سوائے ملفورڈ پہونچنے کے اب کوئی دوسری بات نہیں۔

تیسرا منظر:۔ ویلز کا علاقہ۔ ملک پہاڑی ہے۔ پہاڑ میں ایک کہف ہے۔ کہف میں بلاریوس داخل ہوتا ہے گدریوس اور اورویرگس پیچھے پیچھے ہیں۔

بلاریوس:۔ آج کا دن تو اتنا اچھا ہے کہ گھر میں بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا اور گھر بھی وہ جس کی چھت اتنی نیچی ہو جیسے ہمارے گھر کی ہے۔ لڑکو جھک جاؤ۔ یہ دروازہ اِس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ خدا کی تعریف اور صبح کی عبادت میں خالق کے سامنے جھکو۔ بادشاہوں کے دروازے کی محرابیں بلند ہوتی ہیں کہ دیو اور جنات بھی کلاہ لگائے بغیر آفتاب کو سلام کئے ان میں سے گذر جائیں۔ مرحبا۔ اے خوش زمیں مرحبا۔

گدریوس:۔ مرحبا۔ اے بہشت بریں۔ مرحبا۔

اورویرگس:۔ مرحبا۔ اے فردوسِ بریں مرحبا۔

بلاریوس:۔ لڑکو! سامنے والے پہاڑ پر شکار کرنے چڑھ جاؤ۔ تم جوان ہو۔ ٹانگیں مضبوط ہیں۔ میں بھی میدان سے آتا ہوا تم تک پہنچ جاؤنگا۔ جب تم اوپر پہونچکر نیچے دیکھو گے کہ میں ایک چھوٹے پرندے کے برابر نظر آتا ہوں تو تمہیں معلوم ہوگا۔ کہ جس مقام پر تم ہو وہ کسی چیز کو بڑا اور کسی چیز کو چھوٹا کر کے دکھاتا ہے۔ جب اس بات کو محسوس کرو تو پھر وہ قصے یاد کرنا جو بادشاہوں اور بادشاہی دربارو لڑائیوں اور لڑائیوں کی چالوں اور حیلوں میں تمہیں سناتا رہا ہوں کہ کوئی خدمت اس وجہ سے خدمت مقرر نہیں کی جاتی کہ ایک خاص طور پر کی گئی تھی تا وقتیکہ خدمت لینے والا خدمت سے خوش!

ہی نہیں ہوتی۔ جب دُنیا کی باتوں کو اِس نظر سے دیکھو گے تو ہمیشہ اچھا سبق ملے گا اور ہم اس راحت کو محسوس کریں گے جو ایک ادنیٰ کیڑا اپنے پروں کے خول میں چُھپا بیٹھا محسوس کرتا ہے۔ اِس ادنیٰ کیڑے کو وہ راحت محسوس ہوتی ہو جو شاہینِ بلند پرواز کو نہیں، گو اُس کے پر مضبوط اور اُس کی پرواز بلند ہوتی ہے لیکن جب طوفان آتا ہے تو اِدھر سے اُدھر جھونکے کھاتا پھرتا ہے، ہماری زندگی بہ نسبت اُس شخص کی زندگی کے زیادہ راحت و امن کی ہے جو کسی اُمید کی خدمت میں رہتا ہے۔ اُس کی بدمزاجیاں برداشت کرتا ہے۔ ہماری زندگی زیادہ دولت رکھتی ہے بہ نسبت اُس کی زندگی کے جو رشوت لیتا ہے اور کچھ کام کر کے نہیں دیتا۔ ہماری زندگی زیادہ قابلِ فخر ہے بہ نسبت اس کے جو قیمتی لباس پہنتا ہے اور درزی سے جس نے پوشاک ایسی نفیس تیار کی ہے، اپنا ادب اور تعظیم کراتا ہے مگر اتنا نہیں ہو سکتا کہ درزی اپنے حساب کی کتاب میں قیمت کی وصولی درج کر دے۔ ایسی زندگی ہماری زندگی کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتی۔

گدریوس:۔ آپ یہ سب کچھ اپنے تجربے سے درست کہتے ہیں۔ ہم غریب جن کے پر و پُرزے ابھی تک نہیں نکلے ہیں ہم تو کبھی اپنے آشیانے سے دُور اُڑ کر نہیں گئے۔ ہمیں تو اِس آشیانے سے باہر کی ہوا تک نہیں لگی۔ ممکن ہے کہ ہماری زندگی بہترین ہو۔ اور آپ جو دُنیا کے گرم و سرد کو جھیل چکے ہیں، آپ کے نزدیک ہماری یہ زندگی زیادہ شیریں ہو اور وہ آپ کی زیادہ عمر کے مناسب حال ہو۔ لیکن ہمارے لئے تو وہ ایک لاعلمی کی کال کوٹھری ہے۔ ہماری سیر و سیاحت تو صرف اتنی ہے کہ بستر پر لوٹ لئے۔ یا وہ کسی قرضدار کا قید خانہ ہے جس کی حدود سے باہر وہ قدم نہیں نکال سکتا۔

اروبیریگس:۔ جب ہم آپ کی عمر کو پہونچیں گے تو کس بات کا ذکر کیا کریںگے۔ جاڑے میں جب دسمبر کا تاریک مہینہ آئے گا، باد و باراں میسر ہونگے تو اِس غار میں جو ہمیں کاٹے کھاتا ہے ٹھنڈ اور سردی کے اوقات کیا باتیں کر کے گذاریں گے۔ ہم نے تو دُنیا دیکھی ہی نہیں، جانوروں کا سا حال ہو گیا ہے۔ شکار کی ترکیبوں میں البتہ ہم روباہ سے کم نہیں اور جو شکار ہم کھاتے ہیں اُس کے حاصل کرنے میں ہماری خونخواری بھیڑیوں سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ ہماری ہمت و جوانمردی تو صرف اُس وقت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے جب ہم کسی شکار کو بھاگتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہم تو اپنے اس قفس کو ایک طائرِ خوشنوا کی طرح سرود گاہ بناتے ہیں۔ اور اِس قید میں بھی گیت گاتے ہیں گویا ہم آزاد ہیں۔

بلاریوس:۔ یہ تم کیسی نادانی کی باتیں کرتے ہو، اگر تم کسی شہر میں رہ کر وہاں کی لین دین، بیوپار کا ذاتی تجربہ رکھتے ہوتے یا کسی شاہی دربار میں شامل ہو کر وہاں کی سازشوں اور جرائم سے واقف ہوتے جن سے نہ علیحدہ ہوتے بن پڑتا ہے نہ رہتے تو تمہیں دُنیا کی حقیقت معلوم ہوتی۔ بادشاہی درباروں میں چوٹی پر پہونچنے کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ بلندی سے پستی میں گر و گے یا سمجھو کہ یہ چوٹی ایسی پھسلواں ہوتی ہے کہ ہر وقت گرنے کا خوف ساتھ لگا ہوتا ہے۔ اگر تم کو لڑائیوں کا تجربہ ہوتا جن میں محنت، مشقت ہر وقت خطروں کے تلاش کرنے میں صرف کرنی پڑتی ہے تاکہ عزّت و ناموری حاصل ہو تو پھر معلوم ہوتا کہ خطروں کی تلاش ہی میں یہ عزّت و ناموری ختم ہو جاتی ہے اور بدنامی کی یادگار بھی اسی طرح قائم ہو جاتی ہے جیسے کہ نیکنامی کی ہوئی تھی۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اچھے کاموں کا انعام بُرا ملتا ہے اور اکثر نیک کاموں کا انجام نفرت و بیزاری ہو جاتا ہے اور اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ ناکردہ خطاؤں پر سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ لڑکو! یہ کہانی دُنیا مجھ میں پڑھ سکتی ہے۔ میرے جسم پر رومانیوں کی تلواروں کے داغ اب تک موجود ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ بڑے بڑے لوگوں میں میرے کاموں کی شہرت اوّل درجے کی تھی۔ بادشاہ سمبلین مجھ پر نظرِ مہر رکھتا تھا۔ اور جب شجاعت و سپہ گری

کا ذکر آتا تو سب سے پہلے میرا نام لیا جاتا۔ اُس وقت میری شان اس درخت کی سی تھی جس کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے ٹوٹی پڑتی ہیں۔ مگر ایک رات ایسی آئی، جسے ڈاکوؤں کا طوفان کہو یا کچھ اور کہ میرے سب پھل گر گئے۔ پھل ہی نہیں گرے بلکہ پتے بھی سب جھڑ گئے اور موسم کی سختیاں جھیلنے کو میں بالکل بے برگ و بار ہو گیا۔

گدریوس:- ایسے انقلابات تو راسے کے ردّ و بدل سے پیش آیا کرتے ہیں۔

بلاریوس:- میرا قصور کچھ نہ تھا۔ اس کا حال میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ دو بدمعاشوں نے میرے خلاف جھوٹا حلف دیا۔ میری عزت و حرمت کا مطلق خیال نہیں کیا گیا اور جھوٹے حلف کا یقین کر لیا گیا۔ ان بدمعاشوں نے قسم کھا کر مجھ پر یہ الزام عائد کیا کہ میں رومانیوں سے مل گیا ہوں اور اس جُرم کو ثابت سمجھ کر مجھے جلاوطنی کی سزا دی گئی۔ اور اب بیس برس سے یہ پہاڑ اور اس کے متعلق جس قدر زمین ہے وہی میری دُنیا ہے۔ یہاں میں ایمانداری اور آزادی سے بود و باش رکھتا ہوں۔ اور یہاں میں خدا کے دیئے قرضوں کو ادا کرتا رہا ہوں جو پہلے کبھی ادا نہ کئے تھے۔ بس اب اُٹھو، اس پہاڑ پر چڑھ جاؤ۔ یہ باتیں جو اس وقت ہوئی ہیں شکاریوں کی سی نہیں ہیں۔ آج جو پہلے شکار ماریگا وہ آج کے کھانے پر میزبان ہوگا اور باقی دو بطور خدمتگار ان کے حاضر رہیں گے۔ اِس کھانے میں زہر کا اندیشہ نہ ہوگا جس کا اندیشہ درباری ضیافتوں میں اکثر رہتا ہے۔ جاؤ میں آگے کی وادیوں میں ملونگا۔

(گدریوس اور اراویرگس چلے جاتے ہیں)

دیکھو فطرت کی چنگاریوں کو تلپٹ کرنا کتنا مشکل ہے۔ ان لڑکوں کو خبر نہیں کہ وہ ایک بادشاہ کے فرزند ہیں اور نہ انکے باپ سمبلین کو علم ہے کہ اُس کے دونوں بیٹے زندہ سلامت ہیں۔ یہ لڑکے سمجھتے ہیں کہ وہ میرے ہی بچے ہیں۔ گو وہ ادنیٰ حالت میں اس غار میں رہتے ہیں جہاں جُھک کر انہیں داخل ہونا پڑتا ہے لیکن فطرت مجبور کرتی ہے کہ اس ادنیٰ حالت میں بھی، دوسروں کی بڑھکر امیر و سردار بنکر رہیں۔

بڑا لڑکا جسے سمبلین گدریوس کہتا تھا اور جو تخت برطانیہ کا وارث بھی ہے تم ہے کہ جب میں تین پائوں والے اسٹول پر بیٹھکر لڑائیوں میں اپنے کارنامے سُناتا ہوں تو جو کچھ میری زبان سے نکلتا ہے اُن میں گویا اُس کی رُوح جسم سے مفارقت کر کے جا پہونچتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہاں اس طرح دشمن زخمی ہو کر گرا اور اس طرح آپنے اُسی کی گردن پر اپنا پاؤں رکھدیا۔ یہ کہتا جاتا ہے اور بادشاہوں کا خون اُس کے رخساروں پر جھلکتا جاتا ہے۔ میری باتوں کو سُنکر اُن کے مطابق ایسے جوش و خروش سے حرکتیں کرتا ہے کہ پسینہ میں تر ہو جاتا ہے اس کا چھوٹا بھائی کا فرول جس کا نام بادشاہ نے اراویرگس رکھا تھا، وہ بھی اپنے بھائی کی طرح میری تقریر سُنکر حرکتوں اور جنبشوں میں اپنی جان لڑا دیتا ہے۔ اور ان حرکتوں سے بھی زیادہ پُر جوش الفاظ میں اپنے خیالات ظاہر کرتا ہے۔ سُنو۔ شکار اُٹھا ہے۔ اے بادشاہ سمبلین، خدا اور میرا ضمیر گواہ ہے کہ تُو نے میرے حق میں قطعی بے انصافی کر کے مجھے جلاوطن کر دیا۔ اس غصے میں میں نے تیرے دونوں بیٹوں کو جن میں ایک دو برس کا اور دوسرا تین برس کا تھا چُرا لیا۔ اِس خیال سے کہ جیسا تُو نے مجھے جلاوطن کر کے مجھے میری جائداد اور زمینوں سے محروم کیا ہے اس طرح میں بھی تجھے تیرے تخت کے وارثوں سے محروم کر کے لاوارث کر دوں گا۔ یوریفی جو ان کی دایہ تھی، یہ بچے اُسی کو اپنی ماں سمجھتے رہے۔ اب اسے دایہ یہ دونوں بچے روز تیری قبر پر جا کر تیرے حق میں دُعائے خیر کرتے ہیں اور مجھ بلاریوس کو جس کا نام اس وقت مورگن ہے، یہ دونوں اپنا باپ جانتے ہیں۔ شکار اُٹھا ہے۔

چوتھا منظر:- ملفورڈ ہیون کے قریب ایک گاؤں

کی زمین، پسانیو اور ایموجن داخل ہوتے ہیں ——

ایموجن۔ تم نے تو جب میں گھوڑے سے اتری ہوں کہا تھا کہ ملفورد کا مقام بہت قریب ہے۔ میری ماں نے بھی کبھی بچپنے میں میرا اتنا انتظار نہ کیا ہوگا جیسے کہ میں اس مقام کو دیکھنے کی منتظر ہوں۔ پسانیو! بتاؤ کہ پوسٹی مس کہاں ہے۔ پسانیو! تیرے دل میں کیا بات ہے، تو مجھے اس طرح گھورے جاتا ہے اور کیوں ایسی دردناک آہیں تیرے کلیجے سے نکل رہی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تو اس وقت سخت پریشان ہے اور اپنا حال کچھ زبان پر نہیں لا سکتا۔ اتنا خوف کیوں کھاتا ہے۔ ہمت سے کام لے کہیں تیری طرح اس خوفناک مقام کو دیکھکر میرے حواس بھی گم نہ ہو جائیں۔ بات کیا ہے۔ یہ کاغذ کیسا تو مجھے دیتا ہے؟ تیری نگاہیں اتنی نامہربان کیوں نظر آنے لگیں۔ اگر اس کاغذ میں کوئی اچھی خبر ہے تو خوش ہو، ہنس۔ اور اگر کوئی بری خبر ہے تو جو صورت —— تو نے بنائی ہے وہی رکھ۔ یہ خط تو میرے شوہر کا ہے، اس اٹلی بدبخت نے جہاں زہر دینے والے بہت رہتے ہیں زہر خورانی میں تمام ملکوں کو مات کیا ہے۔ تجھے کوئی مشکل درپیش ہے۔ پسانیو! تم کہتے کیوں نہیں۔ تمہارے بیان سے ممکن ہے کہ کچھ تو اس سخت حالت میں تخفیف ہو جائے جس کے پڑھنے سے ڈرتی ہوں کہ میری نوبت مرنے کی نہ ہو جائے۔

پسانیو۔ آپ خود ہی مہربانی فرما کر اسے پڑھ لیں تاکہ آپکو معلوم ہو کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں اور تقدیر مجھے کس ذلت و خواری تک پہونچانا چاہتی ہے۔

ایموجن۔ خط پڑھتی ہے "...... پسانیو! تیری بیگم نے میرے بستر پر میرے ساتھ بیوفائی کی۔ اس کا ثبوت مجھے ایسا ملا ہے، جس نے میرے دل کا خون کر دیا۔ میں کچھ واہی تباہی باتیں سنکر یونہیں لکھ رہا ہوں، بلکہ میرے پاس ایسا مضبوط ثبوت موجود ہے کہ جیسا میرا رنج و الم تیز و خوں آشام ہے اور مجھے اس کا اتنا ہی یقین ہے جیسے کہ انتقام کا انتظار ہے۔ پس پسانیو! اس نے یہ کام تجھے میری طرف سے کرنا پڑے گا، اگر تیرا ایمان اس کے گناہ سے نہ رنگا ہو تو تو اپنے ہاتھ سے اس کی جان لے۔ اور میں اس کا موقع تجھے ملفورد ہیون میں دیتا ہوں۔ میرا خط اس مضمون کا کہ میں وہاں جا رہا ہوں، پہونچ گیا ہے اگر تو تلوار کا ہاتھ لگانے سے ڈرا اور مجھے اس بات کا یقین نہ دلایا کہ تو نے اس کا سر قلم کر دیا ہے تو پھر میں تجھے اسکی حرامکاری میں قرم سمجھونگا۔ اور مجھے اپنی طرف سے ایک نمکحرام نوکر سمجھنے لگونگا۔

پسانیو۔ میں تلوار کیا کھینچوں گا۔ اس خط ہی نے اس کا گلا کاٹ دیا۔ ہائے تہمت و بہتان، تمہاری دھار تو تلوار سے بھی زیادہ تیز ہے۔ تمہاری زبان میں وہ زہر ہے کہ دریائے نیل کے کل سانپوں میں اتنا نہ ہوگا۔ تمہارا تنفس ہوا کے ساتھ دنیا کے چاروں گوشوں میں جھوٹی باتیں مشہور کرتا ہے۔ بادشاہ اور بادشاہ بیگمیں، ریاستیں اور سلطنتیں، بیاہی اور بن بیاہی عورتیں، یہی نہیں بلکہ قبر کے تاریک کونے کھنڈروں میں بھی بہتان کی آواز اپنا گذر کر لیتی ہے۔ شہزادی صاحبہ! حضور نے خط میں کیا پڑھا؟۔

ایموجن۔ میں نے اس کے بستر پر اس کے ساتھ بیوفائی کی۔ پسانیو! بیوفائی کس کو کہتے ہیں؟ کیا بیوفائی اس کو کہتے ہیں کہ راتوں کو جاگ کر اس کے لئے بیقرار رہوں اسے یاد کروں اور گھنٹوں تک اس کے لئے روتی رہوں؟ اگر نیند آئی بھی تو اسی کے خواب دیکھا کروں۔ اور خواب میں اسے دیکھتے ہی چونک پڑوں اور روتی ہوئی جاگ اٹھوں۔ کیا بستر پر بیوفائی اسی کا نام ہے؟۔

پسانیو۔ افسوس! اے نیکبخت خاتون۔

ایموجن۔ میں اور ... بیوفائی کروں۔ اے دل تو گواہ ہے۔ یاچیمو، جس وقت تو نے میرے شوہر کو حرامکار کہا تھا تو تیری

صورت خبیث ہوگئی تھی۔ اب خیال آتا ہے کہ نہیں، تیری صورت خاصی اچھی تھی۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ کسی خوشرنگ چڑیا نے، جسے فطرت نے نہیں بلکہ رنگ آمیزی نے حسین بنایا ہے تجھے اپنے دام میں گرفتار کر لیا ہے۔ میں غریب تو اب اس کے لئے تازہ پھول نہ رہی۔ میں تو اب ان پوشاکوں میں ہوں جن کا چلن جاتا رہا۔ میں تو ایک پہنی ہوئی پوشاک کی طرح اس قابل بھی نہ رہی کہ دیوار پر لٹکائی جاؤں۔ مجھے تو اب پھاڑ کر پرزے پرزے کرنا بہتر سمجھا گیا ہے۔ ہائے! مردوں کے عہد و پیمان، تم تو عورتوں کے حق میں قاتلوں کے خنجر ہو۔ تیری مہر و وفا کے وعدوں کی نسبت سوائے اس کے کیا سمجھا جائے کہ وہ سب فریب اور دھوکہ ثابت ہونے والے تھے۔ وہ ایسی چیز نہ تھی جو زمین سے قدرتی طور پر اگے، وہ تو عورتوں کو دام میں لانے کی باتیں تھیں۔

پسانیو۔ میری اچھی بیگم، میری ایک بات سن لیجئے۔

ایموجن۔ اینیاس کے زمانہ میں وہ لوگ بھی جو اچھے تھے اس وجہ سے برے اور بے ایمان سمجھے گئے کہ انہوں نے سچوں کی بات نہیں سنی اور سچے اس وقت جھوٹے سمجھے گئے جبکہ سینان نے رو رو کر تروجہ والوں کو مجبور کیا کہ وہ کاٹ کا گھوڑا شہر میں آنے دیں۔ تو پھر انہی جھوٹے آنسوؤں نے سچے آنسوؤں کو جھوٹا کر دیا جو دوسروں کی آنکھوں سے گرے تھے۔ اور حقیقی مظلومیت پر کسی کو رحم نہ آنے دیا۔ اسی طرح تو پوسٹی اس بلندی سے پستی میں گر کر دل اور ایمان رکھنے والوں میں اپنا برا اثر پیدا کر کے ان کو جھوٹا اور جھوٹی قسمیں کھانے والا بنائے گا۔ پسانیو! آ تو ایماندار ایمان کو سلامت رکھ۔ آ، اور اپنے آقا کا حکم بجا لا۔ پھر اگر اپنے آقا سے ملے تو کہنا کہ میں اس کے حکم کی کتنی پابند رہی ہوں۔ دیکھ میں خود تلوار نیام سے کھینچتی ہوں۔ اب یہ برہنہ تلوار اپنے ہاتھ میں لے اور میرے خانۂ دل میں اسے چلا اور سمجھ لے کہ

اب اس گھر میں سوائے غموں کے دوسری چیز نہیں، تیرا آقا جو اس گھر کی دولت تھا اب اس میں نہیں ہے۔ اس کے حکم کی تعمیل کر۔ تو اچھے کاموں میں تو ایسا بہادر تھا۔ اب کیوں بزدل بنتا ہے۔

پسانیو۔ دور ہو اے ظالم تلوار۔ میرے ہاتھ سے ایسا گناہ نہ کروا۔

ایموجن۔ لیکن مجھے مرنا ضرور ہے۔ تیرے ہاتھ سے نہ مری تو پھر تو اپنے آقا کا نمک حلال نہیں، خودکشی کے خلاف خدا کا حکم سخت ہے۔ اس وجہ سے یہ کمزور ہاتھ اور کمزور ہوگئے ہیں۔ آ، دیکھ سینے میں دل یہاں ہے۔ اس کے سامنے سے سب چیزیں ہٹائے دیتی ہوں کہ تیرا ہاتھ نہ رکے اور تیری تلوار میرے سینے میں اس طرح اتر جائے جیسے کہ وہ اپنے زبان نیام میں چلی جاتی ہے۔ ارے یہ کیا ہیں۔ یہ ہیں وفادار پوسٹومس کے صحائف عشق و وفا ہیں جو اب باطل ہو چکے ہیں۔ دفع ہو دور ہو اے میرے دین و ایمان کے غارت کرنے والو۔ تم اب میرے دل کا پردہ بن کر نہ رہو گے۔ اس طرح بے وقوف شاگرد، جھوٹے استاد کا یقین کر لیتے ہیں۔ وہ جن کے ساتھ بیوفائی کی جاتی ہے اس درد کی تیزی کو جلد محسوس کرتے ہیں لیکن دغاباز کے حق میں بھی یہ درد سخت رنج و تکلیف کا مقدمہ ہو جاتا ہے۔ لیوتتوس تیرے ہی لئے میں نے اپنے باپ کی نافرمانی کر کے اسے ناراض کیا اور بڑے بڑے شہزادوں کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی بلکہ ایسے وقوعے شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں۔ اس خیال سے افسوس ہوتا ہے کہ جب تو اس عورت سے جو اب تیرے پاس ہے بیزار ہو جائے گا تو تیرا دل مجھے یاد کر کے کیسا رنج و عذاب میں مبتلا ہوگا۔ پسانیو! مہربانی کر۔ مجھے قتل کر دو۔ بھیڑ قصائی سے پوچھتی ہے کہ تیری چھری کہاں ہے جب میں خود درخواست کرتی ہوں اور تو نہیں سنتا تو اس سے معلوم ہوتا ہے تو

اپنے آقا کا حکم بجالانے میں سستی کرتا ہے۔

پسانیو:۔ اے خاتون باوفا! جسوقت سے مجھے یہ حکم ملا ہے اُسوقت سے ابتک میری پلک نہیں جھپکی ہے۔

ایموجن:۔ پھر قتل کرکے سو کیوں نہیں رہتا؟

پسانیو:۔ ایسا کرنے سے پہلے بہتر ہوکہ میں اپنی آنکھیں نکال ڈالوں۔

ایموجن:۔ تو پھر تو نے اس کام کا قصد کیوں کیا تھا؟ خود آیا اور مجھے اتنی دُور تک لایا۔ گھوڑوں کو مفت میں تکلیف دی۔ وقت ضائع کیا۔ محل میں میرے غائب ہونے سے الگ ہلچل مچی ہوگی، اب میں واپس ہرگز نہ ہونگی۔ جو وقت اور موقع تیرے کام کیلئے مناسب ہے اُسے تو کیوں ضائع کرتا ہے۔ جب شکار زد میں ہے تو پھر کیوں مُنہ موڑتا ہے۔

پسانیو:۔ یہ سب اس لئے کہ وقت سوچنے کو مل جائے اور ایسی بیدردی کا مرتکب نہ ہوں۔ میں نے ایک تدبیر سوچی ہے۔ میری اچھی بیگم ذرا صبر سے اُسے سُن لو۔

ایموجن:۔ بکتے بکتے زبان تھکا ڈالی۔ کہہ، میرے کان تو سُن چکے ہیں کہ میں بیسوہ ہوں۔ اِس سے بڑھکر اُنکے لئے کیا زخم ہوگا اگر زخم کی تہ کو پہونچنے کی کوشش نہ کر لیکن جو کچھ کہتا ہے کہہ۔

پسانیو:۔ بیگم! یہ تو میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ آپ محل واپس نہ جائیں گی۔

ایموجن:۔ ضرور دل میں آیا ہوگا۔ کیونکہ تو تو مجھے قتل کرنے لایا تھا۔

پسانیو:۔ نہیں یہ بات ہرگز نہ تھی۔ اے کاش! جتنا میں ایماندار ہوں اتنی عقل بھی رکھتا ہوتا تو پھر آپ کو میرا مقصد بہتر شکل میں نظر آتا۔ بالکل ممکن ہے کہ میرا آقا کسی دھوکے میں آگیا ہو۔ کسی حرامزادے نے جو اپنے فن میں کامل ہو آپ کو اور آپکے شوہر کو یہ سخت اذیت پہونچائی ہو۔

ایموجن:۔ کوئی رومائی بیسوہ ہوگی۔

پسانیو:۔ نہیں۔ اپنی جان کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میں پوسٹی مس کو آپ کے مرجانے کی اطلاع دیتا ہوں اور ثبوت میں کوئی خون آلود چیز جیساکہ وہ طلب کرتا ہے بھیجدیتا ہوں۔ محل میں آپ کی تلاش ہوگی اِس سے اور بھی آپ کے مرنے کا یقین ہوجائے گا۔

ایموجن:۔ پسانیو! مگر یہ زمانہ میرا کیونکر کٹے گا۔ کہاں رہونگی۔ کیونکر جیونگی۔ اس زندگی میں چین و آرام کہاں نصیب ہوگا جبکہ شوہر سمجھے گا کہ میں مرچکی ہوں۔

پسانیو:۔ اگر آپ محل کو واپس گئیں۔ . . . .

ایموجن:۔ نہیں وہاں تو ہرگز نہ جاؤنگی نہ محل ہے نہ باپ ہے اور نہ اُس تُندخُو، ذلیل اور احمق کلوٹن سے کوئی مطلب ہے۔

پسانیو:۔ اگر آپ محل واپس نہ گئیں تو پھر برطانیہ کو بھی خیرباد کہنا ہوگا۔

ایموجن:۔ پھر تو ہی بتا کہ کہاں رہوں۔ کیا سورج سارا برطانیہ ہی پر چمکتا ہے کیا رات اور دن صرف برطانیہ میں ہوتے ہیں۔ دُنیا کی ضخیم مجلّد میں برطانیہ تھا مگر اب اُن میں نظر نہیں آتا۔ ایک وسیع تالاب میں بط بزرگ کا آشیانہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں تو ایسے انسان بھی ہیں جو برطانیہ سے باہر رہتے ہیں۔

پسانیو:۔ یہ خیال درست ہے اور میں خوش ہوا کہ آپ کے ذہن میں کوئی دوسری جگہ بھی آئی۔ روما کا سفیر لیوکیوس کل ملفورد ہیون میں آنے والا ہے۔ اگر آپ اپنی تاریک قسمت کی طرح اپنی طبیعت کو بھی ایسا بنالیں کہ آپکے دل کی بات تک کوئی نہ پہونچ سکے اور ایسی باتوں کو چھپائے رکھیں جن سے آپ کو خطرہ ہو تو پھر آپ کو موقع مل سکتا ہے کہ آپ پوسٹی مس کے قریب رہیں۔ گو وہ اپنے کام مخفی طریقے پر کرتا رہیگا مگر دوسروں کی زبانی آپ کو اُس کی نقل و حرکت کے حالات معلوم ہوتے رہینگے۔

ایموجن:۔ کاش یہی ہوتا۔ گو اس میں میری عزت و ناموس کو خطرہ ہوگا لیکن اُس کے بالکل تلف ہو جانے کا احتمال نہیں میں ایسے لئے تیار ہوں۔

پسانیو:۔ اب سُنئے بات یہ ہے کہ آپ اس بات کو تو بھول جائیں کہ آپ عورت ہیں اور کارفرمائی کی جگہ جس کی آپ کو عادت ہے، دوسروں کی حکم برداری اختیار کریں۔ خوف اور نفاست جو عورتوں کی سہیلیاں ہیں، بلکہ کہنا چاہیئے کہ حُسن و حیا کیساتھ اگر آپ ہمت و دلیری، حاضر جوابی، لڑنا بھڑنا، ترش مزاجی بھی سیکھ لیں نہیں بلکہ اپنے رُخساروں کے رنگ روپ کو بھی فراموش کر دیں اور اُن کی حفاظت و آرائش کی پروا نہ کریں اور سخت دل بن جائیں۔ افسوس اِس کے سوا دوسرا علاج نہیں۔ نورِ آفتاب جو ہر کہہ و مہ کے بوسے لیتا رہتا ہے آپ اپنا عارض بھی اُسے پیش کریں اور اُس محنت و توجہ کو جو چہرے کی آرائش و زیبائش میں صرف ہوتی تھی اور جس پر جونو دیبی کو بھی رشک آتا تھا ترک کریں۔

ایموجن:۔ جو کچھ کہنا ہے مختصر کہو۔ میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں اور ابھی سے مرد معلوم ہونے لگی ہوں۔

پسانیو:۔ لیکن اپنے کو مرد سمجھنے سے پہلے آپ مَردوں کی وضع قطع اختیار کریں۔ میرے تھیلے میں مرد کا لباس، یعنی کرتہ، ٹوپی، کمربند یا اور ایسی ہی چیزیں جو مردانے لباس سے متعلق ہیں موجود ہیں۔ پس مرد کا بھیس بدل کر جوان ہونے میں تو آپکے شبہ ہے نہیں۔ آپ شریف و نجیب کیسیوس لیوکوس کے سامنے جائیں اور اس سے ملازمت کی درخواست کریں اور اس کو بتائیں کہ کونسے کام آپ کو آتے ہیں۔ اور یہ بھی اُس سے کہیئے کہ موسیقی کا اگر آپ کو شوق ہے تو وہ بھی جانتی ہوں۔ اتنا سُنکر وہ خوش ہو کر آپ سے ملے گا۔ لیوکیوس نہایت معزز اور بڑا پارسا شخص ہے۔ رہا یہ امر کہ غیر مُلک میں جب آپکی بود و باش ہوگی تو ذریعہ معاش کیا ہوگا تو اِس کیلئے میں حاضر ہوں اور کبھی اس کے مہیا کرنے میں قاصر نہ رہونگا۔

ایموجن:۔ بیشک تمہیں میرے آرام کا فکر ہے۔ ہر حال میں خُدا مجھے روزی پہونچاتا رہیگا۔ پسانیو! اچھا اب تم جاؤ اور جتنی باتیں غور کرنے کی ہیں جہاں تک وقت اجازت دیگا ان پر غور کریں گے۔ جس کوشش پر اس وقت میں نے کمرِ ہمت باندھی ہے اُس پر میں عالی ہمتی سے کام لونگی۔ پسانیو۔ اچھا خُدا حافظ۔

پسانیو:۔ بیگم اب تھوڑی مدت کے لئے میں آپ سے رُخصت ہوتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں غیر حاضر رہنے سے سمجھا جائے کہ محل سے میں آپ کو کہیں لے گیا ہوں۔ اے نیک اور شریف شہزادی یہ ایک صندوقچی ہے جو ملکہ نے مجھے دی تھی، اس میں بڑی قیمتی دوا ہے اگر جہاز پر سفر کرتے ہیں، دورانِ سر ہو یا بھوک میں ناتوانی سے طبیعت مضمحل معلوم ہو تو تھوڑی مقدار میں اسے کھا لیجئے گا سب تکلیف دُور ہو جائے گی۔ اب کہیں درختوں کے سایہ میں جا کر یہ مردانہ لباس پہن لیجئے۔ خُدا امن و عافیت کی راہوں میں آپ کا ہادی و نگہبان ہے۔

ایموجن:۔ آمین۔ پسانیو! میں تمہاری شکر گذار ہوں۔

پانچواں منظر۔ سمبلین کے قصر کا ایک کمرہ۔

سمبلین، ملکہ، کلوٹن، کیسیوس سفیر، دربار کے اُمرا اور خُدام خاص داخل ہوتے ہیں۔

سمبلین:۔ بس جو کچھ مجھے کہنا تھا میں کہہ چُکا۔ اب آپ سے رُخصت ہوتا ہوں۔

لیوکوس:۔ شاہ عالی جاہ۔ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ قیصر کا فرمان میرے پاس آیا ہے کہ میں فوراً برطانیہ کو روانہ ہو جاؤں اور میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اب ہمارا قیصر آپکا دشمن ہے۔

سمبلین:۔ آپ سمجھ لیں کہ ہماری رعایا قیصر کے جوئے کو اپنی گردن

پر رکھنا گوارا نہیں کرتی۔ رہے ہم تو ہمارے لئے بادشاہی شانِ عظمت کو کم کرنا مناسب نہیں۔

لیوکوس:۔ اب مجھے خشکی میں سفر کرنے کا پروانۂ راہ داری ملفورد ہیون تک کا طلب کرنا ہے۔ ملکہ کی خدمت میں عرض ہے کہ خدا حضور کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔

ملکہ:۔ اور آپ بھی ہمیشہ شاد و آباد رہیں۔

سمبلین:۔ امرارِ دربار، آپ سفیرِ روما کو جہاں تک وہ کہتے ہیں ہماری شان و عظمت کیساتھ پہونچا دیں۔ لیوکوس خدا حافظ۔

لیوکوس:۔ حضور ہاتھ دیں۔

کلوٹن:۔ بادشاہ کے دستِ مبارک کو خلوصِ دل سے ہاتھ میں لیجئے۔ رہا میرا ہاتھ تو وہ اسوقت سے آپکا دشمن ہے۔

لیوکوس:۔ واقعات جو پیش آنے والے ہیں وہی بتائیں گے کہ انجام کار کون فتحیاب ہوا۔ اچھا۔ رخصت۔ خدا حافظ۔

سمبلین:۔ اُمرارِ دربار آپ سفیرِ روما سے اُس وقت تک جدا نہ ہوں جب تک کہ ہم دریائے سیورن کو عبور نہ کرلیں۔ خوش رہو لیوکوس۔

(لیوکوس سفیر اور اُمرا چلے جاتے ہیں۔)

ملکہ:۔ سفیرِ روما یہاں سے اپنی پیشانی پر شکن ڈالے گیا ہے لیکن ہمارے لئے یہ موجبِ فخر و مسرّت ہے کہ ہم نے اُس کو اپنی جبیں پر بَل ڈالنے کا موقع دیا۔

کلوٹن:۔ یہ تو خوب ہوا کیونکہ آپ کی بہادر رعایا برطانیہ کی یہی خوشی تھی۔

سمبلین:۔ لیوکوس نے قیصر کو یہاں کے لوگوں کے احوال سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب مناسب ہے کہ ہماری جنگی رتھ اور ہماری مرکب سوار فوجیں لڑائی کی تیاری میں مصروف ہوں۔ قیصر کی جو فوجیں اس وقت گالیہ (فرانس) میں موجود ہیں وہ تیار ہو کر اور رومانی لشکر فرانس میں آکر اُن سے مل جائے گا اور پھر فرانس سے برطانیہ پر لڑنے آجائے گا۔

ملکہ:۔ اس کام میں تاخیر نہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ پوری عجلت اور طاقت کیساتھ اُسکی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔

سمبلین:۔ چونکہ ہم بھی ایسا ہی سمجھ رہے ہیں اس لئے مقابلہ کیلئے پوری تیاری کی ہے۔ لیکن اے پیاری ملکہ ہماری بیٹی کہاں ہے؟ رومانی سفیر کے آنے پر جو دربار ہم نے کیا تھا اُس وقت وہ ہمارے سلام کو حاضر نہیں ہوئی۔ جب وہ ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم نے دیکھا ہے کہ وہ ہماری طرف اس طرح دیکھتی ہے گویا ہم از سر تا پا مجسّم کینہ و بُغض ہیں۔ یہ نہیں سمجھتی کہ ہم اُس کے بھلا چاہنے والے ہیں۔ اُسے یہاں طلب کیا جائے۔ کیونکہ ہم نے اُس کی بے ادبیاں اتنی گوارا کی ہیں کہ ہماری عظمت و بزرگی اب اسکی اجازت نہیں دیتی۔

(دربار کا ایک خادم ایموجن کو بلانے جاتا ہے۔)

ملکہ:۔ بادشاہ سلامت جب سے پوسٹی مس یہاں سے جلاوطن ہو کر چلا گیا ہے۔ ایموجن کی زندگی بالکل تنہائی میں گذرتی ہے اب حضور کچھ ایسا علاج کریں کہ یہ تنہائی کا مرض اُس کا رفع ہو اور اس بیماری سے وہ صحتیاب ہو۔ حضور سے یہ بھی التجا ہے کہ اس سے گفتگو میں سختی سے پیش نہ آئیں۔ وہ ایسی نازک مزاج ہے کہ ذرا سا سخت لفظ بھی اُسکے لئے ایک شدید صدمہ ہو جاتا ہے اور ہر صدمہ اُسے قریب الموت کر دیتا ہے۔

سمبلین:۔ ایموجن کہاں ہے۔ اور اپنی اس بے ادبی کا کیا عذر رکھتی ہے۔

خادم:۔ خداوندا شہزادی صاحبہ کے تمام کمرے مقفل ہیں میں نے بہت سے دروازے کھٹکھٹائے مگر جواب نہ ملا۔

ملکہ:۔ جب آخری مرتبہ میں اُس سے ملی ہوں تو کہتی تھی کہ اُسے تنہائی بہت پسند ہے اور یہ کہ اُسے معاف فرمایا جائے کہ ناسازیِ مزاج کی وجہ سے وہ حضور کے سلام کو بھی نہیں آسکی ہے حالانکہ

روبرانہ سامنے حاضر ہوکر اُسے آداب بجالانا ضروری تھا۔ اُس نے
جبھی کہا تھا کہ میں حضور کو اِس امر کی اطلاع کر دوں۔ لیکن رومانی
سفیر کے وارد ہونے سے جو دربار ہوا اُس کی مصروفیت میں آپ سے
عرض کرنا بھول گئی۔ یہ بھول میرا قصور ہے۔

سمبلین:۔ اُس کے کمروں کے دروازے کیوں مقفل ہیں اور وہ
موجود بھی نہیں ہے جو وہم میرے دل میں اُٹھ رہے ہیں خدا کرے
کہ وہ غلط نکلیں۔

(بادشاہ باہر جاتا ہے۔)

ملکہ:۔ کلوٹن میرے فرزند تم بادشاہ کے پیچھے پیچھے جاؤ۔

کلوٹن:۔ اُس کے نوکر پسانیو کو بھی میں نے دو دن سے نہیں
دیکھا۔

ملکہ:۔ جاؤ۔ دیکھو ہوتا کیا ہے۔ پسانیو جو اپنے آقا کا اس قدر
خیر خواہ ہے تیرے پاس میری دی ہوئی ایک دوا ہے خدا سے
امید ہے کہ اُس کی غیر حاضری اِس وقت اِس وجہ سے ہوئی کہ
اس نے وہ دوا کھالی ہو۔ کیونکہ وہ اِس دوا کو ہر مرض کیلئے
اکسیر سمجھتا ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایموجن کہاں گئی۔ ممکن ہے
کہ جب ناامیدی حد سے زیادہ گذری ہو تو جذبۂ عشق کے پر لگاکر
پوسٹی مس کی تلاش میں نکل گئی ہو۔ غرض مرنے یا اپنی عزت غارت
کرنے کو جو کچھ بھی ہو کہیں نکل ضرور گئی ہے۔ ہر صورت میں
میرا مقصد پورا ہوتا ہے اب تاجِ برطانیہ جس کو میں چاہونگی
اُس کو ملے گا۔

(کلوٹن اندر آتا ہے۔)

کہو فرزند کیا حال دیکھا۔

کلوٹن:۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ ایموجن کہیں بھاگ گئی ہے۔ اندر
جائیے اور بادشاہ کی تسلی کیجئے۔ اُن کی حالت تو سخت قہر و
غضب کی ہو رہی ہے۔ کسی کی ہمت نہیں کہ اُن کے قریب
جاسکے۔

ملکہ:۔ (علیحدہ کہتی ہے) خدا آج کی رات اس کو زندہ رکھکر دوسرا
دن نہ دیکھنے دے۔

(ملکہ باہر جاتی ہے۔)

کلوٹن:۔ ایموجن سے تو مجھے عشق بھی ہے اور نفرت بھی۔ وہ حسین ہے
اور شاہانہ مزاج رکھتی ہے متناسب اعضا میں وہ حُسن کوٹ کوٹ کر
بھرا ہے کہ کسی عورت بلکہ بہت سی عورتوں کو بھی یہ بات نصیب
نہیں۔ اُس کی ہر چیز تمام عورتوں سے بہتر ہے۔ اگر تمام عورتوں کا
حُسن ایک جگہ جمع کیا جائے۔ تو یہ حُسن بھی اُس کی خوبی و رعنائی کو
نہیں پہونچتا۔ یہ وجہ تو میرے عشق کی ہے اور نفرت کی وجہ یہ ہے
کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور اس خبیث پوسٹی مس نے
اُس کی عقل پر کچھ ایسا جادو کر دیا ہے کہ اُس کی تمام خوبیاں
غارت ہو چکی ہیں اور یہ وجہ ہے کہ میں اِس سے نفرت کرتا
ہوں۔ نفرت ہی نہیں بلکہ اس سے بدلا نکالنا چاہتا ہوں کیونکہ
جب احمق اور بیوقوف ——

(پسانیو اندر داخل ہوتا ہے۔)

کون ہے؟ کہاں جاتا ہے۔ ادھر آ۔ اے قرم ساق۔ حرامی۔ تیری
بیگم کہاں ہے۔ سچ سچ بتا۔ ورنہ تجھے ابھی جہنم کے بھتنوں کے
حوالے کر دونگا۔

پسانیو:۔ خیر باشد۔ یہ حضور کو کیا ہو گیا۔

کلوٹن:۔ بتا۔ تیری بیگم جس کا تو نوکر ہے کہاں ہے۔ قسم ہے یہ
بات ایسی ہے کہ ایک دفعہ پوچھکر پھر نہ پوچھونگا۔ یہ بھید اگر
تُو نے نہ کھولا تو تیرا دل چیر کر اس میں سے نکال لونگا۔ کیا وہ
پوسٹی مس کے پاس پہونچ گئی۔ پوسٹی مس کو وہ لے جس کے انبار
ذلت و سفاہت سے ایک رتی نیکی بھی کوئی نہیں نکال سکتا۔

پسانیو:۔ میری بیگم کب سے نہیں ملتی ہیں۔ پوسٹی مس تو آجکل
روما میں ہے۔

کلوٹن:۔ میں تو ایموجن کو پوچھتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ ذرا باہر

آ کر کھڑا ہو۔ بس اب سچی بات کہہ۔ ٹال نہیں۔ میرا اطمینان کر۔ آیموجن کو کون کھا گیا۔

پسانیو۔ اے میرے لائق آقا۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔

کلوٹن۔ یہی فرماتا ہوں۔ اے میرے لائق حرامزادے ابھی دیانت کرکے بتا کہ تیری بیگم کہاں ہے۔ اس کے سوا دوسری بات منہ سے نکلی، یا مجھے لائق آقا کہا۔ سچ سچ بتا ورنہ تیرے چپ رہنے پر تجھے موت کے حوالے نہ کیا ہو تو بات نہیں۔

پسانیو۔ تو پھر اس کاغذ کو پڑھیں۔ اس میں جو کچھ ہے اسکے سوا مجھے کچھ معلوم نہیں۔

(ایک خط کلوٹن کو دیتا ہے۔)

کلوٹن۔ اچھا میں پڑھتا ہوں۔ میں تو اس کا تعاقب قیصر کے تخت تک کرونگا، وہ سمجھی کیا ہے۔

پسانیو۔ (علیحدہ کہتا ہے) بجا ہے، ورنہ پھر آپ کے غارت ہو جانے میں کیے کلام ہو سکتا ہے۔ وہ یہاں سے بہت دور ہے۔ خط پڑھکر اس کے پیچھے آپ دوڑیں گے تو ضرور۔ مگر اسکو کوئی خطرہ نہ ہوگا۔

کلوٹن۔ ہائیں یہ کیا لکھا ہے۔

پسانیو۔ (علیحدہ کہتا ہے) مجھے تو اب ایموجن کے مرنے کا حال اپنے آقا کو لکھنا ہے۔ اور اے ایموجن خدا کرے تو تمام آفات سے محفوظ سفر کرتی رہے اور ایک دن خیریت سے تجھے یہاں آنا نصیب ہو۔

کلوٹن۔ بتاؤ۔ خط سچا ہے یا نری بناوٹ ہے۔

پسانیو۔ حضور میرے خیال میں تو ——

کلوٹن۔ لکھا ہوا تو پوسٹی مس کے ہاتھ کا ہے۔ اس کا خط میں پہچانتا ہوں۔ پسانیو! اگر تو بالکل ہی مدہوش نہیں ہے تو میرا ایک کام کر دے۔ اور جو جو کام میں بتاؤں ان کو پوری توجہ کے ساتھ انجام دے۔ مطلب یہ ہے کہ جتنی حرمزدگیاں کرنیکو میں کہوں بڑی سچائی اور صفائی کے ساتھ کرتا رہ۔ پھر اے دیانتدار پسانیو! تیرا شکریہ ادا کرونگا۔ اور ہر وقت تیری ترقی دولت کی سفارش کے لئے میں موجود ہوں۔

پسانیو۔ حضور فرمائیں کیا کام ہے۔

کلوٹن۔ سن جب تو نے اس لفنگے پوسٹی مس کی خدمت اتنے صبر و ثابت قدمی سے کی ہے تو پھر مقتضائے منت گذاری یہی ہے کہ تو میرا بھی محنتی اور جفاکش ملازم ہو جائے۔ بتا۔ تو میری ملازمت کیلئے تیار ہے؟

پسانیو۔ حضور اس ناچیز کو کب عذر ہو سکتا ہے۔

کلوٹن۔ واہ۔ واہ کیا بات ہے۔ اچھا ہاتھ لا۔ اور لے یہ میرے روپوں کی تھیلی اپنے پاس رکھ اور اتنا اور بتا کہ کیا تیرے پاس تیرے آقا کی کوئی پوشاک ہے۔

پسانیو۔ حضور ہے تو مگر مکان پر ہے۔ اور یہ پوشاک وہی ہے جسے پہنکر چلتے وقت وہ شہزادی ایموجن سے ملا تھا۔

کلوٹن۔ اچھا تیری پہلی خدمت یہ ہے کہ وہ پوشاک مجھے لادے اور بس پہلا کام جو تیرے کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ وہ پوشاک فوراً حاضر کرے، بس ابھی جا اور لا۔

پسانیو۔ حضور ابھی جاکر لاتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے۔)

کلوٹن۔ ــ مجھ سے ملفورد ہیون میں ملاقات کرے۔ ایک بات پسانیو سے پوچھنی بھول گیا۔ لو اب میں اسے یاد کئے لیتا ہوں۔ اے حرامی پوسٹی مس میں تو تجھے جان سے مارونگا۔ کہیں یہ پوشاک آ جکی تو بات تھی۔ ایک زمانہ ہوا کہ ایموجن نے کہا تھا۔ اور جو کچھ کہا تھا، اسکی تلخی اور ترشی آج زبان پر آتی ہے۔ کہا تھا کہ "پوسٹی مس کے پھٹے پرانے کپڑے بھی میرے دل میں اتنی وقعت اور عزت رکھتے ہیں کہ یہ میری نجیب و حسین صورت اور میرے شریفانہ خصائل میری نظر میں کچھ حقیقت نہیں رکھتے"۔ بس اب

انی پوستی مس کی پھٹی پرانی اترن میرے گلے میں ہوگی اور میں تیرے مزے لوٹتا ہونگا۔ پہلے تو پوستی مس کو تیرے سامنے قتل کردونگا۔ پھر وہ میری جسارت و جوانمردی دیکھے گی اور پھر میری یہ جسارت و دلیری اس کی نظر میں جس میں سوائے میری تحقیر و تذلیل کے دوسری بات نہیں، اس کی سخت اذیت اور موجبِ ندامت بنکر ظاہر ہوگی۔ جب پوستی مس زمین پر مرا پڑا ہوگا اور میں اس کے مُردہ جسم پر اپنی تقریر کرونگا جس میں اسکی توہین اور ذلت و خواری کے ساتھ اس کے قتل ہونے کا ذکر ہوگا اور پھر اُسے گھسیٹتا ہوا بادشاہ کے دربار میں حاضر کروں گا اور سرِ دربار خوش ہو ہو کر کہوں گا کہ ایموجن نے میری توہین و تذلیل کی تھی اور میں اب بدلا نکالکر نہایت خوش اور مسرور ہونگا۔

(پسانیو، پوستی مس کی پوشاک لیکر آتا ہے۔)

کیا یہی اُس کے کپڑے ہیں؟۔

پسانیو۔ حضور! اسی کے یہ کپڑے ہیں۔

کلوٹن۔ ایموجن کو ملفورڈ ہیون گئے کتنا زمانہ ہوا۔

پسانیو۔ ابھی تو وہ وہاں پہونچی بھی نہ ہونگی۔

کلوٹن۔ اچھا یہ کپڑے ہمارے کمرے میں لیکر حاضر ہو۔ اور یہ دوسری بات ہے جس کا حکم تمہیں دیتا ہوں۔ تیسرا حکم یہ ہے کہ جو تدبیریں اور چالیں تم ہماری دیکھو وہ ہرگز کسی پر ظاہر نہ کرو۔ بس میری خدمت کئے جاؤ۔ پھر تمہاری ترقی لازمی ہے۔ اس وقت تو مجھے ملفورڈ ہیون جاکر اپنا بدلا نکالنا ہے۔ کاش، آج کو میرے شانوں پر پر لگے ہوتے تو اڑ کر میں ہاں جلد سے جلد پہونچ جاتا۔ آؤ دیکھو۔ بے ایمانی نہ کرنا۔

(کلوٹن چلا جاتا ہے۔)

پسانیو۔ یہ تو آپنے میرے نقصان کی بات کہی۔ کیونکہ آپکے ساتھ وفاداری کرنی اپنے آقا کے ساتھ بے ایمانی کرنی ہے اور میں اپنے آقا کے ساتھ جس کے برابر سچا آدمی دوسرا نہیں، کبھی بیوفائی نہیں کرسکتا۔ ملفورڈ ہیون کو آپ جارہے ہیں ضرور تشریف لے جائیں۔ جس کی تلاش میں آپ جارہے ہیں وہ آپ کو وہاں کب ملتی ہے۔ اے خدا کی برکتو! اس پر برابر نازل ہوتی رہو۔ اس احمق کی راہ کھوٹی اور رفتار سست ہو۔ اور سوائے محنت و تکلیف کے اس کا دوسرا انجام نہ ہو۔

چھٹا منظر۔ ویلز کا علاقہ۔ بلاریوس کی کہف کے سامنے ایموجن لڑکوں کے سے کپڑے پہنے نظر آتی ہے

ایموجن۔ اب معلوم ہوا کہ مردوں کی زندگی بھی کیسا محنت و مشقت کا ایک نامختتم سلسلہ ہے۔ تھک کر چور ہوچکی ہوں۔ دو راتیں زمین کو اپنا بستر بنایا۔ میں تو بیمار ہو جاتی۔ مگر قصد اور ارادے نے سنبھالے رکھا۔ پہاڑ کی چوٹی سے جب پسانیو نے بتایا تھا کہ دیکھو وہ سامنے ملفورڈ ہے تو وہ بہت پاس معلوم ہوتا تھا۔ جب کوئی مصیبت کا مارا مسافر ایسے مقامات کے قریب آتا جاتا ہے کہ جہاں اُسے راحت و آرام نصیب ہو تو یہ مقامات اُس سے دُور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ راہ میں دو فقیروں نے بتایا تھا کہ جس راستہ پر جارہی ہو وہ ٹھیک ہے۔ غریب محتاج اپاہج اس بات کے سمجھنے میں کہ سفر کی صعوبتیں اُن کے گناہوں کی سزا یا نیکیوں کی آزمائش ہوتی ہے خطا کرتے ہیں لیکن اُنکی یہ خطا قابل حیرت نہیں۔ جبکہ خود آسودہ اور دولتمند مشکل سے کبھی سچ بات کہتے ہوں آسودگی کی حالت میں خطا کرنی زیادہ مجروح کرنے والی چیز ہے بہ نسبت اس کے کہ تنگدستی میں کوئی جھوٹ بولے۔ غلطی اور خطا بادشاہوں میں جتنی بڑی چیز ہے فقیروں میں نہیں ہے۔ اے میرے آقا اور شوہر اب تو تیرا شمار بھی انہی خطاکاروں میں ہے۔ اس وقت بھوک تھی مگر تیرا خیال آتے ہی بھوک جاتی رہی۔ لیکن اس سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ بھوک کے مارے گری پڑتی تھی۔ ذرا دیکھوں یہ کیا مقام ہے۔ یہاں سے تو ایک راستہ جاتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو کچھ عجیب وحشتناک

گھر سا معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہو کہ میں اندر نہ جاؤں۔ لیکن فاقے اور شدّت کی بھوک فطرت کو مجبور کر دیتی ہے اور انسان میں ہمّت پیدا ہو جاتی ہے۔ امن و ارزانی بزدل پیدا کرتی ہے۔ سختی اور مُصیبت ہمیشہ جوانمرد اور عالی ہمّت پیدا کرتی ہے۔ اے کوئی یہاں ہے اگر کسی کے دل میں خُدا کا ترس ہو تو بولے۔ اور اگر کوئی ایسا نہیں ہے تو پھر دام لے اور روٹی دے۔ کوئی یہاں ہے۔ کچھ جواب نہیں ملا۔ بس میں اندر جاتی ہوں۔ بہتر ہے کہ تلوار برہنہ کر لوں۔ اگر کوئی دُشمن ہے تو خُدا کرے اُسکا دل بھی میری طرح کمزور ہو..... (اندر جاتی ہے۔)

(بلاریوس۔ گدریوس۔ اور ویریگس اندر آتے ہیں)

بلاریوس:۔ پولیڈورنے تو آج اپنے تئیں بڑا زبردست شکاری ثابت کیا ہے بس آج کھانے پر وہ میزبان ہے اور میں اور کاڈول خدمتگار اور باورچی کی حیثیت رکھیں گے جیساکہ شروع میں ہم نے یہی تجویز کیا تھا۔ انسان محنت و مشقت میں کبھی اپنا پسینہ نہ بہاتا اگر اس کی مزدملنے کی اُسے اُمید نہ ہوتی۔ آؤ۔ بھوک ایسی تیز ہے کہ جو کچھ کھائیں گے اُس کا ذائقہ اچھا ہو جائیگا۔ تھکن میں اگر پتھر پر ہی پڑرہیں گے تو گہری نیند آئے گی۔ مگر جو عیش و آرام کے بندے ہیں اُن کو پروں کے نرم تکیے سخت معلوم ہونگے۔ خُدا اِس گھر میں ہمیشہ امن و سلامتی رکھے۔ اے غریب گھر جب ہم باہر تھے تو تو ہی اپنا نگراں تھا۔

گدریوس:۔ میں تو بہت تھک گیا ہوں۔

اروِیریگس:۔ تھکا تو میں بھی بہت ہوں۔ مگر بھوک کے مارے بُرا حال ہے۔

گدریوس:۔ کچھ اُبلا ہوا ٹھنڈا گوشت گھر میں موجود ہے۔ جبتک شکار پک کر تیار ہو اُسے کھا کر کچھ سہارا کر لو۔

بلاریوس (غار میں جھانکتا ہے اور کہتا ہے) ٹھیرو۔ اندر مت جاؤ۔ وہاں تو کوئی بیٹھا کھانا کھاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی پری ہے۔

گدریوس:۔ کیوں کیا بات ہے؟

بلاریوس:۔ قسم ہے۔ یہ تو کوئی فرشتہ ہے۔ اگر فرشتہ نہیں ہے تو حُسن و زیبائی کا بہترین نمونہ ہے بالکل نو عمر ہے۔ لڑکا معلوم ہوتا ہے۔

(ایموجن قریب آتی ہے۔)

ایموجن:۔ گھر کے اچھے مالکو۔ مجھے کوئی نقصان نہ پہونچاؤ۔ اندر قدم رکھنے سے پہلے میں نے آواز دی اور خیال تھا کہ جو کچھ میں نے اس وقت کھایا ہے وہ آپ سے مانگ لیتا یا بہ قیمت حاصل کرتا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے آپ کی کوئی چیز چُرائی نہیں، گو سونا چاندی فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ لیجیے جو کچھ میں نے کھایا ہے اُسکی قیمت حاضر ہے۔ میں تو کھانا کھاتے ہی یہ قیمت یہاں رکھدیتا اور جس کی وجہ سے اِس وقت یہ کھانا ملا ہے اُس کے حق میں دُعائے خیر کر کے جانے والا تھا۔

گدریوس:۔ روپیہ۔ روپیہ۔ اے نوجوان یہ تم کیا کہتے ہو۔ سونا چاندی دُنیا میں جتنا ہے خدا کرے وہ سب خاک ہو جائے! اُنکی قدر تو انہیں لوگوں میں ہوتی ہے جو ناپاک خداؤں کے ماننے والے ہیں۔

ایموجن:۔ آپ تو خفا ہونے لگے۔ اگر اس قصور میں آپ مجھے مار ڈالیں گے تو سمجھ لیجیے کہ اگر میں یہ قصور نہ کرتا تو خود ہی مر جاتا۔

بلاریوس:۔ آپ کہاں جاتے تھے؟

ایموجن:۔ ملفورد ہیون جانے کا قصد تھا۔

بلاریوس:۔ آپ کا نام کیا ہے؟

ایموجن:۔ میرا نام فدلی ہے۔ میرا ایک عزیز اٹلی جا رہا ہے۔ اس کا قصد ملفورد سے جہاز پر سوار ہونے کا ہے وہاں جا رہا تھا کہ رستے میں بھوک سے بیتاب ہو گیا اور یہ قصور مجھ سے ہوا کہ

آپ کے گھر میں داخل ہو کر کچھ کھانا کھالیا۔

بلاریوس:۔ اے حسین نوجوان! آپ ہم کو بالکل ہی وحشی گنوار نہ سمجھیے اور نہ اس وحشتناک مقام کو دیکھکر جہاں ہم رہتے ہیں، ہماری طبیعت کا اندازہ کیجیے۔ خوب ہوا کہ آپ یہاں آ گئے۔ اب تو خاصی رات ہو گئی ہے۔ سفر پھر شروع کرنے سے پہلے ہم آپ کی آسائش کا سامان کریں گے اور آپ کے یہاں قیام کرنے کے لئے شکر گذار ہونگے، اور جو کچھ ہمارے پاس حاضر ہے وہ نوش کیجیے۔ لڑکو! ان مہمان کے یہاں آنے پر اظہارِ مسرت کرو۔

گدریوس:۔ اگر آپ عورت ہوتیں تو میں برابر اس کوشش میں رہتا کہ آپ مجھے اپنا خادم تصور کریں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ عورت ہونے کی حالت میں مول لی جا سکتیں تو میں آپکی قیمت دینے کو تیار ہو جاتا۔

اردیریگس:۔ میں تو غنیمت سمجھتا ہوں کہ آپ مرد ہیں اگر عورت ہوتے تو خدا جانے آپ کے عشق میں کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑتیں، پھر میں تو آپکو اپنا چھوٹا بھائی سمجھونگا۔ اور آپ کا یہاں آنا ایسا ہی مبارک سمجھوں گا جیسا کہ بھائی کا آنا بھائی کے حق میں مبارک ہوتا ہے۔ اب آپ خوش ہوں کہ اس وقت آپ حلقۂ احباب میں ہیں۔

ایموجن:۔ حقیقت میں میں اس وقت دوستوں ہی کے نہیں بلکہ بھائیوں کے پاس ہوں (علیٰحدہ کہتی ہے) اے کاش تم میرے باپ کے فرزند ہوتے تو پھر باپ کی نظروں میں میری وہ حیثیت نہ ہوتی جو اب ہے۔ اور پھر پوستی مس سے میں درجہ مساوات پر ہوتی۔

بلاریوس:۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان کسی فکر اور تکلیف میں ہے۔

گدریوس:۔ کاش میں اسکی فکر و پریشانی کو دور کر دیتا۔

بلاریوس:۔ لڑکو سنو (کان میں کچھ کہتا ہے)

ایموجن:۔ کیسے دل والے یہ لوگ ہیں! اس غار کے سوا نہ انکے پاس ملک ہے نہ زمین، اس میں وہی بادشاہ اور بادشاہ کے درباری ہیں۔ اُن کی نیکیاں اور بھلائیاں وہی ہیں جو اُن کے دل اور ایمان نے اُن میں پیدا کی ہیں اور وہ اُس کی خدمت اور توجہ کو ناپسند کرتے ہیں جو خدا کی متلون مخلوق، بڑے لوگوں کے لئے ظاہر کرتی ہے بھلا وہ کہیں اِن دونوں جوانوں کی ہمسری کر سکتے ہیں۔ اے خدا مجھے معاف کر۔ میں تو اِن دونوں کا ساتھ دینے کے لئے اپنی جنس بدلنے کو تیار ہوں۔ پوستی مس تو بیوفا نکلا۔

بلاریوس:۔ (لڑکوں سے کہتا ہے) ہاں ایسا ہی ہونا چاہیے، لڑکو آؤ! جو شکار مار کر لائے ہیں اُسے پکائیں بھوک میں باتیں بھلی نہیں معلوم ہوتیں۔ جب پیٹ میں کچھ پڑ لے گا تو پھر اس مسافر کا قصہ جتنا وہ سنانا پسند کریگا سنیں گے۔

گدریوس:۔ آپ مہربانی کر کے قریب آجائیں۔

اردیریگس:۔ الّو کے لئے رات اور چکاوک کیلئے صبح کا نمودار اتنا مبارک نہیں ہوتا جتنا کہ آپ کا یہاں آنا ہمارے لئے مبارک ہوا ہے۔

منظر ساتواں:۔ عوام کے اجلاس کا ایوان۔ مجلسِ انتظامی کے دو ارکان اور حکام عدالت آتے ہیں۔

پہلا رکنِ مجلس:۔ قیصر کے فرمان کا مطلب یہی ہے کہ روما کی رعایا چونکہ اس وقت پانونیوں اور دلماتیوں کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف ہے اور گالیا (فرانس) میں جو رومانی فوجیں ہیں وہ باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی طاقت نہیں رکھتی ہیں۔ پس شرکار قوم کو اس جنگ کی طرف متوجہ کرنے میں قیصر نے کاسیس لیوکوس کو اس معرکہ کے لئے سپہ سالاری پر نامزد فرمایا ہے اور فراہمی فوج کے لئے اُسی کو کامل اختیارات عطا فرمائے ہیں۔ قیصر زندہ باد۔ قیصر زندہ باد۔

پہلا حاکم عدالت:۔ کیا فوجوں کا سپہ سالار لیوکوس ہے؟

دوسرا رُکن مجلس:۔ ہاں!۔

پہلا حاکم عدالت:۔ آج کل وہ فرانس میں ہے؟

دوسرا رُکن مجلس:۔ جن فوجوں کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے وہ تمہاری فراہم کردہ فوجوں کو کمک پہونچائیں گی۔ فرمان میں تمہیں اختیار دیا گیا ہے کہ تم کتنی فوج جمع کرو اور اس کو کس وقت لڑائی پر روانہ کرو۔

پہلا حاکم عدالت:۔ ہم اپنے فرائضِ منصبی ادا کرینگے۔

(باقی آئندہ) عنایت اللہ۔ دہلوی

فردوسِ خواب!

نشاطِ رنگ گھٹائیں اٹھیں، فضاؤں میں
ندی کے ساز سے اُمڈا، ترنّمِ مجذوب

سرور زائیاں پیدا ہوئیں، ہواؤں میں
شفق کے ساؤں کی تاثیر ہوگئی، مرطوب

وفورِ شوق سمایا، مری وفاؤں میں
نظر کے سامنے آیا، تصورِ محبوب!

دلِ خراب اٹھا، حُسن کی ضیاؤں میں
تخیلات کے انداز ہو گئے، مرغوب

نگاہ ڈوب گئی، کیف کی گھٹاؤں میں
ہوئے، فسُردہ نظارے مسرّتوں میں غروب

تفکرات کے تیور بنا رہا تھا، میں
جھلک اُٹھا تھا، نظاروں میں جلوۂ ماضی

جگر کی آگ کے شعلے دبا رہا تھا، میں
بھری ہوئی تھی، مگر ان میں غم کی سرجوشی

جمیل خواب کی بستی بسا رہا تھا، میں
مری نظر میں سمائی ہوئی تھی، شادابی

تعینات کے جھگڑے مٹا رہا تھا، میں
دل و نگاہ کی دُنیا ہوئی تھی، نورانی

کسی فریب کے کہنے سے گا رہا تھا، میں
"بہارِ رنگِ تصور کی کیف سامانی!"

مری بہار مرے قلب کے قریب ہوئی
مرے خیال کی آبادیاں ہوئیں، گلپوش

مجھے نشاط فشاں زندگی نصیب ہوئی
میں ہو رہا تھا، تماشائے خواب میں مدہوش

جنوں کی کیف طرازی بھی کچھ عجیب ہوئی
حیات رنگ ہوئے، مُردہ آرزو کے نقوش

حقیقتوں کی فضا درد کی طبیب ہوئی
ترانہ ہائے غم و سوز ہو گئے، خاموش

سکوں نواز مری کربتِ مہیب ہوئی
مرا حبیب ہوا، جلوۂ جمال فروش

وہ خواب عشق کا رنگیں مآل تھا، گویا
خیال تھا، تو حقیقت مثال تھا، گویا

حسین نجف

معارف

لب پہ شکوہ نہیں نالہ نہیں فریاد نہیں
مجھ کو معلوم ہے میں دہر میں آزاد نہیں
ہے یہی گلشنِ ہستی قفسِ تنگِ حیات
سب یہاں لٹ گئے کیوں لٹ گئے کچھ یاد نہیں

اتفاقات سے ہے نقشِ مرکب بنائے شہود
جی بہلا اس میں آپ نہیں ہے کوئی نیرنگیٔ نمود
لیکن اے صاحبِ ادراک ابھی ہو جائیں
ماسوا تیری حضوری میں یکایک نابود

اتفاقات سے ہے دہر کا ایجاد نہیں
دائرہ دام تو ہیں صورتِ صیاد نہیں
خود فراموش نہ ہو مرکزِ ہستی اپنا
خود بھی موجود ہے لیکن یہ تجھے یاد نہیں

نار وہ نور تھی آہ جب کہ طور نہ تھی
ن شعلۂ ازلی سے تشنہ شنید نہ تھی
دل سے اپنی نظر لگا کے غنا پاک کلیم
غیرانِ نورِ حسن ادا و تھی نہ تھی

امین حزیں

جذبۂ کور

کالج جاتے ہوئے بازارِ حُسن میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ دونوں طرف بالاخانوں پر بیٹھی ہوئی مختلف قسم کی عورتیں جاذبِ نگاہ کپڑے پہنے اپنی دلکش آرائش کی نمائش کیا کرتی تھیں، اور اُن کا حُسن جس میں معصیت اور بناوٹی معصومیت کی ملی جلی جھلک ہوتی، فروخت کیلئے برسرِ راہ تھا۔

بی۔ اے کا طالب علم اور اُنیس بیس سال کا نوجوان، اسلم سعید ابھی حُسن و عشق کی کشمکش سے ناواقف تھا۔ چند ماہ پہلے دونوں باپ بیٹے کالج ساتھ ساتھ جاتے تھے جہاں اسلم کا باپ سعید اخلاقیات کا پروفیسر تھا۔ اس لئے اور بھی اُس کی نظریں کسی شاہدِ رعنا پر پڑنے سے پہلے ہی فضا میں بھٹک جاتی تھیں۔ اب کچھ عرصے سے دونوں کا ساتھ نہیں ہوتا تھا اور کالج آتے جاتے اسلم کی معیت میں عموماً بے تکلف دوست —— کالج کے منچلے نوجوان —— ہوتے جن کے لئے دوسروں کی نگاہیں بچاکر کسی جوان عورت کو ایک نظر دیکھ لینا لازمۂ شباب تھا۔ تمام راستے دلفریبیٔ حُسن اور لذّتِ عشق پر گفتگو رہتی اور گاہے گاہے کنکھیوں سے بالاخانوں کی زیارت بھی کرلی جاتی تھی۔ کبھی کوئی اپنی جھوٹی آپ بیتی سُناتا اور کبھی سستے ناولوں کے جذبات کو بھڑکانے والے رومان دُہرائے جاتے۔ اسلم نے حسبِ عادت پہلے پہل تو ان رنگین باتوں ... میں کوئی دلچسپی نہیں لی لیکن رفتہ رفتہ وہ اُن کو مزے لے لیکر سُننے لگا اور کبھی کبھار جب طبیعت جولانی پر ہوتی تو عشق کی کارفرمائی سے متعلق ایک آدھ شعر بھی سُنا دیتا۔ پھر بے معنی قہقہے شروع ہوتے اور آپس میں رائے زنی کی جاتی اور بالآخر سب اپنے اپنے گھروں کو رُخصت ہوجاتے۔

پھر ایک دن وہ آیا جس کی واردات سے یہ افسانہ مُرتّب ہوا۔ اسلم کی نظریں، جن میں جوانی کی لہر آچکی تھی، بالاخانوں پر پڑتے پڑتے ایک کم عمر پیکرِ جمال پر مرکوز ہوگئیں جس کے نقوش، ایک دفعہ دیکھ لینے کے بعد ہمیشہ کے لئے لوحِ قلب پر مرتسم ہوجاتے تھے۔ پندرہ سولہ کی عُمر، سڈول جسم، سُرخ و سفید رنگ، خوبصورت مکھڑہ، چہرے پر شادابی، لبوں پر نزاکت، آنکھوں میں شوخی —— گویا جوانی حُسن میں سے پھُوٹ پھُوٹ کر نکل رہی ہے۔ مطلع ابر آلود تھا اور کیف آور فضا ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ اسلم خیالات میں کھویا ہوا کالج جارہا تھا اور اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خواب کے سمندر میں موجیں اُٹھ اُٹھ کر دامنِ کوہ سے ٹکرارہی ہیں۔ چلتے چلتے وہ یکایک چونکا ...... وہی جانِ جہاں ہلکی دھانی ساری میں ملبوس موٹر سے اُتری۔ آس پاس کے وہ لوگ بھی جن میں ابھی جوانی سسک رہی تھی، اُسے ندیدی نظروں سے گھُورنے لگے۔ اُس نے اسلم پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور مُسکرا کر فوراً ہی سامنے سے گذر کر اپنے بالاخانے پر چلی گئی۔ اسلم مورت بنا ساکت کھڑا رہا۔ اس کے جذبات کا طوفان تعلیم اور مذہب کے بند توڑ دینا چاہتا تھا —— دفعتاً تھوڑے فاصلے پر ایک بالاخانے سے شور و غل بلند ہوا اور ایک دردناک چیخ فضا کو چیرتی ہوئی اسلم کے کانوں میں گونجی —— کسی عروسِ بازاری کے آستانے پر اُسکے رقیبوں میں لڑائی ہوگئی تھی جس کا ہولناک انجام یہ ہوا کہ ایک شخص نے اپنے رقیب کے چھری بھونک دی۔

(۲)

کالج پہونچکر اسلم کو معلوم ہوا کہ ہال میں اخلاقی درس سے متعلق اُس کے باپ کا لکچر ہو رہا ہے۔ پروفیسر سعید کا لکچر! اسکی مؤثر اور دلکش آواز، مناسب اور عمدہ الفاظ، بلند اور فلسفیانہ خیالات اُس کی تقریر کے خاص جوہر تھے، جسے سننے کے لئے چھوٹا اور بڑا، متعلم اور معلم، سب ہی بے چینی سے منتظر رہتے تھے۔

لکچر ختم ہونے کے بعد آپس میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ ایک پروفیسر کہنے لگا "آج سعید بڑے جوش میں تھے"۔ دوسرے نے جواب دیا "جوش میں ہوتے کب نہیں؟ یوں کہو کہ آج جو انہوں نے اپنے لئے موضوع منتخب کیا وہ نہایت اہم اور حسب حال تھا"۔

تیسرے صاحب بولے "اس موضوع پر اس سے بہتر تقریر نہیں ہو سکتی"۔

ایک طالب علم نے دوسرے کے شانے پر ہاتھ رکھکر کہا "دیکھا، ظالم نے کیسی دوشالے میں لپیٹ کر ماری ہیں؟ تم آج کے لکچر سے عبرت حاصل کرو، تم کو اپنی جوانی پر بہت گھمنڈ ہے"۔

"جوانی پر گھمنڈ کرنا تو کوئی عیب نہیں"۔ ایک بے تکلف دوست لاپرواہی سے بولے: "ہاں جیسا کہ پروفیسر صاحب نے کہا نظر بازی نہیں کرنی چاہیئے"۔

"نہیں بھئی، یہ تو انکی زیادتی تھی"۔ ایک اور صاحب نے گویا مسکت جواب دیکر معاملہ ختم کر دیا۔

اسلم عجب خلجان میں تھا۔ صبح کو یہ بیتی اور اب باپ نے یہ درس دیا۔ تمام دن طبیعت پریشان رہی اور کالج کے روکھے پھیکے لکچر دلچسپی سے یکسر خالی رہے۔ کبھی حسن کی شوخی اس کے نوآموز محبت دل میں تڑپ پیدا کرتی اور کبھی باپ کی تقریر کا خیال اُسکے جسم میں ایک تھرتھری سی پیدا کر دیتا۔ ایک گوشے میں تنہا بیٹھا ہوا وہ تقدیر کی ستم ظریفی پر غور کر رہا تھا کہ خیالات اس کے دماغ میں گردش کرنے لگے اور باپ کے الفاظ اس طرح سنائی دینے لگے گویا سعید اسی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے "...... جوانی قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے، اس کے کھو جانے کے بعد دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت اس کی تلافی نہیں کر سکتی...... بچپن اور بڑھاپا یکساں اور لایعنی زمانے ہیں جن میں انسان دوسروں کا محتاج رہتا ہے۔ جب تم بچے تھے تو تمہاری نگاہیں والدین پر رہتی تھیں کہ ماں تمہارا پیٹ بھر دے اور باپ تمہارا تن ڈھک دے۔ جب بوڑھے ہو جاؤ گے اور تمہارے ہاتھ پاؤں جنبش کرنے کے بھی قابل نہ رہیں گے اس وقت مجبور ہو گے کہ تمہاری اولاد اپنے بال بچوں کو دے چکنے کے بعد جو کچھ بھی تمہیں کھانے اور پہننے کو دیدے اُسے بصد خوشی قبول کر لو...... لیکن جوانی وہ عمر ہے جب تم آزاد اور خود مختار ہوتے ہو، جہاں چاہا رہے، جو چاہا کھایا اور جیسا چاہا پہنا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب انسان کی زندگی بنتی یا بگڑتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جوانی زندگی کا امتحان ہے، پاس ہو گئے تو انسان، اور فیل ہوئے تو شیطان! وہ شیطان جس پر ہر وقت اور ہر طرف سے لعنت و پھٹکار برستی ہو...... سولہ سے چوبیس سال تک! یہ وہ عمر ہے جب خدا انسان کی طرح طرح سے آزمائش کرتا ہے، ذرا پاؤں ڈگمگایا اور چاروں طرف پھیلے ہوئے زہریلے کانٹوں نے لہو لہان کر دیا...... اور پھر اس راہ پر حسن کی آغوش میں عشق مچلتا نظر آتا ہے...... جوانی

انگڑائی لیکر بیدار ہوتی ہے اور بھولے بھالے نوجوان صحیح راستے سے بھٹک جاتے ہیں.... منزلِ مقصود خواب کے مندر کی طرح دم بدم دُور ہوتی جاتی ہے اور اُس کے بدلے زندگی کے رنگین ٹھکانے نظر آتے ہیں.... رنگین ٹھکانا! جسے کاشانۂ الفت سمجھکر پرستش گاہ کا درجہ دیا جاتا ہے، جسے قصرِ محبّت سمجھ کر جبہ سائی کی جاتی ہے! سمجھے تم؟ اور انجام کیا ہوتا ہے؟ ــــــ مٹّی کے گھروندے! جنہیں زمانے کے طاقتور پاؤں نے روند کر مسمار کر دیا ہو۔ محبت؟ نہیں، نہیں، سراب! دلدل! بلکہ ریگِ رواں، جہاں قدم رکھا اور انسان زمین میں دھنسنا شروع ہوا، لاکھ کوشش کرو، نکلنا محال، گویا جیتے جی تدفین ہو رہی ہے...... تمہیں اُن بدنصیب نوجوانوں کی ناکام زندگی سے سبق لینا چاہیئے جو انجان یا تعلیم سے محروم ہونے کی وجہ سے اپنی بربادی کی ابتدا بازاری محبت میں مبتلا ہو کر کرتے ہیں اور جن کے کان ایک حُسن فروش کی سیج کے بچھے ہوئے پھولوں کی داستانِ عبرت سُننے کے لئے ہمیشہ کیلئے بہرے ہو جاتے ہیں۔ بیشک اس موقع پر اشد ضروری ہے کہ والدین ان کی سختی سے خبرگیری کریں مگر درحقیقت سب سے بڑی خبرگیری خود کی جاتی ہے۔ جس نے اپنے دامن کو اس وقت معصیت سے بچا لیا اس کی ہمیشہ فتح رہے گی...... بچو! بچو سانپ تک سے ایک حُسن فروش محبوبہ کے، جس کا ڈسا پانی کے ہوتے ہوئے بھی اُسے پی نہیں سکتا اور پیاسا ہی دم توڑتا ہے"

ــــــ ۴ ــــــ

اسلم بیچارا بیچارا جب شام کو گھر پہونچا، سال بھر کے بچھڑے ساون بھادوں گلے مل مل کر رو رہے تھے۔ برکھا رُت جوبن پر تھی اور کالی کالی گھٹائیں پورب پچھم سے گھِر گھِر کر آ رہی تھیں۔ ایسے سمے جوانی مدہوش ہو کر شرابِ شباب کے جام بھر بھر کر لنڈھا رہی تھی اور حسن و عشق بیباکانہ ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ اسلم نے بے چینی سے کروٹ بدلتے ہوئے مایوسی سے کہا "آخر انجام کیا ہوتا ہے؟" دل اور دماغ آمادۂ پیکار تھے۔ کبھی اس کی یکایک جاگی ہوئی محبّت اسکے باپ کو اس طرح شکست دیدیتی گویا اُس کے الفاظ کبھی نہ سلجھنے والے گورکھ دھندے ہیں اور کبھی باپ کی نصیحت اُس کے جذبات پر اس طرح فتح پا لیتی گویا وہ اُس کے سامنے کھڑا ہوا کہہ رہا ہے "جانِ پدر!..... یہ محبت نہیں، جوشِ جوانی ہے ــــ دودھ کا سا اُبال..... عارضی اور مُہلک! وقتی اور تباہی کا نقیب!....." اور پاس ہی آتشدان میں سے سلگتی ہوئی لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں اس طرح آ رہی تھیں جیسے کسی احمق کے بے معنی قہقہے کسی سنجیدہ گفتگو کے دوران میں بے موقع بلند ہو جائیں۔

آہستہ آہستہ بادل چھٹ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نیلے آسمان پر رنگ برنگ ستارے جھلمل جھلمل کرنے لگے جیسے کسی حسین دوشیزہ کے دستِ نازک پر زمرد و یاقوت رقص کر رہے ہوں۔ اسلم کی نیم وا آنکھیں یکبارگی پوری کھُل گئیں اور وہ اپنے دل کی دھڑکن کو ایک ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا ــــ سامنے آسمان پر شہابِ ثاقب ٹوٹا اور ایک دوسرے ستارے میں جذب ہونے کے لئے آگ میں جا ملا۔

ــــــ اور جب کسی کا دل مچل جائے تو بزرگوں کی یہ نصیحتیں، قانون کی یہ سختیاں، دوزخ کی یہ آتشیں لپٹیں کیا حقیقت رکھتی ہیں؟ باپ کو شکست فاش ہو گئی، اب جوانی کی حکومت تھی اور جب جوانی برسرِ اقتدار ہو، زہد و اتقا بھی

پاس آتے ہوئے تھراتے ہیں۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا..... آخرکار اُس بازار میں پہونچ گیا جہاں باوجود اسکے کہ بازاری دوشیزاؤں پر فریفتہ ہونے والوں کے حسرتناک واقعات آئے دن سُننے میں آتے رہتے ہیں، دولت اور حُسن کا بیوپار نہایت کامیابی سے ہوتا ہے۔ "بچہ ہو جوانی کی !" ــــ جب تک چہرے پر دو چلّو خُون کی رونق ہے روپے کے بل پر جاہے جتنی محبت خرید لیجیے۔ آج اسلم کی جوانی دُنیا اور مذہب کی تمام زنجیریں توڑ کر آزاد ہو چکی تھی۔ چنانچہ بغیر کسی خوف و خطر کے وہ بالاخانے پر چڑھ کر دیرانہ عشرتکدے میں داخل ہو گیا، لیکن اُس نے دیکھا کہ وہ نیم عریاں پیکرِ جمال ایک مرد کی آغوش میں مچل رہا ہے۔ ایکا ایکی آہٹ سے چونک کر وہ مرد پلٹا۔ آنکھیں چار ہوئیں اور اسلم کے لبوں پر ایک لفظ کانپ کر رہ گیا ــــــ "ابا !"

صادق الخیری دہلوی

طلسمِ شوق

شررِ آتشِ دل شمعِ صنم خانہ بنا
شعلۂ طور بنا، جلوۂ جانانہ بنا

چھا گیا نورِ چراغِ تہہ داماں ہر سو
زینت و رونقِ آبادی و ویرانہ بنا

سو طرح حسنِ تخیل نے کیا وارفتہ
کہیں سلمیٰ کہیں عذرا کہیں ریحانہ بنا

نگہِ شوق میں خود جذبۂ رنگیں اپنا
کہیں پیمانہ کہیں نرگسِ مستانہ بنا

کھو گیا اپنے ہی جلووں میں دلِ حسن پرست
آپ ہی شمع بنا آپ ہی پروانہ بنا

ہائے وہ طالبِ دیدار وہ مشتاقِ جمال
جو حقیقت سے نقاب اُٹھتے ہی دیوانہ بنا

خود فریبی کی کوئی حد بھی ہے اللہ اللہ
آشنا ہو کے یہ دل اپنے سے بیگانہ بنا

تقاضائے تمنّا

جس نے دیوانہ بنایا اُسے دیوانہ بنا
شعلۂ شوق بھڑک ! شمع کو پروانہ بنا

دلِ حسرت زدہ و دیدۂ پُرنم کب تک
مستیٔ عشق ! انہیں شیشہ و پیمانہ بنا

المدد ذوقِ محبت ! کہ پریشاں ہے سوچ
اس الم خانۂ ہستی کو طرب خانہ بنا

لطف تو جب ہے کہ جو رنج ہو راحت ہو جائے
غمِ دُنیا کو بھی اے دل غمِ جانانہ بنا

شاید اس طرح کچھ احساسِ اذیت کم ہو
وحشتِ ہجر ! مجھے آپ سے بیگانہ بنا

کٹ گئی آرزوئے شوقِ قدمبوس میں عمر
تو ہی کچھ کام دل او لغزشِ مستانہ بنا

چشمِ ساقی مجھے برگشتہ نظر آتی ہے
بگڑی تقدیر کو اے جرأتِ رندانہ بنا

کوکب شاہجہانپوری

زخم وہ دل پہ لگا ہے کہ دکھائے نہ بنے
اور چاہیں کہ چھُپالیں تو چھُپائے نہ بنے

ہائے بیچارگیِ عشق کہ اُس محفل میں
سر جھُکائے نہ بنے آنکھ اُٹھائے نہ بنے

یہ سمجھ لو کہ غمِ عشق کی تکمیل ہوئی
ہوش میں آکے بھی جب ہوش میں آئے نہ بنے

کسقدر حسن بھی مجبورِ کشاکش ہے کہ آہ!
مُنہ چھُپائے نہ بنے سامنے آئے نہ بنے

ہائے وہ عالمِ پُر شوق کہ جس وقت جگرؔ
اُس کی تصویر بھی سینے سے لگائے نہ بنے

قطب کی سیر

(منظوم مکالمہ۔ دلّی کی گھریلو زبان میں)

"ابھی کیا گھر کے گھٹا آئی ہے دیکھا تم نے　　میں تو کہتی ہوں برستا ہے تو کھُل کر برسے
ایسا موسم ہو تو جی گھر میں بھلا کیسے لگے　　بس کڑھائی چڑھے اور باغ میں جھُولا جھُولے
لے لو وہ پھوار پڑی ہائے غضب کے دن ہیں
اماں سچ کہتی ہوں یہ دن تو قطب کے دن ہیں"

"مجھ سے کیا کہتی ہو، کہنا ہے تو بھائی سے کہو　　یا میں خود کہدوں گی تم اُن کو یہاں بُلوالو
خود بھی تیار رہو، بچّوں کو بھی تیار کرو　　اور سامان بھی جو چلنے کا کرنا ہے کرو
اور کیا کہتی تھی میں؟ لو بُوا بس بھُول گئی!
ہاں سُنو اور بھی سب بہنوں کو بھیجو ڈولی"

"تم کو چلنے کا بھی کچھ ہوش میاں احمد ہے!　　دیکھنا ڈیوڑھی میں جا کے ذرا امجد ہے
اے نصیبن! الو وہ پھر اُڑ گئی کیسی بد ہے　　اس ہرائی و جتائی کی بھی کوئی حد ہے
یونہی بدذات مرا ناک میں دَم کرتی ہے
کام کے وقت نگوڑی کہیں جا مرتی ہے"

"بھابی! بچے کو تو میں لیتی ہوں مجھ کو دیجے　　آپ جا کر ذرا پردوں کی خبر لے لیجے"
"بیوی! چھوٹے میاں کہتے ہیں کہ جلدی کیجے"　　"توبہ ہے، کہدو کہ آتے ہیں ذرا دَم لیجے"
مجھکو گھبرانے میں کچھ اُن کو مزا آتا ہے
ریل کا وقت نہیں ہے کہ رہا جاتا ہے"

"کہنا لڑکے سے کہ بچے کو اُڑھا کر لائے　　دُشمنوں کو کبھی پسلی کا خلل ہو جائے"
"لو جی یوں کوئی بُری فال زبان پر لائے　　بات کرنے کا تمہیں دیکھئے کب ڈھنگ آئے"
"ایی تم!۔۔۔ لو میں نصیبن کو بڑی بی سمجھی!
پکنے رندھنے کا تو سامان وہ خود کر لیں گی"

"پڑ گیا جھولا چلو آؤ نا اے بی کوثر!"　　"میں ابھی آئی ذرا پیڑیاں ڈالو جا کر"
"دیر ہوتی ہے بس اب بیٹھ بھی جاؤ اُٹھ کر　　جلدی جھُول آئیں کہ بارش بھی کھڑی ہے سر پر
ایی سُنتی نہیں، کیا کہتی ہوں زینت آؤ!
دیر ہوتی ہے مرا کیا ہے بوا مت آؤ"

"جھولتی ہو تو کوئی گیت بھی آپا گاؤ میں بتاؤں وہ، "سکھی آئے بدروا" گاؤ"
"اے نہیں گیت کوئی ڈھنگ کا اچھا گاؤ میں تو کہتی ہوں بڑے بھائی کا جھولا گاؤ
سال بھر یاد میں سوکھا کیا بے کل جھولا
اب نہیں چھوڑے گا برسات کا آنچل جھولا

"ہوگیا اب تو اندھیرا چلو درگاہ چلیں دُور ہی کیا ہے منٹ بھر میں ابھی جا پہونچیں
رات بیشک ہے مگر اچھا ہے بُرقعے لے لیں ہاں کسے یاد ہے درگاہ کا رستہ دیکھیں
دیکھیے بھائی میاں آپ نہ بتلائیے گا
بولئے بھابی دُلہن پہلے کدھر جائیے گا"
"اچھی مُنہ ڈھکنے سے ہوتی ہے مجھے تو وحشت" "ایہی شاباش تمہیں مُنہ تو چھپاؤ زینت!"
"مردوے سامنے آتے ہیں بوا، صد رحمت! اب تو درگاہ بھی آپہونچی، الٰہی خلقت!
دیکھنا بچیّوں! جالی سے نہ آگے بڑھنا
فاتحہ بس یہیں درگاہ کے باہر پڑھنا"
"اچھا واپس چلیں، جلدی کرو برسات بھی ہے اور ان کھنڈروں میں سُنتے ہیں کہ جنات بھی ہیں"
"توبہ آپا رہی جاتی ہو کوئی بات بھی ہے!" "اے بُوا کیا کروں میں تھک گئی اور رات بھی ہے"
"لو بہن تھک گئیں خوب خُدا رحم کرے
نوج اس طرح سے بھی جوں کی کوئی چال کرے"

"آؤ اب، کھانا ہوا جاتا ہے ٹھنڈا مٹی ختم ہوں گی بھی کبھی باتیں یہ تم بچوں کی!"
"بڑی بی بیسنی روٹی تو کچھ اچھی نہ سکی دیکھتی ہو بوا کیا شکل بنی بھرتے کی!
چٹپٹے پکے ہیں البتہ بگھارے بیگن
یہ مرے ہاتھ کا ہے دیکھیے سادا سالن

"کیوں! پہیلی مری بوجھیں گی بتائیں بھابی؟" "اِک کہانی تو سُنا دیجیے نانی بیوی!"
"بیٹی اب سو بھی رہو، رات زیادہ آئی جائیں گے صبح خُدا چاہے تو واپس دِلّی
یونہی رکھنا مرے اللہ یہ سیریں قائم
اور اسی طرح سے ہر سال سب آئیں جم جم!"

محمد شان الحق حقّی دہلوی

مجھے جانے دو

"مجھے جانے دو" اُس نے کہا۔ اور جب تک میں اُسے روکوں وہ ہاتھ چھڑا کر جا چکی تھی۔ اندھیرے میں اُس کی آنکھوں کی ایک جھپک اور دہلیز پر پاؤں کے بچھوے کی ایک جھنک سنائی دی۔ وہ چلی گئی اور میں کوٹھری میں اکیلا رہ گیا۔

میں وہاں جانا نہ چاہتا تھا۔ میں اکثر اس مکان کے آگے سے گذرا تھا اور شام کے وقت کچھ جوان لڑکیوں کو اُسکے پھاٹک کے آگے کھڑا پایا تھا۔ جاڑے کی راتوں میں نیم آستین جمپر پہنے ہوئے یہ چھوکریاں راہ چلتوں کو لبھانے کی تدبیر کیا کرتی تھیں کوئی بھی آنکھوں والا، غازے کی سُرخی میں عصمت کے خُون کی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ اُن کے جسم کا ہر رُواں تھرتھرا کر کہہ رہا تھا ——ہمیں لے لو—— ایک روپے کے بدلے۔

ان میں سے بعض سگریٹ کا دُھواں نہایت نزاکت سے کسی رنگیلے کے مُنہ پر پھونک دیتی تھیں اور کوئی منچلی کسی بدنما مارواڑی کے جوتے پر پان کی پیک تھوک دیتی تھی جب وہ پلٹ کر دیکھتا تو لڑکیاں آنکھ مار کر کھلکھلا پڑتی تھیں۔ انکی ہر ادا زبانِ حال سے کہتی تھی—— ہمیں لے لو—— ایک روپے کے بدلے۔

ٹریم پر شریف زادیوں اور موٹروں پر امیر زادیوں کے کھیپ کے کھیپ گذرا کرتے تھے۔ اِن سستی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ توبہ استغفار کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔ یہ بدبخت، نسوانیت کی کلنگ، خُدا انہیں غارت کرے! چند ٹکوں کے لئے، شراب کی ایک بوتل یا سگریٹ کی ایک ڈبیا کیلئے یہ اپنا تن ہرایرے غیرے کے سپُرد کر دیتی ہیں—— اور ہم؟...... پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کرنے لگتی تھیں جنہوں نے انہیں اونچی حویلیاں، ریشمی ساریاں اور چھ چھ بچے عطا کئے تھے۔

اس مکان سے لگ کر کالی دیوی کا ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ یہ کالی کلوٹی اور ننگ دھڑنگ دیوی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے لیل و نہار کا تماشہ دیکھا کرتی تھی۔ شام کو جب آرتی شروع ہوتی، اور کمسن لڑکیاں اُس کے سامنے ناچنے لگتیں تو مٹی کے چراغوں کی دُھندلی جوت میں اس کی شکل زیادہ پُر اسرار ہو جاتی۔ معلوم ہوتا کہ عورت کی رُوح ایک سیاہ کفن اوڑھے ہوئے اپنی قبر سے اٹھی ہے اور ایک آن میں مرد کو فنا کر دیگی۔ جو لوگ درشن کے لئے آتے، وہ ہاتھ باندھے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے ان رقاصاؤں کو تاکا کرتے تھے۔ اور جب وہ التفات نہ کرتیں تو یہ زیادہ بیباکی سے ان طوائفوں کو گھورنے لگتے جو پجاری کے ڈر کے مارے سیڑھی کے نیچے سر جھکائے کھڑی رہتی تھیں۔

ان میں سے ایک کا انداز سب سے نرالا تھا۔ اُس کے دل میں پوجا کی عظمت کا مطلق احساس نہ تھا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے نہایت اطمینان سے آرتی کا تماشہ دیکھتی اور وقتاً فوقتاً کیرتن کی لَے پر پیروں سے ٹیک دینے لگتی۔ جب کوئی بوڑھا اپنی پھٹی ہوئی آواز سے تال کو بیتال کر دیتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتی اور پنواڑی کو پکار کر کہتی—— "ارے، ذرا سی سُرتی تو بنا نا۔"

اور کیرتن کا نغمہ کسی مجروح پرندے کی طرح دیر تک تڑپتا رہتا تھا۔

جب میں نے پہلی مرتبہ اُسے دیکھا تو میرا دل آپ ہی آپ مبہوت ہو کر اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مَیں وہاں سے بھاگتے بھاگتے بھی اُس کے قریب پہونچ گیا۔

لیکن اُس نے بے پروائی سے مجھے دیکھا اور اپنی ایک سہیلی سے پوچھنے لگی ـــ "اری، اُس حرامزادے نے کتنے اینٹھے ـــــــ ؟"

اب میں ہر شام کو اس فٹ پاتھ پر سے گذرنے لگا۔ جب وہ اُس مقام پر ہوتی تو ذرا حیرانی سے میری طرف دیکھتی اور پھر کچھ مسکرا کر اپنی ہم جنسوں سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ کبھی وہ وہاں نہیں بھی ہوتی تھی۔ اور مَیں سمجھ جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ میرے دل پر چوٹ سی لگتی، خون کی روانی تیز ہو جاتی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں آجاتیں۔ دُور ہٹ کر لیمپ کے کھمبے کا سہارا لئے میں گھنٹوں کھڑا رہتا تھا حتی کہ پیر شل ہو جاتے تھے۔ میں یوں ہی ٹکٹکی باندھے اس پھاٹک کو تاکتا رہتا تھا۔ بہتیرے شریف اُس کے اندر سے نکلتے اور دائیں بائیں دیکھ کر لپکتے ہوتے بھیڑ میں گُم ہو جاتے تھے۔ لمبی لمبی چوٹیوں اور گھنیری ڈاڑھیوں والے بیسیوں بدمعاش اس چکلہ گھر سے برآمد ہو کر بھیگی بلّیوں کی طرح نیچے دبائے بھاگتے نظر آتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے کیونکر اس سے ہمکلام ہونے کی جسارت کی تھی۔

اُس روز میں اپنے سب سے پیارے دوست کو قبر میں لٹا کر لوٹا تھا۔ اب دُنیا میں میرا کوئی اپنا نہ تھا۔ وہ دق میں گھُل گھُل کر مرگیا اور مَیں اس کے علاج کا کوئی انتظام نہ کر سکا۔ جب وہ مرگیا تو ہم نے اُسے مٹی کے تودوں کے نیچے دبا دیا۔ جب وہ قبر میں سُلا دیا گیا تو میں نے کلیجہ تھام کر آخری مرتبہ اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس پر اب بھی وہی بھولا پن تھا۔ گویا انسان سماج کی قبر پر چاندی کے ڈھیلوں کے نیچے دب گیا۔ اور اُس نے مرتے مرتے کہا ـــ میری پیپ تمہارے جسم کو سڑائے گی، میرا خون تمہارے بدن کو تپائے گا۔ میرے آنسو تمہارے گوشت کو گلائیں گے۔

میں قبرستان سے لوٹا تو میرے جسم کے اندر کچھ نہ تھا۔ ضمیر کی جگہ کوئی چیز بھائیں بھائیں کر رہی تھی، ایک خلا جس پر کاہش کے سوا کچھ نہ تھا۔

شام کے وقت بلا ارادہ مَیں اُسی مکان کے آگے موجود تھا۔ میں نے بنا کچھ کہے ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر گھسیٹ لیا۔

اُس نے مجھے ایک روپیہ دے کر کہا: "اس مندر کے پیچھے کی گلی میں ایک کلال کی دُکان ہے، وہاں سے ایک اَدھا خرید لاؤ۔"

میں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا، لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہو گیا۔ میں نے تہیّہ کر لیا کہ ہر وہ کام اچھا ہے جسے دُنیا بُرا کہتی ہے۔ پھر میں اس کلال کی دوکان میں گھُس گیا۔

مٹی کے بڑے بڑے مٹکے جن پر جھاگ کے بادل سمٹ آئے تھے، جیسے بھینس کے تھن سے دودھ ٹپک رہا ہو۔ ان میں

مکھیاں اور مکوڑے تیرتے ہوئے۔ اندر متوالے ملکر گا رہے تھے۔

"ایک شانمبرون کا آآآ آآ...... بہاآآآآ..... دے نالا...." میں نے جلدی سے ایک اَدّھا خریدا اور دوائی کی چاٹ۔ چٹپٹی مسالے دار۔

اُس نے منہ لگاکر دیکھتے دیکھتے آدھی بوتل ختم کردی۔ پھر چُپ چاپ ایک سگریٹ سلگایا اور میری گود میں اپنے پاؤں پھیلاکر ٹوٹی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہوگئی۔

یک بیک وہ زور سے ہنسی اور مجھے غور سے دیکھکر پوچھا "تم یہاں کیوں آئے؟"

ہوا بند تھی۔ کھڑکی سے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آرہا تھا جس میں دو تین ستارے چنبیلی کے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سوال کا جواب کیا ہوسکتا تھا۔

"بولتے نہیں۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ تم یہاں کس غرض سے آئے ہو مجھے اس مرد سے نفرت ہوتی ہے جو عورت کے پاس بیٹھکر اپنا مدّعا زبان سے نہیں بلکہ نگاہ سے ظاہر کیا کرتا ہے۔ اور اس گھڑی کا منتظر رہتا ہے جب عورت خود اس سے کچھ پوچھے گی تم چاہتے کیا ہو؟"

اُس نے بوتل کی بچی ہوئی شراب اپنے گلے کے نیچے اُتار لی اور سگریٹ کا ایک گہرا کش لیکر باہر دیکھنے لگی۔ میں بدستور چُپ تھا۔ خود مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کیوں آیا ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔

پھر وہ اُٹھکر کوٹھری میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اس میں اپنی صورت دیکھنے لگی جب وہ دوبارہ ہنسی تو مجھے ایسا لگا کہ کوئی مُردہ ہنس رہا ہے۔

"یہ میری ہی صورت ہے۔ اگر میں کاجل غازہ اور لالی کو دھو ڈالوں تو کیا رہ جائے ـــــ دھندلی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، سوکھے ہوئے ہونٹ۔ تین سال کے اندر کیا سے کیا ہوگیا۔ میرے جسم کو گھن لگ چکا ہے۔ میں اندر سے کھوکھلی ہوگئی ہوں۔ مجھے ایسی ایسی بیماریاں لگ گئی ہیں۔ جن کے تصور سے تمہیں وحشت ہوگی اور تم یہاں سے بھاگ جاؤگے۔"

دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ اس کا منہ غصہ سے تمتا رہا تھا۔ مجھ پر آنکھیں گاڑکر وہ کہنے لگی "اور یہ بیماریاں مجھے کہاں سے لگیں؟ یہ تم جیسے چاہنے والوں کا ہی عطیہ ہے۔ مرد ـــــ سوزاک اور آتشک کے جراثیم کا باپ!۔

تم ابھی اس کوچے سے ناواقف ہو۔ نہیں جانتے کہ عورت کیا ہے۔ اگر تمہیں اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح معلوم ہوتا کہ وہ مٹی کا ایک کھلونا ہے اور بس، تو تم آتے ہی اُسے توڑ دیتے، یوں حیرت اور ہیبت سے مجھے نہ تاکا کرتے۔ مگر تم ان لوگوں سے اچھے ہو جو وحشی درندوں کی طرح دیکھتے ہی ہمارے سینوں پر آتے ہیں ہمیں کتوں کی طرح بھنبھوڑتے ہیں اور جب ہڈیوں میں گرد انہیں رہتا تو ہمارے پلّو میں دو چار ٹکلیاں باندھکر چلے جاتے ہیں۔

پھر گھر والی آتی ہے۔ ہماری گرہ سے ایک ایک چھدام نکال کرلے جاتی ہے اور اسکے بدلے ہمیں کھانے کیلئے روٹیاں اور سنگار کے لئے کاجل کی سلائی دے جاتی ہے۔

دن کے اُجالے میں جب تم لوگ ادھر سے آتے جاتے ہو تو حقارت سے منہ پھیر کر اپنے ساتھیوں سے کہتے ہو یہاں چھنالا ہے۔

ان نکھٹی طوائفوں کو عصمت یا عزت کا ذرا پاس نہیں۔ انہیں شہر سے نکالدینا چاہئیے۔"
مگر رات کے اندھیرے میں تم کشاں کشاں آتے ہو اور ان خرابوں کو آباد کرتے ہو۔ تم اپنا مُنہ کالا کر کے اپنی حرام کی کمائی کے چند درم ہمیں دیتے ہو اور پھر اس تجسس میں اپنی حرم سرا کو بھاگتے ہو کہ بیوی تو خیریت سے ہے ــــ"
وہ ہانپنے اور کھانسنے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا اور وہ چارپائی پر گر پڑی۔ اُس نے در و دیوار کو دیکھا اور آپ ہی آپ کہنے لگی "زیادہ دن نہیں۔ یہ مصائب بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔ اب سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔
جب میں مر جاؤں اور میری لاش لاوارثوں کے قبرستان میں پھینک دی جائے تو تم علی گڑی کے مولانا نورالاسلام سے ملنا۔ اُس وقت اُن کے پاس جانا جب وہ منبر پر بیٹھے جمعہ کا خطبہ سُنا رہے ہوں۔ اور تمہیں شرافت کی قسم کہ جب وہ اخلاق کی تفسیر بیان کرنے لگیں تو اپنا صف سے نکل کر کہنا: مولانا میں ایک پردیسی ہوں اور آپ کو یہ پیغام سُنانے کیلئے کلکتہ سے آیا ہوں کہ بداخلاقی اس دُنیا سے چل بسی اب اسے ناحق نہ کوسیئے۔
اور جب سب بُڈھے اپنی عینکیں کھسکا کر تمہیں گھوریں اور پوچھیں کہ یہ کیا بکتا ہے۔ تو تم کہنا: میں آپ کی بیٹی کے جنازے کا تماشہ دیکھکر آ رہا ہوں۔ وہ جسے ایک حرامی بچہ پیدا کرنے کے جرم میں آپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اُسے ایک مردِ مومن نے کچھ دنوں کے لئے اپنے گھر ڈال لیا۔ اور اسی طرح ہاتھوں ہاتھ وہ کلکتہ پہونچکر طوائف کا پیشہ کرنے لگی۔ آپکے ہمجنسوں نے اُسے تحفہ میں گھناؤنی بیماریاں دیں اور جب وہ مرگئی تو ایک حافظ نے اُس کی قبر پر فاتحہ خوانی کی، جب تم یہ کہہ چکوگے تو لوگ تمہیں بہت پیٹیں گے، لیکن اپنی محبت کے صدقے میں اتنی تکلیف اُٹھا لینا۔"
میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں مگر پیروں میں جیسے زنجیر پڑ گئی تھی۔
وہ پھر کھانسنے لگی۔ جب اس کا جی کچھ سنبھلا تو میں نے دیکھا کہ وہ چپکے چپکے رو رہی ہے۔ تم لوگ جانوروں پر رحم کھاتے ہو۔ اُن پر کوئی تشدد کرتا ہے تو سزائیں دیتے ہو۔ میں نے سیٹھوں کو دیکھا ہے کہ چیونٹیوں کو شکر اور سانڈوں کو پوریاں کھلاتے ہیں ــــ مگر عورت! آہ عورت پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو۔
مگر عورتیں بیویاں بنکر طوائفوں سے مردوں کی بہ نسبت زیادہ نفرت کرتی ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ ہمارا وجود اُنکے حق میں کتنی بڑی نعمت ہے۔ ہم انہیں زنا بالجبر، اغوا اور علانیہ عصمت دری سے بچاتی ہیں۔
اور خدا! ــــ وہ ہماری کیوں نہیں سُنتا؟ اگر اس کی جنت میں حوروں کے لئے جگہ ہے تو دُنیا کا ایک کونا ہمیں کیوں نہیں مل سکتا!"

اب ہوا چل رہی تھی اور تاڑ کے پتے غمناک آوازیں کراہ رہے تھے۔ سڑک پر ٹریموں اور موٹروں کا شور بہت کم ہو گیا تھا۔ البتہ اکّے دکّے رکشا کی گھنٹی بج اُٹھتی تھی۔ بادلوں نے آسمان کے اس ٹکڑے کو گھیر لیا تھا۔ اور ان میں کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی۔

وہ پھر بولنے لگی:۔ میں نے صرف ایک مرتبہ محبت کی ہے اور اب بھی اس فریب میں مُبتلا ہوں کہ وہ سچی محبت تھی۔ یہ فریب کبھی نہ ٹوٹے گا کیونکہ قبل اسکے کہ میں اس کا امتحان لوں، وہ مر چکا تھا۔

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اُٹھاکر کس التجا سے مجھے دیکھتا تھا۔ وہی تصوّر مجھے دُنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔
میں نے اپنا مایۂ حیات اُسے سونپ دیا اور اس سے پہلے کہ وہ اِس امانت کو لوٹاسکے، وہ پلیگ میں مرگیا۔
اُس نے مجھے جو بچہ دیا وہ حرامی تھا۔ کاش ہماری محبّت کو اخلاق کی مُہر مل جاتی اور میرا بچہ مل جاتا۔"
اِن بھولی ہوئی باتوں کی یاد سے اُس کا دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کس طرح دلاسا دوں۔ جس ماں کے آگے اُسکے بچے کی لاش پڑی ہوئی ہو اور جس عورت کے آگے اُسکے محبوب کا جنازہ، اُسے تسلی دینے کا اسلوب کوئی زبان پیدا نہیں کرسکتی۔
جیسے وہ عدالت کے آگے بیان دے رہی ہو۔ "میری سوتیلی ماں نے اندھیری رات میں اُس بچے کی لاش آنگن میں گاڑدی۔ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے بجلی کی روشنی میں میں نے وہ نظارہ دیکھا اور پھر چیخ کر بیہوش ہوگئی۔
دو تین روز بعد میرے سوتیلے ماموں نے مجھے گاڑی میں بٹھاکر الہ آباد کا ٹکٹ ہاتھ میں تھمادیا۔ یہیں سے میری مُصیبت کا آغاز ہوتا ہے۔
الہ آباد ...... میرے نسبتی خالو کا مکان ..... میری مرضی کے خلاف عصمت دری ..... بدنامی کا ڈر .....
کلکتہ ..... یہ چکلہ گھر ......"
زیرلب وہ یہ ٹوٹے پھوٹے جملے دُہراتی رہی، اور چند لمحوں کے لئے اسکی آنکھ لگ گئی۔
میں دبے پاؤں اُٹھا اور نکل بھاگنے کی نیت سے جوتے پہننے لگا۔ اتنے میں وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ "کیا تم جارہے ہو؟"
اُسنے اداسی سے پوچھا۔ اب اُسکی آواز نرم و نحیف ہوگئی تھی۔
میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اب بھی کچھ نہ کہہ سکا۔
"اچھا تو جاؤ۔ خدا حافظ۔ اب نہ آنا۔ میں تم سے انتقام نہیں لینا چاہتی۔ اور کوئی ہوتا تو میں بصد شکر سوزاک اور آتشک کے چند جراثیم نذر کرتی۔ وہ کسی اور کو دیتا اور یہ اُس کے ... کو ورثے میں ملتے۔ غرض ساری انسانیت ان امراض میں مُبتلا ہوجاتی۔ تب شاید سماج کے ٹھیکہ داروں کو ہوش آتا کہ اس بلا کی جڑ کہاں ہے۔
مگر کبھی کبھی آکر پوچھ لینا کہ میرے مرنے میں کتنی دیر ہے۔ کوئی کانوں میں کہہ رہا ہے کہ زیادہ نہیں۔
کوئی بھری جوانی میں مرتا ہے تو لوگ افسوس کرتے ہیں کہ کیسا نامراد چلا۔ لیکن مجھے دیکھو کہ زندگی سے موت کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ تم نہیں جانتے کہ ہم آپ اپنی نظر میں کتنی ذلیل ہیں۔ ہمارا ہر لمحہ دوسروں کی خوشنودی میں بسر ہوتا ہے۔ ہم ایسی لونڈیاں ہیں جنکے آقا ہر روز بدلتے ہیں ــــ کیوں کس خیال میں گم ہوگئے۔ جاؤ خدا کیلئے چلے جاؤ۔" لیکن میں نہ جاسکا۔
مجھے اس سے کچھ نہیں لینا تھا۔ پھر بھی میں گرفتار ِ منظر پرندے کی طرح اپنی جگہ سے ٹل نہ سکا۔
"میں نہیں جاؤنگا" یہ کہکر میں نے اپنا سر اُسکے آغوش میں رکھدیا۔ وہ ایک بیجان لاش کی طرح یوں ہی پڑی رہی لیکے دل کی دھڑکن کو میں صاف سُن سکتا تھا۔ اسکی رُوح کا نوحہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔
"تو پھر مجھے جانے دو۔" اُس نے کہا ــــ اور وہ چلی گئی۔

اختر [illegible]

چینی افسانہ

پتنگ

یہ میرے لئے ایک حد تک حیرتناک اور ملال انگیز ہے کہ بہار میں جبکہ پیکنگ کی زمین پر ابتک برف پڑی ہو اور بغیر پتوں کی سیاہ شاخیں آسمان کو منقش کر رہی ہوں، اُسوقت ہوا میں کئی پتنگیں اِدھر اُدھر اڑ رہی ہیں۔

میرے وطنی قصبہ میں پتنگ اُڑانے کا زمانہ عموماً بہار کا دوسرا مہینہ ہے۔ جب سرسراہٹ کی آواز سنو اور گردن اُٹھا کر اِدھر دیکھو تو یقینی کنکھجورے یا کیکڑے کی شکل کی سبز پتنگ نظر آجائے گی۔ کبھی کبھی بغیر لمبی دُم کی چوکور سادی پریشان حال نیچی اُڑتی ہوئی پتنگ بھی نظر آجائے گی۔ جس وقت بید کی نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور شفتالو کے درخت میں نئے پھول آتے ہیں اُس وقت بچوں کی یہ آسمانی آرائش بھی اسی مناسبت سے بھلی معلوم ہوتی۔ یہ سب ملکر بہار کا گرم، دلنواز پیغام لاتے ہیں ــ لیکن اس وقت میں کہاں ہوں؟ میرے ہر طرف جاڑوں کی تباہ کاریاں ہیں۔ مگر پھر بھی گذری ہوئی جوانی اور وطن کی بہار اس وقت فضا میں سانس لے رہی ہے۔

میں پتنگ کا دلدادہ نہیں تھا بلکہ ایک حد تک میں اس سے گھبراتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ناکارہ لڑکوں کے کھیلنے کی چیز ہے۔ لیکن اس کے برعکس میرا کمزور چھوٹا بھائی جس کی عمر اُس وقت دس سال کی تھی۔ پتنگ کا اس قدر دلدادہ تھا کہ اگر اسکے پاس خریدنے کو پیسے نہیں ہوتے تو اور کوئی ساتھ کھیلنے والا نہ ہوتا تو آدھے آدھے دن تک مُسلسل منہ کھولے بڑے شوق سے آسمان کی طرف بغور دیکھتا رہتا۔ اگر کوئی پتنگ کٹ کر گرتی تو وہ خوشی سے چیختا اور تالیاں بجا بجا کر ناچتا۔ میں اس کو احمق اور ناکارہ سمجھتا تھا۔

ایک روز دفعتاً یہ خیال آیا کہ میں نے اُس کو کافی دیر سے نہیں دیکھا ہے۔ بعد میں مجھے یاد آیا کہ پائیں باغ میں میں نے اُس کو بانس کے بوسیدہ ٹکڑوں کو چنتے دیکھا تھا۔ میں سمجھ گیا۔ جلدی سے ویران انبار خانہ کی طرف بڑھا۔ کواڑ کھولتے ہی میں نے اُس کو گرد آلود سامان کے انبار میں ایک بڑے اسٹول کے سامنے ایک چھوٹے اسٹول پر بیٹھا ہوا دیکھا۔ مجھکو دیکھکر وہ گھبرا گیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ کھڑا کانپ رہا تھا۔ اُس کے سامنے والے بڑے اسٹول پر ایک تتلی کی شکل کے پتنگ کا ڈھانچہ رکھا ہوا تھا جس پر اس وقت تک کاغذ منڈھا نہ گیا تھا۔ میں اس کو ڈھونڈھ نکالنے پر بہت خوش ہوا تھا لیکن ساتھ ساتھ اس کا اس طرح مجھ سے چھپا کر پتنگ بنانا دیکھکر مجھے بے انتہا غصہ آیا۔ محض ایک لغو کھلونے کیلئے وہ اس قدر محنت کر رہا تھا۔ پتنگ چھین کر میں نے اس کا ایک کنا توڑ دیا اور اسکی لمبی سُرخ دُم کو زمین پر پھینک کر پاؤں سے مسل دیا۔ میں عمر میں اور طاقت میں بڑا تھا اس لئے فتح میری تھی۔ اس کو دل شکستہ چھوڑ کر بڑے غرور و افتخار سے اپنے کمرے سے چلا آیا۔ اس کے بعد اسکی کیا حالت ہوئی مجھے خبر نہیں اور نہ میں نے اسکی پرواکی۔

بہرکیف میری پریشانی اور اُلجھن کا زمانہ آخر آہی گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ میری عمر کافی ہو گئی تھی۔ بدقسمتی سے مجھے بچوں کے متعلق ایک غیر زبان کی کتاب پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت میں نے جانا کہ کھیل بچوں کی تربیت

کا ایک اہم جزو ہے اور اُن کے کھلونے ان کے فرشتے ہیں: بچپن کا وہ سنگین واقعہ جس کی طرف میں نے بیس سال تک توجہ نہ کی تھی اس کا منظر یکبارگی میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ مجھ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرا دل ایک سیسہ کا ٹکڑا ہے جو بیٹھتا جا رہا ہے۔ گو اس قدر بھاری نہیں ہو گیا ہے کہ بالکل تہ میں ڈوب کر غائب ہو جائے۔ آہستہ آہستہ بیٹھتا جا رہا ہے، بیٹھتا جا رہا ہے۔ نیچے، نیچے۔

میں جانتا تھا کہ میں اپنی اس غلطی کا ازالہ کس طرح کر سکتا ہوں۔ میں اس کو ایک پتنگ بھیج سکتا تھا بلکہ اُس کے اڑانے میں اُس کی مدد اور ہمت افزائی کرتا۔ سب سے بڑھکر یہ میں خود اُس کے ساتھ کھیلتا جس کا وہ ہمیشہ متمنی رہتا تھا۔ ہم لوگ ساتھ مل کر دوڑتے شور کرتے، ہنستے۔ لیکن افسوس! اُس کی بھی میری طرح سے ڈاڑھی نکل آئی تھی۔ اب وقت نکل چکا۔ فرض کرو کہ میں اُس سے معافی مانگتا۔ یہاں تک کہ وہ کہتا "اس کا خیال نہ کیجئے" مجھے یقین تھا کہ اس وقت میرے دماغ کو سکون حاصل ہو جاتا۔ صرف یہ ہی ایک تدبیر تھی۔

جب میں اُس سے دوسری بار ملا تو ہم دونوں میں کافی تبدیلی ہو چکی تھی۔ چہرہ پر مصائب زندگی کے آثار نمایاں تھے۔ میرا دل پھر ڈوب گیا۔ رفتہ رفتہ ہم لوگوں کی گفتگو کا رُخ گزرے ہوئے بچپن کے زمانہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ میں نے ہمت کر کے اس کو پتنگ والا واقعہ یاد دلایا اور اس کا بھی اقرار کیا کہ یہ جوانی کی نادانی تھی۔ میں اُمید کر رہا تھا کہ وہ "اس کا خیال نہ کیجئے" کہکر معاف کر دیگا اور اسکے بعد سے میرا دل ہلکا ہو جائیگا۔

"کیا واقعی ایسا بھی کبھی ہوا تھا؟" اُس نے مُسکراتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ اس نے اس طرح سے اس واقعہ کو سُنا گویا یہ کسی اور کا قصہ ہے۔ اس کو اسکے متعلق ایک لفظ بھی یاد نہ تھا۔

وہ قطعی بھول گیا تھا۔ اس لئے اس کو مجھ سے کوئی نفرت نہ تھی۔ جب نفرت نہ تھی تو پھر معافی کا سوال۔ میں کس طرح اس سے معافی مانگوں؟ کل واقعات صرف میرے ہی دماغ میں محفوظ تھے۔ میں اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا کہ اس بارگراں سے اپنے ضمیر کو دباتے رہوں۔

وطن سے دُور اس سرزمین حیرت و استعجاب میں ایک بار پھر قاصدِ بہار پتنگ آسمان پر پرواز کرتا نظر آرہا ہے۔ اور مجھ کو بھولے ہوئے بچپن کی یاد دلا رہا ہے۔ میں بے انتہا ملول ہو جاتا ہوں۔ آہ۔ میرے لئے بہتر ہے کہ میں اس خزاں رسیدہ یخ بستہ زمین میں دوبارہ واپس چلا جاؤں۔

مترجمہ۔ تقی محمد
(لوشون)

رنجِ بیقیاس

اُداس آسمان پر　　ہجوم ابرِ تار ہے
کسی کو آہ کیا خبر　　کہ کوئی بیقرار ہے

نہیں ہے کوئی رازداں
نہیں ہے کوئی ہمنفس
غریب کا غمِ نہاں
خُدا ہی جانتا ہے بس،

بھری ہے دل میں آگ سی　　لبوں پہ آہِ سرد ہے
تڑپ اُٹھی ہے رُوح بھی　　کچھ اس بلا کا درد ہے

مگر یہ انتہا نہیں
ابھی غم اور آئے گا
نشان نہ مل سکے کہیں
کچھ اس طرح مٹائیگا

اُمنڈ رہی ہیں اور بھی　　غم و الم کی بدلیاں
کڑک رہی ہیں پاس ہی　　تباہیوں کی بجلیاں

مَیں اپنے دل سے پوچھ لوں
اگر سُکون ہو ذرا
یہ رنجِ بیقیاس کیوں
یہ دردِ بے حساب کیا

طلوع و غروب

زندگی کی ایک دوپہر!

میں آج تک سوچتی ہوں کہ کاش! وہ دوپہر میری زندگی میں نہ آئی ہوتی!

اپنی زندگی کی وہ دوپہر میں کبھی نہ بھول سکوں گی۔!—

دادی اماں بیمار تھیں اور اپنی خوابگاہ میں لیٹی نیند میں کراہ رہی تھیں۔ آسمان کے کناروں پر نیلی گھٹائیں متحرک پہاڑوں کی طرح دم بدم اونچی ہوتی جارہی تھیں۔ کوئل زور زور سے کوک رہی تھی۔ گھاس پر ہُدہُد اِدھر سے اُدھر ناچ رہے تھے۔ چاروں طرف ایک سناٹا سا طاری تھا۔ دوپہر نہایت سنسان ہو چلی تھی۔ ابھی دو ہی بجے تھے مگر بادل اتنے گہرے تھے کہ باغیچہ اندھیرا ہو رہا تھا۔ شہتوت اور جنگلی بادام کے پیڑ سیاہ آسمان کے نیچے جادو کے مسحور غلاموں کی طرح چپ چاپ دم بخود کھڑے تھے۔ آنے والی آندھی کے خوف سے سڑک پر کسی راہگیر کا پتہ نہ تھا۔

میں باغ کے زینے پر چپ چاپ کھڑی اپنی بلی کی ٹوکری بُن رہی تھی۔ ایسے وقت میں اچانک باہر کسی نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ اس زمانے میں میں گھنٹی کے بجتے ہی اس خوف سے اُس کی طرف بھاگا کرتی تھی کہ بیمار دادی اماں کی نیند خراب نہ ہو۔ چنانچہ میں دروازے کی طرف لپکی۔ اس وقت دو ہی آدمی آسکتے تھے۔ ڈاکیہ یا ڈاکٹر۔ مگر جھانک کر دیکھا تو ایک اجنبی کو کھڑا پایا۔ ہم مشرقی لڑکیاں اجنبیوں کے آگے بے جھجک جاتے ہوئے توہین محسوس کرتی ہیں۔ ہمارا وقار ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ میں نے دروازے کے پیچھے کھڑے ہو کر پوچھا

"کون ہیں آپ؟"

"مشہدی۔"

"مشہدی؟!"

میں نے یہ نام پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ اور تعجب ہے کہ کیوں نہ سنا تھا۔ حیران کھڑی اپنے حافظے پر زور دیتی رہی۔

پھر باہر سے آواز آئی: "کیا خاتون زہرہ یہیں رہتی ہیں؟ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

یہ سُن کر میں بھاگی بھاگی دادی زہرہ کی خوابگاہ میں گئی۔ وہ ابھی ابھی جاگی تھیں اور اُن کا بخار اُترا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے گھبرایا ہوا دیکھ کر انہوں نے پوچھا "کیا بات ہے بیٹی؟ باہر کیا آندھی چل رہی ہے؟"

میں نے کہا "آپ سے ملنے مشہدی نام اک شخص آیا ہے۔"

یہ سنتے ہی دادی اماں کا چہرہ چمک اُٹھا "مشہدی؟ وہ آیا ہے۔ اُسے تم نے کہاں بٹھایا؟"

"باہر کھڑے ہیں۔"

"جلدی سے اندر بُلا و بیٹی۔ جانتی نہیں یہ سابق سلطان عبدالجلال کے حقیقی بھانجے ہیں۔ شہزادے کو اور اس کے تمام بہن بھائیوں کو "کتاب مقدس" میں نے پڑھائی تھی۔ اسی سلسلے میں سلطان کا تمام خاندان مجھ پر مہربان رہا۔ یقیناً نوجوان شہزادے کو میری علالت کی خبر ہو گئی ہوگی۔ جلدی بھاگو۔ انہیں اندر لے آو۔"

میں نے سیاہ ریشمین جالی کا وہ خوبصورت رومال ٹہلایا جو ہم مشرقی لڑکیاں اجنبی سے بات کرتے ہوئے اپنے چہرے پر

ڈال لیتی ہیں۔ مگر دادی اماں نے کہا "شہزادہ مشہدی سے چہرہ چھپانے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے جاکر دروازہ کھول دیا۔

---(۲)---

دروازے کے کھلنے کے بعد

دروازے کے کھلتے ہی شہزادہ مشہدی اندر داخل ہوئے، میں نے نظر بچاکر آنے والے کو دیکھا۔ نہایت شکیل اور سجیلا نوجوان تھا۔ دراز قد۔ وجیہہ چہرہ۔ مسکراتی ہوئی نیلی آنکھیں۔ خمدار سنہرے ابرو۔ نارنجی رنگت کے چمکدار بال۔ ہونٹوں پر بے پروایانہ اور شاہانہ انداز کی ہلکی مسکراہٹ۔ نظریں ایسی تیز جیسے تمام پوشیدہ رازوں کو کھول کر رکھ دیں گی! حسن و تمکنت کا ایسا مجسمہ میں نے کبھی کا ہیکو دیکھا تھا! نہ ایسی خوبصورتی میری نظر سے گذری تھی۔ نہ ایسا وقار! جی چاہتا تھا کہ ٹکٹکی باندھکر پاگلوں کی طرح انہیں تکے جاؤں۔ مگر نامناسب سمجھکر بڑی کوشش سے نظریں جھکالیں اور شہزادے کو اندر لے چلی۔

دادی اماں اپنے تکیوں کے سہارے بیٹھ گئی تھیں۔

"میری پیاری نانی —— زہرہ" پرنس مشہدی کے منہ سے نکلا۔

دادی اماں نے گردن اونچی کرکے اُن کے بالوں کو بوسہ دیا "تم سب پیاروں کی یاد ہمیشہ میرے دل میں رہی بیٹیا۔ تم لوگوں کی مہربانیاں —— تمہارا اور خصوصاً ننھی شہزادی عائشہ کا بچپن مجھے کبھی نہیں بھول سکتا"

میں دروازے کی اوٹ سے خوبصورت شہزادے کے چہرے اور محبوب انداز کا جائزہ لے رہی تھی۔

وہ اُس وقت نانی پر کسی قدر جھکے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے "نانی۔ دیکھو تو تمہاری علالت کی خبر سنتے ہی میں تین سو میل سے چلا آیا۔ پھر تم کہتی ہو کہ محبت نہیں رہی؟ تعطیلات کا زمانہ ہے۔ ہماری شکار پارٹی "گوجران" کے آبشار کے پاس آئی ہوئی تھی۔

دادی اماں کہنے لگیں "یہ تو خُدا کی مرضی تھی کہ تم عین وقت پر آگئے۔ میں بہت بیمار ہوں پیارے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ خیر خُدا کی مرضی۔ قہوہ پیو۔ ابھی تیار ہو جائیگا۔"

"نہیں اسکی ضرورت نہیں"

"واہ ضرورت کیوں نہیں؟ دیکھو گھٹائیں اُٹھ رہی ہیں، قہوہ کا لطف آجائیگا۔ زیبا۔ زیبا۔ بیٹی قہوہ۔"

مشہدی کی نظریں مجھ پر تھیں۔ میں نظریں جھکائے پردے کے پاس چپ چاپ کھڑی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ بغور میری طرف دیکھ رہے ہیں تو مارے حجاب کے میرا چہرہ گلاب کی طرح سُرخ ہو گیا۔ اُنکے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔ آنکھیں نہایت شوخ ہو گئی تھیں۔

اُدھر دادی اماں اپنی کہانی سُنائے جا رہی تھیں۔

"زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کسے پتہ کب حُکم آجائے۔ بس ایک ہی فکر ہے بیٹیا۔ وہ اس لڑکی کی ہے۔"

"یہ کون لڑکی ہے نانی؟" انہوں نے جھٹ پوچھا۔ جیسے وہ منتظر ہی تھے۔

"زیبا۔ اِدھر آؤ پیاری" دادی اماں نے آواز دی۔

میں قہوہ دان ہاتھ میں لئے ایک ہلکی آسمانی رنگ کی ریشمی چادر میں لپٹی لپٹائی شہزادے کے قریب گئی۔ اور سر جھکاکر کھڑی ہو گئی۔

شہزادہ مشہدی پہلے تو کچھ دیر مسکراکر بغور مجھے دیکھتے رہے پھر نہایت بزرگانہ انداز میں مجھے اپنی طرف کھینچکر میرے سنہرے بالوں پر شفقت سے ہاتھ رکھدیا۔

دادی زہرہ کی طرف آدھے پلٹ کر بولے "فکر کی کوئی بات نہیں نانی. زیبا بہت ہی پیاری لڑکی ہے۔ ایسی لڑکیوں کیلئے فکر کا کیا موقع؟"

شرم و حیا نے میری پلکوں کو اور بوجھل بنا دیا۔

ابھی تک اُن کا ہاتھ میرے سر پر تھا اور اُن کی نظریں میرے چہرے پر۔ خون میری رگوں میں تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ اور سانس بھی زور زور سے چل رہا تھا۔

"فکر کیسے نہ ہو بیٹا! میری زندگی میں زیبا اپنے گھر کی ہو جاتی تو میری رُوح مُسکراتی ہوئی اس جہاں سے رُخصت ہو جاتی۔"

دادی اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے دُھندلی ہو گئیں۔

مجھے دادی اماں کے اس انداز پر بیحد غصہ آ رہا تھا۔ بھلا شہزادہ مشہدی کے آگے اس تذکرے کی کیا ضرورت تھی؟

میں مجروح نظروں سے اُنکی طرف دیکھنے لگی۔

شہزادے نے شاید میری دلی کیفیات کو تاڑ لیا۔ مُسکرا کر بولے "کیوں زیبا؟ تم بھی اس سلسلے میں پریشان ہو؟ کہ تمہاری شادی ——— ؟"

میں نہایت سنجیدگی سے بولی "بالکل نہیں شہزادے مشہدی۔ بالکل نہیں۔"

وہ ہنس پڑے۔ نہایت دلفریبی کے ساتھ ہنسے۔ اس طرح ——— کہ اُن کا چہرہ دمک اُٹھا۔

میں آہستہ سے اُنکے ہاتھ کے نیچے سے نکل آئی۔ اور دریچے کے پاس چُپ چاپ ایک کوچ پر بیٹھ گئی۔

بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے! اور ہوائیں وحشی راگ الاپ رہی تھیں۔ سمندر غصّے سے چیخ رہا تھا۔

شہزادہ مشہدی نے ایک سرگرمی سے کہا "نانی! پیاری حسین لڑکیوں کیلئے فکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اُن کی تقدیر بھی حسین ہوتی ہے۔"

"خدا ایسا ہی کرے پیارے" نانی زہرہ نے کہا۔ پھر ذرا دھیمے لہجے میں بولیں "جمعرات کی شام لفٹنٹ فیروز کی ماں مجھ کو ملنے آئی تھیں۔ وہ زیبا کو پسند کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے لفٹنٹ فیروز بہت ہی معصوم لڑکا ہے۔"

میں شعلہ بار نظروں سے دادی زہرہ کو دیکھنے لگی۔

"میں نے اس لڑکے کو ایک دفعہ دیکھا ضرور ہے۔ خاصا ہے۔ اگر میری رائے پوچھتی ہو تو میں اپنی بیٹی کی شادی کبھی اس سے نہ کرتا۔"

یہ کہکر وہ ہنسنے لگے۔

"کیوں بیٹا! کیا بات ہے؟" دادی زہرہ نے تکیے پر سنبھلکر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ نہایت حلیم الطبع۔ مگر ضرورت سے زیادہ نیک۔ اور تم جانتی ہو میں اعتدال کی قدر کرتا ہوں۔ اُس کی نیکی نے اسے اُلّو بنا رکھا ہے۔ نیک لوگوں کے چہرے آنکھوں کو کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔"

کیسے پاکیزہ خیالات تھے! میں ایک مدت سے دادی اماں کی بوڑھی باتیں سنتے سنتے بیزار سی رہنے لگی تھی۔ اب ان نوجوان خیالات کو سنکر دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ میں نے قدر و محبت کی ایک نگاہ شہزادے پر ڈالی۔

دادی اماں کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی کہنے لگیں "مجھے تو اس علاقے کے تمام لڑکوں میں یہی ایک بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

کچھ دیر کیلئے میں کمرے سے باہر چلی گئی۔ تاکہ یہ تکلیف دہ ذکر ختم ہو جائے۔ جب دوسری بار آئی تو دادی اماں کہہ رہی تھیں "یہ تو کہو شہزادی زبیدہ کیسی ہیں؟"

"امی جان اچھی نہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے انہیں نمونیہ کی دِق ہو گئی ہے۔ سوئٹزرلینڈ گئی ہیں۔ اُنکی ایک ہی تمنا ہے اور وہ یہ کہ اُن کی زندگی میں میری شادی ہو جائے" یہ کہکر

دی ہنسنے لگے۔

دادی زہرہ شہزادے کی طرف دیکھکر بولیں "ٹھیک تو ہے۔ اُن کی یہی خواہش ہونی چاہیئے۔ بیچاری شہزادی زبیدہ ایسے موذی مرض کا شکار ہوگئیں! تو پھر تم نے کیا تجویز کیا؟۔ کب کروگے شادی؟"

بے فکری کے انداز میں سگرٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے شہزادے نے کہا "شادی تو جب ہوگی۔ ہوگی۔ فی الحال منگنی ہوگئی ہے۔ امی جان نے میرے لئے نواب نصیر کی لڑکی پسند کی ہے۔ گذشتہ مہینے میں نے انگشتری بھی انہیں بھیجدی۔"

دادی اماں خوش ہوگئیں "خدا مبارک کرے۔ بس بیٹا۔ اب شادی میں دیر نہ کرو۔ شادی وہی جو جوانی میں ہوجائے۔ تیس تیس۔ چالیس چالیس سال میں شادی! یہ بھی بھلا کیا شادی ہوئی! ابھی بہاریں میں کر ڈالو۔"

اس ذکر سے میرے دل پر اچانک ایک بجلی سی گری۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میری عمارت آرزو کی بنیادیں ہلادیں۔ مگر آخر کیوں ——— ؟ یہ میں کبھی نہیں سمجھ سکی۔

۳

ایک غلطی کا احساس

جب شہزادہ مشہدی رخصت ہونے کو اٹھ کھڑے ہوئے تو دادی زہرہ کی آواز نے مجھے چونکادیا "زیبا۔ شہزادے کو دروازے تک پہونچا آؤ بیٹی۔"

شہزادے نے جھک کر دادی اماں کے رخسار کو پیار کیا۔ پھر ہم دونوں دروازے کی طرف چلے۔ وہاں پہونچکر ہم دونوں تھم گئے۔

"زیبا! خدا حافظ!" شہزادے نے میری طرف دیکھکر نہایت ملائمت کے ساتھ کہا۔

بے اختیار میرا دل چاہتا تھا انکے کوٹ کا دامن پکڑ لوں اور انہیں ہرگز نہ جانے دوں۔ نہ جانے کیوں؟

میں نے بمشکل کہا "مگر آندھی چل رہی ہے۔"

"بہت اچھا زیبا۔ اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں نہیں جاتا۔ تم کسقدر مہربان ہو!"

اپنا مطلب اُن کے ہونٹوں سے ادا ہوتے ہوئے دیکھکر میں شرما گئی۔ بولی "میرا مطلب تھا ایسے موسم میں باہر جانے سے آپ کو تکلیف ہوتی۔"

وہ مسکرائے "میں جانتا ہوں موسم برا ہے۔ چلو کچھ دیر اس سامنے کے دریچے میں کھڑے ہوکر آندھی کا منظر دیکھیں۔"

سامنے زینے کے پاس ایک لمبی سی حسین دریچی کھلی ہوئی تھی جس میں سے سمندر کا منظر بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔

میں جادو کی پتلی کی طرح ان کے ساتھ دریچے تک گئی۔ دونوں چپ چاپ دریچے میں کھڑے باہر کا نظارہ کرنے لگے۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ یکلخت میری طرف پلٹ گئے۔ مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولے "زیبا؟ تمہیں معلوم ہے؟ تم بیحد خوبصورت ہو؟ نہ جانے تمہاری دادی تمہارے لئے پریشان کیوں ہیں؟—" پھر میری ٹھوڑی پکڑ کر اوپر کو اٹھاتے ہوئے ہنسکر کہنے لگے "دیکھو! کیا چاند سی شکل ہے! ایسا حسن عموماً دیکھنے میں نہیں آتا۔"

اسوقت میرے دل میں ایک درد سا اٹھا۔ کچھ دیر بعد ہمت کر کے بولی "دنیا میں حسن کی کمی نہیں۔"

"مثلاً ——؟" شہزادے مشہدی نے شوخی سے پوچھا۔

بے اختیار میری زبان سے نکل گیا "مثلاً نواب نصیر

کی صاحبزادی"۔ اور پھر یکلخت اپنی حماقت کا احساس ہوا۔

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ "ایں؟ کیا نواب نصیر کی صاحبزادی کو تم جانتی ہو؟ میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"جی نہیں۔ میں نے بھی نہیں دیکھا لیکن قیاس کہتا ہے کہ وہ بیحد حسین ہوگی۔"

شہزادے نے سنجیدگی سے کہا۔ "زیبا کیا یہ عجب نہیں میں نے اس لڑکی کو دیکھا تک نہیں جو میری شریک زندگی بننے والی ہے۔ اور جس پر میری حیات کا دارومدار ہوگا؟" پھر ایک پھیکی ہنسی ہنسکر کہنے لگے۔ "زیبا اس وقت تم اپنے دل میں مجھے بیوقوف تو نہیں سمجھ رہیں؟"

وہ مجھ سے اس بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے جیسے ساتھ کے کھیلے ہوئے آپس میں تبادلہ خیال کر رہے ہوں۔

میں کچھ متاثر ہو گئی، بولی: "میں آپ کے متعلق کبھی ایسا خیال نہیں کر سکتی۔"

"کیسا خیال؟ ——— یہ کہ میں بیوقوف ہوں؟ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں زیبا میں درحقیقت بیوقوف ہوں۔ میری ماں نے مجھے اک ایسی لڑکی سے منسوب کر دیا ہے جسے میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ مگر تعجب تو مجھے اس بات کا ہے کہ آج سے پہلے مجھے اپنی اس غلطی کا احساس کیوں نہیں ہوا؟"

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ میرے دل میں ایک نامعلوم خوف کا احساس تھا۔ مستقبل پر ایک بھاری پردہ پڑا تھا۔ اور پسِ پردہ اسرار نے میرے دل کو طرح طرح کے اندیشوں سے بھر رکھا تھا۔

بڑی دیر تک ہم دونوں ساکت کھڑے رہے۔ باہر آندھی پُرانے پیڑوں کو اکھیڑے دے رہی تھی۔ سیاہ بادل تمام آسمان پر مسلط ہو چکے تھے۔ سمندر درندے کی طرح گرج رہا تھا۔

جب میں واپس گھر میں آئی تو اُداس تھی۔ نجانے کیا سوچ رہی تھی۔ نجانے میرا دل کیوں دھڑک رہا تھا۔ آپ سے آپ کبھی آنکھوں میں آنسو امنڈ آتے کبھی لبوں پر ہلکی مسکراہٹ آجاتی۔

۴

کشیدگی

اسی شام کا ذکر ہے کہ بادل اور بھی زیادہ گھرے ہوگئے تھے۔ ہواؤں کا شور کان کے پردے پھاڑے ڈالتا تھا۔

میں باورچی خانے میں دادی زہرہ کے لئے شوربہ گرم کر رہی تھی۔ کہ اسی وقت شاہ بلوط کے پیڑ کے قریب ایک سایہ سا گذرتا دکھائی دیا۔ ایسے موسم میں کون ملاقاتی آسکتا تھا؟

میں نے دریچی سے جھانک کر دیکھا تو لفٹننٹ فیروز کا سر نظر آیا۔ میرے دل سے ایک آہ نکل گئی۔

مجھے آج پہلی بار محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے اس شخص سے محبت نہیں۔ میں اس سے محبت کر ہی نہیں سکتی۔ کیوں؟ کیوں نہیں کر سکتی؟ ——— اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ میں نے بادلوں کو دیکھا جن کے سیاہ سائے میں میرا کاسنی لباس زیادہ گہرا معلوم ہو رہا تھا۔

میں شوربے کی پیالی ہاتھ میں لئے دادی زہرہ کی خوابگاہ میں داخل ہو گئی۔

لفٹننٹ فیروز مجھے دیکھکر کھڑا ہو گیا۔ اور آہستہ سے بولا "آپ کی دادی سو رہی ہیں۔ شوربہ کی پیالی تپائی پر رکھ دیجئے اور باہر چلئے۔"

میں نے کہا "کہاں؟"

"باغیچے میں چلئے۔ آندھی کا زور دیکھیں۔ یہاں باتوں کی

آواز سے وہ کہیں جاگ نہ جائیں۔"

میں نے کسی قدر رکھائی سے کہا: "یہ کیا ضرور ہے کہ ہم یہاں بیٹھکر باتیں ہی کریں؟"

میرے اس لہجے پر حیران ہوکر وہ مجھے دیکھنے لگا۔ کچھ عرصے سے ایک نامعلوم طریق پر سب کے دلوں پر یہ خیال مسلط تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے منسوب ہیں۔ حالانکہ ہماری کوئی باقاعدہ منگنی نہ ہوئی تھی، مگر اس علاقے کے سب لوگ جانتے تھے کہ عنقریب ہم دونوں شادی کی زنجیروں میں اچانک جکڑ دیے جائیں گے۔ خود فیروز اسی غلط فہمی کا شکار تھا۔ چنانچہ جب اس نے مجھے خلاف معمول کسی قدر بدلا ہوا پایا تو آہستہ سے مجھے باغ کے زینے پر لاکر پوچھا: "زیبا کیا بات ہے؟"

میں زرد گلاب کی ایک پتی بے پروائی سے مسل رہی تھی بولی: "کوئی بات نہیں۔"

لفٹننٹ فیروز کہنے لگا: "کیوں زیبا، تم اپنی دادی کی علالت سے پریشان ہو؟ اگر یہی وجہ ہے تو پیاری اپنے دل کو مضبوط رکھو۔ خدا نے چاہا تو ہفتے بھر میں وہ تندرست ہو جائیں گی۔ اور پھر —— اور پھر —— ہم لوگ۔"

"خدا کیلئے ——" میری زبان سے نکلا: "چپ رہو۔ آج یہ باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔"

"کیا ایام عروسی کا بھی ذکر اچھا نہیں لگتا؟"

"زہر لگتا ہے۔"

"زہر لگتا ہے؟" لفٹننٹ فیروز حیران ہوکر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر کچھ وقفے کے بعد بولا: "میں رخصت ہوتا ہوں۔ آندھی بڑھتی جاتی ہے۔ تم بھی آج پریشان ہو۔ کل آؤنگا۔"

یہ کہکر وہ چلا گیا۔

میں کچھ دیر خاموش کھڑی اس شمشاد کے پیڑ کو دیکھتی رہی جو آندھی کے زور سے جھک جھک کر زمین بوس ہو رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ دادی اماں کی خوابگاہ میں گئی۔ وہ ابھی تک سو رہی تھیں۔ میں چپ چاپ انکے سرہانے بیٹھ گئی۔

میرے خیالات معبود جانے کہاں کہاں آوارہ تھے۔ کمرہ خاموش تھا۔ کبھی کبھی دور سے بادلوں کے گرجنے کی آواز آجاتی۔ یا دادی زہرہ کے سانس کی آواز تھی۔

شہزادے مشہدی کا حسین اور دراز مجسمہ میری آنکھوں میں موجود تھا۔ بے پروایانہ انداز۔ دلآویز مسکراہٹ۔ حسین چہرہ۔ شوخ گفتگو۔ پھر ان کا وہ فقرہ —— جس نے میری دنیائے خیال میں ہلچل مچا دی —— "آج سے پہلے مجھے اس غلطی کا احساس کیوں نہیں ہوا!؟"

اللہ —— میرے معبود! اس سے ان کا کیا مطلب تھا! آج سے پہلے —— کیا وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟ —— مگر میں تو اپنا دل۔ اپنے دل کا ایک ایک گوشہ ان کی ضیائے محبت سے منور پاتی تھی!۔

—— ۵ ——

شہتوت کے سائے تلے

اس دن کے بعد مجھے ہر روز شہزادہ مشہدی کا انتظار رہا۔ اکثر سمندر کی طرف اس امید میں نگاہیں دوڑاتی کہ شاید وہ آرہے ہوں۔ مگر اس دن کے بعد وہ ہفتوں نہیں آئے۔

ایک دن جبکہ میں بالکل مایوس ہو چکی تھی، دوپہر کے کھانے سے ذرا پہلے کچھ زیر لب گنگناتی ہوئی باغ میں شہتوت کے پیڑ کے پاس گئی اور نانی زہرہ کیلئے شہتوت توڑنے لگی کہ مصنوعی حرارت سے پکاؤں۔

موسم بہت ہی دلفریب تھا۔ ہلکی گرمی نہایت دل پسند تھی۔ بادل پھٹ گئے تھے۔ سمندر نہایت نیلا بنفشہ کے پھول کے

رنگ کا ہو رہا تھا۔ سبز پتّوں پر سنہری دھوپ جگمگا رہی تھی۔ ایشیا کا گستاخ آفتاب اپنے پورے آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔

اسی وقت باغ کے زینے پر کسی کے قدموں کی آواز آئی اور میں ایکا ایکی خدا جانے کیوں لرز گئی۔

"پیاری زیبا!" مشہدی کی موٹی آواز سنائی دی "میں نے تمام گھر میں تمہیں ڈھونڈ ڈالا"

میرا چہرہ چمک اٹھا۔ میری امیدوں کا چاند کسی افق پر ابھر آیا۔

میں اپنی مسرت چھپا نہ سکی۔ مشہدی قریب آ گئے۔ کہنے لگے "بخدا تم تو شعلہ کی طرح سرخ ہو رہی ہو۔ کیا بات ہے؟"

میں اپنی مسرت کو ضبط کر کے بولی "دوپہر کے کھانے کے لئے شہتوت توڑ رہی تھی کہ مصنوعی حرارت سے بچاؤں۔ آپ تو دنوں بعد تشریف لائے" آخری الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

وہ اک ٹہنی پر نظر جما کر بولے "یہاں آنا شاید نہ آنے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا — کیونکہ"

میرا دل دھڑکنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تمہید ہے وہ تھوڑی منٹوں بعد کچھ اس سے زیادہ واضح بات کہیں گے۔

مگر انہوں نے شہتوت کی ایک ٹہنی جھکا کر گفتگو کا رخ بالکل بدل دیا "دوپہر کیسی گرم ہے"

میرا دل بیٹھ گیا۔ جی چاہتا تھا وہ اپنے افسانوی نامکمل فقرے کو زیادہ واضح کرتے۔

میں نے پوچھا "یہاں آنا نہ آنے سے زیادہ تکلیف دہ کیوں ہوتا......؟"

اس سوال کے بعد مجھے یقین تھا کہ ایک طویل داستانِ محبت سنوں گی۔

وہ ایک میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھکر بولے "زیبا اتنی بھولی نہ بنو۔ ایسے سوال جس آسانی سے کئے جاتے ہیں اس آسانی سے اُن کے جواب نہیں دئے جا سکتے" یہ کہکر کسی خیال میں سیٹی بجانے لگے۔

مجھے غصہ آ گیا۔ آخر کب وہ صاف صاف لفظوں میں مجھ سے کہیں گے کہ انہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟ یہ پس و پیش کیوں؟ میں اس سے تھک گئی تھی۔ میں چاہتی تھی جو بے چینیاں میری رات کی نیند اور دن کے آرام کی دشمن بنی رہی ہیں وہ اظہارِ آرزو کے ساتھ انہیں ختم کر ڈالیں۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ مناسب موقع ڈھونڈ رہے ہیں اور آج کی ملاقات میں ضرور اپنی داستانِ محبت سنا کر رہیں گے۔

اچانک وہ مڑ کر بولے "زیبا خدا حافظ!"

میں سراسیمہ ہو گئی "کیوں؟"

"ایک کام ہے"

میرا دل ٹوٹ گیا۔ آہ ظالم! سنگدل! شہتوت کے سائے میں کیا چیز تجھے اظہارِ محبت سے روک رہی ہے؟ موسم دلفریب تھا۔ سمندر لہریں مار رہا تھا۔ سنہری دھوپ باغیچے پر مسکرا رہی تھی! ایسے وقت کون سی چیز اظہارِ محبت سے روک سکتی تھی —؟

ان ہی خیالات میں گم تھی کہ وہ جانے کے لئے آمادہ بھی ہو گئے۔

میں گھبرا کر بولی "آپ کو سمندری مچھلی کا شوق نہیں ہے؟ ہے تو آپ دوپہر کا کھانا یہیں کھائیے" میں نے یہ اس لئے کہا کہ پرنس مشہدی کو کچھ گھنٹے اور یہاں بسر کرنے کا موقع مل جائے۔

وہ ہنسکر بولے "میرے رک جانے سے تمہیں خوشی ہو گی؟"

"بیحد" میں نے کہا "کھانا بالکل تیار ہے"

"اچھی بات ہے" شہزادہ مشہدی نے کہا۔

میں انہیں کمرۂ طعام میں لے آئی۔

---- ۶ ----

وہ چاندنی رات!

اُس دوپہر دادی زہرہ کی طبیعت کچھ بحال تھی۔ وہ بھی میز پر کھانے میں شریک تھیں۔

اتفاق کہیے یا بدقسمتی کہ ہم کھانے پر بیٹھے ہی تھے کہ باہر اطلاعی گھنٹی بجی۔

دادی زہرہ مسکرا کر بولیں "کیا اچھا ہو گھنٹی بجانے والا فیروز نکلے۔ کیونکہ مشہدی، میں چاہتی ہوں تم ایک نظر اس لڑکے کو دیکھ لو۔"

دادی اماں پر مجھے اتنا غصہ آیا جس کی انتہا نہیں مگر گھبرا سی گئی۔ مشہدی ایک آلو کا ٹکڑا چھری سے کاٹ کر کھا رہے تھے کہ لیتے میں کیا دیکھتی ہوں دادی اماں کی اُمید کے مطابق لفٹنٹ فیروز اندر چلے آ رہے ہیں۔

"بڑی عمر ہے تمہاری۔ ابھی تمہارا ہی ذکر تھا۔ یہ لفٹنٹ فیروز ہیں۔ اور یہ پرنس مشہدی۔ سلطان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے۔"

دونوں بولے: "ہم پہلے مل چکے ہیں۔"

دادی اماں کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا تھا۔

میں بت کی طرح چپ چاپ تھی۔ اور اپنی پلیٹ پر جھکی غیر معمولی انہماک کا اظہار کر رہی تھی۔

فیروز آ کر میرے بائیں ہاتھ بیٹھ گیا۔ کیونکہ یہی ایک نشست خالی تھی۔

"سمندری مچھلی نہایت عمدگی سے تلی گئی ہے" شہزادہ مشہدی نے کہا۔

لفٹنٹ فیروز بولا: "خاتون زیبا نہ صرف مچھلی کے شکار کی بلکہ مچھلی پکانے کی بھی ماہر ہیں۔ کیوں زیبا؟ کل نہر شربوط پر مچھلی کے شکار کو چلو گی؟"

"نہیں ——" میں نے رکھائی سے جواب دیا پھر گوشت پر لیمو نچوڑتے ہوئے بولی: "مجھے مچھلی کے شکار کا اتنا شوق نہیں جتنا تم سمجھتے ہو کہ ہے۔"

"تو کیا اس ہفتے شربوط نہیں چلو گی؟"

"نہیں میرا جی نہیں چاہتا۔"

دادی اماں متوجہ ہو گئیں: "زیبا کیا بات ہے؟ ایک مہینے سے تم کچھ علیل سی رہتی ہو؟"

مجھے یقین تھا کہ اس سوال کا کچھ اثر شہزادہ مشہدی پر ضرور پڑیگا۔ مگر جب اُن کے چہرے کی طرف نظر اُٹھائی تو وہاں کچھ نہ تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے انناس کا ایک ٹکڑا اپنی پلیٹ میں لئے پھلوں کی چھوٹی سی چھری سے کاٹ کر کھانے میں مصروف تھے۔

کھانے کے بعد میں نے کسی نہ کسی بہانے انہیں روکے رکھا کہ شاید کسی زیادہ مناسب وقت میں وہ محبت کی کوئی بات مجھ سے کہیں۔ شاید اس فرانسیسی کھڑکی میں بیٹھ کر کہیں جو نیلے سمندر کی طرف کھلتی ہے۔ شاید صنوبر کے اُس خوبصورت پیڑ کے نیچے، جو بہار کی ہواؤں میں والہانہ جھومتا ہے۔ شاید باغ کے اُس زینے پر، جس پر نارنگی کے درخت کا سایہ دھوپ اور چاندنی میں کانپتا ہے۔ یا شاید رات کی خاموشی میں —— جب ماہ مئی کا نارنجی اور روشن چاند حسن کو مخمور بنا دیتا ہے۔ اس خیال سے میں نے رات تک انہیں روکے رکھا۔

آخر وہ چاند بھی نکلا —— جس کی روشنی میں مجھے امید تھی کہ میری تمناؤں کی کلی کھلے گی۔

وہ ایک نہایت ہی رومانوی رات تھی۔ گرم ایشیا کی ایک فسوں انگیز رات۔ نیلے آسمان پر ماہ مئی کا چاند موجود تھا۔

ہواؤں میں درختوں کے شور کا شبہ۔ سمندر نیند میں بہک رہا تھا۔

زرد لیمو کے درختوں پر گرم موسم کی بلبل رہ رہ کر دردِ دل بیان کر رہی تھی۔ ساحل پر ایسی ہوشربا چاندنی کو دیکھ کر جل پریاں بھی اپنی داستانِ عشق کو تازہ کر رہی ہونگی۔ ایسے وقت میں مَیں نوجوان شہزادے کو ایک عربی وضع کے رنگین اور جالی دار دریچے میں لے آئی۔ جس کے نیچے ایک فوارے کا پانی وارفتگی کے عالم میں اُبل رہا تھا ——— آہ اظہارِ آرزو کے لئے اس سے بہتر وقت اور مقام کیا ہو سکتا تھا؟ دریچہ۔ چاند۔ پھول۔ موسیقی۔ وہ سب چیزیں موجود جن سے ادب اور شاعری کی دنیا رنگین ہے۔

ہم دونوں دیر تک خاموش کھڑے رہے۔

آخر اُکتا کر میں نے کہا "وہ ——— وہ بلبل کیا گا رہی ہے؟ کیا کہنا چاہتی ہے؟"

بلبل جیسے شاعرانہ پرند کا ذکر چھیڑ کر میں خوش تھی کہ شاید اس سے کوئی ابتدا ہو۔

مگر وہ کہنے لگے "میں پرندوں کی باتوں پر عموماً غور نہیں کیا کرتا ——— مگر شاعر کہتے ہیں بلبل ایک حسرت نصیب چڑیا ہے۔"

میں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں "کیوں؟ شاعر اسے حسرت نصیب کیوں کہتے ہیں؟"

"سنا ہے یہ گلاب کی شیدائی ہے۔ اور تم جانتی ہو جو ذی روح محبت کرتا ہے وہ ہمیشہ غم و الم میں مبتلا رہتا ہے ———"

میرے دل کی کلی کھلنے کے قریب تھی۔ مجھے یقین ہو گیا بڑھتے بڑھتے یہ گفتگو ذاتیات پر آجائے گی۔ بلبل اور گلاب ہم بجائے میں ہونگی اور مشہدی۔ مگر افسوس! اسی وقت انہوں نے اپنی کوٹ کی جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ سلگا لیا۔ اور اس کے دھوئیں میں سے سامنے سمندر کو تکنے لگے جس میں ننھی ننھی کشتیاں آ اور جا رہی تھیں۔

میں بولی "جی چاہتا ہے سمندر کی سیر کریں۔ ایسی سہانی چاندنی میں کشتی میں آہستہ آہستہ پانی کے بہاؤ پر جانا ——— اللہ ———"

وہ فوراً رضامند ہو گئے "میرا خیال ہے تمہاری دادی اس سے برا نہ مانیں گی اگر تم میرے ساتھ چلو۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تمہاری منگنی ہو چکی ہے اور عنقریب میں بھی ایک لڑکی کا منسوب ہوں۔" وہ ہنس پڑے۔

اس گفتگو کا میرے دل پر کیا اثر ہوا؟ کشتی کی سیر کا لطف خاک میں مل گیا۔

کچھ دیر بعد ایک لال نما کشتی خود فراموشی کے عالم میں ہمیں نقرئی پانیوں پر لئے جا رہی تھی۔

"زیبا" مشہدی نے کہا "کیسی پیاری رات ہے! کاش زیبا۔ ہماری پوری زندگی ایک ایسی ہی طویل رات ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں میری زندگی میں سب سے زیادہ خوشگوار رات کبھی نہیں آئی۔ یہ حسین رات۔ اُفوہ!"

وفورِ مسرت سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اس تیزی سے کہ کبھی نہ دھڑکا تھا۔ میری روح چیخ پڑنے کے قریب تھی۔ جی چاہتا اس فرشتۂ محبت کے آگے اپنے دل کی کتاب کھول کر رکھ دوں۔

"زیبا!" انہوں نے مجھے مخاطب کیا "ایسے عالم میں تم اتنی گم سم کیوں ہو؟"

"کیونکہ ——— کیونکہ میں جانتی نہیں مجھے کیا کہنا چاہئے۔"

میری آواز لرز گئی۔ دل پاگل ہوا جا رہا تھا۔

"اس کا کیا مطلب زیبا؟ کیا تم افسردہ ہو؟"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے کیونکہ یہ سب کچھ تھا اچانک

ہوا کہ میری قوت برداشت سے باہر تھا۔

"آہ چاندنی کی روشنی میں تمہارا لنقرئی آنسو میرے دردِ دل کی تفسیر کر رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور جھک کر رازداری کے انداز میں پوچھنے لگے "زیبی! کہو۔ اس رات سے پہلے کبھی ایسی دلفریب رات زندگی میں آئی تھی؟ ایسی طرب انگیز؟ ایسی نکہت بیز؟"

"کبھی نہیں۔" ایک سسکی بھر کر میں نے کہا۔ "نہ پھر — نہ پھر کبھی آئے گی۔" میں نے جملہ ختم کیا۔

"تم اپنے مستقبل سے اس درجہ بدگمان ہو؟ مجھے معلوم نہ تھا۔" پھر انہوں نے محبت سے میرا چہرہ اٹھا کر کہا۔ "کیا تم اپنے نسب سے مطمئن نہیں ہو؟ زیبی! کیا تم دونوں میں محبت نہیں ہے؟"

"محبت؟ مشہدی۔ مجھے فیروز سے نفرت ہے۔" میں نے پہلی دفعہ لرزتے ہوئے لہجے میں ان کا نام لیا۔ کیونکہ ابھی ابھی انہوں نے مجھے "زیبی" کہا تھا۔

وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ "میں تو ابتک سمجھتا تھا کہ تم مستقبل کے متعلق حسین خواب دیکھ رہی ہوگی۔ میرا خیال تھا تم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے شیدا ہو۔ یا کم از کم نفرت تو نہیں کرتے۔ تمہاری دادی نے مجھ سے یہی کہا تھا۔ کہ تم دونوں اس رشتے سے ناخوش نہیں ہو۔"

میں پانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہاں میں ناخوش نہیں تھی۔ مگر میں نے فیروز سے محبت بھی کبھی نہیں کی۔"

"مگر اب تو تم اس سے ناخوش معلوم ہوتی ہو۔ بلکہ بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خلاف تمہارے دل میں نفرت بھری ہوئی ہے۔"

میں پانی میں چاند کے دلفریب عکس پر نظر جما کر بولی "بلاشبہ۔ اب تو میری روح اس شخص سے الگ ہٹ جانا چاہتی ہے۔"

"لیکن — آخر اسکی وجہ زیبا؟"

آہ۔ وہ کس قدر بھولے تھے۔ میں اس کی وجہ انہیں کیونکر سمجھاتی کہ میں فیروز سے کیوں ایکاایکی نفرت کرنے لگی تھی۔ ان سے کیونکر کہتی کہ اے شخص میں تجھ سے محبت کرتی ہوں! آہ ایک لڑکی اپنا دل چیر کر نہیں دکھا سکتی۔ میری حیا مجھے کبھی اس بات کی اجازت نہ دیتی۔ یہ تو انہیں خود سمجھ لینا چاہیئے تھا۔ کہ اچانک نفرت کا سبب کیا ہے۔ اگر میں انکی جگہ ہوتی تو پہچان نہ جاتی؟ لمحوں میں تاڑ جاتی۔

وہ مجسمۂ سوال بنکر میری آنکھوں کو تک رہے تھے۔ کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرتے تھے؟ آہ اسی شبہ نے تو میری زندگی تہہ و بالا کر رکھی تھی۔ وہ ضرور مجھ سے محبت کرتے ہیں خواہ وہ اس کا اظہار نہ بھی کریں میں سمجھ سکتی ہوں کہ ابھی اسکا موقع نہیں آیا۔ ان کی دل کی گہرائیوں میں ایک ہی چیز پائی جا سکتی ہے اور وہ میری محبت ہے! — مگر کیا پتہ — یہ سب کچھ دھوکا ہو۔ محض دھوکا! وہ مجھ سے محبت ہی نہ کرتے ہوں۔ لیکن — اگر وہ مجھ سے محبت نہ کرتے تو ایسی چاندنی رات زندگی میں آتی ہی کیوں؟ — وہ دادی زہرہ کی مزاج پرسی کے بہانے دوبارہ یہاں کیوں آتے۔

میری خاموشی حد کو پہونچ گئی تھی۔

وہ بیزار ہو کر بولے۔ "زیبا اگر میرا پوچھنا ناگوار گذرا ہو تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

"آپ کا پوچھنا ہرگز ناگوار نہیں گزر سکتا۔"

"تو پھر تم چپ کیوں ہو؟"

"کیا بتاؤں مشہدی۔ میں کیوں فیروز سے نفرت کرنے لگی ہوں؟"

وہ بچوں کے سے لہجے میں بولے۔ "اچھا تم معتوں ہی

میں بتا دو میں پوچھ لونگا۔"

"یہ میری زندگی کا عظیم تریں راز ہے۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

یہ سنکر اُنہوں نے اپنا خوبصورت مضبوط ہاتھ میرے شانے پر رکھکر کہا۔ "خدا کی قسم زیبا، پھر تو ایسی شادی نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر تم فیروز کی بیوی بن گئیں تو ان رنگین آنکھوں کا کیا حشر ہوگا؟ یہ ننھا سا کاہیدہ جسم نفرت کی آگ میں جل جل کر پھنک جائے گا۔ جہاں محبت نہ ہو وہاں زندگی ویران ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا — کہ تم — تم دونوں کا رشتہ ٹوٹ جائے؟"

"یہ سب کچھ تم پر منحصر ہے۔" ایک چیخ کی طرح میرے مُنہ سے نکل گیا۔ "مشہدی۔ تم چاہو تو سب کچھ کر سکتے ہو۔"

اُن کی آنکھوں میں استقلال چمکنے لگا۔ "میں اپنی پوری کوشش صرف کر دونگا کہ رشتہ منقطع ہو جائے۔ تمہاری دادی سے بھی کہونگا اور اُس بھلے آدمی کو بھی سمجھاؤنگا۔ اچھا زیبی! اب سب کچھ بھول جاؤ۔ زندگی کی تلخیوں کو حرف غلط سمجھو۔ چاند کو دیکھو۔ اس گرجنے والے سمندر کو دیکھو۔ اُفق پہ اِن دھندلے پہاڑوں کو دیکھو۔ زیبا ایسی خوشگوار رات میں زندگی کی تلخیوں کو یاد نہ کرنا چاہیئے۔"

ہم لوگ چاند کی روشنی میں گم ہو گئے۔

آرزوئیں غروب ہو گئیں

دوسرے ہفتے شہر میں گھر گھر یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی میری اور فیروز کی منگنی کی جو افواہیں تھیں اُن کا انجام برا ہوا۔ یعنی ہمارا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔

خواتین میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کسی نے یہ افواہ اُڑائی کہ آئندہ جمعرات کی شام کو شہزادہ مشہدی مجھ کو شادی کرینگے۔ کسی نے کہا کہ فیروز نے خود یہ رشتہ منسوخ کیا۔ غرض جو تھا اپنی بساط کے مطابق خیال آرائیاں کر رہا تھا۔

مگر — تنہا میں اسکی وجہ جانتی تھی۔

دادی زہرہ پر اس واقعہ کا بہت بُرا اثر پڑا۔ وہ کچھ علیل سی ہو گئیں۔

ایک دن جبکہ میں باغ میں شہتوت توڑ رہی تھی وہ مشکل باغ کے زینے طے کر کے میرے پاس پہونچیں۔ کہنے لگیں "زیبا۔ آخر تمہارا ارادہ کیا ہے؟ فیروز سے بہتر شوہر تمہیں کہیں ملجائیگا؟ تم بڑی بیوقوف نکلیں۔"

میں انجان بنی شہتوت توڑنے میں مصروف تھی۔ وہ سامنے ایک چھوٹے سے تنکوں کے کوچ پر بیٹھ گئیں۔ "آخر مجھے بتاؤ تو تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "دادی جان۔ مجھ سے بار بار نہ پوچھئے میرا ارادہ کیا ہے۔ میں کیا کروں؟ میں مجبور تھی۔ فقط فیروز۔ مجھے ناپسند تھے۔"

"مگر آخر کیوں؟ پہلے تو کبھی تم نے یہ نہ کہا تھا۔"

میں پھر خاموش ہو گئی۔

اس واقعہ کے بعد میں سمجھتی تھی کہ شہزادہ مشہدی بہت زیادہ آیا جایا کریں گے۔ مگر وہ اکھٹے چار روز غائب رہے۔ میں اُنکے اس طرز عمل پر حیران ہو رہی تھی۔

چوتھے دن شام کے وقت میں اوپر کی منزل کے ڈرائینگ روم میں بیٹھی ستار بجا رہی تھی۔ غم دل پہ ایک بوجھ کی طرح رکھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے زبان پہ ایک نالہ — جو ستار کے مرتعش تاروں پر اس طرح ناچ رہا تھا۔

جان تم پہ نثار کرتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے۔

اسی وقت عین دریچی کے نیچے باغیچے میں کسی کی گفتگو کی آواز آئی میں نے ستار قالین پر رکھدیا۔ دریچی سے نیچے جھانک کر دیکھا تو دادی اماں اور شہزادہ مشہدی نظر آئے۔ چار دن کے بعد مشہدی کو دیکھکر قلب کی عجب کیفیت ہوئی۔ اِدھر اُنہیں دیکھنے کی خوشی، اُدھر چار دن نہ آنے کی شکایت اور بے پروائی کا صدمہ۔

وہ اس وقت نہایت وجیہہ نظر آرہے تھے۔ شام کی سفید کتائی میں ان کا چہرہ اس قدر بھولا بھالا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بچے کا۔

"آخر اب میں کیا کروں بیٹا مشہدی؟ تم ہی رائے دو۔ آخر آئندہ وہ کیا کرے گی؟ اس نے سوچا نہ سمجھا۔ جھٹ اُسے ناپسند کر دیا۔ آخر فیروز سے بہتر شوہر اُسے کہاں مل جائیگا؟"

مشہدی اطمینان کے لہجے میں بولے "دنیا نہایت وسیع ہے دادی زہرہ۔ آخر زیبا نے کچھ سوچکر ہی اُسے ناپسند کیا ہوگا"۔

دادی اماں غم و غصے سے بے چین ہو کر بولیں "خاک سوچا ہوگا۔ بیوقوفی اور نادانی کے باعث فیروز کو ہاتھ سے گنوا بیٹھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اب آئندہ وہ کرے گی کیا ۔۔؟"

"ہے کہاں؟" مشہدی نے پوچھا۔

"اُوپر ڈرائینگ روم میں تھی ۔۔۔۔ چار دن سے تم نہیں آئے؟"

"ہاں۔ غیر معمولی کام تھا"

تھوڑی دیر میں زینے پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر وہ نیلا پردہ سرکا جس پر جنگلی چھپکلی کی تصویر تھی۔

شہزادہ مشہدی حسب معمول مسکراتے ہوئے میرے سامنے آکھڑے ہوئے۔ وہ اس وقت اتنے خوبصورت اور دلفریب معلوم ہوتے تھے کہ ایسے کبھی معلوم نہ ہوئے تھے۔

پہلے تو انہوں نے آگے کو جھک کر سر کی جنبش سے مجھے سلام کیا۔ پھر میرے قریب آکر بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ "زیبا سناؤ چار دن کیسے گذرے؟ میں تو بہت مصروف رہا"۔

میں بولی "میں سمجھتی تھی کہ تم مجھے بھول چکے"۔

کہنے لگے "نہیں نہیں۔ یہ بات نہ تھی۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ زیبی۔ کبھی نہیں۔ بات یہ تھی کہ وطن سے امی جان کا ایک طویل خط آیا ہے۔ وہ سوئٹزرلینڈ سے واپس آگئی ہیں۔ اور ان کی صحت اطمینان بخش نہیں۔ مجھے فوراً بلایا ہے۔"

میں نے ہمدردی کے لہجے میں کہا "مجھے نہایت افسوس ہے"۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد بولی "اچھا تو پھر ۔۔؟"

"پھر کیا۔ پرسوں شام کے بوٹ سے مجھے چلا جانا چاہیئے ۔۔"

میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ "پرسوں ۔۔ شام ۔؟"

"ہاں پیاری۔ پرسوں شام۔ میری جدائی کا تمہیں رنج ہوگا زیبا؟"

آہ ظالم آدمی! میرے نخل آرزو کی جڑ کٹ گئی اور تو مجھے پوچھ رہا ہے کہ مجھے جدائی کا صدمہ ہوگا یا نہیں ۔۔۔! کم فہم آدمی۔

میری خاموشی پر وہ کچھ حیران ہو کر بولے "زیبا تم مجھے بھول جاؤ گی؟"

میں جل گئی "کوشش کرونگی" میرے منہ سے نکلا۔ اور پھر میں نے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔

وہ متعجب ہو کر بولے "کوشش! کس بات کی کوشش؟"

میں سسکیاں لیکر بولی "تمہیں بھولنے کی"۔

وہ اور زیادہ حیران ہوئے "ایں رو رہی ہو زیبی؟"

کیا واقعی تمہیں میرا جانا مغموم کر رہا ہے؟ پر اس کے ساتھ ہی تم یہ بھی تو کہہ رہی ہو کہ تم مجھے بھول جاؤ گی! ـــ مگر زیبا میں تمہیں نہیں بھولوں گا۔ میں زندگی کے ان ایام کو ہمیشہ یاد رکھونگا جب پہلے پہل تم سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"اور میں ـــ اور میں ـــ ان ایام کو بھولنے کی کوشش کرونگی ـــ میں ہرگز یاد نہ رکھونگی۔"

"تمہارے یہ الفاظ میرا دل توڑ رہے ہیں زیبا۔ میری تمنا تھی کہ جس طرح میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا تم بھی مجھے یاد رکھو۔"

میں بمشکل بولی۔" ویسے میں کب کہتی ہوں کہ تمہیں ضرور ہی بھول جاؤں گی۔ میں یہی کہتی ہوں کہ کوشش کرونگی اگرچہ مجھے یقین نہیں کہ تمہیں بھول سکوں۔ مشہدی میں تمہیں نہیں بھول سکتی۔"

انہوں نے میری آنکھوں کو غور سے دیکھکر کہا۔"کیا واقعی نہیں بھولوگی؟"

"نہیں ـــ"

وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔" اچھا زیبا! خدا حافظ ناصر۔" پھر ایک گہرا سانس لیکر بولے۔" میں اب جا رہا ہوں۔ پھر تمہیں خدا حافظ کہنے کا موقع نہ ملے گا۔ اس لئے مجھے ابھی خدا حافظ کہہ لینے دو۔ کسے پتہ زندگی میں پھر کبھی مل بھی سکوں یا نہ مل سکوں۔ وطن پہونچکر کسے پتہ کیا کیا مصیبتیں پیش آئیں؟ امی جان کی سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ ـــ ان کی زندگی میں ـــ میری شادی ہو جائے۔ زیبی لو خدا حافظ"

یہ کہکر وہ یکلخت مڑ گئے۔ اُن کے قدموں کی آواز زینے پر مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ اور میں صوفے پر آنکھیں کھولے مُردے کی طرح چُپ چاپ پڑی تھی۔ سامنے سورج دم توڑ رہا تھا۔ ادھر میرے دل کے اندر میری آرزوئیں بھی نزع کی کیفیت میں سسک رہی تھیں۔

ـــــــ (۸) ـــــــ

اندھیرا

آج ان واقعات کو پانچ برس گذر گئے۔

دادی جان کا انتقال ہو گیا۔ فیروز کی شادی ہو گئی۔ شہزادہ مشہدی کا بیاہ ہو گیا۔ دنیا تہہ و بالا ہو گئی۔ مگر میں ـــ زندگی کے راستے پر جہاں تھی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

آہ محبت، ایک عورت اور ایک مرد کی زندگی پر کتنا مختلف اثر کرتی ہے۔ اس نے عورت ہی کو بدسلوکی کیلئے کیوں منتخب کیا؟۔

زندگی ـــ جس میں نہ کسی قسم کی کشش تھی نہ دلاویزی ـــ آہستہ آہستہ گذرتی چلی جا رہی تھی۔

میں باغ کے ان راستوں پر حسرت سے نظر ڈالا کرتی تھی جن راستوں پر سب سے پہلے میری اور مشہدی کی باتیں ہوئی تھیں۔ دن کا اکثر حصہ زندگی اس دوپہر کی یاد میں کٹ جاتا جب شہزادہ مشہدی دادی اماں کی مزاج پرسی کو آئے تھے۔ آہ وہ با[illegible] یں کی سیاہی۔ وہ سنسان دوپہر۔ وہ دادی اماں کی خوابگاہ! اُن کا آنا ـــ بالکل کل کا واقعہ معلوم ہوتا تھا!۔

شام ہو گئی تھی۔ ماہ مارچ کی درد انگیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں مکان میں تنہا تھی۔ پھولوں کے بغیچے میں بیٹھی زندگی کی گئی گذری یادوں سے اپنی ویران تنہائی کو روشن بنا رہی تھی کہ یکایک کسی نے مشرقی رواج کے مطابق، دروازے پر دستک دی۔

آہ ـــ ایک گئی گذری دوپہر بھی کسی نے اسی طرح

اچانک دروازے کو کھٹکھٹایا تھا۔

میں ایک آہ بھر کر اٹھی۔ اور دروازہ کھول دیا۔

دروازے کا کھلنا تھا کہ میں ضعف سے گرتے گرتے بچی۔ میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہوا۔ وہاں شہزادہ مشہدی کھڑے تھے۔ بالکل اسی طرح ـــ جس طرح آج سے پانچ سال پہلے آئے تھے۔ صرف اتنا فرق تھا کہ ان کے چہرے پر کہیں کہیں زندگی کی بدسلوکیوں کے نشان پائے جاتے تھے۔

وہ بیتاب ہو کر بولے: "زیبا؟ کیا تم مجھے بھول گئیں؟ ایک مدت کے بعد تمہیں دیکھنا کس قدر مسرت انگیز ہے! آج اتفاق سے میں ادھر سے گزر رہا تھا خیال ہوا ایک رات کیلئے یہاں ٹھہر جاؤں اور تمہیں دیکھتا جاؤں"

میں ٹکٹکی باندھکر انہیں دیکھ رہی تھی۔ اور خاموش تھی۔ گئے گذرے ماضی میں سے ایک دردبھری چیخ اٹھکر میرے کانوں میں آرہی اور دم بدم زیادہ واضح ہوتی جارہی تھی۔ اس کے جنوں انگیز شور سے گھبرا کر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور کھڑی کھڑی لڑکھڑا سی گئی۔

مشہدی نے بڑھکر مجھے سنبھال لیا: "مجھے دیکھکر تمہیں خوشی نہیں ہوئی زیبا؟"

ذرا سے تامل کے بعد میں نے سنبھل کر کہا: "دلی خوشی ہوئی۔ آپ کی بڑی نوازش" پھر ان سے الگ ہو کر بولی۔ "اندر آجایئے"

ہم دونوں ایک کوچ پر اندر جا کر بیٹھ گئے۔ وہی پرانا کمرہ تھا۔ وہی قدیم دریچے۔ اور وہی منظر ـــ!

انہوں نے ایک سرسری نظر ادھر ادھر ڈال کر کہا۔ "ایں زیبا! اس ویران مکان میں زندگی کے دن تم کس طرح کاٹتی ہو؟ تمہاری دادی مرگئیں تم نے شادی سے انکار کردیا۔ آخر کر کیا رہی ہو؟ شادی کیوں نہیں کرلیتیں؟ ـــ اس ویران زندگی سے تمہارا دل نہیں گھبراتا؟ آخر تم نے اپنے مستقبل کے متعلق سوچ کیا رکھا ہے!"

غصے کے ایک لپٹیں نکالتے ہوئے شعلے نے میرے تن بدن کو پھونک ڈالا۔ میں چیخ کر بولی: "جی چاہتا ہے تمہارے منہ پر ایک تھپیڑ ماروں۔ تم نے میری زندگی برباد کردی۔ میری تمناؤں کا خون کرڈالا۔ میرا سب کچھ اجاڑ دیا! اور اب مجھ سے پوچھتے ہو میں نے اپنے مستقبل کے متعلق کیا سوچ رکھا ہے؟ تمہیں شرم نہیں آتی؟ آج سے چھ سال پہلے جو جان لیوا کھیل تم نے شروع کیا تھا اُسے نامکمل چھوڑ کر تم کیوں چلے گئے تھے؟ تمہارے لئے زندگی کی بازی لگانا کوئی بات نہ تھی۔ مگر میرا سب کچھ اسی پر منحصر تھا۔ تم نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جس سے مجھے یہ دھوکا ہوا کہ تم مجھے چاہتے ہو؟ تمہارے لئے یہ ایک مذاق تھا؟ ایک ہنگامی تفریح تھی؟ لیکن میرے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا"

مشہدی کا چہرہ برف کی طرح سفید پڑگیا۔ وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے "زیبا! زیبا! تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تم ـــ تم کو مجھ سے محبت تھی؟ کیا تم نے میری ہی خاطر فیروز کو چھوڑا تھا؟ آہ تقدیر ـــ یہ بات تھی تو تم نے مجھ سے کہہ کیوں نہ دیا؟ اشارتاً ہی کیوں نہ کہا؟ مجھے کیا پتہ تھا تم مجھ پر جان دیتی ہو؟ میں آخری وقت تک منتظر رہا شاید تم کوئی ایسا لفظ کہو جسے سُنکر میں اپنی داستانِ محبت تمہیں سُنانے کی جرأت کرسکوں گا۔ اس آخری شام بھی جبکہ ہم جدا ہو رہے تھے تم ستار لئے بیٹھی تھیں میں نے بڑی دیر تک انتظار کیا۔ شاید تم مجھے وطن واپس جانے سے روک لو۔ اور کہو کہ مشہدی! مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ تو میں پہچان جاتا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے جدا نہ کرسکتی! پر آہ میری

اُمیدوں کے خلاف تم نے کہا کہ تم مجھے بھولنے کی کوشش کروگی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میری حسرتیں سسک سسک کر بے دم ہوگئیں۔ میں ناکام اپنے وطن لوٹ گیا۔ لب گوریاں کے اصرار پر میری شادی نواب نصیر کی صاحبزادی سے ہوگئی۔"

باہر کائنات پر اور اندر میرے دل پر موت کی سی گہری اور بھاری خاموشی مسلط تھی۔ دور باغیچے کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے سورج دم بدم نیچے جارہا تھا۔

مجھے صرف اندھیرے کا احساس تھا جو مجھے نگل لینے کے لئے آسمان سے اُتر رہا تھا یا میرے دل کی خاکستر سے اُٹھ رہا تھا ؎

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا؟

حجاب امتیاز علی

ایک تقلیدی سوال

وہ برکتیں جو نئی روشنی میں آئیں نظر
مہاتما کو ہے کیوں ان سے کد، خدا جانے

میں اُن کی چال سمجھنے لگا ہوں اب اے دوست
مدبّرِ آج وہی ہے جو اُن کو پہچانے

کچھ اہلِ علم یہاں مادہ پرست بھی ہیں،
روایتاً مے عرفاں کے بھی ہیں مستانے

"دیارِ سوز" ابھی ویراں ہوا نہیں بالکل
کہ شمعِ مُردہ کے زندہ ہیں اب بھی پروانے

ہے ان کی "شعلہ فشانی" میں صلح کا پیغام
عجیب چیز ہیں یہ ہوشیار دیوانے

نہ کوٹ سے غرض اُن کو نہ شیروانی سے
لباس کے نئے درکار نہیں ہیں چند آنے

مُفیدِ قوم ہے تقلیدِ رفتگاں بیشک
بُرا وہ خود ہے جو تقلید کو بُرا جانے

مگر یہ شرط نہیں ہے کہ دھوتیاں ہوں وہی
نویں صدی میں جو باندھی تھی اُنکے دادا نے

ہے اتباعِ سلف ہی اگر مدارِ حیات
تو "بے نیازِ حیا" کیوں نہیں یہ فرزانے

وہ گرد پوش سلف تھے جو زیبِ عہدِ عتیق
بُھلا دیا اُنہیں کیوں میرے ان احبا نے

علی منظور حیدرآبادی

جمودِ چمن

شبنم میں ہمت ہی نہیں ہے پھر درخشاں ہونے کی
پھولوں میں جرأت ہی نہیں ہے زیبِ گلستاں ہونیکی

کاسۂ گل لبریز ہے زر سے، دولتِ نکہت پاتی ہے
پھر بھی ہر اک شاخ چمن کی دستِ طلب پھیلاتی ہے

اکثر موجِ بادِ سحر گلشن میں گئی بھی آئی بھی
لیکن سبزہ صحنِ چمن کا لیتا نہیں انگڑائی بھی

اشک بہاتی ہے شبنم کلیوں کو ہنسی آتی ہی نہیں
یعنی جمودِ نظمِ چمن میں کوئی کمی آتی ہی نہیں

آہ مآلِ موسمِ گل پر بلبل نالاں ہوتی ہے
پھر بھی نرگس بسترِ گل پر پاؤں پسارے سوتی ہے

کنجِ چمن میں شام و سحر گو دام فگن صیاد نہیں
بندِ فریبِ آزادی سے طائر بھی آزاد نہیں

بادِ صبا دم توڑ رہی ہے ہر اک پھول سسکتا ہے
گیہ وان ڈالے ہے وگھرے ہیں سارے چمن کو سکتا ہے

طائر چپ ہیں اور نہیں ہے جلوۂ گل کی ارزانی
موسمِ گل ہے پھر بھی چمن میں چھائی ہے ہر سو ویرانی

لیکن اک دن یہ حالت گلشن کی بدلنے والی ہے
سوکھی ہوئی ہر شاخ چمن کی پھولنے پھلنے والی ہے

قطرۂ شبنم پرتوِ خور سے نور فگن ہو جائے گا
پھول شگفتہ ہو کے چمن میں زیبِ چمن ہو جائے گا

پتی پتی ہر اک گل کی دولتِ نکہت پائے گی
شاخِ چمن ہر کاسۂ گل تک دستِ سخا لے جائیگی

موجِ صبا گو آ کے چمن میں دے نہ چمن کو رعنائی
لیکن سبزۂ صحنِ چمن انگڑائی پہ لے گا انگڑائی

اشک بہائے گی شبنم کلیوں کو ہنسی بھی آئیگی
یعنی جمودِ گلشن میں اک روز کمی بھی آئے گی

نغمہ سرا ہو جائے گی بلبل نام نہ ہوگا شیون کا
دیدۂ نرگس ہوگا نگہباں سارے شبابِ گلشن کا

دام فگن صیاد رہے گا ہوگی چمن میں آبادی
طائر ہو کر قید، کریں گے سعیِ حصولِ آزادی

دے گی نویدِ زیست صبا، گل، بند زباں کو کھولے گا
رقص کریں گے سروِ چمن میں منہ سے گلستاں بولے گا

ارزاں ہوگا جلوۂ گل ہر شاخ سے طائر گائیں گے
عہدِ خزاں میں اہلِ چمن انعامِ بہاراں پائیں گے

حصرِ پستی بلندی ہے قائم ہے بلندی پستی سے
عیشِ دوامِ ہستی ہے تغیرِ نظامِ ہستی سے

ماہر شیب دہلوی

بیگانگی

رشید نے اُٹھکر آنکھیں ملیں، دو ایک انگڑائیاں لیں۔ اور ایک کھوئے ہوئے سے انداز میں سیڑھیوں کے قریب جا بیٹھا۔ اُسنے کوٹھے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ تمام چارپائیاں خالی پڑی تھیں۔ سب لوگ نیچے جا چکے تھے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی سامنے اُونچے نیچے مکانوں کا ایک انبار دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے لئے دُنیا ایک بے معنی پھیلاؤ تھی۔ "اچھا تو اب صبح ہو چکی ہے!" اُس نے ایک اور انگڑائی لیتے ہوئے محسوس کیا جیسے وہ نہ ختم ہونے والے دن کی کوفت کا بوجھ محسوس کر رہا ہو۔ اُس کے لئے دن ایک مسلسل کوفت تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ اُس کے نزدیک چھٹی سے بڑھکر کوئی عذاب نہ تھا۔ وہ یوں محسوس کرتا تھا کہ گھر کے تمام لوگ اُس کے وجود سے ہی مُنکر تھے۔ اسلئے انہیں اپنے وجود اور شاید عظمت کا احساس کرانے کیلئے اُس پر لازم ہوجاتا کہ وہ آپا کے چٹکی لے یا محمود کو مُنہ چڑائے یا محمود کے پالتو طوطے کی دُم کھینچ لے اور نہیں تو چیزیں اِدھر اُدھر کر دے۔

رشید نے ایک اور انگڑائی لی "اب میں کیا کروں؟" وہ مبہم طور پر محسوس کر رہا تھا۔ تمام گھر میں اُسے کوئی ایسا کونہ تک نظر نہ آتا تھا جسے وہ اپنا سکتا یا جہاں اُس کی موجودگی سے بیگانگی نہ برستی۔ اُس نے ایک اکتائے ہوئے انداز سے قمیص کے دامن سے اپنی آنکھیں پونچھیں شانے جھٹکے اور دیوار سے سہارا لگالیا۔ زندگی اُس کے لئے ایک ناقابل فہم بیگانگی سے بھری ہوئی تھی۔ وہ صرف یہ سمجھ سکا تھا کہ دُنیا میں یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا کریں تو کیا ہو جائیگا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیوں رشید ہے اور محمود کیوں محمود ہے۔ اور گھر والے اُسے رشید سمجھنے پر کیوں مُصر تھے۔ اُس نے کئی مرتبہ محمود کا سا برتاؤ کر کے آزما لیا تھا۔ مگر اسکے باوجود گھر والے اس پر "رشیدیت" ٹھونس رہے تھے۔

اُسکی نگاہیں اُکتائے ہوئے انداز میں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں گھوم رہی تھیں۔ سامنے محمود کا طوطا پنجرے میں بیٹھا پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ اسکے ہونٹوں پر حقارت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ "محمود کا طوطا ہے محمود کا طوطا۔" اُس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا جیسے اُسے چھیڑ رہا ہو۔ پھر اس کی نظر سامنے کھڑکی پر جا پڑی جو گلی میں کھلتی تھی۔ اُسکے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آگئی۔ اس کی صبح و شام کی مسلسل کوفت میں صرف وہ کھڑکی ہی خوشی کی ایک اُمید گاہ تھی۔ مگر وہ بوڑھا فقیر جس پر رشید اس کھڑکی میں سے روڑا پھینکا کرتا تھا، دو روز سے نہیں گزرا تھا۔ دو روز اس نے بوڑھے فقیر کے انتظار میں گزارے تھے۔ اُسنے ایک جھرجھری لی اور لاشعوری طور پر پاس سے ایک روڑا اُٹھا کر زور سے کسی طرف پھینکدیا۔

رشید ابھی چھ ماہ کا نہ ہوا تھا اور اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایک بڑی بہن کا بھائی ہے۔ اور ماں باپ نے اُسے سسک سسک کر پایا ہے۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ بذاتِ خود کیا ہے۔ اور آیا وہ باپ کا نام قائم کرنے یا ماں کا سہاگ مستحکم کرنے کیلئے ہے یا ماں باپ کے کسی خاص مقصد کیلئے ہے، یا ویسے ہی ہے۔ وہ صرف یہی جانتا تھا کہ اول تو وہ ہے ضرور اور دوسرے وہ کوئی بڑی اہم ہستی ہے اور وہ ماں باپ کی آنکھوں کا نور ہے۔ گو ہستی اور نور کے متعلق اُس کے احساسات واضح نہ تھے۔ وہ جانتا تھا بار بار "گو"

کہہ کر وہ اپنی ماں کو بلا سکتا ہے اور ذرا سے بسورنے سے وہ ماں باپ اور کئی ایک اور شکلوں کو اپنے ارد گرد ناچ نچوا سکتا ہے۔ یعنی اپنی کوئی خواہش پوری کرنے کیلئے اُسے صرف ہونٹ نکالنے کی ضرورت تھی۔ اور یہ بات بھی دُرست تھی جب چھ سال کی مسلسل منتوں کے بعد بیٹا پیدا ہو تو ماں باپ کیلئے اُسے نظر انداز کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔

جب رشید کو پوری طرح اپنی قوت کا احساس ہو گیا تو اُسے دودھ پینا سونا اور باقی وقت نکمے پڑے رہنے یا فضول اپنا انگوٹھا تلاش کرنے یا دور پڑی ہوئی چیزوں کو پکڑنے کی کوشش میں چنداں دلچسپی نہ رہی۔ البتہ لوگوں کو نچانا ضرور باعثِ فرحت تھا۔ — اس دلچسپ شغل میں اس نے دو سال بسر کئے۔ اس عرصے میں ہزاروں انکشافات کے علاوہ اس پر یہ بھی آشکار ہوا کہ وہ بدصورت ہے۔ ابتدا میں تو، سے بدصورتی کے متعلق اور اپنی بدصورتی کی تفصیلات کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ اُسے معلوم ہو تا گیا کہ اُس کی ناک چپٹی ہے، پیشانی چھوٹی اور ہونٹ موٹے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اُسے یہ نہ معلوم ہوا کہ بدصورتی عیب بھی جاتی ہے یا وصف۔ وہ صرف یہی جان سکا کہ ماں باپ اُسے بدصورت کہہ کر یا اُسکے ناک ہونٹ اور پیشانی کے متعلق کچھ کہکر فرطِ انبساط سے اُسے گود میں اُٹھا کر پیار کرتے۔ اس لحاظ سے تو بدصورتی ایک بہت پیاری خصوصیت تھی۔

اُس زمانے میں دُنیا یوں بے معنی نہیں تھی۔ بلکہ مخصوص اُصولوں پر چلتی تھی۔ اُس کا ہنسنا رُونا روٹھنا یقینی نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ وہ دو سال اُس کی زندگی میں ایک گذشتہ مگر قابل حصول رنگینی سے سرشار تھے۔ اُن دنوں زندگی اس قدر پیچیدہ اور لوگ باگ اس قدر ضدی اور اندھے نہ تھے۔ اُن دنوں اپنے وجود کا احساس دلانے کیلئے اُسے کسی دقیق عمل کی ضرورت نہ تھی۔ مگر جلد ہی وہ دن آگیا جب وہ بات نہ رہی۔

اُس روز وہ اپنی بہن کی گود میں بیٹھکر حسب معمول اُسے قواعد کروا رہا تھا کہ اُن کی ملازمہ رضیہ دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی: "بی بی تمہیں مبارک ہو۔ خُدا نے تمہارے گھر ایک اور ننھا بھائی دیا ہے!" سلیمہ نے یہ سُنا اور رشید کو یوں پٹک کر بھاگ گئی جس طرح وہ خود نئے کھلونے کی آمد پر پُرانے کھلونے پھینک دیا کرتا تھا۔ یہ پہلا دن تھا جب رشید کا یوں اپمان کیا گیا تھا۔ اور پھر ایک ایسی اہم ہستی کا اپمان۔ سلیمہ کی اتنی جرأت!!! پہلے تو وہ کچھ دیر تک حیران چُپ چاپ زمین پر بیٹھا رہا —— پھر ان سب باتوں کو سوچ کر اُس نے یکلخت رونا شروع کر دیا۔ اُس کی دانست میں رونے سے بڑھکر کوئی قوت نہ تھی مگر خُدا جانے اُس روز اُس کے رونے میں کیوں اثر نہ تھا۔ حتیٰ کہ آنسوؤں والا رونا بھی کام نہ آیا۔ پھر اُسے تازہ دم ہوکر رونا پڑا اور وہ بار بار تازہ دم ہوکر رویا.....

آخر رضیہ آئی۔ اُس نے رشید کو گھورا اور جھنجوڑ کر اُٹھا لیا۔ اوّل تو رضیہ اُسے منانے کو آئے۔ رضیہ ایک دو ٹکی ملازمہ کسقدر بے عزتی کی بات تھی۔ اور پھر وہ بھی اُسے جھنجوڑ کر اُٹھائے۔ اُس روز اُسکے خیال میں دُنیا کے اُصول ہی بدل رہے تھے۔

ماں کے سامنے جا کر اُس نے دو تین چیخوں سے آپا رضیہ اور دُنیا بھر کے خلاف اظہار کیا۔ مگر ماں اُسے گود میں اُٹھانے اور منجملہ لوگوں کو بُرا بھلا کہنے اور گھورنے کی بجائے نحیف سی آواز میں کہنے لگی: "یہ کیا سر کھا رہا ہے۔ اسے یہاں سے لیجا اور جو نعمت خانے میں مٹھائی پڑی ہے وہ اسے دیدے" یہ تھی اس کی ماں۔ اُس کی اپنی ماں، جس کی آنکھوں کو اُس نے نور بخشا تھا۔ وہ ماں۔ اگر اس کی قوتِ اظہار اپنے باپ کی طرح وسیع ہوتی تو وہ کہہ اُٹھتا: "بس چودھویں صدی آگئی ہے جبکہ

ماں کو اپنے سگے بیٹے سے بھی محبت نہیں رہی۔ ماں کا خون سفید ہوگیا۔..... رضیہ اُسے باورچی خانے میں تنِ تنہا چھوڑ جائے...۔ اپنے ہاتھ سے مٹھائی کھانے کیلئے...... ماں سے دُور.... ماں کی واری صدقے کے بغیر.... سوکھی مٹھائی!!! اور ماں اُس گوشت کے لوتھڑے کے پاس لیٹی رہے کیسی بیہودہ شکل تھی، نہ سر نہ منہ.... یقینی طور پر چودھویں صدی آچکی تھی جس کے متعلق اُسکے ابا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔

پھر اُسے یہ معلوم ہوا کہ ماں بیمار ہے، اور اُس نے اخذ کیا کہ بیمار اُسے کہتے ہیں جس کے ارد گرد ایک بھیڑ لگی رہے۔ جس کیلئے مٹھائیاں منگوائی جائیں۔ اور جس کی اتنی ہی دیکھ بھال ہو جتنی کسی زمانے میں اُس کی اپنی ہوا کرتی تھی یعنی بیماری میں بھی وہی تاثیر تھی جو کسی زمانے میں اُس کے رونے میں تھی۔ اور اب دن بدن زائل ہو رہی تھی۔ بیمار بن کر اُسکی حکومت شاید پھر لوٹ آئے۔ مگر اُسے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کس طرح وہ بیمار پڑجائے۔ اُس نے دو ایک مرتبہ اپنی بیمار ماں کو اس اُمید پر لپٹ کر چوما کہ شاید اس طرح ماں کی بیماری اُسے لگ جائے۔ مگر اس کے باوجود گھر والے اُسے بیمار سمجھنے سے منکر رہے۔ بہرحال ان دنوں اپنی مٹی ہوئی انانیت حاصل کرنے کے لئے رونے رُوٹھنے اور ضد کرنے کے علاوہ اُسکے پاس کچھ بھی نہ تھا اور انکے استعمال میں اُس نے بڑی فراخدلی سے کام لیا۔ مگر انکے استعمال سے مزید مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔

مانا کہ وہ ماں کے دودھ کے علاوہ مٹھائی روٹی اور گوشت کے ٹکڑے بھی کھانے کا عادی تھا۔ مگر ماں کے دودھ سے بالکل محروم کر دینا۔ کھیلنے کو بھی نہ دینا، کسقدر کمینہ پن تھا۔ اس سے پہلے تو اُسے بے روک ٹوک کھیلنے کی اجازت تھی۔

پہلے پہل تو اُسے یہ آس رہی کہ صحت ہونے پر ماں ویسی پہلی سی ماں ہو جائیگی۔ مگر ماں نے بستر چھوڑ دیا، چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ مگر اُسے وہ محبت نصیب نہ ہوئی۔ پیار تو وہ کرتی تھی مگر وہ پیار مقابلۃً ظاہری اور پھیکا محسوس ہوتا۔ ماں کا دھیان تو ہر وقت ننھے کی طرف لگا رہتا تھا۔ اُسی کو ساتھ سُلاتی اور رشید جب رات کو جاگتا تو وہ دیکھتا کہ وہ تنِ تنہا کھٹولے پر پڑا ہے۔ وہ بیچارہ اس اندھیرے پر رو پڑتا۔ اور چاہتا کہ ماں اُسے پاس بُلالے۔ مگر ماں کس بے اعتنائی سے ہاتھ بڑھا کر اُسے تھپک دیتی جس طرح دُور سے کتے کو روٹی کا ٹکڑا پھینکتے ہیں۔

آخر رشید لوگوں کی عدم توجہی سے تنگ آکر احتجاجی حرکات جائز قرار دینے پر مجبور ہوگیا۔ اسکی حرکات سے متاثر ہونا تو کیا ماں باپ نے انہیں سمجھنے تک کی تکلیف گوارا نہ کی۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ دردِ دل کا اظہار لفظوں کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ہر حرکت سراپا اظہار ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے رہے کہ رشید کو بستر پر پیشاب کرنے کی قبیح عادت پڑگئی ہے۔ اور وہ رات کو ڈر کر بلبلا اٹھتا ہے۔ اور اسے اسہال کی شکایت ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جو گالیوں بددعاؤں یا لفظوں سے اپنے غیض و غضب اور دُنیا کی بیوفائی کا اظہار نہیں کر سکتے وہ دردِ دل کا اظہار مثانے اور معدے سے کر سکتے ہیں۔

ماں سے مایوس ہو کر رشید نے اپنے ابا سے از سرِ نو ربط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ تو اس معاملے میں بالکل مجبور تھے۔ چونکہ وہ ہر وقت سُنتے تھے کہ محمود کی شکل ان پر تھی، اور بدصورتی تو خیر۔ رشید کی شکل بالکل ان پر نہ تھی۔ ایک باپ کیلئے اس اہم تفصیل کو نظر انداز کرنا کسقدر مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ کس طرح محمود سے غداری کر سکتے تھے۔

آخر آہستہ آہستہ رشید پر یہ انکشاف ہوگیا کہ بلی کی دُم کھینچنے اور مرغی کے پر نوچنے میں بھی راحت ہوتی ہے۔ گویہ راحت

ماں باپ کا نورِ نظر اور گھر کا چراغ ہونے کے مقابلے میں ہیچ تھی۔ مگر راحت ضرور تھی۔ ماں باپ تو اُس گوشت کے لوتھڑے میں جسے وہ محمود کہہ کر پکارتے تھے اپنا وجود کھو چکے تھے۔ صبح سے شام تک محمود کا ذکر، محمود کی آنکھوں، پیشانی اور ہونٹوں کے قصّے۔ محمود کی صوت، مسکراہٹ اور کھیل کا رونا۔ اور محمود بھی وہ جسے رونے تک کی تمیز نہ تھی۔ کیسی بے سُری الاپتا تھا...... رشید نے کئی مرتبہ محمود کا منہ تک چومنا گوارا کیا کہ ماں کا قرب حاصل ہو یا اُس کا منہ چومنے سے وہ خود محمود بن جائے۔ مگر والدین بھی پتھر کے بنے ہوتے ہیں۔ اُن پر ان باتوں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

ایک روز جب رشید آپا کی لکڑی کا گھوڑا بنا کر سواری کر رہا تھا، اور انکے کاغذات کو پاؤں تلے روند رہا تھا تو انہوں نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جب رشید نے جواب میں چیخوں سے دردِ دل کا اظہار کیا تو انہوں نے دو ایک تھپڑ جڑ دئے اور جلال میں کہنے لگے "بہت بدمعاش ہوا جا رہا ہے۔ کبھی آپا کو مار کبھی ماں سے لڑ... گھر میں کہرام مچا رکھا ہے..... پاجی!"..... اس سرزنش کے دوران میں ماں محمود کا پوتڑا ٹھیک کرنے میں شدّت سے مصروف رہی۔ اُدھر سے گو پیار کی کوئی امید نظر نہ آئی۔ مگر اُسے مجبوراً فریاد لیکر ماں کے پاس جانا ہی پڑا۔ لیکن ماں نے بھی "ہر وقت سر کھاتا رہتا ہے" کہکر ایک تھپڑ مار دیا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ماں نے "یہاں مر" کہکر جھنجوڑ کر اُسے اٹھا لیا اور پاس لٹا دیا۔ یہی تو اُسکی خواہش تھی کہ وہاں مرے۔ کسی سے تھپڑ کھا کر اُسے وہاں مرنا نصیب تو ہوا..... اسکی معلومات میں یہ ایک اضافہ تھا۔

اب رشید تیسری جماعت میں تھا۔ چونکہ پچھلے سال وہ فیل ہو گیا تھا۔ رشید کے والد کا ایمان تھا کہ رشید فطری طور پر کند ذہن ہے بلکہ اُن کا خیال تھا کہ اُس کے دماغ میں عقلِ سلیم کا خانہ خالی ہے۔ اُس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ تیسری جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔ گھر میں وہ اپنے اِس ایمان کے متعلق اکثر بات کرنے کے عادی تھے۔ یا محمود کی ایسے انداز میں تعریف کرتے جس سے رشید کی نااہلیت اخذ ہو۔

"محمود سوالوں میں طاق ہے۔ اگر رشید کا ذہن اچھا ہوتا تو کیسی اچھی بات ہوتی..... مگر یہ رشید کا قصور نہیں..... اُسکی یادداشت ٹھیک نہیں... بیچارے کو باتیں یاد نہیں رہتیں... اور... محمود کی ماں، محمود کی ماں... تم نے سنا... اِدھر آنا... باہر محمود کا اُستاد آیا ہوا تھا کہتا تھا محمود تو فر فر سبق سنا دیتا ہے"

کسی وقت جب دونوں بچوں کے مستقبل کے متعلق ذکر چھڑ جاتا، تو وہ اکثر کہا کرتے "محمود..... محمود کو تو انجینیر بنائینگے... اِسے رڑکی بھیجیں گے... رڑکی! رڑکی سے بڑھکر ہندوستان بھر میں کوئی انجینیرنگ کالج نہیں... سنا تم نے محمود کی ماں... رڑکی میں بہت بڑا کالج ہے۔ شاندار" اور اس دوران میں وہ محمود کی طرف اس انداز سے دیکھتے جیسے کوئی مصوّر اپنے شاہکار کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر وہ چونک کر اور ایک موہوم سی آہ بھر رشید کی طرف دیکھتے "رشید محمود کے طوطے کو دق نہ کرو..... تمہیں تو ہر وقت شرارت سوجھتی ہے... محمود کی ماں... دیکھا تم نے... پنجرے کو بِل دے رہا تھا شیطان..... محمود کی ماں اگر رشید بھی ذہین ہوتا تو اُسے بھی رڑکی بھیجتے... مگر کوئی بات نہیں... کوئی بات نہیں... یہ تو قدرتی باتیں ہیں۔ انسان کو ان باتوں میں دخل نہیں۔ ہیں۔ ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے... کیوں محمود کی ماں، یہ تم کیا دھو رہی ہو..... تمہیں تو ہر وقت کام ہی رہتا ہے۔ ہاں وہ رضیہ کہاں ہے؟... رشید میں کہتا ہوں اس پنجرے کو نہ چھیڑ، سنتا نہیں"

رشید باپ کی ان پیچیدہ باتوں کے دوران میں جمائیاں لے لیکر تھک جاتا۔ پھر دفعتاً اس کا جی چاہتا کہ زور سے مرغی کی دم کھینچے یا آپا کی ٹانگ میں چٹکی لے۔ یا کسی رینگتی ہوئی چیونٹی کو پاؤں سے مسل دے۔ دنیا میں سب سے زیادہ بدنما چیز اُس کے نزدیک محمود کا طوطا تھا۔

رشید اپنی جگہ سے اٹھا۔ ایک اور انگڑائی لی ... "اچھا تو اب کیا کروں؟" اُس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی مگر کوئی چیز اُس کے لئے باعث دلچسپی نہ تھی ... سیڑھیوں سے نیچے اتر کر اس نے دیکھا کہ ماں، آپا اور رضیہ باورچی خانے میں ہیں ... ابا اور محمود کی آوازیں بیٹھک میں سے آرہی تھیں ... شاید کوئی ملنے آیا ہوا تھا ... تمام گھر پر خاموشی سی طاری تھی اور ہر چیز اُسی طرح بیگانہ وار پڑی تھی ... وہ باورچی خانے میں داخل ہوا۔ "اماں" اس نے ایک اکتاہٹ سے انداز میں کہا۔ "اماں، بھوک لگ رہی ہے"

اماں "آ گئے۔ آنکھ کھل گئی۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ صبح اٹھکر اسکول کا کام کیا کرو"۔

آپا "اماں، محمود نے آج صبح صبح ہی دس سوال نکال لئے ہیں" ...

رشید نے ان باتوں پر دھیان نہ دیا۔ اُسنے چاروں طرف سرسری نگاہ ڈالی اور پھر ماں سے لسی کا گلاس لے لیا۔

ماں "منہ ہاتھ تو دھولیا کر۔ کتنا گندا ہے"

مگر رشید لسی پی چکا تھا۔ وہ اپنی قمیص سے منہ پونچھکر گلاس صندوق پر رکھکر باہر نکل آیا۔ کمرے میں سامنے چاقو پڑا تھا۔ اُس نے چاقو اٹھالیا۔ اور سرسری طور پر میز کا کونا کھرچنا شروع کر دیا۔ باہر بیٹھک سے ابا اور کسی مہمان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں:۔

"یہ بھی کیا عمر ہے ... بادشاہی عمر ... بچپن سے بڑھکر زندگی میں کوئی خوشی نہیں"

رشید سوچ رہا تھا۔ بچپن سے بڑھکر کوئی عمر نہیں یہی بچپن ... آخر وہ کیا بات تھی جسکی بنا پر لوگ بچپن کو اس قدر سراہتے ہیں ... کیا باقی عمر اس بچپن سے بھی زیادہ اکتا دینے والی ہے۔ اُس نے ایک جھرجھری لی ... باہر ابا کہہ رہے تھے:۔

"محمود! محمود تو سوالوں میں بیحد طاق ہے ... رڑکی اُرڑکی سے بڑی کوئی درسگاہ نہیں۔ سو روپیہ ماہوار خرچ ... نصیب کی باتیں ہیں۔ وہ ہمارا رشید ... دو سال اس سے بڑا ہے، بالکل کند ذہن، کام چور، نکما ... اللہ کا ہر حال میں شکریہ ادا کرنا چاہیئے"

رشید اُٹھ بیٹھا اور برابر والے کمرے میں چلا گیا۔ شاید اس لئے کہ وہاں ابا کی آواز نہ پہونچتی تھی یا اس لئے کہ سامنے پڑی ہوئی چٹائی سے تنکے کھینچنے کی خواہش مجبور کر رہی تھی۔

باورچی خانے میں ماں کہہ رہی تھی: "رضیہ، وہ کہاں غائب ہوگیا ... جا دیکھ تو کہیں میرے صندوق میں سے کپڑے نکال نکال کر پھاڑ تو نہیں رہا۔ میں بھی کتنی بھول کرتی ہوں۔ صبح صندوق کھولا تو اُسے بند تک نہیں کیا۔ جا دیکھ تو ... توبہ میں تو اس لڑکے سے عاجز ہو چکی ہوں"

رضیہ کی آہٹ سنکر رشید چٹائی کو چھوڑ کر پرے جا بیٹھا اور ایک لوہے کے ٹکڑے کو جو وہاں پڑا تھا ناخن سے کریدنے میں مشغول ہوگیا۔ رضیہ اندر آئی۔ اُس نے ایک نفرت سے کھولتی ہوئی نگاہ رشید پر ڈالی مگر رشید بظاہر اپنے کام میں ہمہ تن مشغول تھا۔ پھر جب رضیہ صندوقی کو تالا لگا رہی تھی، خدا جانے رشید کو کیا ہوا۔ اُس نے اپنے بازو میں ایک اکڑاہٹ سی محسوس کی.... اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر لپکا اور اُس کی دو انگلیوں نے بڑھکر رضیہ کی کمر میں چٹکی لے لی۔ اُس نے بھاگتے ہوئے "اوئی" سنا اور پھر رضیہ خدا جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ مگر وہ غسلخانے میں پہونچکر بالٹی میں ہاتھ ڈبو رہا تھا اور گرتے ہوئے قطروں کو غور سے دیکھ رہا تھا.... قطروں کو گرتے ہوئے دیکھ کر اُسے بوڑھا فقیر یاد آگیا جس پر وہ چوبارے کی کھڑکی میں سے پتھر پھینکا کرتا تھا۔ اُس بوڑھے کی عاجزانہ نگاہ ..... بے بسی ... اور بیچارگی اُسے یاد آگئی.... اُس روز جب اُس کی آنکھ سے پانی ان قطروں کی طرح گر رہا تھا.... کس قدر مضحکہ خیز شکل تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ باہر ماں نہایت غصّے سے پوچھ رہی تھی:۔

"رضیہ، یہ محمود کے طوطے کا پنجرہ یہاں دھوپ میں کس نے رکھا ہے؟"

رضیہ:۔ "توبہ بی بی، میں نے تو ابھی اُسے چوبارے میں رکھا دیکھا تھا۔ میں تو کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگاتی۔ میری تو بی بی یہ عادت ہی نہیں!"

ماں:۔ "بس یہ اُسی شیطان کی کارستانی ہے۔ خدا جانے محمود کے طوطے سے اُسے کیوں بیر ہے۔ اور بھائی ہوتے ہیں آپس میں پیار اور محبت سے رہتے ہیں، اس لڑکے پر تو محمود کو دیکھکر جن سوار ہو جاتا ہے... رضیہ! رضیہ! لے اسے اُٹھا کر چوبارے میں رکھ آ۔ اور اسکی کٹوری میں پانی ڈالدے۔"

رشید دروازے کی دراز سے جھانک رہا تھا۔ "محمود کا طوطا!" اُسکے دل کا کوئی حصّہ کہہ رہا تھا۔

"کیا ہوا۔ کیا ہوا محمود کے طوطے کو؟" ابا اندر آکر کہہ رہے تھے۔ "ہاں بس ایسا کام اور کون کرے گا۔ اِس لڑکے میں تو ذرہ بھر رحم نہیں۔ قصائی ہے قصائی۔ صبح و شام چیزیں اُلٹ پلٹ کرنے کے علاوہ اسے کوئی کام نہیں۔ کل میرے دفتر کے کاغذات کی بیڑیاں بنا رہا تھا.... نامعقول... لے جا رضیہ اسے چوبارے میں لے جا۔ محمود تو اس طوطے پر جان چھڑکتا ہے۔ جب تک اسے کھلا نہ لے خود نہیں کھاتا.... اُسے جانوروں سے کس قدر محبت ہے.... محمود کی ماں! محمود کی ماں!..... محمود کہاں ہے؟...."

"کیوں اباجی!" محمود نے اندر آتے ہوئے کہا۔

ا:۔ "کچھ نہیں بیٹا۔ رشید نے تمہارا طوطا دھوپ میں رکھدیا تھا۔ بیچارے کا گرمی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟"

م:۔ "نہیں اباجی۔ میں نے خود طوطے کو دھوپ میں رکھا تھا۔ اُس نے اپنی پانی کی کٹوری اُلٹ دی تھی۔ اور وہ پانی میں تر ہو رہا تھا۔ میں نے اُسے سکھانے کیلئے دھوپ میں رکھدیا تھا۔ پھر اُسے اُٹھانا مجھے یاد نہ رہا۔"

"محمود کی ماں! محمود کی ماں! اِس کا باپ کہہ رہا تھا۔ "تم نے سُنا؟ محمود نے خود طوطے کو دھوپ میں رکھا تھا۔ محمود کی اچھی عادت ہے۔ دیکھو نا۔ سچ سچ کہدینے سے بالکل نہیں گھبراتا۔ لو اگر رشید طوطے کو دھوپ میں رکھتا تو جانے کچھ ہی ہو جاتا

وہ کبھی بھی اقرار نہ کرتا۔ رضیہ۔ رضیہ۔ کہاں ہے رشید۔ رضیہ!"

ماں:۔ ابھی یہیں تھا۔ خدا جانے کہاں چلا گیا ہے۔ گلی میں ہوگا۔ میں تو اس لڑکے سے تنگ آچکی ہوں۔"

ابا:۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تم تو جلد گھبرا جاتی ہو۔ یہیں کہیں ہوگا۔"

رشید دبے پاؤں غسلخانے سے نکل کر چوبارے میں چلا گیا۔ بوڑھے فقیر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ مگر وہ بوڑھا دو دن سے نہیں آیا تھا۔ رشید کے بدن میں ناامیدی سے سستی سی محسوس ہو رہی تھی۔ جب وہ اس بوڑھے فقیر پر پتھر پھینکا کرتا تھا تو اس کی آنکھیں کیف سے چمک جاتیں اور اس کے جسم کا ذرہ ذرہ لذیذ اضطراب سے جھوم جاتا۔ بس اس کے پھیکے اور لمبے صبح و شام میں یہی ایک عشرت تھی۔ جس سے وہ گذشتہ دو دن تک محروم رہا تھا۔ اس نے چھ سات موٹے موٹے کنکر چن لئے اور کھڑکی میں بیٹھ گیا۔ سامنے کوچے کے پرے مکانوں کا ڈھیر سا نظر آ رہا تھا۔ کوچے میں خاک اڑ رہی تھی۔ دھوپ سے آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ مکانوں سے پرے ریت کے ٹیلے کھڑے تھے جہاں کہیں کہیں بگولے ناچ رہے تھے۔ وہ ان بگولوں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا..... آخر وہ فقیر کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ اس نے جھرجھری لی۔ اور دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اپنی ٹھوڑی اس پر ٹکا دی۔ اور ایک معصومیت بھرے انداز میں بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کسی مزدور کی مشقت کو دیکھ کر وہ خدا سے اسکی نجات کیلئے دعا کر رہا ہو۔

انتظار سے مایوس ہو کر وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ سامنے والے مکان کے روشندان پر پڑی۔ روشندان میں سرخ شیشے دیکھ کر ایک بیگانہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔ اس نے ایک پتھر اٹھا لیا اور اس سے کھیلنے لگا۔ پھر اسے خدا جانے کیا سوجھی.... اس کے بازو نے زور سے جھٹکا کھایا..... چھن..... پتھر سے سرخ شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور وہ معاً کھڑکی سے ہٹ کر چوکی پر آ بیٹھا... سامنے محمود کا طوطا پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ "محمود کا طوطا!" اس کے دل سے آواز آئی جیسے کوئی اسے چھیڑ رہا ہو۔ "محمود!، محمود کا طوطا!۔ محمود کا طوطا!" تمام فضا ان آوازوں سے بھری ہوئی محسوس ہوتی تھی..... اس نے لپک کر پنجرہ اتار لیا اور اسے دھوپ میں رکھ دیا۔ اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔ چوکی پر ابا کا استرا دیکھ کر رشید ٹھٹھک گیا۔ اس نے استرا اٹھا لیا۔ خدا جانے اس کے دماغ میں کیا خیال آیا۔ اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ "محمود کا طوطا!" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا..... وہ پنجرے کے قریب ہو بیٹھا... پنجرے کا دروازہ کھل گیا.... دنیا اسے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی..... حتیٰ کہ اسے بوڑھا فقیر بھی یاد نہ رہا.... چخ چخ چخ...... لہو کی بوندیں اس کے ہاتھوں پر گر رہی تھیں........ سرخ رنگین مخمل سا لہو..... کھڑکی سے باہر ایک رنگین سنہری سرخی سی نظر آ رہی تھی۔ دور بگولے آسمان پر مخملی قوس بن کر جھوم رہے تھے۔

"محمود کا طوطا!" اس کے دل کا کوئی کونہ تمسخر سے کہہ رہا تھا۔ "محمود!۔ طوطا!"

ممتاز مفتی

مسیتا کبابی

مسیتا کبابی کو کون نہیں جانتا۔ سارا شہر جانتا ہے۔ جب تک یہ زندہ رہا کبابیوں کی دُنیا میں اس سے زیادہ دلچسپ کوئی کبابی نہ تھا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے لیکر ادھر دلّی دروازے تک اور ادھر حبش خاں کے پھاٹک اور صدر بازار تک اس کے کباب چٹخارے لے لیکر کھائے جاتے تھے۔ چھوٹے بڑے غریب امیر سب ہی پر میاں مسیتا کے کبابوں نے سکّہ بٹھا رکھا تھا۔ دوکان تو آج بھی ہے اور کباب ہی اس پر بکتے ہیں لیکن "وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی"۔ نہ وہ مسیتا کی سی مزیدار باتیں ہیں نہ وہ مسیتا کا سا کباب بیچنے کا ڈھنگ۔ نہ وہ خریداروں کی بھیڑ ہے نہ وہ چٹ پٹا پن۔

میاں مسیتا کی صورت بھی ایسی گول مٹول تھی کہ گوشے کا کباب معلوم ہوتے تھے۔ شام کو پانچ بجے کے بعد جاڑوں میں اور مغرب کی اذانوں کے قریب گرمیوں میں ان کی دُکان جمتی تھی۔ سری پائے گھر سے پکا کر لاتے تھے۔ کلیجی، گُردے اور بکری کے بھیجے تلے ہوئے الگ اور بھنے ہوئے علیحدہ سینیوں اور پتیلے میں رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ کبابوں سے سیخیں بھرتے جاتے تھے اور آپ ہی آپ بُڑبُڑاتے رہتے تھے۔ ایک نو دس برس کی لڑکی میاں مسیتا کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی اور میاں مسیتا اس لڑکی کو ذرا ذرا سی بات پر گالیاں دیا کرتے تھے اور وہ لڑکی بھی ہاتھ مٹکا مٹکا کر برابر کا جواب دیتی تھی۔ لوگ عموماً مسیتا کی اس گلیار عادت سے بیزار تھے۔ اکثر بھلے مانسوں نے سمجھایا بھی کہ "میاں مسیتا لڑکی ذات کو ایسی کُھلی ہوئی گندی گالیاں نہ دیا کرو اور اگر ذہن کُند ہونے کا اندیشہ ہو تو کوئی چھوکرا رکھ لو" مگر میاں مسیتا مانتے تو جب کہ وہ گالیوں کے دینے اور گالیاں کھانے کو بُرا سمجھتے یا اُن کو اپنی زبان پر اختیار ہوتا۔ ان کا تو تکیہ کلام گالیاں تھیں۔ سیخ پر کباب چڑھاتے تو گالی کے ساتھ، پنکھا چلاتے تو چرخ چوں میں گالیاں بھی شریک ہوتیں۔ دونا بناتے تو گالیاں دے کر۔ غرضکہ گالی بغیر کوئی حرکت کوئی بات ہی نہ ہوتی۔

باوجود میاں مسیتا کے چہلے پن اور گالیوں کے کمبخت کے ہاتھوں میں کچھ ایسا مزہ تھا کہ شام سے رات کے بارہ بجے تک بھیڑ لگی رہتی تھی۔ دور دور سے شوقین آتے تھے۔ دونے بھر بھر کے کباب لے جاتے تھے یا وہیں اکڑوں بیٹھ کر دو دو چار چار سیخیں کھا جاتے تھے۔ اتنا بڑا دلّی شہر ہے اور ہزاروں کبابی لیکن خدا کی قدرت ہے وہ آب و نمک، وہ خوشبو اور لذت نصیب نہیں۔ مسیتا کیا مرا ہم تو کہتے ہیں کہ دلّی کے کباب مرگئے۔ کبابیت مرگئی اور ایک کبابی شخصیت مرگئی۔

مجھے بازار میں کسی دوکان پر بیٹھکر یا کھڑے ہو کر کچھ کھانے پینے سے ہمیشہ نفرت تھی، ہے اور مرتے دم تک رہیگی پھر کباب جیسی شے جس کو رو رو کھا کر آنکھیں بغیر آنسو بہائے۔ ناک بغیر سٹر سٹر کئے اور زبان بغیر چٹخارے لئے نہ رہی لیکن میاں مسیتا کے کبابوں کی چاٹ نے ان سب باتوں پر پانی پھیر دیا تھا اور دوسرے تیسرے دن زبان کا ذائقہ دُرست کرنے کیلئے مسیتا کی دُکان پر جانا ہی پڑتا تھا۔ یہ بات ضرور تھی کہ اکیلا کبھی نہیں گیا۔ ایک دو بے تکلف دوست ساتھ ہوتے تھے۔

دلّی کے اکثر دوکانداروں میں یہ بات پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے کہ وہ گاہکوں کے نمبر کا خیال رکھتے ہیں۔ وار سے سودا دیتے ہیں لیکن خریدار کی وجاہت اور خریداری کی نوعیت سے اُن کا یہ قاعدہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ مسیتا اس اصول کا

بڑی مضبوطی سے پابند تھا۔ اُس کی نگاہ میں ایک پیسے اور ایک روپے کے کباب لینے والا برابر تھا۔ اب اس کو کوئی بُرا کہے یا اچھا۔ اُسکے اس طریق کی کوئی مذمت کرے یا تعریف۔ وہ بڑے سے بڑے موٹر میں بیٹھکر آنے والے کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا کہ "میاں ایسی جلدی ہے تو کہیں اور سے لے لو۔ میں تو نمبر سے دونگا" باوجود اس کے کہ میں اُس کا لگا بندھا گاہک تھا۔ اس کو میری خاطر بھی منظور تھی۔ مجھے وہ خاص طور پر زیادہ دہی لگا کر دھیمی آگ پر سِنکے ہوئے کباب دیا کرتا تھا لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ نمبر کے خلاف دئے ہوں۔ ذرا جلدی کی اور اُس نے تیوری چڑھا کر کہہ دیا "حضرت مسیتا کو اپنی جنٹرمینی سے نہ دبائیے۔ آپ سے پہلے کا یہ لونڈا کھڑا ہے۔ اس کی سیخ سینک دوں پھر آپ کا وارہ۔ دیکھئے یہ آپ کے واسطے لگا رکھی ہے"

مسیتا کی اس مستقل عادت سے دو چار دفعہ ہمیں تکلیف بھی ہوئی اور بُرا بھی معلوم ہوا لیکن ایمان کی بات ہے اس جاہل کبابی میں یہ خصلت ایسی تھی کہ ہزاروں پڑھے لکھوں میں نہیں ہوتی۔ مساوات کا سبق میں نے اسی دُکان پر پڑھا حالانکہ ان حضرت کی اس حق شناسی کی بدولت جس میں کوئی استثنا ہی نہ تھا۔ ایک مرتبہ مجھکو سخت خفت، پریشانی اور بے حد ذلت اُٹھانی پڑی۔ اُس واقعہ کے بعد وہ مر گیا اور مجھے مرنا ہے۔ آج تک میں پچھتاتا ہوں اور اپنی اجتہادی حماقت اور مسیتا کی جہالت آمیز عملِ نمبری پر ماتم کرتا ہوں۔

علیگڈھ سے کرکٹ کی ٹیم آئی ہوئی تھی۔ میرے چند کھلاڑی دوستوں نے اس کی دعوت کر دی۔ اس دعوت کی انتظامی مجلس کا میں بھی ایک رُکن تھا۔ کھانوں کی فہرست تیار ہوئی۔ شامتِ اعمال میرے مُنہ سے نکل گیا کہ مسیتا کے کباب بھی ہونے چاہئیں۔ تھوڑے بحث و مباحثہ کے بعد میری رائے پاس ہو گئی مگر ساتھ ہی اس پر زور دیا گیا کہ جہاں کھلایا جائے وہیں میاں مسیتا کباب لگائیں تاکہ گرما گرم ہوں۔ اِدھر اُتریں اُدھر دسترخوان پر آئیں۔ اور اس کا انتظام مجھ بدنصیب کو سونپا گیا۔ میں خوش تھا کہ مُفت میں مسیتا پر احسان ہوگا اور علیگڈھ والے بھی کیا یاد کریں گے کہ دِلّی کی وہ نعمت کھلائی جو کھانے والے کو سر پاؤں تک جنتی بنا دیتی ہے اور جسکے پہلے ہی نوالے میں خضوع و خشوع شروع ہو جاتا ہے۔

خوشی خوشی میاں مسیتا کی دُکان پر پہونچا۔ وہ ابھی آئے نہ تھے۔ لونڈیا جھاڑو بہارُو کر رہی تھی۔ آج معلوم ہوا کہ یہ گالیوں کا گنبد مسیتا کی بیٹی ہے۔ اتنے میں میاں مسیتا ایک پھٹی ہوئی لنگی باندھے۔ توند سے اُونچا بنیان پہنے، بڑے ٹھسّے سے تشریف لائے۔ سر پر پتیلہ، بغل میں روٹیاں۔ دونوں ہاتھوں میں دو لوٹ۔ سامان رکھتے رکھتے بیسیوں گالیاں تصنیف کر ڈالیں۔ جب ذرا ہلکے ہوتے تو مجھ سے پوچھا۔

"میاں آج اس وقت کہاں۔ سیخیں تو گھنٹہ بھر میں تیار ہوں گی۔ مگر وار پہلا تمہارا ہوگا" میں نے کہا "اس وقت تو میں کباب کھانے نہیں آیا ہوں۔ تمہارے لئے ایک کام لایا ہوں" بولے "میاں۔ میں کس کام کا ہوں۔ کباب بیچتا ہوں اور پیٹ بھرتا ہوں" اور یہ فقرہ کچھ ایسے انداز سے کہا کہ مجھکو خیال آیا کہ کہیں کمبخت انکار کر دے تو مزہ ہی کرکرا ہو جائے۔ ڈرتے ڈرتے کہا کہ "مسیتا ایک دعوت ہے اور اس میں تمہارے کبابوں کی ضرورت ہے۔ علی گڑھ تک نام ہو جائے گا" جواب دیا "کباب جتنے چاہے لیجئے اور ایسے مزے کے لیجئے کہ کھانے والے اُنگلیاں چاٹتے رہ جائیں" میں نے کہا "مگر ایک شرط ہے۔ دعوت کی جگہ چلکر تم کو تیار کرنے پڑینگے"

کہنے لگے: "میاں یہ جھگڑے کی بات ہے۔ مسیتا سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کے دروازے پر جائے۔ یہیں سے لے جائیے گا۔" اِس جملہ میں ایسی کڑک تھی کہ مَیں گھبرا گیا۔ اور زور دیتے ہوئے کہا: "مسیتا یہ کوئی بے عزتی کی بات ہے۔ وہاں تو سب تمہارے قدرداں ہونگے۔ مَیں اپنے دوستوں سے وعدہ کر آیا ہوں۔ میری نصیحت کرکری نہ کرو۔" یہ سُنکر مسیتا کچھ پسیجے۔ اب دوکان پر چند کبابیوں کے رسیا بھی آ گئے تھے، کہنے لگے: "تم مسیتا کی آن توڑتے ہو۔ خیر، مسیتا نے تو آج تک بازار مصطفیٰ میں خدا ہی کو خریدار سمجھا ہے۔ کبھی کسی کے گھر پر ہاتھ پھیلا کر نہیں گیا۔ تم سر ہوتے ہو تو اچھا...... مگر یہ بیچارے کس کی جان کو روئیں گے۔ یہ غریب جو کباب لینے کو آئینگے تو کیا کہینگے.... وقت کونسا ہوگا؟"

دعوت رات کی تھی۔ میں نے کہدیا کہ "رات کا وقت ہوگا لیکن تم کو دن سے آنا پڑیگا۔" یہ سنکر میاں مسیتا کو پھر جلال آ گیا۔ بولے: "حضرت اگر مسیتا پر ایسا ہی ظلم کرنا ہے تو دوپہر کا وقت مقرر کرو۔ وہاں سے فراغت پاکر مَیں دوکان تو لگا سکوں نہیں تو میرا اسلام ہے۔ اس سے زیادہ مَیں آپ کی مروّت نہیں کر سکتا۔"

دسترخوان پر مسیتا کے کباب نہوں اور میری بات میں فرق آ گئے۔ اس لئے یہ آسان تھا کہ دعوت کا وقت بدلدیا جائے۔ چنانچہ اپنی ترکیب سے یاروں کو سمجھا دیا۔ اگرچہ نفسیات اور فلسفہ کا سارا زور لگانا پڑا۔ چنانچہ دعوت دن کے گیارہ بجے قرار پائی۔ اور اسکی میاں مسیتا کو بھی اطلاع کر دی۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ اتنے آدمی کھانا کھائیں گے۔ جسکے جواب میں مسیتا نے عارفانہ لہجہ میں صرف یہ کہا: "اللہ مالک ہے۔ اُسی نے اب تک مسیتا کی آبرو رکھی ہے، وہی اسکی لاج رکھنے والا ہے۔"

دعوت ایک قدیم وضع کے مکان میں ہے۔ صدر دالان میں دسترخوان بچھانے کا انتظام ہے۔ صحن چبوترے سے نیچے ایک سہ دری ہے میاں مسیتا ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر پھسکڑا مارے تشریف فرما ہیں۔ تسلے میں مسالہ ملا ہوا قیمہ۔ زانو کے قریب متعدد سیخیں۔ مٹی کی کونڈی میں کچے تاگوں کے کئی گولے۔ ایک بڑے کونڈے میں پیاز کا لچھا۔ باریک کتری ہوئی ادرک۔ ہری مرچیں اور پودینہ رکھا ہوا ہے۔ کوئلے سلگ رہے ہیں۔ پنکھا چل رہا ہے۔ مَیں صبح سے موجود تھا اور ہر دس منٹ بعد میاں مسیتا کو جھانک آتا تھا۔ نو بجے کے بعد جب دعوت کے دوست شریک آئے اور انہوں نے کہا کہ سارے کھانے تیار ہیں تو مجھے بھی کبابوں کی تیاری کا فکر ہوا۔ جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ ابھی نہ پورے کوئلے دہکے ہیں نہ قیمے نے کبابوں کی شکل اختیار کی ہے۔ میاں مسیتا بڑے آرام سے بیٹھے قیمے کو دہی ڈال ڈالکر مَلتے رہے ہیں۔ دو چار منٹ تو مَیں سیر دیکھتا رہا۔ آخر اکتا کر پوچھا: "میاں مسیتا! یہ کیا کر رہے ہو۔ ابھی تو تم نے سیخوں پر گوشت بھی نہیں چڑھایا ہے۔ کباب کب تک تیار ہونگے۔ دیکھو دس بجنے کو ہیں اور ٹھیک گیارہ بجے دسترخوان بچھ جانا چاہئیے۔"

مسیتا۔ میاں مَیں نہ خالی بیٹھا ہوا ہوں نہ کھیل رہا ہوں۔ کام اپنے رستہ سے ہوا کرتا ہے۔ قیمہ کو ذرا درست کر لوں تو سیخوں کو لوں۔ اتنے میں کوئلوں کا تاؤ بھی ٹھیک ہو جائیگا۔

میں۔ لیکن ہمارے پاس تو صرف چالیس پچاس ہی منٹ ہیں اور تمہارے کام میں ابھی بہت دیر معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے کھانے کبھی کے تیار ہو چکے ہیں۔

مسیتا۔ میاں اُن کا اور کام ہے اور میرا اور کام۔ یہ مسیتا کے کباب ہیں۔ آخر جب سے آیا ہوں اسی میں لگا ہوا ہوں۔ آپ گھبرائیں

نہیں۔ اللہ مالک ہے"۔

میں۔ اللہ تو مالک ہے مگر خدا کے بندے تم نے یہ اوپر کا کام بھی پہلے نہ کر لیا۔ اب کوئی دم میں مہمان آنے شروع ہو جائیں گے۔ وقت کی پابندی بہت ضروری ہے۔

مسیتا۔ آپ میرے ہاتھ پاؤں نہ پھلائیے۔ میں وقت کو دیکھوں یا اپنے کام کو دیکھوں۔ یہ تو مجھ سے کبھی ہوگا نہیں کہ آپ کے ٹیم کی وجہ سے کبابوں کو خراب کر دوں"۔

میں۔ مسیتا تم آج مجھ کو بغیر ذلیل کئے نہیں رہوگے۔ خدا کے واسطے کچھ تو پھرتی کرو۔ لو بس قیمے سے کشتی لڑ چکے" آگ بھی خوب دہک گئی ہے۔ سیخیں لگانی شروع کر دو۔

مسیتا۔ اسی لئے تو میں پرائی تابعداری نہیں کرتا۔ بڑے بڑے نوابوں نے بلایا، نہیں گیا۔ سینکڑوں روپے کے انعام کا لالچ دیا لیکن میں نے دوسروں کی حکومت اٹھانے سے اپنی ایسی حالت کو اچھا سمجھا۔ پھٹے حالوں رہتا ہوں۔ آدھا پیٹ ملتا ہے، بلا سے، کسی کا نوکر تو نہیں۔ غلامی تو نہیں کرنی پڑتی۔

میں۔ تم کس کے نوکر ہو۔ اسوقت تو ہم تمہارے نوکر ہیں۔ صرف یہ عرض ہو کہ ہماری دعوت پھیکی نہ رہ جائے۔

مسیتا۔ اللہ نہ کرے پھیکی کیسی، اتنی چٹپٹی ہو کہ عمر بھر یاد رہے۔ اچھا آپ تشریف لے جائیں اور پورے آدھ گھنٹہ بعد کباب لینے شروع کر دیں۔

یہ کہکر میاں مسیتا نے ہاتھ کسی قدر تیزی سے چلائے اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری سیخوں پر قیمہ چڑھا کر تاگے لپیٹ ڈالے ایک سیخ سے کوئلوں کی سطح کو برابر کیا۔ اینٹیں جو کوئلوں کے دونوں طرف سیخیں لگانے کیلئے رکھی تھیں ان کو دیکھا اور برابر تمام سیخیں لگا دیں۔ پنکھا چلانے والے چھوکرے کو حکم دیا لے ہاتھ چلا۔ زور سے نہیں چلاتا۔

گیارہ بجنے میں دس منٹ تھے کہ مہمان آ پہونچے۔ کالج کے طلبا عموماً آزاد اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ آتے ہی انہوں نے کھانا مانگا۔ مہمان، میزبان اور طفیل سب ملاکر کوئی پچاس آدمی تھے۔ دسترخوان بچھا، خالی رکابیاں چنی گئیں۔ قابوں میں کھانا نکل نکل کر آنے لگا۔ نان بائی نے باقرخوانیاں لگانی شروع کر دیں۔ مجھ کو اپنے کبابوں کا اندیشہ تھا۔ لپکا ہوا میاں مسیتا کے پاس پہونچا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا" حضت یہ چالیس سیخیں تو تیار ہیں۔ کھانا شروع کر دیجئے۔ خدا نے چاہا تو اب تار نہیں ٹوٹنے پائے گا"۔

یہ سنکر میں نے دیکھا تو حقیقت میں آٹھ نو رکابیاں کبابوں سے بھری رکھی تھیں اور ان پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ ادرک پیاز کا لچھا، ہری مرچیں اور کترا ہوا پودینہ چھڑکا ہوا تھا۔ خوشی کی گھبراہٹ میں کہیں میں یہ پوچھ بیٹھا کہ" بھئی کبابوں کے تاگے بھی نکال دئے ہیں"؟ یہ کہنا تھا کہ میاں مسیتا آئیں تو جائیں کہاں، جان کو آ گئے" میاں تم نے مجھے کیا کوئی گنوار سمجھا ہے۔ میں نے کوئی گھامڑوں میں عمر گزاری ہے۔ واہ صاحب واہ اچھی قدر دانی کی۔ کیا کہنے آپ کی سمجھ کے۔ میاں جی میں رہ کر بھاڑ نہیں جھونکا ہے۔ کباب بیچے ہیں کباب اور وہ بھی جامع مسجد تلے جہاں ایک سے ایک تانا شاہی مزاج کا آدمی آتا ہے۔ برے سے برے لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ خوب حضت خوب۔ کیا بغیر تاگے نکالے رکابیوں میں لگا دیتا۔ بہت

تیری قسمت کی ایسی تیسی۔ نہیں میاں یہ وقت کی خوبی ہے۔ مسیتا چالیس برس کا کبابی اور اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کبابوں میں میاں سے تاگے نکال دئے۔ اچھا میاں اچھا!"

مسیتا بڑبڑاتے رہے اور میں نے آکر نوکروں کو بھیج دیا کہ کبابوں کی رکابیاں اُٹھالائیں اور دسترخوان پر چُن دیں۔ کھانا شروع ہوا۔ کمبختی جو آئی میں نے میاں مسیتا کی تعریف کی اور کھانوں میں سب سے پہلے کباب پیش کئے۔ کچھ تو کبابوں کے ذائقہ نے سارے کھانوں کا مٹھ مار دیا جس نے اُن کا ایک لقمہ کھالیا اُس نے دوسرے کسی کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ چند منٹ نہ گزرے تھے کہ کبابوں کی ساری پلیٹیں صاف۔ لتنے میں پچیس تیس سیخیں اور تیار ہو گئی تھیں۔ وہ آئیں اور تکا بوٹی ہو گئیں۔ اب تو یہ عالم ہو گیا کہ ادھر کباب آئے اور اُدھر غائب۔ آنے میں دیر ہوتی تو پھبتیاں کسی جاتیں۔ یہ مہذب شہدے۔ متعلیم یافتہ لنگارے کسی کے روکے کب رُکتے تھے۔ اُٹھ اُٹھ کر دوڑنے لگے۔ جو جاتا تھا میاں مسیتا سے کباب لے آتا تھا۔ اور دسترخوان پر چھینا جھپٹی ہوتی تھی۔ جب معاملہ اس سے بھی گزر گیا اور کباب تیار نہ ملے۔ جو جاتا میاں مسیتا اس سے کہہ دیتے "حضت رکابی چھوڑ جائیے۔ کباب سِک جائیں تو آکر لے جائیے گا" رکابیاں چھوڑ دی گئیں اور انتظار ہونے لگا۔ اب ایک جاتا ہے "میاں مسیتا کباب لاؤ" جواب ملتا ہے "آپ کا ابھی نمبر نہیں۔ وہ جو لبے سے عینک لگائے کھڑے ہیں پہلے پلیٹ اُن کی آئی ہے" دوسرا آتا ہے "لاؤ بھئی ہیں تو دیدو" "ارے میاں وار سے دونگا"

نمبر اور وار سنتے سُنتے آخر جل گئے۔ سعید صاحب جو اس ساری پارٹی کے سرغنہ اور پورے جلا تن تھے بگڑ گئے۔ مجھ سے کہنے لگے "اشرف! یہ تمہارا کبابی آدمی ہے یا پیسے والا ٹٹو۔ نمبر وار دونگا، نمبر وار دونگا کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کہیں میں چانٹا نہ مار بیٹھوں" یہ سُننا تھا کہ مسیتا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ غلافی آنکھیں نکال کر بولے "مسیتا کو چانٹا مارنے والا آج تک پیدا ہوا ہی نہیں۔ یہ سیخچہ بھی دیکھا ہے۔ آدمی کا پیٹ پھاڑ دیتا ہوں۔ تم جیسے انگریزوں کی بیٹ چاٹنے والے ہزاروں دیکھ ڈالے ہوں گے۔ ولایت والوں کی اترنیں کیا پہننے کو مل گئیں کہ اترا ہی گئے۔ ارے ذرا ان کنگلوں کی صورت تو دیکھے کوئی" پھر غصہ سے میری طرف مخاطب ہوئے "آپنے یہ بہروپئے کہاں سے پکڑ بلائے ہیں۔ ایسے لٹیرے مہمان تو ہم نے کہیں دیکھے نہ سُنے۔ کیوں جی ایسے ہی جنٹلمین ہوتے ہیں"

اِدھر میاں مسیتا پر جو اس کا دورا پڑا ہوا تھا اُدھر بعض نوجوان بھی بگڑ چلے تھے۔ علی گڑھ کالج کے طلبا۔ شریف زادے۔ امیروں کے بچے۔ وہ ایک کبابی کی یہ ہتک آمیز گفتگو کس طرح برداشت کرتے۔ میں ڈرا کہ کہیں مسیتا پر حملہ نہ ہو جائے۔ اور وہ اپنی پھوہڑ زبان کی پاداش میں واقعی پٹنے نہ لگے۔ ہنستا ہوا چہرہ بنا کر ایک مصنوعی قہقہہ لگایا اور مسیتا سے کہا "لو بھئی اپنی بانی ختم کرو۔ کب تک ٹیسوا اڑا رہے گا۔ جن جن صاحبوں کی رکابیاں رکھی ہیں انہیں کباب دو۔ تم نے کباب ہی ایسے بنائے ہیں کہ منہ سے لگ کر چھوٹتے ہی نہیں" میری اس تقریر کا بھی میاں مسیتا پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اور زیادہ سخت لہجے میں بولے "کس نے منع کیا ہے۔ نمبر وار آئیں اور لے جائیں۔ بے نمبر تو میں لاٹھ صاحب کو بھی دینے والا نہیں۔ یہ کس کھیت کی مولی ہیں" رفع شر کی غرض سے میں نے کسی قدر بجاجت سے کہا "میاں مسیتا۔ یہ تمہاری دوکان تو نہیں ہے جہاں تم نے نمبر کی شرط لگا رکھی ہے۔ یہ تو ہمارا مکان ہے۔ یہاں پہلے اور پیچھے آنے والے کا کیا سوال۔ یہ گاہک تو نہیں کہ بُرا مانیں گے۔ اور غصہ

کو تھوک دو اور کباب دو۔ مہمانوں پر ایسا نہیں بگڑا کرتے۔" لیکن مسیتا ہیں کہ اپنی ضد سے ایک انچ ہٹنا نہیں چاہتے۔ جواب دیا "مکان ہو، دکان ہو یا آسمان ہو میں اپنی عادت کیوں بگاڑوں۔ برائے شگون کیلئے ناک کٹوانا مجھے نہیں آتا۔ اگر آپ کو اُنکی ایسی ہی خاطر منظور ہے تو آئیے، بسم اللہ کباب لگائیے اور جس طرح جی چاہے دیجئے۔ مسیتا تو اپنے ہاتھ سے دے گا تو تمبر دا ہی دے گا۔" یہ کہتے کہتے میاں مسیتا کھڑے ہو گئے اور اپنا تولیہ کندھے پر ڈال چلے۔ میں نے ہر چند سمجھایا، پھسلایا، ٹھوڑیوں میں ہاتھ دئے۔ لیکن مسیتا پر بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ادھر یہ خیال کہ دعوت میں تو کھنڈر پڑ چکی ہے۔ خدا نخواستہ کوئی اور حرکت نہ ہو جائے۔ حماقت کی شرارت سے ٹکر ہو گئی تو غضب ہی ہو جائے گا۔ اس لئے مسیتا کو جانے دیا۔ لوگوں نے دور تک مسیتا کو شور مچاتے سنا۔ اور میں دل ہی دل میں اپنے اوپر ملامت کرتا رہا۔ آج بھی جب کبھی یہ واقعہ یاد آجاتا ہے تو اپنی بیوقوفی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

اشرف صبوحی دہلوی

اے موت

ابھی تو کیف کی ندی بہائی ہے میں نے — ابھی تو بانسری منہ سے لگائی ہے میں نے
ابھی تو ایک جگر دوز انتظار کے بعد — نقاب چہرۂ گلگوں اٹھائی ہے میں نے
ابھی تو سازِ جوانی کو میں نے چھیڑا ہے — ابھی تو شوق کی بستی بسائی ہے میں نے
ابھی تو حکم دیا ہے فلک کو سجدے کا — ابھی تو دولتِ احساس پائی ہے میں نے
ابھی تو کالی گھٹاؤں کی دیکھ کر مستی — کسی کے زلف کی سوگند کھائی ہے میں نے
ابھی تو حسن کی ایمن نواز کرنوں سے — جگر میں عشق کی دھونی رمائی ہے میں نے
ابھی تو کھیلنا سیکھا ہوں نرم پھولوں سے — شراب و شعر کی محفل جمائی ہے میں نے
ابھی تو حسن کی مخمور سی شعاعوں پر — جگر کو تھام کر اِک چیز گائی ہے میں نے
ابھی تو کاکلِ عنبر فشاں کی لپٹوں سے — تخیلات کی کشتی سجائی ہے میں نے
ابھی تو شعر کی دنیا کو زندگی دی ہے — ابھی تو جدتوں کی مے پلائی ہے میں نے
ابھی تو میری جوانی نے آنکھ کھولی ہے — ابھی تو دولتِ احساس پائی ہے میں نے
ابھی تو نیند کے ماتوں کو میں نے چھیڑا ہے — ابھی تو ایک جھلک ہی دکھائی ہے میں نے

خدارا جینے دے اے موت مجھکو جینے دے
شراب زیست کے پرکیف جام پینے دے

الطاف مشہدی

بھوک

میر جواد علی اپنے محلے کے سب سے زیادہ دولتمند، باعزت اور بارسوخ آدمی تھے، کھانے پینے کے لئے پیسے کی کمی نہ تھی، اس کے علاوہ غدر کے زمانے میں میر صاحب کے دادا نے کچھ انگریزوں کو اپنے گھر میں چھپالیا تھا، جس کے صلے میں آج تک میر صاحب کے خاندان کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار بطور وثیقہ مل رہا تھا۔ میر صاحب کی بڑے مزے میں گزر ہو رہی تھی، میر صاحب آدمی وضعدار قسم کے تھے، جس سے ایک بار دوستی ہو گئی آخر وقت تک نبھاتے رہے، دن بھر بیٹھک میں یار دوستوں کا مجمع رہتا تھا اور شطرنج جمتی تھی، سورج ڈوبتے ڈوبتے میر صاحب تفریح کو نکل جاتے، فتحپوری ہوتے ہوئے دریبہ میں سے نکل کر جامع مسجد آتے، جہاں شبراتی پنواڑی کے یہاں سے ڈبیہ میں پان بھرواتے اور چاوڑی کی طرف چل دیتے۔ نو دس بجے تک کوٹھوں پر رہتے۔ اسکے بعد گھر واپس آجاتے، رات کو تھوڑی سی ہیکر فضل بکڈپو۔ لاہور کے یہاں کا کوئی ناول پڑھتے اور پڑھتے پڑھتے سو جاتے۔ میر صاحب کا یہی معمول تھا۔

میر صاحب کی والدہ اس وقت انتقال کر گئی تھیں، جب یہ دودھ پیتے بچے تھے۔ والد کو مرے ہوئے بھی کئی برس ہو گئے تھے، میر صاحب کی طبیعت کے میلان کو دیکھتے ہوئے والد نے کم عمری ہی میں ان کی شادی کر دی تھی، کچھ دن کیلئے میر صاحب کی باہر کی دلچسپیاں ختم ہو گئیں، لیکن بدقسمتی سے بیگم صاحبہ کچھ دنوں کے بعد آئے دن کی بیمار رہنے لگیں اور جلد ہی میر صاحب کی طبیعت بیوی کی طرف سے ہٹ گئی۔ وہ پھر اپنی پرانی دلچسپیوں میں پڑ گئے، جبتک میر صاحب کے والد زندہ رہے بہو کی دوا دارو کرتے رہے لیکن انکی موت کے بعد اس گھر میں کوئی اتنا بھی نہ رہا جو مریضہ کی تیمار داری کرتا۔ میر صاحب بیماری و بیاری کے جھمیلوں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے بیوی کو میکے پہونچا آئے، جہاں کچھ دنوں کے بعد وہ بھی چل بسیں۔

جب گھر میں کوئی عورت نہ رہی تو میر صاحب نے سوچا کہ نصیبن کو بلالیں، جس نے بچپن میں انہیں دودھ پلایا تھا اور جو اس گھر کی پرانی خادمہ تھی، لیکن وہ اتنی بوڑھی ہو چکی تھی کہ زیادہ چلنے پھرنے اور کام کرنے سے معذور تھی، پھر اس نے وعدہ کر لیا کہ اپنی بیٹی سے دونوں وقت کا کھانا پکوا کر بھیجدونگی۔

گرمیوں کی ایک سنسان دوپہر تھی اور لو چل رہی تھی، میر صاحب پانی سے بھیگے ہوئے پلنگ پر ایک لنگی باندھے لیٹے اپنی توند پر ہاتھ پھیر رہے تھے جو عمر کے ساتھ نہایت سرعت سے ترقی کر رہی تھی، اتنے میں کواڑ کھلے اور نصیبن کی لڑکی جس کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہوگی کھانا لئے ہوئے داخل ہوئی۔

کھانے کے بعد جب وہ برتن کپڑے میں باندھنے لگی تو میر صاحب نے آواز دی:-

"اجی فاطمہ، ذرا سنو تو"

فاطمہ نے برتن باندھتے ہوئے جواب دیا۔

"جی، کیا ہے"

"ہاں، ہاں، ہوں — میں کہہ رہا — میں کہہ رہا

تھا — کہ آج تو تم بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہو"
فاطمہ خاموش رہی، اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔
"کیوں — ہیں، ہیں — کیا ناراض ہو گئیں تم —
سچ جانو، آج تو تم بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہو"
فاطمہ کی پیشانی پر بل آ گئے۔ اُس کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، ہو کیا گیا ہے آپ کو آج اپنی دودھ بہن سے ایسی باتیں کہتے شرم تو نہیں آتی" یہ کہکر وہ چلدی۔
میر صاحب اُس کی طرف لپکے اور اُسکو دبوچ لیا۔
فاطمہ نے ایک دو ہتڑ رسید کیا، اور چیخنے لگی۔
"موئے لتّے جوتے لگواؤنگی کہ سب میر صاحبی رکھّی رہ جائیگی — بڑے شریف آئے کہیں کے!!!"
میر صاحب کو ڈر ہوا کہ کہیں کوئی اسے چیختا ہوا نہ سُن لے، اسلئے جلدی اُسے چھوڑ دیا، جب وہ چلی گئی تو میر صاحب نے چپکے سے دروازے کے باہر جھانک کر دیکھا۔ گلی سنسان پڑی ہوئی تھی، یہ دیکھکر میر صاحب کو ذرا اطمینان ہوا۔
وہ چارپائی پر آکر لیٹے ہی تھے کہ کواڑ کھلنے کی آواز ہوئی میر صاحب کا دل دھک سے ہو گیا۔ گھبراہٹ میں اور تو کچھ نہ سوجھی، جھٹ سے آنکھیں بند کر لیں۔
"میر صاحب، اماں میر صاحب، اماں غضب کرتے ہو یار، ایسی گرمی میں سو رہے ہو، غضب خدا کا آج تو آگ برس رہی ہے، بھئی شاباش ہے تمہاری ہمت پر"
میر صاحب نے جو خلاف توقع اپنے دوست باقر علی کی آواز سُنی تو فوراً اٹھ بیٹھے، بولے "ابھی کھانا کھایا ہے، ذرا قیلولہ کر رہا تھا — آؤ بیٹھو"
باقر علی پلنگ پر میر صاحب کے قریب بیٹھ گئے۔ میر صاحب کے حواس ابھی درست نہ ہوئے تھے، پریشانی کے آثار صورت سے ظاہر ہو رہے تھے، اس کے علاوہ ابھی ابھی جو کشتی ہوئی تھی اس کی وجہ سے ابھی تک اُن کی سانس ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔
باقر علی نے میر صاحب کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا "کیوں، کیا بات ہے، کچھ مکدر سے معلوم ہوتے ہو"
میر صاحب نے جواب دیا۔
"کچھ نہیں یہی گرمی نے پریشان کر رکھا ہے"
"نہیں دوست، کچھ اور ہی بات معلوم ہوتی ہے، یہ ہانپ کیوں رہے ہو، کیا کسی سے کشتی لڑی ہے"
میر صاحب کا دل سینے میں اُچھلنے لگا، سمجھے کہ باقر علی کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے، اس لئے مناسب یہی سمجھا کہ سب کچھ چپ چاپ بتا دیں، اسکے علاوہ باقر علی سے کیا پردہ دو لنگوٹیے یار غار اور شریک کار ہیں۔
"وہ ہے نا — نفیسن — اُس کی لڑکی — وہی لونڈیا۔ ابھی کھانا لیکر آئی تھی۔ گرمیوں کے دن ہیں، مجھے ذرا اچھی معلوم ہوئی، میں نے کہدیا، فاطمہ آج تو تم بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہو، بس کیا تھا، بگڑ بیٹھیں اور لگی اناپ شناپ سُنانے۔ خیریت ہوئی کسی اور نے سُنا نہیں، نہیں تو اور مصیبت ہوتی — اوبار ہے بھائی ادبار۔ چار ٹکے کی لونڈیا بھی اب تو ہمیں اناپ شناپ سُنانے لگی — بڑی آبرو والی آئی کہیں کی!!!"
"اور اگر اُسنے کہیں اپنی ماں سے جاکر کہدیا تو . . . ."
"یہی تو اندیشہ مجھے ہے، وہ بڑی منہ چڑھی بڑھیا ہے"
"اماں، جب کہا ہے تو ڈرتے کیوں ہو، وہ بوڑھی کھوسٹ کر ہی کیا سکتی ہے، کہدینا کہ وہ جھوٹ کہتی ہے، صبح سے باقر علی میرے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے"
"لیکن یہ بات اس بڑھیا سے چھپی تو رہ نہیں سکتی، شام

کو جب وہ اس سے روٹی لے جانے کو کہے گی تو وہ صاف انکار کردیگی اور اگر کہیں وہ بڑھی چرچ گئی تو اور غضب ہو گا۔"

"دیکھو، میری سنو، بہت ممکن ہے فاطمہ خاموش ہو رہے اور ماں سے کچھ نہ کہے، تم تیسرے پہر تک دیکھ لو۔ اگر کوئی بات نہ ہو تو تم خود ہی کہلا بھیجو کہ اب وہ تمہارے لئے کھانا نہ پکایا کرے، کہلا بھیجنا کہ میرے یہاں کھانا پکانے کا انتظام ہو گیا ہے۔"

میر صاحب کو باقر علی کی رائے معقول معلوم ہوئی اُنہوں نے سورج ڈوبنے سے پہلے ہی نصیبن کے یہاں کہلا بھیجا کہ اب انہوں نے کھانے کا دوسری جگہ انتظام کر لیا ہے۔

جاڑوں کے دن تھے، شام ہو چکی تھی، کوئی نو بجے ہونگے لیکن ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میر صاحب ابھی ابھی شراب کی بوتل لیکر آئے تھے اور دو تین جرعے پیکر لیٹے تھے، اسوقت سرور ہو رہا تھا، یکایک کواڑ کھلے اور کسی کے دبے پاؤں مکان میں داخل ہونے کی آواز آئی، میر صاحب نے اپنی نیم وا آنکھوں کو کھولتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔

"ارے تم۔ تم۔ تم کہاں اسوقت فاطمہ؟"

"میں آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"میرے پاس۔ میرے پاس کس لئے آئی ہو۔ گالیاں دینے۔ اُسدن۔ اُسدن۔ یاد ہے۔ ہاں۔"

"جی نہیں، غلطی ہو گئی تھی اُس روز۔"

"تو پھر کس لئے آئی ہو، میرے پاس؟"

"بھوکی ہوں، کئی وقت کی۔"

اور وہ رونے لگی۔

"بھوکی ہو، تم! ہائے، یہ تو ٹھیک نہیں، آخر کیوں!؟"

"اماں بہت بیمار ہیں، کوئی ڈیڑھ مہینے سے گھر میں جو کچھ تھا دوا دارو میں ختم ہو گیا اور اب تو دو دن سے منہ میں ایک کھیل تک اُڑ کر نہیں گئی ہے۔ اماں نے بھیجا ہے، آپکے پاس۔"

"اچھا تو بیٹھو، بیٹھو، ارے تم کانپ رہی ہو، ادھر آؤ، ادھر آؤ، میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ۔" فاطمہ بھیگی بلی طرح سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئی۔

میر صاحب نے لالٹین کی بتی ذرا نیچی کر دی اور خود یہ کہتے ہوئے "شیروانی بیٹھک میں ٹنگی ہے۔ ذرا لے آؤں، اُسی میں دام پڑے ہیں" دروازے کی طرف چل دئے۔

کواڑ کی کنڈی آہستہ سے بند ہونے کی آواز آئی اور میر صاحب لڑکھڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے "لو، یہ لو، اس سے اپنا کام چلاؤ۔" اور وہ اُسکے بالکل قریب آکر بیٹھ گئے "اور دیکھو اگر اور ضرورت ہو تو پھر آجانا، شرمانے کی کونسی بات ہے، کوئی غیریت ہے۔ ہاں! تم تو۔ تم تو......!!"

جب وہ گھر سے باہر نکلی تو اُسکے بال پریشان تھے، کرتے کا گریبان دو چار جگہ سے مسکا ہوا تھا اور وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی، اُسکی ایک مٹھی میں چاندی کے دو گول گول سکے دبے ہوئے تھے۔

گلی کے نکڑ پر کتے کا ایک پلہ اُس کی پرچھائیں سے ڈر کر بھاگا اور دور جاکر بھونکنے لگا۔

سڑک پر ایک یکہ والا گاتا جا رہا تھا۔

ارے ہاں دیکھتے جاؤ، ارے ہاں دیکھتے جاؤ
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

جب وہ بجلی کے کھمبے کے پاس پہونچی تو روشنی میں اُسکے لب ہلتے ہوئے معلوم ہوئے، وہ کہہ رہی تھی۔

"...... دُنیا والے یہوں ہی بکا کریں۔ بھوکوں بھی تو نہیں مرا جاتا۔"

شاہد لطیف

فرصت کی باتیں

"چلو بھئی واہ! ـــــ عجب آدمی ہو تم بھی۔ تلاش کرتے کرتے حیران ہو گیا اور ملے کہاں؟" زیدی صاحب نے سائیکل کو دیوار کے ساتھ کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ میں گردن پھیر کر مسکرایا اور عقیل صاحب کو غصہ آیا۔

افضل اور میں سڑک کے کنارے کنارے چبوترے پر بیٹھے اپنی اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ وہ مجھے "آہِ حزیں" کے حزن و ملال پر آنسو بہانے کی دعوت دے رہے تھے اور میں انہیں چین کے سوشلسٹ نوجوانوں کی سیاسی سرگرمیوں کی داستان سنانا چاہتا تھا۔ وہ "آہنی" بنے بیٹھے تھے اور میں "سینی"۔ وہ ترنم ریز ہونا چاہتے تو میں جوہر انداز بن جاتا۔ آخر وہ چپ ہوتے اور اپنی نظروں کو توڑ توڑ کر میری آنکھوں میں معکوس کرنا چاہا۔ میری زبان نے اشتراکی علم بن کر لہرانا شروع کیا اور آنکھیں ان کی حسیات شعری کو اطاعت کرنے پر مجبور کرنے کے درپے ہوئیں۔ وہ قطع کلامی کر کے میرے بعض الفاظ کو یوں دوہراتے کہ گویا اپنے غیر واضح استدلالی رعب سے دبا کر رات بھر چبوترے پر بیٹھے رہنے کی سزا دیکر رہیں گے۔ میں قدرے ڈرا اور اپنے وقار کو قائم رکھتے انہیں خوش کرنا چاہا۔

"افضل میاں! یہ شاعر بھی کس قدر عجیب لوگ ہیں کہ بزم رزم کے تھکے ماندے سپاہی کے لئے ان کا ایک ایک لفظ نیند سے زیادہ راحت آویز ہوتا ہے اور وہ رات کو سونے کی بجائے گانا شروع کر دیتا ہے۔"

"اگر ان میں یہ "عجبیت" نہ ہو تو ہمارا معمولِ حیات ہی ہمیں زندہ درگور کر دے۔" انہوں نے فرمایا۔

"اور سنو تو!" میں نے کہا۔ "چوکن لکھتا ہے کہ ایک شاعر نے ان کی سرگرمیوں کو "شش رنگیں" کہہ کر پکارا ہے۔"

"تب تو میں......" ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ زیدی صاحب آدھمکے اور "سپاہی و شاعر" کا دلچسپ موضوع انکی "چلو بھائی" کے ساتھ ہی چلدیا۔

"کہاں چلئے گا؟" میں نے پوچھا۔

"میانہ پور تک...... کام ہے کچھ۔" انھوں نے جواب دیا۔

"ایک ہی سائیکل پر؟" میں نے دریافت کیا۔

"تو اور کیا!" وہ بولے۔

"کہیں چالان ہو جائیگا!" افضل میاں نے پیشانی چڑھائی۔ اور میں نے زیدی کو چبوترے پر کرسی کا اشارہ کیا۔ حقہ جو میری نامنظوری کی وجہ سے مایوس ہو چکا تھا، دوبارہ حق حق کرنے لگا۔ "ہو آئیے نا آج وہاں سے بھی!" میں نے زیدی سے کہا اور افضل کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائے "اور کہاں سے؟" زیدی نے پوچھا۔

"وہاں سے!" افضل نے ایک مکان کی طرف انگلی کا اشارہ کیا اور ہم تینوں ہنسے۔

زیدی میری طرح ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے اور کبھی کبھی ٹیوشن تلاش کر کے اس آوارگی سے بچ جاتا ہے جو میرے لئے کلیم خرسی بنی ہوئی ہے۔ چبوترے کے نزدیک ہی ایک صاحب کے ہاں زیدی ان کی دختر کو پڑھانے جاتا تھا اور اس شوق سے کہ اپنے آرام کا

وقت ہی قربان کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ یہاں تک کہ اس کی شانِ شوق نے داد حاصل کی اور منظّم طور پر درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ عرصہ بعد جانے کیا بگاڑ پیدا ہوا کہ زیدی نے وہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ اور اُس نے حسرت پرور انداز سے کچھ ایسا ہی جواب دیا۔

"تجدیدِ مراسم ہی سہی"۔ افضل نے نمکپاشی کی۔ "اوہ" زیدی کے مُنہ سے نکلا اور ہم چونکے۔ وہ خاموش ہو گیا۔

"ناراض ہو گئے آپ؟" افضل نے پوچھا۔

"نہیں جی۔ میں لطفِ صحبت اُٹھا رہا ہوں"۔ اُس نے جواب دیا۔

"تو آپ ہمارے ممنون ہیں نا"۔ میں بولا۔

"کیوں نہیں"۔ زیدی نے عینک ذرا اُوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔

"تو ہم اِس کا عملی ثبوت چاہتے ہیں ــــ کیوں بھائی افضل؟" میں نے کہا۔

"اور اِسپر انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" افضل نے جواب دیا۔

"فرمایئے"۔ زیدی نے پوچھا۔

"آپکی کہانی آپکی زبانی سُننے کو جی چاہتا ہے"۔ میں نے کہا۔

"اور فائدہ یہ ہوگا کہ آپکے متعلق ہمارے جی میں جو شک پیدا ہو گیا ہے وہ دُور ہو جائیگا"۔ افضل نے کہا۔

زیدی خاموش رہا۔ میں نے افضل کی طرف اشارہ کیا اور ہم چبوترے سے اُٹھکر پارک میں چلے آئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی زندگی کا ایک ایسا واقعہ سُنائے۔ جسے وہ زندگی بھر بھول نہ سکتا ہو۔ اور پہلی باری میری تھی۔ میری زندگی کا کوئی ایسا واقعہ تھا نہیں اور عورتوں کے متعلق افسانے گھڑنا میرے بس کا نہ تھا۔ آخر میں نے بات بنانی شروع کی۔

"احراری جتھے جب ریاست کشمیر پر حملہ آور ہو رہے تھے تو میں بھی برائے گرفتاری کا تجربہ کرنے تین ماہ کے لئے جیل پہنچ گیا۔ پہلے روز تو کسی نے کام کے متعلق کچھ نہ پوچھا اور سب سے بڑی سزا جو اپنے لئے میں نے خیال کی، وہ جیل کی خوراک تھی۔ کیونکہ کئی روز تک تو پانی اور چنوں کے سوا زبان نے کچھ نہ قبول کیا۔ اُبلے ہوئے سبزیوں اور درختوں کے پتے، کنکر اور گندم کا ملا ہوا آٹا قیدیوں کی قسمت ہوتی ہے۔ لیکن ہم لوگ اس کے عادی نہ تھے، اس لئے منہ لگانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ تیسرے روز جب مُشقتوں کو ہم پر تقسیم کیا گیا تو آخر کھانا ہی پڑا۔ مجھے چودہ روز نوجوانوں کے ہمراہ چکّیوں پر لے جایا گیا اور اٹھارہ سیر گندم پیسنے کو ملی۔ اس وقت کوٹھڑی میں میرے قریب صرف جیل وارڈر ہی تھا، جس کی مدد سے ایک روز پہلے میں جیل مینوئیل کا مطالعہ کر چکا تھا۔ "یہ کام کس طرح کرتے ہیں۔ میرے بھائی!" میں نے مایوس لہجہ میں وارڈر سے کہا۔ اُس نے مُٹھی بھر دانے لئے اور چکّی میں ڈالکر ایک لمحہ کے لئے دستہ گھمایا۔ "بس یوں کئے جاؤ"۔ کہا اور دروازہ مُقفل کر کے چلدیا۔ اب اگر کام نہ کروں تو سزا بڑھ جانے کا اندیشہ اور اگر کرنے کی کوشش کروں تو کئے نہیں بنتا۔ میں عجیب کشمکش میں آہستہ آہستہ دستہ گھما رہا تھا، اور جسم تو کیا روح کے بازو بھی پھولے جا رہے تھے۔ آخر جیل مینوئیل کا مطالعہ کام آیا اور میں نے نہایت اطمینان سے کھڑے ہو کر چکّی پھیرنے کی ٹھان لی۔ اور پھیرتا رہا یہاں تک کہ چار بج گئے اور قیدیوں کو چُھٹی ہوئی۔ وارڈر نے میری کوٹھری کا دروازہ بھی کھولا اور چکّی کے رگڑے ہوئے پتھر اور جیل کی امانت محفوظ دیکھکر حیران سا ہوا۔

"اب میں کیا کروں ؟" اُس نے پوچھا۔

"اوپر اطلاع" میں نے جواب دیا۔ اور وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد داروغہ کی آمد ہوئی اور اُس کے ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ۔ "اگر اس گندہ دہنی سے آگے بڑھے تو انجام اچھا نہ ہوگا۔ داروغہ صاحب!" میں نے کہا "گالیاں بکنا آپ کے فرائض میں نہیں" وہ ٹھہر گیا اور میری طرف ایک نظر دیکھکر واپس چلا گیا۔ اور میں انجام کا منتظر وہیں بیٹھا رہا۔ آخر چار پانچ محافظ آئے اور چکی اکھیڑ کر باقی سامان ساتھ لئے مجھے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے سامنے پیش کیا۔ اس پیشی کا انجام ہمیشہ سزا میں ظاہر ہوا کرتا ہے، مگر مجھے اطمینان تھا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب میز پر عدالت لگائے کرسی پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بگڑے۔ پتھروں اور گندم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "یہ تم نے کیا کیا ہے ؟" جواب میں میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے لبوں کو جنبش دی اور بس۔

"سنا نہیں" وہ غصہ میں نصف ایستادہ ہوکر بولے۔ اور میرا جواب ایک شوخ مسکراہٹ تھا۔

"بدمعاش کہیں کا — لے جا ..." "سپرنٹنڈنٹ صاحب!" میں نے بات کاٹی۔ "جو کچھ میں نے کیا ہے وہ تو آپ کے سامنے ہے اور میرے کہنے کی ضرورت نہیں — اور اگر آپ کا مطلب اس کی کیوں سے ہو تو جواب دینے میں مجھے عذر نہیں"

"ہاں۔ ہاں یہی مطلب ہے ہمارا" وہ بولے۔

"جیل مینوئیل میں لکھا ہے کہ قیدیوں کو ان کی جسمانی طاقت کے مطابق کام دیا جائے" میں نے کہنا شروع کیا "یہ کام میری طاقت سے باہر تھا۔ دیگر لکھا ہے کہ ایک آدمی کو ایک وقت میں ایک کام کرنے کو دیا جائے۔ دانے ڈالنا علیحدہ کام ہے اور چکی پھیرنا الگ۔ اگر میں دانے ڈالتا تو ایک مٹھی کے بعد میرا کام ختم تھا، میں نے اپنے لئے مشکل کام کا انتخاب کیا اور میرے دست و بازو اس کے گواہ ہیں" میں نے اپنے زخمی ہاتھ اُن کے سامنے کھول دئے۔ انہوں نے دیکھا اور "کل سے اسے کولھو پر لے جاؤ" کا فیصلہ صادر فرما کر چلے گئے۔ مجھے بھی اپنے ساتھیوں میں بھیج دیا گیا۔ میں رات بھر سردی اور کولھو کے خوف سے کانپتا رہا۔

"مگر ......" افضل نے کچھ کہنا چاہا۔ "ختم تو کر لینے دو یار!" میں نے کہا۔ "اور دوسرے دن چند پہلوان نما قیدیوں کے ہمراہ مجھے کولھو پر جانا پڑا۔ میرے ساتھی بہت خوش تھے۔ اکا دن سیر سرسوں کا تیل نکالتے اُن کی ورزش ہو جاتی اور مالش بھی، پہلے دن اُن کے ساتھ مجھے پورا کام کرنا پڑا اور شام کو جب اپنے خیمہ میں پہنچا تو بے اختیار رو دینے کو جی چاہا۔ اور رات سردی اور تکان سے میرا جسم اکڑ گیا"

"مگر سردی روکنے کے لئے کمبل نہیں ملتے ؟" وکیل صاحب نے جرح کی، زیدی میری ... حیرت سے تک رہا تھا۔

"چار بورے ملتے ہیں" میں نے جواب دیا۔ "دو اوڑھنے کیلئے اور دو بچھانے کیلئے۔ اور اُن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر انہیں پھیلا کر صاف کیا جائے تو آپ اُس کے دوسری طرف ہر چیز دیکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ ہم لوگ اُن کو گرد آلود اور "جوں پرور" ہی رہنے دیتے، پھر بھی سردی سے محفوظ نہ رہتے"

"جوں پرور ؟" زیدی بولا۔ "ہاں ہاں" میں نے جواب دیا۔ "اگر جوئیں پلتی رہیں اور رات کو خون چوسیں تو انکی مدافعت

کی کوشش میں جسم کو کسی حد تک گرم رکھا جاسکتا ہے۔"

دونوں ہنسے۔ "اچھا تو دوسرے روز کیا ہوا؟"

اب دوسرے روز کا کیا کرتا۔ ان کی باتوں نے خیال کی روانی روک دی تھی اور میں فضول کوشش میں مفت کی خفت نہ لینا چاہتا تھا۔ "بات دراصل یہ ہے۔" قدرے توقف کے بعد بولا۔ "تین ماہ کی داستان سُنانے کیلئے کم ازکم تین دن درکار ہیں۔ بھائی اب تو میرا حلق خشک ہوگیا ہے اور نتھنے پھُول رہے ہیں۔ فی الحال آپ یہ سمجھ لیں کہ قیدِ تنہائی میں بھُوک ہڑتال بھی کی اور ایسی مشکلات میں تین ماہ گزار دئے۔"

"اب آپ کی باری ہے۔ وکیل صاحب!" زیدی نے کہا۔

"اور میری نہ بھُول سکنے والی کہانی یہ ہے کہ افضل بولا۔ "میری زندگی کا کوئی ایسا واقع نہیں جو عمر بھر یاد رہ سکے۔"

"واہ۔ واہ!" میں نے داد دی۔ اور زیدی ہنستے ہوئے بولا۔ "اب سُنیئے میری۔۔۔"

"دل تھام کر۔" زیدی نے قطع کلامی کی۔

"جی سُنیئے تو" وہ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولا۔ "وہ لوگ ہماری برادری سے ہیں۔ ایک دن مجھے منی کو پڑھانے کے لئے کہا گیا اور پانچ روپے ماہوار معاوضہ پر میں نے منظور کر لیا۔ یوں تو ان لوگوں کو میری شرافت کا پہلے ہی یقین تھا لیکن ایک دو روز کے بعد جب اُنہوں نے میرے بالکل ہی حسابی طریقِ کار کو دیکھا تو پاسبانی کی ضرورت نہ سمجھی اور ہم دونوں کو تنہا ہی چھوڑ دیا جاتا۔"

"دانا ٹھہرے نا۔" زیدی نے کہا۔ "بھلا تیسرے آدمی کی موجودگی میں کیسے پڑھائی ہوسکتی تھی؟"

"اور میں ایک گھنٹہ کی بجائے چار چار گھنٹے وہیں بیٹھا رہتا۔ جب وہ حساب الجبرا کے سوال حل کر رہی ہوتی تو میں اُس کے چہرہ پر نظر جمائے رہتا۔"

"اُس کے چہرے میں کوئی خاص جاذبیت تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ایک نظر دیکھنے سے تو آپ اُس کے چہرے کو نصف مردانہ کہیں گے۔" اُس نے جواب دیا۔ "لیکن اگر آنکھیں بغور دیکھنے کا موقع ملے تو نسائیت کی پوری جھلک نظر آئیگی۔"

"نصف مردانہ چہرے سے آپکا مطلب؟" افضل نے کہا۔

"اُس کے ہونٹوں پر مونچھوں کے بال نمایاں ہیں اور رنگت سیاہی مائل سُرخ ——— جیسے دھوپ میں پھرنے کیوجہ سے مرد کے چہرے کا رنگ اکثر ہوجاتا ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"تو یوں کہیئے کہ اُس کا چہرہ حُسنِ لیلیٰ کو شرماتا ہے۔" میں نے کہا۔

"سُنو تو یار! پہلے کسقدر بے تاب تھے۔ اور اب بات بات پر ٹوکتے ہو۔ میرے اس طرح دیکھنے کو اُس نے ایک دن تاڑ لیا اور کہنے لگی "میرے چہرے میں کیا رکھا ہے؟" ——— "دلکشی" میں نے جواب دیا۔ اور یکایک آسمان پر ابر چھاکر برسنا شروع ہوا۔ جب اُٹھنے لگا تو بولی "بھیگ جائینگے آپ۔"

"بھوک لگ رہی ہے" میں نے کہا۔

"کھچڑی پکی ہے۔ کھا لیجئے" اُس نے جواب دیا۔ "شکریہ ــــ اگر چھتری ہو تو عنایت کریں" میں نے عرض کی لیکن بے سُود۔
اس روز ایک مہینہ ختم ہوگیا تھا لیکن جانے کیوں میں اپنا معاوضہ طلب نہ کر سکا اور بھیگتا ہی واپس چلا آیا۔

اِس کے بعد ہمارا وقت باتوں میں گزرنے لگا۔ گفتگو کا موضوع اکثر مرد و عورت کے باہمی تعلقات ہوا کرتا۔ اور ایک روز باتوں باتوں میں میں نے اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہہ دیا "یو ڈارلنگ لٹل بلیک کیٹ" شاید اس کے غرورِ نسوانی کو صدمہ پہونچا۔ جو غصّہ دباتے ہوئے بولی۔ "احمق!"

"مسٹر احمق" میں نے ترمیم کی۔ "اور مس بلیک کیٹ" وہ ہنسی۔ اس کے بعد ہمارے متعلق غلط افواہیں گرم ہوئیں اور میں نے دو ماہ کا معاوضہ لیکر وہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ بس۔ اب میں اپنی عزّت کو الگ رو رہا ہوں اور وہ اپنی شرافت پر علیحدہ"

"مل جائیے ایک بار پھر" میں نے کہا۔

"خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو" افضل نے کہا اور ہم ہنستے ہوئے پارک سے نکل آئے۔

منظور ملک، بی۔ اے

اے خدائے گردش!

(سانیٹ)

جلو میں فتنۂ محشر لئے پھر کون آتا ہے
دبے پاؤں، جھجکتے۔ ناز سے آہستہ آہستہ
نقاب اُلٹے ہوئے انداز سے آہستہ آہستہ
تبسّم زیرِ لب۔ لہجہ میں جادو گنگناتا ہے
متانت سوتے سوتے جاگ اٹھی لے کے انگڑائی
وہ شاید میری دُنیائے محبت کا فسانہ ہو
وہ شاید بھولے بسرے عہد کا رنگیں ترانہ ہو
شفق نے کروٹیں بدلیں برنگِ زلفِ مینائی
چمن زاروں میں اودے، ارغوانی پھول ہیں قصاں
وہی ساگر میں موجیں ہیں۔ وہی ہے چاند میں رونق
گئی گزری وہ نکہت بیز راتیں پھر نہ آئینگی
وہیں لے چل ادہیں! پھر اے خدائے گردشِ دوراں
جہاں ہے وہ مری عذرا۔ سکونِ جذبۂ وامق
مجھے ظالم زمانے کی تمنائیں ستائیں گی

ثاقب
کانپوری

عورت کی تعلیم و تربیت

عورت کی تعلیم و تربیت پر ہم نے بہت کم غور کیا ہے۔ ہماری موجودہ زندگی میں یہ مسئلہ نہایت اہم اور کافی غور و فکر کا محتاج ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ لڑکیوں کو بہت کم پڑھانا چاہیئے۔ صرف امور خانہ داری میں مہارت اور مذہبی معلومات حاصل ہو جائیں تو کافی ہے مگر یہ خیال دُرست نہیں ہے۔ ہماری وہ لڑکیاں جو مستقبل قریب میں "بیوی" اور "ماں" بننے والی ہیں اگر زیور علم سے آراستہ اور کافی تربیت یافتہ نہ ہوں تو اُن میں اپنے ماحول کی ضروریات کو سمجھنے کی قابلیت و صلاحیت نہیں ہوگی اور نہ وہ حقیقی معنوں میں اپنے شوہروں کی رفیق زندگی اور اپنی اولاد کی ماں بن سکیں گی۔ یہ سوال لڑکیوں کی تعلیم کا نہیں بلکہ بیویوں اور ماؤں کی تعلیم و تربیت کا ہے۔

تعلیم نسواں کے مسئلہ کو ہر مُلک اور ہر قوم کی نظریں نہایت غور و خوض سے دیکھ رہی ہیں مگر ہم نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ اب ہم کچھ بیدار ہوئے ہیں اور ہماری نیند کا خمار کچھ کچھ ٹوٹ رہا ہے۔ مگر یہ کب؟ جبکہ آفتاب لب بام ہے اور دُنیا کی ہر قوم اپنی منزل پر پہنچ چکی ہے۔

ہر قوم کی ترقی اور نشوونما کا اصلی اور حقیقی سبب اس کے افراد کا دماغی ارتقا ہے۔ اسی پر قوم کے عروج اور ترقی کا انحصار ہے۔ ہماری قوم میں جوہر قابلیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ہر فرد کی خواہ وہ مرد ہو کہ عورت باقاعدہ صحیح اصول پر تعلیم ہو اور اُس کے اخلاق کی صحیح تربیت ہو۔

ہر قوم کی زندگی کا راز اس کی دماغی ترقی اور نشوونما میں مستور ہے۔ تعلیم دماغی زندگی کی روح رواں ہے۔ اس سے دماغ کو غور و خوض کرنے کی عادت اور مشق ہوتی ہے۔ یہی اختراعات و ایجادات کی بُنیاد ہے۔ اسی سے دماغ میں سوچنے اور سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی سرچشمہ ہے ساری کامرانیوں اور مقصد برآریوں کا۔ اگر تعلیم نہ ہو تو صحیح دماغ بھی معطل اور ناکارہ بن جاتا ہے۔

علم اِنسان کو صحیح معنوں میں "انسان" بناتا ہے اور حُسن و قبیح کا امتیاز سکھاتا ہے۔ جہالت کی تاریکی کو دُور کرتا ہے۔ اخلاق و عادات کو سنوارتا ہے ہماری اخلاقی قوتوں کو اُبھارتا ہے اور ہم کو فرض شناس بناتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ ہم دُنیا میں علم۔ تہذیب اور تمدّن کے علم بردار تھے۔ آج ہماری حالت دگرگوں ہے۔ آج ہم دُنیا میں سب سے زیادہ پست۔ سب سے زیادہ کمزور۔ سب سے زیادہ ذلیل و خوار۔ سب سے زیادہ بدمعاملہ و ناقابل اعتماد۔ اور سب سے زیادہ علم و ہنر کے محتاج ہیں۔ جو قوم کل ساری دُنیا کو درسِ اصلاح دیتی تھی وہی آج اصلاح طلب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب ہماری حالت وہ نہیں رہی جو چند سال پہلے تھی مگر پھر بھی ہم دوسری اقوام کے مقابلہ میں علمی و عملی میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو ہماری علم و ہنر سے بے اعتنائی اور غفلت ہے اور کچھ ہمارا افلاس و نکبت۔

دُنیا میں جن قوموں کی تعمیر یا تخریب ہوتی ہے اُن میں اُنکی صحیح یا غلط تہذیب۔ تمدّن اور طرز معاشرت کارفرما ہوتی ہے۔ ہر قوم اپنی تہذیب اور معاشرت کے ہاتھوں اپنی تعمیر یا تخریب کا باعث ہوتی ہے اور ہر مُلک اپنے تمدّن کی بدولت ترقی یا تنزل کا

سبب ہوتا ہے۔ جب کسی قوم کا تمدن و معاشرت اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہتا تو اُس قوم کی پستی اور تنزل کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔

دورِ موسائیت یا عیسائیت کے بہ نسبت اسلام کی تاریخی روایات اپنے اندر زیادہ وزنی نتائج رکھتی ہیں۔ اُن کے عروج و پستی کے خارجی اسباب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُن کی تخریب کے اصلی اسباب اُن کا تمدن اور معاشرت تھے۔ تہذیب و تمدن صرف قوم ہی کا نہیں بلکہ انسانیت کی عمدہ تکمیل کا جزو اولین ہے۔ اسی کے ذریعہ سماج کا نظام قائم رہتا ہے اور اسی کے سبب سوسائٹی کی باقاعدہ تنظیم ہوتی ہے۔

ہم نے جہاں اپنی قدیم روایات کو بھلا دیا۔ وہاں اپنی تہذیب و معاشرت سے بھی دست بردار ہوگئے اور اپنے تمدن کو بھی خیرباد کہدیا یہی اسباب ہیں جو ہماری آئے دن کی تخریب و بربادی کا باعث ہو رہے ہیں۔ آج ہماری قومی حیثیت ہر پہلو سے گری ہوئی ہے اور ہم ہر جانب سے ادبار و فلاکت کی خاردار وادیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

جو قوم اپنے عمل میں راسخ نہیں ہے اور اپنے ہر کام اور ہر ارادے کو نامکمل و ناتمام چھوڑ جاتی ہے یا ابتدائی مراحل طے کئے بغیر منزلِ مقصود پر پہنچنا چاہتی ہے وہ کس حد تک اپنے عمل میں کامیاب ہو سکتی ہے؟ اور کس قدر حق رکھتی ہے کہ دُنیا کی دوسری زندہ قوموں کے دوش بدوش چلے؟

تعلیمِ نسواں کی درسگاہوں کے قیام سے پہلے اُن کے مخصوص نصاب کی ترتیب و تکمیل بیحد ضروری تھی۔ جس بُنیاد پر عمارت قائم ہونیوالی تھی اُس کا مضبوط اور مستحکم ہونا ازبس لازمی تھا۔ مگر اس مرحلے کے طے کرنے سے پہلے عمارت کی تعمیر آغاز کردی گئی۔ مردوں اور عورتوں کی تعلیم کا تقریباً ایک ہی نصاب قرار پایا اور عورتوں کے نصابِ تعلیم پر کچھ بھی غور و خوض نہیں کیا گیا اور نہ اُن کے لئے اُن کی مخصوص ضروریات و فرائض کے مدِ نظر ایک علیحدہ نصاب بنانیکی ضرورت محسوس کی گئی۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ نصاب کے ذریعہ تعلیمِ نسواں کا خاطر خواہ نتیجہ یا مقصد برآمد نہیں ہو رہا ہے۔

موجودہ نصاب پر جو تعلیم دیجارہی ہے وہ نہ ہماری لڑکیوں کی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے نہ ہمارے حالات و طبایع کے موافق اور نہ ہماری اخلاقی۔ معاشرتی اور تمدنی ترقی کا باعث ہو سکتی ہے۔ باوجود ان کمزوریوں اور اسقام کے وہ اسقدر گراں ہے کہ ہندوستان جیسے مفلوک الحال مُلک کے باشندے اپنی لڑکیوں کو اُس سے بہرہ اندوز نہیں کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے لڑکیوں کے نصابِ تعلیم کے تعین میں کبھی دلچسپی نہیں لی اور نہ ہم نے کبھی اُس کی اہمیت کو قرار واقعی محسوس کیا۔ ورنہ اس وقت جو مُشکلات اس راستہ میں حائل ہیں کبھی نہ ہوتیں۔ اب اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ماہرینِ تعلیم و حامیانِ تعلیمِ نسواں نہایت پسندیدہ اور موزوں اسلوب پر تعلیمِ نسواں کا جدید نصاب تیار کریں۔ مردوں کے نصاب پر عورتوں کو تعلیم دینا کسی صورت مفید اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ لڑکیوں کیلئے جُداگانہ نصاب کی شدید ضرورت ہے۔ ورنہ موجودہ طرزِ تعلیم سے سود و بہبود کی اُمید بہت کم نظر آتی ہے۔

تعلیمِ نسواں کے نصاب کی ترتیب کیلئے ضروری ہے کہ ماہرینِ تعلیم۔ محبین قوم اور پیشوایانِ دین کے خیالات و آرا معلوم کئے جائیں۔ اُن سب کی متحدہ و مشترکہ کوششوں سے جب تعلیمِ نسواں کا نصاب تیار ہوگا تو یقین ہے کہ ہماری لڑکیوں کے لئے

نہایت مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

ترتیب نصاب کے بعد طرزِ تعلیم کا خوش اسلوبی سے قائم کرنا نہایت ضروری ہے تعلیم کا طرز ایک طالبِ علم کے حق میں امرت بھی ہے اور زہر بھی۔ اسی سے اُس کی تعلیمی حیثیت اور قابلیت نشوونما ہی پاتی ہے اور پستی کی طرف بھی مائل ہوتی ہے تعلیم نسواں کی مخالفت اب بہت کم کی جاتی ہے مگر طرزِ تعلیم کے خاطر خواہ نہ ہونے سے پسند نہیں کیا جاتا ہے۔

طرزِ تعلیم میں قومی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ قومی ترقی کا دارو مدار طرزِ تعلیم پر ہے۔ طرزِ تعلیم کا اثر اخلاق۔ تمدن اور معاشرت پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ تعلیم نسواں کے نصاب کے تعین کے ساتھ ساتھ طرزِ تعلیم کیطرف بھی خاص توجہ کرنیکی ضرورت ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم کے اہم مقصد کے مدِ نظر اس امر کی ضرورت ہے کہ اُن کا نصابِ تعلیم ایسا کارآمد اور اتنا مکمل ہو کہ انکو اپنے نسوانی فرائض وضروریات کا اہل بنانیکے علاوہ اُن میں مذہبی اور قومی خصوصیات بھی پیدا کرے تاکہ وہ اپنی۔ اپنے شریک زندگی اپنی اولاد اور اپنی سماج کی زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بنا سکیں۔

جس قوم سے اُسکی قومیت اور اُس کا تمدن نکل گیا ہو اور اُس کی خصوصیات سلب ہوگئی ہوں وہ گویا دُنیا سے نیست و نابود ہوگئی اُس کا عدم و وجود یکساں ہے۔ ہر قوم اپنی خصوصیات کیوجہ اقوامِ عالم سے اپنا فرق منواتی ہے۔ یہ خصوصیت ایسی ہے جسکو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

موجودہ نصاب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کس حد تک ہماری قومی روایات وخصوصیات کو نصاب میں جگہ دیگئی ہے۔ اور ہماری تواریخ کو کہاں تک طاقِ نسیان پر رکھ دیا گیا ہے۔ بجائے اپنی تواریخ اور قومی روایات سے فائدہ اُٹھانے کے دوسروں کی تواریخ اور روایات سے فائدہ اُٹھانیکی کوشش کی گئی ہے۔ اپنے مشاہیر اور اسلاف کے تذکروں سے نصاب کو محروم کردیا گیا۔ مگر دوسری اقوام کے اکابر ومشاہیر کے تذکروں سے ہماری درسی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ضروری اجزائے تعلیم کو ترک کرکے بہت سی ایسی غیر ضروری باتیں نصاب میں شامل کردی گئیں جن سے بجز اس کے کہ جنسِ لطیف کے نازک اور کمزور دماغوں پر خواہ مخواہ بار پڑے کوئی فائدے کی اُمید نظر نہیں آتی۔

جس قوم کے کشکول میں دوسروں کی دی ہوئی بھیک ہو۔ جو غیروں کے ٹکڑے کھانیکی خوگر بن گئی ہو اور جسکو پرایا مال کھانیکا چسکا پڑ گیا ہو وہ قوم کہاں تک اپنے قوتِ بازو سے کچھ پیدا کرسکتی ہے۔ وہ اپنی ساری کوششیں اور قوتیں غیروں کی بھونڈی نقالی میں صرف کرکے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہے۔ جس قوم نے اپنی جیبوں میں ایسے کھوٹے سکّے بھرتے ہیں وہ بازارِ عالم میں اپنے لئے کیا سودا کرسکتی ہے۔ ایسی قوم کا مستقبل ظاہر ہے کہ کسقدر شاندار اور درخشاں ہوگا۔

جس کی بہار یہ ہے پھر اُسکی خزاں نہ پُوچھ

ہماری آنیوالی نسلوں کے نشوونما کا دار ومدار اور اُن کے ارتقا کا رازِ صحیح اور بااُصول تعلیم نسواں اور اُنکی اخلاقی اور اقتصادی آزادی میں مضمر ہے۔ یہ وہ بنیادی حق ہے جسکو اسلام نے "صنفِ نازک" کو عطا کیا تاکہ وہ اپنی قومی اور مذہبی ذمہ داریوں کو اچھی طرح محسوس کرسکیں۔ ہماری بہنوں کا یہ نصب العین ہونا چاہیئے کہ وہ عہدِ ماضی کی خواتین کی روحانی صفات اور دورِ حاضر کے قابلِ تقلید خیالات اور جذبات کے اتصال کی ایک زندہ مثال بنیں۔ اپنی نفس بلکہ اپنی ہر حرکت اور جنبش میں

اپنی مشرقی شرم و حیا۔ ایثار و وفا اور خودداری و ہمدردی کا لحاظ رکھیں۔ مشرق کی عورت کو قدیم حسن و خوبی کا خزانہ اور جدید تعلیم و تہذیب کے بہترین جوہروں کا آئینہ ہونا چاہیئے۔

جو لوگ مغرب کی تہذیب اور وہاں کی عورتوں کی آزادی کے دلدادہ ہیں وہ اِس تہذیب کی تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمائیں اور نظرِ غور سے دیکھیں کہ اس نام نہاد تہذیب کے پردے میں اُن کی اخلاقی زندگی کہاں تک قابلِ تقلید ہے۔ مغربی تہذیب کی ایک حد تک ضرور تقلید کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے موجودہ تمدّن اور معاشرت میں مغرب کی تہذیب کا بڑا عنصر شامل ہوگیا ہے۔ مگر مغرب کی ہر اد؛ اور ہر حرکت پر بغیر غور کئے آمین کہنا اور اُسکو بمنزلہ "خدائی فرمان" تصوّر کرنا کسی صورت جائز نہیں۔ مغرب کی تقلید اُس حد تک کرنی چاہیئے کہ ہماری اخلاقی حالت اور معاشرت میں کوئی فرق نہ آئے۔ ہماری معاشرت اور گھریلو زندگی بد اخلاقی یا گندم نما جو فروشی کی مثال نہ بن جائے اور ہماری قومی و مذہبی خصوصیات ہم میں سے نیست و نابود نہ ہونے پائیں۔ مغربی تہذیب کی حسین اور نظر فریب صورتوں کو تنقیدی نظر سے دیکھیں کہ اُن میں سے کون ہماری صحبت کے قابل ہے اور کس سے کنارہ واجب۔

مغربی تہذیب و معاشرت کی نظر فریبیاں اور دورِ حاضر کی سحر کاریاں خواہ اپنے اندر کتنی ہی دلکشی اور جاذبیت رکھتی ہوں مگر دیدۂ بینا کے لئے یہ ہماری قوم کی بقا اور تحفظ کا ذریعہ نہیں بلکہ ہمارے اخلاق کی بربادیوں اور تمدّن کی تباہ کاریوں کے اسباب اپنے اندر پنہاں رکھتی ہیں۔ باوجود یہ سب کچھ سمجھنے کے ہم خود کو مغربی رنگ میں از سرتا پا بہت سُرعت سے رنگ رہے ہیں۔ مغرب کی ساری عیش پرستیاں اور سوسائٹی کی جُملہ خرابیاں ہماری سماج میں رواج پا رہی ہیں اور ہم میں وہ ساری بُرائیاں راسخ ہو چکی ہیں جن کے رواج پر خود مغربی مصلحین معاشرت صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔

مغرب کی صحیح تقلید کا سب سے پہلا اثر ہماری بہنوں میں یہ ہونا چاہیئے کہ وہ صاف ستھرا رہنا سیکھیں۔ گھر کے گوشہ گوشے کی صفائی کا خیال رکھیں۔ گھر کی ہر چیز کو سلیقہ اور ترتیب سے سنواریں۔ معاشرت میں صفائی اور پاکیزگی پیدا کریں۔ وقت کی قدر و قیمت کرنا سیکھیں۔ وعدہ کے ایفا کا خیال رکھیں۔ اس طرح کی تقلید ان کے حق میں مفید ثابت ہوگی اور سماج میں اُن کا مرتبہ بلند ہوگا۔ جو بچے اس فضا اور ماحول میں پرورش اور تربیت پائیں گے اُن کے خیالات اور احساسات بھی اپنی ماؤں کی طرح بلند ہوں گے۔

مغرب کے رہنے والوں کا ہر گھر فردوس کا ٹکڑا نظر آتا ہے۔ اس کا یہ سبب نہیں کہ ان کی مالی حالت ہم سے اچھی ہے اس لئے وہ ایسی معاشرت کے پابند ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم غریب عیسائیوں کا مقابلہ اپنے امراء کی معاشرت سے کریں تو بھی یہی فرق نظر آئیگا۔ سلیقہ اور صفائی کیلئے زیادہ روپیہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمیز اور احساس کی ضرورت ہے اور اسی کا ہماری بہنوں میں فقدان ہے۔

ہماری خواتین میں ایک یہ عیب بھی ہے کہ اُن کا وقت اکثر بیکاری۔ فضول گپ شپ اور دوسروں کی عیب جوئی اور نکتہ چینی میں گذرتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُن کی زندگی کا کوئی نظام نہیں اور نہ کام کرنیکے اوقات کا تعین ہوتا ہے۔ اگر بچوں کی تعلیم و تربیت کی اُن میں صلاحیت ہو۔ امور خانہ داری میں ان کو ترتیب اور تہذیب پیدا کرنیکی فکر ہو۔ گھر کی صفائی اور ستھرائی کا خیال ہو۔ نہ نانہ

دستکاریاں سیکھنے کی طرف اُن کی توجہ ہو اور مطالعہ کُتب و اخبار بینی کا شوق ہو تو اُن کا ایک لمحہ بھی رائیگاں نہیں جا سکتا۔

تعلیم کا اثر کسی صورت بھی خراب نہیں ہو سکتا۔ اصل چیز جو زندگی کو تباہ و برباد کرنیوالی ہے وہ ناقص تربیت ہے جس کی سب سے پہلی ذمہ دار ماں ہی اور وہ اُسی وقت اچھی تربیت کرنیوالی ثابت ہوگی جب وہ خود عمدہ تربیت یافتہ ہو۔ اُس کے اخلاق اور خصائل بلند ہوں، صاف سُتھری معاشرت رکھتی ہو۔ وقت کی قدر شناس ہو۔ اصول حفظانِ صحت سے واقف ہو۔ توہمات اور فضول رسم و رواج کی پابند نہ ہو۔

غرضیکہ ہماری بہنوں کو ایسی تعلیم و تربیت ملنی چاہیئے کہ وہ اُن میں خودداری۔ محنت۔ فرض شناسی۔ والدین کی اطاعت۔ پاکدامنی۔ اور وطن پرستی کی روح پھونک دے۔ تاکہ وہ مغرب کی کارآمد اور مفید معلومات حاصل کرنیکے باوجود مشرقی روایات اور طریق معاشرت کا کافی احترام کرنا سیکھیں۔ اُن کو مجسم یورپین نہ بن جانا چاہیئے مگر اُن کے عمدہ خصائل اور قابلِ تقلید صفات ضرور اختیار کرنی چاہئیں۔

مرزا سیف علی خاں؛

ساقی بک ڈپو۔ دہلی کی کتابیں

دلّی سے واپسی

رخصت اے دلّی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں نالہ بہ لب جاتا ہوں میں

یاد آئیں گے مجھے تیرے زمین و آسماں
رہ چکے ہیں میری جولانگاہ تیرے بوستاں

تیرا دل دھڑکا چکے ہیں میرے احساسات بھی
تیرے ایوانوں میں گونجے ہیں مرے نغمات بھی

رشکِ شیرازِ کہن ہندوستاں کی آبرو
سرزمینِ حسن و موسیقی بہشتِ رنگ و بو

ذکرِ یوسف کا تو کیا کیجے تری سرکار میں
خود زلیخا آکے بکتی ہے ترے بازار میں

معبدِ حسن و محبّت بارگاہِ سوز و ساز
تیرے بتخانے حسیں تیرے کلیسا دلنواز

جنّتیں آباد ہیں تیرے در و دیوار میں
اور تو آباد خود شاعر کے قلبِ زار میں

محفلِ ساقی سلامت بزمِ انجم برقرار
نازنینانِ حرم پر رحمتِ پروردگار

یاد آئیگی مجھے بے طرح یاد آئیگی تو
عین وقتِ میکشی آنکھوں میں پھر جائیگی تو

کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر خلدِ علی گڑھ کی ہزاروں محفلیں

کتنے رنگیں عہد و پیماں توڑ کر آیا تھا میں
دلنوازانِ چمن کو چھوڑ کر آیا تھا میں

اِک نشیمن میں نے چھوڑا اک نشیمن چھُٹ گیا
ساز بس چھیڑا ہی تھا میں نے کہ گلشن چھُٹ گیا

دل میں سوزِ غم کی اِک دُنیا لئے جاتا ہوں میں
آہ تیرے میکدے سے بے پئے جاتا ہوں میں

جاتے جاتے لیکن اک پیماں کئے جاتا ہوں میں
اپنے عزمِ سرفروشی کی قسم کھاتا ہوں میں

پھر تری بزمِ حسیں میں لوٹ کر آؤنگا میں
آؤنگا میں اور بہ اندازِ دگر آؤں گا میں

آہ وہ چکّر دئے ہیں گردشِ ایام نے
کھول کر رکھدی ہیں آنکھیں تلخیِ آلام نے

فطرتِ دل دشمنِ نغمہ ہوئی جاتی ہے اب
زندگی اک برق اک شعلہ ہوئی جاتی ہے اب

سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤنگا
لالہ زارِ رنگ و بو میں آگ بن کر آؤنگا

اسرار الحق مجاز
بی۔اے (علیگ)

خیالات کی ہڑتال

عزت نگر ایک چھوٹی سی مگر سونا اُگلنے والی ریاست تھی۔ اس کے حکمراں راجہ صاحب کی سادہ زندگی اور رعایا پروری مثالی تھا۔ عوام اس کے جمہوری طرزِ نظام سے بہت خوش تھے۔ وزرا میں سوائے ایک نامزدہ کے باقی اِنہی کی طرف سے باقاعدہ چناؤ کے ذریعہ نمائندہ ہو کر آتے۔ ریاست کی داخلی اور خارجی حکمتِ عملی اِنہی کے ہاتھ میں تھی۔ انسانوں کا ایک بڑا گروہ اِس دُنیا کے چھوٹے سے ٹکڑے میں خیالی زندگی بسر کر رہا تھا ——

راجگیری کی ہوس انسانی دل میں خواہ مخواہ بُغض اور حسد پیدا کر دیتی ہے۔ ایک قریبی ریاست کے مہاراجہ کے کانوں تک عزت نگر کی دولت اور زمیوں کی خبر گئی۔ اس کی نیّت میں فرق آ گیا۔ ایک بڑی مچھلی کی طرح اُس نے اِسے ایک چھوٹی سی مچھلی سمجھ کر ہڑپ کر جانا چاہا۔ اپنی امارت اور عسکری طاقت کے بل بُوتے پر اپنی اس بوالہوسی کی تکمیل کے لئے اس نے عزت نگر کے بے گناہ انسانوں پر شب خُون مارا۔ ریاست میں خُون کی ندّیاں بہہ گئیں۔ بُوڑھے راجہ اور ریاست کی عزت کی خاطر جو انسانوں سے پہلے کٹ مرے۔ نوجوانوں کے گلے بھی خودداری کے جوش میں تیغ کی خونی دھار سے جا لپٹے۔ مہاراجہ کی بوالہوسی نے بچّے یتیم کر دیئے۔ مائیں بیوہ ہو گئیں اور کئی جوانسال دُلہنوں کا سہاگ لُٹ گیا۔ راجہ رانی کے ناگہاں قتل سے ریاست میں ابتری پھیل گئی۔ چند خود غرض وزیروں نے نئے راجہ کی اطاعت قبول کر لی۔ مہاراجہ نے ان پر ریاست کے خزانوں کے مُنہ کھول دئے لیکن عوام پر بغاوت کا الزام دے کر استبداد کے آخری ترکش ختم کر دیئے اُنہوں نے مجبوراً پیٹ پالنے اور فاقہ کش جسموں کو زخموں سے بچانے کے لئے جبری اطاعت قبول کر لی۔

دن گزرتے گئے۔ عزت نگر پر مہاراجہ کا فرضی تسلط قائم ہو گیا۔ مطلق العنان مہاراجہ اور اُس کے حواری مفت ہاتھ آئی دولت اور عیش کے نشہ میں مخمور تھے۔ امرا، کو ہاتھ میں رکھنے کے لئے اِنہیں ہر قسم کی مراعات دی گئیں تھیں۔ کارخانوں کی ملکیت کی وجہ سے وہ ریاستی تجارت کے اجارہ دار تھے۔ ذاتی رُسوخ کی وجہ سے اعلیٰ عہدے اور ریاستی وظائف اُنہوں نے اپنی ذات اور اولاد کے لئے وقف کر دیئے تھے۔ اِس طرزِ نظام کا اثر یہ ہوا کہ چند ہی سال میں اوسط طبقہ کے لوگ مفقود ہو گئے اور عزت نگر مطلق العنان امرا اور غریب عوام سے بھر گیا۔ نوکری مزدوری، معمولی کاشتکاری بس یہی کچھ ان کی زندگی کا ذریعہ معاش تھی۔ وہ اپنے شہر میں خود کو غریب الوطن تصوّر کرنے لگے۔ اُمرا کے ظالم ہاتھوں نے ان پر رفتہ رفتہ زندگی کے دروازے بند کر دیئے —— اپنی زندگی ایک بار معلوم ہونے لگی۔

عوام اپنی گری ہوئی حالت پر غور و فکر کرنا چھوڑ دیا کیونکہ وہ سمجھ بیٹھے کہ ان کے مقسوم میں یہی لکھا ہے کہ وہ اپنا معیارِ زندگی نہیں کر سکتے۔ غلامی اب ان کا پیشہ ہو چکا ہے۔ اُمرا الگ اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھے اُنہیں صورتِ حالات کو خیال میں لانے کی بھی فرصت نہ تھی —— سرمایہ داری انسانی ذہن سے غور و فکر کا مادّہ چُوس لیتی ہے۔

خیالات پریشان عزت نگر کی بالائی فضا میں چکر لگا رہے تھے۔ ترقی پسند خیالات کی پرواز اور بلند تھی۔ اُنہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اُمراء اپنی انتہائی تعیش پسندی اور عوام اپنی انتہائی بے چارگی کی وجہ سے اپنی حالت سے بے خبر ہو چلے ہیں جیسے انہیں ہماری ضرورت ہی نہیں رہی۔ اُمراء تو آسودہ حالی اور عشرت کی وجہ سے بے خبری میں ہیں لیکن عوام کے دل میں احساس کیوں مُردہ ہو چکا! ہمارا فرض ہے کہ ان کے دل میں احساس کی چنگاری پیدا کرکے دامنِ عشرت کو جلادیں۔ فیصلہ ہوا کہ چند منٹ کے لئے ایک ہڑتال کی جائے کوئی معمولی سے معمولی خیال بھی کسی ذہن میں داخل نہ ہو اور اذہان کو بالکل ایک کاغذ کی طرح کورا کردیں۔ ایک بڑا اجتماع ہو اور فضا میں ہر نوع کے ترقی پسند خیالات جمع ہو کر اپنا رُوح پرور پیغام عوام کے عاقبت اندیش کانوں تک پہنچا دیں۔ ان کا یہ مظاہرہ بنی نوع انسانوں کے ایک مفلس طبقہ کو سرمایہ داری کی قید سے نجات دلائیگا۔

—— آن کی آن میں خیالات جمع ہونے شروع ہو گئے۔ باہمی مشورہ نے فضا میں ایک بھنبھناہٹ پیدا کر دی۔ آزادی، خودداری اور مختلف نوعیت کے ترقی پسند خیالات نے بیک آواز فضا میں گونجنا شروع کر دیا۔ "ہمیں لے لو! انسانو ہمیں لے لو۔ ہم مظلوم انسانوں پر زندگی کے دروازے وا کر دینگے —— آزادی اولاد آدم کا پیدائشی حق ہے اسے مت چھن جانے دو۔ تم اپنے سینوں کو اپنی آرزوؤں کا مدفن کیوں بننے دیتے ہو —— سینے تان لو اور خود ہی تمہارے اندر زندگی کی رُوح پھُونک دی جائے گی۔ ہمیں لے لو اور رُوحِ آزادی تمہاری غلام ہے ——"

اِس قسم کی گونج نے فضا میں ایک کھلبلی مچا دی۔ خیالات کی ہڑتال کی وجہ سے لوگ جو چند منٹ تک بالکل چلتے پھرتے پُتلوں کی طرح ایک دوسرے کا مُنہ تکتے رہے اب اس گونجتی ہوئی آواز کو سُنکر ٹھٹک گئے۔ مظلوم انسانوں نے اسے پیغامِ رحمت سمجھا اور اُمراء نے بدشگونی سے تعبیر کیا۔

مظلوم عوام کو اپنی ذلت کا احساس ہو گیا۔ اُنھوں نے منظم ہو کر اپنی قسمت بدل دینے کا تہیہ کر لیا۔ امراء —— یہ خونخوار بھیڑیئے عوام کو بھیڑوں کا گلہ سمجھے بیٹھے تھے۔ اب اپنے اہتمام میں خلل پیدا ہوتا نہ دیکھ سکے۔ امیر و غریب کی خواہ مخواہ کدورت کا چراغ روشن ہو گیا۔ عوام نے جائز حقوق کا مطالبہ کیا۔ اُمراء کی آہنی گرفت انہیں کچلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ ننگے پاؤں اور سینے ننگے کئے عوام سخت دل اُمراء کے عیش و عشرت کے راستے میں دیوار کی طرح حائل ہو گئے۔ وہ اب زندگی کی تنگ شاہراہ سے ہٹ کر کھلا راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اُمراء نے روکا اور اُن کے خُون سے ہولی کھیلی۔ عزت نگر میں بے موسم گُلِ لالہ پیدا ہو گیا ——

ایام نے پلٹا کھایا۔ عوام کے خُونِ ناحق کو رنگ لانا ہی تھا۔ بے سروسامان انسان اپنے نیک ارادے میں کامیاب ہو گئے۔ اُنکی آنکھوں میں خُون اترا ہوا تھا اور اُنھوں نے اُمراء کو جو جونک کی طرح چمٹ کر ان کا خُون چُوس رہے تھے دُور اُٹھا پھینکا۔ اُمراء کا بکھرنا تھا کہ عزت نگر کی باگ ڈور مستحق انسانوں کے ہاتھ میں آگئی اور اب اس زرخیز ریاست کی آمدنی سے اُن غریبوں کی دال روٹی کا سامان ہونے لگا جو فاقے کاٹ کاٹ کر اس طرح مُرجھا گئے تھے جیسے زندگی نے اُنہیں اپنے سے کوسوں دُور پھینک دیا ہو —— عزت نگر ایک بار پھر لہلہانے لگا۔ ترقی پسند خیالات نے ایک ارضی جہنم کو جنت سے بدل دیا۔

(خواجہ) حسن عباس، بی۔ اے۔

تعارف

۱

تعریف میری کچھ نہیں میرا تعارف کچھ نہیں
کچھ جدّ و امجد کی بنا پر ناز میں کرتا نہیں
کچھ شان و سطوت کا بزرگوں کی مجھے غرّا نہیں
اپنے سلف پر فخر یا وجہِ تأسف کچھ نہیں

۲

رنگیں لطافت سے مری کُل زندگی معمور ہے
آزادیوں کے جنگلوں کی مجھ کو رغبت ہے بہت
فطرت ہے میری فطرتِ عالم کو نسبت ہے بہت
بدمستیوں سے خود مری ہر شے یہاں مخمور ہے

۳

ذکرِ سلف دُنیا میں دُنیا کا تعارف ساز ہے
گو میں نے یہ مانا کہ ہوں چشم و چراغِ خانداں
گو میں نے یہ مانا کہ ہوں میں افتخارِ دودماں
لیکن مجھے کب خاندانی سطوتوں پر ناز ہے

۴

خوشبو مری ہر سو رواں، مثلِ شمیمِ جانفزا
میں ایک گُلِ صحرائی ہوں، میں سبزۂ بیگانہ ہوں
شیدا ہوں خود اپنا ہی میں، اپنا ہی میں دیوانہ ہوں
دُنیا مجھے سمجھے گی کیا، میں خواب ہوں افسانہ ہوں
میرا وجود آئینہ دارِ جلوۂ صبح و مسا

۵

گرویدۂ جوشِ عمل ہوں، قالبِ جانِ عمل
شُہرت کی قلت ہے مگر تشہیر میں دقت نہیں
شہرت سے نفرت ہے مجھے شُہرت مری دولت نہیں
مجھ میں ہے شانِ زندگی، مجھ میں ہے امکانِ عمل

۶

مَیں سبزۂ بیگانہ ہوں، برگِ گُلِ آزاد رَو
مَیں گل کا ایسا جُزو ہوں، ہیں خود پہ جسکو نازشیں
مجھ میں فروغِ کیف ہے، قائم ہیں مجھ میں شورشیں
قائم ہیں مجھ میں شورشیں قائم ہیں مجھ میں سازشیں
پنہاں ہیں کچھ حُسنِ ازل کی مجھ میں ایسی تابشیں
سرگرمیاں میری بنیں گی نازشِ تہذیبِ نو

فرحت کانپوری

مزدور کا بیٹا

جمن :- "باقر کی ماں آج مجھے بہت جاڑا لگ رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے رضائی مجھے دیدو۔ تم لوگ یہ ٹاٹ اوڑھ لو"

بدھنی :- "تمہیں جاڑا لگ رہا ہے تو ہمیں کیا گرمی لگ رہی ہے کہ رضائی تمہیں دیدیں۔ ٹاٹ کو دُہرا کرلو اور دونوں گھٹنے پیٹ سے لگالو جاڑا کم ہو جائے گا"

جمن :- "پیر کیا سیدھے کئے پڑا ہوں کہ موڑ لوں۔ اکہرے ٹاٹ سے تو بدن کھلا رہ جاتا ہے۔ دُہرا کر دونگا تو پھر ساری جان سُکڑ جائیگی"

بدھنی :- "اسی لئے تو کہتی ہوں کہ اس کوٹھڑی کو چھوڑ دو۔ کھڑکی کے کواڑ ندارد۔ ہوا آتی رہتی ہے جاڑا نہ لگے تو کیا ہو؟"

جمن :- "چھوڑ دوں تو پھر جاؤں کہاں۔ ایک روپیہ مہینہ پر کوٹھری کہاں ملے گی۔ اور پھر اتنا سیدھا مالک۔ مہینے کی جس تاریخ جی چاہا کرایہ دیا۔ دوسرے تو ہر مہینے پیشگی وصول کر لیتے ہیں"

بدھنی :- "سڑی سی کوٹھڑی ہے تب ہی تو مالک کی یہ مہربانی ہے۔ ہم چلے جائیں گے تو پھر اس میں کون رہیگا۔ بڑا سیدھا مالک ہے تو کیوں نہیں جاکر کہتے کہ کھڑکی کے کواڑ غائب ہیں، انہیں لگوا دو۔ لگا دے تو جانیں کہ بڑا سیدھا مالک ہے۔ موا خود محل میں ٹانگ پسار کر سوتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ ہم پر اس جاڑے میں کیا گذرتی ہے۔ اس مہینے جب باقر بیمار تھا اور سارا پیسہ دوا دارمن میں لگ گیا تھا اور تم مہینہ بھر کرایہ نہ دے سکے تھے اس وقت موئے کو رحم نہ آیا۔ اگر تم اُدھار لیکر کرایہ نہ چکاتے تو شاید گھر سے نکال دیا ہوتا۔ میرا بس چلے تو مرتے کا منہ نوچ لوں"

جمن :- "باقر کی ماں تم سچ مچ بڑی تیز مزاج ہو۔ ہم غریب ہیں ہمیں امیروں کی شان میں اس طرح نہ بولنا چاہیئے۔ امیروں ہی کی بدولت تو ہماری روزی ہے۔ اگر امیر نہ ہوں تو پھر ہمیں کام کہاں سے ملے اور روٹی کیونکر چلے۔ خانصاحب کے بھی تو آخر ہزاروں خرچ ہیں۔ ان کوٹھڑیوں کے کرایہ کی ہی تو اُن کی اصلی آمدنی ہے۔ کرایہ نہ ملا کرے تو پھر ان کا خرچ کیونکر چلے۔

بدھنی :- "اچھا تمہیں امیروں سے بڑی آس ہے تو انکی خوشامدیں کیا کرو۔ اُن کی تم تعریف کیا کرو۔ میں تمہاری ہاں میں ہاں نہیں ملا سکتی میرا بچہ بیمار تھا۔ وہ دم توڑ رہا تھا۔ موئے کو ترس نہ آیا اور کرایہ لیکر چھوڑا۔ ایک روپیہ کے لئے کونسا اس کا کام اٹک رہا تھا۔ بیٹے کے بیاہ میں سینکڑوں روپے خرچ کر سکتے تھے اور ہم کو ایک روپیہ معاف کردینے میں اسکی جان چلی جاتی"

جمن :- "تم بات سمجھتی نہیں۔ اپنی ہی کہے جاتی ہو۔ بیٹے کے بیاہ میں خانصاحب اگر پورا نہ خرچ کرتے تو لوگ انہیں کیا کہتے؟ سب جانتے ہیں کہ خانصاحب بڑے آدمی ہیں۔ روپے والے ہیں۔ بڑے آدمیوں کی ایک عزت ہوتی ہے اُسے نبھانے کے لئے انہیں خرچ کرنا ضروری ہے ورنہ اُن کی بڑی بدنامی ہو۔ ہم اگر شادی بیاہ میں کسی کو نہ بلائیں تو کوئی الزام نہ دے گا۔ لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنا پیسہ ہی نہیں ہے۔ لیکن خانصاحب اگر کسی کو نہ بلاتے تو لوگ انہیں طعنے دے دیکر اُلو کر دیتے۔ سمجھیں اصل بات یہ ہے"

بدھنی :- "ہونگی۔ کیا آج سوؤ گے نہیں۔ ابھی تو سردی لگ رہی تھی اب خانصاحب کی تعریف میں یہ باتیں کیسے نکلنے لگیں"

یہ غریب میاں بیوی اسی طرح کی باتیں کرتے کرتے سو گئے

جمن ادھیڑ عمر کا ایک مزدور تھا۔ دن بھر محنت کرتا تو پانچ آنے پیسے ملتے وہ بھی کام ملنے پر، ورنہ دو دو دو دن ایک پیسہ نہ میسر ہوتا۔ دو میاں بیوی اور تین بچوں کی پرورش۔ اس پر ہر ماہ ایک روپیہ کوٹھری کا کرایہ۔ مشکل سے یہ بیچارے جسم وجان کا رابطہ قائم رکھ سکتے تھے۔ سردی کڑاکے کی تھی لیکن دو پرانے ٹاٹ اور ایک بوسیدہ کہنہ رضائی کے سوا جس میں مختلف رنگوں کے پیوند شام کے گدلے آسمان پر شفق کی رنگا رنگی کی مضحکہ خیز نقالی کر رہے تھے، اُن کے پاس کوئی دوسرا اوڑھنا نہ تھا۔ کوٹھڑی دس فٹ مربع سے زیادہ نہ ہوگی۔ اسی میں ایک طرف ایک گردے اٹی ہوئی چٹائی پڑی تھی جس پر سارا خاندان سویا کرتا تھا۔ دوسری طرف ایک چولھا بنا ہوا تھا جس کے دھوئیں نے سامنے کی دیوار اور چھت پر آبنوس کا ٹوٹا ہوا رنگ چڑھا دیا تھا جس کا ڈھکنا قبضوں کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ اسی پر کچھ ٹوٹی پھوٹی تامچینی کی رکابیاں اور چند پیالے رکھے تھے۔ جنہیں جستی ٹھیکرے سے اب لوہے کے کہنا بہتر ہوگا۔ دوسرے کونے میں مدھم

نہ رہی۔ ایک فطری فنکار تعلیم و تربیت کا محتاج نہیں ہوتا۔ ہاں اُسے ضرورت صرف ایک ایسے ماحول کی ہے جو اُس کی صلاحیتوں کو متحرک کرکے ان کے اظہار میں معاون ہو۔ دُنیا کا کوئی مایۂ ناز آرٹسٹ کسی فنی ادارہ یا تعلیم گاہ نے پیدا نہیں کیا بلکہ عموماً اُس کی فنکاری سے دُنیا دفعتاً آشنا ہوئی۔ مرزا خود کوئی باکمال مصوّر نہ تھا لیکن اسے آرٹ کی تمیز ضرور تھی۔ باقر کی غیر معمولی صلاحیت اس کی مرکز توجہ بن گئی اور اس نے ایک خاص مقصد کے تحت باقر کو اسکی صلاحیتوں کی نشو و نما میں پوری امداد پہونچانی شروع کر دی۔ اس نے اپنے برش اور رنگ باقر کے لئے وقف کر دیے۔ اگرچہ اپنے اس تاثر کا اظہار باقر پر کبھی ہونے نہ دیا۔ باقر کی بنائی ہوئی تصویروں پر اس کے سامنے وہ صرف مُسکرا دیا کرتا جس طرح بچے جب اپنے سے بڑوں کی حرکات و سکنات کی ناکام نقالی کرتے ہیں تو بڑے ان پر ہنس دیا کرتے ہیں۔ لیکن باقر کی عدم موجودگی پر وہ ان پر عش عش کرتا اور اس خیال کے تصوّر سے خوش ہوتا کہ باقر کے کمال سے وہ ایک دن فائدہ اُٹھا سکے گا۔

مرزا کی تصویر مکمل ہو گئی اور اب اُسے باقر کی ضرورت نہ رہی۔ اس لئے اُس نے باقر کو ایک دن نہایت ہمدردانہ مشورہ دیا کہ اُسے اپنے باپ کے روزگار میں لگ جانا چاہیئے تاکہ وہ مزدوری کے کاموں میں پورا مشاق ہو سکے اور جوان ہو کر اُسے بے روزگاری کا مُنہ نہ دیکھنا پڑے۔ اس مُشفقانہ تمہید کے ساتھ انہوں نے باقر کو اپنی ملازمت سے علیٰحدہ کر دیا لیکن ساتھ ہی اُسے اجازت دیدی کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں ان کے یہاں پر آیا کرے اور ان کے مصوّری کے سامان سے دل بہلایا کرے۔ باقر اس سے زیادہ کچھ نہ چاہتا تھا۔ تصویر بنانے سے اُسے کوئی فائدہ تھا یا نہیں باقر کو نہ اس کا علم تھا نہ اس کی پروا۔ وہ تصویر صرف اس لئے بناتا تھا کہ تصویر بنانے میں اس کا جی ہر دوسرے کام سے کہیں زیادہ لگتا تھا اور اس دوران میں جو لطف و انبساط اُسے حاصل ہوتا کسی دوسرے کام میں اُسے میسّر نہ ہوتا تھا۔ یہ مسرت ہی اس کا انعام تھا اور ایک باکمال آرٹسٹ کی طرح وہ اس سے [illegible] بے نیاز تھا۔ تصویریں بنا کر وہ انہیں مرزا کے اسٹوڈیو [illegible] اور پھر انہیں اُلٹ کر بھی نہ دیکھتا اس لئے کہ اس کا [illegible] [illegible] بے چین رکھتا [illegible] آرٹ کی قدر

نہیں ہوتی۔ اس کا آرٹ اُس کی تخلیقی فطرت کا اظہار ہوا کرتا ہے جو ہمیشہ مشتعل و تشنۂ تسکین رہتی ہے، اس لئے اگر وہ اپنے آرٹ کی تکمیل کے بعد اس سے حظ اُٹھانے میں اپنا وقت گنوانے لگے تو اُس کی اس فطرت سیال کا عمل رُک رُک کر ہونے لگے، جو قطعاً نا ممکن ہے۔ یا اگر وہ اپنے آرٹ کو اپنا کمالِ فن تصوّر کرے تو اس کی اس فطرت کی نمو دکی کوشش پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے اور اس کی تسکین اس کی آرٹ کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ اپنے آرٹ کی قدر شناسی صرف ایک ادنیٰ درجے کا آرٹسٹ کر سکتا ہے جس کی فنی صلاحیت فطری نہیں بلکہ صرف اکتسابی ہوا کرتی ہو۔

مرزا نے باقر کو اپنی ملازمت سے صرف اس لئے برطرف کیا تھا کہ وہ اپنی سوسائٹی سے علیٰحدہ نہ ہو جائے اور اُس کی سافلی دبے حسی جہالت و کم نگاہی کے دھبّوں سے پاک ہو کر مرزا کا حریف نہ بن سکے اور اسے اس طرح اپنے مقاصد کے حصول میں ناکامیابی نہ ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ باقر اسی تاریکی و محرومی کا شکار رہے جو اس طبقہ کا طرۂ امتیاز ہے جس میں وہ پرورش پا رہا تھا وہ کبھی اس طبقۂ اعلیٰ کا آلہ کار بنا رہے۔ باقر فرصت کے اوقات مرزا کے اسٹوڈیو میں گذارا کرتا۔ اس کی تصویروں کے موضوع عموماً اس کے اپنے ماحول سے منتخب کردہ ہوتے۔ وہ ایک فقیر کی تصویر بنا رہا تھا جو ہر روز شام کو مرزا کی دوکان کے سامنے سے گزرا کرتا تھا۔ مرزا بےچینی سے تصویر کی تکمیل کا منتظر تھا یہانتک کہ تصویر مکمل ہو گئی۔

"یہ کیا تم نے اس بڈھے کی تصویر بنائی ہے؟ اسی سے ملتی ہوئی معلوم ہوتی ہے؟"

تصویر کو دیکھتے ہوئے مرزا نے بناوٹی الفاظ میں باقر سے یہ سوال کیا۔ باقر کو اتنی تمیز کہاں تھی کہ مرزا کی گفتگو کا کھوکھلا پن اس پر ظاہر ہو سکتا۔

"جی ہاں" اس نے بے اثری سے جواب دیا۔ اور تصویر پر آخری برش پھیرنے لگا۔ مرزا تصویر کے فنی کمال سے خود تصویر حیرت بن رہا تھا۔ تصویر میں زندگی کی جھلک تھی۔ حیات کی [illegible] بڈھا فقیر دست سوال بڑھائے اپنے لبوں کو تصویر میں [illegible] دیتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مرزا کی اپنی بنائی ہوئی تصویر خود اس کی نظروں میں ادنیٰ معلوم ہونے لگی۔ "میری تصویر کیا خاک [illegible] حاصل کر سکے گی۔ تصویر ایسے کہتے ہیں" اس نے [illegible]

بجائے اپنی تصویر کے باقر کی بنائی ہوئی تصویر کو نمائش میں بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

مرزا کی تصویر "بڈھا فقیر" نمائش کے مقابلے میں اول قرار دی گئی مرزا کو پانچ ہزار روپے انعام میں ملے۔ لیکن ان میں سے ایک پیسہ بھی باقر کا حصّہ نہ تھا۔ مرزا کا نام سارے ہندوستان میں ایک باکمال مصوّر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ آرٹ کے رسالوں نے اس کی تعریف میں لمبی لمبی تحریریں شائع کیں لیکن ان میں کا ایک لفظ بھی باقر کیلئے نہ تھا۔ کیوں ہوتا؟ باقر ایک ادنیٰ طبقے کا فرد ہو کر اس تحسین و ستائش کا اہل کیونکر ہو سکتا تھا! کیا عجب تھا کہ یہ تصویر اگر نمائش میں باقر کے نام سے جاتی تو قبل اس کے کہ صحیح تنقیدی نگاہیں اس پر پڑ سکتیں یہ نمائش میں رکھے جانے کے قابل ہی نہ قرار دی جاتی۔ ایک نیچ طبقہ کے انسان کو آرٹ سے کیا واسطہ۔ اس کا کام تو اعلیٰ طبقے والوں کی ادنیٰ ضروریات بہم پہونچانا ہے۔ اپنی بلند مصروفیتوں کے سامان وہ خود مہیا کر لیں گے۔

مرزا اسی طرح باقر کی بنائی ہوئی تصویریں نمائشوں میں بھیج بھیجکر دولت و شہرت کے انبار جمع کر رہا تھا اور باقر ایک غریب مزدور کی حیثیت سے تنگ حالی و عسرت کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا باپ دفعتاً ہیضہ سے مر گیا اور خاندان کا سارا بوجھ باقر کے سر پڑ گیا۔ زندگی کا بوجھ اس کی بڑھتی ہوئی جوانی کو دبائے جا رہا تھا۔ اُس کی بوڑھی ماں زیادہ دنوں تک اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ اس کے مرنے کے بعد اسکا خاندان منتشر ہو گیا۔ اس کے چھوٹے بھائی روزگار کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکل گئے۔ عام کساد بازاری نے سارے روزگار ماند کر دیتے تھے۔ کئی مہینوں کوئی کام نہ ملتا۔ خانصاحب کا کرایہ کئی ماہ کا دینا تھا۔ وہ برابر کوٹھڑی خالی کر دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ آخر ایک دن انھوں نے اسے کوٹھڑی سے نکلوا دیا۔ باقر نے بچپن سے زندگی اسی کوٹھڑی میں گذاری تھی۔ کوٹھڑی کی مفارقت اُسے بہت شاق تھی لیکن مجبور تھا۔ بے یار و مددگار کوٹھڑی سے نکل گیا۔ سامان جو کچھ تھا خانصاحب کے آدمیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ باقر مہینوں سے بیروزگاری سے گھبرایا ہوا تھا اور برابر شہر چھوڑکر کلکتہ جانیکو سوچتا تھا۔ اس وقت وہ قطعاً آزاد تھا۔ لیکن اس کے پاس ٹکٹ کو پیسہ نہ تھا۔ اس نے سوچا کہ مرزا سے سوال کرے لیکن وہ جانتا تھا کہ مرزا اسے اتنے روپے تو نہ دیگا کہ ٹکٹ کو کافی ہوں۔ اسلئے اُس نے بے ٹکٹ کلکتہ پہونچنے کا فیصلہ کر لیا اور اسٹیشن پہونچکر چپکے سے ریل کے ڈبے میں گھس گیا۔

گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہوئی کہ ایک ٹکٹ انسپکٹر ڈبہ میں داخل ہوا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی باقر کا خون خشک ہو گیا۔ انسپکٹر سبکے ٹکٹ جانچتا اس کے قریب بھی پہونچا اور اس سے ٹکٹ طلب کیا۔ اُسنے نظریں نیچی کئے ہوئے کہا "میرے پاس ٹکٹ کو پیسہ نہ تھا" وہ خوف سے سہما ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ ملزم قرار دیا جا رہا تھا۔

"تو پھر گاڑی کیا تمہارے باوا کی ہے جو بے ٹکٹ چڑھ گئے۔ اُلّو کا پٹھا۔ تم ہمارے ساتھ چلو" ٹکٹ انسپکٹر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ بلاشبہ اس کے غیظ و غضب کے اظہار کا یہ نہایت مناسب موقع تھا! اس ننگے بدن والے کمینہ انسان نے حرکت ہی ایسی کی تھی! خواہ واقعات نے اُسے مجبور ہی کیوں نہ کر دیا تھا۔ اور پھر جرم و گناہ تو اس طبقہ کا پیشہ ہے۔ انہیں قرار واجب سزا دینا طبقہ اعلیٰ کا کام ہے ورنہ عامتہ الناس کے امن و امان میں خلل پڑ جائے۔ طبقہ اعلیٰ کا یہ احسان ہے کہ اُس نے اپنے اوپر یہ ذمہ داری لے رکھی ہے۔ بلاشبہ لغزشیں طبقہ اعلیٰ کے افراد سے بھی ہوتی ہیں لیکن اُن کی لغزشیں جُرم نہیں کہی جا سکتیں اور نہ قانون و انصاف کا ان پر اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر انہیں اپنے عمل و کردار میں آزادی نہ ہو تو وہ طبقہ ادنیٰ میں مسخ ہو جائیں اور پھر ان کی گرفت کرنے والا کوئی نہ رہے۔ غالباً اسی نظریہ کے تحت انسپکٹر غریب مسافروں سے نہایت سختی سے پیش آتا اور ان کے معاملے میں ریلوے ایکٹ کے دفعات کی حرف بحرف پیروی کرتا۔ ان کو اپنے کردار کی سزا ضرور بھگتنی چاہیئے! لیکن وہ خود کو کسی اخلاقی پابندی سے آزاد سمجھتا تھا۔ اس لئے تاجروں سے رشوت اور ریلوے پارسل کے سامان کی چوری میں اُسے کبھی کوئی تامل نہ ہوتا۔

باقر نے کوئی مزاحمت نہ کی اور انسپکٹر کے ساتھ ریل کے ڈبہ سے اتر گیا۔ وہ ریلوے پولس کے حوالے کر دیا گیا۔ انھوں نے اُسے حوالات میں بند کر دیا۔ سچ مچ اس نے بے ٹکٹ ریل میں چڑھ جانے میں ایک بڑے جُرم کا ارتکاب کیا تھا۔ لیکن کیا اُسنے اپنی ضروریات سے مجبور ہو کر ایسا نہ کیا تھا؟ کیا اس نے یہ حرکت فاقہ کشی سے نجات پانے کے لئے نہ کی تھی؟ پھر اس پر رحم کیوں نہ کیا گیا؟ وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔

ریلوے قانون کے مطابق باقر کو چھ ماہ کی سزا ہو گئی۔ قیدیوں کے ساتھ کی زندگی میں شروع شروع میں اسے کچھ الجھن معلوم ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہو گیا۔ اس کے گرد یہاں مختلف طور کے انسان تھے لیکن زیادہ تر ایسے جن کا تعلق اس کے طبقہ سے تھا۔ یہ سب زندگی تو رکھتے تھے لیکن ان میں زندگی کی کوئی علامت نہ تھی۔ ان پر عجیب بے حسی و جمود کی کیفیت تھی۔ اس طرح کی بے حسی جیسی اس تیراک کو ہوتی ہے جو موجوں سے جھگڑ کر تھک جاتا ہے اور بیہوش و ساکت کنارہ پر لایا جاتا ہے۔ اس کا دماغ معطل ہو جاتا ہے اور اس کے حواس مردہ۔ نہ اسے اپنی اس حالت کا کوئی احساس رہتا ہے نہ اس کشاکش کی یاد جس میں وہ مبتلا تھا۔ صرف سانس کی آمد و رفت اور قلب کی حرکت سے اس کی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بھی نہ کچھ سوچ سکتے تھے نہ کچھ سمجھ سکتے۔ نہ یہ کبھی اس پر غور کرتے کہ وہ کیوں جرائم کے مرتکب ہوئے۔ نہ اس پر کہ ان کی سزائیں کس حد تک حق بجانب تھیں۔ قید خانہ کی زندگی میں ان کے لئے کوئی تلخی نہ تھی۔ وہ یہاں بھی ویسی ہی بیفکری کی نیند سوتے جیسی انہیں قید خانے سے باہر میسر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان کی زندگی کے دو لازمی حصے ہیں۔ ایک وہ جس میں وہ جرائم کرتے اور دوسرا وہ جس میں وہ سزا بھگتتے۔ ان کی زندگی کا نہ کوئی نصب العین تھا نہ کوئی مقصود۔ وہ جرائم کے مرتکب اس لئے نہیں ہوتے تھے کہ انکے ذریعے مال و دولت جمع کر لیں بلکہ اس لئے کہ ان کے جرائم ہی انہیں مصروفِ عمل رکھ سکتے تھے۔ ان کے سامنے کبھی کبھی ایک خاص لائحہ عمل تھا جس کے حصول کی ناکام کاوشوں نے انہیں تھکا کر چور کر دیا تھا۔ وہ بھی کبھی اپنی زندگی کے سیلاب سے ابھر کر باہر نکلنے کی کوششوں میں سرگرم تھے۔ ان کی کاوشیں بارہا کامیاب ہوتی نظر آئیں۔ ان کے ہاتھ کنارے کو کئی بار چھو چکے تھے لیکن وہ نکلنا ہی چاہتے تھے کہ کنارے والے بجائے ان کا ہاتھ پکڑنے کے انہیں دھکے دے کر پھر موجوں کے منہ میں گرا دیتے۔ یہاں تک کہ ان کی مقابلے کی ساری طاقتیں زائل ہو گئیں۔ ان کے دل و دماغ قطعاً معطل ہو گئے۔ وہ بہائم کی سی زندگی گزارنے لگے۔ نیک و بد کی تمیز کی ان میں صلاحیت نہ رہی بلکہ بدی کا ان پر تسلط قائم ہو گیا اور ان کے ذوقِ عمل کی تسکین مذہب و اخلاق کی بنا کردہ اصولوں کی توہین سے ہونے لگی۔ انکی گفتگو کا مرکز محور ان کے اپنے جرائم کے کارنامے ہوا کرتے بلکہ ان کو تاجیوں پر تبصرہ جن کی وجہ سے ان کے جرائم کا سراغ مل گیا اور انہیں اسیری نصیب ہوئیں۔ وہ ان بے احتیاطیوں سے

آئندہ محتاط رہنے کا عہد کرتے۔ نو آموز مجرم دوسرے کہنہ مشق جرائم پیشہ استادوں کے شاہکار ان کی زبانی سنکر ان سے استفادہ حاصل کرتے۔ باقر کو ان کی سنسنی خیز داستانیں دلچسپ ضرور معلوم ہوتیں لیکن اس کی نشو و نما ایک ایسے معصوم ماحول میں ہوئی تھی کہ انکے ہم پیشہ ہونے کا خیال تک کبھی اس کے دماغ میں جگہ نہ پاتا گو یہ وہ اسے طرح طرح سے اس کی ترغیب دیا کرتے۔ اکثر جب وہ ان کی بے ربط گفتگو سے تھک جاتا تو ان سے علیحدہ ہو کر ایک تنکا ہاتھ میں اٹھا لیتا اور زمین پر مختلف نقش و نگار بنانے لگتا۔ اس وقت وہ اپنے ماحول کو قطعاً بھول جاتا اور ذہنی طور پر مرزا کے اسٹوڈیو میں منتقل ہو جاتا۔ زمین پر وہ اسی سرگرمی و انہماک سے تصویریں بنانے لگتا جس طرح وہ اسٹوڈیو میں بنایا کرتا تھا۔ رنگ اور کینوس سے محرومی کا اسے احساس تک نہ ہوتا۔ اس کا تخیلہ طرح طرح کے رنگ اس کے سامنے پیش کرتا۔ اسٹوڈیو کے رنگوں سے کہیں زیادہ اقسام کے۔ اور وہ زمین کے پھیلے ہوئے کینوس پر اپنے جذبۂ تخلیق کی پوری تسکین کرتا رہتا۔ ایک فطری فنکار کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار میں کامل آزادی حاصل ہے اس لئے کہ وہ اپنے گرد و نواح سے بے نیاز ہو کر بھی انہیں بروئے کار لا سکتا ہے۔ اس کی فنکاری اسکی اپنی تسکین کے لئے ہوتی ہے نہ کہ دوسروں سے دادِ تحسین طلب کرنیکے لئے۔ پھر اسے کوئی حاجت نہیں کہ اپنی فن کاری کا اظہار مادی طور پر کرے۔ دوسرے قیدی زمین پر لکیریں کھینچتے دیکھکر اسے کچھ خبطی سا سمجھنے لگے تھے۔ وہ اکثر اس کی مشغولیت میں مخل ہو جاتے۔ کبھی اسے کھینچ کر اپنے ہجوم میں لے آتے۔ اس وقت اس کی روح کو سخت اذیت ہوتی اور اس کا بے رنگ اور اداس چہرہ اس کیفیت کی ترجمانی کرنے لگتا لیکن قیدیوں کو اس کی تمیز کہاں ہوتی۔ وہ طرح طرح سے اس کا مذاق اڑانے لگتے اور باقر اپنی مجبوری اپنے دل میں چھپائے رہ جاتا۔

قیدیوں میں ایک سے باقر کی دوستی ہو گئی تھی۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو حالتِ نشہ میں جرم کا مرتکب ہو کر ایک سال سے قید بھگت رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ خاموش رہتا اور مجبوراً جس سے بات کرتا دیتا رہتا۔ جیسے اس کی روح اس سے چھین لی گئی ہو۔ وہ اکثر بیچارگی کا بیہین ہو جاتا جب شیشہ کی پری اسے دور سے اپنی طرف بلاتی ہوئی اور پھر دفعتاً اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ وہ کچھ بڑبڑانے لگتا اور دانت پیستا ہوا اپنی گردن کو زور سے جنبش دیتا جیسے وہ کسی کا ناچ کر رہا ہو۔ باقر جب دوسرے قیدیوں کی ہنگامہ پروری سے تنگ

اُکتا جاتا تو اُس کے پاس آکر بیٹھ جاتا اور اسی سے باتیں کرنے لگتا۔ اس کی گفتگو اس کے اپنے خانگی واقعات اور تعلقات کے بارے میں ہوا کرتی۔ باقر کیلئے اس میں زیادہ دلکشی کا سامان تھا اس لئے کہ اس کے ماں باپ بھی اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ بچوں کی طرح غور سے اس کی باتیں سُنا کرتا جیسے اس کا باپ اس سے بول رہا ہو اور دوسرے قیدیوں سے زیادہ اُس سے اُنس و محبت رکھتا۔

مرزا کے پاس بین الاقوامی نمائش کا اعلان آیا ہے۔ اور ساتھ ہی ہندوستانی آرٹ کمیٹی کی طرف سے ایک چٹھی۔ کمیٹی کو یقین کامل تھا کہ بین الاقوامی نمائش میں مرزا ہندوستان کا سکہ جما دینگے۔ نمائش میں ابھی ایک سال باقی تھا۔ مرزا اعلان پڑھکر بہت خوش ہوا "وہ بہت جلد بین الاقوامی مصور کی حیثیت حاصل کرلے گا۔" باقر کی تصویریں کہیں بھی ذب نہیں سکتیں" وہ اس خیال کے تصور سے غایت درجہ مسرور ہو رہا تھا لیکن اس کے دماغ کی پھیلی ہوئی روشنی میں جسے آئندہ کے سنہرے خواب نے چمکا دیا تھا ایک دھندلی سیاہی کی لکیر بھی تھی۔ اس کی کامیابی کا انحصار اُس کے اپنے کمال پر نہ تھا۔ اسکے چہرے پر مسرت کی تابانی کے ساتھ اپنی بے مائگی کا کھسیانہ پن بھی شامل ہو رہا تھا۔ آج وہ باقر کا بے چینی سے منتظر تھا۔ باقر ایک ہفتہ سے اُسکے یہاں نہ آیا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی طویل وقفہ تھا۔ شام تک مرزا اُسکی راہ دیکھتا رہا۔ اُسے کچھ تشویش سی پیدا ہونے لگی۔ رات کو اُسے چین کی نیند نہ آئی۔ اُسے رہ رہ کر ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی شہرت کا پودا الگ کر دیا جانے والا ہے۔ صبح سویرے اس نے ایک آدمی باقر کا پتہ لگانے خانصاحب کے کٹرہ بھیجا۔ لیکن اُسے باقر کا کوئی نشان نہ مل سکا۔ اس کی رپورٹ سنکر مرزا کے حواس گم ہو گئے۔ "کیا اس کی مصوری کی شاندار زندگی تمام ہونیوالی ہے۔ نہیں ابھی باقر کو ڈھونڈھکر رہیگا۔ لیکن وہ کھلم کھلا اسکی تلاش کیونکر کرسکتا ہے؟" اس کا گنہگار دل اُسے ڈرانے لگا۔ لوگوں کو شک نہ پیدا ہو جائے گا؟ پھر وہ اپنی سرگرمی تلاش کی وجہ کیا بتائے گا؟ ظاہراً باقر کا تعلق اس سے نہایت ادنیٰ ہے۔ ایک برطرف ملازم کیلئے آقا کی اتنی تشویش کیا مشتبہ نگاہوں سے نہ دیکھی جائیگی؟ اس کے دماغ میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے۔ اپنا چھوٹا پن کا احساس اُسے کاٹنے لگا۔ دوسروں کی کوششوں سے فائدہ اٹھانے کا انجام کار اسے نظر آنے لگا۔ "اس کا طبقہ کس درجہ مجبور ہے گرچہ اب تک وہ یہ سمجھتا رہا تھا کہ غربا ہی اسکے دست کرم کے محتاج ہیں۔ لیکن یہ نظریہ کتنا بے معنی اور کھوکھلا ہے۔ طبقہ اعلیٰ کا سارا اقتدار بلکہ اس کی زندگی طبقہ ادنیٰ کی کاوشوں پر منحصر ہے۔ آج وہ اگر اپنی نظریں پھیرلیں اور اپنے جسم و جان طبقہ اعلیٰ کی نفسانیت کی پرورش کے لئے وقف نہ کردیں تو طبقہ اعلیٰ کی اونچی اونچی عالیشان عمارتیں خاک میں ملجائیں۔"

مرزا کی نظروں کے سامنے وہ بھیانک زمانہ پھرنے لگا جب غریب امیر سے باغی ہو کر انہیں ذلیل کتوں کی طرح ٹھکراتے پھرینگے اور امیروں کو دُنیا کے کسی کونے میں پناہ نہ مل سکے گی۔ اس کا سارا بدن کانپ اٹھا۔ "اُف اس کے طبقہ کا مستقبل کتنا خوفناک ہے۔" اسے باقر سے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ اُس کا ضمیر اُس کی گزشتہ بے اعتنائیوں کی مکافات کر رہا تھا۔

"باقر کو صرف تصویر کی خاطر تلاش نہیں کرونگا بلکہ اُس کی حالت سُدھارنے کی غرض سے بھی۔" اس خیال سے اپنے اس ارادے میں ایک نیا استحکام محسوس کیا۔ نیکی کے خیال میں ایک زبردست اندرونی قوت ہے جو ہر بیرونی طاقت کا مقابلہ کرسکتی ہے بدی کا احساس ہی انسان کی رُوح کو کمزور اور بودہ بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے کو ہر طرح کی آفات میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور انہیں کے ناکام مقابلے میں اس کی زندگی تمام ہو جاتی ہے۔

باقر کی قید کی میعاد ختم ہو گئی۔ اس کا شرابی دوست بھی اُسی کے ساتھ رہا ہوا۔ قیدخانہ سے نکل کر وہ دونوں تلاش معاش میں سرگرداں اِدھر اُدھر کی خاک چھانتے پھرتے۔ کچھ محنت مزدوری کرکے یہ کسی طرح اپنا پیٹ پال لیتے تھے۔ جب سے قید سے انہیں آزادی نصیب ہوئی تھی یہ دونوں کلکتہ جانے کی فکر میں تھے لیکن کبھی اُن کے پاس اتنے پیسے نہ ہوتے کہ ریل سے جاسکیں۔ چنانچہ خانہ بدوشوں کی طرح یہ کسی طرح محنت مزدوری کرتے مہینوں میں کلکتہ پہونچ گئے۔ اس کے شرابی دوست نے پھر آہستہ آہستہ شراب شروع کردی۔ اپنی کمائی کا حصہ وہ شراب کی نذر کر دیتا۔ باقر بھی اس تنہا دُنیا میں اس کی رفاقت کی قدر کرتا اور اپنے ہی پیسے سے اُسے بھی کھلاتا۔ اس کا دوست اُسے بھی شراب کا عادی بنانا چاہتا تھا۔ شرابی فطرتاً نہایت فیاض ہوتا ہے۔ وہ کبھی تنہا [illegible] نہیں کرتا۔ باقر نے جب کبھی دو ایک جام [illegible] خاطر پی [illegible] عجیب

کیفیت محسوس ہوتی۔ ایک عالم محویت جس نے اسے تھوڑی دیر کے لئے تفکرات سے قطعاً بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول جاتا اپنی بدحالی، اپنے عزیزوں کا غم، اپنے وطن کی مفارقت۔ وہ اس سرشاری کے عالم میں اپنی انگلی کے قلم سے فضا کے پھیلے ہوئے کینوس پر تصویریں بنانے لگتا۔ اپنی فنکاری کے شاہکار۔ اور جھومتا رہتا۔ وہ رفتہ رفتہ بہت زیادہ پینے لگا۔ نشہ کی کیفیت اس کی روح کی بے چینی کو دور کر دیتی۔ کمائی کا پیسہ وہ زیادہ تر شراب پینے میں اڑا دیتا۔ پیٹ بھر کھانا نہ ملنے کی وجہ سے وہ دن بدن سوکھا جا رہا تھا۔ لیکن شراب اس سے نہ چھوٹ سکتی تھی۔ کیسے چھوٹ سکتی؟ کون ان لمحات سے محروم ہونا پسند کرتا ہے۔ جن میں وہ زندگی کے شیریں خواب دیکھ رہا ہو۔ کیا ہم اسی عالم سرشاری کے متلاشی نہیں جو ہمیں زندگی کی ادھیڑ بن سے بے نیاز کر کے ہمارے دماغ کی ساری الجھنیں دور کرا دے۔ کیا وہ عالم طمانیت اور روحانی انبساط جس کے حصول کا مذہب واخلاق درس دے رہے ہیں۔ اسی قسم کی گم گشتی وخود فراموشی نہیں ہے جسے ہم نشہ کہتے ہیں؟ یہ بھی ہمیں اپنے ماحول سے مستغنی بنانے کا پیغام دیتے ہیں۔ ورنہ زندگی کی کشاکش کا سلسلہ تو لامتناہی ہے۔ پھر یہ طمانیت اور انبساط اسی طرح کی محویت ومغالطہ نہیں جو نشہ میں چھائی ہوتی ہے تو اور کیا ہے ——؟

مرزا کو خانصاحب کے کٹڑے کے کرایہ داروں سے اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ باقر کی طبیعت کچھ دنوں سے وہاں سے اچاٹ ہو رہی تھی اور وہ اکثر ان سے کلکتہ چلے جانے کے قصد کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس لئے وہ ضرور کلکتہ ہی میں ہوگا۔ اسے یہ بات ٹھیک سی معلوم ہوئی اس لئے کہ ہر مزدور اپنا مستقبل سدھارنے کے لئے کلکتہ جانے کی خواہش ضرور رکھتا ہے۔ چنانچہ مرزا کلکتہ پہونچکر سرگرمی سے باقر کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔ وہ ہر گلی کوچہ میں موٹر لئے مارا مارا پھرتا۔ لیکن باقر کا کوئی نشان نہ ملا۔ کلکتہ کی ہنگامہ پرور اور نظر فریب زندگی اسے دلچسپ معلوم ہونے لگی۔ اس کے پاس روپے کافی تھے۔ وہ کلکتہ میں زندگی گذار سکتا تھا۔ ساتھ ہی یہ خیال اسے کلکتہ سے علیحدہ نہ ہونے دیتا کہ شاید کبھی باقر کا سراغ مل جائے۔

باقر نشہ میں چور ہو بازار سے گذر رہا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ کہنی سے اوپر تک ہوا میں جھومتا معلوم ہوتا تھا۔ سوائے شہادت کی انگلی کے جو سیدھی ہو رہی تھی باقی انگلیوں کی مٹھی بندھی ہوئی تھی اس کی یہ اٹھی ہوئی انگلی بھی ہاتھ کی جنبش کے ساتھ حرکت کر رہی تھی اس کی آنکھیں بہت زیادہ پھیلی ہوئی تھیں جیسے کسی چیز کو غور سے دیکھ رہا ہو اور چہرے پر خوشی وطمانیت کی جھلک تھی جو کسی طرح اس کے پچکے ہوئے گالوں کو زیب نہیں دیتی تھی۔ وہ اسی محویت کے عالم میں فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ سامنے سے ایک موٹر تیزی سے اس کی طرف ہارن کی آواز دیتی ہوئی آئی لیکن اس کی بیخودی کا سلسلہ نہ ٹوٹ سکا۔ موٹر کے ایک دھکے نے اسے فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔ موٹر رکی، تماشائیوں کا ہجوم ہو گیا۔ موٹر کا سوار باقر کے قریب رسمی ہمدردی کی خاطر آیا۔ باقر کا جسم لہولہان ہو رہا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور وہ چند منٹ کا مہمان تھا۔ مرزا نے باقر کے تڑپتے جسم کو پہچان لیا۔ اف جس کی جستجو میں وہ اسقدر سرگرداں تھا اسی کی موٹر کا دھکا کھا کر اسکی تلاش کی سرگرمی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر چکا تھا۔ مرزا کا سر چکرا نیلگا اسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، وہ وہاں ٹھہر نہ سکا۔ موٹر میں بیٹھکر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اور اس طرح دنیا کا ایک

سید محمد محسن۔ ایم۔ اے

نقد و تبصرہ

دلّی کی آخری بہار - یہ مصورِ غم علامہ راشد الخیری دہلوی مرحوم کی تصنیف ہے۔ اسکی قیمت ایک روپیہ (عہ) ہے۔ عصمت بکڈپو دہلی سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

علامہ راشد الخیری مرحوم اردو کے مشہور انشا پرداز تھے اور اُن کی کم و بیش سو کتابیں اُن کا نام اُس وقت تک زندہ رکھیں گی جب تک اردو زبان زندہ رہیگی۔ علامہ مرحوم ایک نہایت دلکش اسٹائل کے مالک تھے جو صرف انہی کے لیے مخصوص تھا اور انہی کے ساتھ ختم بھی ہوا۔ مولانا کی طرزِ نگارش میں ادب و انشا کی وہ تمام خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں جو اردو کے کئی انشا پردازوں میں علیحدہ علیحدہ نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا آزاد، ان سب کا لکھنے کا ڈھنگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہے۔ علامہ راشد الخیری کے طرزِ تحریر میں ان تینوں اُستادوں کا عکسِ تحریر موجود ہے۔ اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا نذیر احمد اور مولانا حالی علامہ مرحوم کے اُستاد تھے، اور مولانا آزاد کی صحبت سے مستفیض ہونے کے مرحوم کو اکثر مواقع ملے۔ بس انہی باکمال لکھنے والوں کے خصائصِ قلمی علامہ کی تحریر میں رس بس گئے اور اس طرح وہ اسٹائل وجود میں آیا جو علامہ مرحوم کے نام کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے گا۔ "دلّی کی آخری بہار" مولانا کے انتقال کے بعد شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ۲۵ مضمون ہیں! (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ان مضامین میں دلّی کی وہ تہذیب پیش کی گئی ہے جو ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دلّی کا سُہاگ لُٹ چکا تھا۔ تعلقات کا ہرا بھرا باغ اپنی آخری بہار دکھلا رہا تھا مگر اُجڑے دیار کے اس آخری دَور میں بھی وضعداری کی نہریں لہریں لے رہی تھیں اور صداقت کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ دلّی کی حکومت بدلی، تہذیب بدلی، زبان بدلی، معاشرت بدلی، غرض آسمان بدلا، زمین بدلی۔ علامہ مغفور کی طبیعت پہ اس انقلاب کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اور انہوں نے جہان آباد کے دورِ گزشتہ کی بہار دکھا کر اپنے ساتھ ہزاروں دردمند دلوں کو تڑپایا۔ انہی عبرتناک مضامین کا یہ مجموعہ ہے۔ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ حال ماضی کو دفن کر دیتا ہے اور مستقبل حال کو بھی دفن کر دیتا ہے۔ یہی زمانے کی ریت ہے، بس ع۔ ہمیشہ ہے نام اللہ کا۔

محمدی بوا - یہ مرزا فہیم بیگ چغتائی کی تصنیف ہے اور انہی کی حکایتِ زندگی بھی ہے۔ یہ مختصر سی کتاب بالکل نئی طرز میں لکھی گئی ہے۔ چار سال کا بچہ جب ہوش سنبھالتا ہے تو کس نظر سے ہر ہونے والی بات کو دیکھتا ہے؟ اور اس کے ننھے سے دل و دماغ میں اثر و تاثر کی کیا کیا کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ پھر جب ذرا اور بڑھ جاتا ہے تو اس کے کوائفِ ذہنی کی کیا حالت ہوتی ہے؟ بچے ہی کی زبانی ان سب باتوں کو کہلوایا گیا ہے جس کی وجہ سے پیرایۂ بیان اچھوتا اور دلکش ہو گیا ہے۔ ایسے بیان کیلئے بچوں کی نفسیات کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے، مثلاً:-

"جگمگ جگمگ جگمگاتا آفتاب نکلا۔ اس کی اُجلی اُجلی کرنیں نیم کی ڈالیوں میں سے چھن چھن کر انگنائی میں بکھر گئیں۔ وہ یہی آفتاب تھا جو اَب بھی روزانہ نکلا کرتا ہے۔ اب نہ جانے کیا ہو گیا۔ جب تو اسکی نورانی صورت مجھے بڑی پیاری پیاری لگتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اسے کسی طرح پکڑ لوں اور پانی کے گھڑے میں بند کر کے اُوپر سے چپنی ڈھانک دوں۔"

یہ کتاب بہر میں ہندوستانی کتب خانہ، اردو بازار، دہلی سے طلب کی جا سکتی ہے۔

دیوانِ غالب (طاہر اڈیشن) غالب کا نام آج بچے بچے کی زبان پر ہے۔ اس مقبولیت کا سبب بیان کرنا گویا سُنی سُنائی بات کو دُہرانا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنے غیر فانی مضمون کی ابتدا اس فقرے سے کی ہے کہ "ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں۔ وید مقدس اور دیوانِ غالب۔" اسے اگر ہم مبالغہ سمجھیں تو کم از کم یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اردو کے اور کسی شاعر کو اتنی مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو غالب کو حاصل ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ غالب اپنی شاعری کو خود کوئی وقعت نہ دیتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اور اگر تھوڑا بہت خیال انہیں تھا بھی تو اپنے فارسی کلام کا۔

اُردو کو وہ صرف سے اپنے رنگ کی چیز ہی نہیں سمجھتے تھے سہ

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

مگر یہی بے رنگ مجموعہ بعد میں اُن کی شہرتِ عام اور بقائے دوام کا باعث ہوا۔ اور اتنا مقبول ہوا کہ ہزاروں نہیں تو سینکڑوں ہی نسخے اس کے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ دیوانِ غالب کی جو ایک دم سے مانگ ہوئی تو ہمارے پبلشرز نے بغیر تصحیح کئے ہوئے نسخے چھاپ چھاپ کر چلتے کئے جو غلط سے غلط تر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض تو اتنے غلط سلط چھپے ہیں کہ انہیں دیوانِ غالب کی بجائے دیوان کاتب کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ مگر یہ ابتری اور نفسا نفسی زیادہ عرصے تک جاری نہیں رہی۔ اس کا ردِ عمل ہوا اور بڑی تلاش و تجسس سے صحیح نسخے نکالے گئے اور ان سے ملا کر تصحیح کی گئی۔ منتخب دیوانِ غالب کے علاوہ مکمل دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ کی شکل میں شائع ہوا۔ اس کے بعد آرائشی اڈیشن مرقع چغتائی اور نقش چغتائی شائع ہوئے جن میں کسی حد تک شاعری اور مصوری کا سنجوگ ہوا۔ مگر انہیں صرف مقتدر حضرات ہی خرید سکتے ہیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ کوئی نسخہ ایسا شائع ہو جو بالکل صحیح ہو، خوشنما ہو اور سستا بھی ہو۔ اس کمی کو "طاہر اڈیشن" نے پورا کر دیا۔ آغا محمد طاہر صاحب نبیرۂ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم اس خوبصورت اڈیشن کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:۔

"مدت سے آرزو تھی کہ دیوانِ غالب کا اُردو دیوان شائع کروں، مگر ایسا کہ سند ہو اور سب قسم کے عیوب سے پاک ہو۔ خوش قسمتی دیکھئے کہ اپنے ہی گھر میں ایک مستند قلمی نسخہ نکل آیا۔ یعنی میرے پرنانا جناب حسین مرزا صاحب اعلی اللہ مقامہٗ نواب ناظر قلعۂ معلی ذی علم، صاحب ذوق، صاحب سخن، مرزا کے دوست بلکہ عاشقِ زار تھے۔ وہ انتخاب میں بھی شامل تھے۔ انہوں نے منتخب کلام کا ایک نسخہ اپنے قلم سے لکھ کر مرزا کو دیا۔ مرزا نے پڑھ کر دستخط اور مہر سے مزین کر کے بطور یادگار واپس کر دیا جو اب بھی میری ننھیال میں مرزا کے محبت بھرے تعلق کو زندہ کرتا ہے۔ میں نے یہ دیوان اسی نسخے سے درست کیا ہے۔"

طاہر اڈیشن میں مرزا غالب، اُن کے مزار اور اُن کی تحریر کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ سارا دیوان عکسی بلاکوں سے چھاپا گیا ہے۔ کاغذ عمدہ اور دبیز ہے۔ یہ دیوان مجلد و منقش ہے اور اس لائق ہے کہ ہر اہلِ ذوق کے پاس رہے۔ قیمت بھی مناسب رکھی گئی ہے۔ یعنی عہ؎
کتب خانہ علم و ادب دہلی یا ساقی بکڈپو سے منگایا جا سکتا ہے۔

طنزیاتِ مانپوری

اُردو میں بہت کم مزاح نگار ہیں اور طنز نگار ان سے بھی کم۔ منشی سجاد حسین مرحوم اودھ پنچ کے اڈیٹر نے طنز و مزاح میں نئی نئی باتیں پیدا کیں۔ ان کے بعد کسی اور کو وہ درجۂ کمال حاصل نہیں ہوا۔ اکبر الہ آبادی نے شعر و شاعری میں ظرافت کے جوہر دکھائے اور طنز میں تو آج تک اُن کا جواب نہ ہو سکا۔ رشید صدیقی، آغا فرحت، پطرس اور چغتائی نے اپنے اپنے وقت میں خوب لکھا اور تھک کر چپ ہو رہے۔ اُن کے بعد مزاح نگاروں کی ایک اور کھیپ آئی جن میں سے چند نے نہایت استقلال سے معقول مضامین لکھے۔ ساقی میں علامہ مضحک اور ندیم میں مانپوری نے دادِ ظرافت دی۔ مانپوری کے پندرہ مضامین کا مجموعہ "طنزیاتِ مانپوری" کے نام سے دفتر ندیم، گیا۔ سے شائع ہوا ہے۔ اس کا ہر مضمون نہایت دلچسپ ہے اور طرزِ تحریر بہت بے ساختہ اور مؤثر ہے۔ مانپوری کی عبارت کی خصوصیت یہی کیا کم ہے کہ کہیں محسوس نہیں ہوتا کہ لکھنے والا ہمیں ہنسانے کی کوشش کر رہا ہے(۵)۔ ہماری کمزوریوں کو ہم پر کچھ ایسے ستھرے انداز میں اُجاگر کرتا ہے کہ آہ کے ساتھ واہ بھی سنائی دیتی ہے۔ کتاب کا طویل مقدمہ بھی اپنی نوعیت کی انوکھی چیز ہے خصوصاً "گلستانِ مانپوری"۔ آخر میں مانپوری کے چند اشعار بھی شامل ہیں۔ کتابت و طباعت پاکیزہ۔ کاغذ عمدہ سفید ضخامت ۳۰۸ صفحات۔ جلد خوبصورت۔ قیمت عہ۔ مجلد عہ؎۔
ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ ندیم۔ گیا۔

مومن کے سو شعر

مکتبہ جامعہ دہلی نے سو شعر کے سٹ شائع کر کے ہیں مشہور شعرا کے خصائصِ کلام سے واقف ہونے کا ایک سہل طریقہ بتا دیا۔ اب تک جگر، اصغر، حسرت، فانی، جوش، میر، درد اور غالب کے سو سو بہترین شعر چھوٹی چھوٹی خوبصورت کتابوں کی صورت میں شائع کئے جا چکے ہیں۔ ہر کتاب کے شروع میں اس شاعر کی مختصر داستانِ زندگی اور کلام کی خصوصیات پر مختصر تبصرہ بھی شامل ہے۔ حال میں مومن کے سو شعر شائع ہوتے ہیں جو اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ٹائیٹل پر مومن خاں کی تصویر بھی دی گئی ہے۔ اور مجموعوں کی طرح اس مجموعے

نئی روح
قائم شدہ سنہ ۱۹۰۳ء
نئی طاقت
دماغ
دل
جگر
معدہ
گردے
قوتِ مردانہ
قوتِ مردانہ
از سر نو جوان بنانے والی اکسیر
نوجیون
مسیح الملک شہنشاہ طب حکیم اجمل خانصاحب کی بیاضِ خاص کا نسخہ
مسیح الملک حکیم جمیل خانصاحب دام اقبالہٗ کا نیا عطیہ!
یہ اکسیری دوا منگا کر اپنی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کیجئے اور ایک دفعہ پھر جوان بنکر زندگی کا صحیح لطف اٹھائیے۔
نوجیون:- تمام اعضائے رئیسہ کو قوت دے کر کثیر مقدار میں خون صالح اور مادۂ تولید پیدا کرتی ہے۔ قوتِ مردانہ کو غیر معمولی ترقی دیتا ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو بالکل از کار رفتہ سمجھ چکے تھے ان کو بھی نوجیون نے جوانوں کی صف میں لا بٹھایا۔ انکی رگوں میں نیا خون دوڑنے لگا اور ان کے دل میں شباب کے ولولے پیدا ہونے لگے۔ درحقیقت قوت مردانہ کی یہ وہ اکسیری دوا ہے جس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ جو لوگ زندگی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں اور مردانہ قوتوں کے ساتھ اولاد کے بھی متمنی ہیں انہیں فوراً منگانی چاہیئے۔
نوجیون:- یورپ کی دواؤں کی طرح فوری اثر دکھانے والی اور جلد اثر زائل ہوجانے والی دوا نہیں ہے۔ (اسکے ساتھ طلائے موسیائی بھی استعمال کریں تو طاقت اور سختی کیلئے بے نظیر اور بے ضرر چیز ہے۔ ۳ ماشہ طلا کی قیمت دو روپے چار آنے)
نوجیون کی ترکیب استعمال:- ایک ایک قرص صبح و شام دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔
قیمت:- چالیس خوراک سات روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول)
نوٹ:- نوجیون ہی طاقت کی ایسی دوا ہے جسے آپ بے خطر ہوکر ہر موسم میں استعمال کرسکتے ہیں
قرصِ صدر:- پھیپھڑوں کو طاقت دیتے ہیں۔ خون پیدا کرنیکے لئے۔ دق میں بہت فائدہ مند ہیں۔ خشک کھانسی کیلئے مفید ہیں۔ بھوک ... قیمت فی شیشی ۱۹ قرص ...
ملنے کا پتہ
ہمدرد ہندوستانی دواخانہ۔ پوسٹ بکس ۲۲ دہلی

ہر سال ساقی کے کئی خاص نمبر
شائع ہوتے ہیں انکی قیمت مستقل
خریداروں سے علٰحدہ نہیں لیجاتی۔
نمونہ کا پرچہ مفت

جُرعات

ساقی کا سالانہ چندہ پانچ روپے
اور ششماہی تین روپے ہے
ممالک بیرون ہند سے بارہ شلنگ
قیمت فی پرچہ چھ آنے

جلد ۱۶ — ساقی دہلی۔ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء — نمبر ۴

(قیمت چھ آنہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ساقی کیلئے جو مضامین موصول ہوتے ہیں اُن میں سے زیادہ سے زیادہ کو ساقی میں جگہ دینے کی کوشش کی جاتی ہو۔ مضمون نگار حضرات کی تعداد ماشاءاللہ اتنی زیادہ ہے کہ ساقی کے محدود صفحات اُن کے لئے قطعی ناکافی ہیں۔ گنجائش کی اِس قلت کی وجہ سے اکثر اچھے خاصے مضامین معذرت کے ساتھ ہمیں واپس کرنے پڑتے ہیں، مگر یہ معذرت بعض دفعہ ہمارے لئے عُذرِ گناہ بن جاتی ہے۔ اور پھر جو کچھ اِس گُناہ کی پاداش میں ہمیں سُننا پڑتا ہے اُس کی تفصیل اگر پیش کی جائے تو یقین جانیئے آپ کانوں میں انگلیاں دے لیں گے۔ حُسنِ اخلاق کے اِس مظاہرے پر سوائے خاموشی اختیار کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ چُنانچہ اب تو طبیعت اِس سلوک کی اتنی عادی ہوگئی ہے کہ مذمّت سے مکدّر ہونا تو کُجا تعریف و توصیف سے خوشی بھی نہیں ہوتی۔

مضمون نگاروں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو گمنام رہنا چاہتی ہے یعنی اپنا اصلی نام چُھپانا چاہتی ہے اور کسی فرضی نام سے مضامین شائع کرانا چاہتی ہے۔ اس میں کیا مصلحت ہے؟ یہ راز صرف مضمون نگار کو معلوم ہے۔ مگر بعض گمنام حضرات تو کمال ہی کرتے ہیں کہ ایڈیٹروں سے بھی اپنی اصلی شخصیت پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کی اطلاع کے لئے ہمیں لکھنا پڑتا ہے کہ ایڈیٹر کے بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں اور وہ بھی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہے اِس لئے اُس پر اعتبار کیجئے۔ جب تک اسے یہ نہ معلوم ہوجائے کہ دراصل آپ ہیں کون مُشکل ہے کہ آپ کا مضمون شائع ہوجائے۔ ہر مضمون جو شائع ہوتا ہے اس کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری مضمون نگار کے ساتھ ساتھ ایڈیٹر پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اِس لئے جب تک ایڈیٹر آپ کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہ ہوجائے آپ کا مضمون شائع کرنے سے معذور رہیگا۔ اگر صاحبِ مضمون کو اپنا نام بتانا کسی عنوان گوارا ہی نہ ہو تو ساقی میں چھپنے کیلئے مضمون بھیجنے کی زحمت بھی گوارا نہ فرمائیں۔

ہمارے بعض نئے مضمون نگار حضرات کو شکایت ہے کہ باوجود "تاکید" کے اُن کے مضمون یا غزل کی اشاعت یا عدمِ اشاعت کے متعلق اُنہیں "بواپسی ڈاک" اطلاع نہیں دی جاتی۔ اِس پر بعض حضرات کو "سخت افسوس" ہوتا ہے اور بعض کو "حیرت" تک ہوتی ہے۔ اور غریب ایڈیٹر کو سکتہ ہوجاتا ہے جب وہ اُس ڈھیر کی طرف دیکھتا ہو جو روز بروز بڑھتا ہی چلا جاتا ہو، اور اسی عالمِ یاس میں وہ اپنی شومیِ قسمت کو کوسنے لگتا ہو کہ آج کوئی دستِ غیب کیوں نہ ہوا۔

ساقی کا سالنامہ:- ساقی کا سالنامہ حسبِ معمول جنوری ۱۹۳۸ء میں شائع ہوگا۔ اس کے لئے چند بہت اچھے مضامین آچکے ہیں۔ ۱۹۳۷ء کے سالنامہ میں مولانا عنایت اللہ دہلوی کا بے مثل ترجمہ "ہیملٹ" مکمل شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۸ء کے سالنامہ کے لئے مولانا نے شیکسپیر کے شہرۂ آفاق ڈرامہ "میکبتھ" کا ترجمہ عنایت کیا ہو۔ سالنامہ میں یہ شہ پارہ تمام و کمال شامل ہوگا۔ اُمید ہو کہ بقیہ مضامین ۱۵ اکتوبر تک آجائیں گے اور نومبر اور دسمبر کے پرچوں میں ہم مفصّل اعلان شائع کر سکیں گے۔

شاہد

(بسلسلۂ گذشتہ)

سمبلین

جزو رابع

پہلا منظر۔ ویلز کا علاقہ۔ بلاریوس کے کہف کے قریب کلوٹن آتا ہے۔

کلوٹن۔ اگر پسانیو نے پتہ ٹھیک بتایا ہے تو میں اب اس جگہ کے نزدیک ہوں جہاں ان سے ملنے کی توقع ہو سکتی ہے۔ پوستی مس کے یہ کپڑے تو میرے بہت ٹھیک آئے ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اسکی عورت بھی میرے لئے ٹھیک نہ ہو۔ کیونکہ وہ عورت بھی انہی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے جس نے درزی کو بنایا تھا۔ اور اس درزی کی کاریگری یہ کپڑے ہیں۔ مجھے معاف کیجئے گا مشہور ہے کہ عورت کبھی کبھی اتفاق سے ٹھیک رہتی ہے غرضکہ اب اس عورت کو ٹھیک رکھنے میں میری کاریگری درکار ہوگی۔ تنہا آئینہ میں مشورہ کرنا خلاف شان بات نہیں ہے۔ سمجھ لیجئے کہ میرے جسم کے خطوط ایسے ہی اچھے ہیں جیسے کہ پوستی مس کے۔ میں اس سے جوانی میں کم نہیں، کس بل میں اس سے بڑھا ہوا ہوں۔ قیمت میں بھی اس سے ہیٹا نہیں۔ زمانہ کی مساعدت کے لحاظ سے بھی اس سے زیادہ ہوں۔ میں ملکہ کا فرزند ہوں۔ فوجی خدمات میں جو سب کیلئے یکساں ہیں اس سے زیادہ مہارت اور مشق رکھتا ہوں۔ اور تنہا لڑنے میں تو مجھ سے کون بازی لے جاسکتا ہے۔ مگر اس احمق بیوقوف ایموجن کو کیا کروں کہ باوجود میری ان تمام خوبیوں کے وہ پوستی مس سے عشق رکھتی ہے۔ انسان کی فطرت بھی عجیب چیز ہے۔ مگر پوستی مس سمجھ لے کہ تیرا یہ سر جو شانوں پر لگا اکڑتا ہے ایک گھنٹہ کے اندر کٹ کر دور جا پڑیگا اور تیری عورت پر زبردستی ہمارا قبضہ ہوگا اور پھر اسکی آنکھوں کے سامنے ان کپڑوں کو دھجیاں نہ کردیا ہو تو نام نہیں۔ اور جب یہ سب کچھ ہولیگا تو پھر اس عورت کو گھسیٹتا ہوا بادشاہ کے دربار میں لے جاؤنگا۔ ممکن ہے کہ میری اس سختی سے بادشاہ کے دل پر کچھ میل آئے۔ لیکن میری ماں جسے بادشاہ کے مزاج پر پورا قابو ہے میری سفارش کرکے سب رفع دفع کردیگی۔ گھوڑا میرا تو ٹھیک بندھا ہے۔ بس اب میری تلوار تو ذرا باہر نکل۔ آج مجھے بڑا سخت کام لینا ہے۔ اور اب اے تقدیر تو ان دونوں کو میرے حوالے کردے۔ جگہ کے دیکھنے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں خیال ہے کہ ان سے ملاقات ہوگی۔ پسانیو کی اتنی مجال کہاں کہ مجھے دھوکہ دے۔

دوسرا منظر۔ بلاریوس کی کہف کے سامنے
بلاریوس، گدریوس اور ارویریگس اور ایموجن آتے ہیں۔

بلاریوس۔ (ایموجن سے مخاطب ہوکر) آپ کا مزاج ناساز معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ گھر سے باہر نہ نکلیں شکار کھیلکر ہم سب آپکے پاس آئے جاتے ہیں۔

ارویریگس۔ (ایموجن سے کہتا ہے) بھائی! تم یہیں رہو۔ کیا ہم تم بھائی نہیں ہیں۔

ایموجن۔ مرد مرد سب آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں ایک

مٹی کا پُتلا دوسرے خاک کے پُتلے سے درجے میں البتہ فرق رکھتا ہے گو دونوں کی مٹی ایک ہی ہوتی ہے۔ میری طبیعت اس وقت بہت خراب ہے۔

گدریوس:۔ تم شکار کو جاؤ۔ اردیریگس! میں مریض کے پاس ٹھہرتا ہوں۔

ایموجن:۔ نہیں، میں اتنا بیمار نہیں ہوں کہ کوئی میرے پاس رہے۔ جی اچھا نہیں ہے۔ میں ایسے نازونعمت کا پروردہ نہیں ہوں کہ مرض الموت سے پہلے مرجاؤں۔ بس آپ مجھے تنہا چھوڑ جائیں۔ آپ حسب معمول اپنے سب کام کرتے رہیں۔ جب کوئی خلافِ معمول کام پیش آجاتا ہے تو پھر سب کاموں میں خلل پڑتا ہے۔ میں بیمار ہوں۔ آپ کے یہاں رہنے سے اچھا نہیں ہوجاؤنگا۔ جو خود ملنا جلنا نہ چاہے اس کے لئے کوئی صحبت بھی بھلی نہیں۔ بس التجا ہے کہ آپ مجھے یہیں رہنے دیں۔ میں سوائے اسکے کہ اپنی عزت کا چور رہوں، اور کسی کی چوری نہ کرونگا۔ اور میری یہ چوری اتنی کم قیمت کی ہوگی کہ بس مجھے تنہا مرنے دیجئے۔

گدریوس:۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے تم سے بہت محبت معلوم ہوتی ہے اور یہ محبت وزن میں اتنی ہی ہے جتنی کہ مجھے اپنی ذات سے محبت ہے۔

بلاریوس:۔ بھلا، یہ کیسے؟

اردیریگس:۔ اگر کوئی قصور نہ سمجھا جائے تو میں اس خیال پر اپنے بھائی کے ساتھ متفق ہوں گو وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آتی مگر مجھے اس جوان سے بہت ہی محبت معلوم ہوتی ہے اور آپ کو کہتے سنا ہے کہ محبت کی دلیل بلادلیل ہوتی ہے۔ اگر تابوت رکھنے کے لئے گاڑی دروازے پر کھڑی ہو اور کوئی پوچھے کہ گھر میں کس کا مرنا چاہتے ہو تو میں کہونگا کہ اس جوان کی جگہ میں اپنے باپ کا مرنا گوارا کرونگا۔

بلاریوس:۔ (علیحدہ کہتا ہے) اے موروثی شرافت، فطرت کی صلاحیت، ذاتی بزرگی کا نسلی احساس! سچ ہے بزدلوں کے باپ بزدل ہوتے ہیں۔ کمینوں سے کمینے پیدا ہوتے ہیں۔ فطرت میں اناج بھی ہے اور بھوسی بھی یعنی وہ چیزیں بھی جو قابل قدر ہیں اور وہ بھی جو قابل نفریں ہیں۔ میں اِن لڑکوں کا باپ نہیں ہوں حیرت یہ ہے کہ یہ لڑکا کون ہے جس سے اِن لڑکوں کو مجھ سے بھی زیادہ محبت ہے۔ اب تو صبح کے نو بج چکے ہیں۔

اردیریگس:۔ بھائی! تجھے خدا کو سونپا۔

ایموجن:۔ خدا کرے شکار خوب ملے۔

اردیریگس:۔ خدا کرے تم اچھے ہو جاؤ اور خوش رہو۔

ایموجن:۔ (علیحدہ کہتی ہے) یہ کیسے مہربان اور محبت والے لوگ ہیں۔ خدایا! میں نے بھی کیسی کیسی جھوٹی باتیں سنی ہیں۔ ہمارے درباری کہا کرتے ہیں کہ شاہی دربار کے سوا جہاں جاؤ گے بجز وحشت اور وحشیوں کے اور کچھ نہ دیکھو گے مگر یہ جو کچھ سنا تجربہ اُسے غلط بتا رہا ہے۔ بڑے بڑے سمندروں پر تو ہیبتناک اور خونخوار جانور پیدا ہوتے ہیں لیکن سمندر کے معاون اور مددگار دریاؤں میں خوش ذائقہ مچھلیاں دستر خوان کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ میری طبیعت ابھی تک درست نہیں ہوئی۔ ہائے اس عشق نے بیمار ڈالا ہے۔ پسانیو نے جو دوا دی تھی اسے کھاتی ہوں۔ (دوا کھاتی ہے۔)

گدریوس:۔ میں نے بہت کہا مگر وہ نہ مانا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ شریف ہے مگر بدنصیب ہے۔ کسی نے دغا کر کے اسے آزار پہنچایا ہے۔ خود وہ باوفا اور ایماندار ہے۔

اردیریگس:۔ یہی بات اُسنے مجھ سے کہی تھی اور اتنا اور کہا تھا کہ اب جو کچھ ہونیوالا ہے وہ آپ کو معلوم ہوجائیگا۔

بلاریوس:۔ چلو جنگل شکار کیلئے۔ آج تو ہم تمہیں یہاں چھوڑے جاتے ہیں۔ جاؤ گھر میں جاکر آرام کرو۔

اروِیرِگِس۔ ہم دُور نہیں جائینگے۔ ابھی واپس آجائیں گے۔

بلاریوس۔ خدا کے لئے بیمار نہ پڑنا۔ تمہیں تو ہمارے گھر کا انتظام کرنا ہے۔

ایموجن۔ تندرست ہوں یا بیمار، میں تو ہر حال میں آپکا زیربار احسان ہوں۔

بلاریوس۔ اور ہم بھی آپ کا احسان مانیں گے۔

(ایموجن گھر میں چلی جاتی ہے۔)

یہ جوان گو اسوقت تکلیف اور مصیبت میں ہے مگر شریف ماں باپ کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔

اروِیرِگِس۔ گانے میں ایک فرشتہ کی طرح خوش گلو ہے۔

گدریوس۔ اور کھانا بھی کیسا خوش ذائقہ پکاتا ہے۔ قابوں میں ترکاریاں کاٹ کر اس طرح لگاتا ہے کہ خوش نویس کے لکھے ہوئے ورق معلوم ہوتے ہیں اور شوربے میں کچھ اس انداز سے چاشنی دیتا ہے گویا دیبی جو تو بیمار پڑی ہے، اور غذا کا انتظام اُس کے سپرد ہے۔ کس شرافت کے ساتھ زبان پر آہیں اور لبوں پر تبسم ہے آہوں کو اس کا افسوس کہ ہمدرد کیوں بنے تبسم کیوں نہ ہوئے اور تبسم کو آہوں پر یہ اعتراض ہے کہ تم اِس بتکدہ حسن و سعادت سے نکل کر تیز و تند طوفانی ہواؤں میں جن سے ملاح بھی پناہ مانگتے ہیں کیوں مل جل گئے۔

گدریوس۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبر اور غم دونوں جڑ پکڑ کر اس میں سے پھوٹ نکلے ہیں اور دونوں نے اپنی شاخیں اُلجھا دی ہیں۔

اروِیرِگِس۔ خدا کرے کہ شجر صبر کی شاخیں بلند ہو کر غم کی جڑوں کو جو ایک بدبودار درخت ہے اتنا گلائیں کہ اُس کی شاخیں اس نازک درخت رز پر جو پھیل گئی ہیں خشک ہو جائیں۔

بلاریوس۔ اب تو خاصا دن نکل آیا ہے۔ لڑکو چلو۔ ہائیں یہ کون ہے!۔

(کلوٹن آتا ہے۔)

کلوٹن۔ ان فراریوں کا تو کہیں پتہ چلتا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس خبیث (پسانیو) نے مجھے دھوکا دیا۔ تھکن کے مارے میں تو غش کھانے کو ہوں۔

بلاریوس۔ کیا فراریوں سے اس کا مطلب ہم سے تو نہیں ہے۔ یہ شخص کچھ کچھ مجھے یاد آتا ہے۔ یہ تو ملکہ کا بیٹا کلوٹن معلوم ہوتا ہے۔ خوف ہے کہ اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہونگے اور وہ جنگل میں چھپے بیٹھے ہونگے۔ گو آج برسوں کے بعد اُسے دیکھا ہے۔ پھر بھی جانتا ہوں کہ یہ وہی ہے۔ سالہا سال ہوئے کہ ہم پر سے قانون کی پناہ اُٹھ چکی ہے۔ لڑکو! یہاں سے چلو!۔

گدریوس۔ یہ تو اکیلا آدمی ہے میں اور میرا بھائی ابھی تلاش کئے لیتے ہیں کہ اس کے ہمراہ کچھ اور لوگ تو جنگل میں چھپے نہیں بیٹھے ہیں۔ آپ جائیں میں اس سے بھگت لونگا۔

کلوٹن۔ ٹھیرو۔ تم کون لوگ ہو جو مجھ سے بھاگ رہے ہو۔ کیا تم پہاڑی لٹیرے ہو۔ میں سُن چکا ہوں کہ یہاں رہزن اور قزاق رہتے ہیں۔ خبیثو! تم کس کے غلام ہو۔

گدریوس۔ تجھ سے بڑھکر تو کوئی غلام میری نظر سے ایسا نہیں گذرا جسے جواب دینے میں اس کا سر نہ توڑ دیا ہو۔

کلوٹن۔ تو لٹیرا ہی قانون توڑنے والا بدمعاش۔ ارے قزاق اپنے ہتھیار ابھی ہمارے سامنے ڈالدے۔

گدریوس۔ کس کے سامنے۔ کیا تیرے سامنے۔ تو ہے کون۔ کیا میرا ہاتھ تیرے بازو سے کم ہے اور تو مجھ سے بھی زیادہ بہادر دل رکھتا ہے۔ تیری بکواس البتہ تیرے ہاتھ اور دل سے زیادہ سخت معلوم ہوتی ہے کیونکہ تیری طرح میری زبان خنجر نہیں ہے۔ بتا تو کون ہے۔ اور کیوں میں تیرے سامنے اپنے ہتھیار

ڈال دوں۔

کلوٹن:۔ اے خبیث کمینے کیا ہمارے بیان سے تجھے نہیں معلوم ہوتا کہ ہم کون ہیں۔

گدریوس:۔ نہ تیرے کپڑوں سے اور نہ اس سے جس نے انہیں پہن رکھا ہے۔ بتا کمینے تیرا دادا کون تھا جس نے تیرے یہ کپڑے تیار کئے تھے جن سے تو آدمی معلوم ہو رہا ہے۔

کلوٹن:۔ ارے ذلیل کمینے، میرے درزی کے ہاتھ کے یہ کپڑے نہیں ہیں۔

گدریوس:۔ تو پھر یہاں سے دور ہو اور اس کا احسان مانتا رہ جس نے تجھے یہ کپڑے دئے ہیں۔ تو تو کہیں کا احمق بیوقوف ہے میں تجھے پیٹ کر یہاں سے نکالنا نہیں چاہتا۔

کلوٹن:۔ ارے بد ذات لے میرا نام سن اور سر سے پاؤں تک لرز جا۔

گدریوس:۔ آخر تیرا نام کیا ہے۔

کلوٹن:۔ میرا نام کلوٹن ہے۔ سنا تو نے شیطان!

گدریوس:۔ کلوٹن یا اس سے بھی بڑھکر بد معاش تیرا نام ہو۔ میں اس سے ڈرتا نہیں۔ بندر۔ سانپ۔ مکڑی تیرا نام ہوتا تو ڈرتا بھی۔

کلوٹن:۔ اچھا اور سن۔ اب تو تیرا دم نکلے گا۔ سن میں ملکہ کا فرزند ہوں۔

گدریوس:۔ یہ سنکر افسوس ہوا کیونکہ تو ہرگز اس نسب کے لائق نہیں۔

کلوٹن:۔ کیا اب بھی تو مجھ سے نہیں ڈرا۔

گدریوس:۔ میں تو صرف اس سے ڈرتا ہوں جو عقل رکھتے ہیں اور انہی کا میں ادب بھی کرتا ہوں۔ تجھ جیسے احمق پر تو میں ہنستا ہوں۔ ڈرنا کیسے کہتے ہیں۔

کلوٹن:۔ اچھا تو ادھر آ۔ میں تجھے موت کے گھاٹ اتار دوں۔ اور جب تیرا کام تمام کر چکونگا تو پھر ان کو قتل کروں گا جو مجھے دیکھکر سامنے سے بھاگے ہیں اور پھر ان کے سر کاٹ کر لنڈن کی فصیل پر چڑھا دونگا۔ اے گنوار پہاڑ کے قزاق آ، اور میرے سامنے گردن جھکا دے۔

(دونوں لڑتے ہوئے اسٹیج سے باہر ہو جاتے ہیں)

(بلاریوس اور اروریگس داخل ہوتے ہیں)

بلاریوس:۔ سپاہیوں کی کوئی جماعت ہماری تاک میں بیٹھی نہیں ملی۔

اروریگس:۔ دنیا میں کون ہے جو ہمارا مقابلہ کر سکے یقینی آپ نے اسے پہچاننے میں غلطی کی ہے

بلاریوس:۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مدت کے بعد اسے دیکھا تھا۔ مگر اتنا وقت گذرنے کے بعد بھی صورت نہیں بدلی۔ چہرے کا نقشہ وہی ہے جو پہلے تھا آواز میں جھٹکے اور دفعتاً فوقتاً جلد جلد باتیں کرنے کی عادت پہلے ہی جیسی ہے۔ مجھے تو پورا یقین ہے کہ وہ کلوٹن ہی تھا۔

اروریگس:۔ یہیں تو ہم نے انہیں چھوڑا تھا۔ امید ہے کہ بھائی پولیدور نے اسکی اچھی طرح خبر لی ہوگی آپ تو فرماتے تھے کہ کلوٹن بڑا زبردست اور ظالم ہے۔

بلاریوس:۔ چونکہ ابھی تک پوری جوانی کو نہیں پہونچا ہے اس لئے خوف وخطرے سے ناآشنا ہے۔ سمجھ کا قصور اکثر خوف دل سے نکال دیتا ہے۔ لیکن دیکھو وہ تمہارا بھائی آرہا ہے۔

(گدریوس، کلوٹن کا سر ہاتھ میں لئے آتا ہے)

گدریوس:۔ یہ کلوٹن تو کوئی بڑا ہی احمق تھا۔ روپیوں کی تھیلی تھا مگر اندر سے خالی۔ رستم بھی ہوتا تو اس کے سر سے بھیجا نہ نکال سکتا۔ کیونکہ یہ چیز اس کے سر میں تھی ہی نہیں۔ لیکن اگر میں اسے قتل نہ کر دیتا تو جس طرح اسوقت اس کا

سر میرے ہاتھ میں ہے اسی طرح میرا سر اُسکے ہاتھ میں ہوتا۔

بلاریوس:۔ یہ تم نے کیا غضب کیا۔

گدریوس:۔ جو کچھ کیا بالکل بجا اور درست کیا۔ ایک آدمی کلوٹن نامی کو مار کر اُس کا سر کاٹ لیا۔ اور یہ کلوٹن بقول خود کسی ملکہ کا بیٹا تھا۔ اُس نے مجھے کمینہ، باغی اور پہاڑی رہزن کہا تھا اور قسم کھا کر کہتا تھا کہ وہ ہم تینوں کا سر اتار کر انہیں لندن کی فصیل پر لٹکائے گا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ہمارے سر جہاں تھے وہیں ہیں۔

بلاریوس:۔ بس سمجھ لو کہ اب ہماری خیر نہیں۔

گدریوس:۔ کیوں بابا جان؟ کیوں خیر نہیں؟ ہمیں کیا نقصان پہونچ سکتا ہے اُس نے تو قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ تینوں کو مار ڈالے گا۔ جب قانون ہمیں پناہ نہ دے گا تو پھر ہمیں رحمدل بننے کی کیا ضرورت تھی۔ جب ایک آدمی مغرور اور گستاخ بنکر ہمیں دھمکیاں اور ڈراوے دے، خود ہی میر عدالت اور خود ہی جلاد بنے تو پھر ہمیں ترس کیوں آتا۔ قانون سے تو ہم ہر وقت ڈرتے ہی رہتے ہیں۔ کچھ معلوم ہوا کوئی اور بھی اسکے ساتھ ہے۔

بلاریوس:۔ ہمیں تو چڑیا تک نظر نہیں آئی۔ مگر احتیاط شرط تھی۔ خیال یہی ہوتا تھا کہ ضرور کوئی نوکر یا ملازم ساتھ ہوگا۔ گو اُس کی کیفیت یہ تھی کہ ہر دم مزاج بدلتا رہتا تھا اور وہ بھی بد سے بدتر کی طرف اُس کے یہاں تک تنہا چلے آنے کو سوائے جنون یا دیوانگی اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ دربار میں پرچہ دوڑایا جاتا کہ ہم جو اس غار میں رہ کر شکار کھیلا کرتے ہیں قانون کی پناہ سے خارج ہو چکے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے کہ ہم زیادہ زور پکڑ جائیں۔ بادشاہ اتنی خبر سنتے ہی حسب عادت غضبناک ہو جاتا۔ اور حکم دیتا کہ فوراً گرفتار کر کے ہمیں حاضر کیا جائے۔ میرا تو ابتک یہی خیال ہے کہ وہ یہاں تک تنہا نہ آیا ہوگا۔ نہ تو خود اس کی اتنی ہمت ہو سکتی ہے اور نہ اُسے اس کی اجازت ملتی۔ بس میرے خوف کی وجہ معقول تھی اِبر شخص کا سر اتنا خوفناک نہ سمجھو جس قدر کہ اس کی دُم خوفناک ہے۔

اردیرگس:۔ جو کچھ مشیت میں تھا اُس کا پیش آنا ضروری تھا۔ بھائی پولیڈور نے جو کچھ کیا وہ اچھا کیا۔

بلاریوس:۔ میرا تو آج شکار کھیلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لڑکے فیڈلی کی علالت نے تو میرا راستہ اتنا طولانی کر دیا ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا ہے۔

گدریوس:۔ خود کلوٹن کی تلوار سے جو وہ میرے گلے پر چلانی چاہتا تھا میں نے اس کا سر قلم کر دیا۔ اور اب سر کو چٹان کی پشت پر جو ریخ ہے اس میں ڈالدونگا تاکہ وہ بہتا ہوا سمندر میں پہونچے اور وہاں مچھلیوں کو بتائے کہ ملکہ کے فرزند کلوٹن کا سر ہوں، یہی میرا ارادہ ہے۔

بلاریوس:۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا انتقام ہم سے ضرور لیا جائیگا۔ کاش پولیڈور تو ایسا نہ کرتا۔ مگر مقتضائے جوانمردی یہی تھا۔

اردیرگس:۔ بہتر ہوتا کہ یہ کام میں کرتا اور جو کچھ اس کا بدلہ لیا جاتا مجھ ہی سے لیا جاتا۔ پولیڈور میں تجھے بھائیوں کی طرح چاہتا ہوں۔ مگر اس بات کا ضرور رشک ہے کہ تو نے کلوٹن کا سر کاٹنے کا موقع مجھے نہ دیا۔ کاش ہمیں کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا ہمیں موقع مل جاتا۔ تاکہ ہم اپنی حفاظت کیلئے دشمن کی مدافعت پوری طاقت سے کرتے۔

بلاریوس:۔ خیر جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ہم شکار نہ کھیلیں گے اور کوئی ایسا خطرہ جس میں ہمارا نفع نہ ہو۔ خود تلاش نہ کرینگے۔ بس لڑکو آؤ۔ اپنے چٹان کو چلیں۔ تم اور فیڈلی کھانا تیار کرو، میں اور پولیڈور یہیں ٹھہرے ہیں۔ کھانے کے وقت تک پولیڈور

کو ساتھ لے آتا ہوں۔

اروبرگس۔ غریب فیدلی بیمار ہے میں تو اُس کے پاس بیٹھتا ہوں۔ خدا کرے کہ اُسے اپنا پہلا سا رنگ روپ مل جائے۔ اگر ایسا ہو تو کلوٹن تو ایک تھا، میں کلوٹنوں کے ایک پورے محلّے کا خون کرنے کو بھی یہی سمجھوں کہ میں نے بڑی رحمدلی کا کام لیا ہے۔

بلاریوس۔ اے دیبی۔ اے پاک فطرت تو اپنا نور ان شہزادوں پر خوب چمکا۔ یوں تو یہ دونوں ایسے نیک دل اور پاک نفس ہیں جیسے بادِ صبح نرگس کے پھولوں میں چلتی ہو اور پھولوں کے طرّوں کو جنبش تک نہ ہو لیکن جب بادشاہوں کا خون اُن کی رگوں میں جوش مارتا ہے تو وہ ایسے تیز و تند ہو جاتے ہیں جیسے طوفان میں ہوا کے سخت سے سخت جھونکے ہوں۔ جو پہاڑ پر چنار کے اونچے سے اونچے درخت کی چوٹی کو گھاٹی کی طرف جھکا دیتے ہیں۔ تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ بغیر اس بات کا علم رکھے کہ وہ ایک بادشاہ کے فرزند ہیں۔ محض عقلِ حیوانی اُن میں یہ شان و عظمت پیدا کرتی ہے جو کسی سے انہوں نے سیکھی نہیں۔ اور وہ اخلاق اُن میں نظر آتا ہے جو کسی نے اُن کے ساتھ ظاہر نہیں کیا ہے۔ فطرت اعلان کرتی ہے کہ وہ نسب شاہی رکھتے ہیں۔ ہمّت و شجاعت خود رو درخت کی طرح ان میں پھولتی پھلتی ہے اور وہ میوے ان میں پیدا کرتی ہے کہ گویا میووں ہی کے لئے یہ درخت لگائے گئے تھے۔ لیکن مجھے ابھی تک یہی خوف ہے کہ کلوٹن کا یہاں آکر مارا جانا ہمارے حق میں کسی خرابی کی تمہید نہ ہو جائے خدا کو خبر ہے کہ اس کے مارے جانے کا نتیجہ ہمارے لئے کیا نکلے۔

(گدریوس پھر آتا ہے۔)

گدریوس۔ میرا بھائی کاڈول کہاں ہے، میں نے تو کلوٹن کا سر ایک بہتے دریا میں ڈال دیا ہے کہ ماں کو فرزند کے مارے جانے کی خبر دے۔ اور اس بات کی ضمانت میں اُس کا دھڑ یہاں رکھ لیا ہے۔

(موسیقی کی دردناک آواز کان میں آتی ہے۔)

بلاریوس۔ میرا یہ باجا بھی عجیب ہے۔ پولیدور سنو تو وہ بج رہا ہے۔

گدریوس۔ کیا کاڈول گھر میں ہے؟۔

بلاریوس۔ ابھی تو گیا ہے۔

گدریوس۔ باجا بجانے سے اس کا کیا مطلب ہے۔ جب سے ہماری ماں دایہ کا انتقال ہوا ہے۔ کسی نے اب تک باجے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ دردناک گتیں تو دردناک موقعوں پر بجائی جاتی ہیں۔ یہ بات کیا ہے۔ بے حقیقت باتوں پر جوش آنا یا ذرا ذرا سی بات پر گریہ و زاری کرنا تو بندروں کی جست و خیز یا بچوں کا رونا ہوتا ہے۔

بلاریوس۔ لو، وہ کاڈول خود آرہا ہے۔ اور وہ چیز بھی اُٹھائے لا رہا ہے جس کی وجہ سے ہم اُسے الزام دیتے تھے۔

(اروبرگس پھر آتا ہے اور ایموجن کو جو مُردہ معلوم ہوتی ہے گود میں اُٹھائے ہے۔)

اروبرگس۔ لیجئے وہ طائرِ خوش نوا جس کی ہم کبھی کچھ قدر کرتے تھے، آج اُڑ گیا۔ مجھے تو منظور تھا کہ میری عمر بجائے سولہ سال کے ساٹھ برس کی ہو جاتی۔ بجائے جوانی کی چھتی و چالاکی کے بڑھاپے کی لٹھیا بغل میں ہوتی مگر یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

گدریوس۔ اے نازک اور حسین پھول، میرے بھائی کے ہاتھوں میں اُٹھا ہوا تو اتنا حسین نہیں معلوم ہوتا جیسے کہ اپنے پاؤں پر چلتا ہوا خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔

بلاریوس۔ اے رنج و محن کون ہے جس نے تمہاری تھاہ پا کر اثر

گیلی مٹی کا پتلا جلایا ہو جہاں تمہارا سست رو سفینہ آسانی سے قیام کر سکے۔ پیاری جان! خدا ہی کو علم ہے کہ تو بڑھکر کیسا خوبرو سجیلا جوان نکلتا مگر رنج و غم نے تو تجھے لڑکپن ہی میں گھلا گھلا کر ختم کر دیا۔ کاڈول جب تم گھر گئے تھے تو اُسے کس حال میں پایا تھا۔

ارویرگیس:۔ بالکل اکڑا ہوا پڑا تھا۔ جیسے کہ آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی معلوم ہو رہا تھا کہ کسی مکھی کے بیٹھنے سے گدگدی ہوئی ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ موت کے تیر سے گھائل ہوا ہے۔ دایاں رخسار تکیئے پر ٹکا ہوا تھا۔

بلاریوس:۔ لیٹا کہاں تھا؟۔

ارویرگیس:۔ زمین پر لیٹا تھا۔ دونوں ہاتھ اس طرح سینے پر رکھے تھے۔ میں سمجھا کہ سوتا ہے۔ میں نے اپنے بھاری جوتے اس خیال سے اتار دئے تھے کہ کہیں ان کی آواز سے جاگ نہ جائے۔

گدریوس:۔ وہ تو ابھی تک سوتا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اگر حقیقت میں گذر گیا ہے تو اُس کی قبر سونے کی سیج ہوگی اور پریاں آسمان سے اس کی قبر پر اترتی ہونگی۔ کیڑے مکوڑے اس کے پاس ہرگز نہ آئیں گے۔

ارویرگیس:۔ پیارے فیدلی جب تک بہار کا موسم ہے اور میں یہاں رہتا ہوں اور تیری اس پر حزن و ملال پر حسین سے حسین پھول بچھایا کرونگا۔ ان پھولوں میں زرد گلاب جو تیری جلد سے ہمرنگ ہوگا۔ اور ہلکے نیلگوں پھول جو تیرے لبوں کے رنگ سے مشابہ ہونگے تیری قبر پر بکھیرونگا۔ اور ان میں برگ نسرین بھی ہونگے جس کی خوشبو کچھ کم نہیں لیکن تیرے شمیم نفس کو وہ کہاں پہونچتی ہے پھر تیری قبر پر وہ سینہ سرخ طائر خوشرنگ منقار میں کائی کے ٹکڑے لئے آئے گا کہ تیرے چہرے کو ڈھک دے۔ اس کی منقار کی اس خدمت و خبر گیری پر اُن دولت رسیدہ ورثا کو شرمندہ ہونا چاہیئے جو اپنے باپ کی قبر کو بغیر کسی یادگار کے یونہی پڑا رہنے دیتے ہیں۔ جاڑے میں جب پھول نہیں رہینگے، تو یہی چیزیں تیری قبر پوش اور تیرے مزار کی زائر ہونگی۔

گدریوس:۔ مہربانی کر کے یہ شاعرانہ گفتگو بند کرو۔ یہ موقع بہت رنج و صدمے کا ہے تعریفوں میں وقت گزار کر اس فرض کو ادا کرنے میں تاخیر نہ کرو۔ جو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اس وقت جو سب سے پہلا کام کرنے کا ہے وہ اسے دفن کرنا ہے۔ چلو قبر کی تیاری کریں۔

ارویرگیس:۔ بتائیے اسے کہاں دفن کریں؟۔

گدریوس:۔ جہاں ہماری اماں دایہ یوریفلی رکھی ہے۔

ارویرگیس:۔ بالکل درست ہے۔ اور بھائی پولیدورگو اب ہماری آوازیں اب جوان ہو جانے سے بھاری پڑ گئی ہیں، لیکن جس طرح ہم نے اپنی ماں یوریفلی کو نوحہ گا کر سپرد خاک کیا تھا اُسی طرح اس فیدلی کو بھی دفن کرینگے۔

گدریوس کا دول مجھ سے گایا نہ جائے گا۔ میں صرف روتا رہونگا۔ اور اس گریئے میں تعریف و توصیف کے جملوں میں میں تجھ سے بڑھ جاؤنگا کیونکہ نوحہ غم کے الاپنے میں بن سُرا ہو جانا پادریوں کے جھوٹے مرثیوں اور ان جھوٹی عبارتوں سے بدتر ہوتا ہی جو بطور یادگار قبروں پر کندہ کی جاتی ہیں۔

ارویرگیس:۔ اچھا کچھ گائیں گے نہیں۔ گانے کی جگہ محض اس کی تعریف و توصیف کرینگے۔

بلاریوس:۔ غم جتنا ہی زیادہ ہو اتنا ہی اس کا علاج کم ہونا چاہیئے۔ لڑکو تم کلوٹن کو تو بالکل ہی بھول گئے۔ خیال کرو کہ وہ ایک ملکہ کا فرزند تھا۔ گو یہ سچ ہے کہ ہمارا دشمن بنکر یہاں آیا تھا مگر اس دشمنی کی سزا کو وہ پہونچ چکا ہے۔ کمزور ہو یا

زبردست قبر میں دونوں ایک ہی طرح گلتے سڑتے ہیں۔ مٹی ان دونوں کی ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن احترام اور وقار جو دُنیا کے فرشتے ہیں، اعلیٰ و ادنیٰ میں فرقِ مراتب کا لحاظ کرتے ہیں۔ ہمارا یہ دُشمن ایک شہزادہ تھا۔ اور گو تم نے اُسے اپنا دُشمن سمجھکر مار ڈالا مگر اُس کو ایک شہزادے کی حیثیت سے کہیں دفن کرنا ضروری ہے۔

گدریوس:۔ مہربانی کرکے اس کی لاش ادھر اُٹھا لائیے۔ ایک بیوقوف سخرا بھی ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک بہادر اور جوانمرد جبکہ دونوں مر چکے ہوں۔

اروریگس:۔ اگر یہی مرضی ہے تو اُسے اُٹھا لائیے اور جبتک وہ آئے ہم نوحہ پڑھتے ہیں۔ بھائی شروع کیجئے۔

گدریوس:۔ نہیں، پہلے اس کا مُنہ مشرق کی طرف کر دو۔ ہمارے باپ اس میں مصلحت سمجھتے ہیں۔

اروریگس:۔ دُرست ہے۔

گدریوس:۔ اچھا آؤ ادھر سے اُٹھاؤ۔

اروریگس:۔ اب نوحہ شروع کرو۔

نوحہ

"اب تجھے نہ سُورج کی گرمی کا ڈر ہے اور نہ جاڑے کی تیزی کا۔ دُنیا میں جو کچھ تجھے کرنا تھا وہ ختم ہوا۔ اور جہاں کا تو تھا وہیں چلا گیا۔ اپنی محنت کی مزدوری پا چکا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں چاہے سونے کے بنے ہوں مگر سب کو ایک غریب کوئلے والے کے لڑکے کی طرح ایک دن مر کر خاک ہونا ہے۔

اب تو بڑے لوگوں کے عتاب اور غصّے سے خوف نہ کرا اور عالموں و فاضلوں کی زد سے بھی اب تو دُور ہے۔ اب تجھے کھانے کا فکر نہ ہوگا اور نہ پہننے کا۔

اب تیرے نزدیک ایک کمزور نرسل بھی ایسا ہی ہے جیسے مضبوط بلوط۔

بادشاہ ہو، یا عالم ہو، یا پہلوان سب ہی کو یہی دن دیکھنا ہے اور خاک میں ملکر خاک ہونا ہے۔

اب بجلی کی چمک اور کڑک کا تجھے ڈر نہیں۔ اور نہ مینہہ برستے وقت اولوں کا۔

اب تجھے لوگوں کے اعتراضوں کا خوف اور نہ نکتہ چینیوں کا ڈر ہے۔ تو رنج و خوشی دونوں کو ختم کر چکا۔

تمام چاہنے والے اور نوجوان عشاق تیرے ہی پاس آکر خاک ہونے والے ہیں۔

اب نہ تو کوئی ملّا سیانا تجھے نقصان پہونچا سکتا ہے اور نہ کوئی ساحر اپنے سحر سے تجھے ستا سکتا ہے۔

وہ رُوحیں جن پر مرتے وقت دُعائیں نہیں پڑھی گئی ہیں اور جو دُنیا میں آوارہ پھرتی ہیں تجھے پریشان نہ کرینگی۔ کوئی خرابی اب تیرے نزدیک نہ آئیگی چُپ چاپ مٹی میں ملکر مٹی ہو تا رہ۔ خُدا تیرے مزار کو شہرت بخشے۔"

(بلاریوس کلوٹن کی لاش کو لئے آتا ہے)

گدریوس:۔ ہم نے موت کی کُل رسمیں ختم کر لیں۔ آؤ، اب اس لاش کو بھی یہیں پر رکھدیں۔

بلاریوس:۔ پھول تھوڑے رہ گئے ہیں۔ آدھی رات کے قریب اور پھول لائیں گے۔ قبروں پر ڈالنے کیلئے تو وہ پھول اچھے ہوتے ہیں۔ جن پر رات کی ٹھنڈی شبنم پڑ چکی ہو۔ لاش کو چت لٹادو۔ تم بھی کبھی پھول تھے۔ مگر اب کُملا گئے ہو۔ اور یہی حال اُن پھولوں کا ہوگا جو اس وقت ہم تم پر ڈال رہے ہیں۔ لڑکو ادھر آؤ۔ جُدا جُدا کھڑے ہو کر گھٹنے ٹیک زمین پر ٹیک دو۔ وہی چیز جو خاک نے ہمیں دی تھی اب خاک واپس لے رہی ہے تمہاری خوشیوں کے ساتھ تمہاری تکلیفیں بھی ختم ہوئیں۔

(بلاریوس، گدریوس، اور اروریگس چلے جاتے ہیں)

ایموجن :- (جاگ کر) جی ہاں۔ ملفور دہیون۔ اُس کا راستہ کدھر ہے۔ شکریہ۔ اچھا جھاڑی سے راستہ جاتا ہوگا۔ مہربانی کرکے اتنا اور بتایئے کہ وہ یہاں سے کتنی دُور ہے۔ اے غضب۔ کیا ابھی چھ میل اور چلنا ہے۔ آدھی رات تو چلتے چلتے ہو گئی۔ جو کچھ ہو مَیں تو اب پڑ کر سو جاتی ہوں۔ کسی ساتھ والے کی ضرورت نہیں۔ اے دیوتا و دیبیو۔

(کلوٹن کی لاش دیکھتی ہے۔)

یہ پھول تو دُنیا کی راحتوں کی مثل ہیں۔ اور یہ خُون آلودہ لاش اپنی تکلیف خود بیان کر رہی ہے۔ خُدا کرے کہ مَیں خواب دیکھ رہی ہوں۔ یاد آتا ہے کہ ابھی ابھی ایک غار میں گھر والی بنی چند ایماندار آدمیوں کے لئے کھانا تیار کر رہی تھی۔ مگر یہ جو کچھ بھی ہو جب بخارات دماغ سے اُٹھتے ہیں تو وہ خالی خولی تیر بنکر کسی کو اپنا نشانہ نہیں بناتے۔ ہمارے خیالات اور ہماری تجویزوں ہی کی طرح ہماری یہ آنکھیں بھی اندھی ہوتی ہیں۔ خدایا! میں تو خوف سے اب تک لرز رہی ہوں۔ مگر اے خُدا اگر عرش پر ایک قطرہ بھی رحم کا ہو۔ خواہ وہ ایک چھوٹے سے چھوٹے پرندے کی چشم معصوم ہی کے برابر کیوں نہ ہو۔ مگر اس کا تھوڑا سا حصّہ مجھے دے۔ خُدا کا خوف میرے دل میں ہے اور وہ خواب ابھی تک آنکھوں میں پھر تا ہے۔ گو جاگ رہی ہوں۔ اس کی باتیں ظاہر میں بھی اتنی ہی سامنے ہیں جیسے کہ باطن میں وہ موجود ہیں۔ صرف خیال ہی میں نہیں بلکہ خارج میں بھی وہ محسوس ہو رہی ہیں۔ ایک سر کٹا آدمی پڑا ہے۔ سر بُریدہ! کپڑے اسکے تن پر پوستی مس کے ہیں۔ اسکے پاؤں کی قطع مجھے خُوب یاد ہے۔ یہ ہاتھ بھی اُسی کے ہیں۔ قدم مرکیوری کی شکل کے ہیں۔ ران خُدائے مارس کی ران سے مشابہ ہے اور ہرقل کے مثل بازو مضبوط ہیں۔ لیکن ہائے وہ جوپیٹر کا سا چہرہ اور سر کہاں ہے۔ اسے کیا عرش پر خون ہوا ہے کہ سر غائب ہے۔

اے پسانیو! ملکہ ہکوبہ نے غم سے دیوانی ہوکر یونانیوں کو جلنے کوسنے دئے تھے اب مَیں اپنی طرف سے کوسنے اور شامل کرکے تجھے دیتی ہوں۔ تُو نے اِس موذی شیطان کلوٹن سے سازش کی اور میرے آقا کا سر کٹوا دیا۔ آج سے سب لکھنا پڑھنا۔ دغا اور فریب سمجھا جائے۔ ارے ملعون پسانیو! تُو نے جعلی خط بنا کر دُنیا کے سب سے عظیم الشان جہاز کو غارت کیا۔ اُس کے سب سے اُونچے مستول کو توڑ دیا۔ ہائے پوستی مس تیرا سر کہاں ہے؟۔ پسانیو! چاہے تُو اُس کے دل میں تلوار بھونک کر اُسے مارتا۔ مگر اس کا سر چھوڑ دیتا۔ یہ کہاں ہوا۔ کیونکر ہوا۔ پسانیو تو ہی بتا۔ پسانیو اور کلوٹن کے سوا کسی دوسرے کا کام نہیں۔ ایک طرف غیظ، بُغض و عداوت دوسری طرف روپے کی طمع، انہوں نے یہ دردناک صورت پیش کی ہے۔ ظاہر ہے۔ کیا کلام ہے۔ جب دوا اُس نے مجھے دی تھی تو کہا تھا کہ یہ بڑی اکسیر ہے۔ کیا میں نے نہیں دیکھا کہ حواس پر اس کا اثر قاتل ہے۔ اس سے پسانیو کی یہ حرکت ثابت ہے۔ یہ کام پسانیو اور کلوٹن کا ہے۔ اے خون اپنے رنگ سے میرے رُخسارے سُرخ کر دے۔ تاکہ جو کوئی ادھر سے گذرے اُس کا خوف اور بڑھ جائے۔ اے خُدایا۔ میرے خُدا۔

(ایموجن لاش پر گر تی ہے۔)

(رومانی سپہ سالار لیوکوس، ایک کپتان اور دیگر افسران فوج معہ ایک نجومی کے آتے ہیں۔)

کپتان :- حضور کے حُکم کے مطابق گالیا۔ (فرانس) میں جس قدر فوجیں پڑی تھیں ان سب نے سمندر عبور کر لیا ہے اور اس وقت وہ ملفور دہیون میں اپنے جہازوں سمیت لڑائی کیلئے بالکل تیار ہیں۔

لیوکوس :- لیکن روما سے بھی کوئی فوج آئی؟۔

کپتان :- ارکانِ مجلس انتظامی نے اٹلی کے شُرفا اور سرحد

اٹلی کے قبائل میں جوش پیدا کیا ہے اور وہ سب بڑے جوش و خروش کے ساتھ لڑنے کو تیار ہو گئے ہیں اور اُمید کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بیش قدر خدمات اس جنگ میں پیش کریںگے۔ یہ کُل شُرفا اور سرحدی قومیں جمع ہو گئی ہیں اور یاخیمو برادرِ سینا کی سرکردگی میں ہیں۔ جو رُوما کا مشہور شریف زادہ ہے۔

لیوکوس۔ کبتک انکے یہاں پہونچنے کی توقع ہے۔

کپتان۔ سمندر پر باد موافق چلتے ہی اُنہیں یہاں پہونچا سمجھئے۔

لیوکوس۔ اس خبر سے ساری اُمیدیں قوی ہوئیں۔ کپتانوں کو حُکم دو کہ جس قدر فوجیں آگئی ہیں ان سب کو یکجا ہونے کا انتظام کریں۔ اچھا۔ اب اے نجومی بتاؤ کہ تم نے اس لڑائی کا کیا انجام دریافت کیا۔

نجومی۔ کئی روز تک خداؤں سے مسلسل دُعائیں مانگنے کے بعد کہ کچھ خبر دی جائے۔ کل شب کو اُنہوں نے مجھے ایک رویا دکھایا ہے۔ اس میں کیا دیکھتا ہوں کہ خدائے جوپیٹر کا طائر یعنی رُوما کا عقاب سمت جنوب سے اُڑتا ہوا مغرب کے اس حصّہ میں آیا ہے اور یہاں آتے ہی سُورج کی چمکتی کرنوں میں غائب ہو گیا ہے۔ اگر میرے گناہ اِس خبر کو غلط نہ کر دیں تو یہی سمجھنا چاہیئے کہ رُوما کی فتح ہوگی۔

لیوکوس۔ خدا تمہیں ہمیشہ ایسے ہی سچے خواب دکھائے اور کبھی وہ غلط نہ ہوں۔ ہائیں۔ ٹھہرو۔ دیکھو یہ لاش کیسی ہے جس کا سر غائب ہے۔ شکستہ آثار بتا رہے ہیں کہ مسمار ہونے سے پہلے یہ عمارت بڑی شاندار ہوگی۔ اور یہ غلام کیسا ہے جو لاش پر پڑا سوتا ہے۔ غالباً یہ بھی مر گیا ہے کیونکہ فطرت اجازت نہیں دیتی کہ کوئی زندہ مردہ کو اپنا بستر بنائے۔ یا مُردے پر پڑکر سو رہے۔ ذرا اِس لڑکے کی صورت دیکھنے دو۔

کپتان۔ حضور لڑکا زندہ ہے۔

لیوکوس۔ اُس سے پوچھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ لاش کس کی ہے۔ لڑکے تو اپنا حال بتا۔ کیونکہ تیرا حال معلوم کرنا ضروری ہے۔ یہ کون ہے جسے تو نے اپنا خُون آلود تکیہ بنایا ہے۔ اور وہ کون تھا جس نے فطرت کی اس تصویر کو اس طرح بگاڑ کر اُس کو بدل دیا۔ اور اس خرابے و ویرانے سے تیرا کیا تعلق ہے۔ یہ واقعہ کیونکر پیش آیا۔ یہ کون تھا اور تم کون ہو۔

ایموجن۔ میں تو کچھ نہیں ہوں۔ یا جو کچھ ہوں اس سے کچھ نہ ہوتا۔ میرے حق میں بہتر ہوتا۔ یہ میرا آقا تھا۔ یہ بڑا جری و بہادر برطانوی تھا اور بڑا نیک شخص تھا۔ پہاڑ کے وحشیوں نے اُسے مار ڈالا۔ افسوس اب ایسے آقا کہاں ملتے ہیں۔ مشرق سے مغرب تک بھی نوکری کیلئے کوئی ڈھونڈتا پھرے۔ بہت سے آقاؤں کی آزمائش کرے۔ اچھے بھی ملیں گے۔ خدمت بھی ایمانداری سے کی جائے گی۔ یہ سب کچھ دُرست مگر ایسا آقا اب نصیب نہ ہوگا۔

لیوکوس۔ افسوس لڑکے تیرا بیان سُنکر دل پر وہ اثر ہوتا ہے کہ اس خُون کو دیکھکر نہیں ہوتا۔ اچھا بتا اسکا نام کیا تھا۔

ایموجن۔ "رچرڈ و ڈیکیپ" (علیحدہ کہتی ہے) میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ مگر اس میں کسی کا نقصان نہیں کرتی۔ مگر خدا سُن رہا ہے اُمید ہے کہ وہ میرا قصور معاف کر دے گا۔ آپنے کیا فرمایا؟

لیوکوس۔ اور تمہارا نام کیا ہے؟

ایموجن۔ حضور مجھے فیدلی کہتے ہیں۔

لیوکوس۔ تو اسم بامسمّی ہے۔ تیری وفاداری پر یہ نام خُوب پھبتا ہے۔ تیری وفاداری ہی تیرا نام ہے۔ کیا تو میری ملازمت قبول کریگا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جیسا تیرا پہلا آقا تھا ویسا ہی آقا میں ثابت ہونگا۔ لیکن یقین رکھ کہ میری محبت بھی اِس سے کم نہ ہوگی۔ اگر رُوما کے قیصر کے سفارشی

خطوط بھی کسی قنصل کے ذریعے میرے پاس آتے خود تیرا حال جتنا تیرا اسفارشی بنتا ہے وہ نہ ہوتے۔ آؤ ہمارے ہمراہ چلو۔

ایموجن۔ میں حضور کے ساتھ ہوں لیکن ہمراہ چلنے سے پہلے اپنے آقا کی لاش کو مکھیوں سے بچانے کیلئے اپنی انگلیوں سے گڑھا کھودلوں اور اس گڑھے میں اُسے دفن کرکے اُس پر جنگل کے کچھ پھول ڈالدوں اور جو دعائیں مجھے یاد ہیں وہ اُس پر پڑھ لوں اور جی کھول کر اُس کے لئے رولوں تو پھر آقا کی اس خدمت سے فارغ ہوکر میں حضور کے ہمراہ چلنے کو تیار ہوں۔ اور پھر حضور مجھے اپنا ملازم سمجھیں۔

لیوکوس۔ اے لڑکے! آقا نہیں میں تو باپ بنکر تیری پرورش کرونگا۔ دوستو! دیکھو یہ لڑکا ہم کو کیسی مردانہ باتیں سکھاتا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم کوئی بہت ہی خوبصورت جگہ جہاں پھول کھل رہے ہوں تلاش کریں اور وہاں اپنے ہتیاروں سے قبر کھودیں اور اس لاش کو اپنے ہاتھوں سے اٹھاکر دفن کریں۔ لڑکے اب تیرا یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے اور یہ لاش ایک سپاہی کی لاش کی طرح جملہ فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کی جائے گی اب تو خوش ہو۔ آنکھوں سے آنسو پونچھ۔ بعض پستیاں بھی ایسی ہوتی ہیں کہ وہی زیادہ بلندیوں پہ پہونچنے کا باعث ہوجاتی ہیں۔

تیسرا منظر۔ قصر شاہی کا ایک کمرہ۔ بادشاہ سمبلین۔ امراء، پسانیو اور خدام شاہی داخل ہوتے ہیں۔

سمبلین۔ خادم، پھر جاکر خبر لا کہ ملکہ کا مزاج اب کیسا ہے۔ اور وہ کہاں ہیں۔

(ایک خادم جاتا ہے)

ملکہ اپنے فرزند کے کہیں نکل جانے سے بیمار پڑگئی ہے اور حملہ جنون کا سا معلوم ہوتا ہے۔ جان کو خطرہ ہے۔ خدایا اس حال کو دیکھکر میرا دل کیسا بگڑا جاتا ہے۔ ایموجن جو میرے دل کی چین و راحت کا بڑا ذریعہ تھا کہیں چلی گئی۔ ملکہ بیمار ہوکر بستر پر پڑی ہیں۔ اور تھوڑا ہی زمانہ باقی ہے کہ ایک سخت جنگ پیش آئے گی۔ ملکہ کا فرزند بھی کہیں نکل گیا جس کی اس وقت سخت ضرورت تھی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اب چین و آرام مجھے کبھی نصیب نہ ہوگا۔ (پسانیو سے کہتا ہے) مگر مجھے اے شخص ضرور علم ہے کہ ایموجن کہاں گئی ہے۔ تو انجان بنتا ہے مگر یاد رہے کہ تجھے سخت سے سخت اذیتیں پہونچاکر ہم کل حال معلوم کرلینگے۔

پسانیو۔ عالی جاہ! یہ جان حضور ہی کی دی ہوئی ہے اور حضور ہی کے لئے حاضر ہے۔ مجھے مطلق علم نہیں کہ شہزادی صاحبہ کہاں تشریف رکھتی ہیں۔ اور کیوں یہاں سے تشریف لے گئی ہیں اور نہ یہ جانتا ہوں کہ کب تک واپس آئینگی بادشاہ سلامت! میری درخواست ہے کہ حضور مجھے اپنا خادم جانثار سمجھیں۔

پہلا امیر۔ خداوند نعمت! گذارش ہے کہ جس دن سے شہزادی صاحبہ تشریف لے گئی ہیں، یہ شخص برابر یہیں موجود رہتا ہے۔ میں ضمانت لیتا ہوں کہ یہ آدمی سچا ہے۔ حضور جو حکم اسے دینگے وہ سچی نیت اور خیر خواہی سے انجام دے گا۔ رہا ملکہ سلامت کا فرزند کلوٹن تو اُن کی تلاش میں زیادہ تردد کی ضرورت نہیں، وہ تو یقینی مل جائے گا۔

سمبلین۔ وقت بُرا آیا ہے۔ (پسانیو سے کہتا ہے) ہم تمہیں ایک خاص مدت کیلئے رہا کرتے ہیں۔ ہمارا شبہ ابھی تک تم پر ہے۔

پہلا امیر۔ اب یہ گذارش اور ہے کہ رومانی فوجیں۔ گالیا (فرانس) سے جمع ہوکر ہمارے ساحل پر اُتر آئی ہیں اور انکے علاوہ روما کی مجلس نے وہاں کے شرفا کی بڑی بڑی جماعتیں لڑنے کیلئے بکثرت روانہ کی ہیں۔

سمبلین۔ اب ضرورت تھی کہ ملکہ اور اُس کے فرزند سے مشورہ کرتا۔ ان پیچ در پیچ معاملات نے تو مجھے پریشان کردیا ہے۔

پہلا امیر:۔ عالیجاہ۔ دشمن کے مقابلے کیلئے جیسی کچھ بھی اس کی قوت سُننے میں آئی ہے جنگی تیاریاں حضور کی بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اگر دشمن فوجیں اور زیادہ بھیجے تو حضور اُن کے مقابلے کے لئے بھی تیار ہیں۔ جو کچھ کمی ہے وہ یہ ہے کہ اپنی فوجوں کو نقل و حرکت میں کھینچکر لایا جائے۔ حالانکہ وہ آگے بڑھنے کیلئے بیقرار ہیں۔

سمبلین:۔ ہم تمہارے شکر گذار ہوتے۔ اب ہم جانا چاہتے ہیں۔ اور اُمید رکھتے ہیں کہ وقت پر حسب ضرورت تمام مشکلات کو رفع کرنے کے لئے تم آمادہ اور تیار ہونگے۔ ہمیں اس بات کا خوف نہیں ہے کہ اٹلی ہماری پریشانی کیلئے کیا کچھ کریگا۔ لیکن جو اتفاقات پیش آرہے ہیں ان سے البتہ خائف ہیں۔

(سب چلے جاتے ہیں)

پسانیو:۔ جس خط میں مَیں نے آقا کو اطلاع دی تھی کہ ایموجن قتل کردی گئی ہے اُس خط کا آج تک کوئی جواب نہیں آیا۔ سخت حیرت میں ہوں۔ اور نہ شہزادی صاحبہ کا کچھ حال معلوم ہوا حالانکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی خیر خبر برابر دیتی رہیں گی۔ اور نہ یہ معلوم ہوا کہ کلوٹن پر کیا گذری۔ غرض کہ سب طرف سے سوائے فکر و پریشانی کے اور کچھ نہیں جس بات میں مَیں ہی سب سے بڑھکر سچا اور ایماندار ثابت ہونگا۔ اس وقت جو لڑائیاں ہونے والی ہیں اُن سے پتہ چلے گا کہ مجھے اپنے ملک سے کس درجہ محبت ہے اور جب وقت آئے گا تو بادشاہ بھی میرے حبِ وطن کے قائل ہوجائیں گے مَیں ان لڑائیوں میں لڑکر اپنی جان دونگا۔ پھر جو کچھ شکوک میری نسبت ہونگے وہ بھی صاف کردونگا۔ تقدیر تو وہ چیز ہے جو ایسی کشتیوں کو بھی جن کا کوئی ناخدا نہیں ہوتا امن و عافیت کی جگہ پہونچا دیتی ہے۔

چوتھا منظر:۔ ویلز کا علاقہ۔ بلاریوس کے غار کے سامنے بلاریوس، گدریوس اور اروبرگس داخل ہوتے ہیں:۔

گدریوس:۔ یہ چاروں طرف کیسا شور ہے۔

بلاریوس:۔ ہمیں اب یہاں سے کہیں اور چلا جانا چاہیئے۔

اروبرگس:۔ اگر ہر کام سے یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہا تو بتایئے کہ اس میں زندگی کا کیا خاک لُطف ہوگا۔

گدریوس:۔ واقعی اگر کہیں چُھپ کر بیٹھ گئے تو پھر کیا اُمید ہوسکتی ہے۔ اگر یہی طریقہ رکھا تو ایک طرف سے رومانی اور دوسری طرف سے برطانیہ والے آکر ہمارا کام تمام کردینگے۔ یا شروع میں وحشی سمجھ کر کچھ دنوں اپنا کام نکالیں گے اور اس کے بعد قتل کردیں گے۔

بلاریوس:۔ لڑکو! ہم پہاڑوں میں اوپر چڑھتے ہوئے بلند مقاموں میں پہونچ جائیں گے اور وہاں تمام آفات سے محفوظ رہینگے۔ شاہی فوجوں میں ہماری شرکت کسی طرح ممکن نہیں، کیونکہ کلوٹن کو ہم نے ابھی قتل کردیا ہے ہمیں کوئی جانتا نہیں اور نہ ہم کسی لڑنے والے فریق میں شریک ہیں۔ یہی وجہ ہماری گرفتاری کی ہوجائے گی۔ جواب طلب کیا جائے گا کہ ہم کہاں رہتے ہیں اور ہم سے وہ جُرم قبول کرالیا جائے گا جس کے ہم مرتکب ہوئے ہیں۔ پھر ہمارے جُرم کی سزا سوائے اسکے کچھ نہ ہوگی کہ اذیتیں تکلیفیں اُٹھا کر ہم جان سے مارے جائیں۔

گدریوس:۔ آپ کی یہ باتیں نرے وہم ہی وہم ہیں۔ اس سے ہمارا اطمینان نہیں ہوگا کہ ہم اونچے پہاڑوں پر کہیں جاکر چھپ جائیں اور نہ آپکو ایسا مشورہ دینا زیب دیتا ہے۔

اروبرگس:۔ بھلا غور کیجئے کہ جب رومانی مرکب سواریوں کے گھوڑے ہر طرف ہنہناتے ہونگے۔ لشکروں میں جابجا آگ لگ رہی ہوگی اور سب کے گوش و چشم نہایت اہم اُمور کے خیال میں مصروف ہونگے جیسا کہ اس وقت حال ہو رہا ہے تو اس وقت ہماری طرف کون متوجہ ہوگا۔ اس امر کی تحقیق میں وقت ضائع کریگا کہ ہم کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔

بلاریوس ۔ فوج میں بہت لوگ ایسے ہیں جو مجھ سے واقف ہیں۔ برسوں کی بات ہے مگر خیال کرو کہ کلوٹن اس وقت بہت کمسن تھا مگر اس کی صورت اب تک یاد رہی۔ علاوہ اس کے بادشاہ کو میری خدمت پسند نہیں آتی اور تم سے محبت و الفت کرنیکا موقع بھی اسے نہ ملا۔ پھر میری جلاوطنی کی وجہ تم دونوں کی تعلیم تربیت بھی بخوبی نہ ہو سکی، اس صحرائی زندگی میں طرح طرح کی سختیاں اٹھانی پڑیں۔ اس حالت میں یہ امید عبث ہوگی کہ تمہارے شاہی حسب و نسب کا خیال کر کے تمہارے ساتھ سلوک کیا جائے۔ بلکہ انہی پہاڑوں میں رہنا ہوگا۔ گرمی سے رنگت سیاہ رہے گی اور جاڑے میں سردی سے ہمیشہ کانپتے رہتے رہیں گے۔

گدریوس ۔ یہ جو کچھ بھی ہو۔ اب اجازت دیجئے کہ ہم لشکر میں جائیں۔ مجھے اور میرے بھائی کو تو کوئی نہیں پہچانتا اور اب تو آپ کو بھی لوگ بھول گئے ہونگے۔ یہاں برسوں سے رہتے رہتے آپ اتنے تبدیل ہو گئے اور آپ کی ڈاڑھی بھی اتنی بڑھ گئی ہے کہ کوئی نہ پوچھے گا کہ آپ کون ہیں بھلا خیال تو کیجئے میرے لئے یہ کیسی شرم کی بات ہے کہ میں نے آج تک کسی آدمی کو مرتے نہیں دیکھا اور نہ سوائے جنگلی بکریوں، بزدل خرگوشوں یا صحرا کے ہرنوں کے کسی کا خون دیکھا۔ جو نہ کبھی گھوڑے پر سوار ہوا ہو سوائے ایک گھوڑے کے جس کا سوار بھی میری طرح تھا کہ جس کے مونہہ پر ہمیز تک نہ تھی مجھے تو اس پاک چمکتے سورج کی طرف دیکھنے سے بھی شرم آتی ہے کہ اس کی روشنی سے نفع اٹھاؤں اور ایسا گمنام رہوں کہ کوئی نہ جانے کہ کون ہوں۔

گدریوس ۔ واللہ میں ضرور جاؤں گا۔ اگر چلتے وقت آپ نے دعائیں دیکر رخصت کیا تو میں لڑائی میں اپنی جان کی احتیاط کر کے لڑوں گا اور اگر آپ نے دعا نہ دی تو پھر رومانیوں کے مقابلے میں جو خطرہ پیش آئے گا اس کی مطلق پرواہ نہ کرونگا۔

اروِیرگیس ۔ میں بھی اس پر آمین کہتا ہوں۔

بلاریوس ۔ جب تم نوجوان ہو کر اپنی جانوں کو اتنا ارزاں سمجھ رہے ہو تو پھر کیا وجہ کہ میں اپنی اس ٹوٹی پھوٹی پرانی پن چوری نادر کی یعنی اپنی جان کی حفاظت کروں۔ لڑکو، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر اپنے وطن اور ملک کی لڑائیوں میں اتفاق سے تم نے جان دی تو جہاں تم مرو گے وہیں موت میں میرا بستر بھی ہوگا۔ چلو آگے بڑھو!

(علیحدہ کہتا ہے۔)

ان کی فطرت عالی اس وقت تک مضطر و بیتاب رہیگی جبتک کہ وہ اپنا نسل شاہی سے ہونا ظاہر نہ کریں گے۔

(سب چلے جاتے ہیں)

جزو خامس

پہلا منظر ۔ برطانیہ ۔ رومانی لشکرگاہ ۔ پوستی مس ہاتھ میں ایک خون آلودہ رومال لئے آتا ہے۔

پوستی مس ۔ اے خون آلودہ کپڑے میں تجھے ہمیشہ اپنے دم کے ساتھ رکھوں گا۔ کیونکہ اس رنگ میں میں نے ہی تجھے رنگوایا ہے۔ لوگو! جن کی شادیاں ہو چکی ہیں اگر تم میں سے ہر شخص یہی وطیرہ اختیار کرے جو میں نے کیا ہے تو تم میں سے کتنے لوگ ہونگے جو ذرا ذرا سی بدگمانی پر اپنی بی بیوں کو ہلاک کرنے پر آمادہ نہ ہو جاتے ہونگے۔ حالانکہ یہ بی بیاں تم سے کہیں بہتر ہونگی۔ اے پیسانیو، ہر نیک ملازم اپنے آقا کے ہر حکم کو بجا نہیں لایا کرتا۔ سوائے اچھے کاموں کے کسی قبیح فعل کے کرنے کی اسے پابندی نہیں ہوا کرتی۔ اے خدا! اگر تو میری سب خطاؤں کی سزا مجھے دیتا تو اب تک اس خطا کیلئے میں کیوں زندہ رہتا جو مجھ سے سرزد

ہوئی ہے۔ پھر ایموجن کی جان بچ جاتی کہ باقی عمر وہ پشیمانی اور ندامت میں گذارتی۔ مَیں بدبخت تو وہ ہوں کہ تو مجھ سے بدلا نکالتی لیکن افسوس۔ اے خدا! تُو تو تھوڑے سے قصور پر دُنیا سے اٹھا لیتا ہے۔ یہ بھی تیری محبت اور تیرا ہی احسان ہے تاکہ وہ جسے اُٹھا لیا جاتا ہے زیادہ گناہوں میں مُبتلا نہ ہو۔ خداوند، بعضوں کو تم موقع دیتے ہو کہ وہ گناہوں میں مُبتلا ہوں۔ جب اُن کے گناہوں کا طومار ہو جاتا ہے تو وہ ڈرتے ہیں اور ڈر کر پشیمان اور نادم رہتے ہیں۔ اور اس سے بھی انہیں نفع بخشتا ہے لیکن ایموجن تو تمہاری ہی چیز تھی۔ اُس کی جان بچا کر تم مجھے سزا دے سکتے تھے۔ مَیں یہاں اٹلی کے شریفوں کے ہمراہ لایا گیا ہوں تاکہ اپنی محبوبہ کی سلطنت کے مقابلے میں لڑوں۔ اے برطانیہ! کیا یہ کافی نہ تھا کہ میں نے تیری وارثہ کو ہلاک کرا دیا۔ اس سے بڑھ کر زخم میں اب تجھے کیا پہونچا سکتا ہوں۔ اے خدا صبر کے ساتھ اب میری یہ التجا سُن لے، اب مَیں اٹلی کی یہ پوشاک جو میرے تن پر ہے اُتار پھینکتا ہوں اور اُس کی جگہ برطانیہ کے ایک غریب کسان کے کپڑے پہنتا ہوں۔ اور بس جس فریق کے ساتھ یہاں تک آیا ہوں اُس کے خلاف لڑونگا۔ اور یوں اپنی ایموجن کے لئے جان دونگا۔ میری زندگی کا ہر نفس سوقت موت سے لبریز ہو رہا ہے۔ اور اب مَیں اس طرح مرونگا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔ نہ کسی کو مجھ پر ترس آئے گا۔ اور نہ کوئی مجھے اب دُشمن نہ کر سکے گا۔ غرضکہ اب خطروں میں پڑ کر اپنی جان تلف کرونگا۔ اور باور کراؤں گا کہ مجھ میں کتنی ہمت اور دلیری ہے گو یہ باتیں اب تک میری عادت کے خلاف ہوئی ہیں۔

(چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر:- رومانی اور برطانوی لشکروں کے درمیان میدانِ جنگ کا ایک موقع۔ ایک طرف سے لیوکوس، یاچیمو اور رومانی فوجیں داخل ہوتی ہیں، دوسری طرف سے برطانوی لشکر آتا ہے۔ لیوتھس پوستی مس ایک غریب سپاہی کے سے کپڑے پہنے برطانوی فوجوں کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔ فوجیں اسٹیج پر سے کوچ کرتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ اسکے بعد یاچیمو اور پوستی مس لڑتے نظر آتے ہیں۔ پوستی مس یاچیمو پر غالب آتا ہے اور اُس کے ہتھیار رکھوا لیتا ہے۔ یاچیمو اسکے بعد چلا جاتا ہے۔

یاچیمو:- میرے قلب پر گناہوں کا جو بھاری پتھر رکھا ہے وہ میری جوانمردی کو غارت کئے ڈالتا ہے میں نے ایک معزز خاتون کو دغا دی ہے جو اس مُلک کی شہزادی ہے۔ یہاں کی ہوائیں انتقام کش ہیں وہ جو مجھے کمزور کئے دیتی ہیں ورنہ ممکن تھا کہ یہ ذلیل آدمی جسے فطرت کا دُر دو تلچھٹ سمجھنا چاہیئے لڑائی میں مجھے مغلوب کر لیتا۔ میرے اعزاز و خطابات جس قدر مَیں رکھتا ہوں وہ سب ذلّت و نفرت کے نشان ہیں۔ برطانیہ! اگر تیرے شُرفا اس ذلیل کمینے سپاہی سے جو ہمارے سرداروں کو بھی لڑائی میں مات کرتا ہے بڑھکر ہیں تو پھر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ تم اتنے انسان نہیں ہو جس قدر کہ دیوتاؤں کا درجہ رکھتے ہو۔

چلا جاتا ہے)

(لڑائی شروع ہوتی ہے برطانیہ کی فوجیں فرار ہوتی ہیں۔ بادشاہ سمبلین کو رومانی گرفتار کر لیتے ہیں۔ اس کے چھڑانے کیلئے بلاریوس، گدریوس اور اروپرگس داخل ہوتے ہیں۔

بلاریوس:- برطانیو! خوب جم کر لڑو۔ ہمّت نہ ہارو۔ لڑنے کیلئے ہمارے پاس زمین اچھی ہے۔ دونوں صفوں کے درمیان جتنی جگہ ہے وہ خوب محفوظ ہے۔ سوائے ہمارے اپنے خوف کے دوسری کوئی چیز نہیں جو لڑائی کے لئے ہمیں مُنہ موڑنے

دے سا۔

گدریوس } ہاں جوانو! جم کر لڑو اور خوب لڑو۔
اروِیرِگیس }

پوستی مس پھر آکر برطانوی سپاہ کو مدد پہونچاتا ہے۔ بادشاہ سمبلین کی سپاہ دشمن کے ہاتھ سے اُسے چھڑا لیتی ہے۔ پھر یہ سپاہ چلی جاتی ہے۔ لیوکوس رومانی سپہ سالار آتا ہے اس کے ہمراہ امیوجن اور یاچیمو ہیں ۔۔۔

لیوکوس :- لڑکے لڑکے فوج میں سے بھاگ کر اپنی جان بچا۔ ابتری سخت ہے۔ خدائے جنگ کی آنکھوں پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے پٹی باندھ دی ہے۔ دوست دوست کو قتل کر رہا ہے۔

یاچیمو :- برطانیہ والوں کو کمک پہونچ گئی ہے۔ طالع شوم نے آج کا دن ہمارے لئے شکست کا لکھ دیا ہے اب خیر اسی میں ہے کہ یا تو کمک آئے ورنہ میدان سے فرار ہونا ضروری ہوگا۔

تیسرا منظر :- میدانِ جنگ کا دوسرا حصہ۔

پوستی مس اور ایک برطانوی امیر آتا ہے۔

امیر :- کیا تم وہاں سے آرہے ہو جہاں لڑائی زور کی ہو رہی ہو؟

پوستی مس :- ہاں! وہیں سے آرہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اُن میں سے ہیں جو لڑائی سے بھاگے ہیں۔

امیر :- ہاں! واقعہ یہی ہے۔

پوستی مس :- اس میں آپ کا کچھ قصور نہیں، شکست میں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ یہ تو تائیدِ غیبی تھی کہ ہرتی لڑائی جیت گئے۔ بادشاہ گرفتار اور اس کی فوجیں پراگندہ ہو چکی تھیں۔ شاہی فوجیں پشت دکھا کر بھاگنے کو تھیں بلکہ ایک تنگ مقام ایسا تھا جہاں سے وہ فرار ہوتی نظر آنے لگی تھیں۔ رومانی اُن کے پیچھے تھے اور شاہی فوجوں کو مارتے مارتے کتوں کی طرح انکی زبانیں باہر نکل پڑی تھیں ہلاک کرنے کیلئے اتنے آدمی تھے کہ رومانیوں کے پاس اس کام کیلئے ہتھیار کافی نہ تھے۔ کسی کو مار کر گرایا، کسی کا خون کیا، کسی کو ہلکا سا زخمی کیا۔ بعض خود خوف سے گرے۔ غرضکہ وہ تنگ درہ برطانیہ کے مُردوں سے پٹ گیا۔ مُردوں میں سب کی پیٹھ پر زخم آئے تھے اور بزدل وہ تھے جنہوں نے جان اس طرح بچائی کہ باقی عمر شرمندگی سے گھل گھل کر مریں۔

امیر :- یہ تنگ درہ کہاں تھا۔

پوستی مس :- جہاں لڑائی ہو رہی تھی اُس کے نزدیک ایک بڑا مستحکم مقام تھا، دونوں طرف صف بندی تھی اور پھوس اور نرسل کے پشتے بنا کر اس کے پشت پر خندقیں کھودی تھیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ ایک بڈھے لڑنے والے کو جو ایما ندار آدمی معلوم ہوتا تھا دشمن کے مقابلے کا اچھا موقع مل گیا۔ یہ بڈھا اسی لائق تھا کہ ملک اس کی خدمت اتنے دن تک کرتا کہ اس کی ڈاڑھی سپید بگلا ہو جاتی۔ وہ اس تنگ درہ پر مع دو جوانوں کے آن ڈٹا۔ یہ دونوں جوان نوعمر لڑکے تھے جن کے دن کھیل کود میں بھاگنے دوڑنے کے تھے نہ کہ ایسی خونی لڑائی میں کشت و خون میں مصروف ہونے کے۔ وہ بڑے خوشرو جوان تھے بلکہ اُن حسینوں سے بھی اُن کا حسن و جمال بڑھا ہوا تھا جو منہ پر نقاب اس غرض سے ڈالتے ہیں کہ رنگ میلا نہ ہو یا اس لئے کہ کوئی اُنہیں پہچانے نہیں۔ اس درے پر قبضہ کر کے اُنہوں نے بھاگتے ہوئے برطانیوں کو للکارا اور کہا کہ "برطانیہ کے جنگلی ہرنوں کو تو بھاگتے دیکھا ہے لیکن مَردوں کو فرار ہوتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اگر تم پھر لڑائی کی طرف نہ پلٹے تو سمجھ لو ہم بھی رومانیوں کی طرح تمہارے دشمن ہو جائیں گے اور پھر اُن جانوروں کی طرح تمہیں جان سے ماریں گے جن کے مثل تم اس وقت بھاگ رہے ہو۔ پس تمہاری خیر اسی میں ہے کہ پلٹ کر اپنے ملک کو دشمن سے بچانے کی کوشش کر دو"۔ غرضکہ یہ تینوں جانباز تین ہزار آدمیوں سے ہمت و دلیری میں کم نہ تھے بلکہ

اُتنے ہی آدمیوں کے برابر میدانِ جنگ میں کام کر سکتے تھے۔ باقی فوج کھڑی تھی اس لئے سمجھنا چاہیئے کہ کُل فوج سے مُراد یہی تین آدمی تھے۔ کچھ تو لڑائی کے موقع کی عمدگی نے مگر زیادہ تر اِن تینوں کی شرافت و شجاعت تھی جو ایک بُزدل عورت کو بھی بہادُر اور جری بنا دے کہ خوفزدہ فراریوں میں ہمت و جرأت پیدا ہوئی اور اُن میں بعض تو شرمندگی مٹانے اور بعض واقعی ہمّت و دلیری کے آجانے سے ایسے عالی ہمّت اور جوانمرد ہو گئے جیسے کہ ابتری اور بھاگڑ سے پیشتر تھے۔ بعض شرمندگی دُور کرنے کو اور بعض جو دوسروں کو بھاگتے دیکھکر بھاگے تھے، اور لڑائی میں اِس قسم کی مثال پیش کرنے کو بدترین گناہ سمجھتے تھے پلٹے اور یہ بھی اِس بُڈھے اور دونوں لڑکوں کی طرح قہر و غضب بنکر اس طرح دُشمن کے مقابلے پر آگئے جیسے جنگل کے شیر برچھیوں سے زخمی ہو کر شکاریوں پر حملہ کرتے ہیں۔ اب لڑائی میں ایک آن کو کچھ سکوت سا پیدا ہوا۔ رومانی جو فراریوں کے تعاقب میں تھے کچھ رُکے اور پھر اُن میں ابتری پڑتے ہی بھاگڑ پڑی اور اب یہ حال ہے کہ جو پہلے شاہیں اور عقاب کی طرح جھپٹے مارتے تھے اب وہ مُرغی کے بچوں کی طرح جان بچانے کو زمین پر دبکنے لگے اور کچھ دیر پہلے جو فاتح بنکر آگے بڑھے چلے جاتے تھے اب وہ غلاموں کی طرح پسپا ہونے لگے اور ہمارے وہی آدمی جو پہلے بزدل ثابت ہوئے تھے انہوں نے اس سرے ایسے کھانے کی طرح جو دُور دراز کے جہازی سفر میں زندگی بخشتا ہے دیکھا کہ دشمن بھاگ رہا ہے یہ دیکھکر انہوں نے بھاگتوں کو بُری طرح زخمی کیا بعض نے اُن پر جو مرے پڑے تھے اور بعض نے اُن زخمیوں پر جو پہلے حملے میں جاں بلب ہو کر زمین پر پڑے تھے ہاتھ صاف کیا اور بعض نے اپنے ہی دوستوں پر انہیں دُشمن سمجھ کر وار کیا۔ ایک ایک نے دس دس کا پیچھا کر کے

بیس بیس کو ہلاک کیا۔ اور وہ بھی جو معلوم ہوتا تھا کہ زمین پر مرے پڑے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے اُس وقت میدانِ جنگ کے بھوت اور سُورما بن گئے۔

امیر:- یہ بھی کچھ عجیب اتفاق تھا کہ ایک تنگ درہ ملجائے اور ایک بوڑھا اور دو لڑکے یہ یہ عجیب و غریب کام دکھائیں۔

پوستی مس:- نہیں تعجب نہ کیجیئے۔ گو آپ لوگ تعجب کرنیکے لئے ہیں، کچھ کرنے کے لئے نہیں بنائے گئے۔ بس بہتر ہوگا کہ اب اِن واقعات کو نظم کر کے بطور ایک لطیفہ کے شائع فرمائیں۔ مضمون صرف اِتنا ہو کہ دو لڑکوں اور ایک بُڈھے نے، اور بُڈھا بھی ایسا جس کے بڑھاپے کو دوسرا لڑکپن کہیئے اور ایک اور آدمی نے برطانیہ والوں کی جان بچادی اور رومانیوں کو غارت کر دیا۔

امیر:- مگر آپ اتنا خفا کیوں ہوتے ہیں۔

پوستی مس:- افسوس خفا ہونے سے حاصل ہی کیا۔ جو دُشمن کے مقابلے پر نہ ٹھہرے۔ میں تو اُسے اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ جب کسی کو بھاگنا ہی مقصود ہو تو کیوں نہ بھاگے مگر اسکے ساتھ اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ ایسا آدمی میری دوستی سے بھی جلد بھاگ نکلے گا۔ آپنے تو واقعی مجھے شاعر بنا دیا۔

امیر:- آپ تو درحقیقت خفا ہو گئے۔ لیجیئے خُدا حافظ۔

پوستی مس:- کیا آپ ابھی تک بھاگ رہے ہیں (علیحدہ کہتا ہے)۔ آپ دربار کے امیر یا شریفوں میں رذیل ہیں۔ اس سے بدتر کیا بات ہو سکتی ہے کہ میدانِ جنگ میں یہ نفسِ نفیس موجود ہیں اور مجھ جیسے ادنیٰ آدمی سے دریافت کرتے ہیں کہ لڑائی کا کیا حال ہے۔ آج کتنے ہونگے جنہوں نے جان بچانے کو بھاگے بھی مگر جان نہ بچی۔ رہی میری جان تو وہ تو مصیبت اور ذلت کا ایک طلسم ہے موت کی تلاش میں نکلا۔ مگر موت مجھے وہاں بھی نہ آئی۔ جہاں جان توڑتے سپاہی کرب و تکلیف میں تڑپتے اور

کراہتے تھے اور نہ وہاں اُس نے پوچھا جہاں زور کی لڑائی میں موت کا بازار گرم تھا، موت ایک کریہہ منظر بھوت ہے جس کے کارگزاروں میں کچھ ہم ہی نہیں ہیں جو اس کے لئے چھریاں اور خنجر چلاتے ہیں بلکہ وہ تو شراب کے چمکتے پیالوں، نرم بستروں اور شیریں تقریروں میں بھی چھپا بیٹھا ہے کہ اس کے مقاصد خوب پورے ہوتے رہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہو بہرکیف مجھے موت سے ملاقات کرنی ہے۔ گو اُس وقت میں برطانیوں کا دوست بنا ہوا تھا مگر اب پھر رومانی بنا جاتا ہوں، گو دراصل برطانوی ہوں مگر رومانیوں کے ساتھ رومانی بنکر یہاں آیا تھا۔ اب میں کسی سے نہ لڑونگا بلکہ کمینے سے کمینہ آدمی جو میرے کندھے پر ہاتھ رکھے گا اُسکے سامنے گردن پیش کر دونگا۔ رومانیوں نے یہاں بہت کُشت وخُون کئے۔ اب اتنا ہی زیادہ کُشت وخُون برطانیوں کو کرنا ہے، رہا میں، تو میرا فدیہ تو صرف موت ہے۔ کسی فریق کا بھی حامی بنوں۔ بہرکیف مجھے تو مرنا ہے نہ اب میں یہاں جیونگا۔ اور نہ اس جان کو اپنے ساتھ کہیں لے جاؤں گا جو کچھ بھی ہو مجھے تو کسی نہ کسی طرح ایموجن کیلئے جان دینی ہے۔

(دو برطانوی کپتان اور سپاہی آتے ہیں)

پہلا کپتان:۔ خُدا کا شکر ہے کہ رومانی سپہ سالار لیوکوس گرفتار ہو گیا۔ لوگوں کا خیال کہ وہ بڈھا اور دونوں لڑکے دراصل فرشتے تھے۔

دوسرا کپتان:۔ ایک چوتھا آدمی بھی ذلیل سے کپڑے پہنے ساتھ تھا۔ وہ بھی اس بڈھے اور دونوں لڑکوں کے ساتھ رومانیوں سے خوب خوب لڑا ہے۔

پہلا کپتان:۔ ہاں بیان تو یہی کیا جاتا ہے مگر ان چاروں میں اب تک کسی کا پتہ نہیں چلا ہے ...... کھڑے رہو تم کون ہو۔

پوستی مس:۔ میں ایک رومانی ہوں۔ میرے ساتھی اگر مجھے یوں نہ چھوڑ جاتے تو میں کاہیکو یہاں ہوتا۔

دوسرا کپتان:۔ اس رومانی کتے کو گرفتار کرلو۔ رومانی کی ٹانگ تک یہاں کا قصہ سُنانے کو اپنے ملک کو واپس نہ جانے پائے گی یعنی یہ بتانے کو کہ یہاں چیل کوّوں نے اُن کی لاشوں کو کیسا کھایا ہے۔ یہ ذلیل رومانی تو اپنے کام ایسے بیان کرتا ہے کہ گویا کوئی بڑا افسر تھا۔ اسے ہم اپنے بادشاہ کے سامنے لے جائیں گے۔

(سمبلین، بلاریوس، گدریوس، اوریجس، پسانیو مع چند خدام شاہی اور رومانی اسیرانِ جنگ کے آتے ہیں۔ دو کپتان پوستی مس کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرتے ہیں۔ بادشاہ اُسے داروغہ جیل کے سپرد کرتا ہے۔)

(باقی آئندہ)

عنایت اللہ۔ دہلوی

تائیس:۔ یورپ کے بہترین مصنف کی بہترین تصنیف کا اُردو کے بہترین مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی کے قلم سے ترجمہ۔ یہ فرانسیسی مصنف اناطولِ فرانس کا شہ پارہ ہے۔ اس میں جسم ورُوح کے تصادم کے مسئلہ کو مصرِ قدیم کی ایک عروسِ بازاری کی داستان کے طور پر نہایت دلفریبی سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ ناول تمام دُنیا کی ادبیات میں نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ عنایت اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ ایسی قادر الکلامی اور اعجاز بیانی سے کیا ہے کہ اُردو میں ادبِ لطیف کی ایک غیر فانی یادگار بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے علاوہ محصولڈاک ۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی ۔

بلندیٔ نگاہ

نگاہ کی بلندیوں کا نام جانِ پاک ہے
جگر کی ارجمندیوں کا نام جانِ پاک ہے
ملا ہوا ہے مشتِ خاک کو جو وقفِ سوزِ دل
اسی کی دردمندیوں کا نام جانِ پاک ہے

نگاہ کی بلندیاں ہی عرش ہیں شعور کا
نگاہ کی بلندیاں ہی جام مئے طہور کا
لطیف سی جھلک تھی اک بلندیٔ نگاہ کی
کلیم ترجمان ہوا تھا جس پہ شمعِ طور کا

نگاہ کی بلندیاں بلندیٔ حیات ہیں
نگاہ کی بلندیاں عیارِ کائنات ہیں
نگاہ کی بلندیوں کی انتہا نہیں کوئی
نگاہ کی بلندیاں جہانِ بے جہات ہیں

نگاہ کی بلندیوں کی زد میں ماورائے عرش
نگاہ کی بلندیوں کا منتہا خدائے عرش
نگاہ کی بلندیاں ہیں وہ بلندیاں کہ جو
نگاہِ اہلِ حق میں ہیں بپائے ایں بنائے عرش

امین حزیں (سیالکوٹی)

خط

منوّر خاں کارخانے میں مُلازم تھا۔ چالیس روپے ماہوار ملتے تھے۔ ایک بیوی تھی اور ایک لڑکا اکبر۔ لیکن اکبر کچھ آوارہ مزاج تھا۔ گھر سے تو مدرسے آتا۔ لیکن یہاں دو ایک گھنٹے بیٹھکر باقی وقت گھوم گھام کر گُذار دیتا۔ عُمر کے ساتھ ساتھ آشفتہ مزاجی بھی زور پکڑ رہی تھی۔ ماںتا کی ماری ماں منوّر سے کبھی شکایت نہ کرتی۔ اور جو وہ کہیں اِدھر اُدھر سے کچھ سُن بھی پاتا تو چشم پوشی سے کام لیتا۔ کیونکہ زندگی کا حاصل بھی تو یہی ایک بچہ تھا۔

منوّر خاں جو چالیس روپے لاتا اس میں سے پانچ روپے تو مکان کے کرایہ کے ہی اُٹھ جاتے۔ پانی نل سے وہ خود بھر لاتا۔ ایک روپیہ ماہوار مہترانی لے جاتی۔ کوئی روپیہ ڈیڑھ روپیہ دھوبن کا اُٹھتا اور چار روپے ماہوار اکبر کی تعلیم کا خرچ تھا۔ کپڑا لتّا اور کھانا پینا اس کے علاوہ تھا۔ منوّر کی بیوی رضیہ ایک بہت سمجھدار اور دُور اندیش عورت تھی۔ ہر مہینے دو ایک روپے ضرور پس انداز کر لیتی۔ لیکن اس پر بھی اکبر کا جو داؤ لگ جاتا تو کچھ نہ کچھ اُڑا لے جاتا۔ لیکن رضیہ نہ لختِ جگر سے کچھ کہتی نہ شوہر سے شکایت کرتی۔

مُلک کی اقتصادی حالت خراب ہونے سے جب مُلازموں پر تخفیف کا کلہاڑا چلنے لگا تو اسکی زد سے منوّر بھی نہ بچا اور لگا لگایا روزگار سرمایہ دار کی ایک جنبشِ قلم سے ہاتھ سے نکل گیا۔

مُلازمت سے برطرف ہونے کی پہلی رات تھی۔ منوّر کھاٹ پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا۔ رضیہ ایک دوسری کھاٹ پر سو رہی تھی۔ اکبر کی چارپائی باہر دالان میں تھی۔ رضیہ کی جو آنکھ کھلی تو شوہر کو بیدار پاکر بولی "تم جاگ رہے ہو؟!"

"نیند نہیں آتی" منوّر نے جواب دیا۔

"جانے کیا وقت ہوگا؟" رضیہ نے ایک جمائی لیکر کہا۔

"صبح ہونے کو ہے!" منوّر نے جوابدیا

"مجھے بھی جگا لیا ہوتا!" رضیہ بولی۔

"میں تو پریشان ہوں" منوّر کہنے لگا "تمہیں بھی پریشان کرتا"

دونوں خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد محلّے کی مسجد سے نعرۂ تکبیر بلند ہونے لگا "اللہ اکبر! اللہ اکبر"

کتنی پُرسطوت آواز تھی اور کیسی سکوت آمیز فضا۔ آسمان کی طرف دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ستاروں کا قافلہ بھی رُک گیا ہے۔ جب اذان ہو چکی تو منوّر کہنے لگا "سچ ہے! خُدا مصیبت میں ہی یاد آتا ہے"

"اُٹھو نا پھر!" رضیہ بولی "نماز ہی پڑھ لو"

"ہاں!" منوّر کہنے لگا "اب نمازیں ہی تو پڑھنی ہیں اور کام ہی کیا ہے!"

"توگویا!" رضیہ بولی "نماز تمہارے لئے شغل بیکاری ٹھیرا۔ توبہ کرو توبہ! اُٹھو وضو کرو۔ سُنا نہیں کہ صبح کی دُعا ضرور قبول ہوتی ہے"

"تمہاری تو کبھی قبول نہ ہوئی" منوّر نے طنزاً کہا "دُعاؤں میں اثر ہوتا تو آج بیکار کیوں بیٹھا ہوتا"

"اسے کہتے ہیں کفرانِ نعمت!" رضیہ نے جواب دیا۔

"جو اچھی اور فائدے کی بات ہوئی اسے اپنی محنت اور کرامت سمجھ لیا اور جو کہیں شامتِ اعمال سے کچھ کھو یا گیا تو اسے اللہ میاں کے سر تھوپ دیا۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ ہماری روزی کے فکر سے بھی غافل نہیں۔"

"ہاں سچ ہے!" کہتے ہوئے منور اٹھا اور نماز کی تیاری کرنے لگا۔

آسودگی اور آرام کے بعد مفلسی اور تنگدستی جیسی کچھ روح فرسا ہوا کرتی ہے ظاہر ہے۔ بیشتر آدمی اس امتحان میں مشکل سے ہی پورے اترتے ہیں۔ اور جو کہیں بال بچوں والا گھر ہو تو بڑے بڑے حوصلے والوں کے بھی چھکّے چھوٹ جاتے ہیں۔ اور زمانہ تو رنگ بدلتا ہی رہتا ہے۔ امروز فردا کی چکّی ایک ہی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ لیکن یہ اپنی اپنی قسمت ہے کسی کی آرام سے کٹ گئی اور کسی کی ٹھوکریں کھاتے بسر ہو گئی۔ بہرحال قسمت کا لکھا ہو کر رہتا ہے۔ ہونی کی روک نہ عقل سے ہو سکتی ہے نہ تدبیر سے۔ بس وہی سچ ہے۔

سامنے تقدیر کے رسوائیِ تدبیر دیکھ

منور خاں کو بیکار بیٹھے بہت دن ہو چکے تھے۔ صبح سے شام تک تفکرات کی دنیا میں کھویا رہتا۔ مفلسی اور بیکاری تو تھی ہی لیکن اکبر کی آوارگی سب سے زیادہ سوہانِ روح ہو رہی تھی۔ صبح نکلا تو شام کو آیا اور کبھی دو دو روز غائب!

رات کا وقت تھا برکھا ہو رہی تھی۔ منور کھاٹ پر لیٹا کچھ گنگنا رہا تھا۔ رضیہ چولھے کے پاس بیٹھی اکبر کی راہ دیکھتی تھی۔ کبھی کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوتی اور کواڑ کھول کر گلی میں ادھر اُدھر جھانکنے لگتی۔ کھڑکی کے راستے جب ہوا کا جھونکا آتا تو لالٹین کی بتی جھلملانے لگتی۔

"کیوں بار بار کھڑکی کھولتی ہو؟" منور بولا۔ "بارش تو ہو ہی رہی ہے۔"

"ہاں!" رضیہ بولی۔ "بارش تو ہو رہی ہے۔ لیکن میں تو اکبر کی راہ دیکھتی ہوں۔ کہیں بھیگ رہا ہو گا غریب۔ جانے کیا بجا ہے؟"

"گیارہ بج چکے!" منور نے جواب دیا۔

"گیارہ؟" رضیہ نے تعجب سے کہا۔ "میرے اکبر نے تو ابھی روٹی بھی نہیں کھائی۔"

پھر ہنڈیا کو ہاتھ سے چھو کر۔ "سالن تو ابھی گرم ہی ہے۔ چپاتیاں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔"

"یہ سب تمہاری کرامت ہے۔" منور بولا۔

"میری کرامت؟" رضیہ نے پوچھا۔

"یہی جو اس کمبخت کے لچھن ہیں۔" منور نے جواب دیا۔ "پکا شُہدا ہو گیا ہے، نہ شرم نہ حیا!"

"توبہ ہے!" رضیہ نے کہا۔ "ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ سیانا ہو گا تو خود ہی سمجھ جائے گا۔"

"سبحان اللہ!" منور نے طنزاً کہا۔ "سولہ برس کا تو ہو گیا اور سیانا ہونا ابھی باقی ہے۔ تمہارے اس لاڈ پیار نے تو اُسے تباہ کیا ہے۔ کھانے پلانے کا شوق تو تم نے کر لیا لیکن افسوس تربیت کی فکر نہ کی۔ آج اگر کوئی ہنر ہاتھ میں ہوتا تو چار پیسے کی امید ہوتی۔ میرے پاس ہی سو پچاس ہوتے تو کوئی چھوٹی موٹی دکان ہی کر لیتا۔ گذران تو ہوئی جاتی۔"

"ہاں!" رضیہ نے کہا۔ "کچھ کام کاج تو ضرور کرنا چاہئے۔ بیکار بیٹھے کیسے کٹے گی؟"

"تو نوکری اٹھاؤں؟" منور نے جواب دیا۔ "تمہارا بنا کما چکا اور ہم کھا چکے۔"

"نوکری کیوں اٹھاؤ!" رضیہ کہنے لگی۔ "دو، پونے دو

سو کا زیور موجود ہے۔ کوئی دو اڑھائی سو روپے بھی ہیں۔ لو اور دُکان کرلو۔ اللہ کارساز ہے!"

"اوہو!" منور خوش ہو کر بولا "یہ روپے کہاں سے آئے؟"

"آئے کہاں سے ہیں" رضیہ بولی "تمہارے ہی تو ہیں بس انداز کرتے کرتے رقم ہو گئی! میرے خیال میں تو تم آٹے دال کی دوکان کرلو۔ اکبر بھی تمہارے ساتھ ملکر کام کرنے لگے گا۔"

اکبر کواڑ سے لگا یہ باتیں سن رہا تھا۔ کچھ دیر میاں بیوی میں اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں پھر منور سو رہا۔ اور رضیہ پھر اٹھکر کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اور کواڑ کھول کر ادھر اُدھر جھانکنے لگی۔ بارش ہو رہی تھی: بجلی کوندتی اور بادل گرجتے تھے۔ کچھ جھکڑ بھی چل رہا تھا "اللہ میرے بچے تو خیر سے گھر لائے" کہتی ہوئی کھڑکی بند کر کے کھاٹ پر آلیٹی۔ گھر کا دروازہ اکبر کے لئے اکثر رات بھر کھلا رہتا تھا۔ آج بھی کھلا رہا۔ آخر رضیہ کو بھی نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اب اکبر دبے پاؤں اندر آیا۔ دالان میں لالٹین رکھی تھی۔ ہنڈیا چولھے پر تھی۔ اکبر چپکے سے اسباب والی کوٹھڑی میں گھس گیا۔ دیوار کے پاس ٹرنک رکھا تھا۔ ایک کونے میں مٹی کے دو تین گھڑے ایک دوسرے کے اوپر رکھے تھے۔ کسی میں چھان بورا تھا، کسی میں آٹا۔ رضیہ چابیاں بھی اسی چھان بورے میں چھپا کر رکھا کرتی تھی۔ اکبر نے چابیاں نکال کر ٹرنک کھولا اور زیورات اور نقدی لیکر دبے پاؤں گھر سے نکل گیا۔

بارش تھم چکی تھی اور نو سحر کی برکت سے رات کی ظلمت سیماب پا ہو رہی تھی۔ دالان کی چھت میں چڑیا کا ایک جوڑا رہتا تھا۔ وہ اپنی چڑ چوں سے سونے والوں کو پیغام ہنگامہ آرائی دے رہا تھا۔ رضیہ جاگی۔ لالٹین ابھی تک جل رہی تھی۔ ہنڈیا بھی چولھے پر رکھی تھی۔ چپاتیاں بھی جوں کی توں پڑی تھیں۔ دروازہ بھی کھلا تھا اور اکبر کی کھاٹ بھی خالی تھی۔

"خدا خیر کرے! آج میرا لال آیا نہیں" رضیہ نے ایک جمائی لیکر کہا۔ پھر ضروریات سے فارغ ہو کر نماز کیلئے کھڑی ہو گئی۔ منور ابھی لمبی تانے مزے سے سوتا تھا۔

رضیہ جب نماز سے فارغ ہوئی تو شوہر کو آواز دی۔

"اب اٹھو گے بھی!"

منور نے کروٹ بدلی اور دو ایک بار "ہوں" "اچھا" کہکر پھر سو گیا۔

رضیہ نے پھر آواز دی "اٹھو! نماز کا وقت جاتا ہے۔"

"ہاں اٹھتا ہوں" منور نے لیٹے لیٹے جوابدیا۔

"اٹھو پھر!"

"کہہ تو رہا ہوں!" منور نے ایک جمائی لیکر کہا۔ "اٹھتا ہوں"

رضیہ کسی کام کو اسباب والی کوٹھڑی میں گئی۔ لیکن ٹرنک کھلا دیکھکر یہ حالت ہوئی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ کانپتے کانپتے کپڑے اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہاں نہ زیور تھا نہ روپیہ۔ غریب سر تھام کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔

"کون آیا؟ کون نکال لے گیا؟ اکبر کے سوا تو چابی کا کسی اور کو علم نہ تھا۔"

اتنے میں منور اٹھا اور بیٹے کی کھاٹ خالی دیکھکر بولا۔ "کمبخت آج بھی نہیں آیا۔ کیا بنے گا اس کا۔ خدا اولاد دے تو نیک دے۔"

پھر بیوی سے کہنے لگا "تم اندر بیٹھی کیا کر رہی ہو؟"

پھر دروازے کے پاس کھڑے ہوکر اور ہنسکر "روپے گن رہی ہو کیا؟"

لیکن جب کچھ جواب نہ ملا تو اندر چلا گیا۔

"ارے! یہ تم رو کیوں رہی ہو؟"

رضیہ نے شوہر کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز سے کہا "یہاں تو خاک بھی نہیں۔"

"کیا؟" منوّر نے تعجب سے پوچھا "کیا کہہ رہی ہو؟"

"صندوق کھلا پڑا ہے" رضیہ بولی۔

"روپے لے گیا کوئی؟" بیساختہ منوّر کے مُنہ سے نکلا "اور زیور؟"

"گیا!" رضیہ نے جواب دیا۔

منوّر ایک آہ بھر کر بیوی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور ٹرنک میں سے جلدی جلدی کپڑے نکال نکال کر ایک طرف رکھنے لگا۔

"لے کون گیا؟"

"اللہ ہی جانے!"

"چابی کہاں تھی؟"

"چابی تو یہاں چھان والے مٹکے میں رکھی تھی" رضیہ روتے ہوئے بولی۔

"صبر کرو"

"اب ہوگا کیا؟"

"صبر!" منوّر نے جواب دیا "اکبر کے لچھن تو ایک دنیا کو معلوم ہیں کسی سے کچھ کہو سُنو گی تو اپنی ہی بدنامی ہوگی"

دونوں کوٹھڑی سے نکلکر دالان میں آبیٹھے۔

اس واقعہ کو کئی روز ہو چکے تھے۔ اور اکبر اس روز سے گھر نہیں آیا تھا۔ منوّر نے سارا شہر چھان مارا لیکن بیٹے کا کہیں سُراغ نہ ملا۔ یہ آخری سہارا بھی جاتے رہنے سے دونوں مکان چھوڑ کر روپے ڈیڑھ روپے ماہوار کی کوٹھڑی میں اُٹھ آئے۔ دس پانچ برتن جو گھر میں تھے وہ بھی بیچ ڈالے۔ لیکن رضیہ پر ایک وصف تھا ہر حال میں راضی برضا رہتی۔ دونوں وقت کھانے کو ملے یا ایک وقت کیا مجال جو حرف شکایت زبان پر آئے۔ منوّر جب دن بھر گھوم گھام کر اور مایوس ہوکر گھر آتا تو وہ اُسے بھی تسلی دیتی۔

ایک روز اُسے بہت متفکر دیکھکر کہنے لگی "کبھی تو ہمارے دن بھی پھرینگے۔ کیوں پریشان ہو رہے ہو؟"

"ہاں!" منوّر نے کہا "جب ہم قبر میں ہونگے"

"تم کہو تو میں کسی گھرانے میں نوکری کرلوں" رضیہ کہنے لگی۔

"تم نوکری کروگی" منوّر بولا "نہیں رضیہ! اب میں محنت مزدوری کروں گا"

"وہ کیوں؟" رضیہ نے کہا "سینا پرونا میں جانتی ہوں۔ کھانا بھی پکا سکتی ہوں۔ کیا ہرج ہے جو میں کہیں نوکری کرلوں"

"رضیہ!" منوّر بولا "میری تو صلاح ہے کہ کسی اور شہر میں چل رہیں۔ یہاں تو نوکری بھی مجھ سے نہ اُٹھے گی"

"اپنی ہی ہانکے جاؤگے" رضیہ بولی "یا کسی اور کی بھی سُنو گے؟"

"کیا؟"

"جب محنت مزدوری کرنی ہے تو پھر عار کیسی؟"

"ہاں یہ تو سچ ہے!" منوّر نے جواب دیا۔

رضیہ بولی "محلے میں دو ایک عورتیں ماما کا کام کرتی ہیں تم کہو تو میں اُن سے کہوں؟"

"نہیں!" منوّر نے جواب دیا "پہلے مجھے قسمت آزما لینے دو۔ میں کل صبح منڈی جاؤں گا۔ اللہ نے چاہا تو چار پیسے لیکر ہی آؤنگا"

اتنا کہہ کر منوّر خاموش ہوگیا۔

اس کا جواب غریب رضیہ کے آنسو تھے۔

منوّر اب صبح ہوتے ہی منڈی چلا جاتا اور شام تک سات آٹھ آنے کما لاتا۔ کبھی زیادہ بھی مل جاتے۔ ایک زمانہ اسی طرح گذر گیا۔ رضیہ شاکر بھی تھی اور صابر بھی۔ لیکن ایک پھانس تھی جو کلیجے میں لگی تھی۔ یعنی بیٹے کی یاد۔ اکبر جس روز سے گیا تھا آج تک اس کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔ رضیہ اور منوّر دونوں کے بال سپید ہونے لگے تھے۔ اور یہ ایک نیا فکر تھا جو منوّر کو دامنگیر ہو رہا تھا۔

رمضان کی ستائیسویں تھی۔ ڈاکیہ منوّر کا پتہ پوچھتا محلے میں آنکلا۔ اتفاق سے اس وقت منوّر گلی سے گذر رہا تھا۔

"کیا ہے بھائی؟" منوّر نے پوچھا۔ "میرا ہی نام منوّر ہے"

"یہ ایک رجسٹرڈ خط ہے" ڈاکیہ نے تھیلے سے ایک خط نکال کر کہا۔

"اکبر نے بھیجا ہے؟" بیساختہ منوّر کے منہ سے نکلا۔

ڈاکیہ نے لفافہ پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا "ہاں بھیجنے والے کا نام اکبر ہی ہے"

"لاؤ!" منوّر نے ہاتھ بڑھا کر کہا "میرے بیٹے کا خط ہے۔ کہاں سے آیا؟"

"افریقہ سے" ڈاکیہ نے جواب دیا۔

منوّر خط لیکر جلدی جلدی گھر آیا۔ رضیہ نے جو ہاتھ میں ایک لفافہ دیکھا تو بولی "میرے اکبر کا خط ہے نا۔ سچ کہیو! ہے نا اکبر کا ہی"

"ہاں!" منوّر بولا "ہے تو اکبر کا ہی"

رضیہ نے ہاتھ بڑھا کر کہا "لاؤ مجھے دو۔ اپنے لال کا خط میں آپ کھولوں گی"

"لو تم ہی کھولو" کہتے ہوئے منوّر نے خط بیوی کو دیدیا۔

رضیہ نے خط کو پہلے چوما۔ پھر سینے سے لگایا۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ خط کے علاوہ اس میں سو سو روپے کے دو نوٹ بھی ملفوف تھے۔

بیٹے کا خط اور نوٹ دیکھکر دونوں کی آنکھوں سے شبنم کے قطروں کی طرح آنسو گرنے لگے۔

"لو پڑھو ذرا" رضیہ نے خاوند کو خط دیتے ہوئے کہا۔

منوّر خط پڑھنے لگا۔

ایک طویل داستان کے بعد لکھا تھا۔

"..... اب خدا کے فضل سے میں برسر روزگار ہوں۔ اور اماں سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں امید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے۔ انشاءاللہ فی الحال ہر دوسرے مہینے سو روپے آپ کو اسی طرح بھیجا کروں گا۔ خدا کو منظور ہوا تو اماں کی قدمبوسی کو بھی کسی روز حاضر ہو جاؤنگا۔

آپ کا اکبر

منوّر خط پڑھ رہا تھا۔ رضیہ کے آنسو گر رہے تھے منوّر کی آواز بھی بھرائی ہوئی تھی۔

"کہاں ہے میرا اکبر؟" رضیہ نے پوچھا۔

"افریقہ میں"

"دیکھا میرا لال!" رضیہ نے مسرت کے لہجہ میں کہا۔

"اور میرا اکبر نہیں!" منوّر نے ہنسکر کہا۔

"کیوں نہیں! تمہارا ہی تو ہے!" رضیہ نے شوہر کی طرف دیکھکر کہا۔ پھر نوٹ الٹ پلٹ کر "تو دو سو روپے بھیجے ہیں؟"

"ہاں دو سو!" منوّر نے کہا "اور ہر دوسرے مہینے

سو روپے بھیجنے کو لکھا ہے۔"

"تو بس خدا کا شکر کرو!" رضیہ بولی "اور آج سے منڈی جانا چھوڑ دو۔"

"اور جاؤں بھی تو کیا ہرج ہے" منور نے کہا۔

"لیکن فائدہ کیا؟" رضیہ بولی "اب میرا اکبر کمائیگا اور ہم کھائیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی!" منور نے جواب دیا۔

اب دونوں میاں بیوی آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ڈاکیہ ہر دوسرے مہینے سو روپے دے جاتا۔ ایک مدت اسی طرح گذری۔ رضیہ اب یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ اکبر گھر آئے تو وہ اس کا بیاہ کرے۔ اور اب ہر خط میں اسے واپس آنے کی تاکید لکھواتی۔ آج پھر وہی رمضان تھا۔ اور عید ہونے میں تین چار روز باقی تھے۔ دونوں میاں بیوی کو بیٹے کے خط اور روپے کا انتظار تھا۔ منور ہر روز ڈاکیہ کی راہ دیکھا کرتا۔ جب وہ آتا تو اس سے پوچھتا "کوئی خط تو نہیں؟"

"نہیں!"

"افریقہ سے ڈاک گئی؟"

"ابھی تو نہیں آئی!"

ایک روز وہ اسی طرح ڈاکیہ کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ ایک پڑوسی بھی پاس آ بیٹھا۔ باتوں باتوں میں اکبر کا ذکر آگیا۔ پڑوسی نے پوچھا "لڑکے کو گئے کے روز ہوئے؟"

"سال تو یاد نہیں!" منور نے کہا "لیکن میرے بال سفید نہیں ہوئے تھے۔"

"پھر تو کچھ مدت ہوگئی!" پڑوسی بولا "خط تو آتا ہوگا؟"

"ہاں آتا ہے!"

"یہی ایک لڑکا ہے؟"

"بس یہی ایک!"

اتنے میں سامنے سے ڈاکیہ آنکلا۔ منور نے پوچھا "کوئی خط ہے بھائی؟"

"ہے تو سہی!"

منور نے لپک کر اس سے خط لے لیا۔ رضیہ کواڑ سے لگی کھڑی تھی۔ بولی "خط آیا؟"

"ہاں آگیا!"

دونوں کھاٹ پر بیٹھ گئے۔ منور نے لفافہ چاک کرکے خط نکالا تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "یہ اکبر کا لکھا ہوا تو نہیں ہے!"

"کیا؟" رضیہ نے پوچھا۔

منور کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ خط ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ "ہائے اکبر" کہکر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس خط میں روپے کی بجائے اکبر کی موت کی خبر تھی۔

ایم۔ اسلم۔

ماہِ تمام

مُنہ پہ لیکر گیسوئے شب کا نقاب
مہرِ تاباں سو گیا
حجلۂ مغرب سے نکلا ماہتاب
نور برساتا ہوا
چرخِ نیلی فام کے آغوش میں
اِک نگارِ فتنہ گر
یا فضائے ساکن و خاموش میں
ماہِ کامل جلوہ گر
روئے پر تنویر پر ڈالے ہوئے
ابر کا ہلکا حجاب
"وعدہ گاہِ نیم شب" کی سمت ہے
گامزن با صد شتاب
کس لئے یہ اضطرابِ مُستقل
یہ ہجومِ آرزو
کیا کسی بے مہر کو اے سادہ دل
باوفا سمجھا ہے تُو
چھپ نہیں سکتا حجابِ ابر سے
تیرا فرطِ انبساط
تمتما اُٹھا ہے مُنہ اللہ رے
جوشِ طوفانِ نشاط

تُو نے کھایا ہے مگر رنگیں فریب
اے پرستارِ جمال
خاک ہونے کو ہے دامانِ شکیب
دیکھ اپنے کو سنبھال
"وعدہ گاہِ نیم شب" کو آہ تُو
آج خالی پائیگا
ٹُوٹ جائے گا طلسمِ آرزو
دل لہو برسائیگا
اُس وفا بیگانہ کو چشمِ تلاش
جب نہ پائیگی وہاں
زرد ہو جائے گا رُوئے نُور پاش
دل سے اُٹھیگا دُھواں
اِک مگر تُو ہی نہیں حرماں نصیب
اے جہانگردِ سما!
ہے وفا نا آشنا میرا حبیب
ساری دُنیا سے سوا
وعدہ ہے آج اُس سے ملنے جاؤنگی
وہ نہ آئے گا مگر
اپنی آنکھوں سے لہو برساؤنگی
فرطِ غم سے تا سحر

مرگھٹ ندی کے کنارے تھا۔ چھوٹا سا میدان جس میں کبھی کچھ نہ اُگتا تھا۔ اور اُس کی مٹی سیاہ تھی، جمے ہوئے خون کی طرح سیاہ۔

ندی کے کنارے کے پیڑوں پر ہمیشہ پت جھڑ رہتی تھی، اور اُن کی شاخیں قحط زدہ انسانوں کی طرح ہمیشہ بادلوں کا مُنہ تاکا کرتی تھیں۔ ان پر گِدوں اور کوؤں کے علاوہ کوئی پرند نہ بیٹھتا تھا۔ دُور تک ہڈیوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے اور یہاں وہاں ایک آدھ کھوپڑی زندگی کے انجام پر باچھیں چیر کر ہنس پڑتی تھی۔ ندی کا دھارا ہولے ہولے بہتا چلا جاتا تھا۔ کبھی کوئی موج گھاٹ سے ٹکرا کر سر اُٹھاتی، مرگھٹ کی اُداسی کو دیکھتی اور پھر سر جھکا کر اپنی راہ لگ جاتی تھی۔

وہاں اس شام کو شہر والے کسی کی ارتھی لے کر آئے تھے۔ لاش چتا پر رکھ دی گئی۔ ایک بوڑھے نے اس پر گھی چھڑکا ایک کمسن لڑکے نے آگ دکھائی اور چتا کسی غریب کی جھوپڑی کی طرح چشم زدن میں سُلگ اٹھی۔

مرد ایک طرف سرنگوں بیٹھے رہے۔ عورتیں دوسری طرف زار زار روتی رہیں۔

چتا تیزی سے جلنے لگی۔ دو آدمی لمبے لمبے بانسوں سے لاش کو اِدھر اُدھر لوٹانے لگے۔ گوشت کے ادھ جلے ٹکڑے اُڑ اُڑ کر زمین پر گر پڑتے تھے اور شعلے کتوں کی طرح ہڈیوں کو جبڑے میں دبا کر چٹخارہ بھرتے اور بے بصر آنکھوں سے ہر طرف گھورتے تھے ——!

اندھیرا ہو چلا تھا۔ بادلوں کے دو چار گلابی ٹکڑے اُوپر اُڑ رہے تھے اور ایک دو تارے تیروں کی نوک کی طرح آسمان میں پیوست تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ کے سوا کوئی آواز نہ آتی تھی۔

ابھی لوہارنے انگوچھے کے کونے سے چلم نکالی اور چتا کا ایک انگارہ اس پر رکھ کر مجمع میں کسی ایسے آدمی کو تلاش کرنے لگا جو اُس کی طرح بات چیت کرنے کو بیتاب ہو۔ مگر فضا میں بھاری پن سا تھا اور سب لوگ موت کی موجودگی میں کھوسے گئے تھے

ابھی لوہار نے دونوں مٹھیوں میں چلم تھام کر اس زور کا کش کھینچا کہ انگارہ دہک اُٹھا اور کئی چنگاریاں اُوپر اُچھل پڑیں۔ پھر اُس نے کسی نامعلوم دوست کو مخاطب کرکے کہنا شروع کیا۔ "ہری بول! رام جانے، گولی اس کی چھاتی ہی میں لگی۔ میں موری میں چھُپ کر سب دیکھ رہا تھا۔ وہ جھنڈا لیے ہوئے آگے آگے تھا۔ جب جلوس چوک کے پاس پہونچا تو گھڑچڑھی پولیس کے جوان راستہ روکے کھڑے تھے۔ کپتان نے ڈانٹ کر کہا، آگے جانا منع ہے! بھیّا، اور سب تو بغلیں جھانکنے لگے لیکن ان چھوکروں کا کلیجہ بڑا ہے۔ انہوں نے کہا۔ ہم آگے جائیں گے راستہ چھوڑ دیجئے......"

چھوٹو بات کاٹ کر بولا "اُٹھاتے کیا کہتے ہو۔ اتنی بات چیت کی مہلت کہاں تھی۔ پولیس آندھی کی طرح ہم پر جھپٹی، بھاگنے کا موقع کب ملا۔ جیسے بے کرکٹے بجلی گر پڑے۔ کئی بھاگتے بھاگتے گر کر گھوڑوں کی ٹاپ کے نیچے آگئے۔ کئی رپٹ کر منہ کے بل گر کوئی نالی میں، کوئی سڑک پر۔ لاٹھیوں سے جن کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے انکی بات ہی الگ ہے۔"

اجی!۔ اچھا یہی سہی... جو بھی ہو وہ تھا بہادر۔ جھنڈا لئے ہوئے اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ اتنے میں کوٹھوں سے پتھر برسنے لگے اور ادھر بندوقوں کی گولیاں۔ بھیا، جیسے آندھی میں آم کا ہرا بھرا پیڑ گر پڑے۔ بس ویسے ہی پل بھر میں ایسا پہاڑ سا جوان چھلنی ہو کر گر پڑا۔"
سب خاموشی سے آگ میں کسی نقطہ کو گھور رہے تھے۔ گھٹاٹوپ اندھیرے میں وہ چتا ایسی لگتی تھی جیسے زمین پر بجلی چمک رہی ہو۔

نایک نے زور سے کہا "رام نام ست ہے! کال سر پر کھڑا ہو تو کس کا بس چلتا ہے۔ اگر یہ ماں کا پوت وہاں سے بھاگ جاتا تو کیا تھا۔ پر وہ تو کہو بھاگ کا بدا ملتا نہیں۔"

لکھو مستری نے آنکھیں تریر کر کہا "کیا کہا! بھاگ جاتا؟ ارے میرا بیٹا اور بھاگ جاتا!......" اس نے بے بس نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا "ایسی بات نہ کہو۔ اس کی آتما کو دکھ ہوگا۔ وہ نادان سہی مگر دوسروں کی طرح ہیٹا نہ تھا۔ اُسے اپنے دیس کے جھنڈے کی لاج تھی۔"

"اونہہ۔ اجی، تین بالشت کپڑے سے کہیں دیس کی لاج آتی جاتی ہے۔ کیا بات کرتے ہو۔ میں تو تمہارا بھلا سوچ کر کہتا ہوں۔ کیا مجھے اس کے مرنے کا دکھ نہیں، ارے، میں تو اس لئے کہتا ہوں کہ اِس بڑھاپے میں تمہیں کون پالیگا۔ جوان بیٹا، گھر کا سرتاج۔ اسکے چھوٹے چھوٹے بچے۔ بوڑھے ماں باپ۔ یہ سب کہاں جائیں گے۔ کیا دیس تمہیں روٹیاں دیگا۔"

لکھو نے ایک گہرا سانس لیا۔ اُس کا پڑوسی سچ کہتا تھا۔ اب وہ کیا کریگا۔ دیس تو امیروں کے لئے تھا۔ غریبوں کا دیس کہاں ہے۔ زمین کا کرایہ، پانی کا ٹیکس، روشنی کا محصول۔ اور جب مرجاؤں تو مرگھٹ کے چودھری کا نذرانہ۔ ان سب سے زیادہ دیوتا کا بھوگ۔ وہ کانا دیوتا جو اپھرائے ہوئے مینڈک کی طرح شہ نشیں پر بیٹھا اپنی دُم ہلایا کرتا ہے۔ کہاں تھا وہ جوان بیٹے کی موت کے وقت۔

لیکن نہیں۔ اس کا بیٹا کیا ایسا بیوقوف تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر اپنی جان دی تھی ــــ لکھو کے دماغ میں اسی قسم کے خیالات کا تار سا بندھ گیا۔

شمبھو نے سر ہلا کر کہا "آج صبح تک وہ بھلا چنگا تھا۔ وہ ہتوڑے کی ایک ایک مار سے لوہے کو پانی کر رہا تھا۔ لیکن اب دیکھو۔ سیسے کی ایک چھوٹی سی گولی ہوا میں سنسناتی ہوئی آئی اور بنا کچھ کہے اس کی چھاتی میں گھس گئی۔ ہڈی کو توڑ کر، گوشت کو چیر کر وہ دل کے اندر بیٹھ گئی۔ اور وہ مرگیا۔ ہائے رام، جینا کتنا کٹھن ہے اور مرنا کتنا آسان۔"

اجیا لوہار نے دھنویں کو مُنہ کے آگے سے ہٹا کر کہا "اور جب آدمی مرجاتا ہے تو کیا چھوڑ جاتا ہے۔ نام تو بڑے آدمیوں کا رہتا ہے۔ غریبوں کا نام دھام کیا۔ وہ تو بھائی بندوں کے لئے اپنی یاد چھوڑ جاتے ہیں اور یہ یاد زندگی بھر کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔ دنوں کی دوری گھاؤ پر مرہم کا کام کرتی ہے، سب اپنے اپنے دھندے میں لگ جاتے ہیں اور کبھی سوچو تو ایسا لگتا ہے کہ پچھلے جنم کی کہانی ہے۔"

لکھو چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جن لوگوں نے اُس کے بیٹے کے ہاتھ میں جھنڈا تھمایا تھا، وہ کہاں تھے۔ وہ تو اس مرگھٹ میں نہیں تھے۔ وہ سب بڑے لوگ تھے۔ وہ شودروں کے مرگھٹ میں کیسے آتے۔

لیکن کیا اُس کے بیٹے نے غلطی کی تھی. کیا سمجھ کر اُس نے وہ جھنڈا اپنے ہاتھ میں لیا اور وہ گولیوں کے سامنے کیوں سینہ تانے کھڑا رہا. کیا اُسے کسی کا دھیان نہیں آیا۔

عورتوں کی فریاد دھیمی پڑ گئی تھی۔ وہ اپنی سوجی ہوئی آنکھوں سے چھت کو تاک رہی تھیں جس پر اب لاش کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

لکھو کا تن بدن کانپنے لگا۔ دُنیا اتنی احسان فراموش کیوں ہے. اُس کے بیٹے نے دوسروں کے لئے جان دی تھی! اپنوں کو بھلا کر وہ دوسروں کے لئے مرمٹا تھا۔ اور یہ لوگ یہاں بیٹھے باتیں بنا رہے تھے۔

نایک نے آہستہ سے کہا۔ "اجی، دیکھو اور کتنی دیر ہے. بھوک کے مارے پران مُنہ کو آ رہے ہیں۔"

اتنے میں چھوٹو نے آنکھیں پھاڑ کر سب کو اس انداز سے دیکھا جیسے اُسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"کریم خاں حولدار کہتا تھا کہ جو لوگ ارتھی کے ساتھ مرگھٹ جائیں گے، سرکار میں اُنکی رپٹ کی جائے گی۔"

"ایں، یہ کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ سرکار کا بیری تھا۔ بھائی، سمجھتے نہیں۔ اُس نے گولی نہیں چلائی تو کیا، گولی کھائی تو۔ پھر وہ بیری ہوا یا نہیں۔"

"ہوں۔" نایک نے کپڑے جھاڑنا شروع کیا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ وہ کسی ایسے ویسے کی گولی سے نہیں سرکار کی گولی سے مرا۔ بکھٹ معاملہ ہے. کیوں جی اجی؟"

اجی اپنی جھولی سنبھالنے لگا۔ "ٹیڑھی بات ہے۔ اور کریم خاں حولدار کوئی معمولی آدمی ہے۔ اجی بڑے بڑے مہاجن اُسکے نام سے کانپتے ہیں۔ جس کے گھر چاہے ڈاکہ ڈلوا دے۔ اور جسے چاہے چوری کے الزام میں بندھوا دے۔ آج شہر میں اُسی کا راج ہے۔"

سب لوگ ڈر کر دائیں بائیں یوں دیکھنے لگے گویا کریم خاں کا بھوت مُنہ پھاڑے ہوئے اُنہیں نگلنے کو آ رہا ہو۔ تاروں کی چھاؤں میں پیڑوں کے ڈنڈے اپنے نحیف ہاتھ پھیلائے ہوئے اندھیری رات سے کسی چیز کی بھیک مانگ رہے تھے۔

لکھو گھٹنوں پر سر رکھے نیم بیہوشی کی حالت میں بیٹھا رہا. بہت سے لوگ ایک ایک کر کے سٹک گئے اور جب آگ مدھم پڑی تو صرف چار پانچ آدمی رہ گئے۔

لکھو کا دل اندر سے رونے لگا۔ دیس اور دیس والے! اُنہوں نے ایسا کیوں کیا۔ موت کے آگے تو سب برابر ہیں۔ سب کو ایک دن اسی آگ میں جانا ہے۔ اسی پانی میں سب کی راکھ کو بہہ جانا ہے۔ پھر وہ اسکے بھی متحمل نہیں کہ ایک آن کے لئے آئیں اور مرنے والے کی بیوا کے آنسو پونچھ جائیں۔ اُس کی ماں کے ٹوٹے ہوئے دل پر ہمدردی کا ایک پھاہا رکھ جائیں۔

سیٹھ چھجو مل، کانگریس کمیٹی کے صدر۔ کیا وہ جوان بیٹے کی جان لینے کے بعد بھی اس کا قرض معاف نہ کریں گے۔

کنور پرتاپ سنگھ، بڑے دیس سیوک۔ کیا کریم خاں حولدار کے دست برد سے وہ اُسے نہ بچائیں گے۔"

برسات آ رہی ہے، گھر کا چھپر چھانا ہے، دیوار کو تھم لگانا ہے۔ بھٹی کو ٹھیک کرنا ہے. مگر اس کے بازوؤں میں وہ پہلے کی سی

ں۔ مزدور کا بیٹا، ایک ذراسی گولی سے چھد کر ــــ وہ بھی کسی لوہار کی بنائی ہوئی ــــ مر گیا اور آگ اُسے لے گئی۔
نا ٹھنڈی پڑنے لگی۔ عورتوں نے اس میں پانی کا چھینٹا دیا۔ مردوں نے اس میں اپنے آنسو جھٹکے "رام نام ست ہے" کی
یدان گونج اُٹھا۔ دُور سے گیدڑوں نے جواب دیا "ہوا، ہوا، ہوا"
ب سب چلنے لگے تو لکھو نے دیکھا کہ اس کے پیروں کے پاس ایک کپڑا پڑا ہوا ہے۔ یہ وہی پھٹا ہوا ترنگا جھنڈا تھا۔
ے لٹکتے ہوئے اس کا بیٹا مر مٹا تھا۔ لیکن یہ جھنڈا دیکھنے میں کتنا مکروہ تھا! گھاس پھوس کی طرح سبز، بڑھاپے کی
ر، بیماری کی طرح زرد۔
یکن اب خون میں رنگ کر وہ لال ہو گیا تھا۔ لال ــ زندگی اور موت کا رنگ۔
لکھو نے اُسے اُٹھا لیا۔ اس میں ایسا کونسا جادو تھا جس سے مسحور ہو کر لوگ اسکے لئے سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ معمولی
مادی جو ایک ٹوٹے ہوئے کرگھے پر بنی گئی۔ اور ایک رنگریز نے اس پر کچے رنگ کے چھینٹے دے دئے۔ اس میں
تھا۔
رہی ہو، اب ایک انسان کے خون میں رنگ چکا تھا اور یہ خون تازہ تھا نو بہار پھول کی طرح، گرم تھا جلتی ہوئی
ـرح۔
ـ بیک لکھو کے دل میں یہ خیال اُٹھا کہ اب وہ طاق سے اُس پتھر کے ٹکڑے کو پھینک دیگا اور اُسکی جگہ اس کپڑے کو دیگا
ے بیٹے کے خون کی پپڑی جمی ہوئی ہے ــ!
ورتیں قطار باندھے، ٹوٹی ہوئی آواز میں سیاپا گاتی ہوئی گھر کی طرف جا رہی تھیں۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور رات کا دامن شبنم
ا۔ دُور سے ندی کا دھارا گھائل پرندے کی طرح کراہ رہا تھا۔
ین کی آگ بجھ چکی تھی لیکن آسمان کے ستارے جگمگا رہے تھے۔

ــــــــــ اختر حسین رائے پوری

محبّت
اور
نفرت

ثمراتِ تخیل

واہ فسونِ آب و گل — دہر ہے اِک رنگیں محفل
رزم کُنانِ رہ طوفاں سے — مِل ہی جائے گا ساحل
تیری نگہ سفاک نہیں — اور کسے کہیئے قاتل
عشق کی پایاں بے پایاں — منزل کے آگے منزل
کس کی محفل کو دیکھیں — ہم تم ہیں خود اک محفل
دورِ فلک کا شکوہ کیا — وہ بھی غلط، یہ بھی باطل
خیر ہو تیرے جلوے کی — دل والے ہیں سب بیدل
جوشِ عمل کی خامی کا — نام جہاں میں ہے مشکل
پیرِ مغاں کہتے ہیں جسے — ہے وہ اِنسانِ کامل
یوں بھی سحر ہوتی ہی کہیں — گریۂ شب سے کیا حاصل
دل کی بستی ویران ہی — آ جا اے جانِ محفل
سُرخ نہ ہو کیوں اشکِ غم — خونِ جگر بھی ہے شامل
یوں نہ فسردہ خاطر رہ — غنچہ و گل کی صورت کھِل

دیکھ طلسمِ فکرِ نہال
سحر بیاں شاعر سے مِل

نہال سیوہاروی

"دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی"

رسالہ جامعہ (دہلی) بابت جنوری ۳۶ء میں جناب حکیم آزاد انصاری کا ایک مضمون "غزل کی حمایت" میں شایع ہوا جس میں موصوف نے اُن تمام جائز اور بعض ناجائز اعتراضات کا جواب دینے کی ناکام کوشش کی ہی جو صنفِ غزل پر عموماً اور رسمی (conventional) غزل پر خصوصاً ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ حکیم صاحب خود بھی غزلگو ہیں اور بدقسمتی سے "ڈہی لگلے برس کی تیلیاں" والی غزل کہتے ہیں اسلیئے قدرتی طور پر اُنہیں تمام اعتراضات کا نشانہ خود اپنی ذات نظر آئی۔ ایسی حالت میں اُن کا برہم ہونا اور معترضین پر تبرا کرنا انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔

رسالہ کلیم (دہلی) بابت مئی ۳۶ء میں "نقاد" صاحب نے اس مضمون پر "غزل گوئی" کے عنوان سے ایک کامیاب تنقید لکھی، مگر افسوس ہو کہ جہاں تک اندازِ بیان کا تعلق ہی حکیم آزاد صاحب ہی کے رنگ میں لکھی۔ اسکے علاوہ غزل پر بعض اعتراضات ایسے بھی کئے جو کچھ بھی وزن نہیں رکھتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "نقاد" صاحب کے اس تنقیدی مقالہ نے حامیانِ غزل کے کیمپ میں ایک ہلچل ڈالدی جسکا نتیجہ رگھوپتی سہائے صاحب فراق کا ایک طویل مضمون "دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی" کے عنوان سے جولائی ۳۶ء کے رسالہ نگار (لکھنؤ) میں ہمارے پیش نظر ہے۔

فراق صاحب ایک خوشگو شاعر، ایک اچھے ادیب، اور ایک سمجھدار نقاد ہیں لیکن جوان خون کی حرارت جب مشتعل ہوتی ہی تو جادۂ اعتدال اکثر انسان سے چھوٹ جاتا ہے اور اپنے مسلک اور عقیدہ کے خلاف اس کی روش انتہا پسندانہ ہوجاتی ہے۔ فراق صاحب نے اپنے مضمون کے آغاز میں جناب "نقاد" کی تیز زبانی کا شکوہ کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اُنہوں نے خود جو الفاظ براہِ راست یا بالواسطہ جناب "نقاد" کے لئے استعمال کئے ہیں وہ "نقاد" صاحب کی "جلی کٹی" سے کہیں زیادہ غیر سنجیدہ ہیں۔

اس مقالہ کے سپردِ قلم کرنے سے میرا مقصد نہ "نقاد" صاحب کی حمایت ہی نہ فراق صاحب کی مخالفت۔ کیونکہ دونوں حضرات کی بعض رایوں سے مجھے اتفاق ہی اور بعض سے اختلاف۔ چونکہ مجھے خود اس موضوع سے دلچسپی ہی اور اس کے اکثر پہلوؤں پر میں نے بارہا غور کیا ہے اسلیئے جن نتائج پر میں پہونچا ہوں اُنہیں قارئین ساقی سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ اسکے علاوہ میں نے جنوری ۳۶ء کے ساقی میں اپنے مضمون "ایران کی امرد پرستی کا اثر اُردو شاعری پر" میں عشقیہ شاعری کے نمونے پیش کرنے کا جو وعدہ کیا تھا ضمناً آج وہ بھی پورا ہو جائیگا۔

جناب "نقاد" نے غزل پر جو اعتراضات کئے ہیں اُنہیں مدِ نظر رکھتے ہوئے فراق صاحب نے ایک سوال کیا ہی کہ:۔

"صاحبِ مضمون کا مطلب غزل سے کیا ہو؟ کیا اُن کا مطلب صرف حضرتِ آزاد کی غزلوں سے ہی۔ یا اُردو غزلگوئی کی ابتدا سے ابتک ہزاروں بلکہ لاکھوں کمزور اور ناکامیاب غزلگویوں سے ہی، یا کئی سو محض وقتی اور مقامی "اُستادوں" اور کہنہ مشقوں سے ہے۔ یا اُردو کے معدودے چند چوٹی کے متغزلین سے ہی۔ یا سعدی اور حافظ شیرازی وغیرہ کو بھی وہ قابلِ عتاب ٹھیراتے ہیں؟"

سوال اپنی جگہ پر نہایت معقول ہی اور اگر "نقاد" صاحب کے مضمون سے اسکا کوئی جواب نہ مل سکے تو یقیناً ہم یہ کہنے پر مجبور

ہو نگے کہ "نقاد" صاحب نے عجیب خلط مبحث کیا ہے۔ لیکن جب "نقاد" صاحب کے اِن الفاظ پر ہماری نظر پڑتی ہے کہ :-

(۱) "غزل و تغزل کو مٹاتا یا اس کو حلال و حرام کر ڈالنا کون چاہتا ہے۔ اس کی رُوح و حُسن کو تو متعارف عجیب الخلقت غزلگو شعراہی مسخ کر رہے ہیں۔ "بیرونی" کے پیکر سے "جوکر" کا لباس اتروا کر اُسے ایک عروس جمیل و لباس حریر کی ہیئت میں بدل دینا کیا کوئی ضروری اور اہم اصلاح ادب نہیں؟"

(۲) "مروجہ، مسخ غزل سے آپ اس وقت تک نفور نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپکی یہ مخنّل و مضحکہ خیز فطرت آپکے شامل حال ہے۔"

(۳) "بلاشبہ مروجہ غزل و تغزل ماتم کرنے کی چیز ہے۔"

(۴) متعارف غزل ہی حقیقتاً ایک "بادہوائی تیراندازی" ہے۔

تو فراق صاحب کا سوال بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ مضمون کے آخری حصّہ میں "نقاد" صاحب نے مفصل طور پر اس سوال کا جواب دیا ہے۔ حکیم آزاد صاحب کے اس بیان کے سلسلہ میں کہ :-

"ایک اعتراض غزل پر یہ ہے کہ غزل کا وجود فارسی و اُردو کے سوا کسی اور زبان میں نہیں پایا جاتا" جناب "نقاد" لکھتے ہیں کہ :-

"بلاشبہ یہ اعتراض ہے۔ لیکن مطلقاً غزل پر اپنے وسیع ترین تصور میں، نہیں۔ بلکہ متعارف و متداول غزل پر۔ بے ربط و بے آہنگ غزل پر۔ متضاد و باہم متصادم غزل پر۔ موئے کمر و کوہ سرین والی غزل پر اپنے ہجر دوام اور رقیب روسیہ کے غلبۂ دوام والی غزل پر۔ قاتل شیوہ و قصاب پیشہ محبوب والی غزل پر۔ نہ کہ اس پر جو ہے عرافسانۂ آن شبے کہ یا یار گزشت۔"

اس عبارت کا مطلب بالکل صاف ہی مگر افسوس ہے کہ فراق صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اُن کے نزدیک ان الفاظ سے واضح ہے کہ "نقاد" صاحب ہر غزلگو بلکہ نفس "غزل و غزلیت" سے "بیزار ہیں" اگر یہ ممکن ہو کہ کوئی دن کہے اور آپ رات سمجھیں۔ اور ایک "صوفی" کی لمبی ڈاڑھی آپ کو محبوب کی زلف دراز نظر آئے تو یہ بھی ممکن ہے کہ آپ "نقاد" کو ہر غزلگو اور نفس غزل سے بیزار سمجھیں ورنہ "نقاد" نے تو صاف صاف کہا ہے کہ ہم "غزل و تغزل" کے دشمن نہیں، بلکہ ہم "مروجہ، مسخ اور متعارف غزل کے مخالف ہیں جس کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی اس غزل سے ہرگز بیزار نہیں جو ع افسانۂ آن شبے کہ با یار گزشت کی مصداق ہے۔

تھوڑی دیر کیلئے یہ فرض کرتے ہوئے کہ "نقاد" صاحب نے نفس غزل کو موردِ طعن نہیں بنایا، فراق صاحب ایک سوال اور پوچھتے ہیں کہ :-

"نقاد صاحب نے حکیم آزاد کو اس غلط اور پوچ قسم کی غزلگوئی کا حامی کیونکر مان لیا؟"

اس سوال کا جواب بھی "نقاد" صاحب کے مضمون میں موجود ہے مگر خدا جانے کیوں فراق صاحب کی نظر اس طرف نہیں گئی۔ بات یہ ہے کہ حکیم آزاد نے اپنے مضمون میں عصر حاضر کے "بلند فطرت و بلند خیال" شعرا کی جو فہرست پیش کی ہے "نقاد" کے نزدیک وہ سب کے سب پُرانی لکیر کے فقیر ہیں اور اُن کے کلام میں وہ تمام عناصر کثرت کے ساتھ موجود ہیں جو "نقاد" کے خیال میں ناظورہ غزل کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اِن لوگوں کو جوٹی کا (غزلگو) شاعر سمجھتا ہو اسکے نزدیک غزل کا معیار

کیا ہوگا۔ غالباً اب فراقؔ صاحب کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ "نقادؔ" نے حکیم آزاد کو "غلط اور پوچ قسم کی غزلگوئی کا حامی کیونکر مان لیا"

اس پر میں اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ وقتاً فوقتاً اُردو رسائل میں حکیم آزاد صاحب کا جو کلام شائع ہوا ہے وہ اسی قسم کا ہے جو "نقادؔ" کے نزدیک سوختنی ہے اسلئے "نقادؔ" کا یہ سمجھنا کچھ بیجا نہیں کہ حکیم آزاد صاحب "غلط اور پوچ" قسم کی غزلگوئی کے حامی ہیں۔

اِس محل پر یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "نقادؔ" کا موضوع بحث "غزل" ہے۔ "نظم" کا اگر کہیں ذکر آگیا ہے تو محض ضمنی اور استطرادی طور پر۔ لیکن فراقؔ صاحب نے خواہ مخواہ "نظم" کو بھی اس بحث میں گھسیٹ لیا ہے اور غزل کو نظم کا یا نظم کو غزل کا حریف قرار دیکر اصل موضوع کو غیر ضروری اُلجھنوں میں ڈالدیا ہے۔ بہرحال "نظم" پر فراقؔ صاحب نے جو اعتراضات کئے ہیں ہم اُسکا جواب اصل بحث ختم کرنے کے بعد دینگے۔

جس طرح ایک چاہنے والے کو اپنا محبوب "مجموعۂ خوبی" نظر آتا ہے اور اُس کے صریح و نمایاں عیوب بھی اُسے دکھائی نہیں دیتے اُسی طرح فراقؔ صاحب بھی جو غزل کے چاہنے والوں میں سے ہیں، غزل کے کسی عیب کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اُنکے نزدیک اصنافِ سخن میں غزل کا رتبہ سب سے بلند ہے، اس میں فقط خوبیاں ہی خوبیاں ہیں اور جسے اُن کی اس رائے سے اتفاق نہ ہو وہ یقیناً مذاقِ سلیم سے یکسر بے بہرہ ہے۔ فراقؔ صاحب کے نزدیک :۔

"یہ سمجھنا سخت گمراہی ہے کہ دورِ حاضر میں اُردو "نظم" نے تو ترقی کی لیکن اُردو غزل محض جھک مار رہی ہے اور تجبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی۔ کی مصداق بن رہی ہے"۔ .... "آج سے نصف صدی پہلے مولانا حالیؔ نے غزل کے خلاف جو آواز بلند کی تھی اور ڈاکٹر نذیر احمد اور دیگر مصلحانِ ادب و قوم نے جو غزل سے اظہارِ نفرت کیا تھا اس میں یہ بزرگ ممکن ہے اپنی حد سے آگے بڑھ گئے ہوں لیکن اس کی وجہ پر ذرا کم غور کیا جاتا ہے۔ بات یہ تھی کہ ان بزرگوں نے اُردو غزلگوئی پر اعتراض نہیں کیا ہے بلکہ اپنے وقت کی رائج اور مقبولِ عام غزلگوئی سے اظہارِ برہمی کیا ہے اور ایسا کرنا ضروری تھا۔ امیرؔ و داغؔ کی عریانی و شوخی میں زندہ دلی ضرور تھی مگر یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ساری غزل گوئی "انگیا" اور "محرم" کے لئے وقف ہو جائے .... فطری اور حقیقی غزلگوئی کی طرف دو چار کو چھوڑ کر کسی کی نظر ہی نہ تھی۔ یہ باتیں محرک ہوئیں حالیؔ کے مقدمہ شعر و شاعری میں غزل کے خلاف اس اعلانِ جہاد کی جس کو آج نصف صدی کے بعد دُہرانا "ہز ماسٹرس وائس" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا"۔

اِس امر کا صحیح اندازہ کرنے کیلئے کہ دورِ حاضر میں اُردو غزل واقعی جھک مار رہی ہے یا نہیں اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ فراقؔ صاحب کے پیش کئے ہوئے معیار پر دورِ حاضر کی غزل کو جانچا جائے۔ یعنی یہ دیکھا جائے کہ حالیؔ نے اپنے وقت کی رائج اور مقبولِ عام غزلگوئی سے جن خصوصیات کی بنا پر اظہارِ برہمی کیا تھا وہ عصرِ حاضر کی غزل گوئی میں موجود ہیں یا نہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ آج بھی غزل اُنہیں خیالات کا مجموعہ ہے جن سے حالیؔ نے اظہارِ بیزاری کیا تھا۔ تو مجھے اُمید ہے کہ فراقؔ صاحب بھی اس بات کو تسلیم کر لیں گے کہ اُردو غزل واقعی جھک مار رہی ہے اور اگر یہ ثابت نہ ہو سکے تو پھر ہر شخص کو فراقؔ صاحب کا یہ قول ماننا ہی پڑیگا کہ حالیؔ کے اعتراضات کو آج نصف صدی بعد دہرانا

"ہز ماسٹرس وائس" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

جن وجوہ سے حالی نے غزل کو موردِ طعن بنایا وہ فراق صاحب کے مذکورہ بالا بیان کے مطابق "امیر و داغ کی عریانی و شوخی" تھی اسلئے کہ بھلا "یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ساری غزلگوئی "آنچل" اور "محرم" کیلئے وقف ہو جائے"۔ فراق صاحب کا یہ بیان حد درجہ مغالطہ انگیز ہے معلوم نہیں کہ انھوں نے کسی مصلحت کی بنا پر غزل سے حالی کی بیزاری کا سبب فقط "امیر و داغ کی عریانی و شوخی" کو ٹھہرایا یا "مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ کئے بغیر ہی رائے قایم کرلی۔ اسلئے کہ حالی نے غزلگویوں کی جو "فردِ جرم" پیش کی ہے وہ بہت طویل ہے۔ اور جسکے بعض حصے یہاں نقل کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ و ہو ہذا:۔

"زیادہ کلام جس میں نہ سادگی، نہ جوش، نہ اصلیت، تینوں چیزیں نہ پائی جائیں۔ سو ایسے کلام سے ہمارے شعرا کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ کیونکہ ہماری شاعری زیادہ تر اب دو قسم کے مضامین میں منحصر ہے۔ عشقیہ یا مدحیہ۔ عشقیہ مضامین اکثر غزل، مثنوی اور قصائد کی تشبیب میں باندھے جاتے ہیں اور مدحیہ مضامین زیادہ تر قصائد میں۔ سو ان تینوں صنفوں میں شاعر کا کام یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو مضامین قدیم سے بندھتے چلے آتے ہیں اور جو بندھتے بندھتے بمنزلۂ اصول مسلمہ کے ہو گئے ہیں۔ انہیں کو ہمیشہ بادنیٰ تغیر باندھتا ہے اور اُن سے سر مو تجاوز نہ کرے، مثلاً

غزل میں ہمیشہ معشوق کو بے وفا، بے مروت، بے مہر، بے رحم، ظالم، قاتل، صیاد، جلّاد، ہرجائی، اپنے سے نفرت کرنے والا، اوروں سے ملنے والا، سچی محبت پر یقین نہ لانے والا، اہلِ ہوس کو عاشقِ صادق جاننے والا، بدگمان، بدخو، بدزبان، بدچلن، غرضیکہ ایک حُسن و جمال یا ناز و ادا و دیگر حرکاتِ مہر انگیز کے سوا اور تمام ایسی برائیوں کے ساتھ اسکو موصوف کرنا جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرسکتا ہو اور اپنے تئیں غمزدہ، مصیبت زدہ، فلک زدہ، ضعیف، بیمار، بدبخت، آوارہ، بدنام، مردودِ خلائق، آوارگی پسند، بدنامی کا خواہاں، حُسنِ قبول سے نفور، خوشی اور عافیت سے کنارہ کرنیوالا، مہجور، بدمست، مدہوش، خود فراموش، وفادار، جفاکش، کہیں آزاد طبع اور کہیں گرفتاری کا آرزومند کہیں صابر اور کہیں بیقرار، کہیں دیوانہ کہیں ہوشیار، کہیں غیور اور کہیں چکنا گھڑا، رشک کا پتلا۔ رقیبوں کا دشمن، سارے جہاں سے بدگمان، آسمان کا شاکی، زمین سے نالاں، زمانہ کے ہاتھ سے تنگ، غرضکہ ایک عشق اور وفاداری کے سوا اپنے تئیں اُن تمام صفات سے متّصف کرنا جو عموماً انسان کیلئے قابلِ افسوس خیال کی جاتی ہیں یا مثلاً

آسمان اور زمانہ یا نصیب اور ستارہ کی شکایت کرنا، یا زاہد و واعظ و صوفی کو لتاڑنا اور بادہ کش و بادہ فروش اور ساقی و خمار کی تعریف کرنی اور اُن سے حُسنِ عقیدت ظاہر کرنا، ایمان و اسلام و زہد و طاعت سے نفرت اور کفر و بے دینی و گناہ و معصیت سے رغبت ظاہر کرنی کبھی کبھی مال و جاہ و منصب دنیوی کو حقیر ٹھہرانا اور فقر و عشق و آزادگی وغیرہ کو علم و عقل و سلطنت وغیرہ پر ترجیح دینی۔ اسی طرح کے اور چند مضامین ہیں جو غزل کیلئے بمنزلۂ ارکان و عناصر کے ہیں"۔

یہ "فردِ جرم" طویل ہونے کے باوجود بھی مکمل نہیں۔ کیونکہ مولانا حالی نے یہاں خصوصیت کے ساتھ اُن مضامین کا ذکر کیا ہے جو "عشقیہ" کے تحت میں آتے ہیں۔ ابھی "فلسفہ" اور "تصوف" کا ایک دریائے ناپیدا کنار باقی ہے جو ایک "طوفانِ بے تمیزی" کی طرح غزل پر چھایا ہوا ہے۔

غزل پر اعتراضاتِ حالی کے ضمن میں فراق صاحب نے اپنے بیان کی مزید توضیح اس طرح کی ہے کہ:۔
"حالی کے وہ اعتراض جو انہوں نے نصف صدی پہلے غزل پر کئے تھے آج اُن کا دہرانا اسلئے غلط نہیں کہ بات پُرانی ہو گئی بلکہ حالی کے اعتراض آج اس لئے غلط ہیں کہ امیر و داغ کے بعد اُردو غزل گوئی کے کئی دور ختم ہو چکے اور اس میں حیرت انگیز انقلابات پیدا ہو گئے ہیں۔"
فراق صاحب کے بیان کے مطابق ایک دور تو "خدنگ نظر" کے مشاعروں کو سمجھنا چاہیئے اور دوسرا جذباتی سکول کا دور ہے۔ "اس کے بعد وہ دور آتا ہے جس میں اُردو غزل گوئی .... نئی آوازوں سے نغمہ سرا ہوتی ہے .... (اس دور میں) چوٹی کے غزلگو حسرت موہانی۔ اصغر گونڈوی۔ یاس عظیم آبادی۔ جگر مرادآبادی اور فانی بدایونی کہلائے۔"
امیر و داغ کے بعد سے لیکر آج تک اُردو شاعری کے جتنے دَور آپ کا جی چاہے تسلیم کر لیجئے مگر یہ حقیقت بہر حال اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ حالی کے زمانہ سے اس وقت تک ہر "دَور" کے غزلگو شعرا نے اپنے پیشرووں کی اکثر مکروہ سنتوں کو نہایت اہتمام کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ اس دعوے کے اثبات کی صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ اول اُن تمام مخصوص مضامین کی ایک فہرست پیش کی جائے جو حالی کے زمانہ تک غزلگو شعرا کا موضوع بحث رہے ہیں اور جسے ہم نقالی، سنتِ شعرا کی پیروی اور "رسم و روایت" کی تقلیدِ محض سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد گذشتہ پچاس سال خصوصاً عصر حاضر کے چوٹی کے غزلگو شعرا کے کلام سے کثیر تعداد میں ایسے نمونے پیش کریں جن میں انہیں خیالات پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ زیر بحث شعرا کی تعداد اتنی کثیر اور اُن کی غزلیات کا مجموعہ اس قدر زیادہ ہے کہ اس ایک مضمون میں سب پر فرداً فرداً تنقید کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ اسلئے مجبوراً صرف چند شعرا کو منتخب کرنا پڑیگا اور اُن کے متعلق بھی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں اسلئے کہ مثلاً اگر "کہنہ و فرسودہ خیالات" کم سے کم پندرہ عنوانوں میں تقسیم کئے جائیں اور صرف پانچ شاعروں کے کلام سے ہر عنوان کے ماتحت فقط پانچ شعر نقل کئے جائیں تو ان اشعار کی مجموعی تعداد پونے چار سو ہوگی۔
فراق صاحب کی زبانی دَورِ حاضر کے چوٹی کے غزلگو شعرا کے نام آپ سُن چکے یعنی حسرت موہانی، اصغر، یاس، جگر اور فانی۔ ان پانچوں میں فراق صاحب نے حسرت موہانی کو سب سے افضل مانا ہے اور انہیں "بادشاہِ متغزلین" کا لقب دیا ہے۔ اب اگر ہم عصر حاضر کے بہترین نمایندوں کے "بادشاہ" کے کلام سے اپنے دعوے کو ثابت کر دیں تو غالباً کسی مزید بحث کی ضرورت باقی نہ رہیگی اور دوسروں کے متعلق بھی وہی رائے قائم کر لینا اصولاً بیجا نہ ہوگا۔
اس محل پر ایک نکتہ اور بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ فراق صاحب نے اِن شعرائے پنجگانہ کے درمیان جو فرقِ مراتب قائم کیا ہے وہ "مستند اہل الرائے" کے نزدیک معتبر نہیں۔ فراق صاحب کے نزدیک اصغر گونڈوی کا مرتبہ حسرت موہانی سے فروتر ہے لیکن "نشاطِ رُوح" کے مقدمہ نگار جناب سہیل کی سب باتوں کو اگر باور کر لیا جائے تو اصغر گونڈوی کا ہمرتبہ کوئی شاعر نہ اس وقت موجود ہے، نہ کبھی تھا اور نہ شاید آئندہ ہوگا۔ سہیل صاحب کے اس خیال کی تائید "نشاطِ رُوح" کے دوسرے مقدمہ نگار احسان احمد صاحب نے بھی کی ہے مگر ذرا کمزور لفظوں میں۔
جناب یاس عظیم آبادی نے تو بزعم خود غالب کو بھی چچا بنا کے چھوڑا۔ جب اُنکے نزدیک اپنے مقابلہ میں غالب کی کوئی ہستی

نہیں تو بیچارے حسرت موہانی، اصغر، جگر اور فانی کس شمار میں ہیں۔

شعرائے معاصر میں جگر مراد آبادی کا درجہ اگر آپ جاننا چاہتے ہیں تو سید سلیمان ندوی صاحب کا مقدمہ پڑھیے جو انہوں نے جگر کے دیوان "شعلۂ طور" پر لکھا ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپکو معلوم ہو جائیگا کہ فراق، سہیل، اور یاس سب کے سب ایک شدید قسم کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ شاعر تو صرف ایک ہی اور وہ جگر مراد آبادی ہے۔

فراق صاحب کی فہرست میں سب سے آخری نمبر فانی بدایونی کا ہے۔ اور اس ترتیب کو انہوں نے برابر قائم رکھا ہے مگر میرے محترم دوست پروفیسر رشید احمد صدیقی جنہوں نے دیوانِ فانی پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے، علی الاعلان کہتے ہیں کہ "فانی کو غالب کے مقابلہ میں ایک امتیازی حیثیت دی جاسکتی ہے"۔ لیکن غالباً اس مصلحت سے کہ کہیں پرستارانِ غالب بُرا نہ مان جائیں اپنے بیان میں "مگر بہر حال الفضل للمتقدم" کا دُم چھلا لگا دیا ہے اور میر و فانی کا موازنہ کرتے ہوئے بھی اسی استادانہ پینترے سے کام لیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ :۔

"حقیقت یہ ہے کہ میر کا سوز و گداز، اُن کی لطافتِ زبان، اور نزاکتِ ادا فانی کی شاعری کا اصلی جوہر ہے۔ البتہ متقدم و متاخر کا فرق ہے"۔

مقدمہ نگار حضرات کے بیانات کی رُو سے اِن پانچوں شاعروں میں ہر شخص سب سے افضل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بے معنی بات ہے۔ درحقیقت مقدمہ نگاروں نے اپنے مقدمات میں تنقید کا حق نہیں بلکہ دوستی کا حق ادا کیا ہے اور ساتھ ہی خود اپنی عظمت و بُزرگی کا اظہار و اثبات بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ اِن شعراء کے مراتب نسبی کے متعلق میں اپنی رائے کا اظہار کسی دوسرے وقت کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔ ہاں قارئین ساقی اگر کسی صحیح نتیجہ پر پہونچنے کے خواہشمند ہوں تو انہیں چاہیئے کہ اِن شعراء کے کلام کا براہِ راست مطالعہ کریں اور ان مقدمات کو ہرگز ہرگز نہ پڑھیں کیونکہ اُن میں "یار فروشی" اور "خود فروشی" کا جذبہ کام کر رہا ہے۔

اب ہم اُن مضامین کی ایک مختصر فہرست پیش کرتے ہیں جو ابتدا سے اس وقت تک ہر دَور کے شعراء میں مقبول رہے ہیں اور جن کی بنا پر ہم عصر حاضر کے "چوٹی کے غزلگو شعراء" کو بھی نقال اور کہنہ پرست کہنے پر مجبور ہیں :۔

(۱) پیکان و تیر، خنجر و شمشیر، قتل و خون۔

(۲) نزع، مرگ، قبر، حشر۔

(۳) میکشی۔

(۴) زاہد، واعظ، محتسب، ناصح۔

(۵) جفائے محبوب۔

(۶) "تصوف" و "فلسفہ"۔

(۷) رشکِ خونیں۔

(۸) جنون۔

(۹) آفتاب و ذرہ، دریا و قطرہ، دل و جگر، شمع و پروانہ، لیلیٰ مجنوں۔

(۱۰) ہو بی محل۔

جیساکہ ہم پیشتر بیان کرچکے ہیں ان تمام عنوانات کے ماتحت شعرائے پنجگانہ کا کلام کثیر مقدار میں نقل کرنا ممکن نہیں اسلئے ہم اپنی بحث کو زیادہ تر "بادشاہِ متغزلین" یعنی حسرت موہانی تک محدود رکھیں گے اور بقدر گنجائش اصغر، جگر، اور فانی کے اشعار بھی بطور نمونہ پیش کرینگے۔ جناب یاس عظیم آبادی یعنی میرزا یگانہ چنگیزی کا دیوان کوشش کے باوجود اس وقت تک ہمیں دستیاب نہ ہوسکا اسلئے ناچار اُن کے کلام کے متعلق اظہارِ خیال سے صرف نظر کرنا پڑا۔ عنوانات بالا کی تشریح اور ہر عنوان کے ماتحت حسرت کے اشعار پیش کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہو کہ فراق صاحب نے حسرت اور کلامِ حسرت کے متعلق جو بلند بانگ دعوے کئے ہیں اُنہیں اختصار کے ساتھ یہاں نقل کردیا جائے تاکہ قارئین پر کلامِ حسرت کے مطالعہ کے بعد فراق صاحب کے دعووں کی حقیقت واضح ہوجائے۔ فراق صاحب فرماتے ہیں کہ "نقادوں نے محسوس ہی نہیں کیاکہ

(دفعہ ۱) حسرت کے سوانح حیات، طرزِ زندگی اور حسرت کی غزل گوئی میں کس قدر لطیف ہم آہنگی پائی جاتی ہو اور محسوس کرنا ممکن بھی نہ تھا کیونکہ

(دفعہ ۲) حسرت کا احساسِ عشق اور نظریۂ حسن وعشق ایک "بیمار تخیل" کے بس کی بات نہیں۔

(دفعہ ۳) فراقِ یار میں گھل گھل کر ا بستر مرگ اور گورِ غریباں کے ذکر سے معشوق کو متاثر کرکے حسرت شعر نہیں کہتا۔

(دفعہ ۴) اُس کی غزل گوئی ٹھیٹھ عمل کی زندگی ہے۔

(دفعہ ۵) دُنیا میں کارزارِ عمل کے جتنے سُورما ہوئے ہیں۔ نپولین، سکندر، تیمور، سیزر، انیٹونی، غزنوی، رامؔ کرشن، اور ارجن، یہ تمام ہستیاں شعر وشاعری سے لطف اندوز ہونے کیلئے حسرت موہانی کا دیوان منتخب کرینگی۔"

اس بیان کو پانچ دفعات میں تقسیم کیاجاسکتاہے جیساکہ ترتیب بالا سے ظاہر ہے۔ پہلے ہم آخری دو دفعات کو لیتے ہیں۔

نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں ایک واقعہ بیان کیا ہو کہ سلطان محمود غزنوی ایک مرتبہ جب ہندوستان سے غزنین واپس جارہا تھا تو راستہ میں ایک باغی سردار کے علاقہ میں سے گذر ہوا۔ ایک نہایت مستحکم قلعہ اُس سردار کے قبضہ میں تھا۔ دوسرے دن سلطان نے اس قلعہ کے دروازہ پر پڑاؤ کیا اور سردار کے پاس پیغام بھیجا کہ کل صبح ہماری درگاہ میں حاضر ہو، نذرِ عقیدت پیش کرو اور سلطانی خلعت پہن کر واپس جاؤ۔ دوسرے دن سلطان اور خواجہ بزرگ حسن میمندی گھوڑوں پر سوار ہوکر نکلے۔ دیکھا کہ سامنے سے قاصد چلا آتا ہے۔ سلطان نے خواجہ سے پوچھا کہ بھلا سردار نے کیاجواب دیا ہوگا؟ خواجہ نے فردوسی کا یہ شعر پڑھا ؎

اگر جز بکامِ من آید جواب ٭ من و گرز و میدان و افراسیاب

سلطان نے پوچھا کہ "یہ شعر کس کا ہے۔ اس سے مردانگی کی بُو آتی ہے۔"

اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ مردانِ جنگی کو زیادہ تر ایسے اشعار پسند ہونگے جن میں جرأت و مردانگی کا ذکر ہو، جہاں کمانیں کڑکیں، تلواروں کی بجلیاں چمکیں، تیروں کا مینہ برسے اور حریفوں کے خون سے ہولی کھیلی

جاتے۔ اس بنا پر خیال ہوتا ہے کہ جنگی سورماؤں کو جنکا نام فراق صاحب نے لیا ہے، غالباً حسرت کے وہ اشعار پسند آئیں گے جن میں تیغ و خنجر، اور قتل و خون کا ذکر ہے۔

فرسودہ مضامین کے جو دس عنوان ہم نے قائم کئے ہیں اُن میں
پہلا نمبر، پیکان و تیر، خنجر و شمشیر، اور قتل و خون کا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے مضامین ہمارے یہاں فارسی کے تتبع میں آئے۔ فارسی شاعری میں اس قسم کے خیالات ابتداً شعر کے حالات گرد و پیش کا نتیجہ تھے، رفتہ رفتہ بمنزلہ اصول مسلمہ کے ہوگئے اور بعد میں آنے والوں کے لئے ان کی تقلید ناگزیر ٹھہری۔ اُردو شعرا نے بھی اپنے فارسی پیشرووں کے نقش قدم پر چلنا ضروری سمجھا ورنہ ظاہر ہے کہ اُردو کے ہزاروں شعرا میں سے جنہوں نے ان مضامین پر طبع آزمائی کی ہے دو چار بھی ایسے نہ ملیں گے جنہیں اپنے محبوب کے ہاتھوں اعزاز "شہادت" نصیب ہوا ہو۔ اور بالفرض ایسی چند مثالیں مل بھی جائیں تو کم از کم اس قدر یقینی ہے کہ حسرت، اصغر، جگر، اور فانی ہرگز اُن خوش نصیبوں میں سے نہیں ہیں جنہیں سفاک محبوب نے تلوار کے گھاٹ اُتار دیا ہو۔ جب یہ صورت ہے تو ہم کس طرح مان لیں کہ حسرت کا یہ قول ؎

کیا نہیں شوقِ شہادت کو یہ کافی اعزاز ٭ کہ مرا سر ہے ترے نوکِ سناں کی رونق

کسی امر واقع کا بیان ہے اور سچ مچ قاتل محبوب حسرت صاحب کا سر کاٹ کر نیزہ پر لئے پھرتا تھا۔ یا اصغر صاحب کا یہ بیان ؎

کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں ٭ بہت کچھ سوچکر ظالم نے تیغ خونفشاں رکھدی

کسی حقیقت کا حامل ہے۔ یا جگر صاحب کا یہ کوئی ذاتی تجربہ ہے جس کا ذکر اس شعر میں کیا گیا ہے ؎

صدقے ان ہاتھوں کے مجھکو بھی خبر تک نہ ہوئی ٭ اس نزاکت سے گلے پر مرے شمشیر چلی

یا فانی صاحب نے یہ آپ بیتی بیان کی ہے ؎

لازم ہے احتیاط ندامت نہیں ضرور ٭ لے اب چھری تو پھینک لہو سے بھری ہوئی

کاش فراق صاحب اسپر غور کریں کہ یہ کس کے قتل کے واقعات ہیں؟ کب پیش آئے اور اُن کی کیا اصلیت ہے؟ قارئین یہ خیال نہ کریں کہ اس موضوع پر ہمارے چوٹی کے شعرا نے صرف یہی چار شعر تصنیف فرمائے ہیں۔ نہیں اس قسم کے لایعنی، بے بنیاد اور محض رسمی اشعار سے ان بزرگوں کے دیوان بھرے پڑے ہیں، جبکا تھوڑا سا نمونہ ابھی ہم پیش کرینگے۔

معشوق کے ہاتھوں قتل کی اس مفروضہ "واردات" کے مختلف مدارج ہیں۔ پہلے مختلف پیرایوں میں عاشق صاحب کی طرف سے شوق شہادت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد قاتل کی آمادگی دکھلائی جاتی ہے۔ پھر واقعۂ قتل کا بیان ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں کبھی اپنی سخت جانی کی شکایت کی جاتی ہے کبھی رقصِ بسمل کا تماشا دکھایا جاتا ہے۔ کبھی قاتل کے دامن بچانے کا ذکر ہوتا ہے۔ قتل ہوجانے کے بعد عاشق صاحب کی طرف سے ہدیۂ تشکر معشوق صاحب کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ پھر معشوق، بیگناہ عاشق کے قتل پر نادم ہوتا ہے کبھی اپنے دامن سے خون کے دھبے چھڑانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ کبھی دیدہ دلیری سے مقتول عاشق کا سر نیزہ پر یا اس کا دل تیر کی نوک میں چبھو کر لئے پھرتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے چند اور

لایعنی مضامین ہیں جن پر ہمارے چوٹی کے شعرا نے اپنا عزیز وقت برباد کیا ہے اور اُردو کی عشقیہ شاعری کو ایک اُضحوکہ بنا دیا ہے۔ آیئے "بادشاہِ متغزلین" کی زبانی آپ کو یہ خونیں داستان سُنوائیں۔ آپکو اختیار ہے کہ اسے سُنکر قہقہے لگایئے یا سینہ کوبی کیجئے۔

شوقِ شہادت ؎

ہم بھی مُشتاق ہیں شہادت کے ؛ لے تجھے خونِ اہلِ شوق مُباح
اس درجہ نہ بیتاب ہوا ہے شوقِ شہادت ؛ ہے میان میں اُس شوخ کے شمشیر ابھی تک
پہلے خدا اُسے کہیں شوقِ شکار دے ؛ پھر یہ کہ وہ ہمیں کو نشانہ اُتار دے
کاٹ لوں اپنا گلا آپ کہ جھگڑا ہو تمام ؛ کاش مِل جائے کہیں آپکی شمشیر مجھے
دل خُون ہو چکا ہے جگر ہو چکا ہے خاک ؛ باقی ہوں میں مجھے بھی کرائے تیغزن تمام

قاتل کی آمد آمد ؎

بے نقاب آنیکو ہیں مقتل میں وہ بیشک مگر ؛ دیکھنے کا ہے کو دیگی میری حیرانی مجھے

قتل سے پہلے ؎

کیا تامل ہے مرے قتل میں اے بازوِ یار ؛ ایک ہی وار پہ سر تن سے جُدا رکھا ہے
دیکھئے شوقِ شہادت میں جھکی ہے گردن ؛ آپ اِسوقت ذرا پاس ہمارا نہ کریں
ہم سر جھکائے بیٹھے تھے علم ہو چکی تھی تیغ ؛ پھر کیا کیا خیال جو قاتل ٹھہر گیا

سخت جانی ؎

سخت جانوں پہ اُٹھنے والی ہے ؛ تیری تلوار کا خُدا حافظ
ہمارے شکوہ ہائے سخت جانی پردہ کہتے ہیں ؛ ابھی دیکھی نہیں ہے آپنے تیغِ رواں میری

دامن کشی ؎

اس سلیقہ سے کیا ذبح کہ دامن اُن کا ؛ خُونِ عشاق سے گلنار نہ ہونے پایا
دامن کو بچاتا ہے وہ کافر کہ مُبادا ؛ چُھو جائے کہیں پاکی خونِ شہدا سے

اظہارِ تشکر ؎

اک بار تھا سر گردنِ حسرت پہ رہینگے ؛ قاتل تیری شمشیر کے احسان ہزاروں —

ندامتِ قاتل ؎

خُونِ بیجرمی سے اپنی دیکھکر تلوار سُرخ ؛ ہو گئی مارے ندامت کے جبینِ یار سُرخ
جفائے یار پر چھایا ہے اک عالم ندامت کا ؛ یہی تھا مدعا میری تمنائے شہادت کا
خونِ حسرت جو کیا ہے تو وہ نادم ہیں بہت ؛ کچھ نہ مہندی کی خبر ہے نہ انہیں پان کا ہوش
پہلے تو میرا خُون بہایا خوشی خوشی ؛ پھر کیا وہ خود ہی سوچ کے شرما کے رہ گئے

بہت نادم ہوئے آخر وہ میرے قتلِ ناحق پر ❊ ہوئی قدرِ وفا جب آشکارا آہستہ آہستہ

خُون کے دھبّے سے

قاتل ترے دامن پہ مرے خون کے دھبّے ❊ کچھ اور بھی خنجر سے چھُٹانے میں لگے ہیں

قاتل کی دیدہ دلیری سے

ٹکڑے ہیں یہ کس کے دلِ محروم کے ظالم ❊ ابتک جو ترے تیر کے پیکاں میں لگے ہیں

قتل کرکے مجھکو کہتے ہیں وہ کس کس ناز سے ❊ یہ تو ہم نے صرف چاہت آزمائی آپکی

لگے ہاتھوں تلوار کے دوچار ہاتھ اور بھی دیکھ لیجئے سے

تم لگاتے جو اپنے ہاتھ سے تیغ ❊ سب مرے زخم دلکشا ہوتے

کون یہ دستِ شمشیر نظر آتا ہے ❊ مجھکو اک عالمِ تصویر نظر آتا ہے

تری تلوار سے اے شاہِ خوباں ❊ محبّت ہوگئی ہے ہر گلو کو

رنجشِ بازوئے نازک کی ضرورت کیا تھی ❊ مجھکو اک جنبشِ ابرو سے مٹا دینا تھا

یہ ہیں وہ اشعارِ آبدار جن کی بنا پر بقولِ فراقؔ کارزارِ عمل کے سُورما سکندر، سیزر، تیمور، نپولین، اینٹونی، غزنوی، رام، کرشن اور ارجن وغیرہ شعر و شاعری سے لُطف اندوز ہونے کے لئے حسرتؔ موہانی کا دیوان منتخب کرینگے۔ لیکن فراقؔ صاحب کا یہ نظریہ تسلیم کرنے کے لئے ان سُورماؤں کو مسلوب الحواس اور فاتر العقل فرض کرنا بھی ضروری ہوگا کیونکہ ثباتِ عقل و حواس کی حالت میں دُنیا کا کوئی انسان بھی ایسے اشعار سے متاثر اور لُطف اندوز نہیں ہو سکتا جنکو اصلیت و حقیقت سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہ ہو اور جن کی بنیاد محض چند لایعنی مفروضات پر ہو۔

ہاں یہ بھی ممکن ہو کہ فراقؔ صاحب نے (دفعہ ۴) میں جس "ٹھیٹھ عمل" کا ذکر کیا ہے اس سے اُن کی مُراد وہ "عمل" ہو جسکے مختلف پہلوؤں پر "بادشاہِ متغزلین" نے مندرجہ ذیل اشعار میں روشنی ڈالی ہے۔ سُنیئے سے

اندھیرے میں وہ آ لپٹے تھے پہلے کسکے دھوکے میں ❊ کہ جب آخر مجھے دیکھا تو شرما کر کہا تم ہو

مزاجِ یار مکدّر ہمارے سے کیوں ہوتا ❊ ضرور کوئی نہ کوئی ہوئی فتور کی بات

دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں وہ شبکو ہم سے ❊ رسمِ پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے

حائل تھی بیچ میں جو رضائی تمام شب ❊ اس غم سے ہمکو نیند نہ آئی تمام شب

رشک سے مٹ مٹ گئے ہم دیکھکر گرمِ نظر ❊ غیر نے محفل میں جب اُنگلی دبائی آپکی

ہم حالِ نہیں یوں دل کا سُنانے میں لگے ہیں ❊ کچھ کہتے نہیں پاؤں دبانے میں لگے ہیں

دوپہر کی دھوپ میں میرے بُلانے کے لئے ❊ وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

سامنے سب کے مناسب نہیں ہم پر یہ عتاب ÷ سر سے ڈھلجائے نہ غصّہ میں دوپٹا دیکھو
سب کی خاطر کا ہو خیال تمہیں ÷ کچھ ہمارا بھی انتظام کرو
ہم نے کس دن ترے کوچے میں گذارا نہ کیا ÷ تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

اِس قسم کے پست، سوقیانہ، اور مُبتذل اشعار "بادشاہِ متغزلین" کے یہاں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ہم نے تو صرف نمونہ پیش کیا ہے۔

(دفعہ ۳) میں فراق صاحب فرماتے ہیں کہ "فراقِ یار میں گھُل گھُل کر بسترِ مرگ اور گورِ غریباں کے ذکر سے معشوق کو متاثر کرکے حسرت شعر نہیں کہتا" آیئے ذرا "بادشاہِ متغزلین" کے کلام کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ فراق صاحب کا یہ دعویٰ کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے۔

فرسودہ مضامین کی جو فہرست ہم نے پیش کی ہے اُس میں دوسرا نمبر "نزع۔ مرگ۔ قبر۔ حشر" کا ہے۔

جس طرح "قتل کی واردات" کے مختلف مدارج تھے اسی طرح اس موضوع کے بھی کئی درجے ہیں۔ پہلے عاشق صاحب پر فراقِ یار میں نزع کا عالم طاری ہوتا ہے سنگدل محبوب کبھی تو اسی حالت میں آ پہونچتا ہے اور کبھی عاشق صاحب کے راہی عدم ہونے کے بعد آتا ہے۔ کبھی جنازے میں شریک ہوتا ہے اور کبھی صرف قبر پر جاکر فاتحہ پڑھ آتا ہے۔ کبھی مزارِ عاشق پر پھول بھی چڑھاتا ہے اور کبھی قبر کی زیارت کو بھی نہیں جاتا۔ مرنے کے بعد جب عاشق صاحب خاک میں ملکر خاک ہوجاتے ہیں تو اُن کا غبار دامن محبوب سے لپٹ جاتا ہے۔ آخری منزل حشر کی ملاقات ہے۔ عاشق صاحب اس بھیڑ میں بھی اپنے محبوب کو پہچان لیتے ہیں اور طرح طرح سے اپنی محبّت کا ثبوت دیتے ہیں۔

"بادشاہِ متغزلین" کا عالمِ نزع دیکھئے ؎

ابھی کچھ اور دمِ واپسیں ٹھہر جاتا ÷ کچھ اور بھی جو ترا انتظار ہم کرتے
دمِ آخر مجھے دیکھا تو نادم ہو کے فرمایا ÷ کسے معلوم تھا تیری یہ حالت ہونیوالی ہے
دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق ÷ بس اب جاؤ تم سے خفا ہوگئے ہم

بعدِ مرگ ؎

موت سے پوری ہوئی شرطِ وفا ÷ پر نہ کہا تم نے کہ ہاں ہوگئی
حال مرا تھا جب بتر تب تو ہوئی نہ تم کو خبر ÷ بعد مرے ہوا اثر اب میں اثر کو کیا کروں
درمیانِ ہجومِ حسرت و یاس ÷ میں بھی اک گوشۂ مزار میں تھا

بیوفا محبوب تعزیت کو نہیں آتا ؎

مل گئی خاک میں سب بروئے نازو وفا ÷ تعزیت کو بھی نہ وہ شوخ جفا جو آیا

نہ صرف اتنا بلکہ عاشق صاحب کے مزار پر بھی نہیں جاتا ؎

ہے جہاں مدفن شہیدِ وفا ٭ واں کبھی آپ کا گذر نہ ہوا

حسرت صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہے ؎

فاتحہ پڑھنے چلے مرقدِ حسرت پہ جو وہ ٭ پہلے کس ناز سے رُو رُو کے سنواری گیسو

قبرِ عاشق پر پھول چڑھائے جاتے ہیں ؎

مرقدِ عاشقاں پہ آخرکار ٭ گلفشانی تجھے مبارک ہو

خاکِ عاشق ؎

خاک ہوکر ملا یہ فخر کہ میں ٭ تیرے توسن کا ہمرکاب ہوا

لپٹے اس ڈھب سے کہ پھر ہو نہ جُدا خاک مری ٭ کہیں پہونچے بھی تو اُس گوشۂ داماں کے قریب

حسرت صاحب حشر میں پہونچتے ہیں اور وہاں اس جفا کار سے ملاقات ہوتی ہے ؎

ہم عرصۂ حشر میں بھی حسرت ٭ پہچان گئے اُنہیں نرے ہوش

شکوۂ عشق جو ہم سے کسی عنوان نہ ہوا ٭ حشر میں بھی وہ جفا کار پشیماں نہ ہوا

جنت میں پہونچنے کے بعد یادِ محبوب میں عاشق صاحب حوروں کی طرف ملتفت نہیں ہوتے ؎

یاد میں تیری نہ دُنیا ہی سے بیزار تھا دل ٭ خُلد میں بھی تو مخاطب ہوئے حُور سے ہم

کیا ان اشعار کی موجودگی میں اور انہیں جیسے دوسرے اشعار کے ہوتے ہوئے جو دیوانِ حسرت میں آپکو ملیں گے فراق صاحب کا وہ دعویٰ جو انہوں نے (دفعہ ۳) میں پیش کیا ہے کسی طرح قابلِ قبول ہے ؟

ممکن ہے، بعض حضرات یہ سوال کریں کہ پہلے عنوان کے ماتحت جو اشعار نقل کئے گئے ان سے حسرت صاحب کا قتل ہونا ثابت ہے اور اب یہ بتایا جاتا ہے کہ محبوب کی بے اعتنائی اُن کی موت کا باعث ہوئی اور کہیں ان کا مزار بھی ہے ان دو مختلف بیانوں میں سے کونسا بیان سچا ہے۔ اسکے علاوہ واقعاتِ بعد از مرگ کا جن اشعار میں ذکر ہے وہ مرنے کے بعد کس طرح کہے گئے اور ہم تک کیونکر پہونچے ؟ دراصل ان سوالات کا صحیح جواب دینا میری طاقت سے باہر ہے۔ اگر میں کچھ کہونگا بھی تو وہ محض ایک ظنی اور قیاسی بات ہوگی اس لئے بہتر یہ ہے کہ طالبانِ تحقیق مولانا حسرت کو کانپور کے پتہ پر خط لکھ کر اُن سے حقیقتِ حال دریافت کرلیں یا پھر فراق صاحب سے رجوع کریں ممکن ہے کہ وہ ان مسائل پر کچھ روشنی ڈال سکیں کیونکہ "بادشاہِ متغزلین" کے کلام کے اسرار و رموز کو جیسا وہ سمجھتے ہیں کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔

اپنے بیان کی (دفعہ ۲) میں فراق صاحب نے حسرت کے نظریۂ حُسن و عشق کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ ہماری فہرست مضامینِ فرسودہ" میں اس قسم کا کوئی عنوان نہیں ہے لہٰذا اس موضوع پر ہم تفصیلی بحث نہیں کرینگے۔ البتہ قارئین کی دلچسپی کیلئے اختصار کے ساتھ حسرت صاحب کا "نظریۂ حُسن و عشق" پیش کر دینگے۔

عام طور پر اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ جب کسی پر دل آتا ہے تو۔ بے اختیار آتا ہے ارادہ، خواہش اور کوشش سے انسان کسی پر عاشق نہیں ہوا کرتا۔ لیکن حسرت صاحب اسکے قائل نہیں۔ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی اور ایک چھوٹے سے لڑکے

کو جس میں جوان ہو کر معشوق بننے کی صلاحیتیں نظر آتی ہیں، اپنے لئے انتخاب کر لیتے ہیں اور اس اُمید پر جیتے ہیں کہ جب وقت کا مصوّر حُسن کی تصویر میں شباب کا رنگ بھر یگا تو اس پیکر جمال کی خدمت میں عاشقی کی درخواست پیش کر دینگے اور برسوں کی "اُمیدواری" سے حق محبّت ثابت کر دیا جائیگا۔ اس خیال کو نہایت "جامعیت" کے ساتھ انہوں نے صرف دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے ؎

عمر ہی کیا ہے وہ کمسن ہیں ابھی نام خدا ✤ اُنپہ مرنا ہو تو کچھ دن ہمیں جینا ہے ضرور

معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مولانا کی نظر دوربیں نے اس "کمسن" کو اپنا معشوق بنانے کے لئے انتخاب کیا تھا، اُس وقت وہ خود ماشاءاللہ کافی سن رسیدہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت وہ کافر جوان ہوا، یہ بُوڑھے ہو گئے مگر بحمداللہ اُس پیکر شباب سے حصول آرزو کا جوش سرد نہیں ہوا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

پیرانہ سر بھی شوق کی ہمت بلند ہے ✤ خواہان کام جاں ہیں جو اس نوجواں سے ہم

سطور بالا میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ "مولانا ایک چھوٹی سی لڑکی اور ایک چھوٹا سا لڑکا جس میں جوان ہو کر معشوق بننے کی صلاحیتیں نظر آتی ہیں، اپنے لئے انتخاب کر لیتے ہیں"۔ ممکن ہے بعض حضرات یہ اعتراض کریں کہ جس شعر میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے اس میں ایک لفظ بھی موجود نہیں جس سے اس "کمسن" کا لڑکی یا لڑکا ہونا ثابت ہو۔ جہاں تک اس شعر کا تعلق ہے، یہ اعتراض یقیناً درست ہے لیکن ہمارے پیش نظر مولانا کے دوسرے اشعار بھی ہیں جن سے یہ امر متحقق ہو جاتا ہے۔ اس سے تو غالباً فراق صاحب کو بھی انکار نہ ہوگا کہ دوپٹا لڑکیوں اور عورتوں کیلئے مخصوص ہے اور اس شعر سے سامنے سکے مناسب نہیں ہم پر یہ عتاب ✤ سر سے ڈھل جائے نہ غصّہ میں دوپٹا دیکھو

یہ نتیجہ نکلتا کہ محبوب مخاطب صنف نازک کا ایک فرد ہے، غالباً بیجانہ ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی جب ہم اس شعر پر پہونچتے ہیں ؎

سرتاسر اک لطیفۂ خوبی ہے وہ نگار ✤ زلف اُسکی عنبریں ہے تو ہے مشکبار خط

تو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مولانا صاحب کا محبوب کوئی نچکیا، بھانڈ کا لونڈا ہے جسکے داڑھی بھی ہے اور زلفیں بھی۔

یہ ہے "بادشاہ متغزلین" کا نظریہ حُسن و عشق جس کا سمجھنا بقول فراق "نقاد" کے بس کی بات نہیں ہمیں فراق صاحب کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے۔

اب ہم فراق صاحب کے بیان کی (دفعہ اوّل) کو لیتے ہیں جو سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں اُنہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ حسرت کے سوانح حیات، طرز زندگی، اور حسرت کی غزلگوئی میں زبردست ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ہم نے اپنی "فہرست مضامین فرسودہ" کے پہلے اور دوسرے عنوان کے ماتحت جو اشعار نقل کئے ہیں ان کے مطالعہ کے بعد ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی فراق صاحب کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ان اشعار میں اور حسرت کے سوانح زندگی میں ہم آہنگی تو کجا کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا حسرت زید عمرہٗ ماشاءاللہ تندرست و توانا کانپور میں براجے رہے ہیں پھر کوئی کس طرح تسلیم کر لے کہ ان اشعار میں جو واقعات مذکور ہیں مثلاً مولانا کا قتل، یا عالم نزع اور وفات وغیرہ ان کی

کوئی اصلیت ہے۔ رسم پرستی کا بُرا ہو جسکی بدولت ہمارے ادب میں یہ سرمایۂ خرافات ہر روز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

ہماری فہرستِ مضامینِ فرسودہ کا تیسرا عنوان میکشی ہے۔

شراب خواری ہمیشہ ایرانیوں کا نہایت محبوب مشغلہ اور اُن کی سماجی زندگی کا ایک جزوِ لازمی رہی ہے۔ زردشتی مذہب میں تو شراب جائز ہی تھی لیکن اسلام لانے کے بعد بھی ایران کی میکشی میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا۔ دراصل روایاتِ کہن کا اثر، طبائع کا فطری میلان اور ملک کی آب و ہوا، ان سب چیزوں نے ملکر شراب خواری کو ایک ایرانی کی زندگی کا جزوِ لازمی بنا دیا اور آج بھی جس عمومیت کے ساتھ ایران میں شراب پی جاتی ہے اسکی مثال کسی ایشیائی ملک میں تو کیا یورپ میں بھی مشکل ہی سے ملیگی۔ سنہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ طہران میں میں اپنے ایک دوست کے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ پیاس لگی۔ میں نے پانی مانگا لیکن آبِ سادہ کے بجائے آتشِ سیّال پیش کی گئی۔ جب میں نے اسکے پینے سے انکار کیا تو میرے دوست نے حیران ہو کر پوچھا، کیا آپ نہیں پیتے! میں نے کہا نہیں۔ اسپر اُنہوں نے جو الفاظ کہے وہ مجھے ہمیشہ یاد رہینگے اور وہ ایران کے میلاناتِ امروزہ کا ایک سچا نمونہ ہیں۔ اُنہوں نے کہا۔ "برادر! آدم کہ عرق نخورد، چہ طور ممکن است زندگانی بکند" بھائی، آدمی شراب نہ پئے تو کیونکر جئے۔

غرض میخواری کے اس عام رواج کا نتیجہ یہ ہوا کہ شراب ایرانی شاعری کا ایک مخصوص موضوع بن گئی اور ایران کے لاکھوں شعرا میں شاید دس پانچ بھی ایسے نہ ملیں گے جنہوں نے شراب کے متعلق کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔ جو پیتے تھے اُنہوں نے بیانِ واقع کے طور پر اور جو نہیں پیتے تھے اُنہوں نے اکثریت کی تقلید میں اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ اُردو شاعری تو ایرانی شاعری کا مثنیٰ ہے۔ جو کچھ وہاں ہے، یہاں بھی ہے۔ اصلیت نہ سہی نقالی ہی سہی۔ میر و سودا کے زمانہ سے لیکر اسوقت تک میخواری (جہاں تک سچ مچ پینے کا تعلق ہے) ہمارے شعرا کی ایک نہایت قلیل جماعت تک محدود رہی ہے لیکن اس کے باوجود شراب کے متعلق قریب قریب ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے اور بعض نے تو اس موضوع کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے حالانکہ ان میں سے بعض کے متعلق تحقیقی طور پر معلوم ہے کہ اُنہوں نے پینا تو کُجا شراب کبھی چھوئی بھی نہیں اور چھونا کیسا کبھی دیکھی بھی نہیں۔ لیکن اُن کے دیوان اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے شراب کی بھٹی ہے کہ بڑی بھبک رہی ہے۔ بے معنی نقالی کی اس سے زیادہ افسوسناک مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ وہ بدنصیب شاعر جس نے پینا تو کُجا شراب کی صورت بھی کبھی نہیں دیکھی اور جس کے اشعار کی بنیاد ذاتی تجربات کے بجائے محض "روایت" پر ہے، اُس کے کلام میں کیا لُطف ہو سکتا ہے۔ وہ کیا جانے کہ حقیقی کیف و مستی کسے کہتے ہیں، زاہد و واعظ کو ہمیشہ یہ کہکر للکارا جاتا ہے کہ "ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں"! لیکن اس قسم کے نقال شاعر کیا زاہد و واعظ سے کم لغو گو سمجھے جانے چاہئیں۔ ان لوگوں کا شراب کے متعلق اشعار لکھنا ٹھیک ایسا ہی ہے جیسے ایک اچھوتی کنیا کوک شاستر لکھے یا مہاتما گاندھی شعرِ عرب پر تبصرہ فرمائیں۔

مولٰنا حسرت موہانی کے سوانحِ زندگی کا جہاں تک ہمیں علم ہے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اُنہوں نے دُخترِ رز سے کبھی دل نہیں لگایا۔ ہاں کبھی بھُولے بھٹکے اندھیرے اُجالے کوئی بات ہو گئی ہو تو وہ چنداں قابلِ لحاظ نہیں۔ لیکن اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ماشاءاللہ بڑے دھاونت شرابی ہیں پیتے ہیں اور روز پیتے ہیں۔ ساغر و مینا پر بس کرنیوالے نہیں بلکہ خُم کے خُم لُنڈھاتے ہیں اور پی پی کر دونوں جہان سے بیخبر ہو جاتے ہیں بلکہ فنا ہو کر بھی خاکِ رہِ میخانہ بنتے ہیں بعض بعض غزلیں تو

مطلع سے لیکر مقطع تک شراب میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ آیئے آپ بھی میخواری میں "بادشاہِ متغزلین" کے شریک ہوجایئے اور بیدھڑک ہوکر پیجئے اس لئے کہ ؎

حسرتِ مے پرست کو، بلکہ ہر ایک مست کو ؛ پیرِ مغاں کے دور میں خوفِ خطا سے کیا غرض

اب دیکھئے کہ "حسرتِ مے پرست" کس کس انداز سے پیرِ مغاں کی خدمت میں عرضِ نیاز کرتے ہیں ؎

میری طینت میں ہے دخیل ہوسِ جامِ شراب ؛ بندۂ پیرِ مغاں ہوں میں خسِ جامِ شراب

مجھے طوفِ حرم کی آرزو کیوں ہو گذر میرا ؛ سرِ کوئے بتاں تک ہے درِ پیرِ مغاں تک ہے

مینوشیو نہیں بہجر دو جہان ہے ؛ ہم خوش ہے کہ بندۂ پیرِ مغاں ہے

چلتا ہی روز دورِ مے ارغواں ہنوز ؛ جاری ہی فیضِ محفلِ پیرِ مغاں ہنوز

پیر و پیرِ مغاں تھا میں یہاں تک حسرت ؛ کہ فنا ہو کے بھی خاکِ رہِ میخانہ ہوا

(فرق لائے نہ جگر سوزیِ صہبا میں گلاب ؛ مُغبچو تم کو قسم ہے جو کچھ آمیز کرو)

ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک عرب ہندوستان آیا۔ اتفاق سے "محرّم" کے زمانہ میں اُسے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ جدھر جاتا ہے گریہ و ماتم۔ جدھر دیکھتا ہے شیون و شین۔ حیران ہوکر لوگوں سے پوچھا کہ کون مرگیا جس کے لئے سارا شہر عزاخانہ بنا ہوا ہے۔ جواب ملا کہ "ارے نادان! تجھے معلوم نہیں کہ یہ ماتم حسین ہے۔" عرب نے بڑے تعجب سے کہا کہ "اچھا! یہاں اب خبر آئی ہے۔ حسین کی وفات کو تو تیرہ سو برس گذرے" وہ بیچارا یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جس شخص کی وفات کو تیرہ سو برس گذر چکے آج اُسکی مجلس عزا کیوں برپا ہے۔ لہذا اُس نے یہی قیاس قایم کیا کہ غالباً ہندوستان کے لوگ واقعۂ کربلا سے اب تک بے خبر تھے۔ اب خبر آئی ہے تو مصروفِ ماتم ہیں۔ اُردو شاعری میں پیرِ مغاں اور مُغبچوں کا ذکر بھی ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسا اُس عرب کے نزدیک امام حسین کی وفات کے تیرہ سو برس بعد لکھنؤ میں اُن کا ماتم تھا اس لئے کہ قبولِ اسلام کے بعد خود ایران میں بھی پیرِ مغاں اور مُغبچوں کا وجود برائے نام رہگیا تھا چہ جائیکہ ہندوستان جہاں یہ گروہ نہ کبھی پہلے تھا نہ آج ہے۔ ہاں کوئی صاحب محض مباحثہ کی خاطر نوساری کے پارسیوں کی مثال پیش کرنے لگیں تو اور بات ہے مگر یاد رہے کہ ہماری اُردو شاعری میں جس پیرِ مغاں اور مُغبچہ کا ذکر ہے وہ نوساری سے ہرگز نہیں آیا۔

میخواری کے تمام مدارج پر مولانا نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اشعار ذیل نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں ؎

الٰہی خیر میرے عہدِ ترکِ میگساری کی ؛ ہجومِ شوق میں ہنگامۂ فصلِ بہاراں میں

برسات کے آتے ہی توبہ نہ رہی باقی ؛ بادل جو نظر آئے بدلی مری نیت بھی[1]

خُم لگادے ہم بلانوشوں کے لب سے ساقیا ؛ کام آئیگا نہ ساغر آج نے پیمانہ آج

اسقدر کیں مستیاں ہم بادہ خواروں نے کہ آج ؛ ہوگیا سب رنگ مے سے خانۂ خمّار سرخ

---

[1] میں توبہ کرچکا تھا مگر کیا کروں جلیلؔ ؛ کالی گھٹا کو دیکھ کے نیت بدل گئی۔ دونوں شعروں میں کسقدر "مشابہت" ہے۔

رندوں پہ یہ کیا ستم ہے ساقی ٭ ساغر خالی ہیں پُر سبُو ہیں
اب جو ملتی ہو تو چلّو ہی سے پی لیں مے نوش ٭ انتظارِ طلبِ جام ہے بیجا نہ کریں

دیکھکر غیر کی محفل میں اُنہیں مستِ شراب ٭ نہ ہوا ضبط ہمارے نکل آئے آنسو
رشک سے مِٹ مِٹ گئے ہم تشنہ کامانِ وصال ٭ جب ملا لبہائے ساقی سے لبِ پیمانہ آج

اشعارِ بالا سے قارئین کو یہ بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مولٰنا نے جس سوسائٹی کی تصویر کھینچی ہو وہ کُل کی کُل شرابی ہو۔ رقیب ہے تو وہ شرابی۔ محبوب ہو تو وہ شرابی۔ احباب ہیں تو وہ شرابی۔ اور خود اپنا اور ساقی کا تو پوچھنا ہی کیا کہ یہ تو شراب ہی سے بنے ہیں۔ رندوں کی بدمستیوں کا یہ عالم ہو کہ بیچارے زاہد اور واعظ کو بھی زبردستی پلا دیتے ہیں ؎

رندوں نے پچھاڑ کر پلا دی ٭ واعظ کے نہ چل سکے بہانے

اور پھر اسی پر بس نہیں۔ مولٰنا کا تو یہ ارادہ ہے کہ ہر ولی کو میخوار بنا دیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہو ؎

کر دونگا میں ہر ولی کو میخوار ٭ توفیق جو مجھکو دی خدا نے

اس قسم کی "رسمی شاعری" پر اب جو ہر طرف سے لے دے شروع ہوئی ہے تو یاروں نے "تصوف" کے دامن میں پناہ لی ہے۔ اور معترضین کو "حقیقت" و "مجاز" کے فریب میں مُبتلا کرنا چاہا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ شاعری میں استعارات سے کام لیا جاتا ہے اور کبھی کبھی نظر کو تیر اور آنکھ کو ساغر سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اشعارِ بالا میں جس شراب کا ذکر ہے، جو واعظ بیچارے کو پچھاڑ کر پلائی گئی ہے، اُسے "شرابِ معرفت" ٹھہرانا، مذاقِ سلیم کے گلے پر کُند چھُری چلانا ہے۔

چونکہ مدت سے راقم السطور کا مسکن کانپور ہے اور مولٰنا حسرت بھی ایک زمانہ سے کانپور ہی میں قیام پذیر ہیں اس لئے موصوف کے ذاتی حالات سے ایک حد تک آگاہی ہے۔ اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ مولٰنا حسرت کسی زمانہ میں بھی بھنگ پیا کرتے تھے یا آجکل پیتے ہیں تو ہم ہر قسم کا تاوان ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن "رسم کی پابندی" اور "قافیہ کی مجبوری" نے مولٰنا کی زبان سے یہ شعر نکلوا دیا ؎

عہدِ مستی کے اب کہاں وہ رنگ ٭ ساغرِ بادہ ہو نہ کاسۂ بنگ

یہی ہے وہ ہم آہنگی جو فراق صاحب کے نزدیک حسرت کے سوانحِ حیات اور حسرت کی غزلگوئی میں پائی جاتی ہے۔ فراق صاحب نے حسرت کے سوانحِ زندگی اور حسرت کی غزلگوئی میں ہم آہنگی کا دعویٰ کرتے وقت غالبًا اس امر پر غور نہیں کیا کہ اگر واقعی یہ دعویٰ ثابت ہو جائے تو بیچارے مولٰنا حسرت کو ایک دعاوت شرابی اور ایک "بنگ نوش" ماننا پڑیگا۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں مولٰنائے محترم کی ذات پر صریح اتہام اور قطعی بہتان ہیں۔ اُنہوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہو وہ محض نقالی ہے۔ حقیقت سے اُسے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں۔ (باقی آیندہ)

عندلیب شادانی

رُباعیاتِ فرحت

بزمِ رنداں کو جگمگا دے ساقی — اپنے شیشوں کی سب لُٹا دے ساقی
بدمستِ شراب کر کے دُنیا بھر کو — تفریقِ منَ و تُو بھی مٹا دے ساقی

دل کو مستِ نگاہ کر دے ساقی — کر دے ہاں ہاں تباہ کر دے ساقی
میری بخشش کو خود ہی رحمت دوڑے — اتنا غرقِ گُناہ کر دے ساقی

آنکھیں محوِ نگار کر دے ساقی — انمیں کیفِ بہار بھر دے ساقی
میرے جذباتِ عشق بے معنی کو — زینت دہِ حُسنِ یار کر دے ساقی

مینا میں ہی پھر شراب رقصاں ساقی — پھر جام سے ہی وداعِ ایماں ساقی
کونین غریقِ جام و صہبا ہو جائے — کر دے مستی کا اتنا ساماں ساقی

ایمانِ شراب، جانِ راحت، ساقی — کونین کی ہے تو ہی حقیقت ساقی
جامِ ہستی لئے کھڑا ہے فرحت — بھر دے بھر دے اے مئے محبت ساقی

فرحت کانپوری

زارینہ کا گلِ بنفشہ

کسی زمانے میں ایک جرمن شہنشاہ کی یہ خواہش ہوئی کہ زارِ روس سے صلح کرے۔ حقیقت میں صلح تو تھی ہی لیکن اس کی خواہش یہ تھی کہ دونوں ممالک میں اچھے دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔ بوڑھے آدمی فطرتاً صلح پسند ہوا کرتے ہیں۔ صلح اُن کے دُنیاوی تعلقات میں آسانی بہم پہونچاتی ہے اور جب وہ مرجاتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں ـــ "آہ! آج دُنیا سے وہ واحد شخص اُٹھ گیا جس نے جنگ کے احمقانہ پہلو کو اچھی طرح سمجھا تھا!"

لیکن بدقسمتی سے وہ اتنا ضعیف تھا کہ اُسے خود دارالسلطنت روس تک جانے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لیے اُس نے ایک معذرت نامے کے ساتھ اپنے چانسلر کو اس اہم مہم پر روانہ کیا ـــ ہاں وہ چانسلر جرمنی کا مشہور سیاسی "پرنس فلیرنگ" تھا۔

پرنس فلیرنگ، سینٹ پیٹرسبرگ رات کے وقت پہونچا۔ زار بستر پر جاچکا تھا۔ لیکن اس کا لارڈ چانسلر موجود تھا کھانے کے بعد فلیرنگ کو ایک خوبصورت خوابگاہ آرام کیلئے دی گئی جہاں ایک بہت ہی نفیس انگیٹھی روشن تھی۔ روس سرد ملک ہے۔

دوسرے دن جب وہ اُٹھا تو آفتاب نہ نکلا تھا۔ وہ سویرے اُٹھنے کا عادی تھا۔ اسکی نصف شہرت اسی عادت کی مرہونِ منت تھی۔ اُس نے کپڑے بدلے اور ایک ہلکی سی چہل قدمی کیلئے روانہ ہوگیا۔

لیکن زار کے سپاہی شاید فلیرنگ سے بھی زیادہ سویرے اُٹھنے کے عادی تھے۔ اِس عظیم الشان محل کے ہر کونے پر، ہر دوراہے پر ایک دراز قد سپاہی متعین تھا۔ جیسے وہ گزرتا سپاہی اپنی بندوق اُٹھاکر سلام کرتے جاتے۔ فلیرنگ اِن غیر معمولی سلاموں سے تنگ آگیا تھا کیونکہ خوش الحان پرندے بول رہے تھے اور شبنم کے قطرے ابھی تک سبز گھاس پر ہیرے کے مانند چمک رہے تھے۔ وہ اس وقت کچھ سوچنے کیلئے تنہائی چاہ رہا تھا کیونکہ یہ یقینی امر تھا کہ زار ناشتے کے بعد فوراً اُسے طلب کریگا اور اُسے اہم صلح نامہ کے چند پیچیدہ نکات طے کرنے ہونگے۔

"یہ محافظ نہایت ہی نامعقول ہیں" فلیرنگ نے دل ہی دل میں کہا۔ "انکی شوخ وردیاں آنکھوں پر کسقدر جبر معلوم ہوتی ہیں! خدا نے اس ملک کو ذوقِ سلیم سے زیادہ دولت عطا فرمائی ہے۔"

وہ چلتا ہی گیا یہاں تک کہ اُس نے محسوس کیا کہ محافظوں کا یہ لامحدود سلسلہ ختم ہوا چاہتا ہے کیونکہ درختوں کے اس گھنے جھنڈ میں دُور تک کسی محافظ کی شوخ وردی نظر آرہی تھی۔ راستہ سبز گھاس کے ایک بڑے خطہ پر جاکر ختم ہوتا تھا۔ ولیسی نفیس جمی ہوئی گھاس اُسنے کم دیکھی تھی۔

"کیا ہی اچھی جگہ ہے!" اُس نے کہا ـــ "لعنت ہو تم پر!" اُسکی نظر یک بیک ایک دُور ایستادہ محافظ پر پڑی۔ جو اس سرسبز خطہ کے ٹھیک بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اُسے یہ ایک عجیب بات معلوم ہوئی "ایک محافظ ایسی سُنسان جگہ میں کیوں متعین کیا گیا ہے؟" وہ تنہائی چاہ رہا تھا۔ اُسے کچھ سوچنا تھا۔ زارِ روس سے شرفِ ملاقات کوئی معمولی سی بات تو تھی نہیں۔ لیکن آج تک اُس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ نہیں پیش آیا تھا جسے اُس نے نہ سمجھا ہو ـــ یہ فلیرنگ کی کامیابی کی

دوسری وجہ ہے۔
وہ محافظ کے پاس پہونچ گیا: "معاف کرنا بھئی! لیکن تم یہاں کس چیز کی حفاظت کر رہے ہو؟" اُس نے پوچھا۔
"میں کس طرح جان سکتا ہوں" سپاہی نے کہا جو اتفاق سے درباری گفتگو سے قطعاً ناواقف تھا۔
"لیکن یہ عجیب بات ہے!" فلیرنگ نے اُس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخر اِس کھلے ہوئے میدان میں کس چیز کی حفاظت کی جا رہی ہے؟"
"مجھے یہاں کھڑے رہنے کا حکم ملا ہے" سپاہی نے اس تنقید سے عاجز آکر سخت لہجے میں کہا۔
"لیکن تمہیں یہاں کھڑے رہنے کا حکم کس نے دیا ہے" فلیرنگ نے پوچھا۔
"کیوں؟ سرجنٹ! اور کون حکم دے سکتا ہے؟"
پرنس فلیرنگ اس سے زیادہ واقفیت حاصل نہ کر سکا۔ وہ آگے چلا۔ لیکن واپسی میں بھی وہ بلند و بالا سپاہی اسی طرح ایستادہ تھا۔ بجنسہ اسی طرح صابر، کسی غیر مرئی چیز کی حفاظت کرتا ہوا۔
چاشت کے بعد فلیرنگ کی دربارِ زار میں طلبی ہوئی اور اسی اہم صلح نامہ کی گفتگو چھیڑی گئی۔ تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد زار سخت متعجب تھا کہ ایسا حواس باختہ شخص جس کا دماغ ہر وقت کسی دوسرے خیال میں محو رہتا ہے کس طرح یورپ میں اتنی شہرت حاصل کر سکا!
"مجھے افسوس ہے" زار نے ایک طویل تقریر کے بعد کہا۔ "کہ میں آپ کو اپنا نظریہ نہ سمجھا سکا۔ اگر یہ سوال ہو کہ میں اپنے سپاہی کس طرح پولینڈ میں متعین کرتا ہوں........"
"........ سرسبز خطہ کے بیچ میں!" فلیرنگ یکایک بول اُٹھا۔
زار نے غصہ سے اسکی طرف دیکھا۔
"میں... میں معافی کا خواستگار ہوں" اُس نے گھبراتے ہوئے کہا۔ "اعلیٰ جاہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے آج ایک ایسی بات دیکھی ہے کہ اب تک خبط ہوں اور ابھی تک میرا خیال اسی طرف ہے"
"خوب!" زار نے کہا۔ "کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ وہ کون سی بات ہے؟ ـــ کیونکہ ہم اپنے مہمان کی خاطر داری کے بارے میں بہت محتاط واقع ہوئے ہیں"
فلیرنگ نے سارا قصہ کہہ سُنایا۔
زار کی جبیں پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ وہ سوچ رہا تھا: "درختوں کے اس سرے..... تم کہتے ہو؟..... او! چاندماری کا پرانا میدان شاید؟..... میں اب سمجھا۔ ہاں ہاں ٹھیک بیچ میں ایک سپاہی متعین ہے۔ میں سینکڑوں بار اُس کے پاس سے گزرا ہوں۔ لیکن مجھے یہ کبھی خیال نہیں ہوا کہ وہ وہاں کیا کرتا ہے۔ اچھا چلیں ہم اس سے پوچھیں۔ صلح نامہ کی گفتگو کل پر ملتوی رکھی جا سکتی ہے"
وہ چاندماری کے میدان تک ٹہلتے ہوئے پہونچے۔ محافظوں کی تبدیلی عمل میں آچکی تھی۔ لیکن اُسی جگہ ایک دوسرا سپاہی

ایستادہ تھا۔ اُس نے بھی اسی انداز سے سلام کیا۔ "تم یہاں کیوں متعین ہو؟" زار نے نرمی سے پوچھا۔
سپاہی پر لرزہ کا ایک خاصا دورہ پڑ گیا۔ لیکن اُس نے بھی اقرار کیا کہ وہ بھی اس بارے میں قطعاً ناواقف ہے۔ سرجنٹ طلب کیا گیا۔ اسکی معلومات بھی سپاہی سے زیادہ وسیع نہ تھیں۔ اس کے بعد کپتان بھی بس اتنا کہہ سکا کہ کرنل کے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ کرنل صاحب طلب کئے جائیں۔
کرنل صاحب بس اتنی صفائی دے سکے کہ محافظوں کے تعین میں وہ گذشتہ کرنل کی پیروی کرتے ہیں اور محافظوں کے قیام کا نقشہ وزارت جنگ اور وزارت اُمور داخلہ کی رضامندی سے تیار ہوا ہے۔
"کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم نے اس میں ذرا بھی ترمیم نہیں کی ہے؟" زار نے پوچھا۔
"اعلیٰ جاہ! میں نے گذشتہ بارہ سال کی خدمت میں نمک حلالی اور وفاداری کو اپنا رہبر بنایا ہے" محافظ دستہ کے کرنل نے غرور سے جواب دیا۔ وہ اپنی خدمت کی طوالت پر خاص زور دے رہا تھا کیونکہ ترقی کی فہرست مدت سے اُسکے لئے باعث تکلیف ثابت ہو رہی تھی اور اب اُسے خود بھی اپنی صلاحیت پر دھوکا ہونے لگا تھا۔
"کوئی شخص بھی نہیں حضور! ایک فٹ بھی نہیں حضور" کرنل صاحب اپنا مطلب صاف کرنا چاہ رہے تھے۔
"ہم دوپہر کے کھانے کے بعد اُس کی تحقیقات کرینگے" زار نے جلدی سے کہا کیونکہ وہ اپنی فوج کو فلیرنگ کی نظر میں نااہل ثابت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ "اس عرصہ میں وزارت جنگ کو اس کی خبر کر دینی چاہیئے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ شخص یہاں کیوں متعین کیا گیا؟"
اس خبر کے ملتے ہی دفتر وزارت میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ وزیر جنگ خود دو گھنٹہ تک چند بوڑھے فیلڈ مارشلوں کے ساتھ تحقیقات میں مصروف رہے۔ غریب نائبین اور مُلازمین دفتر کا کیا کہنا؟ بکسوں، الماریوں، ردی کی ٹوکریوں کے اُلٹ پھیر میں کتنی بار ایک دوسرے سے ٹکرائے اس کا تذکرہ ہی فضول ہے۔ گرد کو نہ پوچھئے۔ چھینکوں سے گھنٹوں پریشان رہے ہونگے۔ لیکن اس کمبخت عقدہ کو نہ حل ہونا تھا نہ ہوا۔
سلطنت روس کے سب سے پُرانے فیلڈ مارشل صاحب کی جانب رجوع کیا گیا۔ وہ بستر چھوڑنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے اور اس پر قوت سمع جواب دے چکی تھی۔ وزیر جنگ صاحب اُنکے پاس حاضر ہوئے۔
"ہاں۔ ہاں" بوڑھے فیلڈ مارشل نے غلط سمجھتے ہوئے کہا۔ "شہنشاہ جاننا چاہتے ہیں کہ پچپن برس ہوئے میں نے ترکوں کو کس طرح شکست دی تھی؟ خوب یہ اچھی بات ہے کیونکہ کوئی تاریخ بھی اس کا صحیح واقعہ نہیں بیان کرتی"
حقیقت تو یہ ہے کہ یہ بھی کوئی تحقیق شدہ امر نہ تھا کہ کیا فیلڈ مارشل صاحب نے سچ مچ ترکوں کو شکست دی تھی؟ ترک مورخ یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ فیلڈ مارشل صاحب نے نہایت ہی شرمناک شکست حاصل کی تھی لیکن فیلڈ مارشل صاحب نے جنگ کی ایک طویل داستان شروع کی۔ فوجوں کے قیام کا ایک زندہ مُرقع......
"لیکن" وزیر جنگ احتجاجانہ انداز سے چیخے "شہنشاہ ترکوں کے بارے میں جاننا نہیں چاہتے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ سپاہی خاص طور پر کیوں اس جگہ متعین کیا گیا ہے؟"

"آہ" بوڑھے فیلڈ مارشل نے اپنی ناامیدی کا بیکسانہ اظہار کرتے ہوئے کہا: "اب دماغ ویسا کام نہیں کرتا۔ شاید وہ کسی جرم کی پاداش میں کھڑا کیا گیا تھا"

"لیکن سزا کی طوالت پر تو غور کیجئے" وزیر جنگ نے اپنے پھیپھڑے کی ساری قوت صرف کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بات تو معقول ہے لیکن ہم لوگ تادیب کے معاملہ میں بہت سخت تھے" جواب ملا۔

"لیکن سپاہی تو تبدیل ہوتے رہتے ہیں"

"ضرور" بوڑھے فیلڈ مارشل نے زور دیتے ہوئے کہا: "یہ ہمارے لئے ایک درنئی وقت ہے جو بیس چوکے؟ — آٹھ نہیں نہیں چھ بار تین سو اوپنیسٹھ ...."

وزیر جنگ مایوسانہ انہیں اس حسابی سرسام میں چھوڑ کر دفتر وزارت جنگ کو روانہ ہوگئے۔

دن کے اختتام پر انہوں نے دربار عالی میں آنکھ میں آنسو لاکر اس امر کا اقرار کیا کہ انکی ساری محنت قطعی رائیگاں ثابت ہوئی۔ فوج کا کوئی شخص بھی نہیں کہہ سکتا اور نہ کوئی ایسا کاغذی ثبوت ہی موجود ہے۔

اس عرصہ میں انجنیروں کے ایک جم غفیر نے اس خطہ کا کونہ کونہ ناپ ڈالا لیکن اُسے نہ معلوم ہونا تھا نہ ہوا۔

زار کی اس معمہ کے حل کیلئے بیچینی بیان کرنی مشکل ہے۔ صلح نامہ تو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ دوسرے دن بھی وہی حال رہا۔ خانساماں نے محل کے سارے ملازمین سے باری باری گفتگو کی لیکن سب لاحاصل۔ ملازم سائبان سے گذرتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے:

"آخر سپاہی وہاں کیوں تعینات کیا گیا ہے؟"

تیسرے دن زار نے ہر صوبہ میں ایک اعلان بھجوایا کہ ایک ہزار روبل انعام اُس شخص کو دیا جائیگا جو اس معمہ کا صحیح حل بتائے۔

جھروکہ کے اوپر ایک بوڑھی عورت شاہی میز پوش کیلئے کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ اس ہنگامہ میں سوائے ایک جوان دائی کے جو اس کا کھانا پہونچانے پر مقرر تھی، اُسے سب بھول بیٹھے تھے۔ اسکی بینائی مسلسل کام کرنے سے کمزور ہوگئی تھی۔ اپنی جوانی میں وہ گذشتہ زارینہ یعنی موجودہ زار کی دادی کی دایہ رہ چکی تھی۔

"خدا خیر کرے وہ قاصد کیسا اعلان کر رہے ہیں؟" بوڑھی دایہ نے کہا "کوئی جنگ تو نہیں ہونے والی ہے"

"کیوں تم نے نہیں سُنا؟" جوان چھوکری چہک کر بولی: "اسی اکھڑے سپاہی کے بارے میں"

"کون سپاہی؟"

"گھانس کے میدان والا"

"کونسا گھانس کا میدان؟"

"وہی جہاں لوگ تیراندازی کی مشق کرتے ہیں۔ اسکے ٹھیک بیچوں بیچ ایک سپاہی تعینات ہے۔ یہ جاننے کیلئے کہ وہ کس چیز کی حفاظت کر رہا ہے سب دیوانے ہو رہے ہیں"

"اُسے تو سبکو جاننا چاہیئے"، بوڑھی دایہ نے کہا، "تم لوگوں پر خدا کا رحم! اللہ نے تم لوگوں کو کتنا کمزور دماغ دیا ہے؟"

"لیکن جانتا کوئی نہیں" جوان چھوکری بولی "اس معمہ کے حل کے لئے ایک ہزار کا انعام مقرر ہوا ہے۔"

"میری بچی!" بوڑھی دایہ نے مسکراتے ہوئے کہا "تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔ چل میرا ہاتھ پکڑ کر شہنشاہ کے پاس لے چل۔"

غرض جوان دایہ اُسے نیچے لے گئی اور جب وہ زار کے سامنے پہونچے تو بوڑھی دایہ نے کورنش کے بعد عرض کیا ——— اگر حضور کا حکم ہو تو میں اس کا حل عرض کروں۔ سالہا سال گزر گئے جب زارینہ یعنی حضور کی دادی صاحبہ دلہن تھیں انہوں نے تیراندازی کا ایک مقابلہ کروایا تھا کیونکہ دربار کی بیگمات اس زمانہ میں اس فن کی بڑی ماہر ہوا کرتی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ حضور عالیہ کا نشانہ سب سے اچھا تھا۔ تیراندازی سے بہتر خوبصورت ہاتھوں اور سینہ کی نمائش کا کوئی بھی طریقہ نہیں۔

غرض ساری بیگمات جمع ہوئیں اور پہلی باڑھ کے بعد سب اپنے اپنے تیر کو دیکھنے کے لئے دوڑیں۔ لیکن حضور عالیہ یکایک ٹھہر گئیں اور سب کو ٹھہرنے کو کہا۔ وہ گھٹنے کے بل جھک گئیں اور ساری بیگمات انکے گرد جمع ہو گئیں۔ ٹھیک میدان کے بیچ انکی نظر سال کے پہلے گل بنفشہ سے دوچار ہو رہی تھی۔

زار، آپ کے جد امجد صاحب بھی اس حقیر بنفشہ کے مداحوں کے پاس آن پہونچے۔ کسی نے کہا کہ یہ اچھا شگون ہے کیونکہ حضور عالیہ اُمید سے تھیں۔ خدا کی شان دیکھیے کہ ولادت ہوئی اور آپ کے والد محترم پیدا ہوئے۔ حضور نے فوراً ایک سپاہی طلب کیا اور اُسے اس پھول کے پاس تعینات کیا کہ اس کو بیگمات کے دستبرد سے بچائے۔ اس غریب سپاہی کے لئے یہ ذرا بھی آرام وہ جگہ نہ تھی۔ تیر اکثر اس کے قریب سے ہو کر گذرتے۔ تیراندازی کا مقابلہ ختم ہو گیا لیکن لوگوں کی حفاظت کی غرض سے وہ وہیں تعینات رہا اور اسوقت تک ہے ———"

"لیکن بنفشہ کا پھول؟" زار نے پوچھا۔

وہ وہاں گئے اور ڈھونڈھنا شروع کیا۔ بنفشہ کے پھول کا پتہ بھی نہ تھا۔ مدت ہوئی کہ وہ ناپید ہو چکا تھا۔

لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔ سپاہی وہاں سے ہٹا لیا گیا اور کچھ مدت کے بعد لوگ اس کو اور اس جگہ کو بھی بھول بیٹھے۔

ایک دن مالی کی پنج سالہ بچی ماں کے پاس دوڑتی ہوئی آئی۔ ایک پھول اس کے ہاتھ میں تھا جو کھیلتے ہوئے اُسنے تیراندازی کے میدان میں پایا تھا۔

"دیکھو ماں! سال کا پہلا گل بنفشہ۔"

غرض بنفشہ کا پھول پھر زندہ ہو گیا۔ جب سپاہی کا سخت جوتہ اس کو کچلنے کے لئے موجود نہ تھا۔ داستان کا یہ حصہ کبھی محل تک نہ پہونچ سکا۔

(کپیو)　　شمسی کاکوی

طفلی کے خواب

طفلی میں آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں
اک روز سوز و ساز کی محفل میں ہم بھی ہوں

دل ہو اسیر گیسوئے عنبر سرشت میں
اُلجھے انہی حسین سلاسل میں ہم بھی ہوں

چھیڑا ہے ساز حضرتِ سعدیؔ نے جس جگہ
اُس "بوستاں" کے شوخ عنادل میں ہم بھی ہوں

گائیں ترانے دوشِ ثریا پہ رکھ کے سر
تاروں سے چھیڑ ہو مہ کامل میں ہم بھی ہوں

آزاد ہو کے کشمکشِ علم سے کبھی
آشفتگانِ عشق کی منزل میں ہم بھی ہوں

دیوانہ وار ہم بھی پھریں کوہ و دشت میں
دلدادگانِ شعلۂ محمل میں ہم بھی ہوں

دل کو ہو شاہزادیِ مقصد کی دُھن لگی
حیرانِ سُراغِ جادۂ منزل میں ہم بھی ہوں

صحرا ہو خار زار ہو، وادی ہو آگ ہو
اک دن انہی مہیب منازل میں ہم بھی ہوں

دریائے حشر خیز کی موجوں کو چیر کر
کشتی سمیت دامنِ ساحل میں ہم بھی ہوں

اک لشکرِ عظیم ہو مصروفِ کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں

چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغ آبدار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں

قدموں پہ جن کے تاج ہیں اقلیمِ دہر کے
اُن چند کشتگانِ غمِ دل میں ہم بھی ہوں

اسرار الحق مجاز
(بی۔اے (علیگ))

باغی لڑکی

(اپنی سنجوگتا کے نام)

نہ پوچھ اے دوست برپا حُسن نے کیسی قیامت کی
خُدا رکھے وہ لڑکی ناز پروردہ ہے فطرت کی

اُسے فطرت نے اب تک دامنِ مریم میں پالا ہے
سحر کی مسکراہٹ کو سُبک سانچے میں ڈھالا ہے

منقش ہوگیا ہے دستِ فطرت کا کمال اُس میں
شفق کا رنگ اُس میں! موجۂ بادِ شمال اُس میں!!

وہ حُسن و عشق کی دُنیا میں رومانوں کی دیوی ہے
وہ ملکہ ہے جوانی کی، وہ طوفانوں کی دیوی ہے

وہی ذی قدر نوشابہ کا پُرتمکیں جمال اُس میں
وہی بلقیس کی سطوت، زبیدہ کا جلال اُس میں

چراغِ محفلِ فطرت وہ شمعِ بزمِ امکاں ہے
وفا اُسکی شریعت ہے محبت اُس کا ایماں ہے

جبیں میں اُسکی صبحِ عہدِ آزادی جھلکتی ہے
بغاوت حُسن بنکر اُسکی آنکھوں سے ٹپکتی ہے

محبت کی چمک غلطاں ہے اُسکے نرم سینے میں
سمندر بجلیوں کا موجزن ہے آبگینے میں

ادائے ناز میں مڑتے ہوئے سیلاب کی اک رو
ملائم بازوؤں میں شہپرِ جبریل کا پرتو

حقیقت سے بدل ڈالا وفاؤں کے فسانے کو
محبّت کیلئے ٹھکرا دیا اُس نے زمانے کو

وفا کا راز کھولا اُسنے دُنیا کی نگاہوں پر
وہ بجلی بن کے ٹوٹی رسم کی قربان گاہوں پر

جلا ڈالے رواج و رسم کے جھوٹے نقاب اُسنے
نظر سے توڑ ڈالے جگمگاتے آفتاب اُس نے

بہت اُونچے سُروں میں اُسنے دل کے ساز کو چھیڑا
لرز اُٹھی فضا، تھرا گئے دل، ہل گئی دُنیا

وہ مشعل لیکے نکلی عشق کی تاریک راہوں پر
چراغِ طور چمکایا "محبت کے گناہوں" پر

بہت مسموم کانٹے تھے مگر کلیوں کے دامن میں
لگا دی اِس سرے سے اُس سرے تک آگ گلشن میں

وفا نے اُسکی واضح کر دیا اُلفت کے معنوں کو
ہنسی نے اُسکی پھیکا کر دیا دُنیا کے طعنوں کو

نہ چھوڑیں اعتبارِ عشق کی خودداریاں اُس نے
گوارا کیں محبت کے لئے رسوائیاں اُس نے

کلی بارش کی طغیانی میں جیسے مُسکراتی ہو
ہوا کے تُند جھونکوں میں کوئی لَو جگمگاتی ہو

شگفتہ ہو کنول کا پھول جیسے تیز دھارے پر
بھرے طوفاں میں کشتی آلگے جیسے کنارے پر

مخالف قوتوں کو دل کی نرمی سے کچل ڈالا
سُبک کشتی نے طوفانی ہوا کا رُخ بدل ڈالا

بدل ڈالی فضا اُس نے، بدل ڈالا جہاں اُس نے
نئے سر سے کہی "سنجوگتا" کی داستاں اُس نے

جان نثار اختر (علیگ)

ایک لڑکی

(اِس کہانی میں کوئی کیرکٹر قطعی فرضی نہیں ہے)

۱

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ۱۹۳۳ء یادگار رہیگا کیونکہ اِس سال ہندوستانی مُسلمانوں کے واحد دارالعلوم میں سرکاری طور پر مخلوط تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ یہ قصہ بھی دلچسپ ہے کہ کس طرح یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد اس سنسنی خیز تبدیلی کے لئے قانوناً مجبور کئے گئے۔ ننانوے سال پہلے ہندوستان کے مشہور قوم پرست جرنلسٹ اور سماجی کارکن سلیم الزماں صحافی نے مسلم یونیورسٹی کے ممبران کورٹ واگزکٹو کونسل کے خلاف ایک مقدمہ دائر کیا تھا جس میں اُن بزرگانِ قوم پر قومی امانت کے ناجائز مصرف کے الزامات عائد کئے گئے تھے۔

سلیم الزماں صحافی کا دعویٰ تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جتنا روپیہ جمع کیا گیا تھا وہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے تھا نہ کہ فقط مسلمان لڑکوں کی تعلیم کے لئے اور حکومت نے جیسا یونیورسٹی کا چارٹر منظور کیا تھا تو اس میں بھی واضح کردیا گیا تھا کہ یہ یونیورسٹی تمام مسلمانوں کی تعلیم کے لئے قائم کی جاتی ہے۔ یہ کہیں تخصیص نہ کی گئی تھی کہ مسلمانوں سے مُراد فقط مسلمان مرد ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں سلیم الزماں صحافی نے مشہور زبان دانوں کا فیصلہ پیش کیا تھا کہ لفظ "مسلمان" عورتوں اور مردوں دونوں کے لئے یکساں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس نے مقتدر علمار دین سے بھی ایک فتویٰ حاصل کیا تھا جس میں انہوں نے متفقہ طور پر اعلان کیا تھا کہ گو اکثر مسلمان مردوں پر کسی نہ کسی مولوی نے کبھی نہ کبھی کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ لیکن عورتوں کو ایک جماعت کی حیثیت سے اس وقت تک اسلام سے خارج نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر سلیم الزماں صحافی کا دعویٰ تھا کہ اتنے عرصے تک یونیورسٹی کے دروازے لڑکیوں کے لئے بند رکھکر ممبرانِ کورٹ واگزکٹو کونسل قومی روپے کے ناجائز استعمال کے مرتکب ہوئے ہیں۔

یہ مقدمہ جب یکم اپریل ۱۹۳۵ء کو پہلی بار علی گڈھ کے کلکٹری عدالت میں پیش ہوا تو تمام ملک میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ مسٹر جناح کی مسلم لیگ، ہز ہائنس آغاخاں کی مسلم کانفرنس، مولانا شوکت علی کی خلافت کمیٹی، مولوی مظہرالدین کی جمعیۃ العلمار، صدر یار جنگ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دیگر خالص اسلامی انجمنوں نے تیرہ ہزار دوسو ستاون جلسے کئے جن سب میں کل تعداد حاضرین کی تیرہ ہزار ایک سو پچاس نفوس تھی۔ اس کے علاوہ سلیم الزماں صحافی پر ستائیس مفتیوں نے کفر کے فتوے لگائے اور ستّرہ اخباروں نے اس پر الزام لگایا کہ وہ کانگریس سے روپیہ لیکر کھا گیا ہے۔ مسٹر جناح سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے چودہ نکات میں ایک پندرھویں نکتے کو اور شامل کرلیں کہ ازل سے لیکر ابد تک مسلم یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کبھی جاری نہ کی جائیگی۔ سیٹھ اللہ دیا کی صدارت میں مسٹر علی محمد جناح نے بھنڈی بازار بمبئی کے مسلمانوں کو خالص انگریزی میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "گو میں "ایک علمار" نہیں ہوں مگر سلیم الزماں صحافی کی ہندو پرست حرکت کی سخت مذمت کرتا ہوں"۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "مسلمان کی حیثیت سے وہ مسلم یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کے اجرار کے سخت خلاف ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنی صاحبزادی کو کبھی علی گڈھ بھیجنے کا خیال بھی نہ کیا اور یورپ کے مخلوط اداروں میں تعلیم دلوائی۔ آخیر میں آپ نے پانچہزار روپے روز پر اپنی قانونی خدمات یہ مقدمہ لڑنے کیلئے مسلم یونیورسٹی کو پیش کیں جس پر بھنڈی بازار کے مسلمانوں نے "اللہ اکبر" کے نعرے بلند کئے کیونکہ انگریزی سے ناواقف ہونے کے باعث وہ سمجھے تھے کہ مسٹر حنا نے بیکار روپے روزگار مسلمانوں کو فاقے سے بچانے کے لئے پانچہزار روپے چندے کا اعلان کیا ہے۔ اس جلسہ کے بعد مسٹر حنا نے ایک بیان شائع کیا کہ جب تک کانگریس اپنے گرگوں سے ایسے مقدمے دائر کراتی رہیگی وہ کانگریسی لیڈروں سے فرقہ وارانہ مصالحت کی گفتگو نہ کریں گے۔ اور یہ بھی کہا کہ بھنڈی بازار کے جلسے نے ثابت کر دیا تھا کہ مسلم عوام بھی اس رائے میں مسٹر حنا کے ہم خیال ہیں۔ اس بیان کی تائید سر ابوالبقا اور سر آمین خاں نے کی جنہوں نے کہا کہ نہرو رپورٹ کے بعد یہ مقدمہ مسلمانوں کی قومی زندگی پر کانگریس کا دوسرا حملہ ہے۔

یہ تھی زبردست ابتدا اس مقدمے کی جو ننانوے برس تک مختلف عدالتوں میں چلتا رہا اور اس عرصے میں تیرہ مرتبہ پریوی کونسل میں پیش ہوا۔ سلیم الزماں صحافی کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے رحیم الزماں صحافی نے اس مقدمے کو جاری رکھا۔ اور اس کے بعد اس کے لڑکے کلیم الزماں صحافی نے۔ اس عرصے میں ہندوستان میں کئی انقلابات ہوئے اور حکومتیں تبدیل ہوئیں لیکن مقدمہ کا فیصلہ نہ ہوا۔ ۲۰۳۳ء میں جب کلیم الزماں صحافی کا انتقال ہوا تو یہ مقدمہ ورثے میں اس کی اکلوتی بیٹی سلمہ صحافی کو ملا۔ اگلے ہی سال جب تیسری سوراج حکومت قائم ہوئی تو اس نے فوراً طے کر دیا کہ مسلم یونیورسٹی کے افسران کو لڑکیوں کا داخلہ روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اگر انہوں نے اپنا یہی طرز عمل جاری رکھا تو حکومت یونیورسٹی کی عمارتیں ضبط کر کے وہاں ایک چڑیا گھر قائم کر دے گی۔

اس فیصلہ پر مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں کی یونین نے مبارکباد کا ریزولیوشن پاس کیا۔ ہارون ناصری کی تجویز اور حامد عباسی کی تائید پر بجٹ میں دوسو روپے خواتین طالب علموں کے بیٹھنے کے لئے مخملی صوفوں کے واسطے منظور کئے لیکن ایک سال تک وہ مخملی صوفے بیکار پڑے رہے کیونکہ کوئی لڑکی داخل نہ ہوئی۔ علمار نے فتویٰ دیدیا تھا کہ مخلوط تعلیم حرام ہے۔ اور مشکل یہ تھی کہ قدامت پسند گھرانوں نے ان فتووں کے ڈر سے اپنی لڑکیاں نہ بھیجیں۔ اور جو آزاد خیال گھرانوں کی لڑکیاں تھیں وہ علی گڈھ جیسی فرقہ پرور، اور پرانے خیال کی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے خلاف تھیں۔ آخر کار وہ بھی اس دقیانوسی تعلیم کے خلاف تھیں جو علی گڑھ میں دی جاتی تھی۔ اگلے سال خود سلمہ صحافی کو وردھا کی قومی یونیورسٹی چھوڑ کر علی گڈھ میں داخلہ لینا پڑا۔ تاکہ اپنی صنف کا حق قائم کرے۔

جسوقت سلمہ صحافی کے داخلہ کا فارم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر مولوی ابوالعلم کے پاس پہونچا تو وہ سخت پریشان ہوئے اور دوڑے وائس چانسلر شیخ رحیم الدین کے پاس گئے۔ وہ دونوں مخلوط تعلیم کے سخت خلاف تھے لیکن سلمہ صحافی کا داخلہ کرنے سے انکار کرنا حکومت کے فرمان کی خلاف ورزی تھی۔ "اس کمبخت لڑکی کو داخل تو کرنا ہی پڑیگا" مولوی ابوالعلم بولے "لیکن طالب علم لڑکیوں کے لئے کچھ ایسے قوانین بنائے جائیں جن سے گھبرا کر وہ یونیورسٹی میں داخلے کا خیال ہی چھوڑ دے۔"

اگلے روز یونیورسٹی کی اگزکٹو کونسل کا جلسہ منعقد ہوا تاکہ صورت حال پر غور کیا جائے۔

نواب طاؤس یار جنگ اچکانی نے تجویز پیش کی کہ طالب علم لڑکیوں کے لئے ایک خاص بورڈنگ ہاؤس تعمیر کیا جائے جسکی دیواریں دو سو بیس گز اونچی ہوں اور اس بورڈنگ سے لیکر لکچر کے کمروں تک ایک سرنگ بنائی جائے جس کے ذریعے سلمہ صحافی لکچر سننے جایا کرے۔ اسکے علاوہ ہر لکچر روم میں چاروں طرف سے بند ایک کوٹھری بنائی جائے جس میں سرنگ کا راستہ نکلتا ہو اور اس کوٹھری میں بجائے دروازے یا کھڑکی کے چار باریک سوراخ ہوں جن میں سے پروفیسر کی آواز پہونچ سکے۔ اس تجویز کی زبردست موافقت مولانا النعمان نے کی اور بالاتفاق رائے منظور ہو گئی۔ اس کے بعد پروفیسر عبدالصدیق رشیدی نے تجویز پیش کی کہ جس طرح طالبعلم لڑکوں کے لئے سیاہ بند گلے کا کوٹ اور اٹھارویں صدی ٹرکی کی ٹوپی پہننا لازمی تھا۔ اسی طرح طالب علم لڑکیوں کے لئے برقعہ پہننا لازمی قرار دیا جائے۔ یہ تجویز بھی منظور کر لی گئی۔ اب خداوندان یونیورسٹی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب ان کو یقین تھا کہ سلمہ صحافی کبھی یونیورسٹی میں داخلہ نہ لے گی۔

سلمہ کو جب ان قوانین کا علم ہوا تو وہ بڑی گھبرائی، لیکن کچھ سوچکر اس نے محکمۂ تعلیم و حفظان صحت کو ایک خط لکھا اور ان قوانین کی طرف توجہ دلائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر تعلیم نے ڈانٹ کر وائس چانسلر کو ایک خط لکھا۔ کہ ایسے قوانین بنا کر حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرنے پر آئندہ سخت سزا دی جائے گی۔ اس کے علاوہ محکمۂ حفظان صحت کے ایک انسپکٹر نے یونیورسٹی کا معائنہ کرتے ہوئے لڑکیوں کے بورڈنگ اور سرنگ دونوں کو خلاف قانون قرار دیکر مسمار کرا دیا۔ اگزکٹو کونسل کا ایک جلسہ فوراً صورت حال پر غور کرنے کے لئے منعقد کیا گیا۔ مولوی ابوالعلم نے فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی کا مسلک ہمیشہ حکومت کی اطاعت رہا ہے۔ اس کے لئے ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سلمہ صحافی کو بے پردہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دیدیں۔ وائس چانسلر نے بھی کہا کہ بحالت مجبوری انکو ایسا ہی کرنا ہوگا۔ باقی آٹھ ممبران کونسل نے کہا "جیسا آپ کا حکم سرکار"! اور جلسہ برخاست ہو گیا۔

(۲)

مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں اتنا بڑا انقلاب کبھی نہ ہوا تھا جتنا ایک لڑکی سلمہ صحافی کے داخل ہونے پر ہوا۔ وہ شہر کی مزدور لڑکیوں کے ہوسٹل میں رہتی تھی جو بیسویں صدی کے ایک نواب مضمحل اللہ کے شاندار محل میں قائم کیا گیا تھا۔ جب صبح کو وہ کالج جاتی تو ہر شخص کی نظر اس کی طرف اٹھتی۔ وہ حسین نہ تھی لیکن نوجوان عورت علی گڑھ میں ہمیشہ سے ایک نایاب شے رہی ہے۔ یہ پہلی بار تھی کہ یونیورسٹی کے چند ہزار طالب علموں نے ایک لڑکی کو طالب علم کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ سلمہ نے بیسویں صدی علی گڈھ کے متعلق عجیب و غریب قصے سنے تھے کہ اس زمانے میں اگر اسٹیشن پر سے کسی ریل میں کوئی حسین لڑکی گزرتی تھی تو تمام یونیورسٹی میں ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا۔

پہلے پہل سلمہ کو اس قدر عالمگیر توجہ کا مرکز بننا برا معلوم ہوا لیکن کچھ عرصے بعد وہ اس کی عادی ہو گئی۔ سب سے بڑا انقلاب اس کی کلاس یعنی ایل ایل۔ بی؛ پریویس میں ہوا تھا۔ ایک سوا کیا ون طالب علموں میں وہ اکیلی لڑکی تھی۔ ان سب کی توجہ کی وہ واحد مرکز تھی۔ جب سے اس نے داخلہ لیا تھا ان تمام لڑکوں میں بین تبدیلی نظر آتی تھی۔ جو تیسرے دن داڑھی

مونڈتے تھے وہ اب روز شیو کرنے لگے۔ جو ہمیشہ میلے کپڑے پہن کر آتے تھے، وہ اب صاف کپڑے پہن کر آنے لگے۔ جن کے کوٹوں پر سالوں سے کبھی برش نہ ہوا تھا اُن کے کوٹ اب چمکنے لگے۔ جن کے بالوں میں ہفتوں کبھی کنگھا نہ ہوتا تھا اُنہوں نے کلاس میں آتے وقت بھی جیب میں شیشہ کنگھا رکھنا شروع کر دیا۔ سب سے بڑا کمال یہ ہوا کہ تقریباً تمام طالب علم اب لکچر کے وقت حاضر رہنے لگے۔ ورنہ ایل، ایل۔ بی۔ پریویس میں کبھی ۲۵ فی صدی سے زیادہ لڑکے حاضر نہ ہوتے تھے۔ باقی سب دوستوں سے پُرا کسی بلوا کر کام چلاتے تھے۔ جس دن سے سلمہ صحافی نے داخلہ لیا لکچر روم بھرا رہنے لگا۔ فائنل کلاس کے طلبا بھی کسی نہ کسی بہانے سے آکر بیٹھنے لگے۔ پروفیسر کی زندگی میں بھی سلمہ صحافی کی موجودگی نے کافی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ بھی اچھے کپڑے پہن کر آنے لگے۔ جن کے کوٹ پر ہمیشہ چاک کی سفیدی پڑی رہتی تھی وہ کلاس میں آنے سے قبل نہایت احتیاط سے کوٹ کو برش کرنے لگے، سٹاف روم میں ایک آئینہ، کنگھا، کپڑوں اور بالوں کے برش رکھے گئے۔

کلاس کے تمام لڑکوں میں سلیم اور انور سلمہ میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ یہ دونوں یونیورسٹی کے با اثر اور مشہور طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ سلیم ٹینس کلب کا سکریٹری اور بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ سومنگ باتھ میں مچھلی کی طرح تیرتا تھا اور یو۔ ٹی۔ سی۔ کا سارجنٹ تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک قابل رشک صحت اور سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اُس کو اپنے مردانہ حسن پر کافی ناز بھی تھا اور جب اُس نے سلمہ صحافی میں دلچسپی لینی شروع کی تو سوائے انور کے اُس کی رقابت مول لینے کی کسی نے ہمت نہ کی۔ انور اتنا حسین نہ تھا جتنا سلیم۔ وہ کھلاڑی بھی نہ تھا مگر پڑھنے لکھنے میں وہ سب سے تیز تھا۔ اس نے اوّل درجے میں انگریزی ادب کا ایم۔ اے کیا تھا۔ یونین کا بہترین مقرر اور میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ اُس کے افسانے اور نظمیں ملک کے اکثر قدامت پسند رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ وہ بھی سلمہ صحافی میں دلچسپی لیتا تھا۔ اور کلاس میں جب ممکن ہوتا کوئی ادبی یا قانونی بحث چھیڑ کر اُس سے بات کرنے کا موقع نکال لیتا۔ انور اور سلیم قدامت پسند خاندانوں کے لڑکے تھے۔ ان دونوں کے لئے عورت ایک نامعلوم جنس تھی اسی لئے وہ بیسویں صدی کے شاعر مزاج طالب علموں کی طرح ہر اُس لڑکی میں جس سے کسی طرح اُنکی ملاقات ہو جاتے اسقدر دلچسپی لیتے تھے۔

اُن کی کلاس میں ایک لڑکا احسان اللہ پڑھتا تھا۔ جس کی بدقسمتی سے سات بہنیں تھیں۔ یہ سب لڑکیاں دہلی کی قومی یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں۔ لیکن چھٹیوں میں اکثر علی گڈھ اپنے بھائی سے ملنے آیا کرتی تھیں۔ اس لئے کلاس کے تقریباً تمام لڑکے احسان اللہ سے دوستی گانٹھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہر موقع پر اُس کی آؤ بھگت ہوتی اور نوجوان پروفیسر بھی اُس کا خیال رکھتے۔ سلیم اور انور نے خاص طور سے احسان میں دلچسپی لینی شروع کی۔ سلیم اُس کو روز ٹینس کھیلنے بلاتا اور کلب کی فیس اس کے بجائے خود دیدیتا۔ انور اصرار کرتا کہ احسان اُس کے ساتھ ملکر امتحان کے لئے پڑھے۔ دونوں اُس کی دعوتیں بھی خوب کرتے۔ شروع شروع میں تو احسان ان سب عنایات کو دوستی پر محمول کرتا رہا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اُس نے محسوس کیا کہ یہ دونوں اس سے زیادہ اُس کی بہنوں میں دلچسپی رکھتے تھے جس دن اس کی بہنیں دہلی سے آتیں سلیم اور انور اُس کے ساتھ ساتھ لگے رہتے اور اُس کی بہنوں کی خاطر مدارات میں ضرورت سے زیادہ انہماک دکھاتے حالانکہ وہ سب ملکر ان دونوں کو بیوقوف بناتی تھیں۔ احسان ہمیشہ سے منہ پھٹ واقع ہوا تھا۔ ایک دن جب اُس کو انور اور سلیم کی حرکتوں سے سخت کوفت ہوئی تو اُس نے

اپنی بہنوں کے سامنے ہی ان سے صاف صاف کہہ دیا: "دیکھئے صاحب، اس وقت آپ دونوں بھی موجود ہیں اور میری بہنیں بھی آپکو ان میں سے جس جس سے دلچسپی ہو صاف کہہ دیجئے۔ اُن کی مرضی ہو تو وہ آپ سے دوستی کریں۔ مگر مہربانی کر کے میری جان چھوڑئیے" اُس دن سے انور اور سلیم اور احسان اللہ کے تعلقات کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اُن کو کسی نئے شکار کی تلاش ہوئی۔ جب سلمہ صحافی نے داخلہ لیا تو دونوں نے علیحدہ علیحدہ کوشش شروع کی کہ اس سے دوستی بڑھائی جائے۔

ایک صبح خالی گھنٹہ میں سلمہ برآمدے میں اکیلی کھڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر لڑکوں کا ایک گروہ کھڑا اُس کی طرف گھور رہا تھا۔ سلمہ کو اس قسم کی حرکتوں پر غصہ بھی آتا تھا اور ہنسی بھی غصہ اس لئے کہ خواہ مخواہ اس کو کوئی کیوں اس طرح گھورے اور ہنسی اس بات پر کہ علی گڈھ کے یہ تعلیم یافتہ لڑکے اس قدر دقیانوسی تھے کہ اکیسویں صدی میں بھی ایسی حماقتیں کرتے تھے اُسکو اپنے ڈسک میں اکثر گمنام عاشقانہ خطوط ملتے تھے۔ ایک بار تو ایک نامعلوم عاشق نے ایک قیمتی فاؤنٹین پن اسی طرح پر تحفہ دیا تھا۔ روزانہ ڈسک کے اوپر گلاب کے پھول رکھے ملتے۔ لیکن ان سب مجنوں صفت حضرات میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ کھلم کھلا اس سے بات بھی کر سکے۔ سلمہ کھڑی ان سب باتوں پر غور کر رہی تھی کہ سلیم صاحب اپنا بہترین سوٹ پہنے بالوں میں دھڑیوں لگائے اور فلم اسٹاروں جیسی مونچھیں بنائے ہوئے نازل ہوئے۔

"مس سلمہ صحافی" اُس نے بیسویں صدی کے انداز میں اس قدر جھک کر کہا کہ سلمہ کو ہنسی آگئی: "آپ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟ ..... ہاں ..... وہ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کوئی کھیل کیوں نہیں کھیلتیں؟ دیکھئے آپ کی رنگت زرد ہوتی جا رہی ہے۔ وہ تو آپنے سنا ہی ہوگا۔ All work and no play
Makes Jack a dull boy.
اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ وردھا میں ٹینس کی بہترین کھلاڑیوں میں شمار ہوتی تھیں۔ تو آپ ہمارے سومنگ باتھ کلب میں آج شام کو ٹینس کھیلنے آئیے نا؟"

وہ سانس لینے کے لئے رُکا تو سلمہ نے کہا: "شکریہ۔ میں اب تک تو اس لئے کھیلنے نہ آئی تھی کہ شاید وائس چانسلر صاحب لڑکوں کے اخلاق خراب کرنے کے جرم میں مجھے یونیورسٹی سے نہ نکال دیں"

سلیم اپنے آپ کو آزاد خیال اور ترقی پسند سمجھتا تھا: "ارے آپ بھی کیا کہتی ہیں۔ کس کی مجال ہے کہ آپ کو یہاں سے نکال دیں۔ ہم سب یونیورسٹی چھوڑ دیں گے۔ آپ شاید مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ پچھلے سال ٹکڑوں میں میٹھا کم ہونے پر میں نے ایک مہینے تک ڈائننگ ہال کا اسٹرائک کرا دیا تھا۔ آپ بے فکر ہو کر آج ہی سے کھیلنے آئیے"

سلمہ نے اپنی جان چھڑانے کے لئے وعدہ کر لیا اور کہا کہ وہ اسی مقام پر شام کے پانچ بجے ملے گی اور پھر دونوں اکٹھے سومنگ باتھ لان پر ٹینس کھیلنے جائیں گے۔

سلیم اس سے رخصت ہو کر خوش خوش اپنے کمرے کی طرف چلا۔ راستے میں سوچتا جا رہا تھا کہ Doubles میں سلمہ کو اپنے ساتھ کھلائے گا تاکہ "پارٹنر، پارٹنر" پکار کر پہلے ہی دن بے تکلفی بڑھا لے۔ ہوسٹل کے دروازہ میں داخل ہو رہا تھا کہ بغل میں کتابیں دبائے انور آتا ہوا ملا۔

"کہاں جارہے ہو؟ گھنٹہ تو خالی ہے۔" اُسے کہا۔

"اوہ میں تو ایسے ہی جا رہا ہوں۔" انور نے جواب دیا۔ "ذرا لائبریری سے چند کتابیں لانی ہیں۔"

مگر ہوسٹل سے نکلتے ہی بجائے لائبریری کے انور نے لکچر روم کا رُخ کیا۔ سلمہ اب تک برآمدہ میں کھڑی تھی۔ قدم بڑھاتے ہوئے اس کے پاس پہونچکر اس عاشقِ جانباز نے بھی تنہائی میں گفتگو کا یہ موقع غنیمت جانا اور فوراً تقریر شروع کر دی۔

"مس سلمہ صحافی۔ آداب عرض۔ گستاخی معاف کیجئے گا مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ کورس کی کتابوں کے علاوہ عام لٹریچر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ آپ کو لائبریری میں بھی کبھی آتے نہیں دیکھا۔ اس طرح لاپرواہی سے تو آپ کی واقفیت عامہ صفر ہو کر رہ جائیگی۔"

سلمہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "تازہ کتابیں تو میرے پاس برابر آتی رہتی ہیں۔ مگر میرا خیال تھا کہ یونیورسٹی لائبریری میں شاید میرے کام کی کتابیں نہ ملیں۔ میں نے سُنا ہے کہ یہاں اشتراکی لٹریچر کی ممانعت ہے۔"

"اوہو آپ بھی کس زمانے کی باتیں کر رہی ہیں۔" انور نے جلدی سے کہا۔ "اب تو جب سے قومی حکومت قائم ہوئی ہے ہمارے پرو وائس چانسلر صاحب نے حکم دیا ہے کہ لائبریری میں انقلابی کتابوں پر سے ممانعت اُٹھالی جائے۔ . . . . ہاں تو آپ میرے ساتھ لائبریری تشریف لے چلئے۔ گھنٹہ بھی خالی ہے۔"

"معاف کیجئے گا۔ اس وقت تو مجھے فرصت نہیں ہے لیکن اگر آپ شام کو پانچ بجے مجھے اسی جگہ ملیں تو ہم اکٹھے لائبریری چلے چلیں گے۔"

انور نے سوچا یہ بھی اچھا ہے گا۔ شام کو جب سب کھیل کے لئے چلے جاتے ہیں لائبریری تقریباً سنسان ہوتی ہے سلمہ صحافی سے اکیلے میں خوب باتیں ہو سکیں گی۔

۳

انور خوش خوش "آج ہی گھر میں پوریا نہ ہوا" گاتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا تو سلیم کو "پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں" گاتا ہوا پایا۔ ان کے کمرے کا تیسرا شریک آزاد حسب معمول پلنگ پر لیٹا ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ جاسوسی ناول پڑھنا اور سونا یہ آزاد کے محبوب مشغلے تھے۔ وہ اُن لوگوں میں تھا جو کسی شعبہ حیات میں بھی امتیاز نہیں حاصل کر سکتے۔ نہ وہ پڑھائی میں ہشیار تھا۔ (ہر بار تیسرے درجہ میں پاس ہوتا تھا۔) نہ وہ کھلاڑی ہی اچھا تھا۔ یونین میں کسی نے آج تک اُس کو بولتے نہ سنا تھا۔ اور نہ اُس نے میگزین میں کوئی مضمون لکھا تھا۔ ملنا جلنا بھی کم تھا۔ اور اپنے کمرے کے رفیقوں سے بھی وہ بوقت ضرورت ہی بات کرتا تھا۔ وہ خوبصورت بھی نہ تھا۔ چہرے پر موٹر سائیکل سے گرنے کے کئی نشانات موجود تھے۔ سانولا رنگ تھا، معمولی قد، خشک اور سخت بال، جن میں شاید دن میں ایک بار بھی کنگھا نہ ہوتا تھا۔ غرض اس میں کوئی ایسی صفت نہ تھی کہ وہ عام طالب علموں یا صنف نازک میں مقبول ہو سکتا۔ اور نہ وہ لڑکیوں میں غیر ضرورت دلچسپی کا اظہار ہی کرتا تھا۔ انور اور سلیم کے عاشقانہ مشغلوں کو وہ غیر متعلق دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ نہ وہ اُسکو اپنے رازوں میں شریک کرتے اور نہ وہ کبھی اس کی کوشش کرتا۔

آج سلیم اور انور کی غیر معمولی بشاشت سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کو پھر رومانی کیڑے نے کاٹا ہے مگر اُسنے اُن سے سوائے علیک سلیک

کے کوئی بات نہ کی اور اپنا جاسوسی ناول پڑھتا رہا۔
"تم اتنے خوش کیوں نظر آتے ہو؟" انور نے سلیم کے گانے سے تنگ آکر کہا۔
"تمہیں کیوں بتاؤں" سلیم نے بگڑ کر جواب دیا۔ "مگر میں کہتا ہوں کہ تمہیں آج کون خزانہ پڑا پاگیا ہے کہ خوشی سے پھٹے جا رہے ہو؟"
تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ انور اور سلیم دونوں اپنے اپنے سوٹ کیس میں کپڑے تلاش کر رہے تھے۔
"ابے چھدو۔ ابے چھدو" انور نے نوکر کو پکارا۔ "وہ درزی میرا سوٹ لایا یا نہیں؟"
"اور وہ میرا بلیزر جس کی آستین کھولنے کے لئے دیا تھا وہ آیا یا نہیں؟" انور نے سوال کیا۔
جب معلوم ہوا کہ درزی حسب معمول وعدے کے مطابق کپڑے نہیں لایا تھا تو دونوں نے ملکر اُس کو بُرا بھلا کہا۔ اسکے بعد آزاد کا ٹرنک ٹٹولا گیا کہ شاید اس میں کچھ پہننے کے قابل کپڑے نکلیں۔ مگر وہاں کیا ملتا۔ وہ تو جاڑے کا موسم ایک گہرے پتلون اور گرمی سفید قمیص اور خاکی نیکر پہن کر گذار دیتا تھا۔
کھانا کھا کر سلیم نے سائیکل سنبھالی تو انور نے پوچھا "اس لُو اور گرمی میں کہاں چلے"
"تمہیں کیوں بتاؤں کہ درزی کے یہاں جا رہا ہوں" سلیم نے کہا اور سائیکل پر بیٹھ روانہ ہو گیا۔ اُسکے چند منٹ بعد انور نے آزاد کی سائیکل سنبھالی۔
"میں نے کہا، شاعر صاحب" آزاد نے ہنستے ہوئے فقرہ کسا "کسی کے تیر نظر سے میری سائیکل میں پنکچر نہ کرا لائیگا۔"
درزی کے یہاں سے کپڑے لیکر چلے تو انور کو خیال ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ نیا جوتا بھی تو ہونا چاہیے۔ اور سلیم کو یاد آیا کہ اُس کا ٹینس کا جوتا ذرا پرانا ہو چلا تھا۔ جوتوں والے کے برابر میں ایک جنرل مرچنٹ کی دوکان تھی۔ انور نے ایک نئی ٹائی بھی خرید ڈالی۔ سلیم نے ایک ریشمی مفلر لیا۔ انور نے نئے بلیڈوں کا ایک پیکٹ لیا تو سلیم کو یاد آیا کہ اُسکی Face Cream ختم ہو گئی ہے۔ سلیم نے ریشمی رومال خریدا تو انور نے سینٹ کی شیشی۔
غرض تین بجے کے قریب دونوں دوست لدے پھندے واپس کمرے پہونچے۔ آزاد سو رہا تھا۔ مگر دیر تک نہ سو سکا۔ اُس کو ایسا معلوم ہوا کہ بھونچال آ گیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو انور اور سلیم کمرے کے واحد آئینے میں بیک وقت ڈاڑھی مونڈنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ اور خوب گالم گلوچ اور چھینا جھپٹی ہو رہی ہے۔ اسی جھگڑے میں انور نے اپنا گال کاٹ لیا۔ جو ما آزاد نے اٹھکر خون روکنے کے لئے پھٹکری لگا دی تو اتنے زور سے چلایا کہ اُس پاس کے کمرے والے سمجھے کوئی قتل ہو گیا ہے۔
غرض بڑی مشکل سے تقریباً ساڑھے چار بجے دونوں دوست سج دھج کر تیار ہوئے۔ بالوں میں Brilliantine ڈالا گیا۔ مانگ پٹی کی گئی۔ چہرے پر کولڈ کریم کی مالش ہوئی۔ مگر حالت قابل رحم تھی۔ اتنی سخت گرمی کے باوجود انور نے سب دیا ہوا سخت کالر لگایا تھا جس نے اُس کی گردن کو طوق کی طرح جکڑ دیا تھا۔ اس پر غضب یہ کیا کہ نہ صرف کوٹ پہنا بلکہ واسکٹ بھی۔ سلیم نے بھی اپنی شان جمانے کے لئے یونیورسٹی کے رنگوں کا اونی بلیزر پہنا تھا۔ غرض دونوں کا

پسینہ کے مارے بُرا حال تھا۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" آنور نے سلیم سے پوچھا۔

"تم کوئی ٹھیکہ دار ہو؟" سلیم نے کٹ کر جواب دیا۔ "اور دیکھتے نہیں ہو کہ ٹینس کھیلنے جا رہا ہوں۔ مگر تم بن ٹھن کر کہاں جا رہے ہو؟"

سلیم نے میز پر سے دو کتابیں اُٹھا کر بغل میں دباتے ہوئے جواب دیا "دیکھتے نہیں ہو لائبریری جا رہا ہوں"

خُدا خُدا کر کے پونے پانچ بجے یہ دونوں روانہ ہوئے تو آزاد کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس نے تکیہ کے نیچے سے اپنا جاسوسی ناول نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

۴

یونیورسٹی کے کلاک ٹاور نے چھ بجائے تو آنور نے سلیم سے کہا "بس بھائی اب چلو۔ انتظار کی حد ہو گئی۔ اس لڑکی نے آج ہم دونوں کو بیوقوف بنا دیا"

دونوں دوست ایک گھنٹے سے ٹہل رہے تھے ایک دوسرے کو ایک ہی مقام پر دیکھکر تعجب ضرور ہوا تھا اور آپس میں فقرے بازی بھی ہوئی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد دونوں نے قبول دیا کہ اصل مقصد اُن کے آنے کا کیا تھا۔ جب چھ بج گئے اور سلمہ صحافی نہ آئی تو انہوں نے اُس کو بُرا بھلا کہنے کے بعد طے کیا کہ اب کہیں ٹہلنے چلا جائے۔

سومنگ باتھ رسٹراں میں شربت پینے کے بعد انہوں نے باتفاق رائے کھیتوں کا رُخ کیا۔ ریلوے لائن کو پار کر کے پگڈنڈی پگڈنڈی باتیں کرتے جا رہے تھے کہ کچھ فاصلے پر دو سائیکلیں پڑی دیکھیں۔ ان دونوں سائیکلوں کو وہ پہچانتے تھے۔ فوراً جھجک گئے اور کھیت کی آڑ لے کر اِدھر اُدھر ہشیاری سے نگاہ کی تو برابر کے کنوئیں کی منڈیر پر آزاد اور سلمہ صحافی کو بیٹھا ہوا پایا۔ اس ایک نگاہ میں تعجب، غصہ اور انتقام کی خواہش تمام جذبات موجود تھے۔ غرض صورت حال پر مفصل تبصرہ تھا۔ آزاد اور سلمہ باتیں کر رہے تھے۔ کان لگا کر سُنا تو آنور اور سلیم دونوں کے چہرے سُرخ ہو رہے تھے۔ کیونکہ ذکر خیر اُن کا ہی تھا۔

"کاش تم اُن کو دیکھتے۔ آنور نے مفلر باندھکر اس پر گرم کوٹ پہنا۔ اور سلیم نے نہ صرف سخت کالر لگایا بلکہ واسکٹ بھی پہنی۔ پسینہ کا یہ حال تھا کہ خُدا کی پناہ" اور دونوں نے اتنے زور سے ہنسنا شروع کیا کہ آنور اور سلیم سے برداشت نہ ہو سکا۔ اور وہ اُلٹے قدم واپس لوٹ گئے۔ کچھ عرصہ خاموش چلتے رہے۔ پھر دونوں بیک وقت بولے۔

"بدلہ لیں گے"

"بدنام کریں گے"

کچھ دُور واپس گئے تھے کہ اُن کا ایک کلاس فیلو فضل الدین مل گیا۔ یہ بھی یونیورسٹی کے عاشق مزاجوں میں سے تھے۔ مگر حالی ہی میں شہر کے اسکول کی اپنے سے عمر میں دس برس بڑی ایک دیسی عیسائی ہیڈ مسٹرس کے عشق میں زک اُٹھا چکے تھے اس لئے فی الحال عورتوں کی قوم سے بُغض رکھتے تھے۔ آنور اور سلیم نے نہایت رازدارانہ طریقے پر فضل الدین کو آزاد اور

سلمہ کے "پکڑے جانے" کا "واقعہ" سُنایا۔ اور ساتھ میں یہ بھی کہا "بھائی کسی سے کہنا مت۔ کسی کو بدنام کرنے سے ہمیں کیا فائدہ!"

ایک ہفتہ کے اندر اندر یہ "واقعہ" یونیورسٹی کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔

۵

اور پھر وہ دن آیا جب مسلم یونیورسٹی میں ایک لڑکی بھی نہ رہی۔ "زبانِ خلق" سے تنگ آکر سلمہ اور آزاد دونوں نے نام کٹالیا۔ سلمہ وردھا واپس چلی گئی اور آزاد اپنے جاسوسی ناولوں کا پلندہ اُٹھا اپنے وطن چلا گیا۔

مسلم یونیورسٹی گزٹ نے 'بورڈ گاؤں' کے زمیندار کی سالگرہ کی خوشی میں ایک کالم سیاہ کرنے کے بعد چند لائنیں اس واقعہ پر بھی لکھیں اور لکھا کہ "یہ خوشی کی بات ہے کہ مس سلمہ صحافی کے جانے کے بعد یونیورسٹی ایک خطرناک عنصر سے پاک ہوگئی۔"

حامد عباسی کی تجویز اور ناصر ہاروتی کی تائید پر یونین نے سلمہ صحافی کی جرأت کو سراہتے ہوئے ریزولیوشن پاس کیا۔ ایک دوسرے ریزولیوشن سے یہ طے پایا کہ جو مخملی صوفے لڑکیوں کے لئے بنوائے گئے تھے اُن کو فروخت کرکے اس روپے سے سلمہ صحافی کا ایک مجسمہ یونین ہال کے سامنے لان میں نصب کیا جائے تاکہ اُس زمانے کی یادگار رہے جب یونیورسٹی میں ایک لڑکی پڑھتی تھی۔

حکومت کے قوانین کی رُو سے طالب علموں کی انجمن خود مختار جماعت تھی۔ اس لئے یونیورسٹی کی ایگزکٹیو کونسل اِس ریزولیوشن کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرسکی۔ اور بہت جلد مجسمہ نصب کر دیا گیا۔ اُسی سال یونیورسٹی کے بجٹ میں ایگزکٹیو کونسل نے دس روپے کی رقم "طالبعلموں کے اخلاق کی حفاظت کی تدابیر" کے لئے منظور کی۔ اِس رقم سے ایک بُرقع سلوایا گیا اور وہ سلمہ صحافی کے مجسمہ کو اُڑھا دیا گیا۔

اور مدّت تک یہ بُرقعہ سلمہ صحافی کے مجسمہ پر ڈھکا رہا اور ہوا میں پھڑپھڑا کر قریب سے گذرنے والوں کو عبرت دلاتا رہا۔

مگر ۱۹۴۲ء میں جس سال ہندوستان میں پہلی بار اشتراکی حکومت قائم ہوئی ایک خوفناک زلزلہ آیا جس میں بنارس اور علیگڈھ یونیورسٹیوں کی تمام عمارتیں تباہ ہوگئیں۔ مگر سلمہ صحافی کا مجسمہ اسی طرح قائم رہا۔ زلزلہ کے ساتھ ہی ایک زبردست آندھی چلی جو اس تاریخی بُرقع کو اڑا کر لے گئی۔

خواجہ احمد عباس

ادب اور زندگی

ادب اور زندگی کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ اور اِن دونوں میں بڑا مضبوط ارتباط ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ادب زندگی کا شارح اور اس کا ترجمان ہے۔ اور زندگی ادب کا ایک آئینہ ہے جس میں اُس کے تمام خدوخال نظر آتے ہیں۔
زندگی عبارت ہے مختلف عناصر کی ترکیب واجتماع سے اگر ان میں انتشار پیدا ہو جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

پھر زندگی میں انسان کو طرح بہ طرح کے حوادث اور واقعات سے گزرنا پڑتا ہے۔ جن کے زیر اثر اُس کی نفسانی زندگی اور اُس کی کیفیات عجیب گوناگوں اور متغیر پذیر ہوتی ہیں کبھی اُس پر خوشی کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ ہنس پڑتا ہے پھر کبھی اُس پر حزن ویاس کی اُداسی طاری ہوتی ہے اور وہ غمگین وملول ہو جاتا ہے عشق محبت کی شادکامیاں، دشمنوں سے رنجشیں، گردشِ لیل ونہار کی آفتیں، حوادث روزگار کی مُصیبتیں، عروج وترقی، تنزل وانحطاط، مسرت وغم، خندہ وگریہ الغرض یہ سب کچھ زندگی میں پیش آتا ہے۔ اور انسان کو اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔
ادب ان تمام جذبات وکیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور ادب کے حُسن وقبح کے مطابق اس ترجمانی میں لطافت و کثافت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر نہ صرف یہ کہ ادب اس کی ترجمانی کرتا ہے، بلکہ وہ ہم کو یہ بھی سکھاتا ہے کہ ہم حوادث کا مقابلہ کس طرح کریں، رنج وغم کا استقبال کیونکر کریں۔ دُنیا کی مسرتوں اور خوشیوں کو کس نظر سے دیکھیں، میدان ترقی میں کس بلند ہمتی وعالی حوصلگی کے ساتھ قدم اُٹھائیں۔ بنی نوعِ انسان کے ساتھ ہمارا کیا معاملہ ہونا چاہیئے۔ یگانوں اور بیگانوں کی پہچان کیا ہے۔ دوست کون ہوتا ہے اور دُشمن کسے کہتے ہیں۔ محبت کیوں ہوتی ہے اور کس سے ہوتی ہے۔ محبت کے آداب کیا ہیں؟ مناظرِ قطرت سے ہمیں کس قدر دلچسپی لینی چاہیئے۔ وہ ہمیں کیا اسباق سکھاتے ہیں۔ دریا کی روانی، آبشاروں کا شور، طوفانی موجیں، ہوا کا بہنا، غرضکہ یہ سب اپنے اندر ہمارے لئے کیا پیغام رکھتے ہیں۔
الغرض ادب زندگی کی ہر کیفیت میں ہمارے لئے بہترین رہنما ہے۔ وہ مجلس طرب ونشاط میں بہترین جلیس و ندیم ہے۔ اور محفل عزا وماتم میں مونس وغمخوار، وہ تنہائی میں شریکِ غم ہوتا ہے۔ اور دشوار گذار زندگی کے سفر میں ہمارا رفیق ورد دلنواز۔ ادب ہماری زندگی کو سنوارتا ہے۔ خیالات واحساسات کو بیدار کرتا ہے۔ قوتِ ارادی کو مستحکم کرتا ہے۔ اخلاقی پاکیزگی وطہارت سکھاتا ہے۔ دُنیا میں رہنا اور زندگی بسر کرنا بتاتا ہے۔ ادب زندگی کے پُر خطر راستوں میں مشعلِ راہ اور چراغِ ہدایت ثابت ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ غم واندوہ کی فراوانی سے زار ونزار ہو رہے ہیں۔ آپ کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے اور ایک ایک پل برس ہو کر گزر رہا ہے، اس حالت میں اگر آپکو غالب کا یہ شعر یاد آجائے؎

قیدِ حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یا ذوق کا یہ شعر ورد زبان ہو جائے؎

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات | رو کر گزار یا اُسے ہنس کر گزار دے

یا اکبر الہ آبادی کا یہ شعر نظر سے گزر جائے ؎

اِن مصائب میں بھی مایوس نہیں ہوں اکبر | قیدِ ہستی سے رہائی کی خوشی باقی ہے

تو اِن اشعار کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ آپ کا غم والم سکون پذیر ہو جائے گا۔ اور یہ اشعار دل کے زخموں پر مرہم کا کام دے جائیں گے۔

اسی طرح فرض کیجیے ایک شخص دُنیوی افکار و آلام میں گرفتار ہے۔ اُسے کسی طرح کشمکشِ روزگار سے نجات نہیں ملتی۔ زندگی اُس کے لئے وبالِ جان ہوگئی ہے اور بارِ ہستی اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے۔ اس وقت وہ زندگی کی بے ثباتی کا تصوّر کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ دُنیا میں ہر طرح کے حالات آتے ہیں اور یونہی گزر جاتے ہیں۔ تصوّرات کے اسی سلسلہ میں اُسکو حالی کے یہ شعر یاد آتے ہیں ؎

بُری اور بھلی سب گزر جائے گی | یہ کشتی یونہی پار اُتر جائے گی

رہیں گے نہ ملّاح یہ دن سدا | کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی

تو یقینی بات ہے ان اشعار کو گنگنانے سے اس ہیجانِ غم و اضطراب کو سکون ہو جائے گا۔ اور پھر وہ ایک ٹھنڈا سانس بھر کے خاموش ہو جائے گا۔

فرض کیجیے ایک شخص کسی کام کیلئے اَنتھک کوششیں کر رہا ہے۔ لیکن بدقسمتی اس غریب کی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتی۔ وہ بار بار اُٹھتا ہے مگر ناکامیابی کا تصوّر اس کو بٹھا دیتا ہے۔ اب وہ اُمید و خوف کی عجیب کشاکش میں مبتلا ہے۔ کہ اتنے میں اس کو یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

رہروِ راہِ محبت تھک نہ جانا راہ میں | لذتِ صحرا نوردی دوریِ منزل میں ہے

یا مولانا حالی کا یہ شعر اُس کی زبان پر آجاتا ہے ؎

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا | اب لیا چشمۂ بقا تو نے

تو لازمی طور پر اِن اشعار سے متاثر ہو کر اس میں پھر ایک بار جوشِ عمل، ولولۂ کار، اور اُمنگ و حوصلہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اس میں عمل کرنے کی قوت و حرارت نمایاں و ہویدا ہو جائیگی۔ بغرض کہ ادب زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے اور تاریکیوں میں اُجالا کرتا ہے۔ وہ ہمارے جذبات کا ترجمان اور احساسات کا شارح و مفسّر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم کا ادب اسکی تمدنی و معاشرتی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور کوئی قوم اُسوقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اُس کا ادب ترقی یافتہ نہ ہو۔ بلکہ یوں کہیے کہ ادب ترقی پذیر ہوتا ہے تو قوم خود ترقی حاصل کر لیتی ہے۔ اور قوم ترقی کرتی ہے تو اُسکے سبب سے اس قوم کا ادب خود بخود ترقی پاتا اور عرُوج و برتری حاصل کرتا ہے۔ اس حقیقت کا مشاہدہ ہم آجکل بہت اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ یورپین اقوام ترقی یافتہ ہیں تو اُنکا لٹریچر بھی اعلیٰ اور برتر ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان کا تنزّل و انحطاط ہے اسی لئے اسکا ادب بھی اسی حال میں ہے۔ غرض یہ ہے کہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسکی بقا سے اِسکی بقا اور اُسکے عرُوج و زوال سے اسکا عروج و زوال لازم آتا ہے۔

جمشیدہ شمیم

پریم کہانی

اِن دنوں ہمارے گاؤں میں ایک اجنبی سادھو آیا ہوا تھا۔ اُس کی عمر قریباً تیس پینتیس برس کے لگ بھگ تھی۔ مگر شکل و صورت سے وہ کافی معمّر معلوم ہوتا تھا۔ زمانے کی دستبرد اُس کے چہرے پر اپنے اثرات چھوڑ چکی تھی۔ برگد کے ایک پُرانے درخت کے نیچے اُس نے اپنی جھونپڑی بنا رکھی تھی۔ تمام دن وہ جھونپڑی میں دروازہ بند کئے پڑا رہتا اور شام کے وقت دروازہ کے قریب پیال بچھا کر باہر آ بیٹھتا۔ سُورج غروب ہوتے ہی ہم اُس کے گرد جمع ہو جاتے اور وہ ہمیں ہر روز دُور دراز ممالک کی دلچسپ حکایات سُنایا کرتا۔

آج اُس نے اپنی پریم کتھا سُنانی شروع کی :-

"مَیں موضع بنسی پور میں پیدا ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو میدان کی پُرشور آبادی سے دُور کوہستانی علاقہ میں واقع تھا۔ اردگرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور گاؤں میں داخل ہونے کیلئے پیچ در پیچ گھاٹیوں میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ جو تھوڑی بہت کاشت کے قابل زمین گاؤں والوں کے قبضہ میں تھی وہ نہایت جانفشانی سے اس میں کھیتی باڑی کرتے۔ کیونکہ اُنکی گزران زیادہ تر اِسی زمینداری پر موقوف تھی۔ گاؤں کے قریب ہی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی ایک پہاڑی ندی بہتی تھی۔ جس کا شفاف پانی بنسی پور کے لہلہاتے کھیتوں کو شاداب کیا کرتا تھا۔

بنسی پور کے کسانوں کے ہاں غلّہ افراط سے پیدا نہیں ہوتا تھا اور جو کچھ بھی ہوتا وہ نہایت محنت شاقہ کے بعد۔ تاہم اُنکی زندگی خوب مزے میں بسر ہوتی تھی۔ گاؤں کے ماہی گیر اور نوجوان پو پھٹتے ہی اپنے اپنے جال کندھوں پر رکھے دوپہر کا کھانا تھیلوں میں بھر کر ندی کے کنارے پہونچ جاتے اور دن بھر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف رہتے۔ عورتیں بچّوں کی دیکھ بھال کرتیں۔ گاؤں کی دوسری جانب ایک مقام پر شیریں پانی کا دھارا بہتا تھا جو شاید کسی برفانی چشمہ سے نکل کر آتا تھا۔ اس دھارے کا نام 'بنسی دھارا' تھا۔ شام کے وقت جبکہ ڈوبتے ہوئے سُورج کی طلائی کرنیں پہاڑوں کی سفید پوش چوٹیوں کو شفق آلود بنا دیتی تھیں بنسی پور کی کنواری لڑکیاں اس دھارے کے قریب جمع ہو کر چہل، گانے اور تفریح میں تھوڑا وقت گزارتیں اور جب وہ پانی بھر کر گاؤں کو واپس ہونے لگتیں تو مچھیرے دن بھر کے شکار سے واپس ہوتے ہوئے کھوؤں کے عمق میں گھاٹیوں کے درمیان پیچ در پیچ راستہ طے کرتے ہوئے شام کی تاریکی میں سایہ کی مانند اُوپر چڑھتے ہوئے نظر آنے لگتے۔ اور کوہسار کے سکوت میں اُنکی سیٹیوں اور بانسریوں کی دلگداز آوازوں سے گونج سی پیدا ہو جاتی۔

میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میرا باپ گاؤں کا پردھان یعنی چودھری تھا۔ ابھی مَیں دو برس کا تھا کہ میری ماں مر گئی اور میری پرورش کا سارا بوجھ میرے والد کے سر آن پڑا۔ اس کے حصہ کی تھوڑی سی زمین تھی جسے وہ نہایت جانفشانی سے کاشت کرتے اور غلّہ کی آمدنی پر ہم گذر اوقات کرتے۔ بچپن کا زمانہ میرے لئے نہایت بے فکری و لاپرواہی کا زمانہ تھا۔ سارا سارا دن کھیل

کودیں مصروف رہتے ہوئے دنیا کی کاہشوں کا علم ہی نہ ہوتا۔ تمام بچوں میں سب سے خوبصورت گاؤں کے جوشی پانڈے کی معصوم لڑکی جمنا تھی۔ جمنا کا باپ خاصی ہندی جانتا تھا اور وہ گاؤں کے بچوں کو ہندی کی ابتدائی تعلیم دیا کرتا۔ جمنا اور میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے باعث ایک دوسرے سے حد درجہ مانوس ہو چکے تھے۔ میں عمر میں جمنا سے کوئی دو برس بڑا تھا ہم دونوں میں بیحد محبت تھی اور ہمارے والدین ہماری معصوم محبت سے باغ باغ تھے۔ ہم اکثر مٹی کے گھروندے بنا کر کھیلتے۔ یا گڑیوں سے دل بہلاتے۔ بعض اوقات ایک بڑھیا کے پاس جو ہمارے پڑوس میں رہتی تھی جا کر پرانی کہانیاں سنتے۔ پہیلیاں بوجھتے یا کوئی اور پرلطف کھیل کھیلتے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا کہ گاؤں کے سب لڑکے اور لڑکیاں کھیل میں شریک ہوتے۔ جمنا کسی فرضی ملک کی شہزادی بنائی جاتی۔ میں خود کسی دوسرے ملک کا شہزادہ بنتا۔ دیگر لڑکے لڑکیاں ہماری فوج کے سپاہی بنتے۔ ہم دونوں میں جنگ ہوتی۔ جمنا کو شکست ہوتی اور میں اسے اپنی ملکہ بنا کر اپنے ملک کو لے جاتا۔ یہ کھیل نہایت دلچسپ ہوتا۔

ساون کا مہینہ ہمارے لئے سب سے زیادہ خوشگوار ہوتا۔ اودی اودی گھٹائیں سربفلک پہاڑوں سے باتیں کرتی مستانہ وار آتیں۔ سارا سارا دن بادل گرجتے۔ بجلیاں کوندتیں۔ اور بوندیاں پڑنے لگتیں۔ نیلگوں آسمان پر جب سارس میدانوں کی طرح پرواز کرتے نظر آتے تو سب بچے انہیں دیکھ کر شور وغل مچانے لگتے۔ ندی کا پانی اچھل اچھل کر کناروں سے باہر بہنے لگتا۔ میں اور جمنا دیر تک آم کے درختوں میں پڑے ہوئے جھولے جھلانے میں محو رہتے۔ غرضکہ ہمارا عہد طفلی انہی پرکیف مصروفیتوں میں بسر ہوتا رہا۔

زندگی کے نشیب و فراز پہاڑی خطہ کی اونچ نیچ میں گزرتے گئے۔ زمانے کی گردش کے ساتھ دن اور رات بھی گردش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم نے بچپن سے نکل کر عہد شباب میں قدم رکھا۔ اب جمنا کا وہ زمانہ تھا جب ایک لڑکی میں شباب کی رعنائیاں اپنی تمکنت زا اداؤں اور مسحور کن انداز کے ساتھ جذب ہونے لگتی ہیں اور وہ ریاض حسن کا ایک غنچہ نوشگفتہ نظر آنے لگتی ہے ـــــ ایک ایسا غنچہ جسے ہر دیکھنے والا فوراً حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اسے توڑنے کی بے ساختہ کوشش کرتا ہے۔ گو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ توڑ لینے کے بعد اس کا حسن زائل ہو جائے گا ـــــ واقعی جمنا نہایت حسین وجمیل دوشیزہ بن چکی تھی۔ اس کی مخمور و سیاہ ملکوتی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ اس کے گلابی رخساروں میں دلربائی اور موتی جیسے دانتوں میں بجلی کی سی چمک دمک تھی۔ اسکے سڈول اور خوبصورت اعضا میں جنگلی ہرن کا سا تناسب اور مورنی کی سی نزاکت تھی۔ اگرچہ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ اب بھی جاری تھا تاہم اب وہ بچپن کی سی بے تکلفی نہ تھی۔ فطرتاً ہمارے درمیان حجاب رونما ہو چکا تھا۔ اب میں زیادہ دیر تک جمنا سے باتیں نہ کر سکتا تھا کیونکہ میں دیکھتا کہ اس کی آنکھوں میں حیا جلوہ فگن ہونے لگتی۔ لہٰذا ہم صرف ایک دوسرے کو دیکھنے پر ہی اکتفا کرتے۔

شام کے وقت میں بانسری لئے ہوئے بسنتی دھارے کی طرف نکل جاتا اور کسی اونچی چٹان پر بیٹھ کر بانسری بجانے لگتا۔ میرے ارد گرد اکثر سماں نہایت دلآویز ہوتا۔ پہاڑی خودرو پھولوں کی خوشبو میں بسے ہوئے سرد جھونکے اس طرح آتے جیسے کسی شاعر کی خیالی جنت کے دروازے کھول دئے گئے ہوں۔ سیاہ بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان پر سفید بگلوں کی

قطاریں۔ قریب کے پہاڑی جنگل سے مست طاؤس کی پکاریں ایک سحر ہوتا جس سے مُردے زندہ ہو سکتے تھے۔ دھارے کی طرف سے جب گاؤں کی پری جمال لڑکیاں سروں اور کولھوں پر پانی سے بھرے ہوئے مٹکے اُٹھائے عشق پیچاں کی بیل کی طرح بل کھاتی اور ہرنیوں کی طرح رقص کرتی، آپس میں ایک دوسری کو چھیڑتی۔ پہاڑی گیت عجیب وغریب ترنم کے ساتھ گاتی گاؤں کی طرف آتی دکھائی دیا کرتیں تو میں جھوم جھوم کر بانسری بجانے لگتا۔ جمنا پانی کا مٹکا سر پر اُٹھائے سب سے پیچھے ہوتی اور خاموشی سے نیچی نظریں کئے چلی جاتی۔ میری بانسری کی آواز پر خجالت سے اُس کے گال سُرخ ہو جاتے اور وہ مجھے کنکھیوں سے دیکھکر تیز تیز قدم اُٹھانے لگتی۔ یوں تو بنسی پور کے نوجوان لڑکوں کی مشتاقانہ نگاہیں بے اختیار جمنا پر پڑا کرتیں اور ہر دل پھینک نوجوان یہی چاہتا کہ جمنا اسی کی آغوشِ تمنا کی زینت بنے۔ مگر سب سے زیادہ جمنا کا شیدائی ایک ماہی گیر کا لڑکا رتن تھا۔ اسکی انتہائی خواہش تھی کہ کسی طرح جمنا سے اس کا بیاہ ہو جائے۔

چونکہ میرا باپ گاؤں کا پردھان تھا اس لئے میری خواہش معلوم کر کے وہ جمنا کو اپنی بہو بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور ساون کے ایک خوشگوار دن کو میرا اور جمنا کا بیاہ ہو گیا۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی اور جمنا سولہ سال کی تھی۔ اب ہمارے دن نہایت شادابی ومسرت میں گزرنے لگے۔ میں والد کے ساتھ کاشت کرتا کیونکہ فصل ہی ہم غریبوں کی زندگی کا سہارا تھا۔

میری شادی کو بمشکل ایک برس گزرا ہو گا کہ ایک عجیب مُصیبت ٹوٹ پڑی۔ چند دنوں سے سُننے میں آرہا تھا کہ قرب وجوار کے دیہات میں طاعون کی مُہلک بیماری بیدردی سے لوگوں کو شکار کر رہی ہے۔ ان خبروں سے گاؤں کے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی اور ہر شخص خوفزدہ اور متوحش نظر آنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خوفناک وبا کا دیوتا بنسی پور پر بھی مسلط ہو گیا۔ ایک ہی دن میں کئی کئی موتیں واقع ہونے لگیں۔ گھر گھر صفِ ماتم بچھ گئی۔ رات کے سکوت میں شور وشین کی آوازیں جنگلی درندوں کی چنگھاڑوں سے بھی زیادہ ہیبتناک معلوم ہوتی تھیں۔ چند روز میں پورے خاندانوں کا صفایا ہو گیا۔ مُردہ جسم کئی کئی روز تک بے کفن پڑے رہے۔ ایک بوڑھے ماہی گیر کے پانچ جوان بیٹے یکے بعد دیگرے ایک ہی دن میں نذرِ اجل ہو گئے۔ بچے یتیم، سہاگنیں بیوہ اور ماں باپ بے سہارا ہو گئے۔ کوہستانی علاقہ کے خانہ بدوش لوگ جو پہاڑی گپھاؤں یا درختوں کے پتوں سے بنائی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے تھے اس طرح خوفزدہ ہوئے کہ اپنے اکثر اقربا کو حالتِ نزع ہی میں چوٹی پر سے کسی گہری کھڈ میں لڑھکا دیتے۔ کئی پسماندگان بیماری سے بچ کر بھاگنے کی ناکام کوشش میں راستوں پر بے جان پائے گئے۔ الغرض تمام کوہستانی خطہ میں ایک قیامت برپا تھی۔ جس نے آناً فاناً گاؤں کے گاؤں صاف کر دئے۔ میرے والد اور جمنا کے والدین بھی طاعون کے شکار ہو گئے۔ ہم دونوں کو اس صدمہ سے سخت رنج ہوا تاہم جب خُدا خُدا کر کے وبا فرو ہوئی تو گاؤں کے دیگر بچے کھچے لوگوں کی طرح ہم بھی زندگی کی تگ ودو میں محو ہو گئے۔

میں اب تنہا نہایت محنت سے کھیتی باڑی کرنے لگا کیونکہ اسی پر ہمارا دار ومدار تھا۔ مگر بدقسمتی سے اگلے برس ندی میں اسقدر

طغیانی آئی کہ بہت سے پکے ہوئے کھیت تباہ ہو گئے۔ اور غلہ کا سخت قحط ہو گیا۔ ایک ماہ اسی پریشانی و سراسیمگی میں بسر ہوا۔ چند روز بعد میں نے جنگ کی افواہ سنی۔ غریب اور بیکار نوجوان لڑائی میں جانے کیلئے دھڑا دھڑ بھرتی ہو رہے تھے۔ میں نے بھی اپنے مستقبل کو درخشاں بنانے کیلئے فوجی ملازمت کا ارادہ کیا۔ اور ایک دوست کی وساطت سے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ جب میں جنگ کو جانے کے لئے گاؤں سے رخصت ہوا تو جمنا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے اُسے دلاسا دیا اور خدا کے بھروسے پر چل کھڑا ہوا۔ جنگ کی تباہی و بربادی کا خوفناک نقشہ جو میں نے دیکھا اُسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ دیس کو تیاگ کر متواتر کئی برس تک میں بدیس کی صعوبتیں اٹھاتا رہا۔ اور پورے دس برس بعد جب ملازمت سے فارغ ہو کر میں وطن کو واپس لوٹا تو میرا دل نہایت مطمئن اور طبیعت ازحد مسرور تھی۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ دس برس کی طویل مدت کے بعد جب میں اپنی پیاری بیوی کو شکل دکھاؤنگا تو وہ کسقدر مسرور ہوگی اور ہماری آئندہ زندگی نہایت فارغ البالی سے بسر ہوگی۔

انہی خیالات کو دل میں لئے میں گاؤں میں وارد ہوا۔ سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ ہر طرف سکوتِ شب اپنا دامن پھیلائے ہوئے تھی۔ گاؤں والے دن بھر کی تھکان کے بعد غافل پڑے تھے۔ چاندنی رات تھی اور چودھویں کا چاند پہاڑیوں پر چمک رہا تھا۔ تنویر ریز فضا میں چکور اُڑ رہے تھے۔ دور شمال کی طرف برف پوش بلند چوٹیاں چاندنی میں چمکتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے سیماب کی ایک پتلی سی نہر بہہ رہی ہو۔ جب میں اپنے مکان کے قریب پہونچا تو دروازے سے اندر داخل ہونے کے بجائے میں پشت پر سے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ تاکہ اپنی بیوی کی بیخبری میں اس کی حالت کا اچھی طرح اندازہ کر سکوں۔ جب میں نے کوٹھے پر سے نیچے صحن میں جھانک کر دیکھا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میری بیوی جمنا ایک چارپائی پر رتن ماہی گیر کے پہلو میں بیٹھی ہوئی مزے سے پیار و محبت کی باتیں کر رہی تھی۔ پاس ہی چارپائی پر دو خورد سال بچے سوئے تھے۔ یہ منظر دیکھکر میرے دل پر ایک بجلی سی گری جس بیوی کی خاطر دیس تیاگ دیا تھا اسی نے مجھے چھل دیا۔ میں متحیر ہو کر الٹے پاؤں کوٹھے سے نیچے اُترا۔ میرا ضمیر مجھے اپنی بد قسمتی پر ملامت کر رہا تھا۔

گاؤں میں ٹھہرنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ ندی کے اُس پار پرانے وقتوں کا ایک چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک بڈھا پجاری رہا کرتا تھا۔ وہ مجھے بچپن سے جانتا تھا لہذا میں نے رات اُسی کے ہاں گزارنی چاہی۔ جب میں ندی کو پار کر کے مندر میں داخل ہوا تو بوڑھا پجاری رات کے وقت میرے خلافِ توقع وارد ہونے پر پہلے تو سخت متعجب ہوا لیکن بعد میں مجھے شناخت کر کے اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں نے اُسے اپنی داستان سنائی۔ میری بیوی کی بیوفائی کا ذکر سن کر اُس نے مجھے اصل حالات سے آگاہ کیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ چونکہ پردیس سے مدت تک میری کوئی خبر نہیں آئی تھی اس لئے تین سال بعد رتن نے کسی طرح گاؤں میں یہ خبر مشہور کر دی کہ میں لڑائی میں مارا گیا ہوں۔ اس خبر سے جمنا بہت روئی مگر بالآخر رتن کے سمجھانے بجھانے سے اُس نے صبر کیا۔ اور چند ماہ بعد ان دونوں کی باہم شادی ہو گئی۔

میں اپنی بیوی کی سرد مہری کا ماتم کرتے ہوئے اسی مندر میں پڑا رہا مگر نیند مطلق نہ آئی۔ یکلخت آسمان پر سیاہ بادل منڈلانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام مطلع ابر آلود ہو گیا۔ چند منٹ بعد اس زور کی بارش شروع ہوئی کہ الاماں۔ طوفان

بادوباراں کا وہ شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بادل کی خوفناک گرج۔ بجلی کی لرزہ خیز چمک۔ بارش کا بھیانک شوروغل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضائے بسیط میں دیوتاؤں کی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اور آنِ واحد میں کائنات کے تمام عناصرِ ترکیبی آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہوجائیں گے۔ تمام شب اسی زور سے مینہ برستا رہا۔ علی الصبح جب ذرا بارش تھمی تو میں مندر سے باہر نکلا۔ گاؤں کی طرف نظر کی تو عجیب عبرت انگیز سماں نظر آیا۔ ندی میں اس زور کی طغیانی آئی تھی کہ دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا۔ سارا گاؤں سیلاب کی نذر ہوچکا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں کبھی کوئی آبادی تھی ہی نہیں۔

میرا دل بیوی کے داغِ مفارقت سے پہلے ہی بھرا پڑا تھا۔ اب گاؤں کی تباہی کا منظر دیکھ کر اور بھی اچاٹ ہوگیا۔ دُنیا کی لذتوں سے میں بیزار ہوچکا تھا۔ لہٰذا میں نے جوگ لے لیا اور اب زندگی کے باقی ایام دیس بدیس پھرنے میں گزار رہا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ اس کی دردبھری کہانی سُن کر ہماری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی جب گاؤں کی عورتیں پانی لینے جا رہی تھیں تو اُنہوں نے سادھو کی جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہوا پایا۔ زمین پر خالی گھڑا پڑا تھا اور ایک کونے میں مٹی کا دیا بجھا دھرا تھا۔ ہم میں سے کوئی نہ جان سکا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی وہ کہاں چلا گیا۔

ساغر جعفری

وجدانیات

ترے آتے ہی سب دُنیا جواں معلوم ہوتی ہے
خزاں رشکِ بہارِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

جنونِ سجدہ ریزی کا یہ عالم ہے معاذ اللہ
ہر اک چوکھٹ ترا ہی آستاں معلوم ہوتی ہے

اسے ہر اہلِ دل پہروں مزے لے لے کے سُنتا ہے
مری بپتا حدیثِ دلبراں معلوم ہوتی ہے

کٹے ہیں دن بلاؤں کے سہارے جن اسیروں کے
اُنھیں بجلی بھی شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

مآلِ زندگانی کی حقیقت کُھل گئی جب سے
کسک دل کی متاعِ دوجہاں معلوم ہوتی ہے

خیالِ عیش کی پرچھائیں سے بھی دل لرزتا ہے
نگاہِ حُسن اب کیوں مہرباں معلوم ہوتی ہے

خُدا شاہد ہے میرے بھولنے والے بجُز تیرے
مجھے تخلیقِ عالم رائیگاں معلوم ہوتی ہے

کسی کی جستجو میں وجد اُس منزل پہ پہنچا ہوں
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

سکندر علی وجد

(ایک مکالمہ)

فلسفی اور موت

مقام:۔ تنگ و تار کمرہ، ایک بھیگی ہوئی رات کا پچھلا پہر، سنسناہٹ، ایک قنوطیت پسند بوڑھا فلسفی تنہا بستر مرگ پر لیٹا زندگی کے آخری سانس گن رہا ہے، اُسکے پیش نظر زندگی کی بے روح کیفیتیں ہیں، یکایک موت سیاہ سائے کی صورت میں سرہانے آن کھڑی ہوتی ہے۔ مریض کو شانہ سے ہلاتی ہے، فلسفی مُنہ اوپر کو اُٹھاتا ہے۔ سیاہ سایہ سرہانے رقصاں دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔

فلسفی:۔ (آنکھیں ملتے ہوئے) سیاہ سایہ! میرے اللہ تم کیا ہو!

(سایہ بدستور ناچتا ہے۔ فلسفی اُٹھنے کی سعی کرتا ہے

سایہ اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیتا ہے۔ فلسفی

اس وزنی گرفت کی تاب نہیں لاسکتا۔)

فلسفی:۔ (باہیں پٹکتے ہوئے) مجھے تاریکی دھوکا دے رہی ہے۔

(بدحواس ہوجاتا ہے، سایہ اُسکے اُوپر جُھک جاتا ہے۔)

سایہ:۔ میں موت ہوں۔

فلسفی:۔ موت! کتنا بھیانک رقص ہے۔ (سہم جاتا ہے۔ یکایک اُسکی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوتی ہے۔) موت کا سایہ! میں نے تمام عمر اسی کے انتظار میں صرف کردی۔ (پہلو بدل لیتا ہے) اے موت کے گمنام سائے! پیشتر اس کے کہ تو مجھ پر چھا جائے میری ایک آخری آرزو ضرور پوری کردے۔ مجھے بتا کہ زندگی کیا ہے؟۔

سایہ:۔ (دونوں ہاتھ پھیلا کر) اے راندۂ حیات! تیرا تارِ نفس اب ٹوٹنے ہی والا ہے۔ تو خود ہی رازِ حیات بن جائے گا۔ اور کیا چاہتا ہے۔

فلسفی:۔ (کانپتے ہوئے) نہیں، اے موت! موت کے بھیانک سائے! قبل اس کے کہ دامنِ جہاں سے میری ہستی کا داغ دھل جائے میری یہ بات ضرور پوری ہوجائے۔ بتا، ضرور بتا کہ تو خود انسانی زندگی کا تعاقب کرتا ہے یا بچہ پیدا ہوتے ہی فطرتاً تیری طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔

سایہ:۔ میں زندگی کا پیچھا کیوں کروں جبکہ بچہ اس جہاں میں آنکھ کھولتے ہی میری طرف لڑھکنا شروع کر دیتا ہے۔ میں ایک ایسی چٹان ہوں جہاں کشتیِ حیات ضرور آکر ٹکرائے گی۔ نوزائیدہ بچے کا ایک ایک سانس موت کی پکار ہوتی ہے۔ وقت معینہ پر میں خود ہی اس پر غالب آکر سازِ حیات کا آخری تار توڑ دیتا ہوں۔

فلسفی:۔ گویا موت میں بھی ایک کشش موجود ہے۔ لیکن کیا تم زندگی کا آخری انجام ہو؟۔

سایہ:۔ انجام ہوں، لیکن آخری نہیں۔ میری گود میں زندگی کا دورِ ثانی لوری لے رہا ہے۔ میں ایک کدال ہوں، کدال جو پہلی ہی کوشش میں زمینِ حیات کو کھود کر پانی کی سطح تک پہنچ جائے۔ جانتے ہو کہ پانی کے نیچے بھی زمین ہی ہوتی ہے۔ سمجھ لو کہ زندگی کے بعد موت اور پھر زندگی ہی زندگی ہے۔ حیاتِ انسانی مختصر سا خط ہے جس کے مکمل ہوتے ہی موت اس پر بطور ایک مہر کے ثبت ہوجاتی ہے۔ جس طرح ایک خط اپنے پتہ پر پہونچکر دوبارہ کھلتا ہے کہ اس کے نفسِ مضمون کا پتہ چل سکے۔ بعینہٖ منزلِ مقصود پر پہنچکر میری مُہر کو توڑ کر نامۂ زندگی کا مُنہ کھولا جائے گا تاکہ داورِ محشر بانیِ اعمال کا جائزہ لے سکے۔ نیکی اور بدی میزانِ انصاف میں تل جائے گی۔ خیر و شر کی صدائیں بلند ہونگی۔ انسان اپنے کئے کا پھل پائے گا۔

فلسفی:۔ (مدھم آواز میں) لیکن اُسکی رحمت!۔

سایہ:۔ اس کا ایک قطرہ دونوں جہاں کی وسعتوں کو سمیٹ سکتا ہے۔

فلسفی:۔ اے رقصاں سائے، تیری باتیں حقیقت ہیں۔ اُن کے سامنے کوئی بڑے سے بڑا فلسفہ یا دقیق منطق نہیں ٹھہر سکتی۔ تیری باتوں سے مجھے تسکین ہوتی ہے۔ مجھے یہ تو بتا کہ زندگی خواہ کتنی پُرانی ہو، چند روزہ کیوں دکھائی دیتی ہے۔

سایہ:۔ (بھاری آواز میں) حوادثِ زمانہ اور اپنی کشمکشوں میں اُلجھ کر انسان وقت کی اُڑان سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس کا دل اگرچہ موت کے مفہوم سے ناآشنا نہیں ہوتا لیکن یہ غفلت اُسے بے بس کر دیتی ہے۔ انہی مخمصوں میں گرتا پڑتا وہ اپنے انجام کی طرف لڑھک آتا ہے۔ اسے گذشتہ زندگی موہوم نظر آتی ہے۔

فلسفی:۔ بالکل ایک خواب، ایک ندی جس کا منبع معلوم نہ ہو۔

سایہ:۔ زندگی خواب نہیں بلکہ بذاتِ خود تعبیر ہے اس بیدار خواب کی جو قدرت کے بڑے کارخانہ میں آسمان پر ڈھالا جاتا ہے۔ آخری مرحلے پر پہنچکر یہی خواب موت میں بدل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے نقوش ایک بار پھر آسمان پر جا کر اُبھریں گے، رُوح ایک غیر فانی شے ہے۔

فلسفی:۔ رُوح! زندگی بھر میرے لئے یہ ایک معمہ بنی رہی۔ میں تو اسے ایک ناطق شے سمجھتا ہوں جس کا تعلق جسم سے عارضی ہوتا ہے۔ دوسرے معنوں میں انسانی جسم کے اندر یعنی طاقتِ گویائی ہے۔ اے سائے تجھے قسم ہے اس بڑے داور کی مجھے اس کی حقیقت سے آگاہ کر دے۔

سایہ:۔ رُوح! یہ رُوح جسم کی طرح فانی نہیں۔ جب جسم سوتا ہے رُوح بیدار ہوتی ہے۔ میں خالق کے حکم سے اسے جسم سے جُدا کر کے ابدی نیند سُلا دیتا ہوں۔ رُوح اور جسم میں جُدائی عارضی ہوتی ہے۔ حیاتِ ثانی ایک خُدائی حُکم ہے اس میں تعویق نہیں ہو سکتی۔

فلسفی:۔ لیکن کیا انسان اس جہان میں دوبارہ جنم لے سکتا ہے؟

سایہ:۔ دوبارہ جنم محض ایک خیالی بات ہے، جبکہ خُدا خود انسانوں کی تخلیق پر قادر ہے۔ رُوح ایک بار آزاد ہو کر ہمیشہ کے لئے اس دُنیا سے پرواز کر جاتی ہے۔ ہر نئے بچے کی پیدائش اس بات کا پیغام ہے انسانوں کو کہ اُن کا خالق ابھی کارِ تخلیق سے گھبرایا نہیں۔ وہ نت نئے انسان پیدا کر سکتا ہے۔ رُوح ایک آسمانی شے ہے۔

فلسفی:۔ اگر رُوح آسمانی ہے تو خاکی جسم سے اس کا ملاپ کیونکر ہوا؟

سایہ:۔ ان دونوں کی تخلیق سے مُدعا ملاپ تھا۔ اس ملاپ ہی سے تو زندگی کی تخلیق ہوتی ہے۔

فلسفی:۔ صرف ایک بات اور۔ کیا تم انسان کے پاس اُسکے آخری وقت میں مہمان بنکر آتے ہو یا میزبان؟

سایہ:۔ میں زندگی کا مہمان ہوں۔ رُوح کو زندگی سے کھینچ کر میں جسم کو بے بس کر سکتا ہوں۔ میں تقدیر کا وہ مُنہ زور گھوڑا ہوں جس کی جھپٹ سے زندگی کبھی بچ کر نہیں نکل سکی۔ رقاصۂ حیات کی دلآویز ادائیں یا ترنم انگیز نگاہیں مجھے کبھی متاثر نہیں کر سکیں۔ مجھے خود اپنے رقص پر ناز ہے خواہ تم اسے بھیانک ہی کہو۔ (تیزی سے ناچنا شروع کر دیتا ہے)

فلسفی:۔ (ذرا جوش سے) کیا زندگی کے حقِ میزبانی کا یہی صلہ ہے کہ تم اسے اپنے میں جذب کر لو!

سایہ:۔ صلہ! زندگی تو بارِ احسان سے میری طرف جھک جاتی ہے۔ میں زندگی کی تکمیل کرنے آتا ہوں۔ دُنیا میں سوائے اس کے کسی اور چیز کی تکمیل ممکن نہیں۔ موت اپنے میزبان کے ساتھ کبھی بے وفائی نہ کرے گی۔ اگرچہ مہمان لاکھ پلہ چھڑانے کی کوشش کرے۔

فلسفی:۔ (نرم لہجے میں) تو کیا تم زندگی کے چاند پر داغ کی طرح پیوست ہو جاتے ہو، جبھی تو جسم بے رُوح ہو کر زرد نظر آتا ہے؟

سایہ ۔ میں داغ نہیں۔ مجھے ایک بادل کہہ لو جو آسمانِ حیات پر ایک دم چھاجائے۔ لیکن میرا تسلط عارضی ہوتا ہے۔ میرے اُڑتے ہی زندگی دوبارہ نیلگوں رنگتوں کے ساتھ چمک اُٹھے گی۔

فلسفی ۔ لیکن کیا یہ بالکل سچ ہے۔

(سایہ رقص کرکے خاموشی سے بڑھکر فلسفی کے اُوپر جھکتا ہے۔)

فلسفی ۔ (گھبراکر) یہ کیا؟۔

سایہ ۔ تمہارا وقت معینہ آپہونچا۔ داور کی طرف سے مجھے یہ حکم ہوا تھا کہ میں چند منٹ پہلے تیرے پاس آکر تیری زندگی کی آخری آرزو پوری کر دوں۔ اب بس۔

فلسفی ۔ اک ذرا سی مُہلت میں پاک دامن ہولوں۔

(سایہ بدستور خاموشی سے اوپر کو جھکا رہتا ہے۔ فلسفی اُٹھنے کیلئے باہیں پھیلتا ہے لیکن ایک کروٹ لیتے ہی زندگی کی گرفت سے نکل جاتا ہے۔ تاریکی میں اس کی خاموش آنکھیں چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے رازِ حیات کو پالیا۔)

(خواجہ) حسن عباس۔ بی۔ اے

ساقی کی نگاہیں اور شراب

اُن بیت لواسی آنکھوں سے جب کیف کے چشمے پھوٹتے ہیں
اور دیکھنے والے بیداری میں نیند کا جوبن لوٹتے ہیں

پلکوں پہ لئے میخانہ جب ساون کی گھٹائیں آتی ہیں
ہر سمت سے ظالم توبہ شکن، مخمور صدائیں آتی ہیں

جب رات کی دیوی چپکے سے آنکھوں میں نیند اُنڈیلتی ہے
اور شام سے لیکر صبح تلک اک ٹیس جگر سے کھیلتی ہے

جب صحنِ چمن سے وقتِ سحر آلام کا بادل پھٹتا ہے
غنچوں میں عروسِ فطرت کے ہونٹوں سے تبسم بٹتا ہے

جب درد کے مرہم سے شاعر زخموں کے دہن کو بھرتا ہے
احساس کی تصویروں کو جب قرطاس کی زینت کرتا ہے

جب درد کی لہریں سینے کے ساحل پر دم بھر اُٹھتی ہیں
الطاف مرے پہلو میں جب کچھ حُسن کی نظریں ڈھونڈتی ہیں

جب لیلیٰ مغرب کے در پر سورج کی نگاہیں جھکتی ہیں
اور درد کے مارے انسا کی کچھ دیر کو آہیں رُکتی ہیں

جب صحنِ چمن سے وقتِ سحر آلام کا بادل پھٹتا ہے
غنچوں میں عروسِ فطرت کے ہونٹوں سے تبسم بٹتا ہے

جب دل کے ساز کو بلا کی مدہوش نگاہیں چومتی ہیں
جب تارِ نفس کے پہلو میں نغموں کی گھٹائیں جھومتی ہیں

اُس وقت ملا کر صہبا میں ساقی کی نگاہیں پیتا ہوں
اور حسن کی بیخود کرنوں سے زخموں کو کچھ کچھ سیتا ہوں

الطاف مشہدی

تصحیح خیال خام

(۱)

مری نظر سے نہاں کب ہیں وہ "سخن آرا" — جو شاعروں پہ کئے جا رہے ہیں ظلم صریح
ہے ان کا علم بس اتنا کہ نقل جب نہ کریں — بلا مبالغہ لکھیں "کریہ" کو بھی "کریح"

(۲)

نہیں ہیں ان کی تراکیب ہی لطیف لطیف — ہیں ان کے بعض اسالیب بھی صبیح صبیح
مگر جو یاد نہیں ہے محل استعمال — خود اپنے جہل کی کرتے ہیں ہر جگہ تصریح

(۳)

یہی رہا اگر ان کی نمود کا عالم — مجھے یہ ڈر ہے کہ رُوپوش ہو نہ جائیں فصیح
یقیں کے رنگ میں کہتے غزل — تو کچھ لیتے — مگر — یہ کرتے ہیں غالب کے طرز کی تشریح
وہی لغات وہی ہیں اضافتوں کی لپیٹ — وہی نکات وہی فاضلانہ ہے تلمیح

(۴)

سخنوراں گرانمایہ کیوں نہ ہوں حیراں — جب ان کے علم کی ہوا نکے جہل سے توضیح
وہ "شعر ساز" بھی لکھوائیں شاعروں میں نام — جو نقل ٹھیک اتاریں تو پڑھ سکیں نہ صحیح
بنا نہیں کوئی لفظوں کو جوڑ کر شاعر — کریں یہ لوگ اب اپنے خیال کی تصحیح

تم ان سے کس لئے غافل ہوا علی منظور!
ہر اک پہ فرض ہے جن کے کلام کی تنقیح

علی منظور حیدرآبادی

شاہی سکورا پارٹی

صدیوں سے جاپان میں سیرِ گُل کا دستور چلا آتا ہے۔ لوگ پھولوں کی سیر دیکھنے جاتے ہیں۔ احباب کو اپنے باغ میں بلاتے ہیں اور کھانے پینے کے علاوہ نظارۂ گل کی دعوت کرتے ہیں۔ یوں سیرِ گل کا کوئی تہوار مقرر نہیں۔ نہ اس کے لئے کوئی موسم مقرر ہے۔ بلکہ جاپان میں ہر مہینہ کسی نہ کسی پھول کی بہار کے لئے مخصوص ہے۔ لوگ بارہ مہینے سیرِ گل کا لطف اٹھاتے ہیں۔ پھر بھی ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ پھولوں کی سیر دیکھنے لوگ برساتی بیر بہٹیوں کی طرح گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ اپریل میں بہار شباب پر ہوتی ہے۔ زمین ہر طرف سبزہ اگلتی ہے۔ درختوں پر نئی کونپلیں نکلنے لگتی ہیں۔ سکورا کے درخت جوش میں آکر پھٹ پڑتے ہیں۔ دو چار پھول نہیں بادل کے بادل کھل جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے، پہاڑیوں کی ڈھلان پر، باغ کے میدان میں، پیازی اور ہلکے گلابی رنگ کے بادل چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جاپانی اس منظر کو دیکھ کر وجد کریں تو کوئی تعجب نہیں۔ ایک ساحرانہ کیفیت ہوتی ہے جس سے متاثر ہوئے بغیر کوئی رہ نہیں سکتا۔ خوب جشن منائے جاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں شہنشاہِ جاپان کی جانب سے عمائدین ملک کو سکورا پارٹی میں مدعو کیا جاتا ہے۔

شاہی پارٹی میں ارکین خاندان شاہی کے علاوہ وزرائے سلطنت، اعلیٰ عہدیداران فوج بری و بحری، عمائدین ملک، سفرائے دول اور ان کے سکرٹری بلائے جاتے ہیں۔ سفرائے دول اپنی حکومتوں کے نائب کی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں اور اہلِ ملک اس منصب کی رو سے جو انہیں جاپانی دربار میں حاصل ہے۔ منصب داروں کے آٹھ مدارج ہیں۔ ان میں سے صرف پہلے تین درجے والوں کو یہ شرف حاصل ہوتا ہے۔ اوّل درجے میں ارکین خاندان شاہی ہیں۔ دوسرے درجے میں وزرائے سلطنت، محکموں اور کالجوں کے ڈائرکٹر اور منتخب عمائدین ملک ہیں۔ تیسرے درجے میں اعلیٰ عہدیداران اور دیگر عمائدین ملک ہیں۔

غیر ملکی عہدیداروں کو بھی شاہی پارٹی میں شرکت کا موقع مل جاتا ہے۔ مگر انہیں کو یہ اعزاز نصیب ہوتا ہے جن کو جاپانی دربار کا منصب مل جائے۔ ملازمین سرکار کو تین سال کی ملازمت سے پہلے یہ منصب نہیں ملتا۔ غیر ملازمین کو تو مدتیں گزر جاتی ہیں۔ مثلاً غیر زبانوں کے کالجوں میں اب تک پندرہ ہندوستانی پروفیسر رہ چکے ہیں۔ سب اس شرف سے محروم رہے کیونکہ کوئی دو تین سال سے زیادہ یہاں نہیں رہا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں پہلا ہندوستانی ہوں جسے دربار جاپان کا منصب عطا ہوا ہے اور مسز برلاس کو ملا کر ہمارا پہلا ہندوستانی جوڑا ہے جسے شہنشاہِ جاپان کی جانب سے شاہی پارٹی میں مدعو کیا گیا ہے۔

جیسی پارٹی ویسی ہی شان۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں سکورا پارٹی ہونے والی تھی۔ اس کی شرکت کی اطلاع ہمیں جنوری ۱۹۳۶ء میں سوا سال پہلے دی گئی تھی بلکہ آئندہ چھ سال تک کا پروگرام بنا دیا گیا تھا۔ شرکا اس قدر کثیر التعداد

ہیں کہ دو گروہ بنا دئے گئے ہیں۔ ایک گروہ کو ایک مرتبہ بلایا جاتا ہے اور دوسرے کو دوسرے سال۔ اپریل کے علاوہ ایک پارٹی نومبر میں بھی ہوتی ہے۔ اس وقت گل داؤدی کی بہار ہوتی ہے۔ نومبر کی پارٹی میں بھی گروہوں کی تقسیم ہوتی ہے۔ دونوں پارٹیاں سِشنجو گیوئن نامی شاہی باغ میں کھلے میدان میں ہوتی ہیں۔ بارش ہو تو ملتوی کر دی جاتی ہیں۔ جس گروہ کی باری ہوتی ہے وہ خوب دعائیں مانگتا ہے کہ اللہ میاں دھوپ نکال دے۔ ہم بھی دست بدعا تھے کیونکہ دو سال سے سکورا پارٹی ملتوی ہو رہی تھی۔

چند روز قبل دعوتی رقعہ وصول ہوا۔ یہ ایک پلندہ تھا جس میں رقعے کے علاوہ کئی کاغذات ملفوف تھے۔ ان میں باغ کے اندر اور باہر کے دو نقشے تھے۔ ایک موٹر پر لگانے کا نشان تھا۔ ایک داخلے کا کارڈ تھا جس میں لباس کے متعلق ہدایات تھیں۔ مہمانوں کو بارہ اور دو بجے کے درمیان پہنچنے کی ہدایت تھی۔ چائے نوشی کے لئے چودہ بڑے بڑے احاطے گھیرے جاتے ہیں۔ سفراے دول کے لئے علیحدہ احاطہ ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں دوسرے احاطے کے ٹکٹ مل گئے۔ یہ احاطہ شامیانے کے بالکل سامنے اور متصل تھا۔

باغ نہایت وسیع ہے جس کا رقبہ ایک سو ساٹھ ایکڑ سے زیادہ ہے۔ سابق میں ایک نواب کی ملکیت تھا۔ شاہی اختیارات کی بحالی پر حکومت کے قبضے میں آیا اور عرصہ تک محکمہ زراعت کے ماتحت تجربہ گاہ کا کام دیتا رہا۔ بعدہٗ محکمہ محلات شاہی کے تفویض ہوا۔ ۱۹۰۶ء میں بڑے دروازے کے متصل باضابطہ باغ لگایا گیا۔ شاہی پارٹیوں کے لئے یہی حصّہ کام آتا ہے۔ باقی حصّے میں کہیں شیشے کے گرم مکانات ہیں جن میں گرم ممالک کے پھلدار اور نایاب پودے لگائے جاتے ہیں۔ کہیں محلات ہیں جو رہائش کے کام نہیں آتے بلکہ دعوتوں اور پارٹیوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ کہیں گالف کے لئے میدان ہیں جہاں اراکین خاندانِ شاہی مشق کیا کرتے ہیں۔

پارٹی کے لئے جو حصّہ کام میں آتا ہے اُسے دو قطعوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بڑے دروازے کے اندر گھستے ہی وسیع میدان ہے۔ یہاں مغربی وضع کا باغ لگا ہوا ہے جس میں جا بجا پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ آگے چل کر چائے نوشی کے احاطے ہیں۔ آخر میں شاہی شامیانہ نصب ہے۔ اس میدان کی بغل میں اور عقب میں جاپانی وضع کا باغ ہے۔ جا بجا جھیلیں بنی ہیں جن کی شکل ایسی ہی بے قاعدہ ہے جیسے کسی پہاڑی میدان کی جھیلوں کی ہوتی ہے۔ جھیلوں کے کنارے ڈھلوان ہیں۔ یہی نشیب فراز منظر کو دلفریب بناتا ہے۔ ڈھالوں پر اور روشوں کے کنارے پر سکورا کے درخت ہیں جو اس موسم میں پوری بہار پر ہیں۔ اس باغ میں پانسو سکورا کے درخت لگے ہوئے ہیں جنہیں ہزارا سکورا کہنا چاہیئے۔ ان کی بہار وسط اپریل کے بعد آتی ہے جب یامازکورا اور یوشینو زکورا کے پھول گر چکتے ہیں۔ سکورا سے بہت وسیع علاقہ گھرا ہوا ہے۔ آدمی پھرتے پھرتے تھک جاتا ہے۔ سیر کرتے کرتے ایک وسیع میدان میں پہنچتے ہیں جہاں گھاس کے مخملی فرش پر کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ لوگ یہاں آرام کرتے ہیں جو دیر میں آتے ہیں وہ گھاس پر دراز ہو جاتے ہیں۔ بحری فوج کا بینڈ سامعہ نوازی کرتا ہے۔

یہ مقام شاہی شامیانے کے عقب میں واقع ہے۔ دور تک قناتیں تنی ہوئی ہیں۔ ساڑھے بارہ بجے دروازہ کھلتا ہے اور لوگ

اپنے اپنے احاطوں کی طرف بے تحاشا بھاگتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہ عام لوگوں کا مجمع نہیں ہے۔ بلکہ عمائدین ملک کی پارٹی ہے۔ جس میں کرنل سے نیچے درجے کا کوئی فوجی یا بحری عہدیدار شریک نہیں ہو سکتا۔ کرنیلوں اور جرنیلوں کا آگے کی نشست کے لئے بھاگنا کچھ مضحکہ خیز منظر معلوم ہوتا ہے۔ عموماً جاپانی نہایت سنجیدہ اور متین ہوتے ہیں مگر بھیڑ میں ان کی حالت بالکل بدل جاتی ہے۔ سب اپنی متانت کو بالائے طاق رکھ کر بھیڑوں کی طرح بھاگتے ہیں۔ جب ہلڑ ختم ہو گیا تو پیچھے آنے والے ویسے ہی سنجیدہ اور متین تھے جیسے عموماً نظر آتے ہیں۔

جب سب لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے تو مکبر الصوت نے اعلان کیا کہ حضور ملک معظم کی تشریف آوری میں ڈیڑھ گھنٹہ ہے حاضرین اطمینان سے بیٹھے رہیں۔ دوسرا اعلان ایک گھنٹے بعد ہوا اور تیسرا پاؤ گھنٹے بعد۔ آخری اعلان میں بتایا گیا کہ جب حضور ملک معظم تشریف لائیں گے تو قومی ترانے سے استقبال کیا جائیگا۔ اُس وقت تمام حضرات مودب کھڑے ہو جائیں اور جب تک جہاں پناہ شاہی شامیانے میں پہنچ کر آرام نہ فرمالیں سب اسی طرح کھڑے رہیں۔

حضور ملک معظم کی سواری باغ کے دروازے پر پہنچی تو سفرائے دول و وزرائے سلطنت نے استقبال کیا۔ جب تمام عمائدین آداب بجا لا چکے تو مس ہیلن کیلر مشہور اندھی اور گونگی خاتون کو جو امریکہ سے جاپان کے اندھوں کی معاونت کے لئے آئی ہوئی تھیں بارگاہ خسروی میں پیش کیا گیا۔ شہنشاہ جاپان نے براہ خسروانہ مس موصوف کو شرف باریابی عطا فرمایا۔ یہاں سے شاہی جلوس مرتب ہوا۔ آگے آگے گرینڈ چیمبرلین ایڈمرل ہیاکوتاکے تھے۔ کوئی پندرہ قدم پیچھے ملک معظم فوجی وردی میں تشریف لائے۔ جہاں پناہ کے چار پانچ قدم پیچھے ملکہ معظمہ تشریف لائیں۔ آنحضور کے پیچھے خواص خاصہ اور شہزادگان و شہزادیاں والا تبار تھیں۔ سفرائے دول اور دیگر حضرات جو استقبال کے لئے حاضر ہوئے تھے عقب کے راستے سے اپنے اپنے احاطوں میں شہنشاہ کی آمد کے قبل پہنچ گئے تھے۔ جملہ حاضرین پہلے ہی سے سڑک کے دونوں جانب قطار در قطار کھڑے تھے۔ قومی ترانے کے سُروں میں ملک معظم و ملکہ معظمہ خراماں خراماں تشریف لائے۔ جملہ حاضرین مورتیاں بنا ہے کھڑے تھے۔ سب نے گردن کو خم دے دے کر سلام کیا۔ فوجی اور بحری عہدیدار سیلیوٹ کی حالت میں کھڑے تھے۔ ملک معظم بھی ان کے جواب میں فوجی سلام کرتے تھے۔ ملکہ معظمہ دونوں جانب گردن کو خم کرتی مسکراتی ہوئی گزر گئیں۔ اس پارٹی میں شہنشاہ و ملکہ معظمہ کو جس طرح دو بدو دیکھا اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھا تھا۔ سڑکوں پر جب کبھی شاہی سواری گزرتی ہے تو جاپانی سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے ہیں بادشاہ کی طرف دیکھنے کی کبھی جرأت نہیں کرتے۔ یہاں وہ بات نہ تھی۔ لوگ نظر بچا کر دیکھ رہے تھے۔

ملکہ معظمہ انگوری رنگ کا آفٹرنون گون زیب تن فرمائے ہوئے تھیں جو بے انتہا پھب رہا تھا۔ تمام شہزادیاں ضابطہ کے مغربی لباس میں ملبوس تھیں۔ عام جاپانی خواتین ضابطے کا کمونو پہنے ہوئے تھیں جو عموماً سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں فاختائی یا دیگر رنگ کے کمونو بھی نظر آئے مگر خال خال۔ مردوں کا لباس تو سیاہ تھا ہی۔ عورتوں کے لباس پر بھی سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ ادبیاں بڑی خوبصورت وضع دار بندھی ہوئی تھیں۔ رنگینی صرف مغربی خواتین کے لباس میں نظر آتی تھی۔ مسز برلاس ساڑھی میں ملبوس تھیں جو جاپانیوں کی نظریں اپنی جانب کھینچ رہی

تھیں۔ مرد درباری لباس یعنی مارننگ سوٹ میں تھے اور سر پر سلک ہیٹ تھی۔

لباس کے بارے میں بعض مغربی خواتین نے بڑی بدتمیزی کا اظہار کیا۔ بجائے سہ پہر کے مقررہ لباس کے معمولی کپڑے پہن آئیں جن میں وہ بازار آتی جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض مغربی مردوں نے بڑا گستاخانہ رویہ اختیار کیا۔ کسی جلسے میں ملک معظم تشریف فرما ہوں تو درباری ضوابط کے بموجب کوئی شخص درباری لباس پر اوور کوٹ نہیں پہن سکتا۔ مگر یہ صاحبان برابر لبادہ پہنے رہے۔ انہی مغربی خواتین اور مردوں کی بدتمیزی پر محکمہ محلات شاہی کو اعلان کرنا پڑا ہے کہ آیندہ مغربی حضرات کو رقعات بھیجنے میں احتیاط برتی جائے گی۔

ملک معظم کے شاہی شامیانے میں رونق افروز ہونے پر لوگوں کو کھانے پینے کی سوجھی۔ ہر احاطہ میں میزیں آراستہ تھیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان کی تعداد کے مطابق کھانے پینے کا سامان چنا ہوا تھا۔ میزوں پر غلاف پڑے ہوئے تھے جو شہنشاہ کی آمد سے کچھ پہلے ملازمین نے اتار دئے تھے۔ کھانے کے لئے سینڈوچ، کیک اور بسکٹ تھے۔ پینے کے لئے ساکے، بیر، پورٹ وائن، لیمونیڈ اور چائے تھی۔ ہر ایک کے آگے ایک بکس میں شاہی تحفہ بند دھرا رکھا تھا جسے گھر لے جانے کی اجازت تھی۔ اس میں کچھ کیک تھے۔ لوگ اسے بڑے شوق سے لے جاتے ہیں اور اعزا و احباب میں ٹکڑا ٹکڑا سوغات کے طور پر تقسیم کرتے ہیں۔ وہ اسے سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔

ابھی چار بجنے میں پانچ منٹ تھے کہ حضور ملک معظم و ملکہ معظمہ درباری امرا کی معیت میں پارٹی سے رخصت ہو کر باغ میں داخل ہوگئے اور دوسرے دروازے سے سواری محل کو روانہ ہوگئی۔ بادشاہ سلامت کی روانگی کے وقت بھی کمیگایو بجایا گیا اور جملہ حاضرین مودب کھڑے ہوگئے۔ شاہی سواری کے رخصت ہونے پر مہمان بھی اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہوئے۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ عمائدین ملک کے اس مجمع میں سے بمشکل پانچ فیصدی ٹیکسیوں میں گئے ہونگے ورنہ باقی سب ریلوں ٹریموں اور بسوں میں چلے گئے۔

آخر میں کیمیگایو کا مختصر حال بے محل نہ ہوگا۔ انیسویں صدی کے آخر تک سلطنت جاپان کا کوئی قومی ترانہ مقرر نہ ہوا تھا۔ اسی زمانے میں مسٹر ایکرٹ ایک جرمن ماہر موسیقی جاپان میں مقیم تھا۔ اس نے یہاں کے بعض مدارس میں اور بعض پلٹنوں میں فوجی بینڈ جاری کیا تھا۔ وزارت محکمہ بحر نے اس سے خواہش کی کہ جاپان کا قومی ترانہ مرتب کر دے۔ چنانچہ اس نے پرانی نظموں میں سے ایک نظم انتخاب کی جو کسی شاعر نے ایک ہزار برس پہلے کہی تھی۔ اس کے لئے مغربی موسیقی بنائی یعنی راگ اور سُر تجویز کئے۔ اس طرح جاپان کا قومی ترانہ ظہور میں آیا۔ یہ اُن ترانوں میں شمار ہوتا ہے جو اقوام عالم کے قومی ترانوں میں نہایت موثر مانے جاتے ہیں۔ اس کا لفظی ترجمہ مشکل ہے شاعر بادشاہ سے مخاطب ہو کر یوں دعا کرتا ہے:۔

"تیری سلطنت تا ابد قائم رہے یہاں تک کہ کنکر بڑھ کر چٹان بن جائے اور اُس پر کائی جم کر بڑھتی ہو جائے۔"

نور الحسن برلاس!

ایک حسینہ سے

(اُس کی شادی کے بعد)

وہ ترے جذبات کی آتش فشانی کیا ہوئی
جس سے دُنیا کانپتی تھی وہ جوانی کیا ہوئی

کیوں نہیں ہونٹوں پہ تیرے اب وہ طوفانِ نشاط
وہ تبسّم کیا ہوا وہ گُل فشانی کیا ہوئی

کیوں نظر آتا ہے اب تیرا تبسّم سوگوار
وہ فضائے دل، وہ صبحِ شادمانی کیا ہوئی

اب تری باتیں ہیں گویا فلسفہ کے مسئلے
وہ تکلّم کیا ہوا، رنگیں بیانی کیا ہوئی

اب کہاں ہیں وہ تری آنکھوں کے ڈورے سُرخ سُرخ
جذبۂ معصوم کی وہ ترجمانی کیا ہوئی

اب ترے دل کا سفینہ ہر طرح پابند ہے
بحرِ آزادی میں موجوں کی روانی کیا ہوئی

کیا ہوئیں وہ تیری طوفانی اُمنگیں کیا ہوئیں
زندگانی کیا ہوئی، وہ نوجوانی کیا ہوئی

ہیں ترے جذبات کیوں پھول مرجھائے ہوئے
غنچہ ہائے ناشگفتہ کی کہانی کیا ہوئی

یاد ہو گا تجھ کو میرا شعر[1] تھا وردِ زباں
کیا ہوئی ظالم مری رنگیں نشانی کیا ہوئی

چھین لی کس نے ترے عارض کی سُرخی چھین لی
چار دن میں تیرے پھولوں کی رنگت کیا ہوئی

ہے نظر میں آج تک پھولوں کی ڈالی کا سماں
چال کی شوخی، تبسّم کی صباحت کیا ہوئی

یہ زمانہ اور یہ سنجیدگی کی قید و بند!
کیا ہوئی وہ مسکرا دینے کی عادت کیا ہوئی

گفتگو بھی ہو گئی سی، ہر قدم پر احتیاط
وہ شرارت کیا ہوئی، بیباک جرأت کیا ہوئی

کیوں تری باتوں میں وہ پہلی سی دلچسپی نہیں
وہ طبیعت کیا ہوئی، آزاد فطرت کیا ہوئی

لُوٹ لیں کس نے مسرت کی بہاریں لُوٹ لیں
شامِ عشرت کیا ہوئی، صبحِ مسرت کیا ہوئی

آرزو کی سادگی، دل کی لطافت کیا ہوئی
وہ مقدس اور وہ معصوم اُلفت کیا ہوئی

ماہر القادری

---

[1] تمنا پاک، دل معصوم، فطرت کسقدر سادہ — محبت سادگی ہی سادگی معلوم ہوتی ہے (ماہر)

عورت کی غلامی

حقوقِ نسواں اور آزادیِ نسواں کا شور تقریباً نصف صدی سے بہت بلند ہو رہا ہے، اگرچہ نفس موضوع سے سبکو اتفاق ہے مگر صحیح راہ عمل معدوم، اِس دورِ جدید میں بھی بہت سے تعلیمیافتہ حضرات ایسے موجود ہیں جنہوں نے باوجود روشن خیالی اور تہذیبِ جدید کے پُرزور دعووں کے عورت کو غلامی کی قید و بند میں اس طرح جکڑ بند کر رکھا ہے کہ اُن کی انسانیت کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے۔

بعض حضرات بہ زعم باطل عورت کو مظلوم اور بے دست و پا خیال کر کے اُسے بے پردہ سینما، تھیٹر، کلب اور پارٹیوں میں لیجانے، ڈانس کرانے، نئے نئے فیشن سکھانے اور طرز معاشرت میں یورپ کی تقلیدہی کو اُس کے حقوق کی روائی سمجھتے ہیں، حالانکہ اُسکے حقوق اور آزادی کا راز گھر کی عملی زندگی، حسن معاشرت اور بہتر سلوک میں مضمر ہے۔

آج کل کے مغرب زدہ نوجوان جو یورپ کی ہر رسم و وضع کی کورانہ تقلید کو اپنا دین و ایمان سمجھکر ہندوستان بلکہ تمام مشرق کو اُس کی قدیم معاشرت سے جس کو یہ اپنی جہالت سے "جہالت" سمجھ رہے ہیں، نجات دلانے کے مضحکہ خیز وہم میں مُبتلا ہیں، لفظ "آزادی" کے بولنے اور لکھنے سے تو واقف ہو گئے ہیں مگر اُس کے حقیقی مفہوم سے بالکل ناآشنا ہیں، ان حضرات کے خیال فاسد میں مغربی سوسائٹی کی چند اصطلاحات کا رٹ لینا اور سماج کے چند سطحی طریقوں کو نہایت جدوجہد سے ہر موقع پر نمایاں کرتے رہنا ہی تمدنی اور معاشرتی ترقی کی معراج ہے حالانکہ ان تہیدستان علم و عمل کا سوٹ جس قدر خوشرنگ اور شوز جتنا چمکیلا ہے افسوس کہ اسی قدر اُن کی فکر و عمل پاک صاف نہیں، انہوں نے یورپ کو دیکھا ہے مگر پڑھا نہیں اور نہ غور کیا ہے، پڑھنے اور سمجھنے کے لئے ایسے دماغ کی ضرورت ہے جو صحیح نتائج اخذ کر سکتا ہو نہ کہ اُن آنکھوں کی جو لندن کی شاہراہوں کی سحرانگیں چہل پہل۔ بازاروں کی نظر فریب زیب و زینت، ہائیڈ پارک کی دلفریبیوں، پکاڈلی کی عیش پرستیوں اور رقص گاہوں کی چکاچوند کرنے والی حسین روشنیوں اور عُریانیوں میں کھو جاتی ہوں۔

یورپ میں ایک دَورِ جہالت کی تاریکی کا گزرا ہے جس کو تاریخ میں تاریک صدیوں سے یاد کیا جاتا ہے، عورت کا وجود آدم کے گُناہ کا پھل سمجھا جاتا تھا، یورپ نے اپنے موسائی اور عیسائی دور میں عورت کو بڑی شدید غلامی کی حالت میں رکھا تھا، عیسائیت نے عورت کے وجود کو ایک مستقل وجود تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ دینِ مسیح کے پرستاروں کا عقیدہ یہ تھا کہ عورت کے جسم میں وہ روح ہی نہیں ہے جو مرد کے اندر ہے، قانون اس کے وجود شخصی کو تسلیم نہیں کرتا، وہ کوئی جائیداد اپنے نام سے الگ نہیں رکھ سکتی اور نہ کوئی معاملہ شوہر کی موجودگی میں اپنے نام سے کر سکتی ہے۔

گزشتہ تین چار صدیوں میں یورپ میں تمدنی و اجتماعی انقلاب ہوا، عیسائیت کے ان غیر فطری قیود و شدائد سے تعلیم نے نجات دلائی۔ اب عورت کی حالت پر توجہ ہونے لگی اور رفتہ رفتہ اس کے احترام کا اعتقاد راسخ ہوا، تاہم اُس کی گردن میں اب بھی غلامی کے بہت سے طوق باقی ہیں، یہ اور بات ہے کہ اس کی حسین گردن میں انہیں سنہری اور مرصع زیور بنا کر خوشنما بنا دیا گیا ہو۔

مشتے نمونہ از خروارے اس "محترم جنس" کی غلامی کا ایک نفرت انگیز طوق یہ بھی ہے کہ باوجود آزادیٔ نسواں کے سینکڑوں دعووں کے سوسائٹی اس کو یہ حق دینے سے انکار کرتی ہے کہ وہ اپنا نام ظاہر کرے، جبتک وہ لڑکی ہے اس کا وجود باپ کے نام کا حامل ہے اور عورت ہوکر شوہر کے نام کا تابع، گویا اُس کا علیحدہ اور مستقل وجود ہی نہیں، وہ مرد کی موجودگی میں کوئی قابل اعتنا ہستی نہیں تصور کی جاتی۔

یورپ عورت کو اُس کے فطری حقوق ابتک نہ دے سکا، اسلام دُنیا میں آیا کہ ہر طرح کی ذہنی، خیالی اور جسمانی غلامی کو مٹائے، عورت کی غلامی بھی ایک بہت بڑی غلامی تھی، اس نے عورت کے وجود کو ایک مستقل وجود تسلیم کیا اور مرد و عورت کے حقوق کو بحسن و خوبی واضح کر دیا۔

اسلام نے اس کو حق دیا کہ باپ اور شوہر سے علیحدہ اپنی شخصیت قائم کرے۔ وہ اپنی ملکیت اور جائیداد خالص اپنے نام سے رکھ سکتی اور اپنے نام سے ہر طرح کا قانونی معاملہ کر سکتی ہے۔ وہ یورپ کی عورت کی طرح نہ تو اپنے باپ کے نام سے موسوم ہوتی ہے اور نہ شوہر کے۔

یورپ نے عورت کو سوسائٹی میں بظاہر جو درجہ دیا ہے وہ اُس سے بہت گرا ہوا ہے جو اسلام نے اُس کو عطا کر رکھا ہے، مغرب نے خوش آئند لفظوں میں خوشامد کر کے اُس کی اصلی آزادی چھین لی ہے، وہ اپنی محترم اور نازک صنف کے ساتھ پیار کی بہت کچھ باتیں کرتا ہے، اُسکو محترم، لطیف اور نازک جنس کہتا ہے، اسکو اپنا "نصف بہتر" قرار دیتا ہے، اُسکی عزت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر اسکو اُس نے حقیقی آزادی کی آزادی کس حد تک دی ہے۔ اس آزادی کے متعلق اگر سوال کیا جائے تو وہ کچھ جواب نہیں دے سکتا۔

یورپ کی عورت حقیقت میں اپنے شوہر کی غلام ہے، وہ اپنی ملکیت کا حق کسی چیز پر بھی بحیثیت بیوی ہونے کے نہیں رکھتی، شریک زندگی تو کہلاتی ہے مگر زندگی کی ملکیت میں اُسکی کوئی حقیقی شرکت نہیں پائی جاتی، برخلاف اسکے مسلم عورت اپنے والدین، اپنے شوہر، اپنی اولاد اور بعض صورتوں میں اپنے دوسرے اقربا کی جائیداد میں بھی حصہ پاتی ہے، اپنے شوہر سے مہر کا مطالبہ کر سکتی ہے اس لئے اُسکو بہت زیادہ اقتصادی آزادی حاصل ہے۔

دُنیا میں اصلی آزادی اقتصادی آزادی ہے کہ انسان اپنی گزر بسر کا کوئی ذریعہ پیدا کرے، دوسرے جو کچھ حقوق اور مطالبات ہیں وہ اسکے تابع ہیں۔ اگر یہ آزادی انسان سے چھین لی جائے اور دُنیا بھر کے سارے حقوق دیدئے جائیں تو سب ہیچ ہیں، آخر وہ غلام کا غلام ہی رہیگا اسلئے کہ مفلس کا وجود "وجود" ہی نہیں ہو سکتا۔

ہمارے اکثر نئے تعلیم یافتہ حضرات مذہب و معاشرت میں آزادی کے بڑے دلدادہ ہیں اور جدوجہد کر رہے ہیں کہ خود کو آزاد خیال کہلوائیں، عورت کی آزادی اور حقوق کا بھی اس ضمن میں مطالبہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں نے عورت کو غلام بنا رکھا ہے۔ یہ محض یورپ کے بعض سطحی دلچسپ مناظر کی نقالی کا شوق اور اس کی ہر بات کی غلامانہ تقلید کا ولولہ ہے، اس میں کچھ بھی عقل و فہم کو مطلق دخل نہیں، یہ لوگ عورت کو نام نہاد آزادی دلانا چاہتے ہیں۔ آزادیٔ نسواں کا راگ یورپ سے سُن لیا ہے اور اس پر سر دُھن رہے ہیں۔ لیکن نہ تو اس کا مطلب سمجھا ہے اور نہ اس کے زیر و بم سے واقف ہوتے ہیں۔ بعض تقلید سے قوم نہیں بنتی، سب سے پہلے دماغ کو اندھی تقلید سے آزادی ملنی چاہیئے، پھر رسم و رواج کو، یہ لوگ صرف رسم و رواج کی اتباع سے قوم کو نجات دلانا چاہتے ہیں مگر انہوں نے اپنے دماغ کو یورپ کا غلام بنا رکھا ہے۔

حقوقِ نسواں پر زمانۂ دراز سے ایک ہنگامۂ زبان وقلم برپا ہے، اصلاح، ترقّی اور عمل سب کی زبانوں پر ہے، تعلیم کی ضرورت سب پر روشن ہے، تاہم جو جہالت اور غفلت میں گرفتار رہیں اُن کی سرشاری اور مدہوشی بدستور، جو مُبتلائے معصیت ہیں اُنکی جسارت وجُرأت اُسی طرح قائم، جو بدعملیوں اور مکروہاتِ دُنیا میں گھرے ہوئے ہیں اُنکی حالت بدتر سے بدتر، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم پر اخلاقی قوت ناپید ہے، کوئی قوت یا نظام ایسا نہیں جو ہمیں قول وفعل کی مطابقت پر مجبور کرے۔

اسوقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا نظام پیدا کیا جائے جو ہر حُسنِ عمل کا مظہر ہو اور ہر فعلِ بد کیلئے اپنے اندر ایک سخت معاشرتی اِحتساب رکھتا ہو، جب تک ہماری سماج ایک ایسا اخلاقی نظام پیدا نہ کرے اسوقت تک حقوقِ نسواں وآزادیِ نسواں کی چیخ پکار صدائے بے ہنگام ہے۔

ایک شخص جو اپنی نیک کردار، خوش خصال، معصوم رفیقِ حیات کے لئے خونخوار درندہ ہے، ایک ناعاقبت اندیش جو اپنے ذاتی فوائد اور مصلحت کی بنا پر اپنی بہنوں اور لڑکیوں کو غیر موزوں ازدواج کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا رہا ہے، ایک نفس پرست جو گھر سے باہر کی زندگی میں حسن وجمال کی نمائشی تصویریں دیکھکر آمادہ ہو گیا ہے کہ اپنی رفیقِ زندگی کی رفاقت سے کنارہ کش ہو جائے۔ ایک اندھا جُواری جو حصولِ دولت کے لالچ اور ہوس میں مُبتلا ہو کر اپنی شریکِ زندگی کے تن کا لباس تک جوئے کی نذر کر چکا ہے اور اب تیّار ہے کہ اُس کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہدے، اس کے نفسِ بد کو کیا مجبوری ہے کہ ایسا نہ کرے جبکہ سوسائٹی ہر حال میں اُس کی پذیرائی کیلئے آمادہ ہے اور اسکی اس طرح آؤ بھگت کر رہی ہے گویا کہ اُس نے کچھ کیا ہی نہیں۔

یہی حالت اُس عورت کی بھی ہے جو ایسے ہی افعالِ بے ہودہ اور حرکاتِ ناشائستہ میں مُبتلا ہے مگر کسی احتساب کی غیر موجودگی کی وجہ سے بالکل آزاد ہے کہ نام نہاد سوسائٹی کے سارے خرافات اور عیش پرستیوں میں جی کھول کر حصہ لے اگر کوئی اسکی نسائیت اور مشرقیت کا واسطہ دے کر اُس میں کچھ احساس پیدا کرانا چاہے تو اپنی پوری قوت سے ٹھکرا دے۔

عام طور پر عورت بیوفا مشہور ہے، حالانکہ اُس کی وفاشعاری کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُس نے سینکڑوں برس سے ایک وفادار کنیز کی طرح انواع واقسام کے مظالم سہے۔ — مگر کبھی اُس نے مردوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند نہیں کیا، اس کو ہم نے چڑیوں کی طرح پنجرے میں بند کر دیا، وہ خوش رہی، اس کو ہم نے تعلیم وتربیت سے بیگانہ اور جاہل رکھا، اُسنے کچھ نہیں کہا۔ اس کو ہم نے اپنے جذبات کی تکمیل کا ذلیل ترین ذریعہ بنایا، وہ خاموش رہی۔ اس کو ہم نے ہر قسم کی سزا دی بلکہ قتل تک کر دیا، اس کی زبان پر مہرِ خموشی لگی رہی۔ اُس کو ہم نے آگ میں جلنے کا حُکم دیا۔ وہ بغیر کسی عذر کے خوشی خوشی اپنے پتی کے ساتھ ستی ہو گئی۔ مگر اس رُوح فرسا فعل کے خلاف اُسنے کبھی آہ تک نہ کی۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ باوجود اس وفاشعاری اور اطاعت گزاری کے ہم اُسے بیوفا اور سرکش کہیں؟۔

انفرادی طور پر اگر عورت کی کچھ بیوفائی کی مثالیں ملیں گی بھی تو ان سے ساری "جنسِ لطیف" کیوں مطعون کی جائے، ذرا ہم خود اپنے ضمیر کو ٹٹول کر دیکھیں کہ ہم میں کس حد تک وفاداری کی صفت موجود ہے، ہم عورت کی وفاشعاری، جاں نثاری، اطاعت گزاری، فرماں برداری، ایثار اور اُس کی بے پایاں محبت کو صرف ایک قصور میں بھلا دیتے ہیں کہ اُس نے ہم کو اولاد نہیں دی۔ قصور بھی ایسا کہ جس پر کوئی قابو نہیں اور پھر سزا بھی ایسی دی جاتی کہ جس سے زیادہ تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت سزا عورت

کیلئے ہو نہیں سکتی، ہم فوراً دوسری رفیقۂ حیات سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں اور اُس بے قصور غریب کو ٹھکرا دیتے ہیں، لطف یہ کہ اُس کو طلاق بھی نہیں دیتے۔ اگر دیں بھی تو کس کام کی جبکہ وہ رسم و رواج کے قیود میں پھنسکر مرد کی طرح دوسرے کو اپنا شریکِ زندگی بنانے کے لئے آزاد نہیں!۔

جس طرح بچوں کو کھلونے دیکر بہلاتے ہیں اسی طرح مرد نے عورت کو زیور دیکر بہلا رکھا ہے، سب سے پہلے عورت کو کانوں میں زیور پہنایا گیا اور یہی زیور غلاموں کو بھی پہنایا جاتا تھا، چنانچہ فارسی میں "حلقہ بگوش شدن" کے معنی ہیں غلام یا کنیز ہونا، بیلوں کی طرح نتھنوں میں سوراخ کر کے ایک بڑا سا حلقہ "نتھ" کے نام سے ڈال دیا گیا، غلاموں کی طرح گلوں میں "طوق" پہنائے گئے، مجرموں کی طرح ہاتھوں میں "ہتکڑیاں" ڈالی گئیں، قیدیوں کی طرح پاؤں میں "بیڑیاں" پہنائی گئیں، اور بھولی بھالی سادہ لوح عورت سے کہا گیا کہ یہ "زیور" ہیں جو اُس کے حسن میں چار چاند لگائیں گے، عورت مجسمۂ حُسن ہے اُس کو کسی زیور کی ضرورت نہیں۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی!

اگر تھوڑی دیر کیلئے ہم اس زیور کو عورت کی زیب و زینت مان بھی لیں تو یہ آرائش و زیبائش کس کے لئے تھی؟ یہ بھی مرد کیلئے! ورنہ اس میں عورت کو کیا فائدہ تھا!! ستم ظریفی تو یہ کہ یہ زیور بھی عورت کی ملکیت نہیں سمجھے جاتے، جب تک چاہا پہنایا اور جب چاہا ٹکے لگا دیا، یا چھین کر کسی اور کو دیدیا۔

ہر عورت کی فطرت میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو قدرت کی طرف سے اُسکو عطا ہوئی ہیں یا اُس کے اسلاف سے اُس کو ورثہ میں ملی ہیں، لیکن اُسے جاہل رکھنے، اس میں نیک و بد کا امتیاز پیدا نہ کرانے، اُس کی دماغی قوتوں کو صحیح تعلیم و تربیت سے بیگانہ رکھکر اُبھرنے نہ دینے اور اُس کو اُس کے حقوق سے محروم رکھنے کی وجہ سے ہم اُس کی سیرت کو رفتہ رفتہ مسخ کر رہے ہیں، ہم کو چاہیئے کہ ان سینکڑوں معاشرتی مصائب سے جو جدید تعلیم و تہذیب کی برکت سے اس پر مسلط ہو رہے ہیں، اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ مغرب کی اس نام نہاد آزادی کے خلاف ہمکو پُر زور احتجاج کرنا چاہیئے جو عورت کی "نسائیت" کو پارہ پارہ کر رہی ہے، مغربی تہذیب تمدن کی اندھی تقلید کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی شدید ضرورت ہے جو مشرقی قوام کے حق میں تباہی اور بربادی کے سوا اپنے وسیع دامن میں کچھ نہیں رکھتا۔

عورت میں جو نقائص ہیں اُن کا اگر ہم تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں فطرت کو بہت کم دخل ہے، عورت کی ہمہ نوع کمزوریوں کا سبب اس کو بیجا طور پر قید و بند میں رکھنا ہے ورنہ ہم کبھی اس کو اس درجہ مریض، نحیف اور فطری فرائض کی صحیح انجام دہی میں اس قدر ناکارہ نہیں پاتے۔

کسی قوم کی ترقی اور اصلاح کی بُنیاد غلط تقلید اور عمل نقالی پر نہیں ہے بلکہ صحیح تعلیم اور صحیح عمل پر ہے، ہماری سماج میں اتنی قوت پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر تعلیم صحیح اُصول پر ہو اور اچھی نظیر پیش کرے اور ہر دعویٰ صحیح عمل کے بعد کیا جائے، جبتک کوئی ایسا ذہنی انقلاب نہ ہو اس وقت تک "آزادیِ نسواں" کے عنوان پر دھواں دھار تقریروں یا ہنگامہ خیز مباحث سے قابل اطمینان نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتے۔

میرزا سیف علی خان

عشق اور موت

دریا اُمڈ پڑے، تو سیہ آندھیاں اُٹھیں … کالی گھٹائیں کہتی ہوئی "الاماں" اٹھیں
کہسار کپکپا اُٹھے، گلشن لرز گئے … کچھ یوں اُفق پہ شام کے سائے نمو ہوئے
صحرا سے اُٹھا، ٹھوکریں کھاتا ہوا غبار … ندی کی موج موج تھی، اک جوئے انتشار
کچھ ایسے بڑھتی آتی تھیں، تاریکیاں مگر … سو جانے کو تھے، گویا زمانے کے شور و شر
یہ خامشی خواب نہ ٹوٹے گی، پھر کبھی … کہتی تھی، ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی

۲

چکرا رہی تھی، دورِ عناصر میں کائنات … ہر ذرّے میں تھی، نور فشاں نزع کی حیات
کچھ مُردنی سی آتی گئی، لالہ زار پر … جلوے بھی زرد ہوتے گئے کوہسار پر
ہر گوشۂ نشاط میں ہنگامے چُپ ہوئے … صدیاں ہوئیں۔ کہ سوئے تھے۔ کچھ ایسے سو گئے
قلب و نظر کی گرمیاں افسردہ ہو گئیں … گلنار جلوہ زائیاں پژمردہ ہو گئیں
تاریکیوں میں موت کے کوندے چھلک پڑے … خونیں اُفق میں بجلیوں کے خُم چھلک پڑے

۳

ہنگامے تھے، خموش فضا زرد زرد تھی … میرے نفس کی آگ بھی کچھ سرد سرد تھی
اینٹھی ہوئی زبان تھی، جذبات مُردہ تھے … دُنیا میں زندگی کے نشانات مُردہ تھے
کچھ بھی نہ دیکھ سکتی تھیں آنکھیں کُھلی ہوئی … جھوکا نہ مار سکتی تھیں، باہیں تُلی ہوئی
گیسوئے حُسنِ زرد میں اُلجھا ہوا تھا، دل … بے موت اب بھی حُسن کو سمجھا ہوا تھا دل

تکمیل جذبِ عشق سے دل ہو گیا تھا "عشق!"
یعنی فنا کے خوف و خطر کھو گیا تھا، عشق

[illegible]

افسانہ نگاری

جو مفہوم لفظ "افسانہ" کا ہماری زبان میں ہے قریب قریب وہی مفہوم انگریزی میں (SHORT STORY) کا ہے۔ اس کی پیدائش انجیل سے شروع ہوتی ہے اور افسانہ کے تمام صفات انجیل کے چھوٹے چھوٹے قصائص میں نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس صنف ادب نے امتیازی ترقی نہیں کی، صرف وسطی زمانے میں چاسر نے چند قصے نظم میں ترتیب دئے تھے۔ جن میں افسانوی خصوصیات کافی طور پر نمایاں ہیں۔ انگلینڈ میں ۱۸۳۰ - ۱۶۶۰ تک کافی قصے لکھے گئے لیکن بہت طویل، جن کی وسعت افسانہ کے تنگ میدان میں نہیں آسکتی، کیونکہ افسانہ میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختصر ہو۔

موجودہ افسانہ نگاری کی ابتدا انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے، لیکن عوام نے اس طرف خاص توجہ نہ کی اس لئے ممتاز ادیبوں نے بھی افسانہ نگاری میں دلچسپی نہیں لی۔ اس طرز میں جس نے سب سے پہلے کافی شہرت حاصل کی وہ امریکہ کے دو مشہور ادیب ایڈگر ایلن پو اور ہاتھورن تھے۔ پو پہلا ادیب تھا جس نے ۱۸۴۲ میں افسانہ نویسی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس میں "واحد اثر" ہونا چاہیے۔ ان کے بعد برٹ ہارٹ، او ہنری اور ہنری جیمس وغیرہ ممتاز امریکن ادیب تھے جنہوں نے اس صنف میں کافی شہرت حاصل کی۔ ان لوگوں کے کارناموں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے زندگی اور اپنے ماحول کا کافی مطالعہ کیا تھا گو کہ زندگی کا مرقع پیش کرنے میں ان لوگوں نے مختلف طرز اختیار کئے لیکن ان کا نصب العین ہمیشہ "انسان" اور "زندگی" ہی رہا۔

اسی دور میں فرانس کے ادیبوں نے بھی کافی شہرت حاصل کی۔ میریمی اور بالزک جنہیں انسانی جذبات کی تصویر کھینچنے میں ید طولیٰ حاصل تھا قابل ذکر ہیں۔ فرانسیسی افسانہ نگاروں میں صداقت کی جھلک بہت کم تھی۔ اور روزانہ زندگی کے واقعات سے دور ہٹ کر زندگی کا مرقع مبہم طریقے پر پیش کرتے رہے۔ لیکن ۱۸۵۰ کے بعد جب روسی ادب کا فرانسیسی ادیبوں پر اثر پڑا تو ان لوگوں نے بھی فطرت کے مطابق لکھنا شروع کیا اور صداقت کا نمایاں پہلو اختیار کیا جس کی نظیر وودے اور گے دی موپساں کے کارناموں سے دی جاسکتی ہے۔ ان لوگوں نے جس صداقت اور نیچرل طور پر افسانہ نگاری کو پیش کیا ہے سارے یورپ کے لئے نمونہ بن گیا۔

انگلینڈ میں سب سے پہلا اور ممتاز افسانہ نگار آر۔ ایل۔ اسٹیونسن تھا۔ اس کے بعد روڈیرڈ کپلنگ نے کافی شہرت حاصل کی۔ اسٹیونسن مختصر پسند تھا۔ اس کے افسانے اخلاقی شان اور واحد اثر کی سچی تصویریں ہیں۔ کپلنگ کے قصوں میں مقامی رنگ کی جھلک زیادہ ہے اور اکثر مبالغہ کے خوبصورت ایوان میں ٹہلتا نظر آتا ہے لیکن صداقت کا دامن ہمیشہ پکڑے رہتا ہے۔ اس کے فقرے بہت ہی خوبصورت اور موضوع ہوا کرتے ہیں۔ ان ادیبوں کے پیرو کار انگلینڈ میں کافی پیدا ہو گئے جن میں ہارڈی، ایچ۔ جی۔ ویلس۔ گالس ورذی۔ والٹر ڈیلامیر۔ اے۔ ای۔ ڈبلیو میسن۔ جان بوچن اور جے۔ ڈین وغیرہ نے جدید افسانہ نگاروں میں کافی شہرت حاصل کی۔ ان ممتاز ادیبوں کے افسانوں میں جو خاص خصوصیات ہیں وہ یہ ہے کہ ان کے پلاٹ میں مطابقت اور سادگی ہوتی ہے، واحد قصہ اور واحد اثر ہوتا ہے۔ مکالمہ طبعی اور سادہ ہوتا ہے۔ یہی ان کا طرز خاص ہے جس نے ان کو دوامی شہرت بخشی۔

عہد حاضرہ میں افسانہ نگاری ایک خاص فن قرار دیا گیا ہے۔ اس کے خاص اصول اور طرز مقرر کئے گئے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کے ذریعے یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ ایک ادیب اچھے افسانے کس طرح لکھ سکتا ہے لیکن یہ ضرور متعین کیا جاسکتا ہے کہ ایک افسانہ کے لئے کون سے اجزا ضروری کہے جاسکتے ہیں۔

(۱) تاثیر میں ہم آہنگی۔ موجودہ افسانہ نگاری میں یہ ضروری ہے کہ افسانہ نگار ہمیشہ اس بات کی کوشش کرے کہ قارئین کے دل پر واحد اثر پڑے۔ جب افسانہ نگار ایک واقعہ یا کسی طبقے یا کسی کی زندگی سے متاثر ہوتا ہے تو وہ اس کا گہرا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے افسانے کا خمیر تیار کرتا ہے۔ اس لئے اس پر لازم ہے کہ اپنا افسانہ اس انداز سے بیان کرتا جائے کہ جو اثر اس نے خود لیا ہے وہی اثر اس کے پڑھنے والے پر پڑے۔ اگر پڑھنے والے پر مختلف اثر کام کریں گے تو ایسے قصوں کو افسانہ کے دائرے سے خارج کرنا پڑے گا۔ پوؔ پہلا افسانہ نگار تھا جس نے اس بات پر زور دیا تھا کہ افسانے میں "بے نظیر یا واحد اثر ہونا چاہیئے"۔

(۲) واقعات اور پلاٹ۔ افسانہ نگار کو چاہیئے کہ ہمیشہ ایک واقعہ کو اٹھائے اور اسے صداقت کے ساتھ بیان کرتا چلا جائے۔ اگر وہ مختلف واقعات کی مدد سے جوڑ پیوند لگا کر اپنا افسانہ تیار کرتا ہے تو پہلی خصوصیت یعنی "تاثیر میں ہم آہنگی" کھو بیٹھے گا۔ افسانہ میں مختلف واقعات سے اسلئے پرہیز کیا جاتا ہے کہ اسکی دنیا محدود ہوتی ہے۔ ایک افسانہ نویس اپنے اسباب کو جتنا مختصر کریگا اس کا افسانہ اتنا ہی خوبصورت اور کامیاب رہیگا۔

پلاٹ میں تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) تمہید۔ (۲) منتہا، عروج یا تدریج۔ (۳) موثر خاتمہ ــــ تمہید بہت ہی صاف یا مختصر دیباچہ کے ساتھ شروع کرنی چاہیئے۔ منتہا کے دائرے میں بہت ہی ڈراماتی طور پر داخل ہونا چاہیئے۔ یعنی واقعات اور ہیرو کو اس دھوم دھام اور شوکت سے پہلو بہ پہلو دکھاتا جائے کہ کوئی واقعہ ہیرو کی فطرت کے خلاف نہ ہو۔ افسانہ کو کبھی طول نہیں دینا چاہیئے اس لئے بہت سی چیزوں کو چھوڑ دینا پڑتا ہے اور اس موقع پر یہ امر ضروری ہے کہ پڑھنے والے کی قوت متخیلہ پر زور پڑے تاکہ وہ اپنی تخیل کی مدد سے افسانہ کا تسلسل اور چند واقعات جو افسانہ نویس نے چھوڑ دئے ہیں قائم رکھے۔

خاتمہ عام طور پر حزنیہ یا طربیہ ہوا کرتا ہے اکثر افسانہ نگار خاتمہ کو قارئین پر چھوڑ دیتا ہے کہ اس کا نتیجہ وہ خود خیال لے۔ غیر یقینی اپنا طرز ہے۔ خاتمہ ہمیشہ مؤثر ہونا چاہیئے کیونکہ یہ وقت ہیرو اور افسانہ کو الوداع کہنے کا ہوتا ہے اس لئے جدائی کے وقت افسانہ نگار کو چاہیئے کہ پڑھنے والے پر ایسا اثر ڈالے کہ اسکے افسانہ کی وقعت اور عزت اسکے دل میں قائم رہے۔

(۳) کردار۔ افسانہ نگار کو لازم ہے کہ وہ جتنے لوگوں کو اپنے افسانہ میں جگہ دے صرف ایک یا دو کو امتیازی خصوصیت بخشے اگر وہ زیادہ لوگوں کو مخصوص کریگا تو اس کے افسانہ کا اثر تقسیم ہوجائے گا اور اس کے ہیرو وغیرہ افسانے کی کوئی وقعت یا دلچسپی پڑھنے والوں کی نظروں میں نہ رہیگی۔

اگر افسانہ نگار یہ چاہتا ہے کہ اس کے کردار ہمیشہ دلچسپ اور مؤثر رہیں تو اس کو چاہیئے کہ اس کا کیریکٹر ہمیشہ ہماری روزمرہ زندگی کی اصلی تصویر ہو اگر اس کی فطرت ہماری زندگی سے خلاف ہوگی تو یقیناً ناکامیاب رہیگا۔ اور واقعات کو اس طرح دینا چاہیئے کہ اسی کے کہنا سے معلوم ہوں۔ اگر کیریکٹر ہر کام پر اپنی قسمت کے بھروسے پر چھوڑ دیتا ہے تو وہ کبھی کامیاب

[illegible] میں کوئی دلچسپی پیدا کر سکتا ہے۔ کیونکہ ہم کو تو یہ دیکھنا ہو کہ ایک انسان مصیبت یا خوشی میں اپنے
کو کس رنگ میں [illegible] ہے اور اس مصیبت یا خوشی میں کون کون سی تدبیریں کرتا ہو کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

مکالمہ اور طرزِ تحریر: افسانہ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت اور کامیابی اس کے اسلوبِ بیان میں پنہاں ہوتی ہے۔ ہر کا مکالمہ طرزِ تحریر جتنا بھی پختہ ہوگا اتنا ہی وہ افسانہ نگاری میں کامیاب رہے گا۔ افسانے کا مکالمہ ہمیشہ نیچرل (فطری) ہونا چاہیئے۔ اس کو ہمیشہ ہمارے روزمرہ کے موافق ہونا ضروری ہے اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھے کہ جس حیثیت کا کیریکٹر ہو ویسا ہی اس کا مکالمہ ہو۔ آقا اور غلام کی گفتگو میں ہمیشہ فرق ہونا چاہیئے۔ اگر دونوں کی زبان سے ایک ہی قسم کے الفاظ نکلیں گے تو یقیناً کانوں کو برا معلوم ہوگا۔ اگر ہر کیریکٹر ایک ہی قسم کی گفتگو کرنے لگے تو صداقت میں فرق آجانے کا خطرہ رہتا ہے۔

جہاں تک طرزِ تحریر کا تعلق ہے عبارت سادہ اور دلکش ہونی چاہیئے، الفاظ میں موزونیت اور فقروں میں سیقیت ہو۔ مبہم اور غیر مانوس الفاظ کی جگہ کار آمد اور معنی خیز الفاظ استعمال کرنا چاہیئے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ افسانہ اور دوسری کہانیوں میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب کافی مشکل ہے اور جدید افسانہ نگاری کو دیگر قصوں سے علیحدہ کرنا بہت دشوار ہے۔ لفظ "قصہ" یا "کہانی" کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان کی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں فرق بتانا بہت ہی نازک ہے تاہم جدید افسانہ اور دیگر قصوں میں جو امتیازی فرق ہیں ان سے ہمیں تھوڑی سی تسلی ہو سکتی ہے۔ قصے میں حسبِ ذیل اقسام شامل کیجا سکتی ہیں۔ روایت، حکایت، چٹکلا، داستان، بیان، مسودہ یا خاکہ، کہانی، تمثیل، ناول، وغیرہ۔

جدید افسانے عام طور پر ڈرامائی ہوتے ہیں اور پڑھنے والے پر ایک خاص اثر طاری کرتے ہیں لیکن حکایت، روایت، چٹکلے، مسودے اور کہانیوں کے لئے ڈرامائی ہونا یا واحد اثر پیدا کرنا کام نہیں ہے۔

جدید افسانہ اور ناول کا تعلق بہت گہرا ہے اور اکثر کا یہ خیال ہو کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں لیکن یہ صحیح نہیں جہاں تک واقعات، پلاٹ، کیریکٹر، مکالمہ اور ماحول کا تعلق ہے ان میں کوئی فرق نہیں۔ ان دونوں میں امتیازی فرق یہ ہے کہ افسانہ میں صرف ایک واقعہ یا قصہ ہوتا ہے، کیریکٹر بہت کم ہوتے ہیں اور واحد اثر پیدا کرتا ہے برخلاف اس کے ناول میں [illegible] قصے اور کیریکٹر ہوتے ہیں۔ اس کا زمانہ طویل ہوتا ہے اور غیر ضروری الفاظ زیادہ استعمال ہوتے ہیں [illegible] چھوڑا جاتا۔ بیرل پین نے بہت صحیح کہا تھا کہ "ناول ہم کو تسکین اور آسودگی بخشتی ہے [illegible] پیدا کرتا ہے" ناول نگاری میں کیریکٹر کے ہر پہلو پر کافی روشنی پہنچائی جاتی ہے کیونکہ [illegible] ہے۔

[illegible] ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ ایک افسانہ نگار کے کون کون سے فرائض [illegible] سب سے پہلی چیز جو اس کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کا [illegible] واقفیت کے سوسائٹی اور ماحول کی چھوٹی [illegible]

[illegible] اور اس کا جو اثر انسان کی زندگی پر پڑتا ہو اس کو ذہن نشین کرے۔ انسان کے اخلاق [illegible]
اور جس قسم کا انسان ہو اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرے۔

دوسری چیز جو ایک افسانہ نگار کے لئے ضروری ہو وہ "صداقت" ہے صداقت سے مطلب صرف یہی نہیں ہوا کرتا کہ کسی مسئلہ کو سائنٹفک طور پر حل کرے بلکہ اس کے واقعات نیچرل ہوں۔ بہت سے لوگوں کا یہ سوال ہوتا ہے کہ افسانہ بالکل تخیلی پیداوار ہے اس لئے اس میں صداقت کا نام تک نہیں رہتا لیکن یہ اصحاب "صداقت" کے دائرے کو محدود کر دیتے ہیں اور غلط فہمی کے شکار بن جاتے ہیں۔ افسانوی شاعری کے میدان میں صداقت کے معنی صرف یہی نہیں ہوا کرتے کہ کوئی سچا واقعہ بیان کیا جائے بلکہ ایسے واقعات بھی صادق مانے جا سکتے ہیں جو ہماری روزانہ زندگی میں پیش آ سکتے ہیں۔

فوائد افسانہ:۔ عوام کے نزدیک تو یہ ایک "دل بہلانے" کی چیز ہے اور چونکہ اس میں حسن کی تشریح عشق و محبت کی چھیڑ چھاڑ زیادہ رہتی ہے اس لئے ہمارے نوجوانوں کے لئے دلچسپی کا کافی سامان مہیا رہتا ہو لیکن ایک سچے افسانہ نگار کے نزدیک یہ چیزیں لغو ہیں۔ اس کا منشا کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ ہماری زندگی کے گہرے مطالعے کے بعد اس کے دل پر ایک اثر پیدا ہوتا ہے اور اس اثر کی ترجمانی افسانے کے ذریعہ کرتا ہو۔ وہ ہمکو ایک خوبصورت دنیا کی سیر کراتا ہو اور ہمیں بتاتا ہو کہ ہم بھی اپنی زندگی ایسی بنا لیں جس میں مسرت کا راز پنہاں ہے۔ وہ ہمارے اخلاق کو کاٹ چھانٹ کر درست کرنا چاہتا ہو ہمارے سخت دل کو نرم کرتا ہے ہمارے اندر محبت کے پاک جذبات پیدا کرتا ہے۔ وہ ہمکو ہمدردی اور رحم کی تعلیم دیتا ہو۔ وہ ہماری زندگی کے پنہاں راز کو منکشف کرتا ہے اور اپنے میٹھے نغموں سے ہمیں خوش کرتا ہے۔ ان سب کی تعلیم وہ اپنے افسانے کے ذریعہ ہم تک پہونچاتا ہے۔ زندگی کا بہترین نمونہ جو وہ تیار کرتا ہے اپنے کیریکٹر کے ذریعہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہو اس لئے ایک سچے افسانہ نگار کی وقعت ہماری سوسائٹی میں بہت زبردست ہو وہ ایسا معلم ہے جو ہم کو زندگی کے [illegible] سے آگاہ کرتا ہے۔

افسانہ اور معیارِ محبت:۔ اُردو افسانوں میں اکثر محبت اور حسن و عشق کے تذکرے عام طور پر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ جس سے بہت سے لوگ پریشان ہو گئے۔ افسانہ نگاروں پر [illegible] ہے کہ وہ محبت [illegible] ہمارے سامنے پیش کرے۔ محبت کا جو معیار اس کی نگاہوں میں ہے افسوس ہے کہ ہمارے نزدیک وہ [illegible] معیار [illegible] محبت ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان کیا حیوان سے بھی ہمدردی پیدا [illegible] محبت کی [illegible] ہمارے ذلیل خیالات اور اخلاقی کمزوریاں سب ختم ہو جاتی ہیں۔ [illegible] کے نزدیک جب وہ اپنی تعلیم تکمیل کی حد تک پہنچا دیتا ہے [illegible] افسوس کرتا ہے کہ تمام وقت [illegible] [illegible] کوشش کرے۔

[illegible] ہوتے افسانہ نگار ہمیں محبت کے پاک سمندر میں لیجانا چاہتا ہے کہ وہاں پہنچکر ہمارے [illegible]
[illegible] سے جذبات دل سے مٹ جائیں اور ہم ایک خوبصورت زندگی بسر کریں۔ لیکن ہمارے خیالات شیریں فرہاد
اور لیلیٰ مجنوں کے قصوں سے ایسے بھرے ہیں کہ ہم عشقیہ مضامین یا افسانہ پڑھکر فوراً ہائے ہائے اور جینے [illegible] بازی
شروع کر دیتے ہیں۔ افسوس تو اس کا ہے کہ جو مرقع شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں کے افسانے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں
عوام اس سے واقف ہیں۔ ان کے افسانے تو ہمیں یہ تعلیم نہیں دیتے کہ ہم سر پھوڑیں، گلی کوچوں میں مارے مارے پھریں،
اپنے دامن کی دھجیاں اڑائیں۔ ہمیں تو وہ یہ سکھاتے ہیں کہ انسان اپنے حصول مطلب کیلئے بہت کچھ کر سکتا ہے وہ
یہ نہیں سوچتا کہ اتنا بڑا پہاڑ میں کیسے کاٹ سکونگا بلکہ اپنے کام پر دل و جان سے لپٹ جاتا ہے اور اپنی ہر امکانی کوشش
صرف کر دیتا ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ ہمارا معیارِ محبت بہت ہی محدود اور ناقص ہے۔ اس کی شان و عظمت کی وقعت ہماری
نگاہوں میں قطعاً نہیں اور نہ ہم اس کے مفہوم ہی سے واقف ہیں۔ اس لئے ہمیں افسانوی دنیا میں عشق و محبت کی [illegible]
سے کافی تکلیف پہنچتی ہے اور تعریف یہ کہ جن اصحاب کو تکلیف ہوتی ہے وہ ہمارے اربابِ علم ہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ
یہ ہو سکتی ہے کہ افسانہ نگار خود ہی ایسا ماحول اور گندا حسن و عشق پیش کرتا ہے جس سے لوگوں کے دلوں میں نفرت
پیدا ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگار کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ حسن و عشق ہی کی داستان چھیڑے اس کو زندگی کے ہر
شعبے کے لوگوں کی تصویر کھینچنی چاہیے لیکن چونکہ ابھی اردو زبان میں ابتدائی کوشش ہے اس لئے زیادہ کامیابی نہیں
حاصل ہو سکی۔

افسانہ نگار اور شاعر میں فرق — افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، ناول نگار اور شاعر میں کوئی امتیازی فرق نہیں بتایا جا سکتا۔ کیونکہ ان چاروں کا رشتہ "زندگی" اور "انسان" سے ہے۔ تاہم کچھ فرق تو ضروری ہے
جب [illegible] شاعر کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے تو وہ تڑپ اٹھتا ہے اور بے اختیار اس کی تعریف شروع کر دیتا ہے لیکن افسانہ نگار
جب [illegible] ہوتا ہے تو اپنے جذبات کو روکتا ہے اور سکون کے ساتھ اس کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے اور
[illegible] رگ رگ میں موسیقیت ہوتی ہے اس لئے وہ موزوں کلام کہنے پر مجبور رہتا ہے۔
[illegible] سلیس عبارت میں اپنے مطلب کو ادا کر دیتا ہے تاکہ ہر شخص آسانی سے سمجھ لے۔ ایک مثال
[illegible] صحیح ہو جائیگا۔ فرض کیجئے کہ ایک دوشیزہ کسی جنگل میں تنہا چل رہی ہو [illegible]
[illegible] جذبات کے طوفان برپا ہونگے کہ اگر وہی جذبات عوام میں پیدا [illegible]
[illegible] احساس [illegible] کیفیت طاری ہوگی کہ وہ اپنے کو محو کر دیگا۔ اس کے خیالات [illegible]
[illegible] نہیں ہو سکتا اس کے خوشی کا پیمانہ [illegible]
[illegible]

ہوتے جائیں گے۔ لیکن ایک افسانہ نگار ایسی حالت میں دوشیزہ کے ہر طرز کو نگاہ تحقیق سے دیکھے گا اور آخر میں اس نتیجہ پر پہونچیگا کہ کاش ایسی ہی بھولی بھالی زندگی جو تعصب، کینہ، مکاری و عیاری سے پاک ہو ہر شخص کو نصیب ہو۔ لیکن شاعر اس کے مشاہدے میں اتنا محو ہو جائے گا کہ اس کو اوروں کی خبر تک نہ لگے گی۔ وہ اپنے طوفان بیخودی میں گنگناتا رہے گا اور جذبات و اثر کی ترجمانی کرتا رہیگا جسے ہم شاعری کہتے ہیں۔

آخر میں صرف اتنا اور لکھنا ہے کہ ہر افسانہ نویس کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ واقعات سادے اور فطرت و روزانہ زندگی کے مطابق ہوں۔ کیریکٹر کا انتخاب ایسا ہو جس سے شان اور ظرافت ٹپکتی ہو۔ فطری صداقت کا پہلو ہر جگہ نمایاں رکھے۔ ماحول کا انتخاب ایسا کرے جس سے مبتذل کیفیت نہ طاری ہو۔ افسانے کو ہمیشہ مختصر کرنے کی کوشش کرے۔

علیم الدین خاں!

"فطرت ایک مفلس کی نظر میں"!

فطرت کے پجاری کچھ تو بتا! کیا حسن ہے ان گلزاروں میں
ہے کون سی رعنائی آخر ان پھولوں میں ان خاروں میں

وہ خواہ سلگتے ہوں شب بھر، وہ خواہ چمکتے ہوں شب بھر
میں نے بھی تو دیکھا ہے اکثر، کیا بات نئی ہے تاروں میں

اس چاند کی ٹھنڈی کرنوں سے مجکو تو سکوں ہوتا ہی نہیں
مجکو تو جنوں ہوتا ہی نہیں جب پھرتا ہوں گلزاروں میں

یہ چپ چپ نرگس کی کلیاں کیا جانے کیسی کلیاں ہیں
جو کھلتی ہیں، جو ہنستی ہیں، اور پھر بھی ہیں بیماروں میں

یہ لال شفق، یہ لالۂ و گل، اک چنگاری بھی جن میں نہیں
شعلے بھی نہیں گرمی بھی نہیں، ہیں تیرے آتش زاروں میں

کیا تجکو نظر آتی ہی نہیں یہ لرزش سی، یہ سوزش سی
یہ موت کی ہلکی زردی سی ان صبح کے مدھم تاروں میں

اس وقت کہاں تو ہوتا ہے جب موسم گرما کا سورج
دوزخ کی تپش بھر دیتا ہے دریاؤں میں کہساروں میں

جاڑے کی بھیانک راتوں میں وہ سرد ہواؤں کی تیزی
ہاں وہ تیزی وہ بے مہری جو ہوتی ہے تلواروں میں

دریا کے تلاطم کا منظر ہاں تجکو مبارک ہو لیکن
اک ٹوٹی پھوٹی کشتی بھی ٹکراتی ہے منجدھاروں میں

کوئل کے رسیلے گیت سنے، لیکن یہ کبھی سوچا تو نے
ہیں الجھے ہوئے نغمے کتنے اک ساز کے ٹوٹے تاروں میں

بادل کی گرج، بجلی کی چمک، بارش میں وہ تیزی تیروں کی
میں ٹھٹھرا سمٹا سڑکوں پر، تو جام بلب میخواروں میں

سب ہوش و خرد کے دشمن ہیں سب قلب و جگر کے رہزن ہیں
رکھا ہے بھلا کیا اس کے سوا ان راحت جاں سیاروں میں

وہ لاکھ ہلالوں سے بھی حسیں، کیسی زہرہ، کیسی پروین
اک روٹی کا ٹکڑا جو کہیں مل جائے مجھے بازاروں میں

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں، جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے، اس وقت یہ شبنم موتی ہے

معین احسن جذبی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

کتنی خوش تھیں اپنی بہاریں، کتنی خوش تھی اپنی جوانی
عیش ہی عیش تھا، طوفاں آئے، بادل گرجے، برسے پانی

دونوں کا مذہب گو کہ جدا تھا، وہ تھے غریب اور میں تھی رانی
پیت کی خاطر سب تھا آساں، مذہب، جان، اور آن گنوانی

کتنے بھولے، کتنے حسیں تھے، کتنے شریف اور کتنے مانی
بات میں جھڑکی، ناک پہ غصہ، جیسے باندی میں تھی پرانی

کتنی نرالی چاہ کسی کی، دل میں موہ، اور بات بنانی
وہ بھی عجب تھے دن اور راتیں، وہ بھی عجب تھی اپنی جوانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

دن گئے آئے، خود کو جو کوسا، اٹھکر ہاتھ کو منہ پر رکھا
ہنسکر بولے "تو کیا جانے، کتنا نازک دل ہے میرا!"

باپ کا ڈر تھا، ماں کا خطرہ، بھائی کی شرم اور بہن کا ٹوکا
خود کی لاج، سماج کا طعنہ، ہم کو بھی تھی کب کس کی پروا

کوئی نہ سنگی، کوئی نہ ساتھی، کوئی نہ اپنا، کوئی پرایا
تن، من، دھن کو جس پر وارا، اسکی مرضی سب سے اعلا

سارے دھبے آپ دھلیں گے، پیت کی جو ہو بہتی گنگا
سب کو تجکر ایک کو پایا، دل نے دنیا خاک نہ جانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

ایک معمہ جن کی طبیعت، ایک کرشمہ جن کی فطرت
غصہ جن کا پیار سے میٹھا، گالی تھی پیغام محبت

باطن نرمی، ظاہر گرمی، دل میں مروت، منہ پہ شقاوت
دل میں ہر دم شوق حکومت، جان سے پیاری جنکو عزت

اک دن باپ نے میرے بھیجا، دے کر انکو دور حکومت
میری مسرت! میری حسرت! میرا نصیبہ! میری قسمت!

ان کو نہ تھی گو اس کی چاہت، میں نے ہی بھیجا کر کے منت
ان کی عزت، میری عزت، مجھ کو تھی رکھنی ان کی بانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

وہ تو گئے دور، اور نظر میاں آیا نیا ہی گل سا کھلتا
کس کو خبر، یہ نام کی عزت، اصل میں تھی اک جان کا دھوکا

ہاں با سب کیا، اپنا پرایا، سارے جہاں کا نقشہ بدلا
کتنے بہادر، کیسے خوش تھے، جیسے ہر اک نے شیر کو مارا!

کتنا چاؤ تھا، کتنی خاطر، بیٹھی ہوئی ہیں پھر سے گویا!
کیا جانیں یہ دوست سے دشمن، دل ہے یہ شاکی کی دنیا

جان بھی لیں گے، پیار سے لیں گے، آخر ہو نا لاڈ سے پالا!
پہلے سے پیاری مرضی ہماری، دل سے واری چھٹتے زبانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

بیاہ کا تھا یاں ڈنکا بجتا، آن کی آن میں بات کروں کیا
دل ہو مرا یاں اتنا کڑھتا، واں سے جواب آئے نہ پرچا

جل کر آخر خط اک بھیجا "آپ نہ آئیں، مر گئی [illegible] دعا
ایسی حکومت! ایسی عزت! کس کی آخر کس کو پروا!

ہاتھ میں خط تھا، منہ پہ غصہ، پاس کھڑے تھے، سر جو اٹھایا
تیور بدلے دیکھے کسی کے، ٹھنڈا اپنا پڑ گیا غصّا

[illegible] خط ہم نے ہر تیسرے بھیجا"
کتنی خوش تھی آ گئے سے انکے، دل میں پھر بھی چھیڑ کی ٹھانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

[illegible] ، کتنی میٹھی، کتنی [illegible] بھی!
سہر کی قسم اور پیت کی سوگند، آپ کو بھی جو لگے نہ اچھی!

سنتے ہیں ہم اک بیاہ رچا ہے، دھوم ہے سارے گھر میں جس کی — ہم بھی مانیں آپ کو قابل، شادی ہے کس کی، یہ جو بتا دی!"
یہ کیا کہا آپ نے! آپ کی شادی! کس کی شادی، رادھا میری — رادھا کس کی، رانی کس کی، جاؤ بھی! ہوش کی اپنے دوا کی!
باپ نے بیچ بیچ راجہ ڈھونڈا، ایسا بر اور ایسی شادی — رہنے بھی دو بس عشق کی باتیں، ہو گئیں وہ سب اب تو پرانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

اتنا سنکر — ہائے کہوں کیا، منہ کو کلیجہ آ بنے اک دم — پھر وہ لوٹے، پاس نہ آئے، غم تھا، ہم تھے، موت کا عالم
بولے پپیہا پیہو، پیہو، مور بھی ناچے بن میں چھم چھم — بن بن آئے موج نہ دل میں، لاکھ بدریا برسے پیہم
نین کا ساگر سوکھے سوکھے، آنسو آئیں، آئیں تھم تھم — دل کا لاشہ دھوم سے نکلے، اس کے لئے ہم روئیں جم جم
یاد یہ آئی کس کی دل میں، تیر یہ مارے کس نے دمادم — ہو گئی دنیا کیوں سب ماتم، دل کو ہے شاید موت منانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

ہے ہے، شور یہ کیسا اٹھا! کس کے مکان سے! خیر خدایا! — دل کیوں دھڑکا، ماتھا ٹھنکا، میرے مولا تیرا بھروسا!
ہائے لٹی وہ دل کی دنیا! اتنے ناز سے جس کو بسایا — کس کو خبر تھی اک دن ہو گی، اپنی ہنسی ہی اپنا رونا
ہنس کر بولو "تو کیا جانے، کتنا نازک دل ہے میرا!" — پھر سے ڈرا دو "جان بھی دوں گا، یاد رہے! پر سوت کرونگا"
کتنے سچے قول کے اپنے! وہ بھی کیا اور یہ بھی پورا — موت سے بڑھکر سوت بھی ہو گی، کوئی جہاں میں دشمن جانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

روٹھ گئے بس! دیکھ لی الفت، آؤ پیت کا راگ سنائیں! — آؤ، آؤ من کے راجہ! توبہ! توبہ، توبہ، اب نہ ستائیں!
نین کی گنگا، من کا مندر، پریم کا پنڈت، آہ برائیں — آپ ہوں دیوتا، میں ہوں پجارن، آؤ، آؤ بیاہ رچائیں
حسن حکومت، عشق رعایا، موج کے دن اور عیش کی راتیں — دکھ کی دنیا سکھ سے بدلیں، سب سے الگ اک راج بسائیں
آپ کے دشمن دن یہ دیکھیں، کس کی شادی، کیسی براتیں — رادھا آپ کی تھی، ہے، ہو گی! خوش ہوئے اب تو بات جو مانی!

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

من کے راجہ، دل کے باسی، اداس نہ کیجو اپنی داسی — آپ جو روٹھے آس ہو کس کی، کس رخ ڈولے دل کی کشتی
معاف کرو، لو ہاتھ ہیں جوڑے، دیکھو ہنسی سے توبہ کر لی — کیجو غصہ چاہو جتنا، مار بھی ڈالو اف نہ کروں گی
یاد ہے وہ دن "داس ہوں تیرا، حکم ہے تیرا میری مرضی — ہاتھ ہوں میں، اور تو ہے کنگن، میں ہوں گلا اور تو ہی ہنسلی"
بھول نہ جانا بات وہ میٹھی، "رادھا اچھی" "رادھا میری" — داس ہی کو، لو حکم ہے دیتی، من کی داسی، نام کی رانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

اچھا، آپ نے اپنی چلائی، پھر بھی سوت کو بڑھنے نہ دوں گی — موت سے آپ نہ ہم کو ڈرائیں، جینے کی یاں بھی کس کو خوشی تھی
موت اٹل ہے، عشق امر ہے، موت ہے سوت، اور عشق ہوں میں ہی — مر کے بنوں سوت۔ آپ کی مرضی، عشق کا نام اور جیت ہو میری
گھر میں ہو شادی یوں ہی رچتی، سب کی تمنا خوب ہو پوری — چاند ہی اپنا ڈوب گیا جب جوت کہاں کی، رونق کیسی
اتنے نہ روٹھو، پاس بلا لو کشن کنہیا آئی، آئی — رادھا داسی، رادھا باندی، "رادھا [illegible]" "رادھا رانی"

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

سید علی شاکر [illegible]

فاؤسٹ

مترجمہ:۔ شاہد احمد بی۔ اے۔ (آنرز) دہلوی

فاؤسٹ اردو میں پہلی مرتبہ عام فہم و مسحور کن طویل کہانی
صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ "فاؤسٹ" وہ آئینہ ہے
ں میں ہر زمانے کے انسان کو اپنی صورت نظر آتی ہے۔
نہرہ آفاق شاعر المانیہ گوئٹے نے دُنیا کی اِس بلند ترین فلسفیانہ
نظم میں اپنی عمر کے ساٹھ سال صرف کئے تھے۔ اس کہانی
ں فلسفہ حیات کے مسائل کو شاعرانہ آرٹ کا لباس پہنا کر پیش کیا
گیا ہے اس میں آپ زندگی کا وہ خواب دیکھیں گے جو بیک وقت سہانا
بھی ہے اور بھیانک بھی۔ "فاؤسٹ" فلسفی کی عقل اور شاعر کے تخیل کی
آخری حد ہے نیکی، بدی، حُسن، عشق، گناہ، خون، قتل اور موت کی یہ
داستان رنگین کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ عہ؍

ساقی کے خاص نمبر رعایتی قیمت پر

خاص نمبر	اصلی قیمت	رعایتی قیمت
جاپان نمبر۔ جنوری ۱۹۳۶ء	عمہ؍	عہ؍
سالنامہ۔ جنوری ۱۹۳۵ء	عمہ؍	عہ؍
سالنامہ۔ جنوری ۱۹۳۴ء	عہ؍	۱۲؍
سالنامہ۔ جنوری ۱۹۳۱ء	عہ؍	۱۲؍
سالنامہ۔ جنوری ۱۹۳۷ء	عمہ؍	عہ؍
افسانہ نمبر۔ جولائی ۱۹۳۶ء	۱۲؍	۹؍
افسانہ نمبر۔ جولائی ۱۹۳۵ء	۱۲؍	۸؍
افسانہ نمبر۔ جولائی ۱۹۳۰ء	۱۰؍	۸؍
افسانہ نمبر۔ جولائی ۱۹۳۱ء	۱۰؍	۸؍
ظریف نمبر۔ اپریل ۱۹۳۶ء	۱۰؍	۸؍
ظریف نمبر۔ اپریل ۱۹۳۵ء	۱۰؍	۸؍
ظریف نمبر۔ اپریل ۱۹۳۴ء	۱۰؍	۸؍
ظریف نمبر۔ اپریل ۱۹۳۳ء	۱۰؍	۸؍
دلّی نمبر۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء	۱۲؍	۸؍
دلّی نمبر۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء	۱۰؍	۸؍
ڈانٹے کا جہنم۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء	۱۲؍	۱۲؍
چغتائی نمبر۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء	عہ؍	۱۲؍

۹۶
ہندوستان کے سب سے بڑے مترجم مولانا عنایت اللہ دہلوی کے دلکش تراجم
سلامبو
شہرۂ آفاق فرانسیسی انشا پرداز گستیو فلابیر کا شہ پارہ
جسمیں قرطاجنۂ قدیم کی مٹی ہوئی تہذیب اس طرح از سر نو الفاظ میں تعمیر
کی گئی ہو کہ آپ دو ہزار سال پہلے کی تصویر آنکھوں کے آگے
سلامبو اور ماتو کی محبت کی کہانی اسقدر حسرتناک ہے کہ پڑھنے
والوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رہتے ہیں۔
وحشیوں کی لڑائیوں کا بیان جب آپ پڑھیں گے
تو سانس بھی روک کر لیں گے۔ غرض شروع سے آخیر تک یہ
کتاب عجیب غریب چیز ہے۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات
قیمت تین روپے۔ علاوہ محصولڈاک
نجم السحر
پانچہزار سال پہلے جب مصر کی تہذیب اپنے معراج کمال پر تھی
تو ربِ عمون کی بیٹی ملکہ نجم السحر نے سر بفلک محلوں میں آنکھیں
کھولیں۔ پروان چڑھی، جوان ہوئی اور پھر اُس کی داستانِ عشق
شروع ہوئی جو حد درجہ المناک ہو۔ ساحرۂ آشتی کا جادو۔ ثوربن کے
مظالم۔ کیفر کی پُر اسرار ہستی۔ شمعون نجومی کی سحر آفرینی غرض اُس
زمانے کے تمدن و معاشرت کا کوئی پہلو مصنف کی نظر سے نہیں بچا
ہے۔ اسکے دوران مطالعہ میں آپکو ایسا معلوم ہوگا کہ ماضی کا دلکش
فلم آپ حال کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات
قیمت دو روپے آٹھ آنہ علاوہ محصولڈاک۔
تائیس
یورپ کے بہترین مصنف کی بہترین تصنیف کا اردو کے بہترین
مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی کے قلم سے ترجمہ۔ یہ فرانسیسی مصنف
اناطول فرانس کا شہ پارہ ہے۔ اسمیں جسم و روح کے تصادم کے
مسئلہ کو مصرِ قدیم کی ایک عروس بازاری کی داستان کے طور پر
نہایت دلفریبی سے پیش کیا گیا ہے۔
یہ ناول تمام دُنیا کی ادبیات میں نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے۔
عنایت اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ ایسی قادر الکلامی اور اعجاز بیانی
سے کیا ہے کہ اُردو میں ادب لطیف کی ایک غیر فانی یادگار بنا دیا ہے۔
قیمت دو روپے۔ علاوہ محصولڈاک۔
ہیرودیاس
سلومی کا حسن ابدی کا بے پناہ حسن تھا۔ اس کا نابج قیص گناہ
تھا۔ اُس کا جذبہ کوہ آتش فشاں کی طرح تند اور اُسکی محبت لاوے
کی طرح جھلس دینے والی تھی اُسکے سانس میں زہر تھا اور بوسے
میں موت۔ وہ یوحنان کے لبوں کو چومنا چاہتی تھی مگر یہ خدا رسیدہ
بُزرگ اُسے اور اُسکی ماں کو بُرا بھلا کہتا تھا۔
حکم سے سلومی ایک عظیم الشان دعوت میں
یوحنان کا سر الگا۔
کردینے والی کہانی
ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُکڈپو۔ دہلی؛

نقد و تبصرہ

نہ کار [illegible]

اردو اساتذہ میں سے غالب پر تعلیم یافتہ جماعت کی خاص توجہ ہے اور گذشتہ چند سال کے دوران میں اُنکے اور اُن کے کلام کے متعلق بہت سی کتابیں اور تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اِن تصانیف کا عام میلان غالب کی شاعری خصوصاً اُن کی اُردو شاعری کی بیجا تعریف و توصیف کی جانب رہا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس کی ابتدا میرے مرحوم دوست ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمہ دیوان غالب سے ہوئی تھی۔ جو اُنہوں نے دیوان کے نسخہ حمیدیہ یعنی بھوپال ایڈیشن کے لئے لکھا تھا۔ اگرچہ علامہ اقبال کی وہ نظم جس کا عنوان غالب ہے اور جس کا پہلا شعر یہ ہے کہ ؎

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تاکجا

عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے مقدمے سے بہت پہلے شائع ہوئی تھی۔ خود علامہ موصوف نے غالب کے رنگ کو جس حد تک قبول کیا ہے اُس کو غالب کی تعریف کا بہترین پیرایہ خیال کیا جاسکتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی ہر دلعزیزی بھی اس دور میں غالب کی مقبولیت کا ایک سبب ہے۔ یہ سوال میرے دل میں کئی بار پیدا ہوا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ غالب کے کلام خصوصاً اُن کے اُردو کلام کی جو قدر و قیمت اس وقت ہے وہ اُنکے اپنے زمانے میں نہ تھی۔ اگرچہ اُس زمانے میں اُردو شاعری کا کچھ کم چرچا نہ تھا اور اُن کے معاصرین میں بہت سے ایسے لوگ تھے جن کو اُردو شعر کا صحیح وجدان اور ذوق تھا اور جو اُس کی خوبیوں کو پہچاننے کے ہر طرح اہل تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" میں جو اُردو شعرا کا سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ عام پسند تذکرہ ہے، غالب کی اُردو شاعری کا ذکر کچھ ایسے الفاظ میں کیا گیا ہے جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ممکن ہے کہ مرزا غالب کے اپنے معاصرین اُن کی اُردو شاعری کو نہ صرف ذوق وغیرہ کی شاعری سے کمتر درجے کی خیال کرتے تھے بلکہ اُن کو اس کی لطافت و خوبی کا کوئی صحیح اندازہ ہی نہ تھا۔ اس معاملے میں آزاد مرحوم کے بیانات کو کافی اور درست مان لینے کی ضرورت نہیں اور میں اس خیال کے اظہار کی جرأت کرسکتا ہوں کہ خود غالب کے اپنے زمانے اور اس کے بعد کے زمانے میں ایسے اشخاص یقیناً موجود تھے جو اُن کے اُردو کلام کو اتنا ہی پسند کرتے تھے جتنا کہ اس زمانے کی غالب پرست تعلیم یافتہ جماعت۔ البتہ ان اشخاص کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی اور عام طور پر غالب کو وہ مقبولیت نصیب نہ تھی جو اس وقت ہے۔ ان [illegible] میں سے بھی بعض کسی دوسرے شاعر مثلاً میر، سودا، مومن یا ذوق کو کسی ایک حیثیت سے غالب پر ترجیح دینے کیا کوئی [illegible] لیکن اگر آجکل کوئی شخص اس قسم کے موازنہ کی جرأت کرے تو غالب کا دلدادہ گروہ اس کو بے تمیز اور بدذوق قرار دینے [illegible] یہ سوال باقی رہتا ہے کہ ہماری تعلیم یافتہ جماعت کی غالب کے بارے میں اس شیفتگی [illegible] [illegible] مجھے مسٹر محمد اکرام۔ ایم۔ اے (ایم۔ آر۔ سی) ایس۔ آئی۔ سی۔ ایس کی کتاب "غالب نامہ" [illegible] کی دولت میسر آیا تھا میں نے اس کے اوراق کو نہایت شوق سے اس توقع میں [illegible] [illegible] صفحہ [illegible] پر مجھے جلی قلم سے یہ لکھا نظر آیا۔ "غالب کی مقبولیت کی وجوہات" [illegible]

میں بہت خوش ہوا کہ میرے سوال کا جواب ضرور مل جائے گا۔ اکرام صاحب نے اِس مضمون پر جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ جہاں تک بھی ممکن ہے میں ان کے اپنے لفظوں میں آپ کو سناتا ہوں تاکہ آپ خود اندازہ فرمالیں کہ میری توقع کس حد تک پوری ہوئی۔ اور میری خوشی بجا تھی یا بے جا۔ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"ہم نے مرزا کی شاعری کی خصوصیات جس ترتیب سے وہ کسی دَور میں زیادہ نمایاں تھیں بیان کردی ہیں لیکن مقبولیت سمجھنے کے لئے وہ کافی نہیں"

یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکرام صاحب نے غالب کی شاعری کے چار دَور قائم کئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دَور کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کرنے کے علاوہ اُن کے منتخب اشعار کو زمانہ کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔ اس کا ذکر میں پھر کروں گا فی الحال آگے سنیئے۔

"کلامِ غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ہے ...... مرزا کی شاعری بیشتر عشق و محبت کا بیان ہے لیکن منطقی آئے تو اُس کے لئے یہاں دلائل و براہین ہیں۔ شگفتہ طبع لوگوں کے لئے شوخی اور ظرافت اور انسانی فطرت کی داستان سُننا ہو تو یہاں وہ پتے کی باتیں ملیں گی جن کا لطف جوں جوں چشمِ بصیرت کھلتی جائے گی بڑھتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانِ غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اُٹھاتا ہے۔"

یہاں تک مجھے اپنے سوال کا کوئی صحیح جواب نہ ملا۔ کیونکہ تنوع کو پسند کرنا ہر انسان کی فطرت ہے اور اگر واقعتاً غالب میں یہ صفت اور اُردو شعراء سے زیادہ پائی جاتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی قدر ان کے اپنے زمانے میں کیوں اس حد تک نہ کی جاتی جس حد تک کہ اس زمانے میں کی جاتی ہے۔ لیکن ابھی مسٹر اکرام کا بیان ختم نہیں ہوا اور وہ کہتے ہیں کہ:۔

"مرزا کی مقبولیت کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نئی طرز کے آدمی تھے اور اُن کے خیالات کا جو اسلوب تھا زمانہ اُس کی تائید کر رہا ہے ..... مرزا تقلید کے قائل نہ تھے اپنی سمجھ پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ اُن کی جدت پسندی نئے مضامین اور نئی تشبیہیں تلاش کرنے تک محدود نہیں تھی، بلکہ وضع قطع، پوشش، فنِ لغت، فنِ شعر، انشائے خطوط اور دوسری شخصی اور ادبی باتوں میں بھی وہ اپنے معاصرین اور پیشرووں کی پیروی کرنا ضروری نہ سمجھتے اور آزادانہ اُن پر نکتہ چینی کرتے ..... یہ آزاد خیالی اور تقلید سے نفرت تمام عمر اُنکی امتیازی خصوصیت رہی اور موجودہ زمانے میں بھی یہی طرز مقبول ہے۔"

اِس آخری فقرے کا مطلب میں پوری طرح نہیں سمجھا۔ غالب کی جدت طرازی مُسلّم لیکن کیا یہ صفت جدید تعلیم یافتہ جماعت میں بھی کچھ زیادہ نمایاں ہے؟ میں تو اکثر مبصرین کی زبان سے یہ شکوہ سنتا ہوں کہ اس زمانے کا تعلیم یافتہ ہندوستانی تہذیب و تمدن [illegible] غرض زندگی کے ہر ایک اہم پہلو سے تقلید کی زنجیروں میں گرفتار نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ تقلید اپنے اسلاف کی تقلید نہیں بلکہ غیروں کی تقلید ہے۔ شاید مسٹر اکرام کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ غالب مشرقی شعر خصوصاً اُردو شعرا کی عام روش سے منحرف تھا اور ہم بھی [illegible] اس لئے ہم غالب کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں ہم مسٹر اکرام کے ممنون ہوتے اگر وہ غالب کے کلام کی اُن [illegible] واضح فرماتے جن کی بنا پر اُس کو اپنے تمام پیشرو فارسی اور اُردو شعرا سے علیحدہ اور ممتاز خیال کیا جاسکتا ہے لیکن [illegible] اور وجہ بھی ہے وہ کہتے ہیں کہ:۔

"اس کے علاوہ زبان اور محاورے پر مضمون اور خیالات کو مقدم رکھنے کی جو خصوصیت کلامِ غالب میں موجود ہے مغربی شاعری کے تنقیدی
اصول بھی اس کے حامی ہیں۔ چنانچہ ان سب باتوں کی وجہ سے موجودہ نسل جس کی تعلیم مغربی اصولوں پر ہوئی ہے مرزا میں اور اپنے خیالات میں دوسرے
مشرقی شعرا کی نسبت بہت زیادہ باتیں مشترک پاتی ہے۔"

اس بیان پر مسٹر اکرام نے ایک فٹ نوٹ میں یہ اضافہ فرمایا ہے۔

"مرزا کی قدر شاید دہلی اور لکھنؤ سے زیادہ پنجاب میں ہوئی ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چونکہ پنجاب میں اردو زبان بولی نہیں جاتی
لوگ زبان اور محاورے کی لطیف خوبیوں سے اس طرح لطف اندوز نہیں ہوتے جس قدر خیالات سے۔ اور یہ اتفاق کہ اردو زبان کا مستقبل دہلی
اور لکھنؤ سے زیادہ پنجاب سے وابستہ ہو گیا ہے، دیوانِ غالب کی مقبولیت میں اضافہ کا باعث ہوا ہے۔"

میرا خیال ہے کہ ایک معاملہ میں تو غالب کی شاعری کو تعلیم یافتہ گروہ کے موجودہ رجحان کے بالکل مخالف تصور کیا جا سکتا ہے۔ انہیں
حبِ وطن اور قوم پرستی کے جذبات کی بہت کمی ہے اور اس کمی کا احساس مسٹر اکرام کو بھی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"حال ہی میں مرزا کے چند مداحوں نے ان کے بعض اشعار سے ثابت کرنا چاہا کہ ان میں حبِ وطن کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا حقیقتاً
یہ خیال نہ صرف مرزا کے حالاتِ زندگی اور ان کے فارسی کلام سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا بلکہ مرزا کی افتادِ طبیعت کے غلط اندازے
پر مبنی ہے۔"

اور اس رائے کے ثبوت میں وہ مرزا صاحب کی بادشاہت دہلی کی تباہی کی جانب سے لاپروائی اور انگریز حکام سے ان کے دوستانہ
تعلقات کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ مرزا انگریزی نظام کو مغلیہ نظام پر ترجیح دیتے تھے۔

اس پر مجھے یہ واقعہ یاد آیا کہ پنجاب کے ایک مشہور ادیب نے اثنائے گفتگو میں ایک موقع پر مجھ سے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ غالب کے
کلام کی افسردگی ان کے زمانے کے سیاسی حوادث کا نتیجہ تھی اور انہوں نے استعارے کے پیرائے میں اپنی کئی غزلوں میں ان تاثرات کو ظاہر
کیا ہے جو ان حوادث سے ان کے قلب میں پیدا ہونے لازمی تھے۔ اس ضمن میں ادیب مذکور نے دو غزلوں کا خاص ذکر کیا تھا جن میں سے
ایک وہ مشہور فارسی غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن   ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

اور دوسری ایک اور غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مسٹر اکرام کی تحقیق کے مطابق یہ دونوں غزلیں غالباً غدر ۱۸۵۷ء سے قبل لکھی گئی تھیں اور ان میں کسی خاص تاریخی واقعات کی جانب
اشارے کی تلاش فضول معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال غالب اور تعلیم یافتہ گروہ کی باہمی ہم آہنگی کے اسباب کے متعلق میرے سوال کا اس سے
زیادہ بہتر اور جواب مجھے مسٹر اکرام کے "غالب نامہ" میں نہیں مل سکا اور مجھے اسی جواب پر قناعت کرنی چاہیے۔ کتاب کے چار حصے ہیں پہلے
[illegible] مختصر تمہید ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے سات آٹھ سال غالب کے کلام کے مطالعہ و تنقید اور ان کے سوانح حیات کی
[illegible] صرف کئے ہیں۔ تمہید کے بعد تقریباً [illegible] صفحات میں غالب کی زندگی کے واقعات کو ان کی اپنی تصانیف اور خطوط سے اخذ
[illegible] کے بعد تقریباً [illegible] صفحات میں ان کے فارسی اور اردو کلام اور ان کی شخصیت کے ہر ایک اہم پہلو پر تنقیدانہ [illegible]

سے تبصرہ کیا گیا ہے۔ آخری حصہ غالبؔ کے اُردو اور فارسی اشعار کا ایک نہایت دلچسپ انتخاب ہے۔ جس کے تقریباً دو سو ساٹھ صفحات ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ شاید مصنف کے لیے سب سے زیادہ دشوار ثابت ہوا ہو گا کیونکہ انہوں نے اشعار کے انتخاب کرنے اور موزوں عنوانات کے ذیل میں ترتیب دینے میں صرف ذوقِ سلیم ہی پر انحصار نہیں کیا ہے بلکہ ان کو سنہ تصنیف سے منسوب کرنے کے لئے عالمانہ تحقیق و تجسس سے بھی کام لیا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ ہر ایک غزل اور قصیدے کی تاریخ معلوم کی جائے۔ لیکن مسٹر اکرام نے مجموعی طور پر مرزا غالبؔ کلام کو چند ادوار یعنی زمانوں کے تحت میں تقسیم کر دیا ہے جس سے اُن کی شاعری کے ارتقا کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے اور اکثر جگہ کسی خاص غزل، قصیدہ، نظم کا سنہ تصنیف بھی درج کر دیا ہے۔ ادبیاتِ غالبؔ میں غالب نامہ ایک نہایت قابل قدر اور بعض لحاظ سے بالکل انوکھی کتاب ہے۔ اور اُمید ہے کہ غالبؔ کے پرستاروں میں وہ ضرور مقبول ہوگی۔

پنجاب کے جن ادیبوں نے غالبؔ کو مقبول بنانے میں خاص سعی کی ہے اُن میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر میں مولوی ظفر علی خاں صاحب کا بھی نام لے سکتا ہوں اور یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ دوسری کتاب جو اس وقت میرے پیشِ نظر ہے ان کا مجموعۂ نظم "بہارستان" ہے۔ جس کو اُردو اکیڈمی لاہور نے بڑی تقطیع اور جلی کتابت کے آٹھ سو اٹھائیس صفحات پر شائع کیا ہے۔ مولوی صاحب موصوف بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے لیکر اس وقت تک جمہور کی نگاہوں میں کئی مختلف حیثیتوں سے نمایاں رہے ہیں اور ان میں سے ایک حیثیت شاعر کی بھی ہے۔ ان کی نظمیں اخبار اور رسالوں میں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں اور عام طور پر دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ میں ابھی انکو غالبؔ کے حامیوں کے زمرہ میں شمار کر چکا ہوں لیکن اُن کی اپنی شاعری کا رنگ غالبؔ کے رنگ سے بالکل مختلف ہے۔ اگرچہ اِس دَور کے اور اُردو شعرا کی مانند وہ بھی غالبؔ کے نمونے کی فارسی ترکیبوں کا کم و بیش استعمال کرتے ہیں لیکن غالبؔ کی شاعری کی بُنیاد فطری جذبات اور فلسفہ ہیں اور ان کی شاعری کی سیاست اور اخلاق۔ اس ضخیم مجموعے میں شاید ہی کوئی نظم ہو جس کو ماضی یا حال کے واقعات سے بالکل غیر متعلق تصوّر کیا جا سکے۔ ان کی شاعری کا ایک دلکش وصف ظرافت ہے جو اگر فحش و ہزل اور طنز و تعریض سے مبرّا ہو تو نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ دُنیا کے ادبیات کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعری اور خطابت کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ دونوں فن حسین اور مؤثر الفاظ سے کام لیتے ہیں اور دونوں اعلیٰ اور لطیف جذبات کو اُبھارنے کا تہیہ کرتے ہیں۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب کی شاعری کے مدّاح غالباً مجھے معاف رکھیں گے اگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ ان پر حالیؔ اور اکبرؔ کا بہت اثر پڑا ہے اور ان دونوں شاعروں کے کلام کا بیشتر حصہ کلام موزوں ہونے کی رعایت سے لغوی طور پر شعر کہلانے کا مستحق ہے لیکن معنوی حیثیت سے اس کو منظوم خطابت خیال کرنا چاہیئے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مولوی ظفر علی خاں صاحب شاعری کا فطری ملکہ نہیں رکھتے اور نہ اُن کی شاعرانہ استعداد پر کوئی شبہ وارد کرنا مقصود ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ اُن کی شاعری کا مقصد کیا ہے کیونکہ کسی شاعر یا ادیب سے کسی ایسی چیز کی توقع جو اُس کے مقصد سے دُور ہو بالکل فضول ہے۔ اتنی ضخیم کتاب پر مجموعی شکل میں کوئی تبصرہ کرنا یا اس میں سے صرف چند نظموں کو تفصیلی تنقید کے لئے انتخاب کرنا اس کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک ہوگا۔ یہ بہتر ہے کہ اس مختصر تعارف کے بعد "یارانِ نکتہ داں" کو اس ضیافتِ طبع کی دعوت عام دی جائے جس کا سامان "بہارستان" میں نہایت بڑے پیمانے پر مہیا کر دیا گیا ہے۔

(ولے۔ آئی۔ آر۔ [illegible])

ساقی کے خاص نمبر رعایتی قیمت پر

خاص نمبر	اصلی قیمت	رعایتی قیمت
جاپان نمبر (جنوری ۳۷ء)	عمر	عہ
ظریف نمبر (اپریل ۳۶ء)	۱۰ر	۸ر
افسانہ نمبر (جولائی ۳۶ء)	۱۲ر	۹ر
راشد الخیری نمبر (ستمبر ۳۶ء)	۸ر	۶ر
دانتے کا جہنم (اکتوبر ۳۶ء)	۱۲ر	۱۲ر
سالنامہ (جنوری ۳۵ء)	عمر	عہ
ظریف نمبر (اپریل ۳۵ء)	۱۰ر	۸ر
افسانہ نمبر (جولائی ۳۵ء)	۱۲ر	۸ر
چغتائی نمبر (اکتوبر ۳۵ء)	عہ	۱۲ر
سالنامہ (جنوری ۳۴ء)	عہ	۱۲ر
ظریف نمبر (اپریل ۳۴ء)	۱۰ر	۸ر
دلی نمبر (اکتوبر ۳۴ء)	۱۰ر	۸ر
ظریف نمبر (اپریل ۳۳ء)	۱۰ر	۸ر
افسانہ نمبر (جولائی ۳۳ء)	۱۰ر	۸ر
ناصر نمبر (ستمبر ۳۳ء)	۱۰ر	۸ر
دلی نمبر (اکتوبر ۳۲ء)	۱۲ر	۸ر
افسانہ نمبر (جولائی ۳۲ء)	۱۰ر	[illegible]
سالنامہ (جنوری ۳۱ء)	عہ	۱۲ر
افسانہ نمبر (جولائی ۳۱ء)		
مکمل فائل۔ (۱۹۳۴ء)	للعہ	۳ے
مکمل فائل۔ (۱۹۳۵ء)	للعہ	۳عہ
مکمل فائل۔ (۱۹۳۶ء)	[illegible]	[illegible]

ضرورت رشتہ

ایک شریف و نجیب متوسط الحال [illegible]

رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی سلیقہ شعار، نیک سیرت اور میٹرک پاس ہے۔ دہلی کے ایک شریف النسب خاندان کی فرد ہے۔ جملہ امور بذریعہ خط و کتابت ذیل کے پتہ سے طے کئے جا سکتے ہیں۔

ن معرفت رسالہ ساقی۔ دہلی

امتحان کے بعد بجلی کا کام سیکھئے

کیونکہ اس کام کے جاننے والوں کی ضرورت پنجاب، یوپی و صوبہ سرحد کے ہائیڈرو الیکٹرک ڈیپارٹمنٹ میں دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ "بہترین درسگاہ ہے جو ریگولر ڈگری اور ایڈوڈ ڈگری بہر قابلیت اور ہر حیثیت کے طلباء کیلئے یہ سکول کھلا ہے۔ گورنمنٹ کی مالی امداد ملنے پر سکول کمیٹی نے فیس میں ایک تہائی کی رعایت کر دی ہے [illegible]

پراسپکٹس مفت

مسٹر گرڈ ھلے

یعنی

ضرت ہز رائل ہائنس دی ڈیوک آف ونڈسر کے نام کھلا مکتوب!

از

رِاعظیم بیگ چغتائی بی۔ اے، ایل ایل۔ بی۔ (علیگ) چیف جج عدالت العالیہ جاورہ

ایک انتہا سے زیادہ سنجیدہ اور باوقار مگر طول طویل مکتوب جو کہ ہز رائل ہائنس کی رفیع و اعلیٰ پوزیشن اور جملہ آداب (۳۴) (۳۶)

ہی کو ملحوظ رکھتے ہوتے ایک ذمہ دار مصنف لکھ سکتا ہے۔ اور وہ بھی انتہائی ادب اور لطافت کے ساتھ!

افسانہ نگاری اور ناول نویسی کا نرالا انداز۔ اس عجیب وغریب مکتوب نما ناول میں دیکھئے۔ نفسِ مضمون کی نزاکت

مصنف کی سنجیدہ ظرافت اور عشق ومحبت کی ایک دلربا اور چٹکتی اور چمکتی ہوئی کہانی!

دیکھیے کہ مصنف کا یہ عجیب وغریب ناول کس احترام اور لطافت کے ساتھ حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے،

رہ بھی ایسے کہ واقعہ حاملہ کا ذکر کیا اشارہ تک نہیں ہے۔

کتاب پریس میں دیدی گئی اور تیاری کے بعد مع انگریزی ترجمے کے حضرت ڈیوک موصوف کے پاس بھیجدی جائیگی۔

اس عجیب وغریب ناول کو دیکھنا ہو تو آج ہی آرڈر رجسٹر کرادیجئے۔ قیمت عہ علاوہ محصولڈاک۔ محدود ایڈیشن۔

ملنے کا پتہ۔ ساقی بک ڈپو دہلی۔

ساقی کا سالانہ چندہ پانچ روپے اور ششماہی تین روپے ہے ممالک بیرون ہند سے بارہ شلنگ۔
قیمت فی پرچہ چھ آنے

جرعات

ل ساقی کے کئی خاص نمبر
ئع ہوتے ہیں۔ اُن کی قیمت
قل خریداروں سے علیحدہ
یں لی جاتی۔
نہ کا پرچہ مفت

جلد ۱۶ | ساقی دہلی بابت ماہ نومبر ۱۹۳۷ء | نمبر ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

ساقی ہندوستان کے اکثر تعلیمی محکموں میں منظور شُدہ ہے۔ بموجب چٹھی نمبر ۲۱۶۶۴ مورخہ ۲۵ر اکتوبر پنجاب کے محکمۂ تعلیم میں بھی برائے مطالعہ منظور ہو گیا ہے۔ اطلاعًا یہ اعلان کیا جاتا ہے۔

"دورِ حاضرہ اور اُردو غزل گوئی" کی پہلی قسط شائع ہونے کے بعد ہی یہ افسوسناک خبر آئی کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی رفیقۂ حیات نے سترہ دن کی مختصر علالت کے بعد انتقال کیا۔ اس اچانک سانحے نے پردیس میں ڈاکٹر صاحب پر قیامت توڑ دی ہوگی۔ ساتھ ننھے ننھے بچّے بچّوں کو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس طرح سنبھالا ہوگا۔ ان کے خیال ہی سے دل کٹتا ہے۔ اب سوائے صبر اور دُعائے مغفرت کے کوئی چارہ نہیں۔ موت کے آگے سب عاجز ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر مرحمت فرمائے۔ احساسِ فرض کی ایسی مثال ملنی مشکل ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایسے جانکاہ صدمے میں بھی ساقی کو فراموش نہیں کیا اور ایسی شدید پریشانیوں ہی میں اپنے مضمون کی دوسری قسط لکھ کر بھیجی۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس سلسلے میں ناگوار تکلیف اُٹھانی پڑی ہوگی اس لئے شکر گزاری کے ساتھ ساتھ ہم معذرت خواہ بھی ہیں۔ ہمّت اور استقلال کا اتنا اعلیٰ نمونہ کم نظر آتا ہے۔

مرزا سیف علی خاں صاحب نے عورت کی تعلیم و تربیت اور اس کے حقوق کے سلسلے میں بصیرت افروز مضامین لکھے ہیں۔ یہ مضامین توجہ سے پڑھنے کے لائق ہیں۔ دسمبر میں ان کا ایک اور مضمون اِسی موضوع پر شائع ہونے والا ہے۔ ناظرین منتظر رہیں۔

جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی کی علالت ہنوز جاری ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے معالج نے اُنہیں خطوں کے جواب تک لکھنے سے منع کر دیا ہے، اس لئے ساقی کے ذریعے وہ ان سب بھائی بہنوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے ازراہِ ہمدردی اُنہیں خطوط لکھے ہیں۔

سالنامہ ساقی جنوری ۳۷ء میں چند بے مثل مضامین شائع ہونے والے ہیں۔ ان کی مفصّل فہرست آئندہ پرچے میں پیش کی جائیگی۔ دو تین کے نام سُن لیجئے۔

"میکبتھ" مکمل ترجمہ از مولانا عنایت اللہ دہلوی۔ "فنِ افسانہ نویسی" از جناب ل۔ احمد۔ اکبر آبادی۔ "نعرۂ انقلاب" از قاضی نذر الاسلام، مترجمہ اختر حسین رائے پوری۔ "خوابِ گریزپا" از گالزوردی، مترجمہ مسٹر صادق الخیری دہلوی۔ "فردوسِ گم گشتہ" از ملٹن۔ پہلی دو کتابوں کا ترجمہ۔

ہمیں افسوس ہے کہ نقد و تبصرہ کا حصّہ اب کے بھی شامل نہ ہو سکا۔ دسمبر کے پرچے میں امید ہے کہ مطبوعاتِ موصولہ پر اظہارِ خیال کر سکیں گے۔ اس تاخیر پر پبلشرز سے ہم معذرت خواہ ہیں۔

شاہد

(سلسلۂ گذشتہ)

سمبلین

چوتھا منظر:۔ برطانیہ کا ایک قید خانہ

پوستی مس اور دو جیلر آتے ہیں

پہلا جیلر:۔ بھلا اب تمہیں یہاں سے کون چوری لیجا سکتا ہے۔ تم پہ تو قفل جڑ دئے گئے ہیں۔ جہاں چارہ ملے وہیں چرتے رہو۔

دوسرا جیلر:۔ بشرطیکہ بھوک ہو۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

پوستی مس:۔ اے قید، زنداں تو میرے لئے مبارک ہے تو ہی آزادی حاصل کرنیکا راستہ ہے۔ اے میرے ایمان اور اے میرے ضمیر تو نے مجھے زنجیروں میں اتنا جکڑا ہے کہ یہ ہاتھوں کی ہتکڑیاں اور پاؤں کی بیڑیاں بھی مجھے اتنا جکڑے نہیں ہیں۔ اے آسمان کے خداؤ تم مجھے توبہ و ندامت کا وہ آلہ دو کہ جس سے میں ان زنجیروں کو توڑکر آزاد ہوجاؤں، کیا یہی کہنا کافی ہوگا کہ جو کچھ ہوا اُس پر افسوس ہے۔ اور جس طرح دُنیا میں ماں باپ بچّوں کو سمجھاتے ہیں کہ خدا غفور و رحیم ہے' اور وہی ہمارے گناہوں کو بخشنے والا ہے میں بھی صبر کرکے بیٹھ جاؤں۔ یا میں توبہ کروں، ندامت و پشیمانی ظاہر کروں۔ نہیں ان سب باتوں سے تو یہی بہتر ہے کہ زنجیروں میں کسا پڑا رہوں۔ یہ زنجیریں پابند نہیں کرتیں کیونکہ وہ تو میری خواہش کے مطابق ہیں! اگر روحانی آزادی کے لئے یہی چیزیں ضروری ہیں تو پھر اے خدا اس سے زیادہ مواخذہ نہ کر کہ جو کچھ میں رکھتا ہوں وہ سب مجھسے لے لے۔ خداؤ! مجھے علم ہے کہ تم بد انسان سے زیادہ رحمدل ہو' انسان اپنے قرضداروں سے قرضہ کا تہائی یا چھٹا یا دسواں حصّہ لیکر باقی اُن پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ پھلتے پھولتے رہیں۔ میرے لئے یہ بھی کافی نہیں۔ ایموجن کی جان کے بدلے میری جان لے لو۔ میری جان اتنی گراں قیمت نہیں ہے جیسے کہ ایموجن کی جان تھی، مگر پھر بھی وہ ایک جان ہے۔ خداؤ! تمہارے ہی ہاتھوں کی وہ ایک چیز تھی۔ جھوٹے سکّے لینے میں کون اُن کو پرکھتا ہے۔ صرف چہرہ شاہی دیکھکر اُنہیں قبول کرلیتے ہیں۔ پھر اس صورت کو قبول کرو۔ وہ میری نہیں تمہاری ہی شبیہ ہے۔ بس اے آسمان کی قوتو! اگر اس طرح حساب کرنا ہے تو یہ جان لے لو۔ اور ان سرد اور بھاری زنجیروں کو کھول دو۔ ایموجن میں تجھ سے ہمکلام ہوں گا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہونگا۔

(موسیقی کی صدائیں سُنی جاتی ہیں، پوستی مس کے باپ اسکیلیوس لیوتوس کی روح ایک غبار کی شکل میں نظر آتی ہے' یہ رُوح ایک بڑے مرد معمر کی ہے اور ہاتھ میں ہاتھ دئے ایک بُڑھیا عورت اس کے ساتھ ہے' یہ اسکیلیوس کی بیوی اور پوستی مس کی ماں ہے۔ ان کے آگے آگے موسیقی ہے اور ان کے بعد لیونتی یعنی پوستی مس کے دونوں بھائی ہیں اور اُن کے جسموں پر زخم ہیں کیونکہ وہ لڑائی میں کام آئے تھے' پوستی مس قید خانہ میں زمین پر پڑا سوتا ہے' یہ سب روحیں اس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑی ہوجاتی ہیں)

اسکیلیوس:۔ اے برق و رعد کے مالک بس کر۔ انسان غریب جان ہے' وہ تیری نظروں میں اتنا ہی کمزور اور بے حقیقت ہے جیسے اُس کی نظروں میں مکّھیاں ہوں۔ اِس غریب نے کیا ہوگا

مقابلہ کرنا۔ لڑنا ہے تو خدائے جنگ مارس سے لڑ۔ یا شکایت
کرنی ہے تو دیبی جونو سے کر جو تیری ریاکاریوں پر تجھے ملامت
کرتی ہے اور تجھ سے انتقام کے درپے رہتی ہے۔ میرے اس
غریب فرزند نے سوائے نیکی کے اور کچھ نہیں کیا اور یہ فرزند
وہ ہے جس کی صورت میں نے زندگی میں نہیں دیکھی تھی جس
وقت یہ رحمِ مادر میں فطرت کے وقتِ موعود کا منتظر تھا تو
میں مرچکا تھا اور جس وقت دُنیا میں وہ آیا اُس وقت تو ہی
اُس کا باپ تھا، دُنیا کہتی ہے کہ یتیموں کا باپ تیرے سوا دوسرا
نہیں پس باپ بن کر تو نے اُسے دُنیا کی آفات سے بچایا
ہوتا۔

ماں :- لوکینا دیبی جو بچوں کو پیدا کر کے دُنیا کی روشنی انہیں
دکھاتی ہے تو نے میری مدد نہ کی اور دردِ زہ کی حالت میں
مجھے دُنیا سے اُٹھا لیا اس حال میں پوستی مس نے میرے
بطن سے نکل کر رو رو کر دُنیا کے دشمنوں میں قدم رکھا۔
یہ بچہ اس وقت واجب الرحم تھا۔

اسکیلیوس :- فطرت نے اِس بچے کی صورت شکل اِس کے
کے بڑوں کی طرح ایسی اچھی اور پاکیزہ بنائی تھی کہ دُنیا
اُس کی تعریف کرتی تھی اور اُسے لیونتی کی نسل سے کہکر
پکارتی تھی اور اِسے شیریں میوہ سمجھ کر اس کے حاصل کرنے
کے درپے رہتی تھی۔ ایموجن کی نظر میں اِس کی قدر و قیمت
بہت تھی۔

پہلا بھائی :- جب وہ جوان ہوا تو برطانیہ میں جہاں وہ
رہتا تھا دوسرا اِس کے مثل نہ تھا اور ایموجن کا جس سے
بڑھ کر کوئی اِس کی قدر و قیمت نہ جانتا تھا وہ منظورِ نظر
ہوگیا۔

ماں :- تو پھر شادی کرنے پر کیوں لوگ اُس کے دشمن ہوگئے
اور اُسے جلاوطن کر دیا گیا اور لیونتی کے درجے سے گرا دیا
گیا۔ اور کیوں اسکو اس چیز سے جو اُسکو سب سے زیادہ عزیز
تھی حسین ایموجن سے جُدا کر دیا۔

اسکیلیوس :- اور تُو اٹلی کے کمینے اور رذیل آدمی یاچیمو
کیا وجہ تھی کہ تُو نے پوستی مس کے شریف دل و دماغ میں
ایموجن کی طرف سے بدگمانی پیدا کی جس سے کوئی فائدہ
نہ نکلا۔ تو نے اپنی خباثت کا اُسے نشانہ بنایا اور بس۔

دوسرا بھائی :- اور اسی لئے ہم یعنی اس کے والدین اور
دونوں بھائی اپنے امن و عافیت کا مسکن چھوڑ کر یہاں
آئے ہیں اور ہم دونوں بھائی وہ ہیں۔ جو اپنے ملک کی محبت
میں دشمن سے جان توڑ کر لڑے تھے اور اسی میں مارے
گئے تھے۔ ہم بادشاہ لی نانتوس کے حقوق کے حامی اور اُسکی
عزت کے ہمیشہ خواہاں رہے تھے۔

پہلا بھائی :- اور اسی طرح ہمارے بھائی پوستی مس نے بادشاہ
سمبلین کے لئے سختیاں اُٹھائیں تو پھر اے خداؤں کے
خدا جوپیٹر تو نے کیوں اُس کے نیک کاموں اور حقوق کیطرف
سے اپنی نظر پھیر ہٹالی اور اس کی نیکیوں کی جزا میں التوا
کر رہا ہے۔

اسکیلیوس :- بس اے جوپیٹر اپنے قصرِ بلوریں کا دریچہ کھول
اور باہر دیکھ اور اتنا سخت نقصان اپنی ایک بہادر قوم
کو نہ پہونچا۔

ماں :- جوپیٹر! ہمارا فرزند نیک ہے۔ اس کی مصیبتوں
کو دُور کر دے۔

اسکیلیوس :- جوپیٹر اپنے قصرِ مرمریں سے جھانک ہماری
مدد کر، ورنہ پھر ہم روحیں رُو رُو کر جُملہ اربابِ فلک کی انجمن
میں تیری خدائی کے خلاف فریاد کریں گے۔

دونوں بھائی :- جوپیٹر! ہماری مدد کر۔ ورنہ ہم تیرے انصاف
سے بھاگ کر کسی بڑی عدالت میں تیرے فیصلے کا مرافعہ کرینگے۔

(جوپٹیرایک عقاب پر بیٹھا آسمان پر ظاہر ہوتا ہے۔
کڑاک بجلیوں میں سے ایک خدنگ آتشیں کو نشانہ بنا کر زمین
پر لگاتا ہے۔ روحیں سب دو زانو ہو کر اُسے تعظیم دیتی ہیں)
جوپیٹر:۔ بس خاموش۔ اے طبقۂ اسفل کی رُوحو! چُپ
رہو۔ تم کیونکر مجھ کڑکنے گرجنے والے پر الزام رکھتی ہو میں
وہ ہوں جس کا خدنگِ آتشیں آسمان سے چھوٹ کر تمام
باغی ساحلوں کو جلا کر خاک کر دیتا ہے۔ اے عرش کی
پرچھائیوں تم پھولوں کے تختوں کو جہاں پھول کبھی نہیں
کُملاتے واپس جاؤ۔ اور دُنیا کے مکرُوہات سے اپنے تئیں
پریشاں نہ کرو۔ یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ تمکو معلوم رہے
کہ یہ سب کام ہمارے ہیں جن سے ہمیں زیادہ محبّت
ہوتی ہے اونپر ہم تکلیفیں ڈالتے ہیں اور اُنکو اُن کے
نیک کاموں کا اجر دیتے ہیں تاخیر کرتے ہیں کہ لینے والے
کو یہ اجر اور گراں بہا معلوم ہو۔ تمہارا فرزند جو اسوقت
مصیبت میں ہے اسکو ہم پھر سرافراز کرینگے۔ راحتُ
آرام پھر اسکو دیا جائیگا اُس کی آزمائش پوری ہو چکی
ہے۔ ولادت کے وقت وہ ہمارے ستارے کے عمل میں
تھا۔ اور ہمارے ہی ہیکل میں اُس کی شادی رچی تھی۔
بس اُٹھو اور غائب ہو جاؤ۔ تمہارا فرزند خاتون الموجن
کا مالک اور شوہر ہوگا اور اس وقت کی مصیبتیں اسکے
زیادہ عیش و آرام کا موجب ہونگی، یہ تختی ہم تمہیں دیتے
ہیں۔ اسے پوستی مس کے سینہ پر رکھدو اس تختی پر ہم
نے اپنے رحم و کرم سے اِس کی اچھی تقدیر لکھدی ہے بس
اب جاؤ۔ شکوہ و شکایت کے شور سے اپنی بیخبری ظاہر
نہ کرو۔ کیونکہ اس بات سے ہمیں غصّہ آتا ہے۔ اے عقاب
اب اُونچا اُڑ اور ہمیں ہمارے قصرِ بلوریں میں پہنچادے۔
اسکیلیوس:۔ وہ کڑک بجلی کے ساتھ نمودار ہوا اُس کے
آسمانی نفس میں گندھک
طرف دیکھتا تھا۔ گویا اپنے ۔۔۔
کا اونچا اُڑ کر وہاں جانا جہاں جوپیٹر رہتا ہے اور یہ وہ
مقام ہے جو ہمارے مبارک مسکن سے بھی زیادہ حسین
اور برکت والا ہے۔ یہ کُل باتیں ہمارے حق میں مُفید
ہوئی ہیں اور یہ شاہی پرندہ جب منقار سے اپنے
لازوال پروں کو صاف کرتا ہے تو یہ وقت وہ ہوتا ہے
جب اُسکا مالک اُس سے خوش ہوتا ہے۔
سب ملکر کہتے ہیں:۔ جوپیٹر! ہم سب تیرے شُکر گذار
ہوتے۔
اسکی لیوس:۔ عرش کا فرشِ مرمریں جہاں سے شق ہوا تھا
وہیں جُڑ گیا یعنی جوپیٹر اپنے نورانی قصر میں پہنچ گیا ہمیں
اب یہ تختی اُس کے حکم کے مطابق پوستی مس کے سینہ پر
رکھدینی چاہیئے۔

(روحیں غائب ہو جاتی ہیں)

پوستی مس:۔ (جاگ اُٹھتا ہے) یہ نیند تو میرے حق میں
میرا دادا بن گئی۔ تو ہی نے میرے باپ کو مجھ پر ظاہر کیا
اور تو ہی نے میری ماں اور دونوں بھائیوں کو زندہ کر
دکھایا۔ مگر وائے بدقسمتی، صورتیں دکھا کر وہ چلے گئے۔
پیدا ہوتے ہی فنا بھی ہو گئے۔ وہ قسمت کے مارے
جو بڑے لوگوں کی خوشنودی پر جیتے ہیں اُن کو ایسے
ہی خواب نظر آیا کرتے ہیں جیسے کہ مجھے اس وقت نظر
آیا تھا۔ یعنی بیدار ہوتے ہی کچھ نہیں رہتا۔ گو یہ مصیبت
زدہ کسی لائق نہیں ہوتے پھر بھی اُن پر نوازشات عنایت
بکثرت ہوتی ہیں اور یہی حال میرا ہے کہ ایسا زریں اتفاق
میرے لئے پیدا ہوا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کیوں ایسا
ہوا۔ کہیں پریوں کا گذر تو یہاں نہیں ہے۔ ہائیں۔ یہ تختی

..ی ہے کیسی نادر و نایاب شے معلوم ہو رہی ہے لیکن اِس خیالی دُنیا میں تو کوئی ایسا لباس نہ ثابت ہو جسکو پہننے والے سے بہتر ہو، نیز اُس مضمون اور اُس کے اثرات ہمارے درباریوں کی خصلت سے مختلف ہوں اور جن باتوں کا وعدہ اس میں ہو وہ وعدہ ایفا ہو جائے ....

(تختی کا مضمون پڑھتا ہے) "جب کوئی شیر ببر کا بچہ، جسے نہیں معلوم کہ فی الواقع وہ بچہ شیر ہے بلا جستجو و تلاش معلوم کریگا کہ ہاں وہ ایسا ہی ہے اور وہ امن و سلامتی کی فضا میں اپنے تئیں پائیگا۔ اور جبکہ ایک رفیع الشان شجر صنوبر کی شاخیں جو کاٹ دی گئی تھیں اور سالہا سال سے مُردہ پڑی تھیں پھر سرسبز ہو کر اپنے اصل درخت میں پھوٹ کر بڑھیگی۔ اُس وقت پوستی مس کی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی اور برطانیہ پھر خوش قسمت بنکر امن اور نعمتہائے فراواں میں پھُولے پھلے گا۔" یہ مضمون تو وہ ہے جسے کوئی مجنوں بھی زبان پر لا نیکو دماغ سے نہیں نکالیگا۔ یا یہ محض خواب ہے یا کسی دیوانے کی بڑ ہے۔ یا دونوں چیزیں ملی جلی ہیں۔ یا پھر یہ ایک مہمل تقریر ہے۔ یا کوئی ایسی بات ہے جس کی تشریح عقل نہیں کرسکتی۔ مگر یہ جو کچھ بھی ہو۔ میری زندگی کے سارے کام اُس سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اِس لئے محض ہمدردی کے خیال سے اُسے اپنے پاس رکھتا ہوں۔

(دونوں جیلر پھر اندر آتے ہیں)

پہلا جیلر:۔ اے جناب والا، موت کیلئے تیار ہو جایئے۔

پوستی مس:۔ تیار ہونا کیسا، میں تو انتظار میں بھُنا جاتا ہوں۔ موت کیلئے تیار تو میں مدت سے ہو چکا ہوں۔

پہلا جیلر:۔ حکم پھانسی پر چڑھنے کا آیا ہے۔ اگر آپ اسکے لئے تیار ہیں تو خاصے بھُنے بھُنائے ہیں گوشت وہی اچھا پکتا ہے جو پہلے لٹکا دیا گیا ہو۔

پوستی مس:۔ اگر تماشائیوں کے لئے عمدہ غذا ثابت ہوا تو پھر کھانے کے دام پورے وصول ہو جائیں گے۔

پہلا جیلر:۔ مگر آپ کو تو بڑا بھاری حساب چُکانا ہوگا۔ مگر اس میں سہولیت یہی ہوگی کہ آپ کو کچھ دینا نہ پڑیگا۔ اب شراب خانہ کے بلوں کا آپ کو کیا ڈر ہے۔ شراب کے دام دیتے وقت اتنا ہی افسوس ہوتا ہے جتنا کہ اسکے مہیا کرنے کے وقت مسرت ہوتی ہے۔ پہلے تو آپ فاقوں کے مارے غش پر غش کھاتے آتے ہیں مگر جب واپس جاتے ہیں تو خوشیوں میں جھومتے ہوئے جاتے ہیں افسوس ہے تو اس کا ہے کہ آپکو بہت کچھ دینا پڑا اور بہت کچھ لینا بھی پڑا۔ دماغ بھی اندر سے کھوکلا ہوا اور جیب بھی خالی ہوئی۔ سر تو بوجھل اس وجہ سے ہوا کہ عقل ہلکی پڑ گئی تھی اور جیب یوں ہلکی ہوئی کہ سر بوجھل ہو گیا تھا۔ اب ایسی متضاد باتوں سے آپ فارغ ہوئے مگر کیا بات اس دمڑی کی رسّی کے ٹکڑے کی کہ آناً فاناً میں ہزاروں کا حساب بیباق کر دیا۔ اس رسّی کے ٹکڑے کے برابر کوئی بہی کھاتہ نہیں، قرضہ جو کچھ تھا یا اب ہے یا آیندہ ہوگا اس میں دام دام وصول ہو گئے اور جب یہی حساب کتاب آپ کی گردن کے لئے تختہ بنا تو پوری رسید ہی آپکو مل گئی۔

پوستی مس:۔ میں مرنے سے اتنا خوش ہوں کہ تو زندہ رہنے سے نہیں ہوسکتا۔

پہلا جیلر:۔ واقعہ بھی یہی ہے۔ انسان جو سوتا ہوتا ہے اُسے سونے میں ڈاڑھ کا درد کب معلوم ہوتا ہی مگر جو شخص آپکی نیند سوئے گا اور ملازمت میں ایک جلّاد ہی ہوگا تاکہ آپکو آپکے بستر تک پہونچائے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ آپ جلّاد سے اور جلّاد آپ سے اپنی جگہ بدلنی چاہینگے کیونکہ آپکو

یہ معلوم نہ ہوگا کہ آپ کو کس طرف جانا ہے۔

پوستی مس :۔ نہیں مجھے سب معلوم ہے۔

پہلا جیلر :۔ تو پھر سمجھنا چاہیئے کہ آپکی موت کے سر میں آنکھیں ہیں۔ میری نظر سے موت کی کوئی تصویر ایسی نہیں گذری تو پھر کوئی ایسا شخص آپکو راستہ بتائیگا جو رستہ معلوم کرنا اپنے ذمہ لیگا یا پھر آپ اپنے ذمہ وہ چیز لیں گے جس کا علم آپکو نہیں ہو یا پھر اس تحقیقات کو آیندہ پر چھوڑ دینگے۔ اور جو خطرہ پیش آتے اُسے برداشت کریں گے، رہی یہ بات کہ آپ منزل تک کیونکر پہونچے تو ظاہر کہ منزل تک پہونچنے کا حال آپ کب بتائے آتے ہیں۔

پوستی مس :۔ جیلر سُن۔ کوئی ایسا نہیں ہو جس کے پاس اس رستے کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ہوں جس رستے اب میں جانے والا ہوں سوائے اُن کے جو آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور دیکھتے نہیں۔

پہلا جیلر :۔ بھلا اس سے بڑھکر اور کیا تمسخر ہوگا کہ مُنہ پر آنکھیں ہوں مگر وہ صرف ظلمت کا راستہ دیکھنے کے لئے ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ پھانسی پانا ہی آنکھیں بند کر کے راستہ ڈھونڈھنا ہے۔

(ایک قاصد اندر آتا ہے)

قاصد :۔ جیلر! قیدی کی ہتکڑیاں فوراً کاٹ دو اور اُسے بادشاہ کے سامنے حاضر کرو۔

پوستی مس :۔ قاصد تم خبر اچھی لائے ہیں آزاد کئے جانے کے لئے طلب کیا گیا ہونگا۔

پہلا جیلر :۔ تو پھر کیا پھانسی پر میں چڑھایا جاؤنگا۔

پوستی مس :۔ تو پھر تم بھی جیل کی خدمتوں سے آزاد ہو جاؤگے۔ مُردوں کو کہاں دروازے بند کرنے قفل لگانے پڑتے ہیں۔

(سب چلے جاتے ہیں صرف پہلا جیلر رہ جاتا ہی)

پہلا جیلر :۔ یہ بات تو اور ہے کہ کوئی پھانسی سے بیاہ کرے چھوٹی چھوٹی پھانسیاں پیدا کرے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اس سے پہلے کسی مجرم کو مرنے پر اسدرجہ آمادہ نہیں دیکھا تھا۔ ایمان سے کہتا ہوں کہ اس سے بڑھکر بدمعاش ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ کسی طرح جان بچ جائے۔ ان میں چاہے کوئی رومانی ہی کیوں نہ ہو مگر اُن میں چند ایسے ہی ہوتے ہیں جنہیں اپنی مرضی کے خلاف مرنا پڑتا ہے اور یہی حال میرا ہو کہ اگر مجھے پھانسی کا حُکم ملے۔ کاش سب کی طبیعت ایک سی ہوتی اور طبیعت ہی اچھی ہوتی تو پھر پھانسیوں کی ضرورت ہوتی نہ پھانسی دینے والوں کی۔ یہ بات میں اپنے پیشے کے خلاف کہہ رہا ہوں مگر دل یہی چاہتا ہے کہ پھانسیاں موقوف ہو جائیں۔

پانچواں منظر :۔ سمبلین کا شاہی خیمہ۔

سمبلین، ابلاریوس، گدریوس۔ اروبریگس۔
پسانیو۔ اور امرا دربار معہ حکام سرکاری اور
ملازمین کے داخل ہوتے ہیں۔

سمبلین :۔ آؤ ہمارے پاس بیٹھو۔ خداؤں کو یہی منظور تھا کہ تم ہماری جان بچانے والے ثابت ہو مگر اس وقت افسوس ہے کہ وہ غریب مفلس سپاہی جو لڑنے میں جان کھوئے ڈالتا تھا اور جس کے غصّے کے سامنے بڑے بڑے چمکتے ہتیار رکھنے والے شرمندہ اور خجل ہوتے جاتے تھے اور جو اپنا برہنہ سینہ بڑھائے اُن لوگوں کے مقابل آتا تھا جو لسکے فریق کے آدمی تھے اور جن کے پاس ایسی مضبوط ڈھالیں تھیں کہ کوئی ہتیار اُن پر اثر نہ کر سکتا تھا وہ کہیں نہیں ملتا تلاش کرنے پر بھی اُس کا پتہ نہیں چلتا جو شخص اُسے ڈھونڈھکر

لائیگا وہ ہمارے انعام و اکرام کا مستحق ہوگا۔

بلاریوس:۔ لیسے ادنیٰ آدمی میں ایسا شریفانہ غصّہ میری نظر سے کبھی نہ گذرا تھا ایک ایسے ادنیٰ آدمی سے جس سے سوائے اس کے یہ توقع نہ تھی کہ وہ سوال کرے ہاتھ پھیلائے یا افسردہ نظروں سے خالی بیٹھا ہے۔ ایسے شجاعت کے کام ہونے پر حیرت ہوتی ہے۔

سمبلین:۔ اس کی کچھ خبر نہ آئی؟

لیسانیو:۔ حضور! اُسے مُردوں اور زندوں دونوں میں تلاش کیا جارہا ہو مگر ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔

سمبلین:۔ تو پھر جس انعام کا وہ مستحق ہو اس کا وارث میں خود ہی رہا (بلاریوس اور اروپرگس سے مخاطب ہوتا ہے) اور تم جو برطانیہ کا دل و دماغ، قلب و جگر ہو میں تمہاری قدر کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ تمہاری ہی وجہ سے اِس وقت برطانیہ زندہ بچا اور اب وقت ہو کہ میں دریافت کروں کہ آپ کہاں سے آتے ہیں۔ ضرور اتنا مجھے بتائیے۔

بلاریوس:۔ شاہا! علاقہ کیمبریا ہمارا مولد ہے گھرانے کے ہم شریف ہیں اس کے سوا کسی بات پر فخر کرنا نہ تو درست ہوگا اور نہ شرم و حیا اس کی اجازت دیتی ہو اتنا البتہ کہتا ہوں کہ ہم سب ایمان رکھنے والے لوگ ہیں۔

سمبلین:۔ زمین پر گھٹنے ٹیکئے اور لڑائی کے نائٹ بن کر اُٹھیے۔ میں آپکو آج سے اپنی جان اور ذات کا محافظ مقرر کرتا ہوں اور آپ سبکو حسب حیثیت انعام و اکرام سے مالا مال کرونگا۔

(کورنیلیوس طبیب اور چند خواصیں آتی ہیں)

کورنیلیوس:۔ زندہ بادشاہ عالیجاہ! حضور کی خوشی کو تلخ کرنے کے لئے یہ عرض کرتا ہوں کہ ملکہ گذر گئیں۔

سمبلین:۔ جب طبیب ایسی خبر دے تو پھر اس سے بدتر خبر کیا ہو سکتی ہے میں سمجھتا تھا کہ علاج اور دوا سے ابھی ملکہ کچھ اور زندہ رہیں گی۔ مگر موت تو وہ ہے جو ایک دن طبیب کی جان بھی قبض کریگی۔ انتقال کس طرح ہوا۔

کورنیلیوس:۔ حالت جنون میں سخت درد و عذاب کے ساتھ جان دی۔ اور وہ زندگی جو دوسروں کے حق میں جور و ظلم کی تھی اب مرنے والی کے حق میں ایسی ہی موذی ثابت ہوئی۔ مرتے وقت جن باتوں کا اُنہوں نے اقرار کیا اگر حکم اور اجازت ہو تو عرض کروں؟ ملکہ کی یہ خواصیں حاضر ہیں اگر میرے بیان میں کوئی غلطی ہوگی تو یہ اس کی صحت کردینگی۔ یہ خواصیں رخساروں کو آنسوؤں میں تر کئے اُس وقت موجود تھیں جبکہ ملکہ کا دم نکلا ہے۔

سمبلین:۔ ہاں مہربانی کرکے ضرور بیان کرو۔

کورنیلیوس:۔ پہلی بات جس کا ملکہ نے مرتے وقت اقرار کیا یہ تھی کہ اُنہیں آپ سے مطلق محبّت نہ تھی جو کچھ محبّت تھی وہ اُس شان اور بزرگی کی تھی جو حضور کی وجہ سے اُنہیں حاصل تھی۔ آپکی ذات سے اُنہیں مطلق الفت نہ تھی شادی اُنہوں نے آپ سے نہیں بلکہ حضور کی بادشاہی سے کی تھی اور وہ بیوی درحصل آپکی نہ تھیں بلکہ آپ کے منصب اور درجے کی تھیں خود حضور کی ذات سے اُنہیں نفرت تھی۔

سمبلین:۔ اگر یہ باتیں وہ اپنے دل ہی میں رکھتی اور مرتے وقت زبان پر نہ لاتی تو اس کے کہنے پر بھی مجھے یقین نہ آتا۔ اور کیا کہا؟

کورنیلیوس:۔ آپ کی بیٹی جس سے جھوٹی محبت ظاہر کرکے ہمیشہ بڑی ہوشیاری سے اُسے دھوکے دیتی رہی تھیں اُسکے بارے میں اپنی زبان سے کہا کہ وہ اُنکی نظر میں عقرب سے کم نہ تھی اتفاق سے وہ چلی گئی تھی ورنہ زہر دیکر اسے ہلاک کردیتیں۔

سمبلین:۔ اے نازنین و نازک ترین ڈائن۔ عورت کے دل کا حال کسے معلوم ہوسکتا ہے۔ کچھ اور بھی کہا؟

کورنیلیوس:۔ حضور! اور بھی کہا اور جو کچھ کہا وہ اس سے بھی بدتر تھا۔ مرتے وقت بیان کیا کہ اس کے پاس ایک ایسا زہر تھا جس کے کھانے سے کھانے والے کی زندگی ہر آن اور ہر لحظہ کم ہوتی جاتی ہے۔ موت رفتہ رفتہ آتی ہے اور اس زمانے میں کہ زہر بتدریج حضور پر اثر کرے۔ اسکا مقصد تھا کہ رُو رُو کر آپ کی تیمارداری میں مصروف رہے کبھی آپکے ہاتھ چُومے اور کبھی پاؤں تاکہ آپکا دل اس کے مصنوعی اور جھوٹی ہمدردی سے مُتاثر رہے۔ اور جب آپکے مرنے کا وقت آئے۔ تو اپنے بیٹے کو آپکا متبنے قرار دے کر تاج برطانیہ کا وارث بنا دے لیکن اپنے بیٹے کے یہاں سے غائب ہوجانے پر اس کا رنج و غصہ اتنا بڑھا کہ شرم و حیا بالکل جاتی رہی، نہ دل میں خدا کا خوف رہا نہ انسان کا اور اپنے یہ سب منصوبے زبان پر لے آئی اور جو جو خرابیاں اُس نے سوچ رکھی تھیں جب وہ پوری نہ ہوئیں تو خجل اور مایوس ہوکر مرگئی۔

سمبلین:۔ خواصوں! کیا تم نے بھی یہ سب کچھ سُنا۔

سبھی خواصیں:۔ حضور! ہم نے اپنے کانوں سے یہ سب کچھ سُنا۔

سمبلین:۔ میری آنکھوں کا قصور نہ تھا کیونکہ وہ واقعی حسین تھی۔ اور نہ میرے کانوں کا قصور ہے کہ اس کی خوشامد اور چاپلوسی کی باتیں سُنتا رہا جو فی الحقیقت نہایت دلکش اور پُر اثر تھیں اور نہ دل کی خطا تھی کہ اس کے ظاہر کو اچھا دیکھکر اس کے باطن کو بھی اچھا سمجھا کیونکہ اس حالت میں اس کا اعتبار نہ کرنا ایک قسم کا گناہ ہوتا لیکن اے میری پیاری بیٹی! تو اپنے دل میں ہی کہتی ہوگی کہ یہ سب میری حماقتیں تھیں جسکا حافظ ہونا تو اپنے تجربے سے ثابت کرسکتی ہے۔ خُدا سے اُمید رکھنی چاہیئے کہ وہ یہ سب باتیں درست کردیگا۔

(لیوکوس رومانی سپہسالار، نجومی اور رومانی اسیرانِ جنگ جنکے گرد پہرا لگا ہے اندر آتے ہیں، انکے پیچھے پیچھے پوستی مس اور امجن ہیں۔)

کاسیس لیوکوس:۔ اس وقت تم ہم سے خراج طلب کرنے نہیں آئے ہو جسے اب برطانیہ والوں نے یکقلم منسوخ کردیا ہے۔ گو اس میں ان کے بڑے بڑے بہادروں کی جانیں تلف ہوئی ہیں جو بہادر اس معرکہ میں کام آئے ہیں انکے عزیزوں اور رشتہ داروں نے درخواست دی ہے کہ اُنکے مُردوں کی رُوحوں کو آرام دینے کے لئے ہم تمکو جو اب اُنکے اسیر ہو قتل کردیں۔ ہمنے اُنکی درخواست منظور کرلی ہے۔ اب تم اپنی حالت پر غور کرو۔

لیوکوس:۔ آپ خود غور فرمائیں یہ تو لڑائی کے اتفاقات ہیں۔ یہ اتفاق تھا کہ فتح آپکو ہوگئی اگر ہم فتحیاب ہوتے تو غصہ ٹھنڈا ہونے پر اپنے قیدیوں پر تلوار ہرگز نہ چلاتے لیکن جب خداؤں کی یہی مرضی ہے کہ بجز ہماری جانوں کے اور کوئی چیز فدیہ میں نہ لیجائے تو پھر جو مرضی ہے وہی ہونے دیجئے۔ ایک رومانی کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ایک رومانی کی طرح صبر و استقلال سے جان دے۔ قیصر اغسطس زندہ ہے اور وہی اسباب پر غور کریگا کہ ہم پر کیا گذری۔ یہانتک تو مجھے اپنی ذات کے بارے میں کہنا تھا اب صرف ایک امر میں حضور سے خاص طور پر عرض کرتا ہوں یہ لڑکا جو میرا ملازم ہے برطانوی ہے وہ اسی ملک کی پیدائش ہے۔ اس کے لئے زر فدیہ لیکر اُسے رہا کردیا جائے۔ دُنیا میں کبھی کسی آقا کو ایسی محبت کا آدمی جسے اپنے فرائض منصب کا

اِس درجہ خیال ہوا اتنا محنتی اتنا جفاکش اور اپنے آقا کی راحت و آرام کا خیال کرنے والا سچّا وفادار، ہمہ وقت خدمت کو حاضر، آرام پہنچانے میں مثل بچّے کی دایہ کے، ہر گز کسی کو نہ ملا ہوگا۔ اس کی ان خوبیوں اور اوصاف کے ساتھ میری التجا کو بھی شامل سمجھا جائے جو اس وقت میں نے حضور کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کی ہے اور اُمید کرتا ہوں میری یہ درخواست نامنظور نہ فرمائی جائیگی۔ اُس نے کسی برطانوی کو نقصان نہیں پہنچایا درحالیکہ وہ ایک رومی کا ملازم تھا۔ حضور اس لڑکے کی جان بخشی فرمائیں، اور چاہے کسی کا خون معاف نہ کریں۔

سمبلین :۔ میں نے اِسے کہیں دیکھا ہے، اس کی صورت سے آشنا معلوم ہوتا ہوں۔ لڑکے ہم تجھ پر مہربان ہوئے۔ اور آج سے تو ہمارا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا بات ہے، بیساختہ مُنہ سے نکلتا ہے کہ اے لڑکے تو زندہ رہ اور جو جان بخشی تیری کرتا ہوں اُسکا احسان ماننے کی تو مجھے ضرورت نہیں۔ جو کچھ تو مانگے گا ہماری فیاضی اور اپنی حیثیت کا خیال کرکے وہی تجھے ہم دینگے حتیٰ کہ اگر تو کسی رومانی قیدی کی جان بخشی بھی چاہے گا تو ہم منظور کرینگے۔

ایموجن :۔ میں حضور والا کا نہایت عجز و انکسار اور ادب کے ساتھ شکر گذار ہوا۔

لیوکوس :۔ لڑکے میں نہیں چاہتا کہ تو میری جان بخشی چاہے مگر دل یہی کہتا ہے کہ تو ایسا ہی کریگا۔

ایموجن :۔ نہیں، ابھی مجھے کچھ اور کام کرنا ہے۔ اس وقت میں ایک ایسی چیز دیکھ رہا ہوں جسکی تلخی موت کی تلخی سے بھی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ میرے آقا آپ کی جان بچے یا جائے یہ بات بعد کو دیکھنے کی ہے۔

لیوکوس :۔ افسوس۔ یہ لڑکا اب مجھ سے بے اعتنائی کرنے لگا علیحدہ ہوتے ہی مجھ سے نفرت ظاہر کرنے لگا۔ سچ ہے اُن کی مسرتیں بالکل عارضی ہوتی ہیں جو لڑکوں یا لڑکیوں کی محبت پر بھروسہ کریں، مگر معلوم نہیں یہ لڑکا اس وقت کیوں اتنا پریشان ہے۔

سمبلین :۔ اے لڑکے بتا تو کیا چاہتا ہے۔ مجھے تو تجھ سے ہر لحظہ محبت بڑھتی جاتی ہے، تیرا خیال بار بار آتا ہے جو کچھ تیرے دل میں اس وقت ہو اُسے خوب سوچ سمجھ لے جدھر تو دیکھ رہا ہے کیا وہاں کوئی چیز درکار ہے۔ کیا اس آدمی کی جان بچانا چاہتا ہے، کیا وہ تیرا کوئی عزیز یا خیر طلب ہے۔

ایموجن :۔ حضور جس کی طرف میں دیکھ رہا ہوں وہ ایک رومانی ہے، اُس سے مجھ سے کوئی قرابت نہیں ہے اور اگر ہے تو اتنی ہی ہے جسقدر کہ مجھ میں اور حضور میں ہے چونکہ میں حضور کی رعیت ہوں اس وجہ سے میں بہ نسبت اسکے حضور سے زیادہ قرابت رکھتا ہوں۔

سمبلین :۔ تو کیوں اُدھر غور سے دیکھے جاتا ہے ؟

ایموجن :۔ اگر حکم ہو تو حضور سے کچھ علیحدہ عرض کرنے کی اجازت ہو۔

سمبلین :۔ بڑی خوشی سے جو کچھ تو کہے گا ہم اُسے بغور سُنیں گے۔ تیرا نام کیا ہے۔

ایموجن :۔ حضور! مجھے فیڈلی کہتے ہیں۔

سمبلین :۔ اے نیک لڑکے تو ہمارا غلام ہے اور ہم تیرے آقا ہیں۔ آ۔ ہمارے ساتھ چل اور جو کچھ تجھے کہنا ہے وہ کہہ۔

(سمبلین اور ایموجن علیحدہ کچھ بات چیت کرتے ہیں)

بلاریوس :۔ کیا یہ لڑکا مر کر پھر زندہ ہوا ہے۔

اروبریگس :۔ ریت کا ایک ذرہ دوسرے ذرّہ سے اتنا مشابہ

نہیں جسقدر کہ یہ لڑکا اُس حسین لڑکے سے جسکا نام فیدلی تھا ہمشکل ہی۔ کیوں بھائی گدریوس؟ تمہارا کیا خیال ہی۔

گدریوس:۔ یہ تو دہی مُردہ پھر جی اُٹھا ہی۔

بلاریوس:۔ اچھا ذرا اور غور سے دیکھ لو۔ اسوقت وہ ہمیں نہیں دیکھ رہا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہی کہ دو آدمی ہمشکل ہوتے ہیں! اگر یہ فیدلی ہوتا تو ہمیں دیکھکر ضرور بات چیت کرتا۔

گدریوس:۔ مگر ہم تو اُسے مُردہ دیکھ چکے ہیں۔

بلاریوس:۔ چُپ رہو۔ اب ذرا غور سے دیکھ لو۔

پسانیو:۔ (علیحدہ کہتا ہی) یہ تو میری آقا ہی۔ وہ اپنی جان سے جیتی ہے اب جو کچھ ہی گذرے گذر جانے دو۔

(سمبلین اور اموجن کچھ بات کرکے پھر آتے ہیں)

سمبلین:۔ لڑکے اِدھر آ۔ ہمارے پاس کھڑا ہو اور جو کچھ مانگتا ہے بآواز بلند مانگ۔ یاچیمو تم آگے بڑھو اور جو کچھ یہ لڑکا پوچھے اِس کا جواب دو۔ جواب بالکل صحیح اور صاف ہو۔ ورنہ ہم اپنے دبدبہ شاہی سے جسنے ہمیں عزت و شان بخشی ہے واقعات کی چھان بین کرکے سچ کو جھوٹ سے نکال لیں گے۔ لڑکے تجھے جو کچھ پوچھنا ہے ہو پوچھ؟

اموجن:۔ میرا سوال صرف اتنا ہی کہ یہ انگوٹھی جو اُنکے ہاتھ میں ہے انہیں کہاں سے ملی۔

پوستی مس:۔ اِس لڑکے کو انگوٹھی سے کیا واسطہ ہوسکتا ہی۔

سمبلین:۔ یاچیمو! بتاؤ یہ ہیرے کی انگوٹھی تمہاری اُنگلی میں کیسے آئی۔

یاچیمو:۔ میں اِسبات کے بتانے سے عذاب میں مُبتلا ہونگا اور پھر یہ عذاب آپکے درد والم کا موجب ہوگا۔

سمبلین:۔ میرے درد والم کا باعث کیوں ہوگا۔

یاچیمو:۔ میں خوش ہوں کہ اسوقت مجھ سے وہ بات کہلوائی جاتی ہے۔ جسے مخفی رکھنے سے میں سخت حالتِ عذاب میں ہوں۔ سُنیئے! یہ انگوٹھی دغا اور فریب سے حاصل کی ہے اور یہ ہیرا دراصل لیونتوس کا ہے جسے حضور نے اپنی مملکت سے خارج کیا ہے اور آپکو سُنکر افسوس ہوگا جیسا کہ مجھے افسوس ہے کہ اُس سے زیادہ شریف ونجیب آسمان کے نیچے اِس دُنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ حضور بادشاہ سلامت اگر واقعات سُننا چاہیں تو عرض کروں۔

سمبلین:۔ جو کچھ اِس خاص امر کے متعلق کہوگے ہم سُنیں گے۔

یاچیمو:۔ آپکی وہ عدیم المثال دختر جس کے لئے میرا دل خون روتا ہے اور میری گنہگار رُوح واقعات کو یاد کرکے لرز اُٹھتی ہی اگر اُنکی اجازت ہو تو عرض کروں۔ مجھے غش آرہا ہی۔

سمبلین:۔ "میری دختر" یہ کیا بات ہوئی۔ یاچیمو! میں چاہتا ہوں کہ جب تک تمہاری زندگی ہے تم زندہ رہو اور اس معاملے میں جو کچھ مجھے سُننا ہو اِس سے پہلے تم ہمت نہ ہارو۔ حواس درست کرو۔ اور جو کچھ کہنا ہی کہو۔

یاچیمو:۔ ایک زمانہ ہوتا ہی اور نحس تھی وہ گھڑی جو سر پر آئی کہ شہر روما میں ایک گھر میں جسپر خدا کی لعنت ہو ایک ضیافت میں ہم شریک تھے۔ کاش اِس ضیافت کے کھانوں میں زہر ملا ہوتا! بالخصوص اُس کھانے میں جو میرے سامنے رکھا تھا۔ پوستی مس وہاں افسردہ خاطر بیٹھا تھا۔ اچھا ہوتا کہ ایسے بُرے لوگوں کی صحبت میں نہ ہوتا۔ شریفوں اور نیک بختوں میں وہ بہترین شخص تھا۔ ہوتے ہوتے حسینانِ اٹلی کی تعریفیں ہم کرنے لگے۔ یہ تعریفیں وہ سُنتا رہا۔ ہم اُن کے حُسن وجمال کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے تھے اور مبالغہ بھی اتنا کرتے تھے کہ جس کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ ہم اُن کی خوشگردنی اور تناسب اعضاء کی۔

مدح سرائی میں اتنا غلو کرتے تھے کہ گویا وینس دیبی اور مینروا کے قدیم مجسمے بھی ان کے ہیچ دہیچ کے سامنے گرد ہیں گویا وہ متاع حسن زیبائی کی ایک دکان ہیں جسے دیکھکر ہر مرد کو انکا عشق ہوتا ہے اور اُس کے ساتھ ان میں وہ عشوہ و ناز ہی ہے جو مرد کو عورت کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

سمبلین :- میں تو انتظار میں تھکا جا رہا ہوں۔ جو بات سُننے کی ہے وہ جلد بیان کیجائے۔

یاچیمو :- اگر حضور جلد اذیت اُٹھانی چاہتے ہیں تو میں بھی یہ قصہ جلد بیان کرتا ہوں۔ پوستی مس ایک شریف امیرزادے کی مثل ایک خاتون سے عشق رکھتا تھا۔ یہ خاتون شاہی خاندان سے تھی۔ اِس وجہ سے وہ ہماری باتوں کی طرف متوجہ ہوا اور جن کی ہم تعریف کرتے تھے اُن کی تعریف میں کسی قسم کی کمی کئے بغیر (اور اس میں واقعی اُس نے اپنی شرافت کا پورا ثبوت دیا) اُس نے اپنی بیوی کے حسن و جمال کا نقشہ کھینچا جس میں نہ صرف حسنِ صورت کا ذکر تھا بلکہ حسنِ سیرت بھی شامل تھا تو ہم سبکو ایسا معلوم ہونے لگا کہ جن عورتوں کی ہم تعریف کرتے تھے وہ اُس کی بیوی کے مقابلہ میں باورچی خانہ کی میلی کچیلی مامائیں ہیں۔ زبان کی لطافت اور شیرینی اور پھر دل کا خلوص اِس بیان میں کچھ ایسے آمیز تھے کہ ہم سب اس کے سامنے احمق معلوم ہونے لگے۔

سمبلین :- مطلب کی بات کہو۔

یاچیمو :- سُنیں حضور! مطلب یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ اثنا گفتگو میں آپکی دختر کی عصمت و عفت کے متعلق بحث ہونے لگی۔ پوستی مس کہنے لگا کہ دانیا دیبی کی نسبت آپ کہہ سکتے ہیں کہ اُن میں حدت نفس [illegible] مگر میری بیوی کی طبیعت پاک صاف اور سرد ہے اس پر بدبخت نے اسکی تعریف میں شُبہ ظاہر کیا اور میں نے کہا کہ لیجئے یہ اشرفیاں موجود ہیں اگر میں آپکی بیوی کے ساتھ ہم بستر نہ ہوا تو یہ اشرفیاں آپکی ہیں ورنہ آپ کی انگوٹھی میری ہو جائیگی۔ مگر پوستی مس بڑا سچا آدمی تھا اور اسکو اپنی بیوی کی پاکدامنی پر پورا اعتبار تھا اور اُس کی بیوی کی پاکدامنی وہ تھی جسے آزمائش کے بعد میں نے سچا پایا۔ غرض پوستی مس نے اپنی انگوٹھی شرط میں لگادی۔ انگوٹھی میں ہیرا تھا۔ یہ ہیرا تو کیا چیز ہے اگر یہ ایسا یاقوت بھی ہوتا جو سورج دیوتا کے رتھ میں لگانے کے قابل ہوتا اور اس کی قیمت پورے رتھ کی قیمت کے برابر ہوتی تو بھی پوستی مس کو اُسے شرط میں لگا دینے میں دریغ نہ ہوتا۔ اِس شرط کے بعد میں فوراً برطانیہ میں اسی قصد اور ارادے سے آیا۔ حضور کو میرا دربار میں حاضر ہونا یاد ہوگا۔ جب شہزادی صاحبہ سے مُلاقات ہوئی تو اچھی طرح سبق ملا۔ کہ سچے عشق اور پاپ میں کیا فرق ہے۔ جب نااُمید ہوا تو اب میرے دماغ نے خبث و شیطنت کے ساتھ عمل شروع کیا۔ برطانیہ میں موسم کی سختی کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کے دماغ سُست و ناکارہ ہوتے ہیں۔ میں اٹلی کا رہنے والا تھا یہاں میرے دماغ نے خوب کام دیا۔ غرضیکہ مختصر عرض ہے کہ اب جو تدبیر میں نے سوچی اس میں بے حد کامیابی ہوئی اور جب میں اٹلی واپس گیا تو جو کچھ میں نے اپنی کامیابی کے ثبوت میں بیان کیا اُس نے شریف لیونتوس کو دیوانہ کر دیا۔ چند نشانیاں اور علامتیں بھی میں نے اُسے بتائیں۔ خلاصہ یہ کہ میں نے اُس کی بیوی سے اُسے بدگمان کر دیا۔ شہزادی کی خوابگاہ میں جو تصویریں دیواروں پر لٹکی تھیں اُن کا حال بیان کیا اور یہ جوشن اُسے دکھایا جسے فی الواقع دھوکے سے میں نے حاصل کیا تھا بلکہ اِس کے جسم کے چند خفیہ نشانات بھی بتائے غرضیکہ لیونتوس کو یقین ہو گیا کہ

اُس کی بیوی کی عصمت میں مَیں واقعی خلل انداز ہوا ہوں۔ اور اس طرح جو شرط بدی گئی تھی وہ میَں جیت گیا۔ میں سمجھتا ہوں لیوناتوس یہاں موجود ہے۔

پوستی مس :۔ (آگے بڑھکر)۔ ہاں او بے ایمان، اٹلی کے شیطان تونے یہی کیا اور افسوس مجھ بدنصیب زدو اعتقاد۔ احمق، بے درد قاتل اور سارق۔ پر یا جو لقب دُنیا کے اُن خبیثوں پہ جو گُذر گئے ہیں یا اب موجود ہیں یا آئندہ ہوں موزوں ہو، مجھے دو اور افسوس کرو۔ اے کوئی رسّی کا ٹکڑا یا چاقو یا چھُری مجھے دو۔ یا کوئی ایسی چیز دو کہ میں اپنے کئے کو پہنچوں۔ اے بادشاہ جسقدر عذاب دینے کے آلے اور شکنجے تیرے پاس ہوں اُنہیں طلب کر، میں وہ ہوں۔ جو دُنیا کی بدترین مخلوق ہوں بلکہ اُس سے بھی بدتر اپنے کو شمار کرتا ہوں۔ میں پوستی مس ہوں، جس نے حضور کی بیٹی کو قتل کروا دیا۔ ایک مردود شیطان اور خبیث کی طرح اِس وقت حضور کے سامنے حاضر ہوں۔ جس نے ایک کم درجہ کے شیطان اور سارق کو ایسا کرنیکا اشارہ کیا۔ آپکی بیٹی خوبیوں اور نیکیوں کا ایک مجسمہ تھی بلکہ وہ مجسم نیکی تھی۔ لوگو! مجھ پر تھوکو، پتھر اور کیچڑ برساؤ گلی کوچوں کے کتّوں کو مجھ پر اُکسا کار دو۔ دُنیا کے ہر بدمعاش کا نام لیوناتوس پوستی مس رکھدو جو شیطنیت اور خباثت ہو چکی ہے پھر اُس کے برابر نہ ہوگی۔ ہائے ایموجن میری ملکہ۔ میری زندگی، میری بیوی، ہائے ایموجن۔ ایموجن۔ ایموجن۔

ایموجن :۔ خاموش۔ اے میرے مالک اور آقا۔

پوستی مس :۔ اے شریر لڑکے کیا تو میری ہنسی اُڑاتا ہے۔ کیا میرا کوئی تماشا بنا کر دکھائیگا (ایموجن کو مارتا ہے وہ گر پڑتی ہے)

پسانیو :۔ شریفو! مدد کرو۔ یہ لڑکا نہیں ہے ہماری آقا اور بیگم ہے۔ اے آقا پوستی مس آپنے ایموجن کو اب قتل کیا ہے اب تک آپ اُس کے قاتل نہ تھے۔ لوگو۔ مدد کرو۔ یہ معزز خاتون ہے۔

سمبلین :۔ کیا دُنیا واقعی چکّر میں آگئی ہے۔

پوستی مس :۔ یہ واقعات کیسے پیش آرہے ہیں، جن سے غش پر غش آتا ہے۔

پسانیو :۔ میری بیگم، میرے آقا آپ اُٹھیں۔ جاگیں، بیدار ہوں۔

سمبلین :۔ اگر یہی حال ہے تو پھر خداؤں کا قصد یہی ہے کہ مجھے ہدف بنائیں اور خوشی سے میں ہلاک ہو جاؤں۔

پسانیو :۔ میری بیگم! حضور کا مزاج کیسا ہے۔

ایموجن :۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دُور رہو۔ تونے مجھے زہر دیا تھا۔ تو خطرناک آدمی ہے یہاں سے دفع ہو۔

سمبلین :۔ آواز تو ایموجن کی سی ہے۔

پسانیو :۔ میری آقا۔ میری بیگم، خدا مجھ پر آسمان سے جلتی گندھک کے ٹکڑے برسائے اگر وہ صندوقچی آپ کو کسی اور خیال سے دی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اُس میں اکسیر ہے صندوقچی مجھے ملکہ نے دی تھی۔

سمبلین :۔ کیسی نئی نئی باتیں معلوم ہو رہی ہیں۔

ایموجن :۔ اِس صندوقچی میں زہر تھا اور اُس کا اثر مجھ پر ہوا۔

کورنیلیوس طبیب :۔ خدایا! ملکہ نے مرتے وقت جن باتوں کا اقرار کیا تھا اُن میں ایک بات کہنے کو میں بھول گیا تھا یہ بات ایسی ہے [illegible] پسانیو کو بے گناہ ثابت کرتی ہے۔ ملکہ نے کہا تھا کہ اگر پسانیو نے اپنی بیگم کو وہ معجون جسے میں نے اکسیر بتا کر ملکہ کو دیا تھا دیدی تو پھر ایموجن کے ساتھ میرا

سلوک وہی ہوگا جو ایک چوہے کو زہر دیکر ہوتا ہے۔

سمبلین:- کورنیلیوس! یہ کیا بات ہوئی۔

کورنیلیوس طبیب:- حضور والا، ملکہ اکثر فرمائش کیا کرتی تھیں کہ میں طرح طرح کے زہر تیار کرکے پیش کیا کروں تاکہ وہ ان زہروں سے زہریلے جانوروں، کتّوں اور بلیوں کو مارا کریں۔ یا ایسی چیز کو ہلاک کریں جن کی جان کی کوئی قیمت نہ ہو۔ میں یہ سُنکر ڈرا اور مجھے شُبہ گذرا کہ کہیں ملکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک معاملے میں استعمال نہ کریں، چنانچہ میں نے ایک ایسی دوا تیار کرکے دی تھی جس کے استعمال سے انسان کے حواس کا فعل معطل ہوجائے مگر تھوڑی دیر میں فطرت کی تمام قوتیں بیدار ہوکر اپنا عمل کرنے لگیں۔ ایموجن سے دریافت کیا جائے کیا آپ نے اُسے کھایا تھا۔

ایموجن:- ہاں غالبًا وہی دوا میں نے کھائی تھی۔ کیونکہ میں اس کے کھاتے ہی مرگئی تھی۔

بلاریوس:- لڑکو! دیکھا ہماری غلطی تھی۔

گدریوس:- یہ تو یقینًا فیدلی ہے۔

ایموجن:- (پوستی مس سے کہتی ہے) تم نے کیوں اپنی بیاہتا بیوی کو اپنے سے جُدا کردیا۔ جو عقد ہم میں تم میں ہوچکا تھا وہی قایم ہے۔ کیا پھر مجھے جدا کردوگے۔

(پوستی مس کے گلے سے لگ جاتی ہے)

پوستی مس:- جیسے شاخ پر پھل ہوتا ہے اس طرح گلے لگی رہو۔ یہاں تک کہ درخت خشک ہوجائے۔ اے میری جان، اے میری رُوح۔

سمبلین:- میری بیٹی۔ میری جگر پارہ [illegible] سے تو کیوں الگ تھلگ ہے۔ کیا میں بات کرنیکے قابل نہیں رہا۔

ایموجن:- (دو زانو ہوکر کہتی ہے) میرے حق میں دُعا فرمائیں۔

بلاریوس:- (گدریوس اور اردیرگس سے کہتا ہے) گو اس نوجوان لڑکے سے مجھے محبت تھی مگر اس میں میرا قصور نہ تھا البتہ تمہاری محبت کی خاص وجہ تھی۔

سمبلین:- (بیٹی سے کہتا ہے) میری آنکھوں سے جو آنسو گرتے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ تیرے حق میں آبِ مقدس ثابت ہوں۔ ایموجن تمہاری ماں کا انتقال ہوگیا۔

ایموجن:- حضور! مجھے اس کا افسوس ہے۔

سمبلین:- وہ مفسدہ اور شریر تھی، یہ اُسی کی شرارت تھی کہ آج اتنی مدّت کے بعد ہم دونوں ملتے ہیں، اس کا بیٹا بھی غائب ہے۔ نہیں معلوم کہ وہ کیونکر چلا گیا اور اب کہاں ہے۔

پسانیو:- حضور! اب مجھے کسی بات کا خوف نہیں، جو کچھ عرض کرونگا۔ سچ عرض کرونگا۔ جب میری آقا یعنی شہزادی صاحبہ کہیں چلی گئیں تو ملکہ کے فرزند میرے پاس آئے۔ مُنہ میں غصّہ سے جھاگ بھرے تھے اور قسم کھا کر مجھ سے کہنے لگے کہ اگر تونے نہ بتایا کہ شہزادی صاحبہ کہاں گئیں تو میں فورًا تیری گردن اُڑا دونگا۔ اتفاق سے میری جیب میں ایک خط اپنے آقا کا پڑا تھا اِس خط میں لکھا تھا کہ میں پوستی مس تجھ سے ملفورڈ ہیون کے پہاڑوں کے قریب ملونگا۔ اُسے پڑھتے ہی کلوٹن کے سر پر غضب سوار ہوا اور اُنھوں نے میرے آقا کے کپڑے مجھ سے جبرًا طلب کئے اُنہیں پہنتے ہی وہ اپنے ناپاک مفسدانہ ارادے کو پورا کرنے کے لئے فورًا روانہ ہوگئے اور قسم کھاکر کہا کہ میں تیری آقا کی عصمت شکنی کرونگا۔ اس کے بعد کلوٹن پر کیا گذری مجھے اسکا علم نہیں۔

گدریوس:- اجازت ہو کہ میں اِس قصّہ کو ختم کردوں۔ میں نے کلوٹن کو وہاں قتل کردیا۔

سمبلین:- خداؤں سے پناہ مانگتا ہوں، تم نے آج ایسے ایسے

بہادری اور شجاعت کے کام کئے ہیں کہ دل نہیں چاہتا کہ
کوئی سخت حکم تمہارے بارے میں زبان سے نکلے۔ اے
بہادر نوجوان جو کچھ تم کہتے ہو اُس سے انکار کر دو۔

گدریوس:۔ میں تو کہہ چُکا کہ میں نے اُسے قتل کر دیا۔

سمبلین:۔ کلوٹن شہزادہ تھا؟

گدریوس:۔ مگر گستاخ۔ بیہودہ اور ناشائستہ جو
جو بدسلوکیاں اُس نے میرے ساتھ کیں وہ ہرگز ایک
شہزادے کو زیب نہ دیتی تھیں، نہایت سخت اور ناشائستہ
الفاظ اتنا شور مچا مچا کر میری نسبت کہے کہ اگر سمندر
میں بھی وہ جوش و خروش ہوتا تو میں اُس کی بھی پروا
نہ کرتا۔ میں نے اُس کا سر قلم کر دیا اور میں خوش ہوں
کہ آج وہ یہاں کھڑا یہ قصّہ بیان نہیں کرتا۔

سمبلین:۔ مجھے تمہارے حال پر افسوس ہوتا ہے تم خود
اپنی زبان سے اپنے جُرم کا اقبال کر رہے ہو۔ ہمارے ملک
کے قانون کے مطابق تم سزائے قتل کے مستوجب ہو اور تم
قتل کئے جاؤ گے۔

ایموجن:۔ اس بن سر کی لاش کو تو میں اپنے شوہر کی لاش
سمجھی تھی۔

سمبلین:۔ قاتل کی مُشکیں کس لی جائیں اور اُسے ہمارے
سامنے سے ہٹا لیا جائے۔

بلاریوس:۔ عالیجاہ! ذرا توقّف فرمائیں۔ یہ شخص جس نے
کلوٹن کو مارا ہے کلوٹن سے بہتر آدمی ہے اور ایسے والدین
کا فرزند ہے جیسے والدین کے فرزند آپ ہیں اور آپ سے
ایسے انعام کا مستحق ہے جو کلوٹن کا ایک پورا طبقہ بھی
مستحق نہیں ہو سکتا (سپاہیوں سے کہتا ہے) بازوؤں
کو ہاتھ نہ لگاؤ یہ ہاتھ مُشکیں کسنے کیلئے نہیں بنے ہیں۔

سمبلین:۔ اے بڈھے سپاہی! کیا تو اپنے اوپر ہمارا
غضب نازل کر کے اپنی اُن خدمتوں کو جو تو نے کی ہیں
غارت کرنا چاہتا ہے؟ ابھی تو تجھے تیرے کارناموں کا صلہ
بھی نہیں ملا ہے تم نے کیسے کہا کہ یہ شخص ایسے ہی باپ
کی اولاد ہے جیسے کہ میں ہوں۔

اروریگس:۔ اِس میں اُس نے حقیقت سے بھی بڑھکر
بات کہی ہے۔

سمبلین:۔ اور ایسی بات کہنے پر وہ قتل کیا جائیگا۔

بلاریوس:۔ ہم تینوں ساتھ قتل ہونگے لیکن ہم تینوں میں دو
ایسے اچھے ہیں جیسے کہ ان میں سے ایک کی نسبت کہہ چکا ہوں۔
میرے پیارے بچو! جب تک میرا تعلق تم سے ہے میں اس وقت
ایک ایسی خطرناک تقریر کرنیوالا ہوں جس میں تمہارا فائدہ ہے۔

اروریگس:۔ آپ کو اگر خطرہ ہے تو ہمکو بھی وہی خطرہ ہے۔

بلاریوس:۔ جو بات دراصل ہے اجازت ہو تو عرض کروں۔
اے بادشاہ! آپکی رعایا میں ایک شخص تھا جسے بلاریوس
کہتے تھے۔

سمبلین:۔ اس کا یہاں کیا ذکر ہے وہ تو ایک سرکش باغی تھا
جو یہاں سے جلاوطن کر دیا گیا۔

بلاریوس:۔ وہی شخص اتنا بوڑھا ہو کر آج حضور کے
سامنے حاضر ہے۔ وہ جلاوطن ضرور ہوا تھا مگر مجھے اس کا
علم نہیں کہ وہ سرکش و باغی بھی تھا۔

سمبلین:۔ اِسے یہاں سے لیجاؤ۔ اگر تمام دُنیا اس کی سفارش
کرے تب بھی اُس کی جان سلامت نہیں رہ سکتی۔

بلاریوس:۔ حضور اتنا غصّہ نہ کریں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ
آپ کے اِن دونوں فرزندوں کی پرورش میں جو کچھ میرا صرف
ہوا ہے وہ ادا کیجئے اور جو رقم اس طرح آپ ادا کریں وہ ادا
کرتے ہی ضبط کر لیں۔

سمبلین:۔ یہ تم نے کیا کہا کہ میرے دو فرزندوں کو تم نے

بلاریوس :- میں صاف گو اور دریدہ دہن ہوں۔ اور کسی قدر غصّے میں بھی ہوں۔ میں حضور کے سامنے دوزانو ہوتا ہوں لیکن اُٹھنے سے پہلے اپنے دو بیٹے پیش کرتا ہوں تاکہ اُنکے بُڈھے باپ کی جان بخشی ہو۔ اے شاہ ذیجاہ! یہ دونوں شریف جو مجھے باپ کہتے ہیں میرے بچّے نہیں ہیں یہ آپکے فرزند ہیں اور آپکے خون سے پیدا ہوئے ہیں۔

سمبلین :- میرے بچّے کیسے۔

بلاریوس :- اِس بات کا یقین ایسا کیجئے جیسے کہ آپکو اپنے باپ کا بچّہ ہونے کا یقین ہے سُنیئے میں جواب مورگن کا نام رکھتا ہوں وہی بلاریوس ہوں جس کو مدّت ہوئی کہ آپنے جلا وطن کیا تھا میرا جُرم محض آپ کی خوشی اور ایک خیال تھا۔ میری سزا اور میری شجاعت جس میں میں نے بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھائیں وہی نقصان تھا جو میں نے آپکا کیا تھا۔ یہ شریف شہزادے، جو شریف ہی ہیں اور شہزادے بھی آج بیس برس سے میں اُن کی پرورش کرتا رہا ہوں اور اِس کُل زمانے میں ان کی تعلیم و تربیت کرتا رہا جو علم میں جانتا تھا وہ سب انکو سکھائے۔ میری تعلیم و تربیت جیسی کچھ تھی حضور اس سے واقف ہیں ان کی دایہ یوریفلی تھی جس سے میں نے ان شہزادوں کو چُرانے کے لئے عقد کر لیا تھا۔ جو کچھ میرا قصور قرار دیا گیا تھا جب کہ اس کی سزا مجھے مل چکی ہے تو میں نے اُس دایہ سے شہزادوں کے چُرانے کی تحریک کی جب خیر خواہی اور وفاداری کے بدلے مجھے جلاوطنی کی سزا ملی تو پھر واقعی میں حضور سے باغی ہو گیا۔ جس قدر زیادہ ان بچّوں کے چوری جانے سے حضور کی تکلیف بڑھی تھی اُسی قدر میری غرض [illegible] چُرانے کی پوری ہوتی تھی لیکن شاہا! آپکے دونوں فرزند پھر حضور کے سامنے موجود ہیں اور اب میں ان دونوں سے جو دُنیا میں میرے بڑے پیارے ساتھی تھے جُدا ہوتا ہوں۔ اِس سر پر چھائے ہوئے آسمان کی برکتیں ان پر ہمیشہ نازل رہیں اور مثل شبنم کے وہ ان پر برستی رہیں کیونکہ وہ اِس قابل ہیں کہ آسمان پر ستارے بن کر اُس کی زیبُ زینت ہوں۔

سمبلین :- تم رُو رُو کر اپنا بیان دے رہے ہو۔ گویا تمہارے آنسو جو کچھ تم کہتے ہو اُسپر گواہی دے رہے ہیں لیکن تم تینوں نے جو خدمت آج کی ہے اُس کا ثبوت باور کرنا اتنا دشوار نہ تھا جس قدر اِس قصّے کا باور کرنا جو اس وقت کہہ رہے ہو۔ میرے بچّے کھوئے ضرور گئے تھے۔ اگر یہ وہی ہیں تو میں نہیں جانتا کہ اِن سے بہتر فرزندوں کی تمنّا کوئی باپ کیسے کر سکتا ہے۔

بلاریوس :- تھوڑی دیر اور توقّف فرمائیں، یہ نوجوان جسے میں پولیدور کہتا ہوں یہ حضور کا گدریوس ہے اور یہ دوسرا نوجوان جس کا نام میں نے کاڈول رکھا تھا وہ آپکا اردیرگس ہے۔ یہ آپ کا چھوٹا فرزند ہے جس وقت اُسے چُرایا تھا تو وہ ایک عجیب و غریب شال میں لپٹا تھا جو خود اُس کی ماں ملکہ نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا اور اس کے ثبوت میں وہ شال پیش کر سکتا ہوں۔

سمبلین :- گدریوس کی گردن پر ایک تل تھا جس کی شکل ستارے کی سی تھی اور وہ عجیب قدرتی نشان تھا۔

بلاریوس :- گدریوس موجود ہے ملاحظہ فرمائیں کہ گردن پر قدرت کا وہ نشان اب تک موجود ہے فطرت کی گویا غرض ہی یہی تھی کہ اِس وقت وہ اس کی شناخت کی مکمل شہادت ہو جائے۔

سمبلین :- واہ! اِس وقت میری کیفیت کیا عجیب ہے میں ایک ماں ہوں جس کے تین بچّے ہوئے کوئی ماں کبھی اپنے بطن سے اتنے بچّے ہونے پر اتنی خوش نہ ہوگی جیسا کہ میں ہوں۔

تم پہ خُدا کی برکتیں رہیں۔ تم وہ ستارے ہو جو اپنے فلک سے جُدا ہو کر پھر اُسی میں گردش کرنے چلے آئے۔ ایموجن بیٹی تجھے اس واقعہ نے سلطنت سے محروم کر دیا۔

ایموجن:۔ نہیں حضور۔ مجھے تو دونوں عالموں کی سلطنت مل گئی۔ پیارے بھائی! دیکھو خدا نے ہمیں پھر کس طرح ملایا۔ تم نے مجھے بھائی اس وقت کہا تھا جبکہ حقیقت میں میں تمہاری بہن تھی اور جب میں نے تمکو بھائی کہا تھا۔ تو فی الحقیقت تم میرے بھائی تھے۔

سمبلین:۔ کیا تم پہلے بھی مل چکے ہو۔

اردیرگس:۔ حضور! ہم پہلے مل چکے ہیں۔

گدریوس:۔ اور پہلی ہی ملاقات میں ہم میں محبت پیدا ہو گئی تھی اور ہماری محبت اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ ہم جسے بھائی سمجھ رہے تھے مر نہ گیا۔

کورنیلیوس طبیب:۔ اُسی ملکہ والی دوا کے کھانے سے۔

سمبلین:۔ اے عقل حیوانی، تو بھی عجیب قوت ہے۔ اس مختصر بیان میں واقعات کی اور شاخیں بھی ہیں جنکا حال عجیب و غریب سانحات سے پُر ہے جس کا تفصیلی بیان حقیقت کو واضح کریگا۔ مثلاً یہ کہ تم شہزادے کہاں اور کس طرح رہتے تھے۔ اور ایموجن تم کس طرح ہمارے اس رومانی قیدی کی ملازم ہوئیں۔ بھائیوں سے کیونکر مفارقت ہوئی اُن سے پہلے کس طرح ملنا ہوا۔ اور ایموجن تمہیں یہ حال بھی کہنا ہے کہ گھر سے کیوں نکلیں، اور جب نکلیں تو کس طرف گئیں اور تم تینوں یعنی بلاریوس اور شہزادے لڑائی میں تمہارے شامل ہونیکی کیا وجہ ہے اور ان کے علاوہ اور امور جو اتفاق سے پیش ہوتے رہے سب معلوم کرنے ہیں لیکن یہ وقت اور موقع نہیں ہے کہ ہم ان طولانی سوالات کے جوابات دریافت کریں۔ دیکھو پوستی مس کس طرح ایموجن کا سہارا لئے کھڑا ہوا اور ایموجن کیسی ایک بے ضرر بجلی کی طرح کبھی اپنے شوہر پر کبھی بھائیوں پر اور کبھی باپ پر نگاہ ڈالتی ہے ہر چیز کو مسرت و شادمانی سے متاثر کرتی ہے اور یہی حال خوشی سے اُن کا ہے جو متاثر ہو کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اب یہاں سے چلنا چاہیئے۔ اور سب جائیں میں جا کر بتوں پر قربانیاں چڑھا کر خوشبودار دُھونیوں سے انہیں بھر دیتا ہوں (بلاریوس سے کہتا ہے) بلاریوس! تم میرے بھائی ہو اور میں ہمیشہ تمہیں بھائی کہونگا۔

ایموجن:۔ (بلاریوس سے کہتی ہے) آپ بھی میرے باپ ہیں کیونکہ آپ کے یہاں آرام پانے سے مجھے یہ مبارک دن دیکھنا نصیب ہوا۔

سمبلین:۔ اس وقت سوائے اسیران جنگ کے سب خوش ہیں، ان اسیروں کو بھی خوش کر دیا جائے کہ وہ بھی ہمارے لطف و کرم سے محظوظ ہوں۔

ایموجن:۔ اب مجھے اپنے رومانی آقا سے کہنا ہے کہ میں اب آپکی خدمت کے لئے بھی تیار ہوں۔

لیوکوس:۔ تم خوش رہو۔

سمبلین:۔ وہ غریب سپاہی جو ہمارے لئے اپنی شرافت اور جوانمردی سے لڑا تھا اُسکو بھی اس مبارک وقت میں یہاں آنا چاہیئے تھا اور جس وقت ہم خدا کا شکر ادا کریں تو اُسے بھی یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔

پوستی مس:۔ حضور۔ میں وہی سپاہی ہوں جو ان تینوں لڑنے والوں کے ساتھ تھا اور نہایت زدہ حالت میں حضور کے لئے لڑا تھا۔ میری شکستہ حالی اس وقت اور مقصد کے لئے مناسب تھی۔ یا کیچیمو۔ بتاؤ کیا میں نے ہی تمہیں مار کر گرایا تھا اور جیسے تم کر رہے تھے اگر چاہتا تو وہیں تمہیں ختم بھی کر دیتا۔

پایچیمو:- (زمین پر گھٹنے ٹیک کر کہتا ہے) اس وقت میرے گناہوں کا بوجھ مجھ پر اس طرح گرا ہے جیسے کہ اُس وقت زور و قوت نے مجھے گرایا تھا۔ یہ جان حاضر ہے۔ اسے آپ لے لیں اور یہی میری التجا ہے۔ یہ جان بطور قرض کے میرے پاس ہے۔ لیکن جان سے پہلے یہ انگوٹھی لیجئے اور یہ جوشن بھی حاضر ہے جو دُنیا کی شہزادیوں میں سب سے پاک نفس شہزادی کا زیور ہے۔ جس نے مہر و وفا کی قسم کھائی تھی اور اس قسم میں وہ سچی رہی۔

پوستی مس:- میرے سامنے مت جُھکو۔ جو کچھ زور طاقت مجھ میں ہے اس کا یہی حکم ہے کہ تیری جان بچا دوں اور جو کچھ اذیت و تکلیف تجھ سے پہنچی تھی وہ یہی کہتی ہے کہ تجھے معاف کر دوں۔ زندہ رہ اور آیندہ لوگوں کے ساتھ اپنا برتاؤ بہتر طریقہ کا رکھ۔

سمبلین:- خطا معاف کرنی طبیعت کی فیاضی ہے ہم بھی اس بات کا سبق اپنے داماد سے لیتے ہیں اور اب ہمارا حکم یہی ہے کہ ہم نے سب کو معاف کیا۔

اروی ریگس:- آپ نے اس معرکہ میں ہماری اتنی مدد کی تھی کہ ہمیں بھائی معلوم ہونے لگے تھے مگر اب یہ معلوم کر کے دل خوش ہوتا ہے کہ واقعی آپ ہمارے بھائی ہیں۔

پوستی مس:- شہزادگانِ عالی وقار۔ میں تو آپکا خادم ہوں اور اے روما کے سردار آپ اپنے نجومی کو طلب فرمائیں کیونکہ میں نے ابھی ایک خواب دیکھا تھا اور وہ یہ کہ خدائے جوپیٹر ایک عقاب پر سوار سامنے آیا ہے اور اُسکے ہمراہ چند اور پاک مقدس روحیں ہیں جو میری ہی کُف اور خاندان کی معلوم ہو رہی ہیں جب میں بیدار ہوا تو یہ تختی میں نے اپنے سینہ پر رکھی پائی جو کچھ اس میں تحریر ہے وہ اتنا مشکل ہے کہ میں اس کے معنی نہ سمجھ سکا اب اُسکا مطلب بیان کرنے کے واسطے اس نجومی کو حکم دیں۔

لیوکوس:- فیلارمونس۔

نجومی:- حاضر ہوں۔ خداوند!

لیوکوس:- اس تختی میں جو کچھ لکھا ہے اس کے معنی بیان کرو۔

نجومی:- (تختی کی عبارت پڑھتا ہے) "جبکہ ایک بچۂ شیر کو جو اپنے تئیں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے بادِ بہاری کا ایک ہلکا سا جھونکا اپنے گلے لگائے گا اور جبکہ ایک شاندار درخت صنوبر کی شاخیں جو برسوں ہوئے درخت سے کٹ گئیں تھیں اور مُردہ و خشک ہو گئیں تھیں پھر سرسبز ہو کر اپنے اصل درخت پر نمودار ہونگی اُس وقت پوستی مس کی مصیبتیں دُور ہو جائیں گی۔ برطانیہ خوش قسمت رہے گا۔ امن اور نعمتوں کی فراوانی میں پھُولتا پھلتا رہے گا۔"

لیونتوس آپ وہ بچۂ شیر ہیں اور یہی مفہوم آپکے نام کا ہے یعنی لیو-نتیس (شیر کا بچّہ) (سمبلین سے مخاطب ہو کر) بادِ بہاری کے نرم جھونکے سے مراد آپکی نیک بخت بیٹی ہے ...... اور وہ اپنے شوہر کی نہایت وفادار بیوی ہے اور جو اس وقت بھی تختی کے مضمون کے مطابق بلا آپکے علم و تلاش کے اپنے شوہر کو نہایت مہر و وفا کے ساتھ لپٹی کھڑی ہے۔

سمبلین:- یہ بات تم نے قرینے کی کہی۔

نجومی:- شاندار درخت صنوبر سے مُراد خود بادشاہ سلامت ہیں اور اس شجر کی بُریدہ شاخوں سے مطلب آپکے یہ دونوں فرزند ہیں جنہیں بلاریوس چُرا لے گیا تھا اور جن کی نسبت برسوں سے خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں ہیں اب وہی شاخیں سرسبز ہو کر اس عالیشان درخت پر نمودار ہوئی ہیں جنکی اولاد سے اُمید کیجاتی ہے کہ برطانیہ

امن وسلامتی میں قائم رہ کر وہ ہر طرح نعمتوں سے مالا مال رہیگا۔

سمبلین:۔ اچھا اپنی طرف سے امن وسلامتی کا دور ہم ابھی سے شروع کرتے ہیں اور کاسیس لیوکوس شنوگو ہم فاتح ہیں لیکن ہم قیصر اور رومانی سلطنت کی اطاعت قبول کرتے ہیں اور بقایا خراج کے ادا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں جسے ادا کرنا اپنی شریر ملکہ کے کہنے میں آکر ہم نے بند کر دیا تھا۔ اس شریر ملکہ اور اُس کی اولاد دونوں کو خدا نے انصاف کر کے غارت کر دیا ہے۔

نجومی:۔ خُدا خود آسمان پر بیٹھا اس امن وسلامتی کے سازِ خوشنوا کے سُروں کو ہم آہنگ کرتا ہی اور جو خواب میں نے لیوکوس سے اس لڑائی کے شروع میں جس کی آگ ابھی تک پوری ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے کہا تھا اسوقت اسکی تعبیر پوری ہوتی ہے" اِس خواب میں بیان کیا تھا کہ روما کا عقاب سمت جنوب سے مغرب کی طرف اُونچا اُڑتا ہوا آیا ہی اور سُورج کی کرنوں میں آکر نظر سے غائب ہو گیا ہے" اس سے خبر نکلتی تھی کہ ہمارا شاہی عقاب یعنی قیصر اپنے لُطف وکرم اور نوازشات کو مثل آفتاب کے درخشاں کر کے اسکا نور سمبلین پر برسائیگا اور سمبلین وہ ہی جسکا نور اسوقت مغرب میں چمک رہا ہی۔

سمبلین:۔ آؤ سب ملکر خدا کی تعریف کریں اور اپنے بُت خانوں کی مقدس قربان گاہوں سے دُھونیوں کے دل بادل اتنے اُٹھائیں کہ آسمان پر خُداؤں کے مشام تک وہ پہونچیں۔ ہم اپنی کُل رعایا میں امن کا اشتہار دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ رومانی اور برطانوی نشان دوستانہ طریقے پر ساتھ ساتھ اُڑاتے ہوئے بڑے بڑے جلوس بازاروں میں نکلیں اور جوپیٹر اکبر کے ہیکل میں اِس امن وسلامتی کی تصدیق کی جاتے اور وہاں ضیافت عام کا سامان ہو۔ آج تک کوئی لڑائی اِس لڑائی کی مثل نہیں ہوئی ہوگی جس میں ابھی ہاتھوں سے خُون کے داغ دھوئے بھی نہیں گئے تھے کہ اِس طرح فریقین میں مصالحت اور امن قائم ہو گیا۔

ختم شد

عنایت اللہ دہلوی!

"قوانینِ حیات"

(۱)

جھک گیا جو اور بھی اُسکو جھکایا جائیگا
دیدہ و دانستہ نظروں سے گرایا جائیگا
نقش جو کوشاں نہیں خود ہی اُبھرنے کے لیئے
آپ مٹ جائیگا یا اُسکو مٹایا جائیگا

(۲)

جھک گیا جو اور بھی اُسکو جھکایا جائیگا
دیدہ و دانستہ بے بس کو ستایا جائیگا
رگ ذرا جسکی حمیت کی اگر چل کر گئی
خون پانی کیطرح اُس کا بہایا جائیگا

(۳)

جھک گیا جو اور بھی اُسکو جھکایا جائیگا
دیدہ و دانستہ گرنے کو گرایا جائیگا
جب کسی سے کھنچ نہیں سکتی ہو تصویرِ حیات
نقش باطل کی طرح اُسکو مٹایا جائیگا

(۴)

جھک گیا جو اور بھی اُسکو جھکایا جائیگا
دیدہ و دانستہ خاطر میں نہ لایا جائیگا
جس نے سیکھے ہی نہیں آدابِ محفل کے ابھی
وہ بزمِ ناز سے اُس کو اٹھایا جائیگا

امین حزیں (سیالکوٹی)

جوابِ طلب

۱

عزیز عزیز۔ السلام علیکم۔

تمہیں یاد ہوگا تم نے اپنا ایک افسانہ جو اشاعت کے بعد بہت مقبول ہوا مسودہ کی صورت میں مجھے دکھایا تھا۔ خیالات کے انوکھے پن کے لحاظ سے بے مثل تھا۔ مگر میں نے فوراً گرفت کرلی کہ گالزوردی کا مال ہے۔ تم نے انگریز اشخاص کے نام بدلکر پارسی اور بنگالی ناموں سے اس کی شکل مسخ کرنے کی کوشش کی تھی مگر آنکھ والوں سے اصلیت چھپ نہ سکی تھی۔ میں نے تم پر اردو کے اور افسانہ نویسوں کے ساتھ لپیٹ کر بہت لے دے کی تھی اور اس فعل کو "چوری" سے تعبیر کیا تھا۔ تم اسے "استفادہ" کہتے تھے۔ اب تمہیں یاد آگیا ہوگا۔ اس بحث کا تکرار کی ضرورت نہ ہوگی۔ میرا یہ دعویٰ تمہیں یاد ہو نہ آیا تھا کہ "مواد کا کال نہیں۔ ہمارے گرد و پیش ہر وقت افسانے کھیلے جارہے ہیں۔ روزمرہ کی سینکڑوں وارداتیں ایک سے ایک تخیل کی تحریک کرتی ہیں۔ مبصر اہلِ قلم ان پر قبضہ کرلیتے ہیں اور ہمارے سامنے کاغذی پیراہن میں پیش کردیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہم میں قوتِ تخیل مفقود ہے۔ طبعزاد افسانے جن میں زندگی کے پیچیدہ مسائل پیش یا حل کئے جائیں خود تیار نہیں کرسکتے بلکہ چراتے ہیں۔ یہ دماغی افلاس نہیں تو کیا ہے؟"

تم نے اسے بڑا بول کہا تھا اور مجھے چیلنج دیا تھا کہ ایسا کوئی چربہ ہی قلمبند کرکے دکھا دو تو جانیں۔

افسانہ میرا میدان نہیں۔ میں اس کھیل یا کرتب کا تماشابین رہا ہوں مگر جیسے تماشابین بعض وقت جوش میں آکر میدان میں کود پڑتے اسی طرح میں تھوڑی دیر کے لئے اس کھیل میں شریک ہوگیا ہوں یا پھنس گیا ہوں۔ مگر شاید یہی تمہارے چیلنج کا کافی جواب ہو۔

بلا رنگ آمیزی و انشاپردازی مختصراً میرا ذاتی واقعہ سن لو۔ چونکہ واقعہ سچا ہے مجھے صرف نام بدلنا پڑے۔ گفتگو زیادہ تر انگریزی میں ہے۔ اس لئے زبان بھی زیادہ تر میری ہے۔

ایک مہینہ ہوتا ہے بیگم کو ساتواں بچہ تولد ہوا۔ آخری دو بچوں کے درمیان صرف سوا برس کا فرق ہے۔ ایسی عورت کی صحت کا کیا پوچھنا ہے۔ علاج کے لئے میں نے مسز باسو کو بلایا۔ عیسائی ہے۔ ہماری اس کی پرانی شناسائی ہے۔ اس کا خاندان کبھی ہمارا ہمسایہ تھا۔ ہم نے اسکو چھوکری بھی دیکھا ہے اور اس کی کافر جوانی بھی۔ میں قسم نہیں کھا سکتا کہ اس کے لئے میرے دل کے کسی گوشے میں کبھی کوئی جگہ نہیں رہی ہے۔ سینما کی ایک چلتی پھرتی چھاؤں تھی۔ تعلیم کے لئے وہ کلکتہ چلی گئی۔ شادی ہوگئی۔ برسوں باہر رہی اور فراموش۔ اب وہ پھر مستقلاً یہاں رہ پڑی ہے۔

بیگم:۔ مسز باسو۔

مسز باسو:۔ آپ اپنی پرانی للی کو بھول گئیں؟ میں تو وہی شریر للی ہوں جو آپ کے باغ سے امرود چرا کر کھایا کرتی تھی۔

بیگم:۔ ہاں للی مجھے یاد ہے۔ کھانے سے زیادہ تم برباد کرتی تھیں۔ تم اب بھی جوان ہی ہو۔ درختوں پر چڑھ سکو تو جاؤ امرود توڑ لاؤ اور کھاؤ۔

للی:- (ہنسکر) اب وہ مالی تو نہیں؟ اُس کی ڈانٹ اور ڈھیلے اب تک یاد ہیں۔ داغ بھی موجود ہے۔ یہ دیکھئے۔ ہماری امرود کی چوری میں اکثر آپ کا بھی حصہ تو ہوتا تھا۔

بیگم:- مدت کے بعد تم سے ملکر بڑی خوشی ہوئی، برابر آیا کرو۔ تمہاری بہنیں اور ماں ہم سے کس قدر ملتی تھیں۔ مگر تم تو اب ڈاکٹر ہو۔ اچھا ڈاکٹر علاج ولاج تو ہوتا رہے گا کوئی ایسی تدبیر کرو کہ اب بچہ نہ ہو۔ میں آپریشن کے لئے بھی تیار ہوں خواہ میں اس سے جانبر نہ ہوں۔

میں:- گیارہ برس کے اندر سات بچے ہو گئے، ہر دوسرے برس عدم آباد سے ایک مسافر موجود۔ ان میں ڈیڑھ برس کا بھی فرق تو نہیں ہوتا۔ ہم ان ناخواندہ مہمانوں سے عاجز ہیں۔ یہ بچے کیکڑوں کی طرح ماں کو کھائے جاتے ہیں۔

للی:- (مسکراکر) قصور کس کا ہے؟

میں:- جو جنے۔

بیگم:- (جھینپکر) شرم تو نہیں آتی۔ یہ ڈھٹائی؟ للی یہ باتیں جانے دو۔ میرے دُکھ کا کوئی اور علاج نہیں۔ آپریشن کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

للی:- بہن ہندوستانی اور مسلمان بیوی ہو کر بچے روکنے کو کہتی ہو؟ اول تو آپریشن آیندہ صحت کے لئے سخت خطرناک ہے۔ دوسرے کون جانتا ہے زندگی کی کڑی منزلیں طے کرتے کرتے ان مسافروں میں کتنے رہ جائیں گے۔ توبہ توبہ۔ اللہ سب کو رکھے۔ مگر اُس کی مرضی دعاؤں سے کہیں پلٹتی ہے؟ اسی طرح مسز مکرجی نے چھ اولادوں سے تنگ آکر عمل جراحی کرالیا۔ عجب اتفاق۔ دو برس کے اندر وہ چھوٹوں سدھار گئے۔ آج وہ ایک چوہیا کے بچے کو ترستی ہے۔ اگرچہ آپریشن کے سوا سب تدبیریں ناقابل اعتماد ہیں، جو کر سکیں کیجئے مگر بانجھ تو نہ بنئے۔ قدرت کے ساتھ زیادہ ڈھٹائی سے مقابلہ کرنا بڑا خطرناک ہے۔ اور آپ تو مذہبی بیوی ہیں یہ خدا سے مقابلہ کرنا ہے۔

مجھے دیکھئے۔ "اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے، ایک اولاد سے ابھاگی ہوں"۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

نسخہ لکھکر اُٹھی اور باہر نکلکر میرے ساتھ چمن میں ٹہلنے لگی۔ پھول، پیڑ، بیلیں دیکھیں بھالیں۔ مجھ سے کہا "میں نے سبزی اور پھولوں کے امریکی بیج منگوا کر گاچھیاں تیار کی ہیں۔ آپ تو کبھی آتے نہیں۔ کسی دن آجایئے تو اپنا باغ دکھاؤں۔ گاچھیاں ضرورت سے بہت زائد ہیں جتنی آپ چاہیں منگوالیں"۔ کچھ پودے میرے ہاں سے لیتی گئی اور چلتے چلتے ایک بار اور اپنے ہاں آنے کی تاکید کرتی گئی۔

میں دو تین مخصوص احباب و اعزا کے سوا لوگوں سے بے ضرورت ملتا کم ہوں۔ للی نے فیس بھی نہیں لی تھی۔ بیگم کی حالت کی رپورٹ بھی کرنا تھی اور جی بھی چاہا۔ جانا پڑا۔ بڑی مسرت سے ملی۔ ہاتھ ملایا تو چھوڑا نہیں، لئے ہوئے اپنے باغ میں پہونچی۔ اپنے پھول پھل سبزیاں دکھائیں کچھ سبزیاں پھل اور گاچھیاں میری گاڑی میں رکھنے کی ہدایت کرکے مجھے لئے ہوئے کمرے میں آبیٹھی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں الہیات، تصوف، مذہب اور اخلاق پر بحث چھیڑ دی۔ اور میری دُکھتی ہوئی رگ پکڑلی۔ تم جانتے ہو یہ میرا خاص میدان ہے۔ مذہبی رواداری اور بلند نظری کے پرچار کے لئے میں کافی بدنام ہوں۔ کہنے لگی "میں نے حضرت محمدؐ کے میلاد۔ سری کرشن جی کے جنم اور راجہ رام موہن رائے کی برسی کے جلسوں میں آپ کی تقریریں بڑی دلچسپی سے سُنی ہیں اور اِس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ آپ سب دھرموں اور مذہبوں کو ایک ہی اعلیٰ اور پاک مقصد کے مختلف

ذریعے سمجھتے ہیں۔ یہ راستے اتنے قابلِ اعتنا نہیں جتنی اصل منزلِ مقصود ہے۔ آپ کی ایک ہی بتّی اور رنگ رنگ کے گلوب کی مثال مجھے یاد ہے۔ دھرمیوں نے صرف اپنے اپنے مخصوص رنگ کے گلوبوں ہی کو روشنی سمجھ لیا ہے اور اصل روشنی یا مقصد دکھائی نہیں دیتا۔ اسی بھول سے ساری کٹھنائیاں ہیں۔ آپ کا یہی عقیدہ اب بھی تو ہے؟"

میں:۔ بے شک۔

للی:۔ صرف عقیدہ ہی یا عمل کی ہمت بھی؟

میں:۔ تمہارا مطلب؟

للی:۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی اعلیٰ مقصد اور اس کے ذرائع میں ٹکر ہو تو آپ ذریعہ کی پروا کریں گے یا مقصد کی؟

میں:۔ مقصد کی۔

للی:۔ سمجھکر جواب دیجئے۔ فرض کیجئے کہ آپ کو کسی بلند مقصد کے لئے ضرورت پڑے جھوٹ بولنے کی، چوری کرنے کی، نمازیں قضا کرنے کی، فرض روزے توڑ دینے کی، حج ملتوی کر دینے کی، تو آپ کرینگے؟

میں:۔ میرے خیال سے کرنا چاہیئے۔ مگر ایسی صورتوں کا پیش آنا صرف قیاسی مفروضہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

للی:۔ جی نہیں۔ عملی واقعات ظہور پذیر ہو سکتے ہیں مثلاً ایک خونریز بلوہ فرد کرنا ہو جس کے لئے آپ جیسی دوسری باا ثر شخصیت جس پر فریقین کو اعتماد ہو موجود نہ ہو اور آپ چلے جائیں حج کو۔ محلے میں آگ لگ جائے یا سیلاب آجائے اور اس کشمکش میں جلتوں اور ڈوبتوں کو چھوڑ کر آپ نماز پڑھنے لگیں یا افطار کرنے لگیں۔ کھنچی ہوئی تلواروں اور اٹھے ہوئے ڈنڈوں کو گرا لے اور خونریزی کو روک دینے کے لئے صرف ایک جھوٹ کافی ہو مثلاً یہ کہ "گائے کی قربانی روک دی گئی ہے تم اپنے اپنے گھر جاؤ"۔ مگر آپ کو اس جھوٹ میں تامل ہو۔ اور تلواریں چل جائیں۔ گھر لٹ جائیں۔ آگ لگ جائے۔ ایک یتیم کا وثیقہ اس کے چچا نے غصب کر لیا ہو، اور وہ بیچارہ اس کے بغیر اپنی موروثی جائداد سے محروم، نانِ شبینہ کا محتاج، گدا ہو۔ آپ اس کے چچا کے گھر آتے جاتے ہیں، وثیقہ چرا لا سکتے ہیں، مگر چوری کو حرام سمجھتے ہیں۔

میں:۔ تم تو بڑی منطقی مقنّن ہو گئی ہو۔ تم اپنا مدعا صاف بیان کرو۔ چاہتی کیا ہو؟

للی:۔ میں سردست آپ سے صاف صاف سُننا چاہتی ہوں کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیئے یہی نہیں بلکہ آپ کیا کرینگے! حالات کی نزاکت کے لحاظ سے اہم اور اعلیٰ مقصد پر مذہبی احکام اور اخلاقی قانون کو قربان کرینگے یا نہیں؟

میں:۔ میرا جواب پہلے سے تیار تھا۔ اتنی تقریر کی ضرورت نہ تھی۔ مذہبی احکام ہوں یا اخلاقی یا قانونی میں کسی کو مطلق اور ناطق نہیں سمجھتا۔ سب حالات کے تابع ہیں اور سب کی روح بنی نوع انسان کی بھلائی اور سُکھ ہے۔ اس اصول پر ہر اصول قربان کیا جا سکتا ہے اور موقع ہو تو میں خود حتی المقدور تیار رہوں بلکہ ایسی خدمتوں اور قربانیوں کا متمنّی۔ خلقِ خدا کی خدمت کو میں خدا کی خدمت اور اسکی محبت کا تنہا وسیلہ سمجھتا ہوں۔

اِس ڈھیٹ عورت نے میرا مُنہ چوم لیا۔ قبل اس کے کہ اس ناگہانی حادثہ کے متعلق میں کچھ سمجھ سکتا اور نہ فیصلہ کر سکتا۔ خیر میں تاثرات کی مصوّری پر زیادہ وقت اور کاغذ صرف نہیں کرنا چاہتا۔ ایک سکنڈ کے اندر وہ اپنی جگہ پر بیٹھکر ہنستی ہوئی بولی۔

للی :- "میری اضطراری آزادی کو معاف کیجئے۔ میں اس خوشی کو ضبط نہ کر سکی کہ ایک آپ ہی میرے ہم مذہب نکلے ہیں بہتیرے تعلیم یافتہ آزاد خیال، ہندو، آریہ سماجی، برہمو سماجی، مسلمان عیسائی اور پارسی سے اسی قسم کے سوال کر چکی ہوں۔ مگر کسی نے "ہاں" کی جرأت نہیں کی۔"

میں نے اپنی بوسہ آلودہ کھچڑی مونچھوں کو رومال سے پونچھکر پوچھا "آخر ایسی بحثوں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ یہ تم نے نہیں بتایا؟" اُس نے کہا "ابھی رہنے دیجئے پھر بتاؤنگی۔ مسٹر پاسو (شوہر) کی دوا کا وقت آگیا ہے۔ ابھی پلا کر آئی۔"

پانچ منٹ میں آئی، دوسرے کمرے میں لے گئی جہاں چائے کا سامان کسی قدر تکلف کے ساتھ مہیا تھا۔ زبردستی مجھے سینڈوچ کیک چاکلیٹ انگور سیب ٹھنسائے چائے پیکر میں رخصت ہوا اور اتوار کو کھانے میں شرکت کا وعدہ لیکر اُس نے پیچھا چھوڑا ....

باقی آئندہ۔ تمہارا لطیف

---

(۲)

عزیز عزیز۔ السلام علیکم ....

.... تیسرے ہی روز اتوار تھا۔ وعدہ سے زیادہ مجھے اس کے "پھر بتاؤنگی" کے جواب کی بیتابی تھی اور سچ پوچھو تو اس ادھیڑ عمر میں بھی ایک گھڑی کا وہ اختلاط کچھ کم صبر آزما نہ تھا۔

صاف ستھری تو وہ ہمیشہ رہتی ہے۔ آج زریں جارجیٹ کی ساڑی پہنے اور بانکی وضع سے بال سنوارے زیادہ دلکش اور جوان نظر آتی تھی۔ اس کا شوہر مسٹر پاسو بھی تھا۔ دمہ سے ٹوٹا ہوا۔ وہ کسی وقت ہڈ ماسٹر اور انسپکٹر مدارس رہ چکا ہے۔ فلسفہ کا ایم۔ اے ہے۔ کھانے پر مسئلہ کفارہ، شفاعت، محبت، مکتی، نروان، اور "عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" کے مسائل پر خشک گفتگو رہی۔ للی بہایت توجہ کے ساتھ اُس کی مخصوص پرہیزی غذا اس کے سامنے رکھتی جاتی تھی۔ وہ کھاتا نہیں ٹونگتا جاتا تھا۔ وہ دو ڈھائی تیے کھاکر اور زیادہ بولکر جلد تھک گیا، ہانپنے لگا۔ اور معذرت چاہکر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ہم کچھ دیر کھاتے رہے۔ فراغت کے بعد للی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

للی :- "آپنے میرے شوہر کو دیکھا؟ کس قدر قابل رحم صحت ہے؟"

میں :- واقعی؟

للی :- اور مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ کم قابل رحم؟

میں :- ہرگز نہیں۔ زیادہ۔

للی :- لطیف صاحب۔ لوگ مجھے بہت سکھی سمجھتے ہیں۔ کیا سکھ یہی ہے؟ جبکہ آج آٹھ سال سے ایسے ہی ہیں۔ دمہ کے مارے ہوئے، اکثر خون بھی تھوکتے ہیں۔ ہاضمہ ردی۔ اگر یہ درست ہوتا تو کھلا پلا کر میں انہیں کچھ دن سنبھال لے جاتی۔ جب ان پر دمہ کا دورہ پڑتا ہے تو ساری ساری رات ان کی پیٹھ سے لگی بیٹھی رہتی ہوں۔ یہ ہے میری خانگی زندگی۔

میں :- شراب کے شکار ہیں؟

للی :- اور کیا؟ خود کردہ تو ہے ہی۔ اعصاب جگر دل سب از کار رفتہ ہیں۔ لا علاج۔ صرف زندگی کے باقی دن بھرنا ہے۔ جوانی میں چوبیس گھنٹے مخمور رہتے تھے۔

میں :- مسیحیت کا پہلا تحفہ اور تہذیب کا پہلا سبق!

للی :- لطیف صاحب، یہ طنز کا موقع ہے؟ میں بھی مسلمانوں سے بے خبر نہیں ہوں۔ چاہوں تو سینکڑوں (بقیہ بر صفحہ ۸۹)

"ثمرات"

گذرتی ہے جو دل پر اسے اسیرِ غم بیاں کرلے
خموشی پر گمانِ بے حسی کیوں ہو فغاں کرلے

اگر اپنے کو فطرت کا یہ انساں رازداں کرلے
ہر اک ذرّے سے پیدا بے تکلف سو جہاں کرلے

غنیمت ہے جوانی پھر کہاں یہ عہدِ سرمستی
جہاں تک ہو سکے سیرِ خراباتِ مُغاں کرلے

اُمیدِ دو جہاں بن جا اسیرِ خار و خس کب تک
نئی صورت سے ترتیبِ بنائے آشیاں کرلے

اسی پردے میں ہے رازِ طلسمِ کُن فکاں مضمر
جو تجھ سے ہو سکے تو اپنی ہستی کو عیاں کرلے

جہانِ ظلم جس سے لرزہ بر اندام ہو جائے
فغاں ہی تجھ کو کرنی ہو تو پھر ایسی فغاں کرلے

میں جب قائل ہوں تیری ہمتِ ایذا پسندی کا
غمِ کون و مکاں کو اپنے دل میں میہماں کرلے

بہارِ جاوداں بنکر رہے جو لوحِ ہستی پر
تو اپنے گریۂ خوں کو وہ رنگیں داستاں کرلے

بشر کیواسطے عشقِ تمنّا ہے شہنشاہی
یہ وہ نقشِ گرامی ہے جو تسخیرِ جہاں کرلے

خطیبِ گلستاں ہے ہمنوائے گلستاں ہو جا
سمجھ لیں لالہ و گل جس کو پیدا وہ زباں کرلے

محبت بجلیوں سے کھیلنا خود سیکھ جائیگی
نجاتِ آشیاں چاہے تو قدرِ آشیاں کرلے

سلیقہ کسکو مے نوشی کا ہے کسکو نہیں ساقی
ہر اک کی جانچ فرمالے ہر اک کا امتحاں کرلے

فنا ہو کر جہانِ عشق میں، ہو جا بقا ساماں
اسی عمرِ دو روزہ کو حیاتِ جاوداں کرلے

شکستہ خاطروں کی تا بمنزل دستگیری کر
جو واماندہ ہیں اُنکو بھی شریکِ کارواں کرلے

ہے روحِ زندگی آزادیٔ افکار سے قائم
جو اس کو رائیگاں کرلے، وہ سب کچھ رائیگاں کرلے

ہر اک ذرّے کو کردے آشنا بامِ ثریا سے
زمیں کی جس قدر پستی ہے اوجِ آسماں کرلے

مرے ہر سانس میں ہیں جلوہ پیرا صد حیاتِ نو
غرض میری بلا کو ماتمِ عمرِ رواں کرلے

نہالؔ زار تکلیفِ جہاں گردی سے میں چھوٹوں
مجھے جذبِ گلستاں، کاش خاکِ گلستاں کرلے

نہال سیوہاروی

دُنیا کی ساتویں تعلیمی کانفرنس

دو برس سے اہلِ جاپان تعلیمی کانفرنس کی تیاری میں مُنہمک تھے۔ ۱۹۳۷ء کے شروع ہوتے ہی اس کا انتظامی دفتر علیحدہ قایم ہو گیا۔ جو کام اب تک جاپان کی تعلیمی انجمن انجام دے رہی تھی وہ اس کے سُپرد کر دیا گیا۔ ماہ مئی سے دُنیا کے مختلف حصص سے نمایندے آنے شروع ہوتے۔ آخر جولائی تک ان کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی۔ ۲ر اگست سے کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا اور ایک ہفتے تک جاری رہا۔ جاپانیوں نے کانفرنس کے انتظامات جس خوبی سے انجام دیتے اُس کا نقش تمام نمایندوں کے دلوں پر ثبت ہے۔ اس سے بڑھ کر جن باتوں نے سب کے دلوں کو موہ لیا ہے وہ نمایندوں کا شاندار استقبال اور شاہی پیمانے پر مہمانداری ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد چند نیک نفس مُدرسین کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مختلف ممالک کے تعلیمی اداروں کو متحد کر کے قیامِ امن کی تائید میں اس اتحاد سے مدد لی جائے۔ چنانچہ پندرہ برس ہوئے امریکہ میں ایک انجمن نے جنم لیا جس کا نام ورلڈ فیڈریشن آف ایجوکیشن ایسوسیئیشنز ہے۔ اس کا مقصدِ اعظم یہ ہے کہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ سے مختلف اقوام میں دوستی پیدا کی جائے۔ اس ورلڈ فیڈریشن کی کانفرنس ایک سال بیچ ہوتی ہے۔ اب تک اس کی چھ کانفرنسیں امریکہ اور یورپ میں ہو چکی ہیں۔ امسال ساتویں کانفرنس منعقد ہوئی ہے۔ فیڈریشن کی زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس کی کانفرنس ایشیا کے ایک شہر میں ہوئی ہے۔ ٹوکیو نے تمام ایشیا کی لاج رکھ لی۔

دو سال قبل جاپانی تعلیمی انجمن نے ساتویں کانفرنس کو ٹوکیو میں مدعو کر کے اس کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اہلِ جاپان نہایت اعلیٰ درجے کی انتظامی قابلیت رکھتے ہیں۔ یہ جزئیات سے بے اعتنائی نہیں برتتے۔ بال کی کھال نکالنے کا ان میں خاص ملکہ ہے۔ اسی وجہ سے ان کے انتظامات مکمل ہوتے ہیں۔ تعلیمی انجمن نے کام ہاتھ میں لیتے ہی اسے مختلف صیغوں میں بانٹ دیا۔ جن کے بعد میں بہت سے شعبے بن گئے۔ کام کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اوائل ۱۹۳۶ء میں سب کمیٹیوں کا عام اجلاس ہوا تو اس میں آٹھ سو اراکین موجود تھے۔

تمام دُنیا سے نمائندے آ رہے تھے، لہذا ان کا استقبال اور مہمانداری ایک قومی فریضہ قرار دی گئی۔ حکومت نے ڈیڑھ لاکھ این کا عطیہ دیا۔ ڈھائی لاکھ این پبلک سے وصول ہوتے۔ اس چندے میں جاپان کا ایک ایک مدرسہ شریک ہوا ہے۔ مالی امداد کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی تعلیمی اور تمدنی انجمنوں اور اداروں نے بڑی فراخ دلی سے جاپانی تعلیمی انجمن کی امداد کی۔ کسی نے اپنے مقاصد اور کام کی رپورٹ کے پمفلٹ انگریزی میں طبع کرا کے مفت تقسیم کئے۔ کسی نے تحائف پیش کئے۔ کسی نے مختلف نمائشوں کا بار اپنے سر لیا۔ کسی نے نمائندوں کی تفریح کا مفت انتظام کیا۔ کسی نے پارٹیاں دیں۔ جہاز راں کمپنیوں نے اور جاپانی حکومت کی ریلوں نے کرائے میں تخفیف کر دی۔ ہوٹل والوں نے اپنے نرخ میں رعایت کر دی۔ میونسپلٹی نے اپنی ٹرمیوں کے مفت پاس دیدئے۔

سب سے زیادہ مہماں نوازی خود کانفرنس نے انجام دی۔ نمائندوں کی روزانہ آمد و رفت کا صرفہ بالکل بچا دیا۔ ہوٹلوں اور کانفرنس ہال کے درمیان بسیں جاری کر دیں۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ روزانہ صبح کو ٹوکیو کی سیر کرانے کے لئے مفت بسیں چلتی تھیں۔ سہ پہر کو تعلیمی اور دیگر ادارے دکھانے لے جاتی تھیں اور شام کو گھر پہنچاتی تھیں۔ رات کو کوئی تقریب ہوتی تھی تو وہاں بھی بسیں موجود تھیں۔ ایک ہفتے تک نمائندوں کی جیب سے آمد و رفت اور سیر تفریح میں ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیا۔ بلکہ جس ادارے میں دیکھنے جاتے تھے وہاں چائے اور فواکہات سے بھی خاطر کی جاتی تھی۔ کانفرنس کے ڈائرکٹر صاحبان کو مزید مراعات حاصل تھیں مثلاً جاپانی ریلوں پر سفر کرنے کے لئے مفت پاس ملا ہوا تھا۔

جاپان میں غیر ملکیوں کو زبان کی اجنبیت کی وجہ سے سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے سیاح کم ہوتے ہیں جو دس بارہ ین روزانہ دے کر گائڈ ساتھ رکھ سکیں۔ کانفرنس نے ان دقتوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ نمائندوں کی امداد کے لئے یونیورسٹیوں اور کالجوں سے چار سو رضاکار حاصل کر لئے تھے جو انگریزی اچھی طرح بول سکتے تھے اور سب شریف خاندان تھے۔ ان میں نوجوان لڑکیاں بھی تھیں جو اپنی مسکراہٹ سے دلوں کی کوفت دور کرنے کا ملکہ رکھتی تھیں۔ یہ رضاکار ہر ہوٹل اور کانفرنس ہال میں متعین تھے اور نمائندوں کی امداد کرنے کے علاوہ قابل دید مقامات و ادارے دکھانے کے لئے ساتھ جاتے تھے۔

خاطر تواضع کی حد ہے کہ نمائندوں کو ایسے ایسے مواقع دکھا دئے جاتے ہیں جو معمولی سیاحوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتے۔ عرصے کے رہنے والے یا اکابر رجال ہی ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اہل جاپان اپنے مہمانوں کی تفریح کا بہت معقول انتظام کرتے ہیں۔ معلومات میں اضافے کا انتظام اس سے بھی زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ تھوڑے سے عرصے میں اس قدر معلومات فراہم کر دیتے ہیں کہ ہضم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

نمائندوں میں سب سے زیادہ خود جاپانی تھے جن کی تعداد دو ہزار تھی۔ ان کو غیر ملکی نمائندوں کی سی مراعات حاصل نہ تھیں کیونکہ یہ خود میزبان تھے۔ ان کے مقابلے میں غیر ملکی نمائندے ایک ہزار تھے جن میں سے پانسو ممالک متحدہ امریکہ سے آئے تھے۔ دوسری جماعت کناڈا والوں کی تھی جو اسیؔ افراد پر مشتمل تھی۔ تیسرے نمبر پر ہندوستانی نمائندے تھے جن کی تعداد ستر تھی۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہو کہ ایک بین الاقوامی انجمن کے اجلاس میں اہل ہند کی اتنی بڑی جماعت شریک ہوئی۔ اہل ہنود کے لئے یہ امر باعثِ فخر ہے کہ ساٹھ سے اوپر اراکین انہی کے فرقے سے تعلق رکھتے تھے جن میں ایک درجن سے اوپر خواتین تھیں۔ اہل اسلام کے لئے یہ بات باعثِ شرم ہے کہ کوئی مرد ہندوستان سے نہیں آیا۔ ایک صاحب دنیا کا دورہ کرتے ہوئے بیشک آ پہنچے۔ دو عورتوں نے مسلمانوں کی لاج رکھی ہے۔ ان میں سے ایک یعنی مسز جمال الدین ہندوستانی نمائندوں میں سب سے پہلے جاپان پہنچیں۔ اور دوسری یعنی مس قمر جہاں جعفر علی عین وقت پر جاپان آئیں۔ ان کے علاوہ چار مسلمان نمائندے جاپان میں بنے جن میں سے تین عورتیں تھیں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ بیرونی نمائندوں میں عورتیں مردوں سے زیادہ تھیں۔

ہندوستانی نمائندوں میں دو اصحاب کو ورلڈ فیڈریشن کے ڈائرکٹر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اوّل مسٹر سیشادری

پرنسپل گورنمنٹ کالج اجمیر۔ دوئم مسٹر انعام دار ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ریاست ایدر راجپوتانہ۔ نمائندگان ہند کے انتخاب صدر کا مسئلہ بڑا پُر لطف رہا مسٹر سیشا دری نے چائے کی پارٹی پر تمام نمائندوں کو بلایا اور چائے نوشی کے دوران میں صدارت کے لئے اپنا نام خود پیش کیا۔ بعض نمائندے مسکرائے مگر ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور وہی صدر منتخب ہوئے۔ دیگر قابل اصحاب میں کلکتہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر کالیداس ناگ، بنارس یونیورسٹی کے ڈاکٹر گوڈبولے اور بھاؤنگر کے مسٹر ترویدی تھے۔ موخر الذکر لڑکے لڑکیوں کی باہمی تعلیم کے پُرزور حامی ہیں۔

کانفرنس کے اجلاسوں کے لئے امپیریل یونیورسٹی نے اپنی کئی عمارتیں وقف کر دی تھیں۔ آڈیٹوریم میں عام اجلاس ہوتے تھے۔ دوسرے ہالوں اور کمروں میں شعبوں کے جلسے کئے جاتے تھے۔ کانفرنس کے دفاتر، دفتر معلومات، ڈاکخانہ وغیرہ کے لئے بہت سے کمرے مخصوص تھے۔ یونیورسٹی میں طبی کالج بھی ہے۔ اس کا شفاخانہ نمائندگان کانفرنس کے لئے کھلا ہوا تھا۔ وہاں ہر وقت فرسٹ ایڈ کا برگیڈ موجود رہتا تھا۔ ایک انجمن کی جانب سے عارضی کتب خانہ قائم کر دیا گیا تھا۔ جاپانی اور غیر ملکی کھانوں کے دو رسٹارنٹ کھلے ہوتے تھے۔ چند دُکانیں بھی تھیں۔ جاپان ٹورسٹ بیورو کا دفتر بھی موجود تھا جس میں ہر مقام کے سفر کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اور غیر ملکی سکّوں کا تبادلہ بھی ہو سکتا تھا۔ غرضیکہ ہر ضرورت کا لحاظ کر کے اس کا انتظام کر دیا گیا تھا۔

اسی سلسلے میں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ نمائش گاہوں اور دیگر مقامات پر جہاں نمائندوں کی اکثر آمد و رفت ہوتی تھی سفری ڈاکخانہ کی بس بھی جا پہنچتی تھی۔

۲ر اگست کی صبح کو ایک ٹھیٹھ جاپانی رسم ادا کی گئی۔ ملکی و بیرونی نمائندگان و عہدیداران کانفرنس شہنشاہ میجی کے مقبرے پر آٹھ بجے جمع ہوئے اور درگاہ پر آداب بجائے۔ آنجہانی کے عہدِ حکومت میں ہی موجودہ نظام تعلیم جاری ہوا تھا۔ شام کو آٹھ بجے یونیورسٹی میں کانفرنس کا رسمی افتتاح ہوا۔ آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حاضرین کی تعداد تین ہزار کے اُوپر ہو گی۔ اوّل طلبائے یونیورسٹی کے بینڈ نے قومی ترانہ بجایا۔ جملہ حاضرین مودب کھڑے ہو گئے۔ بہت سے جاپانی اصحاب نے بینڈ کے ساتھ آواز ملا کے گایا۔ پھر مسٹر کوماسو صدر مجلس استقبالیہ نے انگریزی میں مختصر تقریر کر کے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اب مسٹر نگاتا صدر جاپانی انجمن تعلیمی کھڑے ہوئے۔ یہ صاحب سابق میں وزیر محکمہ ما درائے بحر رہ چکے ہیں اور جاپانی انجمن کے روح رواں ہیں۔ آجکل بیمار ہیں اور شفاخانہ میں مقیم ہیں۔ اس جلسے کی خاطر ڈاکٹر سے خاص طور سے اجازت لے کر آئے تھے۔ آپ نے ایک طویل تقریر میں اپنی انجمن کی تعلیمی سرگرمیوں، اہل جاپان کی تعلیمی الوالعزمیوں، اور کانفرنس کے اجلاس کی تیاریوں کا ذکر کر کے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ان سے انتظامی نقائص پر چشم پوشی کی درخواست کی۔ بعد ازاں ہز ایکسیلنسی مسٹر ایچی یاسُوئی وزیر محکمہ تعلیم نے مختصر تقریر میں مہمانوں کا استقبال کیا اور کانفرنس کے مقاصد سے ہمدردی ظاہر کر کے کامیابی کی اُمید کا اظہار کیا۔ آپکے بعد سلسلے وار نائب وزیر محکمۂ خارجہ، صدر ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی، گورنر ضلع ٹوکیو، میئر شہر ٹوکیو نے اپنے اپنے محکموں کی جانب سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ تمام اصحاب کی تقریریں جاپانی

زبان میں ہوئیں اور ان کا ترجمہ انگریزی میں سُنایا گیا۔ ایک امریکہ کے اور ایک انگلستان کے نمائندے نے مہمانوں کی جانب سے پُرتپاک استقبال کا شکریہ ادا کیا۔ سب کے آخیر میں ڈاکٹر منرو صدر ورلڈ کانفرنس کھڑے ہوئے۔ آپ نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ اگرچہ مجھے خطبۂ صدارت پڑھنے کا حق حاصل ہے مگر دیر بہت ہوگئی ہے۔ میں اپنا حق کام میں لانا نہیں چاہتا۔ اس دوران میں مسٹر نگاتا علالت طبع کے باعث اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ ان کی جانب سے صدر مجلس استقبالیہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کرکے جلسہ ختم کیا۔

جلسہ افتتاحی کے بعد دو عام اجلاس اور ہوئے۔ پہلا دو روز کے بعد ہوا جس میں صدر کانفرنس ڈاکٹر منرو نے فیڈریشن کے مقصدِ اعظم پر یعنی تعلیمی اداروں کے ذریعہ سے دُنیا میں امن قائم کرنے کے موضوع پر تقریر کی۔ آپ کی تائید میں چند ممالک کے نمائندوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس جلسے میں ہندوستانی نمائندے کو بھی اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ آخری عام اجلاس ۷ راگست کی شب کو ہوا۔ یہ الوداعی جلسہ تھا۔ ڈاکٹر منرو کے بعد مختلف ممالک کے نمائندوں نے اہل جاپان کے پُرجوش استقبال اور شاہانہ مہماں نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر بھی ایک ہندوستانی نمائندے کو تقریر کرنے کا موقع ملا۔ جلسہ قومی ترانے پر ختم ہوا جو یونیورسٹی کے بینڈ نے بجایا تھا۔

تینوں عام اجلاس رات کے وقت ہوئے۔ ان کے علاوہ روز صبح کے نو بجے سے بارہ بجے تک مخصوص مضامین پر مباحث ہوتے تھے۔ کانفرنس کا کام اٹھارہ شعبوں میں منقسم تھا۔

(۱) تعلیم بالغان۔
(۲) کالج اور یونیورسٹی۔
(۳) براڈکاسٹنگ۔
(۴) تجارتی تعلیم۔
(۵) تعلیمی دستکاری۔
(۶) ابتدائی تعلیم۔
(۷) جغرافیہ۔
(۸) صحت
(۹) ہرمن جارڈن کمیٹی۔
(۱۰) گھر اور مدرسہ۔
(۱۱) مدرسین تیار کرنا۔
(۱۲) ما قبل مدرسہ اور کنڈر گارٹن۔
(۱۳) دیہاتی زندگی اور دیہاتی تعلیم۔
(۱۴) سائنس اور تعلیم سائنس۔
(۱۵) ثانوی تعلیم۔
(۱۶) سوسائٹی کی تنظیم۔
(۱۷) مدرسین کی انجمنیں۔
(۱۸) بصارتی تعلیم۔

تمام شعبوں میں اتنے مقالے وصول ہوچکے تھے کہ ہر شعبے کا اجلاس دو دو تین تین روز تک ہوتا رہا۔ روزانہ آٹھ دس شعبوں کے جلسے ہوتے تھے۔ عام طور سے مقالے انگریزی میں پڑھے جاتے تھے۔ جاپانی حاضرین کی خاطر ان کا ترجمہ جاپانی میں کردیا جاتا تھا۔ اسی طرح کوئی تقریر جاپانی زبان میں ہوتی تو اُس کا ترجمہ انگریزی میں کردیا جاتا تھا۔ ہر مقالے پر مباحثہ ہوتا تھا۔ حاضرین کو سوال کرنے کا موقع دیا جاتا تھا اور مقرر کو جواب دینا پڑتا تھا۔ جاپانی نمائندوں کے مقالے انگریزی زبان میں مطبوعہ پمفلٹ کی صورت میں تقسیم کردئے جاتے تھے۔ بیرونی نمائندوں کے مقالے وقت پر نہ پہنچ سکے۔ جو پہنچ گئے وہ

طبع کرا کے تقسیم کر دئے گئے۔ بعض شعبوں میں اس قدر مقالے وصول ہو چکے تھے کہ ان کے پڑھنے کے لئے وقت کافی نہ تھا۔ پڑھنے والوں کو قطع برید سے کام لینا پڑا۔

کانفرنس کے جلسوں کے علاوہ اس قدر مشاغل فراہم کر دئے گئے تھے کہ کسی نمائندے کے بس میں نہ تھا کہ تمام مشاغل پورے کر سکے۔ پہلا شغل ٹوکیو کی سیر تھا۔ اس کے لئے صبح کا وقت مقرر تھا۔ جن اصحاب کو شعبہ جات کے جلسوں سے فرصت ملے وہ سیر کو جا سکتے تھے۔ کانفرنس کی بسیں تین گھنٹے میں مشہور مقامات دکھلاتی تھیں۔

دوسرا شغل۔ مدارس کا معائنہ۔ ماہ اگست میں تمام مدارس تعطیلات گرما کی وجہ سے بند رہتے ہیں بلکہ اوائل جولائی سے بند ہونے لگتے ہیں۔ تاہم ٹوکیو میں چند ابتدائی اور ثانوی مدارس معائنے کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ ان میں طلبا تو حاضر نہ تھے مگر چند مدرّس مامور تھے کہ نمائندوں کو پھرا کر مدرسہ دکھا دیں۔ بعض کنڈر گارٹنوں میں بچّوں کو خاص طور سے بلا کر انہیں کھیلتے ہوئے دکھایا گیا۔ نمائندوں کے گروہ روزانہ امپیریل یونیورسٹی کا معائنہ کرتے تھے۔

تیسرا شغل تعلیمی نمائش۔ اس نمائش میں موجودہ تعلیمی نظام کنڈرگارٹن سے لے کر یونیورسٹی تک دکھایا گیا تھا۔ نیز زمانہ قبل تاریخ سے اب تک کا نظام تعلیم کتابوں اور آلات تعلیم کے ذریعہ سے دکھایا گیا تھا۔ یہ نمائش عورتوں کے نارمل کالج میں تین دو منزلہ عمارتوں میں منعقد ہوئی تھی۔ اس پر بڑی محنت صرف کی گئی تھی۔ اب تک جاپان میں اتنے وسیع پیمانے پر تعلیمی نمائش نہیں ہوئی تھی۔

اسی ذیل میں ایک اور نمائش تھی جس میں لڑکیوں کے ایک ثانوی مدرسے کی طالبات کی دستکاری دکھائی گئی تھی۔ اس نمائش میں صرف پرانی بیکار اشیا سے بنایا ہوا سامان رکھا تھا۔ جو چیزیں ہر گھر میں ردی سمجھ کر پھینک دی جاتی ہیں انہیں سے کار آمد اشیا بنائی گئی تھیں۔

چوتھا شغل۔ جاپانی آرٹ اور تمدّن کی نمائشیں۔ تین نمائشیں قابل ذکر ہیں۔ اوّل ضلع ٹوکیو کی آرٹ گیلری میں موجودہ آرٹ کی نمائش۔ یہاں جدید مصوّری کے شاہکار اکٹھے کئے گئے تھے جو سابقہ نمائشوں میں دکھائے جا چکے تھے۔ اور اب شوقین اصحاب کی ملکیت ہیں۔ دوئم شاہی عجائب خانے میں قدیم آرٹ کی نمائش۔ اس میں محکمہ محلات شاہی کی جانب سے قدیم آرٹ کے نادر نمونے پیش کئے گئے تھے۔

سوئم شیرو کیا ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں جاپانی لباس کی نمائش۔ اس میں ابتدائے تاریخ سے اب تک کے مختلف زمانوں کے لباس دکھائے گئے تھے۔

پانچواں شغل۔ فنون اور ہنروں کی نمائشیں۔ ان میں سب سے اہم آرائش گل کی نمائش تھی کیونکہ مختلف طرزوں کے استاد اس میں شریک تھے۔ اس قسم کی نمائش اب تک جاپان میں نہیں ہوئی تھی۔ اس آرٹ میں جاپان تمام دنیا سے بلند پایہ رکھتا ہے۔ استادانِ فن کے نزدیک آرائش گل کے بہت سے طرز ہیں۔ ہر ایک اپنا ہی طرز سکھاتا ہے۔ یہاں مشہور طرزوں کے استاد جمع تھے اور حاضرین کے روبرو اپنے اپنے طرز پر پھول سجا کر کمال فن کی داد دے رہے تھے۔ یہ نمائش تین روز رہی۔

دوئم۔ خواتین کی دو انجمنوں کی جانب سے نسوانی ہنروں کی نمائش۔ اس میں دو انجمنیں شریک تھیں۔ پہلی جاپانی خواتین کی انجمن ماورائے بحر۔ اور دوسری کلب خواتین جاپان۔ ایک طویل پروگرام میں بہت سی باتیں شامل تھیں۔ اوّل تو ڈرامہ جو سات اراکین نے کر کے دکھایا۔ دوئم عہد ہیان (سنہ ۸۹۵ء تا سنہ ۱۳۱۲ء) کا لباس پہن کر اسی زمانے کا ماحول پیش کرنا۔ سوئم تقریب چائے نوشی۔ چہارم عہد توکوگاوا کے لباس میں ناچ۔ پنجم قدیم جاپانی ناچ۔ ششم آرائشِ گل کر کے دکھانا۔ ہفتم بونکیئی یعنی کشتی میں ریت اور پتھر کے ذریعہ سے مناظرِ قدرت کا چربہ اُتارنا۔ ہشتم عہدِ کماکورا کا لکڑی کا کام بنانا۔ نہم جاپانی کشیدہ کاری۔ دہم جاپانی گڑیا سازی۔ یازدہم جاپانی برُش سے لکھنا اور تصویر کھینچنا۔ تمام باتیں اراکین انجمن نے خود کر کے دکھائیں۔ یہ پروگرام صرف ایک روز پیش کیا گیا اور آخر میں چائے سے تواضع کی گئی۔

سوئم۔ انجمن خواتین قوم پرست کی جانب سے ایک شب کو شادی کا پروگرام پیش کیا گیا۔ اوّل ناکتخدا لڑکی اور شادی شدہ عورت کے بال مارو ماگے اور شِماداطرز پر بنا کر دکھائے گئے۔ دوئم جاپانی آداب کے تین نمونے پیش کئے گئے :۔ زمانۂ حال میں شاہی فرمانِ تعلیم کے پڑھنے کا طریقہ۔ زمانۂ قدیم میں عورت کے نیزے یا لمبے دستے والی تلوار کے استعمال کرنے کا طریقہ۔ زمانۂ قدیم میں مرد کی جانب سے کسی سردار کی خدمت میں تیر و کمان پیش کرنے کا طریقہ۔ آخر میں شادی کی پوری رسم ادا کر کے دکھائی گئی۔

چہارم۔ واسیدا یونیورسٹی میں فوجی کرتبوں کی نمائش۔ مختلف مدارس کے طلبا نے ایک روز جُودو (جیوجِتسو) کودو (چھری کتکا) تیر اندازی، اور لمبے دستے والی تلوار کے فوجی فنون کی نمائش کی۔ لمبے دستے والی تلوار کے کرتب لڑکیوں نے دکھائے تھے۔

چھٹا شغل۔ انجمن مادرانِ جاپان کی جانب سے جملہ نمائندگان کو ایک روز ایک ٹھیٹھ جاپانی مکان میں چائے پر مدعو کر کے مکان دکھایا گیا اور گھر اور مدرسے کے تعلیمی تعلقات پر گفتگو کرنے کا موقع دیا گیا۔

ساتواں شغل۔ جاپان کی میوزیکل اکاڈمی کی جانب سے ایک شب قدیم و جدید جاپانی موسیقی کے نمونے سُنائے گئے۔ نیز مغربی موسیقی کے نمونے پیش کئے گئے۔

آٹھواں شغل۔ ایک روز رقص کے ایک ماہر اُستاد کی جانب سے اسی کے مدرسے میں طلبہ و طالبات نے جاپانی رقص ناچ کر دکھائے

نواں شغل۔ نواب وزیر تعلیم کی جانب سے ایک شب کابُکی تھیٹر میں کابُکی ڈرامہ دکھایا گیا۔

دسواں شغل۔ اخبار نچی نچی کی جانب سے ایک روز تکاراز کا تھیٹر میں زمانۂ جدید کا ڈرامہ یعنی آپیرا دکھایا گیا۔

گیارہواں شغل۔ بین الاقوامی تمدّنی تعلقات کی سوسائٹی کی جانب سے ایک شب کلب نوایان کے نو تھیٹر میں نو ڈرامہ دکھایا گیا۔

بارہواں شغل۔ سوسائٹی مذکورالصدر کی جانب سے کانفرنس کے چند روز قبل جاپانی تمدّن پر لکچروں کا انتظام کیا گیا تھا۔ موسم گرما کے لحاظ سے موقع بہت موزوں تجویز کیا گیا تھا یعنی دامن کوہ فجی میں جھیل یماناکا کے کنارے تین روز تک اُستادانِ فن نے جاپانی تمدّن کے مختلف موضوعوں پر تقریریں کیں۔

تیرہواں شغل۔ ایک ریشم کے کارخانے میں ریشم کی کاشت کا طریقہ یعنی انڈوں میں سے ننھے کیڑے نکلنے کے وقت سے لے کر ریشم کے تاگے کے بنڈل بنانے تک جملہ اعمال دکھائے گئے۔

اسی سلسلے میں گورمنٹ کی ریلوے ورکشاپ بھی دکھائی گئی۔

چودہواں شغل۔ گارڈن پارٹیاں۔ ایک گارڈن پارٹی صدر توکیو امپیریل یونیورسٹی کی جانب سے یونیورسٹی کے جاپانی وضع کے باغ میں دی گئی۔

دوسری گارڈن پارٹی گورنر ضلع توکیو اور میئر شہر توکیو کی جانب سے مشترکہ طور پر ایک مشہور جاپانی وضع کے باغ میں دی گئی۔ ان دونوں پارٹیوں میں ناچ وغیرہ کا بھی انتظام تھا۔

تیسری گارڈن پارٹی ہزاکسیلنسی مسٹر ہروتا وزیر محکمہ خارجہ کی جانب سے ایک محل میں دی گئی تھی جو شاہی مہمانوں کو ٹھیرانے کے کام آتا ہے۔ اس محل میں قدیم جاپانی آرٹ کے نادر نمونے بھی معائنہ کے لئے موجود تھے۔ یہاں ایک یورپین خاتون نے جاپانی مصوری کے ایک شاہکار کے معائنہ کا بالکل انوکھا طریقہ ایجاد کیا۔ اسے ناخن سے کھُرچ کر جانچا اور نقادی کی خوب داد دی۔ نواب وزیر خارجہ کی پارٹی سب سے شاندار اور پُرتکلف تھی۔

اس قدر مشاغل سے عہدہ برآ ہونا مافوق الفطرت انسان ہی کے بس کی بات ہے۔ اہل جاپان نے اپنی طرف سے مشاغل تفریح وتعلیم فراہم کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ان سے مستفید ہونا نمائندگان کا فعل تھا۔ لوگوں نے اپنے مذاق کے مطابق بعض کو پسند کیا اور بعض کو قربان کیا۔ ان میں تنوع اس قدر تھا کہ کسی کو ترک کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ تھوڑا تھوڑا ذائقہ تو ہر ایک کا چکھ ہی لیا ہوگا۔

کانفرنس کی کامیابی پر کئی پہلوؤں سے تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ بحیثیت ایک بین الاقوامی اجتماع کے نہایت کامیاب رہی۔ آج تک جاپان میں اس پیمانے کی بین الاقوامی کانفرنس نہیں ہوئی تھی۔ چالیس اقوام کے تین ہزار اعلیٰ تعلیم یافتہ نمائندوں کا ایک جگہ جمع ہونا اور ہفتے دو ہفتے تک مسلسل ملتے جُلتے رہنا ایک معنی رکھتا ہے۔ جو قومیں اپنے مدرسین کی عزت کرتی ہیں وہی اقبال مند ہوتی ہیں کیونکہ مدرسین کے ہاتھ میں قوم کا بنانا بگاڑنا ہوتا ہے۔ ایسی قوت کے مالک اصحاب بین الاقوامی دوستی کا بیڑا اُٹھا کر تبادلۂ خیالات کریں تو اُمید قوی ہوتی ہے کہ امن عام کا عہد دُور نہیں ہے۔ کتنی نئی دوستیاں قایم ہوگئی ہونگی جو آیندہ حصول امن میں مدد ہونگی۔

فنی حیثیت سے کانفرنس کی کامیابی میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ توکیو کے اجلاس نے پچھلے چھ اجلاسوں کے بہت سے ریکارڈ مات کردئے۔ شعبہ جات کے جلسے یا تو ماہرین کے لئے ہوتے ہیں یا ان کی محنت کی داد دینے والوں کے لئے۔ ان میں بھی مخصوص مذاق اور قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کارکنان کانفرنس کے سابقہ تجربے کی بناپر شعبوں

کے جلسوں کے لئے کافی وسیع کمروں اور ہالوں کا انتخاب کیا گیا تھا مگر اکثر جلسے ایسے ہوئے کہ کمرے کھچا کھچ بھر گئے۔ بعض ایسے ہوئے کہ شائقین سما نہ سکے اور اجلاس دوسرے بڑے ہال میں منتقل کرنا پڑا۔ شعبۂ ابتدائی تعلیم کے اجلاس میں چھ سو سے اوپر حاضرین موجود تھے۔ مسٹر ہیلنگٹن جو دس سال سے اس شعبے کی صدارت کر رہے ہیں چلا اٹھے کہ میرے خواب و خیال میں بھی اتنا اجتماع نہیں تھا۔ شعبہ جات کے جلسوں میں حاضرین کا اتنا اژدہام جاپانیوں کے علمی عشق پر دلالت کرتا ہے۔

شرکائے کانفرنس کو جاپان اور جاپانیوں کے مطالعہ کرنے کے جو مواقع مہیا کئے گئے وہ عام سیاحوں کو ہرگز میسر نہیں آتے۔ اس سے جاپان کے تمدن کی خوب تبلیغ ہوئی۔ جاپان کو اس قلیل عرصے میں بہت سے ثنا خواں دستیاب ہوگئے۔ جاپان اور دیگر ممالک کے درمیان دوستی کے تعلقات پختہ کرنیوالے ذرائع میں معقول اضافہ ہوگیا۔ یہ بھی کانفرنس کی بڑی کامیابی ہے۔

کانفرنس کو کامیاب بنانے کے ساتھ اس کی ہر یادداشت کو محفوظ رکھنے کا بہت معقول انتظام کیا گیا تھا۔ عام اجلاسوں اور شعبہ جات کے جلسوں کی کارروائی سکرٹریوں نے تو لکھی ہوگی اخبارات کے نمائندے ہر جگہ موجود رہتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات کی خبر اخبارات میں آجاتی تھی۔ تصاویر کی کوئی انتہا نہیں۔ ہزاروں فوٹو لئے گئے۔ خوبی یہ کہ دوسرے روز سے احاطۂ کانفرنس میں بکنے بھی لگے۔ روزانہ ہر ہال اور ہر کمرے میں دو دو کارکن آوازوں کو رکارڈ کرنے کے آلات لئے موجود رہتے تھے۔ جلسہ شروع ہونے سے ختم ہونے تک جو کارروائی ہوتی تھی ریکارڈ کرلی جاتی تھی۔ اس طرح آئندہ نسلوں کے لئے کانفرنس کی پوری کارروائی محفوظ کرلی گئی۔

ہندوستانی نمائندے کانفرنس کی ظاہر و باطنی خوبیوں سے نہایت متمتع ہوئے۔ افسوس ہے کہ بعض ہندوستانی عجیب ذہنیت لے کر جاپان میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ بڑی حقارت سے بیان کرتے ہیں کہ جاپان نے جو کچھ کردکھایا ہے وہ مغرب سے سیکھا ہے۔ گویا سیکھنے کا عمل بڑا ذلیل کام ہے یا مغرب سے سیکھنا مذموم فعل ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے کے دماغ میں ایسے جذبات کی موجودگی کیسی حسرتناک ہے۔ اہلِ ہند کو اہلِ مغرب سے تعلقات قایم کئے ہوئے ڈھائی سو برس ہوگئے۔ اس طویل عرصے میں جدید علوم و فنون پر قادر نہ ہونا قومی انتشار ہی ظاہر کرتا ہے۔ اہلِ جاپان کا اسی برس پہلے مغرب سے ٹکر کھاتے ہی مغربی علوم و فنون کے حصول میں منہمک ہو جانا قومی تنظیم اور جاپانیوں کی اولوالعزمی کی دلیل ہے۔

یہ امر قابلِ مسرت ہے کہ چند تجارت پیشہ اصحاب نے معلمی کے پیشے کو ایسا معزز سمجھا کہ خود کسی نہ کسی تعلیمی ادارے سے تعلق ظاہر کرکے نمائندگی کا شرف حاصل کرلیا۔ اس فعل میں انسانی کمزوری کو خواہ کتنا ہی دخل ہو یہ ضرور ہے کہ ضابطے میں ہندوستان کا ڈیلیگیشن اس سے ملوث نہ ہوا اور ہندوستان کی ویسی بدنامی نہ ہوئی جیسی تین برس پہلے مس نوراہل سکرٹری ریڈکراس سوسائٹی ہند کے طرز عمل سے ہوئی تھی کہ انھوں نے ریڈکراس سوسائٹی میں کارکردہ اصحاب کو تو اپنی ڈیلیگیشن میں شریک کرنے سے انکار کردیا مگر ایک ایسے شخص کو جو اس سوسائٹی سے بالکل نابلد تھا محض اس بناء پر شریک کرلیا کہ مس موصوف کے اسسٹنٹ کا رشتہ دار تھا۔

نمائندگان میں مردوں کا لباس تو یکساں تھا مگر عورتیں اپنے اپنے قومی لباس میں ملبوس تھیں۔ جلسوں اور پارٹیوں میں انہی کے لباس سے رنگینی پیدا ہوتی تھی۔ ہندوستانی ساڑھی بہت پسند کی گئی۔ اس کا گھیرا اور لٹکتے ہوئے آنچل عجیب کیفیت پیدا کرتے تھے۔ ماتھے پر لال بندی لطف دوبالا کر دیتی تھی۔ اہلِ جاپان اس کی اہمیت سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ اہلِ ہند کرسی کی نشست میں گھٹنے پر پاؤں رکھ کر سے کیوں سہلایا کرتے ہیں۔ مسٹر سبنا دری کو ڈائس پر بیٹھے ہوئے اس شغل میں منہمک دیکھ کر لوگ بہت محظوظ ہوئے۔

نورالحسن برلاس!

نالۂ دل

(نذرِ دوست)

ہلا کے آہ! مری زندگی کی بنیادیں!
دوچند ہو گئی پابندگیِ کوئے دوست!!

پگھل گیا ہے تپش سے وجودِ معنی بھی
ہے شعلہ بار کچھ اس درجہ آرزوئے دوست

فشارِ کشمکشِ عقل و دل خدا کی پناہ!
نہ لے اُڑے کہیں جوشِ جنوں بسوئے دوست

فضائے قلب پہ مایوسیاں مسلّط ہیں
سنبھال بہرِ خدا! مجھ کو آرزوئے دوست

نہ سرد مہر ہے وہ، اور نہ سخت دل، ہمراز
عجیب دلکش و وجد آفریں ہی خوئے دوست

وہ خود ہے گردشِ دوراں سے دل بریدہ آہ
اُسے بھی خون رُلاتی ہے آرزوئے دوست

ہیں گرچہ تشنۂ ناکام ظاہری آنکھیں
نفس نفس میں سمائی ہوئی ہی بوئے دوست

جو دل کہ مرجعِ صد انبساط تھا، ہمراز
بنا گئی اُسے ناسور آرزوئے دوست

مسافرت کا ہو احساس کس طرح اُسکو
ہر آن جس کے ہو پیشِ نگاہ روئے دوست

تمام صفحۂ ہستی کی وسعتیں ہو جائیں
لکھے ہی جائے قلم لفظِ آرزوئے دوست

دلفگار

(بسلسلۂ ماسبق)

"دَورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی"

مضامین فرسودہ کے پہلے تین عنوانوں کے ماتحت اب تک ہم نے صرف کلام حسرت سے بحث کی ہے اور اسکی وجہ بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ آیئے اب اس سلسلہ میں اختصار کے ساتھ اصغر، جگر، اور فانی کے کلام کا بھی جائزہ لے لیں۔

"میکشی" کے متعلق اصغر و فانی نے جو کچھ لکھا ہے اس کی مقدار نہایت قلیل ہے اس لئے چنداں قابل لحاظ نہیں اور تقلید بے معنی سے باز رہنے کی یہ کوشش چاہے ارادی ہو چاہے غیر ارادی بہرحال پسندیدہ ہے۔ جگر نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس لئے قابل اعتراض نہیں کہ اکثر "حال" ہے۔ محض "قال" نہیں۔ اگرچہ اندازِ بیان میں نقالی کا رنگ نمایاں ہے۔ اب رہ گئے تیغ و خنجر و قتل و خون اور نزع و قبر و حشر کے مضامین تو یہ بھی اصغر کے یہاں بہت کم ہیں۔ نمونے کے طور پر ہم یہاں "نشاطِ رُوح" سے صرف چند شعر نقل کرتے ہیں ؎

تصویر ہی کھنچی ہوئی ناز و نیاز کی ٭ میں سر جھکائے اور وہ خنجر لئے ہوئے

قاتل نگاہِ یاس کی زد سے نہ بچ سکا ٭ خنجر تھے ہم بھی اک نہ خنجر لئے ہوئے

کاش اصغر مرحوم زندہ ہوتے تو ہم فراق صاحب کی معرفت اُن سے پوچھتے کہ "مولنا سچ بتایئے، کیا واقعی آپکی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ بھی آیا تھا جب ناز و نیاز کی یہ نرالی تصویر کھنچی تھی کہ آپ سر جھکائے ہوتے ہیں اور وہ خنجر لئے آپ کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہے اور اس کے بعد روہیلہ سردار کی طرح جب وہ آپ کو پچھاڑ کر قتل کی نیت سے آپکی چھاتی پر سوار ہوا اور چھری گلے پر رکھدی تو آپ نے کچھ ایسی یاس بھری نظروں سے اُسے دیکھا کہ اس کا "ہارٹ فیل" ہو گیا"۔ تو مولنا ایک راستباز انسان کی طرح یقیناً یہی جواب دیتے کہ "نہیں یہاں یہ تو محض "شاعری" ہے۔ حقیقت سے اِسے کیا واسطہ"۔ اللہ اللہ! اب ہماری شاعری تقلید بے معنی کے ہاتھوں اس درجہ پر پہونچی ہے کہ ہر بے سرو پا بات، ہر دور از کار مبالغہ، ہر دروغ بے فروغ "شاعری" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

وہ دستِ ناز جو معجز نمائیاں نہ کرے ٭ لحد کا پھول چراغِ سرِ مزار نہ ہو

نقشِ قدم ہیں یہ اُسی جانِ بہار کے ٭ اک پنکھڑی پڑی ہے لحد پر گلاب کی

یہ بات مُسلّم ہے کہ ہر شاعر کا بیدرد محبوب غمِ فراق میں گھلا گھلا کے اُسے تمام کر دیتا ہے۔ یہی معاملہ اصغر مرحوم کے ساتھ بھی پیش آیا مگر اسے مولنا کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ اُس آدم کُش نے مولنا کے مزار پر آنے اور پھول چڑھانے کی تکلیف گوارا کی۔ بہت سے بدقسمتوں کو تو یہ اعزاز بھی نصیب نہیں ہوتا۔

ہمارے اس بیان سے کہ اصغر و فانی نے "میکشی" کے متعلق بہت کم اشعار لکھے ہیں اور اصغر کے یہاں تیغ و خنجر اور قتل و خون نیز مرگ و لحد کے مضامین بھی محض خانہ پُری کے لئے ہیں، قارئین کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ ان حضرات کی شاعری

میمونانہ نقالی سے خالی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ نقالی کا میدان ماشاءاللہ بہت وسیع ہے۔ جیسا کہ ہماری فہرست مضامین فرسودہ سے ظاہر ہے۔ اب اپنی اپنی پسند ہے۔ کسی کو کوئی موضوع مرغوب ہے۔ کسی کو کوئی۔ غلطی سے اسی کو بعض حضرات شاعر کے "انفرادی رنگ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ خیر یوں ہی ہی۔ بہرحال نقالی۔ الغرض۔ اصغر نے اگر "میکشی" میں کمی کی ہے تو "فلسفہ باقی" سے اس کا بدل کر دیا ہے۔ اور فانی نے اس کے عوض میں نزع و مرگ و قبر و ماتم کا سوانگ بھرا ہے جس کی تفصیل جلد پیش کی جائے گی۔

اصغر کے بعد جگر کا نمبر ہے لیکن قبل اس کے کہ "شعلۂ طور" سے جگر کی بے کیف نقالی کے نمونے پیش کئے جائیں۔ "شعلۂ طور" کے مقدمہ نگار سید سلیمان ندوی صاحب کے بعض بیانات کا یہاں نقل کر دینا مناسب ہے تاکہ مقدمہ نگار اور شاعر کے قول کا مقابلہ کرنے کے بعد قارئین کو معلوم ہو جائے کہ مولانا صاحب نے بیچارے جگر پر کیسے کیسے "بہتان" باندھے ہیں۔ "بہتان" کے معنی لغت اور اصطلاحِ عام میں چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ میں اپنے نزدیک اسے بھی بہتان ہی سمجھتا ہوں کہ ایک "رندِ شاہد باز" کو "ملائے پارسا" بتایا جائے یا بالفاظِ دیگر کسی شخص کو ایسے صفات سے موصوف کیا جائے جن سے وہ حقیقتاً بیگانہ ہے یا کسی کے متعلق ایسی باتوں سے انکار کیا جائے جو یقینی طور پر اس میں پائی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ سب "اتہام" و "بہتان" کی مختلف صورتیں ہیں۔ سید سلیمان ندوی صاحب جگر کے دیوان "شعلۂ طور" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

(۱) "نہ اس کے کاشانۂ خیال میں چشمہائے بسمل کی آئینہ بندی ہے نہ اس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری ہے نہ اس کے کوچے میں شہدا کے دل و جگر کی گلکاری ہے"

(۲) "تاثر اور دلفگاری اس کے ہر مصرع کی جان ہے... وہ ...... آجکل کے بعض طالب اثر شاعروں کی طرح نہیں جو لاش و مدفن و سورۂ یسین و نوحہ و بین و میت و نزع کا ایک تیر کمند صفت پھینک کر بالقصد مرغِ اثر کو شکار کرنا چاہتے ہیں"

(۳) "جگر کی شاعری میں نہ زلف و شانہ ہے ...."

(۴) "جگر کا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ ......"

مندرجِ بالا سطور میں سید صاحب نے چار دعوے کئے ہیں مگر کلامِ جگر کے مطالعہ کے بعد انسان یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جگر کے متعلق اس سے زیادہ معصومانہ غلط بیانی آج تک کسی نے نہیں کی۔

پہلے چشمہائے بسمل کی آئینہ بندی دیکھئے ؎

دمِ بسمل[1] اگر ہم چھیڑ دیتے دل کے زخموں کو ٭ لہو کا قطرہ قطرہ دردِ دل کی داستاں ہوتا

پھر "بسمل" کی یہی ایک تنہا مثال نہیں۔ آئندہ اشعار میں اور بھی متعدد "بسمل" آپ کو ملیں گے۔ سید صاحب کا دعویٰ

---

[1] "دمِ بسمل" محلِ نظر ہے۔ شادانی۔

ہے کہ جگر کے محبوب کے ہاتھوں میں قصّاب کی چھری نہیں۔ خدا جانے جگر کا یہ شعر سید صاحب کی نظر سے گذرا ہو یا نہیں ؎

مژدہ اے شوقِ شہادت اوج پر تقدیر ہے ؛ آج دستِ ناز میں نازک سی اک شمشیر ہے

شاید بلحاظِ نزاکت مولانا نے اس شمشیر کو قصّاب کی چھری کہنا مذاقِ سلیم کے خلاف سمجھا۔ اچھا اور سنیئے ؎

صدقے ان ہاتھوں کے مجھکو بھی خبر تک نہ ہوئی ؛ اس نزاکت سے گلے پر مرے شمشیر چلی

یہاں خود شمشیر تو نازک نہیں لیکن نزاکت سے چلائی گئی ہے۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اسے بھی قصّاب کی چھری کہنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بہتر۔ اور سُنیئے ؎

کیا کہیں خونِ دو عالم سے بھی اب بجھتی ہو پیاس ؛ خونِ بسمل کی حرارت خنجرِ قاتل میں ہے

کیا یہ بھی قصّاب کی چھری نہیں؟ اس میں تو ماشاء اللہ دو عالم کو ذبح کر ڈالنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اے جناب محبوبِ جگر کے ہاتھ میں تو قصّاب کی چھری ہی نہیں۔ پیکانِ جگر دوز بھی موجود ہے۔ آپ نہ دیکھیں یا نہ دیکھنا چاہیں تو اسکا کیا علاج۔ ہائے کسی نے سچ کہا ہو کہ قبر کا حال مُردہ ہی جانتا ہو۔ سید صاحب کو کیا معلوم کہ بیچارے جگر پر کیا گذری۔ کس بلا کا پیکان تھا کہ سینہ توڑ کر دل میں در آیا اور پار نکل گیا۔ دیکھئے تو جگر کس طرح تڑپ تڑپ کر فریاد کر رہا ہے ؎

توڑ کر سینہ و دل پار کا پیکاں نکلا ؛ جان نکلی مرے اللہ کہ ارمان نکلا[1]

جگر صاحب تو اس دُنیائے فانی سے رُخصت ہوگئے، اب حسبِ دستور قاتل کو اپنی اس حرکت پر ندامت و تاسف ہے اور جگر صاحب اس تاسف کی وجہ جاننا چاہتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ؎

اب مری لاش پہ کیوں سوگ لئے بیٹھے ہو ؛ تم نے شمشیر چلائی تھی تو شمشیر چلی

جگر صاحب کے قتل ہوجانیکے بعد مقتل میں ایک عجب ہنگامہ برپا ہوگیا ؎

ہر سمت سے مقتل میں کیوں ٹوٹ پڑیں نظریں ؛ کیا صورتِ بسمل میں قاتل نظر آتا ہے

مشتاقانِ شہادت ہر طرف سے اُمنڈ آئے کہ اے "تیغِ تیز" والے۔ لگے ہاتھوں ہمیں بھی قتل کرتا جا۔ اور سچ بھی تو ہے کہ بقولِ جگر ؎

سر دادگانِ عشق و محبت کی کیا کمی ؛ قاتل کی تیغِ تیز خدا کی زمین رہے

قاتل کے سر پر تو خون سوار ہی تھا بس جو سامنے آیا، ایک ہی ہاتھ میں صفایا۔ اس "رنگین" واقعہ کو جگر صاحب نے بڑی خوبصورتی سے دو مصرعوں میں بیان کیا ہے ؎

قتل گہ میں آج ہولی ہے جگر ؛ چل رہی ہیں خون کی پچکاریاں

اس ضمن میں ایک نہایت دلچسپ بات قابلِ ذکر ہے۔ جگر کو خدا جانے کیوں یہ خیال آگیا کہ محبوب کو قاتل و قصّاب بنانا ٹھیک نہیں چنانچہ یہ شعر نظم فرمایا جس میں دوسرے شعرا کو ملامت کی گئی ہے ؎

---

[1] جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارمان نکلا۔ فانی بدایونی۔

اِن شاعرانِ دہر یہ ہو عشق ہی کی مار ؛ اِک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا

دیوانِ جگرؔ کے شروع میں "چار بالکل تازہ غزلیں" درج ہیں۔ اُنہیں میں سے دوسری غزل کا یہ شعر ہے۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ غالباً جگرؔ صاحب نے اپنی پُرانی رائے میں کچھ ترمیم کر لی ہوگی لیکن فوراً اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے۔ جب ان "چار بالکل تازہ غزلوں" میں سے تیسری غزل کا یہ مطلع سامنے آتا ہے ؎

اُف یہ تیغ آزمائیاں توبہ ؛ تیری نازک کلائیاں توبہ

معلوم ہوتا ہے کہ "قاتل بنا دیا" والا شعر کسی تبدیلیِ رائے کی بنا پر نہیں کہا گیا۔ بلکہ قافیہ "قاتل" تھا۔ اس کی مناسبت سے جو مضمون بھی اس وقت خیال میں آیا باندھ دیا۔

ان اشعار کے مطالعے کے بعد قارئین کو اختیار ہے کہ وہ سید صاحب کے دعووں کو صحیح مانیں یا جگرؔ صاحب کے بیان کو معتبر جانیں۔ خود ہمارے نزدیک تو جگرؔ ہی کا بیان مرجح و مستند ہے۔

اب ہم سیّد صاحب کے دوسرے دعوے کو لیتے ہیں یعنی جگرؔ صاحب "آجکل کے بعض طالب اثر شاعروں کی طرح نہیں جو لاش و مدفن و سورۂ یٰسین و نوحہ و بین و میّت و نزع کا ایک تیر کمند صفت پھینک کر بالقصد مرغِ اثر کو شکار کرنا چاہتے ہیں۔" جس طرح مولانا کا پہلا دعویٰ کلامِ جگرؔ کی روشنی میں غلط ثابت ہوا اسی طرح یہ دوسرا دعویٰ بھی بادِ ہوا نظر آتا ہے۔ ہم صرف اشعار پیش کئے دیتے ہیں۔ فیصلہ قارئین خود کر لیں۔ اس باب کا آغاز عالمِ نزع سے ہوتا ہے جیسا کہ ہم کلامِ حسرتؔ کے سلسلہ میں ذکر کر چکے ہیں۔

اب جگرؔ صاحب کا عالمِ نزع ملاحظہ کیجئے ؎

نزع میں ڈھونڈھ رہی ہیں آنکھیں ؛ کاش اُنہیں ایک نظر دیکھوں میں
کیا پوچھتے ہو حالت بیمارِ محبّت کی ؛ کچھ اور ابھی گھڑیاں باقی ہیں محبّت[1] کی

مسرور وقتِ نزع جو بیمار ہو گئے ؛ کیا جانے کیا اشاروں میں اقرار ہو گئے
دل میں تم ہو نزع کا ہنگام ہے ؛ کچھ سحر کا وقت ہے کچھ شام ہے

دمِ آخیر بھی اِن کا یہ احترام ہوا ؛ اُٹھے نہ ہاتھ تو آنکھوں ہی سے سلام ہوا
جواب بھی نہ تکلیف فرمایئے گا تو بس ہاتھ ملتے ہی رہ جایئے گا !

عالمِ نزع کی مختلف کیفیتیں آپ دیکھ چکے۔ اب دیکھئے کہ شاعر کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد کیا ہوا ؎

برسنے لگی ہر طرف بیکسی ؛ مری موت میری خبر ہو گئی

---

[1] مطبوعہ دیوان میں اسی طرح تحریر ہے۔ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ شاید "محبّت" کی جگہ "مصیبت" ہو۔ ورنہ پھر قافیہ کیا ہوگا؟

مری موت سُنکر کیا اُس نے ضبط ٭ مگر رنگ چہرے کا فق ہو گیا

نہ جانے دل میں وہ کیا سوچتے ہیں بہم ٭ مرے جنازے پہ تا دیر سر جھکائے ہوئے

فطرت کا عام قانون تو یہ ہے کہ جب رُوح و جسم میں جدائی ہو جاتی ہے تو احساس بھی مٹ جاتا ہے لیکن ہمارا شاعر اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ وہ مرنے کے بعد بھی بیقرار رہ سکتا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی اُسے سکون بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو کلام جگر سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ سُنیئے ؎

بعد مرنے کے بھی قرار نہیں ٭ مرگِ ناکام اسکو کہتے ہیں

بن رہی تھی میرے اُنکے درمیان کیا کیا حجاب ٭ موت نے سب مشکلوں کو آخر آسان کر دیا

نزع و مرگ کا قصہ تمام ہوا اب تربت و مزار و لحد کی باری ہے۔ حسرت صاحب کی وفات کے سلسلہ میں ان واقعات کی تفصیل آپ سُن چکے ہیں جو ایسے موقع پر پیش آتے ہیں۔ اب جگر صاحب کی زبانی سُنیئے کہ اُنپر کیا گذری ؎

وہ عاشق ہوں کہ میری لاش جب زیرِ مزار آئی ٭ محبت نوحہ گر پہونچی تمنا سوگوار آئی

جس پر برس گئی کبھی برقِ جمالِ یار ٭ ہر ذرہ آفتاب ہے اُس کے مزار کا

سنگدل معشوق کی یہ ابلہ فریبیاں تو دیکھئے کہ پہلے تو بیچارے عاشق کو کُڑھا کُڑھا کے مار ڈالا۔ اب قبر پر آنسو بہانے آیا ہے ؎

برسائی آنسوؤں کی جھڑی چشمِ یار نے ٭ کیا اُٹھ کے کہدیا مری خاکِ مزار نے

کچھ دنوں کے بعد دوبارہ جگر صاحب کی قبر پر اس کا جانا ہوا تو کچھ اور ہی عالم تھا ؎

پھیکی سا ہے بدن میں، زرد چہرہ، دل اُداس ٭ چُپ کھڑے ہیں دُور میری خاکِ تربت دیکھکر

تیسری مرتبہ جب ادھر سے گذر ہوا تو بیدرد تربتِ عاشق پر ٹھوکریں لگاتا ہوا چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ اُس بیوفا کے اس عمل سے شاعر صاحب کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی اور قبر کے اندر بے اختیار یہ شعر زبان سے نکل گیا ہوگا ؎

یہ تربتِ عاشق ہے ٹھکرا کے نہ چل غافل ٭ اس خاک کا ہر ذرہ خورشید بداماں ہے

عاشق صاحب جب خاک میں مل کے خاک ہو گئے اور پھر وہ خاک اُڑ کر محبوب کے دامن پر بیٹھ گئی تو عاشق صاحب نے بڑی حسرت سے کہا کہ ہائے ہمیں تو جیتے جی پا بوسی بھی نصیب نہ ہوئی اسی آرزو میں مٹ گئے۔ اب ہماری خاک دامن محبوب تک پہونچی بھی تو کیا۔

قبر کے بعد دوسری منزل حشر کی ہے۔ وہاں جو واقعات حضرات شعرا کو پیش آتے ہیں اُنکی تفصیل حسرت کے ذکر میں بیان کی جا چکی۔ اب دیکھئے کہ جگر صاحب کیا فرماتے ہیں۔ داستان وہی ہے، صرف طرزِ بیان کا تھوڑا سا فرق ہے۔ ؎

مجھے اے شورِ محشر تو نے کیوں چونکا دیا اُٹھکر ٭ بلا ئیں لے رہا تھا بیخودی میں اپنے قاتل کی

نگاہِ شوق نے محشر میں صاف تاڑ لیا ٭ کہاں وہ چھپتے کہ آنکھوں میں تھے سمائے ہوئے

محشر میں بات بھی نہ زبان سے نکل سکی ؛ کیا جُھک کے اُس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے[1]

کہتا ہے سرِ حشر یہ دیوانہ کسی کا ؛ جنّت سے الگ چاہیئے ویرانہ کسی کا

چشمِ دیوانگیٔ شوق یہاں بھی نہ کھلی ؛ عرصۂ حشر ہے اور مستِ غزلخواں کوئی

یہ مانا بھیجدیگا ہم کو محشر سے جہنم میں ؛ مگر جو دل پہ گذرے گی وہ دل ہی جانتا ہوگا

اِس آخری شعر میں واقعی جگر صاحب نے کچھ ایسے حقائق کا انکشاف کیا ہے جو آجتک نہ کسی صوفی کی سمجھ میں آئے تھے نہ کسی فلسفی کی انپر نظر گئی تھی۔ قدرتاً سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جگر صاحب کو محشر سے جہنم میں کون بھیجدیگا؟ خدا یا محبوب اگر مقصود ذاتِ الٰہی ہے تو یقیناً جگر صاحب کی یہ جدّت قابلِ داد ہے کہ خدا بھی انسانوں کی طرح جذبات کا پتلا ہے اور تغیرِ حال بھی اُسے لاحق ہوتا ہے۔ ورنہ پھر "مگر جو دل پہ گذرے گی وہ دل ہی جانتا ہوگا" کے کوئی معنی نہیں۔ اور اگر جہنم میں بھیجدینے کا اختیار جگر صاحب کے محبوبِ مجازی کو حاصل ہے تو یہ خود ایک نئی تحقیق ہے اس لئے کہ اب تک جہنم اور جنّت میں بھیجنے کا اختیار خدا ہی کے لئے مخصوص سمجھا جاتا رہا ہے۔

زلف و شانہ کے مضامین کے متعلق ہماری ذاتی رائے خواہ کچھ بھی ہو لیکن سید سلیمان صاحب کا یہ دعویٰ کہ جگر کی شاعری میں نہ زلف ہے نہ شانہ، قطعاً غلط ہے۔ مثال کیلئے یہ دو شعر کافی ہیں ؎

وہ زلفیں دوش پر بکھری ہوئی ہیں ؛ جہانِ آرزو تھرّا رہا ہے

خود حُسن و شباب اُنکا کیا کم ہے رقیب اپنا ؛ جب دیکھئے اب وہ ہیں، آئینہ ہے شانہ ہے

اب تک جگر کے جو اشعار پیش کئے گئے اور جن کی مثل اور بھی بہت سے شعر شعلۂ طور میں موجود ہیں۔ کیا ان کے باوجود سید سلیمان ندوی صاحب کا یہ دعویٰ قابلِ تسلیم ہے کہ "جگر کا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ ہے"؟

کُہنہ و فرسودہ مضامین پر طبع آزمائی کے شوق کو اگر ایک عالمگیر وبا سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اُردو شاعری (غزلگوئی) کی پوری دُنیا اس سے متاثر ہوئی ہے۔ ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک جسے دیکھو اس بلا میں مبتلا نظر آتا ہے۔ پوچ گویوں کا تو ذکر ہی کیا، چوٹی کے غزلگو بھی اسی گرداب میں غوطے کھارہے ہیں۔ حسرت، اصغر اور جگر کا حشر آپ دیکھ چکے۔ اب ذرا جنابِ فانی کی جولانیٔ طبع ملاحظہ فرمایئے۔ آیئے مضامینِ فرسودہ کی پہلی سرخی یعنی "پیکان و تیر، خنجر و شمشیر، اور قتل و خون" سے ابتدا کریں۔

شوقِ شہادت ؎

---

[1] محشر میں مُسکرا کے گلے سے لگا لیا ؛ کشتوں سے اپنے چال قیامت کی چل گئے۔ — عالیجاہ فضا لکھنوی۔

تیغِ قاتل تری دُہائی ہے ؛ میری موت اور یہ دستبردِ درنگ
سراب مجھے بھاری ہے صدقہ ترے خنجر کے ؛ یہ بار اُتر جاتا، جو وار تھے چل جاتے

آمدِ قاتل ؎

فانیؔ کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی ؛ لے خواب محبت کی تعبیر نظر آئی
کسی کا ہاتے وہ مقتل میں اس طرح آنا ؛ نظر بچائے ہوئے آستیں چڑھائے ہوئے
اداسے آڑ میں خنجر کی مُنہ چھپائے ہوئے ؛ مری قضا کو وہ لائے دُلہن بنائے ہوئے

اپنی سخت جانی اور قاتل کی نزاکت کا شکوہ ؎

مُشکل مرے مرنے کی مشکل ہو کہ آسان ہو ؛ کچھ نازکی قاتل کچھ میری گرانجانی

قتل کرنے سے پہلے قاتل اپنا خنجر دیکھتا ہو جس طرح قصاب گائے وغیرہ ذبح کرنے سے بیشتر اپنی چھری کی دھار دیکھا کرتا ہے۔ فانیؔ صاحب اُسے مشورہ دیتے ہیں کہ نہیں قتل کرنے کے بعد دیکھنا اور اس کی ایک نہایت معقول وجہ بھی بیان کرتے ہیں ؎

دیدنی ہو رنگ دل میں ڈوب کر کھنچنے کے بعد ؛ تم ابھی کیا دیکھتے ہو تھم کے خنجر دیکھنا

فانیؔ صاحب ذبح ہوتے ہیں ؎

اُدھر مُنہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو ادھر دیکھو ؛ مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

اور ذبح ہونے کے بعد احتیاط کی صلاح دیتے ہیں ؎

لازم ہو احتیاط، ندامت نہیں ضرور ؛ لے اب چھُری تو پھینک لہو سے بھری ہوئی

معلوم ہوتا ہو کہ چھُری سے قتل کرنے سے پیشتر قصّاب محبوب نے ایک تیر بھی فانیؔ صاحب کے دل میں بھونک دیا تھا جسکا پیکان اُنہوں نے بالقصد دل ہی میں رہنے دیا تاکہ قبر میں ساتھ جائے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ رسم ہو کہ بعض خوش عقیدہ لوگ "عہد نامہ" کفن میں رکھ دیتے ہیں۔ اس لئے کفن میں کوئی چیز رکھدینے کا خیال تو نیا نہیں تاہم پیکانِ تیر کی جدّت ضرور قابلِ داد ہے ؎

پیکاں کے بھی ٹکڑے ہیں رفو کے بھی ہیں ٹانکے ؛ سینہ میں دھواں خیر سے اُٹھتا ہو کہاں سے
ساتھ جائیگا مری میت کے سامانِ خلش ؛ دل میں رکھ چھوڑے ہیں پیکاں میں نے تیرے تیر کے[1]

خُون کے دھبّے ؎

شکر بھی داغ شاہدِ خونِ شہید ہے ؛ دھویا ہوا ہو دامنِ قاتل جگہ جگہ

---

[1] اس شعر سے یہ امر بھی متحقق ہوگیا کہ ایک تیر کے متعدد پیکان ہوتے ہیں۔ فانیؔ صاحب کی یہ ریسرچ بھی قابلِ تحسین ہے۔

حسرت تو "بادشاہِ متغزلین" ہی ٹھہرے۔ وہ تو تغزل کے ہر رنگ میں استاد ہیں لیکن دوسرے "اساتذہ" نے بھی کسی نہ کسی رنگ میں اپنا کمال ضرور دکھایا ہے مثلاً حضرت اصغر نے "فلسفہ بافی" میں جناب جگر نے استخواں بندی میں اور فانی صاحب نے نزع و مرگ، لاش و کفن، میّت و جنازہ، ماتم و شیون، تربت و گورِ غریباں، قبر کے پھول اور چراغِ مزار وغیرہ کے بیان میں بقولِ شخصے قلم توڑ دیا ہے۔ اعتراض اس پر نہیں کہ فانی نے المیہ مضامین پر طبع آزمائی کیوں کی آخر یہ چیزیں بھی ہماری زندگی کے متعلقات سے ہیں۔ نغمۂ شادی ہو یا نوحۂ غم، ہر ایک بجائے خود ایک اہمیت رکھتا ہے۔ افسوس اس پر ہے کہ ایک جوہر قابل نے اپنا زورِ طبع محض بے بنیاد خیالات کے نظم کرنے میں کیوں ضائع کیا۔ ہر زمانہ ہر قوم، اور ہر زبان کے شعرا نے اس قسم کے مضامین کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ کسی نے قوم کی موجودہ بدحالی پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ کسی نے اپنی عظمتِ رفتہ پر سینہ کوبی کی ہے، کسی نے شہر آشوب لکھا۔ کسی نے اپنے محبوب یا دوست یا کسی عزیز کی موت پر جگر کاوی کی۔ اور یہ سب حالتیں فطری ہیں۔

خاقانی کا وہ قصیدہ دیکھئے جس میں اس نے "ایوانِ مدائن" کو آئینۂ عبرت بنایا ہے[۵۱]۔ سعدی کا وہ قصیدہ پڑھیئے جسے خلافتِ بغداد کی تباہی کا نوحہ کہنا چاہیئے[۵۲]۔ ظفر، غالب، آزردہ، داغ، حالی، سالک، افسردہ، شیفتہ، ماہر، ظہیر، عیش، مجروح وغیرہم کی اُن نظموں کا مطالعہ کیجئے جو دہلی کی بربادی پر لکھی گئیں۔ مومن کا وہ ترکیب بند ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے "معشوقۂ حور طلعت" کی وفات پر سپردِ قلم کیا ہے۔ مگر فانی کے گریہ و ماتم کو ان لوگوں کے نوحہ و شیون سے کیا نسبت؟ فانی کے اس قسم کے کلام کو زیادہ سے زیادہ ایک نہایت رکیک قسم کا مسخرا پن کہہ سکتے ہیں۔ اُن کا درجہ اس میدان میں ایک بہروپئے سے زیادہ نہیں۔ بھلا ایک ہٹا کٹا انسان اگر درجنوں اشعار اپنی جانکنی، موت اور قبر وغیرہ کے اُن حالات میں لکھ ڈالے جنہیں حقیقت سے کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں تو اُسے ایک بہروپئے کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

"نقاد" نے فانی کو "مرگھٹ کا رونے والا شاعر" بتایا ہے۔ فراق صاحب فانی کی اس "تعریف" سے برہم ہو کر فرماتے ہیں کہ "معلوم نہیں" نقاد" صاحب اگر T. S. Eliot اور Shropshire Lad کا Housman کا Waste Land اور Hardy کے Wessex Poems دیکھیں تو کیا کہیں گے؟ بجائے مرگھٹ کے ان شعرا کو تو پورے نظامِ شمسی کا رونے والا بتائیں گے"۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان شعرا اور فانی کے کلام میں کیا مناسبت ہے جو مثال کے طور پر فراق صاحب نے ان کا حوالہ دیا۔ قیاس مع الفارق کی اس سے بہتر مثال مشکل سے ملے گی۔ فراق صاحب کو اگر "انمل بے جوڑ" کا ایسا ہی شوق تھا تو اس کے لئے شعرائے فرنگ کی مثالیں پیش کرنے کی ناحق زحمت گوارا کی۔ انیس و دبیر اور دوسرے مرثیہ گویوں کا ذکر

---

۵۱ ہاں اے دلِ عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں + ایوانِ مدائن را آئینۂ عبرت داں۔

۵۲ آسماں را حق بود گر خون ببارد بر زمیں + بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین۔

کیوں نہ کردیا۔ اس لئے کہ گریہ وبکا اور شیون وماتم کے مضامین تو اُن کے یہاں بھی بکثرت موجود ہیں۔ ہاں یورپین شعرا کی مثال پیش کرنے کا ایک فائدہ ضرور ہے کہ عوام پر پروفیسر صاحب کی "ہمہ دانی" کا رعب جم جائیگا اور بات پردے کی پردے ہی میں رہے گی کیونکہ جو لوگ براہِ راست ہاؤس مین، ایلیٹ، اور ہارڈی کے کلام کا مطالعہ نہیں کرسکتے اُنہیں ناچار پروفیسر صاحب ہی کا قول تسلیم کرنا پڑیگا۔

نمونے کے طور پر ہم اِن شعرا کی چند مختصر نظموں کے ترجمے ذیل میں پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ اُن کے اور فانی کے کلام میں کس حد تک مماثلت ہے۔ ہمنے خصوصیت کے ساتھ ایسی ہی نظمیں منتخب کی ہیں جو اختصار کے ساتھ ساتھ کسی غم انگیز موضوع پر لکھی گئی ہیں:-

A Shropshire Lad by A.E. Housman No. 14

جب ہوا چلتی ہے تو بچھو کا پودا ہلتا ہے، جھکتا ہے اور سیدھا ہوجاتا ہے۔
وہی بچھو کا پودا جواُن عشاق کی قبر پر اُگا ہوا ہے جنہوں نے محبت کی خاطر جان دیدی۔
بچھو کا پودا ہلتا ہے اور ہوا اُس پر سے گذرتی ہے۔
لیکن مرنے والا ذرا بھی حرکت نہیں کرتا۔ وہ قبر کا شیدائی جس نے محبت کی خاطر جان دیدی۔

L IV.

میرا دل حسرتوں سے معمور ہے۔ اپنے گرانبہا دوستوں کے لئے۔
جنمیں کتنے ہی جوانانِ سُبک گام تھے اور کتنی ہی دوشیزگانِ یاقوتِ لب
وہ جوانانِ سُبک گام فراخ چشمہ کے کنارے۔
اور وہ دوشیزگانِ یاقوتِ لب اُن میدانوں میں۔
سُورہی ہیں جہاں گلاب کے پھول مُرجھا جاتے ہیں۔

Waste Land by T.S. Eliot No. IV.

مرگ بغرق:-
فلیبس فنیقی کو مرے ہوئے دو ہفتے گذر چکے۔
بحری مُرغابیوں کی قائیں قائیں، گہرے سمندر کی موج خیزی۔
اور سود وزیاں سب کچھ اُسے فراموش ہوگیا۔
ایک تحت البحر موج نے سرگوشیوں کے ساتھ اُس کی ہڈیوں کو چُن لیا۔
جسوقت وہ اُچھلا اور ڈوبا، گرداب میں داخل ہوتے ہوئے۔

وہ اپنے شباب اور کہولت کے ادوار سے گذرا۔
اے مخاطب! تو چاہے یہودی ہو یا غیر یہودی۔
جس وقت تو جہاز کا (اسٹیرنگ وھیل) پہیا گھمائے اور ہَوا کا رُخ دیکھے تو
فلیبس کو یاد کر لینا کہ وہ بھی کبھی تیری طرح خوبرو اور کشیدہ قامت تھا۔

Wessex Poems by Thomas Hardy "She

عاشق کے جنازے پر

وہ اُسے اُس کی ابدی آرام گاہ کو لئے جا رہے ہیں۔
جلوس آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔
میں بھی بیگانوں کی طرح پیچھے پیچھے جا رہی ہوں۔
وہ اُس کے اعزّہ ہیں اور میں اُس کی محبوبہ۔
میں اپنا وہی شوخ رنگ گون پہنے ہوئے ہوں۔
حالانکہ وہ سب سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس ہیں۔
لیکن اُن کی آنکھوں میں غم کا نشان تک نہیں۔
اور میرا اندوہ مجھے آگ کی طرح بھسم کئے دے رہا ہے۔

محبوبہ کا امضائے مختصر

ایک شاعر کے دیوان کے ایک صفحہ پر، مدّت ہوئی میں نے۔
اس کے نام کے دو حرف لکھ دئے تھے۔
(اس وقت) وہ اُس نورانی خیال کا ایک جُزو معلوم ہوتی تھی۔
جو شاعر بلند فکر کے وجد و سرور کا سرچشمہ تھا۔
اب جب میں وہ صفحہ کھولتا ہوں تو وہی لافانی نور۔
اُن اشعار میں جلوہ گر دیکھتا ہوں لیکن اُس (محبوبہ)
کے نام کے حروف سے وہ درخشانی معدوم ہو چکی ہے۔

اگر آپ کا جی چاہے تو آپ بقولِ فراؔق ان شعرا کو "پُورے نظام شمسی کا رونے والا" قرار دیجئے۔ لیکن اس حقیقت نگار ممکن نہیں کہ اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہو وہ بالکل نیچرل ہے۔ کہیں شہیدانِ محبّت کا ماتم ہے۔ کہیں جوانمرگ دوستوں کی مرگ

بے ہنگام کا رونا ہے۔ کہیں کسی حسرت نصیب کی غرقابی پر بے اختیار آہیں مُنہ سے نکل رہی ہیں۔ کہیں عاشق کے جنازے پر بے مثال ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ کہیں کسی مرنے والی کی یاد میں کلیجہ مُنہ کو آ رہا ہے۔

خُدارا انصاف۔ ان اشکہائے خونین کو فانی کے گریہ و روغین سے کیا نسبت؟ فانی صاحب ماشاء اللہ زندہ اور تندرست ہیں۔ مگر خواہ مخواہ بیمار بنتے ہیں۔ جھوٹ موٹ اپنے اوپر عالم نزع طاری کرتے ہیں۔ مر جاتے ہیں۔ دفن ہوتے ہیں۔ قبر میں تڑپتے ہیں۔ کفن پھاڑ کر بولتے ہیں۔ خاک میں ملکر خاک ہو جاتے ہیں۔ مگر دل کی بیتابی نہیں جاتی۔ بیدردِ محبوب سے شکوہ و شکایت کا سلسلہ برابر باقی رہتا ہے۔ پھر حشر میں اپنے قاتل سے جا ملتے ہیں۔ غرض خرافات کا ایک سمندر ہے کہ اُمنڈ رہا ہے۔ کاش فراق صاحب سوچتے کہ فانی کی شاعری کوئی حقیقت کی آواز ہے یا ایک واہی بہروپئے کا شور و غوغا؟

"نقاد" نے اگر فانی کو مرگھٹ کا رونے والا شاعر" کہا تو یہ "نقاد" کی بیجا طرفداری ہے۔ اس لئے کہ مرگھٹ کے رونے والے کا رونا بھی ایک معنی رکھتا ہے مگر فانی کا رونا محض لایعنی بلکہ اسے رونا کہنا رونے کی توہین کرنا ہے۔ رستمِ ہند گاما پہلوان کو اسٹیج پر میاں مجنوں کا پارٹ کرتے دیکھکر اگر تماشائیوں پر اندوہ و ملال کی کیفیت طاری ہو سکتی ہے تو یقیناً فانی کے وہ اشعار سُنکر بھی ہوگی جن میں اُنہوں نے اپنے عالمِ نزع، وفاتِ حسرت آیات اور کفن و دفن وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

جن حضرات کو کلامِ فانی کے مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا ممکن ہے اُنہیں ہمارے اس قول کے تسلیم کرنے میں کچھ پس و پیش ہو۔ لہذا ہم مثال کے طور پر فانی صاحب کے وہ اشعار پیش کرتے ہیں جو "مقدمہ نگار" کے نزدیک یاسیت کے مرقعے اور ہمارے نزدیک بے بنیاد اور واہی خیالات کی لوٹ ہیں۔

حضرتِ فانی پر عالمِ نزع طاری ہوتا ہے۔ قارئین ذرا اپنا اپنا دل سنبھال لیں مبادا کوئی اندوہناک حادثہ پیش آجائے۔

قدم نکال اب تو گھر سے باہر جو دم بھی سینہ سے ہل نکلے ؛ دکھا نہ اب انتظار اپنا لحد کو ہے انتظار میرا

موت آنے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے ؛ زندگی مشکل ہی تھی مرنا بھی مشکل ہو گیا

"اصولِ شاعرانہ" کے مطابق حضرتِ فانی نے عین عالمِ جانکنی میں اُس "بانیٔ بیداد" کو طلب کیا کیونکہ اُس کے آئے بغیر جان نہیں نکل سکتی تھی۔ وہ آیا۔ اور اب کس طرح حضرتِ فانی کی روح قفسِ عنصری کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتی۔ اللہ اکبر! کس قیامت کی کشمکش ہے۔ خدا دوست دشمن سب کو اس بلا سے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ لیکن ہمارے پاس اس امر کا کافی ثبوت موجود ہے کہ وہ "بانیٔ بیداد" ہر گز ہر گز آخر وقت تک فانی صاحب کو دیکھنے نہیں آیا۔ اگرچہ ایک ضعیف روایت یوں بھی ہے کہ جس وقت فانی صاحب کا دم نکل رہا تھا وہ "بے وفا" کہیں اُدھر سے گذر رہا تھا مگر غرورِ حسن نے اُسے اتنی اجازت نہ دی کہ مرنے والے کی آخری حسرت پوری کر دیتا۔ ہرچند فانی صاحب پکارتے رہے کہ ؎

غرورِ حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دُنیا سے ؛ کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

لیکن نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی بیان کیا یہ روایت ضعیف ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ فانی صاحب جب

اس دُنیائے فانی سے رُخصت ہو چکے تب کہیں وہ "رقیب نواز" آیا۔ جب اس کی آمد آمد کی خبر گرم ہوئی تو فانی صاحب سخت بے چین ہو گئے۔ مُستقبل کی اذیتوں کا احساس کر کے بلبلا اُٹھے اور بیساختہ یہ شعر فرمایا ؎

موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم ❊ کہ جنازے پہ وہ غارت گرِ خواب آتا ہے

بہر حال وہ آیا مگر ابھی دس پانچ قدم کے فاصلے ہی پر تھا کہ حضرتِ فانی نے فی البدیہہ یہ شعر کہا اور نہایت دردناک لہجہ میں بلند آواز سے پڑھا ؎

وہ مرے جنازے پہ بعدِ مرگ آئے ہیں ❊ مدعا ہوا حاصل ترکِ مدعا کر کے

یہ وہ وقت تھا کہ حضرتِ فانی کو نہلا دھلا کر کفن پہنا کر جنازہ گورستان کو لیجایا جانے والا تھا جیسے ہی وہ قریب آیا حضرتِ فانی اس سے مخاطب ہو کر کفن کے اندر سے چلا کر بولے ؎

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے ❊ کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

چنانچہ اُس نے فانی صاحب کے مُنہ سے کفن سرکایا۔ فانی صاحب گو مر چکے تھے مگر ماشا اللہ طبیعت اس وقت بھی حاضر تھی چنانچہ اُدھر اُس نے اِن کے مُنہ سے کفن ہٹایا اِدھر انہوں نے یہ شعر فرمایا جس میں ایک نہایت دردناک پیرایہ میں آخری دیدار سے محروم رہنے کی شکایت کی گئی ہے ؎

پتھرا گئی تھی آنکھ مگر بند تو نہ تھی ❊ اب یہ بھی انتظار کی صورت نہیں رہی

یہ شعر پڑھکر حضرتِ فانی پھر خاموش ہو گئے۔ اسوقت آپ کے چہرہ پر ایک غیر معمولی رونق آگئی تھی۔ "وہ ظالم" یہ کیفیت دیکھکر حیران رہ گیا۔ حضرتِ فانی نے پھر شکوہ سنجی شروع کی ؎

آ گئی ہے ترے بیمار کے مُنہ پر رونق ❊ جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

یہ واقعات ایسے ہیں کہ پتھر کا کلیجہ پانی ہو جائے۔ کوئی کہاں تک متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے آخر وہ "بیدرد" بھی تڑپ اُٹھا اور موت کو کوسنے لگا۔ حضرتِ فانی اُس کی اِس سادگی پر مُسکرا کر بولے ؎

اب مری لاش پر حضور موت کو کوستے تو ہیں ❊ آپ کو یہ بھی ہوش ہو کس نے کسے مٹا دیا۔

یہ شعر سُنکر اس کا دل اور بھی متاثر ہوا اور نہایت محبت بھری نظروں سے فانی صاحب کی لاش کو دیکھنے لگا۔ اب فانی صاحب کے لئے ضبط دشوار تھا۔ مگر بیچارے کمزور آدمی تھے پھر مر کر اور بھی نڈھال ہو گئے تھے اسی طرح مُسلسل شعر خوانی۔ اب ان میں اتنی طاقت بھی باقی نہ تھی کہ شکایت کے چند کلمے زبان سے ادا کر سکتے۔ بہر حال بڑی کوشش اور ہمت کر کے یہ دو مصرعے ارشاد فرمائے ؎

پھیرے میت کی جانب ہے نگاہِ التفات ❊ سینکڑوں شکووں کے نرغے میں لبِ خاموش ہے

انسان کیسا ہی سنگدل کیوں نہ ہو آخر انسان ہے مٹی کا بیجان پُتلا نہیں۔ دل کیسا ہی بے احساس کیوں نہ ہو آخر دل ہے پتھر کا ٹکڑا نہیں۔ یہ سچ ہے کہ اُسی "تغافل کیش" نے حضرتِ فانی کی جان لی تھی مگر اب یہ حالت دیکھکر اس کا دل بھی خون ہو گیا۔ بے اختیار فانی صاحب کی لاش کو لپٹ گیا اور دیوانہ وار فریاد کرنے لگا کہ "فانی! فانی! ہائے لوٹتے

نہیں ہم سے خفا ہو گئے۔ للّٰہ کچھ کہو تو۔ کیوں خفا ہو گئے۔ تم جو کچھ کہو میں کرنے کو تیار ہوں۔ خدارا مُنہ سے تو بولو۔ کچھ کہو تو آخر کیا چاہتے ہو"۔ وہ اس طرح فریاد و زاری میں مصروف تھا اور فانیؔ صاحب بیچارے "ٹُک ٹُک دیدم، دم نہ کشیدم" کے مصداق خاموش پڑے یہ رُوح فرسا منظر دیکھ رہے تھے ؎

کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبورِ خاموشی کا ہائے ؛ وہ جنازے پر ترا کہنا خفا کیوں ہو گئے

مری میّت پہ اُن کا طرزِ ماتم کس بلا کا ہے ؛ دلِ بے مدعا سے پوچھتے ہیں مدعا کیا ہے

فانیؔ صاحب کے اقارب و احباب سب آخری دیدار کر چکے تھے۔ جنازہ اُٹھنے والا تھا۔ گریہ و بُکا کا شور آسمان تک پہونچ رہا تھا۔ "وہ" بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور جانے لگا۔ فانیؔ صاحب نے آخری کوشش کی اور کسی حیلہ سے اُسے چند لمحوں کے لئے اور روک لینا چاہا۔ ایسے شاعر دُنیا میں اب شاید ہی پیدا ہوں جو اپنا جنازہ اُٹھتے وقت شعر کہنے کی قدرت رکھتے ہوں۔ آفریں بر رُوحِ فانیؔ آفریں۔ جب اُس نے پیٹھ پھیری، فانیؔ صاحب نے کفن کے اندر سے چلّا کر کہا ؎

وہ اُٹھا شورِ ماتم آخری دیدار میّت پر ؛ اب اُٹھا چاہتی ہے نعشِ فانیؔ دیکھتے جاؤ

مگر تاثر کے لمحات گذر چکے تھے، فانیؔ صاحب نے لاکھ پکارا مگر اس "وفا نا آشنا" نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور رقیب کے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر تیزی سے روانہ ہو گیا۔ ایسی حالت میں فانیؔ صاحب کے دل کی جو کیفیت ہوئی ہوگی اہلِ دل خود اِس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ع۔ قیامت کی تڑپ تھی، انتہا کی بیقراری تھی۔ شاعر کا اضطراب شعر گوئی ہی سے تسکین پاتا ہے۔ چنانچہ فانیؔ صاحب جس وقت چار آدمیوں کے کاندھے پر سوار اپنی ابدی آرام گاہ کی طرف تشریف لئے جا رہے تھے اُنہوں نے آہستہ آہستہ یہ شعر گنگنانا شروع کیا ؎

سُکونِ موت مری لاش کو نصیب نہیں ؛ رہے ہے مگر کوئی اتنا نہ بیقرار رہے

کبھی اس شعر کی تکرار فرماتے تھے ؎

ہماری لاش مُرقّع ہے بیقراری کا ؛ اک اضطراب کی صورت بھی اس قرار میں ہو

مگر بعض معتبر لوگوں کا بیان ہے کہ یہ شعر حضرتِ فانیؔ نے اپنے مرنے کے فوراً ہی بعد کہا تھا گورستان لیجاتے وقت نہیں پڑھا تھا۔ ان جزئی واقعات کا اختلاف چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ قابلِ لحاظ کوئی اختلاف اگر ہے تو یہ ہے کہ فانیؔ صاحب کے بعض رفیقانِ خاص نے فانیؔ صاحب کے ارتحال کے بعد خود فانیؔ صاحب کی زبان سے یہ شعر سُنا تھا۔ ؎

سُکونِ قلب میسّر ہے موت ہی سے سہی ؛ غرض کہ خاتمۂ رنجِ اضطراب ہوا

مرنے کے بعد انسان پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے چونکہ عام طور پر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے اس لئے یہ مسئلہ ازحد دلچسپ ہے کہ بعدِ مرگ انسان کو "سُکونِ قلب" حاصل ہو جاتا ہے یا زندوں کی طرح اس وقت بھی اضطراب دامنگیر رہتا ہے۔ لیکن مذکورِ بالا دو متضاد بیانوں کی موجودگی میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا اور افسوس ہے کہ فانیؔ صاحب کے کلامِ بعد از مرگ کی روشنی میں بھی یہ مسئلہ اُلجھا کا اُلجھا ہی رہا۔

جن لوگوں کو حضرتِ فانی کے مزارِ پُرانوار پر جانے کا اتفاق ہوا ہے ان کا بیان ہے کہ اکثر قبرِ فانی سے یہ آوازیں آتی ہیں ؎

قبر میں جب کسی طرح دل کی تڑپ کم ہوئی ؛ یادِ خرامِ ناز نے حشر کا آسرا دیا
تری لگائی ہوئی آگ حشر تک نہ بجھی ؛ ہوئے نہ مر کے بھی ٹھنڈے تری جلائے ہوئے

اور فانی بڑھ گئی بیتابیِ دل بعدِ مرگ ؛ کیا کہیں مر کر گرفتارِ بلا کیوں ہو گئے

ان اشعار سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد عاشق بیقرار رہتا ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ مرنے کے بعد بیقراری اور بھی بڑھ جاتی ہے لیکن اب بھی مسئلہ زیرِ بحث حل نہیں ہوا کیونکہ اشعارِ بالا کے ساتھ ساتھ یہ شعر بھی تربتِ فانی پر گونجتے ہوئے سُنے گئے ہیں ؎

مر کر ترے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں ؛ ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں
کب سے آغوشِ لحد میں ہم ہیں سرتاپا قرار ؛ وہ ستم پرور ہے اب تک بدگمانِ اضطراب

یہ ہے فانی کا نغمۂ غم جس کے مفکرانہ انداز کی اہمیت کو (بقولِ فراق) "نقاد" نے نظر انداز کر دیا۔ یہی ہیں وہ اشعار جو فراق صاحب کو "فلسفیانہ احساس" سے مملو نظر آتے ہیں۔ اللہ اللہ، کیا فلسفیانہ یاس و غم ہے۔ ہزار آفریں بر شاعر و صد ہزار آفریں بر ناقدش۔ یہ چند شعر صرف نمونے کے طور پر ہم نے نقل کئے ہیں ورنہ فانی صاحب کا مختصر دیوان اس قسم کے خرافات سے بھرا پڑا ہے۔ اپنی مرگ، تربت اور واقعاتِ بعد از مرگ کے متعلق مرحوم نے بہت کچھ لکھا ہے اور وہ سب ماشاءاللہ اسی رنگ میں ہے جس کا تھوڑا سا نمونہ قارئین نے سطورِ بالا میں ملاحظہ فرمایا۔

ان لایعنی اشعار کو سنتے سنتے قارئین تنگ آ گئے ہوں گے لہٰذا ہم صرف ایک شعر سنا کر اس باب کو ختم کئے دیتے ہیں۔ فانی صاحب جہاں شاعر ہیں وہاں مصوّر بھی ہیں۔ مصوّر اسی معنی میں جس میں "اونچے درجہ کے مقدمہ نگار" شاعر کو مصوّر کہا کرتے ہیں۔ فانی صاحب نے ایک لاجواب تصویر کھینچی ہے۔ تصویر کا حسن صرف یہی نہیں کہ اسے دیکھ کر انسان کے دل میں جذبۂ انبساط پیدا ہو۔ نہیں۔ غم، خوف، نفرت، کراہت، وحشت جو کیفیت بھی طاری ہو صنّاع کے کمال کو ظاہر کرتی ہے۔ فانی صاحب شعرا کے قاعدۂ کلیہ کے مطابق عاشق ہونے کے بعد دیوانے ہو گئے تھے۔ دیوانے کا علاج زنجیر۔ چنانچہ آپ کو بھی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ فراقِ یار کی اذیت، العظمۃ للہ! بڑے گھلتے رہے۔ آخر میاں مجنوں کی طرح صرف پوست و استخواں کا مجموعہ رہ گئے۔ یہاں تک کہ جسم کی کھال بھی گل گل کے گر گئی اور صرف مٹھی بھر ہڈیاں زنجیروں میں لپٹی ہوئی رہ گئیں۔ یہ تھی آپ کی آخری حالت جب آپ نے وفات پائی۔ زنجیروں میں لپٹی ہوئی یہی چند ہڈیاں تھیں جنہیں حضرتِ فانی کا جنازہ کہہ سکتے ہیں۔ انہیں کو لوگ گورستان لے گئے ؎

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں ؛ لئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

اور سپردِ خاک کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہائے اب ایسے "چوٹی کے غزلگو" کہاں پیدا ہوں گے۔

(باقی آئندہ) —— عندلیب شادانی

قاضی نذرالاسلام

"ایک رند خراب حال" ۔ سوسائٹی کی لعنت ملامت اور عوام کی نکتہ چینیوں اور طنز و تشنیع کے باوجود بھی عرفانی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے ۔ لوگ اس کی طرف معنی خیز کنکھیوں سے دیکھتے ہیں ــــ یہ دزدیدہ نگاہیں کبھی کبھی قدر دانی اور جذبات تحسین کی حامل ہوتی ہے ، مگر زیادہ تر اس سے نفرت و حقارت کا مظاہرہ ہوتا ہے ۔

اور "نذرل" بھی ایسا ہی ہے ــــ

مرد اُسے صنفِ نازک کا پرستار سمجھتے ہیں ۔ عورتوں کو شبہ ہوتا ہے کہ وہ اُن سے متنفر اور بیزار ہے ۔ مولوی اسے "ہندو" سمجھ کر اس سے ناامید ہو چکے ہیں اور ہندو اس کو "برہمو" بتاتے ہیں ۔ کچھ لوگوں کی آرزو ہے کہ وہ پھر جیلخانہ بھیج دیا جائے ــ SATURDAY LETTERS ہر ہفتہ اس کا کلام خراب کر کے خوش ہوتا ہے ۔ اس کی "بلبلی" کو "مکھی" سے بدلا جاتا ہے اور اسے ایک ایسے ہوس پرست اور بید ھڑک نوجوانوں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس نے اب تھک کر حب الوطنی اور اصلاح عوام کے مشاغل میں آخری پناہ لی ہے !

ایسے حالات میں یہ امر ایک گونہ تسکین بخش ہے کہ ٹیگور اسے اپنے سایہ عاطفت میں لیتے ہیں ۔ اور اپنے ڈرامہ "بسنت" کا انتساب اس کے نام پر کرتے ہیں ۔ اور اسے "بنگال کا نوخیز شاعر" کہہ کر اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں ۔

یہ مضحکہ خیز نقلیں (Parodies) بھی جو اس کا کلام خراب کرتی ہیں اور اس کا مذاق اڑاتی ہیں ، حد درجہ دلچسپ ہیں ۔ اس کے کمالات اور شخصیت کو نقصان پہنچانے کے بجائے یہ ان پر روشنی ڈالتی ہیں اور اس کی الجھی ہوئی شخصیت کو واضح کرتی ہیں . . . .

اس کی کیفیت کا کچھ اندازہ اس کی "فریاد" سے ہو سکتا ہے ۔ وہ کہتا ہے :۔

"میں دورِ حاضر کا شاعر ہوں مستقبل کا پیشین گو یا پیغمبر نہیں ۔ روبی ٹھاکر اپنے ابدی نغمے سنایا کریں ، مگر مجھے تو صرف صبح کی بھیرویں سے سروکار ہے ۔ اگر روبی ٹھاکر ہر زمانہ کے شاعر ہیں تو میں بھی کم سے کم اپنی پسندیدہ جھک اور اپنے خبط ہی کو شعر کا جامہ پہنا دیتا ہوں "۔

مگر ایک شاعر سے ہمیشہ یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی شخصیت کو تمام و کمال سمجھائے ، خصوصاً ایسے وقت جب وہ معذرت کر رہا ہو جس شے کو نذرل کسبر نفسی سے "ہوجوگ" کہتا ہے ۔ وہ محض "بیکاری کا مشغلہ" نہیں بلکہ ایک آتش خیز جذبہ ہے جو صرف اسی کے لئے مخصوص ہے اور اس کی رومانی طبیعت کا پتہ دیتا ہے ــــ یہ اس کا ہمیشہ آزاد رہنے کا آہنی عزم ہے ۔ موجودہ حالات کے خلاف بغاوت کا ارادہ ہے ، اور حقیقی آزادی اور محبت کی خواہش بے پایاں ہے ــــ

کیا یہی چیزیں نہ تھیں جو اُسے جیلخانہ لے گئیں ؟

اس کا یہ "بیکاری کا مشغلہ" ــــ یہ شوقِ فضول ــــ ہی اس کی شخصیت کا غماز ہے ، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ "خود" ہے ۔

کیا آپ کسی ایسے شخص کا تصور کر سکتے ہیں جس کا کوئی

مشغلہ نہ ہو؟ ——— اُف! کتنا بھیانک تصور ہوگا!

اس کی مشہور نظم "بدروہی" (باغی) جس نے بنگال میں ایک طوفان بپا کر دیا تھا، ان جوشیلے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔

"کہہ، اے جوانمرد غازی
کہہ، میرا سر بلند ہے
جس کو دیکھ کر وہ ہمالیہ کی چوٹی
اپنا سر شرم سے جھکا لیتی ہے!"

جیسے جیسے ہم اس کو پڑھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ہمیں ایک بڑھتی ہوئی روحانی شدت اور بلندی کا احساس ہوتا ہے، ہمارے ارادے مضبوط اور تمام بندشوں کو توڑنے کے قابل ہوتے جاتے ہیں۔ ہماری روح اپنی حدود اور قیود سے آزاد ہوتی جاتی ہے اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ پُر اسرار طاقت وہی ہے، اور اتنی ہی طاقتور ہے جتنی کائنات کی جوشش نمو اور اس کا اصل اصول۔ یہ طوفانِ بلا کے گرداب میں بھی اسیطرح جلوہ نما ہے جیسے نسیم سحر کے ہلکے اور خُنک جھونکوں میں۔ سمندر کے مدوجزر میں بھی وہی ہے اور دھڑکتے ہوئے سینہ میں بھی اسکی کارفرمائی ہے۔ یہ بجلی کی کڑک اور چمک میں اسی حد تک نمایاں ہے جتنی آنکھ کی ضیا باریوں، نغمے کی تھرتھراہٹ، آلام کی شدت اور درد محبت کے مارے ہوئے دل کی آخری ضربوں میں ——— یہی ثوابت میں ہے، یہی سیاروں میں ہے اور یہی "نگاہِ ناز" کے کرشموں اور عارضِ سیمیں کی حیا پروردہ سُرخی میں!

ہم میں بھی یہی رواں دواں ہے۔ ہم بھی وہی ہیں جو یہ زندۂ جاوید طاقت ہے، اس لئے ہم بھی ہر وہ تبدیلی اور حرکت پیدا کر سکتے ہیں جو ہم چاہیں۔ لیکن یہ طاقت جہاں ہر تحریک تخریب کی بانی ہے۔ وہاں کائنات کو سکون اور ہم آہنگی کی لوری دیکر سُلا بھی سکتی ہے ——— اور یہ جبھی ہو سکتا ہے جب تمام طاقتیں متوازن ہو جائیں، جب ظلم اور ناانصافی کا وجود نہ رہے .... اس وقت جاکر کہیں یہ باغی آرام لیگا!

مگر اس وقت بغاوت کے اسباب کیا ہیں! ایک عدم آسودگی، ایک نہ پوری ہونے والی تمنا، ایک کبھی ہار نہ ماننے والی، کبھی نہ تھکنے والی اور ہمیشہ جدوجہد کرتے رہنے کی طاقت۔

اس کا ناول "گم کردۂ اسیری" جو خطوط کا مجموعہ ہے اس حقیقت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ نور الہدیٰ اپنی بھابی کو اپنی بغاوت پسند طبیعت کا حال لکھ رہا ہے، اور ان الفاظ میں سب کچھ کہہ ڈالتا ہے۔

"میری یہ رحم ناآشنا، بہائم صفت بغاوت ——— انسان کے خلاف نہیں، بلکہ اس کے پیدا کرنے والے کے خلاف ہے!"

دیگر مقامات پر بھی ہم کچھ ایسے ہی خیالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ مثلاً

"اس مصیبت زدہ کائنات کے سینہ پر
خدا ڈر کر آنسو بہاتا ہے
کہ کہیں یہ اپنے پیدا کرنیوالے سے بھی نہ بڑھ جائے
اور خود اسی کو لقمہ نہ بنالے!"

یا پھر:۔

"مجھے خدا کی ضرورت نہیں
مجھے انسان کی تلاش ہے"

پس یہ "باغی" مردم بیزار نہیں بلکہ اپنی نوع کا سچا ہمدرد ہے۔ اس کی بغاوت کا سبب وہ غلامی، وہ مصائب اور وہ مظالم ہیں جن کو وہ ——— اس محبت سے خالی دُنیا میں —— اپنے اندر اور چاروں طرف محسوس کرتا ہے۔

یہ باغی آخر چاہتا کیا ہے؟ ایک کامل آزادی کی حالت، محبت اور سرور و نشاط۔

وہ اپنے "آہنگِ فردوس" میں اس کا تذکرہ کرتا ہے :۔

"خواہ جنت میں میرا ہم نشیں کوئی بھی ہو ــــــ

مگر کیا میرا یہ نصب العین حاصل ہو جائیگا ؟"

یا :۔

"ــــ ممکن ہے میں تم سے مل سکوں ــــ وہاں

ــــ جہاں آسمان جھک کر جنگل کے سبز کنارے کو بوسہ

دیتا ہے"

یہ وہی تلاش اور جستجو ہے جو یولیسیز (.Ulysses) کو دامنگیر تھی، جس نے پرومی تھیوس (Promitheus) کے قلب میں آگ لگائی تھی، جس نے فاسٹ (FAUST) کو ستایا تھا ــــ ناممکن الحصول کی تلاش، ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کی خواہش، انسان کے مفاد کے لئے شعلہ آسمانی کی جستجو......!

نصب العین ہمیشہ حصول کی دسترس سے آگے ہی رہیگا اُفق تک ہم کبھی اپنا ہاتھ نہ پہونچا سکیں گے، مگر پھر بھی ہم کو اس تحصیل لاحاصل کی کوشش کو چھوڑنا نہ چاہیئے "ہجوم ناامیدی" کے باوجود بھی یہ "سعی باطل" ہم کو جاری رکھنی چاہیئے۔

اسے کیا چیز ستاتی ہے، اس آوارہ و مجنوں باغی کو؟ وہ اپنے آپ کو "گم کردہ اسیری" کہتا ہے، "آزاد اسیری" نہیں کہتا۔ درد آزادی کیسا ہوتا ہے ؟ آزادی اس کا شعار ہے۔

وہ بالکل آزاد ہے ــــ بلا روک ٹوک ــ

ایسا آزاد جس کا سنبھالنا مشکل ہے۔ مگر پھر بھی ایک پوشیدہ درد اس کے اندر رہ رہ کر ٹیس لیتا ہے۔ اس کا حلق خشک کر دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں وحشت اور حسرت پیدا کر دیتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روح کا یہ جذبہ آزادی ہی ــــ آزادی سے سیر ہو کر ــــ اب پھولوں سے گندھی ہوئی زنجیر غلامی کیلئے بے چین ہے، مگر اسکو کوئی ہستی ایسی نازک اور سریع الحس نہیں ملتی جو اسے اس زنجیر میں مُقیّد کر سکے۔ آزادی اس کا مُنہ چڑاتی ہے :۔

"دیکھ تیری آوارہ گردی اور آزادروی ہی تیرے لئے جنجال ہے ... ایک زندانِ بلا ہے ... کیونکہ یہ تجھ کو سب سے علیحدہ ــــ بالکل تنہا ــــ رکھتی ہے!"

آزادی اپنی بقا کیلئے محبت کی طالب ہوتی ہے اور جس آزادی تو پھر تکمیل محبت کا خواب دیکھتی ہے ــــ "ایک رقص سرمدی" کی آرزو کرتی ہے (اس کھینچا تانی کی نہیں، جو محبت کو "ایک رسا کشی کا مقابلہ" بنا دیتی ہے۔ اور نہ اس کاروباری محبت کی جو ہمارے اس نیم گرم کرہ پر نظر آتی ہے)۔

اس کی "شریک رقص" کہاں ہے ؟

اس کی رس بھری، روح کو تڑپانے والی آواز دور سے سُنائی دیتی ہے، شاید مرمریں فرش پر اس کے قدموں کی جھنکار بھی "فردوس گوش" ہوتی ہے، شاید اس کے ملبوس کی سرسراہٹ بھی دل کی حرکت تیز کر دیتی ہے، مگر ــــــــ

وہ خود کہاں ہے ؟

یہ ہے وہ ازلی درد جو آزادوں کے حصّہ میں آیا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ "باغی" اکیلا اپنے خیالات کی دُنیا میں اِدھر اُدھر گھوما کرتا ہے......

نذرؔل کی شاعری اس کی شخصیت کے ان دو متضاد عناصر کی آئینہ بردار ہے ــــ ایک تو اُس کا جذبہ آزادی اس کا کبھی شکست نہ ہونیوالا جذبۂ آزادی۔ اور دوسری اسکی روحانی تشنگی، اس کی خواہش غلامی ــــ قید محبت کی آرزو اور یہ ایک دوسری بحث کا پیش خیمہ ہے۔ "محبت کا اتنا زیادہ بھوکا ہونے کے باوجود وہ اپنے عقائد اور نظریات میں اتنا بوالہوس اور بندۂ نفس کیوں نظر آتا ہے ؟ لوگ کہتے ہیں۔

"ارے وہ تو پکا اوباش ہے!"

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "کیوں نہ ہو"؟

تصور کیجئے، موسم بہار کے اخیر کی ——— غنودگی طاری کر دینے والی ایک دوپہر میں ایک باغ کا، نرم و گرم ہوا کے خوابناک جھونکوں کا، اور ایک پھول سے دوسرے پھول تک بھٹکتی ہوئی ایک تتلی کا . . . . . . یہ ہے تصویر نوجوانوں کی دلچسپی کے اس مرکز کی . . . . ایک سچے "رند خراب حال" کی!

صنفِ نازک کی طرف سے اسے "بیوفا" اور "بیگانہ خیال" کا خطاب دیا جاتا ہے۔ مگر اسے بیوفا کیوں کہا جائے؟ وہ تو کوئی عہد ہی نہیں کرتا!

وہ ضدی، ہٹ کا پورا، عاشق ——— بھونرا ——— دن دہاڑے موسیقی کے ایک طومار کے ساتھ آتا ہے، شہد چوس لیتا ہے اور صرف "لذتِ نیش" چھوڑ دیتا ہے۔ مگر ہمارا یہ بھولا بھالا رند اوباش آپ سے کسی چیز کا طالب نہیں۔ وہ اپنے "مخصوص اندازِ بے پروائی" کے ساتھ آتا ہے۔ کسی پھول کے گرد تھوڑی دیر طواف کرتا ہے، صرف اس خوشبو سے لطف اندوز ہوتا ہے جو فضا میں پھیلی ہوتی ہے اور اس کے بعد چلا جاتا ہے ——— پھول جاتا ہے مسکراتا ہے! اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ آپ کے سامنے سرِ عقیدت خم کرتا ہے اور پھر، پیار استہ لیتا ہے ——— —— یہ شخص مٹرلنک (Maeterlink) کی کسی ٹریجیڈی کا ہیرو بن سکتا ہے۔

وہ خوب جانتا ہے کہ زندگی اتنی زیادہ "سنجیدہ" ہے کہ وہ خود سنجیدہ رہ ہی نہیں سکتا۔ اسے بخوبی معلوم ہے کہ اس کے دل کی کلی کا ملنا ناممکن ہے۔

پھر بھی وہ زندگی کو عذابِ جان نہیں سمجھتا۔ وہ اپنی حرماں نصیبی کے گہرے احساس اور کبھی نہ پوری ہونیوالی آرزو کو، یاوہ گوئی اور مسخرگی کے بھیس میں، خود اپنے سے بھی چھپاتا ہے ——— وہ جانتا ہے کہ اپنا وقت سڑک کے کنارے کیسے گذارے۔

اس "حسین کلی" کے لئے وہ دن یقیناً یادگار ہوگا جب وہ مایۂ تسکین بن سکے گی اور اس بے چین اور سکون ناآشنا آوارہ گرد کو ہمیشہ کے لئے اپنا اسیر بنائے گی۔ یہ تتلی اس وقت اپنی پرواز چھوڑ دے گی اور اس کے ساتھ شاخِ گل پر رقص کریگی اور صبا کے نرم و نازک جھونکے یہ گیت گائیں گے۔

"کلی اور تتلی ——— تتلی اور کلی
اب ایک ہو جاتے ہیں، ہمیشہ کیلئے ایک!"

اس وقت تک ہمارے تذرُل کو مسکرانے دیجئے تاکہ وہ اپنے آنسوؤں کی یاد کو بہلا سکے۔ یہ اس کی آوارگی، اور بوالہوسی نہیں۔ یہ تو اس کی ملاعبت اور وارفتگی ہے اور اس کی تہ میں ایک شاندار ٹریجیڈی کا مواد ہے ——— ملاحظہ فرمائیے:—

"یہاں کوئی چیز باقی نہ رہے گی
سوائے میرے تمہارے اور درد کے!"

"ماضی" دہلی

موہنی

بمبئی سکول آف آرٹس میں، جو مشرقی فنونِ لطیفہ کا سب سے بڑا ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک حسین دوشیزہ آرٹ گیلری میں ایک قدِ آدم تصویر کے سامنے مبہوت کھڑی تھی۔ اس نے نہایت سادہ کپڑے پہن رکھے تھے جن سے اس کی خوش مذاقی مترشح تھی۔ بہ ظاہر وہ مضطرب اور نڈھال معلوم ہوتی تھی۔ حُسن، عنفوانِ شباب اور اس پر تفکرات و تکان نے اس کے رخساروں کو سُرخ اور آنکھوں کو دلکش بنا رکھا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ حُسن زیبائش سے مبرّا ہونے پر زیادہ دل فریب ہوتا ہے۔ اور جب یہ غریبوں کے حصہ میں آجاتا ہے تو اور بھی نکھر جاتا ہے۔

وہ تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ اس میں ایک کم سن دہقان لڑکا ایک چٹان کے سرے پر منہ سے بانسری لگائے کھڑا تھا۔ چٹان کے نیچے سرسبز وادی ایک ایسے مخملیں فرش کی طرح دور تک پھیلی ہوئی تھی جس کی دھانی زمین پر رنگ برنگے پھول نہایت احتیاط سے کاڑھے گئے ہوں۔ دامنِ کوہسار میں تناور درختوں کے جھنڈ بھیڑوں کے ریوڑ کے مانند بکھرے ہوئے نظر آتے تھے، دور پس منظر میں ڈوبتے ہوئے آفتاب کی آخری کرنیں عقیق کے نیزوں کی طرح اودے بادلوں میں پیوست تھیں۔ اور مندر کے طلائی کلس کے حاشئے ہفت رنگی شعاعوں سے جگمگا رہے تھے۔ فضا میں بگلوں کا ایک قافلہ اپنے بسیرے کی جانب واپس لوٹ رہا تھا۔ تصویر کے حاشیہ پر اس کی سُرخی "سرودِ شام" اور مصور کا نام جگدیش لکھا ہوا تھا۔ جو نہایت مضبوط چوبی چوکھٹے میں جکڑی ہوئی آہنی زنجیروں سے دیوار پر آویزاں تھی۔

دوشیزہ تصویر کے آگے تصویر بنی کھڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے خیالات میں اس قدر کھوئی ہوئی ہے کہ اُسے تصویر میں کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔ دماغ جب خیالات کے ہجوم میں گھر جاتا ہے تو دیگر حواس پر اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتا۔ وہ اسی عالم میں کھڑی تھی کہ جگدیش ہاتھ میں رنگوں کی پیالیاں اور مُوقلم لئے ہوئے ایک دروازہ سے آرٹ گیلری میں داخل ہوا۔ لمحہ بھر کیلئے اس کو بغور دیکھا اور پیشانی پر بل ڈالے ہوئے دوسرے دروازہ سے باہر نکل گیا۔ خوابوں کی دُنیا میں بسنے والے یہ تخیل پرست مصوّر بھی کیسی عجیب و غریب طبیعت کے مالک ہوتے ہیں! کون جانتا ہے کہ اس وقت جگدیش کے خیالات کیا تھے؟

"ڈائرکٹر صاحب ہیں؟" دوشیزہ نے کافی دیر کے بعد ایک چپراسی کو اپنی طرف آتے دیکھکر دریافت کیا۔

"صاحب کسی سے ملاقات نہیں کر سکتے۔" چپراسی نے غیر ارادی طور پر یکبار انھیں الفاظ کو دُہرایا جنھیں وہ برسوں سے دُہراتا چلا آیا تھا اور اپنے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"لیکن میں صرف......"

"صاحب کسی سے ملاقات نہیں کر سکتے۔" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر پیٹی درست کرتے ہوئے پھر وہی جملہ دُہرایا۔

"تم مجھے صرف اندر جانے دو، صاحب تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔" دوشیزہ نے منت آگیں لہجہ میں کہا۔

چپراسی نے ایک بار نظر بھر کے اس کی طرف دیکھا۔ شاید اُسے رحم آگیا۔ کیونکہ اس نے اس مرتبہ جیب سے ایک ملاقاتی پرزہ نکالکر

پیش کیا جس نے اس کی خانہ پُری کر دی ۔

نام : مس موہنی .... پیشہ ..... ملاقات کا باعث :- ......

چپراسی پُرزہ لیکر اندر چلا گیا اور دو منٹ کے بعد لوٹ کر کہا "صاحب کہتے ہیں کہ سہ پہر کو ملو"

جواب سُن کر موہنی نے ایک معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ گویا وہ کہنا چاہتی ہے کہ وہ ایسی چھوٹی چھوٹی یاس انگیز باتوں کو کسی شمار میں نہیں لاتی ۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سہ پہر کریگی ۔ شاید غربت و عسرت میں خودداری کا احساس لازماً زائل ہو جاتا ہے ۔

کچھ دیر بعد دوپہر کے وقفے کا گھنٹہ بجا ۔ ڈائرکٹر صاحب اپنی ہیٹ لئے ہوئے آفس روم سے باہر نکلے ۔ بنچ پر بیٹھی ہوئی موہنی کو دیکھکر ایک لمحہ کیلئے رُکے اور واپس اپنے کمرے میں چلے گئے ۔ حالات خلافِ معمول دیکھکر چپراسی بھی پیچھے پیچھے ہو لیا ۔

"ہم سے کوئی ملاقات کا منتظر ہے ؟"

"نہیں حضور ، وہ تو وہی لڑکی ہے جسے آپنے سہ پہر کو بُلایا ہے "

"اچھا ، اسے اسی وقت بھیجدو "

(۲)

دوسرے دن آرٹ سکول کے پینٹنگ ہال میں موہنی ایک بلند اسٹیج پر ماڈل بنی بیٹھی تھی ۔ ہال کے طول و عرض میں طلبا مختلف زاویوں سے اس کی تصویر کھینچ رہے تھے ۔ ماسٹر صاحب کمرے میں ٹہل ٹہل کر ضروری ھدایات دے رہے تھے ۔ ٹہلتے ہوئے وہ ہال کے دوسرے سرے پر جگدیش کے قریب آکر رُک گئے ۔

"تمھاری آنکھیں نم ہیں جگدیش ، کیسی طبیعت ہے تمھاری ؟"

"کچھ نہیں ماسٹر صاحب ، زکام ہو گیا ہے اس لئے آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں "

"خوب ! تم نے اس کے بھی آنسو بہا دیئے ہیں !! " ماسٹر صاحب نے جگدیش کی بنائی ہوئی تصویر کو بغور دیکھا اور مسکرا کر کہا ۔ "یوں تو یہ بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن اصولاً ..... "

"وہ سچ مچ رو رہی ہے ماسٹر صاحب !!"

"ہوگا ۔ اچھا جگدیش آج تمھاری طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے ۔ اب تم جاؤ اور اپنے کمرے میں آرام کرو ۔ شام کو جب میں بورڈنگ ہاؤس کے قریب سے گذروں تو مجھے اطلاع دو کہ تمھاری طبیعت کیسی ہے "

جگدیش تمام دن خیالات میں کھویا رہا ۔ موہنی کی یہ حالت کسی طرح اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی ۔ چند سال پہلے دونوں ہمسبق رہ چکے تھے ۔ اور ساتھ ہی ولسن کالج کلکتہ میں تعلیم پائی تھی ۔ وہ اسے کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی کی حیثیت سے جانتا تھا ۔ جگدیش بھی چونکہ گھر سے آسودہ تھا اس لئے بی ۔ اے کرنے کے بعد بمبئی آکر محض بہ طور شغل سکول آف آرٹ میں داخل ہو گیا ۔ اس کے بعد کبھی اُسے موہنی کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ۔ بلکہ موہنی کی نظریں تو آج صبح بھی پینٹنگ ہال میں اس پر نہیں پڑیں ۔ اس نے سوچا کہ اگر اس نے

اسے دیکھ بھی لیا تو پہچان نہ سکے گی۔ جبکہ اس کا خود یہ حال تھا کہ وہ اپنے کالج کے بیشتر ساتھیوں کو فراموش کرچکا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اپنے آپ کو کس طرح اس پر ظاہر کرے۔ وہ کسی طرح موہنی کو ایسی ناگفتہ بہ حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

(۳)

شام کو جگدیش بورڈنگ ہاؤس سے نکل کر لب سڑک کھڑا تھا تاکہ ماسٹر صاحب جب وہاں سے گذریں تو وہ انھیں اپنی صحت سے آگاہ کردے۔ چوراہے پر سے مڑکر آتی ہوئی کولتار کی ہموار سڑک افق کے اس پار تک چلی گئی تھی۔ راستہ کے دونوں جانب حدنظر تک ٹیلیفون کے اونچے اونچے آہنی ستون برقی تاروں کے جال کو فضا میں تھامے کھڑے تھے۔ جگدیش ایک ستون کا سہارا لئے نہ معلوم کیا کیا سوچتا رہا۔ وہ خیالات میں اس قدر محو تھا کہ آرٹ سکول کے گھنٹے کی آواز بھی اسے سنائی نہ دی۔ دفعتہً اس کی نظر موہنی پر پڑی جو موٹروں اور گاڑیوں کی آمدورفت کے درمیان سڑک کو عبور کرنیکی کوشش کر رہی تھی۔

"موہنی! موہنی!!" کہہ کر وہ اس کی طرف بڑھا۔

"جگدیش!!" موہنی پلٹ کر اس کے آگے کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک موٹر فراٹے بھرتا ہوا اس سے ٹکرا کر گذر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چوراہے پر آرٹ سکول کے طلبہ اور عوام کا مجمع ہوگیا۔ درمیان میں جگدیش موہنی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے گرد دوستوں کو دیکھکر کہا:-

"ٹیکسی بلواؤ شمسی! ڈیو بھائی دیکھ کیا رہے ہو۔ برف منگواؤ برف، چوٹ زیادہ ہے۔ لوگوں کو ہٹاؤ ذرا بھائی اختر!— موہنی! موہنی!! ہوش میں آؤ!!!"

جگدیش کے ساتھی حیران تھے کہ اُسے اس لڑکی کا نام کیونکر معلوم ہوا۔

ٹیکسی آنے پر جگدیش نے فوراً موہنی کو اپنے دوست ڈاکٹر گیشانی کے ہسپتال پہنچایا۔

(۴)

دو روز کی بیہوشی کے بعد موہنی نے آنکھیں کھولیں اور جگدیش کو اپنے سرہانے پاکر نہایت نحیف آواز میں کہا "میں آپکا احسان کبھی نہ بھولوں گی، جگدیش بابو، لیکن اگر میں اسی حادثہ میں مرگئی ہوتی تو بہت اچھا ہوتا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو موہنی! تم جلد اچھی ہوجاؤ گی، ڈاکٹر صاحب ابھی ابھی کہہ رہے تھے۔ وہ آتے ہی ہوں گے زیادہ گفتگو نہ کرو۔ نقاہت بڑھ جائیگی۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں جگدیش بابو۔ میرے لئے مرجانا ہی بہتر تھا۔ آپ کو میرے متعلق تشویش سی ہو رہی ہوگی، میں چاہتی ہوں کہ آپ کو سب کچھ بتلادوں۔ شاید اس کے بعد موقع نہ ملے۔۔"

جگدیش گو یہ نہیں چاہتا تھا کہ موہنی اپنے آپ کو ہلکان کرے۔ لیکن حالات کو جاننے کے لئے وہ سچ مچ بے چین تھا۔ اسلئے خاموش ہو رہا۔

"دو سال ہوئے پتاجی کا انتقال ہوگیا۔" موہنی نے کہنا شروع کیا "اس کے بعد میں اکیلی رہ گئی، بالکل تنہا۔ رشتہ داروں نے میرے گھر کا صفایا کرکے مجھے چھوڑ دیا۔ میرے ایک ماموں ہیں۔ میں انھیں کے پاس رہا کرتی تھی۔ لیکن جب پتاجی کی چھوڑی ی

ہوئی تمام رقم ختم ہو گئی تو انھوں نے بھی مجھے دق کرنا شروع کیا۔ آخر ایک دن مجھ سے چھٹکارا حاصل ہی کر لیا اور مجھے بمبئی کے ایک فرضی مقام کا نام بتلا کر ٹرین پر سوار کر دیا کہ اس جگہ مجھے استانی کی حیثیت سے طلب کیا گیا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں کسی نہ کسی طرح دُنیا میں اپنی جگہ پیدا کر لوں گی۔ کیونکہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ کالج کی تعلیم یافتہ لڑکیاں بڑی حرّافہ اور زمانہ ساز ہوتی ہیں۔ اور اگر میں ایسی نہ بھی ثابت ہوئی تو ان سے باز پُرس کرنیوالا میرا کون تھا؟ اس کے علاوہ بمبئی میں میرے منگیتر رہتے ہیں۔ شاید انھوں نے یہ سوچا ہو کہ ٹھوکریں کھاتی ہوئی میں سہارے کی امید میں اُن کے دروازہ تک پہونچ جاؤں گی اور انھیں موقع ہاتھ لگ جائیگا کہ میری فراری کی افواہیں پھیلا کر سماج کے آگے اپنی صفائی پیش کر سکیں۔"

موہنی نے ایک گہرا سانس لیکر سلسلۂ کلام کو جاری رکھا "بمبئی پہونچنے پر مجھے اپنے ماحول کی نزاکت کا احساس ہوا۔ یہ صرف تعلیم کا فیض تھا جو میں ایسی حالت میں بھی اپنے حواس قائم رکھ سکی اور چند روز اسی طرح گذار لئے۔ لیکن بہت جلد زمین مجھ پر تنگ ہو گئی۔ دن تو جیسے تیسے بیت جاتے تھے لیکن راتیں زندگی اور موت کی کش مکش میں کٹنے لگیں۔ یہاں کے کنیا آشرم اور دھرم شالے شریف عورتوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہیں۔ ان میں مصیبت کی ماری اور دُنیا کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں کو دو روز سے زیادہ مفت رہنے نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اکثر صورتوں میں پہلے ہی دن آشرم والوں کے عجیب و غریب مطالبات شروع ہو جاتے ہیں علاوہ ازیں شہر کے شریف کہلانیوالے امیروں کی شرافت یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ چند روز کے لئے کسی غیر عورت کو مفت کی روٹیاں توڑنے دیں۔" موہنی ایک لمحہ کیلئے رک گئی

جگدیش مجسمہ کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

"میں نے دُنیا اور دنیا والوں سے مایوس ہو کر خود کشی کی ٹھان لی۔" اس نے پھر کہنا شروع کیا "لیکن میں نے سوچا کہ مرنے سے پہلے مجھے اپنے مردہ جسم کی آخری رسومات کا انتظام کر جانا چاہئے۔ شاید کسی کو مرنے کے بعد مجھ پر رحم آجائے۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی میری لاش کو جو سب سے پہلے ٹٹولے گا وہ اس مال غنیمت کو ہتھیا کر مجھے سڑنے کے لئے وہیں چھوڑ جائیگا اور اس وقت تک میری لاش نہیں اٹھائی جائیگی جب تک کہ اس کی عفونت سے راہگیروں کو سانس لینا دشوار نہ ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد اس بوسیدہ لاش کو ہسپتال سے ڈاکٹری کے کسی طالب علم کے ہاتھ فروخت کر دیا جائیگا۔ آہ غریبوں کو مرنے کے بعد بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ روپئے کے عوض غریبوں کی لاش خرید سکنے والے امیر اُن کے مردہ جسم کی بوٹیاں اڑا دیتے ہیں اور ان کے دل و دماغ کو چیر کر اپنی علمی تشنگی کو دور کرنیکا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اُف! مہذب کہلانیوالی دُنیا کی بربریت!! بہرحال میں نے تسکینِ قلب کیلئے اس دن اس سکول آف آرٹس میں ماڈل بننا پسند کر لیا جس کے سامنے آپنے مجھے دیکھکر آواز دی تھی......"

"آپ زیادہ گفتگو نہ کیجئے۔ آپ کو آرام لینا چاہئے۔" ڈاکٹر کیشا آئی یہ کہتے ہوئے دوا کی بوتلیں لئے کمرے میں داخل ہوئے۔

جگدیش پر ایک سکتہ کا عالم طاری تھا کبھی کبھی وہ اپنے آنسو رومال میں خشک کر لیا کرتا تھا۔ موہنی نے ڈاکٹر کیشا آئی کیطرف نظریں اٹھا کر پھر کہنا شروع کیا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپنے میرے لئے بڑی تکلیف اٹھائی۔ مجھے مر جانے دیا ہوتا۔ پھر بھی میں آپکے خلوص کی ممنون ہوں مگر آپنے میری لاش میں زندگی کی روح پھونک کر مجھے اور بھی مار ڈالا ہے۔ لوگوں کیلئے ڈاکٹر فرشتہ رحمت ہوتا ہے لیکن میرے لئے

ڈاکٹروں کا وجود کس قدر خوفناک ہے۔ معاف فرمائیے میں ہوش میں ہوتے ہوئے بھی ذرا بہکی بہکی باتیں کر رہی ہوں۔ آپنے اس قسم کی گفتگو کاہے کو سُنی ہوگی۔ لیکن اگر آپ کان رکھتے ہیں تو سنئے۔ یہ ساز کے ٹوٹنے والے تاروں کی جھنکار ہے۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ساز صرف ایک بار پیش کر سکتا ہے۔ آہ ڈاکٹر صاحب! ایک ڈاکٹر آپ ہیں جنھوں نے مجھے جِلا کر موت کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ میری زندگی ایک طویل موت بن کر رہ گئی ہے۔ اور ایک ڈاکٹر میرے ہونیوالے پتی ہیں جن کے پاس سماج نے مجھے اس قابل نہ رکھا کہ میں جیتے جی جا سکوں ا سمکتی ہوں کہ وہ بمبئی کے بہت بڑے اور مشہور ڈاکٹر ہیں۔ لیکن آپ کو میرے سر کی قسم آپ ان سے ہرگز نہ کہئے گا کہ آپنے ان کی موہنی کو ایسی حالت میں دیکھا ہے... کیا آپ ڈاکٹر کیشانی کو نہیں جانتے؟ .....“

”موہنی! موہنی!! موہنی!!!“ ڈاکٹر کیشانی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

”آپ اس قدر پریشان کیوں ہو گئے ڈاکٹر صاحب؟ خفا نہ ہوجئے۔ میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے آپ کتنے رحمدل ہیں! ......“

”میں، میں ہی ڈاکٹر کیشانی ہوں موہنی! میں ہی کیشانی ہوں!!“

ڈاکٹر کیشانی نے دونوں ہاتھ موہنی کی جانب بڑھا دیئے۔

جگدیش جس کی آنکھیں اب تک نم آلود تھیں مسکرا دیا۔

(طبعزاد)　　　　غلام عبّاس (موکوی)

میرے حبیب!

مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر
جگر کو سوزشِ پیہم سے ہمکنار نہ کر
مرے شباب کی راتوں کو سوگوار نہ کر
مرے حبیب مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

ترس رہی ہے تری دید کو نظر میری
شبوں کو خون رُلاتی ہے آرزو تیری
مری بہار غدار اخزاں شکار نہ کر
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

ہوئی ہے عمر مسرت کی بھیک پا نہ سکا
ہزار چاہا بھی میں نے تو مُسکرا نہ سکا
خرابِ زیست کو اتنا تو بیقرار نہ کر
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

نظر کو حوصلۂ عرضِ غم دیا میں نے
برستی آنکھ کو وقفِ بیاں کیا میں نے
مگر جواب کہ "یہ ذکر بار بار نہ کر"
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

وطن میں جا کے جو غربت زدہ کو بھولنا تھا
خمارِ قرب میں حسرت زدہ کو بھولنا تھا
تو کیوں یہ کہہ نہ دیا پہلے ہم سے پیار نہ کر
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

الطاف مشہدی

عورت کے حقوق

عورت کے حقوق کے متعلق دُنیا کے مختلف حصوں میں ہزاروں قانون بنے۔ مگر جب تک اسلام دُنیا میں نہ آیا "صنفِ نازک" نے اپنے اصلی اور فطری حقوق حاصل نہیں کئے۔ ظہورِ اسلام سے پہلے "عورت" جس کو فطرت کے حسین ترین شاہکار ہونیکا فخر حاصل ہے نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ اور ایشیا کے ممالک میں بھی ایک ناقابلِ اعتنا ہستی سمجھی جاتی تھی، وہ مرد کی غلام اور ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم ایک ذلیل و خوار اور حقیر ترین شے خیال کی جاتی تھی، جائداد کی طرح ایک شخص سے دوسرے شخص کے نام منتقل ہوسکتی تھی، قمار بازی میں اس کی بازی لگائی جاتی تھی اور اس کا ہار دینا یا جیت لینا تہذیبِ اخلاق کے عین شایانِ شرافت سمجھا جاتا تھا۔

دُنیا کے مختلف ممالک کو فطرت نے انفرادی خصوصیتیں عطا کی تھیں، اُن میں سے روما کو قانون سے خاص مناسبت تھی، رومن قانون تمام دُنیا میں اعلیٰ اور افضل تسلیم کیا جاتا تھا، سارا یورپ اس قانون کو مستند سمجھتا تھا، رومن قوانین آج بھی تمام یورپ کے قوانین کا سنگِ بُنیاد ہیں۔ اس مستند ترین قانون میں عورت کے حقوق یہ تھے کہ وہ کسی کے عقدِ نکاح میں آنے کے بعد اپنے شوہر کی زرخرید جائداد ہو جاتی تھی، اس کا تمام ذاتی مال و متاع خود بخود اس کے شوہر کی ملک بن جاتا تھا۔ اور وہ جس طرح مناسب سمجھتا اس کو صرف کرتا تھا۔ وہ جو کچھ دولت اور روپیہ اپنے زورِ بازو اور محنت سے پیدا کرتی تھی سب شوہر کا مملوکہ سمجھا جاتا تھا، وہ کوئی خدمت حاصل نہیں کرسکتی تھی اور نہ کسی کی ضامن ہوسکتی تھی۔ وہ ادائے شہادت کے قابل نہیں سمجھی جاتی تھی اور نہ کسی سے کوئی معاہدہ کرسکتی تھی، یہانتک کہ وہ وصیت کرنیکی بھی مجاز نہیں تھی۔

حکومت روما نے جب عیسائی مذہب اختیار کیا تو کچھ کچھ اصلاحیں ہوئیں، لیکن یہ اصلاحیں برائے نام اور وقتیہ ہوتی تھیں، کچھ زیادہ وقت گزرنے نہیں پاتا تھا کہ پھر وہی قدیم اصول اور قدیم قوانین اسی آن بان سے لوٹ آتے تھے۔

چھٹی صدی عیسوی میں ایک جلسۂ عظیم اس مسئلہ کے طے کرنے کے لئے منعقد کیا گیا کہ عورت کا جسم "روح" کا حامل ہے یا نہیں، اس اجتماعِ عظیم نے بڑی فیاضی اور دریادلی سے اس قدر تسلیم کیا کہ "عورت" نوعِ آدم میں داخل ہے اس لئے وہ ذی روح سمجھی جاسکتی ہے مگر اس کی تخلیق کی غرض و غایت صرف مرد کی خدمت کرنا اور اس کے ہر حکم کی بلا عذر و حیلہ تعمیل کرنا ہے۔

یورپ میں ایک عرصہ تک اس قسم کے قوانین جاری رہے، تقریباً ساٹھ سال گذرے کہ "قانونِ نسواں" بنا، جس کے بعد ان قوانین اور اصول میں کچھ اصلاح ہوئی، مگر حقیقت یہ ہے کہ بہت سی خامیاں اب بھی باقی ہیں، مثلاً عورت اپنی ملکیت کا حق کسی چیز پر بھی بہ حیثیت بیوی ہونے کے نہیں رکھتی، شریکِ زندگی تو کہلاتی ہے مگر ملکیت میں اس کی حقیقی شرکت نہیں پائی جاتی، باپ یا شوہر سے ہٹ کر وہ کوئی شخصیت نہیں قائم کرسکتی، اپنی ملکیت اور جائداد خالص اپنے نام سے نہیں رکھ سکتی۔ اور نہ کسی قسم کا قانونی معاملہ کرسکتی ہے۔

اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مغربی اور دوسری اقوام نے عورت کے معاملہ میں ہمیشہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے، یہی سبب ہے

کہ غریب عورت ہر دور اور ہر تمدن میں مختلف سلوک اور برتاؤ کی آماجگاہ بنی رہی۔ قدیم تاریخی غاروں اور مندروں کے مجسموں اور نقوش سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کبھی اس کی پرستش بھی کی جاتی تھی۔ کسی زمانہ میں اس کی تصویریں عبادت گاہوں کی زیب و زینت بھی بن چکی ہیں۔ بعض دور اس پر ایسے بھی گذرے ہیں کہ اس کو بے حد ذلیل و خوار سمجھکر اس کے ساتھ نہایت ذلیل برتاؤ کیا جاتا تھا، یہ واقعہ ہے کہ کسی زمانہ میں بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک اور شریفانہ برتاؤ نہیں کیا گیا۔

دوسری سابقہ اور موجودہ تہذیب پر غور کرنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ غریب عورت کو ایک مقبوضہ جائداد سمجھا گیا ہے جس طرح جائداد منقولہ وغیر منقولہ کو کوئی انسان اپنی ملک سمجھکر اس پر قابض رہتا ہے اور اسمیں من مانے تصرف کر سکتا ہے۔ اسی طرح عورت کو بھی تصور کیا جاتا تھا مثل جائداد منقولہ کے وہ اپنے ورثا میں تقسیم ہو سکتی تھی۔ یا اپنے شوہر کی زندگی ہی میں اس کی نظروں سے گر جانیکے بعد سر بازار فروخت کی جا سکتی تھی، گویا کہ وہ مرد کی ایک جائداد منقولہ ہے جس سے ہر قسم کا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

عورت کیلئے جب کبھی قوانین مرتب ہوئے اور اصول قائم کئے گئے ان کا منشاء صرف یہ ہوتا تھا کہ اس کی حیثیت کو کم کیا جائے۔ اور اس کو وہی اپنی قدیم پست اور ذلیل حالت میں رکھا جائے تاکہ مرد کی ہمسری اور برابری نہ کرنے پائے اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرنیکی اسمیں قابلیت اور صلاحیت نہ پیدا ہو۔

بدھ مت میں عورت کا جو تصور تھا وہ اس سے ہویدا ہے کہ اس سے کنارہ کشی اور علیحدگی کا حکم دیا گیا تھا گویا کہ وہ ایک ناپاک اور ذلیل ہستی ہے۔

ہندوستان میں عورت کو عالم شیر خواری ہی میں قتل کر دیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ کسی عورت کا مرد کے نکاح میں آنا ایسا تھا کہ ہمیشہ کیلئے اس کی ملک بن جاتی تھی، شوہر کے بعد یا تو وہ ہمیشہ کیلئے بیوہ بنی بیٹھی رہے یا اس کی ارتھی کے ساتھ "ستی" ہو جائے، کہیں کہیں یہ بھی دستور تھا کہ ایک بیوہ دوسرے بھائی کی موروثی جائداد سمجھی جاتی تھی اور زندہ بھائی کو مردہ بھائی کی بیوی پر بغیر اس کی رضامندی کے اپنی بیوی بنانے کا حق حاصل تھا، بعض دفعہ یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک بھائی اپنی زندگی ہی میں دوسرے بھائیوں کو اپنی ملکیت میں تصرف کا حق دیدیا کرتا تھا، شوہر کی عبادت اور پرستش عورت کی زندگی کا ایک اہم جزو سمجھا جاتا تھا، شوہر کے پیر دھو کر پانی پینا عورت کی اطاعت اور فرمانبرداری کا بہترین اصول سمجھا جاتا تھا، جب تک کہ گھر کے سارے مرد اور لڑکے کھانا نہ کھالیں عورت کو خورد و نوش کی اجازت نہ تھی۔

ہندوستانی تہذیب پر ایک عمیق نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج میں عورت کا وہی درجہ ہے جو نیچ اقوام کو عطا کیا گیا ہے عورت کے ساتھ ہندوستان نے جس قسم کی بدسلوکی کی ہے ویسی شاید ہی کسی ملک میں کی گئی ہو، جب تک شوہر زندہ ہے اس کی کچھ آؤ بھگت ہوتی ہے، لیکن شوہر کے بعد جو سلوک اس کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ اتنا روح فرسا اور دلخراش ہے کہ اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

عرب میں عورت کو وراثت کا مطلق کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، باپ کے بعد اس کی بیویاں بیٹے کو ورثہ میں ملتی تھیں اور وہ ان کو بغیر کسی احساس کے اپنی بیویاں بنا لیتا تھا، کثرت ازدواج کی کوئی حد و انتہا نہیں تھی۔ اکثر قبائل میں شیر خوار لڑکیوں کے ہلاک کرنیکی ظالمانہ اور وحشیانہ رسم جاری تھی۔ لڑکیوں کو بیاہ دینا نہایت مذموم اور ذلیل سمجھا جاتا تھا خسر یا سالا بننا باعث تذلیل تھا۔ لڑکیاں ترکۂ پدری سے محروم رہتی تھیں۔ بعد باپ کے بیٹا اپنی سوتیلی ماں کو بیوی بنا لیتا تھا، دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ عقد کرنا جائز تھا، باپ کے بعد اس کی بیویاں

بیٹے کی نظر میں اموالِ لاوارث سمجھی جاتی تھیں، مرد کی نظر میں عورت کی مطلق کوئی عزت اور وقعت نہیں تھی۔ دورانِ گفتگو میں بھی اسکا کوئی احترام یا پاس نہیں کیا جاتا تھا، جو یتیم و بیسیر لڑکیاں بیاہ کے قابل ہوتی تھیں، اُن کے ولی اور سرپرست اُن میں سے کئی کئی کو اپنے عقد میں لاتے تھے تاکہ ان کا مال و متاع اپنے تصرف میں لائیں۔ ان سے اور ان کے اموال سے مستفید ہونے کے بعد ان کو بے یارو مددگار دربدر کی ٹھوکریں کھانے یا بازارِ حسن کی جنس بنکر عصمت و عفت کا سودا کرنے چھوڑ دیتے تھے۔

عرب کی منتشر اور غیر متحد سماج میں طلاق کی سہولت غیر محدود تھی۔ مرد عورت کو کسی وہم یا کسی خیال کی بنا پر جب چاہتا بغیر کسی وجہ اور سبب کے فوراً طلاق دے سکتا تھا۔ بعض اشخاص اس خیال کے تحت کہ اگر ان کی وہ بیویاں جن کو انھوں نے چھوڑ دیا ہے دوسرں سے عقد کرلیں گی تو اُن کی ذلت ہوگی۔ ان سے دست بردار ہونے کے بعد بھی اپنے ہاں نہایت خراب و خستہ حالت میں رہنے پر مجبور کرتے تھے، اپنی بے خطا اور بےقصور بیویوں کے احساسات اور جذبات کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے۔

چین میں عام طور پر عورت کو تُند خو، ضدی، ہٹ دھرم اور سرکش سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ اصول قائم کر لیا گیا تھا کہ اس کو اپنی حد سے تجاوز نہ کرنے دیا جائے۔ کیونکہ وہ آگے بڑھکر پیچھے ہٹنا نہیں جانتی۔

یونان میں یہ دستور تھا کہ عورت بالکل پردے میں رہے، بچپن ہی میں اس کا بیاہ ہو جاتا تھا۔ چرخہ کاتنا، کپڑے بُننا، کشیدہ کاڑھنا اور خانہ داری کا انتظام کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا، وہ مکان کے ایک علیحدہ حصہ میں رکھی جاتی تھی، باہر نکلنے کی اس کو سخت ممانعت تھی۔ شوہر کی غیر موجودگی میں وہ کسی مرد سے نہیں مل سکتی تھی۔ اور کبھی دعوت ہو تو مہمانوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

رومن تہذیب میں عورت کا لقب بدتہذیب اور تلون مزاج تھا۔ اس میں کوئی خوبی ایسی نہیں سمجھی جاتی تھی کہ اس کو مُنہ لگایا جائے اور حُسنِ سلوک کا مستحق سمجھا جائے۔ یونان کے فلاسفروں کی یہ رائے تھی کہ عورت کو کسی صورت اور کسی حیثیت سے مرد کے برابر نہ ہونے دیا جائے، اگر اس کو مساوی حقوق دیدیئے جائیں تو وہ قابو سے باہر ہو جائیگی اور مرد پر حکومت کرنا شروع کردیگی۔ وہ بیاہی جانیکے بعد اپنے شوہر کی کنیز بن جاتی تھی۔ اس کی ذاتی ملک اور جائداد بھی از خود اس کے شوہر کی ملک ہو جاتی تھی۔ غرضکہ ہر طرح وہ شوہر کی دست نگر اور محتاج ہو کر حالتِ غلامی اور قید میں زندگی بسر کرتی تھی۔ وہ ایک ایسی مقبوضہ شے سمجھی جاتی تھی جو ضرورت کے وقت فروخت بھی ہو سکتی اور رہن بھی کی جاسکتی ہے، اس کا تبادلہ بھی ہو سکتا اور کبھی ایک جامِ شراب پر نثار بھی کر دی جاتی ہے، جب عورت مملوک ہو جائے تو اس کی اپنی ذاتی مالکانہ حیثیت معرضِ بحث میں آہی نہیں سکتی۔

یہودیوں کے ہاں نکاح درحقیقت عورت کی خرید و فروخت ہے، اس کی قیمت عورت کے باپ کو ملتی ہے، مولوی پیشوا اپنی مقدس کتابوں کی شریعت کی رو سے عورت کے ذلیل، حقیر اور کم رتبہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ دُنیا میں "گناہ" عورت کی بدولت وجود میں آیا۔ اور اس گناہ کا سارا وبال اس کی گردن پر ہے، عورت تمام انسانی گناہوں کا سرچشمہ قرار دی گئی۔

ایک یہودی مصنف لکھتا ہے "مرد کی بُرائیاں عورت کی نیکیوں سے کہیں بہتر ہیں" اکثر یہودی تصانیف میں مرقوم ہے کہ "عورت دوزخ کا دروازہ اور جملہ انسانی گناہوں کا سرچشمہ ہے، اس کو محض اس خیال ہی سے شرم کرنا چاہیئے کہ وہ "عورت" ہے، اس کو ہمیشہ نفس کشی کرنی چاہیئے اور اعتکاف میں مشغول رہنا چاہیئے، اس کو اپنے حسن سے شرمندہ ہونا چاہیئے کیونکہ یہ شیطان کا سب سے قوی اور مضبوط حربہ ہے"!

سنہ مسیحی سے کچھ قبل مسئلہ ازدواج کے متعلق ایک بڑا تغیر رونما ہوا، اس کی وجہ انسانی فطرت کے دماغی اور روحانی حصہ پر خاص اثر پڑا۔ اس زمانہ میں رہبانیت کی سموم ہوا شروع ہو چکی تھی، ایک فرقہ نے سب سے پہلے جواز نکاح کے متعلق شبہات ظاہر کئے اس کے بعد ایک اور فرقہ کے خیالات اسی قسم کے ہو گئے۔ ان ہی خیالات کی بنا پر رہبانیت کی صورت قائم ہوئی، رہبانیت کا ایک مُضر نتیجہ یہ پیدا ہوا کہ عورت کی حیثیت اور فطرت کو حد سے زیادہ حقیر و ذلیل خیال کیا جانے لگا، کثرتِ ازدواج کو جائز قرار دیا گیا۔ اور پیشوایانِ دین و اہلِ دیانِ مذہب نے اس رسم کی پابندی شروع کر دی۔

یورپ کے بعض متعصب اور شریر النفس اشخاص نے عورت کے حقوق کے مسئلہ میں اسلام کو بدنام کرنے کی سعی لاحاصل کی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسلام نے عورت کے حقوق دینے میں بہت تنگ نظری اور بخل سے کام لیا ہے، نوعِ انسانی کی سب سے پچھلی صف میں اس کو جگہ دی ہے، وہ اس کو بہت حقیر اور ذلیل و خوار خیال کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ عورت کے جسم میں وہ روح ہی نہیں ہے جو مرد کے اندر ہے، اس نے عورت کی کوئی قیمت ہی مقرر نہیں کی ہے، عورت کی حیثیت اسلام کی نظروں میں غلاموں سے بھی بدتر ہے۔ اس قسم کی لغو اور از سرتاپا غلط فتنہ انگیز افترا پردازیوں اور شر انگیز بہتانوں کا جو اثر صنفِ نازک پر ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے، یہی وجہ تھی کہ سولھویں اور سترھویں صدی میں ان دروغ بیانیوں کی وجہ سے اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کا اس درجہ ہجوم ہوا کہ ہر قسم کے صحیح خیالات اور احساسات کیلئے راہیں مسدود ہو گئیں، مغرب کی تمام سوسائٹیاں اس شور و غل سے اتنی متاثر ہوئیں کہ اسلام کو ایک حیوانیت کا مجسمہ سمجھنے لگیں اور صنفِ نازک تو اسلام کے نام سے اتنی خوف زدہ ہو گئی کہ اگر کبھی خواب میں بھی اسلام کا نام سن لے تو چونک پڑے۔ مگر آخر کار جھوٹ کی شکست اور سچ کی فتح ہو کر رہی۔ ایک دن ساری دُنیا نے دیکھ لیا کہ اسلام نے عورت کے حقوق دینے میں کتنی ہمدردی، فیاضی اور دریا دلی سے کام لیا ہے۔

عورت کا مسئلہ ابتدائے انسانیت سے لیکر آج سے کوئی چودہ سو برس قبل تک دُنیا کی تمام اقوام کے لئے ایک عقدہ لاینحل تھا۔ مگر اسلام نے کس آسانی سے یہ کہہ کر حل کر دیا کہ "تم عورتوں کا لباس ہو اور عورتیں تمہارا لباس"۔ عورت کو حقوق دلانے میں اسلام نے بڑی ہمدردی اور سمجھداری سے کام لیا ہے۔ مرد اور عورت کے حقوق کا اس طرح تعین ہوا کہ یہ دونوں راحت و آرام کی زندگی بسر کریں۔ سب سے پہلے یہ واضح کیا گیا کہ عورت و مرد میں کس قسم کا فطری تعلق ہے اور یہ کہ عورت انسانی معاشرت کی جزوِ اعظم ہے۔ مختلف پیرایوں میں یہ ظاہر کیا گیا کہ مرد اور عورت ایسے رفیق ہیں کہ جن کو ایک دوسرے کی شدید ضرورت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا نصف بہتر ہیں اور ان دونوں کے تعلقات قریب قریب برابری کے ہیں۔

بہت سی دوسری اصلاحات کے ساتھ ساتھ اسلام نے عورت کی بخوبی اصلاح کی اور اس کو قعرِ مذلت سے باہر نکالا۔ سب سے پہلے کثرتِ ازدواج کا قلع قمع کیا گیا۔ جہاں بیحد و حساب بیویاں ہوا کرتی تھیں ان کو چار تک محدود کیا گیا، یہ اجازت بھی اس شرط سے ملی کہ چاروں کے ساتھ یکساں سلوک ہو۔ عورت کی غلامی کے انسداد کے بعد شیر خوار لڑکیوں کے ہلاک کرنے کے خلاف نہایت سخت اور شدید احکام نافذ ہوئے۔ قانونِ وراثت بنایا گیا۔ باپ کے بعد سوتیلی ماؤں اور بہ وقت واحد حقیقی بہنوں سے عقد کرنے کی سختی سے ممانعت کی گئی، مرد کو تاکید کی گئی کہ عورت کیساتھ عزت سے پیش آئے، اسکے احساسات و جذبات کا کافی احترام کرے۔ جو شریر النفس اشخاص عورتوں پر اتہام لگائیں ان کیلئے جسمانی سزا مقرر کی گئی۔ ان اصلاحات نے عورت کو آئے دن کی ذلت و خواری سے نجات دلائی۔

مرزا سیف علی خاں (حیدرآبادی)

روٹیری مشین پر

کیتو با کی آنکھوں کے سامنے تقریباً دو گز چوڑی کاغذ کی پٹی نہایت سرعت سے دوڑ رہی تھی۔ دیکھنے والے کے لئے یکایک اس کی رفتار کا اندازہ کرنا بہت مشکل تھا۔ ایک موٹے اور وزنی ــــ اتنا وزنی کہ اس کو گھمانے کے لئے دو مزدوروں کی ضرورت پڑی۔ بیلن پر کئی ہزار گز لمبے کاغذ کی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ مشین کے چلنے پر وہ پٹی خود بخود کھل کر چھاپنے کی مشین میں چلی جاتی تھی۔ یہ مشین فرش پر بہت مضبوطی سے جمی ہوئی تھی۔ اس میں دو بیلن لگے ہوئے تھے۔ ایک میں حروف ڈھلے ہوئے تھے اور دوسرے میں کچھ نہیں۔ وہ بالکل صاف تھا۔ ان دونوں بیلنوں کی داب سے کاغذ پر حروف اتر آتے تھے۔ لیکن بیلنوں کی داب میں آنے سے پہلے کاغذ کی پٹی کو نمی کھانے کے لئے بھاپ کی ایک ٹنکی میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد بیلنوں کے ایک ہی گھماؤ سے اخبار کے آٹھ صفحے کاغذ کے ایک طرف چھپ جاتے تھے۔ دوسری طرف کے صفحوں کے چھپنے کے لئے کاغذ کو اگلے دو بیلنوں کی داب برداشت کرنی پڑتی تھی۔ پہلی داب میں حروف نیچے والے بیلن میں ہوتے تھے اور دوسری داب میں اوپر والے بیلن میں۔ اس طرح سے اخبار کے دو شیٹ چھپ جاتے تھے۔ کاغذ کا پٹہ کھلتا چلا جاتا۔ ایک کے بعد دوسرے بیلن کی داب کھاتا جاتا اور اس طرح سے اخبار کے شیٹ چھپتے چلے جاتے۔ راستہ میں کاغذ کو چھوٹے چھوٹے پھلوں سے پالا پڑتا جو اخبار کے ورقوں کو کاٹ دیتے تھے۔ آگے چل کر لئی بھی آپ ہی لگ جاتی اور تہ بھی آپ ہی ہو جاتی تھی۔ ان ہی مرحلوں سے گذرتی ہوئی کاغذ کی ایک پٹی اور آتی تھی جو ضمیمہ کی شکل میں اخبار کے ساتھ مل جاتی تھی۔ حیرت انگیز طریقے اخبار کٹ کر، چپک کر، تہ ہو کر، غرض یہ کہ ہر طرح سے مکمل ہو کر ایک سکنڈ میں پانچ پرچوں کے حساب سے مشین سے نکلتا جاتا تھا۔ اخبار کو اٹھانیوالے لڑکے اخبار کو یہاں سے اٹھا کر برابر والے کمرے میں لے جاتے تھے۔

یہ سب کچھ ایک غیر منقطع گھڑگھڑ کے درمیان ہوتا تھا۔ یہ گھڑگھڑ ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کسی بہت بڑے اور بگڑے ہوئے باجے کے سارے سُر ایک ساتھ اپنی بھونڈی آواز کے ساتھ بج رہے ہوں۔ یا اس اخبار کے سارے پڑھنے والے مطبع کی عمارت میں جمع ہو کر ایک ساتھ بغیر سانس لئے جلدی جلدی اخبار کے کالم پر کالم پڑھے جا رہے ہوں۔ کان پڑے کچھ سُنائی نہیں دیتا تھا۔ پریس کی گھڑگھڑ میں سارے الفاظ گم ہو جاتے تھے۔ باتیں اشاروں سے یا مُنہ کو کان سے ملا کر زور سے گلا پھاڑ کر کرنی پڑتی تھیں۔ ضروری گپ شپ لڑانے کیلئے وہاں وقت ہی کس کے پاس تھا!

اتوار کے اخبار کے آج دو ایڈیشن نکلیں گے۔ ایک ایک سکنڈ بہت قیمتی ہو رہا ہے۔ ایک سکنڈ کے خراب ہونیکے معنی ہیں پانچ پرچوں کا خراب ہو جانا۔ اوورسیر کے انڈیکیٹر سے سیل ہٹاتے ہی پریس کے تمام کارندے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک آدمی کو ایک مقررہ وقت کیلئے ایک مقررہ کام کرنا مشین کا ایک پُرزہ سا ہی بن جانا پڑتا ہے۔ رات کے گیارہ بجے سے صبح کے ۴ بجے تک مشین چلتی ہے۔ بے انتہا پریشانی اور پہاڑ ایسی گرمیوں کے دن پانچ گھنٹوں میں نڈر اور بھوت کے مانند لوہے کے غلاموں پریس کے کارندوں میں سے کسی کو بھی اپنی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔ زیادہ نمی کھا جانے کی وجہ سے کاغذ پھٹ نہ جائے، یا نہ معلوم کب کیا ہو جائے، اس ڈر سے ان کی آنکھیں تیزی سے دوڑتے ہوئے چکنے کاغذ پر اور ہاتھ بوقت ضرورت مشین کو بند کرنے کیلئے

لیور پر لگے رہتے ہیں۔

مشین ٹھیک وقت پر بند ہو جائے اور کاغذ کا نیا پٹہ بغیر کسی گڑبڑاہٹ کے مشین پر چڑھ جائے۔ ان دو باتوں پر پریس کے قیمتی اوقات کی بچت بہت کچھ منحصر ہے۔

جب تک کاغذ کا ایک پٹہ جو کئی ہزار گز لمبا ہوتا ہے ختم نہ ہو جائے تب تک مشین بند کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ کاغذ ختم ہونے کے بعد دوسرا پٹہ چڑھایا جاتا ہے۔

کاغذ کی پٹی کے گول پنڈے ترتیب وار رکھے ہوئے صحن والے دروازے میں سے دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ سب آج ہی کام آئیں گے۔

کاغذ چڑھانے کے لئے یا کسی دوسری وجہ سے مشین کو کوئی کارندہ بھی روک سکتا ہے۔ لیکن چلانیکا کام اعلیٰ انجنیر کے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کاغذ چڑھانے یا پھٹے ہوئے کاغذ کو ٹھیک کرنے کے لئے مشین میں گھسنے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشین جس آسانی سے اخبار چھاپتی ہے اسی آسانی سے آدمیوں کی ہڈی کا سُرمہ بھی بنا سکتی ہے۔

ایک ایک تو بیلن پر اور ایک اس جگہ پر جہاں سے اخبار چھپ کر نکلتا ہے مشین کو روکنے کے لئے لیور لگے ہیں۔ کیوبا کی تعیناتی انہی میں سے ایک لیور پر ہے۔ کاغذ کے پھٹ جانے یا خراب ہو جانیکی ساری ذمہ داری اسی پر ہے۔ ضرورت کیوقت مشین کو روک دینے کا حق اسی کا ہے۔

اس وقت کیوبا برف جیسے سفید کاغذ پر آنکھیں گڑائے بیٹھا ہے۔ کاغذ کہیں زیادہ ڈھیلا یا کھنچا تو نہیں کھا رہا ہے؟ اس طرف اس کا خاص خیال ہے۔ کبھی اس کا ہاتھ بریک کے ہینڈل کے دستہ پر پہنچتا ہے۔ تو کبھی لیور پر۔ اس کے ذمہ والے بیلنوں کے دھروں میں 'گریز' (تیل) ٹھیک طریقہ پر پہونچ رہا ہے یا نہیں، یہ معلوم کرنے کے لئے وہ تیل لانیوالی کانچ کی نلیوں کی طرف بھی دیکھتا جاتا ہے۔ تیل کے اچھی طرح نہ پہنچنے سے اور گرمی بڑھ جانے سے آگ لگ جانے یا کسی دوسرے حادثہ کے ہو جانیکا اندیشہ رہتا ہے۔ اور اگر کہیں اس دن اخبار نہ نکل سکا تو نہ معلوم دنیا کے کتنے واقعات یا یوں کہئے کہ ایک طرح دنیا ہی کا خاتمہ ہو جائے۔

مطبع سے بادلوں کی گڑگڑاہٹ کی سی آواز آرہی ہے۔ بے شمار بیلنوں میں سے چوچو کر تیل ٹپک رہا ہے۔ رگڑ کے پیدا کردہ کاغذ کے باریک باریک ذرے بجلی کی روشنی میں تیر رہے ہیں۔ اور کیوبا کی آنکھیں کاغذ، دھرے اور کانچ کی نلیوں پر ہی چکر لگا رہی ہیں۔

وہ اسی میں مگن ہے، اس کا لمبا چوڑا بدن نیلی قمیص سے جسے اس نے پاجامے کے اندر کر لیا ہے، ڈھکا ہوا ہے۔ مشین کی جھپٹ میں اس کے کپڑے نہ آجائیں، اسی وجہ سے اس نے ایسا کیا ہے۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح سیدھا کھڑا ہے۔ صرف اس کے پتلے لیکن مضبوط ہاتھ اپنا کام کر رہے ہیں۔ اس کا داہنا ہاتھ لیور پر ہے۔ ہاتھ سیاہی اور تیل میں بھرا ہوا ہے۔ پسینہ اس کی پیشانی سے ندی کی طرح بہہ رہا ہے۔ سُرخی مائل ڈاڑھی سے گھرے ہوئے چہرہ سے پسینہ کی بوندیں ٹپک ٹپک کر زمین پر گول گول نشان بنا رہی ہیں۔ ظاہرا طور پر وہ اپنے کام میں مشغول معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دماغ میں خیالات بہت تیزی سے ۔ لیکن سامنے والی پٹی

سے زیادہ تیزی سے نہیں ۔ چکر لگا رہے ہیں ۔ تقریباً دو گھنٹے سے ، جب سے وہ یہاں کھڑا ہے ، وہ اپنے خیالات ایک ایک کر کے جمع کرنیکی کوشش کر رہا ہے ۔ ان تمام خیالات کا جو نتیجہ اس نے نکالا ہے وہ اتنا خوفناک ہے کہ وہ کانپ اُٹھے لیکن وہ بڑی ہوشیاری سے اپنے خوفناک خیالات کو چھپائے ہوئے ہے ۔

آج رات کو وہ کسی کا خاتمہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے ۔

یہی اس کے تمام خیالات کا خلاصہ ہے ۔ سر اٹھانے پر وہ اپنے شکار کو سامنے ہی دیکھ سکتا ہے ۔ ریشمی چست ٹوپی سے ڈھکا ہوا سر بیلن اور مشین کے ڈھانچے کے درمیان سے دکھائی دے رہا ہے ۔ کبھی وہ انڈیکیٹر پر جھکتا ہے تو کبھی مطبوعہ تعداد کو درج کرنے کے لئے ٹیبلٹ (نقشہ) پر ۔ وہ اوورسیر ہے ۔ آج رات کو کیوتا با اس کا خاتمہ کر دیگا ۔ یہ بالکل طے شدہ ہے ۔ روزمرہ کی ضروری اور اہم کاموں کی طرح وہ اِسے بھی کریگا ۔ ایسا اٹل فیصلہ اس نے کر لیا ہے ۔

یہی تو وہ جگہ ہے جہاں وہ اپنے خون میں تر ہوگا ۔ یہیں وہ مشین میں کچلا جائیگا ۔ بیلنوں کے نیچے ایک آدمی کیلئے کافی جگہ ہے کاغذ چڑھانے کے لئے انھیں بیلنوں کے نیچے تو جانا پڑتا ہے ۔

روئی کے پیچ میں کام کرتے ہوئے کیوتا با نے دیکھا تھا کہ ان بیلنوں کی کیا طاقت ہوتی ہے ۔ اسے بہت پہلے روئی کی گانٹھیں بھی اسی طرح باندھی جاتی تھیں ، اس وقت کون جانتا تھا کہ چھاپنے میں بھی اسی قسم کی مشین کام آئیگی ۔ اس روئی کے کارخانہ کے اوورسیر پر ایک کارندے نے بیلن چلا دیا تھا ۔ وہ اوورسیر بہت کمینہ تھا ۔ اُسے بہت تنگ کرتا تھا ۔ اوورسیر بھی روئی کی طرح دب کر چپٹا ہوگیا تھا ۔

کیوتا با تو جب چاہے ایسا کر سکتا ہے ۔ ذرا سے اشارہ کا ہی تو کام ہے ۔ صبح کے چار بجے تک جب کبھی کاغذ کا نیا پنڈا چڑھایا جائے وہ ظالم کا خاتمہ کر سکتا ہے ۔

صرف ایک گھنٹہ کے اندر ہی اندر ایسا ہونیوالا ہے ۔ کاغذ کے تین پنڈے ختم ہونے پر چوتھے پر اس کی موت سوار ہو کر آرہی ہے ۔ تینوں پنڈے سامنے ہی تو رکھے ہیں ۔ باری باری سے تینوں ختم ...... ہاں ، ضرور ہی ختم ہو جائیں گے ۔ اور پھر چوتھے کی باری اس کی موت لیکر آئیگی ۔

کاغذ کو نم کرنے کے لئے بھاپ کے بھپکارے مطبع کی گرمی کو اور بھی بڑھا رہے ہیں ۔ وہ پسینہ میں تر ہو رہا ہے ۔ سامنے کی کھڑکی سے اکتوبر مہینے کی ٹھنڈی ہوا آرہی ہے ۔ سر اوپر اٹھاتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کی کنپٹی میں گھس جاتے ہیں ۔ اس کے جبڑے میں ٹیس ۔۔۔ درد ہو رہا ہے ۔ درد کے مارے اس کا سر چکرانے لگا ۔ وہ یکایک جھنجھلا سا اُٹھا ۔ اس کا تمام بدن غصے سے کانپ اٹھا ۔ اس کمبخت درد ہی کی بدولت تو سب کچھ ہوا ہے ۔ ہر رات کو میں ڈیوٹی پر آکر کھڑا ہوا نہیں کہ ٹھنڈی ہوا لگتے ہی کسی آفت کی طرح کنپٹی اور جبڑے میں درد ہونے لگا ۔

آج سے پندرہ دن پہلے کسی نے کیوتا با کو بتایا تھا کہ برانڈی پیا کرو ۔ اس کے پینے سے فوراً درد دور ہو جائیگا ۔ اب تک کیوتا با نے اپنی زندگی میں شراب نہیں پی تھی ۔ لیکن اس بار اُس نے پی ۔ اس کا درد واقعی دور ہوگیا ۔ مگر ' رونڈ ' لگاتے وقت اوورسیر اُس کے پاس آ کھڑا ہوا اور کیوتا با کے سانس روک لینے کے باوجود اس نے بھانپ لیا اور کہا "کیا تم نے برانڈی پی ہے ۔ اب ہم تمہیں

نہیں رکھ سکتے۔ پندرہ دن کے بعد پیشی پر حاضر ہونا۔"

اوورسیر نے سب کچھ مختصراً اور جلدی سے کہہ دیا۔ کیوبا کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس پر جلدی جلدی ہنٹر برسا رہا ہو کیوبا جانتا تھا کہ رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس نے پندرہ دن تک کسی سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اندر ہی اندر اس کا غصہ بڑھتا جاتا تھا وہ کام کی تلاش میں چاروں طرف دوڑتا رہا۔

"تم ہو بھی بہت مضبوط جو تمھیں کام پر لگائے وہ بیماری کا گھر مول لے۔ کیوں ؟ ہے نا ٹھیک ......" کیوبا جہاں کہیں جاتا اس کو ایسے ہی جواب ملتے۔

کل ہی ایک کمپنی کے مینیجر نے کیوبا کو 'صفائی کرنے والے کی اسامی' کیلئے درخواست بھیجنے کا مشورہ دیا تھا۔ ۴۷ برس کی عمر میں ایسا کام! اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے منہ پر طمانچہ مار رہا ہو۔ کیرولن کی گھاٹیوں میں دن بھر مارے مارے پھرنے کے بعد 'لیبون' گاؤں کے پاس آ سے اس کمپن کا پتہ لگا تھا۔ گھر پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ اس کے گھر میں دو زندگیوں کا اور اضافہ ہوا ہے۔ اس کی بیوی حاملہ تھی۔ اسی کے دو جڑواں بچے پیدا ہوئے ہیں۔ چھ سے آٹھ کیوبا کیلئے معمولی بات نہ تھی۔

کیوبا بہت پریشان ہو رہا تھا۔ آج اس کی پریشانی کسی قدر کم ہوئی۔ ممکن ہے خدا نے اس کی مدد کیلئے ہی ان دو فرشتوں کو بھیجا ہو۔ شاید اوورسیر کو ان پر کچھ رحم آ جائے۔ ضرور رحم آ جائیگا۔ خواہ اس کا دل پتھر ہی کا کیوں نہ ہو۔ پھر بھی وہ ضرور پگھل جائیگا۔ ان دو بچوں کی خاطر اسے درخواست کرنی پڑے گی۔ نہیں تو وہ کچھ نہیں کہتا۔ ان! ان بچوں ...... کے لئے .... اسے .... اچھا ہوتا اگر اس کی زبان کٹ کر گر جاتی۔

دیکھنے میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کیوبا کی دردبھری کہانی اوورسیر کے دل پر کچھ اثر کر رہی ہے۔ لیکن آخر میں اوورسیر نے شانے ہلا کر کہا: "تمھارے دو کیا تین بچے بھی ہو جائیں تو مجھ کو اس سے کیا؟ میں شرابی آدمی کو نہیں رکھ سکتا۔ اگر کچھ نقصان ہو گیا یا کسی کی جان خطرہ میں پڑ گئی تو؟۔ نہیں میں شرابی کو نہیں رکھ سکتا۔"

آج کیوبا کی ملازمت کا آخری دن ہے۔ پندرہ دن سے اس کے دماغ میں ہل چل مچی ہے۔ اس وقت وہ مشین صاف کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مشین کے پرزے ایسے صاف نظر آنے لگیں جیسے آتشیں شیشہ سے دیکھنے سے گھڑی کے پرزے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ بس آج آخری بار، اب تک وہ تنہا ہی اپنے فرض کو پورا کرتا آیا ہے، لیکن اب نہیں ...... آج آخری ...... وہ خیالات کے دریا میں ڈوب گیا۔

مشین چلنے لگی۔ پھر ویسے ہی گھڑگھڑاہٹ کی آواز آنے لگی۔ کاغذ کی پٹی پھر اسی طرح اس کے سامنے دوڑنے لگی۔ کاغذ کی پٹی پر بجلی کی ترچھی روشنی پڑ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اور بھی چمک رہی تھی۔ اس وقت اس کی اُداسی مشین کی گھڑگھڑاہٹ میں جیسے گم ہو گئی تھی۔ لیکن کاغذ کی پٹی پر تاکتے رہنے سے اس کا دماغ پھر چکرانے لگا۔ پیشانی پسینہ کے قطروں سے ڈھک گئی۔ سامنے کی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ آ کر اس کی کنپٹی سے ٹکرانے لگے۔ پہلے کی طرح درد نے پھر زور پکڑا۔ اس کے بدن کی ساری طاقت کھنچ سی گئی۔ اس کا دماغ غصہ سے چکرانے لگا۔ اگر یہ میری آخری ڈیوٹی ہے تو اس کی بھی آج آخری رات ہے۔ خبط جنون اس کے دماغ پر پوری طرح سوار ہو گیا۔

ابتدا میں تو اس نے اپنے ان خیالات کو بحث سے دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن — "اس کی یہی سزا ہے۔ وہ اسی کے قابل ہے" ایسے خیالات نے بار بار آکر اس کے سر پر بھوت کی طرح سوار ہو کر قبضہ کر لیا۔ یہ خیال کسی طرح بھی اس کے دماغ سے نہیں نکلتا تھا۔ جبڑے میں ہونیوالی ہر ٹیس کے ساتھ اس کا ارادہ اور بھی پختہ ہو جاتا تھا۔

مشین کی گھڑگھڑاہٹ پہلے ہی کی طرح جاری ہے۔ طرح طرح کی آوازیں آ رہی ہیں۔ مشین کے اس شور و غل میں سے کیوبا کو دو ننھے ننھے بچوں کے رونے کی دل شگاف آواز سنائی پڑنے لگی۔ رونے کی آواز برابر آ رہی ہے۔ مشین بند ہونے پر نہیں آتی۔ اس کا دل بیتاب ہو گیا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ سامنے ہی کاغذ کی سفید پٹی دوڑ رہی ہے۔ وہ اسی پر نگاہ جما کر دیکھنے لگا۔ اسے سفید تکیہ کا سہارا لئے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے سر نظر آئے۔ ان کے کھلے ہوتے چھوٹے چھوٹے منہ اور پھڑکتے ہوئے نتھنے دیکھکر وہ گھبرا گیا۔ وہ سامنے دیکھنے لگا۔ سامنے کواڑوں کے پیچھے اس کو دو آنکھیں نظر آنے لگیں۔ پندرہ دن سے وہ ان آنکھوں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔ یہ آنکھیں اس کی بیوی کی تھیں۔ گھر سے چلنے سے پہلے اس نے اسے بلایا تھا۔ "تمھاری ملازمت ختم ہو گئی ..... تم اب کیا کرو گے؟" اس نے اس سے پوچھا تھا "خدا کے لئے، اے خدا ....." اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ چیخ مار کر رونے لگی۔

لیکن تعجب یہ تھا کہ موقع آتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے۔ مشین کے بند ہوتے ہی اس کی ہمت بھی ختم ہو جاتی۔ کرنے دھرنے کا موقع آتے ہی اس کا ارادہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ اور وہ بحث کرنے لگتا۔ اتنے میں "ہاں! ٹھیک .... گھمائے چلو .... آہستہ" پکارنے کے بعد اوورسیر کاغذ لگانے لگتا۔ اوورسیر کے ان حکموں کا ذرا سے اشارہ سے ہی خاتمہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن کیوبا کو نہ معلوم کیا ہو گیا۔ وہ بت کی طرح کھڑا رہا۔ اس کے ہاتھ جیسے بدن سے چپک گئے ہوں۔ وہ اوورسیر کی طرف دیکھ بھی نہ سکا۔ اوورسیر ایک کھلاڑی کی طرح جو شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال ڈال کر اس کو کھلا رہا ہو مشین میں سر ڈال کر کام کر رہا تھا۔

لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ ابھی تک سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ مشین پر کاغذ چڑھنے کی "کھر رکھر ر" کی آواز ہونے لگی۔ "ٹھہرو" یہ کہہ کر اوورسیر مشین کے باہر نکل آیا۔ "کلک" کر کے لیور اٹھا۔ اور اعلیٰ انجینیر کے حکم "تیار رہو" کے بعد مشین چلنے لگی۔ پہلے تو ایک لمحے تک دھگوں دھگوں، ہوتی رہی۔ پھر پانی کے جھرنے کی سی آواز آنے لگی۔ مشین کے چلتے ہی کیوبا کے دل میں شیطنت نئے سر سے جلوہ گر ہونے لگی۔ وہ کیوبا کی بزدلی پر ہنسنے لگا۔ کیوبا کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کسی نے اس کے دماغ میں چنگاریاں بھر دی ہیں۔ اسے پھر اپنے گھر کا خیال آ گیا۔ بچوں کے رونے کی آواز پھر آنے لگی۔ اسے اپنے آپ کو روکنا مشکل ہو گیا۔ اوورسیر کا خاتمہ کرنے کیلئے وہ بے چین ہو گیا۔ لیکن موقع آتے ہی اسے نہ معلوم کیا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔

اسی طرح کاغذ کا چوتھا پنڈا — جس کے ساتھ اوورسیر کی موت آ رہی تھی — بیلن پر چڑھ گیا۔ لیکن اوورسیر کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ اس کے بعد سات پنڈے تک اور بھی ختم ہو گئے۔ اور اب صرف دو رہ گئے ہیں —

"ہوشیار —"

کاغذ کا آٹھواں پنڈا بھی بیلن پر چڑھ گیا۔ مشین میں پھر پہلے تو گھوں گھوں اور پھر پانی کے جھرنے کی سی آواز آنے لگی۔

"بس اب آخری موقع ہے۔ اگر اب چوک گئے تو چوک ہی گئے۔ پھر موقع نہیں ملے گا" کیتو با کا دماغ ایسے خیالات سے پھر گرم ہو گیا۔

اس کے جبڑے میں پھر وہی ناقابلِ برداشت درد ہونے لگا۔ اس نے دانت پیسنا شروع کیا تاکہ درد کم محسوس ہو۔ لیکن اس کے دانت کڑکڑانے لگے۔ اسے سانس لینے میں بھی بہت کش مکش سے کام لینا پڑتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے جیسے اسے بخار آگیا ہو۔ "بریک" کے پاس ہاتھ لیجاتے ہی اس کی انگلیاں بُری طرح کانپنے لگیں۔

ایسا تو اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایسی ہل چل تو اس کے دل میں پہلی بار ہوئی تھی۔ حالانکہ وقت بہت تیزی سے گذر رہا تھا لیکن اس کے لئے تیز ہونے کے باوجود بھی ایک ایک لمحہ بہت آہستہ آہستہ گذرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

آخر کار ۔۔۔!

کاغذ کا آخری پلڑہ چڑھایا جا رہا تھا۔ کیتو با کا تمام بدن تھرا رہا تھا۔ اگر وہ کسی چیز کا سہارا لیکر کھڑا نہ ہوتا تو شاید وہ کھڑا نہ رہ سکتا زمین پر گر پڑتا۔ اگر اس وقت اسے وہاں سے ہٹ جانیکا حکم دیا جاتا، تو شاید ہی وہ وہاں سے ہٹنے میں کامیاب ہوتا۔ سامنے ہی اس کا شکار تھا۔ اس کا خاتمہ کرنے کیلئے مشین کو چلانیکا کونسا موقع ٹھیک ہوگا۔ یہ سب جاننے کے لئے وہ اپنے شکار کی طرف دیکھ بھی نہیں سکا۔

"آہستہ سے ۔۔۔ ہاں، ٹھیک ۔۔۔۔"

اوورسیر کے یہ الفاظ اس کے کان میں پڑے۔ کیتو با چونک اٹھا اس کا دماغ پھر گرم ہونے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کی گردن مروڑ رہا ہے۔ اسے کچھ لمحہ پہلے وہ جس طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا اس طرف اس کی نظر پھر گئی، گھونگھر والے بالوں کا سر اور کاغذ کو بیلنوں کے درمیان سرکاتی ہوئی انگلیاں اسے نظر آئیں۔ بس یہی ٹھیک موقع ہے۔

اس کا ہاتھ آپ ہی آپ لیور کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے اس کے ہاتھ کو کسی نے اس کے جسم سے علیحدہ کر کے لیور پر پہنچا دیا ہو۔ اتنے ہی میں بجلی کی روشنی یکایک لال ہو گئی۔ بلب کے تار پیلے سے ہو چلے اور پھر بجھ گئے۔ یہ سب کچھ نصف سکنڈ ہی میں ہو گیا۔ سارے مطبع میں اندھیرا چھا گیا۔ کارندوں کی بھنبھناہٹ اور گالی گلوج صاف سنائی دینے لگی۔

کیتو با کے دماغ میں ایک خوفناک خیال دوڑ گیا۔ خدا نے اس کی مدد کیلئے ہی یہ تاریکی بھیجی ہے۔ تاریکی میں کسی کو کیا خبر ہوگی کہ کس نے کیا کیا۔ چٹ پٹ اب موقع ہے۔ وہ بھی مشین کے اندر ہی ہوگا۔

اس کا ہاتھ دستہ سے جا لگا۔ اس کا دماغ چکرانے لگا۔ آگ کی چنگاریوں کا ایک بڑا ہالہ اس کی آنکھوں کے سامنے چکرانے لگا۔ اسے اپنے ہاتھ میں ناقابلِ بیان درد محسوس ہوا۔

لیکن کیتو با خوش تھا۔ وہ انتقام لینے میں کامیاب ہو سکا۔ مشین زور شور کے ساتھ پانی کے جھرنے کی سی آواز کرتی ہوئی چلنی شروع ہو گئی تھی۔ اس شور و غل میں کیتو با کو اپنے شکار کے کراہنے کی آواز آنے لگی۔ اسے کچھ الفاظ بھی سُنائی دینے۔

لیکن یکایک 'سائیں سائیں' کے سوا سب 'گھڑ گھڑ' بند ہو گئی۔ کیتو با کو معلوم ہوا کہ وہ تو اسی کے کان گونج رہے تھے۔ مشین کا ذہن بالکل ہی چپ تھا۔ اوورسیر بول رہا تھا لیکن اس کی آواز میں تکلیف یا کراہنے کا شائبہ بھی نہ تھا۔

"ارے ...... ڈیم ...... یہ سب کیا ہے؟ کیا روشنی والا مر گیا۔ کمبخت! ریزرو لائٹ بھی نہیں رکھتا۔ ارے! کیا کسی کے پاس دیا سلائی کی ایک تیلی بھی نہیں ہے؟"

ایک جلتی ہوئی دیا سلائی گیس لیمپ کے پاس لائی گئی۔ 'بھک' سے لیمپ جل اٹھا۔ لیمپ کی روشنی میں کیتو بانے اوورسیر کا چہرہ دیکھا۔ اسی نے لیمپ کو جلایا تھا۔ اسی طرح تین لیمپ اور جلائے گئے اور مطبع روشن ہوگیا۔

انجن اب تک نہ چلتا تھا۔ حکم کے انتظار میں دو کارندے اپنے اپنے بیور پر کھڑے تھے۔ چاروں طرف خاموشی کی حکومت تھی۔ سب کی آنکھیں جو گیس لیمپ پر لگی ہوئی تھیں پھر اپنے اپنے کام کی طرف آگئیں۔ اخبار اٹھانے والے لڑکے اخباروں کی گڈی بنا رہے تھے۔ ہر طرف سے پہلے کی طرح مختلف آوازیں آرہی تھیں۔

اوورسیر نے جو روشنی کے بجھتے ہی باہر نکل آیا تھا۔ بیلنوں کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد وہ تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھیں کیتو باکی ڈری ہوئی آنکھوں سے لڑگئیں۔

اس کی آنکھوں نے جیسے بڑی بڑی اور گڑی ہوئی آنکھوں سے کیتو با کو پکڑ لیا۔ وہ اپنی نگاہ نہ پھرا سکا۔ اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جیسے سینہ کو چیر کر باہر نکل جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اوورسیر کی آنکھیں یکایک مسرور تبسم سے چمک اٹھیں۔ ان آنکھوں میں محبت اور مسرت کا ایسا انداز تھا کہ کیتو با بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اوورسیر نے اپنی گردن کو اس انداز سے جھٹکا دیا، جیسے وہ اب بھی کیتو با پر اعتماد کرتا ہے اور آئندہ کیلئے اسے ہوشیار کر رہا ہے۔

پھر اس نے دوسرے دو کارندوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا "ہوشیار"

بیلن کا بریک 'کلک' کر کے ہٹ گیا۔

انجنیر نے پکارا "ہوشیار!" مشین پھر چلنے لگی۔ پہلے وہی 'گھوں گھوں' اور پھر وہی پانی کے جھرنے کی آواز ہونے لگی۔ ابھی دس ہزار کاپیاں اور چھپنی تھیں۔ کاغذ کو دوڑتے ابھی دیر نہ ہوئی تھی کہ کیتو با کی نظر اپنے ہاتھ پر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں کی کھال غائب ہے۔ تاریکی اور دماغی بے چینی کے سبب اسے کچھ خیال نہ رہا۔ دستہ پر پہنچنے کی بجائے کسی دوسری چیز سے جا ٹکرایا تھا۔ جس کی رگڑ سے اس کے ہاتھ کی کھال اڑ گئی۔ اور اب خون نکل رہا تھا۔ اس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں تھے۔ خیالات کا خوفناک طوفان اٹھ رہا تھا۔ خون کی گرمی بڑھ جانے کی وجہ سے اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ ان ہی سب وجوہات سے اس کے دماغی توازن میں بہت تزلزل ہوگیا تھا۔ اور اس کے کانوں میں مشین چلنے کی سی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

اخبار چھپ گیا۔ آخری پانچسو کاپیاں دفتر میں پہونچ گئیں۔ پاس والے کمرے سے ڈاک میں بھیجے جانیوالے اخباروں پر مُہر لگنے کی آواز آرہی تھی۔ ایک دو آدمی بقیہ رات مطبع ہی میں کاٹنے کے لئے کاغذ کے ڈھیر پر سونے کا انتظام کر رہے تھے۔ پریس چُپ چاپ کھڑا تھا۔ چاروں طرف کاغذ کا برادہ، تیل اور سیاہی کے داغ پھیلے ہوئے تھے۔ مطبع کے کارندوں کی طرح گویا پریس بھی آرام لے رہا تھا۔ لیکن کیتو با پہلے کی طرح ہی بیٹھا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ وہ بیٹھا بیٹھا سامنے کی طرف تاک رہا تھا۔

اوورسیر کوٹ کی آستینوں میں ہاتھ ڈالتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"اچھا کیوبا! اگر تمھیں کہیں ملازمت نہیں ملی ہے تو ہم تمھیں رکھ لیں گے .... ارے یہ تمھارے ہاتھ میں ہو کیا گیا! میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ جب تک تم چوٹ نہیں کھاؤ گے اتنے ہوشیاری سے رہنا نہیں سیکھو گے۔ اور اگر تمھارے جبڑے میں درد ہوتا ہے تو تم اپنی جگہ بدل لینا" اور وہ مسکراتا ہوا دروازہ کی جانب جانے لگا۔

"سر!" شرم میں ڈوبے ہوئے کیوبا نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے کہا "سر! خدا آپ کا بھلا کرے" ...... اسکی آنکھوں میں آنسو امڈے آرہے تھے۔

"پاگل مت بنو! ہمیں سختی کرنی ہی پڑتی ہے۔ میں نے مینجر سے تمھاری سفارش کردی ہے۔ آہ! تمھارے دونوں بچے! خبر نہیں کس حال میں ہونگے؟" یہ کہہ کر دروازہ سے گذرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

کیوبا چھاپہ کے حروف کے ایک خالی پیپے پر بیٹھ گیا۔ تیل اور سیاہی سے ملوث ہاتھ اس کے منہ کو ڈھکے ہوئے تھے! اس وقت وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر آنسو نیچے گر رہے تھے۔

مترجمہ محمد شمیم جامعی

تجلّیات

سزاوارِ کرم کیا خاک ہم کو باغباں سمجھے؟ | کہ ہم ہر شاخِ گل کو اپنی شاخِ آشیاں سمجھے!
نہ رکھا امتیازِ نازِ فرطِ عجز نے باقی | کہ ہم نقشِ جبیں کو تیرا سنگِ آستاں سمجھے!
نشیمن کی ہوس نے خانماں برباد ہی رکھا | وہ بجلی تھی جسے ہم اپنی شاخِ آشیاں سمجھے!
ابھی واقف نہیں اہلِ چمن رنجِ اسیری سے | گلستاں میں کوئی کیا خاک پھر میری فغاں سمجھے!
نہ رکھا سادگی نے لذتِ بیداد سے محرم | کسی نامہرباں کو ہم ہمیشہ مہرباں سمجھے!
معاذ اللہ کیا کیا اعتمادِ موسمِ گل ہے؟ | اسیرانِ قفس کنجِ قفس کو آشیاں سمجھے!
نہ رکھا فرقِ مرگ و زیست قائم رنجِ ہستی نے | ہم اپنے ہر نفس کو اپنی مرگِ ناگہاں سمجھے!
کہیں تابش! شریکِ لذتِ پنہاں نہ ہو جائے | مرا رازِ غمِ الفت نہ میرا رازداں سمجھے!

تابش دہلوی

کوکن کے بونبل

ہندوستان کے مغربی ساحل پر مغربی گھاٹ اور سمندر کے درمیان "کوکن کا علاقہ ہے۔ جس کے باشندے "کوکنیوں" کے نام سے موسوم ہیں۔ یہاں کے مسلمان ان عربوں کی اولاد سے ہیں جو قرونِ وسطیٰ میں سمندر کے مالک تھے۔ اب بھی یہ اپنی ذہانت، خوبصورتی اور آزاد فطری کیلئے مشہور ہیں۔ ان کے مخصوص پیشے، جہازرانی، جنگلوں کے ٹھیکے اور نمک سازی ہیں۔ بونبل مچھلی کھانے کی وجہ سے کثیر العیال ہیں۔ انکی مادری زبان کوکنی ہے۔ لیکن بڑے حیرت انگیز طریقہ سے اُردو اس کی جگہ لے رہی ہے۔

ابوطاھر

ایک بالشت بھر کا لمبوترا گوشت کا لوتھڑا جس کے مُنہ اور دُم میں کوئی تمیز نہیں کی جاسکتی۔ رنگ سفیدی مائل جس کے اندر سے رگوں میں خون دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ چھونے میں بڑی ملائم اور لجلجی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس پر سفنے نہیں ہوتے۔ یہ ہے بونبل مچھلی کی شکل وصورت جس کو آپنے ابھی تک نہیں دیکھا ہے۔ اس کی تخلیق کے متعلق ایک داستان بھی ہے۔ جب تمام جانوروں کا خمیر تیار ہورہا تھا اس وقت برہماجی کے دربار میں بونبل کی وجہ سے تھوڑی بے لطفی پیدا ہوگئی تھی۔ دراصل یہ میاں بیوی کی لڑائی تھی۔ کیونکہ برہماجی اس کو زہری سانپ بنانا چاہتے تھے۔ اور ان کی بیوی اس کو مچھلی بنانے پر مُصر تھیں۔ ان دونوں کی ہمدردی میں درباریوں میں بھی اختلاف پیدا ہوگیا تھا اور ممکن تھا کہ یہ بات طول پکڑ جاتی۔ لیکن بونبل نے اس معاملہ کو اس طرح ختم کردیا کہ وہ موقع پاکر مغربی ساحل کے سمندر میں غوطہ مار کر غائب ہوگیا۔ اور جب سے اب تک اسی نامکمل حالت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کو مچھلی کہتے ہوئے ہچکچاتا ہوں لیکن عام طور سے یہ مچھلی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ عورتوں کی بات کا مان زیادہ ہوتا ہے۔ گو مچھلی کا روپ نہیں لیکن چونکہ سمندر میں رہتا ہے اس لئے یہ نام رکھنے میں حرج ہی کیا ہے حالانکہ ہم سمندر کے تمام جانوروں کو مچھلی کے نام سے موسوم نہیں کرسکتے۔

(۲) انگریزوں نے بھی اس کو مچھلی تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ بلکہ وہ اسے "بمبئی کا مُرغاب" (Bombay Duck) کہتے ہیں۔ گویا اُن کی نظر میں یہ ایک پرندہ ہے جس کے پر نہیں ہوتے۔ اس مغالطہ کی وجہ دراصل حضرت ڈاروِن صاحب ہیں جن کے مشہور نظریۂ ارتقا سے کہ تمام جاندار نیچے درجہ سے ترقی کرتے کرتے اونچے درجہ پر پہنچے ہیں۔ آپ بخوبی واقف ہیں۔ اسی اصول پر انسان پہلے بندر تھا، بندر شتر مرغ تھا، شتر مرغ مرغابی تھا اور مُرغابی مچھلی تھی۔ لیکن بونبل ایسی مچھلی ہے جو ارادہ تو مُرغابی بننے کا رکھتی تھی اور اس نے اس تیاری میں اپنے سفنوں کی کیچلی اتار کر مُرغابی کے پروں کے لئے جگہ بھی پیدا کرلی تھی لیکن اسی اثنا میں کوکنیوں کی زبان کو اس کے گوشت کا چسکہ لگ گیا۔

اور انھوں نے اس خیال سے کہ کہیں یہ مرغابیاں شمالی ہند کی طرف نہ اُڑ جائیں ان کو مچھلی ہی کی شکل میں رہنے پر مجبور کردیا۔ اس نظریہ سے اس کے گوشت کے ذائقہ کا مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے۔ اس کے متعلق بھی ایک حکایت سُن لیجئے۔

(۳) ایک خدمت گار ہندوستان کے کسی بادشاہ کے ہاتھ دُھلا رہا تھا کہ اسی اثنا میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جب بادشاہ نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بیان کیا کہ وہ بھی کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا رئیس تھا۔ اور جس طرح وہ بادشاہ کے ہاتھ دُھلا رہا تھا اسی طرح خدمت گار اس کے ہاتھ دُھلایا کرتے تھے۔ بادشاہ نے یہ سُن کر اس سے سوال کیا کہ بتاؤ سب سے لذیذ گوشت کس جانور کا ہوتا ہے؟

اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "مُرغ کا"۔ بادشاہ کو اس کے جواب سے اطمینان ہوگیا۔ اور اس نے اس کو انعام و اکرام دیکر آزاد کردیا۔ لیکن کوکنی مورخین کا بیان اس سے تھوڑا مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس خدمت گار نے مُرغ کے گوشت کی تعریف نہیں کی بلکہ "بونبل" کے گوشت کی تعریف کی تھی۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ حکایت صحیح ہے۔ اور جہاں تک ذائقہ کا سوال ہے اس میں بھی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ مرغ اور بونبل در اصل ذات واحد ہیں۔ لیکن ظاہراً طور سے ایک بانگ دیتا ہے۔ پَر پھٹ پھٹاتا ہے اور ٹھونگیں مارتا ہے۔ لیکن دوسرا اپنی نازک جلد کو بچانے کے لئے پانی میں تیرتا پھرتا ہے۔

(۴) بونبل کوکنیوں کی مشہور ترین غذا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سرچشمۂ حیات کی تمامتر لطافتیں یکجا ہو کر اُسکے رگ پٹھوں میں سرایت کر گئی ہیں۔ اس لئے وہ دستر خوان جس پر اس کی پلیٹ نہ ہو کوکنیوں کی نظروں میں بالکل ریگستان ہے۔ مقامی طور پر ایک سودیشی شعر بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ "اگر کوکنی را بونبل نہ بلد تو بوم بوم میشود"۔

تازے بونبلوں کی بہ نسبت سوکھے بونبل زیادہ لذیذ خیال کئے جاتے ہیں۔ سمندر کے کنارے ڈوریوں پر لٹکتے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے دھوبیوں نے کپڑوں کی چندیاں لٹکادی ہوں۔

(۵) ہندوستانیوں کیلئے سوکھا بونبل بڑی زحمت کا باعث ہے۔ اس کے بازار میں گذرتے ہوئے ناک کو دونوں ہاتھوں سے بند کرتے وقت وہی کیفیت ہوجاتی ہے جو سمندر میں ڈوبتے وقت ہوتی ہے۔ یقیناً اس میں کوئی ایسا جزو ضرور معلوم ہوتا ہے جو کلوروفارم سے ملتا جلتا ہے۔ اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو بنگال کیمیکل ورکس بہت آسانی سے ہندوستانی کلوروفارم تیار کرسکتے ہیں۔ جو سستا بھی پڑیگا اور زود اثر بھی لیکن دقت یہ ہوگی کہ اس کو سونگھنے کے بعد ایک ہندوستانی مریض بیہوش ہونیکے بعد پھر کبھی ہوش میں نہ آسکے گا۔

(۶) "جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے"! اسٹیشن پر بونبلوں کی بوریوں کی قطاریں۔ ریل کے ڈبوں میں اچھلوں کی ٹوکریوں کی ساتھ بونبل کے پلندے۔ مسافروں کے اسباب کے ساتھ بونبل کی گٹھڑیاں۔ دوکانوں پر بونبل کے اسٹاک، اور دوستوں اور ملاقاتیوں کے ہاتھ میں بونبل کے دونے۔ ایسی حالت میں ڈر معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی لوٹ پوٹ کر ایک بونبل نہ بن جاؤں۔ ان صورت حالات کے ماتحت کوکن کے سیاح کیلئے بہترین علاج یہ ہے کہ وہ قوت شامہ کو سُن کرنے کا ایک انجکشن لے لے۔

(۷) سوکھا بونبل کوکنیوں کو اس قدر کیوں پسند ہے؟ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اوّل تو یہ کہ یہ مچھلی اس تیزی سے انڈے دیتی ہے کہ ریاضی داں اس کا حساب بھی نہیں لگا سکتے۔ اگر ان کو اسی تیزی سے نہ کھایا جائے تو شاید مغربی ساحل پر کسی جاندار کے رہنے کے لئے جگہ ہی نہ رہے گی۔ دوسری وجہ سیاسیات سے تعلق رکھتی ہے۔ ہندوستان میں ہندو مسلم آبادی

کے تناسب نے بڑی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ خصوصیت سے مسلمانوں کی اقلیت کا سوال فوری توجہ کا محتاج ہے۔ لیکن اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ سوائے اس کے کہ تمام مسلمان، کوکنی مسلمانوں کی تقلید میں سوکھے بونبل کھانا شروع کر دیں۔ دس سال کے اندر تمام مُسلم آبادی "کن نیکون" نہ ہو جائے تو ہمارا ذمہ۔ ثبوت میں اس علاقہ کی مردم شماری کی رپورٹ ملاحظہ ہو۔ اسی سلسلہ میں ہمدرد دواخانہ دہلی کے منیجر صاحب بھی "معجون بونبل" کی تیاری پر غور فرمائیں۔

(۸) سوکھا بونبل اقتصادی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کوکنیوں کی روزی بحیرۂ عرب کی موجوں اور مغربی گھاٹ کے جنگلوں سے وابستہ ہے جہاں تازہ گوشت شکار کی زحمت کے سوا میسر ہی نہیں آسکتا۔ کئی گھنٹوں کی مسلسل محنت کے بعد جس وقت چاول کی روٹی میں بھنے ہوئے بونبل ملفوف ہو کر سامنے آتے ہیں تو تمام جسم "آنا پیدیٹ" (میں پیٹ ہوں) کا نعرہ لگا کر مصروف جہاد ہو جاتا ہے۔ اور وہ لطف آتا ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

(۹) میں نے بھی بونبل کھائے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ یہ میری "چڑ" ہو گئے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کا پروپاگنڈا مجھ پر اثر کر گیا تھا۔ میرے پاس بونبل کے پارسل آتے تھے۔ میرے نوکر کو رشوت دیکر بونبل میرے دستر خوان پر رکھوا دیا جاتا تھا۔ میرے دوست اس کی تعریف میں اس قدر قصیدے پڑھتے تھے کہ غالب اور اکبر الٰہ آبادی نے آم کیلئے بھی اتنی فصیح البیانی سے کام نہ لیا ہوگا۔ جب مجھ پر یہ تمام باتیں بھی کارگر نہ ہوئیں تو دعوتیں شروع ہو گئیں اور دستر خوان پر بونبل طرح طرح کے روپ میں پیش کیا جانے لگا۔ لیکن میں الف لیلہ کے اُس دیو کی طرح جو انسان کی بُو کو سات پردوں میں بھی محسوس کر لیتا تھا بونبل کو پہچان لیتا تھا۔ لیکن کہاں تک۔ آخر ایک روز بے تکلف دوستوں کی محفل میں مجھے بونبل کھلانے کی رسم بڑے شاندار طریقہ سے ادا کی گئی اور میں نے سہ

اے رحمت تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے جبر سے بونبل کو کھا گیا

کہہ کر پہلا لقمہ اُٹھایا۔ آخر میں تمام شرکائے طعام نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ اور اب مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ واقعی بونبل بڑی لذیذ شے ہے۔ میں عمر خیام کی طرح دعا کرتا ہوں کہ مجھے تین چیزیں بخشدے۔ سمندر کا کنارہ۔ بھنے ہوئے بونبل۔ اور چاول کی روٹی۔

سیّد ابو طاہر

تاراچند جی سے ہندی کی چندی

ٹھیٹ اُردو میں

بابو جی! میں نے جو آپ سے باتیں کیں وہ آپ کی سمجھ میں نہ آئیں۔ اچھا مہاتما جی سے جو بات چیت ہوئی کیا اُسے بھی آپ نہ سمجھ سکے۔ اس میں تو کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی تھی اور سب باتوں کو ایسے ڈھنگ سے ایک جگہ اکٹھا کر دیا تھا جسے ہندی کی چندی کرنا کہتے ہیں۔

مہاتما گاندھی سے باتیں کر کے اُٹھا ہی تھا جو آپ کی لکھت ملی۔ اس پر جبھی کچھ لکھ لکھا کے بھیج دینا چاہتا تھا پر یہ دھیان آیا پہلے جو لکھا جا چکا اس کا کیا ہوا جو اب پھر کہی ہوئی باتوں کو دُہرایا جائے۔ اور کہی ہوئی باتوں کا دُہرانا ایسا ہی ہے، جیسے چبائے ہوئے نوالوں کا پھر سے چبانا۔

پھر، گاندھی جی سے بات چیت والی لکھت کی ایک کاپی آپ کے "ہندُستانی" کے لئے بھیجی ہی جائیگی۔ جسے جی لگا کے دیکھنے پر نہ سمجھی ہوئی باتیں آپ چاہیں گے تو سمجھ سکیں گے اور جو اس پر بھی کوئی گتھی نہ سلجھ سکی تو اسے پوچھا گچھی سے سلجھا دیا جائیگا۔ پر اس سب کچھ ہونے پر بھی آپ تو ایسے ہو گئے جیسے کوئی انجان بن جاتا ہے۔

اپنے "رتماہی ہندُستانی" میں اِسے آپ نے چھاپا تو۔ پر اس کا چھاپنا نہ چھاپنا ایک سا ہو کے رہ گیا۔ اچھا، بُرا، بڑا، چھوٹا کوئی فٹ نوٹ لکھنا کیسا آپ اس پر دو ڈھائی بول بھی نہ لکھ سکے۔ اسے پڑھ کے آپ نے کیا کہا، اس کی کتنی باتیں اچھی لگیں، اپنے جی میں آپ نے کیا سمجھوتا کیا۔ یہ سب باتیں جاننا چاہتا تھا۔ پر آپ کے چُپ سادھنے سے کچھ بھی نہ جان سکا۔

جب تک اپریل کا "ہندُستانی" نہیں چھپا تھا یہ سمجھے ہوئے تھا۔ مہاتما سے بات چیت والی لکھت کے چھپنے کی جب گھڑی آئیگی تو آپ اس پر کچھ نہ کچھ لکھیں گے۔ پر جب وہ چھپ چھپا کے سامنے آئی تو یہ دیکھ کر اچنبا ہوا کہ آپ نے تو اُسے ہاتھ بھی نہیں لگایا اور چھوا تک نہیں۔ ساتھ ہی یہ دھیان بھی آیا کہیں ایسا تو نہیں آپ کسی ایسے جھیلے میں پھنس گئے ہوں جس سے دو بول بھی نہ لکھے جا سکے اور اس سے چھٹکارا ملنے پر لکھنا لکھانا اُٹھا رکھا ہو۔ پر اپریل کے "ہندُستانی" کو چھپ کے پانچ چھ مہینے ہو چکے۔ اس پر کچھ لکھنا ہوتا تو لکھ لکھا کے آپ کب کا بھیج چکے ہوتے۔ جب دیکھا آپ کی چُپ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے تو نہ رہا گیا اور یہ چٹھی لکھنا پڑی۔ میں یہ نہیں کہتا جو میں کہہ رہا ہوں بے سوچے سمجھے آپ اُسے مان ہی لیں نہیں پہلے اِسے سمجھ کی کسوٹی پر کسئے۔ ٹھیک اُترے تو مانئے۔ ٹھیک نہ دکھائی دے تو مجھے جھٹلایئے کیسے؟ کیوں؟ اور کس لئے کو ساتھ لے کر۔

ربڑ کو جتنا کھینچئے کھنچے گا اور چھوڑ دیئے تو سکڑ سکڑا کے رہ جائیگا۔ ایسا ہی کھنچنا، سکڑنا، سمٹنا بڑی سے بڑی اور چھوٹی سی چھوٹی بات میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کسی بات کو جتنا بڑھایئے بڑھے گی اور جتنا گھٹایئے گھٹ گھٹا کے رہ جائیگی۔ اکڑ، ٹکر اور چیں پٹاخ کرنے سے بات بڑھتی ہے اور بھلمنساہت برتنے سے بڑھتی ہوئی بات دب دبا جاتی ہے۔

اِسے دیکھ کے آپ کہہ سکتے ہیں:۔ میرا کہنا بھی تو یہی ہے پر میرے اور آپ کے کہنے میں بہت بل ہے۔ میں جو کہتا ہوں "کیوں" اور "کس لئے" کا پورا دھیان رکھکر اور آپ اُسے چھوڑ کر۔

کہیں کہیں سے اپنی لکھت کے کچھ ٹکڑے بھی دیکھ لیجئے۔ ایک جگہ آپ یہ لکھتے ہیں:۔

> "کیا ہندی بھاشا مری ہوئی ہے اور کیا اس کے شبدوں کے سمونے سے اُردو ادھ موئی ہو جائے گی؟"

دیکھئے ہندی اتنی ہی جیتی جاگتی کہی جا سکتی ہے جتنی یہ اُردو میں گھل مل کے اس کی ہو گئی۔ ہندی کے جتنے بول اُردو میں پورے سما چکے اور اپنی اپنی جگہ نکال کے جم چکے وہ سب جیتے جاگتے ہیں۔ انھیں کوئی مرا ہوا نہیں کہہ سکتا۔ ان کو چھوڑ کر ہندی کے اور جتنے

بول ہیں اپنی جگہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں اُردو میں تو انھیں کڈھب اور بھولا بسرا ہی کہا جائیگا۔ گھُلے ملے بول چٹکتی ہوئی کلیاں اور مہکتے ہوئے پھول ہیں۔ ان کا سا رنگ نئے بولوں میں کہاں آسکتا ہے۔ پُرانے چاول جتنا گھی اٹھاتے ہیں نئے چاول اس کا آدھا بھی نہیں اٹھا سکتے۔ تو جو ہندی کے بول اردو میں پورے سما چکے وہ سب اب اُردو ہی کے ہو چکے اور کسی جتن سے بھی وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اب رہا ہندی کے نئے نئے بولوں کا اُردو میں ٹھونسنا تو یہ وہی جھگڑا ہے جس پر میرے آپ کے لکھا پڑھی ہوئی اور ہو رہی ہے۔

بس نئے ٹھونسے ہوئے بولوں کو مرا ہوا کہہ رہا ہوں۔ اور آپ جیتا جاگتا۔ کیوں اور کس لئے یہ میں ان کا مرا ہوا ہونا دکھا رہا ہوں۔ اور آپ کیوں اور کس لئے کو چھوڑ کر انھیں جیتا جاگتا کہنے پر اڑے ہوئے ہیں۔

عربی، فارسی، ہندی ان سب کے وہ ملواں بول جن سے اُردو کا نکھار اور اُبھار ہے۔ ان بولوں سے ہٹ کر اُردو کے ملے جُلے بولوں کو اُن کی جگہ سے ہٹا کر کسی بھاشا کے نئے بول اس میں بڑھانا اُردو کو اَدھ موا بنانا نہیں تو پھر اور کیا ہے۔

اپنی لکھت کا یہ ٹکڑا ابھی دیکھئے:۔

"انیکتا، کولاہل، ارکشا، سمبندھ اور دشا ایسے جن لفظوں کا میں نے استعمال کیا ہے انھیں کون مرا ہوا کہہ سکتا ہے۔ ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیں ہر پڑھا لکھا اور اَن پڑھ چاہے ہندو ہو یا مسلمان انھیں سمجھ لے گا۔"

کیا اچھا ہوتا جو اسی کے ساتھ ساتھ ان پڑھے لکھے مسلمانوں اور ہندوؤں کی لکھتوں کے دو ایک ٹکڑے ہی اپنی بات منوانے کے لئے آپ لکھ دیتے جو ان بولوں کو لکھتے اور بولتے ہیں۔

"ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیں" لکھنے کا یہ ڈھب بتا رہا ہے کہ اپنے جی میں آپ نے مجھے یہیں کا سمجھ لیا اور آپ کے دھیان میں جب میں یہیں کا ٹھہرا تو پھر وہاں کی باتیں کیسے جان سکتا ہوں۔

سُنئے:۔ دلّی کب کی لُٹ لُٹا چکی۔ ایسے ہی لکھنؤ بھی کب کا اُجڑ چکا۔ اب دکھن ہی ایک ایسی جگہ رہ گئی ہے۔ جہاں ہند سے باہر اور پورے دیس کی چوٹی کے لوگ ایک جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں بڑی سی بڑی راجدھانی میں جو جو باتیں ہونا چاہئیں وہ سب آپ یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کا آپس میں مل جُل کے رہنا، ان کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، بول چال، بات چیت، پہناوا ایسا ایک سا ہے جو کوئی انھیں دیکھے تو نہ پہچان سکے اور سب کو ایک ہی سمجھے۔ پھر، جہاں بھی جائیے میل کا کھٹکا تک نہیں۔ سات آٹھ برس کا لڑکا سڑکوں پر سونا اُچھالتا چلا جاتا ہے اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی اُدھر نہیں دیکھتا۔ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا سب کو راج ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ یہاں کی چہل پہل، گھما گھمی، راجا کی دیا سے دن دونی رات چوگنی ہے۔ جدھر منہ کیجئے راج کی دیا کی بہتی ہوئی گنگا دیکھ لیجئے۔ اور جدھر آنکھ اٹھا کے دیکھئے دھن برستا ہوا دکھائی دیگا۔ ایشور اُسے سنسار کی ٹھوکر اور اس کی اونچ نیچ سے بچائے اور دکھن کے راج میں اور چار چاند لگائے۔

سترہ، اٹھارہ برس سے میں بھی اسی سکھ چین کی گھنی چھاؤں میں بیٹھا ہنس بول رہا ہوں۔ چوتھے پانچویں برس اُدھر کا بھی پھیرا ہو جاتا ہے۔ بڑے بوڑھوں کا چھوڑا ہوا کچھ کھیتی باڑی کا دھندا ابھی ہے جس کی دیکھ بھال کیلئے کبھی کبھی گاؤں میں بھی آنا جانا ہوتا ہے اور وہاں کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ایسی نہیں جو ان آنکھوں سے چھپی ہوئی ہو تو پھر آپ کا یہ "ہماری طرف" کہنا کیسا اور آپ کے اس کہنے کو میں کیسے مان لوں۔ میں نے آج تک مسلمان تو مسلمان وہاں کے کسی ہندو کو بھی ایسے بول بولتے نہیں سُنا۔

یہاں کے رجسٹرار آفس میں اپنی جان پہچان کے کچھ لوگ الہ آباد کے بھی ہیں۔ آپ کی لکھت انھیں بھی دکھائی سب نے بڑے اچنبے سے اسے دیکھا اور یہی کہا۔ برس کے برس اُدھر جانا آنا رہتا ہی ہے۔ ہم نے تو ایسے بول کسی ہندو سے بھی نہیں سُنے۔ اب کچھ دنوں سے یہ سُن رہے ہیں:۔ اُدھر ایک بڑا جتھا ایسا اُٹھا ہے جو اُردو میں بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس اور اُن کے پرچار کے جتن کر رہا ہے۔ یہ اور بات ہے جو ڈھائی دن میں بھاشا کی ایسی کایا پلٹ ہو گئی ہو۔

آپ نے سُن لیا الہ آباد والوں نے کیا کہا تو اب بھی اپنی لکھت کے اس ٹکڑے کو:۔

"ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے

جائیں ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ ہندو ہو یا مسلمان
انھیں سمجھ لے گا۔"

کیا آپ دُہرائیں گے۔ ایکتا، کولاہل، شکشا، سمبندھ، ہتوں، آشا، دشا، ابھیاس، نشچے اور ایسے بہت سے اور بھولے بسرے بول۔ یو۔پی، اودھ اور ان جگہوں کے آس پاس کے رہنے والے لوگ آپ کے دھیان میں سبھی سب بولتے اور سمجھتے ہیں اور دوسروں سے بھی آپ یہی منوانا چاہتے ہیں۔ پر جن کے سامنے وہاں کا پورا سماں ہو وہ اسے کیسے ٹھیک مان لیں۔ اور آپ کے دھیان کا ساتھ دینے کی کیسے ہامی بھریں۔

آج کل کے ہندی پرچار والوں کو چھوڑ کر نئے اور پرانے اردو لکھنے والے ہندوؤں ہی کی لکھتوں میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے تھوڑے بہت بول آپ کو دکھانا چاہئیں تھے پر آپ ایسا نہ کر سکے۔

یہ بھی ایک نئی بات دیکھی۔ آپ ایک جگہ جو لکھتے ہیں آگے بڑھکر وہ بات بھول میں پڑ جاتی ہے اور اس کا دھیان نہ رہنے سے آپ ایسی دوسری بات چھیڑ دیتے ہیں جس سے پہلی کہی ہوئی بات کچھ سے کچھ ہو کے رہ جاتی ہے۔ دیکھئے پہلے تو آپ نے یہ لکھا:-

"میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ فارسی، عربی کے وہ
بول جو اب ہماری بولی میں گھل مل گئے ہیں
نکال ڈالے جائیں۔ انھیں رکھئے اور ضرور رکھئے!"

اس لکھت کو پورا کرتے کرتے دھیان بھٹک کے نہ جانے کدھر سے کدھر چلا گیا جو آپ یہ لکھنے لگے:-

"اس آپس کی بول چال کی جو بولی ہے اس کا
آپ کیا نام رکھیں گے۔ میں تو اسے اُردو۔
ہندی یا ہندوستانی کسی بھی نام سے پکارنے کو
تیار ہوں۔ یہی وہ بولی ہے جس کا چوکھا رنگ
مولوی سید ابوالقاسم نے اپنی چٹھی میں دکھایا
ہے۔"

اپنی لکھت کے ان دونوں ٹکڑوں کو سامنے رکھکر دیکھئے اور بتائیے کہ ان میں کوئی گھٹ بڑھ اور اُل جلول نہیں۔ کہیں آپ عربی، فارسی کے ملے جلے بول اُردو میں سے نکالنا نہیں چاہتے۔ اور ان کے نکالنے کی ہامی نہیں بھرتے اور کہیں آپ لکھنے کے ایسے ڈھب کو جسمیں عربی، فارسی کے بول تو بول، اگر، مگر، کہ، چونکہ، بلکہ، چنانچہ، حالانکہ، یا، وگرنہ، لیکن کا بھی کہیں پتہ نہیں، "چوکھا رنگ" کہہ کے سراہتے ہیں۔ سوجھ بوجھ والوں کو تو ایسا نہ چاہئے۔ اُردو میں سے عربی، فارسی کے گھلے ملے بول نکالنا نہ چاہا کہنے کو تو یہ کہدیا۔ پر کیا وہی جو جی میں تھا تو پھر اُسے دکھاوا نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ اس کہاوت کو سچ کرنے کے لئے کہاں کہاں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے ڈھب بول کے بول اُردو میں ٹھونسے جا رہے ہیں۔ دھیان اور رات دن کی بول چال سے جو بول کالے کوسوں پر پڑے ہوئے ہوں جُن چُنا کے انھیں ایک جگہ اکٹھا کرنے کے جتن کئے جا رہے ہیں۔

اوروں کو آپ کیوں دیکھیں اپنے ہی کو دیکھ لیجئے۔ کیا پہلے سے آپ اسی ڈگر پر چل رہے تھے۔ کیا آپ کے لکھنے کا پہلے بھی ڈھنگ تھا۔ "ہندستانی" کا پورا فائل سامنے نہیں۔ نہیں تو آپ کی ایک ایک لکھت کا پورا پورا پتہ دیتا۔ اب اس کے جو دو تین نمبر سامنے ہیں انھیں کو دیکھ لیجئے۔ ان میں آپ کی تین لکھتیں ہیں جنہیں سے کسی میں بھی آشا، شکشا، ویاکرن، ابھیاس، کلیور، جیون، ہردے اور ایسے اور دوسرے بولوں کو آپ کی لکھت نے کہیں مُنہ بھی نہیں لگایا۔

"مسلمانوں کا ہندستان میں آنا" (ہندستانی جولائی ۳۲ء)
"تبصرے" (ہندستانی جولائی ۳۳ء)
"کرۂ زمین" (ہندستانی جولائی ۳۵ء)

یہ تینوں لکھتیں آپ ہی کی ہیں اور جن بولوں کو جیتا جاگتا آپ کہہ رہے ہیں اُن کا ان میں کہیں پتہ بھی نہیں۔ تو اب آپ ہی کہئے ان بولوں کو مرا ہوا نہیں تو جیتا جاگتا کون کہہ سکتا ہے۔ انھیں جیتا جاگتا کہنے میں آپ سے یونہی سی کچھ چُوک ہو گئی۔ آپ کو یہ کہنا چاہئے تھا۔ یہ بول ہیں تو مرے ہوئے پر اب یہ جلائے جا رہے ہیں۔

آپ کی جن لکھتوں کا ابھی اتا پتہ دیا اب کہیں کہیں سے اُن کے لکھنے کا ڈھنگ بھی دیکھ لیجئے اور ہو سکے تو اسی اپنی آجکل کی لکھت سے بھڑا کے جانچئے۔ جولائی ۱۹۳۲ء کے ہندستانی میں آپ کے لکھنے کا یہ ڈھنگ ہے:-

"ان بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندُستان کی
مغربی کنارے پر مسلمان اپنے مذہب کے قائم ہونیکے
کچھ ہی دن بعد آکر بسے اور ان کی تعداد، دولت
اور طاقت بڑی تیزی سے بڑھی۔ ہندُستان کے
مشرقی کناروں پر بھی عربوں کی پُرانے زمانے
میں بہت قدر و عزت ہوئی۔ جب دارا سے نے
پانچویں صدی قبل مسیح میں دجلہ اور فرات کے
دہانوں کو رُکوا دیا اور مصر کی تجارت کو فنا کر دیا تو
یہ تجارت یمن کے عربوں کے ہاتھ لگی۔ عربوں اور
یہودیوں کی نو آبادیاں لنکا اور جنوبی ہند
میں قائم ہوئیں۔"

جولائی ۴۴ء کے ہندُستانی میں بھی اپنے لکھنے کا ڈھچر دیکھ لیجئے۔

"غرض کہ مثنوی چونکہ ادب و حکمت اور حقائق
و معارف کا ایک گنجینہ ہے۔ اس لئے ہر زمانے
میں لوگوں کو اس سے استفادہ کا شوق رہا ہے۔
اور مختلف طریقوں سے اس کے افادہ کو عام
بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ طرح طرح کے
ایڈیشنوں کے علاوہ صرف اس کی شرحوں کا
نام گنایا جائے تو ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی
ہے۔ عام مواعظ میں مثنوی کے قصص و حکایات
اور اس کے نکات و لطائف کا مختلف عنوانوں
اور تقریبوں سے ذکر ہوتا رہا ہے، بہر صورت
اس سے فیضیاب و متمتع ہونیکا کوئی دقیقہ
فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ بایں ہمہ عام حلقوں میں
اکتساب و مطالعہ کا جو صحیح حق ہے وہ خاطر خواہ
ادا نہ ہو سکا۔"

جولائی ۴۵ء کے ہندُستانی میں آپ کی لکھت کا یہ ڈھب ہے:۔

"ایک زمانہ تھا جب انسان کے تصور میں آسمان
ایک لامحدود کرہ تھا جو ایک لازوال قوت کا
مسکن تھا۔ جہاں نورِ ازلی ضو فگن تھا، عقلِ کل
جلوہ افروز تھی، عشق و محبت، سرمستی و مسرت کا
دور دورہ تھا۔ یہ وہ آسمان تھا جو اس عالم کے
نو افلاک پر محیط تھا، ان سب سے الگ اور اوپر تھا۔
دائمی سکون اور امن کا مقام تھا، تبدیلی اور حرکت
سے ماورا تھا۔ عالم کون و فساد نو کروں پر مشتمل تھا۔
کرۂ ارض عین مرکز میں واقع تھا اور اس کی فلک
پر چاند حکومت کرتا تھا۔"

اچھا ہوتا ہے جو ایسا لکھ سکتا ہو اور جس کی اُڑان اتنی اونچی ہو وہ اتنا نیچے اتر آئے اور یہ لکھنے لگے:۔

"اردو کے کلیور کو بپار رہیں گے۔" "میر بھی یہی کہ دن ہے۔" "اس کا بیوہار لیجئے۔" "جو کچھ آپس میں تھوڑا سا بھید ہے۔" "انتر دو باتوں میں ہے۔" "مولوی صاحب کو ہندی کے لفظ کدھیتے جان پڑتے ہیں۔"

اچھا یہ تو بتائیے یہ کیا بات ہے:۔ میرے لکھنے کے ڈھنگ کو آپ نے "چوکھا رنگ" کہا تھا تو اُسے برتا بھی ہوتا اور اسی ڈگر پر آپ بھی چلے ہوتے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ مُنہ سے تو "چوکھا رنگ" کہہ دیا پر اپنی لکھت میں اسے نہ برت سکے۔

عربی، فارسی کے بولوں سے آجکل کے ہندوؤں کی چڑ اور اُنکی جگہ اُردو میں کُڈھب بول ٹھونستے دیکھ کر میں نے اس ڈھب کے کواڑ کھول دیئے تھے اور سمجھتا تھا عربی، فارسی بولوں کے نہ ہونے سے آپ لوگ ادھر ہی آجائیں گے۔ اور ادھر آنے سے ہوگا کیا۔ آئے دن کی تو تو میں میں اور نئی بھاشا بنانے کی دوڑ دھوپ سے چھٹکارا بھی مل جائیگا اور نئے بولوں کی ڈھونڈھ ڈھانڈھ کیلئے گھڑی گھڑی سنسکرت کی ڈکشنری بھی نہیں اٹھانا پڑے گی۔ بنی بنائی بھاشا بیٹھے بٹھائے مل جائے گی۔ اور نئی بھاشا بنانیکی اُدھیڑ بُن میں جو گھڑیاں کٹ رہی ہیں وہ دیس کے کٹھن دھندوں میں کٹنے لگیں گی۔

ہمارے سامنے ہندوؤں کے دو جتھے ہیں۔ ایک وہ جو عربی فارسی نہیں جانتا اس کو تیرا میرا کرنا نہیں آتا۔ اُردو میں جو سنے اور جتنے بول بھی ہیں سب کو یہ اپنے ہی یہاں کا سمجھتا ہے۔ رہا دوسرا جتھا جو کچھ نہ کچھ عربی، فارسی جانتا ہے وہ بات بات میں تیرا میرا کرنے کا راگ الاپتا رہتا ہے اور جب کچھ لکھنے لکھانے کیلئے بیٹھتا ہے تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے عربی، فارسی کے گھلے ملے بول اردو میں سے نکالتا اور کاٹ چھانٹ کے ان کی جگہ نئے نئے کُڈھب

بولوں کو دیتا ہے۔ دھیان نہ رہنے سے بدیسی بولیوں کے بول لکھت کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ لکھ چکنے پر اس کی جانچ پرتال کی جاتی ہے اور جانچنے میں جو بدیسی بول ملتے جاتے ہیں انھیں نکال ڈالا جاتا ہے۔ جیسے کسی نے لکھنے کی دُھن میں یہ لکھدیا: "اُن کا کیا حال ہے؟" "آپ سے امید ہے"۔ جانچ کی کسوٹی پر کسنے میں "حال" لکھا ہوا دیکھ کر دھیان آیا "حال"، "احوال"، "حالت" یہ بول تو عربی ہیں۔ یہ دھیان آتے ہی اُسے کاٹ کر "دشا" کا کڈھب بول اس کی جگہ جڑ دیا۔ "امید" کو پرکھا تو یہ بول فارسی دکھائی دیا۔ اس پر بھی ناک بھوں چڑھائی اور جھٹ سے اس جیتے بول کو بھی کاٹ کوٹ کے اس کی جگہ مرا ہوا بول "آشا" رکھدیا۔ آجکل یہی ہنگ چل پڑا ہے اور بہت سے ہندو اسی میں لگے ہوئے ہیں۔

آپ لکھتے ہیں: "میرا نویدن بھی یہی ہے"۔ نویدن کی جگہ "مقصد، مدعا" لکھا جا سکتا تھا۔ اور کونسے اچنبے کی بات ہے جو پہلے ہی لکھا ہو اور پھر نویدن بنایا ہو۔ مقصد، مدعا یہ وہ بول ہیں جنھیں ان پڑھ سے ان پڑھ بھی سمجھتا ہے اور جو ان بولوں کو عربی ہونے سے آپ نہیں لکھنا چاہتے تھے تو ٹھیٹ اُردو کا بول "کہنا"، نویدن کی جگہ لکھا جا سکتا تھا: "اور میرا بھی یہی کہنا ہے"۔ آپ کی لکھت کا یہ ٹکڑا یوں ٹھیک ہو سکتا تھا۔ پر آپ کو تو "نویدن" کیلئے جگہ نکالنا تھی۔ اور جیسے بھی بنا وہ آپنے نکال ہی لی۔ ایسے ہی عربی، فارسی کے گھلے ملے بولوں کو اُردو میں سے نکال کر "شبد"، "کلیور"، "جیون"، "پورا"، "ویاکرن" جیسے نئے نئے بولوں کو جگہ دی گئی ہے۔

مہاراج! ٹوکا تھا جس کو پھر وہی بات آ دبد اکے کی۔

دیکھئے اُردو لکھنے کے دو ہی ڈھب ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ ہے۔ عربی، فارسی، ہندی کے وہ بول جو اُردو میں گھل مل گئے ہیں ان سب کو ملا جلا کے جو لکھنا لکھانا ہو وہ لکھا جائے۔ دوسرا ڈھنگ وہ ہے جسے "ٹھیٹ اُردو" کہتے ہیں۔ اور اسی ٹھیٹ اُردو میں پہلے آپ کو پھر مہاتما جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھا جا چکا اور اسی ڈھچر پر پھر آپ کو لکھا جا رہا ہے۔ آپنے ان دونوں کو چھوڑ کے لکھنے کا ایک نیا ڈھب یہ نکالنا چاہا ہے جسمیں جگہ جگہ بھولے بسرے بولوں کی بھرمار ہو اور گھلے ملے بولوں کی جان بوجھ کے کاٹ کوٹ کی گئی ہو۔

کیا آپ نہیں جانتے کسی بھاشا میں نئے نئے بول کب اور کس لئے بنا لئے جاتے ہیں۔ دیکھئے۔ جب رات دن کی بول چال، بات چیت، سامنے کے بول کسی بات کو جوں کا توں نہ دکھا سکیں۔ جیسے کسی دوسری بھاشا کی کوئی لکھت آپ اپنی اُردو میں لانا چاہیں اور اس دوسری بھاشا کی وہ لکھت جسے اُردو کے کپڑے پہنائے جا رہے ہوں اس میں کچھ ایسی جگہیں آجائیں جو اُردو کیلئے بھول بھلیاں ہوں اور اس کی بول چال کے گنے چنے بول اس لکھت کے بھید کو نہ کھول سکیں تو جب اس بھید کو کھولنے اور چھپی ہوئی باتوں کو ایسا دکھانے کے لئے جیسے ہاتھوں کی لکیریں دکھائی دیتی ہیں سوچ ساچ کے نئے نئے بول بنانا اور بڑھانا پڑیں گے۔ اس سے ہٹ کر نئے بولوں کے گھڑنے کی کوئی جگہ ہی نہیں۔ جو نسے اور جتنے ملواں بول چلے آ رہے ہیں، انھیں یوں ہی رکھا جاتا ہے اور ان میں کچھ بھی گھٹ بڑھ نہیں کی جاتی۔ نہ جانے بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی ہے جو سامنے کے بولوں کو چھوڑ چھاڑ کے کڈھب بولوں پر لوگ ریجھے ہوئے ہیں۔

اُردو ہی ایک ایسی بھاشا ہے جو پورے دیس میں تھوڑی بہت سب جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے نہ آپ کی نرالی اور انوکھی بولی۔ میری پہلی چٹھی کے اس ٹکڑے کو لکھ کر آپ یہ لکھتے ہیں:۔

"اُردو کی جگہ ہندی کا شبد رکھ دیجئے تو
ہندی والوں کا بھی یہی کہنا ہے"۔

رکھنے کو کیا ہے جو جی چاہے اُردو کی جگہ رکھدیجئے۔ پر سوچ بچار کی آنکھوں سے دیکھئے تو اُردو کا بول اٹل دکھائی دیگا جو اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ اور کوئی دوسرا بول اس کی جگہ لے نہیں سکتا۔ دیس کی چھوٹی بڑی بولیاں جتنی بھی ہیں اُن سب کو الگ الگ دیکھ چکنے پر جب آپ اُردو کو پرتالیں گے تو یہ بل کھلاؤ لاد کھائی دیگا۔

کسی بھاشا کے پھیلاؤ کو کیسے جانچتے ہیں۔ ان پڑھ گاؤں والوں اور گنواروں کی بات چیت کا کیا ڈھنگ ہے۔ عربی فارسی کے بگڑے بگڑائے بولوں کو یہ کس فرّاٹے سے بولتے چالتے ہیں۔ دیس کی بولیوں میں سے مرہٹی میں عربی، فارسی کے بگڑے ہوئے بولوں کی کیسی ریل پیل ہے۔ گاندھی جی کی چٹھی میں یہ سب باتیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس چٹھی کو نہ دیکھا ہو تو دیکھئے اور جو دیکھ لیا ہو تو پھر دیکھئے۔

اپنی اسی لکھت میں ایک جگہ آپ نے یہ بھی لکھا ہے:-

"جس طرح مولوی صاحب ہندی کے لفظوں کو سُن کر کان میں انگلی ڈال لیتے ہیں۔ اسی طرح پنڈت جی اُردو کے چٹ پٹے شبد سُن کر آپ کا منہ تکتے ہیں۔"

آپ یہ کس نے کہہ دیا۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں باتیں بھی ٹھیک نہیں۔ نہ مولوی صاحب ہندی بولوں کو سُن کر کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں اور نہ پنڈت جی اُردو کے چٹ پٹے بول سُن کر کسی کا مُنہ تکتے ہیں۔ ہندی کے وہ بول جنھیں نہ کبھی اُردو نے سُنا اور نہ کبھی دیکھا ایسے ہی بھولے بسرے بولوں کو سُن کر "مولوی صاحب" کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں اور وہ بول جو اُردو میں گھُل مل چکے انھیں سُن کر کون ناک بھوں چڑھا سکتا ہے۔

رہا پنڈت جی کا مُنہ تکنا اس کیلئے میری پہلی چٹھیوں کو دیکھئے جن میں بہت سے پنڈتوں کی لکھتوں کا اتا پتا دیا جا چکا ہے۔ ان پنڈتوں کی لکھتوں کا وہی ڈھنگ ہے جو مسلمانوں کے لکھنے کا۔ پنڈت جی کترا کے کہیں سے الگ نہیں ہوتے اور اسی ڈھرّے پر چلے جا رہے ہیں جس پر مسلمان۔ تو پنڈت جی کا منہ تکنا تب آپ کہہ سکتے تھے جب پنڈت جی اپنی لکھت کا ڈھچر مسلمانوں سے بچ بچا کے الگ رکھتے اور لکھت کی پگڈنڈی پر مسلمانوں کے ساتھ کبھی نہ چلتے۔

دیس کی کسی بات کا ٹھیک شعور ہو نہ ہو جو بھی ہو آپ بھاشا کی دیکھ بھال، جانچ پڑتال کیجئے۔ اس کا آگا تاگا لیجئے۔ آپ کو کوئی روکتا نہیں۔ پر یہ تو بتا دیجئے کہ یہ سب کھٹراگ کس لئے۔ ہندی پرچار کو دھُوم دھڑے آٹھ دن بھی تو ابھی نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے کیا ہو رہا تھا۔ دیس کونسی بولی بول رہا تھا۔ لکھت پڑھت کیسے کی جا رہی تھی۔ دیس والے کسے برت رہے تھے۔ تو جو ہو رہا تھا ابھی اُسے ہی رہنے دینے میں کونسا گھاٹا اور ٹوٹا تھا۔ پُرانی ڈگر چھوڑنا کیوں؟ نئی بنانا کس لئے۔ کیا پُرانا ہونا کوئی بُری بات ہے اور جو کسی بات سے بچنا اس کے پُرانے پن ہی سے مان لیا جائے تو اور سیکڑوں ایسی باتیں ہیں جنھیں اُن کے پُرانے پن سے چھوڑ دینا چاہئے۔ پر کیا وہ چھوڑی جا سکتی ہیں۔

مہاراج! دیس کے دو ہاتھ ہیں۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ انھیں دونوں ہاتھوں نے مل کر اُردو کی ایسی موہنی مورت بنائی جسے آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ یہ بھاشا کسی ایک کی بنائی ہوئی نہیں۔ تو ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ سے اُردو بنی، پنپی، بڑھی اور پھیلی۔ یہ آگے بڑھ ہی رہی تھی جو اس کا ساتھ دینے کیلئے دکھن کی عثمانیہ یونیورسٹی اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس کا ساتھ دینا اُردو کے لئے ایسا ہوا جیسے سونے پہ سُہاگا۔ یہاں کے راج نے کروڑوں کی لاگت سے اُردو یونیورسٹی اور لاکھوں کی پچھادرسے اس یونیورسٹی کے لئے ایک بڑی "اکیڈمی" بنوائی جس میں یورپ کی کٹھن سے کٹھن لکھتوں پہ لکھتیں اُردو کے اچھے اچھے کپڑے پہنتی چلی جا رہی ہیں۔ اور یہاں کی راجدھانی نے سہار ادیکر اُردو کو ایسی اونچی جگہ پہنچا دیا جہاں بڑی بڑی بھاشاؤں کی سبھا جمی ہوئی ہے۔ تو ایسی اُردو جو سارے دیس پر چھا جانا چاہتی ہے اسے چھوڑ چھاڑ کے ایک نئی بھاشا بنانے میں آپ لگے ہوئے ہیں۔

اچھا اب اُردو کو ایک اور ڈھب سے جانچ کے دیکھئے:-

بنگال، گجرات، مدراس ان تینوں جگہوں کی بولیاں دیس کی بڑی بولیوں میں گنی جاتی ہیں۔ کوئی بنگال کا رہنے والا مدراس پہونچ کر اپنی بنگلا بھاشا میں وہاں والوں سے بات چیت کرنے لگے تو کیا اس کا ایک بول بھی مدراس والے سمجھ سکیں گے۔ ایسے ہی مدراس اور گجرات والوں کی بولیاں کیا بنگال کے رہنے والوں کی سمجھ میں آسکیں گی؟ ہند کی چھوٹی بڑی بولیوں میں سے جونسی بولی بھی لیجئے وہ پہلے سے جس جگہ بولی جا رہی ہو وہیں سمجھی جائیگی۔ اس ٹکڑے سے آگے بڑھنے پر اس کا بولنا تو بڑی بات ہے کوئی اس بولی کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ یہاں کی پوری بولیوں میں سے اکیلی اُردو ہی ایسی ہے جو پورے دیس میں تھوڑی بہت سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اُردو بولنے والا دیس کے کسی ایسے ٹکڑے میں بھی چلا جائے جہاں یہ بھاشا نہ بولی جاتی ہو۔ پھر بھی وہاں والے کچھ نہ کچھ اُردو بات چیت سمجھ ہی لیں گے۔

جونسی بھاشا بھی ہو پہلے اس کا پھیلاؤ ہی دیکھا جاتا ہے۔ اور اسی پھیلاؤ سے اس کے بڑے پن کا پتہ لگتا ہے۔ آپ نے دیکھا جو پھیلاؤ اُردو کا ہے وہ یہاں کی کسی اور بولی کا نہیں۔ تو پھر اُردو ہی دیس کی بھاشا ٹھہر سکتی ہے۔ اس پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں:- ہندی بھاشا بھی تو ایسی ہی ہے۔ پر آپ کا یہ کہنا تب ٹھیک

سمجھا جائے گا جب آپ کسی ایسی جگہ کا پتہ دے سکیں جہاں ٹھیٹ ہندی بولی جاتی ہو اور جس میں عربی، فارسی کے بولوں میں سے ایک بول بھی نہ ہو اور وہاں کے لوگ فرّاٹے سے ٹھیٹ ہندی ہی بولتے ہوں۔ گاؤں والے اپنی بات چیت میں عربی، فارسی کے جو سیکڑوں بگڑے ہوئے بول اُٹھتے بیٹھتے بولتے ہیں ان کی یہ بول چال ہندی نہیں کہی جا سکتی اسے بگڑی ہوئی اُردو کہا جائیگا۔

آپ سے یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی چھپی ہوئی لکھت پہونچی۔ اسے اِدھر اُدھر سے اور اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔ یوں تو یہ لکھت اچھی اور بہت اچھی ہے۔ پر کہیں کہیں اس میں کچھ باتیں ادھوری رہ گئیں اور کہیں کچھ لکھنے سے چھوٹ گئیں۔ پھر، پنڈت جی جو تھیوری بنانا چاہتے ہیں وہ کٹھن ہے۔ اُردو، ہندی جھگڑا چکانے کیلئے میرے دھیان میں دو باتیں ہیں جو کچھ کٹھن نہیں۔ سب کا ایکا ہو جائے تو پھر اس جھگڑے ٹنٹے کا کہیں پتا بھی نہ لگے۔ عربی، فارسی کے مَن مَن بھر کے بول ہندوؤں کو اچھے نہیں لگتے۔ اور اسی پر وہ اینٹھے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی ہندی کے کڈھب بولوں کو مسلمان ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے اور اسی پر ان کی تیوری چڑھی ہوئی ہے۔ تو جھگڑا اتنا ہی ہے۔ آپس کی اس تن بھن اور اکڑ تکڑ کو الگ کر کے آپس میں میل ملاپ کے پینگ یوں بڑھا سکتے ہیں:۔

پہلی بات

ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے ایسے لوگوں کو چُن لیا جائے جو بَت بنے اور جھگڑالو نہ ہوں، بات کی پچ کرنے کو بُرا نہ جانتے ہوں، دیس کا پریم اُن کی گھٹی میں پڑا ہو۔ میل ملاپ کے رسیا ہوں اور سب سے بڑھکر وہ لٹریچر اور بھاشا کا اُتار چڑھاؤ اور اس کی اونچ نیچ دیکھنے کی پوری سمجھ رکھتے ہوں اور ایسی باتوں کو پورا پورا جانچ پرتال سکتے ہوں۔ سب کے سب دُھن کے سچے اور بات کے پورے ہوں۔ دونوں جتھوں میں سے ایسے سوجھ بوجھ والوں کو الگ کر کے اور انھیں ملا کے اُن کی ایک پوری کمیٹی بنالی جائے۔ جسمیں یہ بھاشا کی نیّا پار لگانے والے ایک جگہ مل کے بیٹھیں۔ جو ایک کہے دوسرا اُسے کان دھر کے سُنیں۔ جو سچی بات ہوتی ہے وہ آپ دل میں گھر کر لیتی ہے۔ ٹھیک بات کے ماننے میں کبھی ہٹ دھرمی نہ چاہیئے۔ اس کا کہنے والا چاہے کوئی کیوں نہ ہو اور جو ٹھیک نہ ہو تو جب بھی جو کچھ کہنا ہو وہ ایسے ڈھب سے کہا جائے جس کا سننا دوسروں کے لئے دُوبھر نہ ہو جائے۔ سب سے پہلے اُردو کی جو جو لکھتیں ابھی سے اچھی مانی جا رہی ہیں (جیسے سرسیّد، آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد کی لکھتیں) انھیں دے کر ہندوؤں سے کہا جائے:۔ ان لکھتوں میں سے عربی، فارسی کے جو نسے اور جتنے بول آپ لوگوں کو بھولے بسرے دکھائی دیں ان سب کی ایک لسٹ بنالی جائے اور ساتھ ہی عربی، فارسی کے کڈھب بولوں کی جگہ بھرنے کے لئے اپنی ہندی میں سے ایسے گھُلے ملے بول چھانٹ کے کمیٹی کو بتائے جائیں جنھیں مانا جا سکے۔ ایسے ہی ہندی کے جن کڈھب بولوں پر مسلمان ناک بھوں چڑھاتے ہیں ان سب کو ایک جگہ لکھ کے ان کی پوری لسٹ بنالیں۔ اور اسی کے ساتھ بھولے بسرے ہندی بولوں کی جگہ بھرنے کے لئے عربی، فارسی کے گھُلے ملے بول لکھ کر کمیٹی کو دکھائیں۔

تو ہندو اپنی جگہ عربی، فارسی کے بھولے بسرے بولوں کی پوری لسٹ بنانے کے ساتھ اِن بولوں کی جگہ رکھنے کے لئے ہندی کے ملے جُلے بول لکھ لیں گے اور مسلمان اپنی جگہ ہندی کے کڈھب بولوں کی لسٹ بنا چکنے پر ان بولوں کی جگہ برتنے کے لئے عربی، فارسی کے گھلے ملے بول لکھ لکھا کے کمیٹی کے سامنے رکھ دیں گے اس ڈھنگ سے پھیلا ہوا جھگڑا سمٹ سمٹا کے تھوڑی سی جگہ میں آجائیگا اور اب اتنی ہی بات رہجائیگی جو کمیٹی پورے سوچ بچار سے ایک ایک بات کی پوری چھان بین کر کے یہ جھگڑا اب سا چکا دے جس کو ٹھنڈے جی سے دونوں جتھے والے مان لیں اور اُس مانی ہوئی بات میں پھر کوئی کتر بیونت اور گھٹ بڑھ نہ ہو سکے۔ ہندو مسلمان اپنی اپنی جگہ سچائی کے ساتھ پورا پورا سوچ بچار کر چکنے پر آمنے سامنے جب کمیٹی میں بیٹھیں گے تو پھر آپس میں ایک کو دوسرے کی کہی ہوئی سچی اور اچھی بات مان لینے میں کوئی جھجک اور کچھ ڈر نہ رہے گا۔

یہ جھگڑا دو تین کمیٹیوں میں نہیں نبٹ سکتا۔ اس کیلئے کمیٹیوں کا جال بچھانا پڑے گا۔ جب تک ہندو اور مسلمان دونوں مل کے کسی بات کے ماننے کی حامی نہ بھریں تب تک بیچ میں کچھ کچھ دن چھوڑ کے یہ کمیٹیاں یونہی ہوتی رہیں۔ ایک کمیٹی سے

دوسری کمیٹی تک پورے سوچ بچار کے لئے بیچ میں پندرہ دن، مہینہ، سوا مہینہ جو بھی کمیٹی کہے وہی رکھا جائے۔ اس ڈھب سے اُردو، ہندی جھگڑا امٹ مٹا کے رہجائیگا۔ اور اس ڈھنگ سے اس کی بڑھتی ہوئی لے دب دبا جائیگی۔

دُوسری بات

اب تک جو بھی ہو رہا تھا یہ دھیان کر کے اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے: "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا"۔ آج کی باتوں پر سنسار کا چُپ سادھنا آج ہی کے لئے ہے۔ یہی اسکی چُپ کوئی نہ کوئی سمجھوتا کل سامنے لے ہی آئیگی۔ یہ باتیں بہت پھیلاؤ چاہتی ہیں۔

اب تک ٹھیٹ اُردو لکھتا رہا۔ اس ڈھب کے کواڑ میں نے ہی کھولے تھے اور اب میں ہی انھیں بھیڑے دیتا ہوں۔ انھیں کیوں کھولا تھا اور کس لئے بھیڑا جا رہا ہے یہ کوئی بھید نہیں جو آپ سے چھپا ہوا ہو۔ تو اب جو لکھنا لکھانا ہوگا عربی، فارسی، ہندی اب سب بولوں کو ملا جُلا کے لکھوں گا، جیسے اس سے پہلے لکھا کرتا تھا۔

سیّد ابُوالقاسم

کیفِ محبّت

نگاہ مست، دلِ آسودۂ محبّت ہے — عذابِ زیست ہم آغوشِ خوابِ راحت ہے
نہ پوچھیے غمِ الفت میں کتنی لذّت ہے — مری نگاہ میں یہ "خارزار" جنّت ہے
کسی کی یاد نے اک حشر کر دیا برپا — دلِ تباہ میں طغیانِ رنگ و نکہت ہے
خیالِ یار کو اندوہِ دو جہاں سے غرض — خیالِ یار تو اک عالمِ مسرت ہے
یہ امتیاز کہاں شورشِ تمنّا میں — وہ روبرو ہیں کہ آئینۂ محبّت ہے
یہ سوچتا ہوں کہ وہ کیوں نظر نہیں آتے — حجابِ قُرب ہے یا پردۂ لطافت ہے
مجھے ہو ناز نہ کیوں ان کی بے نیازی پر — وہ جانتے ہیں، مرا دل رہینِ الفت ہے
یہی بہت ہے کہ اک ربط ہے انھیں مجھ سے — شریک تو ہیں محبت ہے یا عداوت ہے
وہ جور و ظلم سہی! یہ تو ہو گیا معلوم — کہ اُن کے دل میں بھی کچھ میری قدر و قیمت ہے

شکوۂ رنگیں

دلِ فسردہ و مایوس کیا قیامت ہے — فضا اُداس ہے، عالم غریقِ حسرت ہے
ستاؤ خوب ستاؤ کسے شکایت ہے — دلِ اسیر سزاوارِ ہر اذیت ہے
گناہگار ہوں، کرتا ہوں اعترافِ گناہ — قصور وار محبت ہوں، ہی محبّت ہے
رہی نوازشِ برہم بھی نامکمل سی — یہ دلِ فگار حزیں بسملِ نزاکت ہے
کبھی نہ پائی شکایت نے فرصتِ اظہار — نگاہِ زود پشیماں بھی کیا قیامت ہے
مآلِ جانِ حزیں سوچنے سے کام کسے — تمھیں ہے شوقِ ستم، دل حریصِ لذت ہے
مجھے کہا ہے مگر روشناسِ غم کس نے — یہ مانتا ہوں! غمِ ایجادِ طبیعت ہے
تمھیں کہو یہی شیوہ ہے دل نوازوں کا — یہ جاں کنی یہ عقوبت جوابِ الفت ہے

زمانہ دیکھ رہا ہے تباہیاں میری
تمھارے جور و ستم کی مجھے ندامت ہے

کوکب شاہجہانپوری

ہمارِی تعلیم میں مادرِی زبان کا درجہ

دنیا کے جتنے مہذب اور ترقی یافتہ ممالک ہیں آپ دیکھیں گے کہ ان کے نصاب تعلیم میں ان کی مادری زبان کو خاص امتیاز و اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ وہاں جس طرح ان کو تمام دیگر علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی طرح خود ان کی زبان بھی اچھی طرح سکھائی پڑھائی جاتی ہے۔

ایک انگریز گریجویٹ کو آپ دیکھیں گے کہ بہترین انگریزی بولتا اور لکھتا ہے۔ ایک جرمن گریجویٹ بہترین جرمنی زبان جانتا ہے۔ اور ایک فرانسیسی گریجویٹ خوب اچھی طرح فرانسیسی بولنا اور لکھنا جانتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ خود زندہ قومیں ہیں۔ ان کو اپنی ہر چیز محبوب ہے۔ اور اس کو بھی وہ زندہ رکھنا چاہتی ہیں اسی لئے وہ اپنی زبان کو عزیز رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک انسان کی تعلیم کا مقصد اولیں یہ ہونا چاہئے کہ تعلیم حاصل کرکے وہ منجملہ دیگر علوم کے اپنی زبان بھی عمدہ طریقہ پر بول سکتا ہو اور اس میں اتنی دستگاہ رکھتا ہو کہ اپنے خیالات کا خوش اسلوبی سے اظہار کر سکے۔

ایک تعلیمیافتہ انسان کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اپنی پُرانی روایتوں کو زندہ کرے۔ اپنی مادری زبان کو زندہ رکھے اور اس کی ترقی وترویج کے وسائل وذرائع سوچے اور ان کو اختیار کرے۔ ہر قوم کی بقا اس کی اپنی زبان کی بقا کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اگر زبان مُردہ ہوگئی تو خود وہ قوم بھی مُردہ ہو جائیگی۔ یہ وہ خیالات واحساسات ہیں جن کے ماتحت یورپین ممالک کے لوگ اپنی اپنی مادری زبان کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور اس کی بقا کیلئے تدابیر سوچتے اور ان پر عمل درآمد کرتے رہتے ہیں۔

لیکن افسوس کہ ہمارے ہندوستان کی حالت ان ممالک کے بالکل برعکس وبرخلاف ہے۔ یہاں تو بچّہ کو ابتدا ہی سے جبکہ وہ پانچویں یا چھٹی جماعت میں ہوتا ہے اپنی زبان کے ساتھ نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ جہاں بچّہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے کے قابل ہوا۔ پھر وہ اُردو میں کلام کرنا باعثِ شرم وعار سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ سنِ تمیز کو پہنچنے پر بھی اس کی وہی حالت رہتی ہے۔ بالعموم حال یہ ہے کہ اگر ایک بی۔ اے پاس سے انگریزی میں کچھ لکھوائیں تو وہ بخوشی لکھدیں گے اور اپنی استعداد کے مطابق خاصہ لکھدیں گے۔ لیکن اگر ان سے اُردو میں ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کیجئے تو اول تو وہ سو طرح کے حیلے حوالے کرینگے۔ اور اُردو میں مضمون نہیں لکھیں گے۔ اگر آپ نے سر ہو کر اور پیچھے پڑ کر زبردستی اُن کو مجبور کرکے مضمون لکھوا ہی لیا تو پھر اس میں پچاس غلطیاں ہونگی۔ نہ املا درست نہ خط درست "ق" کی جگہ "ک" لکھ رہے ہیں۔ اور "م" کی جگہ "ن" نہ تذکیر کی تمیز نہ تانیث کی۔ رومال کو مؤنث اور بندوق کو مذکر لکھ رہے ہیں۔ نہ عبارت شستہ نہ مضمون صحیح نہ ترکیب چُست نہ بندش مرتب اور تو اور ان ہندوستانی صاحب بہادروں میں سے بہتر فی صدی ایسے ملیں گے جن کو صحیح طور پر خط لکھنے کا بھی ڈھنگ نہیں آتا

بیگم (شریک حیات۔ نصف بہتر) کو خط لکھ رہے ہیں تو "عزیزۃ" یا "محترمہ مکرمہ" سے تخاطب کیا جارہا ہے۔ اور والدہ ماجدہ کو عریضہ لکھا ہے تو میری جان اماں، میری پیاری اماں" سے شروع کیا ہے۔ یہ عام شکایت ہے جو کالج کے لڑکوں کے متعلق بیان کی جاتی ہے اور عام مشاہدہ اس کا شاہد ہے لیکن غور کیا جائے تو اس میں ان بیچاروں کا کیا قصور؟ بلکہ اصل قصور تو ہے "نصابِ تعلیم" کا اور "طرز تعلیم" کا اور تعلیم کے ماحول اور گرد و پیش کے حالات کا۔

انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں یہ نہیں کہ اُردو پڑھائی نہیں جاتی۔ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح پڑھائی جاتی ہے وہ نہ پڑھائے جانے کے برابر ہے۔ اور تعلیم میں ہماری مادری زبان کو جو درجہ ملنا چاہیئے اس سے وہ سراسر محروم ہے۔ بچّہ کو اسکول کی شروع زندگی ہی سے جو ذہنیت ملتی ہے وہ یہ ہے کہ اُردو بولنا بُری بات ہے۔ اور انگریزی بولنا فخر کی چیز ہے۔ اور لیاقت وقابلیت کی نشانی ہے۔ اس کے استاد وغیرہ اس کو انگریزی بولنے کی تلقین کرتے ہیں اور اگر وہ اچھا انگریزی بولنے اور لکھنے والا بھی ہے تو انعام وغیرہ سے اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ پھر وہ بچّہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اسکول کی اونچی جماعتوں میں جو تعلیم ہوتی ہے تمامتر انگریزی زبان میں ہوتی ہے۔ اردو میں نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر وہ سمجھتا ہے کہ انگریزی زبان کا حاصل کرنا اور اس میں کمال پیدا کرنا زیادہ فخر و نمود کی بات ہے۔ اس کے علاوہ وہ دیکھتا ہے کہ اسکول میں جتنے ماسٹر ہیں اُن میں سب سے کم تنخواہ پانے والے وہ مولوی صاحب ہیں جو اُردو پڑھاتے ہیں۔ اس سے بچّوں کے دل میں ان مولوی صاحب کی کوئی قدر نہیں رہتی۔ اور اسی بنا پر خود اپنی زبان کی ان کے دل میں ذرّہ برابر وقعت نہیں رہتی۔ پھر یہ بھی سبب ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں مختلف سوسائیٹیاں اور انجمنیں ہوتی ہیں۔ بحث ومباحثہ کے لئے کلب ہوتے ہیں اور ان سب کی کارروائیاں تحریریں اور تقریریں انگریزی میں ہوتی ہیں۔ اُردو کا کہیں نام نہیں آتا۔ انعامات جو دیئے جاتے ہیں وہ انگریزی عمدہ بولنے والے اور لکھنے والے کو دیئے جاتے ہیں نہ کہ اُردو پر! پھر یہ کہ حکومت کی زبان انگریزی ہے اس لئے جس کی انگریزی تعلیم پختہ اور عمدہ ہوگی اس کے لئے اچھی ملازمت کے زیادہ مواقع ہیں۔ مگر اُردو میں کافی دستگاہ و مہارت رکھنے والے کے لئے اس قسم کا کوئی موقع نہیں۔

سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اُردو کو نصابِ تعلیم میں بحیثیت ایک ضروری اور لابدی مضمون کے داخل نہیں کیا گیا۔ اور بلکہ بعض یونیورسٹی کے امتحان میں تو اُردو پرچوں کی حیثیت محض اختیاری مضمون کی سی ہوتی ہے۔ مگر انگریزی کو ہمیشہ ضروری و لازمی قرار دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان چند اسباب و وجوہ کی بنا پر ہماری مادری زبان کو تعلیم میں کوئی وقعت حاصل نہیں ہے۔ حالانکہ ہماری تعلیم کا ابتدائی مقصد یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ہم اپنی مادری زبان میں واقفیت بہم پہنچاتے۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ اگر ایک گریجویٹ سے دریافت کیجئے کہ شکسپیر کون تھا؟ ملٹن کس صدی کا شاعر ہے؟ ورڈس ورتھ کو انگریزی شاعری میں کیا مرتبہ حاصل ہے؟ تو وہ آپ کو ان سوالات کے جوابات صحیح صحیح دیگا۔ لیکن اگر اس سے پوچھا جائے کہ غالب کے کلام کی خصوصیات کیا کیا ہیں؟ میر تقی کو غزل گوئی میں کیا درجہ حاصل ہے۔ ذوق کس دَور کے شاعر ہیں؟ تو ان سوالات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں کتنا کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک شخص اعلیٰ تعلیمیافتہ کہلاتا ہے مگر وہ دوسرے کی زبان میں تو بے تکلف تحریر و تقریر

کر سکتا ہے اور خود اپنی مادری زبان میں ایسا کرنے سے عاجز و قاصر رہتا ہے۔

بس سخت ضرورت ہے کہ ہماری مادری زبان نصاب تعلیم میں جس درجہ کی مستحق ہے وہ اس کو دیا جائے۔

اور یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ ابھی سے مذکورہ بالا خامیوں کو رفع کیا جائے۔

جمشیدہ شمیم

آرام کہاں!

"اپنے پھوپھیرے بھائی "محمد دلدار خاں" کی المناک موت پر خون کے آنسو!"

اے بھائی! تجھے کچھ اس کی خبر ہے غم میں ترے کیا حال ہے یاں
کیا بیت رہی ہے ماں پہ تری، کیا گھر کا ہی تیرے آج سماں
اُفتاد ہے کیا بیوہ پہ تری، آنکھوں سے ہیں پیہم اشک رواں
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

اے بھائی سناؤں کیا میں تجھے کس حال میں تیرا بھائی ہے
کس حال میں تیرا ماموں ہے، دل ٹکڑے آنکھ جنائی ہے
ہر سانس گراں ہے دنیا کی، گھر بھر پہ قیامت چھائی ہے
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

ہر آنکھ میں آنسو خون کے ہیں، غمگیں ہے فضا، افسردہ چمن!
ہر ذرۂ ہستی مضطر ہے، ہر سانس ہے دردِ ضبط شکن
ہر دل ہے رہین بیتابی، سینوں میں ہے آتشِ غم سے جلن
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

اُف! اب بھی ہوائیں چلتی ہیں، پیغام مسرت دینے کو
اُف! اب بھی وہی دن رات کے جلوہ رخشاں ہیں دل لینے کو
کیوں چھوڑ گیا ہے ہمکو یہاں تو آگ میں کشتی کھینے کو
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

ہاں اب بھی فضا میں سورج، چاند، ستارے کھیلنے آتے ہیں
ہاں! اب بھی پھول چٹکتے ہیں، طوفان طرب چونکاتے ہیں
اشکوں سے میں دامن بھرتا ہوں، آہوں کے کنول کھل جاتے ہیں
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

انگاروں پہ لوٹ رہا ہوں میں، سرگرم فغاں ہے سوز نہاں
ہر دل میں نہاں بیتابی ہے، ہر روح میں جوشِ رقت ناں
ہر نالہ ہے نشتر زخم جگر، ہر زخم جگر ہے شعلہ فشاں
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے، جب دھیان ترا آجاتا ہے
سر پیٹ کے رہ جاتا ہوں میں، ہر رونگٹا تھرا جاتا ہے
سینے کی فضا میں درد کا بادل جھوم کے لہرا جاتا ہے
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

ہر چند، جو پیدا ہوتے ہیں کہ دنیا میں وہ مرتے ہی نہیں
اجزائے حیاتِ انسانی، تعمیر فنا کرتے ہی نہیں
پھر بھی تو حجابِ ظاہر کے ناسور کبھی بھرتے ہی نہیں
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

اے خوابِ ابد کے متوالے! اللہ کی رحمت ہو تجھ پر
ہر گوشۂ مرقد جنت ہو، یوں بارشِ راحت ہو تجھ پر
انعام و سعود، گراں، پرسش کی نہ ساعت ہو تجھ پر
اُٹھ، دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

کاوش حیدرآبادی

میں اور بچہ

یہاں شہر اور اس کے شور و شغب سے دور، اس راستہ میں جو شاہی محل کو جاتا ہے، اس شاہی محل کو جو کل تک خدیو اسمٰعیل کے لئے تھا اور پھر اس کا نہ ہو سکا، مصری دیوتاؤں کی سرزمین پر، ابزلیس کی وادیوں میں، گرم سیر دریائے نیل کے کنارے جس کی گہرائیوں میں دوشیزگان حسن کی بوسیدہ ہڈیاں دفن ہیں ——— یہاں ایک نغمہ آگیں چمنستان ہے جو ہر آنیوالے کیلئے کھلا ہوا ہے۔ اور اس کی فضاؤں میں غمگین تماشائیوں کے خواب اب تک محفوظ ہیں۔

میں ایک منوّر و روشن دن کی صبح کو وہاں جا نکلی۔ میں نے شہری آداب کو خیرباد کہا اور زمین پر لیٹ گئی جس طرح خانہ بدوش صحرا کے ریت پر لیٹ جاتے ہیں۔ ایک درخت کے سایہ میں سرسبز گھاس پر میں دراز تھی۔ میرے قدموں کے پاس ایک مجسمہ نصب تھا۔

اس وقت مجھے سوائے دو انگریز خواتین کے وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ ان میں سے ایک کے ساتھ تین بچے تھے۔ چند منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ ان میں سے ایک بچہ میرے پاس آنکلا، اس کی عمر کوئی چار سال کے لگ بھگ ہوگی۔ میں نے اس کو آواز دی "یہاں میرے پاس آؤ ننھے!" وہ خوش خوش مسکراتا ہوا میرے قریب آگیا، میں نے اس سے کہا "کیا میری گود میں نہیں آؤ گے؟" وہ خاموشی سے میرے گھٹنے پر بیٹھ گیا۔

جب میں نے اس کے ننھے جسم کا بوجھ محسوس کیا، تو مجھے اپنا مرحوم اکلوتا بھائی یاد آگیا۔ میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا اور آنسو میری آنکھوں میں ڈبڈبانے لگے۔ میں اس بچے کے شیریں رخسارے جلد جلد چومنے لگی۔ اور ان بوسوں سے اپنے اس غم کو بھلانے کی کوشش کرنے لگی جو میرے دل کی گہرائیوں سے اس طرح نکل کر چھا گیا تھا، جیسے کہ کالی گھٹائیں سمندر کے ساحلوں سے اٹھتی ہیں۔

بچوں کے معصوم بوسے کس قدر شیریں ہوتے ہیں!! اور اُن کی مُسکراہٹ کتنی عطر بیز ہوتی ہے!

میں نے اس بچے سے سوال کیا۔ "تمہارا کیا نام ہے، بچے!"

اس نے کہا۔ "روبرٹ"

اس وقت میں نے اس کے چہرے کو بہ نظر غور دیکھا، جس پر انگریزی حسن و جمال کی چمک تھی۔ صاف شفاف چہرہ گویا وہ گلاب اور یاسمین سے گندھا ہوا ایک منجمد مادّہ تھا، جس کو تراش کر ایک انسانی چہرہ بنایا گیا تھا۔ اور گلاب کی پتیوں کا سا نازک دہانہ نزاکت و لطافت کا ننھا گلدستہ تھا۔ اونچی چوڑی پیشانی، جس پر سنہری بال سایہ کئے ہوئے تھے اور آنکھیں، جن میں گہری نیلاہٹ اسی طرح کروٹیں لے رہی تھی جس طرح کہ وہ غروب آفتاب سے پہلے سمندری سطح پر چھائی ہوتی ہے۔ وہ ان بعض انگریزی آنکھوں سے بہت مشابہ تھیں، جو بیک وقت ظاہری انجماد اور باطنی حرارت نیز حلاوت و ملاعبت کی پردہ دار ہوتی ہیں۔ میں نے ان سب علامات کو بہ غور دیکھا، پھر اس بچے سے کہا "روبرٹ! یہ آنکھیں تم کہاں سے لائے ہو؟، اور ان کی نیلاہٹ تم کو کیسے

دی ہے ؟" میرے الفاظ میں سے وہ صرف "دینے" کا لفظ سمجھا۔ جس کو سُنکر اس نے جواب دیا "امی نے !"
میرے مُنہ سے بیساختہ نکلا: خدا تمھاری ماں کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے! تمھارے ابّا کیا کرتے ہیں ؟"
اس نے لکنت آمیز لہجہ میں بڑی مشکل سے جواب دیا "ابّا جان فوجی ہیں، میں بھی ان کی طرح فوجی ہوں !"
میں نے کہا "تم بہت خوبصورت ہو روبرٹ! اور مجھے تم پر بہت پیار آتا ہے۔ لاؤ ذرا اپنا ہاتھ تو دو مجھے !"
بچّوں کے ہاتھ بھی اُن کے تبسم کی طرح شیریں و دلفریب ہوتے ہیں۔ میں نے روبرٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور دستِ قضا و قدر نے خطوط کی صورت میں جو کچھ تحریر کر دیا تھا اُسے پڑھنے لگی۔ وہ ایک مربع بڑی بڑی انگلیوں والا ہاتھ تھا اور اس میں زندگی، عقل اور دل کی لکیریں ظاہر و واضح تھیں۔ مریخ کا اُبھار خطرناک حد تک اس ننھے ہاتھ میں نمایاں تھا...
میں نے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا:۔
"یہ وہ ہاتھ ہے جس کے خطوط آج فرشتوں کے پوشیدہ اشاروں کا پتہ دے رہے ہیں، یہ وہ ہاتھ ہے جو ہمیشہ صرف خوشبوؤں اور پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے کیلئے بڑھیں گے۔ یہ ننھا سا خوبصورت ہاتھ عنقریب ایک فوجی کا ہاتھ ہوگا، عنقریب اس ہاتھ میں تلوار اور جنگی ہتیار ہوں گے اور آتشیں گولے توپوں کے دہانے سے فضا میں پھینکے گا، عنقریب یہ انسانی زندگیوں کو فنا کریگا، خواہ وہ شریر ہوں یا نیک . . . . !"
روبرٹ نے سبز گھاس کو اپنے پاؤں سے رگڑتے ہوئے پھر کہا ——— "میں بھی ابّا کی طرح فوجی ہوں !"
میں نے کہا: "ہاں، روبرٹ! جب تم اس عمر کو پہونچ گے تو یقیناً فوج میں ہو جاؤ گے۔ تم عنقریب اپنے فوجی لباس میں خوبصورت معلوم ہو گے ——— بہت ہی خوبصورت، لیکن اتنے نہیں جتنے کہ تم آج لباسِ طفلی میں حسین معلوم ہو رہے ہو۔ عنقریب عورتیں تم کو دیکھکر شکر ادا کریں گی، چونکہ وہ سپاہیوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ اور آستینوں اور سینہ کے زرّیں نشانات ان کو خوابوں کی دُنیا میں لے جاتے ہیں۔ یہ ننھے ننھے کمزور ہاتھ بڑے مضبوط ہو جائیں گے جو ایذا پہنچائیں گے تکلیف دیں گے اور موت کے گھاٹ اتاریں گے، یہ ہاتھ عنقریب تخریب و بربادی کے آلات کو پورے پورے عزم و استقلال سے دبوچ لیں گے۔ تمھاری یہ خوبصورت آنکھیں اس جلّاد کی آنکھیں ہو جائیں گی جو خون اور آنسوؤں کے دریا بہتے ہوئے دیکھتا ہے اور اس کے دل میں رحم یا نرمی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور تمھارا دل! تم دیکھو گے کہ اس دل کی کیا حالت ہو جائیگی، جو آج ادراک اور شعور سے کتنا کم بہرہ مند ہے : . . . . . . !
"تم ان لوگوں میں سے ہو گے، جو زندگی میں جذبات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، جو عیش کرتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں، مزے اڑاتے ہیں، رنج و غم سے دوچار ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ متضاد کیفیتیں ان پر کوئی اثر نہیں چھوڑتیں، بلکہ مسرتیں اور مصائب ان پر سے اس طرح گذر جاتے ہیں جیسے بادل کے قطرے کسی شیشہ کی سطح پر گرتے ہیں اور اس پر کوئی اثر نہیں چھوڑتے . . . . ؟
یا ان انسانوں میں سے جن کا شعور و احساس تیز ہوتا ہے اور اس کے برعکس وہ کبر و خیالات کی وجہ سے پُشت گردانی کرتے ہیں۔
. . . . . . کسی عورت کے ہاتھ کا لمس کبھی تمھاری آنکھوں میں محبت کے آنسو پیدا، یا تمھارے دل میں ناامیدی کا خنجر پیوست کر سکے گا!

"سنو، روبرٹ! عنقریب تمہارے جسم اور روح میں بالیدگی پیدا ہو جائے گی، عنقریب تم انسانی کیفیات سے دوچار ہو گے اور اپنے کو زندگی کے میدان میں اکیلا پاؤ گے، عنقریب تمہیں احتیاج مبتلائے آلام اور جدوجہد مجبور کریگی، افکار کے شعلے تمہیں ایذا پہنچائیں گے اور رنج و غم کی آگ تمہیں پگھلا کر رکھ دیگی۔ عنقریب تمہیں معلوم ہوگا کہ روح کی پیاس کیا چیز ہے؟ عنقریب تم ایک مکمل انسان ہو جاؤ گے اُف! کتنا ہولناک لفظ ہے! ...... عنقریب تم انسان ہو جاؤ گے یعنی حیوان بھی اور خدا بھی ...."

میں بہت دیر تک خاموش رہی۔

اور اس پُرسکون لمحے میں جو فطرت کی گود میں گذر رہا تھا ایک شیریں نغمہ یکایک باغ کے قریب سے بلند ہوا اور اسکا تموج پھولوں کی خوشبو پر چھا گیا۔ یہ مؤذن کی آواز تھی جو ظہر کی اذان دے رہا تھا، یہ وہی الفاظ تھے جو اس نے صبح ہوتے ادا کئے تھے۔ اور غروب آفتاب کے وقت پھر دُہرائیگا۔

میں نے پوچھا "تم نے کچھ سُنا روبرٹ!"

اس نے جواب دیا "جی ہاں"

میں نے کہا "عنقریب تمہیں معلوم ہوگا کہ مذہب کیا چیز ہے، عیسائیت کیا ہے، اسلام کسے کہتے ہیں۔ عنقریب تم سمجھ سکو گے کہ مذہبی، جنسی، علمی، خاندانی اور انفرادی تعصب کیا ہے۔ عنقریب تمہیں معلوم ہوگا کہ جس کپڑے سے لباسِ عروسی تیار ہوتا ہے اسی سے شہیدوں کے کفن بنتے ہیں۔ عنقریب تم قوموں کو دیکھو گے کہ وہ دوسری اقوام کی جان و مال کے درپے ہیں صرف اس لئے کہ وہ اس کپڑے کے ٹکڑے کے گرد جمع ہیں جس کا رنگ اُن کے رنگ سے مختلف ہے۔ عنقریب تم یہ سب کچھ دیکھو گے، روبرٹ! اور بذاتِ خود اس میں حصّہ بھی لو گے چونکہ تم اپنے باپ کی طرح فوجی ہو!"

بغیر پیار کئے اور بغیر رسمی الفاظ ادا کئے میں روبرٹ سے جُدا ہو گئی۔

میں نے اس لئے اُسے پیار نہیں کیا کہ مستقبل کے انسان کیلئے میں دہشت زدہ سی ہو گئی تھی اور اس نے مجھے اس لئے بوسہ نہیں دیا کہ میں نے اُسے بسکٹ یا مٹھائی نہیں دی تھی ....

(آئنسہ مَی) ——— صلاح الدین قریشی

آپ نہ بدلے دُنیا بدلی

دل میں پھر اک ہوک سی اٹھی — کس نے چھیڑا سازِ ہستی
لب پر آئی یاد یہ کس کی — صورت بھولی، باتیں میٹھی
آن نہ کوئی وفا سے خالی — اُٹھتے "جانی" بیٹھتے "پیاری"
دل میں اُمنگ اور آنکھ میں مستی — کتنی خوش تھی اپنی بستی
ہم ہیں وہی، پر بات ہی بگڑی — کیا ہوئی دُنیا کیا سے کیا تھی
خوش رہیں آپ، دُعا ہے اپنی — بند نہ ہو یہ موت کی ہچکی
غیر، نہ اپنا، کوئی نہ ساتھی — شکوہ کس کا، شکایت کس کی

آپ نہ بدلے، دُنیا بدلی

بدری برسے، بجلی کڑکے — کون سا دن تھا، آپ نہ آئے
اپنے، پرائے، کس نے چھوڑے — کس کے جلوے پیشِ نظر تھے
ٹیڑھی نظر سے کوئی جو دیکھے — آنکھ سے کس کی نکلے شرارے
خوش تھے اداسی، روٹھے حیا کو — وہ بھی عجب تھے عشق کے غمکدے
"پیت کے آگے مذہب کیا ہے" — "نٹ" تھی پنڈت "پیر" تھے "غنڈے"
کام سے چھوٹے، گھر کو پہنچے — گھر سب ڈھونڈھا، دیکھ نہ پائے
ہم نے بھی ڈوری پیت کی ڈالے — چُھپ کر دیکھا، پاس نہ آئے
تھک کر بیٹھے، پھر ہم نکلے — روٹھ کے بولے "رہنے بھی بس دے"
سامنے جا کر ہاتھ جو جوڑے — ہنس کر بانہیں گلے میں ڈالے
چھیڑ کو بھولے یاد سے پہلے — پھر تو ہم تھے، پریم کے جھولے
آہ! وہ دن اک خواب سے نکلے — جیون نیا جل میں ڈوبے
یارب وہ بھی ہوا تھی، کیا تھی — شکوہ کس کا، شکایت کس کی

آپ نہ بدلے، دُنیا بدلی

اب تو جی کی آس نہیں جب — یوں بھی دل کچھ اُداس نہیں جب
قدرِ شکر و سپاس نہیں جب — اُس کے نام کو پاس نہیں جب
دل میں جاں کا قیاس نہیں جب — من میں اپنے ہراس نہیں جب
دل سی دولت پاس نہیں جب — اپنے پیا کی آس نہیں جب
رونا ہنسنا، راس نہیں جب — پیت سی گل میں باس نہیں جب
مرنا کہاں کا، الفت کیسی — شکوہ کس کا، شکایت کس کی

آپ نہ بدلے دُنیا بدلی

لپٹے گُل بلبل سے چٹک کر — باس ملے اُلفت کی مہک کر
قمری سرو پہ آئے چہک کر — چاند کو دیکھے کبک مٹک کر
شمع و پتنگا مرے بلک کر — کوئی جلدی، کوئی سسک کر
جوش پہ آئے ندی بھٹک کر — گلے ملے دریا سے لپک کر
کس کی پھوٹیں آنکھیں تک کر — کون کرے اک بات ہٹک کر
شیشہ نہ ٹوٹا، ہائے ٹپک کر — رہ گئی دل میں پھانس اٹک کر
قسمت جس کی ہووے جیسی — شکوہ کس کا، شکایت کس کی

آپ نہ بدلے، دُنیا بدلی

جان کو رو نہیں کھونا کب تک — دھار پہ تیغ کی سونا کب تک
راتوں کو اُٹھ کر رونا کب تک — دامن یوں ہی بھگونا کب تک
ہجر کے تیر چبھونا کب تک — داغ یہ دل کے دھونا کب تک
اشک کے دانے بونا کب تک — عشق کا حاصل ہونا کب تک
پیت کا گائیں لوٹنا کب تک — دل کا بنائیں کھلونا کب تک
بس بھی کرے دل، ہو گئی ہونی — شکوہ کس کا، شکایت کس کی

آپ نہ بدلے، دُنیا بدلی

غم نہیں اس کا دل جو ٹوٹا — کب تھا یہ، اور کب ہے اپنا
مال یہ غیر کے اپنا بس کیا — بھینٹ تھا جس کی، اس پہ چڑھایا
ختم ہوا جب کام ہی اپنا — دُنیا سے پھر چلنے کا غم کیا
مل کے بچھڑنا غم سے تڑپنا — الفت کا اک کھیل ہے ادنیٰ
کس نے سدا کو سُکھ ہے دیکھا — ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے دُنیا
دل کو کھو کر حق کو پایا — الفت کا یہ راز تھا سچّا
عشق و محبت نیند تھی گویا — مرگ ہے جس کا میٹھا سپنا
تیرے کرم کی آس خدایا — پیت نہیں تو موت ہے جینا
موت کو ہم نے شوق سے پایا — آپ کے دشمن کیوں ہوں رُسوا
"چین" کہاں جب دل کو روندا — آپ نہ کیجئے اس کا خدشا
موت نے میٹھی نیند سُلا دی — شکوہ کس کا، شکایت کس کی

آپ نہ بدلے، دُنیا بدلی

سید شاہد علی، ایم اے

"سنو، روبرو
ہو گئے اور اپنے کوز"

شعلے تمہیں ا

عنقریب

تیرے بغیر

بے وفا ہے بہار بوستاں تیرے بغیر
آ کہ باغِ زندگی میں ہے خزاں تیرے بغیر

بے مزہ ہے محفلِ کون و مکاں تیرے بغیر
مجکو سُونی ہے فضائے دو جہاں تیرے بغیر

چین دل میں، نیند آنکھوں میں کہاں تیرے بغیر
خوابِ شیریں بھی ہے اک خوابِ گراں تیرے بغیر

مضطرب ہے مضطرب عمرِ رواں تیرے بغیر
غیر ممکن ہے سکوتِ جاوداں تیرے بغیر

ہر نفس کی آمد و شد، اک دکاوش کی دلیل
موجِ بوئے گل ہے زنجیرِ گراں تیرے بغیر

تو نہیں تو دل کی بستی میں اُجالا ہی نہیں
تیرہ و تاریک ہے کون و مکاں تیرے بغیر

ہم رکابی میں تری صحرا بھی ہے اک گلکدہ
کاٹنے کو دوڑتا ہے بوستاں تیرے بغیر

آتشِ سیّال رقصاں ہے مرے دل میں کہ آج
ہر رگ و پے میں ہے اک برقِ تپاں تیرے بغیر

چاندنی راتوں کی یہ سرمستیاں بے کیف ہیں
بے مزا ہے ماہتابِ ضوفشاں تیرے بغیر

سیکڑوں سجدے تڑپتے ہیں جبینِ شوق میں
ننگِ سجدہ ہے زمینِ آستاں تیرے بغیر

نغمۂ ہستی، فروغِ زندگی، بزمِ حیات
بے حقیقت سی ہے ساری داستاں تیرے بغیر

فرحتؔ مہجور اسیرِ کلبۂ احزاں میں ہے
کس کو ہے توفیقِ سیرِ بوستاں تیرے بغیر

فرحت کانپوری

محبوب کی آمد پر

مرے چمن کی روش روش پر بہار آئی، بہار آئی
تڑپتے قلب و جگر پہ چھائی، قرار لائی، قرار لائی!

سکوں کے زندہ و روح افزا سائے پھیلے، نظر کی حد تک
ترے خیالوں کی کیف پاشی اُمنڈ کے پہنچی، جگر کی حد تک

(۲)

بھلا دیا ہے ترے تغافل نے وجد میں آ کے شعر کہنا
نہ یاد تھا مستِ کیف رہنا، نہ یاد تھا، دل کی رَو پہ بہنا

ملال چھایا ہوا تھا، میرے خیال کی ضو فشانیوں پر
پڑے ہوئے تھے فسردہ سائے سرد رگوں زندگانیوں پر

امید ڈوبی ہوئی تھی، افسردگی کے سادہ سی مُردنی میں
مرے نظارے کا ذرہ ذرہ غروب تھا، میری بیکسی میں

وہ وقت کچھ اس طرح جگر سوز تھا کہ بس جانتا ہی، دل ہی
نہ رُوح کو کچھ سکون تھا اور نہ زندگی میں تھی، وہ جوانی

نہ شوق زا تھیں، نگہ کی کیفیت اثر خوش جمالیاں ہی
نہ کیف انگیز تھیں، میرے عشق کی شگفتہ خیالیاں ہی

(۳)

نشاط اب چھا رہا ہے، منظر کی زرد زرد خوشگواریوں پر
خیال اب مسکرا رہا ہے، فسردگی کی فگاریوں پر

طرب نظر ہو گیا ہوں میں اب سرور بن کے ہو نیہ چھا رہا ہے
نشے کا طوفان اُڑ رہا ہے سرور پر جھوم آ رہا ہے!

ہوا ہے ماحول کیف آگیں ـــ تصوروں کو جمال بدلے
ترے خیالوں کی کیف باری نے میرے دل کو خیال بدلے

مرے فسردہ و زرد گلشن کی کیف پرور بہار ہے، تو
ہوا ہوں بیخود ـــ میں جس نشہ سے اسی نشہ کا خمار ہے تو

[illegible]
ششماہی تین روپے۔ فی پرچہ ۸ آنے

جرعات

تالک فہرست بارہ شلنگ
نمونہ کا پرچہ مفت بھیجا جاتا ہے

جلد ۱۶ | ساقی دھلی بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء | نمبر ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

خدا کا شکر ہے کہ اس پرچے کے ساتھ ساقی اپنی عمر کا آٹھواں سال پورا کر رہا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں خاص نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ جنوری میں سالنامہ اور جولائی میں افسانہ نمبر شائع ہوئے۔ ان دونوں کی مجموعی ضخامت پانسو صفحے سے زیادہ تھی۔ معمولی پرچے چھیانوے چھیانوے صفحے کے شائع ہوئے۔ اس طرح ۱۹۳۷ء میں ساقی نے تقریباً پندرہ سو صفحے پیش کئے۔ مضامین کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اردو کے بہترین انشا پردازوں نے ساقی کو نوازا۔ سب سے پہلے مولانا عنایت اللہ دہلوی شکریہ کے مستحق ہیں کہ ۱۹۳۷ء میں شیکسپیر کے دو ڈرامے ہیملٹ اور ٹیمپلین اور ڈاکٹر جانسن کا فلسفیانہ ناول راسیلاس اردو میں منتقل فرمایا اور انہیں پیش کرنے کا فخر ساقی کو حاصل ہوا۔ ان کے بعد حضرت ایم۔ اسلم، مسٹر صادق الخیری، مسٹر اختر حسین رائے پوری، اور پریم پنجاری کا میں شکر گزار ہوں کہ ساقی کیلئے بہت اچھے اچھے افسانے ان حضرات نے لکھے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اردو شاعری اور غزل گوئی پر نہایت بصیرت افروز مضامین تحریر فرمائے۔ ساغر جعفری صاحب نے پریم کہانیوں کا دلکش سلسلہ ساقی میں شروع کیا اور ابھی جاری رہیگا۔ فرخندہ اختر بیگم نے لیمب کی کہانیوں کے کئی عمدہ تراجم پیش کئے۔ حجاب امتیاز علی صاحبہ کے افسانے اور ادب پارے بہت پسند کئے گئے۔

ساقی کے بعض اُن خریداروں کو جو ۱۹۳۰ء سے ساقی کے خریدار ہیں یہ شکایت ہے کہ ساقی اب وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ اس کا مجھے بھی اعتراف ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز بدلتی رہتی ہے اور ہمیں اگر زندہ رہنا ہے تو زمانے کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی چلنا پڑے گا۔ جمود و سکون کو موت اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ زندہ اور پائدار ادب پیش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ترقی پسند ہوں۔ آٹھ سال کے عرصے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ ساقی کوئی ترقی بھی نہ کرتا اور زندہ بھی رہتا؟ ہماری ضروریات بدل گئیں۔ ہمارے نظریے بدل گئے۔ پہلے عشقیہ کہانیاں اور غزلیں ہمیں بہت پسند تھیں۔ مگر اب بھوک اور افلاس، غلامی اور آزادی، سماج اور تہذیب، اور اسی نوع کے ضروری مسائل نے ہماری تمام تر توجہ جذب کر لی ہے۔ ادب تو زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ پیشِ نظر مسائل کا عکس ہمارے ادب میں نظر آنا ضروری ہے۔ بس اسی قسم کی چند وجوہ ہیں جن کی وجہ سے ساقی اب وہ نہیں رہا جو ۱۹۳۰ء میں تھا۔ تصاویر کی اشاعت پر بھی زیادہ زور نہیں دیا گیا۔ ان کی بجائے ساقی کی ضخامت میں سولہ صفحے کا اضافہ کر دیا گیا۔ ادبی حلقوں میں اس تجویز کو پسند کیا گیا۔

ساقی کے مستقل خریداروں کو انکا چندہ ختم ہونے سے ایک مہینہ پہلے اطلاع دیدی جاتی ہے تاکہ وہ آئندہ کیلئے خریداری یا عدم خریداری کے متعلق دفتر کو مطلع کر دیں مگر بہت کم حضرات اس ضروری امر کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ سہولت اور کفایت تو اسی میں ہے کہ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیا جائے۔ کیونکہ وی۔ پی۔ کی صورت میں چار آنے کی مزید زیر باری خریدار کو ہوتی ہے۔ جو حضرات ساقی آئندہ اپنے نام جاری رکھنا نہیں چاہتے اگر اطلاع نامہ پاتے ہی دفتر کو ایک ایک کارڈ لکھدیں تو ساقی ایک کثیر رقم کے نقصان سے بچ جائیگا۔ امید ہے کہ خریدار حضرات توجہ فرمائیں گے۔

شاہد

اُردو کی مثلیں اور اُن کی کہانیاں

اُردو کی بہت سی مثلیں دوسری زبانوں کی مثلوں کی طرح قصے کہانیوں یا واقعات سے نکلی ہیں۔ کچھ ان میں سے ایسی ہیں کہ اُن کا قصہ کم و بیش ان کے الفاظ ہی سے سمجھ میں آجاتا ہے جیسے مت کر ساس بُرائی آگے تیرے بھی جائی۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں، دُھوبی کا کُتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ مگر کچھ مثلیں ایسی بھی ہیں کہ اُن کا قصہ اُن کے الفاظ سے سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسی مثلوں کے قصے روز بروز بھولتے بسرتے ہیں۔ اور یہ ایک ادبی نقصان ہے۔ بولنے کو یہ مثلیں لوگ کم و بیش بولتے ہیں۔ اور سُننے والے اُن کا مدعا بھی سمجھ لیتے ہیں۔ مگر عُموماً دونوں نہیں جانتے کہ مثل بنی کیسے تھی۔ آج ہم ایک ایسی مثل اور اس کا قصہ بیان کرتے ہیں۔

کہتے ہیں "بس آنکھوں کی سوئیاں اور رہ گئیں ہیں" یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں کہ کوئی کام تھوڑا سا رہ گیا ہو اور اسے لگے ہاتھوں کر ہی لینا چاہئے ورنہ اندیشہ ہے کہ ساری محنت بیکار جائے اور پچھتانا پڑے۔ دیکھئے کہاں یہ الفاظ کہاں یہ معنی مگر وہ کہانی سُنئے جس سے یہ مثل نکلی ہے۔ الفاظ و معنی کا ربط سمجھ میں آجائیگا۔

کہانی یوں ہے۔ کسی مُلک میں تھا کوئی بادشاہ، ہمارا تمہارا خُدا بادشاہ۔ ایک دفعہ وہ شہر سے شکار کو نکلا۔ بادشاہ بیگم اور اپنی اکلوتی بیٹی کو بھی ساتھ لیا۔ امیر، وزیر، فوج فرّہ، نوکر چاکر، خدم حشم ہمرکاب ہوئے۔ ابھی جھٹپٹا ہی تھا کہ شکار گاہ میں جا پہنچے۔ یہاں ہر قسم کے شکار کی کثرت تھی۔ شکار کا اذن عام دے کر بادشاہ، بادشاہ بیگم اور شاہزادی نے بھی اپنے گھوڑوں کی باگیں اٹھائیں۔ چند امیر نامدار اور خاصہ بادشاہی کے سوار پیچھے پیچھے چلے۔ یہ سب شکار کھیلتے ہوئے ایک طرف کو بڑھے چلے جا رہے تھے کہ بادشاہ کی نظر ایک ہرن پر پڑی۔ اس کے سینگ سُنہری تھے۔ بادشاہ بیگم اور شہزادی نے بھی اسے دیکھا۔ تینوں نے اپنے گھوڑے اس کے پیچھے ڈالے کہ تین طرف سے دبا کر اس کو کمند سے پکڑ لیں۔ گھوڑے ان کے ہوا ہو کر اُڑے۔ ساتھی سارے پیچھے رہے۔ اور یہ تینوں کہیں سے کہیں نکل گئے۔ ہرن بار بار کمند کی زد پر آکر تیر پرتاب سے بھی دُور نکل جاتا تھا۔ مگر نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ تینوں شکاری اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر بہت دور نکل گئے۔ اور ایک لق و دق بیاباں میں جا پڑے۔ اب جو دیکھا تو ہرن کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بہت گھبرائے۔ باگیں موڑیں تو راستہ نہ ملا۔ جتنے چلے اپنی شکار گاہ سے دُور ہوتے چلے گئے۔ راستہ کی تلاش میں یونہی [illegible]مار چلے جاتے تھے۔ کہ دور سے ایک سیاہی سی نظر آئی۔ سمجھے کوئی آبادی ہے۔ وہاں سے رستے کا پتہ ملے گا۔ چلا چل [illegible] پہونچے تو دیکھتے کیا ہیں ایک قلعہ کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ اندر باغ لگا ہے اور پھاٹک اُس کا کھلا ہے۔ سامنے ہی آبدار خانہ ہے۔ کورے کورے گھڑے پانی سے بھرے سُرخ سُرخ بستنیوں سے لپٹے سُنہری کٹوروں سے ڈھکے رکھے ہیں۔ شکاریوں کا جی چاہا دندناتے ہوئے باغ میں گھس جائیں۔ گھڑوں پر جا پڑیں اور ڈگڈگا کر خوب پانی پئیں۔ مگر پھر کچھ سوچکر بادشاہ نے اپنی باگ روکی، بادشاہ بیگم جھکی شہزادی ان کے دل کے خطرے کو سمجھکر خود اپنے گھوڑے

سے اُتری اور بولی:-

"حضور، یہیں ٹھہریں میں اندر جاکر پانی اور قلعہ کی خبر لاتی ہوں بادشاہ اور بادشاہ بیگم" ہائیں ہائیں" کرتے ہی رہے کہ شہزادی قلعہ کے دروازے کے اندر تھی۔ مگر وہ دروازہ کے اندر پہونچی تھی۔ کہ ایک دہماکہ ہوا اور پھاٹک قلعہ کا بند ہوگیا۔ اب تینوں کے حواس گم عقل غائب۔ ہرچند اندر باہر سے تدبیریں کیں اِدھر اُدھر پھرے کہ کہیں کوئی جگہ چڑہنے اُترنے کی ملجائے مگر بیکار۔ پھاٹک سے لگے تینوں اندر باہر کھڑے روتے تھے اور کچھ نہ کرسکتے تھے۔ سُورج سر پر آنے لگا تو شہزادی نے ہمّت کرکے بادشاہ اور بادشاہ بیگم سے کہا کہ "حضور اب خیر سے سدھاریں۔ مجھے میری قسمت پر چھوڑیں۔ حضور کے اب یہاں ٹھیرنے میں سراسر نقصان بلکہ جانوں کا زیان ہے۔ کوئی دم جاتا ہے کہ آسمان یہاں آگ برسائے گا۔ اور زمین شعلے اُگلے گی۔ ابھی وقت ہے۔ اور اُمید تھی کہ اللہ آپکو خیر سے اپنی ولایت میں پہونچادے۔ وہاں سے آپ میرے لئے بھی بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ میں یہاں بہرحال ایک مکان میں ہوں۔ باغ میں کھانے پینے کو کچھ مل ہی جائے گا۔" ماں باپ کا جی نہ چاہتا تھا۔ کہ لختِ جگر بیٹی کو یوں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر کرتے کیا۔ اپنی مجبوری اور بیٹی کے اصرار سے وہ روتے دھوتے وہاں سے چلے کہ شاید کوئی راستہ مل جائے اور وہ اپنے شہر میں پہونچ جائیں تو بیٹی کی رہائی کی کوئی تدبیر کریں۔

ماں باپ کے رُخصت ہونے پر شہزادی پہلے تو بہت روئی بیٹی۔ پھر سوچی جو پڑی ہے بُھگتنی ہی پڑیگی چلو دیکھیں تو یہ باغ کیسا ہے۔ اور حال اس کا کیا ہے۔ چل پھر دیکھا۔ تو سمجھی یہ کوئی شاہی قلعہ اور شاہی باغ ہے۔ اندر اس کے بڑی سی محل سرا ہے۔ دونوں پہلوؤں میں اس کے تمام شاہی کارخانے موجود ہیں۔ جو ہر قسم کے ساز و سامان اور ضروریاتِ زندگی سے بھرپور ہیں۔ اور پھر ہر چیز نئی اور تازہ ہے۔ مگر میر سامان و سربراہ کار بلکہ جاندار وہاں کوئی نہیں ہے۔ یا سب تھے اور پتھر کے ہوگئے ہیں۔ یہ دیکھ دیکھ کر وہ حیران تھی کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے میں جاگ رہی ہوں یا خواب دیکھ رہی ہوں یا دیوانی ہوگئی ہوں۔ یونہی پھرتی پھراتی وہ ایوان خوابگاہ میں پہونچی اور سہم کر رہ گئی۔ دیکھتی کیا ہے۔ ایک نوجوان شاہانہ شکل و صورت کا ایک زرنگار مسہری پر لیٹا ہے اور بدن اُس کا سارا سوئیوں سے بندھا ہے۔ بہت دیر تک سہمی ہوئی اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ڈرتی ڈرتی آگے بڑہی۔ آپ ہی آپ زور زور سے باتیں کرنے لگی۔ پاؤں سے دھم دھم کیا۔ کہ سونے والا جاگ اُٹھے مگر بیداری کی کوئی علامت نہ پائی۔ سمجھی مرچکا ہے۔ کان دل سے لگا کر سُنا۔ تو معلوم ہو زندہ ہے مگر سکتہ ہے۔ اللہ نے اُس کے دل میں رحم ڈالا۔ یہ کہہ کر بیٹھ گئی۔ آؤ اس غریب کی سوئیاں نکالیں شاید زندہ ہوجائے اجر نہ سہی نیکی تو کہیں نہیں گئی ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے سوئیاں نکالنی شروع کیں۔ لیکن یہ کوئی دو چار پہر کا کام نہ تھا۔ اس لئے وہ روز سوئیاں نکالتی تھک جاتی تو باغ کی سیر کرتی۔ کھاتی پیتی اور آرام کرتی۔ ایکدن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ وہ محلسرا کی چھت پر کھڑی ہوا کھارہی تھی۔ دیکھتی کیا ہے۔ کہ ایک قافلہ بردہ فروشوں کا زیرِ دیوارِ قلعہ ٹھیرا ہوا ہے۔ اس نے ایک بردہ فروش سے بات چیت کرکے ایک ملوک سی لونڈی خرید لی۔ یوں تنہائی کا بھی غم غلط ہوگیا۔ مگر سونے والے کی سوئیاں خود ہی نکالتی تھی۔ کیونکہ رفتہ رفتہ رحم کی جگہ اب اس کے دل میں محبّت نے لے لی تھی۔ آخر شدہ شدہ وہ دن آیا۔ کہ سونے والے کی صرف آنکھوں

سوئیاں رہ گئیں۔ شاہزادی نے دل میں کہا اب بات ہی کیا ہے۔ آؤ پہلے ذرا نہالیں پھر یہ سوئیاں نکالیں گے۔ لونڈی کو خوابگاہ میں چھوڑا اور خود حمّام میں چلی گئی۔ بیٹھے بیٹھے لونڈی کے جی میں آئی۔ یہ سوئیاں میں ہی کیوں نہ نکال دوں۔ ابھی شہزادی نہادھو کر آنے نہ پائی تھی۔ کہ لونڈی نے سونے والے کی آنکھوں کی سوئیاں نکالدیں۔ سوئیوں کا نکالنا تھا کہ سونے والا کلمہ پڑھتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اور اُس نے لونڈی سے پوچھا تم کون ہو؟ کہا حضور کی خدمتگار لونڈی۔ اُس نے کہا اب تم خدمتگار نہیں میں تمہارا خدمتگار ہوں۔ تم نے مجھے مُردہ سے زندہ کیا ہے۔ دونوں میں یہ باتیں ہورہی تھیں۔ کہ شہزادی بھی نہادھوکر آگئی۔ نوجوان نے لونڈی سے پوچھا یہ کون ہیں؟ لونڈی نے جواب بیگم۔ بنا چاہتی تھی ناک مُنہ چڑھا کر جواب دیا میری بندور ہے۔ شہزادی کے دل میں ایک برچھی سی لگی اور کلیجہ سے پار ہوگئی۔ وہیں سے وہ اُلٹے پاؤں پھری۔ اور پھر اُدھر کا رُخ نہ کیا۔ یہ جوان جس کا حال تم نے سُنا ایک شہزادہ اور اپنے باپ کا ولی عہد تھا۔ اور یہ باغ و قلعہ دارالسلطنت تھے اور اس کا خاص رمنہ تھا۔ کبھی کبھی وہاں جاتا اور تنہائی کا لُطف اُٹھاتا۔ ماں اس کی سوتیلی تھی۔ اس کو دیکھ دیکھ کر جلتی اور اُس کا ولی عہد سلطنت ہونا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اِس پے اُس نے جادو کے زور سے شہزادے اور اس کے رفقا کا یہ حال بنادیا تھا۔ اب جو شہزادہ اچھا ہوا تو اس کے سارے دوست اور نوکر چاکر بھی جو پتھر کے ہوگئے تھے زندہ ہوگئے۔ اور سارے کارخانوں کی سربراہی ہونے لگی۔ اور لونڈی بیگم بن بیٹھی اور نابکار نے شہزادی کو حکم دیا کہ صبح و شام کو کوّے باغ میں آکر کائیں کائیں کرتے شور مچا کر ہمارے آرام میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ تم ان کو دن کو اُڑایا کرو۔ خبردار غفلت نہ ہو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ اب تم کچھ دنوں شہزادی کو کوّے اُڑانے اور اپنی غلطی کا خمیازہ اُٹھانے دو اور یہ دیکھو کہ لونڈی اب اپنے کئے کی کیا سزا پاتی ہے۔ خُدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

شہزادہ سوئیوں سے نکلا تو اُس کے دل میں یہ ترنگ آئی کہ باپ کی خدمت میں حاضر ہونیسے پہلے اِدھر اُدھر کا ایک سفر کرے۔ ارادے کی دیر تھی سب تیاریاں ہوگئیں چلتے چلتے شہزادے نے بیگم اور قلعہ والوں سے پوچھا کہ اُن کیلئے سفر سے کیا کیا لائے۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ کگ مار لونڈی کی نوبت آئی تو اُس نے کہا کہ میرے لئے سُسن گڑیوں کا صندوق لایئے گا۔ شہزادہ اچھا کہتا ہوا سوار ہوگیا۔ اب خُدا کا کرنا دیکھو کہ وہ پھرتا پھراتا اُسی شہر میں کیوں نہ جانکلے جہاں شہزادی کا باپ تھا۔ وہاں سے چلنے کا وقت آیا تو شاہزادہ مع اپنے رفیقوں کے جہاز میں آکر سوار ہوا۔ ملاحوں نے جہاز کے بادبان کھولے اور لنگر اُٹھایا مگر جہاز کسی طرح نہ چلا۔ جہاز کا کپتان چلاّیا۔ جہاز میں کوئی گنہگار جھوٹا آدمی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا ہے۔ آج تم سب جہاز سے اُتر جاؤ۔ جہاز چار دن میں چلے گا۔ جو خطاوار ہے وہ ہمارے جہاز پر نہ آسکے۔ اب شہزادے کو یاد آیا کہ کگ مارنی سے ہم نے سسن گڑیوں کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اب تک نہیں لی ہیں۔ جہاز سے اُترتے ہی اُس نے شہر کو آدمی دوڑائے شہر میں کسی نے سسن گڑیوں کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ لوگوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ قضا را یہ بات کہیں ایک بڑھیا کے کان میں پڑ گئی۔ یہ شاہزادی کی دداتھی۔ وہ جانتی تھی کہ سسن گڑیوں کا صندوقچہ اس کی شہزادی کے لئے بنا تھا۔ جو گم ہوگئی ہے۔ وہ دوڑی ہوئی بادشاہ بیگم کے پاس پہونچی اور سارا ماجرا بیان کیا۔ بادشاہ بیگم نے سُسن گڑیوں کا صندوقچہ ددا کے ہاتھ شہزادے کے آدمیوں کو بھجوادیا اور جاسوس انکے پیچھے لگادیے۔

شہزادہ سُن گڑیوں کا صندوقچہ لے کر پھر جہاز پر سوار ہوا۔ جہاز اس دفعہ لنگر اُٹھاتے ہی چل پڑا اور شہزادہ چند روز میں اپنے قلعہ میں جا پہونچا، سب کو اُن کی سوغاتیں دیں اور سن گڑیوں کا صندوقچہ گُل مارنی کے حوالے کیا۔ یہ صندوقچہ طلسمات کا صندوقچہ تھا۔ بادشاہ زادی جب رات کو تنہا ہوتی اپنا صندوقچہ کھولتی اس کے کھُلتے ہی ایک باغ سراپا بہار نمودار ہوتا۔ جاروب کش آکر جھاڑو دیتے۔ سقّے چھڑکاؤ کرتے۔ فراش فرش فروش بچھاتے قنات شامیانے لگاتے بارگاہ نصب کرتے۔ تخت بچھتا مسندیں لگتیں۔ نقیب ہرکارے گرز بردار چوبدار آ آکر قرینے سے کھڑے ہوتے۔ پیادے۔ سوار۔ سپہ سالار، علما، حکما، فضلا، اطبا، امیروں، امیرزادے۔ وزیر، وزیر زادے اور شہزادے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوتے بادشاہ کی سواری آتی یہ سب کورنش آداب بجالاتے دربار شروع ہوتا، پریوں کے تخت اُترتے۔ اور ناچ رنگ ہونے لگتا۔ شہزادی یہ تماشہ دیکھتی خوش ہوتی اور اپنا غم بھول جاتی۔ قلعہ میں روز طلسمات کا یہ تماشہ ہونے لگا تو لوگوں کو اس کا پتہ چل گیا۔ خبر شدہ شدہ شہزادے تک پہونچی۔ اس نے لونڈی بیگم سے چرچا کیا۔ لونڈی نے شہزادے کو تو جُل دیا۔ اور شاہزادی کو قلعہ سے نکالنے کی تدبیریں کرنے لگی۔ اتنے میں شہزادے نے کہیں سے چھُپ کر یہ تماشا خود جا دیکھا۔ دن ہوا تو اُس نے گُل مارنی کو اپنے پاس بُلا کر اُس کا سن گڑیوں کا حال پوچھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ وہ شہزادی ہے کیسے وہاں پہونچی۔ اس کی سوئیاں نکالنے میں کتنی مصیبت اُٹھائی۔ اور کس طرح اس کی ایک زر خرید لونڈی آنکھوں کی چار سوئیاں نکال کر بیگم بن بیٹھی ہے۔ اس پر شہزادے کو بڑا غصہ آیا۔ اُس نے حکم دیا کہ اس نابکار لونڈی کو نفوتے تیروں سے اُڑا دیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور نیکی نیک را بدی پیش راہ جو ایک مثل ہے پوری ہو کر رہی۔ اتنے میں جاسوسوں نے شہزادی کا حال اُس کے باپ کو جا سُنایا۔ شہزادے کی سوتیلی ماں بھی مر گئی۔ دونوں بادشاہ بیٹی اور بیٹے کی تلاش میں وہاں پہونچے۔ شہزادے اور شہزادی کی شادی ہوئی اور وہ دونوں مُلکوں کے تخت و تاج کے وارث قرار پائے۔

یہ کہانی ظاہر ہے کہ سراسر خرافات ہے۔ لیکن یہ مثل کہ آنکھونکی سوئیاں رہ گئیں ہیں۔ اسی کہانی سے نکلی ہے۔

عبدالرحمٰن

(باجازت ڈائریکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن)

سحرِ بنگال:۔ طاہرہ دیوی شیرازی کے مضامین کا مجموعہ۔ اس مجموعہ میں چودہ مضامین ہیں جو نگار، ساقی، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، ہمایوں، رومان، عصمت، تہذیب نسواں، شاہجہاں، لیلیٰ اور عالمگیر میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ایک افسانے کے متعلق مولانا نیاز فرماتے ہیں "یہ افسانہ فن کے لحاظ سے اُردو میں اُس ارتقائی درجہ کی چیز ہے جہاں مردوں کا دماغ بھی مشکل سے پہنچ سکتا ہے، چہ جائیکہ عورتوں کی زبان کی صفائی و شستگی کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ بنگال کی ایک ہندو خاتون اتنی صاف اور صحیح اُردو لکھنے میں کیونکر کامیاب ہو سکیں"۔ ایک اور افسانہ کے متعلق کہتے ہیں کہ "اس افسانہ میں جس اعلیٰ پیمانہ میں تجزیۂ نفس کیا ہے۔ ادب اُردو میں اسکی کوئی مثال ملنی محال ہے"۔ سحرِ بنگال کا ہر افسانہ جادو نگاری کا نتیجہ ہے۔ قیمت ۱۲؍ علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ **ساقی بکڈپو۔ دہلی**

"عشقِ غیور"

جفا کا طور مری ناکشیدہ آہ میں ہے
جوابِ بختِ سیہ کا مری نگاہ میں ہے

خودی کی تیغِ دو دم کا نیاز بھی ہو ہی
اگرچہ زور بہت نازکی سپاہ میں ہو

یہ داغِ سینہ نہیں، مہر و ماہ رکھتا ہوں
حریفِ غیرتِ روئے جمال نگاہ رکھتا ہوں

عبث گھمنڈ ہے دولت پہ کیقباد و جم کو
جو آہ رکھتا ہوں میں بے پناہ رکھتا ہوں

نیاز مند ہوں لیکن سگِ کمینہ نہیں
جو ٹھیس لگنے سے ٹوٹے وہ آبگینہ نہیں

یمِ حیات کی موجیں بھی جائیں گی کہیں
ستیزہ کار ہوں، ناخدائے سفینہ نہیں

ستم سہیں گو، مرا مسلک اگر مشیت ہو
عطا کرے عین جفا اگر فتنۂ نیت ہے

نہیں ہے عشق سے نسبت ہوس پرستی کو
ہیں وہ عمومِ شرافت پہ قیدِ ذلت ہو

امینِ حزیں، سیالکوٹی

شانِ تغزل

وحشت سہی، وحشت سے پشیماں تو نہیں ہم
مجنوں کی طرح چاک بداماں تو نہیں ہم

فرقت میں تری یاد ہے اور جوشِ تمنّا
اُلفت میں تری بے سروساماں تو نہیں ہم

ساقی! کبھی اس سمت بھی اک ساغرِ صہبا
کافر ہی سہی، شیخ مسلماں تو نہیں ہم

مانا کہ ترا جلوۂ عریاں نہیں دیکھا
موسیٰ کی طرح طور پہ حیراں تو نہیں ہم

خاموش ہیں، خاموشیٔ حیرت بھی ہے اک چیز
صد شکر، لبِ گنگ خموشاں تو نہیں ہم

خاکِ رہِ اُلفت ہی سہی، ہیں ترے در پر
زُلفوں کی طرح کوئی پریشاں تو نہیں ہم

جو کچھ بھی کیا ہے وہ خلوصِ دل و جاں سے
صد شکر، کہ دُنیا میں پشیماں تو نہیں ہم

پابندِ غزل ہو کے نکھرتے ہیں بھی فرحت
جذبات یہ کہتے ہیں کہ عریاں تو نہیں ہم

فرحت کانپوری؛

لمحاتِ آزادی

گھٹاؤں کے سایوں کی مستی سے بڑھکر
فرشتوں کی پاکیزہ ہستی سے بڑھکر

حسیں بربطوں کے ترنّم سے پیارے
لبِ دلنشیں کے تبسّم سے پیارے

وطن کے حسینوں کے ناموں سے میٹھے
نگاہوں کے پُرکیف جاموں سے میٹھے

ستاروں کی کرنوں کے بستر سے دلکش
مہ و مہر کے سیمگوں گھر سے دلکش

محبّت کے آوارہ راگوں سے پیارے
سیمیں کی زلفوں کے ناگوں سے پیارے

بہاروں کی اُٹھتی جوانی سے شیریں
مری عاشقی کی کہانی سے شیریں

وہ لمحات گذریں جو آزادیوں میں
وہ اوقات گذریں جو آزادیوں میں

الطاف مشہدی

وہ دونوں

اندھیرے میں کچھ مُردے چُپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُوپر موت کی ہلکی ہلکی تاریکی نُور کی چٹانوں میں جم رہی تھی اور نیچے زندگی تاریکی کی موریوں میں پگھل رہی تھی۔

اُن میں سے ایک نے کہا "آؤ، اب ہم اس دُنیا کی باتیں کریں جسے ہم ہمیشہ کے لئے چھوڑ آئے ہیں۔ دیکھو مٹی کی بُوباس کتنی تیز ہے کہ اب تک وہ ہم میں بسی ہوئی ہے اور اس کی ہر موج کے ساتھ زندگی کا کوئی بھُولا ہوا واقعہ ہمیں چونکا دیتا ہے۔"

دوسرے نے روشنی کا ایک گھونٹ پی کر جواب دیا ——— "وہ زندگی میرے لئے ایک ایسی لکیر ہے جسے کسی نے یک بیک مٹا دیا ہو۔ سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں کیوں زندہ تھا، کہاں رہا اور کیا کرتا رہا۔

لیکن میرے کانوں میں اب بھی ایک مُہیب آواز گونجا کرتی ہو۔ صبح سے شام تک روپے گننے میں میں نے اپنی عمر گنوادی اور مجھے اتنی فرصت نہ ملی کہ کبھی آنکھ اُٹھا کر اپنے گرد وپیش کو دیکھتا۔ تن تنہا ایک بڑی سی حویلی میں بیٹھ کر میں رنگ برنگے پتھروں کو اُنگلیوں سے چھُوتا رہا اور جس طرح ان میں زندہ رہا اسی طرح ان میں مر بھی گیا۔ صرف ایک مرتبہ میں نے اپنے باغ میں جھانک کر دیکھا تھا۔ خزاں کا موسم آچکا تھا اور پیڑ پُودے جُھلس کر پتیوں میں سوئے ہوئے تھے۔ لیکن ایک جوان لڑکی گاتی ہوئی انہیں پانی دے رہی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ اُجڑا ہوا چمن ابھی شاداب ہوجائیگا اور اس کی ہوائیں نئی کونپلوں پر ناچنے لگیں گی۔

میرے ہاتھوں سے وہ جواہرات گر پڑے۔ میں نے دیکھا کہ میری زندگی کی پت جھڑ آگئی ہے اور اگر زور سے کوچلی تو یہ ابھی گر پڑیگی۔

میں ہر روز اُس مالن کی آمد کا انتظار کرنے لگا اور کھڑکی پر بیٹھ کر اس باغ کو دیکھنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کے پیڑ ہرے ہونے لگے، ایک دو پھول یہاں وہاں سے نکلے اور اُنھوں نے شرماتے شرماتے اپنے نئے گھر کو کن انکھیوں سے دیکھا۔

تنہائی کا یہ احساس میری جان کا لاگو ہوگیا۔ میرے جسم اور میری روح سے کسی کو کوئی تعلق نہ رہا تھا اور یہ خیال کہ ان بیجان پتھروں کے سوا کوئی مجھے نہ پوچھے گا، میرے لئے انتہائی اندوہ ناک تھا۔ جب میں مر جاؤنگا تو اس زندگی سے مجھے کوئی تعلق نہ رہے گا، کوئی ایسا نہ ہوگا جو میری لاش کو آواز دے اور پکار کر یہ کہے کہ نہیں، اس مُردے کو مجھے واپس دے دو۔ اور میں بھی موت کے مالک سے یہ نہ کہہ سکونگا کہ ہاں ابھی ایک بندھن باقی ہے۔ زندگی سے مجھے کچھ لینا ہی، دُنیا کے بازار میں میں بالکل دیوالیہ نہیں ہوں۔

میں یہ سب سوچ رہا تھا کہ وہی مالن ہنستی اور گاتی ہوئی باغ میں آئی۔ اُس نے شرارت سے ایک پھول کے گال پر چپت

رسید کیا اور ایک نئی ٹہنی کو محبت کے مارے گلے لگا لیا۔

میں باہر بھاگا۔ میری ایک مٹھی میں تجوری کی چابی تھی، اور دوسری میں جواہرات۔ میں نے یہ سب اُس کے قدموں پر ڈال دئے اور عاجزی سے کہا کہ یہ سب لے کر صرف زبان سے کہہ دے کہ میں تجھ سے محبت کر سکتی ہوں۔ پھر یہ سب کچھ تیرا ہے۔

اُس نے حیرانی سے میرے سفید بالوں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا۔ پھر حقارت سے پتھر کے ان ٹکڑوں پر نظر ڈالی اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی ـــ "میرا کام سوکھے ڈنٹھ کی جڑ میں پانی دینا نہیں ہے"۔

اور جب میں مر گیا تو وہ ساری دولت دُنیا کے ہاتھ لگی اور میری تشنہ کام روح اُس وقت اُجالے میں آئی جب اندھی ہو چکی تھی"۔ جب وہ خاموش ہوا تو بہت سے مُردے آہستہ سے بولے۔ "ہاں اُدنیا ہمارے لئے بھی ایسی ہی تھی۔ ہم نے یہ نہیں سوچا کہ زندگی کا لُطف بہت سی حسین لغزشوں میں مُضمر ہے۔ محبت کو ہم نے بھی ڈرتے ڈرتے چھُو کر دیکھا تھا۔ وہ نرم تھی ستاروں کے نغمہ کی طرح اور سخت تھی مضراب کے تاروں کی طرح"۔

سُرخ گھاس کے تختہ پر لیٹے لیٹے ایک مُردہ نے کہا "ہر شام کو وہ باؤلی کے کنارے میرا انتظار کرتی تھی۔ میری یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ سڑک سے ہٹ کر اُس کے پاس جاؤں اور کچھ کہوں لیکن میں جانتا تھا کہ وہ یہاں کیوں کھڑی رہتی ہے اور اسے بھی معلوم تھا کہ یہ ادھر سے کیوں گذرتا ہے۔ اور باؤلی کا پانی ایک خاموش راگنی گاتا رہتا تھا۔ ڈوبتے ہوئے سُورج کی کرنوں میں پیپل کے پتے جھلجھلاتے تھے اور فضا کے سنّاٹے میں بچپن کا بھولا پن ہوتا تھا۔

ایک روز میں نے کسی پھُل واری سے بڑا سا گلاب توڑ کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور جب اُس کے قریب سے گذرا تو جھجکتے اور ڈرتے ہوئے وہ گلاب میں نے اُس کے قریب پھینک دیا۔ اُس نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا، گلاب کو اُٹھا کر سونگھا، اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ اور کَن انکھیوں سے مجھے دیکھ کر مُنہ پھیر لیا۔

کئی سال گذر گئے اور ایک دن اُس نے کسی دوسرے سے شادی کر لی۔ جس دن اُس کی شادی ہوئی، ایک آدمی میرے نام چھوٹا سا پارسل لئے ہوئے آیا۔ اس پر صرف اتنا لکھا ہوا تھا ـــ "ایک گذری ہوئی شام کی یاد میں"۔ جب میں نے اِسے کھولا تو ایک سُوکھے ہوئے گلاب کی پنکھڑیاں ہوا میں بکھر گئیں۔

اِس پامالِ خاکِ گُل کے سوا محبت نے مجھے کچھ نہ دیا"۔

کسی کونے میں دو چلنے والے بیٹھے ہوتے تھے۔ سب مُردوں نے اپنی پسلیوں سے سانس نکال کر آواز دی۔ ـــ "کچھ تم بھی اپنی کہانی سُناؤ۔ تم نے اُلفت میں کیا مزا پایا"۔

مرد نے جواب دیا۔ "محبت مرد کی تخلیق ہے۔ کیونکہ عورت منزل ہے اور مرد رہرو ہے۔ عورت ایک معمّہ ہے بُوجھنے کے لئے، ایک تصویر ہے دیکھنے کے لئے۔ بُوجھنے والا اور دیکھنے والا مرد ہے"۔ ایک ستارہ کی ملگجی روشنی میں اُس نے عورت کا مُنہ اوپر اُٹھایا "غور سے دیکھو، اس کے بالوں میں کیا ہے۔ برگد کی رسی لٹیں جن پر سیاہ رنگ پھیر دیا گیا ہو۔ ان میں یہ بل اور خم کس نے دیا؟ میری تخیل نے۔ اور یہ آنکھ؟ اِس میں یہ چمک کہاں سے آئی؟ میری محبت سے۔ اور اس کی رسیلی آواز؟ اسے میرے نغموں نے شیرینی دی۔ اس کی چال میں یہ قیامت خیزی کہاں سے

آئی ؟ میری ہستی سے۔ میری آرزو محبّت میں رنگینی پیدا کرتی ہے اور میرا تجسّس اس میں یاس و غم کی جھلک لاتا ہے۔"

مُردوں نے مُشتبہ نگاہوں سے ہر طرف دیکھا۔ "اور اس کا ماحصل ؟" عورت نے کہا۔ "مگر زندگی کا ماحصل کیا ہے ؟ ماضی کی یاد اور مُستقبل کی تاریکی۔ زندگی وہ مسافر ہے جو موت کی سُرنگ میں راہ ڈھونڈ ہنے نکلی ہے۔ اسکے ہاتھ میں محبّت کی مشعل ہے۔ جب مُسافر تلاش سے تھک کر کہیں بیٹھ جاتا ہے تو مشعل روشنی کی بجائے دھنواں دینے لگتی ہے۔ لیکن جب تک چلتے رہو وہ روشن رہتی ہے۔"

مگر مُردوں نے مایوسی سے سر ہلا کر پوچھا "اور اس کی لذّت ؟"

"اُس میں درد کے سوا کچھ نہ تھا۔ تمنّا اور انتظار کا درد۔ کیونکہ محبّت کا مزا ایک نئی ناکامی کے بعد ایک نئی اُمید پیدا کرنے میں ہے۔ محبّت پیاس کا پہلا نہیں بلکہ آخری گھونٹ ہے۔"

عورت نے مرد کی بات کاٹ کر کہا۔ "ممکن ہے یہ مرد کی کیفیت ہو۔ ہماری محبّت کی لو صرف ایک بار سُلگتی ہے اور ایک بار بجُھ جانے کے بعد پھر کبھی نہیں بھڑکتی۔ پھر دھنوئیں کے سوا کچھ نہیں رہتا۔"

مرد نے جواب دیا۔ "عورت دیر تک ندّی کے گھاٹ پر بیٹھی رہتی ہے۔ وہ پاؤں لٹکا کر دھارے کے زور کا اندازہ لگاتی ہے، پھر آہستہ سے پاؤں ڈال کر نکال لیتی ہے۔ جب اسے تھاہ کا پتہ چل جاتا ہے تو وہ پانی میں تیرنے لگتی ہے۔ مگر مرد تشنہ لب صحرائی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھنور میں کُود پڑتا ہے۔ باپ کے بعد شوہر اور شوہر کے بعد بچّہ! عورت کو کھڑے رہنے کے لئے کوئی سہارا چاہیئے۔ وہ ماں بن کر مرد کو اُس کی بے پایاں آرزو کی سزا دیتی ہے۔"

مُردوں نے تالی بجا کر کہا۔ "دیکھ لی محبّت کی حقیقت۔ یہ دونوں ایک دوسرے پر دم دیتے رہے۔ لیکن انہیں اب تک نہیں معلوم کہ ان کا مقصد کیا تھا۔ آخر اُنہوں نے کیا کیا ؟"

عورت اور مرد نے کہا۔ "ہم نے زندگی اور موت کے بیچ ایک دیوار بنائی۔ یہ محبّت کی دیوار ہے۔ کیونکہ موت کی یک رنگی سے زندگی کو بچانے والا جذبہ محبّت کا ہی ہے۔

برگ و شجر، جان دار اور بیجان ——— جسے دیکھو زندگی کی اُلفت میں ڈوبا ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ ایک ایسی دُنیا کے دروازے کھُلتے جاتے ہیں جس میں محبّت نفرت پر حکومت کرتی ہے۔

اور کائنات کا دار و مدار محبّت کی کشش میں ہے۔ سیّارے ایک دوسرے کی جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔ مادّہ کا ہر ذرّہ ایک دوسرے کی تلاش میں گردش کُناں ہے۔ اس سارے سلسلے کو ایک دوسرے سے جوڑنے والی کڑی ہماری محبّت ہے۔"

"جاؤ جاؤ"۔ ان مُردوں نے حقارت سے کہا۔ "ان باتوں کے باوجود تم دونوں اسی تاریکی میں رہو گے۔ محبّت تمہیں موت کے اندھیرے سے نہیں نکال سکتی ہے۔"

یہ سُنکر عورت کے لبوں پر تبسّم آیا ——— اور ہر طرف اُجالا ہی اُجالا تھا!

اختر حسین رائیپوری

ایک رات

یاد ہے اک رات زیرِ آسمانِ نیلگوں
یاد ہے مجھ کو وہ تابستاں کی رات
چاند کی کرنوں کا بے پایاں فسوں ـــــ پھیلا ہوا
سرمدی آہنگ برساتا ہوا ـــــ ہر چار سو
اور مرے پہلو میں تُو ـــــ!

یاد ہے مجھ کو وہ تابستاں کی رات
تیرے دل میں راز کی اِک کائنات
تیری خاموشی میں طوفانوں کا غوغائے عظیم
جن کے سرچشمے ہیں فطرت سے قدیم
سیرِ خوش اظہار تیری ہر نگاہ
تجھ کو اِک لمحے میں اُمیدِ وصال
اور اُس سے پیشتر۔
تیرے جسم و جاں کو لپٹائے ہوئے وہموں کے جال
تیرے مژگاں کے تلے گہرے خیال۔
بے بسی کی نیند میں اُلجھے ہوئے!

میرے دل میں تُند جذبوں کا وفور
اور اُس کے ساتھ یہ جاں سوز وہم
غم کا بحرِ بےکراں ہے یہ جہاں،
میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے
سطحِ سوز انگیز پر اس کی رواں،
ایک ساحل، ایک انجانے جزیرے کی طرف
اِسکو آہستہ لئے جاتا ہوں میں۔
اور موجوں کو دغا پیہم دئے جاتا ہوں میں
یہ کہیں غم کی چٹانوں سے نہ لگ کر ٹوٹ جائے!

تیرے سینے کے سمن زاروں میں پیہم لرزشیں
میرے انگاروں کو بے تابانہ پینے کیلئے
اپنی نکہت، اپنی مستی مجھ کو دینے کیلئے
یاد ہے وہ رات زیرِ آسمانِ نیلگوں!

ن۔م۔ راشد۔
ایم۔ اے۔

کسی کی یاد

سوچتا ہوں۔ ریل کا میل جول ہی کتنا؟ آئے۔ بیٹھے۔ ملے جلے۔ چل دئے۔ کوئی کس کس کو یاد رکھے۔ پھر بھی ایک ماجرا جیتے سے نہیں اُترتا۔ بھلائے نہیں بھولتا!

ایک دفعہ آتی گرمی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ مَیں طوفان میل میں سوار ہوا۔ سیکنڈ کلاس میں مَیں اور ایک صاحبزادے اور تھے۔ بیس۲۰ بائیس۲۲ برس کی عمر۔ تندرست۔ عصری نونہال جن سے مل کر برملا کسی کا کہا یاد آیا کہ انسان بھی قدرت کی کیسی کاریگری ہے۔ سوچ بچار میں کتنا اچھا۔ دل کی باتوں میں کتنا اتھاہ۔ چہرے مُہرے میں کیسا بھلا۔ چال ڈھال میں کتنا دیدارو۔ کام کاج میں ایسا جیسے کوئی فرشتہ ہو۔ سُوجھ بُوجھ میں ایسا جیسے کوئی دیوتا ہو۔ دُنیا کا حُسن! کائنات کی خوبی!!

ایک سیٹ پر وہ تھے۔ ایک پر مَیں تھا۔ ریل فرّاٹے بھر رہی تھی۔ پہیّوں سے طبلہ سا بجا رہی تھی۔ جس کی تال میل پر وہ صاحبزادے کچھ گُنگُنا رہے تھے۔ مَیں بھی اخبار دیکھنے لگا۔ نظریں ان حروف پر تھیں:۔

"یہ راجاؤں کی راج نگری۔ یہ بادشاہوں کا تختِ شاہی۔ یہ بج دھج کی بھولی۔ بہار کی دُنیا۔ یہ علم کا گھر حُسن کاری کا گھرانا۔ یہ دولت کا خزانہ۔ انسانیت کا پالنا۔ یہ خطۂ پاک۔ یہ سُکھ کی سیج۔ یہ پیارا وطن۔ یہ ہریالا ہندوستان۔ آہ! آج اگر کچھ ہے تو......"

اتنے میں خُدا کا کرنا کیا ہوا۔ جس سیٹ پر مَیں تھا اُس کے اُوپر والے جھُولے سے ایک سیمل کی روئی کا رنگین تکیہ گرا۔ اور مجھ سے اخبار چھینتا ہوا نیچے آ رہا۔ میں نے حیران ہو کر اُن صاحبزادے کو دیکھا، اُنہوں نے مجھے دیکھا۔ پھر وہ جھُولے کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے بھی جُھک کے اُوپر جھُولے کو دیکھا۔ اس طرح نگاہوں کا خاصا مثلث بن گیا! کیا دیکھتا ہوں۔ سر پر ایک گلستانِ حیات کھلا ہوا ہے۔ یعنی ایک نوعمر بی صاحبہ پھولوں کا باسی گجرا حمائل کئے ہیں۔ دونوں کہنیاں ٹکی ہوئی ہیں۔ اور ہتھیلیوں پر ٹھوڑی اس طرح رکھ لی ہے جیسے گلدان میں گلاب! ننداسی مگر مُسکراتی آنکھوں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ دیکھ کیا رہی ہیں۔ یوں کہو کہ آنکھوں سے شعر کہہ رہی ہیں! میں نے دیکھا تو اُن کے لبوں پر پھُول سی ہنسی کھِل گئی۔ پھر کچھ رک کر لجا کر فرمایا۔ معاف کیجئے! مگر میں نے کچھ نہیں کہا۔ جانے کیوں نہ کہہ سکا۔ اور گھبرا کے اُن صاحبزادے کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ جونہی میں نے اُنہیں دیکھا وہ اُوپر لڑکی کو دیکھنے لگے۔ پہلے مُسکرائے پھر باآواز ہنسے۔ لڑکی بھی ہنسنے لگی۔ اور سارے ڈبے میں نقرئی گھنٹیوں کی سی آواز گونج گئی۔ ان دونوں کے ہنسنے سے میں بھی اپنے آپ ہنسنے لگا۔ سچ ہے۔ ہنستوں کے ساتھ دُنیا ہنستی ہے روتے تو کوئی کسی کا ساجھی نہیں!

میں نے اخبار اُٹھایا اور پھر پڑھنے لگا۔ آنکھیں کہیں تھیں، دل کہیں تھا۔ سامنے سے حروف اس طرح غائب ہو ہو

جاتے تھے۔ جیسے سلیٹ پر سے پانی! ادھر وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔

لڑکا:۔ ہائیں؟! پھر سونے لگیں ؟؟!!

لڑکی:۔ جی ہاں! بس آپ کو تو میرے سونے سے دُشمنی ہے!!

لڑکا:۔ نہیں جی۔ اب نہ سو۔ دونوں وقت ملنے کو ہیں۔!

یہ کہتا ہوا لڑکا جُھولے کے پاس آ کھڑا ہوتا ہے۔ اور لڑکی کو سونے نہیں دیتا۔ دونوں ہنس رہے ہیں۔ مگر میرے روبرو اخبار ہے۔ ہاں آوازیں سُن رہا ہوں۔ بارے کچھ دیر میں لڑکی کی ہنسی نے ایک جھونٹا سا لیا۔ اور اس کی آواز نچلی سیٹ پر آنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ لڑکے نے لڑکی کو جھُولے سے اُتار لیا۔ اب کیا تھا۔ ہنسی دل لگی اور بڑھی یہاں تک کہ دونوں کی آوازوں میں وہ بات سُنائی دینے لگی۔ جو بیحد گُدگُدی کے سے اثر سے پیدا ہوتی ہے میں نے اخبار طے کیا۔ چاہا کہ جنگل کی سیر کروں۔ تو ان پر بھی نظر پڑی۔ مجھے اخبار طے کرتا دیکھ کر لڑکا تو انجان ہو گیا۔ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی نیچی نظروں ہو بیٹھی۔ خیال آیا ہو گا۔ دیر سے اودھم مچا رکھی ہے۔ شاید میں ان سے کچھ کہونگا۔ مگر میں نے کچھ نہ کہا۔

لڑکی کا سولہ سترہ کا سن ہے۔ اور اس میں اک آن ہے جو بیان نہیں ہو سکتی۔ اس پیکرِ حُسن کو دیکھ کر بیک نظر مجھے تو یہ معلوم ہوا کہ صحت و جوانی کا سنجوگ ہو رہا ہے! لباس ہلکے رنگ کا سیدھا سادہ ہے۔ بُشرے پر رنگِ شفق کھیلتا ہے۔ دونوں ہونٹ دانتوں میں دبائے ہیں کہ ہنسی نہ آئے۔ کانوں میں یاقوت کا ایک ایک آویزہ ہے ہاتھوں میں ہیرے کی ایک ایک جڑاؤ چوڑی ہے۔ بال سُنہرے ہیں لانبے ہیں۔ روکھے ہیں اور کمر پر بکھرے ہوئے ہیں۔ جنہیں گردن کے پاس ایک کاسنی ربن نے شیرازہ کیا ہے۔ گویا دُم دار تارا زمین پر نکلا ہے! چھوٹی چھوٹی زلفیں ہوا سے مُنہ پر آ آ جاتی ہیں۔ انہیں بڑے اَنیلے پن سے ہٹایا جاتا ہے۔ اُس وقت ترچھی نظروں مجھے بھی دیکھ لیا جاتا ہے! مگر میں کھڑکی میں سے جنگل کا تماشا دیکھنے لگا۔ میرا مُنہ پھرنا تھا کہ ان دونوں نے مل کر ہنسی کا پھر ایک بمب سر کیا۔ جو دیر تک گونجتا رہا۔ ہنسی متعدی شے ہے۔ ایک کے ہنسنے سے دوسرے کو بھی ہنسنے کی چھیڑ ہوتی ہے۔ وہ دونوں ہنستے تو مجھ پر بھی انبساط کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اب کے بھی یہی ہوا۔ اور اپنے آپ سارا جنگل سرور میں ڈوبا ہوا نظر آنے لگا۔

معلوم ہوا کہ ہرے بھرے جھاڑ۔ اُونچے نیچے پہاڑ۔ پھُولتی شفق۔ نکلتا چاند بھی ان دونوں کے ساتھ ہنس رہے ہیں۔ اور ان کی خوشیوں کو دیکھنے ساتھ ساتھ ہیں۔ ریل فرّاٹے بھرتی چلی جا رہی ہے۔ جنگل بیابان میں کبھی جانور دکھائی دیتے۔ یہ چیکارے ہیں۔ یہ نیل گائیں ہیں۔ وہ ہرن چوکڑیاں بھرتے چلے جاتے ہیں۔ ڈار کی ڈار ابھی ابھی سرپٹ بھاگ رہی تھی کہ ابھی رُک گئی۔ مُڑ کر ریل کو دیکھنے لگی۔ پھر یکایک بھاگنے لگی۔ کہیں دامنِ کوہ میں جھونپڑیاں ہیں جن سے بھورا بھورا دھواں اُونچا ہو رہا ہے۔ کہیں سُہانے کھیت ہیں۔ جن کے پاس گاؤں کی معصوم گجریاں سروں پر ٹوکرے۔ گودوں میں بچے لئے کھڑی ہیں۔ چہروں پر ہنسی ہے۔ آنکھوں میں حیرت۔ ہمیں دیکھتی ہیں کہیں

کسان کاندھے پر ہل رکھے جاتا ہے۔ آگے آگے بیل ہیں پیچھے پیچھے گھروالی لکڑیوں کا گٹھر اُٹھائے ہے۔ لوگ انہیں جو چاہے کہیں۔ یہ قدرت کا دہنا ہاتھ ہیں جن کی بدولت دُنیا پلتی ہے! یہ اور ایسے بیسیوں سین آتے جاتے تھے۔ ایک سینما سا ہو رہا تھا کہ اتنے میں انجن سے دھوئیں کے کالے کالے بادل اُٹھے۔ اور آن کی آن میں پھیل گئے۔ پھر یہ دُھواں ایک سمت میں سمٹ گیا۔ اور دور اُفق پر سیاہ پٹی بن کر ہچکولے کھانے لگا!

چلتے چلتے ریل نے ایکا ایکی سیٹی دی۔ پھر ایسا دھماکہ ہوا جیسے کسی نے دو چار توپیں ملا کر داغ دیں۔ تھا یہ کہ ایک دوسرا میل گزر ا تھا۔ کچھ دیر چل کر ریل نے پھر سیٹی دی۔ لڑکی نے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں کہ پھر کوئی میل نہ گزرتا ہو! مگر اب کے میل کی جگہ اسٹیشن کی روشنیاں نظر آئیں جو دُور سے لال سبز تارے معلوم ہوتی تھیں۔ کچھ دیر سے یہ دونوں میری طرف والی ایک کھڑکی میں آ کر سیر دیکھ رہے تھے۔ باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ باتوں سے مجھے محسوس ہوا کہ ان میں علم کی بُردباری بھی ہے۔ ذوق کی چاشنی بھی ہے۔ خیر شدہ شدہ اسٹیشن قریب ہوا ریل کی دوڑ بھی کم ہوئی۔ پھر اس کے پہیوں سے ایسی آواز آئی۔ جیسے طبلہ کا بندھا ہوا ٹھیکہ بج رہا تھا کہ دفعتہً ٹکڑے بجنے لگے! آخر گاڑی اسٹیشن پہنچ گئی۔ قلی قلی کی آوازیں سُنائی دیں۔ اور مسافروں کی ایک ہُلڑ مچ گئی۔ مگر یہاں گاڑی زیادہ نہیں ٹھیری۔ کوئی دم میں چلنے کو ہی تھی۔ ایک بڑی بی ہانپتی کانپتی ڈبہ کی طرف آتی دکھائی دیں۔ نو دس برس کا ایک ممولا لڑکا اُن کا ہاتھ تھامے تھا۔ گویا زندگی موت کو سہارا دئے تھی!

لڑکی نے بڑی بی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ان کے ساتھ جو اچھا برتاؤ کیا۔ سچ پوچھو تو وہ وہی بہو بیٹیاں کر سکتی ہیں جن کی تعلیم بھی اچھی ہو۔ تربیت بھی اچھی ہو۔ ورنہ ایک بے تربیت کی تعلیم کے تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ مرد ہو تو مرغے کی طرح اکڑا اکڑا پھرے۔ عورت ہو تو ناک چوٹی گرفتار ہو جائے! اچھا ایسے بداطوار کو اتفاق سے کبھی ولایت کی بھی ہوا زدگی ہو جاتی ہے تو سمجھو اس پر پوری ساڑھ ستی آجاتی ہے!!

غریب پھر نہ آدمی کو آدمی سمجھتا ہے۔ نہ باپ کو باپ کہتا ہے! ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ لڑکی نے بڑی بی کو اپنا ہی بڑا سمجھا۔ ذرا غیریت نہیں برتی۔ حالانکہ بڑی بی پورشین تھیں۔ جن سے یہ دونوں انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم ہوا کہ لڑکا لڑکی میاں اور بیوی ہیں۔ لڑکی سُسرال سے میکے جا رہی ہے۔ اس بات سے اور جی خوش ہوا۔ اور ان کی ہنسی دل لگی مجھے بڑی پُر معنی نظر آنے لگی۔ کیونکہ اچھی لڑکی سے کہیں زیادہ میری دانست میں وہ اب اچھی بیوی تھی۔ اور اچھی بیوی شوہر کا سُکھ چین اور سماج کی ایسی برکت ہوتی ہے جو خوشیاں بڑھاتی ہے۔ تو رنجوریاں چھانٹ دیتی ہے! اس لئے ان دونوں کی زندگی مجھے سرتاسر اک تبسم حیات معلوم ہوئی۔ اب جتنا سوچتا تھا مجھ پر روشن ہوتا جاتا تھا کہ ان کی باتیں ان کے معصوم دماغوں کا کام ہیں تو ان کے کام ان پیارے دلوں کی باتیں ہیں!

شام سے رات ہوئی جنگل جنگل چاندنی چھٹکی۔ ریل بے تحاشا بھاگ رہی ہے۔ اس وقت دودھ سی چاندنی میں تارے ایسے دکھائی دے رہے ہیں جیسے سفید سفید چونے میں پانی کی ٹکیاں ہوں! یہی حال زمین پر جگنوؤں کا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر

مجھے جماہیاں آنے لگیں۔ وجہ یہ ہے کہ میں ایک دوست کی شادی سے واپس ہو رہا ہوں۔ دو راتوں سے بالکل نہیں سویا۔ بہتیرا چاہتا ہوں کہ نہ سوؤں۔ انہیں کی باتیں سُنے جاؤں۔ انہیں کی خوشیاں دیکھے جاؤں۔ مگر یہ بس کی بات نہ تھی۔ آخر دل نے کہا لیٹ جا۔ لیٹ کے بھی تو باتیں سُن سکتا ہے! مگر یہ دل کا کہنا نہ تھا۔ ظلمن نیند نے پھسلایا تھا۔ نیند! ماتا والی قدرت کی ٹھنڈی کوک۔ میٹھی گود! جس کے سُکھ کی سیج قطبین میں پھیلی ہوئی ہے!! ہائے! میں دل کے کہنے میں آگیا۔ اِدھر لیٹا۔ اُدھر سو گیا۔ مگر کیا معلوم تھا کہ سوتے میں انسان جاگتے سے بھی بڑا چڑھا بن جاتا ہے۔ تن کی نیند من کو جگا دیتی ہے اسی لئے شاید سچ مچ کی باتوں سے خواب کی باتیں پیاری ہوتی ہیں!

خیر میں سو گیا۔ گو دو روز سے نیند نہ تھی۔ چاہیئے تھا۔ بے خبر سو جاتا۔ مگر ریل کا یہ ماجرا روح کو بھی کچھ ایسا بھا گیا کہ وہ بھی نت نئی نظروں اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں دیکھی بھی ایک بات سُناتا ہوں۔ سوتے سوتے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ون دے جو جنگل دیکھے تھے۔ ان میں کا ایک جنگل ہے۔ جس میں بڑی ساری جھیل ہے۔ جہاں کہیں کہیں کنول کھلے ہوئے ہیں۔ رات کا پچھلا پہر ہے۔ آسمان پر کچھ کچھ چاند کی مُسکراہٹ بھی کھیل رہی ہے۔ چوطرف سناٹے کا عالم ہے۔ جسکو دیکھنے والیاں یا تو وہ روپہلی مچھلیاں ہیں جو کبھی کبھی پانی پر تڑپ جاتی ہیں۔ یا وہ اکیلا راج ہنس ہے۔ جو لب آب گردن جھکائے ایک ٹانگ پر چُپ چاپ کھڑا ہے!! اس وقت جھیل میں آسمان کا ایسا عکس پڑ رہا ہے۔ گویا زمین پر آسمان اُتر آیا ہے۔ یہیں جھیل میں چھوٹے بڑے دو روشن تارے پاس پاس نظر آ رہے ہیں۔ جنہیں دکھا کر کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ دیکھ! یہ پاک روحیں اُنہیں ریل والے میاں بیوی کی ہیں۔

رُوح کی دو باتوں میں اپنے کئی گھنٹے لگ گئے۔ خُدا جانے میں ابھی کتنا اور سوتا کہ معلوم ہوا مجھ پر تکیوں کی بارش ہونے لگی۔ مگر ابھی ایک ہی تکیہ برسا تھا کہ میں چونک پڑا۔ جاگا تو دیکھا۔ سارا ڈبہ خالی پڑا ہے۔ سخت حیرانی ہوئی ریل زناٹے سے چلی جا رہی تھی۔ اور ڈبے میں اس وقت دھیمی دھیمی سبز روشنی تھی۔ کیونکہ برقی کنول پر دھانی ریشم کا حجاب تھا۔ میں اُٹھا۔ حجاب کو دُور کیا تو سارا ڈبہ جگمگا گیا۔ بڑی بی نہ تھیں۔ جانے کہاں اُتر گئیں۔ ہاں جیون کے وہ دونوں تارے البتہ ایک کونے میں مُنہ چُھپائے بیٹھے ہنس رہے تھے۔ ان کی اس معصوم حرکت نے بڑا مزا دیا۔ میں نے پھر حجاب کھینچ دیا۔ ان کے تکیئے کو بیچ والی سیٹ پر رکھ دیا۔ اور اپنے بستر پر آ لیٹا۔ کچھ دیر میں میری پھر آنکھ لگ گئی۔ اور اب کے جاگا تو صبح ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ دونوں میاں بیوی سارس کے جوڑے کی طرح پاس پاس بیٹھے تھے۔ اور حُجت یہ ہو رہی تھی کہ سامنے پہاڑیوں میں جو چاند ڈوب رہا ہے۔ وہ اچھا ہے۔ یا مشرق میں دن کی جو نو بد نور ہے۔ وہ بھلی ہے۔ لڑکی کہہ رہی ہے۔ آپ میری جگہ ہوتے۔ تو اس ڈوبتے چاند کا مزا جانتے۔ اس وقت یہ چاند مجھے چاند تھوڑی معلوم ہو رہا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں میکے ہوں۔ آپ اپنے ہاں ہیں اور آپ کے دھیان میں میں اُداس ٹہل رہی ہوں! لڑکے نے یہ سُنا تو ہنس کر کہا۔ معاف کیجئے! میں آپ کی جگہ کیوں ہوں؟ خُدا نے مجھے مرد بنایا ہے! عورت بن جاؤں!! بانو! میں ہرگز آپ نہیں بننا چاہتا۔ میں تو میں ہی رہونگا۔ اور مشرق کے اس بڑھتے نور کو اپنی اُبھرتی اُمنگوں کا پرچم بناؤنگا! یہ پیاری پیاری حُجت ہو رہی تھی کہ ریل

ادب اور زندگی

یہ ایک ایسا عنوان ہے جس پر لکھنے کیلئے اگر قدرت عمر خضری بھی عطا کر دے تو ناکافی ہے۔ زندگی ایک ایسی چیز ہے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ نہ میں ہوتا نہ علیگڈھ ہوتا۔ نہ ہندوستان ہوتا اور نہ یورپ ہوتا اور نہ "کفن دزدان چند" کا مرکز۔ نہ زمین ہوتی نہ آسمان۔ تو پھر کیا ہوتا؟ کوئی کچھ سمجھے مگر بقول غالب اپنا تو اعتقاد یہ ہے کہ"..... کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا" اب غور کیجئے اس زندگی کی طوفان زائیوں اور قیامت آفرینیوں پر۔ دیکھنے میں پانچ مختصر حرف اور عربی اور انگریزی میں محض چار ہی مگر جب تک یہ چاروں حروف علیحدہ علیحدہ تھے تو کچھ بھی نہ تھا۔ تو پھر کیا تھا؟ غالب کہتا ہے" نہ تھا کچھ تو خدا تھا....." آپ بھی کہئیے خدا تھا، بس خدا، ایک خدا۔

اب اس ایک خدا کو ایک دن (اگر ہم اسے دن کہہ سکیں) کچھ خیال آیا۔ اس طرح نہیں جس طرح ہمارے سرور صاحب کو ہم سے ادب اور زندگی پر مضمون لکھوانے کے متعلق آیا۔ خیر تو اسے ایک خیال آیا۔ خیال کے ساتھ ہی ذوق آفرینش نے انگڑائی لی۔ ایسی انگڑائی نہیں جیسی ہماری اس دنیا میں کوئی "جلوہ گہہ آفت نظارہ" لیتی ہے۔ ہاں تو اس نے انگڑائی لی، آنکھیں ملیں اور پھر ایک نظر "حیات" کے چاروں حرفوں پہ ڈالی جو علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے سے دُور، کوسوں دور، بے انتہا دور چار سمتوں میں معلق آویزاں تھے۔ نظر کے ساتھ چاروں حرفوں میں قوت انجذاب پیدا ہو گئی۔ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی طرف کھچنے لگا۔ خود بخود، بالکل بلا ارادہ۔ وہ کھچتے رہے، ایک دوسرے کی طرف یونہی آہستہ آہستہ کھچتے رہے۔ جتنا قریب ہوتے گئے اتنی ہی ان کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شکل بھی تبدیل ہوتی رہی۔ آخر ایک ایسے پر زور جھٹکے کیساتھ ایک دوسرے سے مل گئے کہ اگر دنیا اس وقت ہوتی تو اس صدمہ سے کانپ کانپ کر منتشر ہو جاتی۔ خیر وہ مل گئے، ایک دوسرے سے متحد ہو گئے اور اب قدرت کی نظروں کے سامنے آدم کھڑا تھا اور ملائکہ اس کے قدموں پر سجود تھے قدرت اپنا نصف کام ختم کر چکی تھی اب اسے مکمل کرنے کے لئے اس نے شعر و موسیقی اور رنگ و بو کے امتزاج سے ایک اور مجسمہ تیار کر کے آدم کے سپرد کر دیا۔ پھر فرشتوں سے فرمایا "اذہبو عبادی"۔ ایک آن کی آن میں آدم و حوا ہماری وسیع زمین پر ناپید اکنار آسمان کی نیلگوں چھت کے نیچے تنہا کھڑے تھے۔ یہاں ہر چیز ویران تھی مردہ تھی۔ دونوں نے ملکر اس میں زندگی کا رنگ بھرنا شروع کیا۔ اور ایکدن وہ آیا جب یہی بیکس و مجبور آدم خدا سے کہہ رہا تھا کہ "تو کہسار و میدان و راغ آفریدی..... خیابان و گلزار و باغ آفریدم ..... تو شب آفریدی چراغ آفریدم"

جب تک آدم و حوا محبت و سرمستی کے دور میں رہے انہیں زبان ہلانے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ پیغامات محبت کیلئے الفاظ کی ضرورت نہیں جب کہ محبت بھری نگاہیں اظہار محبت کا بہترین ذریعہ ہیں مگر جب انہیں محبت کی باتوں کے علاوہ کچھ اور باتیں کرنے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے بجائے زبان کے اعضائے جسمانی سے کام لینا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے ان کے ماحول میں مختلف نئی چیزوں کا اضافہ ہوتا گیا ویسے ہی ویسے انہیں اظہار مطلب میں دقت محسوس ہونے لگی۔ آخر انہوں نے ہر چیز کے نام رکھے۔ جسم کی مختلف حرکات کیلئے لفظ بنائے اور بے تکلف انہیں استعمال کرنے لگے۔ یہاں سے زبان کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان کی اولاد بڑھی اور بڑھ بڑھ کر تمام روئے زمین پر پھیل گئی۔ کچھ آب و ہوا کا اثر، کچھ ماحول کا مقتضیٰ۔ نئے الفاظ بنے، پرانے الفاظ میں تغیر ہوا اور رفتہ رفتہ ایک خط کی زبان دوسرے خط سے مختلف ہو گئی۔

ابتدا میں ہر شخص انفرادی زندگی کا عادی تھا لیکن رفتہ رفتہ زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ تمدن کی نشو و نما سے وہ ایک دوسرے سے متعلق ہوتے گئے۔ باپ تمام اولاد کا سردار ہوتا تھا اور اولاد اسکا احترام کرتی تھی۔ ایک باپ کی اولاد بڑھتے بڑھتے قبیلہ بن گئی اور اب پورے قبیلہ کا ایک سردار ہونے لگا۔ جب تمدن یہانتک پہونچگیا تو وہی زبان جو صرف گفتگو کے کام آتی تھی۔ اسی کو تھوڑا سا آراستہ کر کے لکھنے کے کام میں بھی لانے لگے۔ یہاں سے ادب کی ابتدا ہوتی ہے۔ جیسے جیسے زندگی کے مشاغل بڑھتے گئے ادب بھی ترقی کرتا گیا اور ایک دن وہ آیا کہ ہر قوم اور ہر ملک کا جداگانہ ادب بنگیا۔

اس مختصر خاکہ سے ہم آسانی سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ادب بطور زندگی کے نتیجہ کے پیدا ہوا۔ ادب اور زندگی کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور رہیگا۔ اور اب ادب نے وہ مرتبہ حاصل کر لیا ہے کہ زندگی و ادب لازم و ملزوم چیزیں ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم تاریخ عالم کا مطالعہ کریں تو اس نتیجہ پر پہونچنے کیلئے مجبور ہونگے کہ جس قوم نے ترقی کی اس کے ادب نے بھی ترقی کی اور جس قوم کے ادب کو انحطاط ہوا وہ قوم بھی زوال و پستی کے گڑھے میں جا پڑی۔

اس طرح ہمارے مضمون کے دو خاص حصے ہوتے ہیں۔ (۱) زندگی کا اثر ادب پر۔ اور (۲) ادب کا اثر زندگی پر۔ اور آخر میں دونوں کو مجموعی طور پر لیتے ہوئے ایک حصہ اور بھی ہوتا ہے یعنی ادب میں زندگی کی حقیقت۔

میتھیو آرنلڈ کے نزدیک ادب زندگی کی تنقید و تشریح کا ہی نام ہے۔ اور دنیا کے ہر شاعر نے ہر ادیب نے کسی نہ کسی طرح زندگی کی تشریح کی ہے۔ بعض نے زندگی کو "خواب" کہا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہماری یہ دنیاوی زندگی ایک وقفہ ہے سکون و آرام کا منزل کی طرف بڑھنے کیلئے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ زندگی ایک حقیقت ہے خواب نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں۔ یہی دنیا ہماری منزل مقصود ہے۔ موت کے بعد زندگی ختم لیکن کچھ لوگوں کا خیال اس کے خلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ زندگی ہر دم جواں اور ہر وقت رواں ہے۔ یعنی "جوہر انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں۔ آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں"۔ ان کے نزدیک "موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے"۔ الغرض دنیا کے ادب میں اسی قسم کے مختلف نظریئے پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق زندگی کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اور قطع نظر حیات بعد الممات کے زندگی کی مکمل اور صحیح تشریح میرے نزدیک چکبست کے اس شعر میں ہے کہ "زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب۔ موت کیا ہے؟ انہیں اجزا کا پریشاں ہونا"

اگر دنیا کے ہر ادب میں سے زندگی کے مختلف فلسفوں کے متعلق مثالیں چھانٹی جائیں تو مضمون بہت طویل ہو جائے۔ لہٰذا اس بحث کو چھوڑ کر آیئے ہم اپنے مضمون کے پہلے دو خاص حصص پر علیحدہ علیحدہ طائرانہ نظر ڈالیں اور محض طائرانہ اس لئے کہ بد قسمتی سمجھئے یا خوش قسمتی کہ سکندر کی طرح ہم نے بھی آب حیواں کا ایک قطرہ نہیں چکھا ہے۔ سکندر کی تو لوگ کہتے ہیں حضرت خضرؑ سے ملاقات بھی ہو گئی تھی مگر اپ جناب تو اس سے بھی محروم ہیں۔ ہاں اقبال کی طرح کبھی کبھی جب بجائے "ساحل دریا" کے ہم چارپائی پر پڑے "اپنی سے حقہ رکھے اور گوشہ دل میں چھپائے اک جہان اضطراب" کسی افسانے کا پلاٹ سوچتے یا کوئی شعر موزوں کرتے ہوتے ہیں تو اکثر حضرت خضرؑ مع اپنی نورانی داڑھی کے تصور کی آنکھ کے سامنے تیزی سے گذرتے نظر آتے ہیں۔ خیر خواہ کچھ ہو ہم صرف طائرانہ ہی نظر ڈالیں گے۔ کیونکہ ہمیں فرصت ہی اتنی دی گئی ہے لہٰذا قبل اس کے کہ میں اصل چیز پیش کروں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرے پاس صرف "جام سفال" ہے آپ اسے "جام جم" سمجھ کر کہیں اس میں تمام دنیا کا نقشہ نہ دیکھنے لگیں ورنہ آپ کی مایوسی کا میں ذمہ دار نہیں۔

زندگی کا اثر ادب پر:-

ادب پر زندگی کے اثر کا صحیح اندازہ لگانے کیلئے دنیا کی تمام و کمال تاریخ کا جاننا بھی ضروری ہے اور پھر دنیا کی ہر زبان کا تھوڑا بہت علم لازمی ہے لیکن میں بد قسمتی سے ان دونوں سے کورا ہوں۔ ہاں جو کچھ سنا سنایا ہے وہ کچھ یاد ہے۔ سب سے پہلے بلا کسی لحاظ تفوق کے میں انگریزی ادب کو لیتا ہوں۔ ابتدا میں جب اہالیان انگلستان اول درجہ کے وحشی اور غیر مہذب تھے وہاں کا ادب بھی اسی قسم کا تھا جب ان میں صحیح معنوں میں ادب کی ابتدا ہوئی تو اپنی ادبی زبان بجائے مادری زبان کے لاطینی و فرانسیسی مقرر کی۔ روزمرہ کی گفتگو میں وہ اپنی مادری زبان استعمال کرتے تھے لیکن جب کوئی ادیب یا شاعر کوئی مضمون یا شعر لکھتا تو بیرونی زبان استعمال کرتا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ روم کی تہذیب اسوقت جملہ ممالک یورپ پر غالب تھی دوسرے ممالک کسی اچھی بات کیلئے روم کی طرف دیکھتے تھے۔ اور اس کی تقلید کرنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ لیکن جوں جوں انگریزی قوم میں جذبۂ خودداری پیدا ہوتا گیا وہ اپنی زبان کو لاطینی کے اثر سے پاک کرتے گئے۔ اور آج انکا ادب خالص انہیں کی زبان میں موجود ہے اور روز بروز ترقی کر رہا ہے۔

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ان کی زندگی کا اثر ان کے ادب پر کیا ہوا شروع شروع میں جب مذہب عیسائیت کی ابتدا تھی وہ زیادہ مذہبی قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ اور انکا اسوقت کا ادب بھی زیادہ تر مذہبی ہے۔ وہ یا تو چند مذہبی نظمیں ہیں یا حضرت عیسٰی اور مختلف ولیوں سے متعلق چند تمثیلیں جو مختلف اوقات میں بقدرے تبدیلی مختلف ناموں سے پکاری جاتی تھیں۔ مثلاً Mysteries —— Miracles (معجزات) and Moralities (اسرار غیب و اخلاقی تمثیلیں) یہ ڈرامے کلیساؤں میں خود حضرات پادری وغیرہ ادا کرتے تھے۔ اور اسطرح انجیل مقدس جو لاطینی زبان میں تھی اور عوام نہ سمجھتے تھے۔ اسے اپنے حرکات و سکنات سے عوام کو سمجھاتے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگ مذہبی سے دنیا دار بنتے گئے اور اسی کے ساتھ ان کے ادب میں دنیا داری کا عنصر شامل ہونے لگا۔ اب وہ مذہب و تاریخ کے ساتھ ساتھ تفریح بھی چاہتے تھے تو ڈراموں میں ان کی تفریح کیلئے بھی سامان مہیا کئے جانے لگے۔ جیسے جیسے ان کی معاشرت، ان کے رجحانات بدلتے رہے ویسے ہی ویسے انکا ادب بھی تبدیل ہوتا رہا۔ اور آخر ملکہ ایلزبتھ کے زمانہ میں جب انگلستان کی سیاسی طاقت سب سے بڑھ گئی ان میں جذبۂ غرور و خودداری بھی اسیقدر بڑھ گیا۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسروں کی نقل و تقلید بھی انہیں اپنی توہین معلوم ہونے لگی۔ اور شیکسپیئر نے ڈرامہ کو تمام بیرونی اثرات سے پاک و صاف کر کے بالکل وطنی و قومی بنا دیا۔ اب

اس زمانہ میں جب شیکسپیئر عرفانی نام حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تہا وہاں کے باشندے جس قسم کی زندگی بسر کرتے تھے اس کے ڈراموں سے ظاہر ہے وہ لوگ خوں ریزی، تلوار بازی، جنگ و جدل، شور و غل کے عادی تھے اور انکی اس طرز زندگی کا اثر ڈراموں پر یہ پڑا کہ شیکسپیئر نے ان کے مذاق کے مطابق کافی سامان مہیا کر دیا۔ "سیزر" "انطونی و کلیو پٹرا" "ہیملٹ" "اوتھیلو" "کنگ لیئر" اور "کوریولانس" وغیرہ ڈراموں میں جن خونریزیوں اور ہولناکیوں کو دیکھکر ہم آج لرز جاتے ہیں وہ اسوقت کے لوگوں کیلئے بالکل معمولی شے تہیں۔ اور بغیر اس کے انہیں لطف ہی نہ آسکتا تہا۔ دوسری طرف لوگ ظرافت و مزاح کو پسند کرتے تھے تو اس کے لئے ابتدا کے ڈراموں میں اور بعد کے ڈراموں میں مسخرہ ڈرامہ کا ایک جز وبنگیا تہا۔ اس زمانے کے عوام اکثر و بیشتر گندے، متعفن اور شور پسند ہوتے تھے شیکسپیئر کے ڈراموں میں جا بجا اسکا تذکرہ ملے گا۔ بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں میں صرف شیکسپیئر ہی ایک ایسا شخص ہے کہ خود جس کی زندگی کا اثر اس کے ادب پر نمایاں نہیں ہے۔ ورنہ ہر ایک کی زندگی کا اثر کچہ نہ کچہ اس کے ادب پر ضرور پایا جاتا ہے۔

شیکسپیئر کے بعد دوسرا مشہور شاعر ملٹن ہے۔ ملٹن کی زندگی عموماً ایک تنہا کمرہ میں کتابوں کے درمیان گزری۔ اور اسی کی وجہ سے وہ آنکھوں سے بہی ہاتھ دہو بیٹھا۔ اس کی اس تنہائی پسندی اور کتابوں کا کیڑا بنے رہنے کا اثر اس کے ادب میں صاف نمایاں ہے۔ جب وہ کمرے سے باہر کی چیزوں کا حال لکہتا ہے تو اکثر نفسیاتی اور بعض اوقات واقعات کی غلطی کر جاتا ہے۔ دوسرے اس کی خانگی زندگی کبہی کامیاب اور خوشگوار نہیں گزری۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کے تمام کلام میں صحیح اور سچی محبت کا کہیں تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ تیسرے اس کی زندگی تنہائی پسندی کیوجہ سے خشک اور بیکیف تہی اسی طرح اس کے کلام میں بہی متشائم کیفیت پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد ورڈسورتھ آتا ہے۔ یہ عجیب و غریب قسم کا شخص تہا۔ ہر وقت مرغزاروں اور آبشاروں کی سیر اور شاہد فطرت سے حقیقی عشق۔ اسکا دماغ فلسفیانہ تہا اور یہی وجہ ہے کہ اس کی زیادہ تر شاعری محض فلسفیانہ بحث بنگئی ہے اور حقیقی شاعری سے کوسوں دور جا پڑی ہے۔ لیکن جہاں اسکا شعر حقیقی شعر ہے وہ ہمیں بہی اپنی طرح حسن فطرت میں گم کر دیتا ہے۔ کہو دیتا ہے اور پہر ہر طرف حسن فطرت ہی نظر آتا ہے۔ اس نے انقلاب فرانس کا خوشگوار آغاز اور خوں ریز انجام اپنی آنکھوں سے دیکہا تہا لہذا اسکا دل مایوسی کیوجہ سے غمگین تہا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں اس المناکی کی جھلک نظر آتی ہے۔

اس کے بعد شیلے ہے۔ یہ قسمت کا ستایا ہوا مظلوم زمانہ کا جلایا ہوا ستم کش۔ اور اپنے وطن کا ٹھکرایا ہوا بیکس و مجبور شاعر ایک عجیب و غریب دل و دماغ لیکر آیا تہا۔ اور اگر اس پر زمانہ مصائب نہ توڑتا تو وہ دور انبساط و بہجت کا ایک بلند نظر پیغمبر ہوتا۔ پہر بہی اس کا وہ کلام جو خود اس کی ذات سے تعلق نہیں رکہتا امید افزا اور مسرت آمیز ہے۔ ہاں جب اس نے خود کے متعلق کچہ لکہا ہے تو ہر حرف سے غمگینی اور المناکی ٹپکتی ہے۔ I fall upon the thorns of life, I bleed (میں زندگی کے خارستان میں الجہ گیا ہوں اور میری رگ رگ خونچکاں ہے) میں نے اپنی زندگی کی تمام اندوہناکیاں اور رنج و غم کی وہ تمام اذیتیں جو اس نے گذاری تہیں پیش کر دی ہیں۔ دوسری طرف انقلاب فرانس اس وقت تک ختم ہو چکا تہا۔ اور جو تین پسندیدہ اور خوشگوار اصول اس کے محرک تھے اب صرف وہی شیلے کے کانوں نے سنے اور محض ان اصولوں کو دیکہکر انقلاب کی طرف سے کسی کو بدگمان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ شیلے نے اس طوفان خون اور سیلاب و زندگی کو نہیں دیکہا تہا اس لئے برخلاف ورڈسورتھ کے اس کے کلام میں غمگینی اور مایوسی کی جھلک نہیں پائی جاتی۔ وہ حقیقی حسن کا متلاشی تہا۔ محدود حسن سے اس کی تسلی نہ ہو سکتی تہی۔ وہ جس حسین عورت کو دیکہتا اس طرف راغب ہو جاتا۔ وہ ایک ایسا حسن چاہتا تہا جس سے افلاطونی یعنی بالکل بے غرض محبت کی جاسکے۔ اس نے ایک مجسمہ حقیقی حسن کا اپنے تصور میں بنالیا تہا اور ہمیشہ اسی کا متلاشی رہا۔ اس کی جستجو ایک ایسی ناممکن الحصول شے کیلئے تہی جسکا علاج سوا موت کے کوئی نہ کر سکتا تہا۔ اور آخر بروقت موت نے اس کی چارہ گری کی۔ اور ان مصائب سے اسکا پیچہا چھڑا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری تخئیلی اور آسمانی ہے۔ اس نے اپنی دنیا زمین سے دور اور زہرہ و مشتری کے قریب بنائی تہی۔ تخئیل کے پروں پر وہ ہمیشہ فضا میں پرواز کرتا رہتا ہے اور یہ اثرات اس کے تمام کلام میں پائے جاتے ہیں۔

کیٹس کی زندگی یونانی علم الاصنام سے بہت زیادہ متاثر ہوئی تہی اور اس کے اثرات اس کے کلام میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ وہ ایک ناکام محبت تہا اسلئے محض حسن و عشق کے نغمے گاتا ہے۔ حسن اس کے نزدیک ایک "دوامی مسرت" ہے۔ ایک جگہ اس نے لکہا ہے Beauty is truth, truth beauty, that is all ye know on earth... and ye need to know (حسن ہی صداقت ہے اور صداقت حسن۔ صرف یہی تم دنیا میں جانتے ہو اور اتنا ہی جاننے کی ضرورت ہے) یہ صرف اسکا خیال ہی خیال نہیں تہا بلکہ عملی زندگی میں اس کا اعتقاد بہی یہی تہا۔

ٹینی سن، تنظیم و سادگی کا دلدادہ، ماضی و مستقبل سے بے نیاز صرف حال کا گرویدہ۔ یہ اس کی زندگی کی چند نمایاں خصوصیات تہیں۔ لہٰذا اس کی شاعری

بھی ان تمام خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔ اس کی زبان سادہ ہے۔ اشعار میں نغم و موسیقی سب سے زیادہ ہے۔ نظموں کے موضوع ہمیشہ عام اور معمولی اختیار کرتا ہے۔ اسلئے کہ اب تمدن و معاشرت میں۔ تہذیب و سماج میں عوام امرا کے مقابلہ میں طاقت اور اثر حاصل کر چکے تھے۔ اور اسوقت کی تہذیب و معاشرت کا اثر نہ محض ٹینی سن کے کلام بلکہ اس کے دور کے ہر قسم کے ادب پر نمایاں ہے۔

براؤننگ ان تمام شعرا میں سب سے زیادہ با امید اور مسرور رہنے کا عادی تھا۔ اس کا اعتقاد تھا کہ ہر بدی کا خاتمہ نیکی پر ہوتا ہے۔ عارضی تکالیف کی وہ پروا نہیں کرتا تھا۔ مدت تک اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ لیکن وہ تمام تنقیدوں سے بے پروا ہو کر اپنا کام کئے گیا اور آخر اس کو آج دنیا مشاہیر شعرا میں شمار کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اس کی یہی عادت ہے جس نے اس سے لکھوایا کہ

Strive, and hold cheap the strain (کوشش کرو اور محنت کو عارضی اور معمولی سمجھو۔)
Learn, nor account the pang; dare (بڑھو اور مصیبت کا خیال نہ کرو۔ جستجو)
Never grudge the throe! (غم و الم کی بغیر پروا کئے ہوئے)

اس کی دلیری اور جوان ہمتی موت کے وقت بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہ خاموشی سے بلا چون و چرا خود کو موت کے قبضہ میں نہیں دینا چاہتا۔

I was ever a fighter, so — one fight more. میں ہمیشہ ایک جنگجو رہا ہوں۔ لہذا ایک جنگ
The best and the last. سب سے آخری اور بہترین جنگ اور سہی)

الغرض ان تمام شعرا کے کلام میں ان کی زندگی کے علاوہ اسی طرح ہم انکی ہم عصر زندگی کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اٹھارویں صدی میں امرا و وظیفہ داروں کا زور تھا۔ نئے نئے زیور قیمتی سامان آرائش مروج تھے۔ اسٹورٹ بادشاہ کی آمد کے وقت سے جو آزادیاں، عریانیاں اور عیاشیاں شروع ہو گئی تھیں انکا رد عمل ہو رہا تھا۔ اس کا اثر اس صدی کے ادب پر بھی ہوا۔ یعنی نظموں کا موضوع عام نہیں ہوتا تھا۔ شاعری میں صنائع و بدائع کی کثرت سے آرائش کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس پر نئے نئے قیود لگائے گئے تھے۔ روزمرہ کے الفاظ شعرا میں استعمال کرنا ممنوع تھا۔ اس قسم کے اثرات تھے جو اسوقت کے ادب پر آجتک نمایاں ہیں۔ اس کے بعد فوراً اسکا رد عمل شروع ہوا۔ عوام کی طاقت و عزت کچھ بڑھ گئی۔ قیود سے لوگ گھبرا اٹھے اور گولڈ اسمتھ جو اٹھارویں صدی ہی کا شاعر ہے وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے درمیان ایک پل ہے اس کا شروع کا کلام بالکل پوپ کے تتبع میں ہے لیکن آخری کلام میں اس انقلاب کا اثر جو انگلستان میں ہو رہا تھا کافی جھلکتا ہے۔ اس کی نظم "ویران گاؤں" اس کی شاہد ہے۔ اسوقت اون کی تجارت بڑھ رہی تھی۔ کاشت کی زمین چراگاہوں میں تبدیل ہو رہی تھی اور غریب کاشتکاروں کو ان کے گھروں سے کان پکڑ کر نکالا جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ آپ کو "ویران شدہ گاؤں" میں ملیگا۔ اس کے بعد ورڈسورتھ اس رد عمل کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور قیود سے آزادی کے سلسلہ میں وہ اس انتہائی نقطہ تک پہونچ گیا کہ اس کی بہت سی شاعری محض مقفیٰ نثر رہ گئی اور شعریت کھو بیٹھی۔ تھوڑے دن ادب اسی انداز پر چلتا رہا کہ آخر براؤننگ نے بالکل نیا انداز اختیار کیا جو اعتباراً ماحول تھوڑے دن بالکل غیر دلچسپ بنا رہا لیکن رفتہ رفتہ لوگ اس کے عادی بن گئے۔

میں نے زیادہ تر انگریزی شعرا سے بحث کی ہے بالکل یہی حال انگریزی نثر کا بھی ہے۔ تہذیب و معاشرت اور تاریخ و تمدن نے بالکل اسی طرح نثر کو بھی متاثر کیا۔ جس دور میں جو ناول، افسانے اور مضامین لکھے گئے ان میں اپنے مخصوص دور کے اثرات اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہاں پر ضروری تھا کہ میں ہر مصنف کی تصانیف لیکر بحث کرتا بخوف طوالت احتراز کرتا ہوں کیونکہ ابھی لکھنا بہت ہے اور وقت کم۔

المختصر الیزبتھ کا دور اور اس کے بعد اٹھارویں صدی کے ادب کو اگر ہم بغور دیکھیں تو اس زمانہ کی زندگی کا اثر اس میں نمایاں پائیں گے۔ یہ دور دولت و آرام عیش و سرمستی کا دور تھا۔ بے فکری تھی خوشیاں تھیں دولت تھی اور عیش تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ کہ اس زندگی میں ہر طرف دلچسپی ہی دلچسپی تھی۔ مسرت ہی مسرت تھی۔ اسلئے اس زمانہ کا ادب تمام کا تمام "رجائی" ہے اس کے بعد جب سائنس کی ابتدا ہوئی تو مذہبی اعتقادات کمزور ہو گئے اور لوگ مذہب و سائنس کے درمیان بھٹکنے لگے۔ مذہب پر یقین کمزور ہو چکا تھا اور سائنس پر پختہ نہیں ہوا تھا۔ ٹینی سن اور میتھو آرنلڈ کے ادب میں یہ شک و شبہ صاف جھلکتا ہے اس کے بعد جب سائنس کی فتح مکمل ہو گئی۔ مذہب کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ خدا کے وجود میں بھی شک کیا جانے لگا ورنہ کم از کم اسکا تصور بجائے ایک رحیم و کریم طاقت کے ایک قہار و جبار طاقت سے ہونے لگا۔ جو تفریحاً انسانی زندگی کو دست بگریباں دیکھتی۔ تالیاں بجاتی اور خوش ہوتی ہے۔ اس کا اثر ہارڈی کے تمام ناولوں میں نمایاں ہے وہ پکا دہریہ ہے اور زندگی کے متعلق اس کا نظریہ متشائم ہے۔ موجودہ دور کا تمام ادب حال کی طرز زندگی کا صحیح مرقع ہے۔

یہ تو رہا انگریزی ادب۔ اب آیئے دیکھیں کہ فارسی ادب پر زندگی کا کیا اثر ہوا۔ جب مسلمان عرب کے ریگستان سے اٹھکر ایک طوفان کی طرح تمام ایشیا پر چھا گئے۔ ہر جگہ ان کی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ ہر جگہ ان کی تہذیب پھیل گئی۔ ہر ملک کا پرانا مذہب اسلام سے تبدیل ہو گیا۔ تاہم آبائی تمدن اور مذہبی قدیم اعتقادات بالکل فنا نہیں ہوئے اور ایک دن وہ آیا کہ پرانے اعتقادات نیا لباس پہنکر تصوف کی صورت میں دنیائے اسلام پر چھا گئے ہر ملک میں تصوف کی لہر شروع ہو گئی۔ ہر طرف صوفی و خانقاہ کا آوازہ بلند

ہوا۔ وہ لوگ بھی جو خود صوفی نہیں تھے ان خیالات سے متاثر ہوئے اور ارادی یا غیر ارادی طور پر وہ خیالات ان کی زبان سے نکل گئے۔ اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی کا قریب قریب تمام ادب تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ مولانائے رومؒ تو خود صوفی تھے ان کی تمام مثنوی مسائل تصوف سے مملو ہے۔ حافظؒ کا کلام بھی صوفیانہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اعلان کرتے ہیں کہ

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید   کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

غرض اُسوقت کے تمام ادب میں آپ یہی پائینگے کہ "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ"! حافظ ہمیشہ ساقی حقیقی سے بادۂ عرفاں مانگتا ہے۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا   کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

اور پھر اس بادۂ عرفاں سے مدہوش ہو کر وہ سرور آمیز نغمے گاتا ہے کہ سننے والوں کو بھی بیخود کر دیں۔ خیامؔ تو ہر وقت میکدۂ عرفاں میں کسی خم کے سہارے بیٹھا جام کے جام خالی کرتا رہتا ہے لیکن اس کی سیری نہیں ہوتی۔ اسکا خالی جام ہر وقت ساقی کیطرف بڑھا رہتا ہے اور اس آتش سیال کے خم کے خم خالی کرکے اپنی مخمور زبان سے ایسے شعلے برساتا ہے کہ ہر سننے والے کے دل میں آگ لگا دیں۔

اگر ایک طرف یہ تحریک تصوف تھی تو دوسری طرف شاہانہ عیش و سرمستی بیفکری کا زمانہ تھا۔ حکومت اپنی تھی۔ روٹی پیٹ بھر کے ملتی تھی لہذا "خمار گندم" کا ہونا لازمی۔ اور اسکا نتیجہ تھا مجازی عشق۔ دنیاوی محبت یہانتک تھی کہ سعدیؒ جیسے درویش عش سیاح نے بھی مفلسی اور تمول کے مکالمہ میں تمول کو فتح دلوائی ہے۔ بڑے بڑے شاعر شاندار قصائد پڑھتے اور بادشاہوں سے انعام واکرام حاصل کرتے۔ اس دولت و تعیش کی فراوانی کا تاریک نتیجہ بر آمد ہوا۔ بجائے عورتوں کے حسین و خوبصورت لڑکے عشق و محبت کا مرکز بننے لگے اور بڑے بڑے بلند پایہ شعرا نے اس عشق کا اظہار کیا ہے۔ سیکڑوں غزلوں کے دیوان تیار ہو گئے اور اگر آپ ان میں سے ان کے معشوق کا حلیہ چھانٹیں تو آپ کو وہ بہت جگہ مَیں بہکتا ہوا اور "سبز خط" کا مالک ملیگا۔

تیسرا خاص اثر جوان کے ادب پر نمایاں ہے وہ تشبیہات و استعارات کا زیور ہے۔ دولت کی زیادتی کے ساتھ ان کی زندگی بھی پر تکلف بنگئی تھی وہ آرائش پسند ہو گئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں آپ دور از کار تشبیہات و استعارات کی بھرمار پائینگے۔ ان کے مضامین نظم و نثر لفظی و معنوی صنائع و بدائع سے مملو نظر آئینگے۔ اس کے بعد جیسے جیسے ان کی حکومت کمزور ہوتی گئی ان کے ادب میں بھی انحطاط آتا گیا۔ اب اس میں ابتدا کی سی بلندی اور علو تخئیل نہیں رہا اور آخر جب ان کی طاقت برائے نام رہگئی تو حساس دل اور دور اندیش نظر نے اسے دیکھا اور کرب اذیت سے ایک دم چلا اٹھی کہ "درد ایراں بے دوا ست"! اب ان کا ادب گل و بلبل سے ہٹکر سیاسیات پر آگیا۔ اب شخصی حکومتیں رفتہ رفتہ غائب ہوتی جا رہی ہیں اور رعایا کے جذبۂ بیداری کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و منزلت اور ان کی بے باکی و جسارت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ زمانۂ ماضی کے خاقانی انوری اور عرفی وغیرہ کے قصائد پڑھیئے اور اس کے بعد صرف یہ شعر کہ "بلکا! خود سری و جور تو ایران سوز است۔ بمکافات تو امروز وطن فیروز است" تو اچھی طرح اندازہ ہو جائیگا کہ موجودہ زندگی نے فارسی ادب کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ دوسرے سیاحت آسان ہونے اور مغربی علم و ادب کی ترقی کیوجہ سے ان کی زندگی جس طرح مغربی تہذیب سے متاثر ہوئی اسی طرح ان کا ادب بھی مغربی ادب سے متاثر نظر آتا ہے یہانتک کہ ان کی لغت تک میں سیکڑوں مغربی الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ یہ ہے ایران کی موجودہ زندگی تمدن اور معاشرت کا ادنیٰ کرشمہ کہ موجودہ ادب دور ماضی کے ادب سے سرتاسر مختلف ہو کر رہ گیا ہے۔ نہ اب اس میں وہ نازک تشبیہات اور بلند استعارات ہیں نہ وہ زور تخئیل۔ یہ سب نتیجہ ہے موجودہ افکار و حوادث اور اضطراب و پریشانی کا۔ اب وہ دن گئے جب ایران میں نازک کمر ساقیہ کا دور دورہ تھا وہ زمانہ گذر گیا جب قومی تفوق، سیاسی برتری تھی اور ساتھ ہی ساتھ عیش تھے، بے فکری تھی اور اس بے فکری کے دور میں دنیا جنت سے بھی عزیز معلوم ہوتی تھی۔ ہر ایک کی خواہش یہی تھی کہ ماضی و مستقبل کو حال میں گم کرکے جسقدر مسرتیں بھی حاصل کی جاسکتی ہیں کر لے" بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد است"، ان کی زندگی جس سرمستی میں گذر رہی تھی اس میں سوا شراب و شباب کے کسی اور چیز کا خیال کفر تھا۔ اسوقت کا ایران ایک ایسا گلزار تھا جس میں ہر طرف رنگین پھول دعوت نظارہ دیتے تھے۔ گلوں کے سایہ دار کنجوں میں اسرار محبت پنہاں تھے۔ کالی گھٹائیں اور مخمور ہوائیں ذوق بادہ خواری کیلئے ایک تازیانہ تھیں۔ جب ایسا گلستاں ہو تو ہر سیر کرنے والا کیوں نہ چلا اُٹھے کہ

چہ خواہم دریں گلستاں گر نخواہم   شرابے کبابے، ربابے، نگارے

اور جب ایسا چمنستان ہو تو پھر جنت کی کون پروا کرتا ہے اور وہاں کی شراب کوثر کا کسے خیال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ میخانہ میں بیٹھا جھوم جھوم کر ساقی سے برابر یہی کہہ رہا ہے کہ

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت   کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

اب تو تہذیب بدل گئی۔ دماغ بدل گیا۔ خیالات بدل گئے۔ اب وہاں کے شاعر کو بجائے انگور کے قوم کی رگوں سے خون ٹپکتا نظر آتا ہے

ساقی کے تغافل کی بجائے اب قوم کی غفلت شاعر کے جذبات کو حرکت دیتی ہے، جھنجھوڑتی ہے اور وہ قوم کی حماقتوں، جہالتوں اور بداعمالیوں کو دیکھکر چیخ اٹھتا ہے کہ "خدا ایں یار گر کارش چنیں ست"۔

اب آیئے دیکھیں کہ عربی زندگی نے وہاں کے ادب پر کیا اثر کیا۔ قبل اسلام عرب مختلف قبائل میں منقسم تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح کسی چشمے یا سرسبز و شاداب چراگاہ کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے نہ ان کا کہیں گھر ہوتا نہ ٹھکانا۔ خیمے اور مختلف سامان اونٹوں اور گھوڑوں پر لدے ہوئے ہیں۔ جہاں ڈیرہ ڈالدیا وہیں گھر ہوگیا۔ چند روز ہے جب دیکھا کہ چشمہ کا پانی ختم ہونے لگا تو ہرکارہ گھوڑے پر سوار ہوکر دور دراز ریگستان میں نکل گیا۔ تاکہ کسی اور چشمہ کا پتہ لگائے۔ اس کی اطلاع پر یہ چھوٹی سی دنیا معہ اپنے تمام ساز و سامان کے وہاں جا ٹھیری۔ جب وہاں سے بھی دل بھر گیا تو کسی دوسری جگہ جا پہونچے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ایک ہی جگہ پر دو قبیلوں کا اجتماع ہو جاتا۔ ان میں نہ تو پردے کا رواج تھا اور نہ عمرانی زندگی کے موجودہ معاشرتی قوانین جو ایک دوسرے سے کھچنا اور تکلف کرنا سکھاتے ہیں۔ دونوں قبیلوں کی لڑکیاں اور لڑکے بے تکلف آپس میں ملتے تھے۔ ابلتا ہوا چشمہ، کھجوروں کے جھنڈ اور ان کے سایہ میں شاداب سبزہ پھر ایسی جگہ جوان آنکھیں ملیں۔ جوان چہرے ایک دوسرے کے سامنے بے نقاب ہوں تو کیوں نہ ان آنکھوں میں سے محبت جھانکنے لگے۔ انکی زندگی محدود ہوتی تھی۔ ان کی دنیا صرف وہی تھی جس کو وہ دیکھتے اور جس میں گھومتے تھے۔ کسی اور دنیا سے وہ بیخبر تھے۔ لہذا وہ اپنی اسی مختصر دنیا میں رہکر تمام زمینی مسرت سے لطف اندوز ہو لینا چاہتے تھے۔ ان کی تمام عمر صحرانوردی کیلئے وقف تھی۔ دن کے وقت آفتاب اور رات میں جھلملاتے ہوئے تارے ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وقت کا تعین ثریا، بنات النعش، اور کیوان و عطارد سے کیا گیا ہے۔ ان کے عقائد و توہمات میں شاعر کا ایک بلند مرتبہ ہے۔ ان کا ایمان تھا کہ شاعر غیب داں ہوتا ہے۔ جب کوئی شاعر کسی قبیلہ میں پہونچتا تو لوگ اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے۔ دعوتیں ہوتیں اور تمام عورتیں اس طرح گاتی بجاتی تھیں گویا کسی شادی وغیرہ کی خوشیاں منا رہی ہیں۔ چھوٹے بڑے ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے پھرتے تھے۔ کیونکہ ان کا یقین تھا کہ ایک شاعر ان کی عزت کا نگہبان، ان کی شہرت کو برقرار رکھنے کا ایک آلۂ کار۔ ان کے ناموس کو بلند کرنے والا اور ان کے کارناموں کو بقائے دوام بخشنے کا ذریعہ ہے۔ مشہور نقاد ابن رشیق کا قول ہے کہ وہ صرف تین موقعوں پر اظہار مسرت کیا کرتے تھے پہلے جب کوئی لڑکا پیدا ہوا۔ دوسرے جب کوئی شاعر پہونچ جائے۔ تیسرے جب کوئی گھوڑی بچھیرا جنے۔ چونکہ ان کے یہاں شاعر کو یہ مرتبہ حاصل تھا اسلئے ہر ہر مصرعہ کو الہامی رتبہ حاصل تھا۔ اور اس کی آواز قبیلوں کی تکمیل و تخریب کا باعث بن جایا کرتی تھی۔

یہ تھی ان کی تہذیب اور ان کی زندگی۔ اب ذرا غور کیجئے کہ انکا ادب کہاں تک اس زندگی کا آئینہ دار ہے۔ جیسا اوپر بیان کیا گیا کہ بعض اوقات اتفاقیہ دو قبیلوں کا اجتماع حسن و عشق کیلئے اور وہ بھی صحرائے عرب کا تابناک اور آتش ناک حسن و عشق ہاں تو خیر اسی حسن و عشق کیلئے ایک مست و رنگین دنیا پیدا کر دیتا تھا۔ عربی محبت ہماری محبت کی طرح عارضی نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کی عربی رگوں میں محبت کی لہر ہمیشہ کیلئے دوڑ جاتی تھی۔ پھر جب ایک قبیلہ رخت سفر باندھتا تو عجیب صورت پیدا ہو جاتی۔ ادہر تو یہ حال کہ دل میں غم و الم کا ایک شدید طوفان برپا۔ پلکوں پر آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرات لرزاں اور یاس آگیں نظریں خاموشی اور حسرت سے بزبان حال گویا کہ

مت کہو یہ کہ یار جاتا ہے　　دل سے صبر و قرار جاتا ہے

ادہر محمل چل پڑتا۔ منقش اور رنگین چادریں جنبش ہوتی۔ محمل کے پردے اٹھ جاتے اور آخری بار عاشق کو پرحسرت ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں نظر آتیں آخری بار مایوس نظریں محبت کا پیغام دیتیں۔ نرم و نازک حنا آلود ہاتھ الوداعی سلام کیلئے آہستہ سے اٹھتا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دلمیں ایک یاد اور دماغ میں ایک تصور رہجاتا اور بس۔ اب سوچئے ایک عاشق کیلئے اس سے زیادہ جاں گداز اور صبر آزما حادثہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے جو ابن قتیبہ اپنی کتاب "کتاب الشعر والشعراء" میں لکھتا ہے کہ "عرب کے قصیدہ گو شعراء اپنی نظموں کا آغاز اجڑی ہوئی بستیوں کے آثار و علائم سے کرتے ہیں۔ پھر گریہ و زاری کے بعد اس ویرانے سے تخاطب کرتے اور اپنے ہم سفر کو کچھ دیر توقف کیلئے مجبور کرتے تاکہ وہ ان لوگوں کا تذکرہ کر سکے جو وہاں عارضی طور پر مقیم تھے ان مقامات سے وہ اپنی محبوبہ کی یاد کو وابستہ کرتے اور درد انگیز طریقہ پر اپنی محبوبہ کی جدائی کا منظر کھینچتے۔ اور اس طرح سننے والوں کے دلوں میں ایک ہلچل پیدا کر دیتے کیونکہ محبت کا گیت انسانی روح کو متحرک کر دیتا ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں عورتوں سے ایک موانست پیدا کر دی ہے اور اسکا مشاہدہ ہم کسی نہ کسی رنگ میں کرتے ہیں خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز۔ اس طرح جب شاعر لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے۔ تو سفر کی تھکن۔ جگارہ۔ دوپہر کی تمازت اور اونٹ کی گری ہوئی حالت کا ذکر کرتا ہے اور جب اسے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اسکا مخاطب اس کی تکالیف کو دور کرنے کیلئے آمادہ ہے تو اس کی مدح الاپتا اور کافی مبالغہ سے کام لیتا ہے کہ کوئی صلہ حاصل کر سکے"۔

چونکہ ان لوگوں نے اپنے ملک کے سوا دوسری چیزیں نہ دیکھی تھیں

لہذا ان میں تکلف نام کو نہیں تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسوقت کے عربی ادب میں جو سامان زیبائش استعمال ہوا وہ اُسی ملک سے لیا گیا ہے۔ ان کے تمام ادب میں مقامی رنگ اور ملکی تشبیہات ملیں گی۔ اس کی محبوبہ کی زلفیں نہ سنبل کی رہیں منت ہیں اور نہ مارہائے سیاہ کی وہ بلا جھجک انہیں کوئلے کی طرح سیاہ کہدیتا ہے۔ لیکن اسلام کے بعد جب عرب بحر روم سے ساحل چین تک پھیل گئے تو ان میں یہ سادگی نہ رہی۔ کیونکہ ان کی زندگی ہی بدل گئی۔ گو انہوں نے سلطنتیں قائم کیں ان میں۔ متنبی، ابو نواس اور ابن زیدون جیسے نغز گو شعراء پیدا ہوئے مگر وہ سادگی اور بے تکلفی کہاں جو اس آزاد معاشقہ میں تھی۔

اگر ہم ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو جا بجا ان کے طرز زندگی کی جھلک ملیگی مثلاً اس زمانہ میں عیسائیت کی ابتدا تھی۔ عورتیں اور مرد دونوں راہب ہوتے تھے ان لوگوں نے انہیں دیکھا تھا لہذا وہ بلا ارادہ اپنے اشعار میں ان کا تذکرہ کر جاتے ہیں۔ امراء القیس لکھتا ہے "میری محبوبہ رات کے وقت تاریکی کو منور کر دیتی ہے گویا وہ راہب نصاریٰ تارک الدنیا کا چراغ ہے" ذرا اس زمانہ کے لباس کو ملاحظہ کیجئے اور محبت کا کرشمہ بھی دیکھئے "میں وہاں سے نکل پڑا۔ میں آگے آگے تھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے اور وہ اپنی منقش چادر سے جس سفر کے مناظر کشیدہ تھے ہم لوگوں کے نقش پا کو مٹاتی جاتی تھی" اور واقعی نقش پا کو مٹانا ضروری بھی تھا۔ وہاں کولتار یا سیمنٹ کی سڑکیں تو تھیں نہیں۔ ریگستان تھا اور سراسر ریگ ہی ریگ اگر نقش پا نہ مٹائے جاتے تو پکڑے جانے کے بعد کا حال سب پر ظاہر ہے۔

عورتیں اسوقت بھی گھر کا کام کاج کیا کرتی تھیں اور مرد باہر کا مگر جو امیر ہوتے تھے ان کی عورتیں آزاد رہتیں اور دن چڑھے تک بستروں پہ پڑی اینڈا کرتی تھیں اس شعر سے اسکا اندازہ لگائیے۔ جب وہ چاشت کے وقت سو کر اٹھتی ہے تو مشک کے ریزے پلنگ کی چادر پہ بکھرے ہوتے ہیں۔ وہ بہت دن چڑھے سو کر اٹھنے والی ہے اور گھر کے کاموں کیلئے پیٹی نہیں باندھتی ہے"

ان کی سادگی کی یہ حد تھی کہ وہ صرف وہی تشبیہات استعمال کرتے تھے جو خالص مقامی ہوتیں۔ اور جن سے انہیں روزمرہ واسطہ پڑتا تھا۔ برسات میں بجلی چمکتی ہے تو کتنی نازک اور پرکیف تشبیہہ دیجاتی ہے کہ "اے میرے رفیق تو نے وہ بجلی دیکھی جو میں تجھے دکھا رہا ہوں جیسے محل میں سے کسی کے دو ہاتھ چمک جائیں" یونانیوں کی طرح اسوقت عرب بھی توہم پرست تھے ان کا عقیدہ تھا کہ عاشق و معشوق کی جدائی سے تھوڑی دیر پہلے اس کے علامات ظاہر ہو جاتے ہیں یا تو کوئی کوا مکان کے سامنے آکر بولے گا یا اسی قسم کی کوئی اور بات ظاہر ہوگی۔ آجکل ہندوستان میں بھی گاؤں کی بڑی بوڑھیاں کوے کے بولنے کو کسی مہمان کے آنے کی علامت سمجھتی ہیں۔ تو خیر عربوں میں اسی لئے جدائی کے کوے (غراب البین) کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ مثلاً "یہ بدشگون طائر سمجھتے ہیں کہ کل صبح ہم لوگ جدا ہونے والے ہیں اور اس کی خبر اس کالے کوے نے دی ہے"

عرب میں دوار نامی ایک ہیکل نما بت تھا جس کے گرد مختلف قبیلوں کی دوشیزہ لڑکیاں جوش عقیدت میں طواف کیا کرتی تھیں۔ قبیلۂ نعاج کی لڑکیاں اس رقص میں زیادہ حصہ لیتی تھیں چنانچہ نابغہ ذبیانی ایک جگہہ لکھتا ہے کہ "یہ سیاہ چشم نیل گائیں (دوشیزہ لڑکیاں) پہچانتی ہی نہیں گویا وہ قبیلۂ نعاج کی ہیں جو دوار کے گرد ناچ رہی ہیں"

اس زمانہ میں اکثر قبائل بر سر پیکار رہا کرتے تھے لہذا ان کے یہاں حسن و عشق کے علاوہ رزمیہ شاعری کا بھی کافی حصہ پایا جاتا ہے۔ وہ شعراء جسوقت میدان کارزار کا نقشہ کھینچتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ تلواروں کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور اسی ضمن میں جہاں کہیں گھوڑوں کا ذکر آجاتا ہے تو بس پھر کچھ نہ پوچھئے۔ امراء القیس کا یہ شعر پڑھئے اور اپنے ادب میں اس کی مثال ڈھونڈھنے میں تمام عمر گذار دیجئے "یہ میرا گھوڑا حملہ آور ہوتا ہے۔ پھر ذرا پیچھے کو ہٹ جاتا ہے۔ دوبارہ آگے بڑھتا ہے اور پھر پیچھے ہٹتا ہے جیسے کسی پہاڑ کی چوٹی سے کسی بڑی چٹان کو نیچے لڑھکا دے"

اس کے بعد اسلام پھیلا۔ عرب تمام دنیا پر چھا گئے۔ انکا ماحول بدل گیا۔ عام خیالات اور زندگی دوسری فضا سے متاثر ہو گئی۔ کچھ تو عرب پہلے ہی سے جنگجو قوم تھی اب اسے اپنے جنگی کارنامے دکھلانے کا اور موقع ملا۔ عشقیہ ادب میں کمی آگئی اب شاعری زیادہ تر رزمیہ ہونے لگی یا مذہبی یہانتک کہ حضرت علی کے دیوان میں بھی مذہب کے دوش بدوش رجزیہ اشعار کافی ہیں۔ یونانی ادب بہت کچھ عربی میں منتقل ہو گیا اور اس طرح اب عربی ادب میں علم و حکمت بھی بہت زیادہ شامل ہو گئی۔ چند صدیوں کے بعد مسلمان کمزور ہوتے گئے۔ اور آخر ان کی سلطنت چھن گئی۔ ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ جب وہ قوم ہی قریب قریب مٹ گئی تو اب انکا ادب کہاں حتیٰ کہ مصر کے علاوہ خود عرب میں بھی عربی ادب مفقود ہے۔ ہاں موجودہ بیداری کے ساتھ ساتھ اب عربی ادب بھی دوبارہ زندہ ہو رہا ہے۔ اور ہمیں تعجب سے کہنا پڑتا ہے کہ اسے دوبارہ زندہ کرنے کا سہرا عرب کے نہیں بلکہ مصر کے سر ہے۔

انگریزی۔ فارسی اور عربی ادب پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب آیئے ہم اپنے قومی ادب کو دیکھیں کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کا مرہون منت ہے۔ ہمارا اردو ادب گو اُردو کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں ہوئی ہے خدا کا فضل ہے کہ اس تھوڑی سی ہی عمر میں ادب بنگیا ہے اور قابل قدر ادب۔ سب سے پہلے تو ہماری زبان ہی زندگی کے مختلف واقعات و واردات کا نتیجہ ہے۔ چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے زمانہ میں مغلیہ بادشاہوں اور شہزادوں کی فرودگاہوں اور لشکر گاہوں کو "اردو" کہا کرتے تھے یہاں تک کہ انکا دارالحکومت بھی اردو کہلاتا تھا۔ اردو کا لفظ مغلوں کی تاخت کے دوران میں باہر کے ساتھ ہندوستان میں آیا۔ مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو وہ اپنا تمدن اور اپنی زبان بھی ساتھ لائے تھے لیکن ہندوستانی تمدن کو نہ وہ اپنے آپ میں دم کر سکے اور نہ ہندوستان کے تمدن میں خود دم ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فاتحین ہندوستان میں نہ اپنی زبان کو عام کر سکے نہ خود ہندوستان کی زبان عام بن سکی۔ بلکہ ان اقوام کے اختلاط سے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ جو مختلف مدارج سے گذرتی ہوئی اردو کہلائی۔ اردو کی ابتدا کے متعلق مختلف آرا ہیں۔ سے صرف ایک رائے جو زیادہ قابل قیاس ہے لکھدینا کافی ہے۔ عبدالغفور نساخ نے رسالہ تحقیق زبان ریختہ (۱۲۷۰ھ) میں لکھا ہے کہ "زبان اردو روزمرہ شہر دہلی کو کہتے ہیں۔ اس شہر میں قدیم الایام سے برابر زبان ہندی مروج تھی۔ ہر شخص اسی زبان میں کلام کرتا تھا جب ۵۸۸ھ میں سلطان معزالدین مشہور بہ شہاب الدین غوری نے ملک ہند پر چڑھائی کی اور راجہ ہند کو شکست دی۔ رائے پتھورا کا کام تمام کیا۔ تمام ہند سلاطین غور کے قبضہ میں آیا۔ رفتہ رفتہ زبان قدیم میں لفظ ترکی اور فارسی ملتا گیا۔ جب محمد شاہ بن تغلق شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو باشندگان دہلی پر ایک نیا ظلم کیا کہ ان کو شہر میں رہنے نہ دیا۔ دیوگیر معروف بہ دولت آباد بھیجدیا اور قبل اپنی سلطنت کے زوال کے ان لوگوں کو دہلی بلا لیا۔ اس نقل و حرکت کے باعث بہت سے الفاظ دکھنی بھی زبان دہلی میں مل گئے۔ یہی انداز گفتگو عہد جہانگیر بادشاہ تک رہا۔ جب شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۴۸ھ میں شہر شاہجہاں آباد آباد کیا تو شاہجہاں آباد میں اطراف و جوانب عالم سے ہر قسم کے ذی علم اور صاحب استعداد اور قابل لوگ مجتمع ہوئے۔ قدیم ہندی متروک ہونے لگی۔ محاورہ میں فرق ہونے لگا۔ زبان اردو کی ترقی شروع ہوئی۔"

الغرض ابتدا میں اردو میں جو لکھا گیا اس پر ہندوستان کی زندگی کا بہت کم اثر پڑا۔ صرف زبان تو ضرور یہاں کے اثر سے ایک نئی پیدا ہوگئی مگر شاعری بالکل فارسی کی تقلید میں شروع ہوئی ہاں امیر خسرو کے چند گیت اور پہیلیاں اور مکرنیاں تو ضرور ہندوستانی زندگی کا مرقع ہیں مگر ان کے بعد جوں جوں زبان میں ترقی ہوتی گئی ہندی الفاظ و تراکیب کم اور فارسی زیادہ بڑھتی گئی اور ہر صنف سخن فارسی ہی کی دوسری نقل ہے۔ تشبیہات و استعارات صنائع و بدائع اور جملہ قسم کی آرائش و زیبائش فارسی سے لیگئی۔ یہانتک کہ سودا کے یہاں بہت سے فارسی اشعار کا لفظ بلفظ ترجمہ تک موجود ہے۔ جب مغلیہ سلطنت کمزور ہوتے ہوتے برائے نام رہگئی۔ مختلف ریاستوں اور حکومتوں میں اس کے ٹکڑے ہوگئے اور ذی علم اور صاحب استعداد لوگ دہلی سے لکھنؤ میں جمع ہوگئے۔ اور غدر کے بعد تو بجائے دہلی کے لکھنؤ ہی ادبی لوگوں کا مرکز بنگیا۔ اب ان پر یہاں کی زندگی کا اثر شروع ہوا۔ لکھنؤ کے نواب ہروقت شراب میں مدہوش اور سیکڑوں بیویوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں گھرے رہتے تھے اور اس طرح ان میں زنانہ پن بدرجۂ اتم موجود تھا۔ عورتوں کی اس بے جا قدر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک بھر کی حسین پیشہ ور عورتیں لکھنؤ میں آکر بھر گئیں۔ ان کی موجودگی سے وہاں کے لوگوں کا مذاق سخن بھی نہایت رکیک اور پست ہوگیا۔ عورتوں کے اس غلبہ سے وہاں کی زبان بھی کچھ زنانی ہوگئی۔ نسوانی تراکیب و محاورات زیادہ استعمال ہونے لگے۔ اور عریاں تغزل بڑے زوروں پر ہونے لگا۔ "حسن لب بام" کے عریاں اور ارزاں ہونے نے لکھنؤ کے ہر من چلے کو شاعر بنا دیا لیکن صرف گل و بلبل والا شاعر۔ ہر ایک کی زبان پر اس قسم کے متبذل اور بیہودہ اشعار رہنے لگے کہ

آئے ہو شب وعدہ تو کھل کے ہنسو بولو کون آج کے دن مانیگا عذر حیا کرنا۔ یا

کل جو ٹوٹی تھی وصل میں چوڑی دل میں چبھتی ہے وہ نشانی آج

اس آزاد عیاشی کا وہ زور ہوا کہ شریفوں کو پناہ ملنی مشکل ہوگئی۔ اگر کوئی لفنگا کسی شریف عورت سے جھگڑتا اور وہ غریب خود کو بچانے کیلئے کچھ ہاتھ پاؤں ہلاتی تو اس زمانہ کے بیہودہ گو شاعر اپنے مطلب کے مطابق اس کی بھی اس طرح توجیہہ کر لیتے کہ

یہی تھا یہی ما تھا پائی کا حاصل کوئی چوم لے منہ کلائی پکڑ کر

جب کوئی شریف عورت برقع میں لپٹی ہوئی گذرتی تو یہ عیاش شاعر اس پر طرح طرح کے آوازے کستے۔ کوئی کہتا

ادھر بھی اک نگاہ ناز اپنے حسن کا صدقہ ترے قربان جانبازی کا ارماں ہم بھی رکھتے ہیں

دوسرا چیختا ہے۔

مشتاق دید سے تجھے پردہ نہ چاہئے ایسا نہ چاہئے اسے ایسا نہ چاہئے

تیسرا چنگھاڑتا ہے۔

اسطرف بھی اک نگاہ اے بندہ پرور دیکھنا نیچی نظروں کا تصدق آنکھ اٹھا کر دیکھنا

جب وہ گرتی پڑتی۔ بچتی بچاتی گھر پہونچ جاتی تو من چلے وہاں بھی

اسکا پیچھا نہ چھوڑتے۔ پیچھے پیچھے دوڑتے جاتے ہیں اور چلاتے جاتے ہیں کہ

انتہا کچھ نظر چرانے کی ایک دغاگر سے عاریہ کبتک

وہ جلدی سے اندر داخل ہو گئی تو اب کھڑکی کے پاس کھڑے صدا لگا رہے ہیں کہ

کبھی تو جھروکے سے تم جھانک لو ہزاروں کھڑے زیر دیوار ہیں

غرض یہ تھی اس زمانہ کی زندگی اور یہ تھی اسوقت کی شاعری۔ جہاں کوئی حسینہ نظر آئی۔ بس اس کے سر ہو گئے اور جھوم جھوم کر فرمانے لگے۔

کیا کسی دن بھی نہ مانی جائے گی کیا یونہی اٹھتی جوانی جائے گی

ایام جاہلیت کی عربی شاعری عموماً بہت زیادہ عریاں اور حیا سوز ہوا کرتی تھی لیکن میں کہوں گا کہ ہماری اردو شاعری اس سے بھی زیادہ غیر مہذب اور عریاں ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے اور سر ندامت سے جھکا کر خاموش ہو جائیے۔

وصل کی شب پلنگ کے اوپر مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں یا

دیکھی شب وصل ناف اس کی روشن ہوئی چشم آرزو کی

لیکن ہر چیز کی حد ہوا کرتی ہے۔ مانا کہ عشق خواہ حقیقی ہو یا مجازی یکساں طور پر متاثر کرنے اور روح کو حرکت دینے والا ہے مگر آخر کبتک؟ جب یہ عشق بڑھتے بڑھتے عیاشی کی حد تک پہونچ گیا اور ایک مدت تک لوگ ہجر کے نالے اور وصل کے شادیانے سنتے سنتے تھک گئے تو وہ اس گل و بلبل کی داستان سے گھبرا کر چیخ اٹھے ادہر مسلمانی سلطنت کے بعد مغربی حکومت قائم ہوئی۔ حکومت کے ساتھ مغربی ادب اور مغربی تہذیب بھی آئی اور اس تہذیب نے یہاں کی زندگی کو متاثر کرنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے خیالات پر بھی اس کا اثر پڑا اور خیالات کے ساتھ ادب پر بھی۔ حالی۔ محمد اسمٰعیل میرٹھی محمد حسین آزاد۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ سر سید اور شرر وغیرہ قسم کے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی متفقہ کوشش سے اردو ادب کا رخ پھیر دیا۔ بجائے غزلوں کے مختلف مضامین پر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ باغ و بہار۔ فسانۂ عجائب اور داستان امیر حمزہ قسم کی داستانوں کے بجائے نذیر احمد کے اصلاحی افسانے۔ سر سید کے فلسفیانہ مضامین۔ اور شرر کے تاریخی و ادبی ناول لکھے گئے۔ مغربی تعلیم کے ساتھ عورتوں کی تعلیم پر بھی زور دیا گیا۔ عورتوں کی تعلیم کے ساتھ ان کی مساوات اور ان کے حقوق کا مسئلہ بھی بروئے کار آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں نے بہت کچھ آزادی حاصل کر لی۔ اور اب وہ بھی اردو ادب میں حصہ لینے لگیں۔ ہمدرد اور احساس دل رکھنے والے مردوں نے بھی عورتوں کی مظلومیت کا احساس کیا۔ اگر ایک طرف محترمہ ز۔ خ شروانیہ (علیگ) قسم کی عورتوں نے "آئینۂ حرم" بنکر مردوں سے اپیل کرتے ہوئے اپنی بیکسی و اسیری کی داد چاہی تو دوسری طرف مردوں نے بھی ان کی ہمت افزائی کی اور اپنے مختلف مضامین افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ سے ان کی بیچارگی و کس مپرسی کی حالت لوگوں کے سامنے پیش کر کے ان کی اپیل کی تائید کی۔ سیاسی پستی نے اقبال جیسے شاعروں کو قوم کا رہنما بنایا جس نے اپنے فلسفہ کی چٹان پر کھڑے ہو کر صور بیداری پھونکا اور سوئی ہوئی قوم کو بار بار۔ پے در پے یہ کہکر انگڑائی لینے پر مجبور کر دیا کہ

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز از خواب گراں۔ خواب گراں۔ خواب گراں خیز

اس نے حکومت کی ساحری کو بے نقاب کر دیا اور صاف الفاظ میں بتا دیا کہ۔

ساحر الموط نے تجھکو دیا برگ حشیش اور اے ناداں! اسے سمجھا ہے تو شاخ نبات

دوسری طرف مغربیت کی بڑھتی ہوئی وبا نے راشد الخیری مرحوم جیسی ہستیوں کو اس کی اصلاح کی طرف متوجہ کر دیا۔ وہ عورتیں جو مغربی طوفان میں بہی جا رہی تھیں اس سے بچانے کیلئے انہوں نے اپنے زور قلم سے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنائیں جنہوں نے خوشی سے ان کی کشتی پر آنا منظور کیا ان کو وہ دریائے مواج کی ہلاکت آفرینیوں سے بچا کر ساحل سلامتی پر لے آئے۔

سلطان العلوم تاجدار دولت آصفیہ کی متبرک اور مفید کوششوں سے مغربی علوم و حکمت بھی اردو ادب میں تبدیل ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا ادب صحیح معنوں میں ایک مفید اور قابل قدر ادب بنگیا۔ یہاں تک کہ اس کا اثر پرانی غزل بازی پر بھی کافی حد تک پڑا۔ دور از کار تشبیہات و استعارات کے گورکھ دہندے سے نکلکر اردو ادب میں بہت کچھ سادگی آ گئی۔ غزلیات میں وہ قدیم عریانی و بے حیائی نہیں رہی بلکہ ایک جدید رنگ میں غزلیں لکھی جانے لگیں۔ واجبات عاشقی بھی بدل گئے۔ پہلے شب و روز رونا۔ محبوب کا نام لے کر چلانا اور ہمیشہ وصل وصل کی رٹ لگانا عاشقی کے لوازمات تھے مگر اب۔۔۔۔

غسل کرنا خون سے پھر خاک پر پڑھنا نماز اے اسیر شرع یہ ہیں واجبات عاشقی

پہلے دن رات رقیبوں سے چلا کرتی۔ دربانوں سے جھگڑا ہوا کرتا اور خواہ رقیب بھائی بھائی ہی کیوں نہ ہوں ایک دوسرے کا جانی دشمن ہوتا تھا مگر اب رواداری کا یہ عالم ہے کہ

نزاع کفر و ایماں کیا برہمن کیا مسلماں کیا بہت آگے ہوں اب میں کلمۂ حق و باطل سے

پہلے محبوب کے در پر جبیں فرسائی اور دہیں جبہہ سائی کرتے کرتے ختم ہو جانا پست ہمت لوگوں کا کام تھا لیکن اب بلندی عزم اور علو ہمت یہ کہلوا رہی ہے کہ

عقیدت کی بلندی پر نئی دنیا بناؤں گا میں سجدوں میں اٹھا لایا ہوں خاک آستانوں کی

پہلے عاشق کی آرزوئیں نفس پرستی اور بوالہوسی کی سرمایہ دار ہوا کرتی تھیں وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ "

کیا بات ہے گر بوسۂ لب کر کے عنایت تم مجھسے کہو بس میں کہوں تم سے نہیں اور

کسی کی آرزو ہوتی تھی کہ

مزا جب ہے کہ اس انداز سے ہوں پیار کی باتیں ہمارا ہاتھ سینہ پر تمہارا ہاتھ گردن میں "

اور کوئی کہتا تھا کہ "

مدت سے آرزو ہے کہ صبح شب وصال　　یہ ہنس کے پوچھتا کوئی ارمان اور ہے

یہانتک کہ غالب نے بھی ناکامی وصل سے تنگ کر ایک روز کہہ ہی دیا کہ

ان پری زادوں سے لینگے ہم جنت میں انتقام　　قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

مگر اب حور و قصور کچھ بھی نہیں چاہیئے۔ بس

میں تیرے قدموں کے صدقے کہاں کے حور و قصور　　جھکا ہوا یونہی فرق نیاز رہنے دے

اب نہ وصل کی آرزو ہے نہ گردن میں ہاتھ ڈالنے کی خواہش اور نہ "بوسۂ لب" کی تمنا۔ نہ دنیا چاہیئے نہ عقبیٰ۔ غرض تمام دولت کونین، تمام لذائذ دنیا اور نعائم عقبیٰ میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں بس اب تو یہی درخواست ہے کہ"

لٹادے دولت کونین اور میرے لئے　　بس اک تبسم عاجز نواز رہنے دے

پہلے کی محبت جس قسم کی ہوتی تھی اس کی نہایت صحت کے ساتھ ہم یہ تعریف کر سکتے ہیں کہ

جوانی کا پر جوش طوفاں محبت　　حرارت بھرے دل کا ہیجان محبت

یہ ہے نفس کے دیو سے زیر ہونا　　جواں آدمی کا شکم سیر ہونا

مگر اب کی محبت کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ

محبت ہے ایک آسمانی لطافت　　کثافت کی سب بستیوں سے فراغت

وہ جوہر ہے بے لوث جذبات دل کا　　وہ مرکز ہے پر نور ذرات دل کا

وہ فطرت کا ایک لمعان کرم ہے　　وہ اک جاودانی بہار ارم ہے

پہلے کا نسوانیت سے متاثر اور بزدل شاعر محبوب سے بھی شکوہ شکایت کرتے ہوئے ڈرتا تھا مگر موجودہ بلند ہمت اور دلیر شاعر خدا سے بھی "شکوہ" کرنے میں نہیں جھجکتا۔ یہ ہے گذشتہ اور موجودہ زندگی کا فرق اور اسی مناسبت سے ماضی وحال کے ادب کا فرق۔ القصہ یہ ہے مختصر سا خاکہ ہمارے مضمون کے صرف ایک رخ کا یعنی ہم نے سرسری طریقہ سے دیکھ لیا کہ کہاں تک تاریخ وتمدن۔ تہذیب ومعاشرت کسی قوم کے ادب پر اثر انداز ہوتی ہے اور ہوئی۔ اب تک ہم نے صرف اس سے بحث کی ہے کہ مختلف قوموں کی اجتماعی یا کسی ادیب اور شاعر کی انفرادی زندگی نے اس کے ادب کو کہاں تک متاثر کیا۔ اب آئیے دیکھیں کہ کسی قوم کی زندگی پر اس کے ادب کا کیا اثر ہوتا ہے اور کیا اثر ہوا ہے۔ یہ دیکھنے کے بعد زندگی اور ادب میں جو گہرا اور ناقابل سقوط تعلق ہے اچھی طرح سمجھ میں آجائیگا۔

ادب کا اثر زندگی پر

ادب نے جب کبھی زندگی کو متاثر کیا ہے تو اسوقت جب وہ عین اپنے شباب پر ہوا ہے اور صرف یہی نہیں کہ جس ملک یا قوم کا ادب ہے وہ صرف اسی ملک یا قوم کی زندگی کو متاثر کرے۔ بلکہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک ملک کے ادب نے تمام دنیا کی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ مثلاً پندرہویں صدی عیسوی میں اٹلی کا ایک مصنف میکاولی The Prince لکھتا ہے جس میں بادشاہوں کے متعلق جائز وناجائز طریقہ سے طاقت حاصل کرنے کی تبلیغ کی گئی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سترہویں صدی تک قریب قریب تمام یورپ کے بادشاہ اس کے فلسفہ پر عمل کرتے رہے اور اس عمل کے نتیجہ میں مذہب سماج اور معاشرت میں بہت سے غیر معمولی انقلاب رونما ہوئے۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد جب یونانی حکیم وادیب معہ اپنی حکمت وادب کے وہاں سے بھاگ کر تمام یورپ میں پھیل گئے تو ان کے ادب نے یورپ بھر کے ادب کو متاثر کیا اور اس طرح بالواسطہ یورپ میں دور نہضت شروع ہو گیا جس نے تمام یورپ کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں مغربی ادب نے وہ زور حاصل نہ کیا تھا جو زندگی پر خاص اثر کر سکے بلکہ وہ خود زندگی سے متاثر تھا اور مذکورہ دونوں صدیوں کا ادب اپنے مختلف عہدوں کا آئینہ دار ہے۔ انیسویں صدی میں انگلستان میں گاڈون پیدا ہوا جس نے Political Justice لکھکر انگلینڈ کی طرز زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر کے رکھدیا۔ شیلے اور کیٹس وغیرہ بھی اسی کے مرید تھے۔ ادھر گاڈون کی بیوی نے عورتوں کے حقوق اور آزادی کی تبلیغ کی اس طرح سب نے مل کر انگریز مرد اور عورتوں کی رگوں میں ایک انقلابی لہر دوڑا دی اور ہر طرف سے انقلاب انقلاب کی صدا بلند ہونے لگی۔

فرانس میں روسو اور والٹیر نے انقلابی رسالے تصنیف کئے۔ ٹامس پین Pain نے "انسانی حقوق" Rights of men ــــــ لکھی اس سر تا سر انقلابی ادب کا یہ اثر ہوا کہ تمام رعایا بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہر طرف موت کا بازار گرم ہو گیا۔ ہر "انقلاب زندہ باد" کے بلند و پر جوش نعروں سے گونج اٹھی۔ نپولین تلوار لیکر اٹھا اور ابر و باد کا طوفان بنکر تمام یورپ پر چھا گیا اور روس سے لیکر مصر تک تمام ملکوں کو روند ڈالا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ بلا ٹلی لیکن آزادی ومساوات کا خیال لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر نقش کالحجر بنگیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دنیا کے تمام ملکوں کا طرز حکومت بدل گیا ــــــ The Prince کے فلسفہ کو شکست ہو گئی۔ طرز حکومت کی تبدیلی کے ساتھ رعایا کی معاشرتی اور عمرانی زندگی میں بہت کچھ انقلاب آگیا۔

اب اس کے بعد وہ ادبی دور آیا جو تاریخ میں عہد وکٹوریہ کے نام سے مشہور ہے۔ صنعت وحرفت کے انقلاب کے بعد لوگوں کی عمرانی زندگی میں جو خرابیاں اور کمزوریاں آگئی تھیں انہیں ڈکنس نے اپنے ناولوں میں

پیش کر کے ان کی اصلاح چاہی۔ پے درپے اس نے بااختیار لوگوں کو ان برائیوں کی طرف توجہ دلائی اور اس کے نتیجہ میں ـــــ Poor Laws وغیرہ قسم کے قوانین بننے لگے "صنعتی انقلاب" کے بعد سے غریب کاریگروں اور صناعوں کے ہاتھ سے روزگار چھنکر سرمایہ داروں کے قبضہ میں پہونچ گیا تھا اور اس کی وجہ سے غریب مزدوروں کی زندگی وبال جان بنی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ حکومت میں بھی ان کی آواز نہ تھی۔ اس مظلومیت سے متاثر ہوکر کارلائل اور رسکن جیسے آتش قلم اور آتش زبان اپنا شعلہ بار ادب لیکر اٹھے! سرمایہ داری کے خلاف ایک عام جہاد شروع ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غریبوں اور مزدوروں کی زندگی بہت کچھ سدھر گئی۔ ان کے آرام وفائدے کیلئے حکومت نے قوانین بنائے اور رفتہ رفتہ حکومت میں ان کی آواز بھی شامل ہوگئی ..... عہد وکٹوریہ کے آخری اور بیسوی صدی کے اوائل میں ایک اور مصنف بھی اسٹیج پر چمکا اور وہ ہارڈی تھا اس کا تمام کا تمام ادب متشائم کیفیت کا حامل ہے۔ اس نے اپنے ناولوں میں قسمت وتقدیر کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ نیچری تھا اور اسکا تمام ادب بھی اسی دہریت کا سرمایہ دار ہے۔ اس کے ادب کا اثر زندگی پر یہ ہوا کہ دہریت کا ایک علیحدہ اسکول ہی قائم ہوگیا۔

ادھر روس میں میکسم گورکی۔ چیخوف اور دستووسکی جیسے اشتراکی ادیب پیدا ہوئے اور ان کے ادب نے تمام ملک میں اشتراکیت کی لہر دوڑا دی۔ مذہب ان کی تہذیب میں کوئی چیز نہیں۔ صرف اشتراکیت ہے خواہ اسی کو مذہب کہو یا اخلاقیات کے نام سے تعبیر کرو۔ یہ تینوں مذکورہ ادیب غضب کے حقیقت نگار (ـــــ Realists) ہیں۔ ان کے ادب کا اثر محض روس ہی پر نہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رفتہ رفتہ تمام دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے۔ اگر تمام دنیا بالشوزم کو دبانے کی اسقدر متفقہ کوشش نہ کرتی تو اب تک تمام ملک اسی رنگ میں اچھی طرح رنگے جا چکے ہوتے۔ اور اگر جواہر لال نہرو اپنی کوشش میں کامیاب ہوگئے تو ہندوستان بھی شاید چند سال میں اشتراکی بنجائیگا۔ الغرض یہ رہا مغربی ادب کا اثر زندگی پر۔ اب آیئے عربی ادب کو دیکھیں کہ اس نے زندگی پر کیا اثر کیا۔

عرب میں عموماً دو قسم کا اور اسلام کے بعد تیسری قسم کا بھی ادب عرب کی تاریخ میں ظاہر ہوا یعنی رزمیہ، بزمیہ اور مذہبی۔ وہاں شاعر قبیلے کا دیوتا ہوتا تھا۔ حسین عورتیں اس کی پرستش کرتی تھیں اس لئے کہ وہ انکے حسن وجمال کے راگ گاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس نازک وجمیل جنس کا مشہور مداح عمر و ابن ابی ربیعہ کا انتقال ہوا تو حسین لڑکیوں میں ایک کہرام مچگیا۔ وہ نالہ وشیون کرتیں اور کہتی جاتی تھیں کہ "اب کون ہے جو ہماری جنس کے حسن وجمال کا راگ گائے گا اب کون ہے جو ہماری صنف کی رعنائیوں اور دلربائیوں کی توصیف کریگا!" ..... مرد شاعر کو پوجتے تھے اسلئے کہ وہ ان کے قبیلے کا نام روشن کرنیوالا تھا۔ کسی ایک قبیلہ کی مدح یا ہجو میں اس کا ایک شعر قیامت کا کام کرتا تھا۔ مثلاً عرب میں قبیلہ نمیر نہایت ہی معزز قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب کسی شاعر نے اس کی ہجو میں یہ شعر کہا کہ "

فَغُضِّ الطَّرْفَ اِنَّكَ مِنْ نُمَيْرٍ   فَلَا كَعْبًا بَلَغْتَ وَلَا كِلَابَا

تو تمام ملک میں رسوائی کا یہ عالم ہوگیا کہ اگر لوگ اس قبیلہ کے کسی آدمی سے اس کا نام پوچھتے تو نمیر کا نام چھوڑکر اوپر کی پشتوں کے نام بتاتا حتیٰ کہ آخر اس قبیلہ کا نام ہی دنیا سے محو ہوگیا۔ الغرض عربی شعراء کے ایک ایک شعر نے زندگی اور لوازمات زندگی پر بڑا اثر ڈالا ہے بعض اوقات تو یہاں تک ہوا ہے کہ ایک شعر نے ایک عظیم انقلاب پیدا کر کے رکھدیا ہے۔ رسالہ نگار سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں دیکھئے اور پھر اس بے پناہ اثر کا اندازہ لگائیے

ابتدائے اسلام میں عورت ومرد دونوں باہم ملتے جلتے تھے یہاں تک کہ کعبہ میں بھی دونوں دوش بدوش نظر آتے تھے اور طواف میں ایک کا شانہ دوسرے شانہ سے رگڑ کھاتا تھا۔ سلیمان ابن عبدالملک اموی کے عہد خلافت میں خالد بن عبداللہ القسری مکہ کا سردار تھا اس کے کانوں تک کسی شاعر کے یہ اشعار پہونچے کہ "کیسا پیارا ہے یہ موسم۔ کیسی پیاری ہے مسجد کعبہ اور کیسی پیاری ہیں وہ عورتیں جو حجر اسود کو بوسہ دینے کے وقت ہم کو گھر لیتی ہیں"۔

خالد نے یہ شعر سنکر کہا کہ خیر آیندہ سے وہ تم کو نہیں گھیر یںگی۔ اور حکم دیا کہ مرد وعورت میں تفریق کردیجائے۔ چنانچہ یہ جدائی جو اس وقت قائم ہوئی تھی اب تک باقی ہے۔

ایک غریب عرب کی تین لڑکیاں جو شکل وصورت کے لحاظ سے بھی قابل لحاظ نہ تھیں ان کے لئے شوہر نہ ملتے تھے مجبوراً ان کے والدین مشہور شاعر اعشیٰ کے پاس گئے اور اپنی داستان غم سنائی وہ فوراً اٹھا اور سوق عکاظ میں جاکر ایک قصیدہ ان لڑکیوں کی تعریف میں سنایا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر نے ابھی قصیدہ ختم نہیں کیا تھا کہ تینوں لڑکیوں کو شوہر مل گئے۔

عراق کا ایک تاجر مدینہ آیا۔ اس کے تمام نقاب فروخت ہوگئے لیکن سیاہ نقابوں کو کسی نے نہیں پوچھا وہ مسکین الداری شاعر کے پاس گیا جو کسی وقت اپنی عیش پرستیوں اور رنگ رلیوں کیوجہ سے بہت مشہور تھا لیکن اب تائب ہوکر مسجد میں گوشہ نشین ہوگیا تھا۔ تاجر کا حال سنکر وہ مسجد سے باہر آیا۔ اپنا لباس زہد وتقویٰ اتار کر دی رندانہ وضع اختیار کی۔ اور اپنے ایک دوست کو یہ تین شعر سنا کر کہا کہ شہر کے مغنیوں کو جاکر سنادو۔

"اس معشوقہ ملیح رنگ سے جو سیاہ نقاب ڈالے ہوئے ہے کہدو کہ تو نے

ایک فقیر گوشہ نشین کا کیا حال کر دیا۔ وہ تو اپنا دامن سمیٹ کر عبادت کیلئے ایک گوشہ مسجد میں بیٹھ گیا تھا کہ تو دفعتاً سامنے آگئی اور نماز و روزہ سب غارت کر کے رکھدیا۔ پھر لے حسینہ! تجھے واسطہ ہے دین محمد کا کہیں ایسا نہ کرنا کہ تو اسے قتل کر دے۔"

جسوقت یہ اشعار مدینہ کی گلیوں میں پہونچے تو سب کو یقین ہو گیا کہ دارمی واقعی کسی سیاہ نقاب والی پر عاشق ہو کر مسجد سے باہر آگیا ہے اور تمام مدینہ میں کوئی ملیح رنگ لڑکی ایسی نہ رہگئی جس نے اس تاجر سے سیاہ نقاب خرید کر اپنے چہرہ پر نہ ڈالا ہو۔ اس کے بعد سے سیاہ نقاب فیشن میں داخل ہو گیا۔

ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں خالد القسری عراق و خراسان کا حاکم تھا۔ اسوقت عام دستور تھا کہ مسجدوں میں بلند مینار ہوتے تھے اور ان پر کھڑے ہو کر مؤذن اذان دیا کرتے تھے۔ اتفاقاً خالد نے کسی شاعر کے یہ شعر سن لئے کہ۔۔۔۔ "کاش میں بھی ان موذنوں میں سے ہوتا جو اونچے میناروں پر کھڑے ہو کر آس پاس کی چھتوں پر نظر ڈالتے اور وہیں سے عشوہ طراز ملیح لڑکیوں سے اشارہ بازی کرتے ہیں" فوراً خالد نے حکم دیا کہ تمام مساجد کے مینار منہدم کر دئے جائیں۔

امیر معاویہ مصروف جنگ ہیں اور دشمن کے ہجوم نے اس قدر تنگ کر دیا ہے کہ سوائے فرار کے کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن ٹھیک اسوقت ابن الاطنابہ انصاری کا یہ شعر ان کے کانوں تک پہونچتا ہے۔

ابت لی عفتی وابی بلائی واخذی الحمد بالثمن المربیح

اور وہ نئے جوش کیساتھ حملہ کر کے دشمن کو شکست دیدیتے ہیں۔

خلیفہ سفاح ستر امراء بنی امیہ کے ساتھ بیٹھا ہوا کھانے کا انتظار کر رہا ہے کہ دفعتاً ایک شاعر اندر آتا ہے اور مظالم بنی امیہ کا ذکر کر کے یہ شعر پڑھتا ہے۔

اذکروا مصرع الحسین وزیدا وقتیلا بجانب المهراس

سفاح یہ سنتے ہی اتنا برہم ہو جاتا ہے کہ تمام امراء بنی امیہ کو ایک دم قتل کرا دیتا ہے۔

رشید، مالک بن طوق کے قتل کا حکم دیتا ہے اور جسوقت جلاد اسے قتل کے لئے سامنے لاتا ہے وہ گردن جھکا کر یہ شعر پڑھتا ہے۔

اری الموت بین النطع والسیف کامنا یلاحظنی من حیثما اتلفت

وما بی من خوف اموت وانی لاعلم ان الموت شیء موقت

ولکن خوفی صبیة قد ترکتهم واکبادهم من حسرة تتفتت

رشید رونے لگتا ہے اور کہتا ہے "میں نے تیری لڑکی کا صدقہ تجھے معاف کر دیا۔ جا اور اب پھر لوٹ کر یہاں نہ آنا"

عرب کی تاریخ ادب میں بہت سے اس قسم کے واقعات ہیں لیکن ہمارے مطلب کے لئے یہ چند مثالیں کافی ہیں ان سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ عربوں کی تہذیب و تمدن۔ رسم و رواج۔ عمرانیت و معاشرت پر کتنا گہرا اور بے پناہ اثر ڈالا۔ اسلام کے ساتھ عربی ادب میں ایک بے بہا چیز کا اور اضافہ ہوا اور وہ قرآن مجید ہے۔ عربی زبان میں جتنی بھی فصاحت و بلاغت ہے یا ہو سکتی ہے۔ جتنے صنائع و بدائع ممکن ہیں وہ سب اس کتاب میں موجود ہیں۔ اور دریا کو کوزہ میں بند کرنے کا صحیح مفہوم فی الحقیقت اسی متبرک صحیفہ کو دیکھنے سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگرچہ اور عربی ادب کی طرح اسے شعر و شاعری سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ وہ کسی انسانی دماغ کی پیداوار ہے۔ تاہم عربی ادب میں ضرور شامل کی جاسکتی ہے۔ اور اس مقدس کتاب نے محض عرب قوم ہی کی نہیں بلکہ تمام دنیا کی زندگی کو مجموعی طور پر جس طرح اور جتنا متاثر کیا ہے کر رہی ہے اور آیندہ کرے گی اسے اگر بیان کیا جائے تو سیکڑوں ضخیم جلدیں بھی ناکافی ہونگی۔ اور دوسرے وہ عالمگیر اثر اہل نظر سے پوشیدہ بھی نہیں۔ بے تعصب اور وسیع نظر دل اس کے اثر کا اعتراف کریگا۔ عرب کے وحشیوں اور درندوں کو تمدن کا سبق کس نے دیا؟ جانوروں کو انسان اور انسانوں کو فرشتہ کس نے بنایا؟ دنیائے انسانیت کو پستی کے اسفل السافلین سے نکال کر عرش عروج پر کس نے پہونچا دیا؟ مغرب کے ظلمتکدہ کو اپنی صرف ایک شعاع غلط انداز سے کس نے جگمگایا؟ آج غریبوں کا خون چوسنے والے سرمایہ داروں اور سود خوار مہاجنوں کے خلاف دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک آواز بلند ہو رہی ہے۔ مگر کیا یہ کوئی نئی چیز ہے سود لینے کے ساتھ دینا بھی حرام ٹھرانے میں کیا مصلحت تھی؟ اخوت و مساوات جس کے لئے دنیا آج اس زور شور سے چلا رہی ہے۔ تیرہ سو برس ہوئے دنیا میں سب سے پہلے اسی کتاب نے پیش کی تھی۔ اشتراکیت کی تمام اسکیمیں اور تحریکیں زمانہ ماضی سے لیکر آجتک ناکام رہیں اور رہینگی لیکن اس کتاب کے اصولوں پر مساوات ہمیشہ کامیاب ہوئی اور ہوگی جینوا کی بین الاقوامی لیگ ریگستان عرب کے شہر مکہ کی اس بین الاقوامی لیگ کی بھونڈی اور بیکار نقل ہے جس کا سالانہ منعقد ہونا اس کتاب نے فرض قرار دیا ہے۔ آج مغرب کا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے یہ نظریہ ہم نے بنایا کہ "مرد و عورت ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اور جس طرح علم حاصل کرنیکا حق مردوں کو ہے اسی طرح عورتوں کو بھی ہے" تیرہ سو برس پہلے کی لکھی ہوئی کتاب اٹھا کر ان مغرور مدعیوں کو دکھلا دیجئے کہ یہ کیا لکھا ہے "هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" ما (تم انکا لباس ہو اور وہ تمہارا لباس) اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ "

طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ (طلب علم ہر مسلمان مرد و زن پر فرض ہے)۔ الغرض اس کتاب نے دنیا کی تہذیب تمدن میں جو حصہ لیا وہ ظاہر ہے اور گذشتہ سے اندازہ لگا کر ہم بہایت یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آیندہ دنیا کی زندگی کو پہلے سے بھی زیادہ متاثر کریگی یہ رہا عربی ادب کا اثر زندگی پر۔ اب آیئے سرسری طور سے فارسی گزرتے ہوئے اردو ادب کو دیکھیں۔

فارسی قدیم ادب جیسا کہ بیان ہوا زیادہ تر مذہب اور تصوف سے تعلق رکھتا ہے یا اس میں عشقیہ غزلیں اور مدحیہ قصائد ہیں۔ پھر یہ سب چیزیں بھی ایسی نہیں جن کا زندگی پر کچھ نمایاں اثر پڑا ہو۔ ہاں صوفیانہ ادب کا یہ اثر ضرور ہوا کہ لوگوں کے خیالات زیادہ صوفیانہ ہو گئے اور بہت روز تمام ایران پر تصوف چھایا رہا۔ جب ایران میں صفوی خاندان کی حکومت شروع ہوئی تو اس کے ساتھ تصوف میں کچھ کمی آنا شروع ہوئی۔ لیکن اس کمی کا اوسط عشقیہ شاعری نے پورا کر دیا۔ الغرض فارسی ادب شروع سے لیکر موجود دور تک قریب قریب یکساں رہا۔ ایک طرف تصوف سلاطین کے قرب کو ممنوع قرار دے رہا تھا دوسری طرف بلند پایہ شعرا بادشاہوں کے درباروں میں مستقل طریقہ سے قصیدے پڑھ رہے تھے۔ ایک طرف سعدیؒ نے سلاطین کی طرف سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر پند و نصائح شروع کئے۔ ان کا کچھ اثر ہوتا لیکن دوسری طرف قصائد و غزلیات کے شور نے کچھ سننے نہ دیا دو مخالف طاقتیں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہیں اور اس طرح ایک بھی اپنا اثر زندگی پر نہ چھوڑ سکی۔ جب اس طرح ادب روز بروز کمزور ہوتا گیا تو اسی کے ساتھ ساتھ قوم بھی پستی کی طرف گرتی گئی۔ آخر مغربی ادب کا اثر کہئے یا خوش قسمتی سمجھئے کہ موجودہ دور میں چند شاعر و ادیب ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اس قومی پستی کا احساس کیا۔ اس کے اسباب معلوم کئے اور ایک انقلابی ادب قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ اگرچہ اب پہلے کی سی رنگینی اور حسن آفرینی تو نہیں تاہم جو کچھ انہوں نے محسوس کیا اسے صاف و سادہ الفاظ میں بالکل اسی طرح بیان کر دیا۔ حقیقت ہمیشہ اثر کرتی ہے۔ اور حقیقت کیلئے کسی مبالغہ یا بیکار زیبائش کی ضرورت نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے ۔۔۔ نالہ پابندِ نے نہیں ہے

تو پھر ان کی دکھ بھری آواز کیوں "پابندِ نے" ہوتی۔ محض تخئیلی نہیں بلکہ حقیقی کرب و اضطراب اس نالہ و فریاد کا محرک تھا۔ لہٰذا اس نے سننے والوں پر اثر کیا اور کرنا چاہئے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ایران میں بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ہمارے بدقسمت ہندوستان سے کئی گنا زیادہ وہ پہلے زینے پر کھڑے بام ترقی پر نظریں جمائے ہوئے ہیں اور اگر یہ ہمت برقرار رہی تو بہت جلد ہم انہیں وہیں دیکھیں گے جہاں سنتے ہیں کہ ہمارے آبا و اجداد کا مسکن تھا۔ اور وہ "میراثِ خلیل" جو "تثلیث کے فرزندے گئے" پھر اس کے صحیح وارثوں کو ملجائیگی۔

غرض پہلے جب بادشاہوں اور رئیسوں کی مدح میں ایسے ایسے قصائد پڑھے جاتے تھے کہ ممدوح کو اگر خدا نہیں تو کم از کم خدا کے قریب تو ضرور پہونچا دیا جاتا تھا۔ تو بادشاہ خود کو سب سے بلند اور قوی طاقت سمجھنے لگتے تھے۔ بیجا تعریف سے ہر شخص مغرور ہی ہو جایا کرتا ہے اگر بادشاہ خود کو خدا سمجھنے لگے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اس وقت اس کا ہر لفظ قانون ہوتا تھا۔ وہ جو چاہتا کرتا۔ رعایا میں سے کسی کو زبان ہلانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اگر وہ ظالم ہوتا تو رعایا کو خاموشی سے اس کے تمام مظالم برداشت کرنا پڑتے تھے۔ وہ اُف بھی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن اب رنگ بدل گیا۔ اب جسارت و دلیری بڑھ گئی ہے۔ اب اگر بادشاہ ظلم کرے تو شاعر بیساختہ اور بے خطر یہ لکھ دیتا ہے کہ

کشتِ ملت را گر دی ز تخم پاک درو ۔۔۔ شد کہن قصۂ چنگیز ز بیدادِ تو نو

یا وہ بادشاہ کے سامنے بے تکلف کہہ اٹھتا ہے کہ

بادشاہا! ز استبداد و چیرہ داری مقصود ۔۔۔ کہ ازیں کار جز ادبار نگر دو مشہود

تو اب اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس شعور آزادی کی وجہ سے شخصی حکومتیں جیسی پہلے تھیں اب قریب قریب مفقود ہیں۔ اگر پارلیمنٹ کی سی صورت نہیں ہے تو کم از کم ایک مجلس وزرار تو ضرور قائم ہے۔ پہلے وزرار کی رائے کو بادشاہ ٹھکرا بھی دیتا تھا لیکن اب یہ خطرناک ہے۔ اس آزاد ادب نے رعایا کے ہر فرد کے دل میں آزادی کی لہر دوڑا دی ہے۔

آخر میں میں یہ ضرور کہونگا کہ صوفیانہ ادب نے اگر زندگی پر کچھ اثر کیا تو صرف یہ کہ قوم کو کمزور کر دیا۔ کیونکہ ان کے فلسفہ میں دنیا اور دنیا کی دولت کوئی چیز نہیں۔ دنیا سے اس عام نفرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے سلطنت چھن گئی۔ بادشاہ رنگ رلیوں میں مست۔ رعایا تصوف میں گم۔ سلطنت کی حفاظت کون کرتا۔ اور جو تھوڑی بہت رہ گئی وہ کمزور ہو گئی جب "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" والا مضمون ہو تو کمزوروں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں انہیں طاقتوروں کی لذت کام و دہن بنجانا پڑیگا۔ اور یہی ہوا۔ جب "تنازع البقا" دنیا کا ایک فطری قانون اور بقائے اصلح — Survival of the fittest — ایک اٹل اصول ہے تو پھر دنیا میں رہکر دنیا سے بے نیازی کا خیال کرنا کسقدر لغو اور مہمل بات ہے۔ جنہیں دنیا سے نفرت ہے انہیں دنیا کو قطعی چھوڑ دینا

چاہیئے اور تجربہ اس کا شاہد ہے کہ مسلمانوں کے دماغوں میں جب اس طرح کا لغو خیال سمایا وہ کمزور ہو گئے اور اس کے بعد بے دردی سے فنا کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ خدا بھلا کرے اس تصوف کا جس نے مذہب کو بھی مسخ کیا اور دنیا بھی کھوئی۔ مگر خیر اب حالات امید افزا ہیں اور اگر موجودہ ادب میں یہی جوش و ولولہ اور یہی انقلاب انگیزیاں رہیں تو انشاء اللہ تلافی مافات ہو جائے گی۔ القصہ فارسی ادب کے یہی دو مخصوص کارنامے ہیں کہ قدیم ادب نے انہیں لوریاں دے دے کر سلا دیا تھا لیکن موجودہ ادب نے پھر انہیں چھینٹے دے دیکر اٹھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور اب ہمیں گذشتہ نقصان کو بھول جانا چاہیئے کیونکہ

ہزاروں پھول مٹ کر اک کلی صورت دکھاتی ہے

یا یوں سمجھ لیجئے۔

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اب آیئے دیکھیں کہ ہمارے اردو ادب نے زندگی پر کہاں تک اثر کیا اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس معاملہ میں ہمارا ادب سب سے زیادہ بدقسمت ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ادب چند سال پہلے تک بالکل فارسی کی نقل تھا۔ جو جذبات دل و روح سے برآمد نہ ہوئے ہوں وہ کسی دوسرے کے دل و روح پر کیا اور کس طرح اثر کر سکتے ہیں۔ شاعروں نے شاعری کی، سننے والوں نے تعریف کر دی بس انکا مقصد حاصل۔ اور اگر کسی نے خاطر خواہ داد نہ دی تو پھر اس سے لڑائی اور ہمیشہ کیلئے رنجش اور کیوں نہ ہو۔ جب وہ محض داد ہی کیلئے اتنی محنت کریں اور پھر انہیں وہ بھی نہ ملے جو انکا منتہی شاعری ہے تو پھر کیوں انہیں صدمہ نہ ہو۔ نثاروں نے چند ناممکن الوقوع واقعات جمع کر دیئے۔ بس ناول بنگیا۔ لوگوں نے پڑھا تفریح ہو گئی۔ چلو ان کا بھی مقصد پورا ہو گیا۔ تو بتایئے اس ادب کا کیا اثر زندگی پر پڑ سکتا ہے۔ اگر اس کا کچھ اثر زندگی پر ہوا تو صرف یہ کہ ہر تعلیم یافتہ و غیر تعلیمیافتہ شاعر بنگیا اور بازاری مذاق کی شاعری کر کے دیوان کے دیوان سیاہ کر دیئے۔

وہ قوم جو تلوار لے کر ہندوستان میں آئی تھی اس کے ہاتھ میں اب ٹوٹا ہوا قلم رہگیا۔ جن کی کمروں میں ہر وقت ایک خونخوار خنجر چمکا کرتا تھا ان کے کانوں پر ایک بیہودہ رقم قلم رکھا ہے۔ جس قوم کے جنگی نعروں نے زمین و آسمان میں ہلچل ڈالدی تھی اب اسکا نالہ و شیون آسمان سے ٹکراتا ہے ہوا میں گونجتا ہے اور فضا کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ جو قوم میدان جنگ میں رجز پڑھنے کی عادی تھی۔ اب وہ ادنیٰ مخلوق خدا کی مدح میں نغمات بندگی گاتی ہے۔ جس قوم کی گردنیں دنیا کی زبردست سے زبردست طاقت کے سامنے کبھی نہیں جھکی تھیں اب وہ اپنے تصور سے بنائے ہوئے بتوں کے قدموں پر سجدہ ریز ہے۔ یہ سب ہمارے اس گندہ اور بزدلانہ ادب کا نتیجہ ہے۔ جب تلوار تھی اس نے اپنا کام کیا مگر جب انہوں نے تلوار کو ٹوٹے ہوئے بیہودہ رقم قلم سے تبدیل کر لیا تو اب جو اس قسم کے قلم کا کام ہونا چاہیئے تھا وہ ہوا۔ رجز کا جو اثر ہوتا ہے وہ ہوا۔ اب نغمات بندگی غلامی کی تکمیل کر رہے ہیں۔ جب خودداری اور دلیری تھی دنیا خود بخود کانپ کانپ کر ہمارے سامنے سے جگہ چھوڑ دیتی تھی۔ اب ایک کمزور اور ہیچ معشوق بھی ایک خدا ہے تو پھر ہماری شدت غلامی کا کیا ٹھکانا۔

آخر یہ دور نکبت و فلاکت کبتک رہتا۔ کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جن کی دوربین نظروں نے اس مہمل ادب کے خطرے کو محسوس کیا۔ اُدھر کچھ مغربی ادب نے اپنا اثر دکھلایا اور آخر اردو ادب میں رفتہ رفتہ ایک انقلاب رونما ہوا۔ اور جو اقبال کی ہستی میں انتہا کو پہونچ گیا۔ وہ بلند نظر فلسفی اپنے فلسفہ کا تیشہ لیکر اردو شاعری کے کوہستان پر چمکا اور اپنے تیشہ کی چند ضربوں سے اس نے اس پہاڑ کو قریب قریب ڈھا دیا۔ اب اس میں سے ایک نہر نکلی، صاف و شفاف اور مترنم۔ جس نے ادب کے خشک چمنستان کو بہار کی بوقلموں رنگینیوں سے ہم آغوش کر دیا۔ اس نے اپنی پوری قوت سے صور بیداری پھونکا جس کے اثر سے کچھ تو ایکدم چونک کر اٹھ بیٹھے۔ کچھ اس کے ہم آہنگ ہو کر بیداری کے نغمے گانے لگے اور باقی کم از کم کروٹیں لینے پر مجبور ہو گئے۔ یہ بیداری یہ جوش عمل یہ آرزوئے ترقی جو ہماری موجودہ نسل میں پائی جاتی ہے سب اسی کی "صدائے دردناک" کی رہین منت ہے۔ اب جو اس قافلے میں ایک اضطراب درپے جینی نظر آتی ہے یہ اسی کی "بانگ درا" کا نتیجہ ہے۔ آج ہندوستان کے مزدوروں کی بیداری اس "پیام خضر" کا اثر ہے جو اس نے اپنی زبان سے سرمایہ داروں کی "حیلہ گری" کو ظاہر کرتے ہوئے "بندۂ مزدور" کو دیا۔ غرض اقبال اسی دور ظلمت و نکبت میں اپنے پیغام عمل کی منور شمع لیکر ایک پیغمبر کی حیثیت سے آیا۔ اُس نے جب پیغام عمل دیا تو پیغمبری کی اور جب عشق و محبت کے نغمے گائے تو ساحری کی۔ رفتہ رفتہ اس کے مشن کو دوسرے اور شاعروں اور ادیبوں نے اپنے ذمہ لے لیا اور جوش، سیماب اور ساغر وغیرہ نے عشقیہ مضامین کیساتھ ساتھ قومی اور ملکی نظمیں بھی کثرت سے لکھیں۔ اُدھر قاضی نذرالاسلام نے بنگالی زبان میں وہ وہ شعلے برسائے کہ بنگالیوں کے خرمن غفلت کو پھونک کر رکھدیا۔ اور جو "ستارۂ تخریب" جیسی ہلچل ڈالدینے والی طوفانی نظم لکھ سکتا ہے وہ زندگی میں کون سا انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔

یہ تو ہوا منظوم ادب۔ ادھر سائنس و فلسفہ اردو ادب میں آیا اور کچھ مولویوں کی سخت گیریوں اور شدت کا اثر کہ پرانے خلاف عقل اعتقادات کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ رسالہ نگار ایک مدت سے مولویوں کے خلاف

ایک کامیاب جہاد کر رہا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ کہ اب اسلام کا مفہوم پہلے سے بہت کچھ بدل گیا ہے۔ پہلے اگر اسلام نام تھا لانبی داڑھی، نیچی عبا، عمامہ اور تسبیح کا تو اب جوش عمل اور مکمل انسانیت کا نام اسلام ہے۔ اہل ہنود میں بھی چھوت چھات غائب ہو رہی ہے اور اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ محض اردو ادب ہی کا نتیجہ ہے کیونکہ اس میں بہت کچھ مغربی تہذیب و ادب کا بھی ہاتھ ہے تاہم اردو ادب نے بھی مذہب میں نمایاں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

اب کچھ لوگ آئے اور عورتوں کے وکیل بنکر آئے انہوں نے اصلاحی افسانے اور ناول لکھے جن میں عورتوں کی تعلیم کیطرف توجہ دلائی "ان کی مظلومیت کا اظہار کیا۔ اس پر مغربی تہذیب نے تازیانہ کا کام کیا۔ اور چند سال کے اندر ہندوستان کی عورت کہیں سے کہیں پہونچ گئی۔ کیا پچاس سال پہلے کوئی کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان کی عورت گول میز کانفرنس میں حصہ لے سکے گی۔ یا میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ اور کونسلوں کی ممبر بن سکیگی۔ ڈاکٹر یا وکیل ہو سکیگی اور جب ابھی ہندوستان کے بہت سے مرد ہوائی جہاز یا خود ان کی اصطلاح میں "چیل گاڑی" کے قریب جاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں تو عورت اس میں بے جھجک سفر کر سکے گی۔ یا تو وہ زمانہ تھا جب بقول ز۔ خ۔ ش دانیہ مرحومہ ریل کے نام سے دل میں دھواں اٹھتا" تھا یا اب جب کبھی آپ اسٹیشن پر پہونچ جائیں تو آپ کو نقاب اُلٹے ہوئے چہروں اور رنگین ساریوں کے ہجوم میں اپنی نظر کو ایک جگہ قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

سیاسی ادب میں اخبارات نے زیادہ حصہ لیا۔ اور آزادی کی عام رو تمام ہندوستان میں دوڑ گئی۔ جو کبھی تحریک خلافت اور کبھی کانگریس کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ غریبوں اور مزدوروں کی دردناک حالت دکھلا کر حکومت کی توجہ اسطرف مبذول کرائی گئی اور خود ان مظلوموں کو اپنی مظلومیت کا احساس کرایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں بھی ایک اضطراب اور بےچینی کی لہر دوڑ گئی۔ اور آخر حکومت کو دیہات سدھار کی اسکیم کے ساتھ ساتھ قرضہ بل وغیرہ قسم کے قوانین پاس کرنا ہی پڑے۔ اس آزادی کی عام خواہش کا اثر یہ ہوا کہ نہتے اور کمزور غلاموں نے مسلح اور قومی آقا کے دل میں اپنی طرف سے اندیشہ اور خطرہ پیدا کر دیا۔ اگر اس اندیشہ اور خطرہ نے ایک طرف بہت کچھ اصلاح بھی کر دی۔ تو دوسری طرف پریس ایکٹ کو سخت بھی کر دیا۔ اور اگر آج پریس پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں۔ تو ہندوستان میں بھی بہت سے روسو اور والٹیر جن کی زبانیں اس ایکٹ نے بند کر رکھی ہیں شعلے برساتے ہوئے منظر عام پر نظر آنے لگیں۔ اور انقلاب فرانس سے بھی زیادہ خوفناک انقلاب یہاں برپا ہو جائے۔ پھر یا تو تمام ہندوستان معہ اپنی غلامی کے صفحۂ دنیا سے غائب ہو جائے یا وہ پھر پہلے کی طرح "سونے کی چڑیا"

اور "جنت نشان" بنجائے۔

الغرض ایک زمانہ وہ تھا جب ہر طرف افلاس و نکبت تھی۔ ہر سمت پستی و ظلمت تھی۔ غلامانہ ذہنیت کارفرما تھی۔ ہر طرف غلام ہی غلام نظر آتے تھے، بار غم سے جھکے ہوئے، درد سے کراہتے ہوئے، اور کرب و اذیت سے روتے ہوئے۔ مزدور تھے "سرمایہ دار حیلہ گر"، کے خونیں پنجہ میں گرفتار کمزور دہقاں تھے امیروں کے ہاتھوں لٹے اور پچے ہوئے۔ زیردست تھے زبردستوں کے ہاتھوں برباد کئے اور ستائے ہوئے۔ شاعر کی دردمند نظر اور حساس دل نے اسے دیکھا اور بےساختہ اس کی زبان سے نکل گیا۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا   دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا   مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے   تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

کم فہموں کو اپنی حقیقت کا احساس کرا کے اس نے غلاموں کی مظلومیت کو دیکھا اور یہ کہہ کر انہیں غیرت دلائی کہ

نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھکو   کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

انہیں غیرت دلا کر پھر اس طرح پیغام عمل دیا کہ

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر   شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے   گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اور ابھی ہندوستان میں یہ پیغام گونجے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ سوئی ہوئی آنکھوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو گئے۔ میٹھی نیند سونے والے کروٹیں لینے لگے۔ "عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا" اور آج خود شاعر تسلی آمیز لہجے میں یہ کہ رہا ہے کہ

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز   بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

اور اگر یہی آتش نوائی اور شعلہ باری رہی، ایک دردمند کی آواز اسی طرح اثر کرتی رہی تو چند روز میں یہ عہد فلاکت و نکبت، دور شگفت سے بدل جائیگا۔ یہ ظلمت نور و تجلی سے تبدیل ہو جائیگی۔ نالہ و فریاد قہقہے بنجائینگے اور آنسوؤں کے بجائے تبسم ہی تبسم نظر آیا کریگا۔ خود شاعر ہی کی زبان سے سن لیجئے کہ چند روز کے بعد یہ دنیا کیا ہو جائیگی۔ کہتا ہے اور باعلان کہتا ہے کہ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش   اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
آملینگے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک   بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائیگی
شبنم افشانی مری پیدا کریگی سوز و ساز   اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائیگی
دیکھ لوگے سطوت رفتار دریا کا مآل   موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائیگی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں   محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

المختصر ہم نے اپنے مضمون کے دونوں رخ دیکھہ لئے زندگی نے ادب پر جو اثر کیا وہ بہی اور ادب نے زندگی کو جس طرح متاثر کیا وہ بہی۔ اور اگر ادب اور ادب ہی کیا دنیا اور دنیا کی تمام دلچسپیاں۔ رنگینیاں اور رعنائیاں اسی زندگی کا نتیجہ ہیں تو ادب بہی کوئی معمولی اور کم اہم چیز نہیں۔ بہرحال اس تمام مضمون کے پڑہنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اگر ایک طرف ہم زندگی کیلئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ

ہوتا اگر یہ زندگی۔ علم نہ ہو، ادب نہ ہو — چرخ نہ ہو، زمیں نہ ہو، روز نہ ہو، یہ شب نہ ہو

تو دوسری طرف ادب کے لئے بہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ

گلشن دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو — پہول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

حفیظ نعیمی

نالۂ دل

(نذر دوست)

پہر خون جگر سے سینچ کے میں آباد اجڑا البستان کروں
بیتابی دل کا اے ہمدم اور تجہہ سے حال بیان کروں
للہ نہ کر اصرار، نہ آئیگا لطف اس کے سننے میں
کیوں تیرے سکوں میں مخل ہوکر اب میں تجہکو حیراں کروں

گلزار امید و مسرت پر بے طرح اداسی چہائی ہے — محسوس ہے گو آبادی میں لیکن یہ دل صحرائی ہے

تالیف و طمانیت کا نشاں ملتا ہی نہیں انسانوں میں
اک شور بپا رہتا ہے ہردم ان فانی دیوانوں میں
دکہیوں کی دردبہری آہیں بے معنی! اے اللہ یہ کیا؟!
ہے محو مگر ساری دنیا فرضی و غلط افسانوں میں

صادق کا حال زبوں! انصاف کا خوں! باطل کی پذیرائی — شوریدہ سری مختاروں کی! مجبوروں کی بے دست و پائی

پامالی حسرت سہنے کی اب دل میں نہیں طاقت ہمدم!
انصاف تو کر للہ ذرا! کبتک میں اٹہاؤں بار الم!!
دل ڈوب گیا ناکامی کی موجوں کے تہپیڑے کہا کہا کر
اف! برق محبت نے کر ڈالا صبر و سکوں درہم برہم

ہے میرے لب خاموش میں اک پُر درد حکایت پوشیدہ — رکہتی ہوں تبسم کے پردے میں قلب حزیں رنجیدہ!!

رگ رگ میں بہ رنگ تار نفس ہر وقت سما تا رہتا ہے
وہ جس نے شراب عشق پلاکر مجہکو کیا ہے دیوانہ!
یہ یاس انگیز فضائیں ہیں پر کیف اسی کے تصور سے!
آباد ہے اس نگہ میگوں کی یاد سے دل کا ویرانہ!!

کچہہ اور بجز اس دھن کے نہیں اللہ! تمنا اس دل کو — سودا ہے یہی وحشت ہے یہی ملجائے مرا یوسف مجہکو

"دلفگار"

بجھوں ایک پہیلی

قصہ مختصر، انٹرنس میں نہایت عمدہ نمبروں سے فیل ہوئے۔ آپ کہیں گے "کند ذہن تھے"۔ میں کہتا ہوں کہ ہوی سے لڑکر یا جلی طبیعت سے پرچے دیکھیے تو فیل کرنے کے سوا آپ کو اور توفیق ہی کیا ہوگی؟ فیل ہونے کے بعد اسکول کے ساتھ گھر بھی چھوڑنا پڑا کیونکہ ابا صاحب دوسری شادی رچا بیٹھے۔ بھلا سوتیلی ماں یہ کیوں پسند کرتی کہ سوت کی اولاد اُسکے سامنے پروان چڑھے، چنانچہ جب گھر سے نکالدیے گئے تو روٹی کا فکر ہوا مگر روٹی ملتی کہاں سے؟

چار، پانچ روز تک یونہی ادھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا رہا مگر نوکری کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ جو چند پیسے بچ رہے تھے وہ بھی ایک ایک کرکے خرچ ہو گئے۔ تین وقت سے کھیل کا دانہ تک اُڑکر منہ میں نہیں گیا اور شکل پر بارہ بجنے لگے۔

بھیک مانگتے ہوئے شرم آتی تھی اسلئے یہ سوچ کر کہ اپنے دیس سے دور کسی دوسری طرف کچھ نہ کچھ مل ہی جائیگا ایک طرف چل کھڑا ہوا۔ شہر چھوڑے کئی گھنٹے ہو گئے، اور پیٹ پیٹھ سے آلگا، مگر میں ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے آگے ہی بڑھتا رہا۔ چند اور گھنٹے گذر گئے، یہانتک کہ شام کے جھٹ پٹے میں دانہ دُنکا چُگ چُگاکر چڑیاں اور کوے رین بسیرا کرنے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹنے لگے لیکن مجھے پیٹ بھرنے کی اب بھی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ کبھی کبھی زندگی کی آس ٹوٹ جاتی تو سوچتا "موت کو یونہی آنا ہے تو آچکے، کم از کم بھوک سے تو چھوٹ جائینگے....."

آکاش پر چندرمان براجمان ہو چکے تھے، ہلکی ہلکی چاندنی میں چاروں طرف کی چیزیں مدہم سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ چند گز کے فاصلے پر مٹی کی اونچی مینڈھ سے گھرا ہوا ایک کھیت تھا اور مکئی اور باجرے کی فصل تیار کھڑی تھی، طبیعت ہری ہوگئی۔

لپک کر میں مینڈھ پر چڑھا مگر دھوتی کانٹوں میں اُلجھ گئی، بڑی مشکل سے اس سے چھٹکارا پاکر چپکے چپکے دو چار بھٹے توڑے، ادھر اُدھر سے کچھ کھپچیاں جمع کرکے آگ جلائی۔

تھوڑی دیر ہوئی ہوگی کہ آواز آئی "کون ہے رے؟ کیا کرت ہے؟"

رُوح فنا ہوگئی "مسافر ہوں بھیّا"۔ میں نے بے چارگی سے کہا "بھٹے بھون رہا ہوں"۔

"کھریدے ہیں کیا" ایک تگڑے سے جوان نے میرے قریب آکر پوچھا۔

"خریدتا کہاں سے"؟ میں نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا "بھوکا ہوں بھائی۔ کئی وقتوں کا فاقہ ہے"۔

"تو چوری کی ہے؟ سرم نہ آئی؟" وہ مجھے ذرا حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا کروں" میں نے عاجزی سے کہا "بھوک کے مارے مرا جا رہا ہوں۔ ورنہ چوری کبھی نہیں کرتا"

"بڑے افسوس کی بات ہے" کہکر وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور مجھے غور سے دیکھ کر کہنے لگا "سکل سے تو سریف معلوم ہوتے ہو! بھوکے کا ہیکو ہو؟"

"اس زمانے میں تو شریف ہی بھوکے رہتے ہیں"۔ میں نے کہا "تو کیا میں تمہارے بھٹے کھالوں؟"

وہ میری بات نہ سمجھ سکا اور نرم لہجہ میں بولا "یہ اپنے نا ہیں ہیں، میں تو ادھر سے جا رہا تھا۔ پر تم کہاں رہت ہو؟"

میں نے اپنی کہانی سنائی تو وہ بڑا ملول ہوا اور دھیرے سے کہنے لگا "تم میرے ساتھ چلو۔ یہاں سے تھوڑی دور میری جھونپڑی ہے، جہاں میری عورت اور بالک رہتے ہیں۔ تم کو وہاں باجرے کی روٹی اور گڑ مل جائیگا۔ ایسے چوری سے منش خراب ہو جاتا ہے"۔

اسکی ہمدردی سے میرا دل بھر آیا۔ کیا یہ دیہات والے جنہیں ہم حقیر سمجھتے ہیں، دوسروں کو بھوکا نہیں دیکھ سکتے؟ میں اسکے ساتھ چلدیا، اور اُسکے گھر پہنچ کر مجھے اتنا بھی احساس نہ رہا کہ یہ بیچارا اپنا پیٹ کاٹ کر میرے تن میں جان ڈال رہا ہے۔ رات گئے تک ہماری باتیں ہوتی رہیں۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھہ کر وہ کہنے لگا "بڑا کھراب جمانا ہے گردھاری! پر کیا کریں جندہ تو رہنا ہی پڑتا ہے۔ تم صبح میرے ساتھ چلنا، میں اپنے مالک سے کہہ کر تمہیں کارکھانے میں ملاجم رکھا دونگا۔ وہ بہت دیالو ہے اور مجوروں کی اسے جرورت پڑتی ہی رہتی ہے، چار آنہ روج ملیں گے۔ تم کو بہوت ہیں...... اور یوں تو بڑے بڑے بابو بالسٹری پاس کر کے بھی بھوکے مرتے ہیں۔"

"میں مزدوری کرونگا؟" میں نے دلمیں کہا "سات آٹھ روپے سے میرا کیا کام چل سکتا ہے" مگر پھر مجھے اپنے فاقوں کا خیال آیا اور میرے مُنہ سے بیساختہ نکل گیا "ہاں ہاں گوری شنکر! تم مجھے نوکر کرادو، میں محنت مزدوری کرلونگا"۔

کارخانے کا مالک رتن لال بڑا بدمزاج اور مغرور شخص تھا۔ اسکے چہرے سے شرارت ٹپکتی تھی، اور تمام مزدور اس سے بیحد ڈرتے تھے۔ گوری شنکر کی منت سن کر ایک دفعہ اس نے مجھے سر سے پیر تک حقارت آمیز نظروں سے دیکھا — "تو تم نوکری کرو گے؟ ہوں!! پھر تم سے کاہے کو کنیں گے؟ کدال تم سے کیسے چلیگی؟ تم تو بابو ہو بابو! تم نے اس لالچ میں پڑھا کہ سرکار تمہیں نوکری دے دیگی، جاؤ نا اب اسکے پاس! تمہیں ان حالوں پھرتے دیکھتے لاج نہیں آتی؟" مجھے اپنی بیکسی پر رونا سا آگیا کہ یہ پڑھائی تو بجائے فائدہ پہونچانے کے الٹی جڑیں کاٹ رہی ہے۔

رتن بولا "اور تم سے نوکری ہوگی کیسے؟ ذرا اپنا بدن تو دیکھو، ایک پھاوڑے میں تمہارا تو بازو اُتر جائے گا" لیکن میں نے پھر بھی گوری شنکر کے ساتھ اسکی خوشامد کی جسے سن کر اس نے تکبر سے کہا "کیوں بے گوری! یہ تیرا باوا لگتا ہے کیا؟ کیوں سر ہوئے جاتا ہے؟...... اچھا، خیر! جاؤ کام کرو، مگر کام ٹھیک دیکھو، ورنہ دو آنے بھی نہ ملیں گے"۔

چار پانچ گھنٹے تک بمشکل تمام میں کام کرتا رہا لیکن جسم چور ہوگیا اور بازو اور کمر شل ہوگئی۔ میں اپنی قسمت پر آپ ہی آپ آگ بگولا ہو رہا تھا، تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ رتن مزدوروں کو ڈانٹتا ڈپٹتا چلا آرہا ہے۔ کسی کو لات ماردی، کسی کو موٹی سی گالی سنائی، اور کسی کی پگڑی پر زور سے لپڑ دیا، میں اسے کیسے برداشت کرلیتا، چنانچہ میں نے سوچ لیا کہ اگر مجھسے کچھ بولا تو اس کو گھڑ کے رکھدونگا۔ لیکن وہ مجھ سے نہیں اُلجھا اور چپ چاپ میرے پاس سے گذر گیا۔

(۲)

میں جس کارخانے میں ملازم تھا وہاں نیچ قوم کی عورتیں بھی کام کرتی تھیں۔ مجھے یہاں کام کرتے کوئی سال ڈیڑھ سال ہوا ہوگا کہ ہم میں ایک نئی عورت شامل ہوئی جو ذات کی چماری تھی مگر دیکھنے میں ایسی نہ معلوم ہوتی تھی، اُجلا رنگ، درمیانہ قد، اچھا ناک نقشہ اور خدوخال پر شرافت کے آثار، شاید جوانی کے ستائے ہوئے کسی شریف صاحبزادے کی اسکی ماں پر مہربانی ہوگئی ہوگی جس کا نتیجہ سوناؔ کے وجود میں ظاہر ہوا۔ گوری شنکر کہنے لگا "وہ جو بڑھیا شرتی تھی نا وہ سوموار کو مرگئی، یہ اُسی کی لونڈیا ہے۔ بابو جی نے کرپا کر کے اسے اپنے ہاں ہی نوکر رکھ لیا...... بچاری اکیلی ہے"۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

کچھ دن یونہی گذرے لیکن مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ "ہم بھی ہیں تیرے پرستاروں میں"۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ اسکی سگائی ہوچکی تھی اور اس کا میاں ایک آدھ دن میں آنے والا تھا۔

بھادوں کی ایک شام تھی اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ سورج دیوتا لال پیلے رنگ بدلتے ہوئے پچھم کی طرف دوڑے جارہے تھے اور سوناؔ کھنوں سے

اونچا لہنگا اُٹھائے بھٹکے ہوئے آہو کی طرح ہولے ہولے چل رہی تھی میں بھی تھوڑے فاصلے پر اسکی گوری گوری پنڈلیوں کو آنکھوں میں بسائے چھپتا چھپاتا چلا جارہا تھا۔ جھونپڑی تک پہونچتے پہونچتے اندھیرا پھیل گیا، اور اسکے بالوں جیسی کالی رات چاروں طرف بکھر گئی۔ میں جھونپڑی کے پیچھے ایک کونے میں کھڑا ہوکر ایک موکھے میں سے اُسے دیکھنے لگا، اس نے اندر آکر پہلے دیا جلایا اور پھر ایک ہنڈیا کی طرف بڑھی کہ دفعتاً .... میں نے دیکھا کہ .... وہ مہا دیا لو' سیٹھ رتن لال جی شراب پیئے ہوئے سوناکی طرف چلے آتے ہیں سونا ایکا ایکی "کون ؟" کہکر پلٹی۔ اور رتن نے ہوسناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "سونا! —— تو ڈر گئی؟ ...... اری پگلی میں تجھے ایک خوشی کھبری سنانے آیا ہوں ...... میں تجھ سے سادی کرونگا ..... آ میرے سینے سے لگ جا" اور اس کو آغوش میں لینے کے لئے اس نے اپنے مضبوط ہاتھ اسکی طرف بڑھا دیئے۔ سونا سہم کر پیچھے ہٹی "کیا کہتے ہو مہاراج! میرا آدمی آجکل میں آجائیگا تو وہ ..... "

" ارے چھوڑ اس آدمی کو" ..... رتن اسکے سینے پر سے مسکی ہوئی چولی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بات کاٹ کر بولا "تیرا گونا تو نہیں ہوا پھر کس بات کا فکر کرتی ہے؟ مجھ سے سادی کر لیگی تو تجھے سیٹھانی بناؤنگا۔ اور ...... یہاں تو آ ..... "

"سچ کہتے ہو مہاراج! سونا سراسیمگی کی حالت میں کہنے لگی "پر دھرم بھی تو نشٹ ہو جائیگا، آتما بھی تو پاپن ہو جائیگی ..... "

"پگلی کہیں کی ......" رتن اسکو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے بولا "بس چُپکی ہو جا ......"

اس نے دیئے کو پھونک مار کر بجھا دیا۔ تھوڑی دیر تک آوازیں آتی رہیں "کیا کرتے ہو بابو ... رہنے دو ...... میں بیاہتا ہوں ..... میرا آدمی ...." اور پھر ایک دلدوز چیخ کے بعد مکمل تاریکی اور خاموشی چھا گئی۔

میرے پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے اور اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سنگدل سے کشتم کشتا کر سکتا لہذا جس طرح ہوسکا میں بھاگم بھاگ گوری شنکر کے گھر پہونچا، اور اُسے جھنجوڑ کر تمام واقعات سے آگاہ کیا غصے میں اس کا خون اونٹنے لگا اور اس نے میرے ساتھ جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہوئے کہا "مار کسم سر پھوڑ دونگا سورے کا۔ کیا سمجھا اس نے؟ کسو کی اجت لینی کوئی مخاک پڑ گیا؟"

جب تک ہم وہاں پہونچے، رتن وہاں سے جاچکا تھا اور جھونپڑی کے اندر سے آہ و بکا اور سسکیوں کی آوازیں اس طرح آرہی تھیں گویا رات سسکیاں لے لے کر رو رہی ہو۔

(۳)

صبح ہوتے ہوتے گوری شنکر نے بہت سے مزدوروں کو خبر کر دی مگر جب رتن کو معلوم ہوا تو اس نے بھی تھوڑی دیر میں سارا بندوبست کر لیا۔ کسی کا دھمکی سے اور کسی کا پیسے سے منہ بند کیا اور جو ذرا جی دار تھے، پولس کو روپیہ کھلا کر اُلٹا انہیں کو پھنسا دیا۔ میں اسلئے کہ میری مزدوری چار آنے سے چھ آنے کر دی گئی اور گوری اسلئے کہ وہ رتن کے ہاتھ نہ لگا، اسی روز سونا کا شوہر جو ایک گبرو جوان تھا یہاں آپہونچا لیکن رتن کے سکھائے ہوئے آدمیوں نے سونا کو بدنام کر کے اُسے اُس سے بدظن کر دیا۔

شام ہونے کو آئی، چرواہے بھیگی ہوئی بانسریوں کو بجاتے گائے بھینسوں اور بھیڑ بکریوں کو ہنکائے لئے جاتے تھے کہ گوری ایک درخت کی آڑ میں سے نکل آیا۔ اور میرے پاس بیٹھ کر ہولے سے کہنے لگا "کیا سوچت ہو؟"

میں نے اسکے باوقار چہرے پر سنجیدگی کی جھلک دیکھ کر رسان سے جواب دیا "جیون کو بوجھنے کی کوشش کر رہا ہوں"

وہ شاید کچھ سمجھ گیا کیونکہ اسکے ہونٹوں پر حقارت آمیز اور طنزیہ مسکراہٹ آگئی "ہوں!! .... اچھا ...... ہاں، سونا کا اب کیا ہوگا؟

.... اس کا آدمی رُوٹھ کر چلا گیا ہے!"

"رام جانے! میں نے مونگ پھلی کے دانے مُنہ میں ڈالتے ہوئے کہا "امیر غریبوں کے ساتھ یہی سلوک کیا کرتے ہیں — اور سرکار بھی غریبوں کی حمایت نہیں لیتی۔"

"سرکار نہ لے تو نہ سہی" اُس نے فوراً ہی جواب دیا۔ "اور ہم گریب ہیں تو کیا ہوا، موقع ملے تو میں اس بدمعاش کا خون چوس لونگا...... ان بزدلوں کو دیکھو اس چنڈال سے ڈر گئے ...... تم تو میری مدد کرو گے نا؟"

گویا مجھ پر پہاڑ ٹوٹ پڑا "نہیں، نہیں" میں نے کہا "میں کچھ نہیں کر سکتا۔ امیر اپنے ہتھکنڈوں سے غریبوں کو تباہ و برباد کیا ہی کرتے ہیں.... اور پھر ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟"

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور اُسکی آواز میں تلخی آگئی "ہاں جی لالہ گردھاری مل! تم بھلا کیا کر سکتے ہو؟ تم تو امیروں کو خوش کرنیکے لئے انکے ہاتھوں اپنی اِجت اور دھرم بھی بیچ دو گے۔"

"عزت اور دھرم کو تو گھر چھوڑ دیا" میں نے کہا "وہاں سے تو بس پیٹ لیکر چلا ہوں ...... مجبوری ہے۔"

"ہاں مجبوری ہی تو ہے! تم شہریوں کے لئے" نفرت سے دیکھتے ہوئے بولا "میں تو ایسی مجبوری پہ لات مار چکا ہوں۔"

باؤلے ہوئے ہو تم ٹھاکر! میں نے اسے گویا سمجھاتے ہوئے کہا "بیوی بچے جو ہیں تمہارے! اور یہ سات آٹھ سال کی نوکری!!"

"پیٹ تو تم لیکر چلے ہو چودھری! میں ایشور کے گھر سے دہرم اور اِجت لایا ہوں" اس نے جواب میں کہا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔

اب آپ ہی بتایئے گوری کی بے وقوف نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر میں بھی نوکری چھوڑ دیتا تو آج یہ ٹھرے، چٹ پٹی دال اور بھنے ہوئے چنوں کے لئے دھیلی پائی روز کا خرچ کہاں سے چلتا؟

صادق الخیری

غزل!

ساقیِ مست ہے پیمانہ بکف شیشہ بدست
اور کیا چاہیئے توبہ کے لئے عذرِ شکست

آنکھ ملنا تھا کہ پہلو میں دلِ زار نہ تھا
ہائے وہ شوخیِ بیتاب وہ رعنائیِ مست

نگہِ شوق میں عالم ہے مرقع اُن کا
اب وہی وہ نظر آتے ہیں بہر جلوہ مست

مان بھی جاؤ ہٹا دو رُخِ زیبا سے نقاب
تشنۂ حسن ہے کب سے نگہِ حسن پرست

تو گرفتارِ محبت ہوں ذرا یاد رہے
ابتدا ہی میں نہ ہو جائیں کہیں حوصلے پست

دیکھتے جاؤ ذرا مُڑ کے نگاہِ ناکام
سنتے جاؤ دلِ مایوس کی آوازِ شکست

وقت پر ساتھ کسی نے نہ دیا اے کوکبؔ
گم ہوا قافلۂ شوق بیک جلوۂ مست

کوکبؔ، (رضا جہاں بیگم)

فصیح الملک

ناظم یار جنگ، دبیرالدولہ، فصیح الملک، بلبلِ ہندوستان۔ جہاں اُستاد، نواب مرزا خان بہادر داغؔ، دہلی کے "لعل شب چراغ" راقم الدولہ ظہیرؔ دہلوی ان کے اُستاد بھائی تھے، ظہیرؔ کا ناز تو دیکھو! کہتے ہیں ؎

ہم بھی جنابِ داغؔ کے ہم درس ہیں ظہیرؔ بلبل ہیں وہ تو طوطیِ ہندوستاں ہیں ہم

شعرا کی یہ سُنت ہے کہ اپنے اپنے باکمال اُستاد کا ذکرِ خیر کہیں نہ کہیں کرجاتے ہیں، جس سے اکتسابِ فیض پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً بحرؔ کا یہ شعر۔

فیض پہونچا اک جہاں کو اُن کی تحقیقات سے
حضرت ناسخؔ کا کیا کہنا حکمت اُستاد ہیں

رندؔ لکھنوی

چلکے اب حضرت آتشؔ سے کرو عرض اے رندؔ معرکہ آپ کا یہ طفلِ دبستاں جیتا

نسیمؔ لکھنوی

میں ہوں اے تسلیمؔ شاگردِ نسیمؔ دہلوی مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

نسیمؔ بھرتپوری

دلکش نہ ہوں کیوں نسیمؔ کے شعر شاگرد ہے داغؔ دہلوی کا

خود داغؔ کہتے ہیں ؎

بعد اُستاد ذوقؔ کے کیا کیا شہرت افزا کلام داغؔ ہوا

اس موضوع پر سینکڑوں نہیں ہزاروں شعر پیش کیے جاسکتے ہیں، لیکن جناب داغؔ کو دیکھئے کہ ان کی ہمدرسی پر ان کے اُستاد بھائی فخر کرتے ہیں، اپنے آپ کو طوطیِ ہندوستان کہتے بھی ہیں تو محض اس لئے کہ انہیں بلبلِ ہندوستان کی ہمدرسی کا شرف حاصل ہے ع

داغؔ معجز بیاں ہے کیا کہنا

اب اور آگے بڑھیئے! امیرؔ کا تعلق لکھنؤ سے، داغؔ کا تعلق دہلی سے، ان دونوں اسکولوں میں جو مُغایرت تھی وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس مُغایرت پر معاصرانہ چشمک، سونے پر سہاگہ، باوجود اسکے صوفی باصفا امیرؔ۔ داغ کی غزل پر غزل کہتے ہیں، مقطع ملاحظہ ہو!

امیرؔ اچھی غزل ہے داغؔ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تنکے بیٹھے ہیں

امیرؔ صاحب، داغؔ صاحب سے "دامنِ گلچیں" کے لئے غزل طلب کررہے ہیں:-

"........ موجودہ گلدستوں سے فراغ کی صورت اگر ہے تو یہی کہ محاسن معنوی میں کوشش کی جائے، اس کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ معدودے چند نامور شعرائے خوش فکر وخوش مذاق کا کلام ہمیشہ اس میں چھپے، آپ کی ذات سراپا صفات اس طبقۂ نامورکی افسر ہے اور غایت مشاقی سے اب غزل کہدینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لہٰذا خواستگار ہوں کہ اپنی طبع نازک پر جبر کرکے بالالتزام غزل دینے کا وعدہ کیجئے، مگر یہ پہلے سے کہے رکھتا ہوں کہ غزل ایسی کہا کیجئے گا کہ ہم غریبوں کو بھی کہنے کی گنجائش رہے۔ یہ نہ ہو کہ پہلے ہی سے دُنیا بھر کے قلم توڑ دئے جائیں"۔

اچھا اسی سلسلہ میں امیرؔ صاحب کا ایک اور مکتوب مُلاحظہ فرمائیے!۔

"میرے پُرانے یار پُرانے غمگسار حضرت داغؔ سلامت

خداوند تعالیٰ یوماً فیوماً آپ کے اعزاز کو بڑھائے اور اس فن کو چمکائے ملک کو آپ کی قدر ہو یا نہ ہو میری نظر میں تو جس قدر ہے اس کو آپ کا دل بخوبی جانتا ہوگا۔ آپ حاسدانِ کوتہ اندیش کا کچھ خیال نہ کریں، اربابِ کمال خصوصاً وہ جن سے زمانہ کچھ موافقت کرتا ہے ہمیشہ محسود ہوا کرتے ہیں، محسود ہونا سرمایۂ ناز وفخر ہے، حاسد ہونے سے خدا محفوظ رکھے"۔

سلہ منشی صاحب کی جامعیت سے میں بہت مرعوب ہوں لیکن "تغزل" کی حد تک کبھی آہ داغؔ اور کبھی واہ داغؔ کہنا پڑتا ہے ۱۲

تذکرہ "انتخاب یادگار" دیکھئے اسمیں حضرت امیر مینائی جناب داغ کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں:۔

داغ۔ نواب مرزا خاں خلف نواب شمس الدین خاں مغفور، چالیس برس کی عمر، صاحب دیوان شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد ہیں فرد کامل، خوش مذاق ہونے میں یکتائی حاصل۔

"اِمَامُ الْفَنْ" حضرت جلیل، حضرت امیر مینائی کے خاص شاگرد اور جانشین ہیں، ان خصوصیات کے حامل ہوکر بھی فرماتے ہیں ؎

داغِ فراقِ داغ کو مدت ہوئی جلیل
اب بھی زباں پہ اہل زباں کی ہے ہائے داغ

حقیقت بھی یہی ہے ؎

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ   اے داغ کس طرح تجھے دل سے بھلا ئیں ہم

جلیل کے بڑے استاد بھائی مولنا ریاض خیرآبادی جلیل کے دیوان کی تاریخ کہہ رہے ہیں بھلا داغ کے ذکر کا یہ کونسا موقع تھا؟ مگر نہیں موقع ہو یا نہ ہو۔ ع

داغ اپنی جائے جاتا ہے

دیکھئے! حضرت ریاض، داغ کو کس طرح یاد کرتے ہیں ؎

داغوں کے تختے باغ کھلے بعد داغ   کس سے کہوں درد نہان سخن
کس سے کہوں کون بنا بعد داغ   چارہ گر درد نہان سخن
داغ مٹے مٹ گئے استاد امیر   ہے سخن اب مرثیہ خوان سخن
رہ گئے "ہم" گرد پس کارواں   نقش کف راہروان سخن
نقش کف پا بھی نہیں نقش آب   خاک سرآب روان سخن

غور کیجئے! اس "ہم" میں کون کون ہیں اور انکی "ہستی" کیا ہے؟ دیکھا آپنے ریاض کا اعتقاد داغ کے ساتھ!

امیر مینائی کے ایک اور باکمال شاگرد ہیں مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب انھوں نے مجموعہ مکاتیب شائع کرکے ہم شیفتگان اُرد پر بڑا احسان کیا ہے، اس مجموعے کی ابتدا میں امیر و داغ کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

آخر عمر میں اُستاد نے داغ کے رنگ کلام اور قبول عام کو دیکھکر زبان کی صفائی اور تاثیر پیدا کرنے میں کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے تاہم صنم خانہ عشق کی جلوہ آرائی گلزارِ داغ کی شادابی کو نہیں پہونچی۔"

یہ سب کچھ بجا و درست ہو۔ لیکن اسی "موازنہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا رجحان اپنے اُستاد حضرت امیر مینائی ہی کی جانب زیادہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

شکوہ الفاظ، متانت بیان اور شاعرانہ لطافت ان کے اشعار میں ایسی ہے کہ جو داغ کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ اصناف سخن پر قادر اور استاد ماہر ہیں۔ قصاید با شوکت فر کہتے ہیں اور سخنور با سرمایہ، صاحب علم و فضل، داغ ان اوصاف سے معرا ہیں۔"

علامہ شبلی نے ثاقب صاحب کے ان دلائل تفضیل کو اسی کتاب کے "ریویو" میں یوں رد کردیا ہے:۔

داغ کی کمزوریاں اور غلطیاں دکھلائی ہیں اور اس میں اس بات سے مدلل ہے کہ داغ کا سرمایۂ علمی کچھ نہ تھا۔ لیکن اہل عرب کا خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم رسمی سے بے بہرہ ہوگا اسی قدر بڑا شاعر ہوگا۔ یہی بات ہو کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کرسکتے۔ فارسی میں

ؐ ہمارے بعض .... ہم وطن بزرگوں نے بعض حاسدوں کے بہکانے کی وجہ سے یہ بات مشہور کر رکھی تھی کہ داغ کو "دال منڈی" کے ناٹک نے مشہور کیا ہے۔ داغ جب یہاں آئے ہیں تو ان کی عمر (۶۰) برس سے بھی متجاوز ہوچکی تھی، امیر کا تذکرہ نکلنے کے وقت وہ صرف (۴۴) برس کے تھے مگر دیکھئے امیر صاحب نے ان کی تعریف کن لفظوں میں کی ہے!! دکن آنے سے پیشتر خود حضرت داغ اپنی شہرت روز افزوں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ؎

ہند سے تا بہ دکن داغ ہے شہرت تیری   اب تو کچھ اور ترا بخت رسا کہتا ہے

دیکھیئے تو ہر شخص جانتا ہے کہ فردوسی، انوری اور نظامی کے
مقابلہ میں جاہل تھا۔ تاہم انوری کو اسکی عبودیت کا اقرار ہے
اور نظامی کہتے ہیں ؎

کہ آراست زلف سخن چوں عروس

جامی علم و فضل میں نظامی سے بڑھکر ہیں بغرض شاعری کا
تعلق جذبات سے ہے معلومات سے نہیں "

علامہ شبلی ہی اپنی ایک نظم میں دکن سے خطاب کرتے ہیں۔ اور
کی مابہ الامتیاز خصوصیات میں اپنے آپ کو اور نواب مرزا خاں داغ
اس طرح شامل کرتے ہیں ع

شبلی سحر فن و داغ غزلخواں باتست

ہ کمال بھی کیا چیز ہے، وہ علامہ جو آگے چلکر "مجدد دین اسلام" میں شریک
ہونے والا ہے اپنے بازو پر اس شان سے ایک غزل گو کو جگہ دے!

میرے ایک دوست مجھسے یہ فقرہ سن کر مجھہ پر بہت برہم ہوئے
ہے کہ :۔

آپ نے یہ کیا لکھدیا، شبلی اگر دربار فضلا میں سنہری کرسی پر
وہ فرما ہیں تو داغ بھی مسند آرائے شعر و سخن ہیں۔ خیر مولانا شبلی کیساتھ مولانا
لی کی بھی رائے سن لیجئے :۔

غزل میں ضرور ہے کہ بہ نسبت اور اصناف کے سادگی اور
صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے، آجتک فارسی یا اردو میں
جن لوگوں کی غزل مقبول ہوئی وہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے
اس اصول کو نصب العین رکھا ...... ذوق کی غزل میں
عموماً زبان کا چٹخارا زیادہ ہے۔ مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی
کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں ظفر کا تمام
دیوان زبان کی صفائی اور ادا کی خوبی میں اول سے آخر تک
یکساں ہے۔ لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی
ہے۔ داغ کی غزل میں باوجود زبان کی صفائی، روزمرہ کی
بہتات کے طرز ادا میں ایک شوخی اور تیکھا پن ہے جو اسی
شخص کا حصہ ہے (اقتباس از مقدمہ شعر و شاعری)

اسی رائے کی تائید میں اسی "مقدمہ" کا اور ایک مقام ہدیہ ناظرین ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر انیس نے مرثیہ کو بے انتہا ترقی
دی اور نواب مرزا شوق نے مثنوی کو زبان اور بیان کے
لحاظ سے بہت صاف کیا ہے، اسی طرح دلی میں ذوق، ظفر
اور خاصکر داغ نے غزل کی زبان میں وسعت اور صفائی
اور بانکپن پیدا کر دیا ہے ؎

واہ رے داغ واہ ؎

داغ فراق داغ کو مدت ہوئی جلیل
اب بھی زبان اہل زباں کی ہے ہائے داغ

مولانا حالی نے ہی جامع مکتوبات امیر مولوی احسن اللہ خاں
صاحب ثاقب سے فرمایا کہ جناب مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہ
صاف شعر کو پسند کرتے تھے اور اس لئے اشعار داغ کے مداح تھے
جناب مولانا حالی نے خود حضرت امیر مینائی کے استاد حضرت
اسیر سے سنا ہے کہ :۔

کبھی امشاعرہ کیا جائیں ہماری طولانی غزلوں کو کوئی نہیں
پوچھتا، اور مشاعرہ ختم ہوئے پر داغ کی غزل سب کی زبان
پر ہوتی ہے[۳]

یہی مولنا، داغ کو ایک رقعہ لکھتے ہیں۔ اور اسمیں یہ شعر خواجہ
شیراز کا سرنامے پہ تحریر فرماتے ہیں ؎

آں سیہ چردہ کہ شیرینی عالم با اوست
چشم میگوں، لب خنداں، دل خرم با اوست[۴]

صاحبان ذوق "شیرینی عالم" پر نظر رکھ کے داغ کی کوئی ایک
غزل پڑھ لیں بخدا مزا آجائیگا مزا۔ یہ لطف سخن خداداد ہے۔
مولانا حالی نے ہی بطور پیشین گوئی ایک شعر کہا تھا ؎

---

[۱] مقدمہ مخطوط منشی امیر احمد [۲] مخانہ جاوید [۳] مقدمہ مخطوط منشی امیر احمد +

داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

میں تو اس پیشین گوئی کا قائل ہوں اور آپ؟

بندہ پرور! منصفی کیجیے خدا کو دیکھ کر

زمانہ ہوا مولانا حالیؔ کی ایک غزل "مخزن" کے ایک قدیم پرچہ میں ہم نے دیکھی تھی جس کا مقطع اب بھی ہمارے ضبط ذہن ہے ؎

نعم البدل ہے داغؔ کا حالیؔ کلام داغؔ
ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

مولانا حالیؔ اور مولانا شبلیؔ کے بعد کسی اور نقاد کی رائے پیش کرنے سے فائدہ؟ لیکن قند پارسی بھی تو آخر کوئی چیز ہے؟ اس سے میں حلاوت پا رہا ہوں تو آپ کیوں محروم رہیں:۔

داغؔ - نواب مرزا خاں خلف نواب شمس الدین خاں بہادر برگزیدہ ترین تلامذہ خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوقؔ و از مشیران خاص فرماں روائے رامپور من او را غائبانہ اتحادے است، ہرچند ملاقات صوری صورت نہ بستہ درین نزدیکی گفتار دل آویز خویش را فراہم آوردہ گلزار داغؔ نام دیوانے ترتیب دادہ است، بعد طبع یکے نزد نامہ گرد آورد فرستادہ شوخی کہ در کلام اوست بندہ ندانم کہ امروز دیگرے را داد باشند و زبانے کہ او را بخشیدہ اند فی زمانا کسے را تیسر نیست، بیشتر ازیں ستایش گفتار وے چہ تواں گفت۔ خیر الکلام ماقل و دل۔

معزز ناظرین! یہ رائے بھی کسی معمولی شخص کی نہیں، نواب صدیق حسن خاں غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے، یہ رائے دہندہ اسی فرد فرید کا فرزند رشید ہے۔ الولد سر لابیہ + داغؔ سے متعلق ہمارے پاس اگرچہ اور اتنا ہی ذخیرہ ہوگا جتنا کہ آپکے روبرو پیش کیا گیا ہے لیکن بخوف طوالت اسکو نظر انداز کرتے ہیں ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے یاد کن ایں شاعر دیرینہ را

علی منظور حیدر آبادی

حشرِ جذبات

نازنہ کر حیات پر عظمتِ کار سے گذر
جسمیں خزاں کا رنگ ہو ایسی بہار سے گذر

راہ طلب میں عشق کا ذوقِ فنا دگی ہے حرم
اپنی ہی ہمت دیکھ تو ہیبتِ دار سے گذر

درس لے آفتاب سے، اپنے کرم کو عام کر
موج نسیم صبح بن، ہر خس و خار سے گذر

معرکۂ حیات میں یہ بھی ہے شرط زندگی
ضبط سے آشنا نہ ہو، صبر و قرار سے گذر

محرم عشق ہے اگر، یاس کا ذکر ہے حرام
صبح بہار دیکھ تو، شام بہار سے گذر

حاصل صد بقا ہے جو، پی وہ شراب معرفت
جسکا مآل موت ہو، ایسے خمار سے گذر

حسنِ چمن ہے عارضی اسپہ نہ اعتبار کر
جوشِ حیات ہو اگر رنگ بہار سے گذر

دام تعینات سے، اپنے کو رکھ بلند تو
کھا نہ فریب رنگ و بو، رنگ بہار سے گذر

ثاقبؔ محو بیخودی اپنے کو رکھ نہ پست تو
برق و شرار خود ہی بن، برق و شرار سے گذر

ثاقب، کانپوری

خلط ملط

منیر کے مُکّا مار کر مانی نے اپنے بدن میں شگفتگی سی محسوس کی۔ اُس نے سرسری طور پر زبیدہ کی طرف دیکھا جو گلی کے نکڑ پر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ "آؤ بیدی۔ آؤ ہم اندر چل کر کھیلیں" اسنے اپنا دایاں بازو گھماتے ہوئے کہا۔ زبیدہ نے منیر کی طرف دیکھا جو بسورتا ہوا اپنی جیب سے بلوری گولیاں نکال رہا تھا۔ اور سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ منیر نے اپنی جیب سے ایک نیلی بلوری گولی نکالی اور اُسے ہتھیلی پر رکھکر آنسو پیتے ہوئے دیوار سے مخاطب ہو کر کہا "ہم یہ گولی مانی کو دینگے ہی نہیں"۔

مانی نے کنکھیوں سے نیلی گولی کی طرف دیکھا۔

زبیدہ دوڑ کر منیر کے پاس آگئی۔ اور اس کا بازو پکڑ کر کہنے لگی "آؤ ہم گھر گھر کھیلیں"۔ مانی نے ایک بناوٹی فاتحانہ انداز سے اس ویران گلی کا جائزہ لیا اور اپنی گذشتہ فتح کی یاد کو تازہ کرنیکے لئے اپنا بازو گھمانے لگا ——— ——— اور بے نیازی سے گھر کی طرف چل پڑا "ہم گھر میں ربڑ کی گیند سے کھیلیں گے"۔

مانی کی بے نیازی اور اس کا متحرک بازو دیکھکر زبیدہ اُس نیلی بلوری گولی کو بھول گئی اور للچائی ہوئی اور خائف مگر شوق بھری نظروں سے مانی کو دیکھنے لگی۔ منیر ایک منٹ کے لئے ساکت رہ گیا۔ پھر کہنے لگا "میں بتاؤں بیدی۔ ہمارے پاس دو سُرخ گولیاں ہیں ——— لال سُرخ ——— دکھاؤں ——— یہ دیکھو" اور وہ فاتحانہ انداز سے اپنی جیب ٹٹولنے لگا۔ زبیدہ کی نگاہیں لوٹ آئیں۔ اور وہ شوق سے لال سُرخ گولیوں کی منتظر تھی۔

مانی نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے مُڑ کر ایک نظر منیر اور بیدی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں گلی میں بیٹھے کھیل رہے تھے۔ ایک ساعت کے لئے وہ رُکا، جیسے وہ واپس لوٹ جانا چاہتا ہو۔ پھر اسکی نگاہ اپنے دائیں بازو پر پڑی جو اپنی گذشتہ فتح پر ابھی تک پھولا ہوا تھا ——— اسکی ایڑیاں اُٹھیں ——— اس کا بازو اکڑ گیا۔ شاید اُس وقت وہ اپنے آپ کو منیر سے افضل تر مخلوق سمجھ رہا تھا۔

ڈیوڑھی میں داخل ہو کر وہ سوچنے لگا "اب میں کیا کروں ——— ——— سامنے مُنڈیر پر ایک کوا بیٹھا تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر کوے کی سمت میں ہوا میں ایک گھونسہ مار دیا "شست" کوا اُڑ گیا۔ وہ اپنے آپ سے بہت خوش ہوا مگر یہ ہوائی گھونسہ بازی کا کھیل منیر اور بیدی کی عدم موجودگی میں چنداں دلچسپ نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اتفاقاً بیدی اور منیر وہاں آجائیں ——— اسکی نگاہ بھائی جان کے کمرے کی طرف جا پڑی۔ اس نے غور سے دروازے کی طرف دیکھا، ایک پٹ بند تھا اور دوسرا تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ "بھائی جان نہیں ہیں" اس نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔ معاً اسے یاد آیا کہ بھائی جان کی دراز میں تصویریں تھیں جنہیں وہ اکثر تنہائی میں دیکھا کرتے اور مانی کو دیکھنے سے منع کرتے تھے۔ ان تصویروں کو چوری چوری دیکھنے کی کوشش میں وہ دو دفعہ پٹ بھی چکا تھا۔ اسکے گال پر اس گذشتہ طمانچے کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔

اُس نے اپنا ہاتھ اپنے گال پر رکھ لیا اور وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ مگر اسکے دل میں ایک لذیذ سی دھڑکن ہونے لگی اور اسکی آنکھیں کسی نامعلوم نشے سے جھومنے لگیں ———

خدا جانے بھائی جان ان تصویروں کو چھپا چھپا کر کیوں دیکھا کرتے تھے ——— لمبے لمبے مُنہ والی عورتیں — موٹی موٹی پنڈلیوں والی۔ بھدے سے جسم والے مرد جنکے بدن پر کالے کالے بال تھے ——— اور چہروں پر وحشت سی ——— گنواروں کی طرح، اسنے مُنڈیر کی طرف دیکھا۔ کوا پھر آ بیٹھا تھا۔ شاید ان تصویروں کو بھولنے کی کوشش میں یا اپنی کسی گذشتہ فتح کی یاد تازہ کرنے کے لئے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ سمیٹ کر اپنی آنکھ کے قریب رکھ لیا۔ اور پھر آنکھ کو بند کر کے

بائیں آنکھ سے شست باندھکر "ٹھش" کہکر اپنا بازو اکڑا دیا۔ کوا اُڑ گیا ——— وہ اپنی بندوق پر نازاں محسوس کر رہا تھا۔ مگر اسکے دل میں کوئی کہہ رہا تھا "بھائی جان کی دراز میں"۔ پھر دو بڑے بڑے بلوری گولے اسکے سامنے آکھڑے ہوئے جو بھائی جان کی میز پر کاغذوں پر پڑے رہتے تھے ——— اسے منیر کی نیلی گولی یاد آگئی۔ اور اسکے ہونٹوں پر ایک حقارت بھری مسکراہٹ آگئی۔

وہ دروازے سے بھائی جان کے کمرے میں جھانک رہا تھا۔ بھائی جان کی کرسی خالی پڑی تھی۔ ان کی کتاب زمین پر گری ہوئی تھی، میز پر وہ دونوں بلوری گولے پڑے تھے اور تصویروں والی دراز تھوڑی سی باہر نکلی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ دراز اور دونوں گولے اسے اندر کھینچ رہے ہوں۔ اسکے دل میں کوئی کہہ رہا تھا "بس صرف ایکدفعہ اس پھول والے گولے کو ہتھیلی پر رکھکر دیکھو گا ——— اور دراز میں سب سے اوپر جو تصویر ہوگی اسے دیکھکر واپس لوٹ آؤنگا ——— وہ دبے پاؤں دراز کی طرف جا رہا تھا۔ اسکے پاؤں اس وقت اسے زبردستی لے جا رہے تھے۔

دفعتاً کمرے کے دائیں کونے سے اس نے کپڑوں کی سرسراہٹ سنی۔ ٹھہر گیا ——— مڑا ——— سامنے بھائی جان میز کی طرف پیٹھ کئے کھڑے تھے۔ اُنکے بازوؤں میں ایک رنگدار کپڑوں کا گٹھا سا تھا جو اوپر سے زمین تک پہونچتا تھا، اور جسکے ایک سرے سے ایک چوٹی لٹک رہی تھی۔ بھائی جان اُسکے چوٹی والے سرے پر جھکے ہوئے تھے ——— بھائی جان کا سر جھکا ——— اور وہ کپڑوں کا ستون اور بھائی جان آپس میں خلط ملط ہوگئے ——— مانی وہاں سے بھاگ جانا چاہتا۔ مگر اسکی ٹانگیں گویا تھیں ہی نہیں۔ وہ بھول گیا کہ وہ بھائی جان کے کمرے میں ہے۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ بھائی جان گال پر طمانچہ ماریں تو دو گھنٹے تک گال میں سرسرہٹ رہتی ہے۔ وہ حیران تھا کہ بھائی جان اس کپڑوں کے گٹھے سے کیا کر رہے تھے۔ اور پھر اس کپڑوں کے گٹھے کی چوٹی !!! ——— پھر اُس نے بھائی جان کی آواز سنی ———

"ظالم" ——— بھائی جان اس کپڑوں کے ستون سے باتیں کر رہے تھے !!! ——— پریشانی میں اس کا ہاتھ میز سے جا ٹکرایا ——— دونوں شکلوں میں ایک فوری جنبش ہوئی مانی نے ڈر کے مارے آنکھیں جھکا لیں ——— کچھ خاموش آوازیں سنائی دیں۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

"یہ رومال تو تم بھول ہی گئیں"۔ بھائی جان کی آواز آئی، اس نے ڈرتے ہوئے آنکھ اُٹھائی، سامنے بھائی جان کھڑے تھے۔ بائیں طرف اُنکی ملازمہ بانو بیٹھی میلے کپڑے باندھ رہی تھی۔ "ہاں اور دھوبی کو تاکید کر دینا کہ یہ کالر مجھے شام تک تیار کر دے سمجھی"؟ بھائی جان کی آواز میں جھجھک سی تھی۔

بانو نے جھکی ہوئی نگاہوں سے کالر لے لیا۔ اور مدہم سی آواز میں کہنے لگی "بہت اچھا"۔

مانی نے بھائی کو یوں مشغول دیکھا تو اسے نامعلوم سا احساس کہ اسے وہاں سے سرک جانا چاہئے۔ اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ اسے وہاں کیوں ٹھہرنا نہیں چاہئے۔ وہ حالات کیا تھے، اور وہ شکلوں کا گڈمڈ ہونا کیا تھا۔ البتہ وہ یہ جانتا تھا کہ جب کبھی بانو بھائی جان کے کمرے میں آتی تو بھائی جان یک لخت مانی میں دلچسپی لینا بند کر دیتے۔ کندھے سے اُتار دیتے یا باتیں کرنا بند کر دیتے ——— اور بیگانگی سے کہتے "اچھا مانی اب تم باہر جا کر کھیلو مجھے اب پڑھنا ہے"۔ اور بانو کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک سی لہرا جاتی۔ اس وقت بانو نیچی آنکھوں سے کپڑے سے میز یا پرشر سے دری جھاڑنا شروع کر دیتی۔ مگر مانی کو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کنکھیوں سے بھائی کی طرف دیکھ دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا رہی ہو۔ اسوقت اسکے گال سُرخ سے نظر آتے اور وہ چلتے چلتے ٹھٹکنے لگتی اور "جی اچھا" کہتے ہوئے اسکی آواز میں لوچ سا آجاتا۔ حالانکہ اندر اماں سے باتیں کرتے ہوئے اسکی آواز بھدی سنائی دیتی، اسکی آنکھیں پھیکی اور اس کا مُنہ زرد سا رہتا جیسے وہ دُنیا سے بیزار بیٹھی ہو ———

ماتی نے بھائی کو یوں مصروف دیکھ کر موقع غنیمت سمجھا۔ اور سرک جانا چاہا۔ مگر بھائی جان فوراً بول اٹھے "ٹھیرو ماتی۔ مجھے تم سے کام ہے" ماتی ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس کا دل از سر نو دھڑکنے لگا، اس نے کانپتے ہوئے بھائی کیطرف دیکھا مگر بھائی اپنی نکٹائی دیکھنے میں شدت سے مصروف تھے۔ ماتی نے معصوم سامنہ بنالیا اور ایک اُڑتے ہوئے پر کو پکڑنے میں مصروف ہوگیا۔ بظاہر وہ اس پر سے کھیلنے میں مصروف تھا۔ مگر وہ کنکھیوں سے بھائی اور بانو کو تاڑ رہا تھا۔ بھائی جان بانو کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا رہے تھے اور کہہ رہے تھے "بخدائی بھی لے جاؤ بانو۔ یہ بھی اب کچھ میلی ہوگئی ہے" بانو نے نگاہ اُٹھائی۔ اس کا منہ سُرخ کیوں ہو رہا تھا۔ اور اُسکی آنکھیں خدا جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ ان مسکراتی آنکھوں کے اوپر جھکی ہوئی بھویں دوڑ کر ایک دوسرے کے قریب ہوگئیں۔ اسکی پیشانی پر ایک شکن پڑگیا۔ جیسے وہ گھور رہی ہو۔ مگر وہ پیشانی گھورتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً جس طرح اسکے ابا کی پیشانی گھورتی تھی ——— بانو لچک کر مُڑی، اسکے گالوں میں چھوٹے چھوٹے سے گڑھے پڑے ہوئے تھے، اور وہ اچھل کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ ایک ساعت کے لئے ماتی یہ بھول گیا کہ اُسے اس پر میں محو نظر آنا چاہیئے۔ بھائی جان مُڑے۔ ماتی نے اس مُسکراہٹ کو روکنے کی کوشش کی جو خواہ مخواہ اس پر چھارہی تھی، اور وہ مزید معصومیت سے اپنے کھیل میں مشغول ہوگیا۔

"ماتی جاؤ۔ میرے لئے ایک پانی کا گلاس لاؤ" بھائی نے کہا۔

ماتی نے یہ سُنا اور اُسکے دل سے ایک نامعلوم سا بوجھ اُتر گیا کہ خدا جانے بھائی کیا کیا کہیں گے۔

باہر صحن میں بانو کھڑی کپڑے گن رہی تھی۔ اس کا بدن ڈھیلا اور منہ زرد سا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا خدا جانے بانو کو بھائی جان کے سامنے جاکر کیا ہو جاتا ہے۔ بھائی جان کے کمرے میں وہی بانو بالکل نئی بانو ہو جاتی ہے۔ اس کا دل چوری چوری آرزو کر رہا تھا کہ بانو بھائی جان کے کمرے میں ہی رہے اور وہ چھپ چھپ کر دیکھتا رہے۔ مگر بھائی جان تو ایسے وقت اُسے گھور کر باہر نکال دیا کرتے تھے۔ اور کہتے "تم جاؤ۔ اب مجھے پڑھنا ہے"

پانی کا گلاس لے کر بھائی نے ماتی کا کان پکڑ لیا اور کہنے لگے "تم بہت شریر ہو گئے ہو۔ یوں میرے کمرے میں چوروں کی طرح گھس آتے ہو بدمعاش۔ پھر میں نے یوں آتے دیکھا تو بری طرح سے پیٹوں گا سمجھے"

پہلے تو ماتی سمجھتا رہا کہ بھائی جھوٹ موٹ کہہ رہے تھے۔ مگر جب بھائی نے گھور کر باہر نکال دیا تو ماتی بے چارہ سخت حیران ہوا۔ "یہ عجیب بات ہے۔ بھائی اس آئی گئی بات پر اب خفا ہو رہے ہیں" اسوقت تو انہوں نے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ یہ کیا باتیں ہیں ——— کیوں ——— وہ کیوں گڈمڈ ہو رہے تھے، بانو کی آنکھیں کیوں چمکتی تھیں۔ اس کا منہ سُرخ کیوں تھا ———

"یہ دیکھو ماتی۔ ہمارے پاس چاقو ہے"۔ منیر نے آکر چاقو دکھاتے ہوئے کہا۔

ماتی نے للچائی ہوئی نظروں سے چاقو کی طرف دیکھا۔

اسکی نگاہ منڈیر پر جا پڑی۔ کوا بیٹھا تھا دفعتاً اسے کچھ یاد آگیا "چپ!" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھکر منیر سے رازدارانہ انداز میں کہا "آؤ" اُس نے اشارہ کیا، وہ بیٹھ گیا، اُسنے اپنے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر دائیں آنکھ بند کرلی اور دایاں بازو سمیٹ کر بائیں آنکھ سے شست باندھی "ٹھس" کہکر اس نے اپنا دایاں بازو کوے کی طرف ہوا میں چلا دیا۔ کوا اُڑ گیا۔

"دیکھا" ماتی نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ بندوق ہے کوئی کوا ہو کہیں بیٹھا ہو ایک منٹ میں مر کر اُڑ جائیگا"

منیر پہلے تو متاثر ہو کر دیکھتا رہا پھر وہ فلکت اس بندوق سے بے نیاز ہو گیا۔

"یہ دیکھو" اس نے چاقو کی دھار کی طرف اشارہ کر کے کہا "کوئی چیز ہو ایک جھٹکے میں کاٹ کر دو کر دونگا۔ یہ دیکھو" اس نے ایک تنکے کو کاٹتے ہوئے کہا "یہ ایک یہ دو ——— دیکھا ———" اور مرغی کا پر کاٹ کر

دکھاؤں ؟" آؤ باہر۔ وہاں بیدی کے پاس میں نے بہت سے پر رکھے ہیں۔ بہت سے" ——— اور وہ دونوں باہر نکل گئے۔

منیر مرغی کا پر کاٹ رہا تھا۔ بیدی کا دل دھڑک رہا تھا، شوق سے یا ڈر سے، اور وہ منیر کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ ماتی نے بیدی کو یوں منیر پر جھکے ہوئے دیکھا تو یکلخت اُسے اس کاٹنے والے چاقو میں کچھ دلچسپی نہ رہی وہ لاپروائی سے اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا، وہاں کوئی کوا نظر نہ آیا، پھر فوراً اُسے سوجھی "ہمارے بھائی جان کے پاس ایک اتنی لمبی چھری ہے" اُس نے اپنا بازو اکڑا کر کہا "اتنی لمبی" مگر شاید اُس ننھے سے جیتے جاگتے چاقو میں، اُس اتنی لمبی چھری سے جو ابھی تک محض ایک قصہ تھی زیادہ کشش نہ تھی اسکی یہ بات بیدی کو منیر سے توڑ نہ سکی۔ شاید اسلئے کہ ماتی کی اتنی لمبی چھری کے وجود سے وہ منکر تھے۔ اس کا وہاں ٹھہرنا صریحاً اسکی بے عزتی تھی وہ گھر کی طرف چل پڑا۔

سامنے دروازے میں ان کا نوکر شریف بیٹھا تھا۔ اسنے اپنی قمیص اُتار کر پیٹھ پر ڈال رکھی تھی، اسکے سینے پر لمبے لمبے کالے کالے بال دیکھ کر ماتی اپنی اتنی لمبی چھری بھول گیا۔ ایسے ہی بال بھائی جان کی تصویروں پر تھے، جنہیں وہ دراز میں چھپا کر رکھتے تھے ——— اُس کا ہاتھ چوری چوری اپنی قمیص کے اندر گھس گیا۔ وہاں ایک بال بھی نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ اُسکے بدن پر بھی بال ہوتے۔ اور وہ اپنے آپ کو شریف کے مقابلے میں سخت حقیر سمجھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بدن بھی شریف کی طرح موٹا موٹا اور میلا میلا ہو، اور اس پر بہت سے کالے کالے بال ہوں ——— اُس نے سُنا شریف گا رہا تھا۔ دھیمے دھیمے۔

"ظالم لو کی شیریں ———"

"ظالم"! اُس نے دل میں دُہرایا۔ بھائی جان اُس کپڑوں کے سُتون سے بھی یہی کہہ رہے تھے۔ خدا جانے ظالم کون تھا۔ کیا تھا۔ معاً اُس نے دیکھا کہ شریف کی آنکھ میں بھی وہی بھائی جان والی چمک تھی ——— اسکی آنکھیں شریف کی نگاہوں کی سمت اُٹھیں

سامنے کنوئیں پر ایک عورت پانی بھر رہی تھی۔ اس کا دوپٹہ بار بار سر سے سرک جاتا، اور وہ بار بار اُسے سنوارتی اور مُڑ مُڑ کر شریف کی طرف دیکھتی۔ اُسکی کالی کالی آنکھیں کونوں میں آآ کر شریف پر مسکراتیں، ادہر شریف مسکرا مسکرا کر اور جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔ ماتی کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں باتیں کر رہی تھیں، بغیر بولنے کے بول رہی تھیں ——— پھر اُس نے دیکھا کہ اس عورت نے پانی کا گھڑا اُٹھایا۔ اس نے شریف کی طرف دیکھا۔ اُس کی گردن نے خم سا کھایا۔ اور وہ چل پڑی ——— اور شریف بھی اُٹھ کر اسی طرف چل دیا، جیسے وہ چلتے چلتے بُلا گئی ہو۔

ماتی کے دل میں خیالات کا ایک چھتہ بھنبھنا رہا تھا۔ چھوٹے بڑے کیوں کیسے کس لئے کیا اُسکے ذہن میں آوارہ تھے۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں، باتیں کرتی ہوئی بھویں، پیار سے گھورتی ہوئی پیشانی۔ بال۔ ظالم۔ تمام اُس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

وہ پریشان سا پھر رہا تھا۔

آپا کے کمرے میں سامنے آئینہ رکھا دیکھکر اسکے دل میں اپنی آنکھیں دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی، اُس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آپا بال بنایا کرتی تھیں۔ اس نے کئی مرتبہ دیکھا تھا کہ جب بھائی حمید اماں کو سلام کرنے آتے تو آپا کسی نہ کسی بہانے ایک دفعہ میز کے قریب جا کر اپنا منہ آئینہ میں دیکھ آیا کرتیں۔

آئینہ میں موٹے سے منہ والا اور بکھرے ہوئے بالوں والا ایک لڑکا نظر آ رہا تھا، جسکی آنکھوں میں زرد زرد سے میل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ منہ پر یہاں وہاں کچھ دھبے سے پڑے تھے اس نے جھٹ منہ موڑ لیا۔ سامنے وہی اتنی لمبی چھری پڑی تھی، مگر اس وقت وہ چھری بھی اُسے تسکین نہ دے سکی، اور وہ بے بسی اور پریشانی سے باہر نکل آیا۔

باورچی خانے میں اماں بیٹھی کھانا تیار کر رہی تھیں، اور بانو بیٹھی آلو چھیل رہی تھی "کیسی چُپ چاپ سی بیٹھی ہے" اُس نے بانو کو دیکھ کر دلمیں سوچا۔ اُسوقت اسکی آنکھیں بھی خالی خالی اور اندر کی

طرف دھنسی ہوئی تھیں "آنکھیں بھی کیا اَدلنے بدلنے والی چیز ہیں" اس نے سوچا کبھی کچھ کبھی کچھ۔ خدا جانے کیوں لوگوں کی آنکھوں میں کبھی چمک جاتی تھی، اور کبھی کچھ بھی نہیں۔ اس دُنیا میں کوئی چیز بھی یقینی نہیں" اسوقت بانو کا منہ بھی کچھ زرد زرد سا تھا "خدا جانے کیا بھید ہے؟" ایسے موہوم خیالات اُسکے دل کی تہ میں گھوم رہے تھے۔

اسکی نگاہ بھٹک کر سامنے صحن میں جا پڑی۔ وہاں اسکی مُرغی چُگ رہی تھی۔ اس مرغی کو وہ "چترّی" کہا کرتا تھا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ پڑوسیوں کا مُرغا "چترّی" کو دق کر رہا ہے ——— یک لخت مُرغا چترّی سے لڑ پڑا اور اس نے زور کر چترّی کے سر میں چونچ ماردی ——— پھر وہ دونوں ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو گئے۔ خدا جانے مرغی کیا ہوئی۔ وہ حیران تھا کہ یہ چیزیں کس طرح ایک دوسرے میں اُلجھ جاتی ہیں۔ کس لئے؟

"اماں وہ دیکھو" اس نے صحن کی طرف اشارہ کرکے کہا "یہ مرغا خواہ مخواہ میری چترّی سے لڑتا ہے۔ میں اسے ماردونگا۔ میرے پاس چاقو بھی ہے۔ منیر کے پاس"۔

ماں نے باہر دیکھا اور پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ روک کر بناوٹی غصے سے کہنے لگی۔

"چپ رہ۔ نالائق۔ ایسی گندی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ جا باہر جاکر کھیل"۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے دیکھا بانو کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"خدا جانے باہر لڑکوں سے کیسی گندی گندی باتیں سیکھ آتا ہے" ماں کہہ رہی تھی۔ گندی باتیں! اُس نے سوچا۔ گندی کیوں۔ کونسی گندی باتیں۔ اور وہ سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر جاکر اُس نے اپنی دستی بندوق سے دو ایک کوّے اُڑائے۔ دو ایک اُڑتے ہوئے پر پکڑے۔ اور مرغے کے دو ایک پر نوچے۔ پھر وہ اُکتا سا گیا اور یونہی گھومتا ہوا آپا کے کمرے میں جا نکلا۔ آپا صندوق کے سامنے دروازے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔

"چلو آپا کو چل کر ڈرائیں" اُسے سوجھی اور وہ دبے پاؤں آپا کے پیچھے جا پہونچا۔

اس نے دیکھا آپا کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی ——— آپا اس تصویر کو سینے سے لگا کر بھینچ رہی تھی۔

"ہاؤ" اس نے ڈرانے کی غرض سے چلاّ کر کہا اور ہنس پڑا۔ آپا پہلے تو گھبرا گئی، مُڑ کر دیکھا اور پھر اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگی "تم ہو مانی۔ شیطان"۔ اور آپا نے جھٹ وہ تصویر بغل سے نکال کر صندوق میں رکھکر قفل لگا دیا۔ آپا کو تصویر رکھتے ہوئے دیکھکر مانی نے کہا "آپا بھائی جان کے پاس بھی بہت سی تصویریں ہیں۔ میز کی دراز میں پڑی ہیں۔ اور آپا" اس نے منہ بنا کر کہا "ان تصویروں کے بھدّے بھدّے سے جسم اور لمبے لمبے بال ہیں۔ میں تم کو دکھا دونگا"۔

"چُپ" آپا نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "ایسی بات نہیں کیا کرتے"۔

"نہیں آپا۔ سچ۔ اتنے لمبے لمبے بال۔ اور آپا لمبے لمبے منہ والی عورتیں۔ موٹی موٹی ٹانگیں اور اتنی بڑی ———"

"چُپ گدھا کہیں کا" آپا نے کہا "ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اماں نے سن لیا تو پیٹ جائیگا"۔ اور آپا باہر چلی گئی۔

"کیسی باتیں؟" وہ سوچنے لگا "کیوں نہ کروں۔ بھائی صاحب کے پاس تصویریں تو تھیں۔ اس نے خود کئی دفعہ دیکھی تھیں۔ اور بھائی جان خود انہیں روز دیکھا کرتے تھے۔ آپا کیوں اُسے منع کرتی تھی۔ یہ کیا جھگڑا ہے۔ یہ لوگ کیسے ہیں"۔ وہ سخت پریشان ہو رہا تھا

رات کو آوازیں سُن کر اسکی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں ایک مدھم سا لیمپ روشن تھا۔ اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اُس نے سُنا ابا کہہ رہے تھے "امانت کی ماں تم ہمیشہ ایسی باتیں کیا کرتی ہو"۔

"چُپ دیکھئے، مانی جاگ رہا ہے"۔

"مانی ابھی بچہ ہے۔ اس کا کیا ہے۔ تم بڑی ظالم ہو"۔

مانی نے کنکھیوں سے دیکھا ——— دو دھندلی سی شکلیں

غلط ملط ہوگئیں۔

ماتی سوچ رہا تھا۔ کیا دُنیا کے ہر شخص کو ظالم کہا جاتا ہے اور بھائی جان بھی ظالم کہہ رہے تھے۔ شریف بھی ظالم گا رہا تھا اور اب وہاں رات کے وقت بھی اسکے قریب ہی کوئی ظالم تھا۔ دیکھنے کے لئے اُس نے کروٹ بدلی۔ فوراً وہ آوازیں خاموش ہوگئیں ——— ایک ہاتھ اونچا ہوا لیمپ کی طرف بڑھا۔ کمرے میں بالکل اندھیرا ہوگیا۔ ماتی ڈر گیا۔

"اماں اماں" وہ چیخ مار کر اُٹھ بیٹھا۔

"چُپ کیسا شور مچایا ہے۔"

"امی جان اندھیرا ہے" ماتی نے بسورتے ہوئے کہا۔

"سو جا بیٹا لیمپ میں تیل ختم ہوگیا ہے۔ سارا دن دنگا فساد اور کھیل کود میں کٹ جاتا ہے۔ رات کو بھی تجھے آرام نہیں۔ رات کو تو سو نے دیا کر۔"

"سونے دیا کرو" اس نے سوچا۔ کیا وہ سچ کہہ رہے تھے۔ سونا تو اسے کہتے ہیں جب کہ کوئی بالکل سو جائے۔ ذرا بات نہ کرے۔ وہ حیران سا تھا ——— ظالم ——— غلط ملط ——— اندھیرے میں ماں کا ہاتھ اسکی طرف آیا اور اُسے تھپکنے لگا۔

اگلے روز ماتی زبیدہ سے کہہ رہا تھا۔

"بیدی آؤ کوٹھے پر چل کر کھیلیں۔" وہ کوٹھے پر چلے گئے۔

"یہ نیا کھیل ہے"

"چُپ" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا "میں ہوں ابا اور تم ——— وہ سوچنے لگا ——— نہیں۔ اس کھیل میں لیمپ بھی چاہیئے ——— "اچھا" اس نے خوش ہو کر کہا "تم ہو بانو ——— اور میں ہوں بھائی جان ——— منیر کو بالکل نہ بتانا ——— میں ——— چُپ" اس نے چاروں طرف مڑ کر دیکھا، سامنے دروازہ کھلا تھا ——— "ٹھہرو۔ میں دروازہ بند کر آؤں" ——— اُس نے دبی آواز سے کہا۔ دروازہ بند کر کے وہ اسی طرح منہ پر انگلی رکھے دبے پاؤں واپس آیا ——— "بانو" اُس نے دبی آواز میں کہا "قمیص اُتار دو۔"

——— "اچھا" ——— بیدی نے شوق اور حیرانی سے کہا۔

اور وہ انتہائے شوق اور تحیر سے بُت بنی کھڑی تھی۔

ممتاز مفتی

حوّا کی بیٹی!

شام کا دلکش سماں ہے ڈھل چکا ہے آفتاب
اک طوائف اپنے کوٹھے پر کھڑی ہے بے حجاب

اک بہارِ نشہ و بو، اک نگارِ شوخ و شنگ
عارضوں پر غازۂ گلگوں، لبوں پہ سرخ رنگ

محفلِ زہرہ کا اک آئینۂ سحر و جادوگری
آسماں کی حور، اندر کے اکھاڑے کی پری

حسن اور تازہ جوانی جوش پر آئی ہوئی
راہ چلتوں کی نظر پڑتی ہے للچائی ہوئی

سینہ و بازو پہ زلفِ ناز لہرائے ہوئے
ریشمی ساری کا آنچل سر سے ڈھلکائے ہوئے

زمزمے ہیں عشرتوں کے نقرئی آواز میں
بے حجابی کے تقاضے ہیں نگاہِ ناز میں

اے کہ عشرت کی بہاریں ہیں ترے گلزار میں
بکتی ہے حسن کی رنگینیاں بازار میں

کوڑیوں کے مول دی تو نے جوانی کی شراب
ظلمتوں میں غرق کر ڈالے ہزاروں ماہتاب

عارضوں کا رنگ ہونٹوں کی حلاوت بیچ دی
تو نے کانٹوں کے عوض گل کی نزاکت بیچ دی

اپنی رنگینی سے ہر آغوش تو نے بھر دیا
تو نے دنیا کے لئے جنت کو سستا کر دیا

ایک دنیا کے لئے اذنِ ہوس کاری ہے تو
آج اے حوّا کی بیٹی جنسِ بازاری ہے تو

رات بھر تیرے شبستاں کے در و دیوار پر
تھرتھراتا ہے گنہ آلود روحوں کا اثر

زندگی کے اک بھیانک خواب کا نقشہ ہے تو
جامۂ انسانیت پر بدنما دھبّا ہے تو

تو نے مٹی میں ملا دی ملّتوں کی آبرو
ہے ترے ساغر کی رنگینی میں مذہب کا لہو

توڑ ڈالیں بادۂ الفت کی تو نے چھاگلیں
عشق کی محفل میں روشن کیں ہوس کی مشعلیں

تیرا فرشِ کامرانی ہے بساطِ کشت و خوں
تو گرا ڈالے گی تہذیب و تمدن کے ستوں

تیرے ہاتھوں سے مٹے گا بازوئے محنت کا بل
دستِ دولت آفریں اک روز ہو جائیگا شل

سینکڑوں شعلے ہیں تیرے عشرتوں کے رگ میں
تو مٹا ڈالے گی ایک دن دہر سے نیکی کا نام

تو جلا ڈالے گی دنیا کو سنہری آگ میں
لے رہی ہے آج تو دنیا سے شاید انتقام

بھوک اور افلاس سے جب زندگی تھی تجھ پہ تنگ
عزت و محنت کا دشمن خود غرض سرمایہ دار
جس نے چوسا تیری رگ رگ سے جوانی کا لہو
جس نے ڈالے اس گنہ کی راہ پر تیرے قدم
مدتوں تک بھوک کی ماری رہی جو آتما
پیٹ کی خاطر اگر تو بیچتی ہے جسم آج

تیری عزت کو نگل بیٹھا یہ دولت کا نہنگ
کھیلتا ہے جو برابر نوعِ انساں کا شکار
چاک کر دی جس نے غربت کی قبائے آبرو
تیری عصمت پاشیوں پر وقف ہے جس کا کرم
کر دیا "دولت" نے اسکی آبرو کا خاتمہ
کون ہے نفرت سے تجھ کو دیکھنے والا سماج!

کون سی محفل ہے ایسی جس کی تو ساقی نہیں؟
سامنے دنیا کے تف کرتے ہیں تیرے نام پر
راستہ میں دن کو لے سکتے نہیں تیرا سلام
تیرے کوچے سے جنہیں ہو کر گذرنا ہے گناہ
محفلوں میں تجھ سے کر سکتے نہیں جو گفتگو

ان میں لیکن جرأتِ اخلاق بھی باقی نہیں
خلوتوں میں جو ترے قدموں پہ رکھ دیتے ہیں سر
رات کو جو تیرے ہاتھوں سے چڑھا جاتے ہیں جام
گرم انکی سانس سے رہتی ہے تیری خوابگاہ
تیرے آنچل میں بندھی ہے انکی جھوٹی آبرو

اٹھ! اک ایسی زندگی بے کار ہے تیرے لئے
جس سے رہ جائے تیرے ملک و وطن کی آبرو
جان تک اپنے خریداروں سے لے سکتی ہے تو

عیش گویا عیش کا آزار ہے تیرے لئے
اپنی قیمت ایک ایسی شرط کر سکتی ہے تو
اپنی قیمت عرش کے تاروں سے لے سکتی ہے تو

زندگی میں حشر ڈھا سکتا ہے یہ تیرا شباب
منتظر ہے تیری نظروں کا سماجی انقلاب

جاں نثار اختر علیگ

ڈاکٹر مساریک

۱۶ ستمبر ۱۹۳۷ء کے روزناموں میں برقی اخبار کے ضمن میں ایک خبر شائع ہوئی:۔
"ڈاکٹر ٹی مساریک سابق صدر زیکوسلوویکیا نے ۱۴ ستمبر کو ۸۷ سال کی عمر میں وفات پائی"۔

بہت کم ہندوستانی ہونگے جنہوں نے اس خبر کو کسی توجہ سے پڑھا ہو یا یہ نام بھی اُن کو یاد رہا ہو۔ ایسے ایسے صدر، وزیر اعظم، مدبر، پروفیسر دُنیا کے کسی نہ کسی حصہ میں روز مرا کرتے ہیں۔ غیر ممالک کے لوگ ان پر کہاں تک توجہ صرف کر سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ مگر ڈاکٹر مساریک ان لوگوں میں سے نہ تھا جن کی زندگی پر ایک غلط انداز نگاہ ڈال کر یا نگاہ کئے بغیر گذر جانا جائز ہے۔ اس کی زندگی ہمارے نوجوانوں کے لئے ایک شمع ہدایت ہے۔ خضر راہ ہے، سبق آموز ہے، محرک عمل ہے، اس لئے ہم مختصراً اس کے سوانح حیات مفکر دماغوں اور حوصلہ مند دلوں کے سامنے پیش کرتے ہیں:۔

ٹامس گاریگ مساریک مارچ ۱۸۵۰ء میں زیکوسلوویکیا میں جو اُس وقت آسٹریا کا علاقہ تھا ایک کوچبان کے گھر پیدا ہوا۔ بچپن میں اس کی تعلیم میں غریب باپ نے کیا حصہ لیا معلوم نہیں مگر ماں ہمیشہ اُس کی ہمت افزائی کرتی رہی۔ ہوش سنبھالتے ہی تحصیل علم میں اس کا غیر معمولی انہماک دیکھا گیا۔ اپنے ضلع کے صدر مقام برون میں جہاں وہ تعلیم پا رہا تھا ایک پولیس افسر کے بیٹے کا خانگی معلم مقرر ہوا اور اُس کے خاندان کے ساتھ ویانا جا رہا۔ وہاں اس پر ایک زمانہ ایسا بھی گذرا کہ وہ لوہار کا کام کرتا تھا۔ ہاتھ میں ہتھوڑا ہوتا اور دل میں عظمت و عزیمت کی بلند منزل۔ اپنی تعلیم سے کبھی غافل نہ رہا۔ پھر معلمی اختیار کی اور خود پڑھتا رہا۔ صرف ماں اس کا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ خانگی طور پر اتنی علمی ترقی حاصل کرلی کہ وہ کسی ضابطے کے امتحان کے بغیر ویانا یونیورسٹی میں داخل کر لیا گیا۔ اپنی قلیل کمائی سے فیس بھی ادا کرتا رہا۔ ویانا میں فلسفہ میں امتیاز کے ساتھ ۱۸۷۶ء میں گریجویٹ ہوا، پھر لیپزگ جرمنی میں مزید تکمیل کی اور ویانا یونیورسٹی میں لکچرار ہو گیا۔ ۱۸۸۲ء میں پریگ (موجودہ زکوسلوویکیا کا پایۂ تخت) میں فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا۔

پیشہ تعلیم کے ساتھ ادبیات، صحافت، سیاست اس کا شغلہ تھا۔ اپنے ملک اور باہر کے جرائد میں وہ مضامین لکھتا رہتا تھا۔ پھر اپنا ایک مخصوص جریدہ "ایتھنیم" بھی جاری کیا۔ ۱۸۸۴ء میں وہ اپنی زیک زبان کی انسائیکلوپیڈیا کا مدیر مقرر ہوا۔ اس نے سیاسی انجمنیں بھی بنائیں، توڑیں، دوسری جماعتوں میں مدغم کیں۔ ان کا مقصد مقامی سیاست کا الٹ پھیر تھا جو عام دلچسپی کا باعث نہیں اس لئے ہم اُسے نظر انداز کرتے ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں وہ ویانا کی پارلیمنٹ ریخرت میں اور ۱۸۹۲ء میں ڈایٹ (پارلیمنٹ) میں اپنی پارٹی کا نمائندہ منتخب ہوا مگر ۱۸۹۳ء میں ایک دوسری برسر اقتدار جوان زیک پارٹی سے اختلاف کی بنا پر مستعفی ہو گیا۔

پروفیسر اور مصنف کی حیثیت سے وہ ہمدردی نوع انسان، مساوات اور صداقت کا مبلغ رہا۔ آسٹریا کی سیاسی پالیسی پر وہ ہمیشہ نکتہ چینی کرتا رہا۔ ایک طرف جرمنی کے آسٹریا کا علاقہ غصب کرنے کے خلاف آواز اُٹھائی تو دوسری طرف آسٹریا کے بلقان پر دست درازی اور بوسینا کے الحاق پر صدائے مخالفت بلند کی۔ آسٹریا کی بعض اندرونی سازشوں اور خیانتوں کا راز طشت از بام کیا۔
۱۸۷۶ء میں مساریک بحیثیت پروفیسر، فلسفی، مدبر، مصنف ایسی شہرت و عزت کا مالک ہو چکا تھا کہ ایک دولتمند امریکی خاتون

چارلٹ گاریگ سے اُس کی شادی ہوگئی۔ اور بیوی کے نام گاریگ کو اُس نے اپنے نام کا جزو بنالیا۔ اُس کی بیوی صحیح معنی میں اُس کی شریک زندگی تھی۔ صرف گھر میں نہیں بلکہ میاں کے تمام سیاسی جدوجہد، دکھ سکھ، رنج وراحت میں جان سے اور مال سے۔ ابتدائً مساریک کے حوصلے کی پرواز معلمی واُستادی سے اُونچی نہ تھی۔ مگر فلسفیانہ تدبر نے اُسے سیاست کے کانٹوں میں اُلجھائے بغیر نہ چھوڑا۔ وہ اگر پروفیسری پر قناعت کرلیتا تو ایک مصنف کی حیثیت سے بھی کوئی معمولی رتبہ نہ رکھتا تھا۔ مگر اس کے ضمیر کی تڑپ، صداقت کے جوش، ایمان کے تقاضہ نے اُسے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ذلت وافلاس کی کشمکش سے نکلکر اُس نے عزت وآرام کے بستر پر دم بھر خواب شیریں کا لطف اٹھانا جائز نہ رکھا۔ حُبِ وطن اور محبتِ بنی نوع انسان کی آگ میں تڑپتا اور کانٹوں میں اُلجھتا رہا اور اُس کی بیوی ۱۹۲۳ء تک یعنی مرتے دم تک گھر اور اولاد کی ذمہ داریوں کے باوجود اُسکی آگ اور کانٹوں میں اُسکی شریک اور مددگار رہی۔

مساریک کی زندگی کا ایک نیا پُرعظمت باب جنگ عظیم سے شروع ہوا۔ اُس کے سیاسی عقائد واعمال کے جُرم میں آسٹریا کی فوجی حکومت نے اس کے خلاف غداری اور جاسوسی کا الزام عائد کیا۔ ۱۹۱۴ء میں اُسے اٹلی میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ اور وہاں سے سویزرلینڈ، فرانس اور انگلستان میں ہر جگہ وہ اپنی قوم کی سیاسی آزادی کا پرچار اور ان تھک جدوجہد کرتا رہا۔ اس عرصے میں وہ کنگس کالج لندن میں دو برس پروفیسر بھی رہا۔ وہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ماہر تھا۔ ۱۹۱۷ء میں وہ روس اور وہاں سے امریکہ چلا گیا۔ جہاں آسٹریا کے زوال پر اس نے زیک نیشنل کونسل کی تصدیق وتوثیق حاصل کرلی۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں جب وہ نیویارک کی ایک مجلس ضیافت میں احباب واعیان کے ساتھ شریک طعام تھا اُسے اپنے وطن سے ایک تار ملا کہ وہ زیکوسلوویکیا کے نئے جمہوریہ کا پہلا صدر منتخب ہوا۔ اس نے کسی ہیجان کے اظہار کے بغیر اُسے خاموشی سے جیب میں رکھ لیا اور حاضرین میں سے کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ جب اس جدید ریاست کی بنا پڑی، اس کا صدر امریکہ میں گورنمنٹ پیرس میں، فوج سائبیریا میں اور قوم وطن میں تھی دشمنوں میں گھری ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں سات برس کے لئے دوبارہ صدر منتخب ہوا۔ پھر ۱۹۲۷ء میں اس عہدے کی مزید توسیع کی گئی۔ یہ زیک نیشنل کونسل کے نظام آئینی کے خلاف تھا مگر اُس کی خاطر آئین کو ڈھیلا کیا گیا۔ زیک اور سلوویک دو مختلف اقوام کو ملا کر ایک آزاد متحدہ ریاست قائم کرنے اور اس کی کامل آزادی کو دولِ یورپ سے منوانے کے لئے اُسے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۳۴ء میں وہ پھر یورپ کے دورے پر نکل گیا۔ اور انتہائی جدوجہد کے بعد دولِ ائتلاف ثلاثہ سے معاہدۂ ٹیسبرگ پر دستخط کرالئے۔ اس کی رُو سے زیک اور سلوویک اقوام کا اتحاد اور ائتلاف کی رُکنیت منوا کر زیکوسلوویکیا کو ایک آزاد ریاست تسلیم کرالیا۔ اور دو عملی ریاست کا خاتمہ ہوگیا۔

دسمبر ۱۹۳۵ء میں ضعف پیری کے عذر سے وہ صدارت سے مستعفی ہوگیا۔ اس کی ہشتاد سالہ سالگرہ کی تقریب میں پارلیمنٹ نے اُسکے لئے اسّی ہزار پونڈ کا عطیہ منظور کیا مگر اس نے یہ رقم سرطان کے مریضوں کے لئے ریڈیم کی خرید اور مُفت علاج کیلئے وقف کردی۔

مساریک کے چار بچے ہوئے۔ ایک بیٹا نقاش ہوا اور ۱۹۱۵ء میں فوت ہوا۔ دوسرا پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر ہوا۔ پارلیمنٹ کا ممبر تھا، زیک ریڈکراس (صلیب احمر) کا صدر، جنگ عظیم میں قومی غداری کے جُرم میں قیدخانہ میں رہا۔ تیسرا امریکہ میں ایک ممتاز افسر تھا اور آجکل لندن میں زیکوسلوویک سفیر ہے۔ چوتھی ایک بیٹی ہے جو جنگ عظیم میں باپ کی مددگار اور نگراں حال رہی۔

مگر ان تمام وارثوں میں سب سے زیادہ لائق فخر اسکے وہ روحانی وارث ہیں۔ قومی آزادی اور علمی تصانیف جن کی تعداد تقریباً چالیس ضخیم جلدوں تک پہونچتی ہے اور قریب قریب سب کا موضوع فلسفۂ حریت ہے۔

م۔ مسلم

بمبئی کی مچھلی والیاں

بمبئی کی مچھلی والیاں اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے ہندوستان کی تمام عورتوں سے مختلف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ اُن کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر تندرستی اور تازگی کا نام حُسن ہے تو میں اُن پر سے لکھنؤ کی نزاکت، گجرات کا تناسب، اور پنجاب کا رنگ قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ پشاور کی عورتیں ڈیل ڈول میں ان سے سبقت لے جائیں گی لیکن اپنے پیروں میں وہ تیز رفتاری پیدا نہیں کر سکتیں جو اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں اس کو برق رفتاری کہتا ہوں کیونکہ وہ چلتی نہیں معلوم ہوتیں بلکہ دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سر پر مچھلیوں کی ٹوکریوں کا ایک بڑا بوجھ رکھکر، اور تعجب ہے کہ وہ اس دوڑ میں اپنے وزن کا توازن اور اپنی رفتار کا تناسب اس طرح قائم رکھتی ہیں کہ جیسے مچھلیاں ان کے سر کا ایک حصّہ ہیں اور بمبئی کی سڑک ان کے قدموں کا۔ بس سمندر کی مچھلیوں نے انسان کا روپ لیکر اپنے مسکن کو تبدیل کر لیا ہے۔ ان کے راستہ میں ٹرام، موٹر، وکٹوریہ اور آدمیوں کی بھیڑ کسی طرح حائل نہیں ہوتی۔ ان کے درمیاں سے یہ اس طرح بچی بچائی ہوئی نکل جاتی ہیں جیسے چمگادڑیں رسّیوں اور تار کے جال میں سے۔

ان کا سفر اس خونچہ والے کا سا نہیں ہوتا جو دروازہ دروازہ ٹھہرتا ہوا چلتا ہے بلکہ مسلسل ہوتا ہے۔ قلابا سے چرچ گیٹ تک یا کوئینس روڈ کی لمبی سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یا چرچ گیٹ، مرین لائیں اور چرنی روڈ تک یا اسپلینڈ میدان، کارنک روڈ اور کرافورڈ مارکٹ تک یہ عورتیں مچھلیوں کو جھولا جھلاتی ہوئی چلتی ہیں۔ یہانتک کہ بمبئی کے ہجوم میں اس طرح کھو جاتی ہیں کہ ہم ان کا پتہ نہیں لگا سکتے، لیکن ان سب میں ایک ہی بات مشترک ہوتی ہے اور وہ ان کی بھاگ، دوڑ ہے۔ وہ تو دم لینے کے لئے بھی نہیں ٹھہرتیں بس وقت کی طرح آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں۔ اُن کی یہ کیفیت جب سے وہ ہوش سنبھالتی ہیں اور جب تک کہ ہوش سنبھالنے کے قابل نہ رہیں اسی طرح رہتی ہے۔ گویا اُن کی زندگی ایک مسلسل مصروفیت اور ایک مقدس فرض ہے۔

انہوں نے مچھلیوں سے تڑپ سیکھی ہے اور سمندر سے نمک مستعار لیا ہے۔ سانولے رنگ اور نرم جلد نے اُن کے چہروں کو جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔ جس وقت ان کے سروں پر ٹوکریاں نہیں ہوتیں تو اُس وقت سیاہ بالوں کا موٹا اور گول جوڑا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اپنے سروں پر سمندر کا بھنور اُٹھائے پھر رہی ہیں۔ وہ ایک ساڑھی باندھتی ہیں جو اکثر سفید اور بے داغ ہوتی ہے۔ گھٹنوں تک ان کے پیر بالکل برہنہ رہتے ہیں اور وہ ساڑھی ان کے جسم پر اس طرح کسی ہوئی رہتی ہے کہ ہندوستان کی کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ البتہ رامپور کا تنگ پائجامہ اس کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساڑھی خود انہوں نے نہیں باندھی ہے بلکہ قدرت نے پیدائش سے قبل باندھ دی ہے یہی وجہ ہے کہ جسم بڑھ گیا ہے اور کپڑا نہیں بڑھا۔ یہانتک کہ اب وہ اس قید و بند سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ شاید اُن کی یہ تیز رفتاری اسی کشمکش کا نتیجہ تو نہیں۔ وہ ساری کے ایک پلّو کو کمر کے گرد لپیٹ کر شانہ پر ڈال لیتی ہیں۔ جسم کے بالائی حصّہ پر ایک چُست شلوکہ ہوتا ہے جس کی آستین کہنیوں تک ہوتی ہے۔ کانوں میں سونے کے مُندرے گلے میں سونے کی بدھی اور چہرے پر اطمینان اور فارغ البالی ظاہر کرتی ہے کہ ہندوستان کی دوسری مظلوم عورتوں کی طرح یہ مردوں کے روایتی ظلم و ستم کا شکار نہیں ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ اقتصادی طور سے بالکل آزاد ہیں اور ان میں سے ہر ایک کیلئے تقریباً دس روپے روزانہ پیدا کر لینا کوئی بات ہی نہیں۔

ان کے پیشے نے ان کو جفاکش، نڈر اور دلیر بنا دیا ہے۔ ان کی قوم جسے اس طرف "کولی" کہتے ہیں مغربی ساحل پر اپنی جفاکشی کی آپ مثال ہے۔ ان کے آبا و اجداد قرونِ وسطیٰ میں تجارتی جہازوں کے لئے ایک مستقل خطرہ تھے، گویا سمندر پر انہیں کی حکومت تھی۔ ان عورتوں کی دلیری سے میں بہت ڈرتا ہوں۔ کیونکہ ٹرام اور برقی گاڑیوں پر چڑھتے وقت یہ "پہلے آپ اور بعد کو میں" کے اصول پر عمل نہیں کرتیں۔ یہ اپنی کہنیوں سے دھکا دیتی ہوئی اپنی جگہ آپ پیدا کر لیتی ہیں۔ اکثر اوقات اس جھڑپ میں بہت سے مہذب آدمی گرتے گرتے بچ جاتے ہیں اور جو منچلے اُن کے منہ آتے ہیں تو اُن کی زبان درازی سے منہ کی کھاتے ہیں۔ یہ نشستوں کے لئے بھیک بھی نہیں مانگتیں خصوصیت سے ٹرام کے اندر زرق برق پارسی خاتونوں کے لئے یہ ایک بلائے ناگہانی ہوتی ہیں۔ عورتوں کی مخصوص نشستوں پر بلاتکلف بیٹھ کر اپنی ہمنشین مہذب خاتون کی ایسی ضیافت کرتی ہیں کہ وہ بیچاری محسوس کرتی ہے کہ ایک جل پری نے اُس کو اپنے آغوش میں دبا لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود سے قبل ہی اپنی ناک کو مضبوطی سے پکڑ کر مچھلیوں کے اس بھنور میں سے نکل جاتی ہے اور پوری نشست تو دائمی حساب کم و بیش رائج ہوتی ہوئی ان کے سپرد کر دیتی ہے۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مچھلی والیاں ساحل پر مچھلیاں پکڑنے والوں کی بیویاں یا بیٹیاں ہیں۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ صبح یا شام کو اگر آپ ٹہلتے ہوئے "سیسون ڈاک" پہونچ جائیں تو آپ کو سمندر کی طرف سے شکاری کشتیاں آتی ہوئی نظر آئیں گی۔ جب یہ کنارے پر لگ جاتی ہیں تو اُن میں سے کولی مرد جو کمر تک لنگوٹی کے سوائے بالکل برہنہ ہوتے ہیں مچھلیوں کے انبار لیکر نکلتے ہیں اور دوسری طرف سے ہماری مچھلی والیاں اپنی خالی ٹوکریاں لیکر ان کے استقبال کو بڑھتی ہیں۔ اُسی وقت نیلام ہوتا ہے اور اس طرح مرد مچھلیاں فروخت کرتے ہیں اور عورتیں اُن کو خریدتی ہیں۔ یہ سودا کرنے اور دام چکانے میں بڑی مشاق ہوتی ہیں۔ مچھلیاں ایک ہاتھ سے دیتی ہیں اور دام دوسرے ہاتھ سے۔ اسکے بعد وہ اپنی ٹوکریوں کو آباد کرکے اپنے روزانہ کے دورے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ دراصل اُس وقت یہ سوال نہیں ہوتا کہ کس کی مچھلیاں لذیذ ہیں بلکہ کس کا بدن زیادہ چست اور پھرتیلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بگولوں کی طرح بمبئی کی بادیہ پیمائی کرتی ہیں۔

برسات کے زمانہ میں مچھلی پکڑنے والوں کا کام مندا پڑ جاتا ہے اور اُن کا تمام وقت جال کی مرمت کرنے، شراب پینے اور خاندانی جھگڑوں کو از سرِ نو تازہ کرنے میں گذر جاتا ہے۔ مچھلی والیاں بھی سڑک پر کم نظر آتی ہیں۔ اسی زمانے میں یہ اسٹیشنوں کے پلیٹ فارموں پر بیڑیاں پھونکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

آخر میں میں آپ سے عرض کر دوں کہ میں ہندوستان کی مہذب عورتوں کے زرد چہرے، مرتاض جسم، اور سست رفتاری سے عاجز آ گیا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ تمام ہندوستان سمٹ سمٹا کر ایک لمبا ساحل ہو جائے جہاں تمام آبادی مچھلی والیوں ہی کی ہو اور انہیں کے جھرمٹ میں ہم اور آپ تور کے تڑکے مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہوں۔

سید ابو طاہر

نئی روشنی کا اندھیر

مولوی حیدر علی ترمذی اپنے وقت کے بڑے جید عالم تھے اور عالم بھی باعمل۔ نہایت متشرع۔ عوام وخواص دونوں طبقوں میں احترام تھا۔ دُور دُور تک تقدس کی دُھوم تھی۔ انگریزی حکومت نے ان کی شہرت اور اثر سے ہرچند کام لینا چاہا۔ نوازشات شاہی کا میووں سے لدا ہوا سبز باغ دکھایا۔ یہاں تک کہ گھر بیٹھے بن مانگے شمس العلماء کا خطاب بھی عنایت کر دیا۔ لیکن انہوں نے کبھی بھول کر بھی کسی حاکم یا انگریز سے مصافحہ کرنا گوارا نہ کیا۔ ہمیشہ اپنی کملی میں مگن رہے۔ جب احباب جاہ پسند نے زیادہ اصرار کیا اور گورنمنٹ میں رسوخ کے دینی فوائد دکھانے چاہے تو انہوں نے صاف کہدیا کہ "بھئی فقیر گوشہ نشین کو سرکار دربار سے مطلب؟ اپنے مولائے دوجہاں کی غلامی سے مجھے کہاں فرصت کہ دُنیا کے کتوں کا سلامی بنوں۔"

لیکن بایں ہمہ شانِ بزرگی اپنے گھر میں کوئی ان کا اثر قبول نہ کرتا تھا۔ وہاں نہ ان کے فتوے چلتے تھے نہ سخت گیریاں۔ دینداری کے نام سے نفرت تھی۔ خدا اور رسول کا ذکر آجاتا تو محض رسمی طور پر۔ روزہ نماز کا بھی کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ حج کی تمنا اور زکوٰۃ کا خیال تو دُور کی باتیں ہیں۔ یعنی زندگی کے چاروں اسلامی گوشے ٹٹول ڈالئے کہیں ایمان کی پوری جھلک نہ تھی۔ بلکہ دُنیا اور آج کل کی ارتداد سے لبریز دُنیا کا سماں نظر آتا تھا۔ بیگم صاحبہ رنگین مزاج۔ آزاد خیال۔ صاحبزادہ دلی کے گھر بھوت اور صاحبزادی کا تو پوچھنا ہی کیا نئی روشنی کا برقی لیمپ۔ تینوں دم اور تینوں مولوی صاحب کے مشرب کے خلاف مذہب کی توہین کرنے والے۔

خدائی شان ہے کہ حیدر علی جیسا متقی، شرع کا پابند اور خدا پرست مولوی اور اس کے سایہ میں ایسے شیطانی اعمال پرورش پائیں۔ باہر قال اللہ اور قال الرسول ہو اور اندر ہارمونیم بجیں اور عشقیہ غزلیں اڑیں۔ وہاں تزکیہ نفس کی تعلیم دی جائے اور یہاں نفس پرستی سے مہلت نہ ہو۔ مردانہ میں حدیث وفقہ کی کتابیں کھلی ہوتی ہوں اور زنانخانے میں جدید تعلیم اور دورِ حاضرہ کی معاشرت کا چرچا ہو۔ بات یہ تھی کہ مولانا کی بیگم صاحبہ کے والد خواجہ نسیم نے جو کشمیری نژاد نہایت سحر بیان واعظ تھے، کسی اتفاق سے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور ایک بیوہ یورپین خاتون کو گھر میں ڈالنے کے بعد ان کی معاشرت تقریباً انگریزی ہو گئی تھی۔ اسی مذہبی تبدیلی کی بدولت ان کے حقیقی بھائی خواجہ صمیم آج ڈپٹی کلکٹری کے معزز عہدے پر پہونچکر مسٹر سائیم کہلاتے تھے۔ وہ جس قدر بھی اس جدید طرزِ زندگی کے دلدادہ ہوتے کم تھا۔ باپ کے جیتے جی بیگم صاحبہ کو سوتیلی ماں سے سبق ملے پھر بھائی کے ہاں جب جاتیں اُن کے لکچر سنتیں۔ لڑکی بھی عموماً ساتھ ہوتی۔ مولویت کی روکھی پھیکی زندگی کا رنگ کس طرح جمتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بیگم صاحبہ تو جاہل تھیں صرف خوش غلاف ہو کر رہ گئیں۔ بیٹے صاحب روٹیوں سے بے فکر تھے بُری صحبتوں میں اُلجھ گئے۔ صاحبزادی ماموں زاد بہنوں کو دیکھکر اڑیں۔ کہ ہمیں اسکول میں جانے کا شوق ہوا۔ مولوی صاحب نے سُنا تو بہت بگڑے۔ دو دنوں خفا رہے۔ گھر میں آنا چھوڑ دیا۔ لیکن لڑکی برابر اسکول جاتی رہی۔ اسکول کے بعد کالج کی نوبت آئی۔ اب ماشاء اللہ یہ جوان ہو چلی تھی۔ اچھی خوراک، اچھی پوشاک، صورت شکل میں پری، الڑھ پنے کے دن۔ جا بہ جا تذکرے ہونے لگے۔ ایک دن مولانا کے کسی شاگرد نے بھی بے نقاب دیکھ لیا۔ اور مذہبی سادگی سے مولانا کو بھی اطلاع دیدی۔ مولانا کے غصہ کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ گھر میں جاکر جانماز بچھا، دو ہتڑ مارے، سمجھایا اور جب سختی نرمی کسی بات کا اثر نہ دیکھا تو زندگی بھر گھر میں نہ جانے کا عہد کر کے خاموش باہر

چلے آتے۔

مولوی صاحب گھر میں آئیں یا نہ آئیں نہ ماں کو پروا تھی نہ بیٹی کو۔ انہیں اپنی رنگ رلیوں سے غرض تھی تو اس کو اپنے فیشن سے۔ اسلئے کہ آمدنی کے ذرائع بدستور موجود تھے۔ گھر کے خرچ کی رقم برابر مل رہی تھی۔ مولانا نے گھر میں کے کا عہد کیا تھا نہ بگڑنے کے اسباب کو بند کرنے کا۔ کھانے پہننے میں فرق آتا عیش و راحت میں تنگی ہوتی تو شاید اپنے چال چلن کی برائیوں پر نگاہ جاتی۔ اب تو یہ مثل ہوگئی تم روٹھے ہم چھوٹے۔ تھوڑا بہت خوف تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اور علی الاعلان مغرب پرستیاں ہونے لگیں۔ اسی اثنا میں ادھر تو مولانا کی دختر بلند اختر ثریا بیگم نے بی۔ اے کے امتحان کی تیاری شروع کی ادھر خوش قسمتی سے مولانا کو ہجرت کا موقع مل گیا اور وہ جس قدر جلد ہو سکا مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ بال بچوں کے رہنے کیلئے اپنا مکان تو پہلے ہی سے تھا۔ تین چار ہزار کا زیور بھی ہوگا۔ چلتے وقت دو ہزار روپے نقد بھی حوالے کئے اور کہلا بھیجا کہ "تم لوگوں نے خدا اور رسول کے احکام سے انحراف کیا" میرے حقوق نہیں سمجھے تم جانو۔ اس کا خمیازہ دیر سویر بھگتنا پڑے گا لیکن مجھ پر جو تمہارے حق ہیں میں انہیں بھولکر اللہ و نبی کا گنہگار نہیں بننا چاہتا۔ اس لئے اطمینان رکھو کہ زندگی بھر تمہاری روٹی کپڑے سے غافل نہیں رہونگا۔"

مولوی صاحب کے اس شریفانہ اور ٹھیٹ اسلامی سلوک سے بھی ان ناعاقبت اندیشوں کو کوئی عبرت حاصل نہ ہوئی۔ باپ کی جدائی سے نہ بیٹی کا ایک آنسو نکلا نہ خاوند کی مفارقت سے بیوی کے دل کو ٹھیس لگی۔ بلکہ چہروں پر ایک قسم کی بشاشت اور اطمینان سا معلوم ہوتا تھا۔ مولوی صاحب کے جاتے ہی سارا گھر آزاد ہوگیا۔ پردے کی جو تھوڑی بہت رسم تھی وہ بھی اٹھ گئی۔ دن رات سیریں تھیں۔ تماشے تھے۔ آج یہاں جلسہ ہے تو کل وہاں پارٹی ہے۔ دونوں ماں بیٹیاں کبھی ساتھ اور کبھی الگ اپنی اپنی سہیلیوں اور ہجولیوں میں مغربی سیلاب میں بہی بہی پھرتی تھیں۔ مولوی زادہ نے تو حد ہی کر دی تھی۔ مصلوں کی جگہ جوئے کے پانسے پھینکتے تھے۔ گھر کی اس آوارگی سے تسکین نہ ہوئی تو پاؤں باہر نکالے اور آخر ایک دن کسی طوائف کے ساتھ ایسے گئے کہ عمر بھر پھر نہ پلٹے۔

رہیں بی مولون اور مولوی زادی تو انہوں نے یورپین لیڈیوں کی تقلید کے شوق میں اپنی وضع قطع، طور طریق سب بدل لیا تھا۔ ماں کو میم اور بیٹی کو مس بننے کی ایسی دھن سوار تھی کہ آنکھ، ناک، کان کے سارے لحاظ اٹھا دئے تھے۔ قاعدے کی بات ہے کہ رسمیات کے مقلد اپنے اماموں کی پیروی کرنے میں عموماً بہک جایا کرتے ہیں چنانچہ یہ دونوں ماں بیٹیاں بھی بہک گئیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اپنے کو بھول گئیں ساتھ ہی اپنی قومیت، اپنے ملکی رسم و رواج اور اپنی معاشرت کو بھلا دیا۔ ثریا بیگم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی چشم ما روشن دل ماشاد، بہت اچھا کیا۔ ہماری آئندہ نسلیں اگر زندہ رہ سکتی ہیں تو ان ماں بننے والیوں کو تعلیم دے کر۔ لباس کیلئے بھی اگر مولوی حیدر علی کی بیوی اور بیٹی ہونے سے قطع نظر کرلی جائے، ہم انہیں چنداں قابل ملامت نہیں سمجھتے۔ پرانی قسم کا ہندوستانی بے اصول تو خیر نہیں ہاں بے ڈھنگا پردہ بھی اٹھا دینا کافر نہیں بنا دیتا۔ لیکن جسم کے ساتھ ساتھ خیالات کی عریانیوں کو کیا کہیئے گا کھلے سر، برہنہ شانے، چہرہ بے نقاب محض اپنی نمائش کیلئے بازاروں اور تفریح کے مقامات میں پھرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

ثریا نے بی۔ اے کی ڈگری کیا لی، مغرب کی تقلید کا ٹھیکہ لے لیا۔ بات چیت، چال ڈھال، رنگ ڈھنگ، ایک ایک ادا میں یورپ کی شاگردی کا حق ادا کرتی تھی۔ موجودہ تمدن اور تہذیب جو سانپ کے منہ چھچھوندر بن کر رہ گیا ہے اور آج وہ خود اس سے عاجز آچکے ہیں، بی ثریا کے لئے ایک نعمت تھا۔ وہ اپنے کیرکٹر میں ہر وہ بات پیدا کرنا چاہتی تھی جو اس دور تہذیب کی خصوصیت ہے۔ ثریا کے

اب جوانی کے دن تھے ـــــ مُرادیں ایک تاروں بھری رات کی منتظر تھیں. کئی مہینے سے مختلف الخیال نوجوانوں کی درخواستیں بھی آنی شروع ہوگئی تھیں۔ بالمواجہ بھی پیام سلام ہونے لگے تھے۔ اودھ اور پھر ایک مقتدر علم پرور خاندان کی پہلی مسلم خاتون تھی جس نے اعزاز کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا تھا۔ اس لئے صرف چند اچھے گھرانے اُسے اپنے اندر جذب کرنا چاہتے تھے تاکہ اُن کے ہاں نئی روشنی پیدا ہو۔ ورنہ عموماً نوجوان یا تو اس کی حُسن و جوانی کے خواستگار تھے یا اُنہیں ثریا بیگم کی مغرب پرستی سے اپنا کوئی مفاد مدنظر تھا. ممکن ہے ان خواستگاروں میں ایک دو ایسے بھی ہوں جن کا مقصدِ حقیقی ازدواجی مسرت ہو۔

مرد تو خیر اس معاملے میں خاص طور پر بدنام ہیں. نئی تعلیم اور نئے طرزِ معاشرت نے ان کی ذہنیت گندی سے گندی سہی لیکن صنفِ نازک پر یہ بھوت کیوں سوار ہوگیا۔ یہ نقاب اُلٹتے ہی اس قدر آزاد خیال کس لئے ہوگئیں کہ اپنی صنفی خصوصیات سے بھی ہاتھ اُٹھا لیا۔ اگر عورت ہی وہ مبارک ہستی ہے جس کی گود میں قومیں پلتی، بڑھتی اور ترقی کرتی ہیں تو اس کو ماں بننا چاہیئے نہ کہ ڈائن. ثریا صنف کے لحاظ سے تو عورت تھی اور تعلیم یافتہ عورت لیکن اندھی آزادی اور پرستاروں کی کثرت نے اس کے تصوّرات کو وہاں پہنچادیا تھا جہاں احساسات بالکل کُند ہو جاتے ہیں اور ایک عورت اپنے درجے سے بہت نیچے گر جاتی ہے۔ ثریا کی رائے تھی کہ ازدواجی تعلق وہاں پیدا کیا جائے جہاں عصمت کی قیمت زیادہ سے زیادہ ملے۔ وہ ایک شوہر میں مردانہ اوصاف سے زیادہ جیب کی اہمیت چاہتی تھی۔ اس کا نظریہ تھا کہ شوہر وہی بن سکتا ہے جو بہتر سے بہتر معاشرتی سامان مہیا کر سکے خواہ اس میں خاندانی، قومی، علمی، مردانہ اخلاقی کوئی خوبی ہو یا نہ ہو۔ اسکے خیال میں یہ سارے امتیاز اضافی اور صرف ایک دولت ہی اصلی چیز تھی۔

جوئندہ یابندہ چند ہی ہفتے میں اتفاق سے ثریا کو ایک حُسن پرست شوقین کسی ریاست کا ریٹائرڈ وزیر مل گیا۔ ریاستوں کے بڑے عہدے دار عموماً مرتے مرتے جوان بنے رہنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ پہلے تو یہ ؎

"دشمنِ زندگی است موئے سفید　　روئے دشمن سیاہ باید کرد"

کی موافقت میں چہرے کی سفید دری روئیدگی کو کالا کرتے رہتے تھے۔ مگر اب جب سے خضابِ آہنی کا رواج ہوا ہے بالوں کی کھال تک نکال ڈالتے ہیں۔ بالکل صفاچٹ میدان۔ یہی حال سر ایم سلمانی کا تھا۔ عمر تو پچپن برس سے کم نہ تھی۔ البتہ حرکتیں ساری جوانوں کی سی نیز انگریزوں اور انگریزی معاشرت کے عاشق تھے۔ تموّل اُن کا مانا ہوا تھا ایک معقول پنشن ملتی تھی۔ کئی گاؤں اور تقریباً پانچ سات ہزار روپے ماہوار آمدنی کی سکنی جائداد کے مالک تھے۔ تین لاکھ روپیہ مختلف بنکوں میں جمع تھا۔ پچاس ہزار روپے میں اپنی جان بھی بیمہ کرالی تھی۔ عالیشان کوٹھی میں رہتے تھے۔ متعدد موٹریں سواری کو تھیں۔ پھر فیشن کا کیا پوچھنا۔ ان کا پیام کیا آیا ثریا بیگم کی مُراد آئی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ دو ہفتہ کے اندر نکاح کی قانونی رسمیں پوری ہوگئیں۔ نکاح کیا تھا ایک تماشا تھا۔ ایک سانولا سا انگریز موٹر میں سوار آیا۔ دولہا دُلہن آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ برائے نام قاضی صاحب منہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑائے۔ چلو چُھٹی ہوئی۔ ثریا بیگم مسز سلیمانی ہوگئیں۔ اور موٹر میں ایک حورِ پہلوئے لنگور یہ جا وہ جا۔

چند روز بڑی موجیں رہیں۔ ثریا بیگم کا دماغ لندن اور پیرس کی سیر کرنے لگا۔ تاج محل ہوٹل کو شرمانے والی کوٹھی رہنے کو۔ بہرے خانساماں کمر باندھے دست بستہ ہر وقت حاضر۔ رینکن اور وائٹ وے کی دُکانیں فیشن کی پیاس بجھانے کیلئے چاروں طرف کھلی ہوئیں حکومت میں حکومت ـــــ اور دولت میں دولت۔ لیکن حقیقت میں ایک عورت کی اصلی تسکین ان چیزوں سے نہیں ہوتی۔ موجودہ تہذیب کے یہ

صرف فریب ہیں۔ دو چار ہفتہ کے بعد ہی ثریا بیگم کچھ خاموش اور اداس سی نظر آنے لگیں۔ ایک ڈھلی ہوئی عمر کے دولہا سے کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی نوخیز دُلہن کے جذبات کا احترام کرتا۔ اور اسکی نوجوانی اس مصنوعی اعضا والے پیر نابالغ سے سیراب ہوتی۔

اب ثریا بیگم کو محسوس ہوا کہ وہ اس حال میں خوش نہیں رہ سکتی۔ اُس کے حسن و شباب کا باغ مرجھایا جاتا تھا۔ وہ رات بھر انگڑائیاں لیتی اور سارے دن بےچین رہتی۔ پھولوں کی مسہری بھی ہوتی خواب گاہ میں خیالی عیاشی کی تصویریں بھی مگر وہ راحت جو جوانی سے جوانی کو گلے مل کر ملتی ہے کہاں نصیب تھی۔ سر سلیمان عیاش مزاج آدمی نہ تھے۔ انہیں صرف نئی شادیاں کرنے کا شوق تھا۔ انہوں نے کبھی اپنی کسی بیوی کو تکلیف نہیں دی۔ ان کو ہر قسم کی آزادی تھی۔ کوٹھی میں کھائیں کوٹھوں پر کھیلیں۔ پھر بھی اگر ان کا پیٹ نہ بھرے تو خوشی سے رخصت کر دینے میں بھی عُذر نہ تھا۔

سر سلیمان نے اپنی بیاہتا بیوی کے بعد جس کے بطن سے سات لڑکے لڑکیاں تھیں، کئی نکاح کئے اور سب تھوڑے تھوڑے دن کے بعد اپنی مرضی سے آزاد ہو گئیں۔ لیکن ثریا بیگم سے انہیں کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ اس کی علیحدگی کے خیال سے بھی وہ کانپ اُٹھتے تھے اور اس لئے وہ اپنا زیادہ وقت مشہور ڈاکٹروں، ویدوں اور مُلک کے نامور طبیبوں سے مشورہ لینے میں گزارتے تھے۔ تاکہ ثریا کی بیزاری میں کمی ہو اور یہ وظیفۂ زوجیت کے قابل ثابت ہوں۔ ادھر تو سر سلیمان اپنی فکر میں تھے اور ادھر مسز سلیمان اپنی اُدھیڑ بن میں تھیں۔ ایک طرف دولت اور وجاہت تھی تو دوسری جانب جذبات اور جنسی مسرتیں۔ نہ اس دولت اور اعلیٰ تمدن سے ہاتھ اُٹھانے بنتی تھی نہ اپنی جوانی کا گلا گھوٹنے کو جی چاہتا تھا۔

اِسی کشمکش میں ثریا بیگم کے دو سال گذر گئے۔ جاہل ہوتی یا خیالات میں قدامت پسندی کا اندھیرا ہوتا تو قصہ کبھی کا تمام تھا۔ ذرا بیباکی سے کام لیتی تو طلاق ہو جاتی۔ شوہر سختی سے کام لیتا تو گھُٹ گھُٹ کر مر جاتی یا کچھ کھا کر سو رہتی۔ لیکن تعلیم یافتہ اور خصوصاً یورپی تہذیب کے مقلد ایسی حماقت نہیں کر سکتے۔ ثریا جیسی انگریزی تعلیم کی باعمل خاتون ان روایتی چیزوں سے بالاتر تھی۔ اس کا مطمح نظر کچھ اور تھا۔ اس نے اپنے جذبات کی تسکین کے لئے اسباب بہم پہونچا لئے۔ سر سلیمان کی کمزوریوں اور ثروت کے ذریعے ہر اُس بےعنوانی میں مُبتلا ہو گئی جو پست سے پست کیریکٹر کی عورتوں میں پائی جاتی ہیں مگر سونے کا جھول چڑھے ہوئے اس طلسمی تمدن کو نہ چھوڑا۔ بظاہر سکون تھا۔ دل گناہ یا انفعال سے مُضطرب ہوں۔ نگاہوں میں بیباکی یا ندامت سہی۔ زبانیں بالکل خاموش تھیں۔ انگریزی رواج کے مطابق ملتے رہتے تھے۔ کھاتے تھے پیتے تھے۔ نہ شوہر کو بیوی کے کسی رویہ پر اعتراض کا حق تھا نہ بیوی شوہر سے اپنی زندگی وابستہ سمجھتی تھی۔ میزبان اور مہمان کا سا تعلق تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ مہمان خانے میں ہر قسم کے عیش و آرام ہیں۔

نباہ کے لئے انسان ہوں یا حیوان محبت اور شفقت نہایت ضروری ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات کا تو انحصار ہی محبت اور شفقت پر ہے۔ لیکن جہاں بجائے مناکحت کے تجارت کی گئی ہو اور محبت کے عوض دولت کو اس تعلق کی بُنیاد تصور کیا جائے وہاں ایثار اور ہمدردی تو کیا معنی معمولی نوعی شرافت بھی جاتی رہتی ہے۔ ثریا بیگم نے سر سلیمان سے شادی کی تھی نہ اُن سے اس کو محبت تھی۔ ان کی دولت سے بیاہ کیا تھا اس لئے محبت بھی دولت ہی سے ہونی چاہیئے۔ سر سلیمان تو ایک دلال کی حیثیت رکھتے تھے۔ محبت میں مشارکت کبھی کسی کو پسند ہوئی ہے جو ثریا بیگم پسند کرتیں۔ ان کے زیرِ غور اب یہ مسئلہ تھا کہ سر سلیمان پکے پان ہیں اور میں لاولد۔ اگر یہ مر گئے تو کیا ہو گا۔ ایسی کوئی ترکیب نکالنی چاہیئے کہ بلاشرکت غیر اس دولت پر قابض ہو جاؤں۔ اللہ میاں کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ باوجود ہزار ضبط تولید مسز سلیمان کو حمل رہ گیا۔

کچھ خوشی تھی کچھ رنج۔ سرسلیمانی سے کیا کہتیں۔ دونوں اپنی اپنی کمزوریوں سے واقف۔ مگر یہ چھپنے والی چیز بھی نہ تھی۔ تین چار مہینے بعد خود بخود کھلی اور ثریا بیگم کو بے حیا بنکر شوہر کے کانوں تک یہ خوشخبری پہونچانی پڑی۔

سرسلیمانی پرانے ریاستی خرانٹ تھے سنکر مسکرائے اور خوشی کا اظہار کرکے ایام حمل کی احتیاطوں کا دیر تک ذکر کرتے رہے۔ کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے ناخوشگواری معلوم ہوتی بلکہ اپنے دفتر کے کمرے میں جاکر کہلا بھیجا کہ "اگر اس غیر مترقبہ خوشی کے سلسلہ میں تم اپنی دوستوں کو کوئی پارٹی دینا چاہو تو تاریخ دن مقرر کر دو۔ بہتر سے بہتر انتظام ہو سکتا ہے" لیکن دل میں انتہائی غصہ اور ملال تھا۔ ثریا کی نسبت جتنی افواہیں تھیں سچ ہوگئیں۔ انہیں یہ ہرگز بھی امید نہ تھی کہ ایک مولوی کی بیٹی، تعلیم یافتہ اتنی بے غیرت ہوجائے گی۔ دنیا تو کیا کہتی جس کے گھر میں ہوا سی کی اولاد۔ انہیں ذہنی تکلیف یہ پہونچ رہی تھی کہ حرام کی کمائی میرے ہاں پلے گی۔ میرے نام سے پلے گی۔ میں بیٹھا ہوا دیکھونگا۔ اور مجھے اپنے کئے کی لاج میں کہنا پڑے گا کہ ہاں میری اولاد ہے۔ پھر ترکہ میں میری اصلی اولاد کے برابر حقدار سمجھا جائیگا۔

ان خیالات نے سرسلیمانی کے مزاج میں ایک انتشار سا پیدا کر دیا اور جب تک وہ اس نتیجے پر نہیں پہونچ لئے کہ وضع حمل کے پہلے ثریا کا ٹھکانے لگا دینا ہی آئندہ کے تمام توہمات کو دور کر سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے راز دار ڈاکٹر سے صلاح لی اور ایک سخت ترین زہر کافی سے زیادہ مقدار میں لاکر اپنے سیف میں محفوظ کر دیا تاکہ جس وقت چاہیں کام میں لا سکیں۔ یہ زہر بے بو۔ بے رنگ اور بے ذائقہ بالکل شفاف پانی کی طرح ایک بلوری سفید شیشی میں بھرا ہوا تھا۔ یہ دولت بھی کیا عذاب ہے اور اس عذاب کو دور حاضرہ کے معیار معاشرت نے تو لعنت ہی بنا دیا۔ سرسلیمانی جیسا جنٹلمین مجبور ہے کہ ایک ناقابل معافی گناہ اپنے سر پر لے اور صرف اس لئے کہ اس کی دولت میں چوری نہ ہو۔ ساتھ ہی لیڈی سلیمانی اپنے داؤں سے غافل نہ تھیں۔ اور جس دن سے ان پر یہ راز سربستہ کھل گیا تھا کہ سر سلیمانی آج سے بہت پہلے اپنی تمام املاک اپنی اولاد کے نام ہبہ کر چکے ہیں ان کی صنفی چالاکی ناجائز سے ناجائز تدبیر کیلئے تیار تھی۔

ثریا بیگم بظاہر یہ سمجھتی تھیں کہ سرسلیمانی کا سوائے دو چار معمولی بیویوں کے کوئی نہیں ہے اور وہ بھی سب بے اولاد ہیں۔ یہ نتیجہ کچھ تو ان کی جلد بازی کا تھا اور زیادہ اس مغالطہ میں انہیں سرسلیمانی کی انگریزی معاشرت نے ڈالا تھا۔ دو لڑکے یورپ میں تھے۔ تین کی تعلیم دہرہ دون میں ہو رہی تھی۔ لڑکیاں اپنی خالہ کے پاس رہتی تھیں۔ جنہوں نے کلکتہ میں ایک گرلز سکول کھول رکھا تھا۔ برس میں ایک مرتبہ یہ خود جاتے تھے اور بچوں سے مل آتے تھے۔ اتفاق کی بات بینک کے ایک خط سے ثریا بیگم کو یہ حالات معلوم ہوگئے اور اس معلومات نے اس کو چراغ پا کر دیا۔ دانتوں سے بوٹیاں کاٹنے لگی۔ مگر کیا کرتی۔ ساری چالاکی ہوشیاری اور روشن خیالی دھری کی دھری رہ گئی۔ سرسلیمانی کی پنشن تھی یا بیمہ کا پچاس ہزار روپیہ۔ جس میں سے پنشن تو ان کی زندگی تک ان کا مال تھا اور بیمہ کی رقم مرنے کے بعد کی چیز تھی وہ بھی ورثا میں تقسیم ہوتی۔ ثریا بیگم کو کیا ملتا۔ وہی بروپے میں چھدام۔ ہاں اگر ثریا بیگم لاولد نہ رہے اور اولاد بھی نرینہ ہو تو جھگڑے کے بعد کچھ نہ کچھ مل سکتا تھا۔ اولاد کا انتظام تو قدرت کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ رہا یہ سوال کہ سرسلیمانی کے مرنے کا انتظار کوہ کندن و کاہ برآوردن۔ اس لئے مغربی تقلید کی دلدادہ ثریا کے واسطے ایک ہی راستہ تھا کہ سرسلیمانی کی زندگی جلد سے جلد ختم کر دی جائے تاکہ بیمہ کی رقم ہاتھ میں لیکر اپنے بچے کے نام سے جو پیٹ میں ہے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

بہرحال سرسلیمانی اور مسز سرسلیمانی میں ایک قسم کی خونی کبڈی شروع ہوگئی تھی جس کا پالا دولت کی ڈھیری تھا۔ سرسلیمانی اپنی گھات میں تھے اور ثریا بیگم اپنی تاک میں۔ بدبختی سے سرسلیمانی کو زکام ہوا اور زکام سے بخار۔ ڈاکٹروں نے کمرہ میں قید کر دیا سیف

کھولنے کی ضرورت پڑی۔ سر سلیمانی کو یاد بھی نہ تھا کہ سیف میں ثریا کے قتل کا سامان بھی ہے۔ ثریا کو کنجیاں دیدیں۔ اُس نے جو سیف کھولا تو شیشی نظر پڑی جس پر زہر قاتل، کا سرخ لیبل لگا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر برنارڈ کی چٹھی بھی دیکھی۔ یک دھک رہ گئی۔ جوں توں کر کے شیشی پر قبضہ کر سیف بند کیا اور آگئی۔ خدا کے کام بھی عجیب ہوتے ہیں۔ پل بھر میں مارنے والے کی جان مرنے والے کے ہاتھ میں آگئی۔ ملک الموت کا رُخ ایک اشارے میں اِدھر سے اُدھر مُڑ گیا۔

دوسرے دن صبح کو سر سلیمانی اپنے بستر پر مرے ہوئے ملے اور آج تک پتہ نہ چلا کہ موت کا سبب کیا تھا۔ ثریا نے بیمہ کی رقم کیلئے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ بچہ اور بچہ بھی لڑکا پیدا کر کے دکھایا لیکن دوسری املاک میں تو کیا حصہ ملتا بیمہ کی رقم سے بھی ایک حبّہ نہ ملا۔ اولاد تو اولاد نکاح ہی سرے سے ناجائز ثابت ہوا۔ البتہ ذات بدنامی اور ہزاروں اتہام ضرور ورثہ میں ملے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ تہذیب اور ہماری شاندار معاشرت نے عورتوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ وہ شوہروں کو صرف روپے کیلئے تلاش کرتی ہیں۔ ان کی شادیاں شادیاں نہیں بلکہ ایک تجارت ہے۔ انہیں مردوں کو شوہر بنانے کی ضرورت نہیں۔ ازدواجی رشتہ سے ان کا مقصد سوسائٹی میں بلند جگہ حاصل کرنا اور عشرت پسندانہ زندگی گزارنا ہے۔ اور عشرت پسندانہ زندگی بھی وہ جو سرتاپا بناوٹ ہے جس میں حقیقی مسرت کا نام نہیں۔ اگر ہماری خواتین بھی یورپ زدہ ہو کر، سامانِ آرائش کے لئے۔ موٹروں کے لئے، اعلیٰ لباس کیلئے اور تفریحات کے شوق میں اپنی صنفی لطافتوں، اخلاقی نزاکتوں اور جنسی شرافتوں کو اسی طرح بیچتی رہیں اور ان میں عورت کا صحیح کیریکٹر نمایاں نہ ہوسکا تو نہیں کہا جاسکتا کہ ہماری آئندہ نسلیں ملک کیلئے کیا مفید ہو سکیں گی، اور ایک شریف عورت اور بازاری میں کیا فرق رہے گا۔

اشرف صبوحی دہلوی

سرت چندر چٹرجی

پر

"وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے"

سرت چٹرجی! کتنے اُردو داں اس نام سے واقف ہیں؟۔ خود بنگال میں بہت سے لوگ اس کی پرائیویٹ زندگی کا حال سوائے اس حقیقت کے اور کچھ نہیں جانتے کہ وہ منکسرالمزاج اور بادی النظر میں ایک کم رُو سا انسان ہے جس پر کبھی ایک مشہور اور ممتاز مصنف کا دھوکا نہیں ہوتا مگر "پردۂ راز" میں رہنے کے باوجود بھی یہ شخص بنگال کا سب سے زیادہ ہر دلعزیز ناول نگار ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں اسکے سوانح حیات سے قطع نظر کرکے صرف اس کے آرٹ پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسکی زندگی کے واقعات کا تذکرہ کرنے سے دیدہ و دانستہ احتراز کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی پر ایک پُراسرار تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے جس میں سے ہماری متجسس نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں۔ سرت کی حیا چونکہ اُسے منصۂ شہود پر آنے سے باز رکھتی ہے اس لئے یہاں بھی صرف اُس کے فن سے بحث کی جاتی ہے۔

اس کی سب سے پہلی تصنیف "چرتراہین" ۔"جمنا" نامی ایک ماہوار رسالہ میں شائع ہوئی تھی۔ اسکے شائع ہوتے ہی لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ناول نگاری کے میدان میں ایک نیا شہسوار اُترا ہے ——— ایک ایسا ناول نویس جو سوسائٹی کے اُن تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جن کا تذکرہ پہلے صریحاً ممنوع اور معیوب خیال کیا جاتا تھا!

اسوقت سے اس کے ناول اور مختصر افسانے برابر شائع ہو رہے ہیں۔

اس کے "سماجی ناولوں" کی "پہنائی" اور بنگالی ناولوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وسعتِ نظر لامحدود ہے، اس کی فضائے تخیل بے پایاں۔ وہ پہلا شخص ہے جو اپنے ناولوں میں ان "افتادگانِ قسمت" کا تذکرہ کرتا ہے جن کو ہماری بے رحم سوسائٹی "ارذل ترین خلائق" کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہ لوگ اس کے قصوں میں صرف "زیبِ داستاں" کے لئے داخل نہیں کئے جاتے۔ دراصل وہ ہی سرت کے ناولوں کی جان ہیں۔ وہ نہایت شفقت اور ہمدردی سے ان کی تصویریں کھینچتا ہے، ان کے خدوخال کو نمایاں کرتا ہے، اور اپنے سحرکار قلم کی مدد سے ان کو حیاتِ جاودانی بخشتا ہے۔ سوسائٹی کے بلند ترین طبقہ سے لیکر اسفل ترین طبقہ تک کے لوگ اس کے "پردۂ تصویر" پر نظر آتے ہیں۔ اس کے کردار حد سے زیادہ متنوع اور اصل کے مطابق ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کے ناول ایک قدِ آدم آئینہ ہیں جس میں سوسائٹی کا عکس ہمیشہ کیلئے محفوظ کر کیا گیا ہے۔

بنگالی ناول میں "ریلزم[1]" (اصلیت سے مطابقت) کا خیال سب سے پہلے سرت ہی نے داخل کیا۔ اس سے پہلے بنگالی ناول زیادہ تر تاریخی ہوتے تھے، سماجی نہیں۔ ان میں تخیل کی کارفرمائی زیادہ ہوتی تھی اور واقعیت یا اصلیت کا لحاظ بالکل نہیں کیا جاتا تھا۔ سرت نے سوسائٹی

---

[1] Realism

کی ہُوبہُو تصویر کھینچنے میں وہ ملکہ حاصل کیا ہے کہ اس کے کمال کو "ادبی فوٹوگرافی" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، پھر اس کے بلیغ اشارات تو گویا سونے پر سہاگہ ہیں۔

مگر اس کی "اصلیت نگاری" (realism) اُس قسم کی مکروہ "اصلیت نگاری" نہیں جس کو دورِ حاضرہ کے یورپین مصنفین نے اپنا شعار بنا رکھا ہے اور جن کے خیال کے مطابق خللِ دماغ بھی ایک فن ہے۔ نہ وہ مسٹر جیمز جائس[1] کی طرح کا فن کار ہے جو "اصلیت نگاری" کا عذر پیش کرکے بیہودہ گوئی کیا کرتا ہے۔ وہ تو زندگی کا مطالعہ کرتا ہے اور جس حالت کا مشاہدہ کرتا ہے اس کی تصویر الفاظ میں پیش کر دیتا ہے۔ کہیں کہیں تو اس کا آرٹ میکسم گورکی[2] کی یاد تازہ کر دیتا ہے، فرق صرف اتنا باقی رہ جاتا ہے کہ سرت کے کردار کیفیتِ شعری سے زیادہ مملو اور بہ حیثیت انسان ہونے کے زیادہ کامل ہوتے ہیں۔

اس کا سب سے بڑا مایۂ کمال اسکی "خصائص نگاری" (Characterisation) ہے اور اس فن میں کوئی دوسرا بنگالی (بنگالی کیوں کہیئے؟ ہندوستانی) ناول نگار اس سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

اُوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کے کردار حد درجہ متنوع ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اصل نگاری ہی اس تنوع کا راز ہے ــــ قدرت نے دو انسانوں کو یکساں پیدا نہیں کیا۔ اس کے کردار پُرانے قصّوں اور کہانیوں کے اُن کٹھ پتلیوں جیسے افراد سے بالکل مختلف ہیں، جن کا وجود صرف قصّہ گو یا قصّہ نویس کے ذہن ہی میں ہوتا ہے، اور جن کا خارجی دُنیا میں کہیں پتہ نہیں ملتا۔ قصّہ گو یا قصہ نویس کی تخلیقی قوت اُن کو اپنے خیال کے مطابق صرف دو صفات ــــ نیکی یا بدی ــــ سے متصف کر دیتی ہے۔ قصّہ میں جو شخص ایک بار نیک بنا کر پیش کر دیا گیا وہ ہمیشہ نیک ہی رہتا ہے اور بد کبھی اپنی فطرتِ زشت بدل نہیں سکتا۔

سرت نے زندگی، اس کے تلوّن اور اس کے امکانات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس دُنیا میں مثالی انسان ملنا ناممکن ہے۔ یہاں کا قانون ہی "تغیر اور تبدل" ہے۔ یہاں کوئی چیز کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ زندگی جامد نہیں بلکہ متحرک ہے اور ہر لحظہ نئے نئے رنگ بدلتی رہتی ہے۔ نیک و بد جانچنے کا معیار بھی انفرادی ہے جو ہر شخص اور ہر زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

سرت کے کردار جیتے جاگتے انسان ہوتے ہیں ــــ گوشت و پوست سے بنے ہوئے انسان ــــ جن کی رگوں میں گرم گرم خون دوڑتا ہوتا ہے اور جن کے پہلوؤں میں تڑپتے ہوئے دل ہوتے ہیں۔ وہ ان پُرانے قصّوں اور ناولوں کی "خیالی مخلوق" سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ وہ ہم کو اجنبی اور انوکھے نہیں معلوم ہوتے، کیونکہ ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی میں ان سے اکثر دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ سرت جیتے جی ہم کو اُن کا نظارہ قریب سے کراتا ہے۔ وہ صرف ان کے خدوخال ہی پیش نہیں کرتا بلکہ اُن کے خیالات اور احساسات، ان کی حسرتیں اور ارمان، انکی اُمیدیں اور خطرات، ان کی خوبیاں اور خامیاں ــــ سب ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ نیک و بد کی تقسیم اسے نہیں آتی۔ وہ جانتا ہے کہ نیکی اور بدی کی طاقتیں زندگی کا جزو لاینفک ہیں اور علیحدہ علیحدہ انکا وجود ناممکن ہے۔ ہر شخص کے اندر یزداں اور اہرمن دونوں موجود ہوتے

---

[1] ــــ Mr. James Joyce نوٹ:- ("Ulysses" جیمز جائس کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ بڑے بڑے اہلِ دماغ اسکی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ مگر سچ پوچھئے تو وہ ایک نہایت غیر دلچسپ کتاب ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اوریجنل ہے۔ مگر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ "اوریجنل زیادہ ہے اور آرٹسٹک کم"۔ سوائے اوریجنلٹی اور "کوفت" کے اس میں اور کچھ نہیں۔)

[2] Maxim Gorki

ہیں، گو ہر شخص میں ان کی طاقت اور عظمت کا مظاہرہ یکساں طور پر نہیں ہوتا۔ اور یہی سبب ہے کہ ہر شخص دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

اس کے ناول مزاحِ لطیف اور خوش طبعی کے بہترین نمونے پیش کرتے ہیں۔ اس کی شروع شروع کی تصانیف میں یہ خوش طبعی بذلہ سنجی کی شکل میں نظر آتی ہے۔ ہمیں بے اختیار اناطول فرانس[1] یاد آجاتا ہے۔ وہی آب و تاب موجود ہے، مگر اس تلخی سے معرا جو "پنگوئن آئی لینڈس"[2] میں پائی جاتی ہے۔ چٹرجی انسانوں کی حماقتوں اور لغزشوں کا مشاہدہ کرتا ہے، سوسائٹی کی تباہ کن رسمیں اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتی ہیں۔ بے رحم قسمت کی نت نئی جور و جفا، انسان کے اندر والی متضاد اور باہم برسرپیکار طاقتوں کی ستم ظریفیاں اس کی حساس طبیعت پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ مگر وہ ان سب کا تذکرہ ایک ہمدردانہ تبسم کے ساتھ کرتا ہے ——— شاید اس لئے کہ وہ خود بھی اپنے کسی حد تک بے عنوان دورِ شباب میں، ان سب کا شکار رہ چکا ہے اور ہم کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ ہماری کمزوریوں اور لغزشوں پر خفگی کے بجائے اس کے پاس یا تو ایک معنی خیز مگر طفلانہ تبسم ہوتا ہے یا ایک دبی ہوئی آہ جو باوجود کوششِ ضبط کے اس کے منہ سے نکل جاتی ہے۔ مگر اس کا یہ عجیب و غریب تبسم جو بیک وقت ہمدردی اور تاسف کا مجموعہ ہوتا ہے اس گھنٹی کی آواز سے مشابہ ہے جو طوفان سے پہلے بجائی جاتی ہے۔

اس کے ان ناولوں میں جو بعد کو لکھے گئے ہیں ہمیں وہ بے باک اور بے ساختہ ہنسی مفقود نظر آتی ہے۔ گو اس پرانی خوش مزاجی کا اثر کچھ کچھ باقی رہتا ہے مگر اب اس کا خندۂ زیرلب "زہرخند" ہو جاتا ہے۔ اس کی ہنسی "زبردستی کی ہنسی" بن جاتی ہے۔ اس کے بھولے پن کی جگہ اب کسی اور چیز نے لی ہے جو زیادہ کرخت اور تلخ ہے۔ اب اس کی تصویریں اور مرقعے اندوہگیں ہونے لگے ہیں۔ اس کے کردار دلی جوش سے گفتگو کرتے ہیں مگر فضا میں سنجیدگی چھائی رہتی ہے۔ ہر چیز پر اب اندھیرا سا چھانے لگا ہے۔ زندگی بسر ہوتی ہے۔ دن کٹ جاتے ہیں...... مگر کس امید پر؟ "کسی امید پر نہیں"! وہ خود ہی اپنے ناول "دیوداس"[3] میں اس کا جواب دیتا ہے، جو اس کی عظیم ترین ٹریجڈی (المیہ) ہے۔ "چوبی" میں کچھ امید کی جھلک نظر آتی ہے، "ازکشنیا" کا انجام ہنسی خوشی ہوتا ہے، "گرہاداہا" (خانۂ آتشیں) کا انجام موہوم رہتا ہے ——— یعنی ہم اس کو اپنی مرضی اور خیال کے مطابق جیسا چاہیں سمجھ سکتے ہیں ——— مگر "دیوداس"؟ "دیوداس" امید سے سراسر خالی ہے۔ اس میں صرف دل کی خلش ہے اور آنسوؤں کی تلخی!۔

دیوداس جب اپنی "پارو" (پاربتی) کے گھر کے سامنے دم توڑتا ہوتا ہے تو اس کے پاس ایک متنفس بھی نہیں ہوتا۔ جب صبح کو پارو کو اس کی اطلاع ملتی ہے تو وہ پاگل ہو جاتی ہے .... یہ ہے زندگی اور اس کا انداز بے پروا!۔

ہمیں زندگی کو پھولوں کی سیج نہ سمجھنا چاہیئے۔ گلہائے رنگ رنگ سے یہ خالی ہے اس میں قدم قدم پر خار زار ہیں۔ "پھول" ——— اگر زندگی میں پھول ہو سکتے ہیں! ——— ان نباتاتی پھولوں سے بھی زیادہ عارضی ہوتے ہیں جو ہماری دنیا میں پائے

---

[1] Anatole France
[2] Penguine Island اناطول فرانس کی ایک تصنیف کا نام۔

[3] اردو داں طبقے پر "نیو تھیٹرز لمٹیڈ" (کلکتہ کی مشہور فلم کمپنی) نے "دیوداس" اور "گرہاداہا" جیسے بے مثل ناولوں کو فلمی ڈراموں کی شکل میں پیش کر کے واقعی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اصغر حسین شور نے نہایت پاکیزہ اور عام فہم زبان میں مکالمے لکھے ہیں۔ اور جمنا اور سہگل نے دیوداس میں اداکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ شرت کے اور ناول بھی اسی طرح ملک کے سامنے پیش کئے جائیں۔ "گرہاداہا" کا نام "نیو تھیٹرز لمٹیڈ" نے بدل دیا ہے۔ اس

(بقیہ صفحہ آئندہ)

جاتے ہیں۔ ہاں، کانٹے البتہ ہیں جو ہمارے دلوں میں ناسور ڈالتے رہتے ہیں۔ قسمت رحم ناآشنا ہے اور ہم کمزور اور مجبور، ہم غلطیاں کرتے رہتے ہیں اور حد سے زیادہ توقع رکھنے کے عادی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مگر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ سرت چٹرجی میں کوئی ٹھوس فلسفہ ملنا دشوار ہے اور اس کے ناولوں میں کسی ایک فلسفہ کی تلاش بھی حماقت کے مرادف ہے۔ وہ تو شیکسپیئر کی طرح "عام اور عالمگیر" ہے۔ وہ کوئی عقاید نہیں رکھتا۔ اس کے کردار محض کٹ پتلیاں نہیں جن کے ذریعے کسی فلسفہ کا اظہار کیا جاسکے۔ اس کے خیالات اور احساسات جگہ جگہ منتشر ہیں مگر ان کے مجموعے سے کوئی ایک فلسفہ تیار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ہر کردار کا نقطۂ نظر نرالا ہے اور خود اسی کردار کیلئے مخصوص ہے۔ سرت کے ناولوں میں "ہم خود اسکو کہیں نہیں پاسکتے"۔ کہیں کہیں ہمیں دھوکا ہوجاتا ہے اور ہم کہہ اٹھتے ہیں:- "یہاں، یہاں ہم نے تمہیں پکڑ لیا ہے"! مگر نہیں، وہ ہنستا ہے اور ہوا کی طرح ہماری گرفت سے آزاد ہوجاتا ہے۔ وہ اس روشنی کی طرح جگہ جگہ بھاگا بھاگا پھرتا ہے جو رات کو کسی قبرستان یا دلدل میں نظر آیا کرتی ہے اور جتنا زیادہ اس کا تعاقب کیا جائے اتنی ہی دور ہوتی جاتی ہے۔ ہم بھی سرت کا جگہ جگہ پیچھا کرتے ہیں مگر باوجود اس امر کے کہ وہ ہمیشہ ہمارے سامنے ہی رہتا ہے ہم اس سیماب وش ہستی کا کچھ حال نہیں جانتے۔

ہاں صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اپنے آخری ناولوں میں وہ پہلا فن کار، اپنے شباب کی شوخی اور ترنگ کھو بیٹھا ہے۔ خوش طبعی اب بھی کہیں کہیں ـــــ طویل وقفوں کے بعد ـــــ جھلک اٹھتی ہے مگر اب اس کی روشنی دیرپا نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے بھی وہ شیکسپیئر کا حریف ہے، جسکے اوپر بھی فن کاری حیثیت سے یہی مختلف دور گذرے تھے۔

اور شیکسپیئر ہی کی طرح اس کے تخلیق کئے ہوئے کردار بھی اپنے تنوع اور رنگا رنگی کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہیں۔ اعلیٰ اور اسفل، سب ہی تو موجود ہیں ـــــ کہیں وہ بے فکری سے گپ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، کہیں محبت کا دلچسپ مگر خطرناک کھیل کھیلتے ہوئے، یا اپنے کسی نصب العین کا تعاقب کرتے ہوئے ـــــ سب اپنا اپنا غم غلط کرتے ہیں، اپنی اپنی فکروں میں سرگرداں رہتے ہیں، اور اپنے اپنے مخصوص جذبوں کی پرورش کرتے ہیں ـــــ غرض سرت کی دنیا اتنی ہی دلچسپ اور آباد ہے جتنی خود زندگی! ہارڈی[1] کی طرح اسنے بھی اپنے نسائی کردار زیادہ توجہ اور خوبصورتی سے پیش کئے ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے یہاں عورتیں مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عظیم الشان ہیں ـــــ اچلا، سابتری، کرن موئی، پاربتی، چندرامکھی ـــــ یہ سب کی سب آپ اپنی نظیر ہیں۔ ہندوستانی ادب ابھی تک ان سے روشناس نہ تھا اور اب کہ پہلی بار یہ سب ہماری نگاہ کے سامنے بے نقاب ہو کر آئی ہیں تو ان کے کمالات اور روحانی اور جسمانی صفات کے اعتراف میں ہم سوائے "حیرت" کے اور کوئی خراج پیش نہیں کرسکتے! افسوس کا مقام ہے کہ اس کی جس تصنیف کو گورنمنٹ نے ضبط کرلیا وہی اس کا شاہکار تھی!

(بسلسلہ صفحۂ گذشتہ) فلم کے آخری گیت کے ایک بول کی مناسبت سے اس کا نام "منزل" قرار دیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ نہایت بلیغ اشارات (suggestions) کا حامل ہے۔ جمنا۔ پی۔ سی۔ بروا۔ اور پرتھوی راج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان باکمال آرٹسٹوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے ـــــ ہندوستانی "گویا اور متحرک تصاویر" میں "منزل" ہر اعتبار سے درجۂ اوّل کی مستحق ہے۔ "عوام" شاید اس رائے سے اختلاف کریں، مگر عوام کی پسند کا کیا ٹھکانا!

[1] Thomas Hardy. [2] Shakespeare.

اس کے شروع شروع کے کچھ افسانوں اور ناولوں میں ہمیں ایک ایسی دُنیا نظر آتی ہے جو ہماری دُنیا سے مختلف ہے۔ وہاں ہر چیز پر "خواب" کا سا سماں چھایا رہتا ہے ـــــ مثلاً "چوبی" جس میں برما کے ایک مصوّر اور اُس کی معشوقہ کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ عام طور پر اس قسم کی چیز سرت سے منسوب کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے کیونکہ ہمارے نزدیک تو وہ "مصوّرِ حقیقت" ہے نہ کہ "مصوّرِ خواب" مگر اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرت دوسری اصنافِ ادب میں بھی کامیاب ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اُس پر اِس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ محض خیالی انشا پردازی بے سُود ہے۔ اُس کے حصّہ میں تو "زندگی کی عکاسی" ہی آئی ہے اور وہ اسی کیلئے موزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے اپنا طرزِ تحریر بدل دیا اور الفاظ کے پیکر میں جیتے جاگتے افسانوں کو پیش کرنے کیلئے اُس نے وہ اسلوبِ نگارش اختیار کر لیا جس میں ہر لفظ حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

سرت چندر کی زبان میں ایک سحر آمیز خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ اس کے سوائے کسی بنگالی مصنف نے کبھی ایسی پیاری اور بلیغ نثر نہیں لکھی ـــــ کفایت شعاری ـــــ الفاظ کی کفایت شعاری ـــــ سدا سے اس کا شعار رہا ہے۔ اس کو پڑھکر بنکم (بم چندر) کی نثر یاد آجاتی ہے، گو بنکم کے معائب بھی موجود ہیں یعنی حد سے زیادہ پُر مغزی اور اختصار! ان کی نثر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بعض اوقات معانی سے اتنے زیادہ گرانبار ہو جاتے ہیں کہ اُن کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے اور اُس کی پیچدار عبارت "اسم بامسمیٰ کا کل" کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کی "آرائش" کو دیکھکر ایک "تخیل پرست" "اندیشہ ہائے دُور دراز" میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ طرزِ انشا نامانوس سہی مگر حد درجہ نشاط انگیز اور حسین ہوتی ہے۔ بنکم اور ٹیگور کے بعد اگر کوئی اور بنگالی طرزِ بیان کا مالک ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ سرت ہی ہے۔

جوزف کونراڈ کے علاوہ کسی اور جگہ ایک طوفان کا بیان اتنا موثر نہیں ملتا جتنا "چرترا ہین" میں!

اس کی زبان میں ایک وقت اور بھی ہے۔ اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایجازِ بیان ایسا ہے کہ اگر ترجمہ کیا بھی جائے تو اصل کی خوبی باقی نہیں رہتی۔ وہ ایک لفظ میں ایک خیال ادا کر جاتا ہے۔ اس کا ایک جملہ ایک کردار کے بیان کیلئے کافی ہوتا ہے۔ ترجمہ میں سرت کی یہ امتیازی شان قائم نہیں رکھی جا سکتی ـــ اگر کوئی "دل والا" اسکے ناولوں کا ترجمہ کر دے تو بنگال کی اصلی رُوح دُنیا پر ظاہر ہو جائیگی، جو ابھی تک کوئی دوسرا بنگالی مصنف صحیح طریقے پر پیش نہیں کر سکا ہے۔

سرت کی دُور رس نگاہ انسانی کیریکٹر کی تہ تک پہونچتی ہے۔ اس کی قادر الکلامی باعثِ رشک ہے۔ وہ نہایت بے باکی سے ان گورکھ دھندوں اور معمّوں کو دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے جن میں نوعِ انسانی ہمیشہ سے اُلجھی رہی ہے اور اُلجھی رہیگی۔ لاریب! سرت چٹرجی کا شمار دُنیا کے عظیم ترین اور سب سے زیادہ اور یجنل ناول نگاروں میں ہو سکتا ہے۔

"ماضی" دہلی

اساسِ حیات

زندگی کی شورشوں پر حکمراں ہے خامشی — عالمِ ہنگامہ کی اک پاسباں ہے خامشی
ہے خرامِ ناز سے ناآشنا موجِ نسیم — مطمئن پردوں میں گُل کے تو عروسانِ نسیم
نرم جاں کلیاں سکوں کی گود میں سوئی ہوئی — نیند کی گہرائیوں میں تتلیاں کھوئی ہوئی
یاسمیں کے کُنج "تنہا" کی گھنیری چھاؤں میں — مست بھنورے سو رہے ہیں "رنگ و بو کے گاؤں" پر
پیڑ پر آموں کے محوِ خواب ہے کوئل کی کوک — اور خوابیدہ پپیہے کے دلِ نازک میں ہوک

عندلیب آسودۂ راحت ہے "نوکِ خار" پر — چھا رہا ہے اک سکوتِ عنبریں گلزار پر
سوگ طاری ہے اُسی کی مرگِ بے ہنگام سے — بہہ رہا ہے خونِ دل پھولوں کے رنگیں جام سے
قمریاں زیرِ صنوبر سرنگوں بیٹھی ہوئی — رنجِ مرگِ ہمنشیں میں بے سکوں بیٹھی ہوئی
رو رہی ہے شبنمِ غمخوار جانِ جار کو — دے رہی ہے غُسل جسمِ عندلیبِ زار کو
روئی نرگس، کھول دی سُنبل نے بھی زلفِ رسا — گل گرے، بلبل گئی، گلزار میں اب کیا رہا؟

دفعتاً اُٹھی نگاہِ شاعرِ جادو بیاں — آنکھ میں آنسو جگر میں دردکی جاں کاہیاں
لب پر اک پُرسوز نغموں کا ہجومِ بیکراں — ہاتھ میں لرزش، قلم میں جنبشِ شعلہ فشاں
سینچتا ہے خونِ دل سے سرزمینِ شعر کو — خاتمِ رنگیں میں جڑتا ہے نگینِ شعر کو
نغمہ زن ہوتی ہے فطرت اک نئے انداز سے — رُوحِ خُفتہ جاگ اُٹھتی ہے صدائے ساز سے

شعر ہوتا ہے رواں اُس کے لبِ فریاد پر
زندگی تعمیر ہوتی ہے اسی بُنیاد پر

مرد اور عورت کے فرائض

اسلام کے وجود میں آتے ہی دُنیا نے "عورت" کا صحیح مفہوم سمجھ لیا، وہ عورت جو اب تک ساری دُنیا کی نگاہوں میں ایک ذلیل و خوار ہستی سمجھی جاتی تھی اور جس کی ذلت و بے حرمتی کی کوئی حد انتہا نہیں تھی اب وہی عورت فطرت کا ایک حسین اور لطیف ترین شاہکار بن گئی، ایک پاک اور منزّہ ہستی، سارے عالم کی آرائش و زیبائش، راحت دل و آرام جان، ایک ایسی محبوب و جمیل شے جس کا دل چاند کی رو پہلی اور لطیف کرنوں سے بنایا گیا ہو، اسلام نے دُنیا کو یہ بھی سمجھا دیا کہ مرد اور عورت کے مستقل اتحاد و اتفاق ہی سے تمام دُنیاوی اور روحانی مسرتیں حاصل ہو سکتی ہیں، "انسان دُنیا میں خوشی اور مسرّت کی زندگی بسر کرنے آیا ہے اور صرف وہی شخص صحیح معنوں میں خوش و خرّم رہ سکتا ہے جو اپنے گھر کی چار دیواری میں مسرّت تلاش کرے۔

ہماری گھریلو زندگی میں جذبۂ محبّت کو بڑا دخل حاصل ہے، یہ جذبہ تمام انسانی جذبات سے زیادہ قیمتی ہے، محبّت ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام مشکلوں اور تکلیفوں کو آسان کر دیتی ہے، اور یہ اُسی وقت پیدا ہوتی ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے حقوق اور فرائض سے کماحقہ واقف ہو جائیں۔ ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کا کافی احترام کرنا سیکھیں اور اپنی حد سے تجاوز نہ کریں تاکہ تخمِ محبّت حفظ حقوق اور ادائے فرض کی آبیاری سے نشو و نما پاتا رہے۔

ڈیوک آف ونڈسر، سابق شہنشاہِ انگلستان و ہندوستان کا قول ہے کہ "ایسا بیاہ جس میں محبّت کا شائبہ نہ ہو ایک غیر اخلاقی اور غیر فطری چیز ہے۔ ایک مضبوط کردار کا انسان ہر چیز کو قبول کر سکتا ہے، سوائے اُس ازدواج کے جس میں محبّت نہ ہو، جو بیاہ صرف مادّی مقاصد کے تحت ہوا کرتا ہے وہ نہایت مذموم اور انسانیت کے خلاف ہے، جس ازدواج میں جذبۂ محبّت کار فرما نہ ہو اُس کا قائم نہ رہنا ایک قدرتی اور فطری امر ہے، وہ لوگ جو آپس میں محبّت نہیں رکھتے اور خلوص سے اپنی ازدواجی زندگی نہیں بسر کر سکتے۔ اُن کا ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانا ہی بہت بہتر ہے۔" یہ زرین اقوال اُس شہنشاہ کے ہیں جو صرف "محبت" کی خاطر اپنی اُس وسیع اور عظیم الشان سلطنت سے دست بردار ہو گیا جس میں کبھی سُورج غروب نہیں ہوتا۔

یہ واقعہ ہے کہ محبّت کرنے میں عورت ہی دُنیا کی افضل ترین ہستی ہے، اُس کی محبّت غیر فانی ہے جو باوجود مرد کی کج ادائیوں اور غفلت شعاریوں کے زیادہ مستحکم اور وسیع ہوتی جاتی ہے، مرد کی سینکڑوں بے اعتنائیوں اور لاپروائیوں کے بعد بھی وہ اُس کی خدمت میں دن رات مشغول رہتی ہے، خانہ داری کی ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ اُس کے دوشِ ناتواں پر ڈال دیا جاتا ہے، بچّوں کی پرورش اور تربیت کی بھی وہی ذمہ دار خیال کی جاتی ہے، ہر حالت میں اپنے شوہر کے رنج و غم میں برابر کی شریک اور اُس کی ہمدرد و غمگسار بنی رہتی ہے، مگر باوجود ان ساری خدمات اور ایثار کے اگر کوئی مرد اُس کی تھوڑی بہت دلجوئی بھی نہ کرے تو افسوس ہے ایسے مرد کی عقل اور سمجھ پر۔

عورت اپنی بے لوث محبّت، بے غرض خدمت اور اپنی تمام صفاتِ حسنہ کے عوض اپنے شوہر کے متبسّم ہونٹوں سے اپنی

نسبت صرف چند میٹھی باتیں سُننے کی متمنی رہتی ہے، یہی وہ غذا ہے جس پر اُس کی زندگی کا مدار ہے، اگر مرد اُس کی ان تمام خدمات، ایثار اور خوبیوں کے باوجود اُس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے، اُس کے حقوق سے اُسکو محروم رکھے، اُس کے جذبات اور احساسات کو ٹھکرا دے، اُس کی وفاداری اور عصمت شعاری کو مشکوک نظروں سے دیکھے، اُس کے ہر کام میں نقص نکالے اور پھر یہ شکایت کرے کہ اُسے گھر میں راحت نصیب نہیں تو یہ اُس کی ناسمجھی اور بدبختی کی دلیل ہے، گویا اُس میں اپنی رفیقِ حیات سے اچھے تعلقات پیدا کرنے اور حُسنِ سلوک سے اُسکے اندر جذبۂ محبّت و ایثار بیدار رکھنے کی صلاحیت و قابلیت ہی معدوم ہے۔

ہندوستان کے ۹۰ فیصدی گھروں میں مجسمۂ محبّت و ایثار بے مایہ اور غریب لڑکیاں محض اس لئے مطعون کی جاتی اور اپنے شوہروں کی نظروں میں ذلیل و خوار سمجھی جاتی ہیں کہ وہ اپنے میکے سے بیش قیمت جہیز اور مرصع زیور نہیں لائی تھیں، مگر یہ نمائش پسند اور زر پرست مرد یہ نہیں سمجھتے کہ عورت کا محبت سے بھرا دل مرصع و طلائی زیور اور اُس کی وفاشعاری و ایثار قیمتی زرکار اور زرین لباس سے کہیں بیش قیمت ہے جس کی بدولت ان ناعاقبت اندیش اور حریص انسانوں کے تھکے ہوئے دل و دماغ آرام و چین پاتے ہیں اور اسبابِ معیشت کی فراہمی کے تفکرات اُن کی رگوں کے منجمد خون میں حرارت پیدا کرکے اُن کے مُردہ جسموں میں ایک حیاتِ تازہ پیدا کرتے ہیں۔

فطرت کے اصول کے موافق عورت مرد کی ایک بہترین رفیق اور غمگسار ہے، مگر اُس کی دوستی اور موانست سے استفادہ کرنا مرد کی طرز روش، اُس کی قوتِ فکر اور حُسنِ سلوک پر منحصر ہے، ہمارے گھروں میں عورت کی بہت کم قدر کی جاتی ہے، ہر مرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُس کی بیوی فرشتہ خصلت بن جائے، لیکن اپنی سیرت اور کردار کو درست کرنے کی فکر نہیں کی جاتی، اپنی بُری عادات و اطوار کی اصلاح کی طرف مطلق توجہ نہیں ہوتی، لیکن بیوی کے معمولی عیوب اور غلطیوں پر اس سختی سے نکتہ چینی کی جاتی اور اُنہیں ایسی تنقیدی نظروں سے دیکھا جاتا ہے کہ گویا مرد سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہی نہیں ہوسکتی۔

خانہ جنگیوں اور آئے دن کے جھگڑوں سے وہی لوگ نجات حاصل کرسکتے ہیں جو ایک دوسرے کی فطرت کا عمیق مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اور آپس میں محبت رکھتے ہیں، ایک دوسرے کی طبیعت اور مزاج سے واقف ہونیکے بعد تھوڑا سا ایثار اور بعض وقت تھوڑا جبر کرلینے سے متاہلانہ زندگی کے طویل سال نہایت خوشگوار اور دلچسپ ہو جاتے ہیں اور آپس کی بدمزگیوں اور بے لطفیوں سے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔

کستوری بائی کا بیاہ جب گاندھی جی سے ہوا تو اُن کی ماتا نے اُن کی کلائیوں میں نہایت بھدّی وضع کی چوڑیاں پہنائیں، یہ چوڑیاں اُنہیں میکے سے ملی تھیں اس کا ان بہت پیاری تھیں، مگر گاندھی جی کو ایک نظر نہ بھاتی تھیں، جب مسز گاندھی کو اپنے پتی کی مرضی کا علم ہوا تو اس خیال سے کہ شوہر کی خوشی چوڑیوں سے کہیں بہتر ہے اُنہوں نے اپنے پتی کے سامنے ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں، گویا چوڑیاں توڑ کر پتی کا من موہ لیا، یہ ہے ایک ہندوستانی عورت کا جذبۂ شوہر پرستی!!

خانگی زندگی کی اُلجھنیں میاں بیوی کے درمیان منافرت کی خلیج کو اتنا وسیع نہیں کرسکتیں جتنا کہ دن اور رات کی چھوٹی چھوٹی بظاہر بالکل معمولی مگر خلاف مزاج باتیں نظامِ زندگی کو درہم و برہم کردیتی ہیں، چند سال پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک شوہر نے اپنی شریک زندگی کی رفاقت سے ہمیشہ کے لئے اس لئے دست برداری کرلی کہ باوجود سینکڑوں مرتبہ منع کرنیکے اُس نے "مِسّی" کا استعمال ترک نہیں کیا، اس کم فہم اور ضدی بیوی کا مسز گاندھی سے مقابلہ کیجئے اور غور کیجئے کہ ایک بیوی نے محض اپنی حماقت اور ضد سے کتنی زحمت گوارا کی اور نقصان اُٹھایا اور دوسری نے اپنے شوہر کی خواہش اور نارضامندی کا احترام واحساس کرتے ہوئے اپنی چاہیتی ماں کا عطیہ چوڑیوں سے ہاتھ اٹھاکر اپنے شوہر کے دل کو ہاتھ میں لیلیا غالبًا ایسی ہی عورتوں کی نسبت کہا گیا ہے کہ ایک اطاعت کرنیوالی اور شوہر کے خواہشات واحساسات کا لحاظ رکھنے والی بیوی ہمیشہ اپنے شوہر پر حکومت کرتی ہے۔

گھر کی چار دیواری کے باہر مرد کے جذبات کو برانگیختہ کرنیوالی سینکڑوں چیزیں ہیں اور ہزاروں ایسی بھی ہیں جو اُس کے حوصلہ کو پست اور ہمت کو سرد کرسکتی ہیں، لیکن وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ دُنیا کی ہنگامہ خیزیوں اور غم روزگار کی پریشانیوں سے دُور اُس کا ایک ایسا ہمدرد و غمگسار رفیق بھی ہے جس کے پہلو میں اُس کے لئے ہر طرح کا آرام و سکون نصیب ہوسکتا ہے اور جو اُسے ایسی فرحت و مسرت بخش سکتا ہے جیسی کہ تھکے ہوئے سر کو ایک نرم و نازک تکیہ! جس پر صرف اس کا سر ہی نہیں بلکہ دل و دماغ بھی آرام کرے!! یہی وہ صفت ہے جو ہر مرد اپنی رفیقِ حیات میں دیکھنا پسند کرتا ہے، ہمیں یقین ہے کہ کوئی مرد ایسی عورت کی رفاقت سے ہرگز کنارہ کش ہونا پسند نہ کریگا جس کے دست رفاقت میں اُس کے دل کے زخموں کو مندمل کرنے کا اعجاز مستور ہے۔ اور جس کی زبان میں اُس کی فکروں اور غمہائے روزگار کو بھلا دینے کا جادو پنہاں ہے، ایسی عورت کی رفاقت اور موانست کے بغیر نہ مرد نیکی کی زندگی بسر کرسکتا ہے اور نہ اطمینان کی موت مرسکتا ہے!!

دُنیا کی ساری مصیبتیں اور کلفتیں، اقسام کے رنج و غم، پریشانیاں اور تفکرات، یہ سب کے سب بالکل دُور ہو جاتے ہیں جب انسان اپنی چھوٹی سی مسرت اور راحت سے بھری دُنیا میں بیوی، بچوں اور والدین کے درمیان ہوتا ہے لیکن اس مختصر سی دُنیا کی راحت اُس وقت تک نصیب نہیں ہوسکتی جب تک کہ چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب کے دل شفقتِ پدری، مہرِ مادری اور اطاعتِ فرزندی سے معمور نہ ہوں۔ محبت وہیں قائم رہتی ہے جہاں اطاعت ہو اور جذبات واحساسات کا لحاظ ملحوظِ خاطر ہو، اپنی اس چھوٹی سی دُنیا کو جنت ارضی بنانیکے لئے ہر عورت پر اپنے شوہر کا احترام اور اُس کی اطاعت لازم ہے اور شوہر کے لئے اپنی بیوی پر اعتماد کرنا ایسا ہی ضروری ہے، اطاعت اور اعتماد کے فقدان نے ننانوے فیصدی گھروں کو جہنم بنا رکھا ہے۔

ہر انسان، خواہ وہ مرد ہو کہ عورت اگر راحت و آرام کی زندگی بسر کرنا چاہے تو اپنے گھر کو ایسا نمونہ بہشت بنائے کہ جہاں محبت کی حکمرانی ہو سب کے خیالات نیک اور متفق ہوں، خواہشات پاک اور نگاہیں معصوم ہوں، جہاں بزرگوں کے دلوں سے دُعائیں نکلتی ہوں، جہاں بہن اپنے بھائی کو محبت اور اُلفت کی نگاہوں سے دیکھتی ہو، اور بھائی

اعتماد اور بے لوث محبّت کی نظروں سے، جہاں اولاد والدین کی اطاعت اور فرماں برداری کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتی ہو اور والدین اولاد کو دین اور دُنیا دونوں کے کام کا بنانے کی کوشش میں مشغول ہوں!

بعض نافہم بیویاں اس فکر میں دن رات گھُلی جاتی ہیں کہ اُن کے شوہر بہ نسبت اُنکے اپنی ماؤں سے زیادہ محبت کرتے ہیں! اُن کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ "محبت" محبت سے محبت کرتی ہے!! یہ ممکن ہے کہ ماں اپنے لڑکے سے بہ نسبت اُس کی بیوی کے بہت زیادہ محبّت کرتی ہو! پس ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ لوہا کیوں نہ اُس طرف زیادہ کھنچے جس طرف زیادہ قوت کا مقناطیس ہے!!

ایک حسین و رنگین پھُول اُس شخص کی نظروں میں کوئی دلکشی اور جاذبیت نہیں رکھتا جو اُسکو ہر روز دیکھتا ہے اور اپنے مشامِ جان کو اُس کی خوشبو اور عطریت سے معطر کرتا رہتا ہے، اسی طرح ہمارے بعض نوجوان حضرات ماں کی محبّت کو ایسی ہی نظروں سے دیکھتے ہیں، ذرا اپنی بے اعتنائیوں اور لاپرواہیوں کا خیال کریں، اپنی شوخیوں اور گستاخیوں کے مقابلہ میں اُسکے صبر و ضبط، اپنے سلوک اور بدکرداریوں کے ساتھ اُس کی چشم پوشیوں اور معافیوں کو یاد کریں، اُس کی بے غرض محبت اور جاں نثاری پر نظر کریں کہ ہماری صحت و سلامتی، ہمارے راحت و سکون، ہمارے آرام و آسائش پر وہ خود کو کس طرح پروانہ وار نثار کر دیتی ہے، اُس کے لاانتہا احسانات اور بیحد و حساب عنایات کا عوض کسی صورت ممکن نہیں! اس لئے اُسکی خدمت اور اطاعت ہر انسان کا فرضِ اوّلین ہے، نہ صرف اُس کے قدموں تلے جنّت ہے بلکہ اُس کی ہر نگاہ جنت بدوش ہے جسمیں بے پایاں راحت و مسرت اور سکونِ قلب کے بحرِ ذخار موج زن نظر آتے ہیں۔

جتنی قسم کے تعلقات ایک انسان کو دوسرے انسان سے رکھنے پڑتے ہیں اُن میں سب سے زیادہ گہرا تعلق عورت اور مرد کا ہے، اتنا عمیق اختلاط کسی اور تعلق میں نہیں پایا جاتا، اس تعلق کی بُنیاد باہمی محبت اور رواداری پر ہوتی ہے جسکو ہر دو کی ضروریات و اغراض دمِ آخر تک قائم رکھتی ہیں، یہی ایک ایسا تعلق ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کو مخلوط کرکے ایک مکمل انسان بناتا ہے، اسی کی وجہ ہے کہ رنج و راحت، دولت و مسرّت، عزت و آبرو، آل اولاد غرضیکہ ہر چیز اور ہر حالت میں عورت اور مرد کی شرکت ضروری قرار پاتی ہے، اگر یہ دونوں ایک دوسرے کے جذبات، احساسات، حقوق اور فرائض کا لحاظ اور پاس کیا کریں تو جیتے جی بہشت کا مزہ آجائے!!

ہماری زندگی میں بڑا نقص اور عیب یہ ہے کہ نہ ہم ایک دوسرے کے احساسات کا خیال رکھتے ہیں اور نہ حقوق و فرائض کا لحاظ، ہماری متاہلانہ زندگی کی بسم اللہ ہی غلط ہوتی ہے، معاہدہ کوئی کرتا ہے اور اُسکو نباہنا کسی اور کو ہوتا ہے، والدین نے پابندِ رسم و رواج ہوکر اولاد کے وہ حقوق جو اپنی شریکِ زندگی کے انتخاب کے متعلق اُسکو حاصل ہیں چھین لئے ہیں، یہی بُنیاد ہے ساری بے لطفیوں اور خرابیوں کی جو ہماری موجودہ زندگی میں پائی جاتی ہیں۔

والدین نے اولاد کا یہ حق تو چھین لیا۔ مگر ایک دوسرا حق خواہ مخواہ خود پر لازم کرلیا کہ اولاد کی پرورش کی طرح اُسکا بیاہ دینا بھی ماں باپ کا فرض ہے، ابھی اولاد متاہلانہ زندگی کی حقیقت، ذمہ داریوں اور اُس کے نتائج کے سمجھنے کے قابل بھی نہیں ہوتی کہ والدین کو بیاہ کی فکر پڑجاتی ہے، اولاد جب تک عمر اور قابلیت کے لحاظ سے بیاہ کے قابل نہو بیاہ کا ذکر

ہی نہ کرنا چاہیئے ورنہ قبل از وقت اولاد کے خیالات منتشر و پراگندہ ہونے کا قوی احتمال ہے، عمر کے علاوہ اس امر کا خیال کرنا بھی ضروری ہے کہ بیاہ کے بعد میاں بیوی کی زندگی لطف سے گزرے، اس لئے والدین کا فرض ہے اور اولاد کی خیر خواہی و عاقبت اندیشی اس امر کی مقتضی ہے کہ بیاہ سے پہلے اولاد کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونیکے قابل بنادیں، اگر والدین نے اپنا یہ فرض ادا نہیں کیا اور اولاد کو اس قابل نہیں بنایا کہ بیاہ کے بعد وہ تنہا اپنی آپ کفیل ہو سکے اور متاہلانہ زندگی کے حقوق و فرائض سے کما حقہ واقف ہوجائے تو ایسی اولاد کا عمر بھر بن بیاہے رہنا بھلا ہے!

ہر شخص اپنی اولاد کو دنیاداری اور معیشت کے اصول بتاتا ہے مگر شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جو اپنے لخت جگر کو اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ خلوص و محبت سے پیش آنے، اس کی جائز خواہشات کے پورا کرنے اور اس کے جذبات و احساسات کا احترام کرنے کی تعلیم دی ہو! کتنی مائیں ایسی ہیں جو اپنی لڑکیوں کی نسبت یہ کہہ سکتی ہیں کہ انھوں نے انکو اپنے شوہروں سے محبت کرنے یا اُن کی اطاعت اور فرماں برداری کو اپنا نصب العین بنانے کا عملی سبق پڑھایا ہے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایسی اہم اور ضروری تعلیم نہ دینے اور تربیت سے بیگانہ رکھنے کا جو نتیجہ ہوتا ہے اُس سے ساری دُنیا واقف ہے۔

اولاد کے بننے اور بگڑنے میں ماں باپ کو بہت دخل ہے، انسان میں دو متضاد کیفیتیں پائی جاتی ہیں، ایک طرف تو وہ والدین سے عادات و خصائل، رنگ روغن، صورت شکل اور جسمانی ساخت تک کی میراث لیکر آتا ہے اور دوسری طرف اُسکو تعلیم و تربیت سے عمدہ عادتوں اور اچھی خصلتوں کے اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں، جو عادات و خصائل وہ اپنے والدین سے ورثہ میں لاتا ہے اگر اُن کی تعلیم و تربیت سے کامل طور پر اصلاح نہ ہوگی تو اُن عاداتِ بد کی شورش تو کچھ ضرور کم ہوجائیگی جو اُس کی طبیعت میں راسخ ہو چکی ہیں۔

اولاد کے ساتھ برتاؤ کرنے میں والدین سے جو افراط تفریط سرزد ہوتی ہے وہ بہت کچھ محتاج اصلاح ہے، اولاد کی جسمانی اور روحانی زندگی کی بہتری اور اصلاح کی ذمہ داری زیادہ تر ماں ہوتی ہے جسمانی زندگی سے مراد ہے اولاد کی تندرستی اور توانائی اور روحانی سے اخلاقی اور مذہبی، یہ تب ہی ہوسکتا ہے کہ ماں کو اپنی جسمانی اور روحانی زندگی کے تندرست رکھنے کا خیال ہو، اپنی اور اپنی اولاد کی بھلائی بُرائی کے سمجھنے کی اُس میں صلاحیت ہو۔

اولاد کا ماں سے جتنا گہرا تعلق ہوتا ہے وہ ظاہر ہے، اس عمیق اختلاط کی وجہ سے ماں کی خو بو اولاد میں اچھی طرح بس جاتی ہے، کسی نے بہت سچ کہا ہے کہ بچے کیلئے ماں کی گود اُس کا پہلا مکتب ہے اور ماں "معلم اول"۔ بچہ دل و دماغ کی لوح سادہ لئے پیدا ہوتا ہے، ماں اُس پر نقوش اولین کندہ کرتی ہے، یہ نقوش ممکن ہے کہ صحیح تعلیم و تربیت سے کچھ مدہم پڑ جائیں مگر بالکل مٹ نہیں سکتے۔

اولاد کی بہت بڑی ذمہ داری والدین پر یہ ہے کہ وہ اُسکو دین اور دُنیا دونوں کے کام کا بنائیں، اگر والدین کو اولاد کے حقوق اور اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس ہو تو اُن کی نیند حرام ہوجائے مگر ہماری سماج میں اولاد کے حقوق اور والدین کے فرائض کا جو حق ادا ہو رہا ہے اُس کی اگر توضیح و تشریح کی جائے تو ظاہر ہوگا کہ کس حد تک والدین اولاد کو اپنے نمونے دکھاتے ہیں اور اپنی حرکات و سکنات سے بُری تعلیم دیتے ہیں، بیہودہ لاڈ پیار سے، چوچلوں سے، بیجا ناز برداریوں سے اُنہیں

یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ حاکم ہیں اور سب اُنکے محکوم اُنکی ہر خواہش خواہ وہ کتنی ہی گراں اور بیجا کیوں نہ ہو، پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، ایسی دیوانی محبّت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جتنی بھی بُری عادتیں ہیں سب ہی کا تخم لاڈلی اولاد کی طبیعت میں بویا جاتا اور عمر کے ساتھ ساتھ وہ جڑ پکڑتا، پھوٹتا اور پھولتا پھلتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ والدین ہی اپنی اولاد کی تخریب کا باعث ہوتے ہیں، یا تو وہ خود بُری عادات و خصائل کے حامل ہوتے ہیں اور اُن کی یہ عادتیں اولاد میں راسخ ہوجاتی ہیں، یا یہ ہوتا ہے کہ اولاد کتنی ہی بیجا بات کیوں نہ کرے افراطِ محبّت کیوجہ سے اسکو منع نہیں کرتے بلکہ اپنی ناعاقبت اندیشی سے اُس کے ہر فعل پر آمین کہتے رہتے ہیں، ایسے والدین نادان دوست کے مصداق ہیں کہ اولاد کو نکمّا، خود پسند، ضدی، مُسرف اور عیش و آرام کا دلدادہ بنا کر اُسکو کسی کام کا نہیں رکھتے، نہ دین کا نہ دُنیا کا، ایسی اولاد کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے، اُس کا وجود صرف ننگِ خاندان ہی نہیں بلکہ ملک و قوم کے لئے باعثِ ذلّت و نکبت ہوکر زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن جاتا ہے۔

میرزا سیف علی خاں

دوست کے حضور

نہ پُوچھ اے دوست تیری بزم میں کیا لیکے آیا ہوں
کہ میں شاعر ہوں اور شاعر کی دُنیا لیکے آیا ہوں

کیا ہے منتخب فطرت نے اپنا رازداں مجھ کو
متاعِ حکمتِ پنہاں و پیدا لے کے آیا ہوں

میں تیری زندگی کے آئینہ زارِ تبسّم میں
سحر کی روشنی، شبنم کا جلوہ لیکے آیا ہوں

ترے فرقِ ادا پر سایۂ تقدیس کی خاطر
ردائے مریم و دامانِ زہرا لیکے آیا ہوں

میں کس شانِ تکبّر سے ترے پُر نور قدموں میں
کلاہِ خاور و تاجِ ثریا لے کے آیا ہوں

منقش جس پہ حُسن و عاشقی کے کارنامے ہیں
حریمِ دل کا وہ زرّیں پردا لے کے آیا ہوں

جسے تو چھیڑ کر گردوں کے تارے توڑ سکتی ہے
میں تیری بزم میں اک ساز ایسا لیکے آیا ہوں

کیا ہے تیری خاطر جمع اوراقِ پریشاں کو
کتابِ شوق کا ایک ایک پارا لیکے آیا ہوں

میں تیرے واسطے رنگین خوابوں کے جزیرے سے
بہشتِ رنگ و بو کا ایک خاکا لیکے آیا ہوں

مری آنکھوں سے اِکدن دیکھ رونق اپنی محفل کی
میں تیری انجمن میں چشمِ موسیٰ لیکے آیا ہوں

تکلّف برطرف! دے مجھکو فرمانِ غزل خوانی
تری محفل پہ چھا جانے کا دعویٰ لیکے آیا ہوں

اُٹھا لے اپنے پیمانے، کہ اس دم تیری محفل میں
میں اپنی مئے، میں اپنے جام و مینا لیکے آیا ہوں

ترے شوق و وفا و التفاتِ ناز کے صدقے
نویدِ عشرتِ خوابِ زلیخا لیکے آیا ہوں

تجھی کو چاہے جانے کی ہوس رکھتا ہوں سینہ میں
تجھی سے چاہے جانے کی تمنّا لیکے آیا ہوں

محبّت کی فضا میں، آ کہ اس دُنیا سے کھو جائیں
ہمیشہ کے لئے اِک دوسرے میں جذب ہو جائیں

جاں نثار اختر (علیگ)

"الجواب"

(نومبر کے ساقی میں پروفیسر محمد مسلم کا ایک مضمون "جواب طلب" شائع ہوا تھا۔ اس کا کملہ "الجواب" کے نام سے انصار صاحب کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ "جواب طلب" کے سلسلے میں چار مضمون اور شائع کئے جا رہے ہیں۔

پیارے لطیف!

جس خطرہ سے میں تمہیں عرصہ سے ڈرا رہا تھا آخر تمہیں اس کا شکار ہونا ہی پڑا۔ تم ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے عادی ہو گئے ہو بلکہ تم نے اپنے ذہن کی روش ایسی بنا رکھی ہے۔ میں تمہیں ہمیشہ سے یہ بتاتا رہا ہوں کہ عقل کبھی تمہاری ذہنی گتھیوں کے سلجھاؤ میں تمہاری معاون نہیں ہو سکتی لیکن تم ہمیشہ اس حقیقت کی تردید کرتے رہے ہو۔ میں تمہیں معقول کرنے پہ مجبور تھا۔ اس لئے کہ تم میرے دعوے کے ثبوت میں مجھ سے عقلی دلائل طلب کرتے رہے اور میں عقل سے پرے گفتگو کر رہا تھا۔ تمہاری ذہنیت پر جو اثرات گالسورذی اور برنارڈ شا نے ڈالے ہیں۔ تم ان سے بے خبر ہو یہی وجہ ہے کہ تم نے میرے گالسورذی سے استفادہ کو چوری کہہ دیا، ورنہ تم اس سے پہلے اپنے متعلق گالسورذی کی ذہنی غلامی کا اقبال کر چکے ہوتے۔ تم برنارڈ شا کی طرح سوچنے کے عادی ہو گئے ہو اور شاید اسی کی طرح فری تھنکر (آزاد خیال) ہونے کا فخر بھی رکھتے ہو! تمہاری عقل تمہارے سامنے بھی ویسی ہی پہیلیاں اور گتھیاں پیش کرنے کی عادت پکڑ رہی ہے جن میں برنارڈ شا مبتلا ہے۔

تمہاری عقل نے تمہیں ایک کشمکش میں گرفتار کر دیا ہے۔ منطق کے اصول کے مطابق تم نے جس نظریہ سے ابتدا کی ہے تمہیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ بی بی کی فرمائش تم پر بجا ہی نہیں بلکہ اس کا نفاذ تم پر واجب ہے۔ لیکن میں کہوں گا کہ تمہارا یہ نظریہ ہی غلط بنیاد پر کھڑا ہے۔ اسلئے کہ مذہب و اخلاق کے اصول بچوں کے کھیل نہیں کہ تم ان کے متعلق اس آسانی سے فیصلہ کر لو کہ اگر وہ تمہارے کسی عالی مقصد کے متصادم ہو تو تم مقصد کے آگے انکی پرواہ نہیں کرو گے۔ تمہیں کیا خبر کہ جس مقصد کو تم نے عالی مقصد سمجھ لیا ہے وہ اس مقصد کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہو جسکے حصول کا ذریعہ فطرت نے مذہب و اخلاق کو بنایا ہے۔ میں خود اصولات مذہب و اصولات اخلاق کو کوئی خیالی اہمیت نہیں دیتا۔ میرے نزدیک ان کا وجود ایک نظام سے بڑھکر نہیں ہے جو انفرادی ضروریات وخواہشات سے قطع نظر اجتماعی ضروریات کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے لیکن اس نظام کا بانی کوئی انفرادی شخصیت نہیں بلکہ خود فطرت انسانی ہے۔ تمہارے جسم میں ایک پھوڑا نکل آتا ہے، فطرت خود اسکے اندمال کا سامان کرتی ہے، اکثر و بیشتر حالات میں تم مریض کو فطرت کے کورس پر چھوڑ دیتے ہو۔ ٹائیفائڈ کے بخار میں تم ہمیشہ بیماری کی میعاد کی تکمیل کے منتظر رہتے ہو۔ اسلئے اگر تم اس حقیقت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہو کہ تمہارا جسمانی نظام قائم رکھنے کے لئے فطرت نے اپنے قوانین وضع کر لئے ہیں، جو قطعاً تمہاری دسترس سے باہر ہیں تو پھر تمہارے ذہنی نظام کے لئے بھی فطرت ہی نے کیوں نہ ان قوانین کی بنیاد ڈالی ہوگی جنہیں تم مذہب و اخلاق کے اصول کہتے ہو؟ پھر تمہیں کیا حق ہے کہ تم ان اصولات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر انکی معقولیت و غیر معقولیت کے فتوے چھانٹا کرو؟

تمہارا یہ کہنا کہ "مذہبی احکام ہوں یا اخلاقی یا قانونی میں کسی کو مطلق اور ناطق نہیں سمجھ سکتا۔ سب حالات کے تابع ہیں"۔ قطعاً درست ہے اگرچہ میں قانونی احکام کو مذہبی اور اخلاقی احکام کے ہم پلہ رکھنے کا روادار نہیں لیکن، میرے دوست، اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ ان کا اطلاق یا عدم اطلاق تمہارے یا کسی دوسری شخصیت کے ذاتی فیصلے پر منحصر ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو کیا کسی قانون کا نفاذ ممکن ہو سکتا تھا؟ کیا تمہارے فیصلے آئے دن

میرے فیصلوں سے متصادم نہ ہوتے رہتے ۔ تم لکھتے ہو "سب کی روح بنی نوع انسانی کی بھلائی اور شکم بھی ہے" پس اصول پر ہر اصول قربان کیا جا سکتا ہے، کیوں نہیں! انسان اشرف المخلوقات ٹھیرا اور اسی میں ایک آپ کی ذات بھی ہے۔ سارے قوانین کا اسکی بھلائی کے لئے ہونا کیوں نہ لازم ہو۔ تم مذہب کی کورانہ تقلید و توہم پرستی سے بھاگنا چاہتے ہو۔ لیکن غیر ارادی طور پر تم اسکی حمایت بھی کئے جاتے ہو۔ فطرت کی ساری توجہ و عنایات کے مرکز بس ایک آپ ہی ہیں۔ باقی کائنات تو آپکے آرام و آسائش کے لئے فطرت نے کھڑی کر رکھی ہے گویا فطرت پر آپ کا کوئی بڑا دین ہے جسکی ادائگی میں فطرت ابتدائے آفرینش سے کوشاں ہے۔ لیکن ہنوز یہ قرضہ اسکے سر سے نہ اترا ہے۔ فلسفہ اخلاق کا یہ چار اور یہ تنگ نظری! ٹھیک ہے تمہارا تعقل تمہیں اس سے آگے پہونچا بھی نہیں سکتا۔ انہیں خود غرضی کی رو میں تم نے کتنا مفید اصول وضع کر لیا ہے! لیکن مہربان من ذرا سوچو تو کہ اس عام اصول کے وضع کرنیکا تمہیں کونسا حق حاصل ہے جب کہ تم اپنی ذات سے علیحدہ ہو کر ایک لمحہ کو بھی یہ سوچ نہیں سکتے؟ اگر بفرض محال اس اصول کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اسکے نفاذ کے ذرائع کی تخصیص میں تمہارا کس حد تک دخل ہے؟ تم کہوگے کامل کیوں؟ مگر میں تم سے پوچھونگا کہ اگر تم میں سے ہر شخص کو اپنے طور پر اس مقصد کے حصول کے ذرائع کے جانچ پڑتال کی قدرت حاصل ہو جائے بلکہ ان کے وضع کرنیکا حق بھی حاصل ہو تو کیا اس مقصد کا حصول کبھی ممکن ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے جو کام تمہاری عقل کو مفید معلوم ہوتا ہے میری عقل کے نزدیک ناکارہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، موجودہ مفکرین کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ سمجھتا ہے کہ سائنس کی ترقی انسانیت کے لئے مفید ہے اس لئے سائنس کے ذریعہ انسان اپنے ماحول سے فائدہ اٹھانیکی قابلیت حاصل کرتا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ سائنس کی ترقی نے نئی ایجادات پیش کر کے ہماری ضروریات اتنی وسیع کر دی ہیں کہ ہم اس اطمینان و مسرت سے محروم ہو گئے ہیں جو ہمیں سادہ زندگی میں میسر تھی دونوں کے دلائل اپنی اپنی جگہ پر کافی مستحکم ہیں۔ دونوں کا مقصد ایک ہے۔ انسانیت کو فائدہ لیکن ذرائع متضاد۔ اسلئے میرے دوست تمہارا یہ خیال کہ جو ذرائع تمہارے اعلیٰ مقصد کے حصول میں معاون ہوں تمہیں ان پر عمل کرنا چاہیئے، خواہ وہ مذہب و اخلاق کے قوانین سے متصادم ہی کیوں نہ ہوں قطعاً غلط ہے۔ اسلئے کہ جس مقصد کو ہم اعلیٰ مقصد سمجھتے ہوں ممکن ہے اس عالمگیر مقصد کے نزدیک کوئی وقعت نہ رکھتا ہو جسکی توسیع فطرت کر رہی ہے۔ رہ گئے ذرائع انکے صحیح انتخاب پر بھی تمہیں کوئی دسترس نہیں۔ اس لئے کہ تمہارے پاس جو عقل کی کسوٹی ہے وہ سونا اور تانبے میں کوئی تمیز نہیں کر سکتی۔ اب تمہارے لئے سوائے اسکے کوئی چارہ کار نہیں کہ ان قوانین پر عمل کرو جو حیات اجتماعی کے بنا کردہ ہیں اور تعینی حیات کی ارتقا و بہبودی میں معاون رہے ہیں ورنہ کب کے مفقود ہو گئے ہوتے۔ تمہارے مذہبی و اخلاقی قوانین کبھی تمہیں بیوی کی فرمائش پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ تم نطفے بے بس ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں یہ "فکر" صرف للّی ہی کے معاملہ میں کیوں سوجھائی دی۔ درآنحالیکہ تمہارا تعقل تمہاری روزمرہ زندگی کے ہر فعل میں ایسا تصادم ڈھونڈ کر نکال سکتا ہے۔ شاید انکی عمومیت کی وجہ سے تمہاری نگاہ ان پر نہیں پڑتی۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ للّی کی "زری جارجٹ کی ساری" تمہاری نگاہوں کو گھناؤنی کیوں نہ معلوم ہوئی، اسکے "آراستہ کمرہ" میں تمہارا دم کیوں نہ گھٹنے لگا۔ "سینڈوچ کیک چاکلٹ، انگور، سیب" یہ سب تم سے کس طرح ٹھونسے گئے جب کہ تم جانتے ہو کہ اس ساری کی دلفریبی کے لئے کتنے ننگے بدن والے انسانوں نے اپنے اوپر نیند حرام کر دی ہے۔ اس کمرہ کی آراستگی کیلئے کتنے گندہ بدبودار کوٹھریوں میں رہنے والے مزدوروں نے جانوروں کی طرح کام کیا ہے۔ ان سینڈوچ کیک، انگور کی لذت آفرینی میں کتنے فاقہ کش کسانوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ تمہارے خلق خدا کی خدمت کے جذبہ کو اس وقت سانپ کیوں سونگھ گیا تھا، بنی نوع انسان کی بھلائی کے علمبردار اگر تم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر غور کرتے تو تمہیں للّی کی پرچھائیں تک جو حقوق انسانی کی اس بیدردی سے پامالی کر رہی تھی زہر آلود معلوم ہوتی اور تم اسے اپنے پاس پھٹکنے تک نہ دیتے۔ لیکن تمہارا دردمند دل جو تمہیں "کسی کے آنسو برداشت نہیں کرنے دیتا" کب اسے روا رکھ سکتا تھا کہ تم للّی کو روتا اور بسورتا چھوڑ کر اپنے اعلیٰ مقصد کی تعمیل میں وہاں اُسے چھوڑ کر چلے جاتے۔ اور تم بقول خود اسکے التفات میں کھو گئے لیکن جب تمہیں

اپنی گم شدگی کا ہوش ہوا تو اپنی اس لغزش کی پاسداری میں لگ اس اعلیٰ مقصد کی اوٹ پکڑنے، اور مذہب و اخلاق کے قوانین کو اس کا مدمقابل ٹھہرانے۔ تم ہی بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں، تمہیں اس وقت اپنے اعلیٰ مقصد کے مقابلہ میں ان اصولات کا استحکام کیوں متزلزل نظر آیا جب تم اٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ و ہر ساعت اپنے اس اعلیٰ اصول کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہو اور تمہیں احساس تک نہیں ہوتا؟ کیا تمہارا یہ اعلیٰ مقصد محض ایک فریب نہیں ہے جسے تم نے صرف مذہبی و اخلاقی قوانین کی نافرمانی کے جواز کے لئے گھڑ لیا ہے؟ -

کیا اس تلخ تجربے کے بعد بھی تم عقل کی پاسداری پر اڑے رہو گے؟ کیا اب بھی تمہارے نزدیک عقل کی انتشار انگیزی میں شک کی گنجائش باقی ہے۔ میں تمہیں کتنی بار بتاؤں کہ عقلی دلائل و براہین کا تعلق صرف ہمارے ذہن شعوری سے ہے، اور ذہن شعوری ہمارے دماغ کی ترتیب کا محض ایک جزوی عنصر ہے جس کی مثال سمندر کی سطح پر ان ننھی ننھی موجوں کی سی ہے جو ہر سکنڈ سمندر کی بطنی کیفیات سے بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ تم سمندر کی عظیم الشان سرگرمیوں کا راز ان موجوں میں ڈھونڈ ھنا چاہتے ہو۔ تم اخلاق و مذاہب کے اصولات کو ذہن شعوری کے ہر آن بدلنے والے مسئلوں اور چٹکلوں کے آئینہ میں دیکھنا چاہتے ہو۔ لیکن لطیف تم بھول جاتے ہو کہ آئینہ کے عکس کی جولانی خود آئینہ کے طول و عرض پر منحصر ہے۔ معکوس خواہ کتنا ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو، لیکن عکس ہر حال میں آئینہ کے حدود کے اندر ہی ہوگا۔ مذہب و اخلاق کے قوانین کی وسعتیں اتنی مختصر نہیں کہ تمہاری عقل میں سما سکیں۔ انکی وسعتیں اتھاہ ہیں، تب تو ابتدائے آفرینش سے وہ حیات کی نشو و نما وارتقا میں معاون ہوتے رہے ہیں۔ تمہاری عقل زیادہ سے زیادہ تمہاری اپنی انفرادی زندگی کے چند سطحی معاملات کے لئے قوانین بنا سکتی ہے، لیکن وہ قوانین جن کا اثر انسانیت ہی نہیں بلکہ حیات کی مکمل تاریخ پر رہا ہے کس طرح کسی انسانی عقل کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ وہ خود فطرت کے وضع کردہ ہیں، اور انکی نوعیت و مقاصد کا علم خود فطرت کو ہو سکتا ہے۔

لطیف تم اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ میں تمہیں قطعاً عقل سے دست بردار ہو کر فاتر العقل بن جانے کو کہہ رہا ہوں۔ میں تمہیں صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ خدا کے لئے عقل کی کھینچا تانی سے بچو۔ ورنہ یہ کمبخت تمہیں ذہنی الجھنوں میں مبتلا کر کے ایک دن سچ مچ فاتر العقل بنا کر رہیگی۔ مذہب و اخلاق کے اصول ہی، جنکا تعلق عقل سے زیادہ وجدانیات سے ہے، اور عقلی تربیت کے آگے ان کی معقولیت ہیچ ہو جاتی ہے تمہیں ان ذہنی الجھنوں سے بچا کر تمہارا دماغی توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ خدا کے لئے تم ریتی کو مذہب و اخلاق کے متعلق ان غلط فہمیوں سے نجات دلاؤ جنکی وہ شکار ہو رہی ہے اور جنہوں نے اسے تمہیں اپنا ہم مذہب سمجھکر، تمہاری طرف مائل کر رکھا ہے۔ تمہارا سب سے بڑا اخلاقی فرض اسوقت یہی ہے ؞

نیاز کیش:- عزیز

سید محمد محسن، ایم اے عظیم آبادی

لطیف،

میں نے تمہارے خط دیکھے۔ واقعی کتنے دلچسپ اور پاکیزہ خیالات پر مبنی ہیں۔ اگر ایسے ہی شاہ کاروں کا جدید ادب میں اضافہ ہوتا رہا تو وہ دن دور نہیں کہ اردو زبان اپنی لطافت اور بلندیٔ تخیل کے اعتبار سے سارے عالم کے ادب کو چیلنج دے سکے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے نظر افروز حقائق کے ہوتے ہوئے افسانوں کا گھڑنا یقیناً اپنے ادب کی تذلیل کرنا یا دوسروں کے ہاں سے چوری کرنا ہے اور یہ بڑا احسان کیا تم نے کہ ان خطوں کا

اردوداں طبقہ کی رہبری کے لئے نمونتہً اعلان بھی کردیا لیکن مجھے تو کھٹکتا ہے کہ جس طرح تمہارے دوست نے "گال زوردی وغیرہ سے" مال چرانا سیکھا ہے، اسی طرح تم نے یہ "حقیقت نگاری" بھی ایسوں ہی سے سیکھی ہوگی، ورنہ ہم مشرقی تہذیب کے ہندوستانیوں میں بھلا یہ بات کب پیدا ہوسکتی ہے؟

خیر، یہ تو ایک غیر متعلق بات تھی۔ اصل مقصد تو تمہارے درد کا درماں ہے۔ چونکہ تم میرے لئے اجنبی بلکہ فرضی ہو، اور افسانوں کے مقابلے میں حقیقت پسند اگر میں تمام تکلفات بالائے طاق رکھ کر، جو دراصل دور کے پیوند سے افسانے ہی کی شاخ ہوجاتے ہیں، برطرف کرکے جہاں تک ہوسکے صاف الفاظ میں نفس مضمون کا جواب دیدوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا نا؟

حقیقت میں تم لوگوں کی حالت بھی کس قدر قابل رحم ہے کہ دل ترستا ہی پر ہاتھ نہیں پہونچتا، اور تمہارے ساتھ منصوبے اگرچہ کودا مگر جا پھنسا، پر جاکر ختم ہوجاتے ہیں۔ اسی سے تمہاری اولوالعزمی اور مقصد کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

ایک طرف تو مذہب واخلاق تمہارا خاص میدان رہا ہے اور مذہبی رواداری وبلند نظری کے لئے تم کافی بدنام بھی ہو، اور دوسری طرف تمہاری ہمدردی اور جذبۂ ایثار کا یہ عالم ہے کہ تم سارے مذہبی احکام کو بالائے طاق رکھ کر بنی نوع انسان کی ہمدردی کو اپنا خاص نصب العین قرار دینے، اور اس اصول کے لئے سارے اصول کو قربان کرنے کو تیار ہو۔ لیکن عملی نتیجہ کچھ بھی نہیں۔ للی بے چاری تم سے آس لگائے بیٹھی ہے اور تم ہو کہ "پرائے قرضہ" کے باوجود لیت ولعل کئے جاتے ہو۔ حالاں کہ جانتے ہو، قرض کی ادائگی اور جان بچانا دونوں انسان کے اولین اخلاقی فرائض ہیں۔ کبھی تمہیں اپنی بیوی کا خیال آتا ہے اور کبھی معیار اخلاقی کا۔ للی کبھی ایسا نہیں کرتی حالاں کہ وہ بھی تمہاری "ہم مذہب" ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اعلیٰ مقصد کے آگے مذہبی فروعات قابل لحاظ نہیں ہوتے۔ اسے تو تمہاری "ایک بتی اور مختلف رنگ کے گلوب" والی مثال یاد ہے، اور شاید ایسے ہی موقعہ کے لئے، لیکن تم خود بھول گئے۔ آخر ہو نا ہندوستانی!

تمہاری بیوی "خدا کی دین" سے اس قدر تنگ ہو کہ جو علاج بھی اسکے تدارک کے لئے ہوسکے کرنے سے انکار نہیں خواہ اس میں اسکی جان ہی کیوں نہ جائے، کچھ تو اسلئے کہ ویسے بھی یہ ریشم کے کیڑے اس کے اندام نازک کو کھائے جارہے ہیں اور کچھ اسلئے کہ شاید اسکو بھی یہ خیال ہوگیا ہو کہ دنیا کو اب ایسی "زرخیز" عورتوں کی ضرورت نہیں رہی۔ اسکے باوجود اسے ایک بے ضرر اور یقینی علاج سے گریز بھی ہے جسکے بتلانے پر اتنے بل پڑتے ہیں کہ تم جیسا مضبوط انسان بھی مرعوب ہوکر بہ سبب انتشار ڈھیلا پڑجاتا ہے، بہ صورتے کہ اگر وہ تمہیں للی کی یاری کے لئے وقف کردیتی تو قطع نظر اس سے کہ یہ علاج اس کا مقصد پورا ہوجاتا، اس ایثار سے وہ قدیم روایت بھی زندہ ہوجاتی کہ ایک ہندوستانی عورت اپنے شوہر کے مقصد دمرضی کے لئے خود کو قربان کردیتی ہے یا پھر تم خود بہ حیثیت مذہبی ہونے کے اپنا..... "مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ" والا حربہ استعمال کرکے اسکا منہ بند کرسکتے، لیکن تم میں اتنی ہمت وعقل ہوتی تو یہ روز بد دیکھنا ہی کیوں نصیب ہوتا۔

للی کے نزدیک "بچہ کشی" سے زیادہ اعلیٰ مقصد اور کوئی نہیں۔ کیوں کہ اسے بقائے نام اور شوہر کے خیال کے مطابق اُخروی نجات کی ضرورت ہے، جسکے لئے اس سے بہتر مقصد (خصوصاً بہ حالت مایوسی) یہ ہوتا ہے کہ ایک رفاہ عام کی یادگار قائم کی جاتی اور اس پر ایک کتبہ "بچہ کشی کی آرزو مند" وغیرہ کے عنوان سے لگادیا جاتا اور وہ ایک ابدی اور بلند ترین نوعیت اختیار کرتا لیکن اس کی تمنائیں تو ایک ایسی سعی سے وابستہ ہیں جس کی تکمیل اتنی ہی موہوم اور غیر یقینی ہے جتنی کہ تمہاری امداد سے اس کا حاصل، حالانکہ وہ جانتی ہے "قدرت کیساتھ مقابلہ کرنا خطرناک ہے"۔

تمہاری "ہم مذہب" ہونیکے اعتبار سے گو یا وہ بھی اس "مقدس نیکی" یا "کار ثواب" کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہے، لیکن مانا جی

کی بزرگی اور وقار کا یہ عالم ہے کہ وہ "نیکی" کی جگہ پر بھی "لونڈوں" اور "بزرگوں" کا امتیاز رکھتی ہیں۔ حالانکہ سنا تھا ایسے موقعوں پر تو محمود و ایاز کی صف بھی جدا نہیں ہوتی۔ اور حق تو یہ ہے کہ اس عمر میں لونڈوں سے بھیک مانگتے ہوئے انہیں شرم بھی آنی چاہیئے۔ رہا اس خیانت کا سوال، تو وہ بچپن سے اسکی عادی رہی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ بچپن میں پھل چراتی تھیں اور اب صرف بیج چرانا چاہتی ہیں، "ہوئے گن موئے ساتھی" تو سنا ہی ہے، پھر اعتراض کی کیا بات۔

اگر انہیں صرف مقصد براری اور صحت یابی منظور ہوتی تو جہاں اس دور جدید میں اتنے نوجوان اسکوٹس ہر وقت، ہر نفس کی مدد کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ اس بحرِ غم میں بے کس مسافر کی نیا کھینے بھی کوئی نہ کوئی تیار ہو جاتا۔ مگر افسوس اس کا ہے کہ جوگن کی جھولی" کے لئے صرف "رام نام" کی ضرورت ہے اور وہ بھی صرف تم ہو۔

مسٹر باسو اس معاملہ میں تم سب سے بڑھے ہوئے ہیں کہ صحیح معنے میں انہیں غرض صرف حصول مقصد کی ہے، چاہے وہ کسی طرح ہو، کہیں سے ہو۔ ان کی التجا بیوی سے صرف اتنی ہے کہ

لے جان بیچ کر بھی تو بچہ اگر ملے بس سے ملے جہاں سے ملے جس قدر ملے

اور یقیناً افسوس کی بات ہوتی اگر اتنی فلسفیانہ بحث، کفارہ اور شفاعت' کی بحثوں کے بعد ان میں اتنی فراخدلی اور وسیع النظری بھی نہ پیدا ہوتی۔ لیکن اس طویل مدت میں بے چارے شاید یہ بھی نہ معلوم کر سکے کہ اتنے عرصے جو بیوی "قحط سالی" میں مبتلا رہی تو در اصل قصور کس کا ہے۔

خیر واقعات کی نوعیت سے زیادہ بحث کرنا وقت گنوانا ہے بتانا صرف یہ تھا کہ انیس بیس کا فرق سہی، لیکن قصور سب کا ہے اس لئے سزا سب کو ملنی چاہیئے، یا علاج سب کا ہونا چاہیئے۔

کسی کو حصول مقصد کا صحیح ذریعہ معلوم، نہ اسکی اہمیت کا احساس، اسلئے بہتر ہوگا کہ ہر شخص ذرا اپنی کھوپڑی کا علاج بھی کرالے تاکہ دماغوں کا توازن قائم ہو، اور ان کا استقلال اول تو موانع پیدا ہونے ہی نہ دے، اور جو ہوں بھی تو حصول مقصد کے آگے انہیں ٹھکرا سکے۔

ممکن ہے تمہیں اس سے تشفی نہ ہو۔ کیونکہ امراض مختلف النوع ہیں، میں بہ حیثیت اسکے کہ "نیم حکیم" ہوں، لیکن تمہارے لئے "خطرۂ جان" بننا نہیں چاہتا، مختلف علاج پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ تجربہ کے بعد جس کو علاج مفید ثابت ہو براہ کرم مجھے اطلاع دیدے، میں اسکے نام نامی سے معنون کر کے کسی "جدید شاہی کوک شاستر" کے مدیر کے ہاں بھیج دونگا تاکہ تم لوگوں کی مساعی و تجربہ سے کئی نوجوانان ملک بھی فائدہ اٹھا سکیں۔

اگر تم نے غور کیا ہے تو معلوم ہوا ہوگا کہ تم دونوں کے جوڑے بالکل متضاد واقع ہوئے ہیں۔ تمہیں ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جو بیوی ہو، مگر جنے نہیں، اور باسو کو ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جو بیوی ہو، نہ ہو، مگر جنے ضرور، ادھر تمہاری بیوی کی مردم خیزی کا وہ عالم ہے اور ادھر مسز باسو کی قحط الرجالی' کا یہ حال، تمہاری بیوی کو جننے سے انکار، مگر شوہر کی رغبت، اور مسز باسو کو جننے پر اصرار ہے، مگر شوہر کی رغبت نہیں، اور یہ کہ تم مسلمان ہو اور وہ عیسائی ایسی صورت میں اگر تم برا نہ مانو تو بادی النظر میں ایک صحیح علاج بتا دوں؟ سنو! بہتر ہوگا کہ تم لوگ آپس میں مصلحت انتظامی کے تحت فی الحال "تبادلۂ زوجین" کر لو، تاکہ کچھ تبادلۂ خیالات بھی ہو جائے اور فی الحقیقت تم لوگوں کو اس "حالی، کلدار" کے تبادلے سے اپنا اپنا اصلی نرخ بھی معلوم ہو جائے، میرا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی منطقی بیوی سے کہدو کہ وہ جیسی چیز

باسو سے لینا چاہتی ہو لے لے، پھر تو اسے تم کو للی کی بے کسی پر ترس کھا نیسے روکنے کی کوئی حجت نہ رہیگی نا؟ اب رہا تمہاری غیرت کا سوال تو تم جان چکے ہو کہ بے چارے باسو کتنے پانی میں ہیں۔ انکی صحت قابل رحم ہے، وہ آج نہیں، آٹھ سال سے "ایسے ہی" ہیں، وہ ڈھائی توے کھاتے کیا، ٹونگتے ہیں اور جب وہ ساری رات بیٹھ کر گذار دیتے ہیں تو ان کا ہر ہر عضو لبلبا اُٹھتا ہوگا:۔

"میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی   لے وہ جلوت نہیں، خلوت ہی سہی"

ایسے موقعہ پر انکے لئے تمہاری بیوی سے زیادہ سکون کا باعث کون ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ کئی عدم آباد کے مسافروں کی ضیافت کرتے کرتے مشاق بھی ہوگئی ہے۔ یوں بھی باسو کے دن کے مہمان ہیں بہت جلد تمہارا مال تمہیں واپس مل سکتا ہے۔

پھر تو تمہارے اور للی کے آزاد ہونے میں کون باپ کی بیٹی روڑے اٹکا سکتی ہے۔ اس طرح جب تمہیں اس "کروں نہ کروں" کی صبر آزما حالت سے نجات ملجائے تو با سانی اپنے "کار خیر" کو انجام دیسکوگے، اور للی کو "ٹیس" کے ساتھ ساتھ "تسکین" کا مزہ بھی معلوم ہو جائیگا۔ اخلاقی معیار کا ایک خاص موسم مقرر کرکے اس نے کبھی کا چھٹکارا پالیا ہے، ضعف و عمر کا خیال تمہیں کبھی نہ ہونا چاہئیے، صرف ایک گھڑی کا اختلاط اور ایک بوسہ جس کا جوش صبر آزما ہو جائے، وہ عجب نہیں کہ اس سرمستی کے اثر سے "کھچڑی مونچھوں" پر بھی رنگ خضاب چڑھ گیا ہو، باضابطہ میل جول سے تازہ بہار نہ آجائے اور للی تمہیں "زیادہ دلکش اور جوان" کیا، کنواری مرنی نہ لگے تو انکی حیا کی قسم!۔ ویسے بھی وہ ایک ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر ہوتے ہوئے اسکی تصدیق کر دی ہے کہ تم اسکے لئے ڈاکٹر ہو تو پھر ایکدوسرے کو انجکشن دے کر قوت حاصل کر لینا کون بڑی بات ہے، اور اگر اس پر بھی تمہیں کمزوری کا خیال ہو تو میں سمجھوں گا کہ یہ صرف دہم ہے، ورنہ تم ایسے کمزور نہیں معلوم ہوتے۔ لو، ایک شعر بھی لکھے دیتا ہوں، ممکن ہے تمہارے لئے مقوی ثابت ہو!

جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے   بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

اگر یہ نسخے پسند نہ آئیں تو پھر تم عورتوں پر ہی چھوڑ دو، وہ خود آپس میں کوئی تدبیر کر لیں گی۔ تمہاری بیوی تو اپریشن کے لئے تیار ہی ہے، اور للی کو بھی جو اس مقصد کی فکر میں جان کھو رہی ہے اس سے دریغ نہ ہوگا۔ جہاں اس مسیحائی دور میں ڈاکٹری نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ مردہ کو زندہ کرنے کی سعی کیجا رہی ہے، عورت کے مرد بنانا آگیا ہے، بکرے کی انتڑی آدمی کے لگائی جا سکتی ہے، ان دونوں کو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اور یہ خوش نصیبی ہے کہ ان میں سے ایک عورت خود ڈاکٹر ہے، لہذا وہ باسانی ایکدوسرے کی پردہ پوشی سے مدد کر سکتی ہیں، اس سے مقصد میں کامیابی کی امید بھی قوی ہو جائیگی اور بہ حیثیت ہجولیوں کے ایکدوسری کے حق میں یہ مفید ترین ایثار ثابت ہوگا اور بہترین صلۂ رحم۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ اندیشہ باقی ہی رہتا ہے جو تمہارے دوست عزیز کو ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو تمہاری کوششیں بے ثمرہ جائیں اسلئے میں ایک ایسے علاج کا مشورہ بھی دئے دیتا ہوں جو اتنا ہی آسان ہے جتنا دوسرے دشوار، اتنا ہی سستا ہے جتنے دوسرے مہنگے، اتنا ہی یقینی ہے جتنے دوسرے غیر یقینی، اور جس کی شکست میں فتح، جس کی نامرادی میں کامرانی، جسکی گمنامی میں ناموری، جس کی فنا میں بقا، جسکی لاولدی میں ماتا کی تسکین، جس کی غرض میں بے مدعائی، جسکے گناہ میں اخروی نجات، جس کی علالت میں صحت، جس کی تکلیف میں راحت، جسکی جانکنی میں جانبری، جس کی بے ثمری میں باروری، اور جسکی دستیابی میں ابدی مسرت و سکون ہے، اور وہ صرف ایک وحدہٗ لاشریک ذریعہ ہے جس کے حصول کے لئے مرد فرض شناسی و صحیح خودداری سیکھیں اور عورتیں سچی محبت و ایثار! ❊

تمہارا بیگانہ ہمدرد

احمد

سید علی شاکر، ایم اے

"جواب"

لطیف صاحب هدیۂ نیاز!

تمہاری حسین وجمیل پریشانیوں کا حال معلوم ہوا۔ تم سمجھے ہوگے کہ تمہاری معذوریوں کی یہ داستان میرے ہوش وخرد کے لئے ایک چیلنج ثابت ہوگی لیکن مجھے تمہاری توقعات سے ہمدردی رکھنے کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ تم "نرے احمق" ہی ہو اور بس ——— الہیات، تصوف، مذہب اور اخلاق کو تم بزعم خود اپنے "خاص میدان" سمجھتے ہو اور پھر انہی وادیوں کی ایک خوبصورت چٹان سے گر کر اوندھے منہ زمین پر آرہے ہو!

مصر کی شعلہ فطرت ملکہ قلوپطرہ نے سیزر اور پھر انطانی کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے جس طرح اُلو بنایا تھا اس کا تجزیہ کرکے تم خود میرے سامنے بارہا قہقہے بلند کر چکے ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے قلوپطرہ کی ان تمام "حرکات" کو جو تاریخ میں ہوس کوشی اور نفس پروری کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہیں صرف اسلئے جواز عطا کیا کہ وہ "سیاسی چالیں" تھیں اور بقول تمہارے ان کے پیچھے وطن و سیاست کے "اعلیٰ مقاصد" چھپے ہوئے تھے۔ اپنی یہی رائے تم کلائیو، ہیسٹنگز اور موجودہ زمانے میں خود مسولینی کی ان جیرہ دستیوں کے متعلق ظاہر کر چکے ہو جو "جنگ ابے سینیا" سے متعلق کی گئی ہیں ——— پھر آج اُسی قسم کے "بلند اغراض" کے حضور میں خود تمہاری قوت کار کیوں لرزہ براندام ہوئی جاتی ہے؟ شاید تم اس کا کوئی جواب دینا پسند نہ کروگے لیکن میں بتاتا ہوں کہ تمہارا یہ "پس وپیش" صرف اسلئے ہے کہ تمہارا ضمیر اور تمہاری فطرت سلیم ہنوز تمہاری "علمیت وتعقل" کے اثرات سے کسی حد تک آزاد ہے یعنے تم ابھی تک ایک "فطری انسان" ہو اور بقول ولیم ہیزلٹ تمہارے علمی مشاغل نے تمہیں ابھی پوری طرح جاہل نہیں بنایا۔

مگر یہ باتیں تمہاری سمجھ میں اس طرح نہ آئیں گی واقعات نے تمہیں اس قدر خوبصورت انداز میں فریب دیا ہے کہ جب تک اس سراب کا ذرہ ذرہ چیر کر تمہارے سامنے نہ رکھدیا جائے تم "ریگ رواں" کو "موج غلطاں" ہی تصور کرتے رہوگے۔ میں آئندہ سطور میں جو کچھ لکھنے والا ہوں وہ بہت آزاد چیز ہوگی اور اس لئے اگر تم اپنی فطرت اور اپنی للی کی فطرت کو بے نقاب دیکھنے کی تاب بھی کھو چکے ہو تو باقی تحریر کو بغیر پڑھے نذر آتش کردینا۔

تمہاری اس تمام "آفت ناگہانی" کا خلاصہ یہ ہے کہ للی جس کے ساتھ تم زمانۂ شباب میں چند پرشوق نگاہوں کا تبادلہ کر چکے ہو تمہارے پاس آئی ہے اُس وقت کہ تم اور وہ ازدواج کی جداگانہ شاہراہوں پر کافی عرصہ بسر کر چکے ہو۔ للی تم سے اس چیز کی طالب ہوتی ہے جو بقول اسکے اسکی صحت مامتا، اور خاندانی ورثہ کے مدنظر ناگزیر ہے اور جو اس کا شوہر اسے نہیں دلیکا۔ اس کا مقصد اعلیٰ معلوم ہوتا ہے لیکن "ذرائع" اخلاق کے لحاظ سے ناجائز ——— تم صرف "مقصد پرست" ہو لیکن پھر بھی "ذرائع" کے گھناؤنے پن سے متوحش ——— تم للی کے "مقروض" ہو لیکن ادائیگی سے محترز ——— وہ آج بھی اپنی صبح وشام کو تمہاری یاد پر رائیگاں کر رہی ہے ——— "تمہیں یاد ہو کہ نہ ہو" مگر للی کو آج تک اپنی دوشیزیت کی وہ ساری "غزلیں" یاد ہیں جو تم نے ہی اُسے سکھائی تھیں اُسے معلوم ہے کہ تم نظریات کے انسان ہو ——— علمی آدمی ہو ——— اسلئے خود تمہارے "میدان" میں شکست دیکر وہ اپنے "سوال" کو جائز ثابت کردیتی ہے۔

یہاں تک وہ تھا جو خود تم لکھ چکے ہو۔ اب ذرا سنجیدگی کے ساتھ وہ بھی سن لو جو میرا "مغلس ذہن اور بیمار تخیل" بین السطور میں پڑھ چکا ہے تم للی سے وعدہ کر چکے ہو (ہاتھ پر ہاتھ مار کر) کہ "مجھ سے جو ہوسکے گا اپنی بس بھر کوئی دریغ نہ کرونگا" اس لئے اگر اس کا "سوال" تمہاری سمجھ میں نہیں

بھی آیا تب بھی تم اخلاقی اعتبار سے ایفائے عہد کے پابند ہو چکے ——— پھر اسے بھی چھوڑ دکیونکہ تم شاید اسے بھی ایک خالص "راجپوتی چیز" اور رسمیت کہوگے۔ خود اپنی علمی نظر سے دیکھو — للّی بقول خود ایک خالص انسانی و فطری ضرورت کے لئے تم سے "بچہ" چاہتی ہو اور خود اپنے شوہر کے احکام کی روشنی میں ——— تمہارا ایمان ہو کہ بلند اغراض کے لئے رسمی اخلاقی اصول توڑے جا سکتے ہیں۔ ان حالات کے تحت ایک معمولی دل و دماغ کا انسان بھی یہی استنباط کریگا کہ "تمہارا "پس و پیش" یکسر بزدلی ہو اور تمہیں لازم ہے کہ "اولین فرصت" میں اس فریضۂ انسانی سے سبکدوشی حاصل کرلو۔

——— کس قدر فطری ہو یہ نتیجہ اور کتنا ناگزیر!! ——— مگر لطیف صاحب اگر تم استعجاب نہ کرو تو کہوں کہ یہ نتیجہ ایک حسین منطقی فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اگر تم بے لاگ باتیں سننے کی تاب لاسکتے ہو اور اپنے اس "ناکام رومان" کے علمی تجزیہ و تحلیل کی اجازت دیتے ہو تو سنو۔

تم للّی کے "سوال" کو اخلاقی الٰہیات وغیرہ کی روشنی میں ہی تو دیکھ رہے ہو؟ ——— مگر میں پوچھتا ہوں کہ حضرت ان "لغویات" سے یہ مسئلہ حل ہی کب ہو سکتا ہے؟ فلسفۂ اخلاق ایک "معیاری علم" Normative Science ہے — اس کی روشنی میں صرف اتنا ہی تو بتایا جا سکتا ہے کہ کوئی فعل بحالت موجودہ جائز ہے یا ناجائز — مستحسن ہے یا معیوب — لیکن حسن و قبح کا حکم لگانے سے پہلے اس فعل کی موجودہ حالت کی صداقت بھی تو درکار ہے۔ تم اپنے جدید نظریۂ اخلاق کی رو سے محض اتنا ہی کر سکتے ہو کہ للّی کی استدعا کو جائز یا ناجائز قرار دیدو لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ اس کا مقصد درحقیقت اعلیٰ ہے یا نہیں۔ کیا للّی واقعی صرف بچے کی متمنی ہے؟ ——— کیا یہ واقعہ ہے کہ اسکی التجا شہوانی تحریک کا نتیجہ نہیں؟ تمہاری تمام "اخلاقی عقل و خرد" اس کا جواب نہیں دے سکتی۔ یہ مشکل صرف ایک "مثبت علم" Positive Science کے ناخن تدبیر سے دور ہو سکتی ہے۔ کاش تم کچھ دیر کے لئے اپنی توجہ نفسیات کے مسلمہ قوانین ہی کی طرف مبذول کر سکتے۔ آؤ یہ کام تمہارے لئے میں کردوں۔

تم نے للّی کو "چھوکری" بھی دیکھا اور اسکی کا فروانی بھی" اور تم یہ بھی قسم نہیں کھا سکتے کہ اسکے لئے تمہارے "دل کے کسی گوشہ میں کبھی کوئی جگہ نہیں رہی"۔ لہذا اگر میں کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ جوانی کے ہیجان پرور زمانے میں تمہارے اور للّی کے درمیان "ایک قسم کی محبت" تھی ——— وہی جسے تم نے "پرانی شناسائی" سے تعبیر کیا ہے۔ اسوقت تم دونوں کیا چاہتے تھے؟ ——— تمہاری محبت کی بنیادیں کس چیز پر قائم تھیں؟ ——— اسکی ممکن صورتیں صرف تین ہو سکتی ہیں ——— اول محض شاعرانہ اور رومانوی تحسین حسن کا جذبہ ——— دوئم روحانی لگاؤ ——— سوئم جنسی تعلقات کی تمنا ———

تمہاری محبت شاعرانہ اور رومانوی تحسین کے جذبات پر تو مبنی ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اس صنف کے جذبات رکھنے والے انسان حسن کو پیکر نسوانی تک ہی محدود نہیں رکھتے انکی نظر ایک بھرتی ہوئی ناگن میں بھی وہی جذب و کشش پاتی ہے جو کسی دوشیزہ کی معصوم اور اٹھلاتی ہوئی جوانی میں ——— وہ لوگ اندھیری رات کے تابناک ستاروں سے بھی اتنا ہی کسب کیف کرتے ہیں۔ جتنا کسی انسان کی دو حسین آنکھوں سے ——— وہ صرف حسن کے پرستار ہوتے ہیں، خواہ وہ حسن کہیں ہو۔ اور اسی لئے انہیں ہر ایک "حسین" سے عشق ہو جاتا ہے۔ محبت کی دوسری نوعیت یعنی "روحانی طلب" سے بھی تمہیں کوئی علاقہ نہیں رہا ورنہ تمہاری تحریر میں آج یہ الفاظ نظر نہ آتے کہ "سینما کی ایک چلتی پھرتی چھاؤں تھی تعلیم کے لئے وہ کلکتہ چلی گئی شادی ہوگئی۔ برسوں باہر رہی اور فراموش" ——— روحانی ارتباط بُعد و فاصلے کے اضافے سے ضعیف نہیں ہوتا بلکہ اور زیادہ شدید صورت اختیار کرلیتا ہے ——— لہذا یہ امر ظاہر ہے کہ تمہاری "پرانی شناسائی" جن امیدوں پر قائم تھی وہ صرف لذات جنسی سے متعلق تھیں۔ تمہارا شوق محض جسمانی جنسی اتصال چاہتا تھا ——— شرماؤ نہیں۔ یہ باتیں شرمانے کی نہیں۔ نفسیات کے حقائق ہیں۔ تم نے میری زبان کو اذنِ جنبش دیا ہے تو کھری کھری سننا پڑیگی۔

تمہاری اور للّی کی یہ "تمنا" مناسب تھی یا نامناسب اس سے مجھے سروکار نہیں مگر یہ حقیقت ہو کہ یہ تمنا تشنۂ تکمیل رہی لیکن تم یہ بھی جانتے

ہو کہ انسانی ذہن پر مرتسم ہونے والا حقیر سے حقیر خیال کبھی کبھی محو نہیں ہوتا۔ تمنا اور جنسی تمنا تو پھر ایک بڑی چیز ہے ــــــ نفسیاتی لحاظ سے "تمنا" نام ہے ذہنی قوت کی ایک مخصوص مقدار کے متحرک ہو جانے کا ــــــ اگر خواہش حسب طلب پوری ہو جاتی ہے تو یہ متحرک قوت ختم ہو جاتی ہے مگر ناکامی کی صورت میں یہی قوت "تحت الشعور" ــــ Sub-conscious mind میں مخلوط جذبے ــــ Complex کی صورت میں مستقل طور پر کارفرما رہتی ہے۔ اسلئے یہ امر مسلمہ ہے کہ کوئی خواہش جب تک کسی نہ کسی صورت میں پوری نہیں ہوتی دماغ کے اس حصے میں موجود رہتی ہے جسکا ہمیں کوئی شعور نہیں رہتا۔ ممکن ہے کہ تم اپنی "شناسائی" کو جنسی کشش نہ سمجھتے ہو، یا پھر تم نے زمانۂ فراق میں اسے بھولی ہوئی چیز تصور کرنے لگے ہو مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ "تمنا" تمہارے اور للی دونوں کے تحت الشعور میں مختلف صورت میں موجود رہی ــــــ تم نصف درجن سے زیادہ بچوں کے قبلہ و کعبہ بن چکے ہو اسلئے تمہاری اس "خواہش" کو فراموش ہو جانے کی حد تک مضمحل ہو جانا چاہیئے لیکن للی؟ ــــ اس کا حال تم جانتے ہی ہو تم سے اس نے خود کہا کہ "جیک آٹھ سال سے ایسے ہی ہیں۔ دمہ کے مارے ہوئے۔ اکثر خون بھی تھوکتے ہیں۔ اضمحلال زدہ" ــــ شوہر کی اس ناگفتہ بہ حالت نے للی کی اس پرانی تمنا کو اور زیادہ مشتعل ہی کیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لیڈی ڈاکٹر اور مسز جیک کی حیثیت میں جب للی تم سے ملی تو "بیباکیوں کی ابتدا اسی کی طرف سے ہوئی" اس نے تم سے یہاں تک کہدیا کہ "ہم عورتیں مفت میں بدنام ہیں۔ مرد چنگاری چھوڑیں اور جب آگ اٹھے۔ شعلے بلند ہوں تو کہتے نظر آئیں"۔ تم ایک بڑی حد تک اپنے جذبات کو تسکین دے چکے تھے شاید اسی لئے صرف اتنا کہہ کر رہ گئے کہ "مگر ــــ للی.... پر طبیعت ادھر نہیں آتی"

پس و پیش کے یہ نقطے تمہارے دل کے "چور" کو ظاہر کرتے ہیں۔

لہٰذا غالباً اب یہ تسلیم کر لینا غلط نہ ہوگا کہ للی کی موجودہ خواہش اسی چیز کی دوسری صورت ہے جو تم اور وہ لفظ "شناسائی" سے تعبیر کرتے تھے ــــ یعنی ایک محروم تکمیل شہوانی جذبہ ــــــ للی اور تم اس زمانے میں سوسائٹی اور واقعات سے مجبور ہو گئے ورنہ آج للی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی کہ "اس کا جو وقت تھا۔ میں اس وقت مسلمہ معیار اخلاق پر ثابت قدم رہی" آج وہ پابندیاں دور ہو گئیں اور تحت الشعور کو یہ موقع ملا کہ للی کو اپنی "ناکام تمنا" کی تکمیل کے لئے مصروف عمل کر دے۔

تم دونوں کی فطرت کے اس نفسیاتی تجزیے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اسکے ثبوت میں ایک دو پرلطف باتیں اور سن لو۔ سب سے پہلے تو شاید تمہیں وہ بے اختیار اور غیر متوقع "پیار" یاد ہوگا، جو للی نے تمہاری "کھچڑی موچھوں" پر ثبت کیا تھا۔ دوئم خود تمہاری تحریر کے یہ الفاظ کہ "صاف ستھری تو وہ ہمیشہ سے رہتی ہے۔ آج زریں جارجٹ کی ساری پہنے اور بانکی وضع کے بال سنوارے زیادہ دلکش اور جوان نظر آتی تھی"۔ میں پوچھتا ہوں اگر صرف ولادت وغیرہ کے لئے تمہیں دعوت عمل دیجا رہی تھی تو ان خالص جنسی لوازمات کی کیا ضرورت تھی؟ ــــــ "زریں جارجٹ کی ساری" اور "بانکی وضع کے بال"!!

کیا یہ سارا خصوصی اہتمام اسلئے نہیں تھا کہ منطقی استدلال کے ساتھ ساتھ تمہارے ہوش حواس پر جذبات کی بجلیاں بھی برسائی جائیں؟ ــــــ اور پھر خود "بوسہ" !! ــــ اُف! ــــ میں تو کہتا ہوں اگر تم کو تمہارے نظریہ اخلاق کے ذریعہ بھی شکست نہ دیتی تو صرف یہی ایک بے پناہ جادو تمہیں بجز خموش بنا کر رکھدیتا۔ ممکن ہے کہ تم یا تمہاری للی میری اس تحریر کو ایک صریح بہتان سمجھے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر تم فرائڈ اور یونگ جیسے نفسیاتی محققین سے استصواب کر سکتے اور صرف ایک یہی واقعہ بیان کر دیتے تو تمہیں غالباً وہی جواب ملتا جسے اسوقت میرے قلم سے سنکر تم مجھے "یاس پرست" "مادہ پرست" ــــ Cynic and Materialist کہہ رہے ہو۔ شاید تم للی کے یہ الفاظ پیش کرو کہ "میری خواہش جذبۂ شہوت پر مبنی نہیں"۔ یہ الفاظ حسین ضرور ہیں لیکن ان کا مفہوم جو کچھ واقعی ہے وہ تم خود بھی اب سمجھ گئے ہو گے۔ عورت اکثر زبان دل کے تضاد کی مرکب ہوتی ہے۔ ٹیگور نے اسی لئے کہدیا کہ "جب عورتیں "ہاں" کہتی ہیں تو اُن کا مطلب "نہیں" ہوتا ہے"۔ ایک طرف للی کے اس ادعا کو رکھو اور دوسری طرف نفسیات جنسی کے

ماہر ڈاکٹر شالمی کے یہ الفاظ کہ "جبلتِ جنسی کا حقیقی مقصد انسان کی نگاہوں سے مستور رکھا گیا۔ ایسا غالباً کہیں نہیں ہوتا کہ طرفین کی باہمی محبت یا ہنگامی رغبت افزائش نسل کے باشعور ارادے پر مبنی ہو۔ افعال جنسی کی تمنا اکثر و بیشتر محض شہوانی جذبات کی تسکین کے لئے کی جاتی ہے"۔۔۔۔ گر للّی تم سے جنسی فعل کی متمنی ہے اور محض بچہ کے لئے !! ۔۔۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

یہ ممکن ضرور ہے کہ وہ اپنے جذبات کی نوعیت سے ناآشنا ہو لیکن اصلیت یہی ہے کہ جنسی فعل کو شہوانی لذات کی تمناؤں سے جُدا کرنا بہت دُشوار ہے ۔۔۔۔۔ پھر اگر بُرا نہ مانو تو کہوں کہ تم خود بھی چاہتے یہی ہو اور یہ "چاہنا" بھی اسی قسم کا ہے جسکو نفسیات کے ماہرین صرف تحت الشعور کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ تمہاری ساری تحریر کچھ ایسا ترحم طلب اسلوب رکھتی ہے، جیسے کوئی انسان جرم و قصور کا ارتکاب کرنے سے پہلے اپنی آئندہ حرکات کو سوسائٹی اور اخلاق کے سامنے ناگزیر کہہ کر جائز ثابت کرنا چاہتا ہو۔ تمہارا ایک ایک لفظ شاہد ہے کہ اپنے "پس و پیش" کے باوجود تم پہونچنا چاہتے ہو اُسی نتیجہ پر جسکی طرف للّی شعوری یا غیر شعوری حالت میں جا رہی ہے۔

۔۔۔۔۔اب تھوڑا صرف اشارہ جاتا ہے کہ تمہیں للّی کے ان شہوانی جذبات کا پاس مناسب ہے یا نہیں ۔۔۔۔۔ اس کا جواب تم خود غیر شعوری کیفیت میں یوں دے چکے ہو کہ ۔۔۔۔۔ "ایک معیار اخلاقی معمولی معمولی بہانوں سے جذبات کی بنا پر توڑا نہیں جا سکتا"! تمہارا یہی جملہ ہے جسکے مدنظر مجھے ابتدا میں کہنا پڑا کہ تمہارا ضمیر اور تمہاری فطرتِ سلیم ہنوز تمہاری "علیت و تعقل" کے اثرات سے کسی حد تک آزاد ہے۔

۔۔۔۔۔للّی اور خود اپنی فریب خوردگیوں کو تم بے نقاب دیکھ چکے اب ذرا اپنی بیگم کی صداقت گفتاری بھی دیکھو ۔۔۔۔۔ "جس فعل سے نہ سماج کا فائدہ نہ قدرت کا منشا پورا ہو ۔ صرف ذاتی ہوس ۔ اسکے لئے دوسروں سے اخلاقی قربانی چاہنا خود غرضی اور حماقت ہے"۔

۔۔۔۔۔کہو لطیف، اب تو تم دونوں عورتوں کے خیالات کی حقیقت دیکھ چکے ۔۔۔ اب کیا کہتے ہو ؟ ۔۔۔۔۔ تمہارا عزیز

مسعود جاوید

۔۔۔۔۔

جوابُ الجوابُ

مکرمی عزیز صاحب، تسلیم

آپ حیران ہوں گے کہ یہ کون ہے جو بغیر جانے بوجھے خط لکھنے کو تیار ہوگئی۔ لیجئے بتائے دیتی ہوں تاکہ آپ کی حیرانی دور ہو۔ میں آپکے "ریفارمر" دوست لطیف کی جاہل بیوی ہوں۔ آپ کہیں گے "ہوا کرے مجھے خط لکھنے سے مطلب"! جناب گھبرائیے نہیں مطلب ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔

۔۔۔۔۔سال بھر سے کچھ زیادہ ہوا آپ کا ایک خط، جو لطیف کے نام تھا میری نظر سے گذرا۔ اس خط میں لطیف کا ایک خط بھی نتھی کیا ہوا تھا، جس میں آپ نے جابجا نشان لگائے تھے، آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں چُرا کر اپنے شوہر کے خط پڑھنے کی عادی ہوں۔ محض اتفاق تھا کہ وہ دونوں خط مجھے نظر پڑ گئے۔ اور ایک دفعہ شروع کرنیکے بعد ان کا بے پڑھے چھوڑنا بہت مشکل تھا کیونکہ بڑے دلچسپ تھے۔ اگر یہ اخلاقی گناہ تھا تو بے شک میں نے یہ گناہ کیا۔ خدا معاف کرے۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ آپ کا اور لطیف کا خط پڑھنے کے بعد مجھے ہنسی آگئی تعجب نہ کیجئے میں واقعی ہنسی تھی۔ لطیف کا یہ فقرہ میں بیگم سے کوئی بات نہیں چھپاتا ایک حد تک ضرور درست تھا۔ لیکن اسکے ساتھ کی عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ مرد جب یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ میری بیوی میری رازدار ہے، جب بھی وہ بہت کچھ اپنے دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ مگر عورت کی فطرت اسکے برعکس ہے، وہ شوہر کے آگے اپنا دل کھول کر رکھدیتی ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے ان دونوں کی "دیرینہ محبت" کا حال پڑھکر کوئی خاص تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ جب لطیف نے مجھ سے یہ باتیں کہیں تھیں اس وقت مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ چھپا رہے ہیں اور ایک "شوہر شناس" بیوی کے لئے یہ اندازہ لگانا کہ وہ کیا بات ہے، چنداں مشکل نہ تھا۔

میں ہنسی اس لئے کہ مجھے "جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے" والی مثل یاد آگئی۔ اور اس پر بھی ہنسی آئی کہ مرد اپنی حیوانیت کو کس کس طرح کے پردوں میں چھپانا جانتا ہے یا چھپانا چاہتا ہے۔ "مذہبی رواداری اور بلند نظری کے پرچار کا غلاف" ہے تو خوش نما اکثر لوگ دھوکہ کھا سکتے ہیں۔

جب سے لطیف نے مجھ سے للی کا قصہ بیان کیا تھا میں بہت رنجیدہ تھی "سوت" کے روح فرسا خیال سے نہیں، کیونکہ کم از کم مجھ میں حسد کا مادہ نہیں ہے، ہاں ہندوستانی عورت کی پستی کے خیال سے میرا دل بحرِ غم میں ڈوب جاتا ہے۔ عزیز صاحب مجھے اس صاف گوئی پر معاف کیجئے گا مگر میرا خیال تو یہی ہے کہ مرد، ہر قوم، ہر مذہب اور ہر ملک کا (مستثنیات کو چھوڑ کر) جذبات پرست ہوتا ہے۔ مجھے لطیف کا حال سن کر افسوس تو ضرور ہوا مگر رنج نہیں ہوا۔ ہاں رنج ہوا سخت اور دلی رنج ہوا للی کی حرکت کا اور اس کی بے حیائی اور بے وفائی کا۔

اب تک کبھی بھی ہندوستانی عورت (کم از کم کسی شریف "ہندوستانی عورت" کے متعلق خواہ وہ کسی مذہب اور کسی قوم کی ہو اس قسم کی رکیک بات دیکھیا اور سنا تو کیا کہیں قصے کہانی میں پڑھی بھی نہیں تھی۔ جناب کیا آپ اسے مانیں گے یہ سب برکت انگریزی تہذیب اور معاشرت کی ہے کہ ہندوستانی اس تہذیب کے صدقے میں اپنے مذہب اور اپنی معاشرت سے بیگانہ تو ہو ہی رہے تھے اب انسانیت سے بھی خارج ہونے لگے۔

مردوں سے تو مدت ہوئی ہاتھ دھو چکے تھے مگر اب تو دل میں یہ ٹیس ہے کہ ہندوستانی عورت، وہ عورت جسکی وفا کے افسانے تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ جو اپنے شوہر کی لاش کے کیساتھ زندہ جل جانا خوشی سے منظور کرتی تھی، جو اب بھی شوہر کے بعد اپنا عیش و آرام کھانا پینا ہنسنا بولنا تک چھوڑ دیتی ہے، جو شرع سے اجازت ہونیکے باوجود دوسری شادی کا خیال کرنا بھی حرام سمجھتی ہے، جو شوہر کی زندگی میں اس کے ہر ظلم و سختی کو "سرِ تسلیم" جھکا کر قبول کرتی ہے (تعجب کیجئے اور نہ یہ سمجھئے کہ میں محض شاعری کر رہی ہوں۔ اب بھی ایک دو نہیں۔ سینکڑوں ہزاروں مثالیں آپ کو اس کی ملیں گی۔ ہاں اب آپ لوگوں کی عنایت سے للی جیسی عورتیں ہونے لگیں تو اگلی نسل ان اوصاف سے خالی ہوگی) اتنی گر جائے؟ ایسی ذلیل ہوجائے۔ للی کی اس حرکت سے نہ صرف وہی ذلیل ہوئی۔ بلکہ اس نے ہندوستانی عورت کے باوفا نام پر دھبہ لگادیا۔ جس کا داغ چھٹنا بہت مشکل ہے، اور جب آپ جیسے لوگ اسکی کمر سہلائیں گے تو کیوں اور انگریزی تہذیب کی دلدادہ لڑکیاں اسکی تقلید کو برا سمجھیں گی۔

مجھے تعجب اور سخت تعجب اس بات پر ہوا کہ آپ جیسا شخص جس کو اب تک میں (مضمون اور قصوں میں پڑھکر) بہترین خیالات کا شخص

سمجھتی تھی، ایسی بات کہے جسے کوئی شریف شخص ہرگز زبان سے نہیں نکال سکتا۔ معاف کیجئے۔ یہی میں نے لطیف سے کہا تھا اور یہی آپ سے پوچھتی ہوں کہ آپ لوگ اگر مسٹر باسو کی سی حالت میں ہوں تو آپ اس فعل کو گوارا کرینگے؟ اگر آپ اس کے جواب میں "ہاں" کہیں تو میں سوائے اسکے کہ انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھکر خاموش ہو جاؤں اور کیا کہہ سکتی ہوں۔

میرا خیال تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا کر لطیف کو راہ پر لے آؤنگی اور اس فعل قبیح سے باز رکھ سکونگی مگر یہ آپ کے "ناصحانہ" خط کا اثر تھا کہ میری کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی، میری کوئی بات لطیف نے نہ سنی اور آپ کی "نصیحت" کو بدل و جان قبول کیا۔

کیا آپ اپنے اس ڈرامے کا آخری سین دیکھنا پسند نہ کرینگے؟

تین مہینے کے قریب ہوئے للی کے ایک لڑکی پیدا ہوئی ہے جو سنتی ہوں کہ ہو بہو لطیف کی شکل ہے۔

مسٹر باسو باوجود اپنی پرانی منطق کے اس صدمے کو برداشت نہ کرسکے انہوں نے جب یہ سنا تھا کہ للی کے بچہ ہونیوالا ہے تو بہت خوش ہوئے۔ للی کی ہردم دلداری کرتے اور نہ جانے کبھی سنتی ہوں پہلے سے زیادہ کرنے لگے تھے۔ ان کی صحت بھی "جائداد کے وارث" کے آنیکی خوشخبری سے بہت سنبھل گئی تھی مگر جب بچی اس بدکردار دنیا میں وارد ہوئی اور ڈاکٹرنی نے لیجا کر اسکی صورت اس ضعیف باپ کو دکھائی تو معلوم ہے کیا ہوا؟

بچی پر نظر پڑتے ہی انہوں نے ایک دردناک چیخ ماری اور لطیف کا نام تین بار بھیانک آواز میں انکے منہ سے نکلا اور وہ غش کھا کر گر پڑے۔ انھوں نے بے غیرت بننے کی کوشش کی تھی، مگر اس میں ناکامیاب ہوئے۔ آٹھ دن تک اپنے پرانے مرض میں مبتلا رہ کر وہ اس "بے حیائی" اور "بے وفائی" کے داغ کو دل پر لے کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ہر شخص لطیف پر انگلیاں اٹھاتا تھا۔ اور انہیں بقول خود زندگی دشوار ہو گئی، ساری منطق دھری رہ گئی اور اس افسانے کو تکمیل کو پہونچانے کے لئے "مجبور ہو کر" کل انکی اور مسز باسو کی "شادی خانہ آبادی" انجام پائی ہے۔

عزیز صاحب براہ مہربانی مجھے اتنا بتا دیجئے کہ اس بدنصیب لڑکی کا (جس کی حقیقت سے ہر کوئی واقف ہے) جو لطیف، للی، باسو اور خاص کر آپ کے ظلم کا نتیجہ ہے کیا انجام ہوگا؟؟

مسز لطیف

"ایک خاتون"

اکیلی قبر کا راز

سخت گرمیوں کا زمانہ تھا ۔ میں تفریح کی غرض سے اپنے ایک عزیز، حاجی صاحب کے ساتھ، اُنکے دیہی مکان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ مقام بلدہ سے کوئی پچیس تیس میل کے فاصلے پر ہوگا۔ یہاں حاجی صاحب کا ایک مقطعہ اور کئی وسیع زمینات تھیں، وہ فرصت کے دنوں میں عموماً یہیں رہا کرتے تھے ۔ یہاں زمینات کے علاوہ انکی کئی مقامی دلچسپیاں بھی تھیں ۔ ان کی باتونی اور ملنسار طبیعت کی وجہ سے، اطراف کے لوگ انکے گہرے ملاقاتی اور دوست ہوگئے تھے ۔

ہم ہر روز صبح اُٹھ کر، چہل قدمی کے لئے، دور جنگل کی طرف نکل جایا کرتے ۔ ایک روز جب ہم اس بیابان گردی سے واپس ہو رہے تھے، راستہ کے کنارے ایک قبر نظر پڑی ۔ یہ بہت معمولی اور کچی قبر تھی ۔ لیکن اسکے اطراف دور تک کسی اور قبر کا نام و نشان تک نہیں تھا ۔ اس بے موقع قبر کو دیکھکر مجھے کچھ تعجب ہوا ۔ میں اسکی بے کسی پر دل ہی دل میں غور کرتا چلا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب اپنی بصیرت کی وجہ سے میری خاموشی کی وجہ تاڑ گئے اور عین قبر کے مقابل پہنچ کر رُک کے، اور فرمانے لگے ۔ " آپ کو یہ قبر شاید کچھ بے موقع نظر آ رہی ہے ....." میں نے کہا " حاجی صاحب! کیا دل کی بات پہچانی ہے ۔ ہونا آخر روشن ضمیر...... " حاجی صاحب ایک فاتحانہ انداز سے فرمانے لگے " عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں " ۔ میں نے کہا ۔ " آخر فرمایئے تو سہی، معاملہ کیا ہے؟ ۔ "

اس پر حاجی صاحب نے جیب سے بٹوا نکالا اور پان چباتے ہوئے ایک واقف کار انہ گر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے ۔ " ابھی نہیں۔ اس وقت تو بھوک لگی ہے۔ گھر چل کر ناشتے سے فارغ ہو لو پھر واقعہ سننے میں لطف آئیگا ۔ "

میں خاموش ہو رہا ۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ حاجی صاحب کو خود کہنے کا شوق ہے ۔ میرے پوچھے بغیر بھی وہ سب کچھ، بلکہ ضرورت سے زیادہ ہی بتا دیں گے ۔

میرا قیاس غلط نہیں تھا۔ ہم ناشتے سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ حاجی صاحب نے خود چھیڑا ۔ " کہیئے اس اکیلی قبر کے متعلق کوئی قصہ گھڑا یا نہیں ... "

میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر جواب دیا ۔ " حاجی صاحب! آپ کو خوب یاد آیا لیکن واقعات تو آپکے دماغ میں ہیں ۔ قصہ میں کیسے گھڑ سکتا ہوں "

چا کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے " تو کہو ۔ سُنتے ہو ۔ "

میں نے کہا ۔ " سنونگا کیوں نہیں، اور پھر آپ کی زبان مبارک سے ۔ اگر کوئی دلچسپ واقعہ ہو تو ضرور فرمایئے "

" دلچسپی کی بھی ایک ہی رہی " حاجی صاحب نے زہر خند کرتے ہوئے فرمایا ۔ " تمہارے تمام افسانوں سے بڑھ جائے تو میرا ذمہ ۔ جانتے ہو، کس کی قبر ہے ...... "

میں نے کہا " یہی جانتا ہوتا تو پھر آپ کو کہنے کا کہاں موقع رہتا "

بگڑ کر فرمانے لگے ۔ " پھر وہی تمسخر چلے ...... "

میں نے سوچا کہ کہیں بات بڑھ جائے۔ اور قصہ دو چار روز کے پھیر میں نہ پڑ جائے۔ معذرت چاہی ۔" میرا کوئی خاص منشا نہ تھا۔ معاف فرمائیے۔ آپ کی باتوں میں لطف آتا ہے "

حاجی صاحب نے میری معذرت کو شرف قبولیت بخشا، اور پان چباتے ہوئے فرمانے لگے " عظم علی خاں کو جانتے ہو؟"

میں نے کہا " نام سنا ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کا ایک مشہور باغ ہے۔ جو یہیں کہیں آپکی زمینات سے قریب ہے "

اس پر حاجی صاحب خطیبانہ انداز میں فرمانے لگے ۔" آج کل انگریزی خوان، نوجوان، نپولین اور ہٹلر اور مسولینی کے کارناموں کو تو ورد زبان رکھتے ہیں لیکن ناواقف ہیں تو اپنے باپ دادا کے وطن کے مشاہیر سے ......"

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ۔" اور جانئے کیونکر، جب آپ جیسے بزرگان ملت ہی ان کو معلوم کرانے میں تساہل برتتے ہیں "

حاجی صاحب پھر بگڑ گئے اور کہنے لگے " اس تھوڑے سے عرصہ میں، یہ دوسرا شخصی حملہ ہے۔ میں نے عرض کیا " آپ خواہ مخواہ خفا ہورہے ہیں ایسی تو کوئی بات نہیں تھی ...... اچھا تو، عظم علی خاں ہمارے وطن کے مشاہیر میں سے تھے۔ پھر تو مجھ پر ان کا جاننا اور آپ کا کہنا فرض ہوگیا۔

"ہاں جی بڑا آدمی تھا۔ اب ویسے لوگ پیدا ہی نہیں ہونگے۔ بڑا جری اور ذکی انسان تھا بگر تھا بڑا اکھڑ پٹھان۔ یہاں سے کوئی میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ان کا مشہور باغ ہے کسی زمانے میں وہ شاید ہندوستان کے منتخب باغوں میں ہوگا، اس باغ میں کیا نہیں تھا! ہر طرح کے دیسی اور ولایتی میوؤں سے لدے ہوئے درخت اور روشیں، نہریں۔ غرض باغ کیا اس نواح کی جنت تھی۔ انہیں باغبانی سے بڑی دلچسپی تھی۔ دور دراز سے میوے کے درخت منگاکر یہاں لگائے گئے تھے، سیب، ناشپاتی، امرود، کیلہ، سنترے، لیموں، اور خاص طور پر چینی لیموں، ناریل، چھالیہ، حتیٰ کے بانس بھی جو یہاں پیدا ہوتے تھے میں نے اور کہیں نہیں دیکھے۔ پھولوں میں گلاب، سیوتی، موگرا، چنبیلی، ارغواں، موتیا، غرض سب ہی طرح کے پھولوں کے یہاں بیشما درخت تھے۔ آم کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ بہترین آم پیدا کرنے میں یہ باغ اپنی آپ نظیر تھا۔ معلوم نہیں کہاں کہاں سے بہترین انواع کے درخت منگاکر یہاں لگائے گئے تھے خود عظم علی خاں نے مختلف الانواع کے میل سے نئی نئی قسم کے آم پیدا کئے تھے، جن میں "عظم الثمر" شاید دنیا کا بہترین آم ہوگا۔ کیا آپنے یہ نام بھی نہیں سنا؟ ہم کو یہ آم کھانیکا اتفاق ہوا ہے۔ آم کیا تھا، بہشت کا بہترین میوہ بھی اس پر فوقیت نہیں رکھتا ہوگا ......"

میں نے قطع کلام کیا ۔" معاف کیجئے ۔ یہ کفر و الحاد کے کلمے ہیں جو آپکی زبان سے نکل رہے ہیں " حاجی صاحب ذرا ترش رو ہو کر فرمانے لگے ۔

" یہ تو تمہارے سمجھانیکے لئے تھا " مقصد ہے ناز و غمزہ " والی بات ہے۔ سچ کہوں "عظم الثمر" کے بعد آم کھانے کو طبیعت ہی نہیں چاہتی۔ تم اسکا مزہ کیا جانو ۔ ع ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں "

میں نے پھر ٹوکا " اس تھوڑی سی دیر میں، یہ دوسرا کفر و الحاد کا کلمہ ہے "

" اب تم بات بات پر زبان پکڑنے لگو تو میں کہہ چکا، تم سن چکے۔ ارے میاں یہ تو میں تمہارے قصے کے لطف کے لئے نمک مرچ لگا رہا ہوں! اچھا تو سنو باغ کیا تھا پورا نہاتی چمن تھا، لیکن اب وہاں کیا خاک دھرا ہے۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے ......"

"جب آتش جوان تھا" کیوں حاجی صاحب میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا ۔

" ہاں جی، جب کہ ہمارا آتش، یعنے عظم علی خاں جوان تھا، یعنے اپنے عروج پر تھا۔ والد قبلہ نے ان کے عروج کا زمانہ دیکھا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ بڑا ہی خوبصورت پٹھان بچہ تھا۔ جرات اور ہمت کا یہ حال تھا کہ اکیلا ایک گاؤں کیا بلکہ ایک شہر پر بھاری تھا۔ ایک آج کل کے نوجوان ہیں۔ انہیں اپنی لنگی، چوٹی، کاجل مسی سے کہاں فرصت ......"

مجھے موقع مل گیا۔ میں جانتا تھا کہ حاجی صاحب کا طوفان سیل اب رُکنے والا نہیں ہے۔ ابرو پر بل ڈال کر کہا "یہ آپ کا پہلا شخصی حملہ ہے!" حاجی صاحب چکرائے۔ پان کا بٹوا میری طرف بڑھا کر فرمایا "لو پان کھاؤ، غصہ تھوک دو۔ ع روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ" مشہور ہے کہ سپاہیوں کا ذوق ادنیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بے راہ رو مذاق کا شگوفہ ہے جس اقلیدس کے خطوط میں حُسن نظر آتا ہے۔ کیا ہیں تمہارے موجودہ مکان، سوائے اقلیدس کی شکلوں کے؟ اعظم علی خاں کے مکان کو دیکھو تو ایک سپاہی کے ذوق کا صحیح پتہ چلے گا۔ مکان کیا ہے، ایک اچھا خاصا محل ہے۔ کیا انھیں نقشہ ہے۔ کیسے کیسے دلکش گوشے نکالے ہیں، محل، دفتر، مہمان خانہ، اصطبل، سرداب، جو زیر زمین راستوں سے ملے ہوئے ہیں۔ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ راستے مختلف سمتوں میں، دور تک چلے گئے ہیں۔ اور گھنے جنگلوں میں نکلتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اعظم علی خاں کی ذکاوت ایک بڑے مدبر کی ذکاوت تھی اور ان کا زمانہ گویا حیدرآباد کے قرون وسطیٰ کا آخری زمانہ تھا۔ ان کا باغ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپی سورماؤں کی طرز کا ایک مضبوط قلعہ تھا۔ انکی طبیعت کی وسعت پذیری کے لئے، بلدہ کچھ موزوں مقام نہیں تھا، اسی لئے وہ جلد یہاں اس طرف چلے آئے، اور حقیقی معنوں میں راج کرتے رہے۔

ان کے پاس منتخب جاں بازوں کی ایک جماعت تھی۔ جو نہ صرف انکے کام آتی۔ بلکہ غریب اور مظلوم کسانوں اور زمینداروں کی مدد اور دستگیری کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ ذی اثر زمیندار، چھوٹے چھوٹے مزارعین کی زمینات پر قبضہ کرنے کی ہمیشہ تاک میں رہتے ہیں۔ جہاں کسی مظلوم نے خان کا در کھٹکھٹایا، یہ اپنے سورماؤں کے ساتھ آن کی آن میں، غاصب کے سر پر نازل ہو گئے کس کی مجال تھی جو بپھرے ہوئے شیر سے پنجہ کشی کر کے۔ بسااوقات غاصب کو خود اپنی زمینات سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے تھے، اور وہ مظلوم کے حوالے کردی جاتیں۔ یہ حقیقت میں حیدرآباد کا "رابن ہڈ" تھا۔

اعظم علی خاں کی دولت کے بڑے قصے مشہور ہیں۔ ان کے والد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ "روپیہ کی تجارت" کرتے تھے۔ اصل میں اعظم علی خاں کی دولت کا بڑا حصہ اُن کے والد ہی کا کمایا ہوا تھا۔ بڑے میاں کی عادت تھی کہ صبح اُٹھ کر آسامیوں سے رقومات وصول کرنے بیٹھ جاتے، اور جب تک پچیس تیس ہزار اُن کی تجوری میں نہ پڑ جاتے، کھانے کا ایک دانہ ان کے منہ میں نہ پڑتا جس روز اتنی رقم جمع نہ ہوتی، سمجھ لیجئے کہ ان پر کھانا حرام تھا لیکن خدا بڑا رزاق ہے۔ انکو شاید ہی کبھی بھوکا رہنا پڑا ہوگا۔

سپوت بیٹے نے باپ کی دولت میں اضافہ ہی کیا۔ حالانکہ وہ پرلے درجے کے مُسرف بھی تھے۔ ہر چیز میں نوابی، بلکہ شاہانہ ٹھاٹ تھا۔ ان کی لکھ لُٹ دلچسپیوں کے بے شمار قصے مشہور ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ بمبئی سے واپس ہو رہے تھے۔ ریل کے جس ڈبے میں یہ بیٹھے ہوئے تھے، اس میں دو انگریز، اور دو ہندوستانی مسافر اور بھی تھے۔ راستے میں، ان کی چائے کا وقت آگیا۔ ملازم نے اطلاع دی کہ آگ جلانیکا کوئی سامان نہیں ہے، اشیا اُن کے ساتھ ہوتی تھیں صرف پانی گرم کرنے کی ضرورت تھی۔ خان صاحب انتظار کو کسر شان سمجھتے تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ جیبیں ٹٹولیں۔ آخر نوٹوں کا ایک بنڈل جیب سے نکال کر ملازم کے حوالے کیا۔ اور حکم ہوا ان کو جلا کر چائے تیار کی جائے"

مجھ سے رہا نہ گیا پھر بات کاٹ کر کہا "کیا حماقت تھی..... اس میں کونسی خوبی کی بات ہے"

اس پر حاجی صاحب ذرا جوش میں آکر فرمانے لگے "اب آپ ان انگریزوں کی طرح، اسکو حماقت سمجھئے، یا بے وقوفی۔ بڑے آدمیوں کی حماقتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ انکی ایک سیرت ہوتی ہے، انکی ایک وضع داری ہوتی ہے۔ جس کو وہ ہر قیمت کے معاوضے میں خریدنے پر تیار رہتے ہیں۔ انگریز سوداگر بچے اس راز کو کیا جان سکتے تھے۔ لیکن ہندوستانی مسافروں کا اسمیں فائدہ ہی ہوا، ان کو جب معلوم ہوا کہ یہ ایک حیدرآبادی شخص

ہیں، تو وہ، حیدرآباد کی دولت سے ایسے مرعوب ہوئے، کہ چوکڑی بھول گئے۔ اور بجائے منزل مقصود کے، حیدرآباد ہی کو منزل مقصود قرار دے لیا، اور قسمت آزمائی کے لئے سیدھے حیدرآباد چلے آئے۔

لیکن یہ سب اُس زمانے کی باتیں ہیں جب ہماری دولت ہمارے ہاتھ میں تھی۔ اب ایسے دل گردہ رکھنے والے کہاں پیدا ہوتے ہیں!۔

ایک اور واقعہ سنیئے۔ یہ خود ان کے ملازم نے والد سے بیان کیا تھا۔ خان صاحب دسترخوان پر بیٹھے تھے، ملازم نے دیکھا کہ کانچ کا گلاس کچھ میلا ہے وہ ڈرا کہ کہیں، اس کی پاداش میں جان ہی سے ہاتھ دھونا نہ پڑے۔

خان صاحب کی نظر بچا کر، گلاس اُٹھایا، اور آڑ میں جاکر اُسے صاف کرنے لگا لیکن خوف زدہ بے حد تھا جلدی میں گلاس ہاتھ سے چھوٹ گیا اور چھن سے پتھر پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ ابھی گلاس کے ٹکڑوں کی جھنجھناہٹ ختم نہیں ہوئی تھی کہ اُدھر سے خان صاحب نے آواز دی۔ ملازم، غریب کا خون خشک ہوگیا اور اپنے اگلے پچھلے گناہوں کو یاد کرتا اور توبہ استغفار کرتا ہوا خان صاحب کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا، جب وہ خان صاحب کے سامنے پہونچا تو خان صاحب نے اسکی ہیئت کذائی کو سر سے پیر تک بغور دیکھا، پھر فرمایا۔ "میز خانے میں کتنے گلاس ہیں؟"

"مالک! مجھے معلوم نہیں، آٹھ دس درجن ہونگے۔" وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"اچھا اسی وقت جا، اور جتنے گلاس موجود ہوں، سب لے آ۔"

اس انوکھے حکم کی تعمیل کے لئے وہ امید اور بیم کی حالت میں گیا اور تھوڑی دیر میں دو تین ٹوکروں میں گلاس بھر کرلے آیا۔

خان صاحب نے فرمایا۔ "یہ گلاس لے، اور وہ گلاس جہاں گرا تھا وہیں پر ایک ایک گراتا جا۔"

ملازم کے اور بھی حواس باختہ ہوگئے۔ وہ سمجھا کہ یہ تعزیر کا کوئی نرالا ڈھنگ نکالا گیا ہے۔ لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات۔ یا حافظ و یا ناصر پڑھتا ہوا، گلاسوں کے ٹوکرے اُٹھا، اسی مقام پر جاکر، ایک گلاس اُٹھانے اور چھوڑنے لگا۔ خان صاحب بُت بنے بیٹھے تھے۔ اور ادھر "چھن چھنا چھن چھن چھنا چھن چھن"، کی زیر و بم کی آوازیں مسلسل اُٹھ رہی تھیں۔ کوئی گھنٹہ بھر میں یہ شغل نادر ختم ہوا۔ اور ملازم ہاتھ پونچھتا ہوا مجرم کی صورت بنائے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ خان صاحب نے منہ پھیرتے ہوئے فرمایا "اوہوں۔ وہ پہلی بات ہی اور تھی۔"

خان کی اس ذہنیت کو سمجھنے سے لوگ آج تک قاصر ہے۔ ممکن ہو کہ یہ نشۂ دولت اور کامرانی کی بدمستی ہو۔ لیکن یہ انکی ایک مخصوص سیرت تھی وہ ازمنۂ وسطیٰ کی امارت کا مکمل اور مجسم نمونہ تھے، اور انکے عیوب اس سیرت کا لازمی نتیجہ۔

وہ بیک وقت تنگ دل بھی تھے اور فراخ حوصلہ بھی۔ انکی سزاؤں کا ذکر سُن کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ لیکن انکی ہمدردیوں کا حال معلوم کرکے، اُنکے لئے دل میں ایک بلند جگہ پیدا ہوجاتی ہے۔ اُنکے باغ کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اس پر انکی شخصی نگرانی تھی۔ ہر روز، نماز صبح سے فارغ ہوکر وہ باغ میں چہل قدمی کرنے نکل جاتے۔ اور ایک تیز نظر جنرل کی طرح درختوں کی قطاروں کو بغور دیکھتے گذر جاتے۔ ان کے دونوں ہاتھ پیچھے کو بندھے ہوئے ہوتے، اور ایک بھری ہوئی دونالی بندوق اس طرح پکڑے ہوئے ہوتے کہ اسکی نالیں زمین کی طرف جھکی رہتیں۔ ثمردار باغ پر چوروں کی نظریں ہمیشہ لگی رہتی ہیں۔ خاص طور پر پارڈی قوم کے افراد، ادنےٰ سے ادنےٰ پھل کو بھی چرانے سے نہیں چُوکتے۔ خان صاحب کو یہ چیز سخت ناپسند تھی۔ یوں مانگو تو وہ باغ کا سارا ثمرہ مفت دینے کو تیار تھے۔ لیکن اپنے باغ سے ایک ذرا سا پھل بھی چوری جاتا تو وہ، اس کو اپنی ہتک سمجھتے تھے چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ اندھیرے اندھیرے کوئی اُچکا پھل چُراتا نظر پڑ گیا۔ اور اُنہوں نے بغیر کچھ پوچھ گچھ کئے، دن سے اس پر گولی داغ دی۔ وہ سرد ہوکر گر پڑا اور یہ خاموشی سے ٹہلتے ہوئے، آگے چل دیئے۔ ان کی اس عادت سے دور دور تک لوگ واقف تھے۔ پھر بھی چوری کی فطرت خوف و ہراس پر غالب

ہی رہتی ہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ خان صاحب حسبِ عادت ٹہلنے کیلئے نکلے تھے۔ ایک گوشہ سے پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی۔ یہ ابھی پوری طرح تمیز نہ کرسکے تھے کہ چور کی نظر ان پر پڑی۔ اسکے ہاتھ پاؤں سُن ہوگئے اور وہ چکراکر، درخت سے گرا تو خاں صاحب کے قدموں کے پاس بیہوش تھا۔ خان صاحب نے بندوق پھینکدی اور خود آپ ہی اسے اُٹھاکر مہمان خانے تک لے گئے۔ یہاں اُسے نہایت آرام سے لٹاکر نگہبانی کرتے رہے کوئی گھنٹہ بھر کے بعد جب اس نے آنکھ کھولی، تو انکی صورت دیکھتے ہی بے تحاشہ اُٹھکر بھاگنا چاہا لیکن پاؤں لڑکھڑا گئے اور پھر دھڑام سے گرپڑا۔ خان نے اسے دلاسا دیا۔ اور جب اسکی حالت سنبھل گئی تو جس قدر میوہ، اس روز باغ سے جمع ہوا تھا، سب ٹوکروں میں بھرکر اسکے حوالے کیا اور اپنے مالیوں کو اسکے گھر تک پہونچانے کی تاکید کی۔ جب وہ جانے لگا تو خان صاحب نے نہایت ملامت سے فرمایا۔

"اب زندگی بھر کبھی اس طرف رُخ نہ کرنا" وہ شرم سے سر جھکائے سامنے سے چلا گیا۔

اعظم علی خان نے ایک بازار بھی بسایا تھا جس میں مزارعین کیلئے ہر ممکنہ آرام مہیا کیا گیا تھا۔ سڑک کی دونوں جانب میلوں تک گھنے آم کے درخت لگا دئے تھے، تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کنوئیں کھدوائے گئے تھے۔ ایک بڑا گودام بنایا گیا تھا۔ جہاں خرید و فروخت سے بچا ہوا مال آئندہ بازار کے لئے امانت رکھا جا سکتا تھا اسمیں حد درجے کی امانت داری برتی جاتی تھی کسی کی مجال نہ تھی کہ ایک دانہ بھی اِدھر اُدھر کرسکے۔ یہ بازار ایسا مقبول ہوا کہ دور دراز مقامات سے مزارعین اپنی پیداوار یہیں لے کر آتے تھے۔ یہاں کسی چیز کے گم ہوجانیکا اندیشہ بھی نہ تھا۔ قانون خود خان صاحب کے ہاتھ میں تھا کسی نے ایک پائی چرائی یا دھوکے سے کچھ حاصل کیا تو پھر سمجھ لیجئے کہ وہ تعزیر میں پھنس گیا، اسکی سزا دونوں ہاتھ کاٹنے سے کم نہ ہوتی تھی۔ اس تعزیر کا یہ اثر تھا کہ اگر کوئی ایک پائی بھی بازار میں بھول کر جاتا تو جب تک دوسرے دن بازار میں خود آکر نہ اٹھاتا، کوئی اسکو ہاتھ لگانے کا روادار بھی نہ ہوتا تھا۔ یہ بازار آج تک برابر قائم ہے اسمیں کچھ شبہ ہو تو چل کر دیکھ لو، پوچھ لو، ہر طرح آزمالو۔ گو اب اعظم علی خاں نہیں ہیں، لیکن ان کے جاری ہوئے نقشے کا اثر اب تک باقی ہے"۔

میں نے کہا "یہ سب کچھ ہوا لیکن قبر کا راز اب تک لاینحل ہے"۔

حاجی صاحب ایک تمسخر آمیز تبسم کے ساتھ فرمانے لگے۔

"ارے نہیں سمجھے! تم بھی بڑے بھولے آدمی ہو۔ ابھی تک نہیں سمجھے؟ قربان جیئے آپکی فہم و فراست کے۔ پوری رام کہانی سنی پھر پوچھتے ہیں سیتا مرد تھا یا عورت تھی۔ اسی سمجھ بوجھ کے بل بوتے پر افسانہ لکھنے چلے ہیں۔ ارے میاں یہ قبر اعظم علی کے سوا اور کس کی ہوسکتی ہے؟"

میں نے عرض کیا "میری موٹی عقل کے لئے یہ نتیجہ اس قدر آسان نہیں ہے۔ صاف صاف فرمائیے۔ آخر اس با عظمت ہستی پر ایسی کیا آفت پڑی کہ انکی قبر اس کس مپرسی کی حالت میں، اس ویرانے میں بنائی گئی"۔

"یہ بھی خان صاحب کی انوکھی ذہنیت کا نتیجہ تہا۔ ان کی قبر یہاں انکی وصیت کی تعمیل میں بنائی گئی ہے۔ انکی تاکید تھی کہ انکی قبر اسی مقام پر بنائی جائے جہاں ان کا انتقال ہوا۔ ایک روز وہ گھوڑے پر ادھر سے گذر رہے تھے، ان کے کسی دشمن نے، درختوں کی آڑ میں چھپ کر ان پر گولی چلادی۔ اور وہ اسی مقام پر گرے اور جاں بحق ہوئے"

میں نے جب یہ قصہ پورا سُن لیا تو حاجی صاحب سے وعدہ کرلیا تہا کہ اسکو اعظم علی خاں اور انکی، دونوں کی یادگار کے طور پر لکھوں گا۔ اسلئے قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اس قصے کو پڑھکر اس کا ثواب خان صاحب کے ساتھ حاجی صاحب کی روح پُر فتوح کو بھی بخشیں۔ کیونکہ میرے اور ان کے لئے اس قصے کے حقیقی مصنف حاجی صاحب ہی ہیں۔

عبد القادر سروری
ایم۔ اے

تجلّیات

مجھ پر وہ بزمِ غیر میں نامہرباں نہیں ۔ منظور اُن کو آج مرا امتحاں نہیں

نازو نیازِ عشق کوئی درمیاں نہیں ۔ پھر بھی جبینِ شوق ترا آستاں نہیں

تجھکو بصد حجاب بھی دیکھا ہے بے حجاب ۔ میں اور کامیابِ تماشا کہاں نہیں

صیّاد یہ تمام تصوّر کے تھے فریب ۔ ہر شاخِ گُل پہ ورنہ مرا آشیاں نہیں

پھر ہے بہارِ گُل میں نمایاں کہ میں ابھی ۔ دیوانگی میں خار سے دامن کشاں نہیں

اِک مرگِ ناگہاں ہے مجھے ہر نفس مگر ۔ یہ زندگی بھی زندگیِ جاوداں نہیں

میں خود شناس ہوں مجھے کیا پائیگا کوئی ۔ یہ راز ہے کہ میرا کوئی رازداں نہیں

میرے لیے ہے ذوقِ تماشا حجابِ دوست ۔ ورنہ بجز نگاہ کوئی درمیاں نہیں

محرومِ التفاتِ بہارِ چمن ہوں میں ۔ ایّامِ گُل ہیں اور غمِ آشیاں نہیں

پُر شوق اُنکی سمت نگاہیں ہیں بار بار ۔ کیونکر یقین آئے کہ وہ بدگماں نہیں

وہ کر رہے ہیں پرسشِ احوال اور میں ۔ اس طرح چپ ہوں جیسے کہ منہ میں زباں نہیں

تابش سراغِ منزلِ ہستی بتائے کون؟ ۔ اب گردِ کارواں بھی پسِ کارواں نہیں

تابش دہلوی

مجبوری یا ایثار؟

۱

"شانو کچھ اور سُنا"
"کیا؟"
"رفیعہ کا خط آیا ہے۔ نجمہ بہت بیمار ہے"
"کون نجمہ؟"
"تم نجمہ کو نہیں جانتی؟ نواب کمال جنگ کی لڑکی جو میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے اُسے تم سے ملایا بھی تو تھا"
"اچھا! وہ کیا بیمار ہے؟"
"ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دق کا شروع ہے اور ساتھ ہی بیہوشی اور اختلاج کے دورے بھی پڑتے ہیں"
"تعجب ہے!! وہ تو بڑی تندرست لڑکی تھی۔ یہ کیسے بیمار ہوگئی؟"
"میں تو ڈھائی تین سال سے اس سے ملی ہی نہیں۔ وہ تو تعلیم ختم کرکے حیدر آباد چلی گئی اور میں دہلی چلی گئی۔ پہلے تو ہماری خط و کتابت بڑے شوق سے جاری رہی۔ مگر رفتہ رفتہ نجمہ کے خط آنے کم ہوگئے اور جو خط آتے بھی تھے ان سے بھی بجائے دل لگی اور مذاق کے جو اس کی خاص صفت تھی افسردہ دلی ظاہر ہوتی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو جواب نہ دیا۔ اصرار کیا تو خط لکھنا بند کردیا۔ اب سال بھر سے تو اس کا کوئی خط آیا ہی نہ تھا۔ آج رفیعہ کے خط سے معلوم ہوا کہ سخت بیمار ہے اور شملہ آئی ہوئی ہے"
"تو تم اس سے ملوگی نا؟"
"ہاں ہاں ضرور۔ مگر اس احمق رفیعہ نے کوٹھی کا نام نہیں لکھا۔ خیر کوشش کریں گے تو معلوم ہو ہی جائیگا"
اچھا پانچ بج گئے! اب ٹہلنے چلو۔
"شانو میرا دل افسردہ ہے کہیں نہ جاؤنگی"
"مگر زیادہ فکر کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ چلو ٹہلنے سے ذرا طبیعت بہلے گی"
[illegible] ہم دونوں نے بڑے کوٹ پہن لئے چھڑیاں ہاتھ میں لیں اور روانہ ہوگئے۔

ہم کوئی میل بھر گئے ہوں گے کہ ایک عالی شان کوٹھی نظر [illegible] جس کے سامنے ایک خوبصورت باغ اور ایک طرف ٹینس لان بھی تھا۔ ایک بڑے وسیع برامدہ میں دو دروازوں پر چقیں پڑی ہوئی تھیں تیسرے در کے سامنے ایک حسین پورشین نرس ایک آرام کرسی پر بیٹھی کچھ بُن رہی تھی مگر بار بار اس کی نظر اندر کی طرف جاتی تھی۔ میں ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ نجمہ کی بیماری کا حال سن کر آج مجھے ہر مریض سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ شانتی نے میرا بازو پکڑا اور سامنے کا سائن بورڈ دکھایا جس پر "نواب کمال جنگ بہادر" لکھا ہوا تھا۔ میرے مُنہ سے حیرت کی ایک چیخ نکلی اور میں تیزی سے اندر داخل ہوگئی۔ شانتی بھی میرے ساتھ ہولی۔ نرس کے قریب گل چمن کھڑی تھی۔ یہ نجمہ کی خاص خادمہ تھی۔ ہم دونوں کو کوٹھی میں آتا دیکھکر گل چمن اور نرس غور سے [illegible] رہی تھیں۔ خادمہ نے مجھے پہچان لیا اور جلدی سے میرے پاس [illegible] بولی "کملا بیوی تم کہاں؟" میں نے اسے مختصر طور پر بتایا کہ [illegible] کا نام لکھا دیکھکر آگئی ہوں۔ پھر میں نے اس سے نجمہ کی خیریت [illegible] گل چمن نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"بیوی! وہ تو سال بھر سے بیمار ہیں۔ ڈاکٹروں نے [illegible] سے جانیکو کہا تھا۔ نواب صاحب یہاں لائے مگر مہینہ بھر سے [illegible] ہوگیا اب تک تو ویسی ہی ہیں"

میں نے اپنے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر کہا [illegible] ہم نجمہ سے مل سکیں گے؟" وہ یہ سُن کر اندر گئی اور دو منٹ [illegible] کمرے سے اشارہ کیا۔ ہم دونوں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے [illegible] میں داخل ہوئے۔ ایک بڑی مسہری پر جس پر نرم نرم گدے [illegible] تھے نجمہ لیٹی تھی۔ اس کا جسم ریشمی رضائی سے ڈھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہماری آہٹ سن کر اس نے کروٹ بدلی اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔ آہ وہ ہنستی ہوئی حسین آنکھیں کس قدر [illegible] اور غمگین معلوم ہوتی تھیں۔ اس کا گندمی رنگ جس پر گلاب کی اور سیب کی سی سُرخی جھلکتی تھی۔ اب سرسوں کے پھولوں کی طرح بالکل زرد تھی۔ گداز ہاتھ سوکھ گئے تھے۔ میرے دل کو [illegible]

قریب تھا کہ چیخ پڑوں مگر بمشکل اپنی طبیعت پر قابو حاصل کیا۔ دل پر جبر کر کے چہرہ بشاش بنایا اور مصنوعی بشاشت کے لہجہ میں کہا "آہا نجمہ کسے خبر تھی کہ یوں ملاقات ہو جائے گی۔" نجمہ اس تمام عرصہ میں بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اپنی یاد تازہ کر رہی ہو۔ یہ سن کر اس نے اپنی دونوں باہیں پھیلا دیں۔ "آہ میری کملا" اس کے منہ سے نکلا۔ اور میں بے اختیار اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ ایک لمحہ کے بعد میں نے دیکھا کہ نجمہ کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور وہ پسینہ سے تر ہو گئی۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹی تو دیکھا کہ نجمہ کی آنکھیں بند ہیں اور وہ بے سدھ پڑی ہے نرس نے جلدی جلدی خدا جانے کیا کیا ترکیبیں کیں مگر مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں دیوار کے سہارے بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ نظریں نجمہ پر تھیں اور دل کا عجب حال تھا۔ شانتی نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا اور نرس نے کوئی سرخ دوا میرے منہ کو لگائی۔ پانچ منٹ بعد میں اس قابل ہوئی کہ نجمہ کی حالت کا اندازہ کروں۔ وہ اب تک پوری طرح ہوش میں نہیں آئی تھی۔ مگر نرس نے کہا "اب حالت بہتر ہے اس وقت ضرورت سے زیادہ جوش کی وجہ سے دورہ پڑ گیا۔ [illegible]دی میں اس طرح کی اچانک ملاقات مضر ہے۔"

اس عرصہ میں نجمہ کو ہوش آتا جاتا تھا۔ پہلے تو وہ حیرت سے مجھے گھورتی رہی۔ پھر مجھ پر نظر جما دی۔ میں نے گھبرا کر نرس کی طرف دیکھا۔ اس نے اشارہ کیا کہ خاموش بیٹھی رہو۔ نجمہ نے ذرا دیر بعد پھر آنکھیں بند کر لیں۔

نرس نے جو اس کی نبض پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی کسی دوا کے قطرے اس کے منہ میں ڈالے۔ پانچ منٹ بعد نجمہ نے پھر آنکھیں کھولیں۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ وہ پوری طرح ہوش میں ہے۔ کمزور آواز میں کہنے لگی۔

"کملا مجھے اس وقت کتنی خوشی ہوئی کیا خبر تھی کہ یوں ملاقات ہوگی۔ [illegible] تم خود کیسی ہو!"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "پیاری نجمہ میں تو [illegible] دنوں سے آئی ہوئی ہوں۔ یہ مجھے کیا خبر تھی کہ تم یہاں ہو۔ معلوم ہوا آج ابھی آگئی۔"

"تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو!"

"[illegible] پیاری نجمہ سے کیسے خفا ہو سکتی ہوں۔"

[illegible]

میں۔ فکر نہ کرو بہن! تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔

نجمہ۔ (مسکرا کر) کیوں دھوکہ دیتی ہو کملا میری حالت اچھے ہونے کی ہے؟

میں۔ نجمہ تم اتنی عقلمند ہو کر وہم کرتی ہو۔ ہسٹریا تو کوئی خطرناک مرض نہیں ہے۔

نجمہ۔ ہسٹریا کے ساتھ دق بھی ہوتی ہے۔

میں۔ پرمیشور نہ کرے کیا باتیں کرتی ہو۔

نرس۔ نہیں معلوم کس احمق نے بیگم صاحبہ سے یہ کہہ دیا ہے۔ ہم شرط بدتے ہیں کہ انھیں سوائے ہسٹریا کے اور کچھ نہیں۔ ٹی بی تو ہو ہی نہیں سکتا۔

نجمہ۔ سسٹر میں آپکے اس دھوکے میں نہیں آسکتی۔ خیر مجھے زندگی کی تمنا بھی نہیں۔ جتنی جلد ختم ہو اچھا ہے۔

میں نے بات بدل کر کہا "نجمہ تم نے انھیں بھی پہچانا؟" نجمہ نے غور سے شانتی کو دیکھا "معاف کرنا میرا حافظہ بہت خراب ہو گیا ہے تمھیں بھی بہت مشکل سے پہچان سکی تھی۔"

"یہ میری دوست شانتی ہیں اور بہت جلد میری بھاوج ہونیوالی ہیں۔"

نرس۔ بیگم صاحب اب آپ آرام کیجئے۔ زیادہ بات کرنیسے کمزوری ہو جائیگی۔

نجمہ۔ (منت سے) سسٹر ابھی تو میں نے کچھ بھی باتیں نہیں کیں۔ ذرا دیر اور۔

نرس۔ بیگم! ڈاکٹر ہم پر خفا ہوگا اور نواب بھی ڈانٹے گا۔ اپنی فرنڈ سے کہئے صبح کے وقت آئیں۔ اُس وقت آپ زیادہ دیر بات کیجئے گا۔

نجمہ۔ (حسرت سے) کملا یہ تنہائی تو مجھے اور مارے ڈالتی ہے۔ کیسے ڈاکٹر ہیں جنھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ مجھ جیسے مریض کے پاس ہر وقت ایک ساتھی رہنا چاہئے۔ خیر بہن خدا حافظ!

میں نے جھک کر نجمہ کو پیار کیا اور ہم دونوں گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرے دل کا عجیب حال تھا۔ نہیں معلوم کیسے گھر پہونچی۔ جاتے ہی گھر لیٹ گئی۔ ماسی جی آئیں تو ان سے سب حال کہا اور نجمہ کے ہاں جانے کی اجازت مانگی۔ میری ماں میرے بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھیں۔ مجھے اور بھائی کو ماسی جی نے ہی پالا تھا۔ اور ہم دونوں انھیں ماں ہی کی طرح سمجھتے تھے۔ پہلے تو وہ بہت خفا ہوئیں [illegible] مگر شانتی کے سمجھانے اور [illegible]

پتاجی کے نواب صاحب سے کیسے گہرے تعلقات ہیں، ماسی جی کچھ نرم پڑ ہیں۔ آخر میرے آنسو کام آئے اور انھوں نے دن بھر رہنے کی اجازت دیدی۔

(۲)

میں روز صبح ۹ بجے نجمہ کے پاس چلی جاتی اور رات کو آٹھ نو بجے پرکاش اور شانتی آکر مجھے لے جاتے۔ میں نے نواب صاحب کو راضی کرلیا کہ نجمہ کو دوسرے ڈاکٹروں کو دکھائیں۔ سب ڈاکٹروں نے کہا کہ ہسٹریا ہی ہے۔ دق جس نے بتائی بالکل غلط بتائی۔ لیکن ان کو کسی قسم کا صدمہ پہنچا ہے اور اس وجہ سے دل بہت کمزور ہوگیا ہے۔ جس طرح ہوسکے ان کو خوش رکھا جائے۔ اور ہر ممکن خواہش پوری کی جائے۔ کھلی ہوا۔ اچھی غذا اور خوش رہنا ہی ان کا بہترین علاج ہے۔

اب نجمہ کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ میں ہر وقت اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی چچازاد بہن نورجہاں بھی یہیں تھی۔ مگر میں نے اندازہ لگایا کہ نجمہ اُسے پسند نہیں کرتی اور اس کی صحبت میں خوش نہیں رہتی۔ اگرچہ مُنہ سے کچھ نہ کہتی تھی۔ نواب صاحب بیچارے تو ہر وقت بیٹی کا مُنہ ہی دیکھا کرتے تھے۔ انھیں نجمہ سے بہت محبت تھی۔ نجمہ کی والدہ بیس برس پہلے مرچکی تھیں۔ اور نواب صاحب نے صرف اس کی وجہ سے اور شادی نہ کی تھی۔ مگر اب نجمہ کی بیماری نے ان کی کمر سی توڑ دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ نجمہ اپنے دل کا حال کچھ کہے مگر اس کے مُنہ پر مُہر سی لگی ہوئی تھی۔ میں بہت چاہتی تھی کہ نجمہ سے پوچھوں اُسے کیا غم ہے۔ مگر اس کی کمزوری کی وجہ سے ہمت نہ پڑتی تھی۔ مجھے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ کوئی نوجوان مدت تک نواب صاحب کے ہاں آکر رہا تھا۔ نجمہ کی اس کی بہت دوستی تھی۔ مگر سال بھر سے اس کا کچھ پتہ نہ تھا اور اس وقت سے ہی نجمہ بیمار ہوگئی تھی۔ نجمہ کے بھائی محمود اور شاہد اکثر آٹھویں دسویں دن لاہور سے اس کے پاس آتے تھے جن کے آنے سے نجمہ بہت خوش ہوتی۔ اُسے اپنے بھائیوں سے غیر معمولی محبت تھی۔ نورجہاں بھی جس کا خیال شاہد سے شادی کا تھا اس کے آنے کی خبر سنکر پھولی نہ سماتی اور بڑے جوش سے اس کا استقبال کرتی۔ طرح طرح کے بناؤ سنگار کرتی۔ قسم قسم کے [illegible] سے شاہد کو لبھانے کی کوشش کرتی۔ [illegible] نہیں کرتا تھا۔ جب آتا سارا وقت

بہن کے پاس اس کی دلجوئی میں گذار دیتا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ نورجہاں مجھ سے کھچی کھچی رہتی ہے پہلے تو میری سمجھ میں اس کی وجہ نہ آئی۔ مگر ایک مہینہ کے عرصہ میں نورجہاں کی نفرت کی وجہ مجھے معلوم ہوگئی۔ میں نے اندازہ کیا کہ شاہد صاحب کی مجھ پر نظر عنایت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں نجمہ کے پاس ہوتی اور وہ مجھے دیکھے جاتے مگر میری نظر اُٹھتے ہی اپنی آنکھیں جھکا لیتے اور شرمندہ سے ہوجاتے۔ اگر اتفاق سے نورجہاں وہاں موجود ہوتی تو ایسے غصہ کی نظروں سے مجھے دیکھتی تھی کہ میں پریشان ہوجاتی تھی۔ شاہد کے عادات و اطوار بہت اچھے تھے۔ اعلیٰ تعلیمیافتہ۔ سلیم الطبع اور خوش مزاج نوجوان تھا۔ مگر اس کی محبت بھری نظریں مجھے ایک آن نہ بھاتی تھیں۔ جب کبھی وہ مجھ کو دیکھتا مجھے اپنے پیارے منگیتر وِنے کی یاد آجاتی اور شاہد سے نفرت معلوم ہونے لگتی۔ اُدھر نورجہاں خواہ مخواہ رقابت میں جلی جاتی تھی۔ میں عجب پریشانی میں گرفتار تھی۔ شاہد مستقل طور پر رہنے کیلئے شملہ آگیا تھا۔ اور اگر میں ایک دن نہ آتی تو نجمہ رو رو کر بُرا حال کرلیتی۔ خود نواب صاحب میرے پاس دوڑے آتے۔ ان کا یہ سوال میں ٹال نہ سکتی تھی اور نہ انکار کی کوئی معقول وجہ بتا سکتی تھی۔ جاتی تو شاہد کی محبت بھری اور نورجہاں کی غصہ اور نفرت زدہ نظروں کا شکار بننا پڑتا۔ غرض عجیب طرح کی مشکل میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ شانتی میری حالت دیکھتی تھی مگر اسے نجمہ کی بیماری کی طرف منسوب کرکے خاموش تھی۔

(۳)

نجمہ کے دورے کم ہوگئے تھے۔ طاقت آچلی تھی۔ میں تیسرے چوتھے دن اس کے پاس جاتی تھی۔ غالباً شاہد کی حالت کو نجمہ سمجھ گئی تھی۔ کیونکہ جب میں جاتی تو وہ خادمہ سے کہہ دیتی کہ کسی کو آنے نہ دینا ہمیں تنہائی کی ضرورت ہے۔ اس طرح شاہد کی ملاقات سے تو نجات مل گئی مگر نورجہاں کا غصہ بدستور تھا۔ اور مجھے اس پر غصہ بھی آتا تھا اور رحم بھی۔

ایک دن صبح میں نجمہ کے پاس گئی تو اُسے اور دنوں سے زیادہ بحال پایا۔ اکتوبر کی آب و ہوا نے اس پر اچھا اثر کیا تھا۔ میرا بڑے جوش سے استقبال کیا اور اصرار کرنے لگی کہ آج رات میرے پاس رہ جاؤ۔ میرے بہت پیچھے پڑ کر کہنے لگی۔

"کملا! آج میرا افسانۂ غم سن لو۔ شاید تم کو سنا کر میری دل کا بوجھ [illegible]کم ہو جائے۔"

"نجمہ! یہ تو تم نے میرے دل کی بات کہی۔ میں خود تمھاری [محب]ت کی داستان سننے کو بے چین ہوں۔ مگر تمھارے مزاج سے [ڈر] لگتا ہے۔"

"کیا میں بہت بدمزاج ہوں؟"

"بدمزاج تو نہیں مگر بات بات پر بیہوش تو ہو جاتی ہو۔ خیر [م]یں تمھارا قصہ تو ضرور سنوں گی مگر رات کے لئے ماسی جی اجازت نہ [د]یں گی۔

نجمہ۔ دن میں تو بات کرنا بھی مشکل ہے۔ دیکھتی نہیں ہو نورجہاں [ہر]وقت سر پر سوار رہتی ہیں۔ دروازہ بند کر لو تو کواڑوں سے کان [ل]گا کر باتیں سنتی ہیں۔"

میں۔ یہ نورجہاں عجیب لڑکی ہے۔ نجمہ آخر یہ مجھ سے کیوں جلتی ہے!"

نجمہ۔ کیا سچ مچ تم اب تک اس کی نفرت کی وجہ نہیں سمجھی ہو؟ تم سے اس کا جلنا تو حق بجانب ہے۔

میرا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔

"شاید وہ یہ سمجھتی ہے کہ شاہد صاحب مجھ سے محبت کرتے [ہ]یں۔"

[نجمہ]۔ ٹھیک! یہی بات ہے۔

[میں]۔ یہ اس کی حماقت اور بدگمانی ہے۔

[نجمہ]۔ پیاری بہن! میں نے اب تک ڈر کے مارے تم سے نہیں کہا [واقعہ یہ] ہے کہ بھائی جان بُری طرح تمھاری محبت میں گرفتار [ہیں]۔

[میں]۔ نجمہ میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تمھارے [یہاں] آنا بند کر دوں گی۔

[نجمہ]۔ تو ان کے قصور کی سزا مجھے مت دینا۔ میں جانتی ہوں کہ [مذ]ہب کے خلاف یہ حرکت کر رہے ہیں۔ سب رکاوٹیں ایک طرف [مذ]ہب کی یہی رکاوٹ ایسی ہے جسے وہ کسی طرح دور نہیں [کر سک]تے ... [illegible] ... سکتے ہیں۔ مگر کملا محبت اختیاری بات تو نہیں [illegible] میں اس شخص کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی [illegible] [illegible] تمھاری محبت مجھے یہاں کھینچ لاتی ہے ورنہ میں [illegible] کے سوا [illegible] دوسرے [illegible] پر نظر ڈالنا میرے

عقیدہ میں حرام ہے۔

نجمہ۔ بِتّے کون؟

میں۔ وِتّے میرا بچپن کا منگیتر ہے اور اگرچہ کبھی ہماری ملاقات آزادی سے نہیں ہوئی، اور پچھلے دو سال سے تو ملنا ہی نہیں ہوا کیونکہ انھیں سیر و سفر کا بہت شوق ہے اور اکثر ہندوستان سے باہر رہتے ہیں۔ مگر وہ ہر حال میں میرے دل و جان کے مالک ہیں میں وِتّے کو نہ صرف چاہتی ہوں بلکہ اس کی پرستش کرتی ہوں۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ میں شاہد صاحب کی محبت کو کس نظر سے دیکھوں گی؟

نجمہ۔ کملا پیاری غصہ نہ کرو۔ میں بھائی جان کی طرف سے تم سے معافی چاہتی ہوں۔ اور یقین دلاتی ہوں کہ اب وہ تم پر ایک نظر بھی نہ ڈالیں گے۔ مگر کملا میں پھر بھی کہوں گی کہ محبت اختیاری چیز نہیں۔

اُسی وقت نورجہاں عجب تیکھے انداز سے اندر داخل ہوئی نجمہ نے اُسے دیکھ کر، کچھ اس طرح گویا یہی ذکر تھا، مجھ سے پوچھا، "تو اب کملا تم دوسرے کی ہو جاؤ گی"؟

نورجہاں۔ (جلدی سے) کیا! کس کی؟

نجمہ۔ کچھ نہیں۔ کملا کی شادی ہونیوالی ہے۔

نورجہاں۔ (بیقراری سے) کس سے؟

نجمہ۔ (بے پروائی سے) اپنے منگیتر سے اور کس سے۔

نور۔ کیا نام ہے ان کے منگیتر کا۔

نجمہ۔ آخر تمھیں کیا فکر ہے!

نور۔ ویسے ہی پوچھا تھا۔ ورنہ مجھے کیا مطلب۔

نجمہ۔ (ہنس کر) خفا نہ ہو۔ ان کے منگیتر کا نام وِتّے ہے۔

نورجہاں کے چہرے پر بشاشت آگئی اور وہ ہنس ہنس کر مجھے مبارکباد دینے لگی۔ میں دل میں نجمہ کی حرکت پر ہنس رہی تھی مگر ظاہر میں شرمائی بیٹھی تھی۔

رات کو بھائی جان مجھے لینے آئے مگر نجمہ نے منت سماجت کر کے مجھے روک لیا۔ نجمہ ہی کے کمرے میں میرا پلنگ بچھایا گیا۔ جب سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو نجمہ نے قصہ سُنایا۔

کملا! جب میں تعلیم ختم کر کے حیدرآباد آگئی تو مجھے اپنے مستقبل کی فکر اور شادی کا کبھی خیال [illegible] ابا جان کو میری محبت کی وجہ سے شادی کی [illegible]

اطمینان کے ساتھ اپنا شریکِ زندگی تلاش کرسکوں گی۔ ہماری خاندان میں اکثر لڑکے تعلیمیافتہ ہیں اور اچھے عہدوں پر بھی ہیں۔ وہ اکثر آتے اور مجھ سے ملتے مگر ان سے مجھے نہ کوئی رغبت ہوئی اور نہ نفرت۔

ایک دن سنا کہ ابا جان کے ایک دوست کا خط لیکر ایک صاحب آئے ہیں اور وہ کچھ عرصہ یہاں ٹھیر کر حیدرآباد کی سیر کریں گے۔ اگلے دن شاہد بھائی نے مسٹر فکرت سے میرا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ وہ حال ہی میں ترکی کی سیاحت کرکے واپس آئے ہیں۔ اور اسی وجہ سے فکرت کا لقب اختیار کیا ہے۔ پہلی ملاقات ہی میں فکرت سے مانوس ہوگئی۔ وہ اچھی صورت شکل کا قد آور نوجوان تھا۔ عادات نہایت شائستہ۔ مزاج میں بیحد ظرافت، روشن خیال اور ذہین۔ کیمبرج کا بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی تھا۔ گھر کا امیر بھی تھا۔ والدین انتقال کرچکے تھے۔ جہاں چاہتا جاتا اور رہتا۔ سیاحت کا بہت شوق تھا۔ ایران، ترکی، افغانستان، عرب اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں جاچکا تھا۔ واپس آکر ہندوستان کے مشہور شہروں کی سیر کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں حیدرآباد آنا ہوا۔ تو ابا جان کے ایک دوست کا خط تعارف کیلئے لائے کہ معزز لوگوں سے راہ و رسم ہوجائے۔

اس عرصہ میں برابر ہماری ملاقات ہوتی رہی۔ رفتہ رفتہ انسیت پیدا ہوئی اور پھر محبت بڑھنے لگی۔ میں امکان بھر فکرت سے الگ رہنے کی کوشش کرتی۔ مگر پھر بھی دن میں ایک آدھ مرتبہ ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔ میں جوں جوں اپنی محبت کو بڑھتا دیکھتی میرا خوف بھی بڑھتا جاتا تھا۔ سوچتی تھی کہ یہ ناؤ کیسے پار لگے گی۔ خدا جانے فکرت کون ہے، کیسا خاندان ہے، ابا جان کو معلوم ہوگا تو کیا کہیں گے۔ سب سے زیادہ فکر یہ تھا کہ وہ بھی مجھے چاہتا ہے یا نہیں۔ اگرچہ وہ مجھ سے بہت عزت اور محبت سے پیش آتا تھا۔ مگر آجکل کے فیشن ایبل نوجوانوں کے دل کا حال معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔

غرض محبت اور قدرے بے تکلفی بڑھتی رہی۔ یہانتک کہ فکرت نے ایک دن اقرار محبت کردیا جس سے مجھے خوشی ضرور ہوئی مگر اس وقت تو شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ مجھ سے وہاں ٹھہرا نہ گیا۔ اور وہاں سے بھاگ گئی۔ مگر فکرت جیسے ذہین اور قیافہ شناس آدمی سے اپنی محبت کا راز چھپانا ناممکن تھا۔ شاید ابا جان [illegible] کہ ایک دن وہ شاہد بھائی سے کہہ رہے تھے کہ فکرت کے خاندان کا حال معلوم کرو۔ اس عرصہ میں ایک مرتبہ فکرت سے بھی اس بات کا ذکر آیا۔ میں نے خیال کیا کہ اس پر وہ بجائے خوش ہونے کے فکرمند سا ہوگیا۔ اور اس دن کے بعد سے اکثر متفکر رہنے لگا۔ مجھ سے کہتا نجمہ مجھے بھول جاؤ میں تمہارے قابل نہیں۔ میں یہ سنکر رونے لگتی تو خود بھی بہت متاثر ہوتا بعض وقت جذبات کو روکنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ پڑ جاتا اور وہ میرے قدموں میں بیٹھ جاتا۔ نجمہ میں ان قدموں میں بیٹھنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ آہ! میں نے کیا کیا۔

اس کی یہ باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ بعض وقت سوچتی کہ اس کو مجھ سے محبت نہیں صرف بہانہ کرتا تھا۔ مگر یہ خیال زیادہ دیر تک نہ رہتا۔ کیونکہ اگر مجھ میں انسان کو پہچاننے کا ذرا سا بھی مادہ ہے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ دنیا میں فطرت سے زیادہ سچا اور وفادار آدمی ہونا مشکل ہے۔ پھر خیال آتا کہ وہ کچھ بیمار ہے یہ آخری خیال دل میں بیٹھ جاتا۔ اس سے کہتی فکرت خدا کے لئے اپنا علاج کرو تم کچھ بیمار ہو، وہ جواب میں بڑے پیار سے کہتا۔ نجمہ یہ تمہارا وہم ہے میں بالکل تندرست ہوں۔ البتہ تمہیں جانے کیا ہوگیا ہے روز بروز دبلی اور زرد ہوتی جاتی ہو۔ نجمہ میرے لئے پریشان نہ ہو، میری محبت کو بھلا دو۔ آہ میں نے یہ کیا کیا۔ میں رونے لگتی اور پھر وہی سلسلہ قائم ہوجاتا۔

میری صحت واقعی گرتی جارہی تھی، بھوک اڑ گئی تھی چہرہ زرد ہوگیا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوجاتے دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور خود بخود رونے کو دل چاہتا۔ مگر میں نے اس کا ذکر نہ ابا جان سے کیا نہ فکرت سے۔ جب یہ حالت ہوتی تو کمرہ بند کرکے لیٹ جاتی۔

ایک دن کچھ ایسی ہی حالت ہورہی تھی۔ میں کمرے میں چادر لپیٹے لیٹی تھی۔ دیکھا کہ فکرت چلے آتے ہیں اور بہت پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہے میرے کہنے سے ذرا سا پلنگ پر ٹک گئے۔ اور بڑی دیر تک نیچی نظر جھائے بیٹھے رہے۔ چہرہ سے ایسی کیفیت ظاہر تھی جیسے سخت کرب کی حالت میں ہو۔ میری گھبراہٹ ان کی یہ حالت دیکھکر اور بڑھ گئی۔ بمشکل اتنا کہہ سکی فکرت کچھ تو کہو۔ آخر کیا بات ہے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے ہیں مگر ایک لمحہ کے بعد وہ انھیں پی گئے۔ دفعتاً کھڑے ہوکر میرا ہاتھ [illegible]

ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور عجب درد بھری آواز میں بولے "کاش میں یہ ہاتھ ہمیشہ کے لئے لے سکتا۔" ہاتھ کو ہونٹوں سے لگایا اور جلدی سے چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گئے۔

جب تک وہ کمرہ میں تھے مجھ میں سوچنے کی طاقت نہ تھی جیسے ہی وہ باہر نکلے تھا میرے دل میں خیال آیا کہ فکرت مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ دماغ گھومنے لگا، قسم قسم کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں اور عمر بھر میں پہلی بار میں بیہوش ہو کر گر پڑی۔

ہوش آیا تو اباجان اور دونوں بھائی، ایک نرس اور دو ڈاکٹروں کو بیٹھا پایا۔ رفتہ رفتہ دماغ میں پچھلے واقعات کی یاد آنے لگی۔ میں نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا فکرت وہاں نہیں تھے۔ شاہد نے پیار سے کہا "نجمہ کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے بے خبری سے پوچھا "فکرت کہاں ہیں" انھوں نے کہا "کسی کام سے باہر گئے ہیں دو چار روز میں آجائیں گے۔"

مگر جب ہفتہ بھر بعد میری حالت سنبھلی تو اصل حال معلوم ہوا۔ فکرت میرے کمرے سے نکلتے ہی ایک اٹیچی کیس ہاتھ میں لیکر روانہ ہو گئے تھے۔ اس دن سے پھر ان کا پتہ نہیں ملا۔ اباجان اور شاہد نے دو ایک جگہ دریافت بھی کی۔ صرف ایک صاحب نے یہ کہا "وہ لاابالی طبیعت کا آدمی ہے پھر کہیں سیاحت کو چلدیا ہوگا۔" کملا! یہ ہے میری ناکام محبت کی داستان۔ جب ہی مجھے غشی کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن میں اس قابل نہیں ہوئی کہ پلنگ سے اٹھوں اور دنیا کے کاروبار میں حصہ لوں۔

میں توجہ سے نجمہ کی داستان سن رہی تھی۔ درمیان میں وہ کہیں کہیں رک بھی جاتی تھی اور اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ لیتی۔ مگر قصہ سنانے کے بعد تو وہ بالکل ہی بے حال ہو گئی۔ میں ڈری کہ پھر دورہ نہ پڑ جائے بمشکل اسے چپ کیا، باتوں میں لگایا۔ جب پھر اس کی حالت سنبھلی تو میں نے کہا "نجمہ بیشک فکرت کی جدائی سے تمھیں صدمہ ہوا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تم کھانا پینا بھی چھوڑ دو۔ تمھاری بیماری کا اصلی سبب محض تمھاری کمزوری ہے۔ تمھیں چاہئے کہ سب سے پہلے اپنی صحت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

نجمہ۔ صحت کا خیال کر کے کیا کرنا ہے۔ مجھے جینے کی تمنا نہیں۔

میں۔ زندگی جیسی نعمت کو اس طرح ٹھکرانا بہت بُری بات ہے۔

نجمہ۔ میرے لئے زندگی نعمت نہیں۔ فکرت نہ ہوئے تو جی کر کیا کرنا ہے۔

میں۔ اوّل تو ہم سب مل کر اس کی کوشش کریں گے کہ فکرت مل جائیں۔ لیکن اگر وہ خدا نہ کرے نہ ملے تو بھی تمہیں اپنی طبیعت کو سنبھالنا چاہئے۔ اس طرح اپنی حالت خراب کرنا خودکشی ہے اور تم جانتی ہو کہ خودکشی حرام ہے۔ اگر کسی کو محبت میں ناکامی اور اس کی خواہش پوری نہ ہو تو اسے اپنی زندگی کسی کارآمد کام میں صرف کرنا چاہئے۔

نجمہ۔ اپنی حالت سنبھالنا میرے بس کی بات نہیں۔

میں۔ موت تو اپنے وقت پر آتی ہے۔ نہ پہلے نہ بعد ہاں بیماری آدمی کو محتاج و بے بس کر دیتی ہے۔ دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنا کس قدر تکلیف دہ چیز ہے۔ پیاری بہن دل مضبوط کرو اور کسی کام میں دل بہلاؤ۔

نجمہ۔ میرا دل بہل ہی نہیں سکتا۔ میں فکرت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔

میں۔ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جو انسان چاہے اور نہ کر سکے۔

نجمہ۔ کملا! کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل ہے۔ خیر میں تمھاری نصیحتوں پر عمل کرنیکی کوشش کروں گی۔ مگر امید نہیں کہ اس میں کامیاب ہو سکوں۔

۴

اگلے دن میں نے ڈرتے، ہچکچاتے اور شرماتے ہوئے سارا قصہ نواب صاحب کو سنایا اور کہا کہ اگر آپ نجمہ کی زندگی چاہتے ہیں تو فکرت کی تلاش کیجئے۔ بیچارے بڑے پریشان ہوئے۔ یہ تو میں بھی خیال کر گیا تھا نجمہ کو فکرت سے محبت ہو گئی ہے اور اسی لئے میں نے اس کے خاندان وغیرہ کا حال معلوم کرنیکی کوشش کی تھی لیکن وہ نالائق ایسا غائب ہوا کہ خبر ہی نہ بھیجی۔ مگر مجھے یہ خیال نہ تھا کہ نجمہ اس کے لئے جان تک کی بھی پرواہ نہ کریگی۔ خیر میں کوشش کرتا ہوں شاید اس کا کچھ پتہ چلے۔

اسی دن نواب صاحب نے اپنے کئی دوستوں اور فکرت کے دوستوں کو ان سے [illegible]

زیادہ پڑ رہی تھی اس لئے اگلے دن ہی ہم سب لوگ دہلی روانہ ہو گئے۔ میرا تو گھر ہی دہلی میں تھا اور نجمہ کے اصرار سے دہلی جانا منظور کر لیا۔ اور نئی دہلی میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے کر رہنے لگے۔

دہلی پہنچنے کے دس دن بعد ایک صاحب کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ فکرت عرب گئے ہوئے تھے۔ چند روز ہوئے واپس آئے ہیں اور کلکتہ میں ہیں۔

نجمہ کو بڑی احتیاط کے ساتھ مناسب طور پر یہ خبر سنائی گئی۔ نجمہ کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا معلوم ہوتا تھا کہ دین و دنیا کی کوئی نعمت اُسے مل گئی ہے۔ اس نے اپنے کمزور اور کانپتے ہاتھوں سے فکرت کو خط لکھا۔ اپنا سب حال لکھا اور اُسے بُلانے کیلئے منت سماجت کی۔ مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ اس نے فکرت سے ذرا سی بھی شکایت نہیں کی تھی۔ شاید ڈرتی تھی کہ وہ شرمندگی کی وجہ سے آنیکا ارادہ چھوڑ دے۔

میں اور نجمہ بیقراری سے خط کے جواب کے منتظر تھے۔

— ۵ —

پتاجی اور ماسی جی کو میری شادی کی فکر پریشان کر رہی تھی وہ چاہتے تھے کہ پرکاش کے ساتھ ساتھ میری شادی بھی ہو جائے۔ مگر وِنے نے مہینوں خط بھی نہ بھیجا تھا۔ اور سال بھر سے تو اس کا پتہ بھی نہ تھا کہ کہاں ہے۔ بعض وقت پتاجی کو غصہ آجاتا۔ کہتے کہ میں نسبت چھڑا دوں گا۔ ایسا لڑکا کس کام کا جو ہماری پرواہ بھی نکرے۔ مگر شانتی نے اُن کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ کملا سوائے وِنے کے کسی اور سے شادی نہ کریگی۔ اور وہ اب بھی اُسے اپنا دیوتا سمجھتی ہے۔ جب پتاجی کو یہ حال معلوم ہوا تو اور بھی پریشان ہوئے۔ وِنے کے عزیز کو خط لکھا کہ وِنے سے کہیں کہ لڑکی جوان ہو گئی ہم کہاں تک انتظار کریں۔ اس سے کہو کہ جلد شادی کرلے مگر وہاں سے جواب آیا کہ وِنے خدا جانے کہاں ہے۔ اس کا پتہ لگا کر پھر آپ کو لکھوں گا۔

کچھ دن اسی طرح گذر گئے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ پتاجی ایک خط ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں۔ چہرہ غصہ سے سُرخ ہے۔ [illegible] سر جھکائے کچھ سوچ رہا ہے اور ماسی جی بڑبڑا رہی ہیں۔ [illegible] کچھ پوچھوں کیا بات ہے۔ مگر مجھے دیکھکر پتاجی اور [illegible] اور ماسی جی بڑبڑ کرتی باہر چلی گئیں۔

میں گھس گئیں۔

تمام دن گھر پر اُداسی چھائی رہی۔ شام کو شانتی آئی تو میں اس کا بازو پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ شانتی سچ سچ بتاؤ کس کا خط آیا ہے؟ کیا بات ہے؟ شانتی اس اچانک سوال سے گھبرا گئی۔ پہلے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ایک شرط پر بتاؤنگی تم رنج نہ کرنا۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ خدا جانے کیا خبر ہے شانتی جلدی کہو۔ میرا دم گھٹا جاتا ہے۔

شانتی۔ وعدہ کرو۔ زیادہ اثر نہ لوگی۔

میں۔ (بیقرار ہو کر) ہائے کیا وِنے کو کچھ ہو گیا؟

شانتی۔ (جلدی سے) وِنے اچھے خاصے ہیں۔ مگر اب ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا۔

میں۔ کیا مطلب؟

شانتی۔ وِنے کا خط آیا ہے جسمیں لکھا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بچپن کی منگنی قائم نہیں رکھ سکتا۔ کملا مجھ سے اور میں کملا کو تقریباً ناواقف ہیں اور چونکہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت بھی نہیں اس لئے میں نسبت چھڑانے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتا۔ بزرگوں نے بچوں کا ایک کھیل سا کیا تھا میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایک اور جگہ میری شادی ہونے والی ہے .... تو بہن جب دوسرے کو اپنی پرواہ نہ ہو تو خود بھی اس کی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ وہ جائے جہنم میں۔ میری کملا کیلئے اچھے سے اچھا بر مل جائے گا وہ ہے کیا چیز! ہم اُسے سمجھتے کیا ہیں؟

میں احمق کی طرح شانتی کی صورت کو تک رہی تھی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ یہ کیا بک رہی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرا پندرہ برس کا بنایا ہوا امیدوں کا قلعہ اس طرح ڈھے جائے جس دیوتا کو میں سات برس کی عمر سے اپنے دل میں رکھ کر پوجا کر رہی ہوں وہ اس طرح مجھے ٹھکرا دے۔ نہیں نہیں یہ غلط ہے "شانتی یہ غلط ہے۔ وِنے ایسا نہیں کر سکتا۔ شانتی شانتی پرماتما کے لئے کہو کہ یہ سب مذاق تھا۔ شانتی نے کھینچ کر مجھے لپٹا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "کملا تم رنج نہ کرو ایسے بیوفا اور بیکار آدمی کی تمہیں یقیناً صورت بھی نہ دیکھنی چاہئے۔"

میں چپ چاپ شانتی کے سینہ سے لپٹی بیٹھی رہی۔ مجھے اب اس تلخ حقیقت کا یقین ہوتا جاتا تھا۔ آنکھوں میں سیلاب

[illegible] موجیں مار رہا تھا مگر میری خودداری مانع آتی تھی۔ جو مجھ سے نفرت کرے اس کے لئے میں کیوں جان دوں؟ بار بار میرے کان میں یہ فقرہ گونجتا تھا، ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے۔ آہ مرد اپنا سا حال سب کا سمجھتا ہے، اُس ظالم کو کیا خبر کہ میں اُسے کتنا چاہتی ہوں۔ میں غصہ سے تھر تھر کانپنے لگی۔ شانتی زور زور سے مجھے لپٹا لیا اور پیار سے بولی "کملا کیا سردی لگ رہی ہے" اور ایک شال میرے اوپر ڈال دی۔ میری آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ شانتی نے آہستہ سے مجھے لٹا کر اوپر رضائی ڈال دی اور میں چند منٹ میں غافل سو گئی۔

جب آنکھ کھلی تو پرکاش کو پاس بیٹھا پایا۔ وہ متفکر نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا "کیوں بھیا کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا اس نے میری نبض پر ہاتھ رکھ کر کہا "کچھ نہیں۔ قدرے حرارت ہو گئی ہے۔ شاید نزلہ ہے" میں نے محسوس کیا کہ واقعی گلے اور سر میں دُکھن اور بدن میں شدید درد ہے۔ اسی وقت پتا جی ڈاکٹر گپتا کو لیکر اندر آئے۔ انھوں نے کہا انفلوئنزا کا اثر ہے۔ یہ احمق کیا کا کیا سمجھ رہا ہے۔

دس بارہ دن میں بیمار رہی۔ دل میں طوفان بپا تھا مگر منہ میں نے سی رکھا تھا۔ سب کو میری اس خاموشی پر حیرت تھی۔ میں ساری مصیبت اپنے اوپر جھیل رہی تھی۔ جس آگ میں جل رہی تھی اس کی لپٹ دوسرے کو کیوں لگاؤں۔ دو تین مرتبہ نواب صاحب بھی دیکھنے آئے ان سے معلوم ہوا کہ فکرت کا خط آیا ہے۔ عنقریب آجائیگا۔ میرا دل بیقرار ہو رہا تھا۔ کس طرح نجمہ کا چہرہ خوشی کا دیکھوں۔ میں نامراد رہی تو کیا خدا نجمہ کو بھی بامراد کرے۔ چند دن کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوئی۔ اور سب سے زبردستی اجازت لے نجمہ کے ہاں پہونچی۔ نجمہ اب تندرست تھی ہنستی ہوئی میرے گلے سے لپٹ گئی۔ مسرت اس کے ہر ہر عضو سے [illegible] تھی۔ میں نے مبارکباد دی تو ہنس کر بولی "پیاری کملا! سب تمھاری عنایت ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ تم کیوں بیمار ہو گئیں؟" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تمھاری بیماری میں [illegible]"

[illegible]۔ تمہیں میری قسم سچ سچ بتاؤ۔ کیوں اُداس ہو؟

[illegible]

[illegible] کا [illegible] اب آیا۔ دس دن ہوئے خود بھی آگئے۔ ابّا جان سے معافی مانگی۔ پھر مجھ سے معذرت کی۔ اور بڑی شرمندگی سے اس کا اقرار کیا کہ میں مسلمان نہیں تھا۔ مجھے ہمیشہ سے اس کا شوق تھا کہ نام بدل بدل کر سیاحت کروں۔ شروع میں محض دل لگی کے لئے تم سے محبت کا بہانہ کیا مگر رفتہ رفتہ مصنوعی محبت اصلی محبت میں بدل گئی۔ اب ہر وقت یہ فکر ستاتی کہ میں نے ایک معصوم اور بھولی لڑکی کو فریب دیا۔ اسی لئے تم سے کہتا تھا کہ میری محبت چھوڑ دو۔ تمھاری حالت دیکھکر اور پریشانی بڑھتی رہی اور آخر ایک دن دل پر پتھر رکھ کر تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ کچھ دن دل بہلانے کی ناکام کوشش کی۔ آخر عرب چلا گیا اور وہاں مذہب اسلام کی تحقیق شروع کی۔ جوں جوں اس مذہب کی تحقیق کرتا گیا اس مذہب کا سچا ہونا مجھ پر ثابت ہوتا گیا۔ اور میں نے وہاں ایک مجتہد کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ اس کا حال صرف میرے ایک دوست کو معلوم تھا۔ اسی نے مجھے تمھاری بیماری کی اطلاع دی تو میں واپس آیا۔ آتے ہی تمھارا اور نواب صاحب کا خط ملا۔ میں حاضر ہوں جو چاہے سزا دو۔ پہلے تو ابّا جان بہت خفا ہوئے کہ میری لڑکی ایک نومسلم کو نہیں مل سکتی۔ مگر کچھ شاہد اور محمود کے سمجھانے اور کچھ میری پچھلی حالت یاد کر کے بمشکل رضامند ہوئے۔

میں۔ کس بات پر؟

نجمہ۔ (شرما کر) شادی پر۔

میں نے نجمہ کو لپٹا لیا "نجمہ میں تہ دل سے مبارکباد دیتی ہوں"

نجمہ۔ مگر تم کیوں اس قدر دل گرفتہ ہو رہی ہو؟

میں۔ کچھ نہ پوچھو خوشی میں رنج کا ذکر اچھا نہیں لگتا۔

نجمہ۔ نہیں نہیں کملا میں پوچھ کر رہونگی۔ آخر کیا بات ہے! میں چند منٹ تک اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش میں خاموش رہی "صرف اتنی بات ہے کہ ہرے نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے"

نجمہ۔ ہائیں۔ ہائیں۔ آخر کیوں؟

میں۔ وہ کہتا ہے ہم دونوں میں محبت نہیں ہے۔

نجمہ۔ تو اُسے تمھاری محبت کی خبر نہیں۔

میں۔ نجمہ جب مرد اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا ہے تو ہر بات سے انکار کر دیتا ہے۔

نجمہ۔ اب کسی نہ کسی طرح [illegible]

میں ۔ نہیں نجمہ یہ ممکن نہیں ۔ جو میری محبت کی ذرا قدر نہ کرے چند برس کے بعد معاہدے کو ذرا دیر میں توڑ دے ۔ میں ایسے شخص کی منت نہیں کر سکتی ۔

نجمہ ۔ تو اب کیا ہوگا ؟

میں ۔ صرف یہ کہ اب کبھی میری شادی نہ ہوگی ۔

نجمہ ۔ اگر کہیں وِنے مجھے مل جاتا تو ایسا آڑے ہاتھوں لیتی کہ یاد تو کرتا ۔ بدقسمت ہے کہ کملا جیسی دیوی کی قدر نہیں کرتا ۔

میں ۔ چھوڑو اس ذکر کو ۔ یہ کہو تمہاری شادی کب ہے ۔

نجمہ ۔ اب اس کی خوشی نہیں رہی ۔ کملا رنجیدہ ہے تو نجمہ کو کیا خاک خوشی ہوگی ۔

میں ۔ نہیں میں تم سے زیادہ خوش ہوں ۔ اچھا اپنے محبوب کو ذرا دکھاؤ تو ۔

نجمہ ۔ گل چین ! کیا ندرت صاحب آگئے ؟

میں ۔ تو کیا محبوب نام رکھا گیا ہے ؟ بڑا موزوں نام ہے ۔

کسی نے آہستہ سے دستک دی اور ایک شیریں آواز سنائی دی " نجمہ میں آسکتا ہوں ؟ " نجمہ نے میری طرف عجب دلربایانہ ادا سے دیکھا اور کہا " آیئے " کوئی شخص شام کا سیاہ سوٹ پہنے کمرے میں داخل ہوا ۔ میں نے جلدی سے ساڑی کا آنچل سر پر ڈالا ۔ اور نظر اوپر اٹھائی ۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔ سر میں چکر آگیا ۔ گھبرا کر کھڑی ہوئی اور دیوار کا سہارا لے لیا ۔ میرے منہ سے نکلا ۔ یہ کیا ؟ وِنے یہاں ؟ اور کھڑی کی کھڑی رہ گئی ۔ نجمہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا ۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ نجمہ اور وِنے پر میری اس حالت کا کیا اثر پڑا کیونکہ کچھ دیر تک مجھے ہوش ہی نہ تھا ۔ چند منٹ بعد میں اس قابل ہوئی کہ معاملہ سمجھ سکوں ۔ سب باتیں سینما کے پردے کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گذرنے لگیں اور کل معاملہ میری سمجھ میں آگیا ۔ میں نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو حاصل کیا اور نجمہ پر نظر ڈالی ۔ وہ حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی وِنے کو دیکھ رہی تھی ۔ اور وِنے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے ۔ میں نے ہمت کر کے کہا " نجمہ ! مجھے کیا ہوگیا تھا ؟ " شاید کسی قسم کا دماغی دورہ پڑا تھا ۔ میں کسے وِنے سمجھی ۔ نجمہ نے مجھے دیکھ کر عجیب طرح وِنے پر نظر ڈالی ۔

کملا ۔ اسے ؟ کیا میں مسٹر ندرت کو وِنے سمجھی تھی ۔ توبہ توبہ معاف کیجئے مسٹر ندرت ۔ میرا دماغ اس وقت نہ جانے کیوں معطل سا ہوگیا تھا کہ [illegible] اس طرح دیکھتی تھی !

نجمہ ۔ کملا ! مجھے دھوکا نہ دو ۔ مجھے اصل حال معلوم ہوگیا ۔ مسٹر ندرت اصل میں تمہارے منگیتر وِنے ہیں ۔

میں ۔ نہیں نجمہ میں قسم کھاتی ہوں کہ ندرت میرے منگیتر نہیں ہیں تم نہ جانے کس خیال میں ہو ۔ خود مسٹر ندرت سے پوچھ لو ۔

نجمہ ۔ (خوشی سے) مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ۔ کملا میں تمہاری چالاکی کی تعریف کرتی ہوں ۔ تم نے بہت کامیابی کے ساتھ مجھے مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کی ۔ مگر میں اتنی بھی احمق نہیں کہ حقیقت نہ سمجھ لوں ۔

وِنے ۔ نجمہ تمہارا خیال ٹھیک ہے میں ہی وِنے ہوں ۔ بچپن میں میری نسبت کملا سے کر دی گئی تھی ۔ مگر ایک تو ہم میں کبھی محبت نہیں ہوئی دوسرے اب میں مسلمان ہوگیا ہوں اس وجہ سے یہ نسبت منسوخ ہوگئی ۔

ایک مرتبہ پھر وہی الفاظ " کہ ہم میں محبت نہیں ہوئی " میرے دماغ میں گونجے اور میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا ۔

نجمہ کی غصے میں بھرائی ہوئی آواز میرے کان میں آئی " آپ کس بابت کہہ سکتے ہیں ۔ دوسرے کے دل کا حال آپ کو کیا معلوم ؟ آپ کو کبھی محبت نہیں ہوئی ۔ تمہیں میری کملا کی محبت کی کیا خبر ہو سکتی ہے ۔

وِنے ۔ نجمہ ! محبت چھپائے سے بھی نہیں چھپ سکتی ۔

نجمہ ۔ ہندوستانی شریف لڑکیاں کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتیں میری مثال نہ لیجئے میں نے عام شریف زادیوں کے خلاف آپ سے محبت کی اور آپ نے اس کا پتہ لگا لیا ۔ کملا کو کیا ضرورت تھی کہ وہ آپ سے اپنی محبت کا اظہار کرتی ۔ جب کہ اسے یقین تھا کہ آپ سے اس کی شادی ہونی ہے ۔ اگر آپ کو یہ نسبت ناپسند تھی تو کیوں ہوش سنبھالتے ہی اس نسبت کو نہیں توڑ دیا تاکہ وہ غریب آپ کی محبت پیدا ہونے کا خیال ہی نہ کرتی ۔

وِنے ۔ مگر نجمہ ......

نجمہ ۔ مجھے اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ۔ تم کملا کے ہو اور کملا تمہاری ہے ۔ اسی کا حق مقدم ہے ۔

وِنے ۔ نجمہ ! نجمہ ! تم کیا کہہ رہی ہو !

نجمہ ۔ (غصہ سے) وہی کہہ رہی ہوں جو میری جگہ ہر شریف لڑکی کہتی ۔ آپ نے پہلے غریب کملا کو دھوکا دیا ۔ اس سے محبت نہ کرتے تھے بھی نسبت قائم رکھی ۔ اور پھر مجھ بدنصیب کو اپنی محبت کے جال میں پھنسایا ۔ مگر یاد رکھئے نجمہ کملا کی رقیب نہیں بنے گی ۔ آپ کو

کملا سے شادی کرنا پڑے گی۔

اب تک میں خاموشی کے ساتھ نجمہ اور وِنے کی گفتگو سنتی رہی۔ میرے دل میں سیکڑوں قسم کے خیالات اتنی دیر میں گزر گئے۔ یہ سوچ کر کہ جسے میں اتنا چاہتی ہوں وہ نجمہ پر فدا ہے۔ میرے دل میں حسد کی آگ جلنے لگی تھی۔ مگر نجمہ کی گفتگو نے اس آگ پر پانی ڈال دیا۔ ایک لمحہ کیلئے یہ خیال میرے دل میں آیا کہ اچھا ہی ہے نجمہ وِنے سے شادی نہ کرے اور وہ نامراد ہی رہے۔ تب اُسے معلوم ہو کہ دوسرے کا دل دکھانا کیسا ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال صرف ایک ہی لمحہ کیلئے آیا۔ فوراً ضمیر نے لعنت ملامت کی۔ نجمہ کی پہلی حالت نظروں کے سامنے آگئی، وِنے کی محبت پھر عود کر آئی۔ میں ناکام و نامراد ہی سہی۔ بے لاگ محبت یہی ہے کہ وِنے کی خوشی کو مقدم سمجھوں۔ نجمہ اپنی مراد کو پہنچے۔ اس وقت وہ میری محبت میں شادی سے انکار کر رہی ہے۔ مگر پھر وہ بیمار ہو جائیگی۔ میں جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

میں۔ نجمہ تم فضول مسٹر فکرت سے خفا ہو۔ شادی ہمیشہ فریقین کی مرضی سے ہونی چاہیئے۔ وہ حق بجانب ہیں کہ جس کو وہ پسند کریں اُسے شادی ہونا چاہیئے۔

نجمہ۔ اگر فکرت کو مجھ سے ذرا سی بھی محبت ہے تو میرا کہنا ہرگز مانیں گے۔ انھیں تم سے شادی کرنا پڑے گی۔

وِنے۔ اب تو وہ راضی ہو جائیں تب بھی میں رضامند نہیں۔ نجمہ ایسی ہے کہ مجھے کسی بات کا احساس ہی نہیں۔ میں ہرگز اس سے شادی نہیں کر سکتی جو مجھ سے محبت نہ کرتا ہو۔

وِنے۔ نجمہ! کملا مجھے خود قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔

میں۔ یہ آپ کا عذر لنگ ہے۔ کملا کو رضامند کرنا میرا کام ہے۔

میں۔ نجمہ کیوں ضد کرتی ہو۔ مسٹر فکرت نے مذہب بدل لیا ہے مسلمان اب کسی حالت میں انھیں اپنے میں شامل نہیں کر سکتا۔

[illegible]۔ مذہب تو انھوں نے محض ......

فکرت۔ (بات کاٹ کر) نجمہ اور تم کچھ کہو میں بیشک قصور [illegible] اگر آپ بھی بنگالی نہ کرنے میں [illegible] نہیں ہیں [illegible] میں نے سالوں کی تحقیق کے بعد [illegible] کیا ہے۔

نجمہ۔ کچھ ہو مگر اب میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔

وِنے۔ کملا اگرچہ میں تمہارا قصوروار ہوں۔ مگر تمہیں سے مدد کی درخواست کرتا ہوں۔

میں۔ مسٹر فکرت فکر نہ کیجئے۔ نجمہ سے آپ کی شادی ضرور بالضرور ہوگی۔

نجمہ۔ ہرگز نہیں۔ میں اور کملا کی رقیب!

میں۔ نہیں تم میری رقیب نہیں ہو۔ اب فکرت میرے بھائی اور تم میری بھاوج ہو۔

نجمہ۔ کملا! ہوش میں آؤ۔

میں۔ میں پوری طرح ہوش میں ہوں۔ فکرت اِدھر آؤ (نجمہ کا ہاتھ پکڑ کر) لو وِنے میں اپنے کو تمہارے قابل نہ سمجھ کر اپنی عزیز اور پیاری بہن کو تمھارے سپرد کرتی ہوں۔ اب تم میرے بہنوئی ہو۔ ان کی قدر کرنا۔

وِنے۔ کملا! کملا!!

نجمہ۔ نہیں کملا نہیں! وِنے تمہارا ہے۔

میں۔ وِنے میرا تھا۔ مگر فکرت میرا نہیں تمہارا ہے۔ فکرت میری بہن سے بیوفائی نہ کرنا۔

یہ کہہ کر میں تیزی سے باہر نکل کر گھر روانہ ہو گئی۔

اگلے دن پتاجی سے اجازت لیکر میں لاہور اپنے چچا کے ہاں روانہ ہو گئی۔ تاکہ وِنے اور نجمہ سے دور رہوں۔ شانتی سے کہہ گئی کہ نواب صاحب کے ہاں کسی کو میرا پتہ نہ معلوم ہو۔

یہ سب کچھ کیا مگر وِنے کی یاد ایک منٹ کیلئے بھی دور نہ ہوتی۔ اکیلی بیٹھی اپنی بدنصیبی پر آنسو بہایا کرتی تھی۔ میرے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ خیال یہ تھا کہ جس سے پندرہ سال میری نسبت رہی جس پر میں جان نثار کرنیکو تیار ہوں اسے میری ذرا بھی پرواہ نہیں۔ اگر کسی اور وجہ سے میری وِنے سے شادی نہ ہوتی، مگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے تو میں تمام زندگی اس شیریں خیال کے ساتھ گزار دیتی کہ میرا محبوب بھی مجھے چاہتا ہے۔ کاش میں اس دھوکے ہی میں رہتی مگر اب تو میری زندگی میں کوئی دل خوش کن خیال نہ تھا۔ میں کس امید پر اس پہاڑ سی زندگی کو پورا کرونگی۔

اس بیروقت کی دماغی فکر اور جلن نے میری صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ چچا برابر کہتے رہے کہ کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ تم ضرور کچھ بیمار ہو۔ مگر میں نے ان سے کہدیا کہ آپ بالکل فکر نہ کریں میں قطعی تندرست ہوں۔ یہاں تک کہ ایک دن مجھے تیز بخار آ گیا۔ ہفتوں مجھے ہوش نہیں آیا۔ نہ معلوم کیا گذری۔ جب ہوش آیا تو اپنے کو لاہور کے سب سے بڑے ہسپتال میں پایا۔ ماسی جی، پتاجی، پرکاش، شانتی اور چچا سب لوگ موجود تھے۔ چھ مہینے میں ہسپتال میں رہی شانتی سے معلوم ہوا کہ کسی قسم کے دماغی بخار کا میں شکار ہو گئی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ بیہوشی میں میں خوب ہذیان بکتی تھی۔ جس سے سب کو ونے کا حال معلوم ہو گیا۔ یہ بھی سنا کہ نواب صاحب حیدر آباد چلے گئے ہیں۔ ان کے جانے سے پہلے کئی دفعہ نجمہ ہمارے ہاں آئی۔ اور میرا پتہ پوچھا۔ مگر شانتی نے معافی مانگ لی کہ وہ منع کر گئی ہے۔ میں بتانے سے مجبور ہوں۔ حیدرآباد جا کر فکرت کی نجمہ سے اور نورجہاں کی شاہد سے شادی ہو گئی۔

یہ خبر سنکر ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے بڑے زور سے میرے دل پر مکا مارا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میرے دل کے کسی گوشہ میں اب تک امید کی کوئی کرن باقی تھی۔ آج وہ بھی غائب ہو گئی۔ اب میں بالکل تاریکی میں تھی۔ میں اکثر سوچتی کہ میں نے جو کچھ کیا وہ مجبوری تھی یا ایثار؟ مگر اس کا جواب ٹھیک ٹھیک میری سمجھ میں نہیں آتا۔

ایک دن پڑے پڑے مجھے اپنی اور نجمہ کی وہ گفتگو یاد آئی جو نجمہ کی محبت کی داستان سننے کے بعد ہوئی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ زبان سے کہنا اور بات ہے اور کر دکھانا اور چیز۔ میں نے سوچا کہ اگر اسی طرح کڑھتی رہی تو بیماری مجھے کسی کام کا نہ چھوڑے گی۔ ساری زندگی دوسروں کی محتاجی کی حالت میں بسر ہوگی۔ اگر محبت میں ناکام رہی، بیوی اور ماں کی حیثیت سے دنیا میں کوئی کام نہ کر سکی تو کیا ضرور ہے کہ کسی اور کام کی بھی نہ رہوں۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں یہ آیا کہ ملک کی خدمت سب سے مناسب بات ہے۔ اس سے میرا دل بھی بہل جائیگا اور دنیا میں کوئی مفید کام بھی کر سکوں گی۔ اس فیصلے کے بعد جتنے دن میں نے ہسپتال میں گذارے اپنی صحت کو بحال کرنے کی پوری کوشش کی۔ ونے کے خیال کو دل سے دور رکھتی۔ اور ہندوستان کے حالات اخباروں میں پڑھا کرتی۔

مہینہ بھر بعد میں گھر آ گئی۔ اگلے مہینے شانتی اور پرکاش کی شادی ہوئی۔ سب نے شانتی کے ذریعہ کوشش کی کہ میں شادی پر راضی ہو جاؤں مگر میں نے صاف کہدیا کہ اب میں خانگی زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں رہی۔ میں نے ملک کی خدمت کیلئے زندگی وقف کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

پرکاش کی شادی کے اگلے دن میں نے کانگریس کے دفتر میں جا کر والنٹیروں میں اپنا نام درج کرالیا۔

صالحہ عابد حسین صاحبہ

کسی کی یاد (بسلسلہ صفحہ ۱۶)

سیٹی دی۔ آنے والے اسٹیشن پر مجھے اترنا تھا۔ میں بستر لپیٹنے لگا۔ وہ دونوں اپنے آپ میں مگن تھے۔ بات کی بات میں اسٹیشن آ گیا۔ میں اترنے لگا تو لڑکے نے مزاحاً پوچھا! فرمائیے صاحب! آپ نے بھی تو ہماری باتیں سنیں۔ کون جیتا؟ میں یا یہ! میں نے ہنس کر کہا بھئی بات یہ ہے۔ حجت ایسی ہے کہ دونوں جانب بہت کچھ کہا جا سکتا ہے! اس پر لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ شکر ہے آپ نے بات تو کی ورنہ آپ تو سارے راستے کچھ نیت باندھے بیٹھے رہے! میں نے کہا۔ جی نہیں! آپ کے ساتھ خوشی کی نماز بھی پڑھتا رہا!! اس پر زور کا قہقہہ لگا۔ اتنے میں گارڈ نے سیٹی بجائی۔ ریل نے بھی سیٹی دی اور صبح کے نور میں نہاتی ہوئی ریل چلی۔ اور بات کی بات میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ دن اور آج کا دن۔ اب بھی جب کبھی ان ہنسنے بولنے والوں کی یاد آ جاتی ہے تو زندگی کی خوشیاں جاگ جاتی ہیں۔ جیسے ایک مسافر کو زندگی کے کنارے پھول یاد آ جاتے تھے تو دن کے ساتھ اس کا من بھی ہنستا۔ مہکتا اور جھومتا تھا!!

سید وزیر حسن صاحب

نقد و تبصرہ

تفسیرِ حیات

پنجاب نے اُردو کی ترویج و ترقی میں جو حصّہ لیا ہے اس کے لئے ہر اُردو کا بہی خواہ پنجاب کا شکرگزار ہے۔ اس مردم خیز خطّہ سے وہ ہستیاں اُٹھیں جنھوں نے اُردو کی ڈوبتی ناؤ کو ہندی کے بھنور سے نکال کر پھر ترایا۔ [illegible] کے نامور ادیب حضرت ایم۔ اسلم بھی انہی بے لوث جد وجہد [illegible] والوں میں سے ہیں جنھوں نے دامے درمے قدمے اُردو کو فروغ دیا ہے۔ اسلم صاحب کئی علمی، تاریخی، مذہبی اور ادبی کتابوں کے مصنّف ہیں۔ مزاح نگاری میں ان کا شاہکار "مرزاجی" اُردو میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ افسانہ نگاری اُن کا خاص میدان ہے۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ انھوں نے اب تک کم و بیش دو سو افسانے لکھے ہوں گے جن میں سے بیشتر مجموعوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں اُن کے [illegible] منتخب افسانوں کا مجموعہ "تفسیرِ حیات" کے نام سے شائع ہوا ہے [illegible] ۲۰×۳۰ سائز کے ۷۰۰ صفحات۔ مضبوط جلد۔ سرورق مصور [illegible] اتنی ضخامت کے باوجود قیمت صرف ڈھائی روپئے۔ یہ کتاب اُردو [illegible] ہر لحاظ سے انگریزی کی Omnibus Volumes. کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے۔ ہمیں یہ دیکھکر بے انتہا مسرت ہوئی کہ [illegible] اب اتنی عمدہ اور اتنی سستی کتابیں شائع ہونے لگی ہیں۔ [illegible] کے مشہور پبلشر ملک دین محمد اس شاندار کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ایم۔ اسلم صاحب کے افسانوں کو پڑھئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے [illegible] آنکھوں سے زندگی کے مختلف رُخ دیکھ رہے ہیں۔ اسلم صاحب [illegible] زندگی کو بہت گہری نظر سے دیکھا ہے اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں محسوس کر کے لکھتے ہیں۔ افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ پڑھنے والا بھی اپنے ماحول سے [illegible] بے خبر ہو کر زندگی کی شاہراہوں میں گھومتا پھرتا ہے [illegible] کمال ہے۔ چارلس ڈکنز کی طرح اسلم صاحب بھی ہمیں [illegible] جیتی جاگتی تصویریں دکھاتے ہیں۔ اُن کے کردار [illegible] گوشت پوست کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ اُنھیں [illegible] اور رعنائیاں بھی۔ کہیں قہقہے ہیں کہیں آنسو کہیں [illegible] کہیں آرزو ہے کہیں [illegible] کہیں شکست ہے کہیں فتح۔ غرض زندگی کے سارے نشیب و فراز اسلم صاحب [illegible] افسانوں میں دیکھ لیجئے۔ اس طرح "تفسیرِ حیات" گویا اسم با مسمٰی ہے [illegible] سماج کی کمزوریوں کو بے نقاب کرتے ہیں وہ کسی کی رعایت نہیں کرتے [illegible] واقعات من وعن پیش کر دیتے ہیں۔ اسلم صاحب کا طرزِ تحریر عام فہم سادہ اور دلکش ہے۔ اور اس دلکشی میں مکالمے اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ "تفسیرِ حیات" میں چیدہ چیدہ افسانے شامل ہیں۔ جن حضرات کو اچھے افسانوں کی تلاش رہتی ہے اُن کے لئے یہ کتاب ایک عمدہ تحفہ ثابت ہوگی۔ ملک دین محمد لاہور سے دو روپئے آٹھ آنے میں طلب کی جا سکتی ہے۔

"ش"

موجِ نور

جناب محمد دین ادیب منشی فاضل، ادیب فاضل نے اس نام سے ایک مجموعہ نہایت پاکیزہ نعتوں کا مُرتب کیا ہے۔ شروع میں مولانا اظہر امرتسری کا قابلانہ دیباچہ ہے۔ اس کے بعد عرضِ مدعا بجانب مؤلف۔ پھر حمد و مناجات کے بعد رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان میں مشہور اُردو شعراء کے جذبۂ عقیدت پیش کی ہے درج ہے۔ نیاز کیش شعراء میں علامہ اقبال، ظفر علی خاں۔ آغا حشر مرحوم۔ جوشؔ ملیح آبادی۔ سائلؔ دہلوی۔ حفیظؔ جالندھری جیسے باکمال حضرات شامل ہیں۔ حالیؔ۔ اکبرؔ الہ آبادی۔ مولانا محمد علی کا نعتیہ کلام بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔ "موجِ نور" میں کوئی (۱۰۰) جشنِ میلاد کے موقع پر پڑھنے کی نظمیں، سلام اور نعتیں شامل ہیں۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر مسلمان کے گھر میں رہے۔ قیمت بھی بہت کم ہے یعنی صرف ایک روپیہ۔ ضخامت ۲۰۰ صفحے۔ موجِ نور۔ چکوال ضلع جہلم سے طلب کیجئے۔

نغمات

لطیف الدین احمد صاحب جو ادبی حلقوں میں ل۔ احمد کے نام سے معروف ہیں شعرِ منثور لکھنے میں ایک خاص شہرت کے مالک ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کا ترجمہ "نالۂ مرغ" نثرِ شاعری کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ "نغمات" سچالیس چھوٹے چھوٹے مضامین کا مجموعہ ہے جن کی عبارت اشعار کی طرح مترنم اور اسلوب نظم کی طرح دلکش ہے۔ ان مضامین میں صرف خوبصورت الفاظ [illegible] اور نادر خیالات بھی ہیں۔ الفاظ [illegible]

ہیں جو پڑھنے والے کے خیال کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ اس کو صحیح معنوں میں "ادب لطیف" کہہ سکتے ہیں۔ کتاب مجلد ہے۔ ضخامت ۱۳۰ صفحے۔ ایک روپیہ میں لطیف الدین احمد صاحب۔ من ٹولہ۔ آگرہ سے منگائی جاسکتی ہے۔ "ش" ط

معاہدۂ عمرانی فرانسیسی انقلاب کے روحانی باپ روسو کی مشہور عالم تصنیف "سوشل کونٹریکٹ" کا ترجمہ جناب ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی نے عام فہم و شگفتہ عبارت میں کیا ہے۔ یہ ترجمہ مکتبہ جامعہ دہلی نے اپنی دیرینہ روایات کے مطابق بڑے سلیقہ سے شائع کیا ہے۔ ایک بہت مشہور قول ہے کہ "انسان پیدا تو آزاد ہوا ہے مگر جدھر دیکھو زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے"۔ یہ قول روسو کا ہے اور اسی سے معاہدۂ عمرانی کی ابتدا ہوتی ہے۔ روسو آزادی اور مساوات کا علمبردار تھا۔ بچپن ہی سے اس کے مزاج میں سماج کی ناہمواری اور نظامِ حکومت کے خلاف جذبۂ بغاوت موجزن تھا۔ اسکی پرائیویٹ زندگی اخلاقی اعتبار سے پست تھی مگر اس کا ذمہ دار بھی معاشی نظام کو قرار دینا پڑے گا۔ "معاہدۂ عمرانی" کے بارے میں مترجم کا بیان ہے کہ "روسو کے تمام سیاسی تخیلات اس میں کامل پختگی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس تصنیف میں روسو کے نظریوں کی اساس قانونِ فطرت ہے۔ اور روسو شروع سے آخر تک اس حقیقت پر نہایت سختی کے ساتھ مصر ہے کہ طاقت کو حق (قانون) نہیں کہا جا سکتا۔ قوت کا ہر استعمال صرف اس صورت میں جائز ٹھہر سکتا ہے جب وہ ارادہ اجتماعی اور قوم کی مرضی کے مطابق ہو۔ ارادہ اجتماعی سے مراد کسی خاص وقت میں تمام افراد کے ارادوں کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ارادہ مراد ہے جس پر نسلاً بعد نسلٍ قوم کی زندگی کا مدار ہوتا ہے"۔ ایک جگہ اور لکھا ہے کہ "فرانسیسی انقلاب کے زمانہ میں روسو کی یہ تصنیف انقلابیوں کی انجیل تھی"۔ اسی ایک فقرے سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مکتبہ جامعہ نے اس کتاب کا ترجمہ شائع کر کے اردو پڑھنے والوں کی ایک نہایت اہم خدمت انجام دی ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت دو روپیے۔ "ش"

مشاہیرِ ہند سید بادشاہ حسین صاحب حیدر آبادی بہت اچھے علمی مذاق کے نوجوان ہیں۔ ان کی کتاب "اردو میں قصہ نگاری" شائع ہو کر مقبولیت خاص و عام حاصل کر چکی ہے۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر ان کی تازہ ترین تصنیف "مشاہیرِ ہند" ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں ہندوستان کے مشاہیر کا تذکرہ ہے [illegible] اقبال (۳) سر اکبر حیدری (۴) سر جگدیش چندر بوس (۵) ڈاکٹر ٹیگور (۶) پنڈت جواہر لال نہرو۔ اردو میں بیوگرافی کی بہت کمی ہے۔ انگریزی میں ہر مشہور شخصیت کی کئی کئی بیوگرافیز چھپ جاتی ہیں۔ وقائع حیات کے مطالعے سے ہمیں اچھی طرح غور کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اس شخص نے کن حالات میں کس طرح ترقی کی۔ انگریزی کی ایک مشہور نظم کا ایک بند ہے:-

سب بڑے آدمیوں کی زندگیاں ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ
ہم بھی اپنی زندگی کو عظیم الشان بنا سکتے ہیں۔
اور جب ہم یہاں سے کوچ کریں تو
وقت کی ریت پر اپنے نقشِ قدم چھوڑ جائیں۔

بڑے آدمیوں کے وقائع حیات ہمیں درسِ بصیرت دیتے ہیں اور ان سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ہم ہندوستانیوں کیلئے مشاہیرِ ہند کی بیوگرافیز زیادہ سود مند ثابت ہونگی۔ اس اعتبار سے بادشاہ حسین صاحب کی یہ تصنیف ایک قابلِ قدر چیز ہے۔ ہمیں معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ مشاہیرِ ہند کی دوسری جلد بھی عنقریب شائع ہونے والی ہے جس میں چھ اور مشاہیر (۱) رامن (۲) رے (۳) سروجنی (۴) شاستری (۵) محمد علی جناح اور (۶) مہاتما گاندھی کے مشہور وقائع حیات اور کارنامے درج ہوں گے۔ "مشاہیرِ ہند" کی ضخامت ۱۳۲ صفحات اور قیمت ایک روپیہ ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ سید عبد القادر اینڈ سنز۔ چار مینار حیدر آباد دکن سے طلب کیجئے۔ "ش" ط

دُنیائے تبسم شوکت تھانوی صاحب کے بیس مزاحیہ مضامین کا مجموعہ اس نام سے حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا ہے۔ شوکت صاحب ہمارے مذاق کے ظرافت نگار ہیں۔ اپنے ہم عصر اور ہم مذاق ادیبوں سے انھیں جو خصوصیت ممتاز کرتی ہے وہ ان کی زبان کی صحت و شائستگی ہے۔ چھوٹے چھوٹے اور بے ساختہ فقرے لکھتے ہیں۔ مزاج میں جدت ہے اور شوخی انکی فطرت میں داخل ہے۔ شوکت صاحب کے مضامین کے چار مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ بہت غنیمت ہے کہ اور زیادہ لکھنے والوں کی طرح انکی تحریر میں ابتذال اب تک پیدا نہیں ہوا۔ ایک چیز البتہ ان کے مضامین میں نمایاں ہوتی جا رہی ہے جس میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ [illegible] ملا رموزی کے "ننھے میاں کی والدہ" کی طرح انکی "بیگم" بھی [illegible] پہنچنے نہیں دیتی۔ "دنیائے تبسم" کی کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ ضخامت ۲۱۰ صفحات۔ ٹائٹل دو رنگا۔ کاغذ بھی اچھا لگایا گیا ہے۔ ناشر کا بیان ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا دیباچہ بھی اس کے [illegible]

لگایا جائیگا۔ سہم میں یہ کتاب حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے منگائی جا سکتی ہے۔ "ش" ے

پریم سندیسہ ایم۔ اسلم صاحب کا لکھا ہوا ایک طویل افسانہ ہے جسمیں سماج کی ناہموار اور رسمی پابندیوں پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ محبت کے طریقے ہی نرالے ہیں۔ محبت کا قانون یہ ہے کہ اس کا کوئی قانون نہیں ہے۔ غالباً اسی وجہ سے یونانیوں نے محبت کے دیوتا کو اندھا تصور کیا ہے۔ چھتری خاندان کا ایک تعلیمیافتہ نوجوان ایک بھنگی کی بیٹی کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔ اس سماجی اُلجھن کو افسانہ نگار نے سادھو کا کردار پیش کر کے سلجھایا ہے۔ آخر میں فتح محبت ہی کی ہوتی ہے۔ افسانہ کا پیرایہ بیان دلکش ہے۔ قیمت ۱ر۔ ملک دین محمد کشمیری بازار لاہور سے منگائیے۔ "ش" ے

کلیاں بچوں کیلئے جناب ایم۔ اسلم نے پہلے بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ "کلیاں" بچوں کیلئے انھوں نے حال میں لکھی ہے اس میں (۳۴) چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں۔ زبان بہت آسان لکھی ہے اور کہانیوں کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کیلئے مزاحیہ طرز بیان اختیار کیا ہے۔ کتاب میں جابجا تصویریں بھی ہیں۔ یہ کہانیاں ایسی ہیں کہ بچے انہیں دلچسپی سے پڑھیں گے اور کام کی باتیں بھی سیکھیں گے ۹۶ صفحے کی یہ کتاب ملک دین محمد کشمیری بازار لاہور سے منگائی جا سکتی ہے۔ "ش" ے

پیام تعلیم مکتبہ جامعہ دہلی کے اہتمام سے بچوں کیلئے ایک ماہوار رسالہ "پیام تعلیم" کئی سال سے شائع ہو رہا ہے۔ ستمبر میں اس کا سالگرہ نمبر بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ بچوں کی معلومات بڑھانے کیلئے اس رسالہ میں خاص طور سے مضامین فراہم کئے جاتے ہیں۔ بچوں کو بہلانے کیلئے اسمیں بیکار لطیفے اور قصے نہیں ہوتے۔ سالگرہ نمبر میں واقعاتِ عالم بچوں کیلئے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے "جگ بیتی" کے نام سے لکھے ہیں۔ ایسا عمدہ مضمون کسی اور بچوں کے رسالہ میں ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ پروفیسر مجیب نے "چیونٹی کی باتیں" اور "لینن کی کہانی" بڑی دلچسپ سنائی ہے۔ مولوی محمد شفیع الدین نیر کی نظمیں بہت شوق سے پڑھی جائیں گی۔ "نباتات کی زندگی" "سکاس کی باتیں" "عجیب سکے" اور "قطب شمالی کا ہوائی سفر" معلومات میں ہے ... پڑھنا ذکر ہیں گے۔ "اچھی لڑکی" اور "گوالن کی لڑکی" ... ہیں ... شروع ... ایک ... لڑکی سادہ قصہ ... مضامین معتبر بھی ہیں۔ اس رسالہ میں بچیوں اور لڑکیوں

کیلئے بھی کافی مواد ہوتا ہے۔ سالگرہ نمبر میں دست کاری کے چند اچھے نمونے شامل ہیں۔ یہ ضخیم سالگرہ نمبر بارہ آنہ میں منگایا جا سکتا ہے۔ سالانہ چندہ ۲؎ ہے۔ "مق" ے

آئینہ اسلام مصنفہ منشی قمر الدین صاحب قمر۔ یہ ایک طویل نظم ہے جسمیں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلمان کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے سے عبرت ہوتی ہے اور دل میں قوم کی اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ ۳۲ صفحے کی یہ کتاب منشی بشیر الدین صاحب بشیر لال دروازہ دہلی سے ۲ر میں طلب کی جا سکتی ہے۔ "ش"

ترغیب بیداری یہ بھی منشی قمر الدین صاحب قمر کی ایک بامعنی مؤثر نظم ہے جسمیں مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ سونے اور کھونے کی انتہا ہو گئی۔ اب جاگنے کا وقت ہے اور اگر اب بھی نہیں جاگے تو موت کی نیند سو جائیں گے۔ اس نظم کا موضوع خاص اسراف ہے۔ جس کی مذمت میں شاعر نے اپنا پورا زور صرف کیا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کی قیمت ۱ر ہے اور مندرجہ بالا پتہ سے مل سکتی ہے۔ "ش"

صحیفہ چین مرتبہ سید اسد علی صاحب انوری فرید آبادی بی۔ ایس سی (آنرز) آئی۔ ایف۔ ایس۔ اس مفید و کار آمد کتاب میں چین کے مشہور عالم و مفکر کنفیوشس کی کتاب شو کنگ کا سلیس و شگفتہ ترجمہ درج ہے۔ "شو کنگ" تواریخ عالم میں سب سے زیادہ پرانی مانی جاتی ہے۔ جس کا زمانہ ۲۳۵۵ ق م سے ۷۰۸ ق م تک ہے۔ اُردو ترجمہ ڈبلیو گورن اولڈ کے انگریزی ترجمہ سے ماخوذ ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ اصل کتاب اور انگریزی ترجمہ میں سترہ بادشاہوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اُردو ترجمہ میں صرف گیارہ بادشاہوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ انوری صاحب نے اس خشک موضوع کو مفصل حواشی کی مدد سے اور بعض تاریخی واقعات کو عمدگی سے نظم کر کے بے حد دلچسپ بنا دیا ہے۔ ترجمہ کے علاوہ اس کتاب میں تین مبسوط ضمیمے بھی شامل ہیں۔ پہلے میں کنفیوشس کے مختصر حالات زندگی اس کے فلسفے اور اسکی تعلیم کا ذکر ہے۔ دوسرے میں چین کی جغرافیائی صنعتی، تجارتی، اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور ادبی حالات کو الف بوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ اور تیسرے میں چین کی تاریخ ابتدا تا اوائل ... کمال جانفشانی سے مرتب کی گئی ہے۔ غرض فاضل مؤلف نے اس مختصر کتاب کو زیادہ سے زیادہ مفید و دلچسپ بنانے میں بڑی محنت اور کاوش ...

اُردو میں یہ کتاب اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہے۔ جس میں چینی تمدّن کے ارتقائی منازل سے لیکر عہد حاضر تک کی معلومات خوش اسلوبی سے بیان کی گئی ہیں۔ اس کے مطالعے کے بعد کوئی شخص چین اور چینی تہذیب کے مختلف شعبہ جات سے قطعی بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ طباعت وکتابت کے اعتبار سے بھی یہ کتاب بے نظیر ہے جس سے ناشرین کی خوش مذاقی اور [illegible] ہے۔ ضخامت ۲۴۸ صفحے۔ قیمت عہر۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی۔

"ا۔ن" ۓ

اردات

منشی پریم چند آنجہانی کے تیرہ پاکیزہ افسانوں کے مجموعہ کا نام ہے جو مکتبہ جامعہ کی طرف سے حال ہی میں نہایت آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ منشی پریم چند کا نام نامی اُردو دُنیا میں آج کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مرحوم نے جس روشِ خاص سے فن افسانہ نویسی کی داد دی وہ ستائش و توصیف سے مستغنی ہے۔ وہ موثر اندازِ بیان، وہ شیرینی اور وہ لطافت اور وہ بے مثل قوتِ مشاہدہ جس سے ان کا معمولی سے معمولی افسانہ مالا مال ہوتا ہے، دوسرے افسانہ نویسوں کے افسانے اس سے خالی نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کے جادو نگار قلم نے افسانہ نویسی کو معراج پر پہنچا دیا۔ زیر نظر مجموعہ میں سب کے سب افسانے اُن کے اسٹائل کے بہترین نمونے ہیں۔ ہر ایک میں ان کے طرز تحریر کی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ کمی ہے تو صرف یہ کہ مرحوم کے دو ایک اور نہایت عمدہ افسانے اس مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئے۔ مثلاً "دو بہنیں" "کفن" وغیرہ۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات طباعت کتابت نفیس۔ قیمت عہر۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی۔

"ا۔ن" ۓ

مضامینِ رشید

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اٹھارہ مضامین کا مجموعہ، جو مکتبہ جامعہ دہلی نے زیب و زینت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی بلاشبہ اُردو کے بہترین مزاح و طنز نگار ہیں۔ مکتبہ جامعہ نے موصوف کے مضامین کا مجموعہ شائع کرکے یقیناً اُردو ادب پر احسان کیا ہے۔ لیکن مضامین کا انتخاب درست نہیں ہے بعض ایسے مضامین جن کی حیثیت ہنگامی و وقتی ہے درج کر لئے گئے۔ مثلاً "ارہر کا کھیت" "کارواں پیداست" "کھوکا بگو" وغیرہ ———— دوسری کمی جو اس مجموعہ میں نظر آتی ہے یہ ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے طرز تحریر اور انداز کے انشائی رنگ کے متعلق ایک بسوط تبصرہ و بحث کا اس مجموعہ میں شامل ہونا بھی ضروری تھا تاکہ ہر شخص جو پروفیسر موصوف کی ذات اور ان کے کمالات سے آشنا نہیں اِن مضامین سے مکمل طور پر متمتع ہوسکتا۔ امید ہے کہ ناشرین اگلے اڈیشن میں اس کا خیال رکھیں گے۔ پھر بھی رشید صاحب کے شیدائیوں کیلئے یہ مجموعہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ مضبوط جلد قیمت دو روپئے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ۔ قرول باغ دہلی۔

"ا۔ن" ۓ

کالی داس

چودھری جے کرشن صاحب ایم۔ اے۔ وکیل ایبٹ آباد نے اس مختصر لیکن جامع کتاب کے ذریعہ سنسکرت کے غیر فانی شاعر اعظم کالی داس کو اُردو دُنیا میں نہایت عمدگی سے رُوشناس کرایا ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں کالیداس کے حالات زندگی درج ہیں۔ دوسرے میں اس کی شاعری پر بصیرت افروز تبصرہ کیا گیا ہے اور تیسرے میں اس کے مشہور ڈراموں اور نظموں کو کہانی کی شکل میں اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اور جابجا ترجمے درج کئے گئے ہیں۔ جہاں تک کالی داس کی شاعری اور اس کے کمالات کا تعلق ہے مصنّف نے نہایت عمدہ اور موزوں پیرائے میں تبصرہ کیا ہے۔ لیکن سوانحی حالات میں بعض مختلف فیہ امور کی بابت مصنّف نے اپنی رائے بغیر کسی سند کے پیش کردی ہے۔ ضروری تھا کہ وضاحت سے اُن امور یا کتابوں کے حوالوں کا ذکر کیا جاتا جن سے مصنّف نے اپنا مخصوص نتیجہ مُرتب کیا۔ اِن باتوں سے قطع نظر بلاشبہ اُردو میں کالی داس کے حالاتِ زندگی اور اس کی شاعری پر اس سے پہلے کوئی منظم و کامیاب تبصرہ شائع نہیں ہوا۔ چودھری صاحب کی یہ کتاب اُردو ادبیات میں ایک قیمتی اضافہ کی حیثیت سے قابلِ قدر ہے۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات مضبوط جلد۔ کتابت و طباعت اوسط درجے کی۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ چودھری جے کرشن صاحب ایم۔اے وکیل ایبٹ آباد۔

"ا۔ن" ۓ

ہمایوں نامہ

مغل شہنشاہ بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے اپنے بھائی شہنشاہ ہمایوں کے حالاتِ زندگی اور حکومت کے واقعات فارسی میں "ہمایوں نامہ" کے نام سے لکھے تھے۔ اس کتاب کا ترجمہ سید ابن حسن صاحب شارق دہلوی بی۔اے۔ بی۔ٹی نے بڑی کاوش سے کیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت اور بھی چند مستند کتب پیش نظر رکھی ہیں تاکہ جہاں کہیں تشریح و توضیح کی ضرورت ہو ان کی مدد سے حواشی میں کردی جائے۔ ترجمہ کی دقتیں وہی حضرات

ں کر سکتے ہیں جنھوں نے ایک زبان کو دوسری زبان میں ڈھالنے
حاصل کی ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جس زبان سے ترجمہ
جائے اور جس زبان میں ترجمہ کیا جائے دونوں پر بہت اچھا
حاصل ہو۔ صرف اسی صورت میں بیساختہ ترجمہ ممکن ہے۔
ایوں نامہ" کا ترجمہ صحیح معنوں میں ترجمہ ہے۔

"حضرت بادشاہ کی اختراعات میں سے ایک اختراع
قصرِ رواں یا ایسا محل ہے جس کو جہاں جی چاہے
لے جاسکتے تھے۔ یہ محل لکڑی کا اور سہ منزلہ تھا۔
کاریگر نجاروں نے اس کو مختلف حصوں میں اس
طرح ترتیب دیا تھا کہ ان کو علیحدہ علیحدہ کرکے
منتقل کیا جاسکتا تھا۔ محل کے حصے یا ٹکڑے ایک
دوسرے سے اس طرح ملائے گئے تھے کہ وہ
ظاہر میں ایک ہی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب جی
چاہتا تھا اس کو علیحدہ علیحدہ حصوں میں الگ
کر لیا جاتا تھا۔ اور جہاں جی چاہتا اس کو لیجاتے
تھے۔ اس محل یا قصرِ رواں کی بالائی منزلوں کے
زینے اس طرح بنائے گئے تھے کہ اگر ان کو کھولنا
چاہتے تھے تو کھول لیتے تھے۔ اور اگر ان کو بند کرنا
چاہتے تھے تو بند ہو جاتے تھے۔"

"ہمایوں نامہ" کے ترجمہ کا جو اقتباس اوپر پیش کیا گیا ہے
نمونہ از خروارے سمجھئے۔ کتاب میں جو واقعات درج
خود بہت دلچسپ ہیں۔ سلیس اور صاف ترجمے نے
اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ کتاب میں بابر، ہمایوں،
مترجم کی عکسی تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت ایک روپیہ
۔ ملنے کا پتہ۔ قومی کتب خانہ، اردو بازار، دہلی۔
"دہلی" ۔

محبت اور نفرت

[illegible] حسین صاحب کے افسانوں کا مجموعہ ساقی بکڈپو
[illegible] ہے۔ ساقی کی آئندہ اشاعت میں اس پر تبصرہ
[illegible] کی وجہ سے اس اشاعت میں